شرح الفاظ القرآن
قرآن پاک کی تفسیری لغت
www.KitaboSunnat.com
تالیف: مولانا عبدالرشید گجراتیؒ
مقدمہ: شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ
پسندیدہ فرمودہ
مولانا عبدالرشید نعمانیؒ
مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ
مفتی نظام الدین شامزیؒ
ناشر
شمسی پبلشنگ ہاؤس
جامعہ یوسفیہ بنوریہ شرف آباد کراچی

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم
صل على محمد وعلى آل محمد
كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
انك حميد مجيد
اللهم
بارك على محمد وعلى آل محمد
كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
انك حميد مجيد

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝

شرح الفاظ القرآن

یعنی

قرآن پاک کی تفسیری لغت

جلد اوّل

مؤلفہ

مولانا عبد الرشید گجراتی

شائع کردہ

شمسی پبلشنگ ہاؤس

متصل جامعہ یوسفیہ بنوریہ شرف آباد سوسائٹی کراچی

کتبہ محمد فاروق

اشاعت ثانی: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ جولائی ۲۰۰۶ء

کتاب: شرح الفاظ قرآن

تالیف: مولانا عبدالرشید گجراتی

مطبع: اوکھائی پرنٹنگ پریس

ناشر: مولانا محمد یوسف شمسی

شمسی پبلشنگ کمپنی

جامعہ یوسفیہ بنوریہ، شرف آباد۔ کراچی
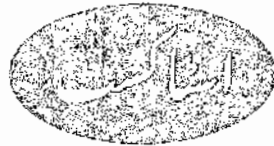
ادارۃ الانور۔ علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ ٹاؤن کراچی۔

ملنے کے پتے

۱۔ مکتبہ بنوریہ۔ سید محمد یوسف بنوریؒ ٹاؤن کراچی۔

۲۔ مکتبہ رشیدیہ۔ بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار کراچی۔

۳۔ اقبال بک ڈپو، صدر کراچی۔

۴۔ یونائیٹڈ [illegible]

سے دنیا عاجز و درماندہ ہے' اسی طرح اس کے معنی ومفہوم کی تعیین سے بھی انسانی عقل بے بس و درماندہ ہے' لہٰذا اس کا وہی معنی ومفہوم معتبر ہوگا جو خود اس کے اتارنے والے رب ذوالجلال نے یا نبی مرسل اور صاحب کتاب نے متعین فرمایا' یا پھر نبی اُمیؐ کے ان تلامذہ اور شاگردوں نے متعین فرمایا جو "صبغۃ اللہ" کی رنگینی میں رنگ چکے تھے۔

اس کے علاوہ جن لوگوں نے قرآن کریم کو اپنی نارسا عقلوں کے زور پر سمجھنے کی کوشش کی' انہوں نے نہ صرف امت کو ضلال وگمراہی کی وادی میں دھکیلا بلکہ حدیث نبوی کے مطابق انہوں نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالیا۔

قرآن کریم کی تفسیر وتشریح ایک طرف اگر اونچے درجہ کا اعزاز ہے تو دوسری طرف یہ دودھاری تلوار اور چھریوں کا ہار بھی ہے کہ جادۂ حق سے سرمو انحراف: "خسر الدنیا والاخرۃ" اور "ضلو فاضلوا" کا مصداق ہے۔

قرآن کریم چونکہ کلام الٰہی ہے' اس لئے اس کے معنی ومفہوم کی تعیین دراصل مراد الٰہی مراد اور منشاء خداوندی کی نشاندہی ہے' اور کسی متکلم کے کلام کی مراد کی تعیین' جبکہ وہ متکلم خود بھی اسی مجلس میں موجود ہو' کس قدر حزم واحتیاط کی متقاضی ہے؟ یہ کسی صاحب علم پر مخفی نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ معانی قرآن کے بیان اور تفسیر وتشریح میں حضرات اکابر علماء و محققین نے بہت شدید احتیاط کی تلقین فرمائی ہے۔

اس غرض سے کہ کوئی مسلمان' قرآن کریم کے کسی لفظ کا اپنی طرف سے کوئی غلط معنی ومفہوم ذہن میں نہ بٹھالے' اکابر علمائے امت نے قرآن کریم کی تفسیر کے ساتھ ساتھ الفاظِ قرآن کی لغات' معانی اور اس کی تشریح بھی فرمائی اور ہر دور میں اس پر گراں قدر تصنیفات شائع کی گئیں۔

اس آخری دور میں جو خواہش نفس اور اتباع ہوا کا دور ہے اور ہرایرا غیرا قرآن کریم کو اپنی تاویلات باطلہ کا تختہ مشق بنا رہا ہے‘ اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں امت کی صحیح راہ نمائی کی جائے۔

لغت عربی میں تو اس سے پہلے بھی ایسے کئی ایک مستند ذخیرے موجود تھے‘ مگر اردو زبان کا دامن اس سے خالی تھا‘ اس لئے ضرورت تھی کہ اردو زبان میں بھی ایسے مستند‘ قابل اعتماد اور لائق اطمینان خزانوں کے ذریعے امت کی راہ نمائی کی جائے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے مخدوم حضرت مولانا حسن الرحمٰن صاحب مدظلہ کو‘ جنہوں نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے جناب حضرت مولانا عبدالرشید گجراتی فاضل دارالعلوم کراچی و تلمیذ رشید امام حدیث حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی قدس سرہ مصنف ’’لغات القرآن‘‘ کی نفیس و انیق کتاب ’’شرح الفاظ القرآن‘‘ یعنی قرآن پاک کی تفسیری لغت کو از سر نو خوبصورت انداز میں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

کتاب پر مجھ ایسے کوتاہ علم و عقل کا کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کتاب پر اکابر علم و تحقیق اور آسمان علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب‘ یعنی: حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی قدس سرہ‘ حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ‘ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ اور امام المجاہدین حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزی قدس سرہ کی گراں قدر تقریظات ثبت ہیں‘ جو اس کی عظمت و ثقاہت کے لئے کافی ہیں۔

بلاشبہ جس کسی عالم و عامی نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہوگا‘ وہ کسی مبطل اور خواہش پرست کے اغوا سے متاثر نہیں ہوگا‘ بلکہ وہ اس کے فتنہ کی سرکوبی کے لئے اپنے آپ کو مسلح پائے گا۔

جب اس کتاب کی اشاعت اول کا مرحلہ آیا تو سب سے پہلے جامعہ فاروقیہ کے

مدیر اعلیٰ حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ نے اس طرف توجہ فرمائی' چنانچہ اس کی کتابت بھی ہوگئی تھی مگر بعض وجوہ سے انہوں نے اس کی اشاعت سے معذرت فرمائی' تو کتاب کے مصنف حضرت مولانا عبدالرشید گجراتی قدس سرہ اس سلسلہ میں امام المجاہدین حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزی شہیدؒ کے پاس تشریف لائے اور انہیں اس کی اشاعت کی طرف متوجہ کیا' چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ کی کوشش سے ہی شمسی پبلشرز کے مالک جناب الحاج فیروز شمسی صاحب نے کتابت شدہ مسودہ تقریباً ۴۵ ہزار روپے میں خرید کر اس کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا' یوں مصنف کتاب حضرت مولانا عبدالرشید صاحب گجراتی قدس سرہٗ نے بذریعہ حضرت مفتی صاحبؒ اس کتاب کے تمام حقوق شمسی پبلشرز کے حوالہ کردیئے اور کتاب منصۂ شہود پر آگئی۔ پیش نظر اشاعت دوم' بھی شمسی پبلشرز ہی کی جانب سے ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو حضرت مصنف' ناشر اور معاونین کی نجات اخروی کا ذریعہ اور امت کی اصلاح وہدایت کا سبب بنائے۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

سعید احمد جلال پوری

۱۴۲۷/۳/۱۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Majlis-ud-Da'wati-wat-Tahqiq-il-Islami
Allama Muhammad Yusuf Banuri Town
Karachi-5, Pakistan

مجلس الدعوۃ والتحقیق الاسلامی
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی ۵ پاکستان

NO:
DATE:
TEL:

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد

ہمارے فاضل دوست اور شاگرد مولوی عبدالرشید صاحب گجراتی اس اعتبار سے قابل مبارک باد ہیں کہ مدرسہ سے فراغ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو ضائع نہیں کیا۔ بلکہ اپنی زندگی کا بہترین مشغلہ علمی انہماک کو بنایا۔ اب خدا کی توفیق ہے کہ اس نے ان کو اپنی کتاب عزیز" کی خدمت کا ذوق عطا فرمایا ہے اور ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ قرآن کریم کی لغت تیار کریں۔ چنانچہ جس لگن اور جذبہ کے ساتھ وہ اس کام میں منہمک ہیں وہ قابل رشک ہے۔ بارہ سال ہونے آئے کہ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اس مبارک خدمت کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ بارک اللہ فی علمہ وعملہ واخلاقہ آمین۔

قرآن پاک کی لغت پر راقم السطور نے بھی کافی ابتداء عمر میں کام کیا ہے۔ میرے بعد مسٹر پرویز نے بھی لغات القرآن" نامی ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کے وہ اہل نہ تھے۔ اور اس لئے وہ خاصی ضلالت وگمراہی کا مرقع ہے۔ مگر ہمارے مولوی عبدالرشید گجراتی کی کتاب علم وتحقیق کی روشنی میں خاصی محنت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ اور امید ہے کہ وہ مقبول خاص وعام ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یوں تو سچی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی خدمت کا حق تو کسی بشر سے کیا ادا ہو سکتا ہے۔ لیکن حسب استطاعت جو بشر بھی اس کار خیر میں حصہ لیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم نہیں رہتا۔ اہل علم جب ہمارے مولوی صاحب کی اس کتاب "شرح الفاظ القرآن" کا مطالعہ کریں گے تو ان کے سامنے یہ حقیقت عیاں ہو کر سامنے آئے گی کہ کم ترک الاول للآخر۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو قبولیت عام سے نوازے۔ اور مرتب کو اخلاص کی برکت سے مالا مال کرکے دنیا وآخرت میں سرخ رو وسرفراز فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

محمد عبدالرشید نعمانی مصنف "لغات القرآن"
یکشنبہ ۱۲ رجب سنہ ۱۴۰۷ ہجری

Justice Muhammad Taqi Usmani
Shariat Appellate Bench
Supreme Court Of Pakistan

محمد تقی العثمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

اما بعد۔ برادر گرامی قدر و مکرم جناب مولانا عبدالرشید صاحب مدظلہم العالی فاضل دارالعلوم کراچی ماشاء اللہ اپنی طالب علمی کے دور ہی سے ذہین وفطین اور علمی ذوق کے حامل تھے۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی صحبت وتلمذ نے ان کے ذوق کو مزید جلا بخشی، اور مجھے یاد ہے کہ حضرت والد ماجد قدس سرہ ان سے بڑی محبت وشفقت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، اور ان کے ساتھ جس بے تکلفی سے پیش آتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ ان سے کوئی کام لینے والے ہیں۔ کیونکہ اللہ والوں کی کسی پر ایسی خصوصی نظر بھی منجانب اللہ ہوتی ہے۔

الحمد للہ۔ محب مولانا عبدالرشید صاحب مدظلہم دارالعلوم سے ضابطے کی فراغت کے بعد مسلسل خدمات دینیہ میں مشغول رہے۔ اور اب ان کی برسہا برس کی محنت کا ثمر شیریں ایک باوقار علمی کتاب "شرح الفاظ القرآن" کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔

قرآن کریم کی متعدد لغات اردو میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن مولانا عبدالرشید صاحب مدظلہم نے سورتوں کی ترتیب سے ہر لفظ کی جو تشریح فرمائی ہے، وہ بڑی مفصل، جامع اور سیر حاصل ہے۔ اصل عربی لغات وماخذ کی روشنی میں لفظ سے متعلق جملہ ضروری تفصیلات اور بوقت ضرورت ایسی تشریح جس سے تفسیر بھی سمجھ میں آجائے، بڑے دلنشین انداز میں بیان فرمائی ہے۔

اصل میں کتاب کی ترتیب [illegible] قرآن کریم کی سورتوں کے حساب سے ہے جس سے مسلسل پڑھنے والے کو [illegible] بہت مدد ملتی ہے۔ لیکن ایک مفصل فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے بھی دیدی گئی ہے، اور اس طرح کتاب سے استفادہ بہت آسان ہوگیا ہے۔

احقر پوری کتاب سے استفادہ کرنے سے تو معذور رہا، لیکن جستہ جستہ مقامات سے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ کتاب نہ صرف اردو، بلکہ دنیا بھر کے تفسیری ذخیرے میں بھی ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔ اب مولانا اسے عربی زبان میں بھی مرتب فرما رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے مطابق اس کی تکمیل کے بھی اسباب مہیا فرمائیں۔ آمین۔

دل سے دعا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبول حاصل کرے، [illegible] اہل علم اور طلبہ دونوں اس سے مستفید ہوں، اور فاضل مؤلف کو اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں اس کی جزائے خیر عطا فرمائیں، اور اسی جیسے مزید علمی کام سرانجام دینے کی توفیق فرمائیں۔ آمین۔ والسلام

۱۱ر شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ

احقر
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
خادم طلبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مکلف مخلوق کی ہدایت کے لئے تکوینی انتظام کے علاوہ (وفی کل شیئٍ له ایةٌ تدل علی انه واحد) (وفی اَنفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْن) تشریعی طور پر دو سلسلے جاری فرمائے تھے، ایک سلسلہ بعثۃ الرسول کا تھا اور دوسرا سلسلہ انزال الکتب کا۔ اور اہلِ عقل پر مخفی نہیں ہے کہ یہ دونوں سلسلے ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس قسم کا تعلق رکھتے ہیں کہ ہر ایک کا کما حقہ سمجھنا دوسرے پر موقوف ہے چنانچہ قرآن کریم میں بار بار اطیعوا اللہ کے ساتھ اطیعوا الرسول کا ذکر اور مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللہ اور حضرت عائشہ الصدیقہ کی روایت وکان خلقه القرآن میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے البتہ اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے بصارت والی عیون اور بصیرت والے دل کی ضرورت ہے آج کل بعض لوگ اس خبط میں مبتلا ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور اقوال سے ہٹ کر اپنی عقل۔ (جس کو وہ عقل کل سمجھتے ہیں) سے قرآن کریم کو سمجھے اور سمجھائے جس کا واضح اور بدیہی نتیجہ خود گمراہ ہونے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس کو مثالوں کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا ہے لیکن یہ مقام اس کے بیان کا متحمل نہیں ہے مختصراً یہ عرض ہے کہ قرآن کریم کے احکام اور الفاظ کو سمجھنے کے لئے خود قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے کہ ایک مقام پر اگر اجمال ہوتا ہے تو دوسری جگہ کچھ تفصیل ہوتی ہے جس سے اس اجمال کو سمجھا جا سکتا ہے اور اگر دوسرے مقام پر تفصیل نہ ہو تو پھر احادیث مرفوعہ کی طرف رجوع ضروری ہے اگر وہاں بھی وضاحت نہ مل سکے تو پھر اقوال صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور اگر اقوال صحابہ میں بھی کسی لفظ کی تفسیر نہ ہو تو پھر اقوال تابعین کی طرف رجوع کرنا اور وہاں سے اس حکم یا لفظ کی تفسیر معلوم کرنا ضروری ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن کریم سے کسی جدید حادثے اور معاملے کا حکم معلوم ہی نہیں کیا جا سکتا ہے، ضرور کیا جا سکتا ہے لیکن ان مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں۔ اس وقت میرے سامنے حضرت مولانا عبدالرشید صاحب گجراتی مدظلہ کی ضخیم کتاب شرح الفاظ القرآن یعنی قرآن پاک کی تفسیری لغت ہیں یہ کتاب ان ہی مذکورہ بالا اصول کے تحت لکھی گئی اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف لغت نہیں بلکہ یہ ایک مکمل تفسیر بھی ہے کیونکہ اس کتاب میں لغوی معنی کے بیان کیساتھ ساتھ مختلف مفسرین کے اقوال اور لفظ جتنے معنی میں استعمال ہوتا ہے سب کا استقصاء اور اگر وہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ مختلف معنیٰ ہے تو اس کی پوری تفصیل ذکر کی گئی ہے اسی طرح اگر کسی لفظ کے معنیٰ میں مفسرین کا اختلاف ہے تو معنیٰ وتفسیر کے اس اختلاف کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کرکے راجح قول کی نشاندہی دلائل کے ساتھ کی گئی ہے حضرت مولانا کو قرآن کریم کی طویل خدمت کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے علم تفسیر کے خاص ذوق سے نوازا ہے اس لئے ان کی یہ خدمت اس قسم کی دوسری خدمات سے بہت فائق ہے اور خاص اہمیت رکھتی ہے اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کے نفع کو عام فرمائے اور اس کو اپنی مخلوق کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنائے اور حضرت مولانا کو صحت کاملہ عاجلہ نصیب فرمائے کہ وہ اپنی کتاب کو مطبوع صورت میں دیکھ سکیں آمین یارب العالمین۔

نظام الدین شامزی

نگران شعبۃ تخصص فی الفقہ الاسلامی

واستاذ حدیث جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامۃ بنوریؒ ٹاؤن کراچی ۵

۱۱ جمادی الثانیہ سنہ ۱۴۲۱ھ

مقدمة

از شیخ الحدیث والتفسیر مولانا سلیم اللہ خان

(۱) قرآن کریم کو اللہ تبارک تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ کہ یہ کتاب لوگوں کے لئے ہدایت ہے، اور ہدایت کے دلائل وبراہین پر مشتمل ہے چنانچہ اس کتاب کے وقت نزول سے لیکر اب تک اس امر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب سے اللہ تعالیٰ کے بہت سارے بندوں نے ہدایت حاصل کی اور راہِ ہدایت پر چلنے کی توفیق سے وہ بہرہ ور بھی ہوئے۔

(۲) نیز یہ بھی مسلّم ہے کہ قرآن معجز اور لاجواب کتاب ہے جس کے مقابلے سے آج تک پوری دُنیا عاجز ہے چنانچہ خود قرآن کریم سے یہ تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ قرآن نے یہ چیلنج دیا کہ اگر لوگوں کو شک ہے کہ یہ اللہ تبارک تعالیٰ کی کتاب نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی کتاب ہے تو ارشاد ہوا کہ تم بھی ان جیسے انسان ہو تم اسی قوم اور قبیلے اور اسی زبان اور علاقے سے تعلق رکھتے ہو جس سے محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے لہذا تم اس جیسی کوئی کتاب بنا کر پیش کرو، یا کم از کم دس سورتیں یا اس سے بھی کم ایک سورت ہی بنا کر پیش کرو لیکن تاریخ عالم شاہد ہے کہ اُسوقت سے لیکر اب تک دنیا اس کتاب کا مثل پیش کرنے سے عاجز ہے اور عاجز رہے گی۔

(۳) اسی طرح یہ بات بھی مسلم ہے کہ اس کتاب سے ہدایت کا حصول اسکے فہم پر موقوف ہے، اس لئے کہ جب تک کسی چیز کو سمجھا نہ جائے اس وقت تک اس کا مفہوم متعیّن کرنا یا اس کی مراد اور مقصود کو حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

(۴) ابتداءِ اسلام میں لوگ اس کتاب کو سمجھنے کے لئے خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا کرتے تھے چنانچہ حدیث کی کتابوں میں یہ واقعہ منقول ہے کہ ایک صحابی نے جب قرآن کی یہ آیت سنی كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ، تم کھاؤ

بموجب تک کہ سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے واضح اور ممتاز ہو، تو اس صحابی نے رمضان میں اپنے سرہانے تکیہ کے نیچے ایک سفید اور ایک سیاہ دھاگہ رکھا اور کھاتے پیتے رہے یہاں تک کہ دن کے ابتدائی حصے میں بھی وہ دونوں دھاگے گھر کے اندر ایک دوسرے سے ممتاز نظر نہیں آئے اس کے بعد جب انھوں نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا تو آپ نے وضاحت کی کہ اس سے مراد صبح صادق کا ظہور ہے جس سے رات کی سیاہی رخصت ہونے لگتی ہے اور دن کی روشنی کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر خود قرآن کریم میں بھی مِنَ الفجر کا لفظ نازل ہوا جو اس وضاحت کی تصدیق کرتا ہے۔ کتب احادیث میں اس قسم کے اور بھی واقعات منقول ہیں۔ اس کے بعد جب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم دُنیا سے تشریف لے گئے تو فہم قرآن کے لئے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی طرف رجوع کیا جانے لگا اسی طرح طبقہ بطبقہ یہ علم سینوں میں محفوظ ہو کر منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ علم کی تدوین کا زمانہ شروع ہوا تو دوسرے علوم کی طرح علم تفسیر کی تدوین بھی ہوئی اور یہ علم سینوں سے سفینوں میں منتقل ہوا اور اس کے اصول و قواعد بھی مدوّن ہوئے۔

علماء تفسیر نے تفسیر قرآن کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں :

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن کریم سے کی جائے۔ قرآن کریم میں بعض دفعہ ایک بات کو ایک مقام پر اجمالاً بیان کیا جاتا ہے پھر خود قرآن کریم اس بات کو دوسرے مقام پر تفصیل سے بیان کرتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں انبیاء سابقین کے بعض قصص جو متعدد مقامات پر بیان کئے گئے ہیں وہ اس کی مثال ہیں۔ اسی طرح بعض دفعہ ایک ہی واقعے کو مختلف مقامات پر مختلف الفاظ میں ذکر کیا جاتا ہے تو الفاظ کے اختلاف سے بھی وضاحت ہو جاتی ہے اور معنی و مراد متعین کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر و تشریح احادیث مبارکہ سے ہو۔ تفسیر کی یہ صورت بہت بہتر اور زیغ و ضلال سے مامون صورت ہے۔ علماء تفسیر نے اس قسم کی تفسیریں لکھی ہیں جن میں ابن جریر طبریؒ اور ابن کثیرؒ اور امام سیوطیؒ کی تفاسیر بہت بہترین اور جامع ہیں۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اگر کسی آیت کی تفسیر و تشریح خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے موجود نہ ہو تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ اس آیت کے متعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے

صحابہ یعنی مزاج شناسانِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی تشریح منقول ہے کہ نہیں، اگر ان حضرات سے کسی آیت کی تفسیر منقول ہو تو پھر اس کو لیا جائے گا اور اسی کو قرآنِ کریم کا مفہوم اور مراد کہیں گے۔

(۴) اور چوتھی صورت یہ ہے کہ اگر کسی آیت کی تفسیر و تشریح معلوم کرنے میں مذکورہ بالا ان تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہ ہو تو پھر اس آیت کی تفسیر کے لئے تابعین کے اقوال کی طرف رجوع کریں گے کیونکہ ان حضرات نے اس علم کو براہِ راست ان لوگوں سے حاصل کیا تھا جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اُٹھائی تھی اور قرآن کریم کے علوم کو خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا۔ نیز یہ بھی ایک بدیہی بات ہے کہ تابعین کی جماعت دین کے فہم، خدا ترسی اور علم و تقویٰ میں اعلیٰ مقام پر فائز تھی اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہترین دَور اور زمانے میں ان کو پیدا کیا تھا اور قرآن کریم کی آیت والّذین اتبعوھم باحسان کا ان کو مصداق بنایا تھا یہ سب ان کے ایسے فضائل و مناقب ہیں کہ بعد والے لوگوں کو اسکا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں، اس لئے عقلِ سلیم کا تقاضا یہی ہے کہ قرآن کریم کا صحیح مفہوم و مراد جتنا وہ جانتے تھے بعد والے اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے اسلئے ان کے اقوال اس سلسلے میں قابلِ اعتبار ہونے چاہئیں۔ اسی بنا پر اصولِ تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ان چاروں طریقوں سے ہٹ کر یا ان اصولوں کو نظر انداز کرکے جو تفسیر لکھی جائے گی وہ صحیح تفسیر نہیں ہوگی بلکہ تفسیر بالرائے ہوگی جس کی مذمت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بیان فرمائی ہے۔

پھر یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے مفردات قرآن کے لغوی معانی کی سمجھ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اگرچہ یہ قرآن فہمی کے لئے واحد بنیاد نہیں اور صرف لغت سے قرآن کو سمجھنا ممکن بھی نہیں اسی لئے تو صحابۂ کرام کے لئے بھی بعض آیات کا سمجھنا ممکن نہ ہوا حالانکہ وہ اہلِ زبان تھے اور لغت اُن کی اپنے گھر کی چیز تھی، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ فہم قرآن میں اس کی بنیادی اہمیت ضرور ہے اسلئے علمائِ تفسیر نے اس کی طرف بھی خاص توجہ دی اور لغتِ قرآن یعنی قرآن کے مفردات

کے لغوی معانی پر خاص کتابیں لکھیں، متقدمین علمار میں سے سیبویہ، اخفش، ابن قتیبہ اور فرا اور بہت سارے علمار نے اس پر کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کتابوں میں سے اکثر کتابیں اب ناپید ہیں یا تو وُہ کتابیں ضائع ہو چکی ہیں اور اب دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں یا دنیا کے مختلف کتبخانوں میں مخطوط شکل میں موجود ہیں لیکن عام لوگوں کے لئے ان سے استفادہ ممکن نہیں، امام راغبؒ اصفہانی یا بعض دوسرے علمار کی کتابیں اگرچہ طبع بھی ہو چکی ہیں لیکن چونکہ وہ کتابیں عربی میں ہیں اس لئے عوام کے لئے ان سے ممکن نہیں تھا اس لئے برصغیر کے علمار نے اس طرف توجہ کی اور قرآن کی لغت اور الفاظِ قرآن کی تشریح پر کتابیں لکھیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مولانا عبدالرشید صاحب مدظلہ کی یہ کتاب بھی ہے، اس کتاب میں صرف قرآن کے لغوی معانی کے بیان پر اکتفار نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا مفہوم اور قرآن میں جس سیاق و سباق میں وہ لفظ استعمال ہوا ہے اس کی پوری تفصیل لغت اور تفاسیر کی معتبر کتابوں کے حوالے سے لکھی ہے نیز اسکی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں وہ الفاظ جو قرآن میں مکرر اور بار بار آئے ہیں انکی تشریح بھی بار بار کی گئی ہے اور اگر دوسرے مقام پر سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی میں کوئی فرق آیا ہے تو اس کی پوری وضاحت کی گئی ہے۔

مولانا موصوف کو چونکہ درس و خدمت قرآن کا وسیع تجربہ حاصل ہے، نیز یہ کہ انہوں نے یہ خدمت عوام میں کی ہے اس لئے عوام کی ذہنی سطح کو مدِّنظر رکھ کر انہوں نے تشریح و تفصیل ذکر کی ہے اور ان تمام اُمور کو ملحوظ رکھا ہے جو فہم قرآن کے سلسلے میں عوام کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔

اس لئے اس کتاب سے [illegible] ص اور علوم قرآنی کے متخصصین کے ساتھ وہ عوام بھی بھرپور فائدہ اُٹھائیں گے جو علوم قرآن اور فہم قرآن کے شائق ہیں۔ نیز ان شار اللہ اس کتاب کے ذریعہ اس فتنہ کا بھی تدارک ہو گا جو ملحدین فہم قرآن کے لبادے میں عوام میں پیش کر رہے ہیں کیونکہ صحیح اور مستند معلومات جب عوام کی دسترس میں ہونگی تو پھر وہ ان معلومات کی روشنی میں ملحدین اور زائغین کے اقوال کے زیغ و

ضلال کو معلوم کر کے اس سے بچ سکیں گے۔

اُمید ہے کہ مولانا کی اس کاوش اور محنت سے عوام وخواص بھرپور فائدہ اُٹھائیں گے اور اپنے دلوں کو قرآنی علوم کے نور سے منوّر کریں گے، وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

سلیم اللہ خاں

۲۴/۷/۱۴۰۸ھ

۱۴/۳/۱۹۸۸ء

عرض مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَاٰلِهٖ اَجْمَعِيْنَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا ۔

اللہ ربّ العزت کا کلام قرآن کریم اس جہان میں وہ نعمت بے بہا ہے کہ آسمان و زمین اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات اس کا بدل نہیں ہوسکتیں، انسان کی سب سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی قرآن کریم کے ساتھ تعلق اور اس کی خدمت سے وابستہ رہنا ہے، اور سب سے بڑی شقاوت اس سے اعراض اور گریز ہے ۔

دارالعلوم کراچی سے علوم دینیہ متداولہ سے فراغت کے بعد ۱۹۶۸ء میں پاکستان ائرفورس میں میں نے بطور خطیب اور امام کے ملازمت اختیار کرلی اور میرا تقرر پی، اے، ایف شارع فیصل کی مرکزی مسجد میں ہوا، اب میرے سامنے بڑا مسئلہ مذہبی کام کی نوعیت کا تھا، سول اور غیر سرکاری اداروں میں کام وسیع اور غیر محتاط بایں معنی ہوتا ہے کہ لکھنے، یا بولنے والے پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ کیا لکھے اور کیا بولے، وہ اپنی زبان وقلم کے استعمال میں خود مختار ہوتا ہے جبکہ فورسز میں ایسا نہیں ہے، چونکہ افواج کا سادہ مزاج اور ان کی مخصوص ترکیب اس کی متحمل نہیں کہ کوئی شخص اپنے مخصوص اور محدود نظریات کو سامنے رکھ کر کام کرے ۔

خاص کر ائرفورس جو ملک کا قابل فخر عظیم دفاعی ادارہ ہے اسکا ادنیٰ سپاہی بھی سنجیدہ اور تعلیم یافتہ ہوتا ہے، یہاں وہی طریقۂ تعلیم پسند کیا جاتا ہے جو عقل ونقل کے مطابق اور مدلّل ہو ۔ ۱۹۷۴ء میں میں نے اللہ کے فضل سے قرآن پاک کا درس شروع کیا اور پورا قرآن

صرف دس۱۰ ماہ میں ختم کرنے کا اعلان کیا، جس میں اوّل سے آخر تک ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور درس عشاء کے بعد سے تکبیرات کے بارہ۱۲ بجے تک اکثر اور کبھی اس سے زیادہ وقت تک بھی ہوا، اور اللہ کے فضل سے ٹھیک دس ماہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، یعنی ۱۵ رشوال ۱۳۹۴ء سے شروع ہو کر ۲۵ رشعبان ۱۳۹۵ھ کو ختم پذیر ہوا، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ،

اس کے بعد سے اب سر درس کا اُنیسواں۱۹ سال شروع ہے اور قرآن پاک کا سلسلۂ درس جاری ہے، اور ذاتِ قدّوس سے استدعا ہے کہ زندگی کا بقیہ حصہ بھی اپنے قرآن ہی کی خدمتیں صرف کرنے کی توفیق عطا کرے اور میری کوتاہیاں معاف فرمائے، وَھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

وَجہ تالیف :

درس کے زمانے میں مجھے خیال ہوا کہ لغت و تفسیر سے متعلق ایک یادداشت تیار کروں، جو آئندہ ہر بار میرے کام آئے اور بار بار کتابوں کی ورق گردانی نہ کرنی پڑے لیکن میرے قابلِ قدر اساتذہ اور مخلص ساتھیوں کی حوصلہ افزائی نے میرے اس طالبِ علمانہ کام کا رُخ بدل دیا اور طالبِ علمانہ یاد داشت کے طور پر لکھا ہوا مسوّدہ کتابی شکل اختیار کر گیا۔

طریقۂ تالیف :

اصحابِ علم و تقویٰ اس بات سے واقف ہیں کہ قرآن کریم میں اپنی رائے سے کوئی بات کہنا اور لکھنا کس قدر خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے، اس کا اصل اصُول یہ ہے کہ قرآن کو قرآن ہی سے حل کیا جائے۔ چونکہ قرآن پاک ایک مقام پر مجمل بات کہتا ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفسیر ہو جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قرآن پاک کا حل اس ذاتِ مبارک صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے کیا جائے جس پر قرآن پاک اُترا، تیسرا طریقہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر اور اس کا حل اکابرین مفسرین کی تفاسیر میں تلاش کیا جائے

پہلی دونوں صورتیں نہایت مبارک ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں سے کامل استفادہ رَاسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ ہی کر سکتے ہیں۔ اوساط اس میں ٹھوکریں کھاتے ہیں، لہٰذا میں نے تیسری صورت کو اختیار کیا اور دست بستہ اکابرین اور اسلاف مفسّرین کے دروازوں پر جھکا اور اپنے سر کو قرآن کریم کے خدمتگاروں کی دہلیز

پر رکھدیا، چنانچہ مَیں نے جو کچھ لکھا ہے بحوالہ لکھا ہے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں لکھی۔

کتاب کی ترتیب:

پیشِ نظر کتاب کی ترتیب سورتوں کے حساب سے رکھی گئی ہے اور اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ سورت میں جو مشکل الفاظ آئیں اُن کا تفصیلی حل معتبر تفاسیر اور کتب لغت سے کیا جائے، لیکن جب کام شروع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ قرآن پاک پر قلم اُٹھانے کے لئے کسی ایک فن کی کتب سے کام نہیں چل سکتا، بلکہ علمِ لغت پر کام کرنے کے لئے تو ایک وسیع کتب خانہ درکار ہے جو مجھے میسر نہیں تھا۔ بظاہر حالات ایسے تھے کہ مَیں اس کارِ عظیم میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ کتب کی نایابی نے میرے راستے تنگ کر دیئے تھے، لیکن لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ کی آیت نے میری آس کو باندھے رکھا۔ اب میرے ربّ کریم کی کرم فرمائیوں کو دیکھئے کہ چند احباب کو جو میرے درس کے شریک تھے میری علمی ضرورت کی طرف متوجہ کر دیا اور چند اہم کتب کی انھوں نے پیش کش فرمائی اور خود مجھ سے جو کچھ اہل و عیال کے جائز اخراجات سے بچ سکا کتابوں کی نذر کر دیا اور آج اللہ کے فضل سے میرا ذاتی کتب خانہ اتنا بڑا ہے کہ الحمدُللہ لغت و تفسیر کی تمام ضروری کتب اسمیں موجود ہیں۔ (وَلَا فَخر)

کتاب کی ترتیب چونکہ سورتوں کی ترتیب پر ہے اس لئے ہوا یہ کہ مختلف الفاظ کو انکی مقامی حیثیت سے آیت یا آیت سے ثابت ہونے والے حکم کو واضح کرنیکے لئے ایک سے زائد بار لانا پڑا، اس طرح کتاب کے صفحات تو کچھ ضرور بڑھے مگر اسی طرح فائدہ بھی بڑھا۔

۱۹۷۵ء سے لیکر ۱۹۸۵ء تک کا عرصہ اس طرح دیدہ ریزی میں گذرا کہ کتنی ہی راتیں الماریوں کو کھولنے اور بند کرنے میں بیت گئیں مفتی کفایت اللہ صاحب کی تعلیم الاسلام سے کشاف تک ہر فن کی کتب سے مدد لی اور بار بار زبان پر عاشقِ لیلیٰ کا یہ شعر آتا رہا ؎

امر علی الدیار دیارِ لیلیٰ   اقبل ذالجدار و ذالجدارا

وما حب الدیار شغفن قلبی   ولکن حب من سکن الدیارا

دورانِ تالیف وقتاً فوقتاً جو علمی مشکلات پیش آتی رہیں اُنکے حل کیلئے مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم سے اور کبھی دیگر اساتذہ سے مدد لیتا رہا۔ کتاب کے اختتام کے بعد پہلی جلد کا مسودہ

مولانا کو پیش کیا اور حضرت نے مختلف مقامات سے پڑھا اور اس کی طباعت کی ذمہ داری قبول فرمائی ۔ دورانِ تالیف اپنے استاذ مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی مدظلہٗ کو بھی بعض مقامات دکھلائے ، انھوں نے مشورہ دیا کہ پرویزی لغات القرآن کو بھی مطالعہ میں رکھو اور لغت کے نام پر اُسنے جو کچھ تحریفات کی ہیں انکی نشاندہی بھی ساتھ ساتھ کردو لیکن پرویزی لغت چونکہ تحریفات اور تلبیسات کا ایک طومار ہے اس پر مستقل کام کرنیکی ضرورت ہے اسلئے زیادہ توجہ اسکی طرف نہ ہوسکی ۔

میں نے الفاظ کی تحقیق کا مدار زیادہ تر تفاسیر پر رکھا ہے اسلئے آپ دیکھیں کہ حل لغات کے ساتھ ساتھ لفظ کی پوری تفسیر ہوگئی ہے ۔

الفاظ کی تفسیری اہمیت کو واضح کرنے کے لئے لفظ کے استعمالات اور محاورات بھی متداول کتب لغت سے نقل کرنے کا اکثر اہتمام کیا ہے ، اب اللہ تعالیٰ سے استدعا ہے کہ جس سعی کی اس نے توفیق بخشی ہے اس کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے ۔

فہرست :

کتاب چونکہ سورتوں کی ترتیب پر ہے اس لئے ایک مشکل یہ پیدا ہوگئی کہ لفظ کو تلاش کیسے کیا جائے اور یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں فلاں لفظ کتاب میں کن کن سورتوں میں کہاں کہاں بیان کیا گیا ہے ، اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے میں نے حروف تہجی کی ترتیب پر ایک مکمل فہرست تیار کرنے کا ارادہ کیا ۔ اس فہرست کی ترتیب میں جو دقّت محسوس ہوئی اسکا اندازہ پہلے نہیں تھا لیکن اللہ کے فضل و کرم سے یہ کام بھی ہوگیا اور مکمل فہرست تیار ہوگئی ۔

اب اس فہرست کی مدد سے ایک ہی مادّہ کے جتنے الفاظ اور صیغے کتاب میں مذکور ہوئے ہیں آپ ایک ہی نظر میں تلاش کرسکتے ہیں ۔

فہرست کی ترتیب سے معلوم ہوا کہ کچھ الفاظ رہ گئے ہیں اور الفاظ بھی بڑے ضروری ہیں چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے آخر میں چند صفحات کا تکملہ لگا دیا گیا ہے ۔ اب یقین تو یہی ہے کہ کوئی لفظ اور صیغہ نہیں رہا جسکا ذکر کتاب میں نہ ہو ۔

ہر لفظ کے اُردو حل کے بعد اہل علم اور طلبہ کے ذوق کی خاطر مکمل عربی حوالے دیئے ہیں جن کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ قرطبی ، لسان العرب ، البحر ، المحیط اور تاج العروس

معارف القرآن اور صحاح جوہری کے صفحات آپ کے سامنے کھول دیئے گئے ہیں ۔

ترجمہ :

آیات کا ترجمہ کرتے وقت میں نے معارف القرآن مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ، تفسیر ماجدی اور موضح القرآن کو سامنے رکھا ہے ۔

جہاں الفاظ کی تفسیر میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہوا ہے وہاں اہلِ تفسیر کے اقوال نقل کر کے فیصلہ اہلِ علم پر چھوڑ دیا ہے اپنی طرف سے قطعًا کوئی رائے پیش نہیں کی ۔ اسی طرح اہلِ لغت کے اختلاف کو بھی ذکر کیا گیا ہے، جہاں کسی لفظ کے معنی کو ترجیح دی گئی ہے وہ بھی اہلِ لغت یا اصحابِ تفسیر ہی کی بیان فرمودہ ہے جبکا حوالہ بھی دیدیا گیا ہے ۔

حوالہ دیتے وقت کتابوں کے صفحات اور جلد نمبر کا اہتمام اس لئے نہیں کیا گیا کہ زیرِ نظر کتاب کی ترتیب سورتوں کی ترتیب پر ہے، مثلاً لفظ بغیر عمد ترونها کے تحت سورۃ الرعد کے لفظ عَمَد کی تشریح و تفسیر ہے تو اس کے آخر میں جن تفاسیر کے حوالے ہیں وہ ان تفاسیر کی انہی سورتوں میں سے لئے گئے ہیں ۔

استدعاء :

اپنے تمام اساتذہ اور ہمعصر ساتھیوں سے استدعا ہے کہ دورانِ مطالعہ کہیں ترجمہ یا مادہ کے بیان میں کوئی علمی غلطی پائیں تو اسکا خطاوار اس بشر کو قرار دیں اور غلطی کی اطلاع مؤلف کو یا طبع کرنے والے ادارے کو فرمادیں تاکہ آئندہ اصلاح ہوسکے ۔

مَیں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ جو کچھ لکھا جائے پوری تحقیق سے بحوالہ لکھا جائے الفاظ قرآن کے معانی اور اس کی تحقیق میں میرا زیادہ تر سرمایہ تفسیر قرطبی، معارف القرآن، امام راغب اصفہانی کی مفردات اور دیگر لغت اور تفسیر کی وہ تمام مستند اور متداول کتابیں ہیں جن کے حوالے جا بجا کتاب کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں اور وہ علمی سرمایہ جس سے استفادہ کیا گیا اس کی ایک فہرست بھی شاملِ کتاب ہے ۔

اظہارِ تشکّر :

میں نے جو مسودہ لکھا تھا اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس میں نیلی سیاہی استعمال کی

اب جب کاتبوں کو دینے کے لئے فوٹو اسٹیٹ کا مرحلہ آیا تو تجربے سے معلوم ہوا کہ اس کی تو فوٹو اسٹیٹ ہی نہیں آتی، اس سے ایک بار پھر دل شکستگی ہوئی کیونکہ دو ہزار صفحات پر مشتمل بیاض کو دوبارہ نقل کرنا بڑا مشکل مسئلہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام بھی فرما دیا' میری اپنی بیٹی حفصہ رشید جو قرآنِ کریم کی حافظہ اور میٹرک کے بعد اس وقت شرح وقایہ اور کافیہ وغیرہ کتب کی طالبہ ہے خوشخط ہونے کے علاوہ سریع التحریر بھی ہے اُس نے از سرِ نو مسودہ کالی سیاہی سے تحریر کر دیا آخر کا کچھ حصّہ میرے مخلص دوست اور شاگرد سینر ٹیک سید ہنر شاہ صاحب نے نقل فرمایا، مَیں ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مخلصانہ طور پر میرا تعاون فرمایا،

سُورَۃُ الفَاتِحَۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَمْدٌ : اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

ساری تعریف اللہ کے لئے ہے (ماجدی) جو فعل علم اور اختیار اور قدرت اور ارادہ سے ہو اس کی واقعی خوبی بیان کرنے کو حمد کہتے ہیں۔ مدح میں نہ فعل کا اختیار ہونا ضروری ہے اور نہ اس خوبی کا واقعی ہونا لازمی ہے۔ اس وجہ سے مدح کسی وقت ممنوع بھی ہو جاتی ہے جیساکہ حدیث میں ہے احثوا التراب علی وجوہ المداحین۔ مدح کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈال دو۔ مگر حمد سے کسی وقت بھی منع نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس میں واقعی خوبی کا اظہار ہوتا ہے

بعض علماء نے تعریف حمد سے قید اختیار کو حذف کر دیا ہے اس لئے کہ اس قید کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ شانہ کی صفاتِ ذاتیہ کی ثنا کو حمد کہنا دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ صفاتِ ذاتیہ جیسے علم وقدرت افعال خداوندی کیطرح اختیاری نہیں۔ اگرچہ یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ یہ صفات اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر ان کے ثمرات ضرور اختیاری ہیں یا ان کے موصوف فاعل مختار ہونا حمد کے لئے کافی ہے۔

حمد اور مدح میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حمد انہیں صفاتِ کمال پر ہوسکتی ہے جن کا صفاتِ کمال ہونا قطعی اور یقینی ہو اور ان میں کسی قسم کے نقص اور عیب کا شائبہ بھی نہ ہو۔ بخلاف مدح کے کہ اس میں نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صفت قطعاً اور یقیناً صفتِ کمال ہو ظناً بھی صفتِ کمال ہونا مدح کے لئے کافی ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ صفت شائبہ نقص سے پاک ہو بلکہ اگر اس میں کچھ نقص بھی ہو تب بھی مدح کے لئے کافی ہے۔ نیز حمد میں یہ ضروری ہے کہ محاسن وکمالات کا ذکر محبت اور اجلال کے ساتھ ہو اور مدح میں یہ ضروری نہیں مطلقاً محاسن وکمالات کے ذکر کرنے کو خواہ وہ محبت اور اجلال سے ہو یا نہ مدح کہتے ہیں۔

(معارف القرآن۔ مولانا کاندھلوی)

علامہ قرطبیؒ حمد کی تعریف یوں بیان فرماتے ہیں الحمد فی کلام العرب معناہ الثناء الکامل (قرطبی) اور اس کی جمع قلت اَحْمُدٌ آتی ہے

حمد اور مدح کے ساتھ ملتا جلتا لفظ شکر ہے

ابو جعفر الطبری اور ابو العباس المبرد کا قول یہ ہے
ان الحمد والشکر بمعنی واحدٍ سواءٌ
(قرطبی) کہ حمد اور شکر دونوں کے معنی ایک ہیں۔
لیکن بعض علماء نے ان میں فرق بیان کیا ہے کہ شکر
عام اور حمد خاص ہے چونکہ شکر زبان، دل اور
جوارح سے کیا جاسکتا ہے جبکہ حمد کا تعلق صرف زبان
سے ہے۔ علامہ قرطبی نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے
کہ حمد شکر سے عام ہے اس لئے کہ حمد میں شکر کے
معنی پائے جاتے ہیں۔ اور شکر میں حمد کے معنی نہیں پائے
جاتے ہیں اس میں مدح کے معنی بھی پائے جاتے ہیں
نیز یہ کہ حمد کو شکر کے مقام پر رکھا جاسکتا ہے۔
(پوری تفصیل قرطبی جلد اول صفحہ ۱۳۳، صفحہ ۱۳۴ میں
ملاحظہ ہو)

اَللّٰہ : ۔ اللہ ذاتِ باری کا اسم مبارک ہے،
اور لفظ اِلٰہ پر الف لام تعریف کا داخل کرکے
بنا ہے۔ اس کا اطلاق سوائے خالقِ کائنات کے
اور کسی پر ہو ہی نہیں سکتا۔ صاحب تاج العروس لکھتے
ہیں عَلَمٌ لِلذَّاتِ وَاجب الوجود المستجمع لجمیع
صفات الکمال غیر مشتق (تاج)
یعنی یہ ذات واجب الوجود کا علم ہے جو تمام صفات
کاملہ کا جامع ہے اور غیر مشتق ہے۔
حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں لَم یُسَمَّ بِہٖ
غَیْرُہٗ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی ولھذا لا یُعرف فی کلام
العرب له اشتقاق من فَعَلَ یَفْعَلُ (ابن کثیر)
لفظِ اللہ کی تفصیلی بحث کے لئے مولانا ابو الکلام
آزاد کا ترجمان القرآن اور سید سلیمان ندویؒ کی کتاب
ارض القرآن کا مطالعہ فرمائیں۔

رَبّ ۔ سارے جہان کا مُربّی (ماجدی)
لفظ ربّ عربی زبان میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا
ہے۔ مالک، آقا، مُربّی، پرورش کرنے والا،
خبر گیری اور نگرانی کرنے والا، فرمانروا، حاکم
مدبّر اور منتظم۔ اللہ تعالیٰ اِن تمام معنوں میں کائنات
کا رب ہے۔ اصل میں یہ رَبَّ یَرُبُّ کا مصدر ہے
مبالغہ کے لئے عدل کی طرح صفت کے طور پر استعمال
ہوتا ہے۔

العٰلَمِیْن ۔ عالمین۔ سارے جہاں، کل
کائنات یہ عَالَم بفتح اللام کی جمع ہے۔ عالم اس چیز
کو کہتے ہیں جس سے خالق کا علم حاصل ہو۔ عالم علامت
سے مشتق ہے۔ عالم کو عالم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ
علامت ہے اسماء الٰہی اور صفات خداوندی کے لئے
عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اِس کے کسی اسم کا مظہر
و آئینہ ہوتا ہے۔ مومن و کافر اس کی شان اور انعام
اور انتقام کے مظہر ہیں۔ صاحب عزت اور صاحبِ
ذلت اس کی شان تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ
مَنْ تَشَآءُ کے آئینہ میں ہیں۔ اور عالم غیب اور
عالمِ شہادت اس کے نام نامی ھُوَ الظَّاھِرُ

وَالْبَاطِنُ کے ترجمان ہیں۔

لفظ عالم خود اسم جمع ہے۔ اس کی کوئی واحد نہیں۔ یہ خلقت اور موجودات کے مترادف ہے۔ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں کہ اَلْعَالَمُ الْخَلْقُ کُلُّہٗ (لسان)

عالمین، جمع کا صیغہ لاکر قرآن پاک نے گویا یہ بتا دیا کہ ہر صنف موجودات کا ایک مستقل نظامِ تربیت ہے اور سب کا آخری سرا قادرِ مطلق واحد و یکتا کے ہاتھوں میں ہے۔ کوئی صنف موجودات اس کے ہمہ گیر نظامِ ربوبیت و تربیت سے آزاد و مستثنیٰ نہیں۔

العالمون جمع عالم وھو کل موجود سوی اللّٰہ تعالیٰ (قرطبی عن قتادۃ)

اَلرَّحْمٰن ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اسم رحمان غضبان اور سکران کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے اور اسم رحیم۔ علیم اور کریم کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ عربی زبان کے استعمال کے لحاظ سے فَعْلَانْ کا وزن جوش و خروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے۔ اور فَعِیْلٌ کا وزن دوام و استمرار اور پائداری و استواری پر دلالت کرتا ہے۔

یہ دونوں اسم خدا کی دو الگ صفات کو بیان کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔ رحمٰن ظاہر کر رہا ہے کہ خدا کی رحمت اپنی مخلوق پر کثرت سے اور جوش اور مہربانی سے برستی ہے اور رحیم اس کے دوام اور استمرار کو بتاتا ہے کہ رب العالمین کی رحمت اپنی مخلوق سے کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ رحمان اور رحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور رحمت سے مشتق ہیں اختلاف اس میں ہے کہ مبالغہ کس میں زیادہ ہے ان دونوں الفاظ کے فرق کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مولانا کاندھلوی، ابن کثیر اور علامہ آلوسی بغدادی نے۔ اصحابِ علم ان کا مطالعہ فرمائیں۔

مٰلِكِ ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ روزِ جزا کا مالک۔ (ترجمہ معارف۔ مولانا کاندھلوی) لفظ مالک، مِلک سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو۔ (معارف بحوالہ قاموس)

اس لفظ میں دو قرأتیں ہیں اور دونوں مشہور اور متواتر ہیں۔ ایک قرأت تو مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جس کے معنی ہیں روزِ جزا کا بادشاہ۔ اور دوسری قرأت ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یعنی روزِ جزا کا مالک اس کی مالکیت اور ملکیت کو روزِ جزا کے ساتھ اس لئے مخصوص کیا کہ اس کے جلال و کمال کا بلاواسطہ ظہور علیٰ وجہ التمام والکمال عالم کے ہر ہر فرد کے لئے ایک ہی آن میں صرف اسی روز ہوگا۔ اگرچہ دنیا میں بھی حقیقی مالک وہی ہے جیسا کہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ والملك في الحقيقة هو الله عز وجل (ابن کثیر) مگر دنیا میں اس کی اپنی مشیت اور حکمت سے کچھ مجازی بادشاہ اور مجازی مالکیت نظر آتی ہے

قیامت کے دن یہ سارے مجاز ختم ہو جائیں گے
علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں قراتوں
میں سے کون سی افضل ہے۔ بعض علماء نے مَلِكِ
بمعنی بادشاہ کو راجح قرار دیا ہے اور اس کی چند وجوہ
بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ملکیت یعنی بادشاہت میں
جو عظمت اور شان ہے وہ مالکیت میں نہیں ہے۔
کیونکہ مالک تو ہر ایک ہوتا ہے جبکہ مُلک ایک ہوتا
ہے۔ دوم یہ کہ مالک کا حکم صرف اپنے مملوک پر
چلتا ہے جبکہ مُلک کا حکم پورے مُلک اور تمام
رعایا پر چلتا ہے۔ تیسرے یہ کہ قرآن کریم میں آخری
سورت میں مَلِكِ النَّاسِ فرمایا گیا ہے۔ اس لئے
مناسب یہ ہے کہ شروع سورت میں بھی مَلِكِ
يَوْمِ الدِّيْنِ ہو۔ اور جو حضرات مٰلِكِ يَوْمِ
الدِّيْنِ پڑھتے ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ ملکیت
یعنی بادشاہت انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے
اور مالکیت انسان اور غیر انسان سب کو شامل ہے
۱ مالک اپنے مملوک کو فروخت کر سکتا ہے
اور بادشاہ رعایا کو فروخت نہیں کر سکتا۔
۲ رعیت اپنے بادشاہ کے ملک سے بھاگ کر
نکل سکتی ہے اور مملوک بھاگ کر مالک کی ملکیت سے
نہیں نکل سکتا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ابن شہاب کے
حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور
حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، امیر معاویہؓ اور یزید بن
معاویہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہی پڑھا کرتے تھے۔
اور شہاب کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مَلِكِ يَوْمِ
الدِّيْنِ مروان نے پڑھا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے
ہیں کہ مروان نے جو قرأت کی ہے تو مروان کے پاس
اس کے صحیح ہونے کا علم تھا جس کی اطلاع ابن شہاب
کو نہ ہو سکی۔ علامہ زمخشری نے مَلِكِ کی قرأت
کو راجح قرار دیا ہے۔ کیونکہ اہل حرمین کی قرأت یہی ہے

الدِّيْن ۔ الدِّيْن قرآن پاک میں چند معانی
کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ۱ مذہب اور شریعت
کے لئے جیسا کہ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ (آل عمران آیت)
کیا خدا کے اتارے ہوئے مذہب کے سوا کسی اور مذہب
کے طالب ہیں۔

۲ قانون ملکی کے لئے مثلاً مَا كَانَ لِيَاْخُذَ
اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (یوسف) اس کو
اپنے بادشاہ کے قانون کی راہ سے یہ حق حاصل
نہ تھا کہ اپنے بھائی کو روک سکے۔

۳ اطاعت کے معنی کیلئے، مثلاً وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (نحل)
اس کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے
اور اس کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے۔

۴ جزاء کے معنی کے لئے جیسا کہ ارشاد ہے کہ
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ (ذاریات)
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں دین بمعنی جزاء ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں الدّین - الجزاء علی الاعمال
والحساب بھا (قرطبی)
اس لفظ کی مزید وضاحت آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ
دِیْنَکُمْ (مائدہ) کے تحت ملے گی

نَعْبُدُ - اِیَّاکَ نَعْبُدُ - تیری ہی ہم
بندگی کرتے ہیں - (معارف)
نَعْبُدُ عبادۃ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کی
انتہائی تعظیم و محبت کی وجہ سے اس کے سامنے
اپنی انتہائی عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار کرنا
(معارف)
اَلْعِبَادَۃُ : الطَّاعَۃُ وَالتَّذَلُّلُ (قرطبی)
طریق معبّد : وہ راستہ جس پر خوب چلا جائے
گویا وہ روندے جانے کی وجہ سے ذلیل ہے -
عبادت کے اصل معنی عربی لغت میں انتہائی خضوع اور
انتہائی عاجزی و فروتنی کے اظہار کے ہیں - لیکن قرآن
پاک میں یہ لفظ اس خضوع و خشوع کی تعبیر کے لئے خاص
ہوگیا ہے جو بندہ اپنے خالق و مالک کے لئے ظاہر
کرتا ہے - پھر اطاعت کا مفہوم بھی اس کے لوازم میں
داخل ہوگیا ہے - کیونکہ یہ بات بالبداہتہ غلط معلوم
ہوتی ہے کہ انسان جس ذات کو اپنے خضوع و خشوع
کا واحد مستحق قرار دے زندگی کے معاملات میں
اس کی اطاعت کو لازم نہ جانے - پس معلوم ہوا
کہ عبادت کے مفہوم میں دو چیزیں داخل ہیں - ایک
غایتِ تذلیل یعنی انتہائی عاجزی اور ذلت ،
دوم غایتِ تعظیم لیکن اس اعتقاد اور شعور کے
ساتھ کہ معبود کو غائبانہ تصرف اور قدرت حاصل
ہے جس سے وہ نفع اور نقصان پر قادر ہے -
(جواہر القرآن)
علامہ ابن قیم لکھتے ہیں : العبادۃ عبارۃ
عن الاعتقاد والشعور بانّ للمعبود سلطۃ
غیبیۃ یقتدر بھا علی النفع والضرر -
یعنی عبادت اس اعتقاد اور شعور کا نام ہے کہ معبود
کو ایک غیبی تسلّط حاصل ہے ، جس کی وجہ سے وہ
نفع اور نقصان پر قادر ہے (مدارج السالکین)
اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا معنی ہوا ہم تیری اطاعت پوری
فرمانبرداری کے ساتھ کرتے ہیں -

نَسْتَعِیْنُ - وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ -
صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں (معارف)
یہ استعانت سے مشتق ہے - جس کے معنی ہیں کسی
سے مدد مانگنا (معارف) یہ باب استفعال سے
جمع متکلم مضارع معروف کا صیغہ ہے ، جس کے معنی
طلبِ مدد کے ہیں -

استعانت کی قسمیں : استعانت یعنی کسی سے
مدد طلب کرنے کی دو قسمیں ہیں : ۱ ایک استعانت
ماتحت الاسباب یعنی ظاہری اسباب کے تحت کسی سے
مدد مانگی جائے - یہ وہ امداد ہے جو تمام انسانوں کو

روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے حاصل ہوتی ہو اور یہ ہی امداد و استمداد انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اس استمداد سے کسی کو مفر نہیں۔ ماتحت الاسباب امداد انبیاء علیہم السلام نے بھی لی ہے۔ جناب مسیح علیہ السلام کا ارشاد مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اور حضرت ذوالقرنین کا قول اَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ اس استمداد ماتحت الاسباب کے قبیل سے ہیں۔

۲۔ استعانت کی دوسری قسم مافوق الاسباب ہے۔ یعنی اسباب مادیہ کے بغیر کسی کو دور و نزدیک سے غائبانہ پکارا جائے اور اس سے استمداد کی جائے یہ پکار اور استعانت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یہی استمداد اور استعانت ہے جس کا اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں حصر ہے۔ اور غیر اللہ سے استمداد مافوق الاسباب شرک ہے۔

اِھْدِ - اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

چلا ہم کو سیدھی راہ (موضح القرآن)

اِھْدِ - یہ ھدٰی یَھْدِیْ ھِدَایَۃً سے امر کا صیغہ ہے۔ لغت کے اعتبار سے لفظ ھُدًی اور ھدایۃً میں کوئی فرق نہیں۔ مگر قرآنی استعمالات میں ھُدی کا لفظ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ھدایت فرمانے کے لئے مخصوص کیا ہے۔ یعنی ہدایت کی جو نسبت اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے ہے اس کے لئے لفظ ھدی مخصوص ہے۔ اور اھتداء (افتعال) کا لفظ ہے اور اس ہدایت کے ساتھ مخصوص ہے جس کا قصد انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ خواہ اُمورِ دنیوی میں ہو یا اُمورِ اخروی ہیں۔ جیسے کہ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً وَّلَا یَھْتَدُوْنَ سَبِیْلًا۔ اس آیت میں اھتداء کا لفظ اُمورِ دنیوی میں استعمال ہوا ہے کہ یہ بے آسرا لوگ نہ کوئی تدبیر کرسکتے ہیں نہ کہیں کا راستہ جانتے ہیں۔

اصولِ نحو کے اعتبار سے لفظ ھدایۃ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ مفعولِ اوّل کی طرف بلا واسطہ حرفِ جر اور مفعولِ ثانی کی طرف کبھی بواسطہ حرفِ جر مثلاً یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ اور کبھی بلا واسطہ حرفِ جر جیسے وَھَدَیْنٰھُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ استعمال کی اِن دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ پہلی صورت میں ہدایت کے معنی اِرائۃ الطریق۔ راہ نمودن یعنی راہ دکھانے کے ہوں گے۔ دوسری صورت میں ایصال الی المطلوب بمنزل رسانیدن یعنی منزلِ مقصود تک پہنچانے کے ہوں گے۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں نَا ضمیر متکلم مفعولِ اول ہے اور الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ بترکیب توصیفی مفعولِ ثانی ہے۔ جو بلا واسطہ حرفِ جر استعمال ہوا ہے۔ اس لئے ہدایت کے معنی یہاں ایصال الی المطلوب یعنی طالبِ ہدایت کو

منزلِ مقصود تک پہنچانے کے ہونگے۔ علامہ قرطبی نے لکھا۔ وقیل یعنی بعض کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ ھدایۃ کے اصل معنی امالۃ یعنی مائل ہونے کے ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے اِنَّا ھُدْنَا اِلَیْكَ ای مِلْنَا الیك یعنی ہم تیری طرف جھکتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ یتھادی بین اثنین۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مرض الوفات میں دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر لڑکھڑاتے ہوئے مسجد کی طرف نکلے اور کمزوری کے باعث کبھی ایک طرف مائل ہوتے اور کبھی دوسری طرف۔ اسی سے ھَدِیَہ ہے کہ ایک کی ملک سے نکل کر دوسرے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور اسی سے ھدی اُس حیوان کو کہا جاتا ہے جو حرم شریف کی طرف لے جایا جاتا ہے اس مفہوم کے اعتبار سے آیت کے معنی ہوں گے مِلْ بِقُلُوبِنَا الی الحق یعنی ہمارے دلوں کو حق کی طرف موڑ دے۔ (قرطبی)

الصِّرَاط ۔ صراط۔ راہ، راستہ۔

سیدھے اور آسان راستے کو صراط کہتے ہیں۔ صراط کی اصل سراط ہے۔ سین کو صاد سے بدلا گیا ہے تاکہ اطباق میں طاء کے مطابق ہو جائے۔ یہ سَرَطْتُ الطَّعَامَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں طعام کو نگل جانا۔ گویا صراط میں اس کا تصور ہے کہ راہ رو، راہ کو نگل جاتا ہے۔ یا راستہ راہ کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ عربی کی ایک مثل ہے قَتَلَ اَرْضًا عَالِمُھَا وَ قَتَلَتْ اَرْضًا جَاھِلَھَا: زمین کے واقف نے زمین کو ختم کیا اور اس سے ناواقف کو زمین نے مار ڈالا۔ اس کی جمع صُرُطٌ آتی ہے۔ جیسے کِتَاب کی جمع کُتُبٌ آتی ہے۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اصل الصراط فی کلام العرب: الطریق۔ یعنی کلام عرب میں صراط کے اصل معنی راستہ ہی کے ہیں۔ عامر بن الطفیل کہتا ہے

مشحنا ارضھم بالخیل حتی
ترکنا ھم اذل من الطریق

ہم نے دشمن کی زمین کو جنگی گھوڑوں سے پُر کر دیا یہاں تک کہ ہم نے اُن کو راستہ سے زیادہ ذلیل کر کے چھوڑا۔

واصل صادہ سینٌ قُلبت مع الطاء صادًا لقُرب مخارجھا۔ (الجوھری)

الصراط والسراط والزراط: الطریق (لسان العرب)

الْمُسْتَقِیْم ۔ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْم

سیدھی راہ۔ استقامت کے معنی توسّط اور اعتدال کے ہیں جو ٹھیک افراط و تفریط کے درمیان میں ہے (معارف القرآن۔ مولانا کاندھلوی)

علامہ راغب فرماتے ہیں کہ استقامت کے معنی خطِ مستقیم کی طرح راستہ کے سیدھا ہونے کے ہیں۔ اور اس سے بطور تشبیہ کے راہ حق کو صراط مستقیم کہتے ہیں اور کسی آدمی کی استقامت کے معنی سیدھی راہ پر قائم رہنے کے ہوتے ہیں۔ (اس کا اصل مادہ قَوَمَ اجوف واوی ہے) محمد بن الحنفیہ کا قول ہے کہ صراط مستقیم سے مراد اللہ کا دین ہے۔ عاصم بن الاحول نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے کہ صراط مستقیم سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دو اصحاب ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں۔ عالیہ کے اس قول کی تصدیق حسن بصری نے بھی کی ہے (قرطبی)

اَنْعَمْتَ - اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ تو نے ان پر انعام کیا تو نے فضل کیا۔ تو نے نوازش کی۔ تو نے احسان کیا۔ اَنْعَمْتَ اِنْعَامٌ سے ہے جس کے معنی فضل کرنے نوازش کرنے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ انعم کا استعمال باب افعال سے اسی وقت ہوگا جب منعم علیہ ذوی العقول میں سے ہو۔ اَنْعَمَ فُلَانٌ عَلٰی فَرَسِہٖ کہنا درست نہیں (راغب)

غَيْرِ - غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے (ترجمہ عثمانی)

قرآن مجید میں لفظ غیر کا استعمال چار طریقوں پر آیا ہے۔ ۱ صرف نفی کے لئے۔ جیسے بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ یعنی اللہ کی طرف ہدایت نہ ہونے کی صورت میں

۲ لفظ اِلَّا کی طرح صرف استثناء کے لئے جیسے مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ مجھے تمہارے لئے کسی الٰہ کا علم نہیں۔ ہاں میں الٰہ ہوں۔ (القصص) اسی طرح سورۂ اعراف میں ہے مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ سوا اس کے تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔

۳ اصل چیز کو باقی رکھتے ہوئے صرف ظاہری شکل و صورت کی نفی کرنے کے لئے جیسے كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا (النساء) جب دوزخیوں کے بدن کی کھال پک جائے گی تو اللہ تعالےٰ اُن کی کھال کی صورت از سرِ نو بدل دے گا یعنی کھال وہی ہوگی صورت نئی پیدا ہو جائے گی۔

۴ صورت اور اصل شے سب کی نفی کیلئے یعنی کسی شے کی مکمل نفی کرکے دوسری چیز کو اس کی جگہ قائم کرنا جیسا کہ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ (الانعام) تم اللہ پر باطل بہتان بندی کرتے تھے۔ اور سورہ توبہ

ہیں ہے وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (لغات القرآن)

لفظ غیر کی مزید وضاحت کے لئے کتبِ نحو اور امام راغب کے مفردات کا مطالعہ کیا جائے

الْمَغْضُوْبِ ۔ مغضوب ۔ یہ غضبٌ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے ۔ غَضَبٌ کے معنی ہیں انتقام کے لئے دل میں خون کا جوش مارنا ۔ اور مغضوب علیہم سے مراد عام مفسرین کے نزدیک یہود ہیں ۔ جن پر خدا کا قہر نازل ہوا ۔ وَغَضِبَ عَلَيْهِ اور اس پر خدا ناراض ہوا ۔ الْمُغْضُوْبُ ۔ بہت زیادہ غصے ہونے والا (راغب)

الضَّآلِّيْنَ ۔ ۔۔ ضَآلِّين ۔ یہ ضلالٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر ہے ۔ اس کی واحد ضَالٌّ آتی ہے بمعنی حیران ، بے خبر ، اس راستہ سے ہٹا ہوا جو انسان کو اصل منزل مقصود تک پہنچانے والا ہو ۔ یہ ھدایت کے مقابل استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن پاک میں ہے فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۔

الضلال فی کلام العرب ھو الذھاب عن سُنَنِ القصْدِ وَطَرِيْقِ الحقّ (قرطبی) ضَلَّ اللَّبَنُ فِي الماءِ کے معنی ہیں دودھ پانی میں گم ہوگیا ۔

ضَآلِّين سے مراد اکثر اہل تفسیر نے نصاریٰ لئے ہیں جو راہِ راست سے بھٹک گئے ۔

سُوْرَةُ البَقَرَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۔ الٓمّٓ ۔ ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں ۔ یہ حروف تہجی کی طرح الگ الگ اور جدا جدا کرکے پڑھے جاتے ہیں ۔ خلفائے راشدین اور جمہور صحابہؓ کے نزدیک یہ حروف متشابہات میں سے ہیں ۔ ان کی اصل مراد خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ یہ خدا اور اس کے رسول کے مابین راز ہوتا ہے ۔ علامہ محمود آلوسی بغدادی کا قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا علم عطا کر دیا جاتا ہے جن کو خدا علوم نبوت کا وارث بناتا ہے ۔ (روح)

ذٰلِكَ ۔ ذٰلِكَ ۔ اسم اشارہ ہے جس کا استعمال بعید اور قریب دونوں کے لئے ہوتا ہے ۔ یہاں دونوں احتمال ہیں ۔ قریب کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور بعید کے لئے بھی ۔ اگر بعید کے لئے ہو تو قرآن کی بلند شان اور ارفع مقام کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوگا ۔ چونکہ قرآن عجیب و غریب حقائق و معارف اور اسرار و غوامض پر مشتمل ہونے کی وجہ سے انسانی فکر و نظر کی جولان گاہ سے بہت دور ہے ۔ اور ذٰلک اگر قریب کے لئے ہو تو پھر ممکن ہے ان ہی حروف مقطعات کی طرف اشارہ مقصود ہو مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن پاک بھی انہی حروف سے بنا ہوا ایک مرکب ہے ۔ اگر تم اس کو خدا کی کتاب ماننے سے انکار کرتے ہو تو اس جیسی کوئی کتاب تم بھی بنا کر پیش کرو ۔

الْكِتٰبُ ۔ الکِتٰب ۔ بمعنی زبانی یادداشتوں یا تحریروں کا مجموعہ نہیں بلکہ باضابطہ و مستند نوشتہ ، ایک صحیفہ مکتوب ۔ قرآن پاک اپنا پہلا تعارف اس انداز میں کراتا ہے جس سے یہ واضح ہو جائے کہ وہ ضبطِ تحریر میں آیا ہوا کتابی شکل میں ایک آسمانی صحیفہ ہے ۔

رَيْبَ : الرَّيْبُ : مصدر رَابَنِي ۔ اِذَا حَصَلَ فِيهِ الشَّكُّ (کشاف) الرَّيْب : اَنْ تَتَوَهَّمَ بِالشَّيْءِ اَمْرًا فَيَنْكَشِفُ عَمَّا تَتَوَهَّمُهُ (راغب)

ریب کے معنی شک اور اضطراب نفس بسلب طمانیت کے ہیں۔ لَارَیْبَ فِیْهِ کے معنی ہوئے اس میں کوئی شک نہیں اور حصول طمانیت اور سکونِ قلب کے تمام اسباب اس میں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

هُدًى - الهداية : دلالة بلطفٍ و منه الهديّة (مفردات)
ہدایت، محبت اور نرمی کے ساتھ راہنمائی کرنا۔

لِلْمُتَّقِيْنَ - متّقین۔ اتقاء سے بنا ہے اتقاء کا لفظ قرآن میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے
۱۔ جس چیز سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اس سے بچنا۔ مثلاً: فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ
۲۔ کسی آفت کے ظہور سے ڈرتے رہنا: وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا - اصطلاحِ شریعت میں ان چیزوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں جو آخرت کے لحاظ سے ضرر رساں ہوں۔

يُؤْمِنُوْنَ ایمان۔ امن سے ہے۔ اس کے اصل معنی امن دینے کے ہیں۔ اگر اس کا صلہ لام کے ساتھ آئے تو اس کے معنی تصدیق کرنے اور اگر ب کے ساتھ آئے تو یقین اور اعتماد کرنے کے ہوتے ہیں۔ ایمان کی حقیقی روح یقین، اعتماد اور اعتقاد ہے۔

الْغَيْبِ - لفظ غیب لغت میں ایسی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں اور نہ انسان کے حواسِ خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں۔ والغیب فی قوله یؤمنون بالغیب ما لا یقع تحت الحواس ولا تقتضیه بدایة العقل۔ (مفردات)

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ - اقامت کے معنی کسی چیز کو اس طرح سیدھا کرنا کہ اس میں کوئی خم نہ رہے۔ مطلب یہ کہ نماز میں ہر جہت اور ہر حیثیت کے تمام مستحبات، واجبات اور فرائض کو ملحوظ رکھ کر پڑھنا اقامت صلوٰۃ ہے۔

الصَّلٰوةَ - صلوٰۃ: مخصوص عبادت کا نام ہے جو مخصوص ارکان کے ساتھ مخصوص اوقات میں ادا کی جاتی ہے۔ اکثر اہل لغت کے نزدیک صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ اصحابِ تفسیر نے لکھا ہے کہ صلوٰۃ خدا کی جانب سے ہو تو رحمت کے معنی ہوں گے اور ملائکہ کی جانب سے ہو تو استغفار کے اور عباد کی طرف سے ہو تو دعا کے معنی ہوتے ہیں۔ اکثر اہل لغت کے نزدیک صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ و قال کثیر من اهل اللغة هی الدعاء والتبریك والتمجید۔ (مفردات)

رَزَقْنٰهُمْ - رَزَقْنَا رزق سے مشتق

مشتق ہے ۔ رزق ۔ کلام عرب میں بڑے وسیع
معنی رکھتا ہے ۔ اس کے اندر ہر قسم کی نعمتیں
آجاتی ہیں ۔ خواہ ظاہری ہوں جیسے مال، اولاد
صحت وغیرہ یا روحانی جیسے علم وحکمت اور فہم
سلیم ۔ یقال للعطاء الجاری تارۃ دنیویًا
کان ام اُخرویًا وللنصیب تارۃ (راغب)
الرزق فی کلام العرب ھو الحظ (کبیر)
اسم لکل ما یُنتفع به (معالم)

یُنْفِقُوْنَ ۔ انفاق کے معنی خرچ کرنا ۔ جمہور
مفسرین کی رائے یہ ہے کہ انفاق میں ہر قسم کا
خرچ داخل ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے ۔
خواہ وہ فرض زکوٰۃ ہو یا دوسرے صدقاتِ واجبہ
یا نفلی خیرات وغیرہ ۔ زکوٰۃ فرض کے لئے عمومًا
لفظ زکوٰۃ ہی استعمال ہوا ہے ۔ واختار
ابن جریر ان الآیة عامة فی الزکوٰۃ
والنفقات ۔ (ابن کثیر)

الْاٰخِرَۃ ۔ آخرۃ، بعد میں آنے والی ۔
مراد معاد و حشر ونشر اور عالم آخرت ہے ۔
یعنی وہ عالم جو موجودہ سلسلۂ زندگی کے
ختم ہونے کے بعد شروع ہوگا ۔ یعنی آخرت
نشأۃ ثانیہ کا نام ہے ۔ (مفردات)

یُوْقِنُوْنَ ۔ یہ ایقان سے بنا ہے ۔ اور
ایقان محکم علم کے معنی میں آتا ہے ۔ جس میں کوئی شک
وشبہ نہ ہو ۔ الایقان اتقان العلم بانتفاء
الشك والشبهة (کشاف)

الْمُفْلِحُوْنَ ۔ یہ فَلَاحٌ سے مشتق ہے ۔
یہ کلمہ دنیا اور آخرت کی تمام خوبیوں کا جامع ہے ۔
اہل لغت کا کہنا ہے کہ کلام عرب میں جامعیت
خیر کے لئے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ۔
لیس فی کلام العرب کلمة اجمع من لفظة
الفلاح لخیری الدنیا والآخرة ۔
(ماجدی بحوالہ تاج)
دیکھئے سورہ مؤمنون لفظ اَفْلَحَ

کَفَرُوْا ۔ کَفَرُوْا کفر سے بنا ہے ۔
کفر کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں ۔ ناشکری کو
بھی کفر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں محسن کے
احسان کا اخفاء ہوتا ہے ۔ الکفر فی اللغة
ستر الشئ، و وصف اللیل بالکافر
لستره الاشخاص (مفردات) اصطلاحِ شریعت
میں جن چیزوں پر ایمان فرض ہے ان میں سے کسی
ایک چیز کا بھی انکار کرنا کفر ہے

انذار ۔ اِنذار، ایسی خبر دینا جس
میں خوف ہو ۔ انذار ایسے ڈرانے کو کہتے ہیں جو
شفقت اور رحمت کی بنا پر ہو (معارف)

خَتَمَ ۔ ختم کے اصلی معنی عربی زبان
میں کسی چیز کو اس طرح بند کرنے کے ہیں کہ نہ کوئی

چیز اندر داخل ہو سکے اور نہ کوئی چیز اس سے نکل سکے خَتَمَ : اس نے ختم کر دیا۔ اس نے مہر لگا دی۔

قُلُوب - یہ قلب کی جمع ہے۔ اس سے مراد احساس، عقل اور ادراک ہے۔

سَمْع اس سے مراد قوتِ سماع ہے۔ سَمْع کی جمع اسماع آتی ہے۔

اَبْصَار - بَصَرٌ کی جمع ہے۔ آنکھ کو بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اور قوت بصر یعنی بینائی کو بھی بصر کہا جاتا ہے۔ قوتِ مُدرکہ بالقلب کو بصیرۃ کہتے ہیں جس کی جمع بَصَائِر ہے۔

غِشَاوَةٌ - پردہ۔ جس سے کسی چیز کو چھپایا جائے۔ اَلْغِشَاوَةُ مَا يُغَطّٰى بِهِ الشَّيْءُ (مفردات) جمع اغشیۃ۔

يُخٰدِعُوْنَ مخادعت کے معنی ہیں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کی کوشش کرنا۔ قرآن میں ہے وَهُوَ خَادِعُهُمْ یعنی وہ ان کو دھوکہ کی جزا دے گا۔ خدا کی طرف جب خدع کی نسبت ہو تو اس کے معنی دھوکہ دینے والوں کو دھوکہ کی سزا دینا ہوتا ہے۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ - شعور عربی میں علم حسّی کو کہتے ہیں اور اسی کا نام اردو میں احساس ہے (ماجدی) اور مشاعر انسان کے آلاتِ حواس کو کہتے ہیں (راغب۔ کشاف)

یہ شعار سے بنا ہے۔ یہ لفظ کسی محسوس چیز کے ادراک کے لئے آیا کرتا ہے۔ یہاں اس لفظ کا استعمال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اگرچہ خدا کو دھوکہ دینے کی کوشش میں خود دھوکہ کھا رہے ہیں۔ دھوکہ ایک محسوس ہونے والی چیز ہے۔ مگر یہ بلید الفہم ہیں کہ ان کو بالکل احساس تک نہیں ہے۔

والشعور علم الشئ علم حسّ من الشعار والمعنى ان لحوق ضرر ذلك بهم كالمحسوس وَهُمْ لتمادى غفلتهم كالذى لا حس لهم۔ (کشاف)

وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ونحو ذلك معناه لا تدركونه بالحواس (مفردات)

مَرَضٌ - مرض نام ہے جسم انسانی کے اعتدال سے نکل جانے کا۔ المرض الخروج عن الاعتدال الخاص بالانسان۔ (مفردات)

اب یہ مرض انسان کو دو طرح سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک حقیقی یعنی جسمی جس کا تعلق انسان کے ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے جس کا قرآن پاک نے وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ میں ذکر کیا ہے۔ دوسری بڑی بیماری وہ ہے جس کا تعلق انسان کے دل اور اس کے اخلاق و عادات سے ہے۔ جیسے کہ جہل،

بزدلی، عناد، بخل، حسد، کینہ وغیرہ۔

زَادَ - زَادَ یَزُوْدُ کے معنی توشہ لینے کے ہیں۔یعنی سفر خرچ لینا۔یہ اجوف وادی ہے۔ اصل مادہ زودٌ ہے۔سفر کا خرچ لینا۔ان کے دلوں میں حسد اور بغض کی بیماری تھی تو خدا تعالیٰ نے ان کو سزا یہ دی کہ ان کی زندگی کا سامانِ حیات ہی حسد کو بنا دیا۔جب کوئی وحی نازل ہوتی، اِن کا مرض بڑھتا۔

یَکْذِبُوْنَ - یَکْذِبُوْنَ کذب سے بنا ہے،جس کے معنی ہیں غلط گوئی اور خلاف واقع خبر دینا۔

الکذب الاخبار عن الشئ علی خلاف ما هو به (کشاف)

لَاتُفْسِدُوْا - یہ افساد سے بنا ہے جس کی اصل فَسَادٌ ہے۔ اِفساد فی الارض قرآن پاک کی اصطلاح ہے۔جس کا مفہوم اس نظام کو بگاڑنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام و قوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے۔

الفَسَاد - الفساد خروج الشئ عن حال استقامته۔ (کشاف)

مُصْلِحُوْن - یہ اصلاح سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی شے کو درست کرنا۔ دو محارب پارٹیوں میں صلح کرانا۔یعنی ہم تو محمدی اور غیر محمدی کی فرق کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

السُّفَھَآءُ - یہ سِفْهٌ سے بنا ہے۔جس کے معنی جہالت، کمی عقل اور حماقت وغیرہ کے ہیں۔ سَفِیْهٌ صفت مشبہ ہے۔ سُفَهَاء اس کی جمع ہے۔ السَّفْه : سخافة العقل وخفة الحلم (کشاف) اُستعمل فی خفة النفس لنقصان العقل (مفردات)

السَّفِیْه : الجاهل ،ضعیف الرأی القلیل المعرفة للمنافع والمضار۔ (ماجدی)

لَایَعْلَمُوْنَ - یَعْلَمُوْنَ علم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی شئ کی حقیقت کو پا جانا۔

العلم : ادراك الشئ بحقیقته (راغب)

علم کی دو اقسام ہیں۔ایک علم نظری اور دوسرا علم عملی۔ لَا یَعْلَمُوْنَ فرما کر ظاہر کر دیا گیا کہ منافق پکے جاہل ہیں

لَقُوْا - لَقِیَ یَلْقٰی ۔ مِلنا۔ ملاقات کرنا۔

اللقاء : الملاقات۔ (راغب)

خَلَوْا - اَلْخَلَآءُ : وہ مکان جس میں کوئی روک نہ ہو۔ الخلاء : المکان الذی لاساتر فیه (راغب) یہ خلی یخلو سے مشتق ہے خلا کا صلہ جب اِلٰی آتا ہے تو اس کے معنی تنہائی کے ہوتے ہیں۔یعنی کسی کو تنہائی میں ملنا۔

شَیٰطِیْنَ - لفظ شیطان شاط یشیط سے فُعْلَان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔اس کے

معنی ہیں جلد باز، تندخو، مشتعل مزاج اور شریر و سرکش ۔ بعض نے شیطان کو شَطَنَ (ک) سے مشتق قرار دیا ہے جس کے معنی بَعُدَ یعنی دور ہونے کے ہیں ۔ یہاں خدا کی رحمت سے دوری مراد ہے ۔ اس صورت پر لفظ شیطان میں نون اصلیہ ہوگا اور اگر شاط سے مانا جائے تو نون زائدہ ہوگا ۔ امام محمد بن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں ہر سرکش شیطان ہے، چاہے اس کا تعلق جنوں سے یا انسانوں یا سے یا حیوانوں سے ہو ۔

مُسْتَهْزِءُوْنَ یہ استہزاء سے بنا ہے جس کے معنی ہنسی اور تمسخر کرنا ہیں ۔ دوسرے کو اپنے سے کمتر سمجھ کر اس کا مزاح کرنا ۔

والاستهزاء : السخرية والاستخفاف

باب استفعال کے مصدر اِسْتِهْزَاءٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر سالم ہے ۔ اصل مادہ هَزْءٌ ہے ۔ مذاق کرنا ۔ مذاق بنا کر انکار کرنا ۔ هُزُءٌ ۔ مذاق

يَمُدُّهُمْ ۔ مَدَّ يَمُدُّ ۔ ڈھیل دینا رسی دراز کرنا ۔ اُن کو ڈھیل دیتا ہے ۔ اُن کو مہلت دے رہا ہے مَدٌّ سے فعل مضارع ہے اور هُمْ ضمیر منصوب متصل مفعول بہ کی ہے ۔ اور اگر هُمْ کو منصوب بنزع حرف جر قرار دیا جائے تو ترجمہ ہوگا ان کو بڑھاتا ہے ۔ مَدّ کے اصل معنی کسی چیز کو لمبا اور دراز کرنے کے ہیں ۔ اسی سے وقتِ طویل کو مدت کہا جاتا ہے ۔

طغیان ۔ طَغیٰ یَطْغیٰ سے مشتق ہے ۔ گناہوں میں انتہا کر دینا ۔ و ذلك تجاوز الحد في العصيان (مفردات)

والطغيان : الغلو في الكفر ومجاوزة الحد في العتو (کشاف)

يَعْمَهُوْنَ ۔ یہ عَمَهٌ سے بنا ہے ۔ عَمَه اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کو راستہ سجھائی نہ دے اور اِدھر اُدھر اندھوں کی طرح ٹٹولتا اور پاؤں مارتا پھرے ۔

العمه : هو التردد في الضلال والتحير في منازعة (ماجدی)

العمه : هو التردد في الامر من التحير (مفردات) يقال : عَمَهَ فَهُوَ عَمِهٌ وَعَامِهٌ وجمعه عُمَّهٌ

عَمیٰ اور عَمِهَ دونوں قریب المعنی ہیں ۔ فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ عَمیٰ بصر اور رائے دونوں کو شامل ہے جیسا کہ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی اور عمہ کا تعلق خاص رائے سے ہے ۔ والعمه مثل العمى الا ان العمى عام في البصر والرأى والعمه

فی الرای خاصۃ وھوالتحیر والتردد لا یدری این یتوجّہ (کشاف)

العمی فی العین والعمہ فی القلب (قرطبی)

اشْتَرَوُا - یہ افتعال ہے اصل مادہ شَرٰی ہے، مصدر شراء آتا ہے۔ شَرٰی یَشْرِی شَرَاءً وَشِرًی خریدنا بیچنا۔ اشتراء کے معنی ہیں کسی چیز کا معاوضہ میں لینا اہل عرب ہر استبدال کے موقع پر اشتراء بولتے ہیں۔ یہاں اس کے معنی ایمان کی بجائے کفر اختیار کرنا ہے۔ اختاروا الکفر عَلَی الایمان۔ (ابن عباس)

الضَّلٰلَۃ - ضَلَّ یَضِلُّ (س۔ض) گمراہ ہونا۔ دین سے پھرنا۔ حق راستہ سے ہٹنا۔

الضَّلَالَۃ: الجورعَن القصد وَفقد الاھتدَاء (کشاف)

رَبِحَتْ - رِبحٌ: خرید وفروخت میں راس المال پر حاصل شدہ نفع کو رِبح کہا گیا ہے۔ الرِّبحُ: الزیادۃ الحاصلۃ فی المبایعۃ (مفردات) الرِّبح: رأس المال (کشاف)

مَا رَبِحَتْ تِجَارَتُھُمْ۔ ان کی تجارت نے کچھ نفع نہ دیا۔

تجارۃ - تجارۃ نفع حاصل کرنے کی غرض سے راس المال کو صرف کرنا۔

التجارۃ: التصرف فی رأس المال طلبًا للربح (مفردات)

التجارۃ عبارۃ عن شراء شئ لیبیع بالربح (تعریفات)

اسْتَوْقَدَ وَقَدَ یَقِدُ کے معنی ہیں آگ بھڑکانا۔ اسْتَوْقَدَ اسی سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں آگ روشن کرنا۔ آگ جلانا۔ باب استفعال کے مصدر استیقاد سے واحد مذکر ماضی کا صیغہ ہے اس نے آگ جلائی۔

اَضَاءَتْ اَضَاءَتْ یہ اِضَاءَۃٌ سے بنا ہے۔ کسی چیز کو چمکانا۔ اس کی اصل ضَوْءٌ ہے ضَاءَ یَضُوْءُ ضَوْءً چمکنا۔ ضَاءَ الْقَمَر چاند چمک اٹھا۔ ان چمکدار اجسام سے نکلنے والی روشنی کو ضوء کہتے ہیں۔ الضوء ماانتشر من الاجسام النیرۃ (مفردات)

والاضاءۃ فرط الانارۃ (کشاف) کتب سماویہ کو بھی ضیاء کہا گیا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَاءً

ماحولہ - ماحول۔ حَالَ یَحُوْلُ حَوْلاً۔ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلنا۔

اصل الحول تغیّر الشئ وانفصالہ عن غیرہ وحول الشئ جانبہ الذی یمکن ان یحوّل الیہ

مفردات

حَالَ يَحُوْلُ حَوْلاً۔ الحَوْلُ : سال گزرنا
حَالَ عَلَيْهِ الحَوْلُ : سال گزر گیا
ذَهَبَ ۔ ذَهَبَ يَذْهَبُ ذِهَابًا ۔ جانا
جب اس کا صلہ حرف باء ہو تو معنی متعدی ہو جاتے ہیں یعنی لے جانا۔ یہاں معنی لے جانا ہیں۔
ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ۔ اللہ نے ان کے نور کو زائل کر دیا۔
النَّار والنُّور ۔ النَّارُ : تقال للهيب الذی يبدو للحاسة ۔ والنور : الضَّوْءُ المنتشر الذی يُعين على الابصار (مفردات)
النار : جوهرٌ مضيئٌ حارٌّ محرق ۔ والنور : ضوءها وضوء كل نيّرٍ واشتقاقها من نَارَ يَنُوْرُ ۔ (کشاف)
تَرَكَ ۔ کسی چیز کو اپنے قصد اور ارادے سے اختیاری طور پر یا اضطراری طور پر چھوڑ دینا۔ ترك الشئ رفضه اختيارًا او قهرًا او اضطرارًا (راغب)
تَرَكَ کا استعمال دو طریق پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ترک ایک مفعول کی طرف متعدی ہو اس وقت معنی طَرَحَ اور خَلّٰی کے ہوں گے اور دوسرا یہ کہ ترک دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس وقت یہ صَيَّرَ کے معنوں

میں ہوگا۔ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ : اس نے ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا۔
ظُلُمٰت ۔ ظُلمۃٌ کی جمع ہے۔ یہ نور کی ضد ہے۔ ظلمت۔ اندھیریں۔ الظُّلْمَةُ عبارة عن عدم النور۔ (کشاف)
صُمٌّ ۔ یہ اَصَمّ کی جمع ہے۔ بہراپن۔ قوتِ سامعہ کا فقدان۔
الصَّمَمُ : فُقدان حَاسَّة السّمع (مفردات)
بُكْمٌ ۔ بُكْمٌ یہ اَبْكَم کی جمع ہے۔ پیدائشی گونگا۔ الّذی يُولد اَخْرس (راغب)
وقال ثعلب : الابكم ان يولد الانسان لا ينطق ولا يسمع ولا يبصر (لسان) یعنی بکم یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر گونگا بہرا اور اندھا ہو۔ بَكِيْمٌ : اَخْرَس، گونگا۔ مطلب یہ ہے کہ کافر لوگ حق ناشناسی میں اس شخص کی طرح ہیں جو پیدائشی طور پر گونگا، بہرا اور اندھا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ابلہ اور غبی بھی ہو۔
عُمْيٌ ۔ عُمی ۔ یہ اعمٰی کی جمع ہے۔ اندھاپن آنکھوں کے اندھے پن اور قلب و بصیرت دونوں کے اندھے پن پر بولا جاتا ہے۔ العمى يقال فی افتقاد البصر والبصيرة ۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى یہ بصیرت کا اندھاپن ہے۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى

بصر یعنی آنکھوں کا اندھا ہونا ہے۔

لَا یَرْجِعُوْنَ ۔ رُجوعٌ ۔ اصل کی طرف لوٹنا۔ الرجوع : العود الی ما کان منہ البدأ (مفردات) مطلب یہ ہے کہ وہ کفر سے حق کی طرف اور ضلالۃ سے حق کی طرف نہیں آئیں گے عن کفرھم وضلالتھم (ابن عباس) انھم لا یعودون الی الھدی بعد ان باعوہ ۔ (کشاف)

الصَّیِّب ۔ صیّب کا لفظ سخت بارش کے لئے بھی آتا ہے اور زور کے ساتھ برسنے والے بادل کے لئے بھی۔

والصیّب : المطر الذی یصوب ای ینزل ویقع ۔ (کشاف)

الصیّب : السّحابُ المختص بالصَّوْب او کصَیِّب : قیل ھو السحاب وقیل ھو المطر (مفردات)

المراد من الصیّب ھو الایمان والقرآن (کبیر)

الرَّعْدُ ۔ الرّعد ۔ بادل کی گرج۔

الصوت الذی یسمع من السحاب (کشاف)

البَرْقُ ۔ برق ۔ بجلی کی چمک اور اس سے نکلنے والی شعاعیں ۔ البرق : لمعان السحاب (مفردات)

الصَّوَاعِق ۔ الصواعق : یہ صاعقۃ کی جمع ہے ۔ اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور یہ اس بجلی کے لئے بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے ۔

والصاعقۃ: قصفۃ رعد تنقض معھا شقۃ من نار (کشاف) یہ صَعِقَ یَصْعَق سے مشتق ہے ۔ فَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۔ گرج کی آواز ۔ صاعقۃ : فضا میں پیدا ہونے والی سخت آواز ۔

حَذَرَ ۔ کسی خطرناک چیز سے بچنا ۔

الحذر : احتراز عن مخیف (مفردات)

حَذَرَ المَوت : ای مخافۃ میل القلب الیہ (ابن عباس)

الحذر : خوف زدہ کرنے والی چیز سے دور رہنا ۔ باب سمع ۔

المَوْت ۔ قوتِ حیوانیہ اور روح کا جسم سے الگ ہو جانا موت حیوانی ہے

زوال القوۃ الحیوانیۃ وابانۃ الروح عن الجسد ۔ (مفردات)

الموت : فساد بُنیۃ الحیوان (کشاف)

(نوٹ) موت کی پوری تحقیق مفردات راغب میں دیکھی جائے۔

مات یموت موتًا۔ مات المکان جگہ کا ویران
ہوجانا۔ (المنجد)

مُحِیْطٌ - مُحِیْطٌ: حافظ۔ گھیرے میں
لینے والا۔ یہ احاطہ سے مشتق ہے۔
والحائط : الجدار الذی یحوط بالمکان
(مفردات) ۔ والمعنی انھم لا یفوتونہ کما
لا یفوت المحاط بہ المحیط بہ (کشاف)

یَخْطَفُ - یخطف ۔ خطف کسی چیز کو تیزی
کے ساتھ اُچک لینا۔
الخطف : الاخذ بسرعۃ (کشاف) خطف
اور اختطاف دونوں ہم معنی ہیں۔ الخطف والاختطاف
الاختلاس بسرعۃ (مفردات)

مَشَوْا - یہ مَشْیٌ سے مشتق ہے۔ ایک
جگہ سے دوسری جگہ کی طرف انتقال کرنا۔
المشی : الانتقال من مکان الی مکان
(مفردات) مشی معتدل انداز سے چلنا اور اگر
رفتار تیز ہو تو اس کو سعی کہا جاتا ہے۔ اور اس سے
بھی تیز ہو تو اس کو عَدْوٌ کہا جاتا ہے۔ مشی حرکتِ
مخصوصہ کا نام ہے۔ المشی : جنس الحرکۃ
المخصوصۃ (کشاف)

جَاعِلٌ - جَعَلَ یَجْعَلُ ۔ اسم فاعل ہے
بنانے والا۔ پیدا کرنے والا۔ جَعَلَ معنوی لحاظ
سے فَعَلَ اور صَنَعَ سے عام ہے۔ اور اس کا
استعمال چند طریقوں سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ
صَارَ اور طَفِقَ کے معنی میں ہو تو یہ لازم
ہوتا ہے۔ کسی مفعول کی اس کو ضرورت نہیں ہوتی
جیسا کہ جَعَلَ زَیْدٌ یقول کذا۔ دوسرا
استعمال اس کا اَوْجَدَ کے معنی میں ہوتا ہے
اس صورت میں یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا
ہے۔ جیسا کہ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ۔ اور
تیسرا یہ کہ ایک شئ سے دوسری شئ کو پیدا اور ایجاد
کرنا۔ جیسا کہ وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ
اَزْوَاجًا۔ اور چوتھا یہ کہ ایک شے کو بدل کر دوسری
حالت دیدینا جیسا کہ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا
(وفی المفردات تحقیق زائد)

خَلِیْفَۃً - خلیفہ وہ ہے جو کسی کی نیابت
کرے خواہ اس لئے کہ اس کا منوب موجود نہیں
یا اس لئے کہ وہ کہیں گیا ہے یا اس لئے کہ منوب
فوت ہوگیا ہے۔ خواہ اس لئے کہ منوب کی
عظمت کا اظہار ہو۔ خلافتِ آدم آخری وجہ
کے اعتبار سے ہے۔

یَسْفِکُ سَفَکَ یَسْفِکُ ۔ بہانا۔
السفک فی الدم صبّہ (مفردات)

الدِّمَآءَ - دَم کی جمع ہے بمعنی خون۔ نُسْقِیْکُمْ

مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا ۔

نُسَبِّحُ ۔ تسبیح۔ اللہ کی پاکی اور تنزیہ بیان
کرنا۔ اَلتَّسْبِیْحُ : تنزیه الله تعالٰی (مفردات)

نُقَدِّسُ ۔ ذات پاک کو تمام عیوب سے پاک
سمجھنا۔ التقدیس التطھیر الالٰھی (راغب)

اٰدَمَ ۔ ابوالبشر۔ مسجود الملائکہ کا نام
ہے۔ زمین سے پیدا ہونے کی وجہ سے آدم نام
رکھا گیا ہے۔ وسُمّی بذلك لكون جسدہٗ
من الارض ۔ (مفردات)

عرض پیش کرنا۔ عرض الشی علیہ
عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۔ پھر ان کو
فرشتوں کے سامنے پیش کیا (ترجمہ فتح)

اَنْۢبِـُٔوْنِیْ ۔ بِنَاءٌ سے مشتق ہے۔ جس
کے معنی خبر کے ہیں۔ مگر ہر خبر کو نبأ نہیں کہا جاتا۔
نبأ اس خبر کو کہا جاتا ہے جس سے سننے والے کو
کوئی فائدہ حاصل ہو یا وہ خبر کسی علم مخصوص کی حامل
ہو یا خبر سے غلبہ ظن حاصل ہو۔ النبأ خبر ذو
فائدة عظيمة يحصل به علم (مفردات)

صٰدِقِیْنَ ۔ یہ صدق سے مشتق ہے اور
صادق اسم فاعل کی جمع ہے۔ صدق، کذب کی
ضد ہے۔ ان دونوں کا تعلق قول سے ہے۔ اعمال
و افعال میں متصور نہیں۔ صدق وہ ہے کہ قول
مافی الضمیر اور مخبر عنہ کے مطابق ہو یعنی جو بات
زبان سے کہی جائے دل میں اس کی تصدیق موجود
ہو اور جس بات کی خبر دے رہا ہے وہ خارج
میں واقع بھی ہو ۔

حَکِیْمٌ اس کا اصل حکمۃ ہے۔
حَکَمَ یَحْکُمُ مضبوط کرنا۔ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ
ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ
والحکمۃ اصابۃ الحق بالعلم والعقل (راغب)

تُبْدُوْنَ ۔ بَدَا یَبْدُوْ بَدْوًا وَبَدَاءً
ظاہر ہونا۔ تبدون باب افعال ہے۔ ابداء: ظاہر کرنا

تَكْتُمُوْنَ ۔ کتمان سے مشتق ہے۔ اخفا
کرنا۔ صحیح بات کو چھپانا۔ الکتمان ستر الحدیث
وَلَا یَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا۔ اللہ سے کوئی بات چھپا
نہیں سکتے۔

اَلْحَقّ ۔ حَقَّ یَحِقُّ حَقًّا وَحَقَّةً حقیقت
ثابتہ۔ ٹھوس بات۔ مطابق واقعہ ۔
حَقَّ الْاَمْرُ : ثبت و وجب فهو حاقٌّ
مؤنث حاقۃ ۔ والحق اسم من اسماء اللہ
العزیز ۔

لَا تَلْبِسُوْا ۔ التباس : لَبَسَ یَلْبِسُ ۔
لَبِسَ الثوبَ کے معنی ہیں کپڑے پہننا۔ اگر
اس کا صلہ علی آئے تو معنی گڈمڈ کرنے کے

ہوتے ہیں۔ لبس الامر علیہ : اس نے معاملہ گڈمڈ کر دیا۔ لَبَسۡھُمۡ کے معنی ہوں گے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیا یا ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا دیا۔ جیساکہ قرآن میں ہے اَوۡ یَلۡبِسَھُمۡ شِیَعًا۔

لبس الشئ بالشئ کے معنی ہوتے ہیں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ حق بات کو چھپانا حرام ہے۔

الزَّکٰوۃَ۔ زکوٰۃ شریعت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ لغوی معنی کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ لفظ نہایت مقدس معنی کا حامل ہے۔ زکی یزکو سے مشتق ہے جس کے معنی پاک ہونے کے ہیں۔ نَفۡسٌ زَکِیَّۃٌ اس نفس کو کہا جاتا ہے جو گناہوں سے پاک ہو۔

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰھَا۔ دوسرے معنی زکوٰۃ کے مادے میں بڑھنے اور نشوونما پانے کے ہیں۔

زکا الزرع : کھیتی بڑھی اور اونچی ہوئی۔

زکوٰۃ اصطلاح میں پاکیزگی اور نشوونما دونوں کے معنی ملحوظ ہیں۔ مُزکّی کا نفس بھی پاک ہوتا ہے اور مال میں بھی برکت ہوتی ہے۔

وَارۡکَعُوۡا۔ یہ امر کا صیغہ جمع مذکر ہے۔ اسم فاعل رَاکِعٌ اور جمع رُکَّعٌ ہے۔ رُکُوۡعٌ بھی فعولٌ کے وزن پہ جمع کا وزن ہے۔ رکوع کے معنی ہیں آگے کی جانب جھکنا۔ تواضع اور تذلّل کا اظہار کرنا۔ الرکوع الانحناء (مفردات) قرآن مجید میں اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔

الرکوع : الخضوع والانقیاد ویجوز أن یراد بالرکوع : الصلوٰۃ (کشاف)

مِنۡ رَکَعَ یَرۡکَعُ۔

تَاۡمُرُوۡنَ اَمَرَ یَاۡمُرُ اَمۡرًا۔ امر : حکم اور شان۔ کسی کو کوئی کام کرنے کا حکم دینا۔ مکلف بنانا۔ والامر : قول القائل لمن دونہ إفعل

(تعریفات للشیخ الجرجانی)

تَاۡمُرُوۡنَ : تم حکم کرتے ہو۔ بتاتے ہو۔

الۡبِرِّ۔ بِرّ کا لفظ عربی زبان میں چند مفہوم ادا کرتا ہے۔ ایفائے عہد۔ وفاداری اور ادائے حقوق وغیرہ۔ یعنی تمام امور خیر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ البِرُّ : سَعَۃ الخیر والمعروف ومنہ البَرّ (بالفتح) لسعتہ۔ ویتناول کل خیر (کشاف) البِرّ ای التوسّع فی فعل الخیرات (راغب)

تَنۡسَوۡنَ۔ نَسِیَ یَنۡسٰی : نسیان کے معنی ہیں جس چیز کا آدمی کو ذمہ دار بنایا گیا ہو اس

اس سے بھول جانا ، ذھول ہو جانا۔ چاہے دانستہ ہو کہ شروع میں تو قصداً چھوڑا اور بے پروائی برتی جس کی وجہ سے آخر کار بھول گیا یا ضعفِ قلب اور غفلت کی بنا پر نسیان نازل ہوا۔

اَنۡفُسَكُمۡ - اَنْفُس : نفس کی جمع ہے نفوس بھی اس کی جمع آتی ہے ۔ مراد اس سے انسان کا روح ہے اور ذات باری پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ یہاں اَنْفُسَكُمْ میں نفس سے مراد ذاتِ انسانی ہے تم اپنے آپ کو بھول جاتے ہو

تَتۡلُوۡنَ - تم پڑھتے ہو ۔ تلاوت کرنا ۔ آسمانی کتاب کا مطالعہ کرنا ۔ تلا یتلو ۔ معنی میں تدبّر کرنا ۔ کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنا کہ درمیان میں تیسری چیز حائل نہ ہو ۔

تَعۡقِلُوۡنَ - عَقَلَ يَعقِلُ عَقْلاً ۔ روک رکھنا ۔ باندھنا ۔ معاقلہ : عقل آزمائی کرنا ۔ عَقَلَ الْغُلَامُ : بچہ کا سیانا ہو جانا

تعقل : سمجھنا ، عقل مند ہونا ۔

عقل ، انسان کی ایک طبعی صفت ہے جو اس کے اندر موجود ہے ۔ عقل ایک نور اور قوت ہے جس کے ذریعہ سے معلومات کی حقیقتوں کو جدا جدا کیا جاتا ہے ۔ عقل کو تجربات کا نچوڑ بھی کہا گیا ہے ۔ بعض اہل علم کا ارشاد ہے کہ عقل انسان کے دل میں ایک نور ہے جس سے حق و باطل کا فرق ہوتا ہے ۔

كَبِيۡرَةٌ - یہاں اس کے معنی بھاری اور گراں کے ہیں ۔ یہ صفتِ مشبّہ کا صیغہ ہے دشوار ۔ شاق ۔ جمع کبائر ۔ اصل مادہ کبر ہے

خٰشِعِيۡنَ - الخشوع : خَشَعَ يَخْشَعُ خشوع کی اصل حقیقت پستی اور فروتنی اور عجز و تذلّل کا اختیار کرنا ہے ۔ یہاں اس کا مقصد یہ ہو گا کہ اپنے کو پوری طرح بے بس سمجھ کر خدا کے سامنے جھک جانے والے ۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ خشوع کے معنی ضراعۃ یعنی عاجزی پر بولا جاتا ہے ۔ ایک حدیث ہے اذا خضعت القلب وَخَشَعَتْ الجوارح ۔ جب دل میں فروتنی ہو تو جوارح پر اس کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے ۔

خاشعین عاجزی اور فروتنی کرنے والے ۔

الصَّبۡرِ - لفظ صبر کے لغوی معنی روکنے کے ہیں ۔ یعنی نفس کو گھبراہٹ اور دل برداشتگی سے بچائے رکھنا اور مایوسیوں سے اس کو بچا کر اپنے موقف پہ ڈٹے رہنا ۔ قرآن میں اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیتِ قلب کے ساتھ اللہ کے عہد پر یقین اور اعتماد کیساتھ

ڈٹا رہے اور عقل و شرع کے خلاف کے ارتکاب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔

الصبر : الامساك فی ضیق۔ والصبر: حبس النفس علی ما یقتضیه العقل والشرع (راغب)

الخشوع - الخشوع : الاخبات والتطامن ومنه الخشعة للرملة المتطامنة واما الخضوع فاللین والانقیاد (کشاف ۱۳۵/۱)

خشوع کا تعلق عام طور پر ظاہر جوارح سے ہوتا ہے اور خضوع کا قلب سے ہوتا ہے۔

یَظُنُّوْنَ - یہ ظنٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گمان کرنا۔ یقین کرنا اور کسی پر تہمت لگانا۔ آدمی کسی چیز کے دیکھے بغیر جو رائے قائم کر لیتا ہے اس کو ظن کہتے ہیں۔ چونکہ اس طرح کی رائے پر بالعموم کامل یقین نہیں ہوتا اس لئے ظن کا لفظ شک کے معنی بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ قرآن پاک میں اس کا استعمال گمان اور یقین دونوں معنوں میں ہوا ہے جیساکہ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ۔ انھوں نے یقین جان لیا کہ اللہ کے عذاب سے کہیں پناہ نہیں مگر اسی کے پاس۔ اور گمان کے معنی میں جیساکہ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ۔ اور بولا جاتا ہے وَظَنَنْتُ زَيْدًا صَاحِبَكَ۔ یعنی میں نے سمجھا کہ زید آپ کا ساتھی ہے۔

اور تہمت لگانا بھی اس کے معنی میں پایا جاتا ہے۔ کسی چیز کی علامات سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اس کو بھی ظن کہتے ہیں۔ جب یہ علامات قوی ہوں تو ان سے علم کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر جب علامات کمزور ہوں تو وہ نتیجہ وہم کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ نتیجہ قوی اور علم کا درجہ حاصل ہو تو اس کے ساتھ حرف اَنْ یا اَنَّ کا استعمال ہوتا ہے۔ جیساکہ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ۔ وہ اپنے علم عقل و فکر کی بے راہ روی کی وجہ سے یہ یقین کر بیٹھے کہ ہماری طرف نہیں لوٹیں گے۔ مگر جب وہ ظن کمزور ہو اور وہم کے درجہ سے آگے نہ بڑھے تو پھر اس کے ساتھ صرف اَنْ استعمال ہوتا ہے۔

الظَّنَّانُ : بدگمان، تہمت باز۔

فَضَّلْتُكُمْ - یہ فضل سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں زیادتی۔ فَضَّلَ باب تفعیل ہے بڑائی دینا۔ یعنی میں نے تم کو دنیا پر بڑائی دی فضیلت دی۔ اس فضیلت سے مراد قوموں

کی ہدایت اور رہنمائی کا ایک خاص منصب ہے
جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو
ایک خاص دور میں منتخب فرمایا۔ جو فضیلت کسی منصب
کی ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہو وہ ایک
مشروط فضیلت ہوتی ہے جب تک صاحب
منصب ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا کرتا رہے
فضیلت حاصل ہوتی ہے اور جب ذمہ داریوں
کو چھوڑ دے تو فضیلت مسلوب ہو جاتی ہے۔
الفضل: کسی چیز کے اقتصاد اور متوسط درجہ سے زیادہ
ہونے کے ہیں اور یہ دو طرح پر ہے ۱۔ محمود جیسے
علم و حلم کی زیادتی ۲۔ مذموم جیسے وغیرہ۔
اچھی زیادتی کے لئے فضل اور بری کے لئے فضول کا
لفظ بولا جاتا ہے

تَجْزِیْ ۔ جَزٰی یجزی جَزاءً: کسی کو بدلہ
دینا یا کسی کی طرف سے ادا کر دینا۔ آیت کے معنی یہ
ہوں گے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کام نہ آسکے
الجَزاءُ: کافی ہونا یا کسی چیز کا بدلہ جو کافی ہو۔

نَجَّیْنٰکُمْ ۔ نَجَا یَنجو نَجاۃً و نَجاءً:
خلاصی پانا، رہائی پانا، نجات پانا، جدا ہونا۔
اصل النجاء الانفصال من الشیئ (مفردات)

شَفَاعَۃٌ ۔ شَفَعَ یَشْفَعُ سے مشتق ہے۔
شفع الشیئ کا معنی ہیں اس کے ساتھ اسی طرح
کی چیز کو ملا کر جوڑا کر دیا شَفَعَ لِفُلَانٍ یا شفع
فیہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کی بات یا
درخواست کے ساتھ اپنی تائید یا سفارش ملا کر
اس کو مؤید کر دینا۔ الشفاعۃ: اَلْاِنضِمَامُ اِلٰی
آخر ناصرًا له او سائلًا عنه (راغب)

عَدْلٌ ۔ عدل کے معنی انصاف برابری
اور فیصلہ کے ہیں۔ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ
یہ کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔
اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا: یا اس کے برابر
روزے۔ العَدْلُ: التقسیط علی سواءٍ
وَلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ، فدیہ کے معنی
میں ہے

آل ۔ آل کی اصل اہل ہے۔ چونکہ جب اس
کی تصغیر بنائی جاتی ہے تو اُهَیل آتی ہے۔ یہاں
ھا کو ہمزہ سے بدل کر آل بنایا گیا ہے۔
اصل آلٌ اَهْلٌ۔ آل سے مراد قوم قبیلہ
اولاد اور اتباع و انصار ہوتے ہیں اور یہ لفظ
اہل کی نسبت خاص ہے۔ اس کا اطلاق
اصحاب جاہ و حشمت کی قوم و اتباع پر ہوتا
ہے۔ کم درجے کے لوگوں کی قوم و اولاد کو
آل نہیں کہا جاتا۔ (کشاف) یہاں آل سے
مراد قوم فرعون ہے آل کا لفظ قوم، قبیلہ
اتباع و انصار اور اولاد سب کو حاوی ہے

یَسُوْمُوْنَكُمْ ۔ سَامَ یَسُوْمُ سَوْمًا۔ کسی پر
بوجھ یا بار ڈال دینا۔ کہا جاتا ہے سَامَهٗ ظُلْمًا

وَسَامَهُ خَسْفًا۔ اس کو ظلم یا ذلت کا مزہ چکھایا یعنی زیادتی کی اور ان پر زبردستی حاکم بن بیٹھا۔

سُوْٓءَ۔ یہ السَّیِّئُ کا مصدر ہے بمعنی برائی قبیح۔ کلمات دعائیہ میں کہا جاتا ہے اَعُوْذُ بِاللہِ من سُوْءِ الْخُلُقِ وَمِنْ سُوْءِ الْفِعْلِ۔ یہ تمام آفات و امراض کا جامع نام ہے (تاج) وہ چیز جو انسان کو غم میں ڈالے (راغب)

یُذَبِّحُوْنَ۔ ذَبْحٌ سے ماخوذ ہے۔ حیوانات کو حلق سے کاٹنا۔ ذِبْحٌ بمعنی مذبوح آتا ہے وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ۔

باب تفعیل سے اس کو اس لئے لایا گیا ہے کہ کثرت کے معنی کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ یعنی وہ تمہارے بچوں کو کثرت کے ساتھ قتل کرتا تھا۔ بعض اہل علم نے اس کو یذبحون تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔

اَبْنَآءَ۔ ابن کی جمع ہے۔ اولادِ ذکور، بچے لڑکے۔

یَسْتَحْیُوْنَ۔ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ ای یَسْتَبْقُوْنَهُنَّ (مفردات) جمع مذکر غائب۔ مصدر اِسْتِحْیَاءٌ۔ اصل مادہ حَیَاۃٌ وَحَیٌّ

بَلَآءٌ۔ غم، مصیبت۔ اس کا اصل مادہ بلا ہے۔ جس کے معنی کمزور اور پرانا کر دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے بَلِیَ الثَّوْبُ ای خَلِقَ یعنی پھٹ گیا پرانا ہو گیا۔ ہموم و غموم کو بلاء اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ جسم کو کمزور اور لاغر کر دیتے ہیں۔ صاحبِ کشاف نے بلاء کے یہاں دو احتمال ذکر کئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بلاء کو اگر فرعون کی طرف منسوب کیا جائے تو اس سے مراد محنت ہوگی جو وہ اسرائیلیوں سے لیتا تھا اور اگر اس کی نسبت نجاء یعنی نجینٰکم کی طرف ہو تو اس کے معنی نعمت کے ہوں گے یعنی اس نجات میں تمہارے لئے بڑی نعمت ہے اس صورت میں ذٰلِكُمْ کا اشارہ نجات کی طرف ہوگا۔

فَرَقْنَا۔ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم نے تمہیں ساتھ لیکر دریا کو پھاڑتے ہوئے عبور کیا یعنی تم کو اس طرح دریا پار کروایا جیسا کہ گود میں لیکر پار کرایا جاتا ہے (تدبر)

فَرَقْنَا۔ فَرَقَ یَفْرُقُ فَرْقًا وفُرْقَانًا جدا کرنا۔ فَرَّقَ بینهما

فَرَقَا الْبَحْرَ: سمندر کو پھاڑ دیا۔
اَلْبَحْرَ۔ بحر سے مراد یہاں بحرِ قلزم ہے یا بحرِ احمر ہے۔ دریائے نیل مراد نہیں۔
اَغْرَقْنَا۔ غَرِقَ یَغْرَقُ غَرَقًا۔ صفت غریق اور جمع غرقیٰ آتی ہے۔
اِغراق: ڈبو دینا۔ غرق کر دینا۔
اُغْرِقُوْا ڈبو دیئے گئے۔ غرق یغرق (س) غَرَقًا: پانی کی تہ میں چلے جانا۔
اَلْغَرَقُ: ڈوبنا۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَکَهُ الْغَرَقُ: جب اس کو غرقابی نے دبوچ لیا۔ (سورۃ یونس)
اور بمعنی بے پرواہ ہونا، غنی ہونا، پانی میں ڈوب گیا تو گویا دنیا سے بے پرواہ ہو گیا۔
باب افعال میں اَغْرَقْنَا اس کے معنی ہیں ڈبویا ہم نے۔ یہاں انہی معنوں میں مستعمل ہے یعنی ہم نے ڈبو دیا۔ اور بطور تشبیہ کے بار احسان ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے۔
فلانٌ غَرِقٌ فی نِعمۃِ فلان۔ فلاں اس کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے۔
وٰعَدْنَا۔ وَعَدَ یَعِدُ۔ وعدہ کرنا
وَعَدْنَا: ہم نے وعدہ کیا۔
اَرْبَعِیْنَ۔ چالیس کے عدد کے لئے آتا ہے۔

الْعِجْل۔ گائے کا بچھڑا۔
عَفَوْنَا۔ اس کا اصل مادہ عَفْوٌ ہے جس کا معنی قصداور ارادہ کرنے کے ہیں قرآن میں اس کا استعمال گناہوں سے درگزر کرنے کے معنوں میں ہوا ہے۔
العفو: هو التجافی عن الذنب (راغب)
عفا عن ذنبه: معاف کر دینا، سزا نہ دینا۔
عَفَوْتُ عَنْهُ: قصدتُ ازالۃ ذنبه صارفًا عنه۔ (مفردات) والمراد بالعفو هنا: محو الجريمة بالتوبة (روح المعانی)
تَشْكُرُوْنَ۔ شکر سے مشتق ہے۔
شکر یشکر (ن) کسی احسان اور بھلائی پر تعریف کرنا۔ شکریہ ادا کرنا۔
شکر الله سعیك: اللہ تم کو تمہاری محنت کا بدلہ دے۔ صفت شاکرٌ جمع شاکرون۔
الشکر: تصوّر النعمة واظهارها
شکر کی تین اقسام ہیں۔ ایک یہ کہ دل سے شکر کیا جائے، اس کو شکر القلب کہا جاتا ہے۔ دل میں محسن کے احسان کا تصوّر رکھنا۔ دوسرا شکر اللسان ہے۔

یعنی زبان سے منعم و محسن کی ثنا و تعریف کرنا۔ اور تیسرا یہ کہ تمام جوارح سے محسن کے انعامات و احسانات کا اظہار کیا جائے۔ محسن و منعم کے احسانات کی ہر ممکن قدر کی جائے اور انعامات کا حق ادا کیا جائے۔ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ۔ منعم حقیقی کے انعامات و احسانات کے شکر سے اظہارِ عجز بھی شکر ہے۔ اور احسانات الٰہی کو پاکر تواضع اختیار کر لینا بھی اقسام شکر میں شامل ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

والشکر عند الجنید: هو العجز عن الشکر وعند الشبلی۔ التواضع تحت رؤیة المنة (روح)

الْفُرْقَانَ ۔ الفرقان کا اصل مادہ فرق ہے فَرَقَ يَفْرِقُ فَرْقًا وَفُرْقَانًا۔ جدا کرنا، فیصلہ کرنا، تفصیل سے بیان کرنا۔ کھل جانا۔ الفرقان یہ تورات اور قرآن دونوں کے لئے بطور صفت استعمال ہے۔ حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی کتاب۔ الفرقان یہاں الکتاب کی صفت ہے لہٰذا عطف تفسیری ہوگا۔ دوسرا قول اہل تفسیر کا یہ ہے کہ الفرقان سے مراد وہ شریعت ہے جو حلال و حرام میں فرق کرنے والی ہے۔ یعنی ہم نے موسیٰؑ کو کتاب کے ساتھ شریعت دی جو حلال و حرام بیان کرنے والی ہے۔ تیسرا قول یہ بھی ہے کہ الفرقان سے مراد معجزات ہیں۔

بَارِئ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ۔ بَرءٌ کا مفہوم لفظ خلق سے ملتا جلتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک ہی جگہ خدا کی تین صفات اکٹھی مذکور ہوئی ہیں هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ خلق کا مفہوم ہے کسی چیز کا خاکہ تیار کرنا۔ بَرءٌ کا مفہوم ہے اس کو ٹھیک ٹھاک کرنا اور تصویر کے معنی ہیں اس کو مکمل کرنا۔

برءَ یَبْرَأُ کا استعمال پیدا کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ باریٔ وہ ہے جس نے مخلوق کو عدم تناسب سے بری پیدا کیا۔ اسم باری کا اطلاق صرف ذات باری ہی پر ہوتا ہے۔ کسی دوسرے پر اس کا اطلاق جائز نہیں۔ اور صفتِ باری سے مراد یہ ہے کہ خدا نے مخلوق کو اعتدال پر پیدا کیا۔ اس کی تخلیق میں نہ تو تفاوت ہے اور نہ ہی عدم تناسب۔ تو باری وہ ذات ہوئی جس نے مخلوق کو اعتدال پر پیدا کیا۔

فَاقْتُلُوا ۔ القتل: قَتَلَ يَقْتُلُ قَتْلًا مار ڈالنا۔ لغوی معنی قتل کے ازالۃ الروح عن الجسد کے ہیں۔ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ: قیل معناه لیقتل بعضکم بعضًا (راغب) القتل المعروف: من ازهاق الروح وعلیہ

دن میں داخل ہونا۔ یوم السّبت۔ یہود کے ہاں مقدس دن ہے۔ جیسا کہ مسیحیوں کے ہاں اتوار اور مسلمانوں کے ہاں جمعۃ المبارک

قِرَدَةً ۔ القِردُ ۔ بندر۔ اس کو سعدان بھی کہتے ہیں۔ جمع قِردَةٌ اور اقراد آتی ہے مؤنث قردۃ جس کی جمع قِرَدٌ ہے۔

خٰسِئِیْنَ ۔ خَسَأَ یَخْسَأُ خَسَأً: کُتے کو دُھتکارنا۔ ذلیل ورسوا۔ خَاسِئٌ ۔ فاعل ہے۔ خٰسِئِیْن۔ اس کی جمع ہے۔ دُھتکارے ہوئے کُتے۔ خسأ لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے۔

نَکَالً ۔ عبرت ونمونہ کے معنوں میں ہے۔ النکال : ما یجعل عبرۃً للغیر (منجد) عبرت ناک سزا جس کو دیکھ کر دوسرے نصیحت حاصل کریں۔

مَوْعِظَةً ۔ مَوْعِظَۃ۔ نصیحت۔ وَعَظَ یَعِظُ وَعْظاً و عِظَۃً نصیحت کرنا۔ موعظۃ اسم مصدر ہے۔ اتّعاظ وعظ کا اثر قبول کرنا۔ وَعْظٌ مصدر باب ضَرَبَ ۔ ایسی نصیحت کرنا جس میں ڈراوا شامل ہو (راغب) بھلائی کی اس طرح نصیحت کرنا کہ دلوں میں رقت پیدا ہو جائے ۔ (خلیل)

اتّعاظ ، افتعال سے نصیحت قبول کرنا۔ موعظۃ اسم مصدر۔

تَذْبَحُوْا ۔ ذَبَحَ یَذْبَحُ ذَبْحًا و ذباحًا ذبح کرنا۔ گلا کاٹنا۔ تم ذبح کرو۔

الْبَقَرَةَ ۔ بقرۃ۔ گائے بیل، یہ اسم جنس ہے جمع بقرات و بقرٌ

هُزُوًا ۔ هَزْؤٌ اصل ہے۔ مسخراپن۔ سخت سردی کو کہتے ہیں۔ هَزَأ اِبِلَهٗ ۔ اونٹ کو سخت سردی سے مار ڈالا۔ استھزاء ٹھٹھا۔

فَارِضٌ ۔ بوڑھی یا عمر رسیدہ ۔ الفارض: المسنّۃ (کشاف) وقال صاحب الکشاف سمیت فارضًا لانہا فرضت سنّہا ای قطعتہا والفارض المسن من البقر۔ انما سُمّی فارضًا لکونہ فارضًا للارض ای قاطعًا۔ (راغب)

بِکْرٌ ۔ البکر: الفتیۃ۔ جوان بن بیاہی، جس نے ابھی بچہ نہ جنا ہو۔ الفارض المسنّۃ التی لا تلد والبکر الفتیۃ التی لم تلد قط۔ یعنی فارض وہ گائے ہے جو بچہ جننے کے قابل نہ رہی ہو۔ بہت بوڑھی ہو چکی ہو۔ اور بکر وہ جس نے ابھی کوئی بچہ نہ جنا ہو۔ (معالم)

عَوَانٌ ۔ عوان بمعنی درمیان یعنی دونوں عمروں کے بین بین ہو۔ العوان :المتوسط بین السنین (راغب)۔ العوان: النصف (کشاف)

صَفْرَآءُ ۔ صفراء گہرا زرد رنگ۔ صفرۃ :

زرد رنگ۔ صفر الثوب: کپڑے کو زرد رنگنا۔

فَاقِعٌ ۔ فَقَعَ یَفْقَعُ (ن ۔ ف) رنگ صاف اور نکھرا ہوا ہونا۔ کہا جاتا ہے فقع لونہ اس کا رنگ صاف اور خالص ہو گیا۔ الفقوع: اشدّ مایکون من الصُّفْرَۃ وانصعہ (کشاف)

اصفر فاقع اذا کان صادق الصفرۃ (راغب) جمع فقاقع۔ مطلب یہ کہ گائے خوش رنگ خوش نما خوش منظر ہے۔

تَسُرُّ ۔ تسرّ سرور سے ہے۔ فرحت اور خوشی۔ یہ دراصل ایک کیفیت جو کسی نفع وغیرہ حاصل ہونے یا اس کی توقع پر دل میں حاصل ہوتی ہے۔ صاحب کشاف فرماتے ہیں اَلسُّرُوْرُ لَذَّۃٌ فِی القلب عند حصول نفع او توقعہ (کشاف)

النّٰظِرِیْنَ ۔ ناظرین جمع ہے ناظرٌ کی نظر ینظر دیکھنا۔ مصدر نظرٌ ہے۔ نظر الیہ: اس کی طرف غور سے دیکھنا۔ نَظِرَۃٌ: مہلت دینا۔ وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ (بقرہ ۲۸۰)

تَشٰبَہَ ۔ تَشَبَہَ: الشِبْہُ والشَّبَہُ: مثل، مانند۔ تشابہ الرجلان ایک دوسرے کے مانند و مثل ہونا۔ جمع اَشْبَاہٌ الشُّبْہَۃُ: مثل، شک۔ جمع شُبُہَات

ذَلُوْلٌ ۔ ذَلُوْلٌ: ای لم تذلل للکراب (کشاف) ہل چلانے اور کنویں میں جوتنے کا کام اس سے نہیں لیا گیا ذَلَّ یَذِلُّ ذُلًّا و ذِلَّۃً ۔ صفت ذَلِیْلٌ رسوا ہونا۔ خوار ہونا۔ و ذَلَّ یَذِلُّ ذِلًّا و ذُلًّا صفت ذَلُوْلٌ ۔ والذلول: الریض ۔ وہ جانور جس کو سدھانا شروع ہی کیا ہو۔ الذی زالت صعوبتہ (روح) ذَلَّتِ الدَّابَّۃُ ذُلًّا: منہ زوری کے بعد سواری کا مطیع ہوجانا۔ ذَلُوْلٌ: یہ صفت فاعلی ہے مطیع و منقاد سواری کو ذلول کہا جاتا ہے۔

تُثِیْرُ ۔ باب افعال کے مصدر اِثَارَۃٌ سے صیغہ واحد مؤنث ہے۔ الاثارۃ کے معنی زمین کو کاشتکاری کے لئے نرم کرنا، ہل کے ذریعے الٹ پلٹ کرنا تاکہ نرم ہو جائے الاثارۃ: قلب الارض للزراعۃ من اَثَرْتُہٗ: اذا ہیّجتہ (روح)

الحرث ۔ حَرْث: کھیتی الحرث: الارض المھیأۃ للزرع ۔ (روح)

مُسَلَّمَۃٌ مُسَلَّمَۃ: ای سلمھا اللہ من العیوب (روح) اللہ نے اسے عیوب سے بچایا ہوا ہے۔ من سَلِمَ یَسْلَمُ سَلَامًا۔ عیب یا آفت سے نجات پانا۔ مُسَلَّمَۃٌ: سالم بے داغ۔

زرد رنگ۔ صفر الثوب: کپڑے کو زرد رنگنا۔
فَاقِعٌ۔ فَقَعَ يَفْقَعُ (ن۔ ف)
رنگ صاف اور نکھرا ہوا ہونا۔ کہا جاتا ہے
فقع لونه اس کا رنگ صاف اور خالص ہو گیا
الفقوع : اشدّ مایکون من الصُّفْرَة
و انصعه (کشاف)
اصفر فاقع اذا کان صادق الصفرة (راغب)
جمع فقاقع۔ مطلب یہ کہ گائے خوش رنگ خوش نما خوش منظر ہے
تَسُرُّ۔ تسرّ سرور سے ہے۔ فرحت
اور خوشی۔ یہ دراصل ایک کیفیت جو کسی نفع
وغیرہ حاصل ہونے یا اس کی توقع پر دل میں
حاصل ہوتی ہے۔ صاحب کشاف فرماتے ہیں
السُّرُورُ لَذَّةٌ فی القلب عند حصول
نفع او توقعه (کشاف)
النّٰظِرِيْنَ۔ ناظرین جمع ہے ناظرٌ کی
نظر ینظر دیکھنا۔ مصدر نظرٌ ہے۔
نظر الیه : اس کی طرف غور سے دیکھا۔
نَظِرَةٌ : مہلت دینا۔ وَاِنْ كَانَ ذُوْ
عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَيْسَرَةٍ (بقرہ ۲۸۰)
تَشٰبَهَ۔ تَشٰبَهَ : الشِبْهُ وَالشَّبْهُ :
مثل، مانند۔ تشابه الرجلان ایک دوسرے
کے مانند و مثل ہونا۔ جمع اَشْبَاهٌ
الشُّبْهُ : مثل، شک۔ جمع شُبُهَات

ذَلُوْلٌ۔ ذَلُوْلٌ: ای لم تذلل للکراب (کشاف)
ہل چلانے اور کنوئیں میں جوتنے کا کام اس سے
نہیں لیا گیا ذَلَّ يَذِلُّ ذُلًّا و ذِلَّةً۔
صفت ذَلِيْلٌ رسوا ہونا۔ خوار ہونا۔ و ذَلَّ
يَذِلُّ ذِلَالٌ و ذُلًّا صفت ذَلُوْلٌ۔
والذلول : الریض۔ وہ جانور جس کو سدھانا
شروع ہی کیا ہو۔ الذی زالت صعوبته
(روح) ذَلَّت الدَّابَّة ذُلًّا : منہ زوری
کے بعد سواری کا مطیع ہو جانا۔ ذَلُوْلٌ :
یہ صفت فاعلی ہے۔ مطیع و منقاد سواری کو
ذَلُول کہا جاتا ہے۔
تُثِيْرُ۔ باب افعال کے مصدر اِثَارَةٌ
سے صیغہ واحد مؤنث ہے۔ الاثارۃ کے
معنی زمین کو کاشتکاری کے لئے نرم کرنا،
ہل کے ذریعے الٹ پلٹ کرنا تاکہ نرم ہو جائے
الاثارۃ : قلب الارض للزراعة من
اَثَرْتُهُ : اذا هيّجته (روح)
الحرث۔ حَرْث: کھیتی الحرث: الارض
المهيأة للزرع۔ (روح)
مُسَلَّمَةٌ مُسَلَّمَة : ای سلمها الله من
العیوب (روح) اللہ نے اسے عیوب سے بچایا ہوا
ہے۔ من سَلِمَ يَسْلَمُ سَلَامًا۔ عیب یا آفت
سے نجات پانا۔ مُسَلَّمَة : سالم بے داغ۔

شِیَةَ ۔ شیہ : داغ دھبہ ۔
لَا شِیَةَ فِیْهَا : لا لمعة فی نقبتها من لونٍ
آخر سوی الصفرة یعنی سوائے صفرۃ
کے اس کے جسم پر کوئی داغ دھبہ نہیں ۔
یہاں تک کہ اس کے سینگ اور پاؤں کے
ناخن زرد ہیں ۔ ، (شِیَةَ) لَا کا اسم ہے
اور فیہا (لَا) کی خبر ہے ۔

فَادّٰرَءْتُمْ ۔ اِدّٰرَءْتُمْ : تم ایک دوسرے
پر الزام دھرنے لگے اِدّٰرَءْتُمْ اِفَّاعَلْتُمْ
کے وزن پر ہے ۔ اس کی اصل تَدَارَءْتُمْ
ہے تا کو دال میں مدغم کرنے کے بعد ابتداء
میں ہمزہ وصل لایا گیا ہے ۔ آپس میں جھگڑنا
ایک دوسرے پر الزام لگانا ۔ اپنے کو بری ثابت
کرنا ۔ ای یبغی کل واحد منکم القتل (کبیر)
دَرْءٌ سے مشتق ہے ۔ اس سے تَدَارَءْتُم
بنا ، اور تَدَارَءْتُم سے ادغام کے قاعدے کے مطابق
اِدّٰرَءْتُمْ ہو گیا ہے ۔ فَادّٰرَءْتُمْ : فاختلفتم
واختصمتم فی شانها لان المتخاصمین
یدرأ بعضهم بعضاً ای یدفعه ویزحمه
او تدافعتم (کشاف ص۱۵۳)

قَسَتْ ۔ قَسَا یَقْسُوْا قَسْوًا وَقَسْوَةً
سخت اور ٹھوس ہونا ۔ جب قساوت دل کی صفت
واقع ہو تو اس سے مراد پتھر دلی اور غلظتِ قلب ہوتی ہے
القسوة فی الاصل الیبس والصلابة
(روح) القسوة : غلظة القلب (راغب)

الْحِجَارَةِ ۔ حجارة : پتھر سنگ الحجر
پتھر ۔ الحجارة جمع ہے ۔ اس کی جمع احجار
اور حِجَارٌ بھی آتی ہے ۔ یہاں حجارۃ کو جمع
قلوب کی جمع کی مناسبت سے لایا گیا ہے اور پھر
اس طرف بھی اشارہ کرنا ہے کہ جس طرح پتھر
صلابت اور سختی میں متفاوت ہیں اسی طرح تمہارے
دل بھی سختی میں متفاوت ہیں ۔ پھر پتھروں کی تین
اقسام تفصیل میں بتائی ہیں ۔ والجمع ، لجمع
القلوب و للاشارة الی انها متفاوتة فی
القسوة کما ان الحجارة متفاوتة فی الصلابة
(روح)

یَتَفَجَّرُ ۔ یَتَفَجَّرُ : فَجْرٌ سے ماخوذ ہے
جس کے معنی ایک چیز کو واضح اور وسیع طور
پر پھاڑ دینا ۔ الفجر : شق الشیٔ شقاً
واسعًا (راغب) تَفَجَّرَ کے معنی بہنا پھوٹنا
فجروار ہونا انفجار کھل جانا ، ہر طرف سے اُمڈنا ۔
التَّفَجُّرُ : التَّفَتُّحُ بالسَّعَةِ وَالْكَثْرَةِ
(کشاف)

الْاَنْهٰرُ ۔ الانهار جمع ہے نہر کی
ہے ۔ دریا ، جہاں کھلا پانی بہنے کا مخصوص
راستہ بنا ہوا ہو ۔ النهر : مجری الماء

الغائض ۔ وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۔
نَهَرَ الدَّمُ : خون زور سے بہہ نکلنا ۔
نهر الماء پانی کا زمین پر بہہ کر اپنے لئے
نہر بنالینا ۔ جمع انہار و اَنْهُر

یَشَّقَّقُ ۔ یَشَّقَّقُ اس کی اصل
یَتَشَقَّقُ ہے ای یَتَدَفَّقُ ۔
شَقَّ یَشُقُّ ۔ پھاڑنا چیرنا ۔ متفرق کرنا ۔
التشقق : التصدّع بطول اوبعرض
(روح)

یَهْبِطُ ۔ یَهْبِطُ ۔ هُبُوط ۔ اوپر سے
نیچے کی طرف گرنا ۔ هَبَطَ مِنَ الجبال
پہاڑ سے اترنا ۔ هابط فاعل ۔ مَهْبَطٌ
ظرف مکان ، اترنے کی جگہ ۔

خَشْيَةِ اللّٰهِ ۔ خشیة ۔ الخشیة مجاز
عن انقیادها لامر الله (کشاف)
یہ خشیۃ پتھروں میں مجازی ہے یا حقیقی ۔
اہل تفسیر نے اس بارے میں دو قول نقل کئے
ہیں ۔ ایک قول یہ ہے کہ خشیت سے مراد
یہاں محض خشیت مجازی یا انقیاد تکوینی ہے
عقل و فہم اور شعور و ادراک سے اس کا کوئی
تعلق نہیں ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خشیت سے
مراد یہاں خشیت حقیقی ہے چونکہ خدا تعالے
نے تمام جمادات بلکہ موجودات ہیں ان کی اپنی
حیثیت کے مطابق فہم و شعور رکھا ہے ۔
فذهب قوم وهو المروی عن مجاهد وغیرہ
انها هنا حقیقة (روح)
ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ میں
اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو قبل از نبوت مجھے سلام
کرتا تھا ۔

بِغَافِلٍ ۔ غَافِلٌ : غَفَلَ یَغْفُلُ غُفُولًا
وغَفْلَةً ۔ بھولنا ۔ چھوڑنا ۔ اغفال : بے
اعتنائی سے چھوڑدینا ۔ تغافل : دانستہ غفلت
اختیار کرنا ۔ الغفلة سهو یعتری الانسان
مِن قلّةِ التحفظ والتیقظ (راغب)
مطلب یہ ہے کہ تمہارے اعمال خدا کے علم و خبر
سے باہر نہیں ہیں ۔

تَطْمَعُونَ ۔ طَمِعَ یَطْمَعُ (ک) طَمَاعَةً
وطَمَعًا وطَمَاعِيَةً صفت طَمِعٌ و طامِعٌ ۔ حرص کرنا ، لالچ
کرنا ۔ خواہش مند ہونا ۔ نفس کا کسی چیز کی طرف
مائل ہونا ۔ مَطْمَعٌ : جس چیز کی طرف طمع کی جائے
الطمع : نزوع النفس الی الشئ شهوة (مفردات)

کَلِمٌ ۔ کَلِمَ الله : الله کی گفتگو ۔
کَلِم : وہ بامعنی لفظ جو آدمی منہ سے نکالے کَلِمَة
کی جمع کَلِمَات اور کَلِمَة کی کَلِمٌ اور
کَلِمَةٌ کی جمع کَلِمٌ ہے ۔ کَلْمٌ : زخمی کرنا
تکلیم : بات چیت کرنا ۔ کَلْمٌ بسکون اللام

اور کَلَمٌ بفتح اللّام دونوں میں فرق ہے کَلْمٌ بالسکون زخم۔ جرحہ کو کہا جاتا ہے اس کی جمع کُلُوم اور کِلام آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کَلَمَہ ای جَرَحَہ۔ اس کا مصدر اَلْکَلْم ہے۔ صفت کَلِیْمٌ ہے بمعنی مجروح۔ و مَکْلُومٌ

کَلِمَۃٌ: بکسر اللّام ماینطق بہ الانسان مفردًا کان او مرکبًا۔ اس کی جمع کَلِمٌ اور کَلِمَاتٌ ہے۔ عام اہل علم کے نزدیک کلام کا اطلاق اُن الفاظِ منظومہ مرکبہ پر ہوتا ہے جو معانی اور مفاہیم کو ظاہر کریں۔ اور نحاۃ کے نزدیک اس کا اطلاق اسم فعل اور حرف پر بھی ہوتا ہے۔ کلام کا ادراک حرف قوتِ سمع سے اور کَلْمٌ..... کا ادراک قوۃِ باصرہ سے۔ چونکہ زخم محسوس ہے اور کلام غیر محسوس ہے۔

الکلام مُدْرَکٌ بحاسّۃ السّمع والکلم بحاسّۃ البصر (راغب)

یُحَرِّفُوْنَ - یہ حَرْفٌ سے مشتق ہے حَرَّف الشیٔ من وجہہ کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے صحیح رُخ سے موڑ کر دوسری سمت کر دینا۔ اسی سے حَرَّفَ القَوْلَ و حَرَّفَ الکَلَامَ جس کے معنی بات یا کلام کے بدل دینے کے ہیں۔ یہ تبدیلی معنوں میں بھی ہو سکتی ہے اور الفاظ میں بھی اور تاویلاتِ باطلہ کی صورت میں بھی۔ اہل کتاب سب صورتوں کے مرتکب تھے۔

حَرَفَ عنہ یَحْرِفُ حَرْفًا: مائل ہونا، منہ موڑ لینا۔ وحَرَفَ لِعِیَالِہٖ: اپنے اہل و عیال کے اِدھر اُدھر سے کما کر لانا۔ حَرْفٌ: کسی چیز کا کنارہ سرا یا حد وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ۔ لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں کہ خدا کی عبادت کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ یعنی احکامِ خداوندی میں فائدہ نظر آیا تو کر لیا ورنہ انکار کر دیا۔

عَقَلُوْہُ - عَقَلُوْہُ: عقل سے ماخوذ ہے۔ عَقَلَ یَعْقِلُ روکنا، باندھنا، باز رکھنا عقل ایک روحانی نور ہے جو غیر محسوسات کا ادراک کرتی ہے۔ اور وہ ایک غیبی جوہر ہے جو صاحبِ عقل کو مہالک میں پڑنے سے روکتا اور منافع کی راہنمائی کرتا ہے۔ نورٌ روحانی بہ تُدْرِکُ النفسُ مالا تدرکہ بالحواس وقد سُمّی العقلُ عقلًا لانہ یعقل صاحبہ عن التورّط فی المھالک (منجد)

اَلْعَقِیْلَۃُ: شریف اور پردہ دار عورت۔

تُحَدِّثُوْنَهُمْ ۔ تُحَدِّثُوْنَ : حَدَّثَ يُحَدِّثُ
تَحْدِيْثًا ۔ روایت کرنا ۔ حدیث کی روایت
جمع احادیث ۔ الحدیث : کثیر الحدیث
(منجد) حَدَثَ الاَمْرُ : وَقَعَ یعنی کوئی نیا
واقعہ پیش آگیا ۔ الحدث جمع احداث ۔
اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ کے معنی ہیں ۔ کیا تم ان کو بتا
دیتے ہو ۔

فَتَحَ ۔ فتح : فَتَحَ يَفْتَحُ فَتْحًا
صفت فاتح اسم مفعول مفتوح ۔
الفتح کے معنی ہیں اغلاق اور اشکال کا دور کرنا ۔
واضح کرنا ۔ حقائق کھولنا ۔ راز بتانا ۔
الفتح : ازالۃ الاغلاق والاشکال و
ذلک ضربان احدھما یدرک بالبصر
کفتح الباب والثانی یدرک بالبصیرۃ
کفتح الھم وھو ازالۃ الغم ۔ یعنی
فتح کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک ظاہری یعنی دروازہ یا
تالا وغیرہ کھولنا ۔ ان کا اثر ظاہرًا دکھتا ہے ۔
اسی کو امام راغب نے یُدرک بالبصر
فرمایا ہے ۔ اور دوسری فتح کی وہ قسم ہے
جس کا تعلق باطن سے ہے جیسا کہ رنج و غم کا
ازالہ کرنا ۔ ظاہر ہے کہ اس کا ادراک بصیرۃ ہی
سے ہوگا ۔ بصارۃ ، امور مخفیہ کا ادراک کرنے
سے قاصر ہے ۔ اسی سے افتتاح ہے ۔ ابتدا کرنا ۔
شروع کرنا ۔ فتح علیہ : خبردار کرنا ، لقمہ
دینا ۔ الفتح : اسرار و معارف جو خدا کی طرف
سے دل پر وارد ہوں ۔

لِيُحَآجُّوْكُمْ ۔ لِيُحَاجُّوا : محاجًا ۔
آپس میں جھگڑنا ۔ ایک دوسرے کی دلیل
کو رد کرنے کی کوشش کرنا ۔ والمحاجّۃ :
ان یطلب کل واحد ان یرد الآخر
عن حجتہ (راغب) لیکن محاجہ مراد نہیں ہے
صیغہ محاجہ مبالغہ کے لئے لایا گیا ہے ۔
والمفاعلۃ ھنا غیر مرادۃ والمراد لیحتجوا
بہ علیکم ۔ (روح)

يَرْغَبُ ۔ رَغِبَ يَرْغَبُ رَغْبًا وَرَغْبَۃً
چاہنا ۔ خواہش کرنا ۔ محبت کرنا یا اعراض
اور رُخ گردانی کرنا ۔ اگر رَغِبَ کا صلہ فی یا
اِلٰی آئے تو معنی محبت کرنے اور کسی کی طرف
مائل ہونے کے ہیں ۔ مثلاً رَغِبَ فِيْهِ چاہنا
خواہش کرنا اور رَغِبَ عَنْهُ : اس کی طرف سے
منہ پھیر لیا ۔ اس کو ناپسند کیا ۔ چھوڑ دیا ۔
فاذا قیل رغب فیہ والیہ یقتضی الحرص
علیہ ۔ قال تعالیٰ : اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ ۔
واذا قیل رغب عنہ یقتضی صرف الرغبۃ
عنہ والزھد فیہ ۔ (راغب)
مطلب یہ ہے کہ رَغِبَ کا صلہ جب اِلٰی یا فیہ

آئے تو اس کے معنی کسی چیز کو پسند کرنے اور چاہنے کے ہوتے ہیں۔ اور اگر اس کا صلہ عن آئے تو پھر معنی بے رغبت اور بیزار ہونے کے ہوتے ہیں

سَفِهَ ۔ سَفِهَ یَسْفَهُ سَفَهًا وسَفَاهَةً۔ جہالت۔ احمق بنا بداخلاق۔ السَّفَهُ : خفّة فی البدن۔ سَفِهَ زیادہ تر لازم آتا ہے، لیکن کبھی متعدی بھی آتا ہے مثلاً یہاں سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی ہوں گے اس نے اپنا نصیبہ بگاڑ لیا۔ سَفِهَ رَاْیَهٗ اس نے غلط رائے قائم کی۔ تو سَفِهَ نَفْسَهٗ متعدی کے معنی یوں ہوں گے کہ اس نے اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کیا۔

قرآن پاک نے سفاہت کا لفظ دنیا اور آخرت دونوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ سفاہت دنیوی کے بارے میں ارشاد ہے : وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ اور سفاہتِ اخروی کے متعلق وَ اَنَّهٗ كَانَ یَقُوْلُ سَفِیْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا۔ صفت سَفِیْهٌ جمع سُفَهَاء۔

نَفْسَهٗ ۔ نَفْسَهٗ ۔ نَفْسٌ : کے عربی کلام میں کئی معنی آتے ہیں۔ مثلاً عظمت، ہمت عزت، ارادہ، رائے، عیب، روح، نفس

نفس سے مراد اگر روح ہو تو مؤنث ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ خَرَجَتْ نَفْسُهٗ اور شخص مراد لیں تو مذکر ہوتا ہے جیسا کہ خَمْسَةَ عَشَرَ نَفْسًا۔ نَفِسَ (س) نَفْسًا و نَفَاسَةً بخل۔ کہا جاتا ہے۔ نفس بالشیٔ بخل کیا۔ نَفِسَ عَلٰی فُلَان حسد کرنا۔ نَفِسَتِ الْمَرْاَةُ عورت کا بچہ جننا۔ صفت منفوس۔ نَفُسَ (ک) مصدر نَفَاسَةً و نُفُوْسًا پسندیدہ ہونا۔

نَفَّسَ (تفعیل) مصدر تنفیس۔ دفع مشکلات یقال نفّس عنه الکربة۔ غم کو دور کر دیا۔ مہلت دینا نَافَسَ مصدر مُنَافَسَةً۔ باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا۔ مقابلہ کرنا۔ اگر نفس کی نسبت حق تعالیٰ کی جانب ہو تو اس سے مراد خود ذات ہوتی ہے وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ۔ فنفسه ذاته (راغب)

اصْطَفَیْنٰهُ ۔ اصْطَفَیْنٰهُ : صَفَا یَصْفُو صَفْوًا۔ صاف کرنا۔ محبت میں خلوص۔ الصَّفْوَةُ : مخلص دوست۔ اَصْفَاهُ بکذا: ای اختصّه وارضاہ به جمع اصفیاء۔ المصطفیٰ : پسندیدہ، برگزیدہ۔ چنا ہوا۔ الصَّفْوَانُ : چکنی چٹان۔ صفوان صفا کی طرح ہے۔ اس کی واحد صفوانۃ ہے

الصّفوانُ كالصّفا الواحدة صَفْوَانَة
(راغب) وقال ابن كثير صفوان جمع
صفوانة۔ فمنهم من يقول الصفوان
يستعمل مفردًا ايضًا وهو الصفا وهو
الصخر الاملس (ابن کثیر)

وَصّٰى ۔ وَصّٰى۔ وصیۃ کا لفظ ایک
وسیع مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہر حکم اور
ہدایت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ وَصَّيْتُهٗ
بکذا کے معنی ہیں میں نے اس کو حکم دیا۔ میں
نے اس کو یہ کرنے کو کہا۔ مطلب یہ ہوا کہ حضرت
ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو حکم دیا کہ تم مرتے دم
تک مسلمان اور خدا کے مطیع رہو گے۔
تَوصِيَة کے معنی تعلیم و تلقین کرنے کے ہیں
عام اس سے کہ یہ تعلیم و تلقین کوئی شخص اپنی وفات
کے وقت کرے یا زندگی کے کسی دوسرے مرحلہ
میں الوصیۃ واحد، جمع وصایا ہے۔
الایصاء : وصیت کرنا۔
الوَصِيَّةُ : التقدم الى الغير بما يعمل
به مقترنًا بوعظٍ (راغب)
وصیت مرنے والوں کی ہدایت تک محدود
نہیں ہے۔ تواصو القوم : ایک دوسرے
کو وصیت کرنا۔ ارضٌ وَاصِيَةٌ : باہم گھتے
ہوئے گھاس والی زمین۔

الدِّيْنَ ۔ الدین : اطاعت۔
یوم حساب۔ مکافاۃ۔ غلبہ۔ حکم۔ مذہب
الدین یقال للطاعۃ و الجزاء۔
یہاں دین سے مراد دینِ الٰہی ہے جو شروع
سے خدا کا دین ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ
حقیقی دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔
دین دراصل اس ملّت اور قانون کا نام ہے
جس میں انقیاد و تسلیم پوری طرح موجود ہو۔
الدین کالملۃ لکنہ یقال اعتبارًا بالطاعۃ
والانقیاد للشریعۃ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا
مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ
ای طاعۃً (راغب)
دَانَ يَدِيْنُ دِيْنًا۔ دین کا اختیار کرنا۔
منہ قولہ تعالٰی وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ۔
دَانَ يَدِيْنُ دَيْنًا بفتح الدال :
قرض دینا۔ صفت فاعلی دائن۔ مفعول مدیون
دَانَ الرجل۔ قرض لینا۔

شُهَدَآءَ شہداء جمع شہید،
بمعنی الحاضر (کشاف) اَمْ كُنْتُمْ
شُهَدَآءَ میں اَمْ منقطع ہے۔ استفہام
انکاری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم وہاں حاضر
نہیں تھے۔ شَهِدَ يَشْهَدُ شُهُوْدًا۔
مجلس میں حاضر ہونا۔ شَهِدَ الشیٔ

کسی چیز کو دیکھنا ۔ معائنہ کرنا ۔ اطلاع پانا ۔ شَهِدَ علیٰ کذا ۔ گواہی دینا ۔ صفت شاہد ۔ مفعول مشہود ۔ اس کی جمع شہود اور شُهَدَآءُ آتی ہے ۔

الشھید : جس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو ۔ المشاھدۃ : معائنہ کرنا ۔ دیکھنا ۔ اَشْهَدَهٗ : گواہ بنانا ۔ استشھدہ : کسی کو گواہ بننے کے لئے کہنا ۔ الشھود والشھادۃ الحضور مع المشاھدۃ اِمّا بالبصر او بالبصیرۃ ۔ (راغب)

مِلَّۃ ۔ ملّۃ : اس دین اور قانون کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے انبیاء اور رسولوں کے ذریعہ نازل کیا ۔ تاکہ اس قانون پر عمل کے سبب انسان خدا کو پاسکیں ۔ دین اور ملّت ان دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ ملّت کی اضافت ہمیشہ انبیاء کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ ملّۃ ابراھیم وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيْ ۔

ملت کی اضافت افراد امت کی طرف بھی نہیں کی جاسکتی ۔ مثلاً ملّۃ زید یا ملّتی وغیرہ نہیں بولا جاتا ۔ اسی طرح ملّت کی اضافت اسم باری کی طرف بھی نہیں ہوتی ۔ مثلاً ملّۃ اللہ نہیں کہا جائے گا ۔ بخلاف دین کہ دین کی اضافت افرادِ امت کی طرف بھی ہوتی ہے اور جناب باری کی طرف بھی ۔

قرآن پاک میں ہے يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اسی طرح لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۔

ملت کی اصل املاء ہے ۔ کہا جاتا ہے اَمْلَلْتُ الکتابَ اِملاءً ۔

قال تعالیٰ : فَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ ۔ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ ۔

واصل الملۃ من امللتُ الکتاب (راغب)

علامہ ابن منظور لکھتے ہیں :

الملّۃ الشریعۃ والدّین ۔ وفی الحدیث لایتوارث اھل الملّتین ۔ (لسان)

حَنِيْفًا ۔ حنیف ۔ حنیفاً : مستقیماً و مائلاً الی الحق ۔ حَنَفَ يَحْنِفُ : جھکنا ۔ مائل ہونا ۔ باطل سے ہٹ کر حق کو اپنانا ۔ حق کی طرف مائل ہونا ۔ حَنَفَ اور تَحَنَّفَ دونوں کے معنی ہیں دینِ ابراہیم کو اختیار کرنا ۔ حنیف وہ شخص ہے جو ہر طرف سے کٹ کر پوری طرح خدا کا ہو رہے ۔

الحنیف : المائل عن کل دین باطل الیٰ دین الحق (کشاف)

حَنَفٌ یہ جَنَفٌ کے متضاد ہے حَنَفٌ ضلالت کو ترک کر کے ہدایت و استقامت کو

اختیار کرنا اور جَنَفٌ ہدایت کو ترک کر کے گمراہی کو اپنا توشۂ حیات بنالینا۔ الحنف ھو میل عن الضلالۃ الی الاستقامۃ، والجنف میلٌ عن الاستقامۃ الی الضلالۃ (راغب) حنیف واحد جمع حنفاء۔

قرآن پاک میں لفظ حنیفاً دس جگہ استعمال ہوا ہے اور دو جگہ حنفاء جمع کے ساتھ آیا ہے۔

اَسْبَاط ۔ یہ سبط کی جمع ہے۔ لغوی معنی بڑھنے اور پھیلنے کے ہیں۔ اس سے مراد نسلِ یعقوب کی مختلف شاخیں ہیں۔ قال الزمخشری الاسباط حفدۃ یعقوب ذراری ابناءہ الاثنی عشر (کشاف) والاسباط قبائل کل قبیلۃ من نسل رجل (راغب)۔

لفظ سبط عام طور پر نواسوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ حفدۃ پوتوں کیلئے بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ صرف اولادِ یعقوب کے لئے بولا گیا ہے۔ لفظ اسباط قرآن میں پانچ مقامات پر آیا ہے۔ ہر جگہ قبائل اسرائیل یعنی اولادِ یعقوب مراد ہے۔

شِقَاق ۔ شَقَّ یَشُقُّ شَقًّا۔ پھاڑنا۔ متفرق کرنا۔ کہا جاتا ہے شقّ عصا القوم: قوم کی جمعیت کو منتشر کر دیا۔ الشِّقَّۃُ: القِطْعَۃ۔ اَلْمُنْشَقَّۃُ کالنصف الشُّقَّۃُ والشاق المخالفۃ (راغب)

شقیق: دو حصوں میں پھٹی ہوئی چیز کا ایک حصہ۔ سگا بھائی، شقیقۃ۔ سگی بہن۔ مشقّۃ: دشواری۔ مشکل۔ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں کہ شقاق: شَاقَّہٗ کا مصدر ہے۔ جس طرح ضَارَبَ ضِرَابًا اور خَالَفَ خِلَافًا اور اس کے معنی عداوت رکھنے اور مخالفت کرنے کے آتے ہیں۔ اس کی اصل شَقٌّ یعنی یہ ایک شق میں ہوا اور وہ ایک شق میں۔ شق طرف کو کہتے ہیں (البحر المحیط)

سَیَکْفِیْکَ ۔ سین حرف استقبال ہے جو مستقبل قریب کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا جو وعدہ آپ سے کر رہا ہے یہ ہو کر رہے گا اور یہودیوں کی سخت گرفت ہوگی۔ ومعنی السین انّ ذٰلک کائن لامحالۃ۔

کَفٰی یَکْفِی کِفَایَۃً: کافی ہونا۔ صفت کافٍ آتی ہے۔ کَفٰی فُلَانًا: کسی چیز پر قناعت کرنا۔ اور دوسری چیز سے بے نیاز کر دینا اور خود مقابلہ میں آجانا۔ کفیتہٗ شَرَّ عَدُوِّہٖ: میں نے اس کو اس کے دشمن کے شر سے بچالیا۔ کفٰی کے فاعل پر عموماً حرف با زائد آتا ہے۔ جیسا کہ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا۔ اصل میں کَفَی اللّٰہُ شَہِیْدًا ہے۔ شَہِیْدًا تمیز ہے۔ الکفایۃ: ما فیہ سَدُّ الخَلَّۃِ وبُلُوغ المُرَادِ فی الاَمرِ (راغب)

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ : اب اللہ آپ کی طرف ان کے مقابلہ میں ہے ۔ یہ ایک وعدہ تھا، جو بنو قریظہ کے قتل اور بنو نضیر کی جلاوطنی کی صورت میں پورا ہوا ۔

صِبْغَة ۔ صبغۃ اللہ : اللہ کا رنگ صَبَغَ يَصْبِغُ (ن ض) رنگنا ۔ يقال صَبَغَ الثَّوْبَ کپڑے کو رنگنا ۔ صِبْغًا و صَبْغًا مصدر ہیں ۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ میں صبغۃ منصوب ہے فعل محذوف سے ۔ اصل یوں ہے صَبَغَنَا اللّٰهُ صِبْغَةً ۔ (بیضاوی ۔ ابو سعود ۔ کشاف)

مُخْلِصُوْنَ ۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ہم تو اس ہی کے لئے مخلص ہیں ۔ خَلَصَ يَخْلُصُ خُلُوْصًا وخلاصًا خالص ہونا ۔ خَلَصَ الْمَاءُ مِنَ الْكَدَرِ ۔ پانی کدورت سے پاک ہو گیا ۔ مُخْلِصُوْنَ اخلاص سے ہے ۔ باب افعال سے اسم فاعل جمع بحالت رفعی ۔ اخلاص المسلمين انهم قد تَبَرَّءُوْا مِمَّا يَدَّعِيْهِ الْيَهُوْدُ مِنَ التَّشْبِيْهِ وَالنَّصَارٰى مِنَ التَّثْلِيْثِ ۔ (راغب)

اَلْقِبْلَة ۔ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمْ ان کو کس چیز نے ان کے قبلہ سے ہٹا دیا ۔ قبلہ : وہ مکان جس کے مقابل رُخ کر کے نماز پڑھی جائے ۔ صار اسماً للمكان المقابل المتوجه اليه للصلٰوة (راغب)

وَسَطًا ۔ اُمَّةً وَّسَطًا : ایسی امت جو ہر اعتبار سے اور ہر معیار سے غایت اعتدال پر ہو، کج روی اور افراط و تفریط سے بالکل الگ ہو ۔ لفظ وسط عربی زبان میں وسیع مفہوم کو واضح کرتا ہے ۔ اما الوَسَط فانه فی کلام العرب الخيار (ماجدی از ابن جریر) اسی طرح اس کا استعمال عادات محمودہ کیلئے بھی ہوتا ہے استعير للخصال الحميدة بوقوعها بين طرفی افراط و تفريط (ماجدی از بیضاوی) حافظ ابن کثیر نے وسط کی تفسیر عدل سے بھی نقل کی ہے ۔ ابو سعید خدری کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وسط کی تفسیر عدل کی ہے ۔ وسط الشیٔ ما له طرفان متساويا القدر ۔ (راغب)

وسط کی پوری تشریح معارف القرآن (مولفہ مفتی اعظم پاکستان) میں ملاحظہ فرمائی جائے ۔ حضرت نے اس مقام پر نہایت علمی کلام فرمایا ہے ۔

جَعَلْنَا ۔ جَعَلَ کی تحقیق گزر چکی ہے ۔ یہ کَانَ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ اس کے ایک معنی جائز اور مشروع کرنے کے ہیں ۔ مثلاً مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ ۔ خدا نے بحیرہ اور سائبہ کو مشروع یعنی

جائز قرار نہیں دیا۔

لِنَعْلَمَ ۔ عَلِمَ یَعْلَمُ کے معنی جس طرح جان لینے اور معین کر دینے کے آتے ہیں۔ کسی چیز کو کما حقہ جاننا پہچاننا، حقیقت کا ادراک کرنا۔ یقین حاصل کرنا۔ عَالِمٌ: اسم فاعل علم میں درک رکھنے والا۔ جمع عَالِمُوْن ۔

اسی طرح اس کے ایک معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے ممیز اور الگ کر دینے کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۔ اور ہم تم کو آزمائیں گے یہاں تک کہ ظاہر کر دیں تمہارے اندر سے اُن لوگوں کو جو جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بیت المقدس کی جانب رُخ کرنے کی اجازت وقتی اور عارضی تھی اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ لوگوں پر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ کتنے آدمی ہیں جو فی الواقع رسول کے تابع اور کتنے ہیں جو اپنی آبائی روایات کے پرستار ہیں۔ اور پھر مُڑ کر اپنے آبائی دین کو اختیار کر لیتے ہیں۔

يَنْقَلِبُ ۔ قَلْبٌ ۔ یہ قَلَبَ يَقْلِبُ سے ماخوذ ہے۔ ایک حالت سے دوسری حالت کی جانب پلٹنا۔ قَلَبَ الشَّيْءَ اوپر کے حصے کو نیچے کی جانب کر دینا۔ اسی سے انقلاب ہے جس کے معنی لوٹنے اور پھرنے کے ہیں۔ الانقلاب : الانصراف (راغب)

عَقِبَيْهِ ۔ عَقَبَ يَعْقِبُ عَقْبًا ۔ ایڑی مارنا۔ العَقِبُ والعَقْبُ ۔ پاؤں کا پچھلا حصہ، ایڑی۔ عَقَبَهٗ : کسی کو پیچھے کر دینا۔ تعاقب : ایک دوسرے کا پیچھا کرنا، تعاقب کرنا۔ العُقْبُ والعُقُبُ : انجام، نتیجہ (جمع اعقاب)

يُضِيْعَ ۔ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ : ضَاعَ يَضِيْعُ ۔ ضائع ہونا۔ تلف ہونا (ض) اَضَاعَ يُضِيْعُ اِضَاعَةً : ضائع کرنا، ہلاک کرنا، تلف کرنا۔ معنی متعدی ہیں۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ : ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو ضائع کر دیں۔

اِيْمَانَكُمْ ۔ ایمان امن سے ہے۔ اس کی تحقیق گزر چکی ہے۔ یہاں صرف مراد کو ذکر کرنا ہے۔ ایمان سے مراد باتفاق مفسرین صلوٰۃ یعنی نماز ہے۔ لفظ صلوٰۃ کو چھوڑ کر ایمان کو اس کے لئے اختیار کیا گیا کہ ایمان کا لفظ جامع ہے۔ قول نیت اور عمل کا۔ جس سے واضح ہو گیا کہ جس نیت کے ساتھ شریعت کے مطابق کوئی عمل بھی کیا گیا ہو، وہ ضائع نہیں ہوتا۔ فسمّی الصلاة ایمانا لاشتمالها علی نيّة وقولٍ وفعلٍ ۔ (قرطبی)

لَرَءُوْفٌ ۔ رَءُوْفٌ : رَأَفَ يَرْؤُفُ رَوْفًا، (سکون) اور رَأَفَ يَرْأَفُ رَأْفَةً ۔ مہربانی، رحمت، شفقت۔ الرَّأْفَةُ : الرحمة ۔ (راغب)

رافت اور رحمت معنیٰ دونوں قریب قریب ہیں۔ البتہ رافۃٌ میں رحمت کا غلبہ زیادہ ہے۔

الرَّأفۃ : اشدّ من الرحمۃ (قرطبی)

وَجْہٌ ۔ وَجْھَكَ : وَجْہٌ۔ وَجُہَ یَوْجُہُ وَجَاھَۃً (ک) ذی وجاہت ہونا تواجُہ۔ ایک دوسرے کے سامنے آنا۔ وَجْہٌ چہرہ۔ منہ۔ ہر چیز کا ابتدائی اور شروع کا حصّہ۔ وجہ الدھر : زمانہ کا شروع۔ چونکہ چہرہ انسان کا اشرف حصّہ ہونے کے علاوہ ابتدائی اور شروع کا حصّہ بھی ہے اسلئے انسانی چہرہ کو وجہ کہا گیا ہے۔ اس کی جمع وُجُوۃٌ اور اَوْجہٌ آتی ہے۔ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ۔

الوجہ : اول ما یستقبلك واشرف ما فی ظاھر البدن۔ (راغب)

الوجہ : نوع۔ قسم۔ سبب۔ دلیل۔ کہا جاتا ہے لَیْسَ لِکَلَامِكَ وَجْہٌ تمہارے کلام کی کوئی وجہ صحت نہیں۔ لھٰذا القول وَجْہٌ۔ اس بات کی دلیل ہے۔

الوِجْہ وَالوُجُوۃُ : سمت۔ طرف۔ جانب۔ الوِجْھَۃُ وَالوُجْھَۃُ وہ جانب جس کی طرف توجہ ہو۔ جمع جہات۔

شَطْر ۔ شَطَرَ یَشْطُرُ شَطْرًا ، شطر الشیءَ کسی چیز کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دینا۔ اس کی جمع اَشْطُر اور شُطُور آتی ہے

شطر الشیٔ : نصفہ۔ ومنہ الحدیث: الطھور شطر الایمان (قرطبی)

وشَطُرَ یَشْطُرُ شَطَارَۃً : شوخ ہونا۔ بےباک ہونا۔ چالاک اور کج رَو ہونا۔ یہاں شطر سے مراد مسجدِ حرام کی سمت ہے۔

وَلِکُلٍّ ۔ کُلٌّ : یہ ایسا اسم ہے متعدّد افراد کا احاطہ کرنے کے لئے یا واحد کے اجزاء کو عام کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ یہ اضافت کے بغیر مستعمل نہیں ہوتا خواہ لفظاً ہو یا تقدیراً بہرحال یہ مضاف ہوگا جب اس پر ما مصدریہ ظرفیہ داخل کر دیا جائے تو اس میں تکرار کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں جیسا کہ کلّما اتاك زید اکرمْہ جب بھی زید تیرے پاس آئے تو اس کی عزّت کرنا۔ اور یہ اسم کُل نکرہ اور معرفہ دونوں کی صفت کے طور پر بھی مستعمل ہوتا ہے۔ اس موقع پر وہ موصوف کی صفت کی انتہائی حد کو بیان کرتا ہے۔ جیسے کہ ھو العالم کلّ العالم یعنی وہ عالم علم کی انتہائی حد کو پہنچا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ معرفہ و نکرہ محدودہ کی تعریف کے لئے بھی آتا ہے جیسے سَجَدَ الْمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّھُمْ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ کل کا لفظ مفرد اور مذکر ہے۔ اس کا

مفہوم مضاف الیہ کے اعتبار سے ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اگر نکرہ کی طرف مضاف ہوگا تو اس کے معنی کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا اور اس کے بعد ضمیر مذکر مفرد آئے گی جیسے کُلّ شئ فعلوہ بحکمۃ۔ انھوں نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ کیا۔ غرضیکہ اس کے معنی کا تعین مضاف الیہ کے لحاظ سے ہوگا۔

لفظ کُل اگرچہ لفظاً نکرہ ہے لیکن عموماً اس سے مراد وہ خاص گروہ یا اشخاص ہوتے ہیں جن کا ذکر اس سے قبل ہوچکا ہوتا ہے مثلاً:
وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا۔
اسی طرح وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ۔ چنانچہ یہاں بھی کُل سے مراد وہ گروہ اور قبائل ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے۔ یعنی اہل کتاب یہود اور نصارٰی۔
مطلب یہ ہے کہ ان سب کا اپنا اپنا ایک قبلہ ہے جس کا یہ رُخ کرتے ہیں۔ یہ تیجھر مزاج اس کو کہاں چھوڑتے ہیں۔

جَمِيْعًا

جمیع: جَمْعٌ اور جماعۃ لوگوں کا اکٹھ۔ انبوہ۔ یقال للجموع جمع وجمیع وجماعۃ (راغب)
الجمیع: لوگوں کی جماعت۔ جمع کی ہوئی شئ۔
جَمَعَ يَجْمَعُ جَمْعًا۔ جمع کرنا۔ اکٹھا کرنا (منجد)
الجمع ضمّ الشئ بتقریب بعضہ من بعض (راغب)

حُجَّةٌ

مُحَجَّةٌ: دلیل۔ مخاصمہ۔
حَجَّهٗ: دلیل میں غالب آجانا۔ اِحْتَجَّ: اپنے دعوی پر دلیل قائم کرنا۔ اِسْتَحَجَّ: دلیل طلب کرنا۔

فَاذْكُرُوْنِيْ

ذَكَرَ يَذْكُرُ ذِكْرًا: ذَكَرَ اللّٰهَ۔ حَفِظَهٗ وَمَجَّدَهٗ وَسَبَّحَهٗ۔
ذِكْرٰى وتَذْكَار وَتَذْكِرَة۔ بیان کرنا۔ ذہن میں محفوظ کرنا۔ یاد کرنا۔ مُذَاكَرہ اور تَذَاكُر کے معنی ہیں باہم گفت گو کرنا۔ اِذکار اور تذکیر کے معنی ہیں یاد کرانا۔ فیہ ذِكْرُكُمْ ای بیانکم اور مذکور کے معنی موجود کے بھی آتے ہیں۔
لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ای موجودًا۔

وَاشْكُرُوْا لِيْ

شَكَرَ يَشْكُرُ شُكْرًا وشُكُورًا۔ کسی احسان اور بھلائی پر تعریف کرنا، شکریہ ادا کرنا۔ شَكَرَ اللّٰهُ سَعْيَكَ۔ اللہ تم کو تمہاری کوششوں کا بدلہ دے۔
الشکر تصوّر النعمۃ واظہارھا (راغب)
شکر الرجل ولہ: کسی احسان اور بھلائی پر تعریف کرنا۔ صفت فاعلی شَاكِرٌ۔ جمع شاکرون۔
شکر کی ضد کفر ہے جس کے معنی نعمت کو بھلا دینے اور اس کو چھپا رکھنے کے ہیں۔

الْجُوْعِ ۔ الجوعُ یعنی المجاعة بالجدب والقحط فی قول ابن عباس ۔ وقال الشافعی : ھو الجوع فی شھر رمضان ۔ (قرطبی) والجوع : صیام شھر رمضان (کشاف) ۔ آیت میں احتمال دونوں ہی ہیں بھوک ۔ تنگدستی اور قحط سالی بھی مراد ہو سکتی ہے ۔ جیساکہ اکثر اہل علم کا رجحان اسی طرف ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مراد ماہ رمضان کے روزے ہوں ۔

الجُوعُ : الالم الذی ینال الحیوان من خُلوّ المعدة من الطعام ۔

صفت جائع ۔ جَوعان : شدید بھوک (مفردات)

الْخَوْفِ ۔ الخوف : کسی ناپسندیدہ حادثہ کا خطرہ ہونا ۔ ڈر ۔

الخوف : توقع مکروہ (راغب)

خَافَ یَخَافُ خَوْفًا وخیفًا ۔ ڈرنا ۔ خوفزدہ ہونا ۔ گھبرانا ۔ محتاط ہونا ۔ صفت خائف جمع خُوَّفٌ وخُیَّفٌ ۔ تخویف : ڈرانا ۔ خِیفَة : وہ حالت جو ڈر کے وقت انسان پر طاری ہوتی ہے ۔

نَقْصٍ ۔ نَقَصَ یَنْقُصُ نَقْصًا و نُقْصَانًا ۔ حق کم کرنا ۔ حق تلفی کرنا ۔

النَّقْصُ : الخسران فی الحظ ۔ (راغب)

اَمْوَال ۔ مال کی جمع ہے ۔ اہل بادیہ کے نزدیک مال کا اطلاق اکثر بالتو حیوانات وغیرہ پر ہوتا ہے ۔ یہ مَالَ یَمُوْلُ مَوْلًا سے ماخوذ ہے ۔ مالدار ہونا ۔ تموّل ۔ مالداری ماله یمولہ مَولًا و اَمَالَهٗ ۔ مالدار بنانا (منجد)

الْاَنْفُسِ ۔ اَنْفُسٌ یہ نفس کی جمع ہے تحقیق گزرچکی ہے ۔

الصَّفَا ۔ اس کے لفظی معنی لغت کے اعتبار سے صاف پتھر اور خالص چٹان کے ہیں ۔ الصّفا : الحجارۃ الصافیة ۔ (راغب) وقال المبرد ھو کل حجر لایخالطه غیره من طین وتراب ۔ (ماجدی)

صفا : اس پہاڑی کا نام ہے جو مکہ شریف میں مسجد حرام کے پاس ہے ۔ ایام حج میں سعی کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے ۔ سعی گاہ کے ہر دو جانب دو پہاڑیاں ہیں ایک کو صفا اور دوسری کو مروہ کہا جاتا ہے ۔ اور صَفَا : صَفَاةٌ کی جمع ہے سخت اور ہموار چٹان ۔

الْمَرْوَةَ ۔ اس کے معنی بھی سفید اور نرم پتھر کے ہیں ۔ صفا اور مروہ یہ دونوں دو پہاڑیاں ہیں جو بیت اللہ کے قریب ہی ہیں ۔ اصل الصفا فی اللغة : الحجر الاملس وھو ھنا جبل بمکة والمروۃ جبل ایضًا (قرطبی)

شَعَآئِر - شَعَائِر: یہ شعیرۃ کی جمع ہے۔ جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس اور شعور دلانے والی ہو اصطلاح دین میں مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لئے بطور ایک علامت اور نشان کے مقرر کئے گئے ہوں۔ مناسکِ حج کو بھی شعائر اللہ کہا گیا ہے۔

الشعائر المتعبدات التی اَشْعَرَهَا اللہ تعالیٰ ای جعلها اعلاماً للناس من الموقف والسعی والنحر (القرطبی ص۱۸۱ ج ۲)

والشعار: العلامة۔ (قرطبی) مراد مقاماتِ عبادت ہیں۔

اَلْحَجّ :۔ حَجَّ يَحُجُّ حَجًّا۔ قصد کرنا۔ ارادہ کرنا۔

واصل الحج: القصد (قرطبی)

اصطلاح میں حج نام ہے ایامِ مخصوصہ میں مقاماتِ مخصوصہ کی زیارت کرنا۔

اصل الحج: القصد للزيارة، خُصّ فی الشرع بقصد بيت اللہ تعالٰی اقامةً للنسك (راغب)

اِعْتَمَرَ - اِعْتَمَرَ: عمرہ کرنا۔ عمرہ کے معنی ہیں زیارت کرنا۔ العمرۃ الزیارۃ عمرہ کو حج اصغر بھی کہا گیا ہے۔ اس میں حج کی طرح مہینہ اور تاریخ وغیرہ کی کوئی قید نہیں اسی طرح اس میں مزدلفہ وغیرہ میں وقوف نہیں ہے۔ (العمرۃ الزیادۃ (قرطبی)

اِعْتَمَرَ: اس نے عمرہ کیا۔ اِعْتِمَارٌ مصدر باب افتعال سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔

جُنَاحَ - جناح - جَنَحَ يَجْنَحُ جُنُوْحًا مائل ہونا۔ جَنَحَتِ السَّفِينَة: کشتی ایک جانب جھک گئی۔ اس گناہ کو بھی جناح کہا جاتا ہے جو انسان کو حق کی طرف سے پھیر دے پھر اس کے بعد ہر اثم اور گناہ کو جناح کہہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ گناہ جب بھی ہوتا ہے کرنے والا حق سے منحرف ہو جاتا ہے۔

وسُمّی الاثم المائل بالانسان عن الحق جناحًا۔ (راغب)

الجناح: پرندوں کے پر وبازو۔

جُنْحٌ اور جِنْحٌ۔ رات کا تاریک حصہ۔

یہاں لَاجُنَاحَ عَلَيْهِ کے معنی یہ ہوں گے کہ لَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔ قال القرطبی و اصله من الجنوح وهو الميل۔

يَطَّوَّفَ - يَطَّوَّفَ: اصل میں يتطوف ہے۔ تا کو طا میں ادغام کیا گیا ہے۔ طَوَفٌ

کے اصل معنی کسی چیز کے گرد گھومنے یا چکر لگانے کے ہیں۔ چوکیدار جو مکان کی حفاظت کی خاطر چکر لگاتا ہے، کو بھی طائف کہا جاتا ہے۔ اَلطَّوْفُ: مَشْیٌ حَوْلَ الشَّیْءِ یہاں طواف سے مراد خاص دو مکانوں میں ایک مخصوص انداز سے آمد و رفت ہے۔

شَاکِرٌ - شکر: یہ صلوٰۃ اور توبہ کی طرح ان الفاظ میں سے ہے جن کے معنی کا تعین نسبت اور صلہ سے ہوتا ہے۔ جب شکر کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اعمالِ عباد کا قدردان ہے۔ ان کے تھوڑے عمل پر بہت زیادہ ثواب اور بدلہ دیتا ہے۔

الشکر من اللہ تعالیٰ ان یُعطی لعبدہٖ فوق ما یستحقہ۔ اور جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے تو اس کے معنی شکرگزاری کے ہوتے ہیں۔ تو شاکر کے یہاں معنی ہوں گے قدردان۔ اور چونکہ وہ علیم بھی ہے اس لئے وہ کسی کے عمل سے بے خبر بھی نہیں۔ لہٰذا اعمال کی قدر پورے طور پر کرتا ہے۔ شَکُوْرٌ (بفتح شین) بڑا شکرگزار بڑا قدردان۔ یہ فَعُوْلٌ کے وزن پر صفت کا صیغہ اوزانِ مبالغہ میں سے ہے۔ شَکُوْرٌ اسماءِ حسنیٰ میں سے بھی ہے جب اس کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہو جیسا کہ اِنَّهٗ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ۔ بے شک وہ بڑا قدرشناس اور بردبار ہے۔ اور شُکُوْرٌ: شین کے ضمہ کے ساتھ شَکَرَ کا مصدر ہے۔ شکرگزاری۔ شکر کرنا

اِلٰـہ - اِلٰہ کے معنی معبود کے ہیں۔ اس پر الف لام تعریف کا داخل کرکے لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے بطور اسمِ ذات کے بولا گیا ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ: معناہ لامعبود الّا اللّٰہ۔ (قرطبی)

اَلَہَ یَاْلَہُ اُلُوْھَۃً و الاھۃً بندگی کرنا۔ عبادت کرنا۔ اَلِہَ یَاْلَہُ (سمع) سے مصدر اَلَھاً: حیران ہونا۔ عقل کا متحیر ہونا۔ اَلِہَ: اِذَا تَحَیَّرَ، وذٰلِکَ اَنَّ الْاَوْھَامَ تتحیر فی معرفۃ المعبود و تدھش الفطن ولذلک کثر الضَّلَالُ وَفَشَا الباطل وَقَلَّ النظر الصَّحِیْح (کشاف) جمع آلِھَۃٌ

اَلْفُلْک - اَلْفُلْکُ: فُلک کشتی۔ جہاز۔ سفینہ۔ یہ فَلْکٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گول ہونا۔ فَلَکَ ثَدْیُ الجاریۃ۔ لڑکی کے سینہ کا گول ہونا۔ اَلْفَلَکُ چکر لگانے کی جگہ۔ سفینہ کو فلک بھی اس لئے

کہا جاتا ہے کہ وہ پانی پر چپکر لگاتی ہے۔
جمع اور واحد میں اس کا وزن یکساں ہے۔ اسیطرح
مذکر و مؤنث میں برابر ہے۔ البتہ اگر فلک واحد
کی صورت میں استعمال ہو تو مذکر ہوتی ہے جیساکہ
فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ۔ مشحون، فلک کی صفت ہے
جو واحد مذکر ہے۔ اور اگر جمع ہو تو اس کا استعمال
مؤنث ہوتا ہے۔ جیساکہ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ
فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ۔
الفُلكُ: السفینۃ۔ ویستعمل ذٰلك
للواحد والجمع (مفردات راغب وقرطبی)

اَلْبَحْرِ۔ بحر دراصل اس مکان کو کہا
جاتا ہے جس میں کثیر پانی جمع ہوا ور مکان
(جگہ) وسیع ہو۔ پھر اسی وسعت اور کثرت کا
خیال کرتے ہوئے دوسرے وسیع اور کثرت کے
معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ مثلاً کہا جاتا ہے
بَحَرْتُ كذا۔ یعنی میں نے کشادہ کر دیا۔
اسی طرح کہتے ہیں بَحَرْتُ البَعِیْرَ۔ میں نے
اونٹنی کے کان چیر دیئے۔
بحیرہ: وہ اونٹنی جو دس بچے جن چکی ہو۔
ایسی اونٹنی کو کان چیر کر آزاد کر دیتے تھے۔
اس پر سوار ہونا ممنوع ہوتا۔ گویا اس کو مقدس
تصوّر کیا جاتا تھا۔
التبحّر فی العلم۔ علم کی وسعت۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھوڑے پر
سوار ہونے کے بعد فرمایا کہ وجدته بحرًا۔
میں نے اس کو بحر کی طرح تیز رو پایا ہے
اصل البحر کل مکان واسع جامع للماءِ
الکثیر (راغب)

بَثَّ۔ بَثَّ یَبُثُّ بَثًّا: پھیلانا۔
بَثَّ الْخَبَرَ: خبر کو پھیلایا۔
اِنْبَثَّ: پھیلنا۔ متفرق ہونا۔ اَلْبَثُّ: پراگندگی
سخت غم۔ اَصْلُ البثِّ، التفریق
و اثارۃ الشئ۔ وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ
دَآبَّةٍ: اشارة الی ایجاده تعالیٰ مالم یکن
موجودًا (راغب)

دَآبَّةٍ۔ دَبَّ یَدِبُّ دَبًّا و دَبِیْبًا:
زمین پر سانپ کی طرح رینگنا۔ بچوں کیطرح
گھٹنوں کے بل چلنا۔
لفظ دابّۃ کا استعمال دو طرح آیا ہے
ایک عام اور وسیع مفہوم میں دوسرے خاص
اور محدود مفہوم میں۔ اس کا معروف اور زیادہ
استعمال ان جانوروں کے لئے ہوتا ہے جو
سواری یا بار برداری کا کام دیتے ہیں۔ اور
دوسرا استعمال اس کا عام ہے۔ ہر جاندار
کو دابہ کہا جاتا ہے۔ اس کے خاص معنوں کے
لحاظ سے پرندے اس میں داخل نہ ہوں گے۔

اور ایک مقام پر خود قرآن پاک میں بھی پرندوں کو دابہ سے الگ کرکے ذکر کیا ہے۔ مثلاً فرمایا کہ مَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ ۔ تو یہاں طائر کو الگ کرکے بیان کیا گیا ہے۔ اس پر بعض حضرات کو یہ شبہ ہوگیا ہے کہ پرندے دابہ کے مفہوم میں داخل ہی نہیں حالانکہ یہ غلط ہے۔ صاحب قرطبی نے اس خیال کی تغلیط کی ہے اور جب یہ اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو اس میں تمام حیوانات مع انسان کے داخل ہوتے ہیں۔ جیساکہ فرمایا وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَآبَّةٍ اس آیت میں دابہ کا لفظ وسیع مفہوم میں ہے

الدابّة والدبیب : مشی خفیف و یستعمل ذلك فی الحیوان وفی الحشرات (راغب) و دابّة تجمع الحیوان کلّه (قرطبی)

لفظ دابہ قرآن پاک میں چودہ مرتبہ آیا ہے اس کی جمع بھی قرآن میں مستعمل ہے۔ اس کی جمع دوابّ آتی ہے۔ قرآن میں یہ چار مرتبہ آیا ہے۔ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (انعام)

تَصْرِيفِ ۔ تصریف : صرف سے ماخوذ ہے۔ کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلنا۔ لوٹانا۔ ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو تبدیل کرنا۔

تصریف الرّیاح : ہواؤں کے رُخ بدلنا۔ مختلف سمتوں سے چلانا۔

الصّرفُ : ردّ الشیٔ من حالة الی حالة او إبداله بغیره۔ والتصریف کالصّرف، تصریف الرّیاح هو صرفها من حال الی حال (راغب) تصریفها : ارسالها جنوبًا و شمالًا و دبورًا وصبًا۔ (قرطبی)

الرِّيَاحِ ۔ الریاح : ریح کی جمع ہے۔

الرّیحُ : ہوا۔ بُو۔ اچھی چیز۔

الرّیاح جمع ریح سمّیت به لانها تأتی بالروح غالبًا

السَّحَابِ ۔ سحاب : سَحَبَ يَسْحَبُ سَحَابًا وسَحَابَةً ۔ زمین پر گھسیٹنا۔

جَاءَ يَسْحَبُ ذيله : وہ مغرورانہ چال سے آیا یعنی اپنے دامن کو زمین پر گھسیٹتا ہوا۔ بادلوں کو بھی سحاب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ فضاؤں میں ہواؤں کے ذریعہ چلتے ہیں۔ اور گویا ہوائیں ان کو اطراف و جوانب میں گھسیٹتی پھرتی ہیں۔ خوب پیٹ بھر کر کھانے کو بھی سَحَبٌ کہتے ہیں۔ سُمّی السّحابُ سحابًا لِانسحابه فی الهواء (قرطبی)

اصل السحب : الجر۔ (راغب)
اس گھسیٹنے اور کھینچنے کے معنوں میں لفظ سحب
کئی جگہ استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً یَوۡمَ یُسۡحَبُوۡنَ
فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوۡهِهِمۡ ۔ اور یُسۡحَبُوۡنَ
فِی الۡحَمِیۡمِ ۔
السحاب : بادل جمع سُحُبٌ ۔ سَحَابَة
جمع سحائب ۔ (لسان)

الۡمُسَخَّرِ ۔ مُسَخَّرٌ : سَخَّرَ تَسۡخِیۡرًا :
مطیع ہونا ۔ تابع ہونا ۔ محکوم ۔ فرمانبردار ۔
یہاں مسخر سے مراد ہے ایک مکان اور جگہ سے
اُٹھا کر دوسرے مکان کی طرف اس کو منتقل کرنا
سُخۡرِیَة : مخول ۔ ٹھٹھا ۔
سخرت السفینة : کشتی کا عمدہ رفتار سے چلنا ۔
المُسَخَّر : المذلل وتسخیرہ : بعثه
من مکان الی آخر وقیل تسخیرہ : ثبوته
بین السماء والارض من غیر عمدٍ ولا علائق
(قرطبی) امام قرطبی کے بیان کردہ دونوں معنوں
پر آیت حاوی ہے ۔
تسخیر کے معنی ہیں کسی کو مطیع اور فرمانبردار بنا کر
بلا کسی اجرت و معاوضہ کسی کی خدمت میں لگا دینا ۔
تو بادلوں کو مسخر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ خدا کے
امر اور اس کے حکم کے تحت بالکل مقہور و مجبور
ہیں ۔ امام راغب فرماتے ہیں التسخیر :
سیاقة الی الغرض المختص قهرًا (مفردات)

تَبَرَّاَ ۔ یہ بَرَاُ سے ماخوذ ہے ۔
بَرۡءٌ اور بَرَاءٌ اور تبرّی تینوں کے
معنی ناپسندیدہ امور سے بیزاری کا اظہار کرنا ہیں ۔
اور بَرَاُ کے معنی ہیں عدم سے وجود میں لانا ۔
بَرَاُهٗ : خلقه من العدم ۔ (منجد)
التبرّی : التفصّی مما یکرہ مجاورته (راغب)
صفت بَرِیۡءٌ ۔ قال : اِنَّ اللّٰهَ بَرِیۡٓءٌ
مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ وَرَسُوۡلُهٗ ۔ جمع بریئون
قال تعالیٰ : اَنۡتُمۡ بَرِیۡٓــُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ ۔
دوسری جمع اس کی بُرَآءُ ہے ۔ قال تعالیٰ :
اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡکُمۡ ۔
تَبَرَّاَ : وہ بیزار ہوا ۔ اس نے بیزاری ظاہر
کی ۔ باب تفعُّل کے مصدر تَبَرُّءٌ سے ماضی کا
صیغہ واحد مذکر ہے ۔

تَقَطَّعَتۡ ۔ تَقَطَّعَتۡ قَطۡعٌ سے ماخوذ ہے ۔
قَطَعَ یقطع قَطۡعًا کاٹنا ۔ علیحدہ کرنا ۔ ایک
چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا ۔ قطعه عن
حَقِّهٖ اس کو حق سے روک دیا ۔ قَطَعَ
الطریق راستہ بند کر دیا ۔ لفظ قطع عام ہے
کہ ہر مقطوع پر اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔ چاہے
قطع محسوس ہو یا غیر محسوس ۔ یعنی مُدرَک بالبصر
ہو جیسا کہ قطعت الثَّوبَ ۔ کپڑے کو کاٹا

یا غیر محسوس جیساکہ قطع الصلوٰۃ۔ نماز کو
باطل کرنا۔ یہ قطع مُدرک بالبصیرہ ہے
اس لئے قطع الطریق کا اطلاق دونوں
طریقوں پر ہوتا ہے۔ قطعتُ الطریق
یعنی میں نے منازلِ سلوک کو سر کرلیا۔
اس طرح قطعت الطریق: کے معنی راستہ
بند کرنا اور مسافروں کو لُوٹنا ہے۔
لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ
ترجمہ: میں کاٹ کر رکھ دوں گا تمہارے ہاتھ
اور پاؤں مختلف جانب سے۔
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا
وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ۔
ان کو گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کے
ٹکڑے کر دیگا۔

الْاَسْبَابُ۔ اسباب: یہ سَبَبٌ کی
جمع ہے۔ جس کے معنی رسّی کے ہیں جس سے باندھا
جاتا ہے۔ اس باندھنے سے چونکہ متفرق اجزاء
باہم مل جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے قریب
ہوجاتے ہیں لہذا اس معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس
کے اندر تعلق و توسّل اور اسباب و وسائل کا مفہوم پیدا
ہوا۔ پھر اس میں مزید توسّع پا کر کسی شے کے متعلقات
واطراف کے لئے بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔
تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ سے مراد یہی آخری معنی ہیں

الاسباب: الوُصلات التی کانوا
یتواصلون بھا فی الدنیا من رحم وغیرہ
(قرطبی)

حَسَرٰتٍ۔ حَسَرَاتٍ: حَسْرَةٌ کی جمع
ہے۔ حَسِرَ يَحْسَرُ حَسْرَةً: افسوس کرنا۔
نادم و شرمندہ ہونا اور حَسَرَ يَحْسُرُ حَسْرًا
(ن۔ض) کے معنی ہیں کھولنا۔ کہا جاتا ہے:
حَسَرَ كُمَّهٗ عَنْ ذِرَاعِيهِ: اس نے اپنی
آستین چڑھالی۔ اسی طرح حَسَرَتِ
الْجَارِيَةُ خِمَارَهَا عَنْ وَجْهِهَا: لڑکی نے
اپنے چہرے سے اپنی اوڑھنی ہٹالی۔ اور حاسر
وہ فوجی جو بلا ہتھیار کے ہوں اور سروں
پر خود بھی نہ ہوں۔ انسان کے اعمال کو حسرات
کہا گیا ہے۔ چونکہ یہ انسان کو آخرت میں
اس کا اصل مقام دکھادیں گے۔ دنیا میں
اس کو جو شبہ خدا اور دین میں تھا وہ بھی کھل
جائے گا۔

الحسر: کشف الملبس عما علیہ۔
والحسرة: الغم علی ما فاتہ والندم
علیہ۔ (راغب)

حسرت: ندامت اور شرمندگی کے اس درجے
کا نام ہے جس کے بعد ندامت کا کوئی درجہ
نہ ہو اور آدمی پوری طرح مایوس اور مجبور ہوگیا ہو۔

الحسرة اعلی درجات الندامة علی شئ فائت (قرطبی)

خَسَرَات: حسرۃ کی جمع ہے۔ جیسا کہ تمرۃ کی جمع تمرات اور جفنۃ کی جمع جفنات وشھوۃ کی جمع شَھَوَات۔

حَسِرَ یَحْسَرُ (س) تھکنا۔ کما قال تعالٰی: یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ۔ حسیر یعنی تھکی ماندی مایوس ہو کر لوٹے گی۔

حَلٰلاً - حَلَّ یَحِلُّ حَلَالًا۔ اس لفظ کے اصل معنی ہیں گرہ کھولنا۔ اسی سے جو چیز انسان کے لئے شرعاً جائز قرار دے دی گئی ہو اس کو حلال کہا جاتا ہے۔ گویا جو ممانعت کی گرہ تھی وہ کھول دی گئی اور عائدہ شدہ پابندی کو ختم کر دیا گیا، خود قرآن پاک نے عقدہ کشائی کے معنوں میں لفظ حَلَّ کو استعمال کیا ہے۔ کما قال وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ

اصل الحَلّ: حَلُّ العُقدۃ (راغب)

وسُمّی الحلال حلالًا لانحلال عقدۃ الحظر عنہ (قرطبی) اصطلاحِ قرآن میں حلال وہ شئ ہے جس کے استعمال کو شریعت نے جائز قرار دیا ہو۔ اور دوسرے کا حق اس میں شامل نہ ہو، الحلال ما احلّه الشرع (معالم)

طَیِّبًا - طَیِّبًا: طَابَ یَطِیْبُ طَیْبًا سے ماخوذ ہے۔ طَیِّب صیغہ صفت ہے۔ خوش ذائقہ پسندیدہ جن سے نفس وروح دونوں لذت حاصل کریں۔

اصل الطیب، ما تستلذہ الحواس وما تستلذہ النفس۔ (راغب)

شرعی اعتبار سے طَیِّب وہ مال ہے جو جائز ذرائع سے کمایا گیا ہو۔ بیع فاسد نہ ہو اُجرت فاسد نہ ہو۔ سود و قمار بازی سے کمایا ہو مال طیّب نہیں کہلاتا بلکہ وہ حرام ہے۔ اسی سے ان لوگوں کو بھی طیّب کہا جاتا ہے جو فسق و فجور اور جہل کی آلودگیوں سے پاک ہوں اور علم و معرفت اور اعمالِ حسنہ سے آراستہ ہوں رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً، وقال تعالٰی: لِیَمِیْزَ اللّٰهُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ۔ وقال: طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ۔ وقال: وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ۔ یعنی اعمالِ سیئہ کو اعمالِ صالحہ کے بدلہ میں نہ اختیار کرو۔

صَعِیْدًا طَیِّبًا۔ وہ مٹی جس پر نجاست نہ ہو۔

خُطُوٰتِ - خطوات: خطوۃ کی جمع ہے۔ خَطْوَۃٌ اور خُطْوَۃٌ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اتنی مقدار کو خطوۃ کہتے ہیں جو دونوں

قدموں کے درمیان کی مسافت ہے۔ خطوات جمع خَطوۃ و خُطوۃ بمعنی واحدٍ،
والخطوۃ ما بین القدمین۔ جمع قلت خُطُوات اور خَطُوات ہے، خَطَوَاتٍ بھی جمع ہے۔ (قرطبی)

السُّوْٓءِ ۔ سُوْٓءٍ: سَاءَ یَسُوْءُ سَوَاءً وَسُوْءً و سَوَاءَۃً۔ غم، حزن، ملال، برائی۔ سُوْء اسم ہے۔ ہر وہ امر جس کے پس منظر میں مضرت اور نقصان ہو اور انسان کے لئے باعث پشیمانی ہو۔ سُوْء کو سُوْءٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے عواقب میں سوائے شرمندگی اور ندامت کے کچھ حاصل نہیں۔

لفظ سوء کا استعمال قرآن پاک میں وسیع معنوں میں ہوا ہے۔ اس سے مادی اور جسمانی نقصان تو عام مراد لیا جاتا ہے۔ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ۔ وَاَدْخِلْ یَدَكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ۔ اس سے مراد یہاں جسمانی مرض برص ہے۔ اسی طرح اُخروی نقصان پر بھی اس کا اطلاق قرآن پاک میں شائع ہے۔ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ۔ نادانی سے برا کام کرتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔

سوء: اسم ہے۔ ہر اس قبیح امر و فعل کو کہا جاتا ہے جس کو دیکھ کر عقلمند شریف آدمی کو صدمہ اور ملال ہو۔

الشوء کل مایغم الانسان من الامور الدنیویۃ والاخرویۃ ومن الاحوال النفسانیۃ والبدنیۃ (راغب)

سُمّی السوء سُوءً لانّہ یسوء صاحبہ بسوء عواقبہ۔ (قرطبی)

الْفَحْشَآءِ ۔ فحشاء: ہر وہ امر جسے شریعت نے مردود قرار دیا ہو۔ اور عقل و شرع کے اعتبار سے قبیح ہو۔

فحشاء کا لفظ قول اور فعل کی تمام برائیوں پر حاوی ہے۔ اور اس کا اطلاق ان برائیوں پر ہوتا ہے جن کی قباحت و بے حیائی بالکل واضح ہو۔ قرآن پاک میں اس کا اطلاق زنا، لواطت اور ننگے ہو کر طواف کرنے پر ہوا ہے۔

مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ اس سے مراد زنا ہے۔ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ۔

قرآن پاک میں لفظ فحشاء سات دفعہ آیا ہے

الفحش والفحشاء والفاحشۃ ماعظُمَ قُبحُہٗ من الافعال والاقوال (راغب)

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ فحشاء کے اصل معنی تو قبیح المنظر کے ہیں پھر ان ظاہری معنوں کا لحاظ کرتے ہوئے قبیح معانی کے لئے بولا جانے لگا۔

والفحشاء اصله قبیح المنظر، کما قال

ع وجیدٍ کجیدِ الریم لیس بفاحشٍ

ثم استعملت اللفظة فیما یقبح من المعانی۔ (قرطبی)

فَحُشَ : بدہونا۔ اِفْحَاش: فحش بکنا فحش کی تہمت لگانا فحشاء : زکوٰۃ میں بخل کرنا۔

فَحَّاش : بُرا۔ بدگو، بُرا انسان۔ لفظ سوء اور فحشاء میں شرعاً یہ فرق بیان کیا گیا ہو کہ سوء وہ ہے جس میں حد ہو۔ یعنی شرعی سزا ہو۔ السّوء مالاحدّ فیه، والفحشاء مایجب الحدّ فیه (کشاف۔ قرطبی)

اَلْفَیْنَا ۔ اَلْفَیْتُ کے معنی ہیں وَجَدْتُّ میں نے پالیا۔ اَلْفَیْنَا جمع متکلم ہم نے پایا۔ بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا۔ بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ سورۂ یوسف میں ملا ہے:

وَاَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَی الْبَابِ، اور ان دونوں نے دروازے کے پاس اس (عورت) کے شوہر کو پایا۔

اَلْفَاهُ کَاذِبًا: اس نے اسے جھوٹا پایا۔

تَلَافَی التَّقْصِیْرَ: اس نے تقصیر کی تلافی کردی

اَلْفَیْنَا، افعال کے مصدر اِلْفَاءٌ سے بنا ہے اس کا مادہ مجرد لَفْیٌ ہے۔ اس کا لام کلمہ حرف یا ہے۔

اَلْفَیْنَا : وَجَدْنَا۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے

فَاَلْفَیْتُه غیرَ مُسْتَعْتِبٍ
وَلَا ذَاکِرِ اللّٰهِ اِلَّا قَلِیْلًا (القرطبی)

یَنْعِقُ ۔ نَعَقَ یَنْعِقُ کے معنی چیخنے اور آواز دینے کے ہیں۔ نَعَقَ الْمُؤَذِّنُ ۔ مؤذن نے اذان دی۔ نَعَقَ الرَّاعِی بِغَنَمِهٖ ۔ چرواہے نے اپنے گلے کو للکارا۔ یہاں یَنْعِقُ کا صیغہ تمثیلاً لایا گیا ہے جو عقل و بصیرت سے بیگانہ ہیں ان کو بھیڑ بکریوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ پکارنے والے کی آواز کو تو سنتے ہیں مگر اتنا پتہ نہیں کہ یہ چرواہا اُن کو کس کام سے پکارتا ہے۔ آواز سنتے ہیں اور بدک جاتے ہیں

النَّعِیق : زجر الغنم والصیاح بها (قرطبی)

النَّعْقُ : التصویتُ ۔ (کشاف)

اَلْمَیْتَةَ ۔ میتہ یا مردار وہ جانور ہے جو بغیر ذبحِ شرعی کے مرجائے۔

المَیْتَةُ مافارقته الرُّوحُ من غیر زکاة مما یذبح (قرطبی)

المیتة من الحیوان مازال روحه بغیر تزکیة (راغب)

الدَّمَ ۔ دم۔ خون جو بہتا ہوا ہو۔ دم سیال خون ہو وہ حرام ہے۔ فحرم

المسفوح من الدم۔ (قرطبی)

دمٌ کی جمع دماء

اَلْخِنْزِیْرِ۔ خنزیر ایک حرام ترین جانور کانام ہے، جس کے تمام اجزاء حرام ہیں۔ صرف اس کے بالوں سے جوتا سینے کا کام لینا جائز ہے۔ تمام جانوروں میں سے یہ بے غیرت ترین ہے

اُھِلَّ۔ اُھِلَّ : ہلال سے ہے جس کے معنی آواز دینے پکارنے اور شہرت دینے کے ہیں الاھلال : رفع الصّوت (قرطبی) اسی سے بچے کی ابتدائی آواز اور رونے کو بھی اھلال کہتے ہیں۔ چاند کو بھی ھلال اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی طرف اشارے ہوتے ہیں اور اس پر آوازیں بھی بلند ہوتی ہیں کہ وہ دیکھو چاند فلاں درخت کی شاخ پر سے نظر آرہا ہے۔

اضْطُرَّ۔ یہ ضَرَّ یَضُرُّ سے ماخوذ ہے۔ باب افتعال ہے۔ حرف ض کی مناسبت سے ت کو طا سے بدل کر اضْطَرَّ بنا ہے۔ الاضطرار: الاحتیاج الی الشئ۔ (لسان العرب) ضَرَّہٗ الی کذا: الجأہ الیہ۔ اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کرکے دھکیل دیا۔ اِضطرّ الیہِ: اس کو فلاں چیز کا محتاج بنا دیا۔

ضُرَّ بَصَرُہٗ : اندھا ہوگیا۔

اَضَرَّہٗ (افعال) تکلیف پہنچانا۔

بَاغٍ۔ بَغٰی یَبْغِی بُغَاءً وبُغْیَۃً: طلب کرنا۔ حق سے ہٹ جانا۔ بَغٰی عَلَیْہِ : تعدّی کرنا، ظلم کرنا۔ صفت باغ۔ اس کی اصل بَاغِیٌ ہے۔ بَاغِ کے قاعدہ بَاغٍ بنا۔ جمع بُغَاۃ و بُغیان آتی ہے۔ غَیْرَ بَاغٍ یعنی اس کی نیت اور ارادہ نافرمانی اور قانون شکنی کا نہو۔ بَغْیٌ کے اصل معنی تجاوز کے ہیں۔ اس تجاوز اور بغی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محمود ہے جیساکہ عدل سے تجاوز کرکے احسان کی طرف بڑھنا۔ یعنی اصل حق دینے کے بعد مزید احسان کرنا اور زیادہ دینا۔ تجاوز اور بغی وہ مذموم ہے کہ حق سے باطل کی طرف رُخ کرلیا جائے یہ حرام ہے۔

عَادٍ۔ عَادٍ : اس کی اصل عائد ہے جیساکہ ھَادٍ کی اصل ھَائِدٍ اور شَاكٍ کی شَائك۔ عَادَ یَعُوْدُ عَوْدًا وعَوْدَۃً و معادًا کسی کی طرف مائل ہونا، دوبارہ مڑکر آنا۔ العود : الرجوع الی الشئ بعد الانصراف عنہ۔ (راغب)

وَلَا عَادٍ : یعنی حدودِ شرعیہ توڑنے والا نہ ہو نیت کے فساد سے خالی ہو۔

الْقُرْبٰی ۔ القُرْبٰی ۔ قَرُبَ يَقْرُبُ
قُرْبًا وقُرْبَانًا ۔ کسی چیز کے قریب ہونا ۔
القُرْبٰی وَالقُرْبَۃ وَالقَرَابَۃُ : رشتہ داری
قربت داری ۔ قریب کی برادری ۔ القربان
وہ چیز جس کے ذریعہ سے تقرب الی اللہ ہو ۔

ابْنَ السَّبِيْلِ ۔ ابن السبیل ۔
مسافر، ابن بیٹا ۔ السبیل راستہ ۔ معنی
یہ ہوئے کہ راستے کا بیٹا یعنی راستہ طے
کرنے والا مسافر ۔

الْيَتٰمٰى ۔ یَتٰمٰی یتیم کی جمع ہے ۔ یتیم
اس بچے کو کہا جاتا ہے جس کا باپ بلوغت سے
پہلے فوت ہو گیا ہو ۔

اَلْيُتْمُ : انقطاع الصبی عن ابیہ
قبل بلوغہ وفی سائر الحیوانات من قبل
امّہ ۔ (راغب) یعنی حیوانات میں یتیم وہ ہے
جس کی ماں مر جائے ۔

الْمَسٰكِيْنَ ۔ مسکین کی جمع ہے ۔ مراد
وہ غریب ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو
وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا
و المسکین : قیل ھو الذی لاشئ لہ
(راغب)

مسکین کی اصل سکون ہے ۔ جس کے
معنی حرکت کے بعد ٹھہر جانے کے ہیں ۔
مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس مال تھا مگر
گردشِ زمانہ نے ختم کر دیا اور اس کی مالی
حرکت بند ہو گئی ۔ اسی سے مَسْكَنَۃ ہے
حرفِ میم اس میں زائد ہے ۔ مطلب یہ ہے
کہ اُن پر سکونت مسلّط کر دی گئی ہے ۔ اب یہ
کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتے جس سے ان کو عزت
حاصل ہو سکے ۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّۃُ وَ
الْمَسْكَنَۃُ (ان پر ذلت اور محتاجی چمٹا دی گئی)

وَالسَّآئِلِيْنَ ۔ سائلین سائل کی جمع ہے
کھانا طلب کرنے والے فقراء ۔ یہ مہموز العین ہے
سَاَلَ يَسْاَلُ مانگنا سَائِلٌ : مانگنے والا ۔

الرِّقَابِ ۔ الرقاب رقبہ کی جمع ہے ۔
لفظی معنی گردن کے ہیں ۔ اصطلاح میں اس سے
مراد غلام ہوتے ہیں ۔ لفظ رقاب کا اطلاق
قیدیوں پر ہوتا ہے ۔ یہاں فی الرقاب کی
اصل فی فَكِّ الرقاب ہے ، مضاف محذوف ہے
الرقاب : جنگی قیدی ۔ غلام ۔ مقروض

الْمُوْفُوْنَ ۔ المُوفُون : وفٰی سے ماخوذ
ہے ۔ وفٰی یَفِی وَفَاءً ۔ وَفٰی بعَھدِہٖ
اذا اتمم العَھْدَ (راغب) مُوْفٍ واحد
ہے ۔ ایفاء مصدر ہے ۔ باب افعال سے ،
مجرد اور مزید دونوں متعدی ہیں ۔

الْبَاْسَآءِ البأساء ۔ البأس : الفقر

والشدۃ (کشاف) الشدۃ والفقر (قرطبی)
یہ بُوسٌ سے مشتق ہے بَاْسَاءٌ کا اصل تعلق
مالی پریشانیوں سے ہے
بَئُسَ یَبْئُسُ بَاْساً ۔ مضبوط ہونا ۔
صفت بَئِیْسٌ ہے ۔

الضَّرَّآءِ ۔ ضَرَّ یَضُرُّ سے ماخوذ
ہے ۔الضَّرَّاءُ سختی ۔ مالی تنگدستی ۔ بیماری۔
نقصان ۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ضرّاء
سے مراد جسمانی مشکلات ہیں ۔
والضرّاء : المرض والزّمانۃ ۔ قالہ
ابن عبّاس (قرطبی)

الْبَاْسِ ۔ شجاعت بہادری ۔ یہاں مراد
جنگ ہے ۔ حین البأس ای وقت الحرب (قرطبی)
یعنی جنگ کے وقت ۔ بَاْسٌ ۔ لڑائی ۔ سختی
شدّت ۔ آفت

الْقِصَاصُ ۔ قَصٌّ سے ماخوذ ہے ۔
جس کے اصل معنی اتباع کرنے اور نقش قدم پر
چلنے کے ہیں قَالَتْ لِاُخْتِہٖ قُصِّیْہِ
اس کی بہن کو کہا کہ اس کا پیچھا کر ۔
فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِمَا قَصَصًا وہ دونوں
اپنے نقش قدم کا تعاقب کرتے ہوئے پلٹے ۔
اسی لئے قصّہ گو کو القاص کہا جاتا ہے ۔ چونکہ
وہ اخبار و واقعات کا تعاقب اور پیچھا کرتا ہے
اسی سے قِصَاصٌ نکلا ہے اس لئے کہ قاتل کا تعاقب
کیا جاتا ہے ۔ پھر قصاص اس سزا کو کہا
جانے لگا جس میں مجرم اور قاتل سے وہی معاملہ
کیا جاتا ہے جس کا وہ خود مرتکب ہو ۔
القصاص ماخوذ من قَصَّ الاثر وھو اتّباعہ
ومنہ القاص لانہ یتبع الاٰثار والاخبار (قرطبی)

الْقَتْلٰی ۔ قتیل کی جمع ہے مقتول کے
معنوں میں ہے ۔ یہ لفظ مذکر مؤنث دونوں میں
برابر ہے ۔

اَلْحُرُّ ۔ آزاد ۔ یہ غلام اور عبد کی ضد ہے
حر جس پر غلامی کا دور نہ گزرا ہو ۔

الْعَبْدُ ۔ غلام ، مملوک یہ حُرّ کی ضد ہے
جمع عباد آتی ہے ۔

الْاُنْثٰی ۔ عورت ۔ الانثی خلاف الذکر
مرد کے مقابل ہے ۔ جمع اِنَاثٌ و اُنَاثٰی
جمع الجمع اُنُثٌ (منجد)

اَخِیْہِ ۔ اَخٌ بھائی ۔ اس کی اصل اَخَوٌ ہے
جس کے معنی مشارکت فی الولادۃ کے ہیں ۔
پھر اس اخوت کو عام کر کے دینی اور انسانی
مشارکت پر بھی اخوت کا اطلاق کیا جانے لگا ۔
یہاں بھی اخیہ سے مراد انسانی اور اسلامی
اخوت ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ قاتل اگرچہ مجرم
ہے مگر آپ کا اسلامی اور انسانی رشتہ اس سے

اب بھی جڑا ہوا ہے جمع اخوان و اخوۃ

اَدَاء - الاداء : دَفْعُ الحَقِّ دَفعةً وردّ الامانۃ۔ (راغب)

حق ادا کرنا اور امانت صاحبِ امانت کے سپرد کرنا۔

الْوَصِيَّة کے لفظی معنی نصیحت کے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد وہ ہدایتیں ہوتی ہیں جو وصیت کر جانے والے کی موت کے بعد قابلِ عمل درآمد ہوتی ہیں۔

جَنَفًا - جَنَفٌ : نادانستہ طور پر غلطی میں گناہ کر گزرنا یا گناہ کی طرف مائل ہونا۔

الجنف : المیل عن الحق بالخطاء (کشاف) وفی الصحاح : الجنف المیل (قرطبی) من جَنِفَ یَجْنَفُ (س)

اِثْم - دانستہ جرم کا ارتکاب کرنا۔

اَثِمَ یَاثَمُ اِثْمًا و اَثَامًا کے معنی پیچھے رہنے کے ہیں۔ اِثْمٌ وہ افعال جو حق سے پیچھے ہوں آثِم یا اَثِیم گنہگار کو کہتے ہیں چونکہ وہ ان افعال کی وجہ سے حق سے ہٹ جاتا ہے

الصِّيَامُ - صوم کی جمع ہے۔

صَامَ یَصُوْمُ صَوْمًا و صِیَامًا۔ صوم کے لغوی معنی کسی شے سے رُک جانے اور اس کو ترک کر دینے کے ہیں۔ نابغہ شاعر کہتا ہے ؎

خیلٌ صیامٌ وخیلٌ غیرُ صائمۃٍ
تحت العجاج وخیلٌ تعلک اللجما

بہت سے بھوکے اور بہت سے آسودہ گھوڑے میدانِ جنگ کے غبار میں کھڑے ہیں اور دوسرے بہت سے اپنی لگام چبا رہے ہیں۔

صَامَ الفرسُ صَوْمًا کے معنی ہیں گھوڑا کھانے سے رُک گیا۔ خاموشی پر بھی لفظ صوم کا اطلاق ہوا ہے اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا یعنی سکوت عن الکلام کی نذر مانی ہے۔ اور اصطلاحِ شریعت میں صوم نام ہے مُفطِرات سے رُک جانے کا روزہ کی نیت کے ساتھ۔ اور یہ کھانا، پینا اور جماع ہیں۔ اور یہ رُکنا صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک ہے۔

الصوم فی الشرع ھو الامساک عن المُفطِرات مع اقتران النیۃ من طلوع الفجر الی غروب الشمس۔ (قرطبی)

رَمَضَان - رَمِضَ یَرْمَضُ (س) رَمْضًا و رَمَضًا۔ سخت گرمی۔ رَمْضٌ ایسی شدید گرمی کہ دوپہر کو چرنے والے

جانوروں کے کلیجے پھٹنے لگے۔ اِر ماض: جلانا۔ درد پہنچانا رَمِضَ الصَّائم روزہ دار کے پیٹ کی حرارت سخت ہوگئی۔ حدیث میں ہے صَلوٰۃ الاوّابین اِذَا رَمِضَتِ الفصال یعنی اوّابین کی نماز اس وقت ہے جب اونٹ کے بچے گرمی کی شدّت کی وجہ سے چرنا ترک کردیں چونکہ اُن کے پاؤں جلنے لگتے ہیں۔

اسی رمضت الفصال سے رمضان ماخوذ ہے۔ چونکہ مہینوں کے نام قدیم عربوں سے ماخوذ ہیں تو جب رمضان کا مہینہ آیا تو اس وقت چونکہ سخت گرمی تھی اس لئے انھوں نے اس کا نام رمضان رکھا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ رَمِضَ الحَرُّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں جلا دینے والی گرمی۔ چونکہ روزہ گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ اس لئے اس کا نام رمضان رکھا گیا۔ وہ مہینہ جو گناہ کو جلا دیتا ہے۔

علامہ جوہری لغوی نے کہا ہے کہ رمضان کی جمع رمضانات اور ارمضا رلائی جاتی ہو رَمِیْضٌ تیز دھاری والا چاقو چھری وغیرہ رمضان: ماخوذٌ من رَمِض الصَّائم یَرمُضُ اِذَا حَرَّ جَوفُہٗ من شِدَّۃِ العَطَش (قرطبی)

شَھْر۔ اِشہار سے مشتق ہے۔ جس کے معنی مشہور کرنے کے ہیں، شَھَرَ سَیفَہٗ تلوار کو سونتا۔ تشھیر، شہرت دینا، مشہور کرنا۔ مہینہ کو شہر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مشہور ہے۔ ایک چاند سے دوسرے چاند تک مہینہ پورا ہو جاتا ہے۔ اس کی معرفت مخفی نہیں ہے۔ جمع شہور آتی ہے۔ والشھر مشتق من الاشھار لانہ مشتھر لایتعذّر علمہ علی احد (قرطبی)

عِدَّۃٌ۔ عَدَّ یَعُدُّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گننا۔ شمار کرنا العِدّۃ یہ فعلۃٌ کے وزن پر ہے معنی معدود کے ہیں۔

عِدّۃ کے مرفوع ہونے میں کئی احتمال ہیں ایک تو یہ کہ مبتدا کی خبر ہو۔ یعنی الواجبُ عِدّۃٌ دوسرا احتمال یہ ہے کہ تقدیر کلام یوں ہے کہ فَعَلَیہِ عِدّۃ۔ اس صورت میں عدّۃ مبتدا مؤخر ہوگا۔

اَلْیُسْرَ۔ سہولت۔ رعایت۔ معافی۔ یہ عُسر کے مقابل ہے۔ الیسر: التسھل (راغب) مَیْسُور: قلیل۔ تھوڑی چیز۔ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ۔ ای الغنی۔ یعنی قدرت علی الاداء۔ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ قرآن سہل اور آسان کر دیا تاکہ یاد کرنے میں دقت نہ ہو۔ حدیث میں ہے یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا

اَلْعُسْرَ ۔ تنگی ۔ یہ یُسر کی ضد ہے ۔ عُسریٰ تنگی، دشواری تعسیر: سخت کرنا اعتسار زبردستی لے لینا ۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۔ بلا شبہ تنگی کے ساتھ آسانی بھی آتی ہے ۔ عُسْرَۃٌ مالی تنگی ۔ فاقہ مستی کی حالت ۔

العسرۃ : تعسّر وجود المال (مفردات)

وَلِتُكْمِلُوا ۔ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ تُكْمِلُوْا ، کمال سے ماخوذ ہے ۔ کامل ہونا پورا ہونا ۔ اکمال اور تکمیل پورا کرنا ۔ مکمل کرنا ۔ اَعْطَيْتُهُ الْمَالَ كَمَالًا میں نے اسے پورا مال دیا ۔ یہ لفظ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے ۔ الکامل جس کے تمام اجزاء پورے ہوں ۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۔ مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں ۔

کمال کا اصل یہ ہے کہ جو چیز جس غرض و مقصد کے لئے ہے وہ پوری ہو ۔

کمال الشئ حصول ما فیہ الغرض منہ فاذا قیل کَمُلَ ذٰلک معناہ حصل ماھو الغرض منہ ۔ (راغب)

رَفَثَ ۔ رفث کے لفظی معنی شہوت انگیز کلام کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد جماع اور صحبت بالنساء کے ہیں ۔ اور تمام ان باتوں پر بھی رفث کا اطلاق ہوتا ہے جو میاں بیوی سے ارادۂ شہوت سے کرتا ہے ۔

کنایۃ عن الجماع ۔ والرفث کلمۃ جامعۃ لکل ما یریدہ الرجل من امرأتہ (قرطبی)

بعض نے الرفث کے معنی قول قبیح کے کہے ہیں یعنی فحش گوئی ۔ وقیل الرفث: اصلہ قول الفحش ۔ (قرطبی)

مسائل حج میں ارشاد ہے فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ یہاں رفث سے مراد فحش گوئی ہے ۔ جب رفث کا صلہ اِلیٰ آتا ہے تو پھر معنی جماع کے بھی ہوتے ہیں ۔

لِبَاس ۔ لباس کا اصل استعمال پہننے کے کپڑوں پر ہوتا ہے ۔ یہیں سے اس میں عموم پیدا کر کے میاں بیوی کے باہم امتزاج و اختلاط کو بھی لباس سے تعبیر کر دیا گیا ۔ چونکہ لغوی اعتبار سے لباس پہننے کے اُن کپڑوں کو کہا جاتا ہے جن سے انسان اپنا سر ڈھانپتا ہے اور اپنے جسم کو چھپاتا ہے ۔ اس طرح مرد اور عورت بھی ایکدوسرے کے لئے ستر اور پردہ ہوتے ہیں ۔ اس لئے ایکدوسرے

کے لباس بھی ہوتے ہیں ۔
اصل اللباس فی الثیاب ثم سمّی امتزاج کلّ واحدٍ من الزوجین لصاحبہ لباسًا (قرطبی) لبس یلبس الثوب استترہ وجعل اللباس لکل ما یُغطی من الانسان عن قبیح ۔ (راغب)

تَلْبِسُوْنَ ۔ حقیقت چھپا کر خلافِ حقیقت بات کرنا۔ حق اور باطل کو آپس میں گڈمڈ کرنا ۔
لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ وقال: لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ۔ وقولہ: صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ ۔ اس سے مراد جنگ میں پہننے والی مخصوص زرہ ہے ۔

تَخْتَانُوْنَ ۔ الخیانہ :حکم عدولی کرنا امانت میں خیانت کرنا ۔ اِخْتِیَان سے ماخوذ ہے خیانت کی طرف مائل ہونا ۔ جسم میں کمزوری اور ضعف محسوس کرنا۔ یہاں پر آخری معنوں کو بھی مراد لیا گیا ہے ۔چونکہ صحابۂ کرام سے خیانت کا ارتکاب نہیں ہوا کیونکہ اگر حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی ہوتی تو تَخْتَانُوْنَ کی بجائے تخونون انفسکم ہوتا۔ قرآن کے طرزِ بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی کسی قائم کردہ حد کو صحابہ کرام نے نہیں توڑا بلکہ اس حد بندی سے تقاضائے بشریت سے پھسل جانے کا خطرہ محسوس کرتے تھے اور یہ ممانعتِ جماع تضیق نفس کا باعث تھا جس کو حق تعالٰے نے اٹھا لیا اور اجازت عطا کردی۔ اسی کو فَتَابَ عَلَيْكُمْ سے تعبیر فرمایا ۔ امام راغب جو لغاتِ قرآن کے رمز شناس ہیں، فرماتے ہیں :
تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ۔ وَالْاِخْتِیَان مراودۃ الخیانۃ ولم یقل تخونون انفسکم لانہ لم تکن منھم الخیانۃ بل کان منھم الاختیان فان الاختیان تحرك شھوۃ الانسان لتحرك الخیانۃ (راغب)

عَفَا ۔ عفی یعفو عفوًا معاف کرنا ۔سزا نہ دینا ۔ قصد کرنا ۔ جب عفا کا صلہ عن آتا ہے تو عفیٰ کے معنی گناہوں کے معاف کرنے کے ہوتے ہیں
عَفَوْتُ عنہ : قصدتُ ازالۃ ذنبہ صارفًا عنہ (راغب) میں نے اس سے درگزر کرتے ہوئے اس کا گناہ مٹا دینے کا قصد کیا۔

بَاشِرُوا ۔ یہ مباشرۃ سے ماخوذ ہے ۔ جس کے معنی ہیں دو جسموں کا آپس میں ملنا مرد اور عورت کا بدن ایک دوسرے سے لگنا ۔ یہاں کنایہ ہے جماع سے ۔ والمباشرۃ الافضاء بالبشرتین وکُنیَ بھا عن الجماع (راغب)

کنایۃ عن الجماع (قرطبی)

الْخَيْطُ ۔ الخیط الابیض: خاط یخیط:
الخیط ڈوری، دھاگہ جمع خُیُوط وخُیُوطۃ
الخیط الاسود رات کی تاریکی الخَیْطُ الابیض
صبح کی سفیدی یعنی طلوع صبح ۔ مطلب یہ ہے
کہ رات کی تاریکی چھٹ جائے اور صبح کی
روشنی نمودار ہونے لگے ۔ خیط لمبی گردن والے
شتر مرغوں کو بھی کہا جاتا ہے ۔ نعامۃ
خیطاء : طویلۃ العنق ۔ کانما عنقہا
خیط (راغب)
خیط سے مراد اہل عرب رنگ اور الوان بھی
لیتے ہیں ۔ والخیط فی کلامھم عبارۃ
عن اللون (قرطبی)
الخیط الابیض ضوء الصبح مُنْفَلِقٌ ۔
والخیط الاسود جُنح اللیل مکتُومٌ

اَتِمُّوا ۔ اِتْمَامٌ سے ہے ۔ کسی چیز کے
تمام اجزاء کی تکمیل کر دینا اور جس چیز سے جو
مقصد تھا وہ حاصل ہو جائے ۔
اَتِمُّوا امر کا صیغہ ہے وجوب کا معنی
دے رہا ہے ۔ یعنی تکمیل صیام واجب ہے
توڑنے والا مجرم ہوگا ۔ اَمْرٌ یَقْتَضِی
الوُجُوب (قرطبی)

عٰکِفُوْنَ ۔ عکوف کے معنی ہیں اپنے
آپ کو کسی شے پر روکے رکھنا ۔ لازم پکڑنا
اسی سے اعتکاف ہے ۔ اعتکاف اصطلاح
شرع میں مسجد میں اپنے آپ کو عبادت کیلئے
مقید کرنا ہے ۔ العکوف الاقبال علی
الشئ وملازمتہ علی سبیل التعظیم
(راغب) وھو فی عرف الشرع ملازمۃ
مخصوصۃ فی وقت مخصوص علی شرط
مخصوص فی موضع مخصوص (قرطبی)

تُدْلُوْا ۔ اِدْلَاءٌ : لغوی معنی ادلاء
کے کنوئیں میں ڈول ڈالنے کے ہیں جیسا کہ
فَاَدْلٰی دَلْوَہٗ پھر اس کو وسعت دے کر
اس میں رسائی اور قربت کا مفہوم پیدا کر لیا
گیا جس طرح ڈول پانی کے قریب ہو کر اس
کو کھینچ لیتا ہے اس طرح مال حرام رشوت
وغیرہ حکام تک رسائی کا سبب بن جاتا ہے
جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فیصلہ غلط ہو جاتا ہے
اور اہل حق کو محروم اور مجرم کو نوازا جاتا ہے ۔
اصل الادلاء ارسال الرجل الدلو
فی سبب متعلقا بہ (ابن جریر، ماجدی)
واستعیر للتوصل الی الشئ (راغب)

اَھِلَّۃ ۔ ہلال کی جمع ہے نئے چاند کو
کہا جاتا ہے ۔ اس سے مہینے بھی مراد لئے گئے ہیں

مَوَاقِیْت ۔ میقات کی جمع ہے جس کے

معنی مطلق وقت اور منتہائے وقت کے بھی آتے ہیں۔ المواقیت: جمع المیقات وھو الوقت وقیل المیقات منتہی الوقت (قرطبی)

میقات اسم آلہ ہے، مواقیت اس کی جمع ہے۔ وقت پہچاننے کے ذرائع، احرام باندھنے کی حدیں۔

اَلْبُیُوْت یہ بیت کی جمع ہے۔ مکان رہائش گاہ۔ رات گزارنے کی جگہ۔

مسکن: اصل البیت ماوی الانسان باللیل (مفردات)۔ جمع بُیُوتٌ آتی ہے۔ بات یبیتُ بَیْتًا۔ رات گزارنا

ظُھُوْر ۔ ظَھْرٌ کی جمع ہے بمعنی پشت۔ پیٹھ۔ کاندھے سے لیکر سُرین تک کا حصہ ظہر ہے۔ ظہر اور بطن دو متقابل لفظ ہیں

اَبْوَابٌ ۔ بابٌ کی جمع ہے مَدْخَلٌ مکان میں داخل ہونے کا راستہ۔

بَوَّابٌ: دربان۔ چوکیدار۔

ثَقِفْتُمُوْا ۔ ثَقِفَ یثقفُ ثقفًا و ثَقُفَ۔ حاذق ہونا۔ فتحمند ہونا۔ کسی کو پالینا رَجُلٌ ثَقِفٌ اپنے کاموں میں ہوشیار۔ یہاں ثقف ادراک کے معنی میں ہے۔

حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ : اَدْرَکْتُمُوْھُمْ

الثقف: الحِذقُ فی ادراك الشئ وفعله (راغب)

والثقف وجود علی وجه الاخذ والغلبة

رَجلٌ ثَقِفٌ سریع الاخذ لاقرانه (کشاف)

الثقف: القتبض والمنبط (حاشیہ کشاف)

ثقف کے معنی مضبوط گرفت کے ہیں۔ ثقاف اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے نیزہ سیدھا کرتے ہوئے کام لیا جاتا ہے۔ نیزہ کو اس آلے سے پکڑ کر ہتھوڑے سے سیدھا کیا جاتا ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جہاں بھی کافروں کو پاؤ مضبوط پکڑ لو اور قتل کر ڈالو۔

اَلْفِتْنَۃُ ۔ فَتَنٌ کے اصل معنی ہیں سونے کو بھٹی میں ڈالکر کھرا کرنا اس میں سے کھوٹ نکالنا اسی سے فتنہ ہے۔ امتحان کرنا۔ مشکلات میں پڑنا۔ کفر و شرک پر بھی قرآن نے فتنہ کا لفظ بولا ہے۔ اصل الفتن ادخال الذھب النارَ لِتَظھَرَ جودَتُه من رَدَاءَتِه (راغب)

یہاں فتنہ سے مراد کفر و شرک ہے۔ کفر و شرک ہی تمام فسادات کی اصل ہے۔

انما سُمّی الکفر بالفتنة لانه فساد فی الارض یؤدّی الی الظلم والھرج وفیه الفتنة وقیل الفتنة عذاب الآخرۃ۔

عذابِ آخرت کو فتنہ کہا گیا ہے (کشاف)

وقال القرطبی : الفتنۃ هناك الشرك
وماتابعه من اذی المؤمنین . و اصل
الفتنۃ : الاختبار والامتحان ۔
ماخوذ من فَتَنتُ الفضۃ

عُدْوَان ۔ عُدوان کے لفظی معنی زیادتی
کے ہیں اور مراد قتل ہے ۔
والمراد من العدوان هٰهنا المعاقبۃ
والمقاتلۃ ۔ (ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۲۷)
بمعنی ظلم ۔ تعدّی ۔ زیادتی ۔ عدل و
انصاف کو نظر انداز کرنا ۔ حد سے گزر جانا ۔
یہاں عدوان سے مراد کفار کے ظلم اور زیادتی کی
سزا ہے ۔ یہ عَدَا یَعْدُو کا مصدر ہے ۔ نصر سے آتا ہے ۔
وسُمّی مایُصنع بالظالمین عدواناً
من حیث هو جزاء عدوان ۔ اذ الظلم
یتضمّن العدوان فسمّی جزاء العدوان
عدواناً ۔ (قرطبی)

اَیْدِی ۔ یَد کی جمع ہے بمعنی ہاتھ
اس کی جمع ایادی بھی آتی ہے اس کی اصل
واحد یَدْیٌ و یَدِیٌ ہے ۔

التَّهْلُكَةِ ۔ یہ مصدر ہے ۔ هَلَكَ
یَهْلِكُ هَلَاكًا و هُلْكًا و تَهْلُكَۃً
یہاں ہلاکت سے مراد جہاد کو ترک کرنا ہے
چونکہ جہاد اور جنگ کا ترک اور اس سے غفلت
قومی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے ۔
فَاَخْبَرَنَا ابو ایوب ان الالقاء
بالید الی التهلکۃ هو ترك الجهاد
فی سبیل اللہ ۔ (قرطبی ص ۳۶۱ ج ۲)

الْحَجّ ۔ حَجَّ یَحُجُّ حَجًّا ۔ ارادہ کرنا ۔
مقامِ مقدسہ کی زیارت کا قصد کرنا ۔ حَجّ
مصدر ہے حِجّ اسم ہے ۔ مراد بیت اللہ
کی زیارت اور حج کرنا ہے ۔

الْعُمْرَۃ ۔ عمرہ کے لفظی معنی زیارت کے
ہیں ۔ العمرۃ : الزیارۃ التی فیها
عمارۃ الوُدّ (راغب) گویا عمرہ اس زیارت
اور قصد کو کہا جاتا ہے جس کی عمارت محبت پر
قائم ہو

اُحْصِرْتُمْ ۔ احصار کے لفظی معنی کسی سبب
سے گھر جانے کے ہیں چاہے دشمن کی وجہ سے
یا امراض وحوادث کی وجہ سے ۔ یہ تمام ان
مشکلات کو حاوی ہے جو حج کیلئے رکاوٹ
بنیں ۔ الاحصار : المنع من طریق
البیت یُقال فی المنع الظاهر کالعدو
والمنع الباطن کالمرض ۔ (راغب)

اسْتَیْسَرَ ۔ یُسر سے ماخوذ ہے ۔
سہولت، آسانی میسر آنا ۔ استفعال ہے ۔

الْهَدْی ۔ کے لغوی معنی اُس پیش کش

کے ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجی جائے۔ مراد وہ جانور ہیں جو قربانی کے لئے مخصر بیت اللہ کی طرف روانہ کرتا ہے۔

اَلْهَدْيُ اور اَلْهَدِيُّ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ یہ هَدٰى يَهْدِىْ سے ماخوذ ہے ہدیہ دینا۔ وهو مايُهْدٰى اِلَى بَيْتِ اللهِ۔

تَحْلِقُوْا ۔ یہ حلق سے ماخوذ ہے حَلَقَ يَحْلِق حَلْقًا و تحلاقًا۔ گلے پر مارنا، سر مونڈنا۔ اصل میں حلق گلے کو کہتے ہیں حلقه اى قطع حَلقه اس کا حلق کاٹ دیا۔ پھر یہیں سے اس کا استعمال بال کاٹنے پر ہو گیا۔ جُعِل الحلق لِقطع الشعر (راغب)

مَحِلَّهٗ ۔ یہ حَلَّ يَحِلُّ سے ظرف ہے۔ وقت اور جگہ دونوں کو شامل ہے۔ اى مكانه الذى يجبُ نحره فيه (کشاف ومدارک) وهو الحرم۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک قربانی حرم میں نہ پہنچ جائے سر نہ مونڈو۔

اَلْعِقَاب ۔ عَقَبَ يعقُبُ عَقْبًا وعُقُوْبًا و عَاقِبَةً ۔ عَقَبَ الرَّجُلُ؛ خلیفہ بننا، پیچھے آنا۔ عذابِ آخرت کو عقاب اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اعمالِ انسانی کے صلہ کے طور پر بعد میں ملتا ہے۔ یہاں عقاب سے مراد عذابِ آخرت ہے۔ عقوبة معاقبة اور عقاب تینوں عذابِ آخرت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ (راغب)

فُسُوْقَ ۔ یہ فسق سے ماخوذ ہے حکم عدولی کرنا۔ احکام کے ادا کرنے میں کوتاہی کرنا۔ تمام چھوٹے بڑے گناہوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ فاسق اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے شریعت کا اقرار کرنے کے باوجود احکام کی بجا آوری میں کوتاہی کی ہو۔ یہاں فسوق سے مراد گناہ ہیں یعنی جميع المعاصى كلها۔ الفسوق اتيان معاصى الله عزوجلّ فى حال احرامه بالحج (قرطبی)

اَلْجِدَال ۔ مجادلۃ سے ہے اس کی اصل جَدْلٌ ہے۔ رسّی بانٹنا۔ مضبوط بنانا۔ الجدال وزنه فِعالٌ من المجادلة وهى مشتقة من الجدال وهو الفتل (قرطبی) یہاں جدال سے مراد آپس میں باہمی چپقلش آپس میں لڑنا۔ بدکلامی کرنا ہے۔ الجدال: المفاوضة على سبيل المنازعة والمغالبة (راغب) فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ کا معنی یہ ہوں گے کہ کوئی فحش بات اور بے حکمی نہ ہو اور آپس کا ہرگز کوئی

فساد نہ ہو، حج پورے نظم وضبط سے کیا جائے
ارض جدالۃ سخت زمین۔
جدلتُ الحبلَ رسی بانٹنا۔
جدال باب مفاعلۃ کا مصدر ہے باہم جھگڑنے اور ایک دوسرے پر چھا جانے کے لئے گفتگو کرنے کو جدال کہتے ہیں۔
تَزَوَّدُوْا۔ زَادَ یَزُوْدُ زَوْدًا: توشہ لینا۔ سفر کا خرچ لینا۔ زاد اس جمع شدہ مال کو کہتے ہیں جو فی الوقت ضرورت سے زائد ہو۔
والزاد: المدخر الزائد علی ما یحتاج الیہ فی الوقت۔ (راغب)
تَزَوَّدُوْا: یعنی جب حج کے لئے نکلو تو خرچ لیکر نکلو مانگتے نہ پھرو اور تقویٰ اختیار کرو۔
فَضْلًا۔ فَضِلَ یَفْضَلُ فَضْلًا و فَضَلَ یَفْضُلُ فَضْلًا فضیلت والا ہونا۔ فَضَلَ (ن) یَفْضُلُ باقی رہنا۔ مال کو فضل کہتے ہیں چونکہ یہ بھی انسان کی فضیلت کا ذریعہ ہے اور یہاں فضل سے مراد باتفاق مفسرین تجارت اور مال کا لین دین ہے۔ اور قرآن پاک میں دوسری جگہ فضل کا لفظ تجارت کے لئے بولا گیا ہے۔ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔ وابتغاء الفضل وَرَدَ فی القرآن بمعنی التجارۃ (قرطبی)
الفضل الزیادۃ عن الاقتصاد (راغب)
اَفَضْتُمْ۔ اس کے لفظی معنی انبوہ در انبوہ لوٹنے کے ہیں۔ یہ فَاضَ سے مشتق ہے۔ کہا جاتا ہے فَاضَ الاناء اذا امتلأ حتی ینصبّ عن نواحیہ (قرطبی) برتن بھر کر کناروں سے گرنے لگا۔ پانی چھلکنے لگا۔ فیّاض اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو کثیر العطاء سخاوت کرنے والا ہو۔ اصطلاح فقہ میں افاضہ عرفات سے مزدلفہ میں آنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب عرفات سے لوٹ کر مزدلفہ آؤ تو وہاں خدا کو خوب یاد کرو
اس کے برتن کو لباب بھر دیا۔
عَرَفَات۔ مکۂ معظمہ سے جو سڑک مشرق کی جانب طائف کو جاتی ہے اس پر مکہ سے کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر کئی میل کے رقبہ کا ایک لمبا چوڑا میدان پڑتا ہے اس کو عرفات کہتے ہیں (ماجدی) یہ عرفہ کی جمع ہے اور عرفات اس خاص مقام کے لئے بطور اسم علم کے استعمال ہوتا ہے
صاحب تفسیر قرطبی نے تفصیل کے ساتھ اس کے ماخذ کا ذکر کیا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

مَشْعَرِ الْحَرَامِ۔ مَشْعَر کے لفظی معنی نشانی اور علامت کے ہیں اور الحرام اس کی تعظیمی صفت ہے۔ یہ اس خاص مقام کا نام ہے جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ہے۔
اور پورے میدان مزدلفہ کو بھی مشعر حرام کہتے ہیں مشعر حرام کو جمعؔ بھی کہا جاتا ہے چونکہ اس میں مغرب و عشاء کی دونوں نمازوں کو جمع کیا جاتا ہے۔
مزدلفہ کو مشعر حرام اس لئے کہتے ہیں کہ حدود حرم میں ہے۔ جبکہ عرفات حدود حرم سے خارج ہے
مزدلفہ کو مزدلفہ کیوں کہا جاتا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ اِزْدِلَافٌ سے مشتق ہے جس کے معنی تقرب حاصل کرنے اور قریب ہونے اور ملاقات کرنے کے ہیں۔ جناب آدم و حوا کو جنت میں کے دو مختلف مقامات پر اتارا گیا تو ان کی پہلی ملاقات مزدلفہ میں ہوئی۔ یعنی وہ مقام ہے جس میں سب سے پہلے انسانی جوڑے کی ملاقات ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ مقام خود ایسا ہے کہ لاکھوں بندگانِ خدا یہاں اپنا تعلق خدا سے جوڑتے ہیں اور خدا کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ مزدلفہ وہ مقام ہے جہاں بندہ خدا سے ملاقات کرتا ہے۔ اور خدا کے نزدیک ہوتا ہے۔

المشاعر: المعالم الظاهرة۔ وانما سُمّيت المزدلفة المشعر لانها داخل الحرام (ابن کثیر) مشعر حرام سے مراد باجماع امت مزدلفہ ہے۔ عبداللہ بن عمرو سے جب سوال کیا گیا کہ مشعر حرام کونسا مقام ہے تو انھوں نے مزدلفہ پہنچکر کہا کہ یہ مقام ہے مشعر حرام۔ (ابن کثیر)

انما سُمّيت بفعل اهلها لانهم يزدلفون الى الله ويتقربون بالوقوف فيها (قرطبی)

علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ:
لم يختلف اهل العلم ان المشعر الحرام المزدلفة۔ (احکام القرآن)

الضَّآلِّيْنَ۔ ضَلَّ يَضِلُّ ضِلَالاً و ضَلَالَةً۔ گمراہ ہونا۔ بے راہ روی اختیار کرنا۔ گم ہونا۔ راستہ سے ہٹ جانا۔ بے دینی اختیار کرنا۔ جہالت۔ نادانی۔ بھول چوک وغیرہ۔
ضلالت ہدایت کی ضد ہے۔ ضلّ عن الطريق راستہ بھٹک گیا اور ضلّ الشیٔ عنہ۔ چیز گم ہوگئی۔ لفظ ضالین جمع اور

ضال واحد ہے۔ اس کی جمع ضُلّال بھی آتی ہے
یہاں ضلال سے مراد ناواقفیت اور امورِ مُلک
سے بے خبری ہے۔ صاحب مفردات علامہ
راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ ضلال کی دو قسمیں ہیں
ایک ضلال علوم نظریہ میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ
معرفتِ الٰہی اور اس کی وحدانیت اور نبوت
وغیر ذلک من الحقائق۔ ان علوم نظریہ کی
طرف ان آیات میں اشارہ ہے
وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ
وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلاً بَعِیْدًا
دوسری قسم ضلالت کی علوم عملیہ کی ضلالت ہے
جیسا کہ احکامِ شرعیہ کی معرفت اور اصول عبادات
سے بیگانگی۔
اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلاً بَعِیْدًا۔
غرض یہ کہ ضلال کے اصل معنی راہِ مستقیم
سے انحراف کے ہیں یہ انحراف چاہے تھوڑا
ہو یا زیادہ۔ الضلال: العدول عن
الطریق المستقیم (راغب)
پھر یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ
عدول عن الطریق عمداً ہو یا سہواً ہر دو کو ضلال
کہا جاتا ہے۔ اور جب لفظ ضلال کی نسبت
انبیاء کی طرف ہو تو مراد سہو ہوتا ہے۔

حَسَنَۃ ۔ وہ طاعت ہے جو اللہ کے
نزدیک پسندیدہ اور بہتر ہے اور اس کے
اندر ہر قسم کی خیر و خوبی آگئی (ماجدی)
اس لیے حسنات کو نکرہ استعمال کیا گیا ہے۔
انّ حَسَنَۃ نکرۃ فی سیاق الدعاء فھو
محتمل لکل حسنۃ من الحسنات (قرطبی)
حسنہ کا لفظ عام ہے۔ تمام جسمانی اور مالی
نعمتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔
الحسنۃ یُعَبّر بھا عن کل ما یسر من نعمۃ تنال
الانسان فی نفسہ وبدنہ (راغب)
اسی سے احسان ہے۔ کسی کے ساتھ
حسن سلوک کرنا۔ نیکی کرنا۔ اصل حق سے
زیادہ دینا۔
عَدل: حق پورا دینا اور پورا لینا ہے۔ اس سے
زائد، خوشی سے زیادہ دیدینا احسان میں شمار ہے
نَصِیْبٌ ۔ یہ نَصَبَ یَنْصُبُ سے
ماخوذ ہے۔ کسی چیز کو گاڑنا۔ کھڑا کرنا۔ تھکنا
مرض کو نصب کہتے ہیں اور نُصُب وہ مقامات
(تھان) جہاں غیر اللہ کے نام پر نذریں وغیرہ
دی جاتی ہوں۔ اسی سے نصیب ہے متعین شدہ
حصہ کو کہتے ہیں۔ اور نصیب اس پتھر کو بھی کہتے
ہیں جو بطور یادداشت کے کہیں گاڑا گیا ہو۔
اور نُصُب ان پتھروں کو بھی کہتے ہیں جہاں پر

مشرکین اپنے آلہہ باطلہ کی قربانیاں کرتے
تھے ۔ قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے
کہ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ ۔
تعب اور تھکاوٹ پر بھی نصب کا لفظ
بولا گیا ہے ۔ قرآن میں ہے : لَقَدْ لَقِیْنَا
مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ۔ والنصیبُ
الحظّ المنصوب (راغب) یعنی متعین حصہ

سَرِیْعُ ۔ یہ سَرُعَ یَسْرُعُ سِرْعًا و
سُرْعَۃً سے ماخوذ ہے ۔ سَرِیْعٌ صفت ہے ۔ جیسا کہ
عَظُمَ یَعْظُمُ سے عظیم ۔
جلدی کرنے والا ۔ والمعنی فی الآیۃ
اَنَّ اللّٰہ سبحانہ سریع الحساب لا یحتاج
الی عدٍّ ولا الی عَقْدٍ ۔ وقیل سریع
المجازات للعباد باعمالھم (قرطبی)
مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کو بدلہ
دینے میں کوئی دیر نہیں لگے گی کیونکہ وہاں گننے
اور شمار کرنے کی احتیاج نہیں ہے وہ علیم و حکیم ہے

الْحِسَابِ ۔ گننا ، شمار کرنا ۔ الحساب
مصدر ہے جیسا کہ محاسبۃ ۔ حَسِبَ یَحْسَبُ
حِسَابًا و حِسَابَۃً و حُسْبَانًا و حِسَابًا و
حُسْبَانًا ۔ اور کبھی شے محسوب کو حساب کہہ دیا جاتا ہے (قرطبی)

تَعَجَّلَ ۔ عَجِلَ یَعْجَلُ عجلًا و عُجْلَۃً
جلدی کرنا ۔
کہتے ہیں عَجِلَ بِہٖ اِلَیْہِ ایک کام سے
دوسرے کی طرف جلدی کرنا ۔ تَعَجَّلَ فی
الامر کام میں جلدی کرنا ۔ استعجال :
جلدی طلب کرنا ۔ برانگیختہ کرنا ۔ یہاں
تعجیل سے مطلب یہ ہے کہ منیٰ سے مکہ کی
طرف روانگی کے لئے دونوں صورتیں جائز ہیں ۔
اگر کوئی شخص دس دن کے بعد صرف دو دن
قیام کر کے ۱۲ کی شام کو مکہ چلا آئے تو بھی
درست ہے ۔ اور جس کا جی چاہے ۱۳ تک
وہیں ٹھہرا رہے جب بھی ٹھیک اور بہتر ہے

یُعْجِبُکَ ۔ آپ کو تعجب میں ڈالتا ہے
اَعْجَبَہٗ و عَجَّبَہٗ ۔ تعجب میں ڈالنا ۔ حیرانی
میں ڈالنا ۔ عَجِبَ یَعْجَبُ عَجَبًا ۔ خوش
ہونا ، پسند کرنا ۔ تعجّب ۔ فریفتہ ہونا
کہتے ہیں تعجّبنی فلان ۔ فلاں نے مجھے
فریفتہ کر دیا اور فتنہ میں ڈال دیا ۔
یُعْجِبُکَ ۔ صیغہ واحد مذکر غائب از
باب افعال ، کاف ضمیر منصوب متصل مفعول بہ
کی ہے ۔ العُجْبُ ۔ فخر ۔ تکبّر ۔ خود بینی ۔ پیش
آنے والی چیز سے انکار ۔
العُجْبُ ۔ ہر چیز کا پچھلا حصہ ۔ دُم کی جڑ ۔
جمع عُجُوْبٌ ۔
عُجَاب اور عجیب وہ چیز جس پر تعجب

کیا جائے۔ عجیبۃ۔ جس پر تعجب کیا جائے۔
جمع عجائب۔

عجب اور تعجب آدمی کی وہ کیفیت ہے
جو کسی چیز کا سبب سمجھ نہ آنے کی وجہ سے
طاری ہوتی ہے۔

العجب والتعجب حالۃ تعرض للانسان
عند الجهل بسبب الشئ (راغب)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ
یعنی آپ کو اس کی باتیں تعجب میں ڈال دیتی ہیں
اس سے اخنس بن شریک مراد ہے۔

اَلَدُّ۔ الدّ کے معنی شدید الخصومۃ
کے ہیں۔ یعنی سخت جھگڑالو ہے۔

لَدَّ يَلُدُّ لَدًّا و لَادَّ لِدَادًا و مُلَادَّۃً۔
لَدَّہٗ عَنِ الشئِ منع کرنا۔ روکنا۔ لادّعنہ
مدافعت کرنا۔ الاَلَدُّ الخصیم الشدید
شدید باتونی۔ رَجُلٌ الَدُّ و امرأۃ لَدَّاءُ
(قرطبی)

اَلْخِصَامِ۔ یہ خَاصَمَ کا مصدر ہے
جھگڑا کرنا۔ جیسا کہ خلیل نحوی کا قول ہے
اور زجاج کے نزدیک یہ خصم کی جمع ہے
جیسا کہ کلبٌ اور کلابٌ اور صعبٌ صِعابٌ
مطلب یہ ہے کہ وہ بہت جھگڑالو ہے۔
معنی اول کے اعتبار سے باب مفاعلۃ کا
مصدر ہے اور ثانی کے اعتبار سے خصمٌ
کی جمع ہے۔ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خصام
مصدر ہے۔ چونکہ قرآن میں ہے۔ وَهُوَ فِي
الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ۔ یہاں الخصام
مصدر ہے۔

الخصیم: شدید المخاصمۃ۔ و
خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ۔ (نحل ۴)
الخصیم۔ یہ خصومت کے لئے خاص ہے۔
قرآن میں ہے قَوْمٌ خَصِمُوْنَ[1]۔ یہ صفتِ
مشبہ کا صیغہ ہے (زخرف ۵۸)

واصل المخاصمۃ ان یتعلق کل واحدٍ
بخصم الآخر ای جانبہ۔ (راغب)
اصل میں خصمٌ کے معنی کنارہ کے ہیں۔ اور
مخاصمہ کے معنی ایک دوسرے کو کنارے
سے پکڑنے کے ہیں۔ بوری کو کونے سے پکڑ کر
کھینچنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
ایک حدیث میں ہے نَسِيْتُهَا فِي خُصْمِ
فراشي۔ میں اس کو بستر کے کونے میں
بھول آیا ہوں۔ (راغب)

اَلْحَرْثَ۔ کھیتی۔ صفتِ فاعلی حارثٌ،
جمع حُرَّاث۔ صفت مفعولی حریثۃ جمع حرائث
حَرَثَ الْاَرْضَ۔ زمین میں ہل چلانا۔ حرث
المال۔ مال کو جمع کرنا۔ حرث الشئ۔ کسی چیز

[1] جھگڑالو لوگ

اچھی طرح مطالعہ کرنا۔ المحرث ھل۔ زمین کھودنے کا آلہ۔ حَرَثَ یَحرُثُ۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ حرث کے معنی لغوی شق کرنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ الحرث فی اللغۃ الشق و منہ المحراث لما یُشقّ بہ الارض

اسی طرح مال کمانے اور جمع کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے اُحرُثْ لدنیاکَ کانكَ تعیش اَبدًا۔

امام راغب فرماتے ہیں: الحرث القاء البذر فی الارض وتھیئوھا للزرع (مفردات)

حرث کا لفظ قرآن پاک میں عورتوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے کہ حرث سے مراد کھیتی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ حرث سے اشارہ عورتوں کی طرف ہو اور نسل سے مراد اولاد ہو۔ وَیُھْلِكَ الحَرْثَ وَالنَّسْلَ یتناول الحرثین (راغب)

اور آیت نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ میں حرث سے مراد عورتیں ہی ہیں۔

اَلنَّسْل ۔ اصلہ الخروج والسقوط۔ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ ۔ وَمِنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ۔ (قرطبی) النسل: الانفصال عن الشیٔ۔ (راغب) ایک چیز کا دوسری چیز سے نکلنا۔ جدا ہونا اور گرنا۔ نَسَلَ الطَّآئِرُ الرِّیش ۔ جانور کا پر جھاڑنا۔

النَّسْلُ من كل شیٔ من الحیوان۔ (ماجدی)

النّسل : اولاد۔ خلق۔ ذُرِّیّۃ۔

اَلْعِزَّۃُ ۔ عَزَّ یَعِزُّ عِزًّا وَعِزَّۃً وَعَزَازَۃً عزیز ہونا، قوی ہونا، کمیاب اور قلیل ہونا، دشوار اور سخت ہونا۔

اَلْعِزَّۃُ: یہ لفظ قرآن کریم نے خالق کائنات کی صفت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یعنی وہ ذات جس کا غلبہ اور اقتدار پوری کائنات پر حاوی ہے

عَـزَّہٗ مدد کرنا، عزت کرنا۔

عَزَّہٗ فی الکلام: گفتگو میں غالب آنا۔ قرآن میں ہے: عَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ۔ گفتگو میں مجھ پر غالب آگیا ہے۔

عزت دراصل اس حالت کا نام ہے کہ انسان کو وہ شرف حاصل ہو کہ مغلوب نہ ہو۔

العزّۃ حالۃ مانعۃ للانسان من ان یُغلب (راغب)

العزۃ القوۃ والغلبۃ (قرطبی)

یہاں عزت سے مراد جاہلانہ حمیت ہے۔ کہ جب اس کو خدا کا حکم یاد دلایا جاتا ہے تو جہالت اس کو برانگیختہ کر دیتی ہے اور بھڑک اٹھتا ہے کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں اور یہ مجھے کیا دعوت دیتے ہیں لہٰذا وہ اہل اسلام کی دشمنی پر اتر آتا ہے۔ العزّۃ ھنا الحمیّۃ (قرطبی)

اسی سے عزیزٌ ہے جو غالب ہو مغلوب نہ ہو۔

حَسْبُہٗ - حَسَبَ یَحْسُبُ حِسَابًا وحِسْبَانًا وحسبۃً وحِسَابَۃً۔ شمار کرنا۔ گننا۔

حَسُبَ یَحْسُبُ حَسَبًا: شریف الاصل ہونا۔ صفت حَسِیْبٌ۔ جمع حُسَبَاءُ۔

حَاسَبَ مُحَاسَبَۃً: حساب کی جانچ پڑتال کرنا

لفظ حسب کفایۃ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں اکثر یہی مراد ہوتے ہیں۔

حَسْبُنَا اللّٰہُ ای کافینا۔ حَسْبُھُمْ جَھَنَّمُ، کافیھم۔

حَسْبُہٗ جَھَنَّمُ کا مطلب یہ ہوگا کافیہ جَھَنَّمُ۔ یعنی اس کو جہنم کافی ہے

وحَسْبُ یُسْتَعمل فی معنی الکفایۃ (راغب)

الْمِھَادُ - مَھْد اور مِھاد۔ وہ مکان جو نیند کے لئے تیار کی جائے۔

مَہد: زمین پر بچے کو سُلانے کے لئے بستر بچھانا۔ اَلْمِھَادُ: قرارگاہ۔ ٹھکانا۔

مَھَدَ یَمْھَدُ فرش بچھانا۔ مَھْدٌ اور مِھَادٌ بستر۔ فرش۔ جمع مُھُوْدٌ اور اَمْھَادٌ۔ مَھد کی جمع مِھاد بھی ہے۔

والمِھَاد جمع المھد وھو الموضع المُھَیّأ للنوم ومنہ مھد الصبی (قرطبی)

المَھْدُ ما تُھَیّئُ للصبی (راغب)

مَرْضَاتِ - المرضات: الرِّضا، یقال رَضِیَ یَرْضٰی رِضًا ومَرْضَاۃً۔ راضی ہونا۔ خوش ہونا۔ صفت رَاضٍ، جمع رَضُوْن وراضون اور رَضِیٌّ کی جمع ارضیاء ورُضَاۃٌ ہے۔ مَرْضَاۃِ اللّٰہِ یعنی اللہ کی رضا جوئی۔ مرضاتٌ مصدر میمی اور اسم مصدر ہے رضامند ہونا۔ پسند ہونا۔ رضامندی۔ خوشنودی۔

السِّلْمِ - ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً: کُوْنُوْا عَلٰی مِلَّۃٍ وَاحِدَۃٍ۔ واجتمعوا علی الاسلام واثبتوا علیہ۔ (قرطبی)

سِلْم کے معنی لغوی اعتبار سے صلح وامن کے ہیں۔ یہ حرب کے مقابل ہے۔ مگر یہاں مراد صلح وامن کے معنی نہیں ہیں بلکہ اسلام کے ہیں۔ اور اہل عرب کے کلام میں سلم کا لفظ اسلام کے معنوں میں آیا ہے۔

دعوتُ عشیرتی للسِّلم لمّا
رأیتھم تولّوا مدبرینا

یہ ایک کِندی شاعر نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کہا ہے۔ قبیلہ کِندہ کے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کی طرف لوٹ گئے تھے اور پھر مسلمانوں

کو یہ حکم ہے بھی نہیں کہ وہ سب صلح میں شریک ہوں ۔ بلکہ صرف اتنا حکم ہے اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا لیکن یہ کہ ابتداء بالصلح یہ شانِ مومن کے خلاف ہے ۔ لہذا یہاں سِلم سے مراد باتفاق مفسرین اسلام میں دخول کامل ہے ۔

فالسّلمُ هنا بمعنى الاسلام (قرطبی)

السِلم کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے ۔ نافع ، ابن کثیر اور کسائی نے بالفتح پڑھا ہے اور باقی قُرّاء نے کسرہ کی قرأت ہی کو اختیار کیا ہے (بیضاوی)

بعض حضرات نے سِلم ۔سُلم اور سَلم بالفتح میں فرق بیان کیا ہے ۔ ابو عمرو بن العلاء نے ذکر کیا ہے کہ سِلم سے مراد اسلام ہے اور جو سورہ محمد اور سورہ انفال میں ہے وہاں دونوں جگہ بالفتح سے مراد صلح اور مسالمہ ہے لیکن مبرد نے اس تقسیم کو رد کیا ہے ۔ عاصم بن جُحْدری نے یہ تقسیم کی ہے السِّلم: الاسلام و السَّلم: الصلح ۔ والسَّلَم بفتح اللام : الاستسلام یعنی الانقیاد لیکن محمد بن یزید نے ان تمام تعریفات کو ناپسند کیا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ ان تعریفات کی اصل قیاس پر ہے ۔ جب کہ اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ لغات کا فیصلہ قیاس سے کرنا غلط ہے بلکہ لغات کا تعلق صرف سماع سے ہوتا ہے ۔

لہذا صحیح یہ ہے کہ سِلم سَلم اور سَلَم تینوں کے معنی واحد ہیں ۔ جیساکہ مشہور لغوی عالم کسائی نے اختیار کیا ہے ۔

قال الکسائی السّلم والسَّلم بمعنی واحد وکذا هما عند اکثر البصريين وهما جميعًا يقعان للاسلام والمسالمة ۔ سِلم مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (قرطبی ج۳ ص۲۲)

كَآفَّةً ۔ لفظ کافّۃً جمیعًا اور عامّۃً کے معنی میں آتا ہے ۔ یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں حال واقع ہے ۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اُدْخُلُوا کی ضمیر سے حال ہو دوسرے یہ کہ سِلم بمعنی اسلام کا حال قرار دیا جائے ۔ پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ یعنی ہاتھ پاؤں، دل و دماغ ہر طرح سے اسلام کو اپنا لو ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے اسلام کا اظہار ہو مگر دل سے اقرار نہ ہو ۔ دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں ۔ یعنی کافۃً اسلام کی صفت ہوگی ۔ مطلب یہ ہوگا کہ دین کے تمام احکام کو قبول کرو ایسا نہ ہو کہ کچھ احکام تو اسلام کے لئے اور کچھ یہودیوں کے لئے اور ایک اور اسلام بنام یہودی اسلام رکھ لیا (ملخص از معارف مفتی)

كَافَّةً : كَفَّ يَكُفُّ كَفًّا وكَفَافَةً - منع کرنا۔ روکنا۔ كَفَّهٗ عَنِ الْاَمْرِ - کام سے روکنا۔ كَفَّ وكُفَّ بصره : اندھا ہونا۔ تَكَفَّفَ النَّاسَ : لوگوں سے مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلانا۔ الكَفَّةُ : ترازو کا پلڑا۔

الكِفَّة : ہر گول چیز۔ الكُفَّة : کنارہ۔ کسی چیز کی آخری حد۔ كُفَّةُ القميص : کرتے کے دامن کے اردگرد لگی گوٹ (منجد)

كِفَّةُ الميزان۔ یعنی ترازو کے پلڑے کو کفہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ چیز کو تفرق اور کمی زیادتی سے روکتی ہے۔ كَفُّ الانسان ہتھیلی کو کہتے ہیں کہ انسان کے نفع اور نقصان کو جمع کرتی ہے۔ یہیں سے کافہ جماعت کے معنوں میں بولے جانے لگا کہ جماعت بھی افراد کو تفرق و انتشار سے روکتی ہے۔ كافّة کی اصل كففتُ ہے۔ جس کے معنی ہیں منعتُ۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں اسلام میں داخل ہونے سے کوئی چیز نہ روکے۔

وهو مشتق من قولهم كففتُ اى منعتُ۔ اَوِ الكف المنع (قرطبی)

فَاِنْ زَلَلْتُمْ۔ زَلَّ يَزِلُّ زَلًّا وزَلَلًا و زُلُولًا : پاؤں کا پھسل جانا۔ گر جانا۔ سیدھی راہ سے ہٹ جانا۔ زَلَلٌ کا استعمال تو قدم پھسلنے میں ہے۔ پھر یہیں سے اس کو اعتقادات اور آراء کی بے راہ روی پر بھی بولے جانے لگا۔

زَلَلْتُمْ : اى تنحّيتم عن طريق الاستقامة۔ واصل الزلل فى القدم ثم استعمل فى الاعتقادات والآراء وغير ذلك۔ (قرطبی)

ظُلَل۔ یہ ظُلَّةٌ کی جمع ہے۔ بمعنی بادل سحاب۔ والظُّلَّةُ : السَّحَابة (راغب)

ظُلَّة : ہر وہ چیز جس سے سردی یا گرمی سے بچاؤ کیا جائے جیسے چھاتہ وغیرہ۔ جمع ظُلَلٌ وظِلَالٌ

الظِّلُّ : سایہ۔ جمع ظِلَال واظلال وظلول

ظُلَل ظُلَّة کی جمع تکسیر ہے جیسے ظُلْمَةٌ کی جمع ظُلَمٌ۔ ظِلّ بکسر الظاء کی جمع ظُلَّات اور ظِلَال آتی ہے جیسے کہ يَتَفَيَّؤُ ظِلٰلُهٗ، ظِل کی جمع قلت اَظْلَال ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ظِلَال ظُلَّة کی جمع ہو جیسا کہ قِلَال قُلَّةٌ کی جمع ہے۔ بعض نے فِي ظِلَالٍ مِنَ الْغَمَامِ پڑھا ہے۔ یہ ظِل کی جمع ہے۔ معنوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

الغَمَام۔ غَمَّ يَغُمُّ غَمًّا ڈھانکنا۔ غمگین کرنا غَمَّ القمرُ النُّجُومَ چاند نے

ستاروں کی روشنی کو ماند کر دیا۔ غم اور رنج کو غم اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ فرحت اور سرور کا ساتر ہے۔ اسی سے غمام بادلوں کو کہا جانے لگا۔ چونکہ یہ سورج کی روشنی کے لئے ساتر ہوتے ہیں۔

الغمُّ: ستر الشئ۔ ومنه الغمام لکونه ساترًا لضوء الشمس (راغب)

الغمام: السحاب الرقیق الابیض۔ سمّی بذلك لانه یغم ای یستر (قرطبی)

سَلْ ۔ سَاَلَ یَسْاَلُ سُؤَالًا وسَاَلَةً وَمَسْاَلَةً ۔ چاہنا۔ درخواست کرنا۔ کسی چیز کی حقیقت جاننے کے لئے پوچھنا۔

السُّؤَالُ: استدعاء معرفة او ما یؤدّی الی المعرفة واستدعاء مال او ما یؤدّی الی المال (راغب)

سَلْ اصل میں سُؤَال سے ماخوذ ہے۔ اصل میں اِسْئَلْ تھا۔ سین کو حرکت دے کر ہمزہ وصل کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ صیغہ اِسْئَلْ کے ہمزہ وصل کو گرانے کے بارہ میں اہل عرب میں دو طریق رائج ہیں اور قرآن پاک میں دونوں طرح کا استعمال موجود ہے۔ ایک یہ کہ جب سؤال ابتدائے کلام میں آئے تو ہمزہ وصل کو بالکلیہ گرا دیا جاتا ہے جیسا کہ یہاں موجود ہے سَلْ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ اور اگر یہ امر کا صیغہ حرف عطف کے بعد آئے تو ہمزہ کو برقرار رکھا جاتا ہے مگر متحرک نہیں ہوتا جیسا کہ وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ اور وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ

كَمْ ۔ یہ حروفِ استفہام میں سے ہے اور اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ استفہام عدد سے ہو جیسے كَمْ دِرْهَمًا لَكَ تمہارے پاس کتنے درہم ہیں۔ اس صورت میں اس کی تمیز منصوب ہوتی ہے۔ دوسرا كَمْ استفہام خبر کے لئے آتا ہے كَمْ عَبْدٍ مَلَكْتُ میں بہت سے غلاموں کا مالک ہوں كَمْ خبریہ کے معنوں میں کثرت کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس کی تمیز مجرور ہوتی ہے۔

حرف كَمْ یہاں ترکیب میں منصوب ہے اس لئے کہ یہ اٰتَيْنٰهُمْ کا مفعول ثانی ہے۔ بعض نے كَمْ کو ایک محذوف فعل سے منصوب کیا ہے۔ اور تقدیر کلام یوں بیان کی ہے كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ حرف كَمْ ہمیشہ اپنے مفعول سے مقدم ہوتا ہے چونکہ حروفِ استفہام صدرِ کلام کو چاہتے ہیں۔ آگے مِنْ اٰيَةٍ اس کی تمیز ہے۔ اس کے ممیز پر حرف مِنْ عموماً داخل ہوتا ہے جیسا کہ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۔ وكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ ۔

كم عبارة من العدد ویستعمل فی باب

الاستفهام و ینصب بعدہٗ الاسم الذی یمیّز بہٖ۔ (راغب)

والمراد بالآیۃ کم جاءھم فی امر محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اٰیۃٍ معرّفۃٍ بہ دالّۃً علیہ۔ (قرطبی)

زُیِّنَ ۔ زَانَ یَزِیْنُ زَیْنًا۔ زینت دینا خوبصورت بنانا۔ آراستہ کرنا۔ الزَّیْنُ مصدر ہے بمعنی آراستگی۔ خوشنما۔ یہ ضد ہے شَین کی، بمعنی بدنمائی۔ قباحت۔ برائی۔ عیب۔ زَیْنٌ کی جمع ازیانٌ۔ مُزَیِّنٌ: نائی۔ حجام۔ صفت زائن الزیّان: نہایت خوبصورت۔

حدیث میں ہے زَیِّنُوا القُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ قرآن کو حُسنِ آواز سے پڑھو۔ زِیْنَۃ: خوبصورتی بے عیبی۔

زینتِ حقیقی تو یہ ہے کہ انسان آخرت اور دنیا دونوں میں کامیاب ہو۔ امورِ دین کو بھی ٹھیک ٹھاک ادا کرے اور حقوقِ دنیا سے بھی غافل نہ ہو اور انسان کے لیے کسی بھی حال میں نقصان دہ نہ ہو۔

الزینہ الحقیقیۃ ما لایشین الانسان فی شیٔ من احوالہ لا فی الدنیا ولا فی الآخرۃ (راغب)

پھر زینت کی تین اقسام ہیں ایک زینت نفسیہ ہے جیسے کہ علمِ نافع اور اعتقاداتِ حسنہ اور دوسری زینت بدنیہ ہے۔ جیسا کہ قوتِ جسمانی اور اعتدالِ اعضاء اور طول وقامت کا تناسب اور تیسری زینت خارجیہ ہے قرآن پاک میں تینوں کا استعمال ہوا ہے۔ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ یہ زینت نفسیہ ہے۔ اور قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ یہ زینت خارجیہ ہے۔ چونکہ مشرک ننگے ہو کر طواف کرتے تھے قرآن نے کہا کہ زینتِ لباس کو تم پر کس نے حرام کیا ہے۔ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ فِیْ زِیْنَتِہٖ یہ زینت دنیوی ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ یہ زینت بدنیہ ہے۔ اگرچہ لفظ زینت یہاں نہیں مگر مراد زینت ہی ہے۔

زُلْزِلُوْا ۔ زَلَّ یَزِلُّ زَلًّا وَزَلَلًا وَمَزَلَّۃً صفت زَلِیْل و اَزَلُّ، مؤنث زَلَّاءُ۔ زَلَّ عَنِ الْحَقِّ وَالصَّوَابِ۔ صحیح راستہ سے پھر جانا۔ انحراف کرنا۔ زَلَلٌ مصدر ہے۔ زَلْزَلَ یُزَلْزِلُ زَلْزَلَۃً۔ شدید حرکت۔ ارتجاف الارض واھتزازھا جمع زَلَازِل: شدائد مصائب۔ یہ زلزلہ اشخاص و افراد میں بھی ہوتا ہے اور احوال و زمین میں بھی ہوتا ہے۔

والزلزلۃ: شدۃ التحریک۔ زَلْزَلَ اللّٰہُ

الارض زلزلۃ وزلزالاً بالکسر اذا تحرکت
واضطربت۔ (قرطبی)

زُلزِلُوا کے معنی ہیں انہیں خوفزدہ کیا گیا، انہیں خوب جانچا گیا یہاں تک کہ وہ بے ساختہ پکار اُٹھے کہ خدایا تیری مدد کب ملنے والی ہے
زُلزلوا خُوّفوا او حُرّکوا۔ وقال الزجاج اصل الزلزلۃ من زلّ الشئ عن مکانہ
(قرطبی)

الْقِتَالُ ۔ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ :
تمہارے اوپر لڑنا فرض کر دیا گیا ہے ۔
قاتل یُقَاتِلُ قِتالاً و قیتالاً و مُقَاتَلۃً لڑنا۔ دشمنی کرنا۔ قتال مصدر ہے۔ اس کی اصل قَتَلَ یَقْتُلُ قَتْلاً سے ہے ۔ قتل کے معنی جسم سے روح کا نکال دینا ہے اور روح کا جسم سے جدا ہوجانا ہے۔ پھر اگر روح کا اخراج قصداً خارجی قوت اور فعل سے ہو تو اس کو قتل کہتے ہیں۔ اور اگر روح کا خروج طبعی اسباب سے ہو جیسے مرض وغیرہ سے تو اس کو موت کہتے ہیں ۔
لفظ قتل لعنت اور بددعا کے لئے بھی قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے ۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ای لعنھم اللہ ۔ (التوبہ آیت ۳۰)
القتل : اصل القتل ازالۃ الروح عن الجسد کالموت لکن اذا اعتبر بفعل المتولی یُقال القتل ۔ واذا اعتبر بفوتِ الحیاۃ یقال موتٌ (راغب)

کُرۡہٌ ۔ کُرۡہٌ لَّکُمۡ تمہارے لئے دشوار ہے ۔ تمہیں گراں گزرتا ہے ۔ یہ ھُوَ کی خبر ہے ۔ کُرۡہٌ اور کَرۡہٌ دونوں کے معنی ایک ہیں ۔ ناپسند کرنا ۔ بُرا جاننا ۔ اسم فاعل کارِہٌ مفعول مکروہٌ ہے ۔ اور کَرُہَ یکرُہُ باب کرم سے ہو تو اس کی صفت کریہٌ آتی ہے بمعنی بدنما ۔ بعض اہل لغت نے کُرۡہٌ اور کَرۡہٌ بفتح الکاف میں فرق بیان کیا ہے کہ کُرۡہٌ وہ کام جس پر خود اپنے کو مجبور کیا جائے ۔ اور کَرۡہٌ بفتح الکاف وہ کام جو دوسروں کی مجبوری اور زبردستی سے کیا جائے بعض نے یہ فرق بھی بیان کیا ہے کہ کَرۡہٌ بالفتح وہ مشقت ہے جو انسان کو خارج سے لاحق ہوتی ہے جیسا کہ کوئی کام کسی کی مجبوری سے کرنا اور کُرۡہٌ بالضم اس کلفت و مشقت اور ناپسندیدگی کو کہا جاتا ہے جو اپنی ذات سے پہنچی ہو ۔ یعنی کسی کام کو طبعاً ناپسند کرتے ہوئے کرنا ۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ دونوں کے ایک ہی معنی آتے ہیں جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے ۔ قیل: الکُرہ والکَرہ واحد نحو الضَّعف والضُّعف
کُرۡہٌ لَّکُمۡ ۔ یہاں یہ کراہت فریضہ مذہبی

سے نہیں تھی بلکہ اس کا اصل منشا اہل و عیال اور وطن کی جدائی اور مفارقت تھی اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عکرمہ کا قول ہے کہ قتال اور جہاد محبوب ترین ہوگیا تھا۔ اور اس آیتِ کریمہ کے نزول پر صحابہ کرام بے ساختہ پکار اٹھے کہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا اور پھر یہ بات بالکل واضح ہے کہ کسی مامور بہ کو کما حقہ بجالانا ایک دشوار امر ہے پھر یہ کراہت کبھی طبعًا ذکر ہے جس سے فطرۃً بچنا دشوار ہے۔ باقی عقل و شرع کی رو سے کراہت تو اس کا صحابہ کی ذوات میں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اِکْرَاہٌ : مجبور کرنا۔ زبردستی کرنا۔ لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ دین میں زبردستی نہیں۔ کُرْہ لفظًا مصدر ہے مگر معنیً مفعول ہے مکروہ کے معنی دے رہا ہے جیسے خُبْزٌ بمعنی مخبوز پکی ہوئی روٹی۔

کَارِھُوْن : ناپسند کرنے والے۔ کَارِہٌ واحد ہے۔ باب سمع سے متعدی ہے۔

کَرِہَ : ناپسند کرنا۔ کَرَہَ (ف) ناپسند ہونا

شَرٌّ۔ شَرٌّ لَّکُمْ : وَھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وہ تمہارے حق میں باعثِ خرابی ہو۔ نقصان ہو

اَلشَّرُّ : کینہ۔ برائی۔ دشمنی۔ جنگ۔ عیب۔ جمع شُرُوْر۔ شِرَّۃٌ۔ تیزی۔ غصہ۔ طیش۔ حرص۔ شُرٌّ کراہت۔ ماقلتُ ذٰلکَ لِشُرِّكَ میں نے تیری کراہت کی وجہ سے یہ نہیں کہا۔

شَرِیْرٌ : شرارت کرنے والا۔ جمع اشرار و اَشِرَّۃ۔ شَرَّیَشِرُ وَیَشُرُّ : شری ہونا۔ شر انگیز ہونا۔ شَرًّا و شَرَارَۃً۔ مصدر شَرٌّ دھوپ میں سکھانا۔ شَرَّ اللَّحْمَ۔ گوشت کو دھوپ میں سکھایا۔ شَرَّ الثَّوْبَ : کپڑے کو دھوپ میں سکھایا۔

شر کی تعریف : شَرٌّ دراصل جامع لفظ ہے جو تمام اقسامِ سوء پر حاوی ہے۔

الشر : الذی یرغبُ عنہ الکل (راغب) شر وہ ہے جس سے سب کو نفرت ہو۔ یہ خیر کی ضد ہے۔ خیر وہ ہے جس کی طرف سب کو رغبت ہو۔

خَیْرٌ۔ بہتری۔ بھلائی۔ ہر اچھا کام یہ شر کی ضد ہے۔ عدل۔ انصاف۔

خیر کی تعریف : الخیر مایرغب فیہ الکل (راغب) خیر وہ ہے جس کو سب پسند کریں۔ خیر اور شر دونوں کی دو اقسام ہیں۔ ایک یہ کہ خیر ہر حالت میں خیر ہو اور ہر فرد کے لئے بہتر ہو جیسے کہ عقل عدل نیکی اور شر ہر حالت میں شر ہو اور ہر ہر فرد کے لئے شر ہو جیسا کہ قتل ناحق، چوری۔ زناکاری۔ دوسری قسم خیر و شر کی مقید ہے۔

ایک کے لئے خیر کا پہلو ہے اور دوسرے کے لئے
شر کا بھی امکان ہو۔ جیسا کہ مال وغیرہ۔ یہ بعض
کے لئے فتنہ اور شر ہے بعض کے لئے خیر کا ذریعہ
بھی ہے۔ جیسا کہ خود قرآن پاک میں ہے اِنْ
تَرَكَ خَيْرًا اگر وہ مال چھوڑے

صَدٌّ ۔ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ :
روکنا ہے خدا کی راہ سے ۔
صَدَّ يَصُدُّ صَدًّا ۔ صَدَّهٗ عن كذا :
روکنا۔ ہٹانا۔ منع کرنا۔ صَدَّ عنه : اعراض
کیا۔ صفت صَادٌّ جمع صُدَّادٌ۔ مؤنث
صادّة ۔ جمع صَوَادُّ و صُدَّادٌ ۔ مَاءٌ
صَدِيْدٌ : گندہ پانی جس میں خون اور پیپ
کی ملاوٹ ہو۔ (ابراھیم ۱۶)
وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ
وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ
عِنْدَ اللهِ (البقرۃ ۲۱۷)
ترکیب : صَدٌّ مبتدا۔ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ
صَدّ کے متعلق ۔ وَكُفْرٌۢ بِهٖ صَدّ پر معطوف
ہے ۔ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ مجرور معطوف ہے
سَبِيْلِ اللهِ پر اور یہ عَنْ کا مدخول ہے۔
ای صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ اور وَاِخْرَاجُ
اَهْلِهٖ کا عطف بھی صَدّ پر ہے اور ان تینوں
کی خبر اکبر ہے۔
قال القرطبی : وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ
ابتداء وَكُفْرٌۢ بِهٖ عطف على صَدٍّ
وخبر الابتداء اَكْبَرُ عِنْدَ اللهِ ای اعظم
اثمًا من القتال فی الشهر الحرام ۔
اس ترکیب کو امام قرطبی نے مبرّد کی طرف
منسوب کر کے صحیح قرار دیا ہے ۔

يَزَالُوْنَ ۔ زَالَ يَزُوْلُ زَوْلًا وزَوَالًا
جگہ سے ہٹ جانا ۔ زَالَهٗ يَزُوْلُهٗ زَيْلًا۔ ہٹانا۔
جدا کر دینا ۔ اپنے مکان سے الگ کر دینا ۔
زوال ایسی شے میں بولا جاتا ہے کہ پہلے ایک
جگہ میں ثابت اور قائم تھی بعد میں ہٹا دیا جائے
زاله یزیله زیلاً ۔ کسی چیز کو اس کی جگہ
سے ہٹا دینا۔
الزوال : يقال فی شئ قد كان ثابتًا
قبل ۔ (راغب)
لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ : وہ تمہارے ساتھ
جنگ جاری رکھیں گے
فعل زَالَ منفی معنوں کا متقاضی ہے ۔ جب اس
پر حرف نفی (لا) داخل ہوتا ہے تو اثبات
کے معنی دیتا ہے ۔ زالت الشمس مالتْ عن
كبد السماء (منجد)

يَرْتَدِدْ ارتدّ يرتدّ ارتدادًا :
ارتداد اور ردّت کے معنی ہیں جس راہ سے

آیا تھا اسی راہ سے لوٹ جانا۔ البتہ تھوڑا فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ رِدّۃ کفر کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ارتداد عام ہے۔
اصل مادہ رَدَّ یَرُدُّ رَدًّا ہے کسی چیز کو پھیر دینا۔ واپس کر دینا۔ قبول نہ کرنا۔
رَدَّ الباب: دروازہ بند کرنا۔ مُرتد: دینِ حق سے انحراف کرنے والا۔ کافر۔
الارتداد والرِّدۃ: الرُّجوع فی الطریق الذی جاء منہ (راغب)

حَبِطَتْ۔ حَبِطَتْ: حَبِطَ یَحبَطُ (س) حَبْطًا وحُبُوطًا۔ عمل کا بیکار ہو جانا۔
وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ
فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ۔ اللہ نے ان کے اعمال کو برباد کر دیا۔
اعمال کے حبط ہونے کی مختلف صورتیں ہیں
ایک یہ ہے کہ اعمال کی غرض وغایت محض دنیوی ہو تو ان کا چونکہ آخرت میں کوئی نفع نہ ہوگا لہٰذا یہ بھی حبط ہوئے۔ دوسری صورت یہ کہ اعمال تو اُخروی اور نیک طرز کے تھے مگر اعمال سے مقصود رضائے الٰہی اور حصولِ آخرت ہی نہ تھا۔ لہٰذا یہ بھی سود مند نہ ہونے کی وجہ سے حبط ہو گئے۔
اور تیسری صورت یہ ہے کہ اعمال بھی صالحہ تھے اور مقصود بھی آخرت تھی۔ مگر ان کے ساتھ معاصی اتنے تھے کہ ان کی پاداش میں اعمالِ صالحہ باعثِ نجات نہ بن سکے لہٰذا یہ حبط ہوئے۔
اعاذنا اللہ من حبط الاعمال۔
اصل حبط یہ ہے کہ جانور اتنا چارہ کھائے کہ پیٹ پھول جائے اور اس کو اپھارا ہو جائے
واصل الحبط من الحَبَطِ بفتح الباء وھو ان تکثُرَ الدابۃ اکلاً حتی ینتفخ (راغب)
حَبِطَتْ: ای فَسَدَتْ وبَطَلَتْ۔ ومنہ الحَبَطُ وھو فساد یلحق المواشی فی بطونھا من کثرۃ اکلھا الکلاء فتنتفخ اجوافھا (قرطبی)

ھَاجَرُوْا۔ ھَجْرٌ اور ھِجْرَان کے معنی ہیں جدا ہونا۔ چھوڑ دینا۔ مفارقت اور جدائی اختیار کرنا۔ ایک مقام کو ترک کر کے دوسرے کو اپنانا۔ انہوں نے دار الکفر سے ہجرت کی۔ انہوں نے وطن چھوڑا۔ (باب مفاعلۃ سے)
الھَجْرُ والھِجْرَان: مفارقۃ الانسان غیرہ (راغب)
الھجرۃ معناھا الانتقال من موضع الی موضع وقصد ترک الاوّل ایثارًا

للثانی (قرطبی)

هَجَرَ یَهجُرُ هَجرًا و هِجرانًا۔ الھجرۃ اسم ہے۔ اصطلاحِ اسلام میں ہجرت نام ہے دین و مذہب کی حفاظت اور بقاء کی خاطر اپنے محبوب و عزیز وطن اور برادری کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف نکل جانا جہاں ایمان کی حفاظت ہو سکے۔ پھر یہ ہجرت کئی اقسام کی ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ ہجرت بالبدن ہو جیساکہ فرمایا وَاهجُرُوهُنَّ فِی المَضَاجِع یہ کنایہ ہے ترکِ تعلق سے کہ ان کو تنہا چھوڑ دو ان کے ساتھ صحبت نہ کرو۔ اور دوسری ہجرت بالقلب ہے جیساکہ اِنَّ قَومِی اتَّخَذُوا هٰذَا القُراٰنَ مَهجُورًا یہ ہجران قلب ہے۔ وَاهجُرهُم هَجرًا جَمِیلًا۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد ھجران باللسان ہو اور ہجران بالقلب بھی محتمل ہے۔

جَاهَدُوا جاهَدَ یُجَاهِدُ مُجَاهَدَةً محنت اور کوشش میں پوری طاقت لگا دینا

الجُهدُ والجَهدُ والمجهود: طاقت ہمت۔ الجهاد بفتح الجیم سخت زمین بے نبات و بے ثمر۔ الجهاد بکسر الجیم۔ دین کی حفاظت کی خاطر اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے دشمنوں سے جنگ کرنا۔

جَهَدُوا فِی سَبِیلِ اللّٰهِ انھوں نے اللہ کی راہ میں لڑنے کا حق ادا کر دیا۔

الجُهدُ والجَهدُ: الطاقة والمشقّة

الجهاد: هو الدّعاء الی الدین (تعریفات)

الجهاد والمجاهدة: استفراغ الوسع فی مدافعة العدو (راغب)

الاجتهاد: اخذ النفس ببذل الطاقة وتحمّل المشقّة۔ راغب)

جاهد: مفاعلةٌ، من جَهَدَ اذا استخرج الجهد۔ (قرطبی)

یَرجُونَ ۔معناه یطمعون و یستقربون (قرطبی) اللہ کی راہ کی امید اور اس کا قرب چاہتے ہیں۔ اس میں ان مؤمنین کو بشارت ہے جن سے قتل ہو گیا تھا۔

رجا یرجوا رجًا و رَجَاءً ۔ اصل میں کنوئیں کے دونوں کناروں کو کہا جاتا ہے۔ جمع اَرجاء۔ امید میں بھی توقع اور ڈر دونوں ہوتے ہیں اس لئے رجاء کہا جاتا ہے۔

رَجَاءٌ ایسی امید جس میں خوف اور ڈر بھی ہو کہ شاید گرفت ہو جائے۔ اسی طرح خوف سے اس میں بہتری کی بھی امید ہوتی ہے۔

الرّجاء ظنٌّ یقتضی حصول ما فیه مسرّةٌ (راغب) والرجاء ابدًا معه خوف ولابدّ کما ان الخوف معه رجاء (قرطبی)

أُولٰٓئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللّٰهِ۔ یہ ہی لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔

اَلْخَمْرُ۔ خَمِرَ یَخْمِرُ و خَمَرَ یَخْمُرُ خَمْرًا چھپانا۔ پوشیدہ کرنا۔ خِمَار اس اوڑھنی اور دوپٹہ کو کہا جاتا ہے جس سے عورت اپنا سر چھپاتی ہے۔ جمع خُمُرٌ۔ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ۔ (النور ۳۱)

خمر کے لغوی معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ چونکہ شراب بھی انسان کی عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اسی وجہ سے اس کو خمر کہا گیا۔

والخمرُ سُمّیتْ لکونھا خامرۃ لمقرّ العقل (راغب)

ان لغوی معنوں کا اعتبار کرتے ہوئے بعض علماء نے ہر مسکر چیز کو شراب کے حکم میں قرار دے کر حرام کہا ہے۔

والخمر ماخوذۃ من خَمَرَ اذا ستر ومنه خمار المرأۃ۔ فلمّا کانت الخمرُ تستر العقل وتُغطّیه سُمّیت بذٰلك (قرطبی)

اَلْمَیْسِرُ۔ میسر مصدر ہے اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں یاسِر: تقسیم کرنے والا۔ جاہلیتِ عرب میں مختلف قسم کے جُوئے رائج تھے جس میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جوا کھیلا جاتا تھا بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے اور بعض محروم رہتے تھے۔ محروم رہنے والے کو پوری اونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی، گوشت سب فقراء اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اور جُوا جس طرح آج فرنگی تہذیب میں جائز ہی نہیں بلکہ تہذیب و ثقافت کا جزو ہے اسی طرح قدیم عرب کی تہذیب میں یہ دونوں چیزیں شرافت کا طغراء امتیاز تھیں۔

المَیْسِر اصل میں یَسَرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اپنے ساتھی کے لئے کسی چیز کو واجب کر دینا۔ کہا جاتا ہے یَسَرَ لی کذا اذا وَجَبَ۔ (القرطبی ص۵۲ ج۳)

المَیسر قِمَار العرب بالازلام (قرطبی)

میسر میں جوے اور قمار کی تمام شکلیں داخل ہیں۔ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر طرح کا قمار حرام اور ناجائز ہے۔

علامہ قرطبیؒ نے مجاہدؒ، محمد بن سیرینؒ، حسن بصریؒ، سعید بن مسیبؒ، عطاء، قتادہؒ، معاویہ، بن صالح، طاؤس و علیؓ بن ابی طالب و ابن عباسؓ کے اقوال نقل کئے ہیں کہ ہر وہ شے اور کھیل جس میں قمار ہو وہ میسر ہے

کل شئ فیہ قمار من نرد وشطرنج فھو المیسر حتی لعب الصبیان بالجوز والکعاب ۔ یعنی ہر چیز جس میں قمار بازی اور ہار جیت ہو وہ چاہے بچوں کے اخروٹ ، لکڑی کے گٹکے ہی کیوں نہ ہوں حرام ہیں ۔
اس میسر اور قمار بازی کی حرمت پر حضرت استاذ العلماء مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن جلد اول میں تفصیلی بحث کی ہے ۔ طالب حق کو معارف القرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے ۔ اس کی حرمت کی ایک بڑی اور معقول وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک کا نفع دوسرے کے نقصان پر موقوف ہے ۔

مَنَافِعُ ۔ یہ منفعۃؓ کی جمع ہے ۔ ہر وہ چیز جس سے فائدہ اٹھایا جائے ۔
المنفعۃ : جمع منافع : کل شئ ینفع بہ (منجد)
نَفَعَ یَنْفَعُ نَفْعًا ۔ نَفَعَہٗ بکذا ۔ فائدہ پہنچانا یہ ضَرٌّ کی ضد ہے ۔ نَافِع اسم فاعل ہے اور یہ اللہ تعالٰے کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے نافع وہ ذات جو دوسروں کو نفع پہنچائے نفّاعٌ بہت نفع دینے والا ۔
وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ : اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں ۔ مطلب یہ کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگائی اور دوسرے کا مال اپنا بن گیا ۔ اور دوسری بات یہ کہ غریب لوگوں کو عرب قمار بازی سے فائدہ تھا کہ گوشت ان کو مل جاتا تھا ۔
لیکن وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ان کا گناہ اور اس میں مخفی مضرتیں فائدوں سے بہت زیادہ ہیں ۔ لہذا اصحابِ عقل و دانش کو اس سے احتراز بہتر ہے ۔ چنانچہ محتاط صحابہ نے اس آیت کے نزول پر ہی شراب کو ترک کر دیا تھا ۔ انہوں نے مَنَافِعُ لِلنَّاسِ پر نگاہ نہیں رکھی بلکہ ان کی جانب اثم کو دیکھ کر ان کو چھوڑ دیا ۔

اَلْعَفْوَ ۔ عفوؔ سے مراد اتنا خرچ کرنا ہے جو اپنے اوپر بار نہ ہو ۔
العفو ماسَہُلَ و تیسّر وفضل ولا یشق علی القلب اخراجہ ۔ فالمعنی : العفو ما فضل عن حوائجکم ولم تؤذوا فیہ انفسکم فتکونوا عالۃ وھذا اولٰی ماقیل فی تاویل الآیۃ ۔ (قرطبی)
عفو کے بعد لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کا جملہ قابلِ غور ہے ۔ اسی سے عفو کے معنی متعین ہو جاتے ہیں ۔ یہ ارشاد اس لئے بیان فرمایا کہ تم خرچ کرنے میں غور و فکر سے کام لو ۔ جس طرح آخرت کی ضروریات ہیں اسی طرح دنیا کی ضروریات بھی ہیں ۔ اِن سے

قطع نظر کر کے خرچ کرنا درست نہیں کہ کل کو خود فقر و فاقہ کی نذر ہو جاؤ یا اہل و عیال کے حقوق ضائع ہو جائیں اور وہ بے سروسامان رہ جائیں۔ چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا ارشاد فرمایا کہ خیر الصدقۃ ما انفقت عن غنیً ۔ دوسری روایت میں ہے خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی حضرت قتادہؓ کا قول ہے کہ صَدَقۃ عن ظھر غِنیً : یعنی صدقہ بہتر وہ ہی ہے جس کے بعد آدمی خود فقر و فاقہ کا شکار نہ ہو جائے بلکہ وہ غنی رہے۔ علامہ قرطبیؒ نے حسن بصریؒ، قتادہؒ، عطاءؒ، سدی قرظیؒ، محمد بن کعب اور ابن ابی لیلیٰؒ کا قول بھی یہ ہی نقل کیا ہے کہ العفو ما فضل عن العیال عفو وہ ہے جو اہل و عیال اور بیوی بچوں کے اخراجات سے بچ جائے اس کو آخرت اور دنیا دونوں کا خیال رکھتے ہوئے خرچ کیا جائے

العفو: نقیض الجھد وھو ان ینفق مالا یبلغ الفاقۃ منہ الجھد ویقال للارض السّھلۃ العفو۔ (کشاف)

العفو: مایسھل الفاقۃ۔ (راغب)

عفو یہ عفا یعفو سے مصدر ہے

العفو: الفضل والمعروف، خیار الشئ و اطیبہ۔ (منجد)

ان آخری معنی کے لحاظ سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ جو مال خرچ کرو وہ اچھا اور پاکیزہ ہو۔ کما قال تعالیٰ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ۔ (البقرہ ۲۶۷)

تُخَالِطُوا۔ خَلَطَ یَخْلُطُ خَلْطًا۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ خلطٌ مصدر ہے۔ تخالطوا مفاعلہ سے ہے، ایک دوسرے سے ملنا جُلنا۔

ھٰذہ المخالطۃ کخلط المثل بالمثل کالتمر بالتمر (قرطبی)

مطلب یہ ہے کہ شریعتِ الٰہیہ کا اصل مقصود بچے کی مصلحت کو مدنظر رکھنا ہے۔ وہ خواہ اس کے اپنے ساتھ رکھ کر ہو یا علیحدہ رکھ کر اگر بچے کے مال کی مصلحت ان کے ساتھ رکھنے میں ہے تو ساتھ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر یہ خطرہ ہو کہ ساتھ رکھنے سے حدودِ خداوندی ملحوظ نہ رہ سکیں گی تو پھر خیر اجتناب میں ہے۔

لَاَعْنَتَكُمْ۔ اصل میں عَنِتَ یَعْنَتُ عَنَتًا کسی مشکل اور دشوار کام میں پڑنا۔ عَنَتٌ کے لفظی معنی ضرر اور زیاں کے ہیں پھر یہیں سے یہ ہلاکت کے معنوں میں بھی استعمال

ہونے لگا ہے۔

اَعْنَتَ باب افعال سے ہے جس کے معنی ہیں دوسرے کو مشکل میں ڈال دینا کہا جاتا ہے : اَعْنَتَ الرَّاکِبُ الدَّابَّۃَ سوار نے سوار کو مشکل میں ڈال دیا۔ اس پر اتنا لاد دیا جس کا اس کو تحمل نہ تھا۔

تعنّت کسی پر سختی کرنا۔ تَعَنَّتَہٗ : کسی کی تکلیف چاہنا۔ مُتَعَنِّتٌ : جو خواہ مخواہ دوسروں کی مشکلات کا طالب ہو، دوسروں کی تنگی میں اس کو راحت ہو۔

عنت کا لفظ فسق و فجور اور زناکاری پر بھی بولا جاتا ہے۔ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ میں بعض نے زناکاری کا خوف مراد لیا ہے مگر یہاں اَعْنَتَکُمْ کے معنی مشکل اور مشقت میں ڈال دینے کے ہیں۔

لَاَعْنَتَکُمْ : لحملکم علی العنت وھو المشقۃ ۔ (کشاف)

العنت: المشقۃ ۔ وقال ابن الانباری اصل العنت التشدید ۔ (قرطبی)

مطلب یہ ہے کہ اس مخالطت کی اجازت میں تمہارے لئے آسانیاں ہیں۔ اگر خدا چاہتا تو تمہیں دشواریوں میں ڈال دیتا۔

تَنْکِحُوْا۔ نَکَحَ یَنْکِحُ نِکَاحًا وَنَکْحًا : نکاح کرنا۔ عقد کرنا۔ شادی کرنا۔

اصلُ النکاح للعقد ثمّ استعیر للجماع۔ نکاح میں اصل معنی عقد کے ہیں۔ پھر اسی سے جماع کے لئے استعارۃً بولے جانے لگا۔

صاحب قرطبی نے نکاح کے اصل معنی جماع کے لئے ہیں۔

و نکح : اصلہ الجماع (قرطبی) لیکن نکاح کے معنی اصلی جماع مراد لینا محال ہے کیونکہ جماع کے جتنے بھی نام ہیں سب کنایۃً ہیں ھکذا اوجدتُ فی بعض التفاسیر۔

اَعْجَبَ۔ اَعْجَبَ یُعْجِبُ اِعْجَابًا : کسی کو تعجب میں ڈالنا۔ اعجاب : خوش ہونا، بھلی لگنا۔ اَعْجَبَ بنفسہ مغرور ہونا۔ العُجُب: تکبر غرور۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکوں کے ساتھ رشتہ مناکحت نہ کیا جائے، چاہے مشرک اپنے مال و دولت یا صحت و جمال کی بنا پر کتنا ہی بھلا لگتا ہو۔

اَلْمَحِیْضِ یہ مصدر میمی ہے معنی حیض کے مرادف ہے۔ حَاضَ یَحِیْضُ حَیْضًا و محیضًا و محاضًا۔ عورت کا ایام ماہواری میں داخل ہونا اسم فاعل حَائِضٌ وحائضۃ۔ جمع حُیَّضٌ وحوائض۔ الحیضۃ جمع حِیَض۔

المحیض: الحیض وھو مصدر (قرطبی)

اس آیت میں یہ حکم ہے کہ ایامِ حیض میں عورتوں سے صحبت نہ کی جائے۔ ان ایام میں مقاربت بالاتفاق ناجائز وحرام ہے۔

اَذًى - اَذِیَ یَأْذَی اَذًی وَاِذَاۃً تکلیف پانا۔

اَذًی ھُوَشَیْءٌ ماتَتَأَذّٰی بہ المَرأۃُ

یہاں اَذًی کنایہ ہے مخصوص گندگی سے

ھو کنایۃٌ عن القذر علی الجملۃ (قرطبی)

حَرْثٌ - حرث کے معنی عربی میں کھیتی کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ باغوں کی نوعیت کی ہو یا دوسری فصلوں کی۔ عورتوں کے لئے کھیتی کے استعارہ ایک سیدھا سادا پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لئے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے نیز بیج کھیتی ہی میں ڈالے جاتے ہیں۔ کھیت باہر نہیں پھینکے جاتے۔ کوئی کسان اس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اسی طرح عورت کے لئے فطرت کا یہ ضابطہ ہے، ایام ماہواری کے زمانہ میں یا کسی غیر محل میں اس سے قضائے شہوت نہ کی جائے اس لئے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جام اور غیر آباد گی کا زمانہ ہوتا ہے اور غیر محل میں مباشرت اذیت اور اضاعت ہے۔ اس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لئے اس کا ارتکاب جائز نہیں (تدبر قرآن)

حَرْثٌ : تشبیہ لانھن مزروع الذریۃ۔ فلفظ الحرث یعطی ان الاباحۃ لم تقع الا فی الفرج خاصۃً اذ ھو المزروع (قرطبی)

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے کسی نے سوال کیا کہ عورتوں کے پاس غیر محل میں جانا کیسا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ یہ آدمی مجھ سے کفر کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ یعنی اس فعلِ قبیح کو کفر قرار دیا۔ اور جمہور علماء کا فتویٰ یہی ہے کہ اس کا ارتکاب کفر ہے اعاذنا اللہ۔

حرث کے ایک معنی تو زمین میں بیج ڈال کر اس کو پھل وغیرہ اگانے پر تیار کرنا ہے کہ جو بیج اس میں ڈالا جائے وہ ضائع نہ ہو۔

الحرث : القاء البذر فی الارض وتھیؤھا للزرع۔ (راغب)

محروث کو بھی حَرْث کہا جاتا ہے۔

اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ زمین میں ہل چلانا

فاعل حارث جمع حُرّاث وحَرَّاث

حَرْثٌ وہ زمین جس میں تخم ریزی ہوتی ہے۔ اور غلّۃ کا نشو ونما ہوتا ہے۔

اور غلہ سبزی کا نشوونما ہوتا ہے۔

اَنّٰی ۔ اَنّٰی کے مشہور و معروف معنی کَیْفَ و اَیْنَ کے ہیں۔ یعنی جس طرح کے جس کیفیت کے ساتھ اور جدھر سے جس جہت سے کے ۔ قرآن پاک میں لفظ اَنّٰی ۔ کَیْفَ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ یہاں اَنّٰی، کَیْفَ کے معنی معنی میں ہے

مطلب یہ کہ کَیْفَ شِئْتُمْ مِنْ قِیَامٍ وقُعُوْدٍ واضطجاعٍ واقبالٍ وادبارٍ
(جلالین)

دوسرے معنی حرف اَنّٰی کے اَیْنَ کے ہیں یعنی جدھر کے جس رُخ کے ۔ مطلب یہ کہ جدھر سے چاہو عورت سے اپنی خواہش پوری کرو۔ اس معنی سے بعض فاسد مزاجوں نے عورت سے غلط کاری کو جائز قرار دیدیا، جس کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی

تیسرے معنی حرف اَنّٰی کے مَتٰی کے ہیں اس صورت میں اَنّٰی ظرف زمان کے طور پر ہوگا اور معنی یہ ہوں گے کہ آپ جس وقت چاہیں رات کو یا دن کو اپنی کھیتی کو جا سکتے ہیں۔ اَنّٰی شِئْتُمْ مِنْ لیلٍ ونہارٍ ۔ ای فی مَتٰی زمانٍ اَردتُمْ
(ماجدی بحوالہ بحر محیط)

دراصل اَنّٰی حرف استفہام ہے۔ یہ ایسے امر کے بارے میں سوال کرنے میں بولا جاتا ہے جس کے کئی رُخ ہوں اور کسی کو بغیر بیان کے متعین کرنا مشکل ہو۔ یہ این ۔ کیف اور متٰی سے عام ہے ۔ یہاں مقام و محل تو اگرچہ متعین اور مقرر تھا لیکن چونکہ خود اس محل میں داخلے کی صورتیں مختلف تھیں اس لئے ایسا حرف بولا گیا جس میں تمام صورتوں کو محل مخصوص میں جائز قرار دیا۔

اَنّٰی: تجیئ سوالاً واخباراً عن امرٍ له جھات ، فھو اعمّ فی اللغۃ من کیف ، ومن این ، ومن متٰی ۔ (القرطبی ص ۹۳ ج ۳)

عُرْضَةً ۔ عُرْضَةً کے عام اور متداول معنی ہدف یا نشانہ کے ہیں اور عُرضہ وہ شے جس کے ذریعہ انسان اپنا بچاؤ کرتا ہے یعنی ڈھال وغیرہ ۔

عُرضہ کے ایک معنی حجاب کے بھی ہیں۔ صاحب کشاف نے انھیں معنی کو ترجیح دی ہے ۔ ای حاجزاً لما حلفتم علیہ (کشاف)

عُرْضَةً فُعلۃ کے وزن پر ہے بمعنی مفعول ہے جیسا کہ قُبضۃ بمعنی مقبوض ۔

طاقت اور ہمت کو عُرضہ کہتے ہیں۔ ھو عُرضۃ لکذا ۔ وہ اس کی طاقت رکھتا ہے ۔

ھو عُرضۃ للناس وہ لوگوں کے طعن و تشنیع کا ہدف اور نشانہ ہے ۔

العِرضُ : عزت، اچھی عادات ۔ جمع اعراض
العُرضُ: دامنِ کوہ، جانب، کنارہ ۔
العَرضُ : سامان، متاع ۔ غیر دائمی شئے ۔ کہتے ہیں ھٰذا الامر عرضٌ یہ امر زائل ہونے والا ہے ۔ اس کی جمع بھی اعراض ہے ۔

مطلب یہ کہ اللہ کے نام کو امورِ خیر سے رُکنے کی ڈھال نہ بناؤ اور اسم باری کو نشان بنا کر غریبوں سے پہلو تہی نہ کرو ۔

اللَّغْو ۔ یہ لَغَا یَلْغُوْ ولَغِیَ یَلْغیٰ لَغْنًا سے ہے ۔ ایسا کام اور کلام جو بے ضرورت ہونے کے علاوہ بے محل بھی ہو اور کوئی فائدہ بھی اس میں نہ ہو ۔

اللغو من الکلام مالا یُعتدّ بہ وھو الذی یورَدُ لاعن رویّۃ وفکر فیجری مجری اللغا ۔ وھو صوتُ العصافیر ونحوِھا من الطیور ۔ (راغب)

یُؤْلُوْنَ ۔ اٰلیٰ یُؤلی ایلاءً واَلِیّۃ قسم کھانا ۔ اَلِیّۃ : قسم، جمع الاَیَا ۔

شاعر کہتا ہے

قلیل الالایا حافظٌ لیمینہ
وان سبقت منہ الألیّۃ برّتِ

مفسّرِ قرآن عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ عرب جاہلیت کے زمانے میں عورتوں کو ایذا دینے کے خاطر ایک سال دو سال تک ایلاء کرتے تھے جس کی وجہ مظلوم عورتوں پر بہت زیادتی ہوتی تھی اسلام نے اس کی حد بندی کر دی کہ ایلاء کی مدّت صرف چار ماہ ہے ۔ اس سے زیادہ ایلاء نہیں ہوگا بلکہ اگر چار ماہ کے اندر رجوع نہ کیا تو عورت خود مختار قرار پائے گی ۔

یؤلون : ای یحلفون (قرطبی)

والایلاء من ان یقول : واللہ لا اَقربکِ اربعۃ اشھر فصاعدًا (کشاف)

تَرَبُّص ۔ رَبَصَ یَرْبُصُ رَبْصًا
کسی کے لئے بھلائی یا برائی کا انتظار کرنا ۔
تربّص ۔ کسی امر سے رُک جانا ۔ انتظار کرنا ۔
التربّص : التأنّی والتأخّر ۔ (قرطبی)
التربّص : الانتظار بالشئ (راغب)

ایلاء کو چار ماہ میں محصور کرنے کا سبب یہ ہے کہ عورت اپنے فطری جذبات پر اس سے زیادہ مدت گزرنے سے صحیح معنوں میں قابو نہیں پا سکتی ۔ اللہ تعالیٰ نے ان بشری کمزوریوں کو ملحوظ فرماتے ہوئے چار ماہ کی مدّت مقرر فرما دی ہے ۔

فَاءُوْا ۔ فَاءَ یَفِیْئُ فیئۃ و فُیُوْءًا
رجوع کرنا ۔ لوٹنا ۔ واپس آنا ۔ جلدی سے پیچھے کی طرف لوٹنا ۔

فاءوا : معناہ رجعوا و منہ قولہ

حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ ۔ (قرطبی)
الفیئۃ : الرجوع ۔ اسی سے زوال کے بعد کے سایہ کو فَیْءٌ کہتے ہیں ۔ اس لئے کہ وہ مشرق سے مغرب کی جانب لوٹتا ہے ۔

عَزَمُوْا ۔ عَزَمَ یَعْزِمُ عَزْمًا وَعَزِیْمَۃً ۔ کسی کام کو کرنے کا پختہ ارادہ کرنا ۔ امرٌ عَازِمٌ وہ کام جس کا پختہ ارادہ ہو ۔ عزیمۃ : پختہ ارادہ جمع عزائم ۔ عازم فاعل ۔ جمع عازمون وعَزَمَۃ ۔

العزم والعزیمۃ : عقد القلب علی امضاء الامر (راغب)

العزیمۃ : تتمیم العقد علی الشئ (قرطبی)

قُرُوْء ۔ لفظ قُرُوْء مشترک المعنی ہے ۔ حیض کے معنی بھی دیتا ہے اور طہر کے بھی لغت میں قُرْء کے معنی وقت معلوم کے ہیں جیسا کہ ابن قتیبہ کا قول ہے اصل القُرء فی کلام العرب الوقت ۔ لیکن اس سے میعاد کا آغاز بھی مراد ہو سکتا ہے اور میعاد کا اختتام بھی ۔ دونوں مفہوم ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور لغت عرب میں دونوں کا استعمال ہے ۔ علامہ رازی نے ابو عبیدہ کا قول نقل کیا ہے کہ الاقراء فی کلام العرب من الاضداد ۔ (کبیر)

القرء کے معنوی اختلاف کی وجہ سے فقہاء اور مفسرین میں بھی اختلاف رائے ہوا ہے ۔ ایک معتبر جماعت نے قرء کو طہر کے اور پاکی کے معنوں میں لیا ہے ۔ ان حضرات کی اصل بنیاد حضرت عائشہ رضؓ کا قول ہے ۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ انما الاقراء الاطہار ۔ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن سے سنا ہے کہ ما ادرکتُ احدًا من فقہائنا الا یقول ذلک، یرید قول عائشۃ ۔ یعنی ابوبکر بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے قول عائشہ رضؓ کے خلاف کسی فقیہ کو کہتے ہوئے نہیں سنا ۔

امام شافعی، امام مالک اور دیگر بہت سارے فقہاء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے ۔ لیکن دوسری طرف حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ ابن مسعودؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے اجلہ صحابہ کرام ہیں جن کی تعداد فقہاء و مفسرین نے تیرہ تک بیان کی ہے ۔ یہ تمام حضرات اس پر متفق ہیں کہ قرء حیض اور ناپاکی کے معنوں میں ہے ۔
چنانچہ امام ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور تمام ائمہ حنفیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے ۔ ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ قال اصحابنا جمیعًا الاقراء الحیض وھو قول الثوری والاوزاعی

والحسن بن صالح (احکام القرآن ص ۳۶۴ ج ۱)
اور ائمہ لغت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔
قرأت المرأۃ اذا حاضت فھی مقرئ
وقال الاخفش اقرأت المرأۃ اذا صارت
صاحبۃ حیض (قرطبی)
والقرء فی الحقیقۃ اسم للدخول فی الحیض
عن طھر (راغب)
قرءٌ واحد ہے۔ اس کی جمع قروءٌ اقرءٌ
اور اقراءٌ آتی ہے۔ پوری تفصیل قرطبی اور
احکام القرآن للجصاص میں دیکھئے۔

اَرْحَامٌ۔ یہ رحم کی جمع ہے۔ رَحِمٌ
اور رِحْمٌ بچہ دانی۔ رشتہ داری۔
ذوی الارحام: رحم کے رشتے۔

بُعُوْلَۃ: یہ جمع ہے، بمعنی خاوند۔
شوھر۔ اس کی واحد بعلٌ آتی ہے۔
البعولۃ جمع البعل وھو الزوج (قرطبی)
البعل ھو الذکر من الزوجین۔
قال اللہ تعالیٰ: ھٰذا بَعْلِیْ شَیْخًا۔
وجمعہ بُعُوْلَۃٌ (راغب) لغوی اعتبار
بعل کے معنی مالک اور سردار کے ہیں۔
اس مالکیت اور بلندی کے معنی کے لحاظ سے
خاوند کو بعل کہا گیا ہے۔ وسمّی بعلاً لعلوّہ
علی الزوجۃ بما قد ملکہ من زوجیتھا (قرطبی)

بَاعَلَ القومُ قوم نے باہم ایک دوسرے
میں شادیاں کیں۔ بُعول اور بِعال دو جمع
ہیں۔ بعولۃ کے آخر میں ھا زائدہ ہے۔ تاکید
جماعت کے لئے جیساکہ فحل کی جمع فحولۃ ہے

اِفْتَدَتْ۔ فدیٰ یفدی فَدًی و
فِدَاءً۔ مال وغیرہ دیکر اپنے آپ کو مشکل
سے چھڑانا۔ کہا جاتا ہے فدت المرأۃ زوجھا
عورت نے مال دیکر خاوند سے طلاق لے لی۔
الفِدی والفِداءُ: حفظ الانسان عن
النائبۃ بما یبذل عنہ۔ فدیہ وہ عوض اور
مال جس کے بدلہ میں اہل ذمہ کی حفاظت کا امتِ
مسلمہ ذمہ لیتی ہے۔
یہاں فدیہ سے وہ مال مراد ہے جو عورت
طلاق کے عوض میں مرد کو دیتی ہے۔
یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر مرد اور عورت میں نباہ
نہ ہوسکے تو عورت فدیہ دیکر مرد سے طلاق لے
سکتی ہے۔ اصطلاح میں اس مسئلہ کو خلع کہا
جاتا ہے۔ خلع کی رقم حقِ مہر کی رقم سے زائد جائز
نہیں ہوگی

تَعْضُلُوْھُنَّ۔ فَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ۔
عَضَلَ یَعْضِلُ وَعَضِلَ یَعْضَلُ عَضْلاً
وَعِضْلَانًا وعِضْلاً۔ رکاوٹ پیدا کرنا۔
اور خواہ مخواہ اڑنگے ڈالنے لگنا۔

العضل : الحبس والتضییق (کشاف)
العضل : التضییق والمنع (قرطبی)
تَعْضُلُوهُنَّ معناہ تحبسوھن (قرطبی)
مطلب یہ ہے کہ عدت کے بعد عورت اگر
نکاح کرنا چاہتی ہے تو تم اس کی راہ میں حائل
نہ ہو اور اس کو اپنی پسند کے خاوند سے نکاح
کرنے سے منع نہ کرو۔ کیونکہ جو عورت طلاق پاکر
اپنی عدت پوری کر چکی ہو تو وہ آزاد ہے کہ جہاں
پسند کرے نکاح کرے بشرطیکہ معروف کی حد
میں رہ کر کرے۔ اسی لئے بالمعروف کی قید
لگائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شرعی قاعدہ کے
خلاف عورت نکاح کرنا چاہتی ہے تو عضل کا حق
ہوگا، اولیاء روک سکتے ہیں۔ مثلاً بلا نکاح آپس
میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہو جائیں
یا تین طلاقوں کے بعد نا جائز طور پر آپس میں نکاح
کر لیں یا عدت ہی میں دوسرے شوہر سے نکاح کا
ارادہ ہو تو ہر مسلمان کو اور بالخصوص عورت کے
اولیاء کو روکنے کا حق ہے بلکہ ضروری ہے۔
اسی طرح اگر کوئی لڑکی بلا اجازت اپنے اولیاء
کے اپنے کفو کے خلاف دوسرے کفو میں نکاح کرنا
چاہتی ہے یا اپنے مہر مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے جس کا
اثر خاندان پر پڑتا ہے جس کا اس کو حق نہیں تو یہ
رضامندی بھی قاعدۂ شرعی کے مطابق نہیں۔

اس صورت میں لڑکی کے اولیاء کو اس نکاح
سے روکنے کا حق ہے (ملخص از معارف القرآن)
قرآن پاک نے اسی لئے اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَھُمْ
کے ساتھ بِالْمَعْرُوْفِ کی بھی قید لگائی ہے
تاکہ اس باہمی رضامندی کی اجازت سے غلط فائدہ
اٹھانے کی راہیں بند ہو جائیں۔

یُوْعَظُ - وَعَظَ یَعِظُ وَعْظًا وعِظَةً
وَعَظَةً : نصیحت کرنا۔ الوَعْظَة : واعظ
کا کلام۔ وَعْظٌ۔ نصیحت جمع وَعْظَاتٌ
اَلْعِظَۃُ : وعظ نصیحت۔ جمع عِظَاتٌ۔
واعِظ فاعل، وعظ کہنے والا جمع وَاعِظُون و وُعَّاظٌ
الموعظة۔ نصیحت کرنا جمع مواعظ۔
وعظ ایسی زجر و نصیحت کو کہا جاتا ہے
جس میں برے نتائج سے خوف دلایا جائے۔
اور انسان کے قلب میں رقت اور نرمی پیدا ہو
الوعظ : زجرٌ مقترنٌ بتخویفٍ وقال
الخلیل ھو التذکیر بالخیر فیما یرق علیہ
القلب۔ (راغب)

حَوْلَیْنِ - حَوْلٌ کا تثنیہ ہے۔
حال الشیئ کسی شے کا لوٹنا۔ واپس ہونا
سال۔ ایک حال سے دوسری حالت میں
بدلنا۔ حَالَ علیہ الحول : کسی چیز پر سال
گزرنا۔ مِن حَالَ الشیئ اذا انقلب،

فالحول منقلب - منقلب من وقت الاول الی الثانی (قرطبی) وقیل سمی العام حولاً لاستحالۃ الامور فیہ فی الاغلب

الرَّضَاعَۃَ - رَضِعَ یَرْضَعُ رِضَاعًا و رَضَاعَۃً بچے کا ماں کا دودھ پینا۔ رِضاعۃ بکسر الراء و رَضَاعۃ بفتح الراء دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ مُرضِعٌ دودھ پلانی والی عورت مُرضِعَۃ اس وقت کہتے ہیں جب بچہ پستان منہ میں لیکر چوس رہا ہو۔ مرضعۃ کی جمع مُرضعات آتی ہے

کِسْوَتُھُنَّ - کَسَا یَکْسُو کسوًا وکُسٰی یَکسِیْ کسًا۔ کپڑے پہننا۔ کساء کمبل۔ کپڑا۔ جمع اکسیۃ - اَلْکُسْوَۃُ والکِسْوَۃُ لباس جمع کُسًی وکِسًی۔ الکساء: شرافت وبزرگی۔

الکِساءُ وَالکِسْوۃُ: اللباس۔ وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَہٗ رِزْقُھُنَّ وَکِسْوَتُھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے کھانا اور کپڑا شریفانہ طور پر۔ جو کسی قاعدۂ شرعی کے خلاف نہ ہو۔ عورت کے ان اخراجات میں مرد کی وسعت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ بلکہ یہ اخراجات مرد کی حیثیت کے مطابق ہوں گے

الْوَارِثِ - وَرِثَ یَرِثُ وِرْثًا وَوَرْثًا وتراثًا۔ وارث ہونا۔

وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ اور اسی طرح کا انتظام وارث کے ذمہ بھی ہے۔ وارث سے مراد فقہی اصطلاح میں وہ قرابت دار محرم ہیں جو بچہ کے شرعی وارث ہیں۔ اگر باپ مرجاتا ہے تو مرضعہ کے نان ونفقہ کا انتظام وارثوں پر واجب ہوگا۔ الورثۃ والتراث: میت کا ترکہ کما قال اللہ یَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ۔

وَارِثٌ فاعل ہے۔ اس کی جمع وَرَثَۃٌ وورّاثٌ ہے

فِصَالًا - فَصَلَ یَفْصِلُ فَصْلًا جدا کرنا۔ الگ کرنا۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کرنا۔ جدائی ڈالنا۔ فصل کے اصل معنی تفریق اور جدائی کے ہیں۔ بچے کے دودھ چھڑانے کو فِصال اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہاں بچے اور ماں کی چھاتی میں جدائی ہورہی ہے

الفصال والفصل: الفطام، و اصلہ التفریق (قرطبی)

الفصل: ابانۃ الشیئین من الاٰخر ایک چیز کو دوسری سے جدا کرنا۔

تَشَاوُرٍ مُشَاوَرَۃ۔ مَشْوَرَۃٌ؛ ایک دوسرے کی رائے لینا۔ آپس میں مشورہ لینا۔ التَّشَاوُرُ وَالْمُشَاوَرَۃُ والمشورۃ

استخراج الرأی بمراجعة البعض الی البعض (راغب)

والتشاور: استخراج الرأی وکذلك المشاورة۔ (قرطبی)

تشاور اصل میں شَارَ یَشُوْرُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں شہد کو چھتے سے نکالنا۔ شَارَ یَشُوْرُ شَوْرًا و مُشَارًا شہد کو چھتے سے نکالنا۔ شَارَ العَسَلَ۔ شہد کو چھتے سے نکالا۔

مَآ اٰتَیْتُمْ - باب افعال کے مصدر ایتاء سے صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اور حرفِ ما موصولہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مرضعہ کو جو دینا طے کیا ہے وہ اس کو دیا جائے اس طے شدہ اجرت میں کمی بیشی نہ کی جائے مَآ اٰتَیْتُمْ جو تم نے دینا کیا ہے۔

یُتَوَفَّوْنَ - اس کا اصل مادہ وَفٰی یَفِیْ وَفَاءً ہے پورا کرنا۔ کہا جاتا ہے وَفٰی بالعَهْدِ: وعدہ پورا کر دیا۔ وَفَی النَّذْرَ نذر پوری کی۔ وَفّٰی۔ حق پورا دینا۔ تَوْفِیَةً مصدر۔ اَوْفٰی یُوْفِیْ اِیْفَاءً: پورا کرنا۔ اَوفی الکَیْلَ: پورا ناپا۔ تَوَفّٰی تَوَفِّیًا حق پورا ہونا۔ تَوَفّٰی حَقَّهٗ: اپنا پورا حق لے لیا یُتَوَفَّوْنَ اس سے ہے۔ جن کی مدت حیات پوری ہو گئی۔ کہا جاتا ہے تَوَفَّی المُدَّةَ مدت پوری کر دی۔

اَلْوَفِیْ وَالْمِیْفَاةُ: زمین کا اونچا حصہ۔

اَلْوَفِیُّ: پورا، کامل۔ وفادار۔ اس کی جمع اَوْفِیَاءُ ہے۔ الوَفَاتُ: موت۔ اس کی جمع وَفَیَاتٌ آتی ہے۔ پھر یہیں سے وفات کو موت کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔ چونکہ وفات زندگی کے پورا ہونے کا نام ہے۔ مرنے والے نے زندگی پوری کر دی، زندگی کا حق پورا ہو گیا۔

یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ۔ وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ: اور جو لوگ تم میں وفات پا جاتے ہیں۔

یَذَرُوْنَ - وَذَرَ یَذِرُ وَذْرًا: کاٹنا۔ وَذَرَ الجُرْحَ۔ زخم کو چیرا۔ یَذَرُ الشَّیْءَ: کسی چیز کو کم درجہ کی سمجھ کر چھوڑ دینا۔

الوَذْرَةُ: گوشت کا چھوٹا ٹکڑا۔

وَذَرَ میں چھوڑنے اور ترک کرنے کے معنی صرف امر اور مضارع کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی ماضی قرآن پاک میں مستعمل نہیں ہے، یہاں وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا۔ یَتْرُکُوْنَ کے معنی

میں ہے - يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ای یترکوا
اَزْوَاجًا (قرطبی) وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ
الرِّبٰوا - وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ -
فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ

خِطْبَة - خِطبہ عورت کو کنایۃً ہے
واشارۃً نکاح کیطرف مائل کرنا
خَطَبَ يَخْطُبُ خَطْبًا وَخِطْبَةً وخَطَابَةً
خَطَبَ القَومَ وخَطَبَ فِی القَومِ
قوم کو خطاب کیا۔ تقریر کی۔
خَطَبَ خُطْبَةً ۔خطبہ پڑھنا۔ صفت خَطِیْب
جمع خُطَبَاء۔
وخَطَبَ خِطْبَةً: منگنی کرنا۔
خطبہ وہ عورت جس سے منگنی کی جائے۔
صفت خَاطِب ۔ خَطْبٌ : وہ اہم معاملہ
جس کے بارے میں کثرت سے تخاطب ہو۔
فَصْلَ الخِطَاب : دوٹوک بات فیصلہ کن
کلام۔ الخِطْبُ بسکون الطاء خطبہ کرنے
والا آدمی۔ خطبہ اُس کلام کو بھی کہا جاتا ہے جو
نکاح کے وقت پڑھا جاتا ہے۔
الخُطبة تختص بالموعظة۔ والخِطبة
بطلب المرأة (راغب)

اَكْنَنْتُمْ - یہ اِکْنَانٌ سے ماضی کا صیغہ
ہے اس کی اصل کِنٌّ ہے۔ چھپانا، پوشیدہ کرنا
بچانا۔ کِن اس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں
کوئی چیز چھپائی جائے۔ وہ پردہ جس کے نیچے
کوئی چیز چھپائی جائے کِنٌّ کہا جاتا ہے۔
اکنان : دل کی مخفی باتوں کو کہا جاتا ہے۔
اکننتُ بما یستر فی النفس (راغب)
اَكْنَنْتُمْ معناه سَتَرْتُمْ واَضْمَرْتُمْ
مِنَ الزَّوجِ بِهَا بعد انقضاء عدّتها
الإكنانُ : الستر والاخفاء (قرطبی)
الكنان : الغطاء الذی یکنّ فیه الشئ
والجمع اَكِنَّة (راغب) اسی سے ہے
وَقُلُوْبُنَا فِیْ اَكِنَّةٍ ای فی غطاءٍ عن
تفهّم ما تورد علینا ۔ مکنون: چھپائے
ہوئے۔ محفوظ۔ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ
محفوظ انڈے۔ بلا گرد وغبار۔ یہ عورت
کے گورے رنگ اور حسن کی تشبیہ ہے عرب
لوگ عورت کے گورے رنگ کو انڈے سے تشبیہ
دیتے ہیں۔ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ: خوبصورت چھپے
موتیوں کی طرح حسین، بے داغ۔

عُقْدَةَ - عقدة النكاح ۔ عقد نکاح
عَقَدَ يَعْقِدُ عَقْدًا : گرہ لگانا۔ عقد
البیع بیع کو پختہ کرنا۔ عقد الیمین ۔قسم کو
پکا کرنا۔ العُقْدَةُ - گرہ۔ مطلب یہ ہے
کہ زمانہ عدت میں نکاح کی پکی بات چیت نہ کرو

لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ : والمعنی لَا تَعْزِمُوْا عَلٰی عُقْدَةِ النکاح فی زمان العدّة ۔ (قرطبی)

اَجَل ۔ اَجَلَ يَاْجُلُ اَجَلاً دیر کرنا

اَجَلٌ : مدّت ۔ مقررشدہ وقت ۔

الاَجَل : المُدّة المضروبة للشیٔ (راغب) حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ مطلب یہ ہے کہ عدت کی مقررہ مدت جب تک گزر نہ جائے نکاح ثانی کی دعوت عورت کو نہ دیجائے

فَاحْذَرُوْا ۔ حَذِرَ يَحْذَرُ حَذَرًا وَحِذْرًا و محذورةً ۔ پہلوتہی کرنا ۔ احتراز کرنا ۔ بچنا ۔ حَذَارِ : اسم فعل بمعنی امر کے حاذرٌ فاعل ، بچنے والا ۔ محذور : جس سے بچا جائے ۔ المحذور مَا يُحْذَرُ مِنْهُ (منجد) الحَذَرُ : کسی خوف کی چیز سے بچنا وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۔ (آل عمران ۲۸)

خُذُوْا حِذْرَكُمْ : اسلحہ جس سے دشمن ڈرتا ہے ۔ وَيَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ : آخرت کے خوف سے ڈرتا ہوا ۔

اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ اللہ تمہارے دلوں کے بھید جانتا ہے ۔ لہٰذا اس سے ڈرتے رہو ۔

تَمَسُّوْهُنَّ ۔ مَسَّ يَمَسُّ وَمَسَّ يَمُسُّ (ن۔س) مَسًّا و مَسِيْسًا : چھونا ۔ اَمَسَّ : افعال سے ، چھوانا ۔ تَمَاسَّ : تفاعل سے ایک دوسرے کو چھونا ۔ مَسَاسِ اسم فعل ہے ، جیسے حَذَارِ ۔ لامساس : مت ہاتھ لگاؤ ، مت چھوو ۔ اَلْمَسُّ : مصدر ہے بمعنی چھونا اَلْمَسُّ اور اَللَّمْسُ دونوں قریب المعنی ہیں لیکن لمس کا استعمال کبھی کبھی کسی چیز کے طلب کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔ کہا جاتا ہے لَمَسَ الشَّيْءَ کسی چیز کو طلب کیا ۔ اور مسّ ہمیشہ چھونے پر بولا جاتا ہے ۔

یہاں طلاق قبل الدخول کا مسئلہ بیان کرنا ہے ۔ اگر طلاق قبل الدخول ہوگئی تو حق مہر نصف ہوگا ۔ اگر حق مہر مقرر نہیں تھا تو متعہ دینا ہوگا ۔ تفصیل تفاسیر میں ملیگی ۔ یہاں مسّ سے مراد دخول و مقاربت ہے ۔

تَفْرِضُوْا ۔ فَرَضَ يَفْرِضُ فَرْضًا : لکڑی کاٹنا ۔ چیرنا ۔ معین کرنا ۔ فرض الامر معین کرنا اور فَرَضَ يَفْرِضُ فُرُوْضًا وفَرَاضَةً : گائے کا عمر رسیدہ ہونا ۔ فَرَضَتِ الْبَقَرَةُ : گائے بوڑھی ہوگئی ۔ اسی سے ہے لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۔ صفت فَارِض ۔ اور فَرُضَ فَرَاضَةً (کرم سے)

لہ آل عمران آیت ۲۳۵

علم فرائض جاننے والا ہونا۔

الفریضۃ: فرض۔ زکوٰۃ۔ مقررشدہ حق جمع فرائض۔ فرض کے لغوی معنی کسی سخت چیز کو کاٹنے کے ہیں اور پھر فرض اس کاٹنے کو کہا جائے گا جس میں اس فرض اور قطع کا اثر ظاہر ہو۔ والفرضُ قطع الشئ الصّلب والتاثیر فیہ کفرض الحدید (راغب) پھر یہیں سے اس کو قطع احکام کے لئے استعمال کیا گیا۔ فرائض اللہ اللہ کے احکام مقرر کئے ہوئے فیصلے۔ قرآن پاک میں فرض کا صلہ جہاں علیٰ آیا ہے وہاں اس کے معنی ایجاب کے ہیں۔ اِنَّ اللہَ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ ای اوجب علیک العمل بہ۔ (راغب)

یہاں تفرضوا سے مراد حق مہر کا مقرر کرنا ہے اور فریضہ، حق مہر۔

مَتِّعُوْھُنَّ ۔ یعنی ان مطلّقہ عورتوں کو نفع دو۔ کتنا دینا چاہئے۔ یہ اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق ہے۔ اسی لئے مَتِّعُوْھُنَّ کا لفظ قرآن پاک میں عام ہے۔ لغوی تحقیق گزر چکی ہے۔

اَلْمُقْتِرِ ۔ مُقتِر سے مراد تنگدست ہے۔ قَتَرَ یَقْتُرُ و یَقْتِرُ قَتْرًا و قُتُوْرًا قَتَرَ عَلٰی عِیَالِہٖ: اہل و عیال پر خرچ کی تنگی کرنا۔ القتر: تقلیل النفقۃ۔ و مُقتِر: فقیر۔ (راغب) پھر فقیری اور تنگدستی سے اس کو ذلت کے معنوں میں بولے جانے لگا جیسا کہ تَرْھَقُھَا قَتَرَۃٌ۔ اس کے مقابلے میں مُوسِع ہے۔ کشادہ ہاتھ صاحب حیثیت مالدار۔

اَلْمُوْسِعِ ۔ صاحب مال۔ صاحب حیثیت المُوسِع بسکون الواو وکسر السین وھو الذی اتّسعت حالہ (قرطبی)

وَسِعَ یَسَعُ سَعَۃً وسِعَۃً۔

وسِعَ المکانُ: جگہ کا کشادہ اور کھلا ہونا۔ الوُسْعَۃ وَالوِسْعَۃُ۔ آسودگی۔ قدرت طاقت۔ وَسُعَ یَوْسُعُ وسَاعَۃً: کشادہ ہونا۔ صفت وَسِیْعٌ و واسِعٌ: کشادہ۔ فراخ۔ طاقت ور۔

یَعْفُوْنَ ۔ یہ جمع مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ عَفَا یَعْفُوْا عَفْوًا معاف کرنا۔ عَفَا عَنِ الحَقِّ۔ حق ساقط کرنا۔ نہ لینا۔ یہاں عَفْوٌ معاف کرنے اور درگزر کرنے کے معنی میں ہے۔ کہ اگر عورت نصف مہر جو حق ہے چھوڑ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اسی طرح اگر مرد معاف کر دے یعنی پورا حق مہر دیدے یا نصف واپس نہ لے تو یہ زیادہ بہتر ہے

يَعْفُوْنَ : معناه يَتْرُكْنَ وَيَصْفَحْنَ (قرطبی)

تَنْسَوُا - نَسِيَ يَنْسٰى نِسيانًا ونِسايَةً بھول جانا۔ تَنَاسٰی۔ بھولنے کا بہانہ بنانا اَلْمَنْسِیُّ بھولی ہوئی چیز نَسْیًا مَنْسِیًّا۔ بھولی بسری چیز۔ نَسْیَانٌ و نَسَّاءٌ۔ بہت بھولنے والا۔

اَلنِّسْيَانُ: ضدّ الذكر والحفظ (لسان)

اَلنِّسْيَانُ: ترك الانسان ضبطَ مَا اسْتُوْدِعَ (راغب)

اَلْفَضْلَ - فَضْلٌ سے مراد پورا حق ادا کر دینا ہے۔ مرد کو عورت پر فضیلت ہے۔ اس عظمت و فضیلت کو ملحوظ رکھتے ہوئے چاہیے مرد پورا مہر دیدے۔ مجاہدؒ کا یہ قول ہی نقل ہوا ہے :

قال الفضل : اتمام الرجل الصداقة كلّه او ترك المرأة النصف الذى لها۔ (قرطبی)

حَافِظُوْا - یہ محافظۃٌ سے امر کا صیغہ ہے۔ تمام امت کو حکم کیا جا رہا ہے کہ وہ نماز کو اپنے اوقات میں تمام شروط کو ملحوظ رکھتے ہوئے پابندی سے ادا کریں۔

محافظۃ کے معنی مداومت اور مواظبت کے ہیں۔ یعنی نماز ہمیشہ اور پابندی وقت کے ساتھ پڑھی جائے۔

المحافظة : المداومة على الشئ والمواظبة (قرطبی)

اَلْوُسْطٰی - یہ اوسط کی تانیث ہے وَسَطَ يَسِطُ وَسْطًا بہتر اور معتدل۔ افراط و تفریط سے خالی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

وَسَطُ الشئ خيره واعدله۔ (قرطبی)

قٰنِتِيْنَ - قَنَتَ يَقْنُتُ قُنُوْتًا اطاعت کرنا۔ قَنَتَ اللهَ و قَنَتَ لِلّٰهِ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ اللہ کے لئے عاجزی اور کمال اطاعت کے ساتھ بندگی کرنا۔

اَقْنَتَ (افعال) نماز میں طویل رکوع کرنا۔

اِقْتَنَتَ : مطیع ہوا۔ القانت فاعل عابدٌ : نمازی۔ عبادت کرنے والا جمع قُنَّتٌ اور قَنُتَ (ک) سے صفت قنيت۔ کم خوراک کھانا۔ القنوت : لزوم الطاعة مع الخضوع (راغب) قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ ۔ وَاقْنُتِيْ لِرَبِّكِ تو اپنے رب کی اطاعت کر۔

لفظ قنوت دراصل وسیع المعنی ہے۔ اس لئے اہل تفسیر میں اس کے معنی کو متعین کرنے کے بارے میں کچھ اختلاف ہے۔ مگر حاصل سب کا ایک ہی ہے حضرت شعبی کا قول ہے قانتين طائعين۔ جابر بن زید، عطاء اور سعید بن جبیر کا قول بھی یہ ہی ہے۔ اور ضحاک فرماتے ہیں کہ قنوت کا لفظ

قرآن میں جہاں بھی آیا ہے وہ طاعت کے معنی میں ہے ۔ کل قنوتٍ فی القرآن فانما یعنی به الطاعة ۔

مجاہدؒ کا قول ہے کہ معنی قٰنتین خٰشعین والقنوت : طول الرکوع الخشوع وغض البصر وخفض الجناح ۔

اور حضرت ربیع سے منقول ہے کہ القنوت طول القیام ۔ اور ابن عباسؓ سے قٰنتین کے معنی داعین کے منقول ہیں ۔ (از قرطبی)

جامع تعریف وہ ہے جو امام راغبؒ سے نقل کی گئی ہے۔

رِجَالًا ۔ رِجْلٌ سے مشتق ہے ۔

رِجلٌ پاؤں ۔ رَاجِل پیدل چلنے والا۔ پاؤں پر کھڑے ہونے والا۔ راجل کی جمع رجال ہے رِجَالًا کا مقصد یہ ہے کہ پاؤں پر کھڑے کھڑے ایک جگہ پر نماز پڑھ لے چاہے اشارہ سے ہو۔ اتنا خیال رہے کہ سجدہ کا اشارہ رکوع کے اشارہ سے زیادہ پست اور نیچا ہو ۔

رِجَالًا کے معنی چلتے پھرتے نہیں ہے ۔ چونکہ چلتے پھرتے نماز ادا نہیں ہوتی ۔ اگر کھڑے ہوکر بھی نماز پڑھنے پر قدرت نہیں تو پھر قضا کرنا بہتر ہے ۔ جب اطمینان ہو جائے پڑھ لے۔ رَجُلٌ آدمی ۔ مذکر ۔ مرد ۔ جمع رِجالٌ ۔

رَجِلَ یَرجَلُ رَجلًا : پیدل چلنا ۔ رَجُلٌ سخت مضبوط آدمی ۔ مکان رجیل وہ جگہ جس کے دونوں طرف دو ہوں ۔

رُجْلَةٌ : چلنے کی طاقت ۔ مردانگی ۔

کَلَامٌ رَجِیلٌ : فی البدیہ کلام کہنا

رِجْلٌ : عہد اور زمانہ کو بھی کہتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کَانَ ذٰلِکَ فِی رِجْلِ فلان : یہ فلاں کے زمانے اور عہد میں تھا ۔

رُکْبَانًا ۔ رَکِبَ یَرکَبُ رُکُوبًا و مَرْکَبًا سوار ہونا ۔ رَکِبَ الطَّرِیقَ : راستہ پر چلنا ۔ رَکِبَهُ الدَّیْنُ : مقروض ہونا

راکِب : سوار ۔ مرکب : سواری ۔ جمع مراکب راکب فاعل جمع رُکَّابٌ و رُکبانًا ۔ و رَکَبَةٌ و رَکْبٌ بسکون الکاف

مطلب یہ ہے کہ اگر پاؤں پر کھڑے ہوکر پڑھنے میں بھی خطرہ ہے تو سواری پر بھی پڑھ سکتے ہیں ۔ ان تاکیدات سے اتنی بات معلوم ہوگئی کہ محافظۃ علی الصلوٰۃ کا حکم بہر حال دائمی اور ضروری اور قطعی ہے ۔ ترک نماز کی اجازت بڑے خطرناک حالات میں بھی نہیں دی گئی ۔

رُکوب کے معنی ہیں انسان کا جانور کی پشت پر بیٹھنا ، سواری کرنا ۔ اور راکب اونٹ پر سواری کرنے والے کو کہا جاتا ہے ۔ جمع رُکبان اور رُکبٌ ۔ پھر اس میں وسعت دیکر عام سواری کی

چیزوں پر بھی اس کا اطلاق کر دیتے ہیں۔
کشتی اور جہازوں کی سواری کو بھی رکوب
کہتے ہیں۔ رکب السفینۃ۔ کشتی پر بیٹھنا۔
سواری کرنا

اَمِنْتُمْ۔ اَمْن سے ماخوذ ہے۔
بے خوف اور مامون ہو جاؤ۔ خطرہ ٹل جائے

دِیَار۔ یہ دار کی جمع ہے بمعنی گھر
بیت۔ یہ دَارَ یَدُوْرُ سے مشتق ہے۔
گھومنا۔ چکر لگانا۔
دَارَ الدَّھْرُ: زمانہ کا پلٹ کھانا۔ دِیْرَ
سے کا درد۔ الدَّار: گھر مکان۔ مذکر و
مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جمع
دِیَارٌ و دُوْرٌ و اَدْوِرَۃٌ و دِیَارَۃ
الدَّارَۃ: محل قبیلہ۔ چاند کا ہالہ۔ جمع
دَارَاتٌ و دُوْرٌ

اُلُوْفٌ۔ یہ اَلْفٌ کی جمع ہے بمعنی
ہزار ہا کی تعداد۔ الف کی تحقیق گزر چکی ہے۔

قَرْضًا۔ قَرَضَ یَقْرِضُ قَرْضًا بدلہ دینا
قَرَضَ المَکَانَ: جگہ سے ہٹ جانا۔ تجاوز کرنا۔
قَرْضٌ کے اصل معنی قطع کرنے اور کاٹنے کے ہیں۔
یہاں قرض اسم ہے ہر وہ چیز جس پر بدلہ مطلوب ہو
قرآن پاک کی اصطلاح میں قرض وہ رقم ہے
جو دین کی کسی مد میں خرچ ہو سکے۔ یہاں مراد
مصارفِ جہاد ہیں۔
قال الزجاج: القرض ھو کل ما یفعل
لیجازی علیہ۔ تقول العرب: لك
عندی قرض حسن (کبیر)
القرض: اسم لکل ما یلتمس علیہ الجزاء
واصل الکلمۃ القطع (قرطبی)
مقراض: قینچی کا ایک پھل۔ اس کی تثنیہ
مقراضین اور جمع مقاریض ہے۔

اَضْعَافًا۔ یہ ضِعْفٌ کی جمع ہے۔ دگنا
کرنا۔ ضَعَفَ یَضْعِفُ وضَعُفَ ضَعِیْفٌ
وضُعْفًا وضَعَافۃً وضَعَافِیَۃً۔ کمزور ہونا
ضَعَفَ یَضْعَفُ (ف) ضَعْفًا۔ ضَعَفَ
القَوْمَ: زیادہ کرنا۔ ضَعَّفَ الحَدِیْثَ
حدیث کو ضعیف قرار دینا۔ ضَاعَفَ یُضَاعِفُ
مُضَاعَفَۃً: دو چند کرنا۔ ضَعْفٌ اور ضُعْفٌ
کمزوری کو کہا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں
میں ایک لطیف فرق یہ ہے کہ ضُعف بالضم
بدن کی کمزوری کو کہتے ہیں اور ضَعف بالفتح
عقل و رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں۔ جیسے کہ
وَكَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا
ضعیف سے مراد ضعیف العقل ہے اور ضِعف:
یہ الفاظ متضائفہ میں سے ہے جن میں سے
ایک کا وجود دوسرے کے وجود کا متقاضی ہے

جیسا کہ نصف اور زوج۔ یہ عدد میں بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ضَاعَفْتُہٗ ای ضممتُ الیہ مثلہ۔ اَضْعَافٌ: کئی گنا۔ دونے پر دونا۔ یہ ضِعْفٌ کی جمع ہے جس کے معنی دو گنے کے آتے ہیں۔ اَضْعَفُ: زیادہ کمزور یہ افعل التفضیل ہے۔

یَقْبِضُ - قَبَضَ یَقْبِضُ قَبْضًا۔

کسی چیز کو پورے ہاتھ سے پکڑنا۔

قَبَضَ یَدَہٗ عَنِ الشَّیْءِ: کسی چیز کے پکڑنے سے ہاتھ روکنا۔ القَبْضَۃ۔ اسم مرّۃ ایک مرتبہ پکڑنا۔ تَقَبَّضَ بابِ تفعّل سے۔ سکڑ جانا تَقَبَّضَ اکٹھا کرنا۔ سمیٹنا۔

تقابض المتبایعان: مشتری نے مبیع پر اور بائع نے قیمت پر قبضہ کر لیا۔

یہاں یَقْبِضُ کے معنی تنگی کرنے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ بسط و کشاد خدا کے اختیار میں ہے۔ جس کو چاہے فقیر کرے، جس کو چاہے غنی کرے۔

القبض تناول الشیٔ بجمیع الکفّ (راغب)

اس کے مقابلہ میں قَبْصٌ ہے، کسی چیز کو سر انگلیوں سے پکڑنا۔

یَبْسُطُ - بَسَطَ یَبْسُطُ بَسْطًا۔ پھیلانا

اور بَسُطَ بَسَاطَۃً: مغرور ہونا۔ بَاسَطَ یُبَاسِطُ: خندہ پیشانی سے پیش آنا۔ البَسْطَۃُ: وسعت۔ کمال۔ قابلیت۔ بسط الشیٔ: کسی چیز کو وسعت دینا۔ پھیلانا

بَسَطَ الشَّیْءَ نَشَرَہٗ وَوَسَّعَہٗ (راغب)

اَلْمَلَأُ - مَلَأٌ کا اصل لغوی مفہوم بھرنا ہے

اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی قوم کے اشراف واعیان اور اکابر وسادات کے لئے استعمال ہونے لگا۔ چونکہ قوم کے اشراف و سادات ہی قوم کی رونق اور عزت کو بھرتے ہیں اور ان کی پنچایتوں اور مجلسوں کو پُر کرتے ہیں۔ اس لئے اشرافِ قوم کو مَلَأٌ کہا جاتا ہے۔

مَلَأَ یَمْلَأُ مَلْأً وَمَلْأَۃً وَمِلْأَۃً بھرنا۔ مَلَأَ الاِنَاءَ برتن کو پورا بھر دیا۔ المِلْأُ: وہ مقدار جس سے برتن بھر جائے جمع اَمْلَاءٌ۔ کہا جاتا ہے اِنَّہٗ لَنَائِمٌ مِلْءَ جَفْنِہٖ وہ بے فکر سوتا ہے۔

اَلْمَلَأُ: قوم کی جماعت۔ اشرافِ قوم۔ المَلَأُ الْاَعْلٰی: عالم ارواح۔ المَلَأُ: مشورہ ظن، جمع۔ اخلاق۔ اس کی جمع اَمْلَاءٌ ہے۔ اَلْمَلْأُ مصدر ہے۔ بھرنے کا طریقہ۔ اسی سے ہے مَلْآن بھرا ہوا۔ مَلَأٌ یہ اسم جمع ہے جیسے قوم اور رھط وغیرہ۔

مَلَأٌ مطلق جماعت کو نہیں کہا جاتا بلکہ قوم کے

اہل حل وعقد اور اہل الرائے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

الملأ: الاشراف فی الناس کانھم ممتلئون شرفاً (قرطبی)

الملأ: جماعة یجتمعون علی رأی فیملئون العیون رواءً ومنظراً والنفوس بہاءً (راغب)

الملأ من القوم وجوھھم واشرافھم (لغ)

حسن اخلاق کو بھی مَلأ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے: أحسنوا الملأ فکلکم سیروی (مسلم) (قرطبی)

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہاں اس آیت میں ملأ سے مراد قوم ہے۔ چونکہ معنی کا اقتضاء یہی ہے۔ الملأ فی ھٰذہ الآیۃ: القوم لان المعنی یقتضیہ (قرطبی)

مطلب یہ ہوگا کہ کیا آپ نے اسرائیلی قوم کی طرف نہیں دیکھا موسیٰؑ کے بعد

ابْعَثْ - تو بھیج اور قائم کر۔

بَعَثَ یَبْعَثُ بَعْثًا روانہ کرنا۔ بھیجنا۔

بَعَثَ بِہٖ دوسرے کے ساتھ بھیجنا۔

بَعَثَہٗ مِنَ النَّوْمِ نیند سے جگا دیا۔

البعث: زندہ کرنا - انبعث: بھیجا جانا۔ تیزی ظاہر ہونا۔

البَعْثُ والبعیث: وہ جس کے غم اس کو نیند سے بیدار رکھیں۔

بعث: فوج جو بھیجی جاچکی ہو۔ جمع بُعُوثٌ وبُعُوثٌ۔ باعث: سبب، جمع بواعث۔

بَعِیْث: مبعوث بھیجا ہوا۔ یہاں البعثُ سے مراد قائم کرنے اور مقرر کرنے کے ہیں۔

مَلِکًا - مَلِک کے معنی صاحب اختیار واقتدار کے ہیں۔ یہ اقتدار مطلق بھی ہوتا ہے جیساکہ جبار اور مطلق العنان بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے۔ اور محدود و مقید بھی ہوتا ہے جیساکہ ایک پابند آئین وقانون یا پابند شریعت بادشاہ کو۔ یہاں آیت میں دوسرے معنی مراد ہیں۔ المَلِكُ ھو المتصرف بالامر والنھی فی الجمھور (راغب)

مَلِك: بادشاہ، صاحب اختیار واقتدار۔ جمع مُلُوك - مِلْك: ملکیت۔ جمع املاک بادشاہی۔ قبضہ۔ اَلْمَلَكُ: فرشتہ۔ جمع ملائکۃ وملائك۔ مَلَاكٌ: اقتدار

مُلْكٌ: غلبہ۔ اقتدار۔ بادشاہت۔

مملکت: ملکیت۔ بادشاہت۔

مَلَكَۃٌ: عادت۔ قابلیت۔ مہارت۔

مَلَكَ یَمْلِكُ: مالک ہونا۔

مَلَكَ عَلَی الْقَوْمِ: غالب ہونا۔

عَسَيْتُمْ: عَسٰی۔ یہ افعالِ مقاربہ میں سے ہے۔ یہ جامد ہے۔ محبوب چیز میں امید اور مکروہ بات میں خوف کے لئے آتا ہے۔ البتہ اس کا ماضی مختلف صیغوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بھی عَسَيْتُمْ جمع مذکر حاضر ماضی معروف کا صیغہ ہے۔

عَسِيَ يَعْسٰی عَسًی کے معنی سختی اور مضبوطی کے ہیں۔ عَسَی النَّبَاتُ: نبات کا سخت اور مضبوط ہونا۔ اَعْسِ بِهٖ فعل تعجب ہے اَخْلِقْ بِهٖ کے معنوں میں۔ یعنی کس قدر لائق اور مناسب ہے۔

هَلْ عَسَيْتُمْ کا مطلب یہ ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ جب جہاد کا حکم ملے تو تم بھاگ کھڑے ہو۔ یہ بات مردِ مومن نے یعنی ان کے نبی نے اُن کی اُفتادِ طبع اور سابقہ تجربات کی بنا پر فرمائی۔ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب جہاد کا حکم سنایا جائے تو تم بھاگ کھڑے ہو

ومعنى هذه المقالة هل انتم قريب من التولي والفرار۔ (قرطبی)

یہ قول ان کے نبی حضرت سموئیل علیہ السلام کا ہے کہ تم ایک مطالبہ کر رہے ہو جس پہ پورا اُترنے کی تمہاری طرف سے مجھے امید کم ہے۔ اکثر اصحابِ تفسیر نے عَسٰی کی تفسیر لازم کے ساتھ کی ہے۔ وجہ اس کی یہ بتائی ہے کہ امید اور طمع کے معنی خدا کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہیں لہٰذا قرآن پاک میں جہاں بھی عسٰی کا لفظ ہے معنی لازمی میں ہوگا۔ مثلاً عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ۔ یقیناً تمہارا خدا اور رب تم پر رحم کر لے گا۔ لیکن صاحب مفردات القرآن علامہ راغب فرماتے ہیں کہ ان مفسرین سے اس معاملہ میں چوک ہوگئی ہے۔ چونکہ لفظ عَسٰی افعالِ مقاربہ میں سے ہے۔ اس کے معنی یقین اور لزوم کے نہیں ہیں۔ یہ طمع اور ترجّی کے معنی دیتا ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا سے امید لگائے اور اس سے خیر کی توقع رکھے۔ مثلاً عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امید ہے تمہارا رب، تمہارے دشمنوں کو ہلاک کر دے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کی توقع اور امید رکھو کہ تمہارا خدا تمہارے دشمنوں کو ہلاک کر ڈالے۔ مطلب یہ کہ عَسٰی۔ ہے تو ترجی اور امید ہی کے لئے۔ مگر اس میں امید اور توقع کا مطالبہ بندوں سے ہوتا ہے۔

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ۔ ای

کو نوارا جین ذٰلک ۔ یعنی تم اس بات
کی خواہش اور امید رکھو کہ خدا تمہارے
دشمنوں کو تباہ کر دے ۔

طَالُوْتُ ۔ یہ معرفہ اور عجمہ ہونے کی
وجہ سے غیر منصرف ہے ۔ یہ حضرت یوسفؑ کے
بھائی بنیمین کی اولاد میں سے تھے مگر حوادثاتِ
زمانہ کا شکار ہو کر نہایت غربت کی زندگی
گزار رہے تھے ۔ اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ طالوت
دباغت کا کام کرتے تھے ۔ بعض نے سقّار لکھا
ہے ۔ علم و جسم میں خدا نے اس بزرگ کو وافر حصہ
عنایت کیا تھا ۔ یہی علم و وجاہت خدا نے
اُن کی بادشاہت کا باعث بنا دی ۔ یہ قد و قامت
اور وجاہت میں تمام اسرائیلیوں سے نمایاں حیثیت
رکھتے تھے ، ان کا قد تمام اسرائیلیوں سے بلند
تھا ۔ بڑے سے بڑا آدمی ان کے کندھوں سے بھی نیچے
تھا ۔ مفسّرین نے لکھا ہے کہ اس کا اصلی نام ساول
ہے ، طالوت ان کا لقب ہے جو طویل القامت ہونے
کی وجہ سے پڑا ۔ اطول من الناس
برأسه و منكبه ۔ (مدارک)

و قيل سُمّي طالوت لطوله (قرطبی)

اَلْجِسْمُ ۔ وجود بدن ۔ ہر وہ شے جو طول
عمق اور چوڑائی رکھتی ہو ۔ اس کی جمع اجسام
و جُسُوم اور اَجْسُمٌ آتی ہے ۔
جَسُمَ یَجْسُمُ جَسَامَۃً ۔ تناور ۔ موٹا
اور مضبوط ہونا ۔ صفت جَسِیْمٌ و
جُسَامٌ جُسْمَان ۔ بدن جسم ۔

اَلتَّابُوْتُ ۔ تابوت ایک صندوقچہ تھا
جس کا اصطلاحی نام تابوت سکینہ تھا ۔
یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملّی اور قومی ورثہ
تھا ۔ جس کو وہ نہایت عزیز رکھتے تھے ۔ اس کا
احترام ان کے ہاں مذہبی عبادت کا درجہ رکھتا
تھا ۔ جنگوں اور لڑائیوں میں اس صندوق
کو اس یقین کے ساتھ ، ساتھ رکھتے تھے کہ
اس کی برکت سے فتح ہوگی ۔ ان کے باہمی جھگڑوں
سے فائدہ اٹھا کر عمالقہ نے حملہ کر دیا اور ان
کو شکست دی اور یہ تابوتِ سکینہ کو اٹھا کر
لے گئے ۔ پھر یہ صندوق طالوت کے دورِ حکومت
میں حاصل ہوا ۔

یہ تابوت بنی اسرائیل میں کب سے چلا آرہا تھا
اس میں کوئی یقینی بات تو کچھ مشکل ہے ۔ البتہ
اتنا معلوم ہے کہ یہ تابوت دورِ موسیٰ سے
قبل کا ہے ۔

علامہ قرطبی نے نقل کیا ہے کہ یہ تابوت
حضرت آدمؑ پر خدا نے اُتارا تھا اور یکے بعد
دیگرے وقت کے انبیاء اور رسل کے
پاس رہا ۔ تا آنکہ عمالقہ نے ان پر حملہ کیا اور

اور تابوت اٹھا کر لے گئے۔ اور پھر عہدِ طالوت میں تائیدِ غیبی سے واپس ہوا۔

سَكِينَةٌ - یہ فَعِيلَةٌ کے وزن پر ہے اور سکون سے ماخوذ ہے بمعنی وقار اور طمانیت کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس صندوق اور تابوت میں تمہارے حق میں سکون اور رحمت ہے اور اس سے تمہارے حوصلے بڑھتے ہیں
هو سبب سکون قلوبکم۔ (قرطبی)

بَقِيَّةٌ - اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کے تبرکات ہیں جو اس صندوق میں محفوظ تھے۔ کہتے ہیں کہ اصل تورات کی الواح اور حضرت موسیٰؑ کا عصا بھی اس میں تھا۔

بَقِيَ يَبْقَى بَقَاءً وبَقَى يَبْقِيْ بَقْيًا: باقی رہنا ثابت رہنا۔ کسی چیز کا اپنی حالتِ سابقہ پر قائم رہنا۔ بَاقٍ فاعل ہے۔ فنا کے مقابل ہے۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ۔ جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ حرف یَ آخر سے گر گیا ہے۔

بَقَا يَبْقُو بَقَاوَةً: دیکھنا۔ انتظار کرنا
حدیث میں ہے: بَقِينَا رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ای انتظرناہ وترصدنا لہ
البقاء: ثبات الشئ علی حالۃ الاولی (راغب)

بَقِيَّةٌ: باقی رہا ہوا۔ جمع بقایا۔

تَحْمِلُهُ - تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ
اس (تابوت) کو فرشتے اٹھالائیں گے۔

فَصَلَ - فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ
طالوت فوجوں کو لے کر بڑھے۔ آگے نکلے۔ فَصَلَ کے معنی دو چیزوں کو آپس سے جدا اور الگ کر دینا۔ فَصَلَ يَفْصِلُ فَصْلًا۔ جدا کرنا۔ قطع کرنا۔
الفصل ابانۃ احد الشیئین من الآخر۔ (راغب)
یہاں فَصَلَ خَرَجَ کے معنی میں ہے۔
فَصَلَ: معناہ خَرَجَ بھم (قرطبی)

الْجُنُوْد - یہ جُنْدٌ کی جمع ہے بمعنی فوج لشکر سپاہ۔ جُند کی واحد جُندی ہے سپاہی کے معنی میں۔ اور جُند فوج۔ جمع جنود اور اَجْنَاد: فوجیں۔ اس جنود کی تعداد آٹھ ہزار بتائی گئی ہے۔

نَهَر - یہاں نہر سے مراد نہر اُردن ہے یہ فلسطین اور اردن کے درمیان جالوتی فوج سے مقابلہ کے لئے اسرائیلیوں کو یہ دریا پار کر کے جانا پڑا تھا۔ نہر کی جمع انہار آتی ہے یہ دریا فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان ایک نہر کی حیثیت رکھتا تھا اس کا بہاؤ شمال سے

جنوب کی جانب ہے، یہ بحرِ جلیل اور بحرِ طبریہ سے ہوتا ہوا بحرِ مردہ میں جا گرتا ہے۔ (ماجدی)

طعم - طَعِمَ یَطْعَمُ طَعمًا وطعامًا کھانا۔ جمع اطعمۃ۔ مِطْعامٌ: بہت مہمان نواز میزبان۔ الطُّعمُ: تناول الغذاء (راغب)

اِغْتَرَفَ - کسی چیز میں سے تھوڑا سا ہاتھ سے لے لینا اور غُرفۃ وہ چیز جو ہاتھ میں لی گئی۔ غَرَفَ یَغْرِفُ غَرفًا۔ اس کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے غَرَفَ نَاصِیَتَہٗ: پیشانی کے بال کاٹنا۔ تراشنا۔ اسی سے ہے غَرَفَ الماءَ بِیَدِہٖ: پانی چلو میں لینا۔ الغَرفُ مصدر ہے۔ اس درخت کو بھی کہتے ہیں جس سے چمڑا رنگا جاتا ہے۔ الغِرفۃُ: چلو بھرنے کی ہیئت۔ جمع غِراف

الاغترافُ: الاخذ من الشئ بالید وبآلۃٍ۔ (قرطبی)

اَلغَرفَۃُ: ایک مرتبہ اور ایک ہاتھ سے پانی لینا اور الغُرفَۃ بالضم دونوں ہاتھوں سے لینا۔

جَاوَزَہٗ - جَاوَزَ یُجَاوِزُ مُجَاوَزَۃً وجَوَازًا: کسی جگہ سے آگے گزر جانا اور آگے بڑھ جانا۔ اَجَازَ اِجَازَۃً: جائز کرنا اجازت دینا۔ نافذ کرنا۔ انعام دینا۔ کہا جاتا ہے: اَجَازَہٗ بالف دِرھَمٍ اس کو ایک ہزار کا انعام دیا۔ اسی سے جائزۃ ہے انعام اور بخشش۔ اس کی جمع جوائز آتی ہے۔ یہاں جاوَزَہٗ ھُوَ سے مراد نہر اردن کو پار کرنا ہے۔ ہٗ کی ضمیر نہر کی طرف ہے اور ھو تاکید کے لئے ہے۔

الھا تعود علی النھر وھو توکید
(قرطبی ص ۲۵۵ ج ۳)

یَظُنُّوْنَ - ظَنَّ یَظُنُّ ظَنًّا یقین کرنا۔ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّآ اِلَیْہِ انہوں نے یقین سے جان لیا کہ خدا کے سوائے کوئی پناہ گاہ نہیں۔ اسی طرح ظن وہم و گمان میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ وظننتُ زیدًا صَاحِبَکَ۔ میرا گمان ہے کہ زید بھی تمہارا ساتھی ہے۔

الظن: گمان۔ یقین۔ شک۔ جمع ظُنُوْن
وَیَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَ۔

ظَنَّۃ: تہمت۔ ظنّان: بدگمان و بدظن۔ ظنینٌ: مُتَّھَم۔ مشکوک۔ یہاں یظنّون میں ظن یقینِ محکم کے معنی میں ہے۔ چونکہ آیت کا مقتضا یہ ہی ہے۔ ابن عباس سے یہ تفسیر منقول ہے کہ ای یَعْلَمُوْنَ ویَستَیْقِنُوْنَ (ماجدی)

وظن بمعنی التیقن۔ (قرطبی)

لیکن یہاں احتمال اس کا بھی ہے کہ ظن شک کے
معنی میں ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مومنین
صادقین کو اپنی قلت فوج اور دشمن کی کثرت فوج
کی وجہ سے یہ گمان ہوگیا کہ ہمیں اس جنگ میں مرتبہ
شہادت ملے گا جو ملاقات الٰہی کا ذریعہ ہوگی
تو وقوع شک قتل میں ہے۔ اس صورت میں تقدیر
عبارت یوں ہوگی و قَالَ الَّذِیْنَ یتوھمون
انھم یُقتلون مع طالوت فیلقون اللہ
شھداء ، فوقع الشك في القتل۔ (قرطبی)

فِئَةٍ ۔ الفئۃ : لوگوں کی ایک
جماعت یا ٹولی۔ گروہ۔ ایک ٹکڑا۔
فَأَىَ يَفْأَى فَأْوًا و فأيًا (منجد) کاٹنا۔
پھاڑنا۔ تلوار سے وار کرنا۔ کہا جاتا ہے فَأَىَ
رَأْسَ فُلَانٍ کسی کا سر تلوار سے کاٹ دینا۔
تفأى القدحُ : پیالہ کا پھٹنا۔ الفأوُ مصدر
ہے۔ دو پہاڑوں کے درمیان شگاف پڑ جانا۔
الفئة اسی سے ہے جماعت اور گروہ کو
کہا جاتا ہے۔ جمع فئاتٌ اور فُئُوتٌ اسی
سے فَيْءٌ ہے اچھی حالت کی طرف لوٹنا اور رجوع
کرنا۔ قال : حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۔
الفيءُ والفيئةُ : الرجوع الى حالةٍ محمودةٍ
الفيئ مال غنیمت کو بھی کہا جاتا ہے۔ والفئۃ
الجماعة المتظاهرة يرجع بعضهم الى بعض في
التعاضد۔ (راغب)
الفئةُ : الجماعة من الناس والقطعة
منهم۔ من فَأَوْتُ رَأْسَهٗ بالسيف
وفَأَيْتُهٗ اى قطعتُہ (قرطبی) جماعت چونکہ
لوگوں میں منتخب کرکے اور جدا کرکے بنائی جاتی ہے
اس لئے اس کو الفئۃ کہا گیا۔
الفئة الباغية : مطالبہ کرنے والی فوج۔
دمِ عثمان کی طالب جماعت

بَرَزُوْا ۔ بَرَزَ يَبْرُزُ بُرُوْزًا ۔ کھلے
میدان میں نکلنا۔ بَرِزَ (س) يَبْرَزُ بَرَزًا
گمنامی کے بعد ظاہر ہونا۔ صفت بَارِزٌ ۔
بَرُزَ يَبْرُزُ بَرَازَةً (کرُمَ) سے جب آتا ہے
تو اس کے معنی فضیلت اور شجاعت میں اپنے ساتھیوں
سے فوقیت حاصل کرنا ہے۔ صفت مذکر بَرْزٌ اور
مؤنث بَرْزَةٌ ۔ امرأةٌ بَرْزَةٌ عفيفة۔
بَرْزَة : شریفہ اور پاکدامن عورت کو کہا
جاتا ہے۔ اسی سے مُبَارَزَةٌ دشمن کے مقابلہ
پر نکل کر لڑنا۔ دشمن کو چیلنج کرنا۔ وَلَمَّا بَرَزُوْا
لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ اور جب جالوت اور اس
کی فوجوں کے سامنے آگئے۔ یہ جنگ دیار عمالقہ
میں لڑی گئی۔ اور یہ اقوام کی جنگ تھی اپنا حق
حاصل کرنے کے لئے اقوام کی جنگ لڑنے کی اجازت ہے۔

جَالُوْت ۔ یہ قوم عمالقہ کا سردار تھا ہر وقت آہن پوش

رہتا تھا۔ یہ حضرت داؤد کے ہاتھوں قتل ہوا۔ طالوت اور جالوت دونوں عجمی نام اور علم ہونیکی وجہ سے غیر منصرف ہیں۔

اَفْرِغْ ۔ اَلْاِفْرَاغُ: بہانا۔ ڈالنا۔ اِفراغ الماءِ: پانی گرانا۔ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا: صبر عطا کر۔ فَرَغَ يَفْرُغُ و يَفْرَغُ فَرَاغًا: کام پورا کرکے خالی ہونا۔ فارغ ہونا۔ فَرَغَ لَهٗ وَ اِلَيْه۔ قصد کرنا۔ فَرَّغَ الدِّمَاءَ: خون بہانا۔ کہا جاتا ہے فرّغ اللّٰهُ عَلَيْهِ الصَّبْرَ: اللہ اس کو صبر دے۔

ثَبِّتْ ۔ یہ تثبیت سے امر کا صیغہ ہے۔ ہمیں ثابت قدم رکھیں، ہمیں سہارا دیں ثَبَتَ يَثْبُتُ (ن) ثَبَاتًا یہ زوال کی ضد ہے ثابت رہنا۔ قرآن پاک میں دوسرے مقامات پر ہے يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا ۔ و رجلٌ ثَبْتٌ و ثبيتٌ فی الحربِ: جنگ میں ڈٹ کر لڑنے والا۔ بہادر۔ ثَبُتَ يثبُتُ ثباتةً: بہادر ہونا۔ مستقل مزاج ہونا۔ ثَبَتَ ثُبُوْتًا: کسی جگہ ٹھہرنا۔ اقامت کرنا۔ ثَبَتَ عَلَى الْاَمْرِ: کسی کام پر ہمیشگی کرنا۔ صفت ثابت و ثبیتٌ۔

هَزَمُوْهُمْ ۔ هَزَمَ يَهْزِمُ هَزْمًا چبانا۔ دشمن کو شکست دینا۔ چھپانا۔ هَزَمَ الكلام: بات چھپانا۔ هَازِمَةٌ: مصیبت۔ جمع هوازم۔ الهَيْزَمُ: شیر سخت۔ مضبوط۔ الهَزِيمَةُ: شکست۔ اصل الهزم: غمز الشئ اليابس حتى يَحطِمَ (راغب) کسی خشک چیز کو دبا کر توڑ دینا۔ هَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ: انہوں نے ان (دشمنوں) کو اللہ کے حکم سے شکست دیدی۔ جُنْدٌ مَا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ مِهْزَمٌ: اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے سر میں نیچے آگ لگا کر کھیلتے ہیں، ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ گویا مخالف پارٹی کو شکست دیتے ہیں۔

دَفْعُ ۔ دَفَعَ يَدْفَعُ دَفْعًا و دِفَاعًا وَمَدْفَعًا: ہٹانا دور کرنا۔ دَفْعٌ جب حرف اِلٰی سے متعدی ہو تو دینے اور پہنچانے کے معنی دیتا ہے جیسا کہ فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ۔ ان کے اموال ان کے حوالہ کرو اور جب حرف عَنْ کے ساتھ متعدی ہو تو یہ حمایت اور تعاون کے معنی دیتا ہے۔ جیسا کہ اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی مدافعت کرتا ہے۔ یعنی ان کی حمایت کرتا ہے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ۔ اگر اللہ تعالیٰ بعض کو بعض سے نہ ہٹاتا

تو زمین فساد سے لبریز ہو جاتی۔

وَلَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ

یہاں بھی دافع کے معنی حامی اور مددگار کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زمین میں جب اشرار و بُغاۃ کی نافرمانیاں کثرت سے ہونے لگتی ہیں اور وہ بندگانِ خدا کو تنگ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایک جماعت کو قوت دیتا ہے جو ان کی سرکوبی کر کے امن قائم کرتی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ۔ اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ دنیا میں حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہوتے ہیں وہ یوں ہی گردش گردوں سے برپا نہیں ہوتے بلکہ ان کی پشت پر خدا کی حکمتیں ہیں۔ اور ظلم و طغیان کی اصلاح مدنظر ہوتی ہے۔

(الحمد للہ یہاں تک دو سپاروں کی لُغات بیان ہو گئیں۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اوّلاً و آخراً

تِلْكَ الرُّسُلُ

كَلَّمَ۔ كَلَّمَ اللّٰهُ: اللہ نے کلام کیا۔ خطاب کیا۔ براہِ راست بات کی۔ كَلَّمَ اللّٰهُ میں مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ (مدارک۔ کشاف)

روح القدس۔ اس سے مراد حضرت جبرائیل ہیں۔ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ۔ ہم نے ان کی تائید فرشتہ اعظم سے کی۔ یعنی ان کی حفاظت کی۔ بچایا۔

اَلْحَيُّ۔ زندہ، اپنی قدرت اور اپنی ذات سے۔ صفت حیات۔ اس کی جزوِ ذات ہے۔ موت اور عدم حیات کا اس پر گزر نہیں اس پر فنا نہیں۔ الحیّ الباقی الذی لاسبیل علیہ للفناء (کشاف)

یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ زندہ ہے اور سب کی زندگیاں اس کی حیات سے وابستہ ہیں۔ اَلْحَيُّ صفتِ مشبّہ کا صیغہ ہے۔ فعیل بمعنی فاعل ہے۔

اَلْقَيُّوْمُ۔ یہ قَامَ يَقُوْمُ سے مبالغہ کا وزن ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم ہو اور دوسروں کے قیام و بقاء کا واسطہ اور ذریعہ ہو۔ وہ صفتِ قیام میں کسی کا محتاج نہ ہو۔ دوسرے سب محتاج ہوں بلکہ سب کا قیام قیّوم کی ذات و تدبیر سے وابستہ ہو۔ القائمُ بتدبیرِ ما خَلَقَ (قرطبی)

اَلْقَيُّوْمُ: القائمُ الحافظُ لِکُلِّ شیٔ والمعطی مابہ قوامُہٗ (راغب)

اس کی اصل قَیْوُوْمٌ ہے ایک واؤ کو یا بناکر
یا۔ کو یا۔ میں مدغم کردیا گیا ہے

سِنَةٌ ۔ سِنَةٌ کے معنی اونگھ کے
ہیں۔ علامتِ غفلت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غفلت سے
بَری ہے۔ سِنَةٌ وَسَنٌ سے ماخوذ ہے۔
وَسَنَ یَوْسَنُ وَسَنًا وَسِنَةً اونگھنا نیند سے جاگنا۔
اونگھ غنودگی۔ سِنَةٌ کی اصل وَسْنَةٌ ہے۔ واو کو حذف
کردیا ہے والاصل فی سنة وسنة حذفت الواؤ
والسنة: النعاس فی قول الجمیع (قرطبی)
سِنَةٌ سے مراد بالاتفاق اونگھ۔

نَوْمٌ ۔ نَامَ یَنُوْمُ نَوْمًا و نِیَامًا
سونا۔ اونگھنا۔ مرنا۔ نوم انسان کی اس حالت کو
کہتے ہیں جبکہ وہ نیند کی وجہ سے بالکل غافل ہوجائے
اور ذہن اور عقل دونوں غافل ہوجائیں۔
والنوم هو المستثقل الذی یزول معه
الذهن فی حق البشر (قرطبی) بعض اہلِ علم
نے نوم کو خفیف موت سے تعبیر کیا ہے۔ وقیل
النَّوْمُ مَوْتٌ خَفِیْفٌ والموتُ نَوْمٌ ثقیل
(راغب) نوم اور سنة کی نفی سے نیند کی ابتدائی
اور انتہائی دونوں حالتوں کی نفی ہوگئی جس کے معنی
یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ غفلت کے تمام اثرات سے
کمال درجہ پاک ہے۔

کُرْسِیٌّ واحد ہے۔ جمع کَرَاسِیٌّ
کُرْسِیٌّ کے معنی عربی لغت میں کسی چیز کی جمی جمائی
تہہ کے ہیں۔ اسی سے کرسی کا لفظ بنا جو بیٹھنے کی
جگہ یا چیز مثلاً تخت وغیرہ کے لئے استعمال ہوا۔
کِرْسٌ، چیز کی اصل۔ جڑ اور بنیاد کو کہتے ہیں۔
کرس کی جمع اکراس آتی ہے اور جو چیز مختلف
اجزاء جمع کرکے بنائی جائے اس کو بھی کرس
کہتے ہیں اور کرسی کو بھی اسی لئے کرسی کہتے ہیں کہ
وہ مختلف اجزاء تختے، کیل وغیرہ جمع کرکے بنتی ہے
وکل شیئ مجتمع من الشیئ کِرْسٌ۔ عرفِ عام میں
تو کرسی سے مراد وہی خاص کرسی ہے جس پر بیٹھ
جاتا ہے۔ اقتدار اور علم کو بھی کرسی کہتے ہیں اور
رئیس اور امیر کو بھی کرسی کہدیا جاتا ہے جن کی طرف
لوگ رجوع کرتے ہیں۔ وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا علم اور اقتدار
آسمانوں اور زمین کے تمام اطراف و اکناف پر
حاوی ہے۔ کوئی گوشہ اور کوئی کونہ اس کے اقتدار
سے الگ نہیں ہے۔ اگرچہ لفظ کرسی کثیر المعانی ہے
علم، اقتدار، امیر، حاکم، قدرت سب پر بولا جاتا ہے
لیکن یہاں آیت کی مراد کرسی سے خاص مقام اور
موضع کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ کرسی دراصل ایک
عظیم ترین کرہ ہے جو عرش کے مقابلہ میں تو اگرچہ
کافی چھوٹا ہے مگر خود اس کی وسعت بہت زیادہ
ہے۔ اگر ارض و سماء کو جمع کرکے کرسی میں رکھدیئے

جائیں تو یوں معلوم ہوگا کہ کسی جنگل کے میدان میں
ایک معمولی سا کڑا پڑا ہوا ہے وقد الذی تقتضیہ
الاحادیث ان الکرسی مخلوق بین یدی
العرش والعرش اعظم منہ (قرطبی)

یَئُودُهٗ ۔ اَدَ یَئُوْدُ اَدًا کے معنی
کسی چیز کا ایسا بھاری اور گراں ہونا کہ اس کا سنبھالنا
مشکل ہو جائے۔ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا
کے معنی یہ ہوئے کہ ارض وسما کی دیکھ بھال خدا
کو گراں نہیں نہ وہ تھکتا ہے نہ اس کو یہ بھاری
معلوم ہوتا ہے کہ سہارا دینے کے لیے کسی
کے تعاون کی ضرورت پیش آئے۔ یَئُوْدُ کی اصل
اَوْدٌ ہے۔ ثقل اور بوجھ کو کہا جاتا ہے۔
لَا یَئُوْدُهٗ ای لا یُثقِلُه (راغب)
اٰدَهُ الامرُ اَوْدًا و اُوُوْدًا۔ بَلَغَ مِنْهُ
المجهُودُ وَالمَشَقَّةُ (اللسان)

اِکْرَاہَ ۔ اکراہ کے معنی ہیں کسی انسان
کو ایسے فعل یا قول پر مجبور کرنا جس کے کہنے اور کرنے
پر وہ دل سے راضی نہیں ہے جیسا کہ حکم ہے کہ
لا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء ۔
والاکراہ یقال فی حمل الانسان علی ما
یکرھه (راغب)
اِکراہ باب افعال ہے۔ اس کی اصل کُرْہٌ
ہے جیسا کہ تحقیق گزر چکی ہے

الرُّشْد ۔ رُشْدٌ ہدایت۔ حق،
اسلام۔ دین۔ رَشَدٌ اور رُشْدٌ، یہ
غَیٌّ کی ضد ہیں۔ ہدایت کی جگہ ان کا استعمال
ہوتا ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کا استعمال
دو ابواب سے ہوتا ہے۔ رَشَدَ یَرْشُدُ (ن)
سے اور یَرْشَدُ سَمِعَ سے۔ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ
فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا ۔
بعض اہل لغت نے رُشْدٌ اور رَشَدٌ میں یہ
فرق بیان کیا ہے کہ رَشَدٌ خاص ہے۔ اور
رُشْدٌ عام ہے۔ چونکہ رُشد کا اطلاق امور دینی
اور دنیاوی دونوں پر ہوتا ہے جبکہ رَشَدَ کا
اطلاق خاص امور اخروی پر ہوتا ہے۔
رَاشِدٌ اور رَشِیْدٌ دونوں کو عام ہے۔ دنیاوی
اعتبار سے بھی اگر کوئی راہِ ہدایت پر ہو اس کو
راشد اور رشید کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر
امور اخروی اور دینی میں مستقیم ہو تو اس کو بھی راشد
اور رشید کہہ دیتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ هُمُ
الرّٰشِدُوْنَ۔ وَ مَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ
یہاں رُشد سے مراد راہِ اسلام ہے۔ مطلب
یہ کہ اب کفر اور اسلام دونوں واضح ہو چکے ہیں

الْغَیّ ۔ یہ غَوٰی یَغْوِیْ سے مصدر
ہے۔ غَیٌّ۔ اعتقاد اور رائے کی کجی کو کہا جاتا
ہے۔ مطلق ضلال اور گمراہی کو غی نہیں کہتے

اَلْغَيُّ جهل فی اعتقاد فاسد (راغب)
الغَيُّ مصدر غوی یغوی اذا ضلّ فی
معتقدٍ ورأیٍ (قرطبی)

الطَّاغُوْت

طَغِیَ یَطْغٰی طَغْوًا
طَغَا یَطْغُوْا طُغُوًّا وطُغْوَانًا سے ماخوذ ہے
جس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا متمرد ہونا، باغی ہونا۔
اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَیَطْغٰی ۔ وَلَا تَطْغَوْا فِیْهِ ۔ اِنَّنَا نَخَافُ
اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ۔ ان سب آیات
میں طَغٰی حد سے بڑھنے کے مفہوم میں ہے۔

طاغوت کی تعلیل صرفی

علامہ محب الدین
ابوالبقاء عبداللہ العکبری اپنی تالیف ما منّ به
الرحمٰن من وجوہ الاعراب والقرأت فی القرآن
میں فرماتے ہیں: طاغوت مذکر اور مؤنث واحد جمع
سب میں ایک طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اصل
طَغَیُوْتٌ ہے کیونکہ یہ طغیت تطغی سے ہے۔
اور یہ بھی جائز ہے کہ واو سے ہو کیونکہ یَطْغُوْ بھی
بولا جاتا ہے۔ یہ یا کا استعمال اکثر ہے اور اسی پر
مصدر طغیان آتا ہے۔ پھر لام کلمہ کو مقدم کر کے
غین سے پہلے کر دیا گیا تو طَغَیُوْتٌ یا طاغوت
بن گیا۔ پھر حرف علت متحرک اور اس کا ما قبل
مفتوح ہوا تو اس کو الف سے بدل لیا گیا۔ اور اب
اس کا وزن فَعَلُوْتٌ ہے۔ اور در اصل یہ ملکوت

کی طرح مصدر ہے۔
واضح رہے کہ مصدر ہونے کی صورت میں اس کی
تاء زائد ہوگی۔ اور علامہ عینی نے بعض سے یہ
بھی نقل کیا ہے کہ اس کی تا زائد نہیں بلکہ لام کلمہ کا
بدل ہے اور اس کا وزن فَاعُوْلٌ ہے۔
پھر اس میں یہ بحث بھی ہے کہ یہ مصدر ہے یا نہیں
مبرد نے تصریح کی ہے کہ میرے نزدیک زیادہ
درست یہ ہے کہ یہ جمع ہے۔ ابوعلی فارسی کہتے
ہیں کہ ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ طاغوت
مصدر ہے جیسا کہ رغبوت، رہبوت اور ملکوت
ہیں۔ پس جس طرح یہ اسماء آحاد ہیں اسی طرح
یہ اسم بھی مفرد ہے جمع نہیں ہے اور جو چیز اس
کے مصدر مفرد ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ یہ
آیت کریمہ ہے اَوْلِیٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ
ان کے رفیق شیطان ہیں۔ کہ جمع کے مقام پر
مفرد لایا گیا ہے۔ جس طرح سے کہ هُمْ رِضًا
هُمْ عَدْلٌ کہا جاتا ہے۔ اور سیبویہ کے
نزدیک یہ اسم جنس ہے مفرد و مذکر۔
علامہ زمخشری تفسیر الکشاف میں فرماتے ہیں
کہ یہ لفظ شیطان یا شیاطین کے لئے استعمال
کیا گیا۔ کیونکہ یہ مصدر ہے اور اس میں کئی مبالغے
ہیں (۱) مصدر سے موسوم کرنا گویا کہ شیطان کی
ذات خبیثہ خود طغیان ہے۔ صیغہ بھی

مبالغہ کا صیغہ ہے کیونکہ رحموت کے معنی ہیں وسیع رحمت اور ملکوت کے معنی ہیں فراخ ملک (۳) قلب جو اختصاص کے لئے ہے کہ غیر شیطان کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔

(لغات القرآن نعمانی)

طاغوت کی اصل طغیوت ہے۔ کیونکہ یہ طغیت تطغی سے مصدر ہے مثل ملکوت اور رھبوت کے۔ یہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (حقانی)

والطاغوت عبارۃ عن کل مُتَعَدٍّ وکل معبودٍ من دون اللہ ویُستعمل فی الواحد والجمع (راغب)۔

وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ۔ وقال اَوْلِیَآؤُھُمُ الطَّاغُوْتُ۔

صاحب مفردات فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک طاغوت فَعْلُوت کے وزن پر ہے اور یہ مصدر ہے۔ جیسا کہ جبروت اور ملکوت۔ اور بعض نے اس کی اصل طَغَوُوتٌ بیان کی ہے۔ تعلیل ہو کر طاغوت بنا۔ پہلے لام کلمہ میں قلب کیا گیا، اور پھر واؤ کے متحرک اور ما قبل مفتوح ہونے کی وجہ سے اسے الف سے تبدیل کر دیا گیا۔ طاغوت کا اردو ترجمہ تو مشکل سا ہے البتہ شیطان سرکش اس کے معنی کو واضح کرتے ہیں۔ اس سے مراد باطل خدا ہیں۔ بتوں کو بھی طاغوت کہا جاتا ہے۔ طاغوت کی جمع طواغیت آتی ہے۔

اَلْعُرْوَۃ۔ ہر وہ چیز جس کو پکڑ کر آدمی لٹک جائے اور سہارا پکڑے۔ عَرَا یَعْرُو عَرْوًا۔ عراہ فلانًا امرٌ۔ پیش آیا۔ عَرَا فلانٌ عَلَیہ۔ مانگنے کے لئے قصد اور ارادہ کرنا۔ صفت فاعل عارٍ اور مفعول مَعْرُوٌّ اعترٰی یعترِی اعتراءً۔ عطیہ مانگنے کیلئے جانا۔ اعتراہ امرٌ۔ کوئی کام لاحق ہونا۔ عِرْوٌ وہ شخص جو معاملات کا اہتمام نہ کرے اس کی جمع اَعْرَاءٌ آتی ہے۔ کہا جاتا ہے اَنَا عِرْوٌ مِن کَذَا۔ میں اس چیز سے خالی ہوں۔ عَرِیَ یَعرٰی عَرِیَّۃً وعُرْیَانًا ننگا ہونا کپڑوں سے خالی ہونا۔ صفت عَارٍ وعُرْیَانٌ ہے جمع عُرَاۃٌ۔ مؤنث عَارِیَۃ۔ جمع عوار وعلا یات۔ عُرْیَۃ ننگا پن عَارِیَۃ ادھار چیز۔ عُروۃ سے مراد ایسا حلقہ ہے جس کے تھامنے سے آدمی بے فکر ہو جائے اور دوسرے تمام سہاروں کو اتار پھینکے۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی۔ میں شی معقول کے لئے شیٔ محسوس کا استعارہ ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی حلقے کو تھامتا ہے وہ اس کے دستہ اور حلقے

کو مضبوط پکڑ لیتا ہے۔ اسی طرح جو دین
کو تھامتا ہے وہ ان دلائل سے وابستہ ہوتا ہے
جو اس پر رہنمائی کرتے ہیں۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى میں عُروۃ
سے مراد مجاہد کے نزدیک ایمان اور سُدّی نے
کہا ہے کہ عروہ سے مراد اسلام ہے۔ ابن عباس
اور سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ عُروۃ سے مقصود
کلمۂ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔
وھٰذہ العبارات ترجع الی معنی واحدٍ (قرطبی)

عراء میدان کو کہتے ہیں۔ فَنَبَذْنٰهُ
بِالْعَرَاۗءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ۔ پھر ہم نے اُس کو
کھلے میدان میں ڈال دیا جب کہ وہ بیمار تھے

اعتراء۔ سامنے آنا۔ قصد کرنا۔ پیش آنا
اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا ہمارے
معبودوں میں سے کسی نے تمہیں مشکل میں ڈال دیا

مَعَارِی۔ انسان کے وہ اعضاء جو عموماً کھلے
رہتے ہیں جیسے ہاتھ منہ وغیرہ لَا تَجُوْعَ فِيْهَا
وَلَا تَعْرٰى نہ تو بھوکا ہوگا نہ ننگا۔

الْوُثْقٰى یہ وثاقۃ سے ماخوذ ہے
اعتبار کرنا۔ بھروسہ کرنا۔ فاعل واثق اور
مفعول موثوق بہ آتا ہے۔ اوثق اسم تفضیل
مذکر اور وثقٰی اسم تفضیل مؤنث ہے۔
وَثِقَ يَثِقُ ثِقَةً وَّ وُثُوْقًا وَّ مَوْثِقًا :
وثق بفلان : اعتبار کرنا۔ بھروسہ کرنا
وَثُقَ الشَّيْءُ۔ ثابت اور قوی ہونا۔ مضبوط
ہونا۔ ثقۃٌ مصدر ہے۔ قابلِ اعتماد اور بھروسہ
ہونا۔ جمع واحد، مذکر و مؤنث سب پر یکساں
بولا جاتا ہے۔ وَثَاقٌ و وِثَاقٌ وہ چیز جس سے
باندھا جائے رسی وغیرہ۔ وثیقٌ مضبوط
جمع وِثَاقٌ۔ اس کی مؤنث وَثِيْقَةٌ آتی ہے
جمع وثائق آتی ہے۔ خود وُثْقٰی کی جمع وُثُق
ہے جیسے فُضْلٰی کی جمع فُضُلٌ آتی ہے۔
جمع الوثقى الوُثُقُ۔ فالوثقى فُعلىٰ من
الوثاقة۔ (القرطبی ص۲۸۸ ج۳)

انْفِصَام۔ اِنْفَصَمَ منقطع ہونا۔ بغیر
جدائی کے ٹوٹنا۔ الفَصِيم و المنفصَمُ: ٹوٹا ہوا
کٹا ہوا۔ فَصَمَ يَفْصِمُ فَصْمًا۔ فصم
الدملج ونحوه (منجد) بازوبند وغیرہ
کو بغیر جدا کئے توڑنا۔ فَصَمَ الشیءُ: توڑ دیا۔
لا انفصام لها کا مطلب ہوگا کہ جب تک
تمسک بالعُروہ رہے گا ہلاکت سے محفوظ ہوگا
اگر چیز کو الگ کر کے کاٹا اور توڑا جائے تو اس کو
قَصْمٌ (بالقاف) کہتے ہیں۔

وَلِيٌّ : دوست۔ مددگار، رفیق، پشت پناہ
سرپرست۔ محب وَلِيٌّ واحد ہے اس کی جمع
اَوْلِيَاۗءُ ہے۔ وَلِيَ يَلِي وَلْيًا و وَلِيَ يَلِي

وَالِیًا و ولایۃً - دو یا اس سے زیادہ چیزوں کا اس طرح ملنا کہ ان کے درمیان کوئی غیر چیز حائل نہ ہو۔ وَلِیَ فُلَانًا - دنا منہ وقَرُبَ وَتَبِعَہٗ مِنْ غَیْرِ فَصْلٍ - یعنی بغیر فاصلہ کے پیچھے پیچھے چلنا۔ ولاءٌ اور تَوالی کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ دو چیزوں کا یکے بعد دیگرے اسطرح آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہو پھر یہیں سے استعارۃً قرب کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہ قرب عام ہے مکان کے اعتبار سے ہو یا دین کی وجہ سے ہو یا کسی اور نسبت سے جیساکہ دوستی۔ اور نصرت کے اعتبار سے۔ وَلَایَۃ بفتح الواو اور وِلَایَۃ بکسر الواو دونوں کے معنی ہیں کسی کام کا متولی اور نگران ہونا۔ اَلْوَلِیُّ اور المَوْلیٰ دونوں کبھی اسم فاعل کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی اسم مفعول کے اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہاں ولی اسم فاعل کے معنوں میں ہے۔ مفعول مُوَالاً کے وزن پر آتا ہے۔ وَلِیّ اور مولیٰ دونوں قریب المعنی ہیں لیکن مؤمن کو ولی اللہ تو کہہ سکتے ہیں مگر مولی اللہ کہنا ثابت نہیں۔ لیکن جناب باری تعالےٰ کے حق میں دونوں کا استعمال درست ہے۔

الولاء والتوالی ان یحصل شیئان فصاعدًا حصولًا لیس بینھما مالیس منھما (راغب)

اَلْوَلِیُّ فعیل بمعنی فاعل - قال الخطابی: الولیّ الناصر- یَنْصُرُ عِبَادَہُ المُؤْمِنِیْنَ - (قرطبی)

شَمْسٌ - سورج کی ٹکیا اور دھوپ دونوں کو شمس کہا جاتا ہے۔ جیساکہ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ - سورج اور چاند دونوں ایک خاص حساب سے چل رہے ہیں شمس یومُنا دن کا دھوپ والا ہونا وَالشمسُ یقال للقرصۃ وللضوءِ المُنْتَشِرِ عنھا وتجمع علی شُمُوسٍ (راغب)

الْمَشْرِق - جمع مشارق سورج کی جائے طلوع - مشرق اور مغرب جب مفرد ہوں تو ان سے مراد شرقی اور غربی دو جہتیں ہوتی ہیں اور تثنیہ ہو تو دو موسم یعنی موسم سرما اور موسم گرما مراد ہوتے ہیں اور جب جمع کا صیغہ ہو تو اس سے ہر روز کا مشرق اور مغرب مراد ہوتا ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ[1] - رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَالْمَغْرِبَیْنِ[2] - رَبُّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ[3] -

الْمَغْرِب - سورج کی جائے غروب۔ جمع مغارب آتی ہے۔ غروب کے معنی ہیں سورج کا غروب ہو جانا حواس انسانی سے دور۔ اسی سے ہر مسافر کو غریب کہتے ہیں کہ وہ اپنے وطن سے دور چلا جاتا ہے۔ کوّے کو بھی غراب کہنے کی یہی وجہ ہے، کہ وہ حصولِ معاش میں

[1] المزمل آیت ۹ [2] الرحمٰن ۱۷ [3] المعارج ۴۰

بہت دور نکل جاتا ہے۔

غَرَبَ يَغْرُبُ غَرْبًا وَغُرُوبًا وَغُرْبَةً

دور نکل جانا۔ غَرُبَ الرَّجُلُ : بَعُدَ

بُهِتَ - بَهِتَ اور بُهِتَ بَهْتًا و بَهَتًا۔ ہکا بکا رہ جانا۔ حیرانی سے خاموش اور دم بخود ہو جانا بَهَتَهُ حیران و مبہوت کر دینا، لاجواب بنا دینا۔ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ۔ کافر یہ سُنکر حیران اور ششدر رہ گیا۔ بُہتان۔ ایسا الزام کہ سُن کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ آدمی سُن کر حیران اور ششدر رہ جائے۔ مَبهُوت : حیران و پریشان، حیرانی کے عالم میں پڑا ہوا۔ ششدر۔ صاحب کشاف نے بُهِتَ کی تفسیر مغلوب کرنے سے کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ای فَغَلَبَ اِبْرَاهِيْمُ الْكَافِرَ (کشاف) بُهِتَ الرَّجُلُ و بُهِتَ وَ بَهِتَ (س) اذا انقطع وسكت مُتَحَيِّرًا (قرطبی) بُهِتَ الَّذِي كَفَرَ اي دُهِشَ و تَحَيَّرَ (راغب)

قَرْيَةٍ - بستی، شہر، گاؤں، قوم۔ لوگوں کی جماعت۔ قریۃ کے اصل معنی جمع کے ہیں۔ کہتے ہیں قَرَيْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ : میں نے پانی کو حوض میں جمع کیا بستی یا شہر کو بھی قریۃ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ لفظ قَرْيَة جس طرح شہر اور بستی پر بولا جاتا ہے اسی طرح قوم، جماعت اور قافلہ پر بھی اس کا اطلاق عام ہے اور قرآن میں دونوں طرح کے استعمالات ہیں۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً ۔ خدا ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے جو ہر طرح کی آفات سے محفوظ امن اور چین سے بستی تھی۔ اس میں قریہ سے مراد اہل قریہ ہیں۔ اسی طرح وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ میں اکثر مفسرین اور اہل علم نے یہاں اهل کا لفظ محذوف مانا ہے اور مراد بستی کے رہنے والے ہیں۔ اور وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۔ اور ہم نے تم سے پہلے بھی بستیوں کے رہنے والوں میں مرد ہی نبی بنا کر بھیجے تھے جن کی طرف ہم نے وحی کی۔ یہاں قُرٰی سے مراد بستی ہے۔ القریۃ : جمع قُرًى و قِرًى۔ اس کی طرف نسبت کرنی ہو تو کہتے ہیں قَرَوِيٌّ۔ القِرٰى : وہ کھانا جو مہمان کو پیش کیا جاتا ہے اور وہ پانی جو حوض میں جمع کیا جائے۔ القاری فاعل ہے۔ گاؤں کا رہنے والا۔ کہتے ہیں جاء كل قارٍ وبادٍ۔ ہر شہر اور گاؤں کے رہنے والا آیا۔

خَاوِيَةٌ - خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا

یہ عربی کا ایک محاورہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ بستی
بالکل تباہی اور بربادی سے مٹ چکی تھی، چھتیں
گریں اور پھر دیواریں گر کر چھتوں پر پڑیں۔
سُقطت السُّقُفُ ثم سقطت الحیطانُ
علیھا (قرطبی) خُوَاءٌ کے معنی خالی ہونے
کے ہیں۔ کہا جاتا ہے خَوَتِ الدَّارُ۔ مکان
خالی ہوگیا۔ پھر اس کو وسعت دے کر انہدام اور
تباہی کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا۔ خَوَتِ
البَیْتُ گھر گر گیا، منہدم ہوگیا۔ خَوٰی بطنُہ
مِنَ الطّعام یعنی اس کا پیٹ طعام سے خالی ہوگیا
التخویۃ: دو چیزوں کے درمیان خالی جگہ
چھوڑ دینا۔ خَوٰی یَخْوِیْ (ض) خَوَاءً۔
خالی ہونا، منہدم ہونا۔ خَاوِیَۃٌ: معناھا
خالیۃ۔ واصل الخواء الخُلُوّ (قرطبی)

عُرُوْش ۔ یہ عرش کی جمع ہے۔
عَرَشَ یَعْرُشُ وعَرَشَ یَعْرِشُ عَرْشًا وعُرُوْشًا
مکان بنانا، لکڑی کی چھت بنانا۔ عریش مکان کی چھت
کو کہتے ہیں اور پھر ہر اس چیز کو جو سایہ کے لئے
یا چھپنے کے لئے بنائی جائے عریش کہتے ہیں۔
والعریش سقف البیت وکل ما یُتھیّأ
لیُظَلَّ او یُکَنَّ فھو عریش۔ (قرطبی)
خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا۔ وہ اپنی چھتوں پر
گرے پڑے تھے۔ انگور کی ٹیٹوں کو جن پر بیلیں
چڑھائی جاتی ہیں، معروش کہتے ہیں جیسا کہ فرمایا
مَعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ۔ ٹیٹوں پر چڑھائے
اور بغیر ٹیٹوں پر چڑھائے ہوئے۔
وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ۔ جو ٹیٹوں پر چڑھاتے تھے۔
یہاں یعرشون کے معنی یَبْنُوْنَ کے بیان کئے
گئے ہیں یعنی جو وہ مکان بناتے تھے۔ تختِ شاہی
کو بھی عرش کہتے ہیں۔ وَرَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ
اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔ نَکِّرُوْا لَھَا
عَرْشَھَا۔ اس کے تخت میں ردّ و بدل کردو۔ پھر
بطور کنایہ عرش کا لفظ عزت۔ غلبہ اور سلطنت
میں بولے جانے لگا ہے۔ کہتے ہیں۔ فلانٌ ثُلَّ
عَرْشُہٗ۔ اس کی عزت جاتی رہی۔ العرش مِنَ
القوم۔ قوم کا سردار۔ رئیس العرش مِنَ
البیت۔ چھت۔ العرش مِنَ البئر۔ وہ لکڑی
جس سے کنوئیں کے اوپر کا حصہ بنایا جائے۔
یعرشون۔ مکان اونچے بناتے ہیں
عَرَشَ بالمکان۔ قیام کرنا۔
تعریش البیت۔ مکان کی چھت بنانا۔
تعریش الامر۔ کام میں دیر کرنا۔
عرش علیہ۔ اس پر قابو پالیا۔

یَتَسَنَّہْ ۔ لَمْ یَتَسَنَّہْ: من
السَّنَۃِ ای لم تُغَیِّرْہُ السِّنُوْن (قرطبی)
ابوطلحہ بن مُصرّف نے لَمْ یَسَّنَّ پڑھا ہے

حرف تا۔ کو سین میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ اس کی اصل
سَنْھَۃٌ ہے سَنَھَتِ النَّخْلَۃُ سے مشتق ہے
جبکہ کھجوروں پر ایک عرصہ گزر جائے۔ جمہور کے نزدیک
یَتَسَنَّہْ میں ھاء اصلیہ ہے۔ سَنِہَ یَسْنَہُ
سَنْھًا بہت سالوں والا ہونا۔ صفت اس
کی سَنِہٌ آتی ہے۔ سَنِہَ الطَّعَامُ والشَّرابُ
متغیر ہونا۔ بگڑ جانا۔ سَانَہَ الرَّجُلَ ایک سال
کا معاہدہ کرنا۔ اسی سے ہے تَسَنَّہَ بہت
برسوں والا ہونا۔ تَسَنَّہَ الخُبْزُ: روٹی کا گل
سڑ جانا، بدبودار ہو جانا۔ سَنَۃٌ کے معنی
سال کے ہیں۔ اس کی اصل میں اہل لغت کے دو نظریات
معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس کی اصل
سُنَّۃٌ ہے کیونکہ محاورہ ہے سَانَھْتُ فُلَانًا
میں نے فلاں صاحب سے سالانہ اجرت پر معاملہ
کر لیا ہے۔ اور پھر جب اس کی تصغیر بنائی جاتی
ہے تو سُنَیْھَۃٌ آتی ہے۔ یہ مزید اس کی دلیل
ہے کہ السَّنَۃ کی اصل سَنْھَۃٌ ہے۔ ایک
قول کے مطابق لَمْ یَتَسَنَّہْ اسی سے ہے۔
یعنی سالہا سال گزرنے پر تغیر نہیں آیا۔ بعض
کے نزدیک اس کی اصل سِنْوَۃٌ ہے۔ وجہ اس کی
یہ ہے کہ سَنَۃٌ کی جمع بنائی جائے تو وہ سَنَوَاتٌ
آتی ہے۔ اسی سے سَانَیْتُ فعل ہے۔ اس صورت
میں ھاء برائے وقف ہو گی جیسا کہ کِتَابِیَہْ
اور حِسَابِیَہْ وغیرہ میں۔ بہر حال اختلاف
اس کے لام میں ہے کہ وہ واؤ ہے یا ھاء ہے
دونوں صورتوں میں اس کا اشتقاق سَنَۃٌ
سے ہے کیونکہ اس کا لام کلمہ ھاء ہے یا لام ہے۔
وَانَّ اشْتِقَاقَہٗ مِنَ السَّنَۃِ عَلَی الْوَجْھَیْنِ
لِاَنَّ لَامَھَا ھَاءٌ او واو (کشاف)

الْعِظَامَ۔ عَظْمٌ کی جمع ہے۔
عظم کے معنی ہڈی کے ہیں فَکَسَوْنَا الْعِظَامَ
لَحْمًا۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا اور
لباس پہنایا۔ عَظْمُ الرَّحْلِ بغیر تنگ کے
پالان کی لکڑی۔ عظمۃ الذراع: بازو کا
موٹا حصہ۔ عَظُمَ الشَّیْءُ کے اصل معنی کسی
چیز کی ہڈی کے بڑا ہو جانے کے ہیں پھر مجازاً
ہر چیز کے بڑا ہونے پر اس کا استعمال ہونے
لگا ہے۔ خواہ اس عظم کا تعلق حس سے ہو یا
عقل سے اور عام اس سے کہ عظیم مادی چیز ہو یا
معنوی۔ عَذَابُ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ قُلْ ھُوَ
نَبَؤٌا عَظِیْمٌ۔ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ
عَظِیْمٍ۔ اور عظیم کا لفظ اجسام میں بولا جائے
تو ایسے اجسام پر بولا جاتا ہے جن کے اجزاء متصل
ہوں مگر اس کے بالمقابل کثیر کا لفظ ایسے افراد
پر بولا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں
جیش عظیم کے معنی ہیں بھاری لشکر۔

مَالٌ عَظِیۡمٌ زیادہ مال۔ یہاں عظیم کثیر کے معنی میں ہیں۔ عَظُمَ (ک) عِظَمًا وعَظَامَۃً بڑا ہونا۔ صفت عظیم ہے۔ جمع عُظَمَاء۔ عَظَمَ یَعۡظُمُ (ن) عَظۡمًا۔ کُتے کو ہڈی ڈالنا اَعۡظَمَ الۡاَمۡرُ۔ بڑا ہونا۔ کہا جاتا ہے: مَا یَعۡظُمُنِیۡ اَنۡ اَفۡعَلَ کَذَا: مجھے کوئی چیز بھی ایسا کرنے سے ہول میں نہیں ڈالتی۔ عظمات القوم: سرداران قوم۔

نُنۡشِزُ۔ نُنۡشِزُ۔ نَشَزَ۔ یَنۡشُزُ نَشۡزًا ونُشُوۡزًا۔ بلند ہونا۔ اُٹھنا۔ رُکنا۔ صفت ناشِز وناشِزۃ۔ النشز۔ بلند زمین کو کہتے ہیں۔ نَشَزَ فلان کے معنی بلند زمین کا قصد کرنا۔ اسی سے ایک محاورہ ہے: نشز فلانٌ عن مَقَرِّہٖ اپنی قرارگاہ سے اوپر اُبھرنا ہر اوپر اُٹھنے والی چیز کو ناشز کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ لفظ انہی معنوں میں بارہا استعمال ہوا ہے۔ وَاِذَا قِیۡلَ انۡشُزُوۡا فَانۡشُزُوۡا۔ یعنی جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ جایا کرو۔ پھر یہیں سے زندہ کرنے کے معنوں میں بارہا استعمال ہوا ہے۔ چونکہ وہ بھی اپنی قبروں سے اوپر اُٹھیں گے۔ وَانۡظُرۡ اِلَی الۡعِظَامِ کَیۡفَ نُنۡشِزُھَا۔ گدھے کی ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم ان کو کسطرح جوڑ کر زندہ کرتے ہیں۔ ننشز کے نون کو فتح کے ساتھ

بھی تلاوت کیا گیا ہے۔ یعنی نَنۡشُزُھَا (ن) مرد کی نافرمان عورت کو بھی ناشزہ کہتے ہیں۔ کہ وہ بھی اطاعت سے نکل کر اپنے مقام سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ قرآن میں ہے وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ اور جن عورتوں کی نسبت تمہیں خوف ہو کہ سرکشی کرنے لگی ہیں۔

حضرت اُبی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے اس کو نُنۡشِئُھَا انشاءً سے پڑھا ہے۔ اہل کوفہ اور ابن عامر نے تو ننشزہی پڑھا ہے مگر اہل قرأت کی ایک بڑی جماعت نے نشور بالرّاء پڑھا ہے یعنی کَیۡفَ نُنۡشِرُھَا۔ نَشَرَ یَنۡشُرُ نُشُوۡرًا کے معنی موت کے بعد اُٹھنے (یعنی حیات بعد الموت) کے ہیں۔ عاصم نے نَنۡشُرُ (ن) سے پڑھا ہے۔ نون کے فتح اور شین اور راء کے ضمہ کے ساتھ ابن عباس، حسن اور ابو حیوہ سے بھی یہی قول ہے۔ بعض اہل علم نے نشور اور نشوز دونوں کے معنی الاحیاء بعد الموت کے کئے ہیں۔ فقیل ھما لغتان فی الاحیاء بمعنًی (قرطبی) البتہ لغت میں حیات بعد الموت کیلئے نشور بالرّاء زیادہ مشہور ہے۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنۡشَرَہٗ۔ نَشَرَ الۡمَیِّتُ یَنۡشُرُ نُشُوۡرًا ای عاش بعد الموت۔

اعشیٰ کا شعر ہے ؎

حتی یقول الناس مما رأوا
یا عجباً للمیت الناشر (قرطبی)

النَّشَزُ : المرتفع من الارض (ایضاً)
اس صورت پر آیت کے معنی یہ ہوں گے اُنظُرْ اِلَی العِظَامِ کَیْفَ نَرْفَعُ بعضها علی بعضٍ فی الترکیب للاحیاء۔

یَطْمَئِنَّ - لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ : یہ اطمینانٌ سے ہے۔ اس کا اصل مادہ طَمَنَ ہے۔ اطمینان کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ٹھیک اس طرح ٹک جانا کہ اس کے اِدھر یا اُدھر جھکنے یا لڑھکنے کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔ یہیں سے یہ لفظ نفس یا دل کی حالت کی تعبیر کے استعمال ہونے لگا الطمانینۃ والاطمینانُ : السکون بعد الانزعاج (راغب)
طمانینت اور اطمینان کے معنی ہیں خلجان کے بعد نفس کا سکون پذیر ہونا قرآن میں یہ لفظ چند مقامات پر آیا ہے وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ اس لئے کہ تمہارے دلوں کو سکون ہو۔
وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کا مقصد یہ ہوگا کہ میرا دل الیقین کامل حاصل کرے۔
والطمانینۃ : اعتدال و سکون۔
و طمانینۃ القلب هوان یسکن فکرہ فی الشیء المعتقدِ (قرطبی)

صُرْهُنَّ - صُرْ : صَوَرٌ کے معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ صُرْتُ الشیئَ یا اَصَرْتُ الشیئَ کے معنی ہوں گے میں نے اس کو اپنی طرف مائل کر لیا اپنے سے اس کو ہلا لیا۔ اسی سے فَصُرْهُنَّ ہے یعنی ان پرندوں کو اپنے سے ہلا لو۔ بعض محقق اہل تفسیر نے صُرْهُنَّ کے فعل صُرْ کو صَوْرٌ سے ماخوذ مانا ہے اور اس کے معنی قطع کرنے اور کاٹنے کے ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان چار پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف پہاڑوں پر رکھ دو۔
صَارَ یَصُوْرُ صَوْرًا کے معنی ہیں قطع کرنا ٹکڑے کرنا۔ صُرْهُنَّ : معناہ قَطِّعْهُنَّ (قرطبی)
حضرت ابن عباس، مجاہد اور ابوعبیدہ ابن انباری سے یہ ہی معنی مذکور مراد ہے۔ و قیل قَطِّعْهُنَّ صُوْرَۃً (راغب)

حَبَّة - جمع اس کی حُبُوبٌ آتی ہے گندم اور جو وغیرہ کے دانوں کو کہتے ہیں۔ حَبٌّ اور حَبَّةٌ مطعومات کے دانوں کو کہتے ہیں۔ اور حِبٌّ اور حِبَّةٌ خوشبودار پھلوں اور پودوں کے بیج کو کہتے ہیں۔

سَنَابِل - یہ سُنبلۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں بالی، کونپل۔ کہا جاتا ہے اَسْبَلَ الزَّرْعُ کھیتی میں بالیں پڑ گئیں۔

رِئَاءٌ۔ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاءَ النَّاسِ
یعنی اپنا مال لوگوں کو دکھانے کی خاطر خرچ کرتا ہے۔
رَاٰی یَرٰی رَاْیًا وَرُؤْیَةً۔ وَرَائَةً و
رِئَاءً آنکھ سے دیکھنا۔ امر رَ آتا ہے۔
الرُّؤْیَا آنکھ یا دل کی نظر۔ الرِّیَه نظر
الرِّئَاءُ کسی کو دکھانا۔ رَاٰیَ یہ مہموز العین
اور ناقص ہے۔ اس کا عین کلمہ ہمزہ اور لام کلمہ
حرف یا ہے۔ کیونکہ اس سے اسم مشتق رُؤْیَة
آتا ہے۔ الرَّوِیَّة اور التَّرْوِیَةُ کے معنی کسی چیز
پر غور وفکر کر کے کسی ایک چیز کی طرف مائل ہونے
کے ہیں۔ اسی سے ہے مُرْتَئِیْ متفکر غور وفکر
کرنے والا۔ رَاٰی کا ہمزہ مضارع سے حذف
کر دیا جاتا ہے۔ صرف یَرٰی۔ تَرٰی۔ اَرٰی
اور نَرٰی بولتے ہیں۔ الرُّؤْیَةُ کے معنی ہیں
کسی موجود و محسوس اور مرئی چیز کا ادراک کرلینا۔
الرُّؤْیَةُ : اِدراكُ المرئی۔ والرَّوِیَّةُ
وَالتَّروِیَةُ : التفکّر فی الشئ والامالة
بین خواطر النفس فی تحصیل الرأي (راغب)
رَاٰی جب حرف اِلٰی کے ساتھ متعدی ہو
تو اس کے معنی اس طرح پر دیکھنے کے ہوتے ہیں کہ
دیکھنے والے کو عبرت حاصل ہو۔ کما قال :
اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔

صَفْوَانٍ۔ صَفْوَانٌ کے معنی چکنے پتھر
یا چکنی چٹان کے ہیں۔ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ
یہ تشبیہ محرومی اجر و ثواب کے لحاظ سے دی گئی
ہے۔ مَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ۔ اس کی مثال
ایک چکنے پتھر کی مثال ہے جس پر کسی طرح کی
شادابی نہ ہو۔ صَفْوَانٌ جمع ہے۔ اس
کی واحد صَفْوَانَةٌ ہے۔ نحوی اور لغوی امام
کسائی کا قول یہ ہے کہ صفوان واحد ہے
اس کی جمع صِفوانٌ (صاد) کے کسرہ کے
ساتھ آتی ہے۔ اسی طرح صُفِیٌّ اور صِفِیٌّ
بھی صفوانٌ کی جمع ہیں لیکن علم لغات کے مشہور
امام مبرد نے اس پر نکیر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں
کہ صُفِیٌّ صفا کی جمع ہے جیسا کہ قفا کی جمع
قُفِیٌّ آتی ہے۔ اس کو صَفْوان اور صَفَوان
یعنی فا کے سکون اور فتح دونوں طرح پڑھا گیا
ہے۔ الصَّفْوانُ هوا لحجر الاَملسُ ۔
والصَّفْوانُ جمعٌ۔ واحده صَفْوَانَة
قاله الاخفش (قرطبی)
صَفْوَان اصل میں صَفَاءٌ سے ماخوذ ہے
جس کے اصل معنی کسی چیز کا ہر طرح کی آمیزش
سے پاک وصاف ہونے کے ہیں۔ پھر اسی سے
صفا اُس پتھر کو کہنے لگے جو چکنا اور صاف ہو
صفوان اور صفا دونوں کے معنی صاف
ستھرے چکنے پتھر کے ہیں۔ صفا و مروہ دو

مخصوص پہاڑوں کے نام ہیں ۔ اصل الصَّفاء
خلوص الشئِ مِنَ الشَّوبِ (راغب) یعنی
کسی چیز کا ہر طرح کی آمیزش سے پاک وصاف
ہونا ۔ الصَّفِیُّ اور اَلصَّفِیَّۃُ ۔ مالِ غنیمت
میں سے اس چیز کو کہتے ہیں جس کو امیر اپنے لئے
خاص کرلے ۔

تُرَابٌ ۔ مٹی ۔ زمین ۔ تُراب کے معنی
اصل مٹی کے ہیں ۔ قرآن پاک میں یہ لفظ مٹی
کے معنوں میں متعدد بار استعمال ہوا ہے ۔
خَلَقَکُمْ مِنْ تُرَابٍ ۔ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ
تُرَابًا ۔ اس سے تَرِبَ کے معنی فقیر ہونے
کے بھی آئے ہیں ۔ چونکہ فقر و فاقہ انسان کو مٹی
میں ملا دیتا ہے ۔ جیسا کہ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا
مَتْرَبَۃٍ ۔ ایسا مسکین جس کو مسکنت نے
مٹی بنا دیا ہو ۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ خود زمین پر بھی
لفظ تراب بولا جاتا ہے ۔ اس کی جمع تِتْرَابٌ
تیارِبٌ ۔ تَوارِبٌ اور تَوْرَبٌ وغیرہ دس
وزنوں پر آتی ہے ۔

وَابِلٌ ۔ موسلا دھار بارش کو کہتے
ہیں ۔ اَلْوَابِلُ : المطر الشدید (قرطبی)
وَبَلَ یَبِلُ وَبْلاً ۔ وَبَلَ بالعصا :
لاٹھی سے لگاتار مارنا ۔ وَبُلَ یَوْبُلُ (ک)
وَبَالاً و وَبَلاً سخت ہونا ۔ وَبُلَ المکان
کسی جگہ کا مضرِ صحت ہونا ۔ وَابَلَ مُوَابَلَۃً
مواظبت کرنا ۔ ہمیشگی کرنا ۔ وَبْلٌ وَابِلٌ
بڑے قطروں والی بارش ۔ وَبَلَتِ السَّمَاء
تَبِلُ وَبْلاً ۔ یہ ضَرَبَ سے آتا ہے ۔ بارش
برسنا ۔ یحیٰ ابن یعمر کی حدیث میں ہے اِیَّمَامَالٍ
اَدَّیْتَ زَکَاتَہٗ فَقَدْ ذَھَبَتْ اَبَلَتُہٗ ۔ یہاں
اَبَلَتُہٗ بمعنی وَبَلَتُہٗ ہے حرف واو کو الف
سے تبدیل کیا گیا ہے ۔ مطلب یہ کہ جس مال کی
زکات آپ نے نکالی اُس سے مصیبت ٹل گئی ۔
وَبَلَتِ السَّمَاءُ آسمان کا بہت بارش برسانا
ضَرْبٌ وَبِیْلٌ وعَذَابٌ وبیل ۔ سخت مار
اور سخت عذاب ۔ اسی سے ہے اَخَذْنٰہُ
اَخْذًا وَّبِیْلاً ہم نے ان کو بڑی شدت سے
پکڑا ۔ اَخْذٌ وَّبِیْلٌ عبرتناک اور مضبوط گرفت
الوَبْلُ والوَابِلُ : المَطر الثقیل
القِطار (راغب) پھر اسی ثقل و شدت
کے معنی کے لحاظ سے ہر اُس چیز کو وبال کہا
جاتا ہے جس میں ضرر اور نقصان ہو ۔ اسی سے
ہے وَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِھِمْ ۔ انہوں نے
اپنے کیے کی سزا پائی ۔

صَلْدًا ۔ صَلْدٌ کے معنی سخت اور چکنی
چیز کے ہیں ۔ اَرْضٌ صَلْدٌ یا مَکَانٌ صَلْدٌ

اُس زمین کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز اُگتی نہ ہو۔ رأسٌ صَلْدٌ وہ سر جس پر بال نہ ہوں۔

الصَّلْدُ : الاملس من الحجارۃ۔

صَلِدَ یَصْلَدُ صَلَدًا فھو صَلْدٌ (لام ساکن) وھو کل ما لا ینبت شیئا۔

الأصْلَدُ : الاجرد بلغۃ ھُذیل (قرطبی)

لَا یَقْدِرُوْنَ ۔ یَقْدِرُوْنَ میں جمع کی ضمیر کا مرجع ریا کار کافر اور احسان جتلانے والوں کی طرف ہے۔ وہ قدرت نہیں رکھتے۔ قُدْرَۃٌ مصدر۔

قَدْرٌ : اندازہ۔ پیمانہ۔ قَدَرْتُ الشیئَ : میں نے اس چیز کو ماپا۔ اندازہ کیا۔ قَدَرْتُ الشیئَ بالشیئِ : ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ رکھ کر ماپا اور اندازہ کیا کہ یہ اس کے برابر ہے یا نہیں۔

تَثْبِیْتًا ۔ ثَبَتَ یَثْبُتُ ثَبَاتًا ۔ یہ زوال کی ضد ہے۔ کسی چیز کا ایک جگہ جمے رہنا، قائم رہنا

رَجُلٌ ثَبْتٌ وثَبِیْتٌ فی الحرب۔ لڑائی میں ثابت قدم رہنے والا۔ اسی سے ہے اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا ۔

الاِثْبَاتُ وَالتَّثْبِیْتُ باب افعال وتفعیل کسی چیز کو ثابت کرنا۔ موجود کرنا۔ چاہے موجود کرنا فی الواقع ہو یا عقلی اور علمی اعتبار سے ہو۔ کہا جاتا ہے فلانٌ ثابت عندی۔ وہ میرے پاس یا میرے نزدیک عقلی دلیل سے ثابت ہے و نبوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثابتۃ۔ یعنی دلائل صحیحہ کی رو سے۔

افعال سے اَثْبَتَ اللہ کذا۔ اللہ نے فلاں چیز کو پیدا اور موجود کر دیا اور ثبوت حکمی کے معنوں میں آتا ہے جیسا کہ اثبت الحاکمُ علی کذا۔ قاضی نے فلاں پر یہ حکم لگایا۔

تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ ۔ تثبیت کے معنی مضبوط کرنے جمانے اور مستحکم کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مال خدا کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اس مقصد سے بھی خرچ کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کریں کہ وہ دین کے احکام کی تعمیل اچھی طرح کر سکیں۔ حرفِ مِنْ مفعول پر داخل ہے یعنی انفس : تثبیتًا کا مفعول ہے۔ حاصل یہ ہے کہ وہ اپنا مال خدا کی راہ میں صرف اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ ان کو کمال ایمان اور ثابت قدمی اور اطمینان حاصل ہو جائے۔

رَبْوَۃٌ ۔ رَبْوَۃٌ کے معنی بلند اور مرتفع زمین کے ہیں۔ استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتفع ہونے کے ساتھ مسطح اور ہموار ہونا بھی اس کی خصوصیات میں ہے۔ قرآن پاک میں اس لفظ کو دوسری جگہ یوں استعمال کیا ہے اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ ذات قرار سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتفع ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو ہموار ہونا بھی ضروری ہے۔

چنانچہ امام قرطبی فرماتے ہیں :
الرَّبوۃ بفتح الراء وکسرھا المکان المرتفع ارتفاعًا یسیرًا۔
ربوہ کو رابیۃ بھی کہتے ہیں۔ گویا وہ بلندی پر ہے۔ رباء بھی اسی سے ہے جس کے معنی بڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ۔ جب ہم نے اس پر پانی برسایا تو وہ لہلہانے اور ابھرنے لگی۔
زَبَدًا رَّابِیًا : نالوں اور ندیوں کے پانی پر جھاگ ابھر آنا۔ اَرْبٰی کے معنی ہیں بلند ہونا۔
اَرْبٰی عَلَیْہِ۔ کسی پر بلند ہونا۔
اسی شدت اور سختی کے معنوں میں بولا گیا ہے
فَاَخَذَھُمْ اَخْذَۃً رَّابِیَۃً۔ خدا نے ان کو سخت گرفت میں لیا۔
رَبَّیْتُ الْوَلَدَ فَرَبَا۔ میں نے بچے کی تربیت کی اور وہ بڑھ گیا۔
الرِّبَاء : سود کو بھی ربا اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ آسانی سے بڑھتا ہے۔ سود خور کو گھر بیٹھے بٹھائے دُگنی تگنی رقم ملتی رہتی ہے۔
یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰو وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ اللہ سود کو مٹاتا ہے (بے برکت کرتا ہے) اور خیرات کو بڑھاتا ہے، برکت دیتا ہے۔
الرِّبٰو - الزیادۃ علی رأس المال (بیان)

الرباء فی اللغۃ الزیادۃ مطلقًا (قرطبی)
والرباء الذی علیہ عرف الشرع شیئان تحریم النَّساء والتفاضل فی العقود وفی المطعومات۔ (قرطبی)
کسب حرام پر بھی ربا کا اطلاق کیا گیا ہے یہودیوں کے بارے میں ارشاد ہے :
وَاَخْذِھِمُ الرِّبٰو وَقَدْ نُھُوْا عَنْہُ (قرطبی)
اکثر محقق علماء نے یہاں بھی رباء سے سود ہی بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس آیت سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ سود یہودیوں پر حرام تھا۔
(واللہ اعلم)

طَلٌّ - طل کے معنی بہت ہلکی اور بہت تھوڑی تھوڑی بارش کے ہیں۔ جس کو بوندا باندی بھی کہتے ہیں۔ اسی سے اوس اور شبنم کو بھی طل کہتے ہیں۔ طَلَّ الارض فھی مطلولۃ: زمین پر اوس پڑی۔ طُلَّ دَمُ فُلَانٍ یعنی فلاں کا خون باطل کر دیا گیا۔ اس کے قصاص کی پرواہ نہیں کی گئی۔
الطلّ: المطر الضعیف المُسْتَدِقّ من القطر الخفیف (قرطبی) وفی الصحاح الطل اضعف المطر والجمع الطِّلال (ایضًا)
فَطَلٌّ : فمطرٌ ضعیف القطر (کشاف)
مطرٌ خفیف۔ (جلالین)

طَلٌّ جمع طِلَال و طَلِل ۔ طَلَلٌ ۔ اونچی جگہ
ویران کھنڈرات اس کی جمع اطلال وطُلُولٌ
آتی ہے۔ طلیل پرانی چٹائی جمع طِلَّۃ واَطِلَّۃ
وطُلُل ۔

نَخِيل ۔ نخیل اور نخل کھجور کے درخت
یہ واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے
اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِیَۃ کھجوروں کے کھوکھلے
تنے ۔ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ ۔ وہ کھجوریں
جن کے خوشے نرم ونازک اور لطیف ہوتے
ہیں وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِيۡدٌ ۔
اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابہ تہہ بہ تہہ ہوتا ہے
النَّخِیل : یہ نخل کی جمع ہے۔ وَمِنۡ ثَمَرٰتِ
النَّخِيۡلِ میں بطور جمع ہے ۔ اہل لغت نے
نَخِیلٌ کی واحد نَخِیۡلَۃٌ اور نَخۡلٌ کی واحد
نَخۡلَۃٌ بھی بیان کی ہے

اَعۡنَاب ۔ اس کی واحد عِنَبَۃٌ ہے
عِنَبٌ انگور اور اس کی بیل دونوں کے لئے
بولا جاتا ہے ۔ عِنَبَۃ پھنسی کے معنی ہیں آتا
ہے جو شکل میں انگور کے دانوں کی طرح ہوتی ہے
عِنَبٌ جمع ہے ۔ جس کی واحد عِنَبَۃٌ ہے اور
جمع اَعۡنَابٌ اور جمع قلت عِنَبَاتٌ ۔

الۡكِبَرُ ۔ كِبَرٌ : بڑھاپا ۔ کِبَرٌ کِبَرٌ
اور مَکۡبَرٌ تینوں کے معنی معمر ہونے کے ہیں
کِبَرٌ کُبۡرٌ کَبَارۃ ۔ بڑا ہونا عظیم وجسیم ہونا ۔
تکبیر بڑائی بیان کرنا ۔ اَللہ اکبر کہنا ۔ کابِرٌ
بڑا شریف کِبۡرٌ ۔ شرف ۔ مُتَکَبِّرٌ ۔ خدا کی
صفت ہے ۔ کِبر اور کبیر ۔ صِغر اور صغیر
یہ باہم مقابل ہیں ۔ کبیر ۔ صغیر کا مقابل ہے
کبیر اور صغیر یہ اسمائے اضافیہ میں سے
ہیں جن کے معانی ایک دوسرے کے لحاظ سے
متعین کئے جاتے ہیں ۔ ایک ہی چیز دوسری چیز
کے مقابل میں چھوٹی اور ایک کے مقابل میں بڑی
بھی ہو سکتی ہے ۔ قلیل وکثیر کی طرح ان کا
استعمال کمیت متصلہ یعنی اجسام میں ہوتا ہے کبھی ۔ اور کبھی
کمیت منفصلہ یعنی عدد میں ہوتا ہے اور بعض اوقات
کبیر اور کثیر دو مختلف جہتوں کے لحاظ سے ایک ہی
چیز پر بولے جاتے ہیں ۔ چنانچہ فِيۡهِمَاۤ اِثۡمٌ
كَبِيۡرٌ میں ایک قرأت کثیر بھی ہے ۔ کما
اشار الیہ صاحب جلالین ۔ قال وفی
قراۃ بالمثلثۃ ۔ امام راغب فرماتے ہیں :
واصل ذٰلك ان يستعمل فی الاعيان لثم
استعير للمعانی کہ ان میں اصل تو یہ ہے کہ اعیان
میں استعمال ہوں لیکن استعارۃً ان کو معانی پر بھی
بولتے ہیں جیسا کہ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا
كَبِيۡرَةً ۔ وَلَاۤ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكۡبَرَ
اسی طرح آیت کریمہ میں يَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَكۡبَرِ

الکبریاءُ - یہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ارض و سما میں بڑائی صرف اللہ کی ہے۔

الکبریاء ردائی (الحدیث)

اِعْصَارٌ - اعصار کے معنی ہیں گرد باد، گرد و غبار اور بگولے کے ہیں۔ تند و تیز آندھیاں جب چلتی ہیں تو ایک گول اور نہایت تیزی کے ساتھ گھومتا ہوا بگولا عمود کی شکل کا آسمان کی طرف اٹھتا ہے اور گرد و غبار اڑاتا ہوا تیزی سے گزر جاتا ہے۔ اس کی اس کی تیزی اور شدت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کی زد میں آجائے وہ جھلس جاتی ہے۔ فِيهِ نَارٌ اس کی تیز گرمی اور شدت کا غماز ہے۔ اس سے وہ محسوس آگ مراد نہیں ہے جو ہمارے ہاں معروف ہے

الاعصار : الریح التی تستدیر فی الارض ثم تسطع نحو السماء کالعمود (کشاف) والاعصار ریح تثیر الغبار (مفردات القرآن)

الاعصار فی اللغۃ : الریح الشدیدۃ التی تھبُّ من الارض الی السّماءِ کالعمود (قرطبی)

وھو الریح الشدید (ابن کثیر)

ریح شدیدۃ (جلالین)

الاعصار الریح الشدیدۃ المرتفعۃ (جمل)

دن اور رات دونوں کو عصران کہتے ہیں۔ اعصار کا اصل مادہ عَصْر ہے۔ یہ عَصَرْتُ الشیئ کا مصدر ہے۔ کسی کو نچوڑنا۔ معصور اس چیز کو کہتے ہیں جس کو نچوڑا گیا ہو۔ جو نچڑ کر حاصل ہوا اس کو عُصَارَۃ کہتے ہیں شیرہ۔ شربت۔ رس وغیرہ اور عِصَارٌ سخت گرد و غبار اس کا ظرف مَعْصَرٌ آتا ہے نچوڑنے کی جگہ۔ مِعصَر اور مِعصَرۃ انگور وغیرہ نچوڑنے کا آلہ۔ فاعل عَاصِرٌ ہے۔ جمع عَصَرَۃ اور عَاصِرُون۔ عَاصِرَۃ کی جمع عَوَاصِر و عَاصِرَات۔ مُعَاصِرَۃ : ہم وقت ہونا۔ ایکدوسرے کا زمانہ پانا۔ العصر رات اور دن۔ دن کا آخری حصہ۔ نماز عصر۔ اعصار کی جمع اعاصر و اعاصیر آتی ہے اِنِّیْ اَعْصِرُ خَمْرًا میں نے خواب میں اپنے آپ کو شراب نچوڑتے دیکھا۔ (یوسف) وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً یہاں معصرات سے مراد بادل ہیں جو پانی نچوڑتے اور گراتے ہیں۔ اعتصار کے معنی کسی چیز کو دبا کر اس سے رس نچوڑنے کے ہیں۔ العَصْر اور العُصُر۔ وقت۔ زمانہ۔ نماز عصر۔ جمع عُصُور (لسان العرب)

مُعْصِر : وہ عورت جو جوانی کو پہنچ جائے زمانہ حیض میں داخل ہو جائے۔ اہل عرب زمانہ شباب کو اعتصار کہتے ہیں۔ امام راغب نے ابن احمر کا ایک شعر نقل کیا ہے

و انما العیش بربّانه
و انتَ من امنانه مُعْتَصِرٌ

زندگی کا لطف تو اٹھتی جوانی کے ساتھ ہے جبکہ تم اس کی شاخوں سے نچوڑتے ہو

فَاحْتَرَقَتْ - احتراق کے معنی جل جانا فاحترقت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ احراق کسی چیز کو جلانا۔ الحریق آگ کو کہتے ہیں ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ عذاب آتش کے مزے لو (اعاذنا اللہ) قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ کہنے لگے اس (ابراہیمؑ) کو جلادو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ہم اس کو جلادیں گے مَاءٌ حُرَاقٌ کھاری پانی۔
احتراق کا اصل مادہ حرق یحرق (ن) سے بمعنی آگ سے جلانا۔ حَرَقَ بِالْمِبْرَدِ۔ کسی چیز کو ریتی سے رگڑنا۔ محرق ریتی۔ مصدر حُرْقٌ بمعنی جلن۔

تُغْمِضُوْا - اغماض سے ہے بمعنی چشم پوشی کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ تم خراب چیز کو خود لینے کو تیار نہیں ہو گے اِلَّا یہ کہ مجبوری کی بنا پر یا کسی مصلحت کی وجہ سے چشم پوشی کر جائے۔
الغامض : بہت نشیبی زمین۔
اغمض النظر : اس نے باریک بینی اور تعمق نظر سے کام لیا۔ الغمض : نیند کا جھونکا۔ اتنی نیند کہ آنکھ بند ہو جائے۔ (ابن فارس۔ راغب)
اغماض کی اصل غَمْضٌ ہے۔ غَمْضٌ غِمَاضٌ۔ غُمَاضٌ نیند کا جھونکا۔ اونگھ کہتے ہیں۔
ما اکتحلتَ عَيْنِي غَمضًا و غماضًا۔ میری آنکھ نہیں لگی۔ ما ذُقتُ غمضًا ولا غماضًا چشم من یکدم نخفتہ۔ میں نے ایک پل بھی نیند نہیں کی۔ غَمَضَ عَيْنَهٗ و اَغْمَضَهَا کے معنی ہیں آنکھ کو بند کر لینا۔ پھر اس سے تسامح اور تغافل پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اغمض الرجل فی اَمْرٍ کذا۔ آدمی نے اپنے معاملہ میں تساھل سے کام لیا اور اپنا بعض حق چھوڑنے پر راضی ہو گیا۔ تُغْمِضُوْا فِيْهِ غالباً یہ ہے کہ یہ تغمیض العین سے ماخوذ ہے۔

يَعِدُ : وَعَدَ يَعِدُ وَعْدًا و مَوْعِدًا مِيعَادًا۔ الوَعْدُ کا لفظ خیر و شر دونوں طرح کے وعدوں پر بولا جاتا ہے۔ البتہ لفظ وعید

کا عام استعمال بلکہ خاص شر اور عذاب
کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُم
وَعْدَ الْحَقِّ۔ جو وعدہ تم سے خدا نے کیا تھا وہ
سچا تھا۔ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَنْ
یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ۔ یہاں وعد بمعنی وعید
لیا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں اَلشَّیْطَانُ
یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ میں وعدہ خوف تنگدستی
کے معنی میں ہے۔ اور وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ
الْمَغْفِرَۃَ میں وعدہ خیر ہے۔

المَوْعِدُ اور المِیْعَاد: دونوں لفظ کبھی
مصدر اور کبھی اسم ظرف ہونے کی صورت
میں ان سے مراد وعدہ کا زمانہ یا مقام وعدہ
ہوتا ہے فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَکَ مَوْعِدًا
ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر
کرلو۔ مَوْعِدُکُمْ یَوْمُ الزِّیْنَۃِ تمہارے لئے
یوم زینت (عید کا دن) کا وعدہ ہے۔

عِدَۃٌ: یہ وَعْدٌ سے اسم ہے۔ اس کی
جمع عِدَات آتی ہے لیکن خود مصدر وَعْدٌ
کی جمع نہیں۔ وَعَدْتُ متعدی ہوتا ہے
جو دو مفعولوں کو چاہتا ہے۔ وَاِذْ وٰعَدْنَا
مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً میں ایک مفعول
مُوْسٰی اور دوسرا مفعول اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً ہے

اَلْفَحْشَآء۔ اَلْفَحْشَآءُ کا اطلاق
ہر شدید برائی اور ہر بری صفت پر ہوتا ہے۔
قرآن پاک میں اس سے زنا۔ لواطت اور عریانی
جیسے کھلے جرائم کو تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں یَاْمُرُکُمْ
بِالْفَحْشَآءِ میں فحش سے مراد عام مفسرین کے
نزدیک بخل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان انسان
کو ادائے زکوٰۃ اور صدقات سے فقر کا خوف
دلا کر روکتا ہے۔ یَغْرِیْکُمْ عَلَی الْبُخْلِ وَمَنْعِ
الصدقات (کشاف) وھی المعاصی والانفاق فیھا (قرطبی)

تُبْدُوْا۔ یہ اِبْدَاءٌ سے ہے جس کے معنی ہیں ظاہر کرنا،
کھولنا، واضح کرنا۔ اس کی اصل بَدْوٌ ہے۔ بَدَا یَبْدُوْ
بُدُوًّا وَبَدَاءً نمایاں طور پر ظاہر ہونا وَبَدَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ
مَا لَمْ یَکُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ۔ اور ان پر خدا کی طرف
سے وہ امر ظاہر ہوا جس کا انہیں خیال بھی نہ تھا۔
وَبَدَا لَھُمْ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوْا۔ وَبَدَتْ
لَھُمَا سَوْاٰتُھُمَا۔ اُن کے ستر ظاہر ہو گئے۔

اَلْبَدْوُ: یہ حَضَرٌ کی ضد ہے۔ گاؤں۔
جَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ تم کو گاؤں سے یہاں
لایا۔ بَدْوٌ: بَادِیَۃ کے معنوں میں بھی آتا ہے
بادیہ۔ صحراء اور ہر وہ مقام جہاں کوئی
عمارت وغیرہ اور انسانی بستی نہ ہو۔ صحراء کو
بادیہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں ہر چیز ظاہر اور
کھلی نظر آتی ہے۔ اسم فاعل بَادٍ آتا ہے۔
سَوَآءَنِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ۔ البادسے

مراد گاؤں سے آنے والے ہیں۔ اس کی جمع بَادُون آتی ہے۔ جیساکہ لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ۔

الْبَدْوُ خانہ بدوش عرب قبائل۔

التَّعَفُّف ۔ یہ تفعّل سے مبالغہ کا وزن ہے۔ کسی غیر مناسب حال سے پوری طرح بچنا۔ عَفَّ سے ماخوذ ہے۔ کہتے ہیں عَفَّ عَنِ الشيء یعنی رُک گیا

التَّعَفُّفُ : تَفَعُّلٌ وھو بناء مبالغۃ من عَفَّ عن الشيء اذا اَمسَكَ عَنهُ وَتَنَزَّهَ عَنْ طَلَبِهٖ (قرطبی)

عِفَّةٌ : نفس میں ایسی حالت کا پیدا ہوجانا جس کے ذریعے سے انسان غلط راہ روی سے بچ جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی تھوڑی چیز پر قناعت اور صبر کرنے کے ہیں۔ جو بمنزلہ عفافہ کے ہو یعنی بچی کھچی چیز جس سے گذارہ ہوجائے۔

اَلْعِفَّةُ : حصول حَالَةٍ للنفسِ تَمْتَنِعُ بِهَا عَنْ غَلَبَةِ الشَّهْوَةِ (راغب)

الْاِستِعفَافُ : طَلَبُ العِفَّةِ ۔ (راغب)

عَفَّ يَعِفُّ عَفًّا وعِفَّةً ۔ عَفَافًا وعِفَافَةً حرام یا غیر مُستحسن چیزوں سے بچنا۔ عفیف صفت ہے۔ جمع اَعِفَّة ۔ اَعِفَّاءُ ۔ وعِفُّون آتی ہے۔ مؤنث صفت عفیفۃ ہے جمع عَفِيفَاتٌ وعَفَائِفُ

سِيمَا یہ اسم مقصور ہے بمعنی علامت نشانی۔ اسے ممدودہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ یعنی سِيمَاءٌ۔ ایک لغت اس میں سِيمِيَاءٌ بھی ہے علامت اور ہیئت کے معنی میں آتا ہے۔ اس کا اصل مادہ سَوْمٌ ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کی طلب میں جانا۔ سَامَتِ الإبِلُ : اونٹ چراگاہ میں چرنے کے لئے چلے گئے۔ یعنی گھاس کی طلب میں۔ سُمْتُ الإبلَ فِي المَرْعٰی۔ میں نے اونٹ چراگاہ میں بھیجدیئے۔ اسی معنی میں باب افعال سے آتا ہے۔ کہتے ہیں۔ اَسَمْتُ الْاِبِلَ اور تفعیل سے کہتے ہیں سَوَّمْتُهَا۔ قرآن پاک میں ہے و مِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُوْنَ۔ اس سے درخت بھی شاداب ہوتے ہیں جن میں تم اپنے چوپاؤں کو چراتے ہو۔

تَسَوَّمَ : نشان لگانا۔ علامت قائم کرنا۔ سَامٌ موت کو کہتے ہیں۔ مُسَوَّمٌ : نشان زدہ خوبصورت۔ وَالْخَيلِ الْمُسَوَّمَةِ : نشان زدہ خوبصورت گھوڑے۔

السیما : العلامۃ (قرطبی)

اَلسِّيمَا وَالسِّيمِيَاءُ العلامۃ (راغب)

یہ علامت کس طرح کی تھی اور کون سی تھی جس سے

دیکھ کر یہ پہچانا جا سکتا تھا کہ یہ مستحق ہیں۔
اس میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ مِن صُفرۃ الوَجہ ورثاثۃ الحالِ چہرے کی زردی اور خستہ حالی۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

اِلْحَافًا ۔ اِلحَافٌ کے معنی اِلحاحٌ کے ہیں۔ لپٹ کر مانگنا اور سوال کرنا۔ لحاف کے معنی ہیں اوڑھنے کا کپڑا۔ مطلب یہ ہوگا کہ لَا یَسْئَلُونَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔ لوگوں سے سوال کرنے کو یہ اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بناتے۔ یعنی عزتِ نفس کی وجہ سے بالکل سوال نہیں کرتے۔

سِرًّا ۔ یہ اِسْرَارٌ سے ہے کسی بات کو چھپانا۔ مخفی رکھنا۔ یہ اعلان کی ضد ہے سِرٌّ : بھید، راز۔ چھپی ہوئی بات۔ دل کی مخفی بات۔ یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی : چھپے بھید اور نہایت مخفی راز بھی جانتے ہیں۔
یَعلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۔ خدا تمہاری پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے اور ظاہری کو بھی سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً پوشیدہ رکھ کر اور آشکارا کر کے

یَتَخَبَّطُ ۔ یہ خَبَطَ یَخْبِطُ خَبْطًا سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں اندھا دھند مارنا۔ جیسے کہ درخت سے پتے جھاڑتے وقت آدمی مارتا ہے۔ خَبطٌ ان پتوں کو بھی کہتے ہیں جو جھاڑے جاتے ہیں۔ خبوط : ظالم بادشاہ۔ یہاں معنی ہیں شیطان کا دیوانہ بنا دینا یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۔ شیطان لپٹ کر اس کو مجنون بنا دیا ہو۔ الخُبَاط : پاگل پن۔ الخبیط : وہ حوض جس کو اونٹوں نے پاؤں مار مار کر توڑ دیا ہو۔

الْبَیْعِ ۔ بَاعَ یَبِیْعُ بَیْعًا۔ خرید و فروخت۔ چیز دے کر قیمت وصول کرنا۔ بائع فاعل۔ صفت مفعولی مَبِیعٌ۔ البیع کے معنی خریدنے اور الشراء کے معنی بیچنے کے ہیں۔ لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔
اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ ۔ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے۔

سَلَفَ ۔ سَلَفَ یَسْلُفُ سَلْفاً۔ گذرنا، آگے بڑھنا، سبقت کرنا۔ سَلَفٌ : گذشتہ آباء و اجداد (جمع اسلاف) مَا سَلَفَ : جو گذر گیا، جو ہو چکا۔

یَمْحَقُ ۔ مَحَقَ یَمْحَقُ مَحقًا۔ باطل کرنا بے برکت کرنا۔ والمَحقُ : النقص والذھاب ومنہ محاق القمر وھو انتقاصہ (قرطبی)
محق اللّٰهُ الشیَ : گھٹانا۔ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰو : خدا سود کو مٹاتا ہے ۔ بے برکت کرنا۔ اس کی

برکت کو لے جاتا ہے۔ یَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ کافروں کو نابود کرتا ہے۔ مِحَاقٌ قمری مہینہ کی آخری راتوں کو کہتے ہیں کہ چاند گھٹ جاتا ہے

ذَرُوْا - وَذَرَ یَذِرُ سے امر جمع مذکر کا صیغہ ہے وَذَرٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو کم درجہ کی سمجھ کر چھوڑ دینا ذَرُوْا مَا بَقِیَ جو بچ گیا ہے اس کو حرام ہونے کی وجہ سے چھوڑ دو۔
وَذَرَ کی ماضی کا استعمال بہت کم بلکہ کالعدم ہے قرآن میں مضارع کا استعمال تو ہے ماضی کا نہیں ہوا۔

حَرْبٌ - جنگ۔ لڑائی۔ جنگ کا راز۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ حرب کہتے ہیں جنگ میں کسی کا سامان چھیننا۔
اَلْحَرْبُ : اَلسَّلْبُ فِی الْحَرْبِ (راغب)
حَرَبَ یَحْرُبُ حَرْبًا۔ حَرِبَ الرَّجُلُ : جنگ میں مال چھیننا۔ حَرِیْبٌ : لٹا ہوا۔
اَلتَّحْرِیْبُ : لڑائی بھڑکانا۔ مِحْرَبٌ : جنگجو۔ گویا وہ جنگ بھڑکانے کا آلہ ہے۔ اَلْحَرْبَۃُ : برچھا۔ مسجد کے محراب کو بھی اسی لئے محراب کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان سے جنگ کرنے کی جگہ ہے

تَدَایَنْتُمْ - اَلتَّدَایُنُ اور اَلْمُدَایَنَۃُ کے معنی ہیں آپس میں قرض اور ادھار کا لین دین کرنا۔ دَانَ یَدِیْنُ دَیْنًا قرض دینا۔ صفت فاعلی دَائِنٌ۔ مفعول مَدْیُوْنٌ۔ دِنْتُہٗ : میں نے اس کو قرض دیا اس کے معنی قرض لینے کے بھی آتے ہیں۔ اسی طرح اَدَنْتُ کے معنی قرض لینا بھی آتے ہیں اور قرض دینا بھی۔ اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی جب تم کسی مدتِ معیّنہ تک کے لئے قرض کا معاملہ کرو تو اس کو دیکھ لو۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ یُّوْصِیْ بِھَآ اَوْ دَیْنٍ۔ تقسیم وراثت ادائے قرض اور وصیت کے بعد ہوگی۔ دَیْنٌ۔ قرض

اَلدِّیْنُ - اَلدِّیْنُ کے معنی اطاعت اور جزاء کے آتے ہیں اور بطور استعارہ دین بمعنی شریعت بھی آتا ہے۔ دین ملّت کی طرح ہے۔ لیکن شریعت کی فرمانبرداری اور اطاعت کے لحاظ سے اسے دین کہا جاتا ہے۔ فرمایا : اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ دین خدا کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اَلدِّیْن ایک جامع لفظ ہے۔ جو یوم آخرت۔ اسلام۔ قانون، اسلام۔ قدرت۔ مذہب۔ پرہیزگاری وغیرہ سب پر بولا جاتا ہے۔ دِنَّاھُمْ کَمَا دَانُوْا (حماسہ) ہم نے اُن کے ساتھ ایسا ہی کیا جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ کیا

یُمْلِلْ - اِمْلَالٌ اور اِمْلَاءٌ دونوں لغات ہیں۔ اَمَلَّ اِمْلَالًا و املی املاءً

اہل حجاز اور بنی اسد وغیرہ کی لغت میں اَمَلَّ زیادہ مستعمل ہے۔ کہتے ہیں اَمْلَیْتُ کی اصل اَمْلَلْتُ ہے۔ دوسرے لام کو تخفیفِ کلام کی خاطر یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ قرآن پاک نے دونوں لغات استعمال کی ہیں فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا یہ املاء سے ہے، جس کے معنی ہیں تحریر کرانا۔ یا لکھوانا۔ وَلْيُمْلِلْ اِملال سے ہے، اس کے معنی بھی املاء ہی کے ہیں۔ اِمْلَاءٌ کے اصل معنی تو ڈھیل دینے کے ہیں۔ تحریر کرانے کو بھی املاء اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں لکھنے والے کو مہلت اور ڈھیل دی جاتی ہے کہ وہ لکھ لے۔

الاملاء والاملال لغتان (کشاف۔ قرطبی)

يَبْخَسْ۔ بَخَسَ يَبْخَسُ بَخْسًا۔ کسی کو کم دینا کسی چیز کو ظلمًا کم کرنا۔ کہتے ہیں کہ لَاتَبْخَسْ اخاك حقّه اپنے بھائی کا حق نہ گھٹاؤ۔

البخسُ: ناقص۔ وَلَاتَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ۔ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ۔ اَلْبَخْسُ۔ النقص (قرطبی)

رِهَان - یہ رَهن کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ شے ہے جو قرض دینے والے کے قرض کی ضمانت کے طور پر اس کے قبضہ میں کرادی جاتی ہے۔ معنی الرهن احتباس العين وثيقة بالحق ليستوفى الحق من ثمنها۔ (قرطبی)

رَهَنَ يَرْهَنُ رَهْنًا گروی رکھنا۔ دائم ثابت رہنا۔ رِهْنٌ اور رِهَانٌ دونوں مصدر ہیں۔ رهان، رهن کی جمع ہے اور احتمال ہے کہ مصدر ہو۔ رهينة گروی رکھی ہوئی چیز۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (المدثر۔ ۳۸)

رهينةٌ کی جمع رهائنُ۔ لفظ رھن کی پوری تفصیل قرطبی جلد ۳ میں ملاحظہ ہو۔

اِصْرًا۔ اَصْرٌ اور اُصْرٌ عہد و پیمان۔ بوجھ گناہ۔ جمع اَصَارٌ آتی ہے۔ ایسا بوجھ جو قوتِ برداشت میں نہ ہو۔ اَصَرَ يَاصِرُ کے معنی ہیں توڑنا اَصْرًا جو انسان کی کمر توڑ دے۔ اِصْرٌ۔ پختہ وعدہ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ - یہاں بوجھ اور سخت احکام مراد ہیں۔

اِصْرًا ای ثقلًا : الاِصْرُ الامر الغليظ الصعب۔ اَلْاَصْرُ شدّة الامر (قرطبی)

اِصْرٌ : بھاری بوجھ۔ ایسا بوجھ جو چلنے والے کو روک دے

سُورۃ آلِ عمران

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَزَّلَ ۔ تنزیل سے ہے کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارنا۔ اس کا اصل مادہ نزول سے ہے نَزَلَ یَنۡزِلُ (ض) اوپر سے نیچے کی طرف اُترنا محاورۃً کہتے ہیں نَزَلَ عَنۡ دَابَّتِہٖ وہ سواری سے اُتر آیا۔ اور جب نَزَلَ کا صلہ با ہو تو معنی ٹھہرنے کے دیتا ہے جیسا کہ نَزَلَ فی مکان کَذَا کسی مکان میں ٹھہرنا۔ نزل بمکانِ کذا۔ دونوں کا معنی ایک ہے۔

اِنزال ۔ یہ باب افعال سے ہے۔ انزال کے معنی ہیں اُتارنا۔ اَنۡزِلۡنِیۡ مُنۡزَلًا مُّبٰرَکًا وَّاَنۡتَ خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ۔ (المومنون۔ آیت ۲۹) نَزَلَ بکذا اور اَنۡزَلَہٗ دونوں ہم معنی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر عذاب یا نعمتوں کے نازل کرنے سے ان کا وقوع یا عطا کرنا مراد ہوتا ہے اور یہ یا تو بعینہٖ اسی چیز کے نازل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک کا نازل کرنا۔ یہ ان چیزوں کا اسباب پیدا کر کے ان کی طرف ہدایت کر دینے کا ذریعہ ہوتا ہے، جیسا کہ لوہا اور لباس وغیرہ۔ چنانچہ انعامات کے بارے میں ارشاد ہے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ (سورۃ الکہف آیت ۱۸) اَللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ ۔ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ ۔

عذاب کے متعلق اِنزال کا لفظ قرآن پاک نے استعمال کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَہۡلِ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ

قرآن پاک اور فرشتوں کے نازل ہونے کے متعلق قرآن میں دو طرح کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک اِنزال اِفعال سے اور دوسرا تنزیل، تفعیل سے۔ ان دونوں میں معنوی فرق جو علماء لغت نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ تنزیل کے معنی ایک چیز کو مرۃً بعد اُخریٰ الگ الگ اجزاء میں متفرق کر کے اُتارا جائے۔ اور انزال کا لفظ عام ہے یعنی اس کے معنی میں کسی چیز کو یک مُشت ایک بار اُتار دینے

کے بھی ہیں۔ اور متفرق طور بھی۔ قرآن پاک کے بارہ
میں عام طور پر لفظ تنزیل بھی استعمال ہوا ہے۔
نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (الشعراء۔ آیت)
اس میں ایک قرأت نُزِّلَ بِهِ الرُّوحُ الامین
کی بھی ہے۔
نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيلًا (بنی اسرائیل آیت ۱۰)
ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اُتارا۔ نَحْنُ نَزَّلْنَا
الذِّكْرَ۔ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ هٰذَا الْقُرْاٰنُ
کہ اس پر قرآن ایک ایک حکم کر کے کیوں اُتارا گیا۔
یعنی ایک ہی بار کیوں نہ اُتارا گیا۔ اور ایک آیت
کریمہ لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ
مُّحْكَمَةٌ۔ احکامِ جہاد کے بارہ میں ہے۔ اس میں
پہلی بار نُزِّلَ اور دوسری بار اُنْزِلَ کا لفظ
استعمال ہوا ہے۔ اس میں ایک لطیف اشارہ
اس طرف کرنا ہے کہ منافقین کا مطالبہ تو یہ تھا
کہ جہاد کے احکام یکے بعد دیگرے اتریں تاکہ
وہ اُنھیں سرانجام دے سکیں لیکن جہاد کا حکم
جب ایک دفعہ اُتار دیا گیا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے
اور فرار کے بہانے تلاش کرنے لگے۔ مطلب یہ
کہ انکا مطالبہ تو بہت سے احکام کا تھا مگر اطاعت
ایک کی بھی نہ کی۔
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ
(البقرہ آیت ۱۸۵)

میں بھی لفظ انزال سے مراد آسمانِ دنیا میں یکبارگی
نزول ہے۔ لِاَنَّ الْقُرْاٰنَ نَزَلَ مُنَجَّمًا و نزل
الکتاب ان جملۃً (کشاف) والقرآن نزل
نُجُوْمًا شَيْئًا بَعْدَ شَيْءٍ فَلِذٰلِكَ قَالَ نَزَّلَ و
تنزیل مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ (قرطبی)
والفرق بین الانزال والتَّنْزِيْل فی
وصف القرآن والملٰئکۃ ان التنزیل یختص
بالموضع الذی یُشِیْرُ الیہ انزالہ مفرقا و
مرّۃً بعد اُخرٰی والانزال عام (راغب)
لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ
(الحشر۔ ۵۹) میں اسی طرف اشارہ ہے۔ کہ اگر
قرآن پاک ایک ہی دفعہ میں پہاڑ پر اُتارا جاتا تو وہ بھی
دب جاتا۔
تَنَزَّلَ کا لفظ بھی نَزَلَ کی طرح صلہ باء
کے ساتھ مستعمل ہونا محاورۃ ہے۔
نَزَلَ الملك بكذا و تَنَزَّلَ بِهِ۔ فرشتہ
اس کو لیکر اترا۔ قرآن پاک میں ہے۔ نَزَلَ بِهِ
الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ
فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ۔ اور جو القاء اور کلام
شیطان کی طرف سے ہو تو وہاں صرف تَنَزَّلَ
استعمال ہوتا ہے۔ انزال اور تنزیل کا لفظ
ایسی کلام پر قرآن نے نہیں بولا۔ تَنَزَّلَتْ بِهِ
الشَّيٰطِيْنُ۔ ملخص از راغب

اَلتَّوْرَاۃُ : التوراۃ اور انجیل۔ بعض اہل لغت نے ان دونوں ناموں کو غیر عربی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ صاحبِ کشاف نے نقل کیا ہے لہٰذا ان کے نزدیک ان الفاظ کے عربی اشتقاق کی جستجو بے فائدہ ہے۔ لیکن مفسرین کے ایک بڑے گروہ نے توراۃ اور انجیل دونوں کو عربی قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان حضرات کے ہاں یہ دونوں نام مشتق ہیں۔ چنانچہ علامہ محمد بن احمد انصاری، صاحبِ تفسیر قرطبی فرماتے ہیں کہ التوراۃ معناھا الضیاء والنور النبہ اس کے اشتقاق میں اہلِ لغت کا کچھ اختلاف ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ وَرَی الزَّنْد سے مشتق ہے۔ وَرَی اور وَرِیَ دونوں ہم معنی ہیں۔ چقماق سے آگ نکالنا۔ وَرَی الزَّنْد و وری لغتان اذا اخرجت نارہ (قرطبی) اصل اس کی تَوْرِیَۃ ہے۔ تَفْعَلَۃٌ کے وزن پر۔ آخری تا زائد ہے۔ صرفی قاعدہ کے مطابق تعلیل ہو کر توراۃ بنا ہے۔ چونکہ تَوْرِیَۃ میں یا متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے تبدیل کیا گیا ہے۔ لہٰذا تورات بنا۔ اس میں ایک احتمال یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تَفْعِلَۃٌ یعنی عین کے کسرہ سے ہے اس صورت میں تعلیل یہ ہوگی کہ راء کے کسرہ کو فتحہ سے تبدیل کر دیا گیا جیسا جَارِیَۃٌ میں جاراۃ اور نَاصِیَۃ میں ناصاۃ کہہ دیتے ہیں۔ یہ دونوں قول فراء نحوی کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ علماء کوفہ نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ علماء نحاۃ میں سے مشہور نحوی اور لغوی عالم علامہ خلیل کا قول یہ ہے کہ توراۃ اصل میں وَوْرَیَۃ ہے اور اس کا وزن فَوْعَلَۃ ہے۔ اس میں تعلیل یہ ہوئی ہے کہ پہلی واؤ کو تاء سے تبدیل کیا گیا ہے۔ اور واؤ کے فتح کی وجہ سے یاء کو الف سے تبدیل کیا ہے۔ توراہ شد۔ کلام عرب میں واؤ کو تاء سے تبدیل کرنا عام ہے۔ جیسا کہ تَوْلَج یہ اصل میں وَوْلَج ہے۔ فَوْعَلٌ کے وزن پر۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ فَوْعَلَۃ کا وزن تَفْعَلَۃٌ سے زیادہ آتا ہے

ایک تیسرا قول یہ بھی ہے کہ توراۃ توریۃ سے ماخوذ ہے چونکہ توراۃ میں زیادہ تر کلام تلویحات کے انداز کا ہے (واللہ اعلم) اس سے اس کو توراۃ کہا گیا ہے۔ یعنی ایسی کتاب جس کا طرز کلام توریاً ہے۔ لیکن جمہور اہل تفسیر کی رائے میں توراۃ وَرَی الزَّنْد سے ماخوذ ہے۔ چونکہ قرآن پاک میں اس کی صفت ضیاء اور نور بیان ہوتی ہے۔ والجمھور علی القول الاول لقولہ تعالیٰ : وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ (قرطبی) توراۃ کی جمع توار آتی ہے۔

اِنْجِیْل : انجیل اس صحیفۂ آسمانی کو کہتے ہیں جو جناب مسیحؑ کو دیا گیا آج اُس کا وجود دُنیا سے ناپید ہے اگرچہ اپنے وقت میں ایک مبارک کتاب تھی مگر جو کچھ آج اناجیل کے نام سے نصاریٰ میں رائج ہے اس کو حقیقی انجیل سے کوئی واسطہ نہیں۔

تحقیق : انجیل، افعیل کے وزن پر ہے اس کا اشتقاق نجل سے ہے۔ جس کے لغوی معنی اصل شئ کے ہیں۔ توراۃ تو چونکہ ناپید ہو چکی تھی اور دین ومذہب بھی تاکِ نسیان میں پڑا ہوا تھا انجیل نے رہنمائی کی اور حقیقت حال کو واضح اور تورات کے گمشدہ علوم ومعارف کی عقدہ کشائی کی۔ اس لئے کتابِ مسیح کو انجیل کہا گیا چونکہ علوم وحکم کی اصل یہی کتاب تھی ولد اور والد کو نجل کہتے ہیں چونکہ یہ بھی ایک دوسرے کی اصل ہیں۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ انجیل نجلتُ الشئ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز کو نکالنے کے ہیں۔ انجیل سے چونکہ علوم و حکم نکالے گئے ہیں اس لیے اسے انجیل کہا گیا۔ اور پھر انجیل ہی ایک ایسی کتاب تھی جس نے اپنے وقت میں لاکھوں بندگانِ خدا کو باطل سے نکالا اور راہِ حق پر انھیں گامزن کیا۔

بعض اہل علم کا رجحان یہ بھی ہے کہ انجیل نجل العین سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں آنکھوں کا بڑا ہونا اور خوبصورت ہونا روایت میں ہے کہ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم انجل۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں کشادہ اور بڑی تھی۔ تو انجیل نے چونکہ اپنے نورِ غیبی کی وجہ اپنے ماننے والوں کو وسعت دی اس لیے اس کو انجیل کہا گیا۔ یعنی دینی پہلو میں تنگیاں تھیں انجیل نے ان میں تخفیف کی۔

ایک قول یہ ہے کہ انجیل تناجل سے مشتق ہے تناجل کے معنی تنازع اور جھگڑے کے آتے ہیں۔ انجیل کے بارے میں یہودیوں نے چونکہ جھگڑا کیا اور اس وقت کی کتاب کو نہ مانا اس لیے اس کو انجیل کہا گیا۔ یعنی وہ کتاب جس میں تنازع اور جھگڑا کیا گیا

(ملخصاً از قرطبی)

ایک قول یہ ہے کہ ہر لکھی ہوئی کتاب کو لغۃً انجیل کہتے ہیں چنانچہ قرآن کو انجیل کہا گیا ہے۔ حدیث میں ہے جناب موسیٰ علیہ السلام نے دورانِ مناجاۃ عرض کی کہ اے خدا یا میں نے ایک ایسی قوم کو الواحِ توراۃ میں لکھا دیکھا ہے۔ جن کی اناجیل اُن کے سینوں میں ہوں گی تو اُس قوم کو میری امت بنا دے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ امت محمدیہ ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں اَنَاجِیلُھُمْ فِی صُدُوْرِھِمْ یہاں اناجیل سے مراد اجزائے قرآن ہیں۔ امت کا ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جس کو قرآن پاک کا کوئی حصّہ اور سورت یاد نہ ہو۔

اَلْفُرْقَانُ : الفرق والفرقان - ایک اعتبار سے تو دونوں ہم معنی ہیں۔ چونکہ فرق کے معنی ہیں دو چیزوں میں امتیاز اور فصل پیدا کرنا۔ اور دو چیزوں کو آپس سے الگ الگ اور جدا جدا کر دینا چاہیے۔ یہ جدا شدہ چیزیں کیسی بھی ہوں۔ گویا فرق نام ہے مطلق امتیاز اور فصل محض کا۔ فرق کا ہم معنی دوسرا ایک لفظ الفلق ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کا پھٹ جانا۔ اس میں انفصال اور جدائی ضروری نہیں۔

فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى - دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا۔ یہاں ظاہر ہے کہ دانہ کے پھٹ کر دو ٹکڑوں میں جدا جدا ہونا ضروری نہیں۔ اسی طرح فَالِقُ الْاِصْبَاحِ۔ لیکن فرق میں فصل بین الشی ضروری ہوتا ہے۔

اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ - دریا کو دو بڑے بڑے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ الگ شدہ ٹکڑے کو بھی فرق کہتے ہیں۔

فِرْقَه : گروہ جماعت - فَانْفَلَقَ. فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ -

فریق، وہ جماعت جو دوسرے سے الگ ہو جائے۔

قال : فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ. وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ

سر کی مانگ کو بھی فرق اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔

فَرَقْتُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ - میں نے دو چیزوں کو الگ الگ کر دیا۔ عام اس سے کہ یہ علیحدگی محسوس بالنظر ہو یا اس کا تعلق صرف بصیرت سے ہو۔

فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ - فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا - فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ

یہاں ان آیات میں فرق بصیرت کا فرق ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ۔ ہم نے قرآن کو متفرق طور پر نازل کیا ہے۔ اسی سے ہے۔

التفریق : کسی کے اتحاد اور شیرازہ بندی کو توڑنا اور زائل کرنا۔

مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ - البقرة

فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ - (طٰہٰ)

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ - (البقرہ)

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ - (الانعام)

اور مفارقہ (باب مفاعلہ سے) کے معنی ہیں دو شخصوں کا آپس سے جدا ہونا۔

هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ - (کہف)

وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ - لیکن الفرقان خاص ہے۔ اس کا استعمال قرآن پاک نے حق و باطل میں امتیاز اور جدائی پر کیا ہے۔ اور یہ مصدر نہیں بلکہ بطور اسم صفت کے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہ رَجُلٌ قِنْعَانٌ - وہ آدمی جس کے حکم پر قناعت کی جائے۔

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (انفال)
یعنی وہ تمہارے دلوں میں وہ نور پیدا کر دے گا۔
جس کے ذریعہ سے تم حق و باطل کو واضح کر دگے
وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ ۔ انفال
يَوْمَ الْفُرْقَانِ سے مراد جنگِ بدر ہے۔ جس نے
اس دنیائے ہست و بود میں کفر و اسلام کو نکھیر دیا
وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ ۔
الفرقان سے مراد تورات ہے۔ اور الکتٰب کا
عطف تفسیری ہے۔ قرآن پاک کو بھی کئی مقامات پر
الفرقان کہا گیا ہے۔ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى
وَالْفُرْقَانِ۔ اور یہاں بھی وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ
سے مراد قرآن پاک ہے (قرطبی۔ کشاف۔ راغب)

يُصَوِّرُ ۔ یہ بابِ تفعیل سے ہے۔ اس کا اصل
اشتقاق صَوْرٌ ہے ۔ صَارَ يَصُوْرُ صَوْرًا کے
معنی ہیں جھکانا۔ آواز دینا۔ مائل کرنا۔ صارہ الیٰ کذا
ای اَمَالَہٗ (قرطبی) اور صَوِرَ يَصْوَرُ سے معنی لازم
آتے ہیں۔ بمعنی جُھکنا۔ اسی سے ہے صورۃ کسی چیز
کے ظاہری خد و خال جس سے پہچانا جاسکے۔ اور
دوسری چیز سے امتیاز کیا جا سکے۔ پھر اس صورت
کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک مادی صورت جس کو ہر
عالم و جاہل دیکھتا اور جانتا ہے۔ جیسا کہ انسانی
شکل و صورت اور گدھے گھوڑے وغیرہ کی صورت
اور دوسری قسم اس کی صورتِ عقلیہ ہے اس کا
ادراک صرف اصحابِ علم و عقل کو ہوتا ہے۔ عوامی فکر
کی گرفت میں صورتِ عقلیہ نہیں آتی۔ جیسا کہ انسانی عقل
و فکر کی صورت۔ ظاہر ہے، اس کا فہم صرف اہل علم کو
ہوگا۔ يُصَوِّرُكُمْ فِى الْاَرْحَامِ ۔ میں دونوں
معنوں کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے
وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۔ اور فِيْٓ
اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۔
شکل اور ھیئت کو صورت کہنے کی وجہ یہ بھی ہے
کہ اسے ایک ہیئت اور شکل سے دوسری طرف
مائل کیا جاتا ہے۔ فاشتقاق الصُّوْرَة : من
صَارَهٗ الیٰ کذا اذا اَمَالَهٗ اِلٰى شِبْهٍ وَهَيْئَةٍ
(قرطبی) الصُّوْرَة ما يُنْتَقَشُ به الاَعْيَانَ
و يتميّز بها غيرها۔ (راغب)

اَلْاَرْحَامُ ۔ یہ رحم کی جمع ہے۔ بچہ دانی
ماں کے پیٹ کا وہ مقام جہاں بچے کی نشو و نما
ہوتی ہے۔ رَحُوْمٌ اس عورت کو کہتے ہیں جسے
خرابیٔ رحم کی بیماری ہو۔ استعارہ کے طور پر رحم کا
لفظ قرابت داری پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ اَقْرَبُ
رُحْمًا ۔ رُحْمٌ اور رَحِمٌ دونوں ہم معنی ہیں۔

مُحْكَمٰتٌ ۔ اس سے وہ آیات مراد
ہیں جن میں لفظی اور معنوی اعتبار سے کسی قسم کا اشتباہ نہ ہو
مُحْكَمٰتٌ یہ باب افعال کے مصدر احکام سے
جمع مؤنث اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ وہ آیات جن کی

دلالت علی المعنی واضح ہو۔ یہ حنفی علماء کے نزدیک متشابہات کا مقابل ہے۔

مُحکمٰت : اس سے وہ آیات مراد ہیں جن میں لفظی اور معنوی اعتبار سے کسی قسم کا اشتباہ نہ ہو۔ اپنی مراد کو پوری طرح واضح کرتی ہوں اور قواعدِ عربیہ سے واقف فوراً معنی کو سمجھ جائے۔ مفتی اعظم فرماتے ہیں :۔ محکمات اُن آیات کو کہتے ہیں جن کی مراد ایسے شخص پر ظاہر اور بیّن ہو جو قواعدِ عربیّہ کو اچھی طرح جاننے والا ہو۔ اور جن آیات کی تفسیر اور معانی ایسے شخص پر ظاہر نہ ہوں ان کو متشابہات کہتے ہیں۔

(معارف بحوالہ مظہری)

المحکم ما لایعرض فیه شبهة من حیث اللفظ ولا من حیث المعنی (راغب)

والمحکمات من آیِ القرآن ما عُرِفَ تاویله و فُهِمَ معناه وتفسیره۔ یہ قول جناب سفیان ثوری اور حضرت جابر بن عبداللہ کا ہے۔

وقال النحاس : احسن ما قیل فی المحکمات والمتشابهات ان المحکمات ما کان قائمًا بنفسه لایحتاج ان یرجع فیه الی غیره

(قرطبی جلد ۴ صفحہ ۱۹)

فالمراد به اللفظ الذی لا اشتراكَ فیه ولا یحتمل عند سامعه اِلّا معنًی واحدًا۔

(جصّاص ج ۲)

اُمّ ۔ اُمُّ الکِتٰب : یہ دراصل محکمٰت کی تعریف ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ساری تعلیمات اور اصل اصول یہ ہی آیات ہوتی ہیں۔ جن کے معانی اور مفاہیم اشتباہ والتباس سے پاک ہوتے ہیں۔

یہاں اس حقیقت کو بیان کر دیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں بالکل واضح اور صاف ہیں۔ جن سے ایک ہی معنٰی نکلتے ہیں وہی اصل مراد و معیار ہیں۔ دوسری آیات جن کے معنی میں دوسرا احتمالات بھی ہوں تو انھیں محکمات پر پیش کیا جائے گا۔

اُمٌّ ۔ ہر شئ کی اصل کو اُمّ کہتے ہیں۔ لفظ اُمٌّ کی اصل میں اختلاف ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس کی اصل اُمَّهَةٌ ہے۔ چونکہ جمع اُمَّهَات آتی ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اصل میں مضاف ہے یعنی اُمَمٌ اور اس کی جمع اُمَّات آتی ہے اور تصغیر اُمَیْمَةٌ آتی ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ عام حیوانات میں لفظ اُمَّات اور دیگر ذوی العقول کے لیے اُمَّهَات کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اَلْاُمَّة :۔ ہر اس جماعت کو کہتے ہیں جن میں باہم دینی رشتہ موجود ہو۔ اس کی جمع اُمَمٌ آتی ہے۔

ویقال بکُلّ مَا کَان اَصْلًا لِوُجُود الشئ او تربیته اَو اِصلَاحِه او مَبْدَئه (راغب)

اُمّ کے لغوی معنی قصد کرنے کے ہیں۔ اور قصد چونکہ

انسان کی محرکات کی اصل ہے۔ غالباً اس سے
اس کے مفہوم کو وسعت دیکر ہر چیز کی اصل کے لیے
اسے استعمال کر لیا گیا۔
اُمُّ القُریٰ ۔ مکہ معظمہ۔ اُمُّ الطریق :
شارع عام۔ اُمُّ النجوم : کہکشاں ۔
اُمُّ الرأس واُمُّ الدماغ : وہ جھلی جس میں
دماغ لپٹا ہوا ہوتا ہے ۔
اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا - ابراھیم
عبادتِ الٰہی میں ایک جماعت اور ایک قوم کے
بمنزلہ تھے ۔
اِمَامٌ : مقتدیٰ۔ جس کی اقتدا کی جائے ۔
اُمَّةٌ : مدّتِ دراز۔ ایک بڑا عرصہ۔
مُتَشٰبِهٰتٌ ۔ متشابہات سے مراد وہ
آیات ہیں جن کی لفظی یا معنوی مماثلت کی وجہ سے
تفسیر بیان کرنا مشکل ہو۔ عام فقہاء کے نزدیک
متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے ظاہری
معنی سے مقصود کا علم نہ ہو سکے (راغب)
المتشابہ مالم یکن لِاَحَدٍ اِلٰی علمہ سبیل
مما استأثر اللّٰہ بعلمہ دون خلقہ ھذا احسن
ماقیل فی المتشابہ (قرطبی)
متشابہ کا اصل مادہ شبہ ہے۔ شِبہ کے معنی
ہیں تشبیہ دینا۔ شُبِّهَ علیہ الامرُ : کسی پر معاملہ
کا مشتبہ ہو جانا۔ اَشْبَهَهٗ وَشَابَهَهٗ کے معنی
مانند اور ہم مثل ہونے کے آتے ہیں۔ اَشْبَهَهٗ
اس کی مانند۔ اشبہ اُمّہٗ : لڑکا ماں کے
مشابہ ہے۔ یعنی عورت کی طرح کمزور ہے ۔
شَبَهٌ شِبْهٌ اور شَبِيْهٌ ان تینوں کے اصل معنی
مماثلت بلحاظ کیفیت کے ہیں۔ مثلاً لون، طعم و
ذائقہ وغیرہ کا باہم مماثل ہونا۔ یا عدل وظلم میں
اور دو چیزوں کا حسّی یا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل
ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو سکیں تو اس
کو شُبْهَة کہتے ہیں جیسا کہ وَ اُتُوْا بِهٖ
مُتَشَابِهًا ۔ اُن کو ایک دوسرے کے ہم مثل پھل
دیئے جائیں گے۔ یعنی وہ اصل میں مختلف ہونے کے
باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے ہوں گے ۔
اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۔ چونکہ بہت سے بیل
ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔
تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۔ ان لوگوں کے دل ملتے
جلتے ہیں، جہالت میں ایک دوسرے کی طرح ہیں۔
زَيْغٌ ۔ زَاغَ يَزِيْغُ زَيْغًا : مائل ہونا،
حقیقت سے ہٹ جانا، حالتِ استقامت سے
ایک جانب ہو جانا۔ اور تزایغ بمعنی تمایل ہے
یعنی بہت مائل ہونا اور باہم ایک دوسرے کی طرف
جھکنا۔ رَجُلٌ زَائِغٌ مائل ہونے والا۔ جمع زاغۃ
و زَائِغُوْنَ ۔ زَاغَتِ الشَّمْسُ ۔ سورج کا زوال
کی طرف مائل ہونا۔ زَاغَتِ الْبَصَرُ ۔ نگاہ کا غلطی

کرنا۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی نظر نہ تو حقیقت سے ایک طرف کو ہٹی اور نہ ہی غلطی کی۔ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ آنکھوں کا پتھرا جانا فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ۔ جب وہ از خود سیدھی راہ سے ہٹ گئے، تو اللہ تعالےٰ نے بھی پھر اُن کو اُسی طرف مائل کر دیا۔

اَلزَّیْغُ: المیل ومنہ زاغت الشمس وَزَاغَتِ الْاَبْصَارُ۔ ویقال زاغ یزیغ زیغًا اذا ترک القصد (قرطبی)

الزیغ: المیل عن الاستقامۃ والتمایل (راغب)

اَلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ سے اشارہ اصل میں نصاریٰ کی طرف ہے جنہوں نے راہِ راست کو ترک کر کے محض متشابہات کو اپنا دین بنا لیا تھا۔ لیکن علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ آیت اپنے عموم الفاظ کی وجہ سے تمام اہل زیغ، کج رو اور کج رائے زندیق ملحد، صاحبِ بدعت کو شامل ہے۔

وھذہ الآیۃ تعمّ کلّ طائفۃ مِن کافر وزندیق وجاھل وصاحب بدعۃٍ۔

(قرطبی ج ۴ ص ۱۳ سورۃ آل عمران)

تَاْوِیْل

۔ اَوْلٌ سے مشتق ہے۔ بیان حقیقت ٹھیک پڑنا۔ تعبیر بتانی۔ کل بٹھانی۔ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ۔ اِن کی کل بٹھانی کوئی نہیں جانتی سوائے اللہ کے۔

(لغات القرآن للنعمانی)

یہ اَوَلٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کو اصل کی طرف لوٹانا یا پھیر دینا اور مَؤَیِّل اس مقام کو کہا جاتا ہے جس کی طرف لوٹ آیا جائے۔ یعنی جائے بازگشت۔

التاویل من الاَوْل: ای الرجوع الی الاصل (راغب)

اَلرَّاسِخُوْنَ

۔ رسوخ کے معنی مضبوط ہو جانے اور جڑ جم جانے کے ہیں۔ الرّسُوخ الثبوت فی الشیٔ۔ کل ثابت راسخ (قرطبی)۔ تو راسخون فی العلم وہ ہوتے ہیں جن کے دلوں میں دین کے حقائق ثبت ہو چکے ہیں۔

راسَخُوا فی العلم ای ثبتوا فیہ وتمکّنوا وعضّوا فیہ بضرسٍ قاطع (کشاف)

فلانٌ راسخ فی العلم: فلاں پختہ علم والا ہے

وَقُوْدٌ

۔ وقودُ النّار: آتشِ جہنم۔ تحقیق گزر چکی ہے۔ دیکھئے البقرہ

دَاْب

۔ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ۔ داب کے معنی حالت یا معاملہ کے آتے ہیں۔ الدّأبُ العَادَۃ والشأن۔ (قرطبی)

دَبَّ الشَّرابُ فی عُرُوقِہ: شراب اس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ یہ مثلیت رجوع بے سود

ہونے میں ہے۔ گویا تاریخ سے استشہاد ہے کہ جس طرح ماضی میں فرعون کے کام اُس کا مال و اولاد نہ آیا اور اُنھیں عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکا۔ اسی طرح ان کافروں کے حق میں بھی یہ سارے مادی سہارے بالکل عبث ہیں۔ دَأَبَ یَدْأَبُ دَأْبًا وَدُءُوبًا وَدَأَبًا کوشش کرنا، مسلسل چلنا۔ دَأَبَ فِي السَّيْرِ وہ مسلسل چلا۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ۔ اور کام میں لگا دیا۔ تمہارے سورج اور چاند کو ایک دستور پر برابر۔

(ترجمہ شیخ الہند)

الْعِبْرَة ۔ یہ عَبْرٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچ جانا لیکن عُبُورٌ کا لفظ خاص کر پانی کے عبور کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ عبور چاہے پانی پر تیر کر ہو یا کشتی کے ذریعہ۔ عَابِرِيْ سَبِيْلٍ: مسافر کو کہتے ہیں کہ وہ راستہ کو عبور کرتا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف رحلت کرتا اور پہنچتا ہے العبرۃ اور الاعتبار اس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی دیکھی چیز کی وساطت سے ان دیکھے نتائج تک پہنچا جائے۔ يَاأُولِي الْأَبْصَارِ۔ اے اصحابِ بصیرت عبرت حاصل کرو۔

تعبیر: خواب میں دیکھی ہوئی چیز کی بیداری میں ہونے والے اشارات کی توضیح کرنا۔

لَعِبْرَةً پر تنوین تعظیم کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ واقعات ہدایت و بصیرت کا بہت بڑا درس عبرت ہیں۔

الْقَنَاطِيْر ۔ یہ قنطار کی جمع ہے۔ اس کے معنی مالِ کثیر کے آتے ہیں۔ اس کے بعد مقنطرۃ کی صفت اس طرح استعمال ہوتی ہے جس طرح عربی میں نَيْلٌ أَنْيَل اور ظِلٌّ ظَلِيْل وغیرہ کی تراکیب استعمال ہوتی ہیں۔ القناطير جمع قنطار وهو العقدة الكبيرة من المال۔ (قرطبی)

قَنْطَرَ: کے معنی احکام اور مضبوطی کے آتے ہیں۔ قنطرت الشئ، اذا احکمته۔ ومنه سُمّی القنطرة لاحکامها۔

پل کو قنطرہ اس کی مضبوطی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے قال الزجاج: القنطار ماخوذ من عقد الشئ واحکامه (قرطبی)

الْقِسْط ۔ قَسَطَ يَقْسُطُ قَسْطًا وَقُسُوطًا عدل۔ انصاف۔ ظلم و جَوْر۔ القِسط۔ جب قاف کے زیر اور سین کے سکون کے ساتھ ہو تو معنی ظلم و جور کے ہوتے ہیں۔ (غیاث اللغات) قرآن پاک میں قسط بمعنی عدل و انصاف بھی بیان کیا ہے۔ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۔ يَأْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ

اَلْقَسْطُ کے معنی پاؤں کا ٹیڑھا پن یا لنگڑا پن کے بھی ہیں۔ یہ الفحج کی ضد ہے۔ جس کے معنی پاؤں کے اگلے حصہ کی جانب سے دور ہونے کے ہیں۔ پھر یہیں سے لفظ کا استعمال ظلم، جور اور بے انصافی کے معنوں میں ہونے لگا اس کی صفت قاسط آتی ہے۔ قَسَطَ الرَّجُلُ فَهُوَ قَاسِطٌ۔ ظلم کے معنوں میں ہے۔

وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا[1]

اَلْاِقْسَاطُ اس کے اصل معنی کسی کو اس کے حق دینے اور انصاف کرنے کے ہیں۔

اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ[2]

اَلْقِسْطَاسُ: ترازو کو کہتے ہیں اور لفظ میزان کی طرح اس سے بھی مراد عدل و انصاف ہوتی ہے

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ[3] ترازو سیدھی رکھ کر تولو۔ قِسط بکسر القاف کے معنی ہیں عدل و انصاف۔ (معارف)

صاحب لغات الحدیث علامہ وحید الزماں نے نہایہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اَقْسَطَ يُقْسِطُ فَهُوَ مُقْسِطٌ کے معنی عدل اور انصاف کے ہیں اور قَسَطَ يَقْسِطُ فَهُوَ قَاسِطٌ کے معنی جور و ظلم کے ہیں۔ تو ہمزہ باب افعال کا یہاں سلب ماخذ کا ہوگا۔ جیسے شکی اور اشکی ہیں (لغات الحدیث)

اَلْقِسْطُ: اَلْعَدْلُ (قرطبی)

القِسْطُ فهو النصيب بالعدل كالنصف والنَّصَفَة۔ (راغب)

الدِّيْن۔ لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اطاعت۔ تعبد اور بندگی عباد کی طرف سے خدا کے سامنے عجز و انکساری کا پوری طرح اظہار کرنا۔ غلبہ اور تسلط حاکم اعلیٰ کی طرف سے۔

دَايَنَهُ مُدَايَنَةً: فیصلہ کے لئے حاکم اعلیٰ کی طرف لے جانا۔

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (المومن)

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (زمر)

قاعدہ اور ضابطہ جس کی پابندی کی جائے۔ جیسا کہ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (یونس)

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا۔ (یونس ۱۰)

اِنِ الْحُكْمُ لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (یوسف آیت)

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (روم۔ آیت ۳۰)

[1] الجن [2] الحجرات۔ [3] بنی اسرائیل

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۔
محاسبہ ۔ فیصلہ ۔ روزِ جزاء ۔
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ وَاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ (الذاریات)
اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۔
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ثُمَّ مَآ
اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (الانفطار)
ان آیات میں دین بمعنی محاسبہ اور یوم جزاء
استعمال ہوا ہے ۔ الدَّیّان : اِسمٌ من
اسماء العزیز ۔ معناه الحکم القاضی ۔
سلف میں یہ کسی سے حضرت علیؓ کے بارے میں
سوال کیا گیا تو اُنھوں نے کہا کہ : کان دیّانُ
ھٰذہ الامّۃ بعد نبیّھا ۔ یعنی نبی کے بعد
وہ اس امت کے قاضی رہے ہیں ۔
علامہ راغب فرماتے ہیں کہ : دین کے معنی
اطاعت اور جزاء آتے ہیں ۔ اور بطور استعارہ
دین بمعنی شریعت بھی آتا ہے ۔ اور دین ملت کیطرح
ہے لیکن شریعت کی طاعت اور فرمان برداری کے
لحاظ سے اسے دین کہا جاتا ہے ۔ اِنَّ الدِّيْنَ
عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ دین خدا کے نزدیک تو صرف اسلام
ہے ۔ الدین یُقال للطّاعۃ والجزاءِ
واستُعیر للشریعۃ (مفردات القرآن)
امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں دین طاعت
اور ملت کے معنی میں ہے
الدین فی ھٰذہ الآیۃ الطاعۃ والملّۃ (قرطبی)
مطلب یہ ہے کہ دین خدا کے نزدیک صرف اسلام
ہے ۔ اب مقبولیت کا شرف صرف اسی کو حاصل ہے
اس کی مقبولیت ہی کو بیان کرنے کے لیے دونوں جملوں
کو معرفہ لایا گیا ہے ۔ یعنی الدین اور الاسلام
دونوں معرفہ ہیں ۔ اور مبتدا ، خبر جب دونوں معرفہ
ہوں تو فائدہ حصر کا ہوتا ہے ۔ اصل کلام یہ ہے
الدّینُ الاسلام ۔

الدّین : الجزاء والمکافاۃ ۔ دِنْتُہٗ بفعلِہٖ
میں نے اس کو اس کے کیے کی جزا دی
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ ای مالك یوم الجزاء
والدّینُ الطاعۃ ۔ دِنتُ لہٗ کے معنی ہیں
میں نے اس کی اطاعت کی ۔ کَمَا تَدِیْنُ تُدَان
ای کما تفعل یُفعل بك (لسان)

غَرَرٌ ۔ غَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ۔ دھوکے میں ڈال دیا ہے ان کو ان کی
افترا پردازیوں نے ۔
غَرَّ یَغُرُّ غَرًّا وَغِرَّۃً وَغُرُوْرًا دھوکہ دینا ، باطل
کی طرف مائل کرنا ۔ محاورہ ہے ۔ ما غَرَّكَ
بفلانٍ یعنی تو نے اس کے خلاف کیسے جرأت کی ۔
غَرَّ یَغُرُّ غَرًّا وَغِرَارًا ۔ شریف ہونا ۔ یہ
نَصَرَ سے آتا ہے ۔ غِرٌّ : بھولا ، فریب خوردہ ،
ناتجربہ کار ۔ الغَرُوْرُ : صیغہ صفت کا ہے ۔

دھوکہ دینے والا۔
غَرَّ یَغُرُّ (س) غُرُوْرًا وَغِرَّۃً وَغَرَارَۃً۔
حسین خوبصورت، روشن۔ غَرَّ الوَجْہُ: چہرہ
چمک اٹھا۔ اَلغَرُّ بفتح الغین۔ یہ مصدر ہے۔
زمین کا شگاف، کپڑے کی شکن کو کہتے ہیں۔
طویتُ الثوب علی غَرِّہٖ۔ الغَرُوْر: ہلاکت
کے درپے۔ الغُرَّۃ۔ گھوڑی کی پیشانی کی سفیدی
ہر چیز کا ابتدائی اور بڑا حصہ۔ اَلغُرُوْرُ: دھوکے
کا ذریعہ۔ الغُرُوْرُ: مصدر ہے، بیہودہ کلام
کرنا۔ غَرَّارٌ: بڑا دھوکہ باز۔ غِرَّۃٌ کے معنی ہیں
بیداری کی حالت میں غفلت اور غِرَارٌ وہ غفلت
جو اونگھ کے ساتھ ہو۔ غَرَرْتُ فُلَانًا۔ کسی کو غافل
پاکر فریب سے اپنا مقصد حاصل کرنا۔ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ
الکَرِیْمِ۔ اے انسان تجھے اپنے رب کریم کے بارے
کس چیز نے دھوکے کے ساتھ غافل بنا دیا ہے۔
لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی البِلَادِ۔
وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا۔
یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ القَوْلِ غُرُوْرًا
دھوکہ دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع
سازی کی باتیں ڈالتے ہیں۔

تَنْزِعُ: تَنْزِعُ المُلْکَ۔ نَزَعَ یَنْزِعُ
نَزْعًا۔ کسی چیز کو اپنی جگہ سے کھینچنا۔ نَزَعَ الشَّیْءَ
مِنْ مَکَانِہٖ۔ کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا دینا۔
نَزَعَ الاَمِیْرُ عَامِلَہٗ۔ عامل کو امیر نے معزول
کر دیا۔ نَزَعَ یَنْزِعُ نُزُوْعًا کے معنی رکنے کے
ہوتے ہیں۔ نَزَعَ عَنْ کَذَا۔ رک گیا۔ اور نَزَعَ
یَنْزِعُ نِزَاعًا (ف) کے معنی اشتیاق کے ہوتے
ہیں۔ نَزَعَ اِلٰی اَھْلِہٖ۔ مشتاق ہونا۔ نَزَعَ لَہٗ
نَزْعَۃً اِلٰی کذا کا مطلب یہ ہے کہ اس کا فلاں
چیز کی طرف میلان ہے۔
تَنْزِعُ المُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ کا مطلب یہ ہوگا کہ
تو جس سے چاہے بادشاہت کھینچ لے۔
وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ۔
وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا۔ ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب
کر انسان کی روح کھینچتے ہیں۔
اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ
مُّسْتَمِرٍّ تَنْزِعُ النَّاسَ۔ یہاں تَنْزِعُ النَّاسَ
کا مطلب یہ ہے کہ آندھی اپنی شدت کی وجہ سے
لوگوں کو گھروں سے باہر نکال کر پھینک دیتی تھی۔
التَّنَازُعُ اور مُنَازَعَۃ کے معنی ہیں ایک دوسرے
کو کھینچنا اور باہم لڑائی جھگڑا کرنا۔
فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ۔ بِئْرٌ نَزُوْعٌ
اس کنویں کو کہا جاتا ہے جو کم گہرا ہو۔ یا ہاتھ سے
پانی نکالا جا سکے۔

تُذِلُّ: تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ۔ تو جسے چاہے
ذلت دے۔ یعنی عزت سلب کرے اور رسوائی

مقدر کردے۔ ذَلَّ يَذِلُّ اِذْلَالًا وَذِلَّةً وَذِلَّةً۔ ذلیل وخوار ہونا۔ اَذَلَّ کسی کو ذلیل اور رسوا کرنا۔ ذَلَّ يَذِلُّ ذُلًّا (من) سے جب آتا ہے اس کے معنی زور وقہر کی وجہ سے جھکنے کے آتے ہیں۔ اور جب انسان نرمی طبیعت کی وجہ سے جھکے اور پستی کو اختیار کرے تو ذِلّ کہتے ہیں۔ ذال کے کسرہ کے ساتھ۔ قرآن پاک میں ہے کہ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ والدین کے سامنے مقہور اور مجبور بن کر رہو اور ایک قرأت میں ہے۔ ذال کے کسرہ کے ساتھ۔ یعنی اُن کے سامنے نرم مزاج اور اطاعت گزار بن کر رہو اور یہی زیادہ قریب المعنیٰ ہے۔ چونکہ مِنَ الرَّحْمَةِ کا جملہ اس کا مقتضی ہے کہ اولاد والدین کی اطاعت خندہ پیشانی سے کرے۔ بغیر تا مصدر ذُلّ اور تا کے ساتھ ذِلَّۃ آتا ہے۔ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ۔

ذلت اور عجز وانکساری اگر انسان کی اختیاری ہو تو یہ محمود ہے جیسا کہ ارشاد ہے اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اسی طرح انسان کی بے سروسامانی پر بھی ذلت کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حکم ہے کہ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ جمع واحد اس کی ذلیل ہے۔

ذَلَّ يَذِلُّ ذُلًّا۔ اِذَا غَلَبَ وَعَلَا (قرطبی) الذُّلُّ مَاكَانَ عَنْ قَهْرٍ يُقَالُ ذَلَّ يَذِلُّ ذُلًّا۔ وَالذِّلُّ مَاكَانَ بَعْدَ تَعَصُّبٍ وَشِمَاسٍ مِنْ قَهْرٍ (مفردات راغب نور محمدی)

مُحْضَرًا۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا۔ جس روز ہر شخص اپنے ہر نیک کام کو اپنے سامنے پائے گا۔

مُحْضَرٌ۔ سامنے لایا ہوا۔ اِحضارٌ سے مفعول ہے۔

اَمَدًا۔ اَمَدًا بَعِيْدًا۔ دور کی مسافت اے کاش کہ میرے اور اُن اعمالِ بد کے درمیان اتنا بُعد ہوتا اور یہ مجھ سے اتنے دُور ہوتے کہ میں ان کو حاصل کرنے یا ان کا ارتکاب کرنے پر قادر ہی نہ ہوتا۔

لفظِ اَمَد کسی کی چیز کی حد اور غایت اور انتہا کے لیے آتا ہے۔ مَا اَمَدُكَ۔ آپ کی عمر کیا ہے۔

اَمَد اور اَبَد۔ دونوں قریب المعنیٰ ہیں۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ اَبَدَ میں غیر محدود اور غیر معیّن زمانے کے معنی ہیں اور اَمَدَ اگرچہ اس کا زمانہ غیر معیّن ہے مگر ہوتا محدود ہے۔ غیر محدود نہیں ہوتا۔ اسی طرح لفظ زمان اور اَمَد میں بھی فرق ہے کہ اَمَد غایتِ شئے کے لیے ہے اور زمان کا لفظ مدت کے مبدا اور غایت کے لیے ہے۔ اس کی جمع آماد آتی ہے۔ الاَمَد۔ الغاية

وجمعه آماد (قرطبی) کہا جاتا ہے طَالَ
عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ۔ ان پر مدت طویل ہوگئی۔
اَمَّدَ کے معنی ہیں مدت کا متعین کرنا۔
اَمِدَ کے معنی غصہ اور ناراضگی کے بھی آتے ہیں
اَمِدَ عَلَيْهِ اَيْ غَضِبَ غَضَبًا (قرطبی)
فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ
تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا
(آل عمران)
ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ
اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا۔ (کہف)
قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ
اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا (الجن)

تُحِبُّوْنَ ۔ تم محبت کرتے ہو۔ باب
افعال کے مصدر اِحْبَابٌ سے مضارع
جمع مذکر حاضر۔ حَبَّ يَحِبُّ حُبًّا وَحِبًّا۔
محبت کرنا۔ کسی کی رغبت کرنا۔ يَحَبُّ (س)
محبوب ہونا۔ پیارا ہونا۔ اَلْحُبُّ مصدر ہے
دوست عاشق اور محبوب۔ جمع احباب۔
حَبٌّ اور حَبَّةٌ : گندم اور جو وغیرہ کے دانے
کو کہتے ہیں اور حِبٌّ وہ عاشق اور محبوب
جس کی محبت حد سے بڑھ جائے۔ مَحَبَّةٌ
کے معنی کسی کو اچھا سمجھ کر اس کا ارادہ کرنے
اور چاہنے کے ہیں۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ۔
اگر تم خدا کو واقعی خدا کی اوصاف کے ساتھ
محبوب رکھتے ہو تو میری اتباع کرو

مُحَرَّرًا ۔ یہ حُرِّيَّة سے ماخوذ ہے
جو کہ عبودیت کی ضد ہے۔ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ
مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا (قرطبی) جو بچہ میرے
پیٹ میں ہے میں نے اُس کو تیری نذر کیا۔
عکرمہ اور مجاھد نے مُحَرَّرًا کے معنیٰ خالص کئے
ہیں۔ یعنی یہ بچہ خالص تیری عبادت کے لئے ہوگا
اُمورِ دُنیا سے اس کو کوئی تعلق نہ ہوگا۔ امام قرطبی
فرماتے ہیں کہ یہ معنی لغت میں معروف ہیں۔
يُقَالُ لِكُلِّ مَا خَلَصَ حُرٌّ وَمُحَرَّرٌ بمعناه
(قرطبی) حریت کی دو قسمیں ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ
انسان غلامی میں گرفتار نہ ہو پیدائشی آزاد ہو
اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ میں اسی طرف اشارہ ہے۔
اور دوسری قسم وہ ہے کہ آدمی اخلاقِ ذمیمہ اور
عاداتِ رذیلہ سے آزاد ہو۔ اور حریتِ کاملہ وہ ہے
کہ دونوں چیزیں پائی جائیں۔ غلام بھی نہ ہو اور
بلند اخلاق کا مالک بھی ہو۔ حُرُّ الوجہ غنی۔
شریف۔ بے احتیاج۔ حریر۔ ریشمی کپڑا جو
کھردرے پن سے آزاد ہو۔

الرَّجِيْمِ ۔ رِجَامٌ : پتھر کو کہتے
ہیں۔ اس سے رجم ہے۔ جس کے معنی ہیں پتھرانا

رَجَمَ يَرْجُمُ رَجْمًا سنگسار کرنا۔ رَجَمَ الْقَبْرَ۔ قبر پر پتھر کا کتبہ نصب کرنا۔ جس کو سنگسار کیا گیا ہو اس کو مرجوم کہتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۔ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ پھر استعارہ کے طور پر رجم کا لفظ جھوٹے اقوال اور اباطیل کے لیے بھی بولا گیا ہے جیسا کہ رَجْمًا بِالْغَيْبِ۔ غیبی باتوں میں اٹکل کے تکے چلانا۔ شیطان کو رجیم اسلئے کہتے ہیں کہ خیرات اور ملأ اعلیٰ سے راندہ ہوا ہے فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ۔

شُهُب ثاقبہ کو بھی رُجُوم کہا جاتا ہے۔ چونکہ شیطان کے لئے رجم کا کام دیتے ہیں۔ رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ لَا تَرْجُمُوْا قَبْرِيْ ۔ میری قبر پر پتھر نہ نصب کرنا الْمُرَاجَمَۃ۔ باہم ایک دوسرے کو مغلظات سنانا، ایک دوسرے کو گالیاں دینا۔ ترجمان بھی رَجْمٌ سے ہے تفعلان کے وزن پر۔

كَفَلَ ۔ کفالت کرانا۔ کسی کی سرپرستی میں دینا۔ سرپرست بنانا۔ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا زکریّا کو اس کا سرپرست بنایا۔ ایک قرأت میں كَفَلَهَا زَكَرِيَّا ہے۔ یعنی فا کی تخفیف کے ساتھ۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ حضرت زکریّا نے اُن کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ گویا كَفَلَ کے فاعل زکریّا ہوں گے۔

كَفَلَ يَكْفُلُ كَفْلًا وَكَفَالَةً : کسی کے نان نفقہ اور خبر گیری کا ذمّہ دار ہونا۔ كَفَلَ اور اَكْفَلَ دونوں ہم معنی ہیں۔ کسی کے نان نفقہ کی ذمّہ داری لینا۔ کسی کو ذمہ دار بنانا۔

کفالۃ کے معنی دراصل ضمانت کے ہیں۔ تَكَفَّلْتُ بِكَذَا کے معنی کسی کا ضامن بننے کے ہیں۔ اور كَفَّلْتُهُ فُلَانًا کے معنی ہیں میں نے اس کو فلاں کی ضمانت و ذمّہ داری میں دیدیا۔ اَكْفِلْنِيْهَا ۔ اس کو میرے سپرد کردو۔ اور كِفْل اس مقدار اور حصّہ کو کہا جاتا ہے جو انسان کی بقدرِ ضرورت کفالت کرے۔ قرآن میں ہے : وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۔ اور كِفْلٌ حصہ کے معنی دیتا ہے۔ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ تمہیں دو حصّے ملیں گے۔ یہ كَفَلَ يَكْفُلُ اور كَفِلَ يَكْفَلُ دونوں ابواب سے آتا ہے۔

الْمِحْرَاب ۔ محراب اس حجرہ اور مکان کو کہا جاتا ہے جو خاص کر یکسوئی حاصل کرنے اور عبادت کے لیے بنایا جائے۔ محرابِ مسجد کو بھی محراب اس لیے کہا جاتا ہے کہ امام الگ ہو کر وہاں کھڑا ہوتا ہے۔ المحراب: الغرفۃ قال الازھر وسُمّی المحراب محرابًا لانفرادہ الامام فیہ وبُعدہ من الناس[1]۔

[1] ماجدی بحوالہ قاموس ولسان)

محراب کا اصل مادہ حرب ہے۔ کما مر تحقیقہ
المحراب فی اللغۃ اکرم موضع فی المجلس (ذہبی)

اَلذُّرِّيَّةُ: رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً
میرے رب مجھ کو نیک اولاد عطا کر۔ ذُرِّيَّةً ۔ اولاد
طَيِّبَةً ۔ نیک ۔ پاکیزہ اخلاق اور بلند کردار۔
لفظ ذُرِّيَّة کا اطلاق واحد جمع مذکر اور مؤنث سب
پر ہوتا ہے۔ یہاں واحد کے معنوں میں آتا ہے۔ وجہ
اس کی یہ ہے کہ جناب زکریا علیہ السلام کی دعا
کے الفاظ دوسری جگہ وَلِيًّا کے ہیں۔ فَهَبْ لِيْ
مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا لفظ وَلِيٌّ واحد ہے۔ اگر مراد
جمع ہوتا تو یہاں اولیا ہوتا۔ لفظ طيبة میں تاء
تانیث لفظ ذُرِّيَّة کی تانیث کی وجہ سے ہے۔
کلامِ عرب میں عموماً ایسا ہوتا ہے۔ موصوف کی ظاہری
اور لفظی شکل و صورت کا لحاظ کر کے صفت بیان کر دی
جاتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے

اَبُوْكَ خَلِيْفَةٌ وَلَدَتْهُ اُخْرٰى
وَاَنْتَ خَلِيْفَةٌ ذَاكَ الْكَمَالُ

یہاں ولدتہ کو مؤنث خلیفہ کی تانیث کی وجہ سے
لایا گیا ہے حالانکہ خلیفہ یہاں مذکر ہے۔
والذریۃ یقع علی الواحد والجمع۔
(کشاف، قرطبی)

الذریۃ کے معنی اصل میں تو چھوٹی اولاد کے ہیں
لیکن عرف میں عام ہو گیا ہے۔ چھوٹی اور بڑی ہر طرح
کی اولاد کو ذُرِّيَّة کہتے ہیں۔ ذُرِّيَّة کے اشتقاق میں
علماء کے تین اقوال صاحب مفردات نے نقل کیے
ہیں۔ ایک یہ کہ ذَرَءَ سے مشتق ہے یعنی مہموز اللام
ہے جس کے معنی ظاہر کر دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے
ذَرَءَ اللّٰهُ الْخَلْقَ خدا نے مخلوق کو ظاہر یعنی موجود
کیا۔ پیدا کیا۔ تو گویا اصل میں تو ذریہ مہموز اللام
ہے مگر کثرتِ استعمال کی وجہ سے ہمزہ متروک ہو گیا
جیسا کہ دَوِيَّةٌ اور بَرِيَّةٌ میں ہوا ہے۔ دوسرا
قول یہ ہے کہ اس کی ذُرِّوِيَّة اصل ہے۔
فُعْلِيَّةٌ کے وزن پر۔ اور یہ ذَرٌّ سے مشتق ہے
جیسے قُرِّيَّة قر سے مشتق ہے۔ بعض کے
نزدیک ذَرَيْتُ الْحِنْطَةَ سے ماخوذ ہے۔
جس کے معنی گندم کو ہوا میں صاف کرنے کے لیے
اڑانا ہیں۔

يَحْيٰى ۔ قدیم صحائف میں ان کا نام یوحنا ہے
حضرت مسیح سے عمر میں تقریباً چھ ماہ بڑے ۳۰ء
میں والی شام ہیرود کے حکم سے شہید ہوئے۔
صاحب قرطبی نے ایک قول تین سال بڑے ہونے
کا بھی نقل کیا ہے۔ وکان یحیٰی اکبر من عیسٰی
بثلاث سنین (قرطبی)

سَيِّدًا ۔ یعنی دین کے بارے میں مقتدا
اور پیشوا، ہادی، سردار۔ سید کا معنی ایک
بڑی قوم کا رئیس اور سردار بننے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے

سیّد القوم، قوم کا سردار۔
سیّد الثوب، یا سیّد الفرس نہیں بولا جاتا
چونکہ سیّد القوم شریف النفس اور مہذب
و با اخلاق ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ایسے شخص کو بھی
سیّد کہتے ہیں جو پاکیزہ اخلاق، فاضل النفس ہو۔
یہاں سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا میں لفظ سیّد انہی معنوں
پر محمول ہے۔ اَلْفَیَا سَیِّدَھَا لَدَی الْبَابِ
یہاں خاوند کو سیّد کہا گیا ہے، چونکہ وہ بیوی
کا نگران اور کفیل ہوتا ہے۔
السیّد: الذی یسود قومه وینتهی
الی قوله۔ صاحب قرطبی فرماتے ہیں کہ اس
آیت سے انسان کا سیّد نام رکھنے کا جواز
معلوم ہوتا ہے۔ ففیه دلالة علی جواز
تسمیة الانسان سَیِّدًا۔ (قرطبی)

حَصُوْرًا۔ یہ حصر سے فَعُوْلٌ کے وزن
پر ہے۔ جس کے لغوی معنی اپنے آپ کو گھیرے
رکھنے والا ہیں۔ یہیں سے اس کا استعمال اس
شخص کے لیے ہوا جو لذّاتِ دنیا سے منقطع اور
اپنے آپ کو کامل ضبط میں رکھنے والا ہو۔ جناب
یحییٰ کی زندگی حضرت مسیح کی طرح بالکل درویشانہ
تھی۔ حصور، حصر سے مشتق ہے جس کے
معنی تنگ کرنے اور گھیرنے کے ہیں۔ قرآن میں
وَاحْصُرُوْهُمْ۔ انھیں گھیر لو۔ حصیر کے
معنی روکنے والا کے ہیں۔ جیل اور قید خانہ
کو بھی حصیر کہتے ہیں، چونکہ وہ بھی مجرموں کو روکتے
اور تنگ کرتے ہیں وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ
حَصِيْرًا ہم نے دوزخ کو کافروں کا قید خانہ
بنایا ہے۔ حصیر چٹائی کو بھی اس لیے کہتے ہیں کہ
اس کے ریشے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط
ہوتے ہیں۔
یہاں حَصُوْر سے مراد عورتوں سے رغبت
نہ رکھنے والا ہیں۔ اپنی عفت اور پاک دامنی
کی وجہ سے عورتوں کی طرف ان کو کوئی میلان
نہ ہوگا۔ چنانچہ جناب یحییٰ کی شادی نہیں تھی۔
والحصور الذی لا یأتی النساء (قرطبی)
اصله من الحصر وهو الحبس ایضًا

عَاقِر۔ قرآن میں ہے: فَعَقَرُوْهَا۔ انہوں نے
اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ پھر اسی سے مرد
اور مرد اور عورت کو بھی کہا گیا جن کی قوتِ
تولید ختم ہو چکی ہو۔ رجلٌ عاقرٌ اور امرأةٌ
عَاقِر۔ بانجھ مرد اور بانجھ عورت۔
وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ کا مطلب یہ ہے کہ میری بیوی
بانجھ ہو چکی ہے۔ یعنی ظاہری اسباب تو ولادت
کے لیے نہیں۔ تو اپنی قدرت سے ہی بچہ عطا کریگا
عقار۔ شراب کو بھی کہتے ہیں۔ چونکہ وہ انسان
کی عقل کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے

رَمْزًا۔ رمز کے معنی ہیں اشارہ کرنا۔ عام ہے کہ اشارہ ہاتھ سے ہو یا ہونٹ اور بھویں وغیرہ سے۔ اگرچہ لغۃً رمز شفتین کے ساتھ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ الرمز فی اللغۃ: الایماء بالشفتین وقد یستعمل فی الایماء بالحاجبین والعین والیدین۔ (قرطبی)

الْاِبْكَار۔ طلوع فجر سے دن چڑھنے تک کا وقت اِبکار ہے۔ الابکار من طلوع الفجر الی وقت الضحٰی (قرطبی)

اور اَبْكَارٌ: بکر کی جمع ہے بمعنی کنواریاں۔

اَلْبُكْرَة۔ دن کا پہلا حصہ۔

اَقْلَام۔ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ جب وہ لوگ اپنے قلم ڈال رہے تھے۔

قَلَمَ يَقْلِمُ قَلْمًا۔ کاٹنا۔ تراشنا۔ اَلْقَلَمُ لکھنے کا آلہ۔ اور جب تک قلم تراشا نہ جائے اس کو قَصَبَۃٌ اور یَرَاعَۃٌ کہتے ہیں اور تراشنے کے بعد قلم کہتے ہیں۔ اور تراشتے اور قلم بناتے وقت جو تراشے وغیرہ گرتے ہیں ان کو قُلَامَۃٌ کہتے ہیں۔

اَلْقَلْمُ بسکون اللام مصدر ہے جس کے معنی کسی سخت چیز کو کاٹنے اور تراشنے کے ہیں۔ اور تراشیدہ چیز کو قلم کہتے ہیں۔ اور بمعنی مفعول ہوتا ہے۔ جیسے نِقْضٌ بمعنی منقوضٌ ہے تو قَلَمٌ بمعنی مَقْلُوْمٌ ہوگا یعنی تراشا ہوا اس کی جمع اقلام آتی ہے۔ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَام اقلام قرعہ اندازی کے تیروں کو بھی کہتے ہیں اور یہاں اقلام سے مراد بعض مفسرین نے وہ تیر ہی لئے ہیں۔ (قرطبی۔ راغب)

يَخْتَصِمُوْنَ۔ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ۔ اور آپ اس وقت اُن کے پاس نہ تھے جب وہ باہم ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔

يَخْتَصِمُوْنَ۔ یہ اختصام سے ہے (افتعال) ایک دوسرے کے ساتھ کسی تنازعہ میں اختلاف کرنا۔ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ میرے سامنے مت لڑو۔ وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ۔ اور وہ آپس میں جھگڑیں گے۔ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ۔ علانیہ جھگڑالو۔ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ بلکہ وہ قوم ہی جھگڑالو ہے۔

وَجِيْهًا۔ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ دنیا و آخرت دونوں میں معزز و شریف۔ یہ جملہ یہودیوں کی تردید میں ہے، کہ جن کی تم توہین کرتے ہو وہ دونوں جہانوں میں صاحب عزت و شریف ہے۔

وَجِيْهًا یہ وِجْهٌ سے ماخوذ ہے۔ اور

وَجْهٌ چہرے کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ استقبال
کے وقت سب سے پہلے انسان کا چہرہ آتا
ہے۔ اس لئے ہر چیز کے ابتدائی حصّہ کو
وَجْه کہتے ہیں۔ وجہ النہار کا مطلب ہے،
دن کا ابتدائی حصہ۔ پھر چونکہ چہرہ سب سے
اشرف اور باعظمت ہوتا ہے۔ اس لئے اس
کا اطلاق شرافت وعظمت پر بھی ہوتا ہے۔
اور وَجِيه وہ آدمی جو قوم میں شریف
اور باوقار ہو۔ جس کے معنی مرتبہ اور منصب
کے ہیں۔ وَجْهٌ اور جاہ دونوں میں فرق
یہ ہے کہ وَجْه چہرے اور مرتبہ دونوں
پر بولا جاتا ہے لیکن جاہ صرف مرتبہ کے لئے
بولا جاتا ہے۔ ذُوجَاهٍ: صاحب وجاہت
و مرتبہ

الْمَهْد - الْمَهْدُ گہوارہ۔ يُكَلِّمُ
النَّاسَ فِي الْمَهْدِ کا مطلب ہے کہ وہ زمانۂ
طفلی میں کلام کرے گا۔ مَهْد اُس بستر کو
کہا جاتا ہے جو بچے کو سُلانے کے لئے
تیار کیا جاتا ہے
كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا
أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا

كَهْلًا - اس سے مراد پختہ عمر ہے۔
کھل کا زمانہ بچپن سے بڑھاپے تک کا ہے۔
بعض اہل تفسیر نے نقل کیا ہے تیس سال سے پچاس
سال تک کا زمانہ کھل کہلاتا ہے۔ الكَهْلُ
بين حال الغلومة وحال الشيخوخة (قرطبی)
كَهَلَ يَكْهَلُ كُهُولًا وكَهُلَ يَكْهُلُ كُهُولَةً
ادھیڑ عمر کا ہونا۔

بَشَرٌ - آدمی۔ انسان۔ بَشَرَةٌ کے معنی
انسان کی اوپر کی سطح والی جلد ہیں اور جلد کے
اندرونی حصّہ کو اُدَمَةٌ کہتے ہیں۔ بَشَرَةٌ کی جمع
بَشَرٌ اور اَبْشَارٌ آتی ہے۔ لفظ بشر واحد
اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اس کا تثنیہ
بَشَرَيْن ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:
أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا۔

الطِّين - طین وہ مٹی جس میں پانی ملا کر
تیار کیا گیا ہو جیسے گارا وغیرہ۔ طِنْتُهُ كَذَا
وَطَيَّنْتُهُ کے معنی ہیں دیوار وغیرہ کو گارے
سے لیپنا۔ مِنْ طِينٍ لَازِبٍ۔ چپکنے والی مٹی

هَيْئَة - کسی چیز کی حالت کو کہتے ہیں۔ چاہے
حالت شئ محسوسہ ہو یا غیر محسوسہ معقولہ لیکن
عموماً یہ لفظ حالت محسوسہ یعنی ظاہری شکل وصورت
پر بولا جاتا ہے۔ إِنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ
الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ میں ظاہری شکل مراد
ہے۔ هَيَّأَ کے معنی اسباب مہیا کرنے کے
ہیں۔ قرآن پاک میں ہے وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ

أَمْرِنَا رَشَدًا ۔
هَاءَ يَهِيئُ هَيْأَةً وَهَيُوءَ يَهُوءُ
هَيَاءَةً خوش شکل ہونا ۔ هَاءَ يَهَاءُ
هَيْأَةً ۔ هَاءَ إِلَيْهِ کسی کا مشتاق ہونا ۔
مُهَايَأَةٌ موافقت کرنا ۔ تَهَيَّأَ لِلْأَمْرِ
تیار ہونا، آمادہ اور مستعد ہونا ۔ هَاءَ لَهُ
اُس کے لئے وہ آمادہ ہوگیا ۔ اس کی صورت
بنا دی ۔

طَيْرًا ۔ طَارَ يَطِيرُ طَيْرًا وَطَيَرَانًا
وَطَيْرُورَةً ۔ پرندے کا فضا میں حرکت کرنا ۔
اُڑنا ۔ طَائِرٌ: فاعل پرندہ ۔ جمع طُيُور و
اَطْيَارٌ ۔ طَيَّرَ ۔ اُڑانا و اَطَارَ وَطَيَّرَ الْمَالَ
مال تقسیم کرنا اور تَطَيَّرَ کے معنی پرندے سے فال
لینے کے ہوتے ہیں ۔ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ ۔ طَيْرٌ
طائر کی جمع ہے ۔ جیسے راکب کی جمع رَكْبٌ ہے ۔
قرآن پاک میں ہے وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ
وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً ۔ إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ
ہم تم سے بدفالی لیتے ہیں، یعنی تم کو نامبارک
سمجھتے ہیں ۔

انسان کے اعمال کو بھی طائر کہا جاتا ہے
اس لئے کہ اعمال صادر ہونے کے بعد انسان کی
قدرت سے نکل جاتے ہیں، گویا اُڑ جاتے ہیں
چنانچہ ارشاد ہے وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ
طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۔ انسان کے اعمال کو
اس کے گلے میں لٹکا دیا جائے گا ۔ اور لفظ طیر
مذکر اور مؤنث دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے
(کما قال القرطبی)

أَنْفُخُ ۔ یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے ۔
نَفَخَ يَنْفُخُ نَفْخًا ۔ کسی چیز میں منہ سے پھونک
مارنا ۔ نَفَخَ الضُّحَى ۔ دن کا چڑھنا ۔ نَفَخَتِ
الرِّيحُ ہوا کا اچانک چلنا ۔ انتفاخ ۔ پھولنا
تکبر کرنا ۔ النَّفْخُ مصدر ہے بمعنی پھونکنا
يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ ۔ صور کی پھونک ۔
وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۔ نَفَخَ الرُّوحَ کے معنی
ہیں دنیا میں کسی میں روح پھونکنا ۔ وَنَفَخْتُ
فِيهِ مِنْ رُوحِي ۔
نُفَاخ: ورم، پھیلاؤ ۔ النُّفَّاخَةُ پانی کا بلبلہ
النَّفِيخُ مصدر ۔ وہ آدمی جس کو آگ پھونکنے پر
مقرر کیا گیا ہو ۔

اَلْأَكْمَهَ ۔ اکمہ اس آدمی کو کہتے ہیں جو
پیدائشی نابینا ہو ۔ الاکمہ الذی یولد
اعمٰی (قرطبی) از ابن عباس وابوعبیدہ ۔
مجاھد کا قول یہ ہے کہ اکمہ وہ شخص ہے جس کو
دن کو دکھتا ہو مگر رات کو نہ دیکھتا ہو ۔
کبھی کَمَهٌ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جس
کی بینائی بعد میں چلی گئی ہو ۔ جیسا کہ ایک شعر میں

اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔
كَمَهَتْ عَيْنَاهُ حَتّٰى ابْيَضَّتَا۔ اس کی دونوں آنکھیں بے نور ہو کر سفید ہو گئیں۔
كَمِهَ يَكْمَهُ كَمْهًا۔ اندھا ہونا

الْاَبْرَصَ ۔ الاَبْرَص۔ برص کا مریض جس سے انسان کی جلد سفید ہو جاتی ہے۔
هو بياضٌ يَعْتَرِى الجلد۔ گویا یہ ایک جلدی بیماری ہے۔

تَدَّخِرُوْنَ ۔ مستقبل کے لئے ذخیرہ اندوزی کرنا۔ بابِ افتعال سے ہے۔ اس کی اصل اِذْتِخَارٌ ہے۔ تا اور ذال دونوں کو دال بنا کر ادغام کیا گیا ہے۔ مجاھد اور زہری نے اس کی اصل کا لحاظ رکھتے ہوئے مَاتَذْخَرُوْنَ پڑھا ہے۔ اِدِّخَارٌ : ذخیرہ کرنا

اَحَسَّ ۔ حَسَّ يَحِسُّ حَسًّا۔ حَسَّ وَ اَحَسَّ دونوں قریب المعنی ہیں۔ محسوس کرنا، معلوم کرنا۔ کہا جاتا ہے : اَحَسَّ وَحَسَّ مِنْهُ خَبَرًا اس سے خبر معلوم کی۔
الحَاسَّة : وہ قوّت ہے جس سے عوارضِ حِسّیہ کا ادراک ہوتا ہے۔ اس کی جمع حَوَاسّ آتی ہے۔ اور حَسَّ يَحُسُّ جب (ن) سے آتا ہے تو اس کے معنی قتل کرنے کے ہوتے ہیں۔
الحَسِيْس اور الحِسُّ : حرکت اور آہٹ وغیرہ کو بھی کہتے ہیں۔ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا۔ یعنی ان کی آہٹ بھی نہیں سُنیں گے۔ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ۔ یعنی جب جناب عیسٰی نے اُن میں ارادۂ قتل اور نافرمانی کو محسوس کیا۔ جانا۔ جب اُن کو مخالفوں کے ارادوں کا علم ہوا۔ یہاں اَحَسَّ عَلِمَ کے معنی میں ہے
فَلَمَّا عَلِمَ (کشاف)
وَاَحَسَّ معناه عَلِمَ وَوَجَدَ۔
وَالْاِحْسَاسُ : العلم بالشئ،
قال تعالٰى : هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ اَحَدٍ
والحِسُّ : القتل۔ قال الله تعالى :
اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ۔
وقال ابو عبيدة معنى اَحَسَّ : عَرَفَ
واصل ذٰلك وجود الشئ بالحاسّة
(قرطبی)

الْحَوَارِىُّ ۔ یہ حَوْرًا سے ماخوذ ہے۔
حَارَ يَحُوْرُ حَوْرًا واپس ہونا، پلٹنا کپڑے کو دھو کر صاف کرنا۔ یہ پلٹنا، چاہے بلحاظ ذات کے ہو چاہے بلحاظ فکر و نظر کے
اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ۔ اس کا خیال یہ تھا کہ وہ خدا کی طرف پھر کر نہیں آئے گا۔ یہاں مر کر دوبارہ زندہ ہونا مراد ہے۔
حَارَ الماءُ فِى الحَوْضِ۔ پانی کا حوض میں گھومنا

اور حَارَ فِیْ اَمْرِہٖ معاملہ میں متحیر ہونا۔
حَوَّرْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کو گھمانا اور سفید کرنا۔
حواری کے لفظی معنی کپڑے کو دھو کر صاف کرنے والے
کے ہیں۔ واصل الحور فی اللغۃ : البیاض۔ و
حَوَّرْتُ الثیاب بیضتُ (قرطبی)
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی رفقا چونکہ
عموماً دریا کے کنارے کام والے ماہی گیر تھے۔ اس لیے
آپ کے بعد بھی رفیقوں شاگردوں کا یہی لقب پڑ گیا۔
مَکَرُوْا : وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ
اُنہوں نے بھی خفیہ تدبیر کی اور خدا نے بھی خفیہ
تدبیر کی۔ لفظ مکر عربی زبان میں لطیف اور خفیہ تدبیر
کو کہتے ہیں۔ اگر وہ اچھے مقصد کے لیے ہو تو اچھا
ہے اور برائی کے لیے ہو تو برا ہے۔ اردو زبان کے
محاورات میں مکر صرف سازش اور بری تدبیر اور
حیلہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے عربی محاورات
پر شبہ نہ کیا جائے۔ اسی لیے یہاں خدا کو خَیْرُ
الْمَاکِرِیْن کہا گیا ہے۔ (معارف القرآن)
علمائے تفسیر نے مکر کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک
محمود اور دوسری مذموم۔ مکر کے معنی اصل میں حیلہ
کے ساتھ کسی کو اس کے مقصد سے پھیر دینا ہے
پھر یہ حیلہ اگر امرِ خیر کی خاطر ہے تو اس کو محمود کہا
جائے گا۔ جیسا وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ چونکہ
ذاتِ خداوندی کے تمام افعال خیر ہیں۔ اور اگر

یہ حیلہ کسی امرِ قبیح کے لئے ہو تو مکر برا ہوگا۔ جیساکہ
حکم ہے وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ
اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والوں پر پڑتا ہے
وَمَکَرُوْا مَکْرًا وَّمَکَرْنَا مَکْرًا۔ مَکَرُوْا سے مکرِ
مذموم اور مَکَرْنَا سے مکرِ محمود مراد ہے۔
اس کی اصل مَکَرَ یَمْکُرُ مَکْرًا باب نَصَرَ سے ہے
حیلہ کرنا۔ فریب دینا۔ واصل المکر فی اللغۃ :
الاحتیال والخداع۔ (قرطبی)
المَکْرُ : صَرْفُ الغَیْرِ عَمَّا یَقْصُدُہٗ بِحِیْلَۃٍ (راغب)
مُتَوَفِّیْکَ : متوفی۔ اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی
اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ۔ جس وقت کہا اللہ
نے اے عیسیٰ میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھا لوں گا اپنی
طرف۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)
لفظ متوفّی کا مصدر توفّی ہے اور مادہ وَفٰی
ہے۔ اس کے معنی عربی لغت میں پورا پورا لینے کے ہیں
وفاء ایفاء۔ استیفاء اسی معنی کے لیے بولے
جاتے ہیں۔ توفّی کے بھی اصل معنی پورا پورا لینے
کے ہیں۔ تمام کتب لغت عربی زبان کی اس پر شاہد
ہیں۔ اور چونکہ موت کے وقت انسان اپنی اجل
مقدر پوری کر لیتا ہے اور خدا کی دی ہوئی روح
پوری لے لی جاتی ہے۔ اس کی مناسبت سے یہ
لفظ بطور کنایہ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا
ہے۔ اور موت کا ایک ہلکا سا نمونہ روزانہ انسان

کی نیند ہے۔ اس کے لیے بھی قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی اُن کو نیند کے وقت۔

حافظ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح (ص ۲۰۳) میں فرمایا ہے کہ التوفی فی لغۃ العرب معناھا القبض والاستیفاء وذلک ثلثۃ انواع احدھا التوفی فی النوم والثانی توفی الموت والثالث توفی الروح والبدن جمیعًا اور کلیات ابوالبقاء میں ہے، التوفی: الاماتۃ والقبض وعلیہ استعمال العامۃ، او الاستیفاء واخذ الحق وعلیہ استعمال البلغاء۔ اسی لیے آیت مذکورہ میں لفظ متوفی کا ترجمہ اکثر حضرات نے پورا لینے سے کیا ہے۔ جیسا کہ ترجمہ شیخ الہند میں مذکور ہے۔ اس ترجمہ کے لحاظ سے مطلب واضح ہے کہ ہم آپ کو یہودیوں کے ہاتھ میں نہ چھوڑیں گے بلکہ خود آپ کو لے لیں گے۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ اپنی طرف آسمان پر چڑھا لیں گے۔

(معارف القرآن از مفتی محمد شفیع)

مطلب: مطلب یہ ہوا کہ توفی کے اصل معنی تو استیفاء کے ہیں اور موت پر جو لفظ توفی کا اطلاق ہوتا ہے وہ بھی اس ہی وجہ سے آتا ہے کہ اس میں جان پوری لے لی جاتی ہے۔ اور اگر جان اور جسم دونوں کو پورا پورا لے لیا جائے تو بدرجۂ اولیٰ توفی ہوگی۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کی توفی ہوگی

(معارف القرآن۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ)

لغتِ عرب میں اس کا مادہ (میٹر) وَفٰی یَفِیْ وَفَاءً ہے جس کے معنی پورا کرنے کے آتے ہیں اور اس کو جب بابِ تفعّل میں لے جا کر توفّی بناتے ہیں تو اس کے معنی کسی شے کو پورا پورا لے لینا۔ کسی شئ کو سالم قبضہ میں کر لینا کے آتے ہیں تَوَفّٰی اَخَذَہٗ وَافِیًا تَامًّا. یقال تَوَفَّیْتُ مِنْ فُلَانٍ مَالِیْ عَلَیْہِ اور چونکہ موت میں بھی اسلامی عقیدہ کے مطابق روح کو پورا پورا لیا جاتا ہے اس لیے کنایہ کے طور پر کہ جس میں حقیقی معنی بحالہ محفوظ رہا کرتے ہیں تَوَفّٰی بمعنی موت مستعمل ہوتا ہے اور کہتے ہیں تَوَفَّاہُ اللّٰہُ ای اَمَاتَہٗ۔ لیکن اگر موقع پہ دوسرے دلائل ایسے موجود ہوں جن کے پیش نظر تَوَفّی کے حقیقی معنی لیے جا سکتے ہوں یا حقیقی کے ماسوا دوسرے معنی بن ہی نہ سکتے ہوں تو اس مقام پر خواہ فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول ذی روح انسان ہی کیوں نہ ہو وہاں حقیقی معنی پورا لینا ہی مراد ہوں گے۔ مثلاً آیت اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا۔ اللہ پورا لے

لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو جن کی موت ابھی نہیں آئی ہے پورا لے لیتا ہے نیند میں وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ کے لیے بھی لفظ توفی بولا گیا ہے۔ یعنی ایک جانب یہ صراحت کی جارہی ہے کہ یہ وہ جانیں ہیں جن کو موت نہیں آئی اور دوسری جانب یہ بھی بصراحت کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیند کی حالت میں ان کے ساتھ توفی کا معاملہ کرتا ہے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ فاعل ہے یعنی مُتَوَفِّیْ اور نفسِ انسانی مفعول ہے یعنی مُتَوَفّٰی۔ مگر پھر بھی کسی صورت میں توفی بمعنی موت صحیح نہیں ہیں۔ ورنہ تو قرآن کا جملہ وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ العیاذ باللہ مہمل ہو کر رہ جائے گا۔

(قصص القرآن جلد ۴ ص ۱۱۳)

وَقَالَ الزمخشری مُتَوَفِّيْكَ ای مُسْتَوْفِیْ أَجَلَكَ معناه إِنِّي عَاصِمُكَ مِنْ أَنْ يقتلك الكفّار ومُؤَخِّرُكَ إِلَى أَجَلٍ كتبتُه لَكَ. و مُمِيْتُكَ حَتْفَ أَنْفِكَ لَا قَتِيلاً بِأَيْدِيْهِم (کشاف)

صاحبِ کشاف کے اس بیان سے اتنی بات تو بہرحال ظاہر ہے کہ جناب مسیح کو یہودیوں نے نہ قتل کیا اور نہ ہی اُن کے ہاتھوں ان کی موت ہوئی بلکہ خدا نے جناب مسیح کے ساتھ طبعی موت کا وعدہ کیا ہے جس کا پورا لازمی ہے

نَبْتَهِلْ ۔ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۔ پھر ہم خدا کے سامنے خشوع کے ساتھ التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔

نَبْتَهِل : بَهَلَ يَبْهَل بَهْلاً سے مشتق ہے۔ اس کے اصل معنی صاحبِ مفردات کی تحقیقات کے مطابق یہ ہیں کہ اصل البهل : کون الشئ غیر مراعی کسی چیز کا اس حال میں ہونا کہ اُس کی دیکھ بھال نہ کی جائے۔ الباهل اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پائے بند کیے بغیر چھوڑ دیا گیا ہو۔ ایک عورت کا مقولہ ہے کہ أَتَيْتُكَ بَاهِلاً غَيْرَ ذَاتِ صِرَارٍ یعنی میں تمہیں پوری آزادی دیتی ہوں کہ جس طرح چاہو لطف اندوزی کرو۔ اور ابتہال فی الدعاء کے معنی ہوتے ہیں عاجزی کرنا۔ دعا نہایت ہی انکساری سے کرنا۔

جن حضرات نے ابتہال کے معنی لعنت کرنے سے کیے ہیں وہ اس لیے کہ یہاں وقوع ابتہال لعنت ہی کے لیے ہونا تھا۔ علامہ قرطبی نے ابن عباسؓ سے ابتہال کے معنی تضرع فی الدعاء کے نقل کیے ہیں۔ ای نتضرع فی الدعاء۔ عن ابن عباسؓ ابو عبیدہ اور کسائی سے لعنت کے معنی منقول ہیں واصل الابتهال الاجتهاد فی الدّعاء باللعن وغیرہ اور بَهَلٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو مقدار میں بہت تھوڑا ہو اور ضرورت پوری نہ کر سکتا ہو بَهَلَهُ اللّٰهُ ای لَعَنَهُ۔ بَهْلَةٌ اور بُهْلَةٌ بفتح الباء وضمها دونوں کے معنی لعنت کے آتے ہیں لیکن اس کے معنی بہل کے اعتبار سے کسی چیز کو بے اعتنا سمجھ کر چھوڑ دینے کے ہیں۔

اَبْهَلَهٗ اذا اَهْمَلَهٗ ۔ وناقۃٌ باھِلٌ : لا
صِرَارَ عَلَيْهَا ۔ واصل الابتهال ھٰذا ۔
ثُمَّ اسْتُعْمِلَ فِي كُلِّ دُعَاءٍ يُجْتَهَدُ فِيْهِ
وان لم يَكُنِ التفاتاً ۔ (کشاف)
ابتہال کے معنی دعا اور تضرع کے ہیں لیکن اس
کے اندر ترک کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اس وجہ
سے یہ ایک دوسرے پر لعنت کی بد دعا کے لیے
معروف ہے ۔ (تدبر قرآن)

دُمْتَ ۔ مَا دُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا ۔
جب تک آپ اس کے سر پر کھڑے رہیں۔ اس کی
اصل دَوَامٌ ہے جس کے معنی ٹھہر جانے اور سکون
کے ہیں۔ کہا جاتا ہے دَامَ الْمَاءُ پانی ٹھہر گیا۔
حدیث میں ہے اَلْمَاءُ الدَّائِمُ میں بول و
براز نہ کیا جائے یعنی رُکا ہوا اور بند تالاب
وغیرہ میں پیشاب نہ کیا جائے ۔ دَامَ شَيْءٌ کا
محاورہ ہے۔ وہ چیز جو زیادہ عرصہ تک رہ سکے
اور خراب نہ ہو۔ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا
مَا دُمْتُ فِيْهِمْ ۔ یعنی جب تک میں ان میں
ٹھہرا رہا ان کی خبر رکھتا تھا۔ دَوَّمَتِ الشَّمْسُ
فِي كَبِدِ السَّمَاءِ سورج وسط آسمان میں ٹھہر گیا
ایک شعر ہے

وَالشَّمْسُ حَيْرٰى لَهَا فِي الْجَوِّ تَدْوِيْمٌ

سورج حیران و پریشان ہو کر فضا میں ٹھہرا ہوا
ہے الدِّيْمَةُ وہ بارش جو لگاتار رہے۔
(اللسان)

دَامَ يَدُوْمُ دَوْمًا وَدَوَامًا وَدَيْمُوْمَةً
ثَبَتَ وَامْتَدَّ وَاسْتَمَرَّ (منجد)
وَكُلُّ شَيْءٍ سَكَنَ فَقَدْ دَامَ ۔ دَامَ الشَّيْءُ
سکن (لسان)

يَلْوُوْنَ ۔ يَلْوُوْنَ اَلْسِنَتَهُمْ سے مراد یہ
ہے کہ وہ تحریف بالکتب کا ارتکاب کرتے ہیں۔
معنوی تحریف بھی کرتے ہیں اور لفظی بھی۔ اگرچہ لفظ
يَلْوُوْنَ سے یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ معنوی تحریف
کرتے تھے۔ مگر چونکہ دونوں طرح کی تحریف ثابت
شدہ امر ہے۔ اس لیے آیت کا مصداق دونوں
اقسام ہیں۔ لَوٰى يَلْوِيْ لَيًّا کے معنی ہیں موڑنا،
بانٹنا۔ لَوَى الْحَبْلَ ۔ رسی بانٹنا۔ لَوٰى يَدَهٗ
اس کے ہاتھ کو موڑا۔ لَوٰى رَأْسَهٗ سر پھیر لیا۔
قرآن میں ہے لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وہ سر مارتے
ہیں۔ محاورہ ہے لَوٰى لِسَانَهٗ بِكَذَا ۔ جب کوئی
جھوٹ بولے یا اٹکل پچو کی باتیں بنائے۔ اِذْ تُصْعِدُوْنَ
وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ جب تم دور بھاگے جاتے
تھے اور پیچھے پھر کر کسی کو دیکھتے تک نہیں تھے۔
اَللِّوَاءُ : جھنڈا۔ کیونکہ وہ بھی ہوا میں ادھر اُدھر
پھرتا رہتا ہے۔ لَوَيْتُ الْحَبْلَ اَلْوِيْهِ لَيًّا
فَتَلْتُهٗ (لسان) واصل اللّي : الميل ۔
لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ ۔ ای عناداً عن الحق وميلاً
عنه (قرطبی) يَلْوُوْنَ ، لَيٌّ مصدر سے
جمع مذکر مضارع غائب کا صیغہ ہے۔ وہ گھماتے
ہیں پھراتے ہیں

تَدْرُسُوْنَ ۔ دَرَسَ یَدْرُسُ دِرَاسَۃً پڑھانا۔ دَرَسُوْا انہوں نے پڑھا
دَرَسَ یَدْرُسُ دُرُوْسًا نشان مٹنا۔ صفت دارس۔ جمع دوارس۔ دَارِسَ الدَّارُ: گھر کے نشان باقی رہ گئے۔ اور کسی چیز کے نشان کا باقی رہنا فی ذاتہٖ اس بات کو چاہتا ہے کہ چیز کی اصل مٹ چکی ہے۔ اس لیے دُرُوْس کے معنی مٹ جانے کے بھی کر لیے جاتے ہیں۔ دَرَسْتُ الْکِتَابَ والعلم کے معنی ہیں کہ میں نے کتاب کو حفظ کر کے اس کا اثر لے لیا۔ اور اثر کا حاصل ہونا چونکہ بار بار پڑھنے سے ہوتا ہے، اس لیے درستُ الکتاب کے معنی مسلسل پڑھنے کے بھی آتے ہیں (مظہری ص ۶۹ ج ۲)
درسوا ما فی الکتاب: انہوں نے کتاب میں جو کچھ ہے پڑھا بھی ہے اور بعض اہل تفسیر نے اس کے معنی یہ بھی کیے ہیں کہ انہوں نے کتاب پر عمل ترک کر دیا۔

مِیْثَاق ۔ میثاق کے معنی پختہ عہد و پیمان کے ہیں جو قسموں کے ذریعہ مؤکد کیا جائے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالےٰ نے انبیاء سے عہد لیا۔

اَلْبِرّ ۔ لفظ بِرٌّ کے لفظی اور حقیقی معنی ہیں کسی شخص کے حق کی پوری ادائیگی اور اس سے کامل سبکدوشی۔ اور احسان اور حسنِ سلوک کے معنی میں بھی آتا ہے۔ بَرٌّ بالفتح اور بَارٌّ۔ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو اپنے ذمہ عائد ہونے والے حقوق کو پوری طرح ادا کر دے۔
قرآن کریم میں بَرًّا بِوَالِدَتِیْ اور بَرًّا بِوَالِدَیْهِ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اُن حضرات کے لیے یہ استعمال ہوا ہے جو اپنے والدین کے حقوق کو مکمل طور پر ادا کرنے والے تھے۔
مادّہ بَرٌّ، میں وسعت، فراخی اور کشادگی کا مفہوم بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ بَحْرٌ کے مقابل استعمال ہوا ہے، جیساکہ ارشاد ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ اور معنی وسعت کے اعتبار سے۔ بِرٌّ بکسر الباء کے معنی ہوں وسیع پیمانہ پر نیک سلوک کرنا اور بَرٌّ بالفتح خوب نیکی کرنے والا۔ خدا اور رسول کا کامل مطیع۔
اسی لفظ بَرٌّ بالفتح کی جمع اَبْرَارٌ ہے جو قرآن میں بکثرت استعمال ہوئی ہے۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا[1]۔ اور دوسری جگہ ہے اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ[2]
بَرٌّ کا مقابل اور ضد فُجُوْرٌ ہے (حاصل از معارف)
وقال الراغب: البِرُّ الصدق والطاعة۔ بَرَّ یَبَرُّ اِذَا صَلَحَ بَرَّ فِیْ یَمِیْنِهٖ۔ یَبَرُّ اِذَا صدقه ولم یحنث بَرَّ رَحِمَهٗ اِذَا وَصَلَهٗ

وُضِعَ ۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ۔ سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا، بنایا گیا وہ وہ ہے جو مکہ میں ہے۔
الوَضْعُ: کے اصل معنی ہیں نیچے رکھ دینا۔ وَاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ۔ اور آبخورے ترتیب سے رکھے ہوئے۔ موضع جگہ، مکان۔ جمع مواضع

[1] الانسان [2] الانفطار

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهٖ ۔ وَضْعٌ کا لفظ
وضع حمل اور بوجھ اُتارنے کے معنی میں آتا ہے۔
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ اور وَضعُ المکان
کے معنی مکان بنانے کے آتے ہیں۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ
وُّضِعَ لِلنَّاسِ میں یہی مراد ہے۔

بَکَّۃ مکّہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ عربی قبائل
میں سے بعض قبائل کی زبان کے مطابق ہے عرب
لوگ عام طور پر میم کو باء سے بدل کر پڑھتے ہیں۔
جیسے کہ لازم اور لازب اور راتم اور راتب
میں۔ صاحب کشاف فرماتے ہیں ھِیَ عَلَمٌ لِلبَلَدِ
الحَرَامِ۔ ومکّۃ وبکّۃ لغتان فیہ (کشاف)
علامہ قرطبی نے نقل کیا ہے کہ بکّہ خاص موضع البیت
اور مکّہ پورے شہر کو کہتے ہیں اور محمد بن شہاب
کا قول یہ ہے۔ بکّہ مسجد الحرام اور مکّہ پوری حدودِ
حرم کو کہا جاتا ہے۔ اور مجاھد کا قول یہ ہے کہ مکّہ
اور بکّہ ایک ہی چیز ہے۔ اور بَکَّۃ : بَکٌّ سے
مشتق ہے جس کے معنی ازدحام کے ہیں۔
کہتے ہیں تَبَاكَّ الْقَوْمُ اِذَا اجْتَمَعُوْا
چونکہ ایام حج میں لوگوں کا ازدحام ہوتا ہے۔
اس لیے اس کا نام بکّہ ہوگیا۔ وسُمِّیَتْ بَکَّۃ
لازدحامِ النَّاسِ فِی مَوْضِعِ طوافِهِمْ۔
بکّہ کے معنی گردن توڑنے کے بھی آتے ہیں۔
عبداللہ بن زبیر کا قول ہے کہ جب بھی کسی جابر بادشاہ
نے بیت اللہ کی تخریب کا قصد کیا خدا نے اُس کی
گردن توڑی ہے اور اپنے گھر کی حفاظت کی ہے

مَکَّۃ۔ یہ وہ خوش نصیب شہر ہے جو آخر الانبیاء
کا مولد اور وطن ہے اور اہل اسلام کا مقدس
ترین مرکز ہے۔ یہ مَکٌّ سے بنا ہے جس کے
معنی ہیں چوسنا، ہلاک کرنا اور کھٹانا۔ تَمَکُّکٌ
اور اِمْتِکَاكٌ کے معنی ہیں سب چوس لینا اور
اصرار کرنا۔ حدیث میں آتا ہے لَا تَمَکَّکُوْا عَلٰی
غُرَمَائِکُمْ اپنے مقروضوں سے سخت تقاضا مت
کرو۔ کہتے ہیں مَکَّ الفَصِیلُ مَا فِی ضَرْعِ النَّاقَۃ
بچے نے اونٹنی کا سب دودھ چوس لیا۔ بعض اہل علم
کی رائے یہ ہے کہ مکّہ بھی اسی سے ماخوذ ہے
چونکہ مکّہ اپنے دشمنوں کو چوس لیتا ہے یعنی ہلاک
کردیتا ہے۔ وقیل سُمِّیَتْ بذلك لِاَنَّها
تَمُكُّ مَنْ ظَلَمَ فِیهَا (قرطبی ۔ راغب)

وَاعْتَصِمُوْا۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا۔
اور اللہ کی رسّی سب مل کر تھامے رہو۔
اِعْتَصِمُوْا یہ اعتصام سے ہے جس کے معنی ہیں
کسی چیز کو پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا۔ اس کی اصل
عَصْمٌ ہے۔ جس کے معنی روکنے کے ہیں۔
لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ۔ آج خدا کے
عذاب سے کوئی روکنے والا نہیں۔ بعض نے یہاں
لَاعَاصِمَ کے معنی معصوم کے لیے ہیں۔ یعنی آج خدا
کے عذاب سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اس سے یہ
نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ عربی زبان میں عاصم بمعنی
معصوم آجاتا ہے۔ بلکہ یہاں بتانا یہ مقصود ہے
عاصم اور معصوم لازم اور ملزوم ہیں۔ ایک کا

حصول دوسرے کے حصول کو مستلزم ہے۔ اس لیے لفظ
عاصم بول کر معصوم مراد لیا گیا ہے وَمَنْ یَّعْتَصِمْ
بِاللّٰہِ۔ جس نے خدا کی ہدایت کی رسّی کو مضبوط پکڑ لیا۔
وَلَا تُمْسِکُوْا بِعِصَمِ الْکَوَافِرِ میں عِصَمٌ جمع
ہے اور اس کی واحد عِصْمَۃٌ ہے اور عِصْمَۃٌ
کے معنی عقد نکاح ہوتے ہیں۔ تو آیت کے معنی یہ ہونگے
کہ جو عورتیں مسلمان نہیں ہونا چاہتیں انھیں مت
روکو بلکہ ان کو طلاق دے کر عقد نکاح سے آزاد
کر دو۔ عِصمۃ الانبیاء کے معنی انبیاء کی حفاظت
کے ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے خدا کی حفاظت میں
ہوتے ہیں اور رذائل سے بالکل محفوظ۔ گناہ کا صدور
نبی کی ذات سے نہیں ہوتا۔ العِصْمَۃُ اَلْمَنْعَۃُ (قرطبی)
اَعْتَصَمَ بِہٖ وَاعْتَصَمَ مضبوط پکڑنا۔ لازم
ہونا۔ اعتصام کے معنی کسی شی کو مضبوطی سے پکڑنے
اور تھامنے کے ہیں۔ اعتصام باللہ کے معنی اللہ
کے احکام و ہدایات اور اس کی کتاب پر مضبوطی سے
نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں مخالفت موافقت
سے بے نیاز ہو کر قائم رہنا۔ (تدبر)
اَلْعِصْمَۃُ : المنع۔ و العاصم : المانع
الحامی۔ و الاعتصام : الامتناع بالشئ
افتعال من العِصْمَۃ۔ (اللسان)

اَصْبَحْتُمْ ۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖۤ اِخْوَانًا
سو تم اس کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔
یہاں اَصْبَحْتُمْ بمعنی صِرْتُمْ ہے۔ اور
قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی اَصْبَحْتُمْ آیا ہے
وہ صِرْتُمْ کے معنی میں ہے و معنی اَصْبَحْتُمْ
بِنِعْمَتِہٖۤ اِخْوَانًا ای صِرْتُمْ بِنِعْمَۃِ الاسلام
اخوانًا فی الدین۔ و کل ما فی القرآن
اَصْبَحْتُمْ مَعْنَاہُ صِرْتُمْ۔ اِنْ اَصْبَحَ
مَآؤُکُمْ غَوْرًا ای صار غائرًا (قرطبی)

اِخْوَان یہ اَخٌ کی جمع ہے بمعنی بھائی۔
اخوان سے مراد مذہبی رشتہ داری ہے۔

شَفَا: کنارہ۔ ہر چیز کا آخری حصہ، کونہ۔
و شَفَا کل شیٔ حَرْفُہٗ (قرطبی)
یہ شَفْوٌ سے ماخوذ ہے۔ شفا کنوئیں کے کنارے
کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ کنوئیں کا کنارہ ہلاکت کے
قریب ہوتا ہے۔ اس لیے شفا ھلاکت کے معنی
میں بھی بولا جاتا ہے عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ
گر جانے والی کھائی کے کنارہ پر اور شَفَا حُفْرَۃٍ
مِّنَ النَّارِ آگ کا کنارہ۔ مراد دوزخ ہے۔
اَشْفٰی فُلَانٌ عَلَی الْھَلَاکِ فلاں ہلاکت کے
قریب پہنچ گیا وَمَا بَقِیَ مِنْہُ اِلَّا شَفَا
مطلب یہ ہے کہ چیز تھوڑی ہی رہ گئی ہے۔
و اشفی علی الشئ : اَشْرَفَ عَلَیْہِ۔
عام طور پر یہ لفظ چاند یا سورج کے غروب کیلئے
بولتے ہیں مَا بَقِیَ مِنْہُ اِلَّا شَفَا یعنی

سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔
والاصل فی شفا شفوٌ۔ (قرطبی)
اس کی تثنیہ شفوان اور جمع اَشفاء ہے (راغب)

حُفْرَةٍ ۔ الحفر وہ مٹی جو گڑھے میں سے نکالی جاتی ہے۔ یہ اسم مفعول کے معنی میں ہے جیسے کہ نقض بمعنی منقوض۔ الحُفْرَةُ اور الحفیرۃ گڑھا جس سے مٹی نکالی جائے اور المِحفار۔ المحفر اور المِحْفَرَةُ بیلچہ وغیرہ۔ مٹی نکالنے کا آلہ۔ تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سُم کو بھی حافر کہتے ہیں۔ چونکہ وہ بھی اپنی تیزیٔ رفتار کی وجہ سے گرد وغبار اُڑاتا ہے۔

اَنْقَذَ ۔ اَنْقَذَكُمْ۔ تم کو بچا لیا۔
الاِنقاذُ۔ کسی خطرہ یا ہلاکت سے خلاصی دینا۔
فرسٌ نَقِيذٌ۔ دشمن سے چھینا ہوا گھوڑا گویا وہ اُس سے بچایا گیا ہے۔ جمع نَقَائِذ۔ نَقِذَ يَنْقِذُ نَقَذًا۔ نجات پانا نَقَذًا لَكَ تو محفوظ رہے۔ النَّقَذُ۔ سلامتی۔

تَبْيَضُّ ۔ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ۔ چہرے کی سفید (منور) ہوں گے۔ بیاضٌ۔ سفیدی۔ یہ سَوَادٌ کی ضد ہے۔ ابیضَّ اِبیضاضًا و بَیَاضًا فھو مُبْیَضٌّ۔ سفید ہونا۔ اہل عرب کے ہاں سفید رنگ چونکہ سب سے بہتر خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ عزّ و شرف کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اَبْيَضُ الوُجُوه۔ اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو عام عیوب سے پاک ہو۔ اور فضل و کرم کا مالک ہو۔ اس اعتبار سے اِبْيَاضُ الوجوہ سے مراد مسرّت و فرحت اور اِسْوِداد الوجوہ سے مراد غم ہوگا۔
اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا۔ یعنی جب ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ہے، تو اس کا چہرہ غم سے سیاہ ہو جاتا ہے۔ بیاض الوجوہ یہ خوشی سے کنایہ ہوتا ہے اور اسوداد الوجوہ غم سے۔
بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ۔ رنگ کی سفید اور پینے والوں کی لذت۔ انڈے کو سفید ہونے کی وجہ سے بیضہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع بَیْضٌ آتی ہے۔ انڈا چونکہ پرندے کے نیچے محفوظ رہنے کی وجہ سے صاف ستھرا رہتا ہے اس اعتبار سے بیضہ بول کر خوبصورت عورت مراد لیتے ہیں اور بیضۃ البلد یہ کلمہ تعریف اور ذم دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ بیضۃ البلد سے مراد حاکم شہر اور صدر مقام وغیرہ مراد ہوتا ہے (لسان)

تَسْوَدُّ ۔ تَسْوَدُّ وُجُوهٌ۔ کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔ السَّوَادُ یہ بیاض کی ضد ہے بمعنی سیاہ ہونا۔ مراد یہ ہے کہ غمناک ہوں گے سواد العین۔ آنکھ کی سیاہ دیھری۔ اور جماعت

کو بھی سَوَاد کہتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ۔ یعنی تم مسلمانوں کی بڑی جماعت کے ساتھ رہنا۔ اسی سے سَیِّد ہے۔ بڑی جماعت کا سردار۔ رَئِیْسُ القوم قوم کا معزز فرد۔

یُوَلُّوْکُمْ۔ یُوَلُّوْکُمُ الْاَدْبَارَ۔ پُشت پھیر جائیں گے، میدان چھوڑ جائیں گے

اَدْبَار: یہ دَبْرٌ اور دُبُرٌ کی جمع ہے۔ اس کی ضد قُبُلٌ ہے۔ دُبُر ہر چیز کا آخری اور پچھلا حصّہ۔ کنایۃً یہ دونوں لفظ دُبُر اور قُبُل مقامِ بول و براز پر بولے جاتے ہیں۔ وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ جو شخص جنگ کے روز پیٹھ پھیرے گا، بھاگے گا۔ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ۔ جنگ میں پیٹھ مت پھیرو۔

وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ۔ یعنی نماز کے بعد اَدبار سے مراد نماز کا آخری حصّہ ہے۔ اور اَدْبَارَ النُّجُوْمِ۔ اس میں ایک قراءت اِدْبَارَ النُّجُوْم ہے۔ اس صورت میں یہ مصدر بمعنی ظرف ہوگا۔ یعنی ستاروں کے ڈوبنے کا وقت۔ اَدْبَرَ فُلَانٌ فلاں نے پیٹھ پھیر دی وَاللَّیْلِ اِذَا اَدْبَرَ رات کا مڑنا رات پیٹھ پھیرنے لگی۔ یعنی صبح ہونے لگی۔

دَبَرَ السَّهْمُ الْهَدَفَ۔ تیر نشان سے ہٹ کر گرا۔ دابر جڑ کے معنوں میں آتا ہے جیسا کہ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا[1] اِنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِیْنَ[2]

اَدْبَرَ: اعراض کرنا، پُشت پھیرنا۔ فخر سے مُڑنا۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔ (المدّثر)

التَّدبیر۔ تَدَابَرَ القَوم۔ باہم اختلاف کر کے قطع تعلق کر لینا۔

التَّدْبِیْر۔ تفصیل سے کسی معاملہ میں غور کرنا اس کے انجام پر نظر رکھ کر سوچنا۔ تدبّر کرنا۔ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۔ دنیا کے تمام کاموں کا انتظام کرنے والے فرشتے۔

تَدَبَّرَ الْاَمْرَ۔ کسی امر کے نتائج پر غور کرنا۔ الدُّبُرُ وَالدُّبْرُ بفتح الباء وکسرها۔ ہر چیز کا پچھلا حصّہ۔ جمع اَدْبَار۔

حَبْل۔ حَبْلٍ مِّنَ اللهِ۔ حَبْلٌ کے معنی رسّی کے ہیں۔ یعنی اللہ کی رسّی۔ اس سے مراد عہدِ الٰہی ہے۔ وہ یہ کہ جو کمزور یا بیمار، عورتیں یا بچے ہوں اُن کو قتل نہیں کیا جائے گا حَبْلٍ مِّنَ اللهِ۔ یعنی الذمّة التی لهم (قرطبی) فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ۔ حبل مَسَد کھجور کی رسّی۔ رگیں اور نصیں بھی چونکہ رسّی سے ملتی جلتی ہیں، اس لئے شہ رگ کو بھی حَبْلُ الْوَرِیْد

[1] الانعام [2] الحجر ۶۶۔

کہا گیا ہے۔ حَبْلُ الرَّمْل۔ ریت کا ٹیلہ۔ رسّی
سے چونکہ دو چیزوں کو ملایا بھی جاتا ہے۔ اس لئے
ہر چیز کو بھی حبل کہدیتے ہیں جو دوسری چیز
کے ساتھ ملانے کا سبب اور ذریعہ ہو۔

الحِبَالَة : شکاری کا پھندا۔ جال۔ حدیث
میں ہے النِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّیَاطِین۔ عورتیں شیطان
کے جال ہیں۔ حبائل۔ حبالۃ کی جمع ہے

اٰنَآء ۔ اٰنَآءَ اللَّیْلِ سے مرادرات کے
اوقات۔ یہ ظرفیت کی بنا پر یہاں منصوب ہے
اس کی واحد اِنْیٌ اَنًی د اِنیٌ ہے (قرطبی)
اَنٰی یَاْنِیْ وقت کا قریب آنا۔ اَنی الشیءُ۔ اس کا
وقت قریب آگیا۔ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا۔ کیا ابھی مومنوں کا وقت نہیں آیا۔
اَنَی الْحَمِیْمُ۔ پانی حرارت میں انتہا کو پہنچ گیا۔
یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ اللَّیْلِ۔ وہ رات
کو خدا کی آیات پڑھتے ہیں۔ اَلْاَنَاۃُ۔ حلم، وقار،
طمانیت۔ اَنٰی یَاْنِیْ اَنْیًا و اِنًی وَ اِنَاءً
قریب ہونا۔ اَنَی النَّبَاتُ۔ نبات پک گیا۔
و اَنِیَ یَاْنیٰ اِنًی دیر کرنا۔ پیچھے رہنا۔
الاَنَاء۔ برتن، جمع اٰنِیَۃٌ۔ جمع الجمع اَوَانٍ
(راغب - منجد)

صِرٌّ ۔ سخت سردی اور ٹھنڈی چیز
کو کہتے ہیں جیسے پالا یا برف وغیرہ۔

اَلصِّرُّ : البَرْدُ الشدید (قرطبی)
قال اکثر المفسرین واھل اللغۃ الصِّرّ
الصِّرُّ البرد الشدید۔ (ماجدی بحوالہ کبیر)
اس کی اصل صَرٌّ ہے۔ جس کے معنی باندھنے کے
ہیں۔ صَرَّ یَصُرُّ صَرًّا۔ باندھنا۔ اور صُرَّۃٌ
وہ تھیلی جو اونٹنی کو باندھی جاتی ہے تاکہ بچہ
دودھ نہ پی جائے۔ اور صُرَّۃ اس تھیلی کو بھی کہتے
ہیں جس میں نقدی باندھ کر رکھ دی جاتی ہے۔
اور پستان بند کو صِرَار کہتے ہیں۔ اَلْاِصْرَارُ
بھی اسی سے ہے۔ کسی کام پر سختی سے جم جانا۔
اور یہ قرآن پاک میں گناہ کے کام پر جم جانے کے
معنوں میں آیا ہے۔ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا
فَعَلُوْہُ۔ وہ اپنی غلطی پر جم نہیں جاتے۔ ثُمَّ
یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا۔ یعنی پھر غرور سے ضد کرتا
ہے۔ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَکْبَرُوْا۔ اپنے کفر پر اڑ
گئے اور تکبر کیا۔ وَکَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَی
الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ۔ اور وہ گناہ عظیم پر جمے
بیٹھے تھے۔ اور الاِصْرَار اس عزم وارادہ
کو بھی کہتے ہیں جو پختہ اور مضبوط ہو۔
محاورۃً کہا جاتا ہے۔ ھٰذَا مِنِّیْ صِرِّیْ
یعنی میں نے اس کا پختہ عزم کر لیا ہے۔

اَلصَّرُوْرَۃُ : وہ مرد یا عورت جس نے حج
نہ کیا ہو۔

صَرْصَرٌ ۔ صَرْصَرٌ اور صرصر۔ صِرٌّ سے ہے جس کے معنی سخت ٹھنڈک کے ہیں ۔
رِيحًا صَرْصَرًا ۔ سخت تیز اور ٹھنڈی ہوا۔
اس آیتِ کریمہ میں اکثر اہل تفسیر نے صِرٌّ سے مراد بَرْدٌ شَدِيدٌ ہی لی ہے
الصِرُّ : الرّيح البارِدة (کشاف)
لیکن بعض مفسرین نے صِرٌّ کی تفسیر حَرٌّ شَدِيدٌ سے بھی کی ہے ۔ یعنی صِرٌّ کے معنی سخت گرم شئی کے ہیں ۔ وَالصِرُّ: قيل الحَرُّ الشديدُ المُحْرِقُ ۔ وقيل الصِرُّ بمعنى الصَّرْصَر وهوالشئ البارد (الجمل)
صَرَّ يَصِرُّ صَرًّا وَصَرِيرًا ۔ جب ضَرَبَ سے آتا ہے تو اس کے معنی چوں چوں کرنے اور چلانے کے آتے ہیں ۔ صَرِيرُ الباب دروازہ کا چوں چوں کرنا ۔ صَرَّ الرَّجُلُ ۔ زور سے چلاّنا ۔ فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ یعنی (ابراہیم علیہ السلام) کی بیوی چلاتی ہوئی آئی ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں صَرَّةٍ کے معنی چیخنے کے ہیں ۔ اور صَرْصَر وہ آواز جو شکرے کے پَروں سے نکلتی ہے ۔

بِطَانَةً ۔ لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ ۔ اپنوں کے سوا کسی کو بھیدی نہ بناؤ ۔ بِطَانَة کے معنی دلی دوست، رازدار اور بھیدی ۔ کپڑے کا باطنی اَستر جو جسم سے ملا رہے وہ بھی بطانہ کہلاتا ہے ۔ یہ بطنٌ سے مشتق ہے ۔ بطن کا استعمال ہر شئے میں ظَہر کے خلاف ہوتا ہے ۔ اوپر کی جانب کو ظَہر اور اندر کی جانب کو بطن بولتے ہیں اور کپڑے کے اوپر کے حصّہ کو ظِہارہ اور اندرونی اور نیچے کے حصّہ کو جو جسم سے ملا رہے جیسے اَستر وغیرہ کو بطانہ کہتے ہیں ۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں کہ وہ اس کا اوڑھنا بچھونا ہے یعنی وہ اس کو نہایت مرغوب و محبوب ہے ۔ اسی طرح بطانہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ عربی لغت کی مشہور و معتبر کتاب لسان العرب میں بطانہ کے معنی اسی طرح کے لئے ہیں ۔
بطانة الرجل صاحبُ سِرّہٖ وَ داخِلة امرہ الذی یشاورہ فی احوالہ ۔ یعنی بطانۃ الرجل کسی شخص کے دلی اور رازدار دوست اور اس کے معاملات میں دخیل کو کہا جاتا ہے جس سے وہ اپنے معاملات میں مشورہ لے ۔ اصفہانی نے مفردات القرآن اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں بھی یہی معنی بیان کئے ہیں ۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ بطانہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو رازدار، وَلی اور دوست سمجھا جائے ۔ اس کو اپنے معاملات میں معتمد اور

مشیر بنایا جائے (معارف القرآن از مفتی اعظم)
بطانة الرجل وَلِيجَتُهٗ : خَصِيصُهٗ
وصفيه الذی یُفضی الیہ بشقورہ (کشاف)
شُقُور شین کے پیش کے ساتھ ہے۔ اس سے
مراد اُمورِ مہمّہ ہیں۔ و بطانة الرجل خاصّته
الذین یستبطنون اَمْرَهٗ (قرطبی) وتستعار
البطانة لمن تختصه بالاطلاع علی
باطن امرك۔ اَبْطَنَهٗ : اس نے اس کو اپنا
بھیدی بنا لیا (لسان)

یَأْلُوْنَكُمْ ۔ یَأْلُوْنَ یہ جمع کا صیغہ ہے
جس کے معنی کوتاہی اور کام میں تقصیر کرنے
کے ہیں۔ اَلَا یَأْلُو۔ اَلْوًا و اُلُوًّا۔ و اُلِيًّا
اسی باب سے باب افتعال اِئْتَلٰی آتا ہے
کہا جاتا ہے اِئْتَلٰی فی الْاَمْرِ۔ کام میں کوتاہی
کرنا۔ دیر لگانا۔ اَلَوتُ فُلَانًا کے معنی
اَوْلَيْتُهٗ تَقْصِيْرًا ۔ میں نے اس کو کوتاہی کا
والی بنا دیا جیسے۔ کَسَبْتُهٗ ای اَوْلَيْتُهٗ
کَسْبًا۔ میں نے اس کو کسب کا والی بنادیا۔
ما الوتُهٗ جُهْدًا۔ میں نے مقدور بھر اس سے
کوتاہی نہیں کی لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا کے معنی
یہ ہوں گے کہ وہ لوگ اپنے مقدور بھر کوشش
کرتے ہیں کہ تمہیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع
ہاتھ سے نہ جانے۔

اَلَا فِی الْاَمْرِ یَأْلُوا اِذَا قَصَّرَ فِيْهِ
(کشاف) واَلَوْتُ فِی الْاَمْرِ قَصَّرْتُ فِيْهِ
(راغب) لَا یُقَصِّرُوْنَ فیما فِيْهِ الفَسَادُ
علیکم (قرطبی)
ای لَا یُقَصِّرُوْنَ لَکُمْ فِی الفَسَادِ (جلالین)
اَلًّا و اِلًّا و اَلٰی نعمت۔ فضل، مہربانی۔
جمع آلَاءٌ۔ قرآن میں ہے : فَاذْکُرُوْا
اٰلَآءَ اللّٰهِ۔ خدا کی نعمتوں کو یاد کرو۔ یہ ایسے
ہی ہے جیسے کہ اٰنَاءٌ کا واحد اَنًا و اِنًا آتا ہے
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۔

خَبَالًا ۔ الخبال سے مراد خَبَلٌ ہے
جس کے معنی فساد کے ہیں۔ اکثر اہل تفسیر نے
یہ ہی معنی بیان کئے ہیں۔ الخبال۔ الخَبْلُ
والخَبَلُ۔ الفسادُ (قرطبی۔ کشاف)
دراصل خبال۔ خَبَلٌ۔ خَبْلٌ اس مرض کو
کہتے ہیں جو جانوروں کو لگتی ہے اور ان میں
اضطراب اور فساد پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے
جنون وغیرہ امراض۔ علامہ قرطبی فرماتے
ہیں کہ الخبال یہ وہ مرض ہے جو افعال ابدان
اور عقل و فکر سب میں لاحق ہوتا ہے۔
وقد یکون ذلك فی الافعال والابدان
والعقول (قرطبی) حدیث میں ہے :
من اصیب بدمٍ او خَبْلٍ ای جرحٍ یُفسِدُ

العَضُوَ۔ اور خَبَلٌ عام طور پر فسادِ اعضاء پر بولا جاتا ہے۔ خَبِلَهٗ وَخَبَّلَهٗ ای اَفْسَدَهٗ خَبَلَهُ الحُبُّ : اس کو محبت نے اندھا کر دیا۔

عَنِتُّمْ۔ یہ عَنِتَ یَعْنَتُ عَنَتًا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مشکل۔ مشقت۔ ہلاکت۔ عَنِتَ فُلَانٌ اُس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی ایسے مشکل کام میں پھنس جائے جس میں تلفِ جان کا خطرہ ہو۔ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۔ ای ذلّت وخضعت۔ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ جو تم میں سے ھلاکت سے ڈرتا ہو۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ میں مَا مصدریہ ہے مطلب یہ ہوگا کہ وَدُّوا عنتکم۔ تمہاری ہلاکت کو یہ پسند کرتے ہیں۔

وَالعَنَتُ : المشقة (قرطبی) مُعَانَتَهٗ اور مُعَانَدَةٌ کے معنی ہیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ عناد اور کینہ سے کام لینا۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ کے معنی ہیں کہ وہ شی جو تمہیں مشکلات میں ڈال دے، آپ پر گراں ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)

عَضُّوْا۔ عَضَّ یَعُضُّ عَضًّا و عَضِیْضًا یہ بَا اور عَلٰی کے صلہ کے ساتھ عموماً آتا ہے۔ دانت سے پکڑنا۔ کاٹنا۔ دانت پیسنا اور جس چیز کو دانت سے کاٹا جائے اُس کو العِضَاضُ کہتے ہیں۔ اور العِضُّ بد خُلق بخیل، بہت قوی۔ جمع عُضُوضٌ۔ اور اَلْعِضَاضُ : جانوروں کے آپس میں دانتوں سے کاٹنے کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْعُضُّ۔ کھجور کی گھٹلی۔ خاردار جھاڑی جسے اونٹ کھاتے ہیں۔ وَالعَضُّ : اَلشَّدُّ بِالاَسْنَانِ عَلَى الشَّيءِ۔ حدیث میں ہے عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ اس کو ڈاڑھوں سے تھام لو۔ یعنی لازم کر لو۔ یہ ایک مثال ہے کسی چیز کو سختی سے پکڑنے پر بولا جاتا ہے۔ عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ۔ تم پر غصّے کی شدت کی بناء پر اپنی انگلیاں کاٹ کھاتے ہیں۔ رَجُلٌ مُعِضٌّ اپنے کام میں ہوشیار آدمی گویا اس نے کام کو دانتوں سے پکڑ لیا۔ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ۔ ندامت کی وجہ سے ہاتھوں کو کاٹے گا۔

اَلعَضُّ : اَزْمٌ بِالاَسْنَانِ (راغب)
وَالعَضُّ : عبارة عن شِدَّةِ الغَيْظِ مَعَ عَدَمِ القُدْرَةِ عَلَى اِنْفَاذِهٖ (قرطبی)

ابو طالب کا ایک شعر ہے کہ جس کا ایک مصرع صاحب قرطبی نے نقل کیا ہے۔ ع

يَعُضُّوْنَ غَيْظًا خَلْفَنَا بِالاَنَامِلِ[1]

[1] وہ ہمارے بعد غصّے سے انگلیاں کاٹتے ہیں

الْاَنَامِلَ۔ یہ جمع ہے۔ اس کی واحد
اَنْمُلَةٌ آتی ہے۔ میم کے پیش کے ساتھ۔
اگرچہ بعض نے فتح کے ساتھ بھی صحیح کہا ہے
اس سے مراد انگلیوں کے پورے ہیں یعنی
اطراف الاصابع (قرطبی)

الْغَيْظَ۔ غَاظَ يَغِيظُ غَيْظًا۔ غصہ
سخت غضبناک ہونا۔ الغیظ اُس حالت کا
نام ہے جو انسان اپنے دل کے دوران
خون کے تیز ہونے پر محسوس کرتا ہے۔
قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ۔ آپ کہدیں کہ بدبختو
تم اپنے غصے میں مرجاؤ۔ غَاظَهٗ۔ کسی کو غصہ
دلانا۔ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔
وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ۔ اور اگر غیظ کی نسبت
اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو معنی انتقام لینے کے
ہوتے ہیں۔ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَائِظُوْنَ۔ وہ
ہمیں غصہ دلا رہے ہیں۔ یعنی وہ مخالفانہ حرکتوں
کی وجہ سے ہمیں انتقام پر آمادہ کر رہے ہیں
الغَيْظُ اَشَدُّ غَضَبٍ وهو الحرارة التی
يجدها الانسان من فوران دم قلبه (راغب)

الصُّدُوْرِ۔ صَدَرَ يَصْدُرُ وَيَصْدِرُ
صَدْرًا وَمَصْدَرًا واپس پھرنا۔ کسی طرف
رُخ کرنا۔ صَدَرَ عَنِ الْمَكَانِ کے معنی واپس
لوٹنا۔ پھرنا اور صَدَرَ اِلَى الْمَكَانِ کے معنی
کسی جگہ کی طرف جانا۔ اور صُدُوْرٌ کے معنی ہیں
حادث ہونا۔ نکلنا۔ ظاہر ہونا اور سینہ پر مارنا
تصدیر (تفعیل) اور اصدار (افعال) دونوں
کے معنی ہوتے ہیں۔ لوٹانا۔ واپس کرنا۔ صَدَرٌ
یہ اسم مصدر ہے بمعنی رجوع کرنا۔ اسی سے
طوافِ صدر ہے یعنی وہ طواف جو مکہ سے لوٹتے
وقت کیا جاتا ہے جس کو طواف الوداع بھی کہتے
ہیں۔ صَدْرٌ دراصل ہر چیز کے سامنے والے
اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے یہ لفظ سینہ
پر بھی بولا جاتا ہے۔ چونکہ سینہ انسان کے سامنے
والا اوپر کا حصہ ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ سینہ
کے لئے متعدد بار بولا گیا ہے۔
رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ۔ وَحُصِّلَ مَا فِي
الصُّدُوْرِ۔ لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ
تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔ یہ
صَدْرٌ کی جمع ہے۔ اسی طرح وَشِفَاءٌ لِّمَا
فِي الصُّدُوْرِ۔ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ
مُّؤْمِنِيْنَ۔

بعض حکماء نے قرآن پاک میں وارد شدہ دو
لفظوں قلب اور صدر میں ایک لطیف اور
علمی فرق بیان کیا ہے کہ جہاں قرآن پاک میں قلب
کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں صرف علم و عقل کی
طرف اشارہ ہے۔ جیسے کہ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

لِذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ یعنی جو شخص دل رکھتا ہے، اس کے لئے اس میں نصیحت ہے۔ اور جہاں قرآن پاک میں صُدُوْرٌ کا لفظ آیا ہے وہاں علم وعقل کے علاوہ شہوت۔ ہوائے نفس اور غضب وغیرہ قوائے نفسانیہ کی طرف بھی اشارہ کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ میں قوائے نفسانی کی اصلاح کا سوال ہے۔ اسی طرح وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ میں بتایا ہے کہ قرآن پاک نفسانی امراض کے لئے شفاء ہے۔ اور وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ میں اسی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس سے شفا حاصل صرف مومن ہی کرتے ہیں۔ (راغب)

مَصْدَرٌ: کے معنی پانی سے سیر ہو کر لوٹنا۔ یہ ظرف مکان اور ظرفِ زمان دونوں کے لیے آتا ہے۔ اور علماء نحاۃ کی اصطلاح میں مَصْدَر اس لفظ کو کہا جاتا ہے جس سے ماضی مستقبل وغیرہ کا اشتقاق فرض کیا ہو۔

غَدَوْتَ - اَلْغُدْوَةُ وَالْغَدَاةُ مِنْ اَوَّلِ النَّهَارِ (راغب) غُدْوَةٌ اور غَدَاةٌ کے معنی ہیں دن کا ابتدائی حصہ۔ غُدْوَةٌ کی جمع غُدُوٌّ آتی ہے جیسا کہ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ آصال کے مقابلہ میں غدو لایا گیا ہے۔ آصال جمع ہے۔ شام کا وقت۔ اور غُدُوٌّ مصدری معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسا کہ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ۔ غَدَاةٌ کے مقابلہ میں قرآن پاک میں لفظ عَشِیٌّ استعمال ہوا ہے جیسا کہ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِیِّ بمعنی صبح و شام۔

اَلْغَدَاءُ اس کھانے کو کہتے ہیں جو دن کے ابتدائی حصہ میں کھایا جاتا ہے۔ اَلْغُدْوَةُ جمع غُدُوٌّ وغُدًى۔ اَلْغَدْوَةُ جمع غَدَوَات اَلْغَدَاء جمع اَغْدِیَة۔

غَدَا يَغْدُوْ وغُدُوًّا۔ صبح کو چلنا۔ غَدَا بمعنی صَارَ بھی مستعمل ہے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتا ہے۔ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ۔ جب آپ صبح کے وقت اپنے گھر والوں سے نکلے۔ غزوہ اُحد کی طرف روانگی حضرت عائشہ رضی کے گھر سے ہوئی تھی۔ وَهُوَ غُدْوَةٌ اِلٰی اُحُدٍ من حُجْرَةِ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا (کشاف)

تُبَوِّئُ - تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ۔ یعنی آپ مسلمانوں کو قتال کے لئے مناسب مقامات پر جما رہے تھے۔ اس کی اصل اَلْبَوَاءُ ہے۔ کسی جگہ کے تمام اجزاء کا مساوی ہونا۔ اس کی ضد نَبْوَۃ ہے جس کے معنی ہیں اجزائے شئی کا ناہموار ہونا۔ مَكَانٌ بَوَاءٌ۔ وہ مکان و جگہ جو ٹھہرنے والے کے لئے سازگار ہو۔ بَوَّاْتُ لَهٗ مَكَانًا کے معنی ہیں۔ میں نے اس کیلئے

جگہ کو ہموار کیا اور تَبَوَّأَتُ اس کا مطاوع ہے۔ درست جگہ پر ٹھہرنا۔ وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا۔ یعنی مصر میں گھر بناؤ۔

مَقَاعِدَ ۔ مَقْعَد کی جمع ہے۔

قَعَدَ یَقْعُدُ قُعُوْدًا وَمَقْعَدًا ۔ کھڑے ہونے کی حالت میں بیٹھنا۔ قُعُوْدٌ ۔ یہ قیام کی ضد ہے یہ اضداد میں سے ہے قَعَدَ بِهٖ کھڑا کرنا، بٹھانا قَعَدَ عَنْ حَاجَتِهٖ مؤخر کرنا۔ قَعَدَ لِلْحَرْبِ جنگی آدمیوں کو لڑائی کے لئے تیار کرنا۔ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ یعنی جنگی مورچے لڑائی کے لئے۔

قَعْدَۃٌ صیغہ مَرَّۃ ہے۔ ایک مرتبہ بیٹھنا اور قِعْدَۃٌ بکسر القاف بیٹھنے کی حالت۔ القعود قاعد کی جمع بھی ہے۔

تَفْشَلَا ۔ اصل میں تَفْشَلَانِ ہے حرف اَنْ کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا ہے فَشِلٌ کمزور آدمی۔ بزدل۔ فَشِلَ الرَّجُلُ فَشَلًا فَهُوَ فَشِلٌ۔ کَسِلَ وَضَعُفَ (لسان)

فَشِلَ یَفْشَلُ فَشَلًا۔ لڑائی کے وقت بزدلی دکھا جانا۔ اور باہر نہ نکلنا۔ صفت فَشِلٌ ۔ فَشِیْل۔ جمع اَفْشَالٌ وفُشُلٌ۔ قرآن پاک میں ہے حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ۔ یہاں تک کہ تم ہمت ہار گئے اور حکم رسول میں تنازع کرنے لگے۔ فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ۔ تَفَشَّلَ الْمَاءُ۔ پانی بہہ نکلنا۔ اَلْمُفَشَّلُ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو دوسری قوم میں شادی کرلے۔ گویا وہ بھی نکاح کے حق میں کمزوری کر گیا۔ (لسان)

مُسَوِّمِیْنَ۔ یہاں یہ لفظ مَلٰٓئِکَۃ کی صفت واقع ہوا ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ امتیازی علامت کے ساتھ ممتاز ہوں گے یہ کونسی امتیازی علامت تھی اس میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ اُن فرشتوں کے عمامے سبز رنگ کے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ فرشتوں نے سفید پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے بعض کی پگڑیاں سبز اور بعض کی سفید ہوں

مُسَوِّمِیْنَ۔ یہ سوم سے ماخوذ ہے۔

السَّوْمُ : کے معنی ہیں کسی چیز کی طلب میں جانا تو اس کے مفہوم میں دو اجزاء ہیں۔ ایک طلب اور دوسرا جانا۔ سَامَتِ الْاِبِلُ : اونٹ طلب معاش میں چراگاہ میں نکل گئے۔ اور سَائِمَۃ اُن اونٹوں کو کہا جاتا ہے جو اپنا گزر باہر چر کر کرتے ہیں اور سُمْتُ الْاِبِلَ فِی الْمَرْعٰی ۔ میں نے اونٹ چراگاہ میں چرنے کے لئے بھیج دیئے ہیں۔ اَسَمْتُ الْاِبِلَ اور سَوَّمْتُهَا بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ جیسا کہ وَمِنْهُ

شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُوْنَ ۔ اور اس سے درخت بھی شاداب ہوتے ہیں۔ جن میں تم اپنے جانوروں کو چراتے ہو۔ سِيْمَاء اور سِيْمِيَاءُ کے معنی علامت اور نشان کے ہوتے ہیں جیسا کہ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔

مُسَوِّمِيْنَ کو دو طرح پڑھا گیا ہے۔ ایک مُسَوَّمِيْنَ بوزن مفعول کے معنی ہیں مُعَلَّمِيْنَ بِعَلَامَاتٍ یعنی اُن کی مخصوص علامتیں ہوں گی ابن عامر، حمزہ، کسائی اور نافع کی قرأت یہی ہے اور ایک قرأت مُسَوِّمِيْنَ (الصیغہ اسم فاعل) ہے۔ یعنی انہوں نے اپنے پروں یا گھوڑوں پر علامتیں بنا رکھی ہوں گی۔ تَسَوَّمُوْا فَاِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ قَدْ تَسَوَّمَتْ کہ نشان بنالو کیوں کہ فرشتوں نے بھی اپنے لئے نشان بنائے ہوئے ہیں (راغب) کشاف۔ قرطبی۔

سَامَ يَسُوْمُ سَوْمًا وَسُوَامًا۔ سَامَ السِّلْعَةَ سامان کو فروخت کرنے کے لئے پیش کرنا۔

يَقْطَعَ ۔ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تاکہ کفر کرنے والے ایک گروہ کو ہلاک کردے۔ مقصد یہ کہ ایک گروہ کو ہلاک کر کے کفر کی طاقت کو کمزور کردیا جائے قَطَعَ يَقْطَعُ قَطْعًا وَمَقْطَعًا کے معنی کاٹنا اور جدا کرنا ہیں۔ قَطَعَهٗ عَنْ حَقِّهٖ کسی کو حق سے روکنا۔ یہاں آیت کریمہ میں باجماع مفسرین قَطَعَ ہلاک کرنے کے معنی میں ہے۔ اور (ل) کا تعلق ماقبل کی آیت نَصَرَكُمُ سے ہے۔ یعنی وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ۔ لِيَقْطَعَ طَرَفًا۔ (قرطبی)

طَرَفًا ۔ طرفًا سے مراد یہاں باتفاق اہل تفسیر جماعت یا گروہ ہے۔ لِيُهْلِكَ طَرَفًا (کشاف راغب) الطرفُ : ہر چیز کی آخری حد۔ گوشہ۔ چیز کا ٹکڑا شریف آدمی (جمع اطراف)

يَكْبِتُ ۔ يَكْبِتَهُمْ : كَبَتَ يَكْبِتُ كَبْتًا کسی کو پچھاڑنا۔ ذلیل کرنا۔ كَبَتَهٗ بِوَجْهِهٖ منہ کے بل گرا دینا۔ كَبَتَ فُلَانٌ غَيْظَهٗ فِيْ جَوْفِهٖ : غصہ کو اندر ہی اندر پی جانا۔ كَبَتَ اللّٰهُ الْعَدُوَّ : خدا دشمن کو ذلیل کرے۔ الکبت کے معنی ہیں کسی کو سختی اور ذلّت کے ساتھ واپس کردینا۔

الكبت : الرَّدُّ بِعُنْفٍ وَتَذْلِيْلٍ (راغب) اَوْ يَكْبِتَهُمْ ۔ اَوْ يُخْزِيَهُمْ وَيُغِيْظَهُمْ بِالْهَزِيْمَةِ (کشاف)

كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وہ ذلیل کئے جائیں گے جیسا کہ ان سے پہلے والے ذلیل کئے گئے۔ حدیث میں ہے : اِنَّ اللّٰهَ كَبَتَ الْكَافِرَ اللہ نے کافر کو پچھاڑ دیا اپنی رحمت سے ناامید کردیا۔ فَكَبَتَتْهُ

رنجیدہ۔ غمگین اور مکبوتٌ غمگین اور رنجیدہ کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ انّ النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم جاءَ اِلیٰ ابی طلحۃ رائی ابنہٗ مَکبُوتًا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوطلحہ کے پاس تشریف لائے تو ان کے لڑکے کو غمگین پایا۔ ان کا اونٹ مرگیا تھا، جس کا ان کو رنج تھا۔ کَبَتَ کَبَدَ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جس کے معنی ہیں جگر پر مارنا۔ اس اعتبار سے بعض اہل لغت کے نزدیک یَکْبِتَھُمْ کی اصل یَکْبِدَھُمْ ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ خدا اُن کے جگر کو رنجیدہ کردے، اُن کے جگر اُلٹے کردے۔ واصلہٗ فیما ذکر بعض اھل اللغۃ یَکْبِدُھُمْ ای یُصیبُھُمْ بالحُزْن والغَیظِ فِی اَکْبَادِھِم تو گویا یَکْبِتَھُمْ میں دال کو تا سے بدلا گیا ہے (قرطبی۔ کشاف)

خَآئِبِیْنَ خابَ یَخِیبُ خَیبۃً طلب میں ناکام ہونا۔ مایوس و ناامید ہونا۔ الخائبین: المنقطع الامَل (قرطبی)

خائبین غیرظافرین بمُبْتَغَاھُمْ (کشاف)

کَاظِمِیْنَ ۔ کاظمین الغیظ: غصّہ کو ضبط کرنے والے۔ کظم کہتے ہیں غصہ کو ضبط کرجانے کو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غصہ سے مغلوب نہیں ہوتے۔

کَظَمَ یَکْظِمُ کَظْمًا: کَظَمَ البَابَ۔ دروازہ بند کرنا۔ کَظَمَ البعیرُ: اونٹ کا جگالی کرنے سے رُکنا۔ کَظَمَ الغیظَ۔ غصہ کو روکنا۔ اور کَظَمَ السِّقاء مشک کو بھر کر اس کا منہ بند کردینا۔ کِظَام وہ چیز جس سے کسی چیز کو بند کیا جائے اور الکَظْمُ مَخْرَجُ النفس کو کہتے ہیں۔ یعنی سانس کی نالی۔ جمع اکظام وکِظام آتی ہے۔ اَخَذَ بِکَظَمِہٖ اس کی سانس کی نالی کو پکڑ لیا۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کو رنجیدہ کردیا اور کَظُومٌ کے معنی سانس کے رُک جانے کے ہیں۔ یہ خاموش ہوجانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اِذْ نادٰی وَھُوَ مَکْظُومٌ اُنہوں نے خدا کو اس حالت میں پکارا کہ وہ غمگین تھے۔ کَاظِمِیْنَ الغَیْظَ غصہ کو ضبط کرنے والے۔ متحمل مزاج۔

سُنَنٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِکُمْ سُنَنٌ یقیناً تم سے پہلے (بھی) مختلف طریقے گزر چکے ہیں۔ سُنَنٌ سُنَّۃٌ کی جمع ہے۔ سیدھی راہ جس میں کوئی خم نہ ہو۔ کہتے ہیں فُلَانٌ عَلٰی سُنَّۃٍ یعنی وہ بالکل سیدھی راہ پر ہے۔ اپنی خواہش سے اِدھر اُدھر ہٹا نہیں ہے۔ عرب کا مشہور شاعر ھزلی کہتا ہے

فَلَا تَجْزَعَنْ مِنْ سُنَّۃٍ اَنْتَ سِرْتَھَا
فَاَوَّلُ رَاضٍ سُنَّۃً مَنْ یَسِیْرُھَا

سُنَّۃ، اُمّۃ کو بھی کہا جاتا ہے۔
شاعر نے کہا ہے۔
مَاعَایَنَ النَّاسُ مِنْ فَضْلٍ کَفَضْلِهِمٖ
وَلَارَأَوْا مِثْلَهُمْ فِی سَالِفِ السُّنَنِ
یہاں سالف السنن سے مراد سالف الامم ہے۔
سُنَّۃُ الوُجُوہِ۔ چہرے کی گولائی۔ اور سُنَّۃُ النبی سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طریقہ ہوتا ہے۔ جس کو آپ نے اختیار فرمایا ہو اور سُنَّۃُ اللہ سے مراد حق تعالےٰ کی حکمت اور طریقہ اطاعت ہوتا ہے۔
سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً۔
والسُّنن: جمع سُنّۃ وھی الطریق المستقیم وَالسُّنَنُ الْاُمَمُ (قرطبی۔ راغب)
سُنَنٌ جمع سُنّۃ وھی الطریقۃ والعادۃ ۔؟
سِنٌّ: دانت اس کی جمع اَسْنَان آتی ہے قرآن میں ہے۔ السِّنُّ بِالسِّنِّ۔
سِنُوْت: دانتوں کا منجن۔
یہاں سُنَن سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کے تحت وہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ ایک قوم اگر اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی تعمیل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو زمین میں عظمت دیتا ہے۔ اور ایک قوم (اللہ تعالیٰ) احکام الٰہی کی تکذیب کرتی ہے تو خدا اُس کو رُسوا کرتا ہے۔

قَرْحٌ ۔ القَرحُ الجرح (قرطبی)
قرح زخم کو کہا جاتا ہے۔ فتح اور ضمہ دونوں لغت ہیں۔ جیسا کہ عَقْر اور عُقْر
صاحب مفردات القرآن علامہ اصفہانی فرماتے ہیں کہ القَرْحُ اُس زخم کو کہتے ہیں جو کسی خارجی اثر سے پیدا ہو اور القُرح لضم القاف اُس زخم کو کہا جاتا ہے جو خود اندر سے پیدا ہو۔ مثلاً پھنسی پھوڑے کے اثر سے۔
قَرَحَ۔ فَتَحَ سے متعدی آتا ہے۔ قَرَحْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اُس کو زخمی کر دیا۔ اور قَرِحَ (سمع) سے لازم آتا ہے بمعنی زخمی ہو جانا۔ اور کبھی فتح سے لازم آتا ہے۔ جیسا کہ قَرَحَ قَلْبُہٗ۔ اس کا دل زخمی ہو گیا۔ اور کبھی قَرْحٌ کا لفظ زخم اور قُرْحٌ اس تکلیف پر بولا جاتا ہے جو زخم سے پیدا ہو وقد یقال اَلْقَرْحُ لِلْجِرَاحَۃِ وَالْقُرْحُ لِلْاَلَمِ۔ (راغب واللسان) وَاِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ سے زخم مراد ہے۔ رَجُلٌ قَرِیْحٌ۔ زخمی آدمی۔

اَیَّامٌ ۔ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ

مطلب یہ ہے کہ فتح وشکست کوئی دائمی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ آتی جاتی ہے اور حکمتِ الٰہی کا تقاضہ بھی یہ ہی ہے۔ ایام یوم کی جمع ہے۔

الایام جب جمع کی سورت میں آتا ہے تو اس سے مراد تاریخ عالم کے وہ دن ہوتے ہیں جن میں بڑے بڑے واقعات وحوادث پیش آئے ہوں۔

ایام العرب سے مراد اہل عرب کی قدیم لڑائیاں ہیں وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللهِ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں قوموں پر جو عروج وزوال کے بڑے بڑے واقعات پیش آئے ہیں اُن کے ذریعہ ان لوگوں کو خدا کی عظمت بتاؤ۔ تو : تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ کا مطلب یہ ہے کہ یہ حوادث اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اُس کے قانون آزمائش کے تحت پیش آتے ہیں۔ لہٰذا صبر وتحمل کا دامن نہ چھوڑو۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ فتح وشکست مجرد حق وباطل کا معیار نہیں ہے۔

يُمَحِّصَ ۔ يُمَحِّصَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا آیت میں یُمَحِّصَ کے معنی کسی چیز کو میل کچیل اور کھوٹ سے بالکل صاف کر دینا ہے۔ مَحَّصَ الذَّهَبَ بِالنَّارِ کے معنی ہوں گے سونے کو غل و غش اور کھوٹ سے پاک وصاف کر دیا۔ حدیث میں يُمْحَصُ النَّاسُ فِيهَا كَمَا يُمْحَصُ ذَهَبُ الْمَعْدِنِ یعنی ایک ایسا فتنہ ہوگا جس میں لوگوں کی ایسی آزمائش ہوگی جیسے کان کے سونے کی آزمائش ہوتی ہے۔ مَحَّصَ اللهُ الْعَبْدَ مِنَ الذَّنْبِ۔ اللہ بندے کو گناہ سے پاک کرے گا۔

رَبَّنَا مَحِّصْ عَنَّا ذُنُوبَنَا۔ خدایا ہم کو گناہوں سے پاک وصاف کر دے۔ تَمْحِيصٌ جانچنا۔ آزمانا۔ پاک صاف کرنا۔ نکھارنا۔

المَحْصُ کے اصل معنی کسی چیز کو کھوٹ اور عیب سے پاک کرنے کے ہیں اور یہ فَحْصٌ کے ہم معنی ہیں۔ مگر الفَحْصُ کا لفظ ایک چیز کو دوسری ایسی چیز سے الگ کرنے پر بولا جاتا ہے جو اس میں مل گئی ہو لیکن درحقیقت اس سے منفصل ہو کر۔ مگر مَحْصٌ کا لفظ ان ملی ہوئی چیزوں کو الگ کرنے کے لئے آتا ہے جو اس سے متصل اور گھل مل گئی ہو۔

اصل المحص تخليص الشئ مما فيه من عيب كالفحص لكن الفحص يقال في ابراز شئ من اثناء ما يختلط به وهو منفصل عنه والمحص يقال في ابرازه عما هو متصل به (راغب) مَحِصَ يَمْحَصُ مَحْصًا۔ مَحِصَ الحبل اذا انقطع وبره۔

التمحيص : التخليص (قرطبی)

لِيُمَحِّصَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا ای ليطهرهم من الذنوب۔ (بیضاوی)

مُحَمَّدٌ ۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) محمد نبی آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک ہے۔

جو قرآن پاک میں چار دفعہ استعمال ہوا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ[1] ۔ وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ (احزاب) وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (محمد) مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ

[1] آل عمران

بَيْنَهُمْ (الفتح) لفظی معنی ہیں وہ شخص جس کی مدح بہت بار بار کی جائے یا جو صفاتِ حسنہ کا مجموعہ ہو۔ يُقَالُ فُلَانٌ مُحَمَّدٌ اذا كَثُرَتْ خصالُه المحمُودَةُ (راغب)

اور صاحب لسان العرب فرماتے ہیں کہ وَالمحمّدُ الذی كثرت خصاله المحمودة۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اس نام کا رواج بہت کم تھا۔ علامہ ابوجعفر محمد بن حبیب البغدادی المتوفی ۲۴۵ھ نے کُل سات آدمی اس نام کے گنائے ہیں۔ اور ان میں ایک محمد بن سفیان بن مجاشع ہیں۔ ان کے بابت تو یہ کہا ہے کہ اُن کے والد نے ایک شامی راہب سے یہی سن کر کہ آئندہ پیغمبر کا نام محمد ہوگا، اپنے لڑکے کا نام محمد رکھ دیا (ماجدی)

مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمد کے معنی مجموعۂ خوبی کے ہیں۔ ع

اے کہ تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

صاحب مفردات القرآن نے تو خوب وضاحت فرمائی ہے کہ الذی اجتمعت فیه الخصال المحمُودة رجلٌ محمودٌ ومحمّدٌ اذا كثُرَتْ خِصاله المحمُودة (قرطبی)

اِذْنٌ - مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

ممکن نہیں کہ کوئی نفس حکم خدا پائے بغیر مر جائے۔

اَلْاِذْن : اجازت۔ علم۔ فَعَلَهٗ بِاِذْنِیْ اس نے یہ کام میری دانستگی میں کیا۔ اَذِنَ اِلَيْهِ بات کو کان لگا کر سُننا۔ کہا جاتا ہے حَدَّثْتُهٗ فَاَذِنَ لِیْ اَحْسَنَ الْاُذُن۔ میں نے اس سے بات کی تو اُس نے میری بات کو خوب غور سے سُنا۔ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ۔ اور وہ اپنے رب کا حکم سُنے گی اُسے واجب بھی ہے۔ اِذْنٌ کا لفظ اُس علم پر بھی بولا جاتا ہے جو سماع سے حاصل ہو۔ جیسا کہ فرمایا کہ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ۔ تو خبردار ہو جاؤ کہ خدا اور رسول سے تمہاری جنگ ہے۔ الاذن فی الشئ کے معنی ہیں یہ بتا دینا کہ کس چیز میں اجازت ہے۔ قرآن پاک میں اذن اللہ کا لفظ جب اللہ کی طرف مضاف ہو کر بولا جاتا ہے تو مراد اللہ کا حکم اور اس کا ارادہ ہوتا ہے وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ جو مصیبت تم کو دو جماعتوں کے ملنے کے دن پیش آئی وہ خدا کے حکم سے تھی۔

اسی طرح یہاں آیت ہیں وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ میں مراد یہ ہے کہ کوئی انسان خدا کی طرف سے حکم و اجازت کے بغیر دنیا سے رخصت نہیں ہو سکتا۔ ومعنی بِاِذْنِ الله : بقضاء الله وقدرته (قرطبی)

اَذِنَ بالشئ اِذنًا۔ عَلِمَ جاننا اور آذَنَ (افعال) فُلَانًا الامر او بالامر : اطلاع دینا۔ آگاہ کرنا۔ ایک قرأت میں فَاٰذِنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ ہے۔ یعنی سُود خوروں کو آگاہ کر دو کہ وہ اللہ سے جنگ کے لئے تیار ہو جائیں

ثَوَاب - ثَابَ جِسْمُهٗ ثَوْبًا ثَوَبَانًا۔

اس کا جسم بیماری کے بعد پھر اصلی حالت پر آگیا۔

ثَوَابَ الدُّنیا دنیا کا فائدہ۔ ثوب کا اصل معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آنا کے ہیں۔ یا غور و فکر کے بعد جو حالت مقدور و مقصود ہوتی ہے، اُس تک پہنچ جانے کے ہیں چنانچہ حکماء کے قول اَوَّلُ الفِکرۃِ اٰخِرُ العَمَل میں انہی معنی کی طرف اشارہ ہے یعنی آغازِ فکر انجامِ عمل بنتا ہے۔ ثَاب یثوبُ ثَوبًا وثُؤبًا لوٹنا۔ ثَابَ النَّاسُ لوگوں کا اکٹھا ہونا۔ ثَاب المَاءُ۔ پانی کا حوض میں جمع ہونا۔ اور ثَوَّبَہٗ من کذا۔ (تفعیل سے) بدلہ دینا ثَابَتْ اِلیَّ نَفْسِی۔ میری سانس میری طرف لوٹ آئی۔ کنوئیں کے منہ پر جو پانی پلانے کی جگہ بنائی جاتی ہے اس کو مَثَابَہ کہتے ہیں۔ اور غور و فکر سے حالتِ مقدرہ مقصودہ تک پہنچ جانے کے اعتبار سے کپڑے کو ثوب کہا جاتا ہے۔ کیونکہ سوت وغیرہ کاتنے سے اصل مقصود لباس ہوتا ہے۔ گویا کپڑا بن جانے کے بعد سوت اپنی حالتِ مقصودہ کی طرف لوٹ آیا۔ یہی حال ثوابِ العمل کا ہے۔ کہ عمل سے اصلی مقصود انسان کو مل جاتا ہے اگر عمل درست ہیں، تو ثواب بھی بہتر اور اگر کمزور ہیں تو ثواب بھی کمزور رہے گا۔ لغوی اعتبار سے ثواب کے لفظ کا اطلاق خیر و شر دونوں طرح کے بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ لیکن اکثر اور متعارف نیک اعمال کی جزا میں ہے۔ جیسا کہ ثَوَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللہ اور وَاللہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَاب

رِبِّیُّوْنَ

رِبِّیُّوْنَ۔ بکسر راء و تشدید باء مکسورہ وضمِ یاء۔ رب کی طرف منسوب ہے۔ جیسے رَبَّانِی معنی ہیں رب والے۔ حرفِ راء یہاں مفتوح کی بجائے مکسور خلافِ قیاس استعمال ہوا ہے۔

بعض حضرات نے رِبِّیُّوْن کا معنی بہت سی جماعتوں کے لیے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ رِبَّہ بکسرِ راء بمعنی الجماعۃ کی طرف منسوب ہے۔ رِبِّیُّوْن سے مراد علماء و فقہاء ہیں۔ جیسا کہ عبداللہ بن ابن عباس اور حسن بصری سے منقول ہے۔

(معارف۔ مفتی اعظم و قرطبی)

اَلْوَھْنُ

اَلْوَھْنُ : فَمَا وَھَنُوْا : وَھْنٌ کے معنی ضعف کے ہیں۔ عام اس سے کہ یہ ضعف عمل کا ہو یا ارادے کا۔ جسم کا ہو یا کردار و اخلاق کا۔ ایک حدیث میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ تم سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح ہو جاؤ گے۔ بادِ مخالف کا ہر جھونکا تمہیں اُڑاتا پھرے گا۔ صحابہ نے سوال کیا کہ اس کا سبب کیا ہوگا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے اندر وَھْن پیدا ہو جائے گا۔ صحابہ نے پوچھا کہ وَھْن کیا چیز ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ حُبُّ الدُّنیا وَکَرَاھِیَۃُ المَوت۔ دنیا کی محبت اور موت کا خوف۔ یعنی یہ دو سبب ہیں جو انسان میں بزدلی پیدا کرتے ہیں اور انسان کو راہِ خدا میں جہاد کرنے سے روکتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عزم و حوصلہ اور عمل و ارادہ کی پستی جو انسان کو راہِ حق سے ہٹائے وَھْن ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ چند

جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ [1] یہاں جسمانی کمزوری کا ذکر ہے۔ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ [2]۔ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا [3] یہاں عزم و ارادہ کی سستی مراد ہے کہ نہ تو بے دل ہونا اور نہ کسی کا غم کرنا۔ وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ [4] قوم کفار کا تعاقب کرنے میں بے ہمتی نہ کرنا۔ تو یہاں عزم و ارادہ مراد ہوگا

اَلْوَهْنُ: ضُعْفٌ من حَیث الخَلْق اَوِ الخُلُق (راغب) الوهن: اِنکِسَارُ الجِدِّ بالخَوفِ (قرطبی)

الواهنة: سب سے نچلی اور چھوٹی پسلی۔

الوَهْنُ مِنَ الابِلِ۔ موٹا اور پستہ قد۔

ضَعُفُوْا ۔ وَمَا ضَعُفُوْا۔ اور نہ کمزور ہوئے ضَعُفَ یا ضَعَفَ ناتوان و کمزور ہونا اور ضِعْفٌ دُگنا۔ اِضعَافٌ دُگنا کرنا کمزور کرنا یہ اَلْقُوَّةُ کے مقابلے میں آتا ہے۔

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ۔ طالب اور مطلوب دونوں کمزور ہیں۔ الحج

خلیل لغوی کا قول ہے کہ ضُعفٌ جسم کی کمزوری پر بولا جاتا ہے۔ صفت ضعیفٌ اور جمع ضِعَاف اور ضُعَفَاء آتی ہے۔ الضَّعْفُ بالفتح والضُّعفُ بالضم: خلاف القوة وقیل الضُّعفُ بالضم فی الجسد والضَّعفُ بالفتح: فی الرأی والعقل (لسان العرب)

اِسْتَكَانُوْا ۔ اسْتَكَنَ کی اصل سکون ہے کمزور اور بزدل انسان۔ اپنے مقابل کے لئے بے دست و پا ہو جاتا ہے اور دشمن جو حشر اس کا کرنا چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ و اصل اِسْتَكَنَ من السُّكُون فانّ الخاضِعَ الذلیل یسکن بصاحبِهٖ فیفعلُ بهٖ مایُرِیْد (مظہری)

یہ اسْتِكَانَةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی دب جانے اور عاجز ہو کر رُک جانے کے ہیں۔ یہاں قرآن پاک نے تین متقارب المعنی الفاظ ذکر کئے ہیں۔ وَهْنٌ۔ ضَعفٌ۔ اسْتِكَانَةٌ۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ ان تینوں میں ایک لطیف فرق یہ ہے کہ وَهْن تو قلب کی کمزوری کو کہا جاتا ہے اور ضَعف عام ہے اور استکانہ اظہار عجز کو کہتے ہیں۔ گویا یہ وَهْنٌ و ضَعفٌ کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

اَلاِسْتِكَانَةُ: الذلة والخضوع (قرطبی)

اسْتَكَانَ فُلَانٌ تَضَرَّعَ۔ (راغب)

اِسْرَافٌ: اہل تفسیر کی رائے یہ ہے کہ اسراف سے مراد یہاں گناہ کبیرہ ہیں۔ اِسْرَافَنَا یعنی الکبَائِر (قرطبی) السَّرَفُ کا معنی انسان کے کسی کام میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں مگر عام طور پر اس کا استعمال انفاق یعنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنے پر بولا جاتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا۔ خرچ کرنے میں نہ تو بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں کہ ضرورت کی جگہ پر بھی خرچ نہ ہو۔

الاسرافُ: اَلْاِفْرَاطُ فی الشئ ومجاوزة الحد (قرطبی)

الرُّعْبَ ۔ رَعَبَ يَرْعَبُ رَعْبًا وَرُعْبًا ڈرنا رَعَبَ الرَّجُلَ۔ ڈرانا۔ رَعَبَ الاِنَاءَ اَوِ الحَوضَ

[1] مریم [2] لقمان [3] آل عمران [4] النساء

برتن یا حوض کو پانی سے بھرنا۔ الرُّعْبُ کے اصل معنی خوف سے بھر کر کٹ جانے کے ہیں۔
کہا جاتا ہے: رَعَبْتُهٗ فَرَعَبَ رُعْبًا۔ میں نے اس کو خوف زدہ کیا تو وہ خوف کھا گیا۔
الرُّعْبُ الخَوْفُ (قرطبی) رُعْبٌ مصدر ہے اور رُعُبٌ اسم ہے۔
سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ کے معنی یہ ہیں سَنَمْلَاُ قُلُوْبَ الْمُشْرِكِيْنَ خَوْفًا وَفَزَعًا (قرطبی)

سُلْطَانًا : مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا مطلب یہ ہے کہ شرک کی تائید میں نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اصل السلطة القوۃ والمراد به الحجة۔ یعنی سلطنت کے اصل معنی قوت کے ہیں اور مراد اس سے دلیل ہے
سلطان: زور، قوت، حجت، سند، حکومت
تاج العروس میں ہے کہ جب سلطان کے معنی برہان وحجت کے ہوں تو اس کی جمع نہیں آتی۔ کیوں کہ اس صورت میں وہ مصدر کے قائم مقام ہوتا ہے
محمد بن یزید نے کہا ہے کہ سلیط ہے جس کے معنی زیتون کے تیل کے ہیں، اس کے روشن کرنے کی بنا پر ماخوذ ہے کیونکہ دلیل ایسی ہونی چاہئے جو روشن ہو
التسلّط اس کے معنی ہیں غلبہ حاصل کرنا۔
سَلَّطْتُهٗ فَتَسَلَّطَ میں نے مغلوب کیا تو وہ مغلوب ہو گیا۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ كہ لیکن اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ۔
اسی سے بادشاہ کو سلطان کہتے ہیں۔ اور لفظ سلطان غلبہ اور تسلط کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا۔ ۳۳/الاسراء
عرف عام میں تو عام طور پر صاحب سلطنت کو ہی سلطان کہا جاتا ہے لیکن قرآن پاک میں اس کا اطلاق دلیل وحجت پر بھی ہوتا ہے۔ بلکہ ابن عباس کا قول تو یہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی لفظ سلطان آیا ہے وہ حجت اور دلیل ہی کے معنوں میں ہے۔
جیسا کہ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ۔ خدا کی آیات میں بلا دلیل جھگڑتے ہیں۔ السَّلَاطَةُ مِنَ التَّسْلِيْطِ وَهُوَ الْقَهْرُ وَالسُّلْطَانُ مِنْ ذٰلِكَ (قرطبی)

مَثْوٰی : اس مکان کو کہا جاتا ہے جس میں بسا جائے اور مستقل قیام کیا جائے۔ یہ ثَوٰى يَثْوِيْ ثَوَاءً سے ماخوذ ہے۔ کسی جگہ ٹھہرنا۔ آباد ہونا اور مثوٰی کی جمع مثاوِ آتی ہے۔
اَثْوَاهُ فِي الْمَكَانِ: کسی کو کسی جگہ ٹھہرانا۔ قیام کرانا۔ الثَّوِيُّ مہمان خانہ۔ قیدی۔ جمع اَثْوِيَاءُ۔ اور مَاْوٰى کا لفظ جائے پناہ اور اس مکان پر بولا جاتا ہے جس کی طرف کوئی چیز لوٹ کر آئے۔ نام اس سے کہ یہ لوٹ آنا رات کو ہو یا دن کو۔
المثوٰی: المكان الذی يقام فيه۔ والماوٰی كُلُّ مَكَانٍ يَرْجِعُ اِلَيْهِ شَيْءٌ لَيْلًا كَانَ اَوْ نَهَارًا[1]

[1] قرطبی

قرآن پاک میں یہ لفظ کئی مقامات پر بولا گیا ہے۔
وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْ اَهْلِ مَدْيَنَ۔ یعنی آپ کا بسیرا اہل مدین میں نہ تھا۔ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اور اَلثَّوِيَّةُ: بھیڑ بکریوں کا باڑہ۔
اَلثَّوَاءُ: اَلْاِقَامَةُ مَعَ الْاِسْتِقْرَارِ (راغب)
الْمَثْوٰى: مَكَانُ الْاِقَامَةِ الْمُنْبِئَةِ عَنِ الْمُكْثِ (جمل)

تَحُسُّوْنَهُمْ۔ اَحَسَّ کے معنی ہیں کسی کی حس کو باطل کر دینا۔ ابو عبیدہ لغوی کا قول ہے کہ حَسٌّ کے معنی قتل کے ذریعہ کسی کا استیصال کرنے کے ہیں۔ اَلْحَسُّ: الاستیصال بالقتل (مظہری)
تَحُسُّوْنَهُمْ۔ تم ان کو قتل کر رہے تھے۔
حَسَّ يَحُسُّ کے معنی دشمن کو اس طرح قتل کرنے کے کہ اس کو بالکل پامال اور اس کا استیصال کر دیا جائے۔
صاحب کشاف نے اس کی تفسیر میں انہی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اى تَقْتُلُوْنَهُمْ قَتْلًا ذريعًا (کشاف۔ قرطبی)

فَشِلْتُمْ۔ فَشَلٌ کے معنی ڈھیلے اور سست پڑ جانے کے ہیں جس کی وجہ سے آدمی کمزور ہو جاتا ہے۔ فَشِلَ يَفْشَلُ فَهُوَ فَشِلٌ۔ کمزور اور بزدل ہو جانا۔
حَتّٰى اِذَا فَشِلْتُمْ: جَبُنْتُمْ وَضَعُفْتُمْ
(قرطبی ص ۲۳۵ ۔ مظہری ص ۱۵۲ ج ۲۔ طبع کوئٹہ)

تَنَازَعْتُمْ۔ یعنی تم آپس میں اختلاف رائے کرنے لگے۔ یہ تنازع فی الحدیث سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک بات میں ایک شخص کچھ رائے دے اور دوسرا کچھ۔ اس سے تنازع فی الامر کا مطلب یہ ہے کہ نبی نے جو حکم دیا تھا، اس کی تعمیل میں تم نے اختلاف رائے کیا۔
یہ نَزْعٌ ہے۔ جس کے معنی کسی کو اس کے اصل مقام سے کھینچنے کے ہیں۔ نَزَعَ الشَّيْءَ۔ چیز کو اپنی اصل جگہ سے کھینچ لیا۔ نَزْعٌ کا لفظ محبت یا عداوت کو دل سے نکال دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ
اور تنازع اور منازعة باہم ایک دوسرے کو کھینچنا اور مخاصمت کرنا۔
فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

عَصَيْتُمْ۔ عَصٰى عِصْيَانًا کے معنی ہیں اطاعت سے نکل جانا۔ عَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی اور وہ اپنے مقصد کو کھو بیٹھا۔ یہاں مراد ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بلا اجازت کے ہٹ جانا۔
اى خَالَفْتُمْ اَمْرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى الثُّبُوْتِ (قرطبی)
یہ صحابہ کرام کا عصیان محض اجتہادی ہے۔

تُصْعِدُوْنَ۔ یہ اِصْعَادٌ سے ہے۔ اِصْعَادٌ کے اصل معنی کسی چڑھائی کی سمت میں جانے کے ہیں۔ ایک قراءت میں تَصْعَدُوْنَ مجرد بفتح تاء ہے۔ اسی سے اَصْعَدَ فِى الْعَدْوِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی سمت میں منہ اٹھائے بھاگ کھڑے

ہونے کے ہیں۔ اِصْعَادٌ کی اصل صَعُوْدٌ ہے جس کے معنی اوپر کی جانب چڑھنے کے ہیں۔ ایک ہی چیز کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے صَعُوْدٌ اور نیچے اُترنے کے لحاظ سے حَدُوْرٌ کہتے ہیں۔

صَعُدٌ۔ صَعِیْدٌ۔ صَعُوْدٌ تینوں الفاظ ہم معنی ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ صَعُوْد اور صَعَد کا لفظ عقبہ یعنی گھاٹی پر بولا جاتا ہے۔ اور بطور استعارہ کے ہر دشوار امر پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِکْرِ رَبِّہٖ یَسْلُکْہُ عَذَابًا صَعَدًا

اور صَعِیْدٌ لفظ زمین کے بالائی حصہ پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا گرد و غبار بھی چونکہ زمین کے بالائی حصہ ہی سے اُڑتا ہے اس لئے بعض اہل علم کے نزدیک یہاں صعید سے مراد وہ گرد و غبار ہے جو اوپر چڑھتا ہے۔ لہٰذا نماز کے تیمم کے لئے ضروری ہوگا کہ تیمم میں ہاتھوں کے ساتھ گرد لگے۔

الاصعاد کے معنی تو دور تک چلے جانے کے ہیں۔ یہ دور جانا عام ہے چاہے بلندی کی طرف ہو یا پستی کی جانب۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ اَلْاِصْعَادُ: السَّیْرُ فِیْ مُسْتَوٍمِنَ الارض و بطون الاودیۃ والشِّعَاب (قرطبی)

علم نحو و لغت کے مشہور امام فَرَّاء کا قول ہے کہ اصعاد سفر شروع کرنے کے معنی میں آتا ہے اور اِنْحِدَار سفر سے واپسی پر بولا جاتا ہے۔ ایک شعر میں اصعاد کے یہ معنی مراد لئے گئے ہیں۔ ابوعبیدہ کہتا ہے

قَدْ کُنْتِ تَبْکِیْنَ عَلَی الْاِصْعَادِ
فَالْیَوْمَ سُرِّحَتْ وَصَاحَ الْحَادِی

کہتے ہیں: اَصْعَدْنَا مِنْ بَغْدَادَ اِلٰی مَکَّۃَ یعنی بغداد سے مکہ کی طرف سفر کیا۔

صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ الاِصْعَادُ: الذھاب فی الارض والابعاد فیہ (کشاف) حضرت اُبَیؓ کی قرأت بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ فِی الْوَادِیْ (کشاف)

الاصعاد: فقد قیل ھو الابعاد فی الارض سواءٌ کان ذلک فی صُعُوْدٍ اَوْحَدُوْرٍ (راغب)

تَلْوٗنَ۔ وَلَا تَلْوٗنَ۔ تم کسی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہی نہیں تھے۔ تَلْوٗنَ یہ لَوٰی یَلْوِیْ سے ماخوذ ہے۔ لَوٰی یَدَہٗ: ہاتھ موڑنا۔ اعراض کرنا۔

اَمَنَۃً۔ اَمَنَۃً نُّعَاسًا۔ راحت غنودگی اَمَنَۃ کے معنی راحت سکون اور اطمینان کے ہیں نُعَاسٌ: اونگھ اور نیند کو کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ بدلیت کے طریقہ پر اَمَنَۃً کی گویا وضاحت ہے۔ یہ راحت و سکون، اونگھ عطا کر کے دیا گیا۔

اونگھ اور نیند دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی شہادت بھی ہے۔ دل و دماغ پریشان ہو تو نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ اَمْنٌ اور اَمَنَۃٌ دونوں ہم معنی ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے ان دونوں کے لفظی فرق کی طرح معنوی فرق بھی بیان کیا ہے کہ اَمَنَۃ اُس سکون اور وقار کو کہتے ہیں جو اسباب خوف کی موجودگی میں ہو اور امن وہ

وہ ہے جو اسبابِ خوف بالکل زائل ہو جانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یہاں اَمَنَۃً سے مراد اسبابِ خوف کی موجودگی میں راحت و سکون حاصل ہونا ہے۔

(قرطبی۔ راغب)

اَهَمَّ ۔ اَهَمَّتْهُمْ ۔ یہ هَمٌّ سے مشتق ہے۔ اصل میں هَمٌّ کا معنی اُس ارادے کے ہیں، جو ابھی دل ہی میں ہو۔ ع

وَهَمُّكَ مَالَمْ تُمْضِهِ لَكَ مُنْصِبٌ

جب تک تو اپنے ارادے کو پورا نہ کرے وہ تمہیں بے چین رکھے گا۔

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا ایک قوم نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کرے۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا (یوسف) وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا اور وہ ایسی بات کا قصد کر چکے جس پر قدرت نہیں پا سکے۔ اور یہاں وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ یعنی ایک گروہ کو اپنی جان کی فکر کھائے جا رہی تھی اَهَمَّتْ ۔ اِهْمَامٌ سے واحد مونث کا صیغہ ہے فکر میں ڈال دینا۔

اَلْهَمُّ : الحزن وجمعہ هُمُوْم ۔ هَمَّ بالشئ يَهُمُّهَا ۔ نواہ واراده وعزم علیه

(لسان)

مزید وضاحت کے لئے دیکھئے سورۂ یوسف وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ کے تحت۔

اَلْمَضَاجِع ۔ مَضْجَعٌ کی جمع ہے۔ لیٹنے کی جگہ۔ ضَجَعَ يَضْجَعُ پہلو کے بل لیٹنا۔ آیت میں مضاجع سے مراد مقتل ہے۔ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ای الی مصارعهم (قرطبی)

غُزًّى ۔ یہ الغَزْوُ سے مشتق ہے جس کے معنی دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کے ارادہ سے نکلنا ہیں غَزٰى يَغْزُوْ غَزْوًا ۔ وہ دشمن سے جنگ کے ارادہ سے نکلا۔ ایسے شخص کو غازی کہتے ہیں۔ جمع غُزَاةٌ اور غُزًّى آتی ہے۔ جمع غازی کعافٍ وعُفًّى۔[1]

لِنْتَ ۔ لِنْتَ لَهُمْ ۔ آپ اُن کے حق میں نرم رہے۔ اس کی اصل لَانَ يَلِيْنُ لِيْنًا و لَيَانًا نرم ہونا ہے۔ یہ خُشُوْنَةٌ کی ضد ہے۔ جس کے معنی سختی اور کھردرا پن کے ہیں۔ اس کا اصل استعمال تو اجسام میں ہے لیکن اخلاق کے لیے بھی اس کا استعمال بطور استعارہ ہوتا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۔ میں لفظ لِنْتَ اخلاق حمیدہ کی نرمی کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی یہ خدا کی رحمت ہے کہ آپ ان کے حق میں اخلاق کے اعتبار سے بہت نرم ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ فُلَانٌ لَيِّنٌ و فُلَانٌ خَشِنٌ

فَظًّا ۔ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ ۔ تند خو سخت طبع ۔ سَيِّئُ الْخُلُقِ جَافِيًا (مظہری) فظّ کے معنی دُرشت خُو اور غلیظ القلب کے معنی سنگ دلی کے ہیں۔

اَلْفَظُّ : الغليظ الجافی ۔ الفظّ کی جمع اَفْظَاظٌ آتی ہے (قرطبی)

اِنْفَضُّوْا ۔ انفضاض : متفرق ہونا ۔ بہنا ۔ اَلْفَضُّ : مصدر ہے بمعنی بکھری ہوئی قوم فَضَّ يَفُضُّ فَضًّا ۔ فَضَّ الشَّيْئَ کسی چیز کو توڑ کر

[1] مظہری

ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ فَضَّ خَتْمَ الْكِتَابِ۔ خط کی مہر توڑنا۔ فَضَّ الْقَوْمَ۔ قوم کو متفرق کرنا فَضَّ اللّٰهُ جَمْعَهُمْ اللہ ان کی جمعیت کو متفرق کرے۔ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ آپ کی مجلس سے اٹھ کر بکھر جاتے۔ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ِۨانْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو ادھر اُدھر بھاگ جاتے ہیں (فتح محمد)

شَاوِرْ۔ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ۔ معاملات میں اُن سے مشورہ لیجیے۔ اَلتَّشَاوُرُ وَالْمُشَاوَرَةُ وَالْمَشُوْرَةُ کے معنی ہیں ایک دوسرے کی طرف بات لوٹا کر رائے معلوم کرنا (راغب)

مطلب یہ ہے کہ آپ حسب سابق اپنے فیصلے اور کاموں میں ان حضرات سے مشورہ بھی لیا کریں۔ تاکہ اُن کی پوری تسلی ہو جائے۔ اس میں اس کی طرف ہدایت فرمائی کہ جو خیر خواہی کا داعیہ ان کے لیے آپ کے قلب میں ہے عمل سے بھی اس کا اظہار کریں کہ اپنی مشاورت سے ان کو مشرف فرمائیں[1] اور شوریٰ اس امر کو کہا جاتا ہے جس میں مشورہ کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ اور وہ اپنے کام میں آپس میں مشورہ سے کرتے ہیں۔ یہ دراصل شُرْتُ الْعَسَلَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں چھتہ سے شہد نکالنا۔ شِرْتُ الدَّابَّةَ کے معنی ہیں گھوڑے کی دوڑ معلوم کرنا کہ کس قدر دوڑ سکتا ہے۔

قال اهل اللغة: الاستشارة ماخوذة من قول العرب شرت الدابة (قرطبی)

عَزَمْتَ۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ جب آپ پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیے اَلْعَزْمُ اور اَلْعَزِيْمَةُ کے معنی ہیں کسی کام کو قطعی طور پر کرنے کا ارادہ کرنا۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ۔ نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرو۔ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ۔ اگر طلاق کا پختہ ارادہ کرلیں وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ اور ہم نے ان میں صبر و ثبات نہ پایا۔ بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ عزم اور حزم دونوں ہم معنی ہیں اور گویا حزم میں عین کو حاء سے بدل دیا گیا ہے۔ لیکن لغت عرب کے مشہور امام ابن عطیہ نے اس کی تغلیط کی ہے۔ حَزْمٌ دراصل دقت نظر اور خطا سے بچتے ہوئے معاملات کی تنقیح کرنے کا نام ہے اور عزم فیصلہ کو جاری کرنا ہے۔ العزمُ: قَصْدُ الْاِمْضَاءِ (قرطبی)

غَلَّ۔ غَلَّ يَغُلُّ غُلُوْلًا کے معنی خیانت بدعہدی اور بے وفائی کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ دراصل لفظ نصح کی ضد ہے جس کے معنی خیر خواہی اور خیر سگالی کے ہیں۔ اصحاب لغت میں سے زجاج نے مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ کی تشریح جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّخُوْنَ اُمَّتَهٗ کے الفاظ سے کی ہے۔ لفظ غل (بکسر العین) جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔ غش۔ عداوت۔ ضغن حقد اور حسد کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا لفظ غل کو صرف مالی خیانت کے ساتھ مخصوص کرنا کوئی معقول وجہ نہیں۔ اگرچہ شان نزول

[1] معارف

خاص ہے مگر الفاظ کے عموم کا خیال کرتے ہوئے
یہ کہا جائے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امت کے کسی
معاملہ میں خیر کے سوا کوئی ارادہ نہیں فرماتے ۔
مفتی اعظم پاکستان لکھتے ہیں کہ : لفظ غلول
مطلق خیانت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور
خاص کر مالِ غنیمت کی خیانت کے لیے بھی ۔ اور مالِ
غنیمت میں چوری اور خیانت کا جرم عام چوریوں اور
خیانتوں سے زیادہ اشد ہے کیونکہ مالِ غنیمت میں
پورے لشکر اسلام کا حق ہوتا ہے ۔ تو جس نے
اس میں چوری کی اُس نے سینکڑوں ہزاروں آدمیوں
کی چوری کی ۔ (معارف القرآن جلد ۲ ص ۲۲۹ تا ص ۲۳۱)

سَخِطَ : السَّخَطُ والسُّخْطُ : اُس غصے
کو کہتے ہیں جو سزا کا مقتضی ہو ۔ اِذَا هُمْ
يَسْخَطُونَ ۔ وہ فوراً غصہ ہو جاتے ہیں ۔
اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۔ اُن سے خدا ناراض
ہوا ۔ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔ اُس شخص
کی طرح جو خدا کا غصہ لے کر لوٹا ۔ یعنی اپنی بدعملیوں
کی وجہ سے خدا غضب میں آگیا ۔ سَخِطَ يَسْخَطُ
سَخْطًا ۔ سَخِطَ علیہ ۔ ناراض ہونا ۔ سُخْطٌ
سُخُطٌ سَخَطٌ ناراضگی ۔ مُسْخِطٌ وہ چیز جو غصہ
دلائے ۔ مَسْخُوطٌ مفعول ہے بمعنی مکروہ ۔
السَّخَطُ وَالسُّخْطُ : الغَضَبُ الشَّدِيْد
المقتضی للعقوبة ۔ سَخِطَ الرجلُ وعليه
کسی پر ناراض ہونا سَخِطَ الشیءَ کسی چیز کو ناپسند
کرنا ۔ اَسْخَطَهُ (افعال) کسی پر غضبناک کرنا ۔
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ (محمد ۲۸)
یہ اس سبب سے کہ جو طریقہ خدا کی ناراضگی کا
موجب تھا ، یہ اسی پر چلے ۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

اَفْوَاهٌ : يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ (یہ) لوگ
اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں ۔ اَفْوَاهٌ فَمٌ
کی جمع ہے جو اصل میں فُوْهٌ ہے ۔ قرآن پاک میں جہاں
کہیں بھی قول کو افواہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے
وہاں اکثر دروغ گوئی اور کذب بیانی مراد ہوتی
ہے ۔ مثلاً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى
قُلُوْبُهُمْ ۔

فَادْرَءُوْا : قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ
الْمَوْتَ ۔ ان کو کہہ دیجئے کہ اپنے سے موت کو
ٹال دو ۔ فَادْرَءُوْا یہ دَرْءٌ سے ہے ، جس کے
معنی ہیں نیزہ وغیرہ کا ایک طرف مائل ہو جانا ۔
تحقیق سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے ۔

يَجْتَبِىْ : اجتباءٌ ۔ یہ باب افتعال ہے
جس کے معنی ہیں انتخاب کے طور پر کسی چیز کو جمع کرنا
قرآن پاک میں ہے وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا
لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا (اعراف ۔ ۱۰۳) اور جب آپ
اُن کے پاس کوئی آیت نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ تو نے
اپنی طرف سے کیوں نہیں بنالی ۔ یعنی تم نے خود ہی تالیف
کرلی ہوتی ۔ کفار یہ جملہ دراصل طنزاً کہتے تھے ۔
جَبٰى يجبی جبايَةً سے جبی الماءُ فی الحوض ۔
حوض میں پانی جمع کرنا ۔ حوض کو جابیۃ کہا جاتا ہے
اس کی جمع جواب آتی ہے ۔ قرآن پاک میں اس کی
جمع استعمال ہوئی ہے ۔ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ ۔
اور لگن جیسے بڑے بڑے حوض ۔ يُجْبٰى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ

ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ۔ جہاں ہر قسم کے میوے پہنچائے جاتے ہیں۔

یبخلون : یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ۔ جو کچھ خدا نے اُن کو دیا ہے اس میں بخل کرتے ہیں۔ بَخِلَ یَبْخَلُ بَخَلًا وَ بَخُلَ یَبْخُلُ بُخْلًا۔ بخیل اور کنجوس ہونا۔ بُخل کے شرعی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر واجب ہو اس کو خرچ نہ کرے۔ اسی لئے بُخل حرام ہے اور اس پر جہنم کی وعید شدید ہے۔ اور جن موقعوں پر خرچ کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے وہ اس بُخل حرام میں داخل نہیں۔ البتہ معنی عام کے اعتبار سے اس کو بُخل کہدیا جاتا ہے۔ اس قسم کا بُخل حرام نہیں مگر خلافِ اَولیٰ ہے (معارف القرآن)

البخل والبخل فی اللغۃ: ان یمنع الانسان الحق الواجب علیہ فامّا من منع مالا یجب علیہ فلیس ببخیل۔ (قرطبی)

قربان : حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ۔ لفظ قربان ہر ایسی چیز پر بولا جاتا ہے جس سے اللہ کا قرب حاصل کرنا مقصود ہو۔ لفظ قربان کا اطلاق ہر طرح کی نذر و نیاز وغیرہ پر ہوتا ہے عرف عام میں اس کا اطلاق نَسِیْکَۃ یعنی ذبیحہ پر ہوتا ہے۔ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا۔ جب ان دونوں نے خدا کے دربار میں نذریں پیش کیں۔ واحد و جمع دونوں پر لفظ قربان بولا جاتا ہے۔ قُرْبَانًا اٰلِھَۃً لفظ اٰلِھَۃ جمع ہے۔ اس لیے قربان کو بھی جمع کہا گیا ہے۔

الزُّبُر : جَآءُوْا بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ۔ جو شواہد اور نوشتوں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے۔

الزُّبُر یہ زبور کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ مختصر رسالے ہوتے ہیں جن میں صرف اخلاقی مواعظ ہوتے ہیں (ماجدی) اور زُبُر صحائفِ داؤدی کو بھی کہا جاتا ہے

زُحزِح : فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ۔ تو جو شخص آگ سے بچا لیا گیا (اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہے) زَحْزَحَۃٌ کے معنی ہیں دُور ہٹانا۔ برطرف کرنا۔

رَابِطُوْا۔ یہ لفظ ربط سے بنا ہے۔ جس کے اصل معنی باندھنے کے ہیں اور اسی وجہ سے رباط اور مرابط کے معنی گھوڑے باندھنے اور جنگ کی تیاری کے لیے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اسی معنی کے لیے آیا ہے۔ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ۔ اصطلاح قرآن و حدیث میں یہ لفظ دو معنوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اول اسلامی سرحدوں کی حفاظت جس کے لیے جنگی گھوڑے اور جنگی سامان کے ساتھ مسلح رہنا لازمی ہے۔ تاکہ دشمن اسلامی سرحدوں کی طرف رُخ کرنے کی جرأت نہ کرے۔ دوسرے نماز باجماعت کی ایسی پابندی کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی انتظار میں رہے (معارف القرآن۔ قرطبی)

رَبَطَ الفرس کے معنی گھوڑے کو کسی جگہ حفاظت کیلئے باندھنے کے ہیں۔ اسی سے رباط الجیش ہے۔ فوج کا کسی جگہ پر مقرر کرنا۔ اور رباط: وہ مقام اور جگہ جہاں حفاظتی دستے قائم ہوں اور رَبَطْتُ ورابطتُ کا مصدر بھی رِبَاطٌ آتا ہے۔

شرح الفاظ القرآن من سورۃ النساء

بَثَّ ۔ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً
یعنی پھر اسی ایک جوڑے کی اولاد کو اطراف ارض میں پھیلا دیا۔ بَثَّ یہاں نشر کے معنی میں ہے
و بَثَّ معناہ فَرَّقَ وَنَشَرَ فِي الْاَرْضِ (قرطبی)
قَالَ الْفَرَّاء : وَبَثَّ : نَشَرَ (زاد المسیر)

الْاَرْحَام : رحم کی جمع ہے۔ عورت کے پیٹ کا وہ مقام جہاں بچہ بنتا ہے ۔

رَقِيْب : نگہبان ۔ خبر رکھنے والا۔ محافظ رقوب سے، جس کے معنی نگاہ رکھنے اور نگرانی کرنے کے ہیں۔ بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا بے شک اللہ تم پر نگراں ہے ۔ اس نگرانی میں انسان کی کوئی حالت بھی مخفی نہ ہو۔ بلکہ رقیب دراصل وہ ذات علیم ہے جس کے علم ونگرانی سے اس کون و مکان اور ماکان وما یکون کا کوئی ذرہ بھی مخفی نہ ہو۔ ایسی ہی ذات کو اہل اسلام عالم الغیب کہتے ہیں۔ ابن جوزیؒ نے خطابی کا قول نقل کیا ہے کہ الرقیب ھو الحافظ الذی لا یغیب عنہ شئ ۔ ابن عباس اور مجاھد سے بھی یہ ہی قول نقل کیا ہے۔ رقیبًا: حافظًا مطلقًا (مظہری)
حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں : اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ای مُرَاقِبٌ لجمیع احوالکم واعمالکم

حُوْب : اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا
مطلب یہ ہے کہ مال یتیم میں تصرف کرنا گناہ عظیم ہے ۔ لفظ حوب بقول ابن عباس کے حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں بڑا گناہ۔ لیکن لفظ حوب خود عربی زبان کا بھی ہے۔ اور اس کے معنی بڑے گناہ کے ہیں ۔ الحوب : الذنب العظیم (کشاف)
مراسیل ابو داؤد میں ہے کہ حضرت ابو ایوبؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا ۔ ان طلاق امّ ایوب یحوب حُوْبًا كبيرًا ای ذنبًا عظیمًا ۔ (مظہری)
حَابَ يَحُوْبُ حَوْبًا ۔ حاب الرَّجُلُ ۔ گناہ کرنا۔ حوب کے اصل معنی اونٹ کو ڈانٹنے اور اور زجر کرنے کے ہیں۔ گناہ کو حوب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کو اس سے روکا گیا ہے۔ دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں اَللّٰهُمَّ اغفر حَوْبَتِي ۔ ای اثمی حَوْبٌ: حاجت کو بھی کہتے ہیں ۔
اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَرْفَعُ حَوْبَتِي ۔ ای حاجتی اس میں تین لغات ہیں ۔ حُوبٌ بالضم ۔ اہل حجاز کی قرأت یہ ہی ہے ۔ دوسری قرأت حَوْبٌ ہے یعنی بفتح الحاء ۔ یہ بنو تمیم کی لغت ہے ۔ تیسری قرأت

حَابًا ہے۔ یہ قرأت اُبی بن کعب کی ہے۔
الحَوْبُ بالفتح اور الحَيَابَة۔ دونوں مصدر
ہیں اور الحُوبُ بالضم اسم ہے۔
و قال الفراء المضموم الاسم والمفتوح
المصدر (ابن جوزی) (قرطبی)۔
الحَوْبُ الاثم (راغب)

مَثْنٰی : مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ یہ
الفاظ معدولہ میں سے ہیں۔ آحاد یہ واحدٍ واحدٍ
کا معدول ہے اور مَثْنٰی یہ اثنین اثنین کا۔
ثُلٰث یہ ثلٰثۃ ثلٰثۃ کا اور رُبَاع اَرْبع اَرْبع کا
معدول ہے۔ اَلثَّنْیُ والاثنان۔ یہ دونوں
اُن کلمات کی اصل ہیں جو اس مادہ سے بنتے ہیں۔ یہ
کبھی معنی عدد کے اعتبار سے استعمال ہوتے
ہیں اور کبھی تکرار معنی کے لحاظ سے جو اُن کے اصل
مادہ میں پایا جاتا ہے اور کبھی ان میں عدد اور
تکرار دونوں ملحوظ ہوتے ہیں۔
اَلثِّنٰی جس کا دو مرتبہ اعادہ کیا جائے۔ حدیث
میں ہے لَا ثِنٰی فی الصَّدَقَۃ۔ یعنی صدقہ
سال میں دو مرتبہ نہ لیا جائے۔ قرآن پاک میں
ہے۔ اَلَآ اِنَّھُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ۔ دیکھو
یہ اپنے سینوں کو دُہرا کرتے ہیں۔ ابن عباسؓ کی
قرأت یَثْنَوْنٰی ہے۔ یہ اثْنَوْنَیْتُ کا مضارع
ہے۔ ثَانِیَ عِطْفِہٖ تکبر سے گردن موڑ لیتا ہے
اَلْاِسْتِثْنَاءُ کے معنی کلام میں ایسا لفظ لانے
ہیں جو پہلے عام حکم سے بعض افراد کی تخصیص یا
اس عام حکم کے کُلِّیَّۃً مرتفع ہونے کا فائدہ دے۔

اَلثَّنَاءُ کے معنی بار بار کسی کی خوبیاں بیان
کرنے کے ہیں۔ اَثْنٰی عَلَیْہِ کے معنی ہیں کسی کی ثناء
بیان کرنا، اس کے اوصاف و محامد کا تذکرہ کرنا۔
ثَنٰی یَثْنِیْ ثَنْیًا۔ موڑنا۔ تہ لپیٹنا (مفردات)

تَعُوْلُوْا : ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ لَّا تَعُوْلُوْا۔
یہ زیادتی نہ ہونے کے قریب تر ہے۔ عَوْل کے
معنی ایک طرف جھک جانے، اور جور کرنے کے
ہیں۔ وَلَا تَعُوْلُوْا کے معنی ہوں گے ظلم و
زیادتی نہ کرو
العَوْل ھُوَ تَرْکُ النِّصْفَۃِ بِاَخْذِ الزِّیَادۃ
(راغب) مِنْ قولھم عال المیزان عَوْلًا
اذا مَالَ وَعَالَ الحاکِمُ فی حکمہٖ اذا جَارَ
(کشاف) معناہ لَا تَجُوْرُوْا وَلَا تَمِیْلُوْا و
ھٰذا ھو المختار عند اکثر المفسرین (کبیر)
لاخلاف بین السلف وکل من رُوِیَ عند
تفسیر ھٰذہ الایۃ ان معناہ اَنْ لَّا تَمِیْلُوْا
وَاَنْ لَّا تَجُوْرُوْا (جصاص)
ای ذٰلکَ اَقْرَبُ اَنْ لَا تَمِیْلُوْا عَنِ الحقِّ
وتجوروا۔ عن ابن عباس و مجاھد وغیرھا۔
یقال عال الرجلُ یَعُوْلُ اِذَا جَارَ وَمَالَ
(قرطبی) اور عَالَ یَعِیْلُ عَیْلَۃً کے معنی ہیں
فقر و احتیاج۔ وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً۔
وَالعَیْلَۃُ والعَالَۃُ الفَاقَۃ (قرطبی)
امام شافعیؒ سے اس کے معنی اَنْ لَا تَکْثُرَ
عِیَالُکُمْ کے منقول ہیں۔ یعنی تمہارے عیال
زیادہ نہ ہو جائیں۔ علامہ بغویؒ لکھتے ہیں کہ:

وماقاله احدٌ۔ انما يقال: اعال يُعيل اعالةً اذا كثر عياله (معالم التنزیل)
یعنی یہ معنی کسی اور نے بیان نہیں کیے۔ تحقیق تو یہ ہے کہ کثرتِ عیال کے لیے اَعَالَ یُعِیْلُ اِعَالَۃً بولا جاتا ہے

نِحْلَۃً ۔ خوش روئی۔ کشادہ دلی خندہ پیشانی بغیر تنگی محسوس کیے۔ النِّحْلَۃُ وَالنُّحْلَۃُ دراصل عطیہ اور ھبہ کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد عام طور پر وہ ھبہ اور عطیہ ہوتا ہے جو تبرعًا دیا جائے۔ عطیہ خاص ہے اور ہبہ عام ہے۔ کیونکہ ہر ہبہ کو نحلہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر نحلہ کو ہبہ نہیں کہتے۔ صاحب مفردات فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں نحلہ نحل سے مشتق ہے اور اس میں مکھی کے فعل کے معنی ملحوظ ہیں۔ شہد کی مکھی کو بھی نحل کہتے ہیں۔ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ ۔ یہ مکھی بھی گویا لوگوں کو شہد بنا کر عطیہ دیتی ہے۔ نحلتہٗ کذا کے معنی ہیں میں نے اس کو عطیہ دیا۔ حکماء کا بیان ہے کہ شہد جن پودوں سے غذا لیتی ہے ان کو بالکل نقصان نہیں دیتی۔ اور نحلۃ اور نُحلۃ عورت کے حقِ مہر کو بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ مرد کی طرف سے ایک عطیہ ہوتا ہے۔ چونکہ ظاہر ہے کہ مہر کے بدلہ میں عورت کی طرف سے مرد کی ملک میں کوئی چیز نہیں آتی۔ بلکہ وہ صرف منافع بضعہ کا مالک ہوتا ہے۔ عورت کی کوئی چیز مرد کی ملک میں نہیں آتی۔ لفظِ نحلۃ میں اہلِ تفسیر کے چار قول منقول ہیں

ایک[1] قول یہ ہے کہ نحلۃ فریضۃ کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے فریضہ مہر کو خوشی سے ادا کرو تنگی کا احساس نہ کرنا چاہئے۔ یہ قول ابن عباسؓ، قتادہ، ابن زید وغیرہ کا ہے

دوسرا[2] قول یہ ہے کہ لفظ نحلۃ ہبہ اور عطیہ ہی کے معنوں میں ہے۔ یہ قول فراء کا ہے۔ ابن انباری کا قول ہے کہ اہلِ عرب قبل از اسلام عورتوں کو مہر دیتے ہی نہیں تھے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے مہر کو فرض کر دیا تو گویا یہ خدا کی طرف سے عورتوں کو ایک ہبہ اور عطیہ ہے۔

ابو عبیدہ[3] کا قول یہ ہے کہ نحلہ وہ عطیہ ہے جو طیبِ نفس سے دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ لَا تُعْطُوْهُنَّ مُهُوْرَهُنَّ وانتم کارهون

چوتھا[4] قول یہ ہے کہ نحلۃ کے معنی دیانت کے ہیں اس لیے تقدیر کلام یہ ہوگی کہ اٰتوهن صدقاتهن دِیَانَۃً۔ ذکرہ الزجاج عن بعض العلماء۔ (زاد المسیر)

نِحْلَۃً: ای عن طیبِ نفسٍ من الازواج من غیر تنازع۔ (قرطبی)

طِبْنَ ۔ فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا ۔ اگر وہ عورتیں خوشی سے تمہیں کچھ معاف کر دیں۔ طَابَ یَطِیْبُ طِیْبًا فَهُوَ طَیِّبٌ طَابَ الشَّیْءُ۔ کسی چیز کا پاکیزہ اور حلال ہونا۔ اور مناسب حال ہونا۔ فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاۤءِ ۔ ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں پسند آئیں۔ یعنی تمہارے مناسب حال ہوں۔

ورنہ پسند تو بہت سی ایسی عورتیں ہو سکتی ہیں جن کو حبالۂ عقد میں لانا ناممکن یا محال ہوتا ہے۔ اور اصل میں طیب وہ چیز ہے جس سے انسان کے حواس اور نفس دونوں کو لذت حاصل ہو۔

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۔ ہماری عطا کردہ حلال چیزوں میں سے کھاؤ۔

الطَّعَامُ الطَّيِّبُ : اس طعام کو کہا جاتا ہے جو حلال ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ لفظ طُوبیٰ بھی یہیں سے بنا ہے۔ طُوبیٰ لَهُمْ ۔ ان کے لیے خوشی ہے۔ طُوبیٰ سے مراد ہر قسم کی خوش گواریاں ہیں۔ اگرچہ ایک جنت کا نام بھی طوبیٰ ہے، جو اہل ایمان کو عطا ہو گی۔ اس کو طوبیٰ کہنے کی وجہ بھی یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں ہر قسم کی خوشیاں اور خوش گواریاں حاصل ہوں گی۔

صَدُقَات ۔ یہ صَدُقَةٌ (بفتح صاد و ضم الدال) کی جمع ہے۔ صَدُقَة اور صُداق عورتوں کے مہر کو کہا جاتا ہے۔ مُلّا علی قاری، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں: وسُمّی بہ لانّہ یَظْهَرُ بِهٖ صِدقُ مَیلِ الرَّجُلِ اِلَی المَرْأَةِ ۔ یعنی مہر کو صُداق اور صَدُقہ اس لیے کہتے ہیں کہ صدق کے اس مادہ میں سچ کے معنی ہیں۔ اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے اسی مناسبت سے مہر کو صُداق کہنے لگے۔ (معارف)

صَدُقَہ میں ایک لغت صُدْقَةٌ (بسکون دال) بھی ہے۔ اس کی جمع صُدُقات یعنی بضم الصاد و سکون الدال آتی ہے۔ اَلصَّدُقَاتُ جمع الواحِدَةُ صَدُقَة ۔ قال الاخفش : و بنو تمیم یقولون صُدْقَة والجمع صُدْقَاتٌ[1]

هَنِيْٓـًٔا ۔ فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۔ تو تم اس کو کھاؤ رچتا پچتا۔ (یہ ترجمہ شاہ صاحب کا ہے)۔ مراد یہ ہے کہ بیوی کے اجازت کے بعد اس مال کو بے تکلف اپنے تصرف و استعمال میں لا سکتے ہو (ماجدی)

اور هَنِيْٓـًٔا مَرِيْٓـًٔا ۔ دونوں لفظ فعیل کے کے وزن پر صفت کے الفاظ ہیں۔ اور هنيئًا تین ابواب سے آتا ہے۔ هَنَأَ (ف) و هَنُؤَ (ک) و هَنِئَ (س) لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مشقت اور تکالیف اٹھائے بغیر حاصل ہو جائے اور جب یہ طعام کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی خوش گوار طعام کے ہوتے ہیں۔ یعنی ایسا طعام جو کسی مشقت کے بغیر حلق سے اتر کر جزو بدن بن جائے

الهَنِيْئُ کلّ ما لا يلحق منه مشقّة ولا يَعْقُبُ وَخَامَةً (راغب) وكل ما لم يأت بمشقّة ولا عناء فهو هَنِيْئٌ (قرطبی)

مَرِيْٓـًٔا ۔ مِنْ مَرِئَ الطعام فهو مَرِیٌّ ۔ هَنِیْءٌ کا لفظ بھی مذکورہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ غرض دونوں الفاظ قریب المعنی ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت تھانوی نے ان دونوں لفظوں کا ترجمہ خوش گوار کے الفاظ سے کیا ہے۔ اور شاہ عبد القادر نے رچتا پچتا کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

(معارف القرآن مفتی)

[1] قرطبی

مَرِیْئٌ : الطَّعَامُ اِذَا انْھَضَمَ وَحُمِدَتْ عاقبتہ (ابن جوزی) ۔

قِیَامًا ۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا ۔ اور تم کم عقلوں کو اپنا وہ مال نہ دو جس کو اللہ نے تمہارے لیے مایۂ زندگی بنایا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ مال اللہ کی بڑی نعمت ہے ۔ اور بڑی قدر کی چیز ہے ۔ اس کے اوپر انسان کی حیاتِ مادّی اور معاشرتی کا مدار ہے ۔ اس کو نادانوں کے سپرد کر کے ضائع نہ کرو اس کی اصل قَامَ یَقُوْمُ قِیَامًا ہے ۔ صیغۂ صفت قَائِمٌ آتا ہے بمعنی کھڑا ہونا ۔ قَائِمٌ کی جمع بھی قِیَامٌ آتی ہے ۔ اَقَامَہٗ (افعال) کے معنی دوسرے کو کھڑا کرنے اور سہارا دینے کے ہیں ۔ اَقَامَ بِالْمَکَانِ اِقَامَۃً ۔ کسی جگہ قیام کرنا ٹھہرنا ۔ لفظ قیام قرآن پاک میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ ایک یہ کہ کسی شخص کا تسخیری طور پر یا اپنے ارادہ سے کھڑا ہونا ۔ جیسا کہ مِنْهَا قَائِمٌ وَّحَصِيدٌ ۔ ان میں سے بعض تو باقی ہیں اور کچھ تہس نہس ہو گئے ۔

دوسرا ۔ کسی شئے کی حفاظت اور نگرانی کرنے کے معنوں میں ۔ قِیَامٌ لِلشَّیْءِ ۔ شئے کی حفاظت اور نگرانی کرنا جیسا کہ اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ ۔

تیسرا ۔ کسی کام کا پختہ عزم و ارادہ کر لینا ۔ جیسا کہ فرمایا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ یہاں قُمْتُمْ بمعنی عزم و قصد ہے ۔ اور

اور قیام و قوام اس چیز کو کہتے ہیں جس کے سہارے کوئی چیز قائم رہ سکے ۔ جس طرح عِمَادٌ اور سِنَادٌ وہ چیز جس سے کسی چیز کو سہارا لگایا جائے ۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ ۔ یہاں بیت اللہ کے قِیَامًا لِلنَّاسِ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی دنیا اور آخرت کی اصلاح اور درستگی بیت اللہ سے وابستہ ہے (راغب) حسن اور بعض دیگر اہل قرأت نے یہاں قیام کی جگہ قوام پڑھا ہے ۔ ابن قتیبہ کا قول ہے کہ قوام اور قیام دونوں کے معنی ایک ہی ہیں (ابن جوزی)

بعض اہل فن نے قِیَامًا کو قِیَمًا بھی پڑھا ہے ۔ قِیَمًا قِیْمَۃٌ کی جمع ہے ۔ مطلب یہ ہوگا کہ جس مال کو خدا نے مال و اشیاء کی قیمتیں بنایا ہے تم اس کو بے وقوفوں کے ہتھے چڑھا کر برباد نہ کرو ۔ (واللہ اعلم)

(قِیَامًا) ای لِمَعَاشِکم و صلاح دینکم والقِیَامُ والقِوَامُ مَا یُقِیمُكَ ۔ (قرطبی)

اٰنَسْتُمْ ۔ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا تو اگر تم ان میں ہوشیاری پاؤ تو ان کے اموال اُن کے حوالے کر دو ۔ آنَسَ باب افعال کے معنی ہیں کسی چیز سے اُنس پانا یا دیکھنا ۔ اٰنَسْتُ نَارًا میں نے آگ دیکھی ۔ اور آیتِ کریمہ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم اُن سے اجازت لے کر اُنس پیدا نہ کر لو ۔

اَلْاِنْسَان : بنی آدم چونکہ فطرۃً کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ ایک دوسرے سے میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے اس کو انسان کہا گیا ہے۔ گویا اُنس و موانست۔ انسانیت کا خاصہ ہے۔ اسی بناء پر اہل تحقیق کا کہنا ہے انسان طبعی طور پر متمدن واقع ہوا ہے۔ وہ آپس کے میل جول کے بغیر زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پھر دوسری وجہ یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو محبت ہو جاتی ہے اس سے مانوس ہو جاتا ہے۔ صاحب مفردات القرآن امام راغب نے لکھا ہے بعض اہل لغت کے نزدیک انسان کی اصل اِفْعِلَانٌ کے وزن پر اِنْسِیَانٌ ہے جس کے معنی ہیں بھولنا۔ چونکہ انسان عہد خدا کو بھول گیا اس لیے انسان کہا گیا۔

بِدَارًا۔ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا۔ اور مال جلد جلد اور اسراف سے اور اس خیال سے کہ یہ بڑے نہ ہو جائیں، مت کھاؤ۔ یعنی اس خوف سے کہ اگر بڑے ہو گئے تو یہ مال اُن کو دینا پڑے گا۔ لہذا پہلے ہی ختم کر دو بِدَار اور مُبَادَرَۃ کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف لپکنا، جلدی کرنا۔ سبقت لے جانا۔ جو لغزش انسان سے عجلت اور جلد بازی کی وجہ سے ہوتی ہے اس کو بھی بادرۃ کہتے ہیں اس کی جمع بَوَادِرٌ آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کانت من فلان بوادر فی ھٰذا الامر۔ یعنی فلاں نے جلد بازی میں اس کام میں غلطیاں کی ہیں۔

تَبَادَرَ الْقَوْمُ۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا۔ اَلْبَدْرُ۔ چودھویں رات کا چاند۔ جمع بُدُوْرٌ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس چاند کو بھی بدر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سورج سے جلدی نکلتا ہے۔ البَادِرُ جلدی کرنے والا۔ جلدباز۔ جمع بوادر۔ البَدْرَۃُ۔ دس ہزار درہم۔ البدرۃ من المال دس ہزار درہم کی تھیلی۔ البادرۃ۔ تیزی اور شتابی کو کہتے ہیں۔ تیر کی نوک کو بھی بادرۃ کہتے ہیں۔ بَدَارِ۔ یہ اسم فعل ہے بمعنی اَسْرِعْ یعنی جلدی کر۔ بَدْر میں ایک معنی کسی چیز کے بھرنے اور پُر ہونے کے ہیں۔ البَدْرَۃُ مِنَ المَالِ کا معنی ہے مال سے بھری ہوئی تھیلی۔ تو اس اعتبار سے چودھویں کے چاند کو اَلْبَدْر کہنے کی وجہ یہ ہو گی کہ اس تاریخ میں چاند بالکل پورا اور بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح کھلیان وغیرہ کو اَلْبَيْدَر کہتے ہیں چونکہ وہ بھی غلّہ سے بھرا ہوتا ہے۔ جمع بَيَادِر۔

البَدْر : یہ مدینہ منوّرہ سے چند میل کے فاصلے پر مکہ کی طرف ایک مقام کا نام ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں رمضان ۲ھ میں سب سے پہلی اسلامی جنگ ہوئی جس کو جنگِ بدر کہا جاتا ہے۔

البَادِرَۃ : مونڈھے اور گردن کے درمیان کا گوشت۔ حدیث میں ہے۔ فَرَجَعَ بِهَا تَرْجُفُ بَوَادِرُهٗ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب آیات کے نزول کے بعد لوٹے تو کندھوں کے درمیان کا گوشت تھرک رہا تھا۔

دَفَعْتُمْ۔ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ

اور جب تم اُن کے اموال ان کے حوالہ کرنے لگو (تو اُن پر گواہ بھی کر لیا کرو) دفع کے معنی ہیں ہٹانا۔ دفع کرنا، سپرد کرنا۔ جب اس کا تعدیہ حرفِ اِلٰی کے ذریعہ ہو تو اس کے معنی دیدینے اور حوالہ کر دینے کے ہوتے ہیں۔ فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ اور فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ۔ دونوں جگہوں میں معنی حوالہ کرنے کے ہیں۔ یہ دَفَعَ يَدْفَعُ باب فتح سے آتا ہے۔

سَدِيْدًا۔ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا اور انھیں چاہیے کہ بات پکی کہیں۔ قَوْلًا سَدِيْدًا یعنی سچی اور صحیح بات جس میں کوئی پہلو شر اور فساد کا نہ نکلتا ہو۔ اور اِتلافِ حقوق سے بھی پاک ہو۔ مطلب یہ ہے کہ مریض کو جواب آخری وقت میں ہے یہ ترغیب دی جائے کہ اُس کے مال میں جو حقوق واجبہ ہیں انہیں ادا کرے اور اپنے ایسے غریب رشتہ داروں کے حق میں وصیت کر دے جن کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا۔

السَّدِيد : العدلُ والصّوابُ من القول اى مُرُوا المريض بان يَخرُجَ من ماله مَا عَلَيْهِ مِنَ الْحُقُوْقِ الْوَاجِبَۃِ۔ (قرطبی) ورثہ میں وصیت کرتے وقت اس کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ ورثہ کا حق نہ تلف ہو۔

سَدَّ يَسُدُّ۔ سَدَدًا وَسَدَادًا۔ درست ہونا هُوَ يَسُدُّ فِيْ قَوْلِهٖ۔ وہ ٹھکانہ کی بات کہتا ہے۔ سَدِيْد : فعیل کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔

سَعِيْرًا۔ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔ اور وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

السَّعْرُ : کے معنی ہیں آگ بھڑکنا۔ سَعَرْتُ النَّارَ۔ آگ بھڑکانا۔ پھر یہیں سے مجازی طور پر لڑائی بھڑکانے اور چھیڑنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اِسْتَعَرَ الْحَرْبُ۔ لڑائی بھڑک اٹھی۔ اَلْمِسْعَرُ۔ وہ لکڑی جس سے آگ بھڑکائی جائے۔ السُّعَارُ : آگ کی تپش۔ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ۔ جب آگ بھڑکائی جائے گی۔ عَذَابَ السَّعِيْرِ۔ بھڑکتی آگ کا عذاب۔ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ۔ اور سعر مروجہ نرخ کو کہا جاتا ہے۔ یہ اسْتِعَارُ النَّارِ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا گیا ہے۔ اس کی جمع اَسْعَارٌ ہے۔ سَعَرَ يَسْعَرُ سَعْرًا (ف) آگ بھڑکانا۔ نَاقَۃٌ مَسْعُوْرَۃٌ۔ مشتعل اونٹنی۔

تَدْرُوْنَ۔ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے باپ اور بیٹے اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ آخرت میں یا دنیا میں تمہارے حق میں نفع رساں کون ہے۔ لہٰذا تقسیمِ وراثت کا کام تمہارے اوپر نہیں چھوڑا بلکہ علیم و خبیر نے یہ کام خود اپنے ذمے لیا ہے۔ یہ دَرَايَۃ سے ہے۔ اور الدِّرَايَۃ اس معرفت کو کہتے ہیں جو کسی قسم کے حیلہ یا تدبیر سے حاصل کی جائے اور یہ دَرَيْتُهٗ وَدَرَيْتُ بِهٖ دِرْيَۃً دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس کا تعدیہ حرف باء کے ساتھ بھی آتا ہے اور بغیر باء کے

بھی جیسا کہ فَطِنْتُ اور شَعَرْتُ ۔ اِدَّرَیْتُ بمعنی دَرَیْتُ آتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے کہ

وَمَاذَا یَدَّرِی الشُّعَرَاءُ مِنِّیْ
وقدجاوزتُ رأس الاربعین

اور شعراء مجھے کیسے دھوکہ دے سکتے ہیں جب کہ میں چالیس سال سے بھی تجاوز کر چکا ہوں۔

دَرٰی یَدْرِیْ دَرْیًا ودِرْیًا ودَرْیَۃً ودِرْیَۃً ودَرَایَۃً۔ اس باب سے یہ آخری یعنی دَرَایَۃً بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ کسی چیز کو حیلہ سے جاننا۔ لیکن حیلہ اور جاننا اس باب کے لیے کوئی لازمی معنی نہیں۔ مطلق جاننے پر دَرَایَۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔ البتہ جب اس کو افتعال میں لے جائیں گے تو اس وقت اس کے معنی میں حیلہ سازی کا مفہوم ضرور ملحوظ رہے گا۔ جیسا کہ اِدَّرَی الصَّیدَ شکار کو دھوکہ دینا۔

کَلَالَۃً ۔ کَلَّ یَکِلُّ کَلًّا وَکِلَّۃً وَکَلَالًا وکُلُولًا وکَلَالَۃً وکُلُولَۃً۔ تھکنا۔ اس کی صفت کَالٌّ ہے اور اُردو زبان میں تو ایسا لفظ نہیں جو کلالہ کے مفہوم کو کماحقہٗ ظاہر کر سکے۔ البتہ عربی میں کلالہ ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ ماں باپ ہوں اور نہ اولاد۔ یعنی نہ اصول ہوں نہ فروع۔

ابن جوزی نے زاد المسیر میں ابوبکر صدیقؓ، عمر بن خطابؓ، علی بن ابی طالب، ابن مسعود، زید بن ثابت، ابن عباس، حسنؒ، سعید بن جُبیرؒ، عطاءؒ اور زہریؒ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ کلالہ اصل میں مصدر ہے جو کَلَالٌ کے معنی میں ہے۔ کلال کے معنی ہیں تھک جانا۔ جو ضعف پر دلالت کرتا ہے۔ باپ بیٹے والی قرابت کے سوا قرابت کو کلالہ کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ قرابت باپ بیٹے والی قرابت کے نسبت کمزور ہے پھر کلالہ کا اطلاق اس مرنے والے پر بھی کیا گیا جس نے نہ اولاد چھوڑی اور نہ والد۔ اور اس وارث پر بھی اطلاق کیا گیا جو مرنے والے کی ولد اور والد نہ ہو۔ لغت کے اعتبار سے جو اشتقاق بنایا گیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ ذُوْ مقدر ہو۔ اور کلالہ بمعنی ذُو کلالہ ہو۔ یعنی ضعیف رشتہ والا۔ پھر اس مالِ موروث پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا جو ایسے میت نے چھوڑا ہو جس کا کوئی ولد اور والد نہ ہو (معارف القرآن از مفتی اعظم)

حاصل یہ کہ کلالہ اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا کوئی نسبی رشتہ دار نہ ہو اور وراثت دور کے لوگ بنو عم وغیرہ کو مل جائے۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں فسمّوا القرابۃ کَلَالَۃً لانھم اطافوا بالمیّت من جوانبہ لیسوا منہ ولا ھو منھم (قرطبی)

قطرب لغوی نے کہا ہے کہ کلالۃ ہر اس رشتہ کو کہا جاتا ہے جو والدین اور بہن بھائیوں کے علاوہ ہو امام راغب فرماتے ہیں کہ قطرب کا قول بلا سند ہے۔ ولیس بشیءٍ۔ یعنی قطرب کا قول کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ کلالۃ اکلیل سے مشتق ہے۔ اکلیل تاج کو کہتے ہیں چونکہ وہ سر کے اطراف وجوانب کو گھیر لیتا ہے۔

الکلالۃ مشتقۃ من الاکلیل وھو الذی
یحیط بالرأس من جوانبہ والمراد ھٰنا من
یرثہ من الاکلیل، لا اصولہ ولا فروعہ
(ابن کثیر)

ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے ارشاد فرمایا: من مات ولیس لہ ولد ولا
والد۔ یعنی کلالہ ہر اس میت کو کہتے ہیں جس کا باپ
اور اولاد زندہ نہ ہو۔ اس روایت میں آپ نے خود
میت کو کلالہ قرار دیا ہے۔ اور کلالہ کے یہ دونوں
معنی صحیح ہیں۔ چونکہ کلالہ مصدر ہے۔ جو وارث اور
مورث دونوں پر بولا جاتا ہے۔

والکلالۃ فی الاصل مصدر بمعنی الکلال
وھو ذھاب القوۃ من الاعیاء (کشاف)
وقال جمہور اللغویین انہ المیت الذی
لا ولد لہ ولا والد۔ اس کی صحت کی ایک دلیل
یہ پیش کی گئی ہے کہ یہ کلّت الرحم سے ماخوذ
ہے۔ جس کا مطلب دور کی رشتہ داری ہے۔
کلّت الرحم: اذا تباعدت القرابۃ بینھما
فسمیت القرابۃ البعیدۃ من ھٰذا الوجہ (جمل)

اَلّٰتِیْ۔ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ
نِّسَآئِکُمْ۔ اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی
کا کام کریں۔ الّٰتِیْ یہ جمع ہے اس کی واحد میں تین
لغات ہیں ۱ اَلَّتِیْ ۲ اَلَّتِ۔ بکسر التاء وحذف
الیاء ۳ وَاللَّتْ باسکان التاء وحذف الیاء
اسی طرح اس کے تثنیہ میں بھی تین لغات ہیں:
۱ اللّتان ۲ اللّتا بحذف النون۔ ۳ واللّتانّ
بشدّ النون۔ الّتی اسم مبہم ہے جو مؤنث
کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کا استعمال
ہمیشہ معرّف باللام ہوتا ہے۔ بغیر الف لام
نکرہ کی صورت میں یہ مستعمل نہیں ہوتا۔ اور صلہ
ملائے بغیر اس کا مطلب بھی واضح نہیں ہوتا۔
الّتی کی جمع کے اوزان بھی اس کے واحد اور تثنیہ کی
طرح متعدد ہیں: ۱ اللاتی یہ جمع اس باب کی
کثیر الاستعمال ہے۔ ۲ اللّاتِ بحذف الیاء
وبناء الکسرہ ۳ اللّائِیْ بالھمزہ واثبات الیاء
۴ اَللّاءِ بکسر الھمزۃ وحذف الیاء ۵ اَللّآ۔
یہاں ہمزہ اور یاء دونوں کو حذف کر دیا گیا ہے
پھر ان اسماء موصولہ کی جمع الجمع کے بھی متعدد اوزان
ہیں۔ اللّائی کی جمع اللّواتی اور اَللّاءِ کی جمع
اللّوآء اور اہل لغت کے ایک قول میں اس کی جمع
اللّوات ہے (قرطبی)

الفَاحِشَۃَ۔ ہر برائی کو فاحشہ کہا جاتا ہے
چاہے قولی ہو یا فعلی۔ امام رازی نے اس کی تفسیر
اَلْفِعْلَۃُ الْقَبِیْحَۃُ سے کی ہے اور اس مقام پر
فاحشہ سے مراد باتفاق مفسرین زنا ہے۔
(کبیر۔ روح۔ راغب)

مَقْتًا۔ اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّمَقْتًا وَسَآءَ
سَبِیْلًا۔ بلاشبہ (یہ منکوحہ آباء کے نکاح
سے نکاح کرنا) بے حیائی نفرت کی چیز اور بہت
برا طریقہ تھا۔
مَقْتًا۔ مذاق سلیم رکھنے والوں کے عرف میں یہ بڑی
گندی چیز اور فعل قبیح تھا۔ مقت ایسی بری

چیز کو کہتے ہیں جس کو دیکھتے ہی مذاقِ سلیم نفرت کرے۔ چنانچہ امام راغب فرماتے ہیں کہ المقتُ بغض شدید۔ لمن تراہ تعاطی القبیح (راغب) مَقَتَ یَمقُتُ مَقْتًا۔ کسی کو انتہا درجہ کا مبغوض اور بُرا جاننا۔ صفت مَقِیتٌ اور مَقوتٌ آئی ہے۔ عرب جاہلیت میں باپ کی منکوحہ مطلقہ یا بیوہ سے نکاح کر تو لیا جاتا لیکن اُس سے شریفانہ نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور عام عرف میں اس کو نکاح المقت یعنی مبغوض کہا جاتا تھا۔ اور باپ کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح کرنے والے کو المُقتی کہتے تھے اور اُس سے جو اولاد پیدا ہوتی اس کو مُقیت کہتے تھے۔

ابو العباس کہتے ہیں کہ میں نے ایک اعرابی کے لڑکے سے سوال کیا کہ نکاح مقت عربی میں کس کو کہا جاتا ہے۔ تو اُس نے کہا ھو ان یتزوج الرجل امرأة ابیه اذا طلقھا او مات عنھا۔ (قرطبی) واصل المقت البغض (قرطبی) حاصل یہ کہ زمانہ جاہلیت میں باپ کی مطلقہ اور بیوہ سے نکاح کیا کرتے تھے۔ اس مذکورہ آیت میں اللہ پاک نے اس بے شرمی کے کام سے منع فرمایا اور اس کو موجبِ مقت یعنی خدائے پاک کی ناراضگی کا باعث بتایا۔ ظاہر ہے کہ یہ کیسی اخلاق کی موت اور کردار کی خرابی ہے۔ کہ جس کو ایک عرصہ تک ماں کہتے رہے۔ اُس کو باپ کی موت کے بعد بیوی بنا کر رکھ دیا۔ (معارف القرآن)

طَوْلًا ۔ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ۔ طول کے معنی وسعت اور مقدرت کے ہیں۔ یہ لفظ خاص کر فضل و احسان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک طولاً سے مراد آزاد عورت ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس آزاد نہ ہو وہ باندی سے نکاح کر سکتا ہے۔ گویا آزاد عورت کی موجودگی میں باندی سے نکاح ممنوع ہوگا۔ علامہ قرطبی نے امام ابو یوسف کا مسلک یہی نقل کیا ہے (قرطبی ج۵ ط۱۳۶) شَدِيْدُ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ۔ سخت عذاب دینے والا اور صاحب کرم۔ يَسْتَاْذِنُكَ اُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ۔ جو ان میں سے دولت مند ہیں وہ آپ سے اجازت مانگتے ہیں۔ اور آیتِ زیرِ بحث میں لفظ طولاً اس مال سے کنایہ ہے جو عورت کو بطور مہر یا نان و نفقہ میں دیا جاتا ہے۔

والمراد ھٰھنا القدرة علی المھر فی قول اکثر اھل العلم (قرطبی) طولاً: کنایة عما یُصرفُ الی المھر والنفقة (راغب)۔

اس کی اصل طَالَ يَطُوْلُ طَوْلًا یہ قصیر کی ضد ہے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس اتنا زیادہ مال نہ ہو جو آزاد عورتوں کے حقوق کو ادا کر سکے تو باندی کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ قرآن پاک کے طرزِ بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حتی الامکان آزاد عورت سے ہی نکاح کرنا چاہئے۔ باندی سے نکاح اس وقت کرنے کی اجازت ہے۔ جب آزاد عورت سے نکاح کرنے کی کوئی سبیل نہ رہے۔ امام ابو حنیفہ کا یہ ہی مذہب ہے۔ کہ آزاد عورت سے نکاح کی قدرت

ہوتے ہوئے باندی سے نکاح کرنا مکروہ ہے (معارف)

الْمُحْصَنٰتِ ۔ اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ (جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو) کہ آزاد مسلمان عورت سے نکاح کر سکے (تو وہ مسلمان باندی سے نکاح کر سکتا ہے) احصان کے معنی ہیں روک میں آجانا۔ قید میں آجانا۔

الاحصان هو أن يحمى الشئ (ابن قتیبہ)

الاحصان فی اللغة المنع (کبیر)

مُحْصَنٰت کے معنی ہوئے قید میں آجانے والی عورتیں۔ مراد شادی شدہ عورتیں ہیں۔ عقد نکاح کو قید (احصان) سے تعبیر کرنے میں اشارہ اس طرف نکلا کہ ازدواج خود محافظ عفت ہے۔ ای هنّ لِلنِّسَاءِ ذَوَاتِ الْاَزْوَاجِ اَحْصَنُوْهُنَّ وَ مَنَعُوْهُنَّ ۔ (ابن قتیبہ) مطلب یہ کہ محصنہ اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا پہلے نکاح ہو۔ اب کوئی دوسرا شخص اس کو اپنے نکاح میں نہیں لے سکتا نہ خود وہ پہلے خاوند کے ہوتے ہوئے دوسرے کے عقد میں جا سکتی ہے۔ پھر یہ لفظ احصان صرف منکوحہ کے لیے خاص نہیں بلکہ ہر پاک دامن اور عفیف عورت کو جو آزاد اور شریف النفس ہو محصنہ کہتے ہیں۔ اور آیت مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ میں مُحْصَنٰت سے مراد شریف مسلمان آزاد عورتیں ہیں۔ جو ابھی کسی کے حبالۂ عقد میں آئی ہوں۔ چونکہ ان حرائر کے اخراجات اور حقوق زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اجازت دی کہ اگر آزاد عورتوں سے نکاح کی وسعت نہ ہو تو باندیوں سے نکاح کی اجازت ہے۔

امرأة حصان عفیفہ عورت۔ حَصَان کی جمع حُصُنٌ آتی ہے اور امْرَأَةٌ حَاصِنٌ بھی کہتے ہیں اس کی جمع حَوَاصِنٌ ۔ الحِصَان کے معنی محصنہ عورت کے ہیں خواہ وہ احصان پاکدامنی کی وجہ سے ہو اور یا دوسرے کے ساتھ نکاح کر لینے کی وجہ سے۔ چنانچہ صاحب تفسیر قرطبی فرماتے ہیں کہ (المحصنٰت) یرید الحرائر۔ یعنی یہاں محصنٰت سے مراد مطلق آزاد عورتیں ہیں

مُسٰفِحٰت ۔ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ ۔ یعنی جو عورتیں قید نکاح میں لائی جائیں وہ محض مستی نکالنے والیاں نہ ہوں۔ مُسٰفِحٰت سے مراد کھلی فاحشہ اور کسبی عورتیں ہیں۔ یہ عورتیں دوسرے سے اگر نکاح کرتی ہیں تو ان کے پیش نظر محض تعیش ہوتا ہے۔ سَفَحَ يَسْفَحُ سُفُوْحًا وَ سَفْحًا ۔ خون یا آنسو بہانا۔ السَّفَّاحُ ۔ بہت خون بہانے والا۔ قاتل، ظالم۔ السِّفَاحُ زنا بدکاری

اَخْدَان ۔ وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۔ اور نہ وہ مخفی یاریاں لگانے والیاں ہوں۔

اخدان یہ جمع ہے۔ اس کی واحد خِدْنٌ اور خَدِيْنٌ آتی ہے۔ یہاں قرآن پاک نے فاحشہ عورتوں کی دو صفات کا ذکر کیا ہے۔ ایک مُسٰفِحٰت اور دوسری اَخْدَان۔ مسافحات تو ان عورتوں کو کہا جاتا ہے جو کھلے طور پر ارتکاب

زنا کرتی ہوں کوئی ایک ان کا آشنا نہیں ہوتا
بلکہ یہ تمام زانیوں کا متاع مشترک ہوتی ہیں ۔
دوسری اخدان یہ وہ فواحش ہیں جو اندرونِ
خانہ محدود اور متعین افراد سے عشق لڑاتی ہیں ۔
المسافحة ۔ المجاهرة بالزنٰى التى تكرى
نفسها لذلك و ذات الخدن هى التى
تزنى سرًّا (قرطبی)
عرب میں یہ دوسری قسم پسندیدہ تھی جو بڑے
درجہ کے لوگوں کی معمول بہا تھی ۔
غیر مسافحات ۔ غَیرَ زَوَانٍ (القرطبی ج۵ ص۱۴۳)
علامہ دریابادی لکھتے ہیں کہ دنیائے حسن
بیسواؤں کی دو قسمیں تقریباً ہر جگہ قائم رہی ہیں
ایک کھلی ہوئی کسبیاں دوسری چھپی ہوئی
خانگیاں ۔ جاہلیت عرب کے تمدن میں بھی یہ ہی
تفریق قائم تھی (حاشیہ ماجدی)

اَلْعَنَتَ ۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِىَ الْعَنَتَ
مِنكُمْ ۔ عَنَتَ يَعْنُتُ عَنَتًا ۔ عَنَتَ
فلانٌ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی مشکلات
میں پھنس جائے ۔ مطلب آیت یہ ہوگا کہ یہ اجازت
نکاح ان رجال کے حق میں ہے جو اپنی عفت
وعظمت کی حفاظت اور بچاؤ پر قدرت نہ رکھ
سکیں ۔ ان کو یہ خطرہ ہو کہ کہیں غلط عمل
نہ کر بیٹھیں ، تو یہ باندیوں سے نکاح کر سکتے
ہیں ۔ لیکن بہتر صورت حال صبر و تحمل ہے ۔

سُنَنٌ ۔ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ
الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ ۔ سُنَنٌ یہ سُنَّةٌ
کی جمع ہے اور سُنَّةٌ واضح اور کھلے راستہ
کو کہا جاتا ہے ۔ تَنَحَّ عَنْ سَنَنِ الطريق
راستہ کے کھلے حصہ سے ہٹ جاؤ ۔ سنۃ النبی
سے مراد آپ کے اختیار کردہ طریقے ہوتے ہیں ۔
اور سُنۃ اللہ سے مراد حق تعالیٰ کی حکمت اور طاعت
و بندگی کا طریقہ ہوتا ہے ۔

اَلْجَارِ ۔ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ
الْجُنُبِ ۔ الجار ۔ پڑوسی ۔ ہمسایہ ۔ ہر وہ شخص
جس کی سکونت گاہ دوسرے کے قریب اور
مکان کے متصل ہو وہ اس کا جار کہلاتا ہے ۔
جار : ان الفاظ میں سے ہے جو دوسرے کے
تقابل سے معنی دیتے ہیں کیونکہ کسی کا پڑوسی
ہونا اس وقت متصور ہو سکتا ہے جبکہ دوسرا
بھی اس کا پڑوسی ہو ۔ چونکہ ہمسائے کا حق عقلاً
اور شرعاً بہت بڑا حق سمجھا گیا ہے ۔ اس بنا پر
ہر وہ شخص جس کا حق بڑا یا وہ کسی دوسرے حق
کو بڑا خیال کرتا ہو اسے اس کا جار کہدیتے ہیں ۔
الجار ذی القربٰی سے مراد وہ پڑوسی ہے
جو اپنا رشتہ دار عزیز بھی ہو ۔ اور الجار الجنب
وہ ہمسایہ جو غیر رشتہ دار ہو ۔ کہتے ہیں
اِسْتَجَرْتُهٗ فَاَجَارَنِى ۔ یعنی میں نے اس سے
پناہ مانگی تو اس نے مجھے پناہ دیدی ۔ گویا یہ
ایک دوسرے کے قریب رہنے کی وجہ سے اخلاقاً
اور شرعاً ایک دوسرے کے معاون اور مددگار
ہیں اِنِّى جَارٌ لَّكُمْ ۔ میں تمہارا مددگار ہوں
وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ۔ وہ پناہ دیتا ہے

اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دی جاسکتی۔
وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ۔ زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطعات ہیں۔ اور لفظ جار کا صلہ جب عن استعمال ہو تو معنی راستے سے ہٹ جانے کے ہوتے ہیں۔ جَارَ عَنِ الطَّرِيقِ کا مطلب یہ ہے۔ راستہ سے ہٹ گیا۔ علامہ قرطبی نے ان دونوں جملوں پر طویل کلام کیا ہے۔ اور اہل علم کے متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ جار ذی القربٰی سے مراد مسلمان پڑوسی ہے اور جَارِ الْجُنُبِ سے مراد غیر مسلم، یہودی، نصرانی وغیرہ (القرطبی)

الْجَنْبِ - وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ:
صاحب جنب ہم مجلس۔ اس ہم مجلسی میں یا صحبت ورفاقت میں کوئی قید نہیں۔ رفاقت ومصاحبت خواہ سالہا سال کی ہو یا چند منٹ کی بہرحال اپنا حق قائم کر جاتی ہے (ماجدی) وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ کے لفظی معنی ہم پہلو ساتھی کے ہیں جس میں وہ رفیق سفر بھی داخل ہے جو ریل میں، جہازمیں، بس میں، گاڑی میں آپ کے برابر بیٹھا ہو۔ اور وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی عام مجلس میں آپ کے برابر بیٹھا ہو۔ (پوری تفصیل کو معارف القرآن میں دیکھا جائے)

مُخْتَالًا - إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا۔ اللہ تعالیٰ قطعاً ایسوں کو دوست نہیں رکھتا جو خود بین ہیں - فخار ہیں۔ مختال وہ ہے جو اپنی بڑائی کے خیال میں گرفتار رہتا ہے۔ اور عزیزوں قریبوں اور پڑوسیوں کے حقوق کی طرف التفات کرنے میں کسر شان سمجھتا ہے

المختال : ذوالخُيَلاءِ اى الكبر (قرطبی)
اس کی اصل خَالَ يَخَالُ خَيْلًا وَخِيْلًا وخَالًا وَمَخَالَةً - وہم کرنا۔ گمان کرنا۔ اس میں مضارع واحد متکلم کا صیغہ إِخَالُ اور أَخَالُ دونوں طرح مستعمل ہے۔

الخائل : متکبر اور مغرور۔ جمع خَالَةٌ اور الخالة مغرور عورت کو بھی کہتے ہیں۔
مختال: یہ باب افتعال سے فاعل ہے۔ اِخْتَالَ اختيالاً کے معنی ہوتے ہیں تکبر کے ساتھ اکڑ کر چلنا۔ الخَيَالُ : وہم وگمان۔ جمع اَخْيِلَةٌ المُخَيِّلَةُ والخِيَالِيَّة قوت خیالیہ۔

الخيال : اس دماغی صورت کو بھی خیال کہا جاتا ہے جو کسی شخص یا چیز کے سامنے سے ہٹ جانے کے بعد دماغ میں رہ جاتی ہے۔

الخيال : اصل میں اس صورت مجردہ کو کہتے ہیں جو خواب یا آئینے میں نظر آتی ہے یا کسی کی عدم موجودگی میں دل کے اندر اس کا تصور آتا ہے۔

فَخُورًا - فَخُورٌ وہ ہے جو دوسروں پہ اپنا فخر زبان سے جتلاتا ہے۔ اور اپنی بڑائی کے تذکروں میں خوش ہوتا رہتا ہے۔ فخر کے معنی ان چیزوں پر اترانے کے ہیں جو انسان کے ذاتی جوہر سے خارج ہوں جیسے مال وجاہ وغیرہ۔
اس میں دو لغات ہیں۔ ایک فَخْرٌ بسکون الخاء اور دوسرا فَخَرٌ بفتح الخاء فَخُورٌ اور فَخِيرٌ

دونوں اسم مبالغہ کے صیغے ہیں۔ فخر کرنے والے کو فاخر کہا جاتا ہے۔ اور ہر عمدہ اور نفیس چیز کو بھی فاخر کہا جاتا ہے۔ ثَوْبٌ فَاخِرٌ قیمتی لباس۔ اَلْفَخَّار: مٹکوں کو کہتے ہیں چونکہ وہ بھی ٹھونکا لگانے سے ایسے بجتے ہیں جیسے کوئی بڑا متکبر غرور سے بولتا ہے۔

مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے۔ الْفَخُوْرُ الذي يَعُدُّ مَنَاقِبَهٗ فَخْرًا۔ والفخر البذخ والتطاول (قرطبی)

اَلْبُخْل ۔ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ۔ اپنے جمع کردہ ذخائر کو ان جگہوں میں خرچ کرنے سے روکنا جہاں انھیں روکنا نہیں چاہئے تھا۔ یہ الجُود کے بالکل بالمقابل ہے جس کے معنی سخاوت کے ہیں۔

بَخِلَ (س) اس نے بخل کیا۔ بخیل اسم مبالغہ کا صیغہ ہے بہت بخل کرنے والا۔ پھر ان بخیلوں کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ہیں جو خود اپنے مال کو حق اور جائز مصرف میں خرچ نہیں کرتا۔ دوسرے وہ بخیل جو خود بھی خرچ نہیں کرتے اور دوسروں کو یہ ہی تبلیغ کرتے ہیں کہ کسی امر خیر میں خرچ نہ کریں یہ بخیلوں کے استاد ہیں۔

قَرِيْنًا ۔ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ۔ قرین ساتھی اور دوست یہ اقْتِرَانٌ سے فعیل کے وزن پر اسم مبالغہ ہے اور مقارن کے معنی میں ہے۔ والقرين: المقارن

ای الصاحب والخليل (قرطبی)

یہاں معنی آیت میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ جس نے دنیا میں شیطان کی دعوت کو قبول کیا اور اس کی اتباع کر لی تو گویا اس نے شیطان کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ جو بہت بُرا ہے۔ قرین کی جمع قُرَنَاءُ آتی ہے دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ جس کا ساتھی آخرت میں شیطان ہو وہ بہت بُرا ساتھی ہے۔ دونوں احتمال آیت کے بیک وقت مصداق ہیں چونکہ آخرت میں جو مُصَاحَبَت ان حرمان ایمانوں کو شیطان کے ساتھ ہوگی وہ دنیا ہی کے اعمال کا ثمرہ ہوگی۔

سُكٰرٰى ۔ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى۔ نماز کے قریب نہ جاؤ اس حالت میں کہ تم نشے میں ہو۔

یہ سُكْرَان کی جمع ہے جیسا کہ كُسَالٰى كَسْلَانٌ کی جمع ہے۔ سَكِرَ يَسْكَرُ سُكْرًا مدہوش و بیخود ہو جانا مغلوب العقل ہونا۔ بے خود ہونا۔ متحیر ہونا۔

والسکر نقيض الصحو (قرطبی)

سكرت عينه تحيرت۔ اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا آنکھوں کو اشتباہ ہو گیا۔ ہماری آنکھیں مخمور ہو گئی ہیں۔ اَلسُّكْر دراصل اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جائے

نَطْمِسَ ۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا اس سے پہلے کہ ہم چہرے بگاڑ ڈالیں۔ طَمَسِ وجہ

سے مراد چہرے کے نقش و نگار اور آنکھ و ناک اور منہ وغیرہ اعضاء کو مٹا دینا۔

طَمَسَ کے معنی ہیں کسی چیز کے اثر کو زائل کر کے اس کا نام و نشان مٹا دینا فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ۔ جب ستاروں کو بے نور کر دیا جائیگا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ۔ اے پروردگار ان کے مال و دولت کو برباد کر۔

اَلطَّمْسُ : اِسْتِيصَالُ اثرِ الشئِ (قرطبی)

اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوهًا۔ ای نَمْحُوَ تخطيطَ صُوَرِهَا (کشاف)

طَمَسَ يَطْمِسُ وَيَطْمُسُ طَمْسًا دونوں لغت ہیں۔ طَمَسَ اور طَسَمَ دونوں ایک ہی معنی دیتے ہیں۔ طَمَسَ الاثر وطَسَمَ ای اَمْحٰى كُلّه لغات (قرطبی)

فَتِيلًا۔ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا۔ اُن پر دھاگہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ فتیل کے لفظی معنی دھاگہ کے ہیں۔ عربی محاورہ میں مراد حقیر سے حقیر، چھوٹی سے چھوٹی چیز ہوتی ہے[1] فَتَلَ الحَبْلَ يَفْتِلُ فَتْلًا۔ رسّی بانٹنا فتیل دراصل اس دَیرے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی شگاف میں ہوتا ہے۔ والفتيل۔ المفتول وسُمّی مایکون فی شق النّواة فتيلًا لکونه علٰی هيئته (راغب)

والفتیل : الخيط الذی فی شق النواة التمرة (قرطبی)

الْجِبْتِ۔ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ بُت اور شیطان کو مانے ہوئے ہیں۔ سورۂ نساء کی آیت ۵۱ میں دو لفظ الجبت اور الطاغوت کا ذکر کیا گیا۔ ان سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کے اس بارہ میں متعدد اقوال ہیں۔ ابن عباسؓ، ابن جبیر، ابو العالیہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ جبت حبشی لغت میں ساحر کو کہتے ہیں اور طاغوت سے مراد کاھن ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جبت سے مراد سحر ہے اور طاغوت سے مراد شیطان ہے مالک بن انس سے منقول ہے کہ اللہ کے سوا جن چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کو طاغوت کہا جاتا ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں : وقول مالك فی هذا الباب حسن۔ امام مالک کا قول اس بارے میں زیادہ پسندیدہ ہے۔ کیونکہ اس کا ثبوت قرآن سے بھی ہوتا ہے۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔

علم حدیث کے مشہور راوی حضرت عکرمہ کا قول ہے کہ جبت اور طاغوت سے کعب بن اشرف اور حیّ بن اخطب مراد ہیں۔

علامہ قرطبی نے آخر میں ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ الجبت كل ما حرّم الله والطّاغوت كلّ ما يطغى الانسان۔

غرض یہ کہ الجبت کا اطلاق اللہ کے سوا ہر معبود پر ہوتا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ اس کا استعمال ساحروں و کاھنوں اور اس طرح کے دوسرے شعبدہ بازوں پر ہوتا ہے۔ اور طاغوت بھی

[1] ما بعدی

درحقیقت باطل خدا پرستی ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن طاغوتیت میں تمرد، سرکشی اور کبر و غرور بھی ہوتا ہے۔ اور یہ طاغوت انسان کے مزاج میں بغاوت پیدا کر دیتے ہیں اور یہ طاغوتیت زدہ راہِ حق سے محروم ہو جاتا ہے۔

یُقال لکلّ ما عُبِد من دون اللّٰہ "الجبتُ"[1]۔

حدیث میں حضور علیہ السلام کا اپنا ارشاد ہے الطِیَرَۃُ والعِیافَۃ والطُرُقُ مِنَ الجبت

بدشگونی لینا۔ اور پرندوں کے آواز اور گذر وغیرہ سے حالات بتلانا۔ اسی طرح گٹیاں مارنا یا رمل زائچہ وغیرہ کھینچ کر حالات بتانا۔ یہ سب جبت ہیں۔ واللہ اعلم

الجبت: الاصنام وکل ما عُبِد من دون اللّٰہ۔ و الطاغوت: الشیطان (کشاف)

موجودہ صدی کے عظیم مفسر اور فقیہ مفتی اعظم پاکستان نے لکھا ہے کہ ان متعدد اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے اس لیے سب ہی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کہ اصل میں جبت تو بُت ہی کا نام تھا لیکن بعد میں اس کا استعمال اللہ کے سوا دوسری عبادت کی جانی والی چیزوں پر بھی ہونے لگا۔

(معارف القرآن)

نَقِیْرًا ۔ فَاِذًا لَّا یُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِیْرًا

تو یہ تو لوگوں کو تل بھر نہ دیں۔ (ماجدی)

نقیر کے لفظی معنی اس گڑھے کے ہیں جو کھجور کی گٹھلی میں ہوتا ہے۔ کھجور کی گٹھلی کے متعلق قرآن پاک میں تین الفاظ وارد ہوتے ہیں۔ ایک فتیل جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے کہ فتیل اس باریک تاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اندر باریک سا لمبے طور پر ہوتا ہے۔ دوسرا نقیر ہے۔ یہ ایک نہایت اور چھوٹا سا ذرہ گٹھلی کے سر پر پشت کی جانب ہوتا ہے۔ اور یہ نقیر ہی وہ ذرہ ہے جس سے درخت اگتا ہے

و النقیر: وھو النقرۃ التی فی ظھر النواۃ (جمل)

(کشاف) النقیر: وھو النکتۃ التی فی ظھر النواۃ ومنہ تنبتُ النخلۃ (قرطبی)

تیسرا لفظ القطمیر ہے جو کھجور کی گٹھلی کے اس چھلکے کو کہتے ہیں جو اس کے اوپر لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ ان تینوں الفاظ کا استعمال شئ حقیر کے لیے ہوتا ہے۔ اور نقیر اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کو کھود کر اس میں نبیذ بھرا جاتا ہے۔

النقر: کسی چیز کو کھٹکھٹانا حتی کہ اس میں سوراخ ہو جائے۔ المنقار کھٹکھٹانے کا آلہ۔ پرندے کی چونچ۔ چکی کندہ کرنے کی اوزار۔ النقرۃ: وہ گڑھا جس میں سیلاب کا پانی باقی رہ جاتا ہے۔ نَقَرتُ الرجلَ۔ زبان کو تالو سے لگا کر آواز نکال کر کسی آدمی کو بلانا

النقیر: وھو النقطۃ التی فی النواۃ (ابن کثیر)

النقیر: وُقبۃٌ فی ظھر النواۃ (راغب)

نَضِجَتْ ۔ کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ

جب کبھی اُن کی جلدیں پک جائیں گی ہم ان کی جلدوں کو بدل کر دوسری کر دیا کریں گے تاکہ برابر تازہ عذاب چکھتے رہیں (ماجدی)

[1] راغب

نضج : کے لفظی معنی پک جانے کے ہیں۔ یہاں مراد جل چکنے سے ہے۔ مقصود یہاں یہی ہے کہ عذاب منقطع نہ ہوگا اور عذاب ہمیشہ تازہ رہے گا۔
المقصود دوام العذاب وعدم انقطاعها
(ماجدی از کبیر)

نضج اللحم : گوشت کا پوری طرح پک جانا
نضیج الرأی : اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو پختہ رائے والا ہو۔ نَضِجَ نَضْجًا و نُضْجًا : پکنا
والمعنی فی الآیة تبدل الجلود جلودًا اُخرٰی [1]

یہاں بعض ملاحدہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ایسی جلدوں کو بدل کر عذاب میں مبتلا کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے جنہوں نے کوئی نافرمانی نہیں کی۔ امام قرطبی نے اس کا جواب یہ دیا کہ جلدوں کو عذاب اور عتاب کرنا مقصود نہیں بلکہ اصل عذاب نفس کو دینا ہے۔ جلد تو صرف نفسِ مجرم میں احساس پیدا کرنے کا سبب ہے۔

شَجَرَ ۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰی يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ۔ تیرے رب کی کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایمان دار نہیں ہو سکتے جب تک ان جھگڑوں میں بھی آپ کو حکم نہ مان لیں جو اُن کے آپس میں اُٹھتے ہیں۔

شجر کے معنی اصل میں اختلاف اور اختلاط کے ہیں درخت کو بھی شجر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں مختلف ہوتی ہیں اور اس اختلاف کے باوجود ایک تنہ اور ان سب کا مرکز ہوتا ہے۔ سب شاخیں اسی سے سب پیوست ہوتی ہیں۔

شجر۔ درخت اس کی جمع اشجار آتی ہے۔ شجرات اور شَجَرَةٌ بھی جمع ہیں۔ ہودج میں لگی ہوئی لکڑیوں کو بھی شجار کہتے ہیں جمع شواجر آتی ہے۔
شَجَرَ معناہ : اختلف، اختلط و منه الشجر لاختلاف اعضائه (قرطبی)
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ سے مراد باہمی جھگڑے ہیں۔

حَرَجًا ۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ و پھر جو آپ فیصلہ کریں اس میں یہ اپنے دلوں میں تنگی بھی محسوس نہ کریں۔

الحَرَجُ اور الحَرَاجُ کے اصل معنی اشیاء کے جمع ہونے کی جگہ کے ہیں اور جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور موجود ہے اس لیے تنگی اور گناہ کو بھی حَرَج کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں کئی جگہوں میں لفظ حَرَج گناہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۔
اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی۔
حَرِجَ صَدْرُهُ ۔ سینہ تنگ ہونا
يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا ۔
حَرَجٌ جمع أَحْرَاج وحِرَاج و حَرَجَة جمع حرجات
اصل میں حَرَج کے معنی کسی چیز کے مجتمع ہونے کی جگہ کے ہیں۔ ایک جگہ جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور موجود ہے۔ اس لیے تنگی اور گناہ کو حَرَج کہا گیا [2]

حِذْر ۔ خُذُوا حِذْرَكُمْ ۔
یعنی اپنے بچاؤ کا سامان تیار رکھو۔ الحِذْرُ : بچاؤ
وقیل خُذُوا السلاح حذرًا (قرطبی)
الحذرُ : خوف زدہ کرنے والی چیز۔ حَذِرَ يَحْذَرُ سمع سے آتا ہے۔ اور حَذَارِ اسم فعل ہے بمعنی ڈر۔

---
[1] قرطبی ۔ [2] نعمانی

اِنْفِرُوْا - فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ - گروہ در گروہ کوچ کرو۔ نَفَرَ يَنْفِرُ نَفْرًا و نُفُوْرًا - و نِفَارًا نَفَرَ: اُن الفاظ میں سے ہے جن کے معنی صلہ سے بدلتے ہیں۔ نَفَرَ مِنْ كَذَا۔ نفرت کرنا، ناپسند کرنا۔ نَفَرَ عَنْ كَذَا۔ اعراض کرنا۔ نَفَرَ الْقَوْمُ متفرق ہو جانا۔ نَفَرَ اِلَى الشَّئِ - جلدی کرنا۔ کسی چیز کی طرف سبقت کرنا۔ مَا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا - وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا۔ مگر وہ اس سے دُور بدک جاتے ہیں۔ نَفَرَ اِلَى الْحَرْبِ ۔ لڑائی کے لیے نکلنا۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا - تم ہر حالت میں کافروں سے جنگ کیلئے نکلو۔ چاہے سامانِ جنگ اور اسبابِ معیشت تھوڑے ہوں یا زیادہ۔ فَانْفِرُوْا۔ مطلب یہ کہ دشمن سے لڑنے کے لیے تیار رہو۔ المعنى انهضوا لِقتال العَدُوِّ (قرطبی)

ثُبَاتٍ - ثُبَات ثُبَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی چھوٹی سی جماعت کے ہیں۔ جس کو فوجی دستہ (سریہ) کہتے ہیں۔ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم جہاد کے لیے نکلو تو اکیلے اور تنہا نہ نکلو بلکہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں یا بڑے لشکر کے ہمراہ نکلو۔ شاعر کا قول ہے ع

وَ قَدْ اَغْدُوْ عَلٰى ثُبَةٍ كِرَامٍ

اور میں شریف لوگوں کی جماعت کے پاس جاتا ہوں۔ اسی سے محاورہ ہے ثَبَّيْتُ عَلٰى فُلَانٍ کسی کے متفرق محاسن بیان کرنا۔ ثُبَةٌ کی تصغیر ثُبَيَّةٌ آتی ہے۔ لہٰذا یہاں حرف یاء محذوف ہوگا۔ لیکن ثُبَةُ الْحَوْضِ جس کے معنی وسط حوض کے ہیں جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ یہ اجوف ہے اور اس میں عین کلمہ محذوف ہے۔ اور اس کا عین کلمہ واؤ ہے۔ اس کی تصغیر ثُوَيْبَةٌ آتی ہے لہٰذا ثُبَۃ الحوض اجوف ہے جو ثَابَ يَثُوْبُ سے ہے۔ اور ثُبَةُ الجماعَة یہ معتل ہے یہ ثَبَا يَثْبُوْ سے مثل خَلَا يَخْلُوْ کے ہے۔

ثُبَاتٍ: معناه جَمَاعَاتٍ متفرّقات (قرطبی)

يُبَطِّئَنَّ - وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ لقیناً تم میں کوئی ایک گروہ ایسا بھی ہے جو دیر لگاتا ہے۔ یعنی جہاد میں شرکت سے بچنے کی کوشش میں رہتا ہے اور ٹال مٹول کرتا رہتا ہے یہاں مراد منافقین پر تعریض کرنا ہے اور مِنْكُمْ اس لیے ارشاد فرمایا کہ بظاہر وہ مسلمانوں کی صف میں داخل تھے۔

اَلْبُطْوُءُ: کے معنی ہیں چلنے میں دیر لگانا اور سستی کرنا اور یہ باب كَرُمَ و تفاعل اور استفعال اور افعال اور تفعیل سے استعمال ہوتا ہے اس کے تمام ابواب میں اصل معنی دیر کے ملحوظ ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جب كَرُمَ سے اس کا استعمال ہو تو اس وقت مراد یہ ہوتا ہے کہ دیر کرنے والا اس کا عادی ہے اور جب تَبَاطَأَ تفاعل سے ہو تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دیر کرنے والا اس فعل کا عادی مجرم تو نہیں لیکن کام ناپسند ہونے کی وجہ سے اس سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہتا ہے اور بتکلف دیر لگا کر ٹال مٹول کرتا ہے۔

اور باب استفعال میں طلب کے معنی پائے جاتے ہیں۔ یعنی اس سست رو کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے بھی مجھ جیسے ہو جائیں۔ اور اس میں باب افعال اَبْطَأَ اور تفعیل بَطَّأَ لازم اور متعدی دونوں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں بَطَّأَهُ اور اَبْطَأَهُ مؤخر کرنا۔ یہ معنی متعدی ہیں۔ اَبْطَأَ عَنْ كَذَا وَ بَطَّأَ عَنْهُ متأخر ہونا۔ تَبَطَّأَ وَتَبَاطَأَ فِيْ سَيْرِهٖ۔ چلنے میں پیچھے رہنا دیر لگانا۔ حاصل یہ کہ اَلْبُطُوْءُ میں لازم اور متعدی دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ اور آیتِ کریمہ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ میں دونوں معنی مراد ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ کچھ افرادِ امتِ مسلمہ کی صفوں میں ایسے بھی گھس گئے ہیں جو جہاد میں نہ تو خود شریک ہونا چاہتے ہیں اور نہ دوسروں کا شریک ہونا پسند کرتے ہیں۔

اَلتَّبْطِئَةُ وَالْاِبْطَاءُ اَلتَّاَخُّرُ۔ ما اَبْطَاَكَ عَنَّا فَهُوَ لَازِمٌ وَيَجُوْزُ بَطَّأْتُ فُلَانًا عَنْ كَذَا۔ اَیْ اَخَّرْتُهُ۔ فَهُوَ مُتَعَدٍّ (قرطبی) و مثلہ فی الکشاف و راغب

بُرُوْج ۔ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ تم جہاں کہیں بھی ہوگے، وہیں تمہاری موت آئے گی۔ خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں ہو۔ مطلب یہ کہ اگر جہاد سے اس لیے جی چراتے ہو کہ موت سے بچ جاؤ تو موت تو ہر حال میں آتی ہے۔

اَلْبُرُوْجُ: یہ بُرْجٌ کی جمع ہے۔ بلند عمارت اور عظیم محل پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

وواحد البروج بُرْجٌ۔ وهو البناء المرتفع والقصر العظيم (قرطبی)

البُرج الحصون (کشاف) البُرُوجُ فی کلام العرب الحصون والقلاع۔

(جمل بحوالہ خازن)

معلوم ہوا کہ کلامِ عرب میں بُرج کے اصل معنی تو قصر اور محل کے ہیں پھر اس کو وسعت دے کر ستاروں کی مخصوص منازل پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: وَالسَّمَاۤءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ۔ اَلَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاۤءِ بُرُوْجًا اور قرآن پاک کی آیت وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ میں دونوں احتمال ہیں۔ اگر بروج السماء مراد ہو تو اس کے ساتھ لفظ مُشَیَّدہ کا استعمال بطور استعارہ ہوگا اور صرف مفہوم مراد ہوگا۔ اور کلامِ عرب میں اس طرح کا مفہوم مراد لیا گیا ہے۔ عرب کے مشہور شاعر زھیر کا کلام ہے۔ کہتا ہے:

وَمَنْ هَابَ اسبابَ الْمَنَايَا يَنَلْنَهٗ
ولو نَالَ اسبابَ السَّمَاۤءِ بِسُلَّمِ

یعنی جو شخص اسبابِ موت سے ڈرتا ہے تو وہ لامحالہ اس کو پالیں گے اگرچہ سیڑھی لگا کر آسمان کے اسباب پر کیوں نہ چڑھ جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم بروج السماء میں جو محکم ترین ہیں چلے جاؤ تو موت سے نہیں بچ سکتے۔ دوسرا قوی احتمال یہ ہے کہ بُروج سے مراد بُروج الارض ہوں۔

ثعلبہ بن عمرو العبدی کہتا ہے۔

وَلَو کُنتُ فِی غُمدَانَ یَحرُسُ بَابَہ
اراجیل أحبُوشٍ واسودُ آلفٍ
اذاً لاَ تَتَنِی حَیثُ کُنتُ مَنِیَّتِی
یَحُثُّ بِہَا ھَادٍ لِاَثرِی قَائِفٌ

اگرچہ میں قلعہ غمدان میں بھی چلا جاؤں جس کے دروازوں پر حبشی پہرہ دے رہے ہوں تو پھر بھی موت میرے پاس پہنچ جائے گی۔ جیسے ایک قائف حُدی خواں میرے نقشِ قدم پر چلا جا رہا ہو۔

علم تفسیر کے مشہور مفسر امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اصح یہ ہے کہ یہاں قرآن کی مراد بُرج الارض ہیں چونکہ انسانی قوت وبس میں زمین ہی کے قلعوں میں اپنا بچاؤ کرنا ہیں۔

فقال الاکثر وھو الاصح۔ انه اراد البروج فی الحصون التی فی الارض المبنیة لانہا غایة البشر فی التحصن والمنعة (قرطبی)

ثوب مبرج: اس کپڑے کو کہتے ہیں جس پر برجوں کی تصویریں نقش ہوں۔ پھر ان نقوش میں خوب صورتی کا تصور پاکر اس سے تبرجت المرأة کا محاورہ نکلا جس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تبرجت المرأة عورت نے مزین کپڑے کی طرح اپنی آرائش اور حسن وجمال کا اظہار کیا۔ دوسرا معنی یہ لیا گیا ہے کہ تبرجت المرأة عورت اپنے قصر سے ظاہر ہوئی۔ قرآن پاک میں ہے وَلَا تَبَرَّجنَ تَبَرُّجَ الجَاھِلِیَّةِ الاُولٰی۔ اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح پہلے جاہلیت کے زمانے میں اظہار تجمل کرکے محلات سے نکلا کرتی تھیں اب اس طرح مت نکلو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے غَیرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِینَةٍ بشرطیکہ اپنی زینت کی چیزیں ظاہر نہ کریں۔ پھر لفظ برج کے معنی وسیع اور خوبصورت ہونے کے لحاظ سے خوب صورت اور کشادہ آنکھ کو بھی برج کہتے ہیں۔ وَالبَرَجُ: سعة العین وحسنها تشبیھاً بالبرج فی الامرین (راغب)

البرج: بفتح الراء کے معنی خوبصورت کے آتے ہیں برجت عینه۔ حسین آنکھ والا ہونا۔ جناب عمر فاروق کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ طوالٌ آدلَم اَبرج۔ حضرت عمرؓ لمبے قد، سانولے رنگ کے خوبصورت آنکھ والے تھے۔

مُشَیَّدَةٍ - شَادَ یَشِیدُ شَیدًا۔

شَیَّدَ البِنَاءَ۔ عمارت کو بلند کرنا۔ شَیَّدَ الحَائِطَ دیوار پر چونے کا پلستر کرنا۔ شَادَ جِلدَہٗ بالطِّیبِ۔ جسم پر خوشبو ملنا۔ الشِّید۔ گچ وغیرہ کا پلستر۔ اور المَشِید یہ مفعول ہے۔ پلستر کی ہوئی۔ شَیَّدَ قَوَاعِدَہٗ مکان کی بنیادوں کو چونے گچ وغیرہ سے مضبوط بنانا۔ شَیَّدَ القَصرَ: رفعہٗ او طلاہٗ بالشِّید (جمل)

مشیدة۔ من شادَ القصر اذا رفعه او طلاہ بالشید وھو الجص (کشاف)

معناہ فی قصور من حدیدٍ (قرطبی)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رہنے سہنے اور مال و اسباب کی حفاظت کے لیے مضبوط و عمدہ گھر تعمیر

کرنا نہ خلافِ توکل ہے اور نہ خلافِ شرع ہے (معالم)

بَيَّتَ ۔ اس نے رات میں مشورت کی۔ اس نے تحریف کی۔ اور وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ یہ تَبْيِيْتٌ سے ہے۔ رات کو سوچنا۔ چھپانا۔ تدبیر کرنا۔ تبدیل کرنا۔
اَلتَّبْيِيْتُ : اَلتَّبْدِيْلُ (قرطبی) وبَيَّتَ الرَّجُلُ الْاَمْرَ اِذَا دَبَّرَهٗ لَيْلًا

يَتَدَبَّرُوْنَ ۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اَلتَّدَبُّرُ وَ التَّدْبِيْرُ: کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور و فکر کرنا۔ تَدَبَّرْتُ الشَّيْءَ ۔ فَكَّرْتُ فِيْ مُعَاقَبَتِهٖ ۔ وَالتَّدْبِيْرُ اَنْ يُدَبِّرَ الانسانُ امرہٗ کانّہ ینظر اِلٰی مَا تَصِيْرُ اِلَيْهِ (قرطبی) تُدَبِّرُ الْاَمْرَ. تَاَمُّلُهٗ والنظر فی ادبارہ ومایَؤُوْلُ اِلَيْهِ فِیْ عَاقِبَتِہ ومُنْتَهَاہ (کشاف)
یہ بابِ تَفَعُّل سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔
علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں غور و فکر کرنا واجب ہے، تاکہ معنی معلوم ہوں۔

اَذَاعُوْا ۔ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۔ اور انہیں جب کوئی امن یا خوف کی خبر پہنچتی ہے تو یہ اسے پھیلا دیتے ہیں۔ ذَاعَ يَذِيْعُ ذَيْعًا وَذُيُوْعًا وَذَيْعُوْعَةً ۔ ذَاعَ الْخَبَرُ : خبر وغیرہ پھیلنا اَذَاعَ الْخَبَرَ اِذَاعَةً خبر کو پھیلا دینا۔ افواہ اُڑانا۔ اَلْمِذْيَاعُ : وہ شخص جو اپنے راز کو مخفی نہ رکھ سکے۔ اور اِذَاعَة : اس خبر پھیلانے کو کہتے ہیں جو بغیر کسی صحیح تحقیق کے اُڑا دی گئی ہو۔
اَذَاعُوْا بِهٖ ای اَفْشَوْهُ واظهروہ وتحدثوہ بِهٖ قبل اَنْ یقفوا عَلٰی حَقِيْقَتِهٖ (قرطبی)
الاذَاعَة الاِشَاعَة (جمل)
اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیر یقینی باتوں کو خواہ مخواہ لوگوں کے سامنے بیان کرتے رہنا اور بلا تحقیق کے اٹکل پچو لگانا جائز نہیں۔
حضور علیہ السلام کی ایک حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ : كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ ۔ یعنی انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ ہر سُنی سُنائی بغیر تحقیق کے بیان کر دے

يَسْتَنْۢبِطُوْنَ ۔ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ اس کی اصل نَبَطٌ ہے۔ کنویں کا پہلا پانی۔ اسی سے استنباط ہے جس کے معنی استخراج کے ہیں۔ الاستنباط فی اللغة : الاستخراج (قرطبی) يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ وہ اس کی تحقیق کرتے ہیں وہ اس کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔

حَرِّضِ ۔ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ آپ پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی بجز آپ کی ذات کے۔ اور آپ مسلمانوں کو آمادہ کرتے رہیں۔
تحریض کے معنی ہیں کسی شے کی خوبیاں بکثرت

بیان کرکے اس کی جانب شوق ورغبت دلانا۔ گویا صحیح اور سچا پروپیگنڈہ کرنا۔

التحریض: الحث علی الشیٔ بکثرۃ التزیین وتسھیل الخطب فیہ۔

(از ماجدی۔ راغب)

وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ای حضھم علی الجھاد والقتال (قرطبی) سورۂ انفال میں ہے يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ۔

الحَرَضُ: صاحب مفردات القرآن لکھتے ہیں کہ: الحَرَضُ مَالَا يُعْتَدُّ بِهٖ وَلَاخَيْرَ فِيْهِ یعنی جو چیز اتنی نکمی ہوجائے کہ اس کو درخورِ اعتناء ہی نہ سمجھا جائے وہ الحرض ہے۔ اس لیے جو شخص قریب الہلاک ہو اس کو حَرِضٌ کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر بیماری طول پکڑ جائے یا بیماری کی وجہ سے لاغر وناتواں ہوجائے تو اس وقت بھی عرب کہتے ہیں احرضہُ المرضُ بیماری نے اس کو گلا ڈالا اور ناتوان وکمزور کردیا۔ سورۂ یوسف میں ہے حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهَالِكِيْنَ۔ یعنی آپ اپنے بیٹے یوسف کی یاد میں قریب الھلاک اور ناتوان ہوجائیں گے۔ یا پھر ھلاک ہی ہوجائیں گے۔

حَرَّضْتُ فُلَانًا علی کذا۔ میں نے فلاں کو اُبھارا۔ ترغیب دی۔ جہاد اور قتال سے پہلو تہی کرنا ایک روگ ہے۔ جس کی وجہ سے انسان ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ اور یہ بدترین حرض ہے کہ اگر قومی اور اجتماعی صورت اختیار کرجائے، تو نظام ملک اور تحفظ ملک وملت دونوں مفلوج ہوجائیں۔ اس لیے باری تعالیٰ نے فرمایا کہ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی آپؐ ان کے حرض کا ازالہ فرمائیں

حَرَّضَ فُلَانًا عقل کی خرابی کو درست کرنا۔ كَاَنَّهٗ فِى الْاَصْلِ اِزَالَةُ الْحَرَضِ۔ نحو مَرَّضْتُهٗ وَقَرَّيْتُهٗ۔ ای ازلتَ عَنْهُ المَرَضَ والقذی (راغب) ومثلہ فی الجمل

اَرْكَسَ۔ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا

رَكْسٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے سر پر اُلٹا کر دینا یا اُس کے اول سرے کو موڑ کر پچھلے سرے کے ساتھ ملا دینے کے ہیں۔

الرَّكْسُ والنَّكْسُ: قلب الشیٔ علی رأسہ او ردّ اوّلہ علی آخرہ۔ اَرْكَسَهُمْ وَرَكَسَهُمْ۔ ای رَدَّهُمْ اِلَى الكفر وَنَكَسَهُمْ۔ (قرطبی) اَلْمَرْكُوس (ایضًا) وارتکس فُلَانٌ فی اَمْرٍ كَانَ نجامنہ (قرطبی) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ای رَدَّهُمْ اِلٰى كُفْرِهِمْ (راغب)

حَصِرَتْ۔ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ۔

الحصر: رُکنا۔ گھیر لینا۔ بخیل ہونا۔ دل تنگ ہونا۔ دل پر دباؤ محسوس کرنا۔

حَصِرَ يَحْصُرُ حَصْرًا (س) صفت حَاصِرٌ وحَصِيْرٌ۔ وجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا۔ ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قیدخانہ بنایا ہے۔ اس میں حصیر سے مراد روکنے والا کے

ہیں۔ اور حصیر کے معنی ہیں مِہَاد یعنی سونے
کی جگہ۔ بچھونا وغیرہ کے بھی مستعمل ہیں۔
اسی سے حَصُوْر ہے۔ وہ شخص جس کی فطری پاکیزگی کی
وجہ سے عورتوں کی طرف رغبت نہ ہو۔
اَوْجَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ یا اس حال
میں تمہارے پاس آئیں کہ ان کے دل رُک گئے
اس میں حصر سے مراد بخل یا بزدلی وغیرہ سے سینوں
کا تنگ ہونا ہے۔ ای ضَاقَتْ بالبُخل والجُبْن[1]
الحَصْرُ: التضییق۔ قال عزّ وجلّ وَاحْصُرُوْهُمْ
ای ضَیِّقُوْا عَلَیْهِمْ (راغب)
حَصِرَتْ ای ضَاقَتْ (قرطبی)
الحَصَرُ: الضِّیقُ والانقباض (کشاف)
مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کفار ہیں سے صلح و آشتی
سے رہنا چاہتے ہیں اور نہ وہ مسلمانوں سے براہِ
راست لڑنا چاہتے ہیں اور نہ وہ مسلمانوں کے
خلاف دوسرے کافر قبائل کا تعاون کرتے ہیں،
ان کے ساتھ مسلمان بھی تعرض نہ کریں۔ چونکہ اصل
مقصد تو مسلمانوں کو محفوظ رکھنا ہیں اور وہ ان
کے ہتھیار ڈال دینے سے حاصل ہو گیا۔

اِعْتَزَلُوْا۔ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ اگر وہ تم سے
کنارہ کش ہو جائیں۔ اور تم سے قتال نہ کریں۔
اور تمہارے ساتھ سلامت روی رکھیں تو پھر
تمہارے لیے اُن کے ساتھ لڑنے کی اللہ کی طرف
سے اجازت نہیں۔

اعتزال کے معنی ہیں کسی چیز سے کنارہ کشی
اختیار کرنا اور علیحدہ ہو جانا۔ لفظ اعتزال
بدن اور دل دونوں کی علیحدگی پر بولا جاتا ہے۔
دل کی علیحدگی یہ کہ کسی چیز کو عقیدۃً چھوڑ دینا۔
اور بدن کی علیحدگی یہ کہ دو محسوس جسموں کا آپس
میں مفارقت اختیار کرنا۔ عام اس سے کہ جدائی
اور مفارقت عارضی ہو یا دائمی۔ فَاعْتَزِلُوا
النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ۔ میں وقتی اور عارضی
اعتزال مراد ہے۔ اَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ یہاں دائمی اعتزال مراد ہے
اعتزال باب افتعال سے اصل مادہ عَزْلٌ ہے
اَلْاِعْتِزَالُ: تَجَنُّبُ الشَّیْءِ عِمَالَةً كَانَتْ اَوْ
بَرَاءَةً اَوْ غَیْرَهَا بِالْبَدَنِ كَانَ ذٰلِكَ اَوْ
بِالْقَلْبِ (راغب)
عِمَالَةً سے مراد پیشہ وغیرہ سے علیحدگی مراد ہے

تَحْرِیْرٌ۔ فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ۔
ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا (واجب ہے)
تحریر کے معنی کسی غلام کو آزاد کرنے کے ہیں۔
حَرَّرْتُ الْقَوْمَ میں نے ان کو آزاد کر دیا۔

دِیَةٌ۔ فَدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓی اَهْلِهٖ
تو خون بہا واجب ہے جو اس کے عزیزوں کے حوالہ
کیا جائے گا۔
اَلدِّیَةُ: ما یُعْطٰی عِوَضًا عن دَمِ الْقَتِیْل
اِلٰی وَلِیِّهٖ (قرطبی) دیۃ اس مال کو کہا جاتا
ہے جو قتل کے عوض بطور خون بہا کے مقتول کے ورثہ
کو حکومت دلاتی ہے۔

مُتَعَمِّدًا۔ وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا
اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر دے۔

[1] الراغب

العمد کے معنی کسی چیز کا قصد کرنے اور اس پر ٹیک لگانے کے ہیں۔ العماد وہ چیز جس پر ٹیک لگائی جائے۔ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ سے مراد وہ چیزیں اور اسباب ہیں جن پر اس قوم کو اعتماد تھا عَمَدْتُ الشیٔ و عَمَدْتُ الحائط : دیوار کو سہارا دے کر کھڑا کر دینا۔ اور تعمّد کے معنی قصداً کوئی کام کرنا کے آتے ہیں۔ یہاں یہ ہی مراد ہے کہ جس نے قصداً قتل کیا۔ العمد والتعمد فی التعارف خلاف السھو وھو المقصود بالنیۃ (راغب) اور عَمَدٌ اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جس کے سہارے خیمہ وغیرہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا بغیر ستونوں کے جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔

مَغَانِمُ ۔ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ

مَغَانِم، یہ مَغْنَمٌ کی جمع ہے۔ مالِ غنیمت جو کفار اور دشمن پر فتح حاصل ہونے کے بعد مسلم فوج کو ملے۔ یہ غَنَمٌ سے ماخوذ ہے۔ غنم بکریوں کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ اور الغنم کے اصل معنی ہیں کہیں سے بکریوں کا ہاتھ لگ جانا اور ان کو حاصل کرنا پھر یہ لفظ ہر چیز پر بولے جانے لگا ہے جو دشمن یا غیر دشمن سے حاصل ہو سکیں اس کا عام استعمال قرآن پاک میں اسی مال پر ہوا ہے جو کفار سے حاصل ہو۔ جیسا کہ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ۔ مَغَانِم جمع ہے مغنم کی۔ منفعت حاصل ہونے والا مال۔

اطْمَأْنَنْتُمْ ۔ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۔ پھر جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز کو قائم کرو۔ الطمانینۃ والاطمینان کے معنی ہیں خلجان کے بعد نفس کا سکون پذیر ہونا۔ أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ سن لو کہ دل کا آرام خدا کی یاد میں ہے۔ یعنی نفوس کا خلجان خدا کی یاد ہی سے دور ہو سکتا ہے فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ کا مطلب یہ ہے کہ جب تم سے خوف جاتا رہے اور کافروں کی طرف سے مطمئن ہو جاؤ۔

يَخْتَانُونَ ۔ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ ۔ اور آپ ان لوگوں کی طرف سے وکالت نہ کیجئے جو اپنے حق میں خیانت کرتے ہیں اختیان۔ یہ باب افتعال سے ہے جس کے معنی ہیں خیانت کے لئے حیلہ کرنا۔

خان یخون خوناً وخیانۃً ۔ خان فی کذا: امانت میں خیانت کرنا۔

عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ اور الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ میں خیانت کی نسبت خود خائن کی طرف کر کے یہ بتلا دیا کہ خیانت کا وبال آخر کار خود ہی کے خلاف پڑتا ہے۔

مُرَاغَمًا ۔ وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۔ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین پر رہنے سہنے کی جگہ اور بہت گنجائش پائیگا مُرَاغَماً سے مراد پناہ گاہ ہے۔ مطلب یہ ہے

خدا کے دین کی حفاظت کے لیے اگر کوئی اپنے گھر اور وطن کو چھوڑ دیگا تو اُس کو ہراسان نہ ہونا چاہیے خدا اُس کو کوئی اچھی پناہ دے گا جہاں اس کو وسعت اور فراخی نصیب ہوگی۔
اور دراصل یہ رَغِمْتُ اِلَیْہِ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی کے پاس چلا جانا۔ جیسا کہ غَضِبْتُ اِلیٰ فُلَانٍ۔ ناراض ہوکر کسی دوسرے کے پاس چلا جانا۔ الرُّغَام کے اصل معنی مٹی کے ہیں۔ رَغِمَ اَنْفُہٗ۔ اُس کی ناک مٹی میں مِل جائے یعنی وہ رسوا ہو۔ رغم انف فلان کے معنی ناراض ہونے کے بھی آتے ہیں۔ لفظ مُراغم کی مقبول ترین تفسیر حضرت مفتی صاحب کی ہے۔ فرماتے ہیں آیت کا لفظ مُرَاغَمًا مصدر ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف منتقل ہونا۔ اور منتقل ہونے کی جگہ کو بھی مُراغم کہہ دیا جاتا ہے۔ ان دونوں آیات میں ہجرت کی برکاتِ ظاہرہ وباطنہ کا بیان ہے۔ جن میں اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ جو اللہ اور رسول کے لیے ہجرت کرتا ہے اللہ اس کے لیے دنیا میں راہیں کھول دیتا ہے۔ آخرت کے ثواب و درجات تو وہم و گمان سے بالاتر ہیں۔
اچھے ٹھکانے کی تفسیر مجاھد نے رزق سے اور حسن بصری نے عمدہ مکان سے اور بعض دوسرے مفسرین نے مخالفین پر غلبہ اور عزت وشرف سے کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ چنانچہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب کسی نے اللہ کے لیے وطن چھوڑا ہے تو اللہ نے اس کو وطن کے مکان سے بہتر مکان اور وطن کی عزت وشرف سے زیادہ عزت، وطن کے آرام سے زیادہ آرام عطا کیا ہے۔ (معارف القرآن)

مُرَاغَمًا : ای مُحَوَّلًا یُنْتَقَلُ اِلَیْہِ (جمل)
وقال الامام القرطبی: اختلف فی تاویل المراغم۔ فقال مجاھد: المراغم: المتزحزح وقال ابن عباس والضحاک والربیع وغیرھم المراغم: المتحوّل والمذھب۔ وقال ابن زید والمراغم: المھاجر۔ لیکن ان تمام اقوال میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر مفتی صاحب کا قول نقل کیا گیا ہے۔
اس مہاجر مَا یُنْتَقَلُ اِلَیْہِ کو مراغم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں جب کوئی مسلمان ہوتا تو وہ اپنی قوم کی تمام ناراضگیوں کے باوجود قوم کے عَلَی الرَّغم دار الاسلام میں ہجرت کر جاتا تھا۔ (واللہ اعلم)

یَرْمِ۔ ثُمَّ یَرْمِ بِہٖ بَرِیًٔا
پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دیتا ہے۔
رمٰی یَرْمِیْ رَمْیًا۔ کسی چیز کو پھینکنا۔ الرَّمْیُ کا استعمال جب اجسام یعنی مادی چیزوں میں ہو تو پھر اس کے معنی پھینکنے کے ہی آتے ہیں جیسا کہ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ وَاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ۔ سورۃ المرسلات میں دوزخ کے حالات میں ارشاد ہے: اِنَّھَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ کَالْقَصْرِ۔

دوسرا استعمال اس کا اقوال میں ہوتا ہے۔
قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی اس کا استعمال اقوال میں ہوا ہے وہاں معنی تہمت اور قذف کے ہیں
ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓـًٔا۔ پھر وہ گناہ دوسرے بے گناہ پر ڈال دیتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ (نور) جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں۔
وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ۔ جو پاکدامنوں پر تہمت لگاتے ہیں۔

بُهْتَانٌ ۔ فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا۔ بَهَتَ بَهْتٌ بُهْتَانٌ۔ کسی پر جھوٹ باندھنا۔ الزام لگانا۔ بُهْتٌ۔ کذب جھوٹ۔ بَهْتٌ حیران ہونا۔ حیران کرنا۔
بَهُوْتٌ۔ بہت جھوٹ بولنے والا۔ کذاب غلط گو۔ بَهَتَ (ف) یَبْهَتُ وَبَهِتَ بَهْتًا حیران و ششدر ہونا۔ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ یہ سن کر کافر حیران رہ گیا۔ لاجواب ہو گیا۔
هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ یہ تو بہت بڑا الزام ہے۔ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ۔
یہاں بہتان زنا سے کنایہ ہے۔
بُھتان۔ کسی پر ایسا الزام دھرنا جس سے وہ بری ہو۔ وَالْبُهْتَانُ مِنَ الْبَهْتِ۔ وهو اَنْ یَسْتَقْبِلَ اَخَاكَ بِاَنْ تَقْذِفَهٗ بِذَنْبٍ وَهُوَ مِنْهُ بَرِیْءٌ (قرطبی)

اِثْمًا ۔ اثم وہ بڑا گناہ ہے جس میں قصد و تعمّد لازمی طور پر ہو یا وہ جو بندوں کا گناہ ہو۔ یعنی حقوق العباد میں ہو۔
الاثم لا یکون الّا مِنَ العَمَد (ابن جریر)
او کبیرۃٌ او ما لا یکون من العمد (روح)
ذنبٌ فی مظالم العباد۔ (مدارک) یہ تمام حوالہ جات بعینہ ماجدی سے منقول ہیں۔
اِثم وہ گناہ ہے جو اعمال و افعال کے ثواب سے روکنے والا ہو (راغب)

نَجْوٰی ۔ لَاخَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ
اُن کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے۔
یعنی لوگوں کے باہمی مشورے اور تدبیریں جو فکرِ آخرت سے آزاد ہو کر کیا کرتے ہیں۔ ان میں کوئی خیر نہیں۔ چونکہ جس غور و فکر سے محض چند روزہ دنیا کے معاملات مقصود ہوں آخرت میں اُن کا کوئی نفع نہ ہوگا۔ نَجْوٰىهُمْ میں ضمیر کا مرجع کوئی خاص طبقہ یا گروہ نہیں بلکہ مراد عامّۃ الناس ہیں۔ ای نجوی النّاس جمیعًا (ابن جریر)
اَلنَّجْوٰی : یہ اصل میں مصدر ہے جس کے معنی ہیں الگ اور تنہا ہو کر کسی سے سرگوشی کرنا راز کی بات کرنا۔ اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ۔ یعنی کافروں کی سرگوشیاں شیطان کی حرکات سے ہوتی ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰی۔
اور اسی طرح وَاَسَرُّوا النَّجْوَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اور ظالم لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔
ان تینوں آیات میں نجوٰی مصدری معنی میں ہے اور لفظ نجوٰی بطور صفت بھی قرآن پاک میں

مستعمل ہوا ہے اور جمع واحد دونوں کے لیے یکساں آیا ہے۔ جیساکہ :
النّجِیُّ کے معنی ہیں سرگوشی کرنے والا۔ جیساکہ ارشاد ہے : وَقَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا۔ ہم نے اس سے باتیں کرنے کے لیے قریب کیا۔
اور فَلَمَّا اسْتَیْأَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِیًّا
اور جب وہ اس سے ناامید ہوگئے توالگ ہو کر صلاح کرنے لگے (فتح محمد)
النَّجْوٰی : السِّرُّ بَیْنَ الاثنین (قرطبی)
نَجَا یَنْجُوْ نَجَاۃً وَنَجَاءً وَنَجْوًا۔ خلاصی پانا نجات پانا۔ چھٹکارا حاصل کرنا۔ نجا فلانٌ من فلان۔ کا محاورہ ہے جس کے معنی نجات پانے کے ہیں۔ اور اَنْجَیْتُہٗ اور نَجَّیْتُہٗ کے معنی کسی کو نجات دینا، رہا کرنے کے ہیں۔
قرآن پاک میں ارشاد ہے فَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
وَ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کو بھی اور آپ کے اہل خانہ ایمان والوں کو بھی بچالیں گے۔
ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا۔ پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے۔ اس طرح کی قرآن میں بہت سی مثالیں ہیں۔
النَّجَاۃُ وَالنَّجْوَۃُ بلند جگہ کو کہتے ہیں جو ارتفاع کی وجہ سے دوسری جگہوں سے جدا اور الگ معلوم ہو۔ بعض اہل لغت کا قول ہے کہ نجویٰ اس زمین کو کہتے ہیں جو بلندی کی وجہ سے سیلاب کی زد میں نہ آسکے۔ والنَّجْوَۃُ من الارض المُرتفع المُنفصِل بارتفاعِهِ عمّا حَوْلَهٗ (قرطبی)
وَالنَّجْوَۃُ والنَّجَاۃُ المَکانُ المُرتفع المُنفصَل بارتفاعِهِ عمّا حَوْلَهٗ (راغب)
نَاجَیْتُہٗ کے معنی سرگوشی کرنا کے ہیں۔ چنانچہ صاحب کشاف فرماتے ہیں (لاخَیْرَ فی کثیرٍ مِنْ نَجْوٰهُم) من تناجی الناس۔ لوگوں کا باہم ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشی کرنے کے ہیں۔ لیکن اس کے اصل معنی بلند زمین پر کسی کے ساتھ تنہا ہونے کے ہیں۔ پھر یہیں سے اس کلام کو جو دو آدمی دوسرے سے الگ تھلگ ہو کر کرتے ہیں، نجویٰ کہدیتے ہیں۔
بعض اہل لغت نے کہا کہ نَجْوٰی نَجَاۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں خلاصی حاصل کرنا۔ نَجَا مِن کَذَا کے معنی ہوں گے کسی سے نجات پانا۔ رہائی پانا۔

مَعْرُوْف ۔ المعروف کے معنی ہیں ہر وہ کام جو شریعت میں اچھا سمجھا جائے اور جس کو اہل شرع پہچانتے ہوں۔ اور اس کے مقابل منکر ہے جو شریعت کا ناپسندیدہ ہو اور اہل شریعت میں اس کا کوئی تعارف نہ ہو۔ محض ہوس پرستی سے یہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔
والمعروف اسمٌ لکلّ فعلٍ یُعرفُ بالعقل او الشرع حُسنه (راغب)
والمعروف لفظٌ یعمُّ اعمال البرّ کلّها۔ (قرطبی)

مَرِیْدًا وَاِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا۔ یہ لوگ پکارتے بھی ہیں تو صرف

شیطان سرکش کو۔
المَارِدُ وَالمَرِیْد جنوں اور انسانوں میں سے اس
سرکش کو کہتے ہیں جو ہر قسم کی خیر سے بالکل عاری ہو
وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ
ہر سرکش شیطان سے حفاظت کے لیے۔
یہ شجرٌ اَمْرَدُ سے ماخوذ ہے۔ شجر اَمْرَد
اُس درخت کو کہتے ہیں جس پر پتے نہ ہوں۔ ریت کے
ٹیلے کو بھی رملۃ مرداء اسی لیے کہتے ہیں کہ اس پر
کوئی چیز اُگتی نہیں۔ نوخیز نوجوان جس کے منہ پر ابھی تک
داڑھی مونچھ نہ ہو اَمْرَد کہتے ہیں۔
المَارِدُ والمَرِیْد من شیاطین الجن والانس
المُتعَرِّی من الخیرات (راغب)
المَرِیْد والمارد : ھو الذی بلغ الغایۃ
فی الشر والفساد یُقال مَرَدَ من باب نصر
وظَرُفَ اذا عتا وتجبّر فھو مارد ومَرِید
المَرِیْد : العاتی المتمرد۔ فعیلٌ من
مَرُدَ الرجلُ اذا عتا۔ المَرِید الخارجُ
عن الطاعۃ (قرطبی)

یُبَتِّکُنَّ ۔ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ
بَتَكَ بَتْكًا۔ کاٹنا۔ البَتْكُ اور البَتُّ
کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں مگر بَتَكَ کا
لفظ اعضاء یا بال وغیرہ کے قطع کرنے پر بولا جاتا
ہے۔ کہتے ہیں بتك شَعْرَہٗ بال کاٹا۔ اسی
سے سیفٌ بَاتِكٌ یعنی قاطع تلوار۔ بِتْكَۃٌ
کسی چیز کا قطع کیا ہوا حصہ۔ اس کی جمع بِتَكٌ
آتی ہے اور بَتٌّ کا لفظ رسّی یا تعلق کے قطع
کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اَلْبَتُّ القطعُ (قرطبی)

یُفْتِیْ ۔ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللّٰهُ
يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۔ اور آپ سے عورتوں کے بارے
میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے اللہ اُن کے
حق میں تمہیں ان کا حکم بتاتا ہے۔ اَفْتیٰ فی المسئلۃ
مسئلہ واضح کیا۔
الاستفتاء کا معنی کسی مسئلہ کا حکم معلوم کرنے
کے ہیں۔ يَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۔
آپ سے عورتوں کے حق مہر اور دیگر مسائل کا حکم
معلوم کرتے ہیں۔ اور الافتاء کے معنی فتویٰ
دینا اور حکم بتانا کے ہیں۔ اور کسی مشکل مسئلہ کے
جواب کو فتیا اور فتویٰ کہتے ہیں۔
فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ
اسی طرح افتاء کا لفظ بھی قرآن پاک نے استعمال
کیا ہے۔ اَفْتُونِي فِي أَمْرِي ۔ میرے
اس مشکل مسئلہ میں مجھے مشورہ دو۔
اَلفُتْیَا وَالفَتْوٰی : الجواب عمّا یُشکِلُ من
الاحکام (راغب)

اَلشُّحُّ ۔ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ ۔
یعنی حرص۔ تو تمام نفوس کے سامنے دھری ہستی
ہے۔ ایسی مصالحت میں عورت کو تو یہ حرص
ہوتی ہے کہ مجھے آزاد کر دیا تو اولاد برباد ہو جائیگی
یا میری زندگی دوسری جگہ تلخ ہوگی اور شوہر کو یہ
لالچ ہے کہ جب عورت نے اپنے حقوق ہی معاف
کر دیئے تو اب اس کو رکھنے میں کیا مضائقہ ہے۔
الشُّحُّ : ایسے بخل کو کہتے ہیں جس کے ساتھ حرص

ہوئی ہو اور یہ انسان کی عادت میں داخل ہوچکا ہو وَمَنْ يُوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ اور جو شخص حرصِ نفس سے بچا لیا گیا (سورۂ حشر) وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

الشح قرآن میں تین دفعہ آیا ہے۔

اَلشُّحُّ : خودغرض۔ حریص۔

ابن شحائح : بہت کم دودھ دینے والی اونٹنیاں

زَنْدَۃٌ شَحَّاحٌ : وہ چقماق جس سے آگ نہ نکلے۔

مَاءٌ شَحَاحٌ : تھوڑا پانی

شح کی جمع اَشِحَّۃٌ آتی ہے۔ کہتے ہیں :

قَوْمٌ اَشِحَّۃٌ بخیل لوگ۔ قرآن پاک میں دو دفعہ جمع بھی وارد ہوئی ہے اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ۔ احزاب

فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ۔ ایضاً رَجُلٌ شَحِيْحٌ : بخیل آدمی۔ خَطِيْبٌ شَحْشَحٌ۔ خوش بیان۔

والشُّحُّ : الضبط على المعتقدات والارادة في الهمم والاموال (قرطبی)

اَلْمُعَلَّقَةِ - فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ وہ عورت جس کا شوہر لاپتہ ہوگیا ہو اب نہ تو وہ نکاح ہی کرسکتی ہے چونکہ شوہر کی موت کا یقین نہیں اور نہ وہ شوہر والی کہلاسکتی ہے چونکہ شوہر کی حیات یقینی نہیں۔

یہاں آیتِ کریمہ میں معلقہ سے مراد وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ تو طلاق دیکر آزاد کرتا ہے اور نہ بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے۔

الْعَلَق - العلق کے معنی کسی چیز میں پھنس جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے : عَلِقَ الصَّيْدُ فِي الْحِبَالَةِ - شکار جال میں پھنس گیا۔ اور جب شکار جال میں پھنس جائے تو کہتے ہیں اَعْلَقَ الصَّائِدُ

تَخُوْضُوْا - فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ۔ تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہوجائیں۔

اَلْخَوْضُ کے معنی پانی میں اُترنے اور اُس کے اندر چلے جانے کے ہیں۔ اور بطور استعارہ کسی کام میں لگے رہنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا زیادہ تر استعمال فضول کاموں میں لگے رہنے پر ہوا ہے۔ اِنَّا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا۔

اَلْخَوْضُ : الشروع في الماء والمرور فيه واكثر ما ورد في القرآن ورد في ما لم يذم الشروع فيه (راغب)

خَاضَ يَخُوْضُ خَوْضًا وَخِيَاضًا۔

خَاضَ الْمَاءَ : پانی میں گھس گیا۔

خَاضَ فِي الْحَدِيْثِ : گفتگو میں مشغول ہوا۔

نَسْتَحْوِذْ - قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (اگر کفار کا پلہ بھاری ہو تو) کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تمہارا گھیراؤ نہ کیا تھا اور تم کو مسلمانوں سے بچا لیا۔ اس آیت میں منافقین کی ذہنی دنائت کو آشکارا کیا گیا ہے۔

حَاذَ يَحُوْذُ حَوْذًا ۔ حفاظت کرنا ۔ حَاذَ
علی الشیٔ ۔ نگہبانی کرنا ۔ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِ
الشیطان ۔ شیطان نے اُن پر غلبہ کیا لیا ۔ یعنی شیطان
نے ان کو قابو میں کر لیا ہے ۔ اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ
ای اَلَمْ نَغْلِبْ عَلَيْكُمْ حَتّٰی هَابَكُمُ الْمُسْلِمُوْنَ
وَخَذَلْنَاهُمْ عنكم ۔ يُقَالُ اِسْتَحْوَذَ عَلٰی
كذا ای غلب عَلَيْهِ (قرطبی) والاستحواذ
التَّغَلُّبُ على الشیٔ والاستيلاء عليه (جمل)
وَنَسْتَحْوِذُ فی اللغة بمعنی نستولی (ابن جوزی)

كُسَالٰی ۔ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا
كُسَالٰی ۔ اور یہ لوگ جب نماز میں کھڑے ہوتے
ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں ۔
الکسل کے معنی کسی ایسے معاملہ میں سستی کرنے کے
ہیں جس میں سستی نہ کرنی چاہیے تھی اسی لیے کسل کو
مذموم نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ كُسَالٰی اور
كَسَالٰی بفتح الکاف کسلان کی جمع ہے ۔
وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰی
اور یہ جب نماز میں آتے ہیں تو سست اور کاہل ہوتے
ہیں ۔ وقال اللیث : الکسل : التثاقل عما
لا ينبغی ان يُتثاقل عنه والفعل اكسل و
كَسِلَ (لسان) كَسِلَ يَكْسَلُ كَسَلًا وَهُوَ
كَسِلٌ ۔ یہ باب سَمِعَ سے آتا ہے ۔ فحلٌ كَسِلٌ
وہ نر جو جفتی میں کمزور ہو ۔ اِمراۃ مِكْسَال :
وہ عورت جو نازپروردہ ہونے کی وجہ سے کام میں
سست ہو ۔ کُسالی جمع کسلان والکسلُ
التثاقل عن الامر (زاد المسیر)

مسئلہ : جس کسل کی یہاں مذمت کی گئی
ہے وہ اعتقادی کسل ہے اور جو باوجود اعتقادِ
صحیح کے کسل ہے وہ اس سے خارج ہے ۔ پھر اگر
کسی عذر سے ہے جیسے مرض و تعب و غلبۂ نوم قلب
تو قابلِ ملامت بھی نہیں اور اگر بلا عذر ہو تو قابلِ
ملامت ہے (معارف از بیان القرآن)

الدَّرْكِ ۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِی
الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۔
یقیناً منافق دوزخ کے سب سے نچلے درجہ
میں ہوں گے ۔
الدَّرْكُ اور الدَّرَجُ دونوں کے معنی قریب
قریب ایک ہی ہیں ۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا
ہے کہ دَرْک باعتبار حُدُور یعنی پستی کے کہا جاتا ہے
اور الدَّرَجُ صعود اور بلندی کے لحاظ سے بولا
جاتا ہے ۔ اس لیے کہتے ہیں درجات الجنۃ و
درکات النار ۔ اسی حُدُور فی النار کے
اعتبار سے دوزخ کا ایک نام ہاویہ بھی ہے ۔
الدَّرْكُ كالدَّرَجِ لكن الدَّرَجُ يُقَالُ اعتبارًا
بالصُّعود والدَّرْكُ اعتبارًا بالحُدُور (راغب)
لفظ درک کو بفتح الراء و سکون الراء دونوں طرح
پڑھا گیا ہے ۔ اس کی جمع اَدراک آتی ہے ۔ جیسا کہ
جَمَلٌ و اَجْمَالٌ ۔ اور دَرْک بسکون الراء کی ایک
جمع اَدْرُكٌ بھی اہل لغت نے بیان کی ہے جیسا کہ
فَلْسٌ کی جمع اَفْلُسٌ (قرطبی)
اور سمندر کی تہہ اور اُس رسی کو جس کے ساتھ
پانی تک پہنچنے کے لیے دوسری رسی ملائی جاتی ہے

دَرْکٌ کہا جاتا ہے۔ اور لفظ دَرَک تاوان اور خرید و فروخت میں نقصان ہونے پر بھی بولا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے لَا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشٰى پھر نہ تو (فرعون کے) آپکڑنے کا خوف کرے گا اور نہ غرق ہونے کا۔

اَدْرَكَ - کسی چیز کی غایت کو پہنچ جانا۔ پالینا۔ اَدْرَكَ الْوَلَدُ لڑکا بچپن کی آخری حد کو پہنچا۔ یعنی بالغ ہونے کے قریب ہوگیا۔ اَدْرَكَ الثَّمَرُ پھل پک گیا۔ ادرك المسئلة جان لینا۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ۔ یہاں تک کہ اس کو غرق کے عذاب نے آپکڑا۔ اور آیت کریمہ: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ خدا ایسا ہے کہ اس کو نگاہیں نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔

یہاں پر بعض اہل علم نے فرمایا کہ لَا تُدْرِكُهُ سے ادراکِ بصری کی نفی کرنا مقصود ہے۔ کہ انسان کی آنکھ ذاتِ قدسی کو نہیں دیکھ سکتی۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں ادراک کی نفی بلحاظِ بصیرت ہے اور ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت میں اس معنی پر تنبیہ ہے جو جناب صدیق اکبرؓ کے قول میں پائے جاتے ہیں۔ جناب صدیق ذاتِ باری کو ان الفاظ میں پکارتے ہیں يَا مَنْ غَايَةُ مَعْرِفَتِهِ الْقُصُوْرُ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ۔ اے وہ ذات جس کی معرفت کی غایت بھی اس کی معرفت سے عجز اور کوتاہی ہے۔ اس دُعائے صدیق میں اس طرف اشارہ ہے کہ خدا کی معرفت کی غایت یہ ہے کہ انسان کو تمام اشیاء کا کما حقہ علم حاصل ہو جانے کے بعد یہ یقین ہو جائے کہ ذاتِ باری تعالیٰ نہ کسی کی جنس ہے اور نہ کسی کی مثل ہے۔ بلکہ وہ ان تمام چیزوں کی موجد ہے۔

تَدَارَكَ تدارك: پالینا۔ مافات کی تلافی کرنا۔ تَدَارَكَ الْقَوْمُ ایک دوسرے سے آملنا۔ تَدَارَكَ الْخَطَأَ بِالصَّوَابِ۔ غلطی کی درستی کرنا۔ خطا کی اصلاح کرنا۔ لَوْلَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ اگر اُن کے پروردگار کا فضل اُن کی دست گیری نہ کرتا تو وہ میدان میں ڈال دیئے جاتے بدحالی میں۔ یعنی اگر اُن کی توبہ قبول نہ ہوتی اور وہ اجتہادی خطا پر قائم رہتے تو وہ دریا سے نکال کر کنارہ پر ڈال دیئے جاتے اور اُن کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہوتا لیکن چونکہ توبہ قبول ہوگئی اب ملامت کا شائبہ نہ رہا۔ اور بجالت بجائے مذموم ہونے کے ممدوح ہوگئے۔

اِدَّارَكَ - اِدَّارَكَ کی اصل تدارک ہے حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ای تَدَارَكُوا بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ۔ بلکہ آخرت کے بارے میں اُن کا علم منتہی ہو چکا ہے۔ اِدَّارَکَ میں اصل تدارک ہے حرفِ تاء کو دال میں مُدغم کیا گیا ہے۔ بعد میں ابتدائے سکون کی وجہ سے شروع ہمزہ وصلی لیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اُمورِ آخرت سے بالکل بے خبر ہیں۔ آخرت کو پالینے سے ان کا علم منتہی ہو چکا ہے

اَلْاَسْفَل ۔ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ سَفَلَ (ن) سَفِلَ (س) سَفُلَ (ک) سُفُوْلًا نیچا ہونا۔ پست ہونا۔ حقیر ہونا۔ صفت سَافِلٌ سَفُلَ فِي عِلْمِهٖ اَوْ فِي خُلُقِهٖ۔ علم واخلاق میں ادنیٰ ہونا۔ السِّفْلُ نیچائی السُّفْلُ یہ عُلُوٌّ کی ضد ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ۔ پھر اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں۔ وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى۔ السُّفْلُ ضدّ العُلُوِّ (راغب)

درک اسفل سے مراد دوزخ کا سب سے نچلا طبقہ ہے۔

غُلْفٌ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ غُلْفٌ غِلَافٌ کی جمع ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے دل علوم ومعارف کے خزانے ہیں۔ علوم موسوی سے لبریز ہیں ہم کو کسی دوسرے علم کی ضرورت نہیں۔ جمع غِلَافٍ قرطبی۔ راغب)

اور ایک قول یہ ہے کہ غُلْفٌ جمع ہے اَغْلَفُ کی۔ اور اَغْلَفُ اس چیز کو کہتے ہیں جو غلاف میں بند ہو سیف اغلف تلوار جو نیام میں بند ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے قلوب غلافوں میں ہیں۔ اس لیے ہم کو قرآن کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ ای قُلُوْبُنَا فِيْ اَغْطِيَةٍ وَهُوَ كَقَوْلِهٖ قُلُوْبُنَا فِيْ اَكِنَّةٍ (قرطبی)

طَبَعَ ۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ بلکہ اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ اسی طرح خدا کافروں کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے

ان آیات میں طبع کے معنی دلوں کو زنگ آلود اور گندہ کر دینے کے ہیں۔ یہ اسی طرح جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔ الطبع : الختم (قرطبی)

الطبع والطبيعة الخليقة والسجية التى جُبل عَلَيْهَا الانسان وطَبَعَ اللّٰهُ الخَلْقَ على الطبائع التى خَلَقَهَا فانشأهم عَلَيْهَا وَطَبَعَهُ اللّٰهُ عَلَى الْاَمْرِ يطبعه طبعًا فَطَرَهُ ۔ (لسان)

اَلْمَسِيْح ۔ وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ

مسیح جناب عیسیٰ بن مریم کا لقب ہے۔

مَسَحَ يَمْسَحُ مَسْحًا کے معنی کسی چیز پر ہاتھ پھیرنے اور اس سے نشان اور آلائش صاف کر دینے کے ہیں۔ اور لفظ مسح صرف کسی پر ہاتھ پھیرنے اور کبھی ازالۂ اثر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مَسَحْتُ يَدِيْ بِالْمِنْدِيْلِ۔ میں نے رومال سے ہاتھ صاف کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی بیمار۔ اندھے کوڑھے وغیرہ پر ہاتھ پھیرتے تو وہ ٹھیک ہو جاتا مَسَحَ اللّٰهُ مَا بِكَ مِنْ عِلَّةٍ۔ یعنی اللہ تمہاری علت دور کر کے تم کو صحت عطا کرے۔

مسح بالدھن کے معنی آتے ہیں ملنا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ جب حضرت مسیح پیدا ہوئے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسا کہ ان کے جسم اور سر پر تیل ملا ہوا ہو۔ اس لیے آپ کو مسیح کہا گیا۔ بعض کا قول ہے کہ مسیح مَسَحَ الْاَرْضَ سے

ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں زمین کی پیمائش کرنا پھر مجازی اعتبار سے زمین پر چلنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: مَسَحَ البَعِيْرُ المَفَازَةَ وَذَرَعَهَا اونٹ نے بیابان کو عبور کیا۔ لہٰذا جناب مسیح کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ زمین کی سیاحت کرتے تھے۔ خدا کی اس زمین پر ان کا کوئی مکان نہ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی سیاحت ہی میں گزار دی۔ اُن کے زمانہ میں ایک گروہ تھا، جن کو زمین کی سیاحت کی وجہ سے مشائین اور سیاحین کہتے تھے۔ (راغب ملخصاً)

اَلْمَسْحُ ۔ اصطلاحِ شریعت میں مَسَح کے معنی اعضاء پر پانی گزارنے کے ہیں۔ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ۔ اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو۔ گیلے ہاتھوں سے سروں کو مس کرو۔

صَلَبُوْا ۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ۔ اور نہ وہ اس (مسیح) کو قتل کر سکے اور نہ اُن کو سولی پر چڑھا پائے۔ یعنی ان لوگوں نے حضرت مسیح بن مریم کو نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔ بلکہ صورتِ حال یہ پیش آئی کہ معاملہ اُن پر مشتبہ کر دیا گیا۔ صَلَبُوْا کے اصل معنی محض سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کے ہیں۔ چڑھا کر ختم کر دینے کے معنی اس میں نہیں۔ صاحبِ مفردات فرماتے ہیں کہ: هُوَ تَعْلِيْقُ الْاِنْسَانِ لِلْقَتْلِ (راغب)

اردو میں یہ مفہوم سولی دینے سے نہیں سولی چڑھانے ہی سے ادا ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادر اور علامہ تھانوی کے اردو ترجموں میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ (ماجدی)

الصُّلْبُ کے معنی سخت کے ہیں۔ پُشت کو بھی اس کی سختی اور صلابت کی وجہ سے صُلبٌ کہتے ہیں۔ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ وہ جو پیٹھ اور سینے کے بیچ سے نکلتا ہے۔ صلب کی جمع اصلاب آتی ہے۔ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ۔

الصَّلْبُ والاصلاب: کے معنی ہڈیوں سے چکنائی نکالنے کے ہیں اور صَلَبٌ جس کے معنی قتل کیلئے لٹکا دینے کے ہیں۔ بعض اس کو صَلَبٌ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں مقتول کی پیٹھ کی ہڈی اس لکڑی کے ساتھ ملائی جاتی ہے۔

الصَّلیب: اصل میں سولی کی لکڑی کو کہتے ہیں۔ اور بعد میں لفظ صلیب عیسائیوں کے مذہبی شعار کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔ اور اس لکڑی کو صلیب کہتے ہیں جو عیسائی لوگ بطور تبرک و عبادت کے گلے میں لٹکائے پھرتے ہیں۔ اب پیتل اور اسٹیل کی صلیبوں کا بھی عام رواج ہو گیا ہے۔

ثَوْبٌ مُصَلَّبٌ وہ کپڑا جس پر صلیب کی شکل بنی ہو۔ حدیث میں ہے: نَهٰى عَنِ الصَّلٰوةِ فِى الثَّوْبِ الْمُصَلَّبِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کپڑے کے ساتھ نماز پڑھنے سے منع کیا ہے جس میں صلیب کی شکلیں بنی ہوئی ہوں۔

شَكٌّ ۔ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ وہ آپ کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں شَكَّ يَشُكُّ شَكًّا۔ شَكَّ فِى الْاَمْرِ

شک و شبہ کرنا۔ صفت فاعلی شاکٌّ صفت مفعول مشکوک۔ شَكَّ عَلَيْهِ الْاَمْرُ معاملہ کا مشتبہ اور مشکوک ہونا۔ جمع شکوک آتی ہے۔
الشَّكُّ نقيض اليقين وجمعه شكوك
صاحب مفردات القرآن فرماتے ہیں کہ الشك اعتدال النقيضين عند الانسان وتساويهما۔ یعنی شک کے معنی دو نقیضوں کے انسان کے ذہن میں برابر اور مساوی ہونے کے ہیں۔ پھر شک کبھی تو چیز کے عدم اور وجود میں ہوتا ہے اور کبھی جنس میں کہ شئی کونسی جنس ہے اور کبھی شک چیز کی اُس غرض میں ہوتا ہے جس کے لیے یہ چیز وجود میں لائی گئی ہے۔ تو گویا شک جہالت کی ایک قسم ہے۔ لیکن شک اور جہالت میں فرق یہ ہے کہ شک میں انسان کے سامنے شئی کی دو متساوی جہتیں ہوتی ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی بلا دلیل اختیار کرنا مشکل امر ہے۔ اور جہل میں نقیض کا علم نہیں ہوتا۔ یعنی جہل کبھی محض عدم علم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جاہل کو نقیض کا علم نہیں ہوتا۔ تو ہر شک کو جہل تو کہا جاتا ہے مگر ہر جہل کو شک نہیں کہا جاتا۔ شک کی بہترین تعریف مفسر تھانوی نے کی ہے۔ یعنی قول بلا دلیل۔ نظریہ پہ نظریہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں کوئی بات بنائے نہیں بنتی (ماجدی)

قَصَصْنٰهُمْ۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ
القَصُّ کے معنی نشانِ قدم پر چلنے کے ہیں۔ کہتے ہیں قَصَصْتُ اَثَرَهٗ میں اس کے نقش قدم پر چلا اور قَصَصٌ کے معنی نشان کے ہیں۔ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا۔ وہ اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔
اخبار ماضیہ کو بھی القصص کہا جاتا ہے۔
وقص عليه القصص۔ وَفِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ ان کے قصہ میں عبرت ہے۔
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ۔ ہم آپ کو ایک اچھا قصہ سناتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بعض انبیائے کرام کا ذکر آپ سامنے کیا گیا ہے اور بعض کا ذکر آپ پر نہیں کیا گیا۔ اس سے متکلمین نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ہر ہر نبی پر تفصیل کے ساتھ ایمان لانا ضروری نہیں۔ چونکہ اگر ہر نبی کی معرفت ضروری ہوتی تو خدا تعالٰی تمام رسولوں کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کرتا۔ مزید تشریح کے لئے سورۂ یوسف کی آیت اَحْسَنَ الْقَصَصِ دیکھئے۔
قَصَصٌ اسم مصدر ہے۔

لَا تَغْلُوْا۔ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ
اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اور اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو۔
الغُلُوُّ کے معنی کسی کے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ اگر یہ غلو اشیاء میں ہو تو اس کو غَلَاءٌ کہتے ہیں۔ غَلَا السِّعر نرخ کا بڑھ جانا۔
صفت غالٍ و غَلِيٌّ اور اگر غلو قدر و منزلت میں ہو تو غُلُوٌّ کہتے ہیں۔
مبالغہ کرنا۔ حد سے بڑھ جانا اور اگر تیر اپنے نشانے اور حد سے آگے بڑھ جائے تو غُلُوٌّ بسکون اللام

استعمال ہوتا علا السہم تیر دور نکل گیا۔ تینوں صورتوں میں یہ باب نصر سے ہی استعمال ہوتا ہے۔ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ کا مطلب یہ کہ اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔ اور ہانڈی کے جوش اور اُبال کھانے کو بھی غَلْیٌ کہتے ہیں۔ مگر یہ غلی یغلی غلیاً وغلیانا سے ماخوذ ہے۔

الغُلُوّ تجاوز الحد (راغب) الغلو التجاوز فی الحد (قرطبی) والغلو الافراط و مجاوزۃ الحد (زاد المسیر ابن جوزی)

اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ غلو فی الدین حرام اور ناجائز ہے۔ اس آیت میں اہل کتاب کو غلو سے منع کیا گیا ہے۔ غلو کے لفظی معنی جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے معلوم ہوا، حد سے نکل جانے کے ہیں۔ صاحب احکام القرآن امام جصاص فرماتے ہیں: الغلو فی الدین ھو مجاوزۃ حد الحق فیہ۔ یعنی دین میں غلو یہ ہے کہ دین میں جس چیز کی جو حد مقرر کی گئی ہے۔ اس سے آگے نکل جائے۔ (احکام القرآن)

الغَلْوَۃُ: وہ انتہائی حد جہاں تک تیر پہنچ سکے۔

یَسْتَنْکِفُ - لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ۔ مسیح اس بات سے عار نہیں کھاتے کہ وہ خدا کے بندے ہوں۔ استنکاف۔ نَکْفٌ سے ماخوذ ہے۔

نَکَفْتُ مِنْ کَذَا واسْتَنْکَفْتُ مِنْہُ کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے لئے باعث عار سمجھنا۔ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْکَفُوْا وَاسْتَکْبَرُوْا فَیُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا اصل میں نکفت الشیٔ سے ہے، جس کے معنی کسی چیز کو دور ہٹا دینا ہیں نَکْفٌ: رخسارے سے ہاتھ کے ساتھ پسینہ صاف کرنا۔ بحرٌ لَا یُنْکَفُ: بحر بے کنار۔ بے پایاں سمندر۔ الانتکاف (افتعال) ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف نکل جانا۔

واصل یستنکف، نکف۔ و قال الزجاج استنکف ای اَنِفَ۔ ماخوذ من نکفتُ الدمعَ اذا نحّیتَہ باصبعک۔ پیشانی سے آنسو پونچھنا۔

اِنکافٌ کے معنی ہیں خدا کی تسبیح و تنزیہ بیان کرنا۔ حدیث میں ہے: انہ سُئل عن قول سبحان اللّٰہ فقال: انکاف اللّٰہ من کل سُوْءٍ حضور علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ سبحان اللہ کے کیا معنی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کی پاکی بیان کرنا ہر عیب اور برائی سے۔

نَکْفٌ کے معنی عیب کے بھی آتے ہیں۔ کہتے ہیں: ما علیہ فی ھٰذا الامر نکفٌ ولا وکفٌ ای عَیْبٌ (ماخوذ از قرطبی۔ راغب۔ کشاف)

بُرْھَانٌ - یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ اے لوگو! تمہارے پاس یقیناً ایک کھلی دلیل تمہارے پروردگار کی طرف سے آچکی ہے۔

البُرْھَانُ: یہ بَرِہَ یَبْرَہُ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی سفید اور چمکنے کے ہیں۔ صیغہ صفت اَبْرَہ

اور مؤنث بَرْهَاء اور جمع بُرْهٌ اور بُرْهَات اور کہتے ہیں بَرْهَنَ الشيءَ وَعَلَيْهِ۔ کسی چیز پر دلیل قائم کرکے اس کو واضح کر دینا۔

بُرْهَانٌ۔ یہ رُجْحَانٌ کی طرح فُعلان کے وزن پر ہے۔ ایسی دلیلِ قاطع کو برہان کہتے ہیں جو دعوے کو بالکل واضح کر دے اور ہر حال میں اور ہمیشہ سچی ہو۔ اس بُرهان سے مراد یہاں ذاتِ نبوت ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ جن کی سیرتِ پاک اور تعلیم کی جامعیت نے ہر مشکل کو آسان اور ہر پتھر کو پانی بنا دیا ہے۔

البرهان أوكد الأدلة (راغب) يعني محمدا صلى الله عليه وسلم عن الثوري۔ وسماه برهانا لأن معه برهانٌ وهو المعجزة (قرطبی)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ بُرھان سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ آپ کی ذاتِ مبارک اور آپ کے اخلاقِ کریمانہ آپ کے معجزات اور آپ پر کتاب کا نزول یہ سب چیزیں آپ کی نبوت اور آپ کی رسالت کے کھلے کھلے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد کسی اور دلیل کی احتیاج باقی نہیں رہتی گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خود ایک مجسم دلیل ہے۔

نُوْرٌ۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا

نور سے مراد یہاں قرآن مجید ہے جس کے اندر چھوٹے بڑے انفرادی اور اجتماعی سارے مسائل کا حل موجود ہے۔ فأمّا النورُ المبين، فهو القرآن (زاد المسير ابن جوزي) والنور المنزل هو القرآن عن الحسن۔ وسماه نورًا لأنّ به تتبيّن الأحكام

ويهتدى به من الضلالة (قرطبی)

شَرْحُ الْفَاظِ الْقُرْآنِ مِنْ

سُوْرَةُ الْمَائِدَةِ مَدَنِيَّةٌ

سورۂ مائدہ مدنی، اس معنی میں ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامِ مدینہ کے آخری عمر شریف کا زمانہ ہے۔ ورنہ واقعۃً اس کے بیشتر حصہ کا نزول مکہ مکرمہ حجۃ الوداع ذی الحجہ سنہ ۹ھ کے موقعہ پر ہوا ہے اور کچھ صلح حدیبیہ سنہ ۶ھ سے واپسی کے وقت اور کچھ سال فتح مکہ سنہ ۸ھ میں (ماجدی)

سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کی اصل اصطلاح یہ ہے کہ جو سورتیں ہجرت سے قبل قیام مکہ کے زمانہ میں اتریں اُن کو مکی کہتے ہیں اور قرآن کا جو حصہ اور سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں ان کو مدنی کہتے ہیں۔ چاہے مقام نزول کوئی اور ہو۔

اَلْعُقُوْد۔ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو۔

عُقُوْد: عقد کی جمع ہے جس کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں اور جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں بندھ جائے اس کو بھی عقد کہا جاتا ہے۔ اس لیے بمعنی عہود ہو گیا۔ يقال وفى بالعهد وأوفى به والعقد: العهد الموثق شبّه بعقد الحبل۔ (مدارك)

العقد: الجمع بين اطراف الشيء (راغب)

العقُودُ : الرّبُوط، واحدھا عقدٌ۔
یُقال عقدتُ العھدَ والحبلَ (قرطبی)
لفظ عقد اصل میں تو سخت اجسام کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے عقد الحبل. رسّی کو گرہ باندھنا۔ عقد البناء وغیرہ محاورات ہیں۔
پھر بطور استعارہ اس کا استعمال معانی میں بھی ہونے لگا۔ جیسا کہ عقد البیع، سودے کو پختہ کرنا۔ عقد العھد محکم عہد باندھنا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے عقدتُہٗ وعاقدتہ وتعاقدنا وعقدتُ یمینَہٗ ، میں نے اس سے پختہ عہد و پیمان باندھا۔ قرآن پاک میں ہے عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ۔ یعنی جن لوگوں سے تم نے پختہ عہد باندھ لیے ہیں۔ اسی طرح بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ۔
والعقد: العھد الموثق (کشاف)
فھو یُستعمل فی المعانی والاجسام (قرطبی)
(راغب۔ ابن جوزی)
علّامہ علی بن محمد الشوکانی فرماتے ہیں کہ جب اس کا استعمال معانی میں ہوتا ہے تو یہ حکم کی مضبوطی اور پختگی کا فائدہ دیتا ہے کہ دونوں فریقوں نے جو معاہدہ اور عقد کیا وہ نہایت محکم ہے اور اس کی حفاظت دونوں فریق پوری طرح کریں گے۔
امام تفسیر ابن جریر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ عقود سے مراد یہاں معاہدات ہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں : وحکی ابن جریر الاجماع علی ذلک قال والعھود ماکانوا یتعاقدون علیہ من الحلف وغیرہ۔ (ابن کثیر)

امام جصّاص صاحبِ احکام القرآن فرماتے ہیں کہ عقد کہا جائے یا عہد و معاہدہ۔ اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریق آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈال رہے ہوں اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہوگئے ہوں۔
قال ابو بکر : العقد : ما یعقدہ العاقد علی أمر یفعلہ ھو او یعقد علی غیرہ فعلہٗ علی وجہ الزامہ ایّاہ۔
(احکام القرآن)
ہمارے عرف میں اس کا نام معاہدہ ہے۔ اسی لیے خلاصۂ مضمون اس جملہ کا یہ ہوگیا کہ باہمی معاہدات کا پورا کرنا لازم و ضروری سمجھو۔ (معارف)
اب دیکھنا یہ ہے کہ ان معاہدات سے کون سے معاہدات مراد ہیں۔ بظاہر اہل تفسیر کے اقوال اس میں مختلف نظر آتے ہیں۔ ابن جوزی نے اس اختلاف کے بارے میں پانچ اقوال نقل کیے ہیں۔
ایک یہ کہ عقود سے مراد وہ عہد و میثاق ہے جو بندہ اور خدا کے مابین ہے۔ کہ خدا نے جن چیزوں کو حرام فرمایا ہے ان کو حرام اور جن کو حلال کہا ہے، ان کو حلال سمجھا جائے۔ یہ ابن عباس اور مجاہد کا قول ہے۔ دوسرا یہ کہ دین کے تمام احکام کی پابندی کا نام عہد ہے۔ تیسرا یہ کہ عقود سے مراد وہ عہد ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں ایک آدمی دوسرے آدمی یا ایک جماعت سے دوسرے جماعت کرتی تھی۔ یہ ایک قسم کا فریقین میں حلف ہوتا تھا کہ مشکلات

ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کریں گے
چوتھا یہ کہ عقود سے مراد وہ عہد ہے جو حق تعالیٰ جل شانہ نے اہل کتاب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا کیا تھا۔
پانچواں یہ کہ یہ عقود عام ہے ہر اس عقد کو جو لوگ آپس میں طے کرلیں مثلاً بیع، نکاح، منت ونذر اور قسم ویمین وغیرہ۔ (زاد المسیر)
امام راغب فرماتے ہیں کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں اور پھر فرمایا کہ اس کی ابتدائی تین قسمیں ہیں :
ایک وہ معاہدہ جو انسان کا رب العالمین کے ساتھ ہے۔ مثلاً ایمان وطاعت کا عہد یا حلال وحرام کی پابندی کا عہد۔
دوسرے وہ معاہدے جو ایک انسان خود اپنے نفس کے ساتھ کرتا ہے۔ جیسے کہ نذر وغیرہ مان لی۔
تیسرے وہ معاہدات ہیں جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے۔
حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں حاصل کلام یہ کہ جو بھی معاہدات آپس میں شرعی حدود وقیود میں رہ کر ہوں ان کا پورا کرنا لازم ہے اسی سے عقیدہ ہے جس کے معنی محکم اور پختہ یقین کے ہیں (راغب) اور عقیدہ کا مدار آیات محکمات پر ہوتا ہے۔ اوہام وظنون سے عقیدے نہیں بنتے۔

اَلصَّیْدُ ۔ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۔ الصَّید سے مراد یہاں شکار ہے۔ اور مراد وہ شکار ہے جس کا کھانا جائز اور حلال ہو۔
الصید : یہ اصل میں صَادَ یَصِیْدُ صَیْدًا کا مصدر ہے۔ اس کے معنی کسی محفوظ چیز پر قدرت حاصل کرکے اس کو پکڑنے کے ہیں مگر شرعاً ان حیوانات کو پکڑنے پر بولا جاتا ہے جو اپنی حفاظت آپ کریں اور وہ حلال بھی ہوں یعنی کسی حرام جانور پر صید کا اطلاق شرعاً نہ ہوگا۔

اَلْقَلَآئِد ۔ القَلْدُ کے معنی رسّی وغیرہ کو بل دینے کے ہیں جیسے قَلَدْتُ الْحَبْلَ میں نے رسّی باٹا، بل دیا۔ اور بٹی ہوئی رسّی کو قلید یا مقلود کہتے ہیں۔ اور قلادہ اُس بٹی ہوئی رسّی کو کہتے ہیں جو گلے میں پڑی رہتی ہے۔ القلائد اسی کی جمع ہے۔ یہ بٹے ہوئے پٹے اُس نشانی کے لیے ہوتے تھے کہ یہ جانور اللہ کی نذر ہیں۔ حرم میں ذبح ہوں گے۔ اور یہاں القلائد سے مراد ذواتُ القلائد ہیں یعنی قلادہ والے جانور مراد ہیں۔

بَهِیْمَة ۔ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ بھیمہ اُن جانوروں کو کہا جاتا ہے جو عادۃً غیر ذوی العقول سمجھے جاتے ہیں۔ کیونکہ لوگ ان کی بولی کو عادۃً نہیں سمجھتے تو ان کی مراد مبہم رہتی ہے۔ اور امام شعرانی نے فرمایا کہ بھیمہ کو بھیمہ اسلیے نہیں کہتے کہ ان کو عقل نہیں اور عقل کی باتیں ان پر مبہم رہتی ہیں جیسا کہ لوگوں کا عام خیال ہے

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عقل وادراک سے کوئی جانور بلکہ کوئی شجر و حجر بھی خالی نہیں۔ ہاں درجات کا فرق ضرور ہے۔ ان چیزوں میں اتنی عقل نہیں ہے جتنی انسان میں۔ اس لیے انسان کو احکام کا مکلف بنایا گیا ہے، جانوروں کو مکلف نہیں بنایا گیا۔ ورنہ اپنی ضروریات زندگی کی حد تک ہر جانور بلکہ ہر شجر و حجر کو حق تعالےٰ نے عقل وادراک بخشا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ۔ عقل نہ ہوتی تو اپنے خالق و مالک کو کس طرح پہچانتیں اور کس طرح تسبیح کرتیں۔ مفتی اعظم فرماتے ہیں کہ امام شعرانی کے فرمانے کا خلاصہ یہ ہے کہ بھیمہ کو بھیمہ اس لیے نہیں کہتے کہ اس کی بے عقلی کے سبب معلومات اس پر مبہم رہتی ہیں بلکہ اس لیے کہ اس کی بولی لوگ نہیں سمجھتے۔ اس کا کلام لوگوں پر مبہم رہتا ہے

(معارف القرآن)

اَلْبُهْمَةُ : اصل میں ٹھوس اور سخت چٹان کو کہتے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر بہادر آدمی کو بھی بھمہ کہدیتے ہیں۔ نیز ہر وہ عقلی اور حسّی چیز جس کا عقل و حواس سے ادراک نہ ہوسکے اس کو مبہم کہتے ہیں۔ علامہ راغب فرماتے ہیں کہ : البھیمة مالا نطق علیہ وذلك لما فی صوتہ من الابھام۔

لَیْلٌ بَهِیْمٌ : سیاہ رات کو کہتے ہیں۔ یہ فعیل بمعنی مُفْعَلٌ ہے اور تاریکی کے باعث اس کا معاملہ بھی چونکہ مبہم رہتا ہے اس لیے اس کو بہیم کہا جاتا ہے یا فعیل بمعنی مُفْعِلٌ ہو یعنی فاعل کے معنی میں ہو چونکہ وہ چیزوں کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے اسلیے اس کو بھیم کہا جاتا ہے　(راغب)

البُهْمَةُ : اسمٌ لکل ذی اربع سُمّیتْ بذلك لابھامھا من جھة نقص نطقھا وفھمھا وعدم تمییزھا وعقلھا

(قرطبی - فتح القدیر)

البھیمة : کلّ ذات اربع فی البرّ والبحر　(کشاف) وفی القاموس :

البھیمة : کل ذات اربع قوائم ولوفی الماء او کل حیّ لا یمیّز　(جمل)

اَلْاَنْعَامُ : نَعَمٌ کی جمع ہے۔ پالتو جانور۔ جیسے اونٹ گائے بھینس بکری وغیرہ جن کی آٹھ قسمیں سورۃ انعام میں بیان فرمائی گئی ہیں ان کو انعام کہا جاتا ہے　(معارف)

آیت کی مراد یہ ہوگی کہ گھریلو جانوروں کی آٹھ قسمیں تمہارے لیے حلال ہیں۔ علامہ راغب فرماتے ہیں کہ النَّعم کا لفظ خاص کر اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ چونکہ اونٹ عرب کی بڑی نعمت تھی۔ لیکن بعد میں اس کا استعمال عام جانوروں بھیڑ بکریوں وغیرہ پر بھی بولا جانے لگا۔ اس میں یہ بات ملحوظ ہوگی کہ دیگر حیوانات کو انعام اسی وقت کہا جاتا ہے۔ جب کہ ان میں اونٹ بھی شامل ہوں۔

تَعَاوَنُوْا۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى۔ ایک دوسرے کے ساتھ مدد نیکی اور تقوٰی میں کرتے رہو۔ اس ایک جملہ میں قرآن حکیم نے ایک ایسے ہولی اور بنیادی مسئلہ پر ایک حکیمانہ فیصلہ دیا ہے جو پورے نظام عالم کی روح ہے اور جس پر انسان کی سرفلاح و صلاح بلکہ خود اس کی بقا اور زندگی موقوف ہے۔ دنیا کا پورا نظام انسانوں کے باہمی تعاون وتناصر پر قائم ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مدد نہ کرے تو کوئی اکیلا انسان خواہ کتنا ہی عقلمند یا کتنا ہی زور آور مالدار ہو اپنی ضروریاتِ زندگی کو تنہا حاصل نہیں کر سکتا اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تعاون دنیا ہی کے ساتھ نہیں بلکہ مرنے سے لے کر قبر میں دفن ہونے کے تمام مراحل اسی تعاون کے محتاج ہیں۔ بلکہ اس کے بعد بھی اپنے پیچھے رہنے والوں کی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا محتاج رہتا ہے۔ غرضیکہ دنیا کا کوئی انتظام بھی بغیر باہمی تعاون کے انجام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اور پھر اصحابِ عقل و فہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ تعاون وتناصر انسان کے حق میں اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب کہ یہ حدودِ شرعی وقانون کے اندر ہو اور اس کا منشا خیر وفلاح ہو جس میں انسانیت کا بھلا ہو اس لیے ارشاد فرمایا: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى۔

اور اگر یہی تعاون وتناصر رہزنی، چوری، بغاوت وسرکشی پر ہو تو ملک وملت کا شیرازہ بکھر بھی سکتا ہے اور ہلاک بھی اور امنِ عامہ کے لیے تباہ کن بھی۔ اس لیے آگے ارشاد فرمایا: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

تحقیقِ لفظی: العَوْنُ کے معنی کسی کی مدد اور پشت پناہی کرنے کے ہیں۔ اور لفظ عَوْن خود صفت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کہتے فُلَانٌ عَوْنِیْ وہ میرا مددگار ہے اور جب اس کو بابِ افعال میں لے جائیں تو معنی ہوتے ہیں دوسرے کی مدد اور اعانت کرنا۔ قَدْ اَعَنْتُہٗ میں نے اس کی مدد کی۔ قرآن میں ہے فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ: تم میری قوتِ بازو سے مدد کرو اور پھر جب تفاعل میں لے جائیں تو معنی ہوتے ہیں ایک دوسرے کی امداد کرنا۔

التعاون: التظاھر (راغب)

قال الفراء لیُعِینَ بعضُکم بعضًا (ابن جوزی فی زاد المسیر)۔

آمِّیْنَ: وَلَآ آمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ۔ اور نہ ان لوگوں کو چھیڑا جائے جو باعزت گھر کا قصد کیے جا رہے ہو۔ اَلْاَمُّ کے معنی ہیں سیدھا مقصد کی طرف متوجہ ہونا اور کسی طرف مائل نہ ہونا۔ اَمَّ یَؤُمُّ اَمًّا: قصد کرنا۔ آمٌّ صیغہ صفت بمعنی قصد کرنے والا۔ آمِّیْنَ اسی کی جمع ہے۔ وَلَآ آمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ۔ اَلْاَمُّ: القاصِدُ (ابن جوزی) یعنی القاصدین لہ من قولھم

اَمَّمْتُ کَذَا ای قَصَدْتُہٗ (قرطبی)
شَنَآن۔ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ
قَوْمٍ۔ شَنَاٰن (ب ف وس) دونوں ابواب
سے آتا ہے۔ شَنِئْتُہٗ کے معنی بغض کی وجہ
سے کسی چیز سے نفرت کرنے کے ہیں۔
شَنَاٰنُ قَوْمٍ کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی دشمنی
ایک قرأت اس میں شَنْاٰن بسکون النون
بھی ہے۔ اس صورت میں یہ اسم ہوگا اور شَنَآن
بفتح النون کی صورت میں مصدر ہوگا۔ اسی سے فرمایا
کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ بیشک
تیرا دشمن ہی بے اولاد ہوگا۔
الشَّنَآن : البغض۔ وَالشَّنْآن بتسکین
النون البغيض (ابن جوزی)
یَجْرِمَنَّکُمْ۔ یَجْرِمَنَّ۔ الْجُرْمُ کے
اصل معنی درخت سے پھل کاٹنے کے آتے
ہیں صیغہ صفت جَارِم اور جمع جِرَام
تَمْرٌ جَرِیْمٌ کھجوریں اور جُرَامَۃ ان
کھجوروں کو کہتے ہیں جو کاٹتے وقت نیچے
گرجائیں اور بطور استعارہ کے یہ کسب
مکروہ کے لیے بولا جاتا ہے اور کسب حلال
کے لیئے اس کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے
اور یہ باب افعال اور ضَرَبَ سے عام طور پر مستعمل
ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ۔ بیشک جرم کرنے والے
دنیا میں ایمان والوں سے مزاح کرتے تھے۔
اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ (القمر)

اور جرم باب ضَرَبَ سے لَا یَجْرِمَنَّکُمْ
شِقَاقِیْۤ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ اور لَا یَجْرِمَنَّکُمْ
شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا۔
قرآن پاک میں ہے فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ۔
یہاں دونوں احتمال ہیں۔ باب افعال بھی ہوسکتا
ہے اگر اس کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو
اور اگر اَجْرَام پڑھا جائے یعنی بفتح الہمزہ تو یہ
جُرْمٌ کی جمع ہوگی۔ یعنی میرے اعمال کی ذمہ داری
میرے اوپر ہے۔ و یُقَالُ جَرَمَ یَجْرِمُ
جَرْمًا اذا قطع۔ قَالَ الرّمانی علیّ بن عیسی
وھو الاصل۔ اور لَا جَرَمَ لَا بُدَّ کی طرح
استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ
(قرطبی۔ راغب) قال ابن فارس: جَرَمَ
واَجْرَمَ ولَا جَرَمَ بمعنی قولك لَا بُدَّ
ولَا محالَة۔ واصلها من جَرَمَ ای
کسب (فتح القدیر) جَرَمَ واجْتَرَمَ لِاَهْلِه
اپنے اہل و عیال کے لیے کمانا۔
اَلْمُنْخَنِقَةُ۔ وہ جانور جو گلا گھوٹ کر
خود مارا جائے۔ خَنَقَ یَخْنُقُ خَنْقًا۔ خَنَقَہٗ
گلا گھوٹنا۔ اختناق گلا گھٹنا۔ الخُنَاق
ایک بیماری کا نام ہے جس میں دم گھٹتا ہے۔
اَلْمَوْقُوْذَةُ۔ وہ جانور جو ضرب شدید کے
ذریعہ ہلاک ہوا ہو جیسے لاٹھی یا پتھر وغیرہ سے
مارا گیا ہو اور جو تیر کسی شکار کو اس طرح قتل
کردے کہ دھار کی طرف سے نہ لگے ویسے ہی
ضرب سے مر جائے وہ بھی موقوذہ میں داخل ہوگا

حرام ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں
بعض اوقات معراض تیر سے شکار کرتا ہوں
اس کا کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر معراض تیر
سے جانور مر جائے تو وہ مت کھاؤ چونکہ وہ
موقوذہ کے حکم میں ہے۔ اگر دھار کی طرف سے
لگا ہے تو کھا سکتے ہو (معارف القرآن)

اَلْوَقْذُ: یہ ضَرَبَ سے آتا ہے۔ جس کے
معنی ضرب شدید کے ہیں۔ الموقوذۃ: ای
المقتولۃ بالضرب۔ (راغب)
الموقوذۃ: التی تُضربُ حتی تُوقَذَ ای
تشرف علی الموت (ابن جوزی)
جو شکار بندوق کی گولی سے ھلاک ہوگیا،
اس کو بھی فقہاء نے موقوذہ میں داخل اور حرام
قرار دیا ہے۔ امام جصاص نے حضرت عبداللہ
بن عمرؓ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے تھے:
المَقتُولَۃُ بِالبُندُقَۃِ تِلکَ المَوقُوذَۃُ
یعنی بندوق سے جو جانور ہلاک کیا جائے وہ ہی
تو موقوذہ ہے۔ اس لیے حرام ہے۔
علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ امام اعظم ابو حنیفہ
شافعی، مالک سب اس پر متفق ہیں۔
صاحب احکام القرآن[1] نقل فرماتے ہیں کہ ہر وہ جانور
جو قانون تذکیہ کے خلاف مارا گیا ہو وہ موقوذہ
میں داخل ہے۔ ویدخل فی الموقوذۃ
کل ما قتل منھا علی غیر وجہ الزکاۃ
جصاص معناہ فی القرطبی

اَلْمُتَرَدِّیَۃُ۔ یعنی وہ جو کسی پہاڑ، ٹیلہ
اونچی عمارت یا کنوئیں وغیرہ میں گر کر مر جائے وہ
بھی حرام ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود
سے روایت ہے کہ اگر کوئی شکار پہاڑ پر کھڑا ہے
اور تم نے بسم اللہ پڑھ کر اس کو تیر مارا اور وہ
تیر کی زد سے نیچے گرا اور مر گیا۔ اب اس کو نہ کھاؤ۔
چونکہ احتمال ہے کہ وہ گرنے کی وجہ سے مرا ہو۔
اسی طرح اگر جانور پانی میں گر گیا تو وہ بھی متردیہ
ہے۔ معارف بحوالہ جصاص
والمتردیۃ ھی التی تتردی من العلو الی
السفل فتموت (قرطبی)

اَلنَّطِیحَۃُ۔ وہ جانور جو کسی ٹکر اور تصادم
سے ہلاک ہوگیا ہو جیسے ریل، موٹر وغیرہ کی زد میں
آکر مر جائے یا کسی دوسرے جانور کی ٹکر سے مر جائے۔
النطیح و الناطح: اس آہو یا پرند کو کہتے ہیں
جو شکاری کی طرف سیدھا آئے گویا وہ سینگ
سے مارنا چاہتا ہے۔ نواطح الدھر:
حوادث زمانہ، گردش ایام۔
معارف۔ راغب۔ قرطبی وغیرہ)

اَلسَّبُعُ۔ وہ درندے جو چیر پھاڑ کر کھانے
والے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جانور بھی حرام
ہے جس کو درندوں نے پھاڑ کر مار دیا ہو۔

اَلنُّصُب۔ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ
وہ جانور حرام ہے جو نُصب پر ذبح کیا گیا ہو
نُصب وہ پتھر ہیں جو کعبہ کے گرد کھڑے کیے
ہوئے تھے اور اہل جاہلیت ان کی پرستش کرتے

[1] احکام القرآن للجصاص ص۳۰۲

اور ان کے پاس لا کر جانوروں کی قربانی ان کے لیے کرتے تھے۔ اور اس فعل کو عبادت سمجھتے تھے۔ اہل جاہلیت ان قسموں کے جانوروں کو کھانے کے عادی تھے۔ قرآن کریم نے ان سب کو حرام قرار دیا (معارف)

نَصَبَ الشَّیْءَ کے معنیٰ کسی چیز کو کھڑا کرنے یا گاڑ دینے کے ہیں۔ مثلاً نیزے کے گاڑنے یا عمارت وغیرہ میں پتھر نصب کرنے یعنی کھڑا کرنے کو نصب کہتے ہیں۔ اور اس پتھر کو نَصِیْبٌ کہتے ہیں جو کسی مقام پر بطور نشان کے گاڑا جائے اس کی جمع نَصَائِبُ ونُصُبٌ آتی ہے۔ كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ۔ نُصُبٌ کی جمع انصاب آتی ہے بعض اہل فن نے کہا ہے کہ نُصُبٌ جمع ہے اور اس کی جمع نِصَابٌ ہے جیسا کہ حُمُرٌ کی جمع حِمَارٌ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نُصُب اسم مفرد ہے اس کی جمع اَنْصَاب ہے (قرطبی)

اَلْاَزْلَامُ : وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ

ازلام: زَلَمٌ کی جمع ہے۔ زلم اس چیز کو کہتے ہیں جو جاہلیت عرب میں اس کام کے لیے مقرر تھے کہ ان کے ذریعہ قسمت آزمائی کی جاتی تھی۔ یہ سات تیر تھے جن میں سے ایک پر نَعَمْ ایک پر لَا اور اسی طرح دوسرے تیروں پر بھی کچھ نہ کچھ لکھا تھا اور بعض بالکل خالی بھی تھے۔ یہ تیر خادم بیت اللہ کی نگرانی میں رہتے تھے۔ جب کوئی کام کرنے کی ضرورت پڑتی تو ان سے فال لیتے تھے۔ اگر نعم نکلا تو کر لیا۔ لَا نکلا تو چھوڑ دیا

حرام جانوروں کی فہرست میں قرآن پاک نے اس لیے اس کو ذکر کیا ہے کہ عربوں کی جاہلیت میں ایک عادت یہ تھی کہ چند آدمی شریک ہو کر کوئی اونٹ وغیرہ ذبح کرتے مگر گوشت کی تقسیم بجائے اس کے کہ جتنا کسی کا مال اس میں لگا، اس کے مطابق کریں، یہ تیروں سے کرتے تھے۔ جس میں کوئی بالکل محروم رہتا اور کسی کو اپنے حصے سے بھی زیادہ مل جاتا۔ اس میں ہوتا یہ کہ حق والے کو بسا اوقات بالکل محروم ہونا پڑتا۔ اس لیے جانوروں کی حرمت کے ساتھ اس طریقہ کار کی حرمت کو بھی ذکر کر دیا۔ (مستفاد از معارف)

مفتی اعظم فرماتے ہیں: علماء نے فرمایا کہ: آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں خواہ اہل جفر کے ذریعہ یا ہاتھ کے نقوش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر یہ سب طریقے اِسْتِقْسَام بِالْاَزْلَام کے حکم میں ہے۔

و واحد الازلام: زَلَمٌ (بیضاوی)

زَلَمَ يَزْلَمُ زَلْمًا: خطا کرنا۔

زَلَمَ الْاِنَاءَ: برتن بھرنا۔

اَكْمَلْتُ : اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ

اِکْمَالِ دین کی تفسیر ابن عباس سے یہ منقول ہے کہ: دین کے تمام احکام و آداب و حدود و فرائض مکمل کر دیئے گئے۔ اس تفسیر کے مطابق اکمالِ دین کا مطلب یہ ہے کہ دین کے تمام احکام کو ہر لحاظ سے مکمل کر دیا گیا ہے۔ اب نہ اس میں کسی زیادتی کی ضرورت ہے اور نہ منسوخ ہو کر

کمی کا احتمال چونکہ اس کے متصل بعد سلسلۂ وحی
ہی منقطع ہو گیا تھا۔ اَکْمَلْتُ باب افعال سے
واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ میں نے کامل کر دیا۔
میں نے پورا کر دیا۔ مصدر اکمال کسی چیز کو
کامل بنا دینا۔

امام راغب فرماتے ہیں: کمال الشئ
حصول ما فیه الغرض منه فاذا قیل کَمُلَ
ذٰلك فمعناه حصل ما فیه الغرض منه۔
یعنی کمالِ شئ سے مراد ہے وہ غرض پوری ہو جانا
جس کے لیے وہ وجود میں آئی تھی۔ اور جب کسی
چیز کے متعلق کَمُلَ ذٰلك کہا جاتا ہے تو
اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس سے
مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا۔

کَمَلَ وکَمُلَ وکَمِلَ۔ کمولاً وکمالاً
پورا ہونا۔ اَکْمَلْتُ: میں نے کامل کر دیا۔ میں
نے پورا کر دیا۔

اَتْمَمْتُ - وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ
اتمام نعمت سے مراد مسلمانوں کا غلبہ اور عروج
اور ان کے مخالفین کا مغلوب و مفتوح ہونا ہے
جس کا ظہور مکہ مکرمہ کی فتح اور رسوم جاہلیت
کے مٹانے سے اور اس سال حج میں کسی مشرک
کے شریک نہ ہونے کا ذریعہ ہوا۔

اتمام نعمت کا مطلب یہ ہے کہ اب مسلمان
کسی کا محتاج نہیں ان کو خود حق تعالیٰ شانہ
نے غلبہ و قوت اور اقتدار عطا فرما دیا جس کے
ذریعہ وہ اس دین حق کے احکام کو جاری و نافذ
کر سکیں۔ (معارف القرآن)

ومعناه فی الخازن تَمَّ یَتِمُّ تَمًّا وتَمَامًا
کسی چیز کے تمام اجزاء کا پورا ہو جانا۔

مَخْمَصَة - فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ
غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِاِثْمٍ - تو جو کوئی بھوک کی
شدت سے بے قرار ہو جائے، گناہ کی طرف
رغبت کیے بغیر۔

مخمصہ کے معنی شدتِ بھوک کے ہیں۔
کلام کا مطلب یہ ہے کہ اس کھانے میں اس کا
گناہ کی طرف میلان نہ ہو بلکہ صرف اضطرار
کا رفع مقصود ہو۔

مخمصہ اس بھوک کو کہتے ہیں جس سے پیٹ
پچک جائے۔ مَخْمَصَةٍ ای مجاعة تورث
خَمَصَ البطن۔ (راغب)

رَجُلٌ خامصٌ پچکے ہوئے پیٹ والا آدمی۔
اخمص القَدَمَین۔ پاؤں کے تلوے کا گڑھا
اَلْخَمْصَةُ: الجوع وخلاء البطن من الطعام
والخمصُ ضُمُورُ البطن (قرطبی)
والخمصُ: الجوع (ابن جوزی)
خَمَصَ یَخْمِصُ خَمْصًا وخُمُوصًا۔ خَمَصَهُ الجُوعُ
بھوک کا کسی کو دُبلے پیٹ والا کر دینا۔

اَلْجَوَارِحِ - یہ جارحہ کی جمع ہے۔ مراد وہ
شکاری سدھائے ہوئے درندے ہیں جو
پھاڑ چیر کر کھانے والے ہوں۔ الجرح کے معنی
زخم کے ہیں۔ ان جانوروں کو جارحہ اسی لیے
کہتے ہیں کہ یہ شکار کو زخمی کرتے ہیں۔

مُكَلِّبِيْنَ - الكلبُ کتے کو کہا جاتا ہے
اس کی جمع اکلب اور کلاب آتی ہے۔ کَمَثَلِ
الکلب (اس کی مثال) کتے کی طرح ہے
مُكَلِّبِيْنَ یہ مُکَلِّب کی جمع ہے یعنی کتوں کو
شکار کی تعلیم دینے والے۔ ٹریننگ دینے والے
وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ۔ اور
ان (اصحاب کہف) کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ
پھیلائے ہوئے۔ اسی سے الکَلَبُ بفتح اللام
کا اشتقاق کیا گیا ہے جس کے معنی شدتِ حرص
کے ہیں۔ هُوَ اَحْرَصُ مِنْ كَلْبٍ وَرَجُلٌ كَلِبٌ
شدید الحرص۔
مُکَلِّبٌ۔ شکاری کتوں کی تربیت کرنے والا۔
ان کو شکار کرنے کا طریقہ سکھانے والا۔
اس کی جمع مُکَلِّبین ہے۔ مُکَلِّب کے دوسرے
معنی ہیں چھٹنے والا۔ اہل لغت نے دونوں معنی
بیان کئے ہیں اور یہاں آیت کریمہ میں دونوں
معنوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چونکہ شکار اسی وقت
حلال قرار دیا گیا ہے جب کہ یہ چھٹنے اور اُچکنے
والے درندے سُدھائے ہوئے ہوں
وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ
تُعَلِّمُوْنَهُنَّ - اور ان جانوروں کا شکار بھی
حلال ہے جو تمہارے لیے ان شکاری جانوروں نے
پکڑا ہو جن کو تم نے سدھایا ہوا ہو۔
مُکَلِّبِیْن یہ دراصل تَکْلِیْبٌ سے مشتق ہے
جس کے اصل معنی کتوں کو سدھانے اور سکھلانے
کے ہیں۔ پھر عام شکاری جانوروں کو سکھلانے
اور شکار پر چھوڑنے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے
لگا۔ صاحب جلالین نے اس کی جگہ مُکَلِّبِیْن کی تفسیر
ارسال سے کی ہے ای ارسلتہ علی الصَّيْدِ۔
جس کے معنی ہیں شکار پر چھوڑنا۔ اور تفسیر قرطبی
میں بھی یہ قول نقل کیا گیا ہے۔
اصحاب الکلاب وھو کالمؤدب صاحب
التادیب (قرطبی)

عَزَّرْتُمْ - وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ۔ اور تم ان
(رسولوں) کی مدد کرتے رہوگے۔ یعنی دشمنوں کے
مقابلہ میں تم خدا کے رسولوں کا اور اس کے دین کا تعاون
کروگے۔ یہ عَزْرٌ سے ہے۔ عَزَرَ يَعْزِرُ عَزْرًا
کے معنی ہیں مدد کرنا۔ ملامت کرنا۔ منع کرنا۔
عَزَرَهٗ عَلَى الْاَمْرِ۔ خبر دینا۔ عَزَرَهٗ عَنْ كَذَا[1]
التعزیر: کسی کو شرعی حد سے کم سزا دینا۔
التعزیر: اس مدد کو کہتے ہیں جو جذبہ تعظیم کے
ساتھ ہو۔ شرعی سزا کو بھی تعزیر اسی لیے کہتے ہیں
کہ یہ تادیبی سزا درحقیقت ظالم کو ظلم سے روکنے
پر مدد ہے کہ اس کی اصلاح ہو۔
(معارف۔ مفردات راغب)
والتعزیر: التعظیم والتوقیر۔
عَزَّرْتُمُوْهُمْ ای رددتم عنهم اعدائهم[2]

تَطَّلِعُ - وَلَا تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ
مِّنْهُمْ۔ آپ کو ان کی خیانت کی اطلاع آئے
دن آتی رہے گی۔ طَلَعَ يَطْلُعُ طُلُوْعًا۔ طَلَعَ
عَلَى الْجَبَلِ۔ پہاڑ پر چڑھنا۔ طَلَعَ الْبِلَادَ
کسی ملک کا قصد کرنا۔ طَلَعَ الشَّمْسُ طُلُوْعًا

[1] منع کرنا۔ [2] قرطبی

کے معنی آفتاب طلوع ہونے کے ہیں۔
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ۔
حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔
مَطْلَعَ کے معنی ہیں سورج طلوع ہونے کی جگہ
حَتّٰى إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ
عَلٰى قَوْمٍ۔ اسی سے طَلَعَ عَلَيْنَا فُلَانٌ
وَاطَّلَعَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں کسی کے
سامنے ظاہر ہونا اور اوپر پہنچ کر نیچے کی طرف
جھانکنا۔ هَلْ أَنْتُمْ مُطَّلِعُونَ فَاطَّلَعَ
بھلا تم اس کو جھانکنا چاہتے ہو۔ اتنے میں وہ خود
جھانکے گا۔ فَأَطَّلِعَ إِلٰى إِلٰهِ مُوسٰى[1]
أَطَّلَعَ الْغَيْبَ ، لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ۔
نَضِيد : جن کا گابھا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔
الطلوع ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جس پر سورج
طلوع ہو۔ طلاع آفتاب کی مناسبت سے
طلع النخل کا محاورہ ہے جس کے معنی درخت
خرما کے غلاف کے ہیں جس کے اندر خوشہ ہوتا
ہے

خَائِنَة ۔ یہ خِيَانَةٌ کے معنوں میں ہے
خیانت کا لفظ عہد اور امانت کا پاس نہ رکھنے
پر بولا جاتا ہے۔ الخائنة : الخيانة (قرطبی)

اِصْفَحْ ۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ
صَفْحٌ مصدر ہے، ملامت ترک کرنا اور معاف
کر دینا۔ جرم پر مؤاخذہ نہ کرنا۔ صفح یہ عفو
سے زیادہ بلیغ ہے۔ اسی لیے ایک مقام پر سورۃ
بقرہ میں ارشاد ہے : فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا
حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ ۔ یہاں حق تعالیٰ
نے عفو کے بعد صفح کا ذکر کیا ہے چونکہ انسان
کسی وقت معاف تو کر دیتا ہے۔ مگر صفح سے کام
لینا دشوار ہوتا ہے کہ اس قدر درگزر کرے
کہ مجرم کو مجرم ہی نہ گردانے۔ تو صفح کا مطلب
یہ ہوا کہ ان کے جرائم کے باوجود بھی ان سے
انتقام نہ لیں۔ ان سے نظر بچاتے رہیں۔
صَفْحٌ کے اصل معنی جانب اور کنارہ کے ہیں
جیسا کہ لسان العرب میں ہے : الصَّفْحُ :
الجَنْبُ۔ وصفح كل شئ جانبه۔
تو صفح کے معنی ہوئے کنارہ کش ہونا۔ الزام
سے درگزر کرنا۔ یہ صَفَحَ يَصْفَحُ کا مصدر ہے۔
اِصْفَحْ اسی سے امر کا صیغہ ہے۔ اَلصَّفْحُ
تَرْكُ التثريب وهو ابلغ من العفو (راغب)

اَغْرَيْنَا ۔ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمَا الْعَدَاوَةَ
وَالْبَغْضَاۤءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۔ اَغْرَيْنَا
غَرْوٌ سے ماخوذ ہے غَرِيَ بِكَذَا کے معنی
ہیں کسی کے ساتھ چپٹ جانا۔ امام راغب
فرماتے ہیں کہ اَصْلُ ذٰلِكَ مِنَ الْغِرَاءِ
کہ اصل میں یہ غِراء سے ہے اور غراء
اس مادہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو دوسرے
کے ساتھ پیوست کیا جائے۔ اَغْرَيْتُ
فُلَانًا بِكَذَا کے معنی ہیں میں نے فلاں کو اس
پر اُبھارا۔ اور اُکسایا۔ آیت کے معنی یہ ہوئے
کہ ہم نے اُن کے اندر باہم قیامت تک دشمنی
اور کینہ ڈال دیا۔ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ یعنی مسیحی

[1] تاکہ میں موسیٰ کے خدا کی طرف چڑھ جاؤں (فتح محمد)

قومیں مذہبی اعتبار سے کبھی ایک جگہ جمع نہ ہوسکیں گی۔

اَغْرَیْنَا: ای ھَیَّجْنا و قیل اَلْصَقْنَا بھم ماخوذ مِنَ الغِراء وھو ما یُلصِق الشئ بالشئ (قرطبی) مطلب یہ کہ بغض و عداوت ان کے ساتھ قیامت تک کے لیے چپکا دیا گیا ہے۔

فَتْرَۃٍ - یُبَیِّنُ لَکُمْ عَلٰی فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ۔ فترت کے لفظی معنی سست ہو جانے ساکن ہونے، منقطع ہونے اور کسی کام کو معطل اور بند کر دینے کے آتے ہیں اور اس سے مراد کچھ عرصہ کے لیے سلسلۂ وحی کا بند اور موقوف ہو جانا ہے۔ اور یہاں فترت سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے لے کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کا زمانہ ہے۔ فَتَرَ یَفْتُرُ فُتُوْرًا وَ فَتْرَۃً - تیزی کے بعد ساکن ہونا۔ سختی کے بعد نرم ہونا۔

جَبَّارِیْنَ - قَالُوْا یٰمُوْسٰی اِنَّ فِیْھَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ۔ جبّار یہ اَلْجَبْرُ سے مشتق ہے۔ اصل میں اس کے معنی زبردستی اور دباؤ کے ساتھ کسی چیز کی اصلاح کرنا۔ صیغہ صفت جابر اور مفعول مَجْبُوْرٌ آتا ہے۔ الجبّار یہ اسم مبالغہ ہے۔ جب لفظ جبّار انسان کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ناجائز تعلّی سے اپنے نقص کو چھپانا۔ اور پھر بطور استعارہ کے عام طور پر اس کا استعمال مذمت ہی میں ہوتا ہے۔ وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ (۱۴ : ۱۵)

ہر سرکش ہٹ دھرم نامراد ہو گیا۔

وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا۔ اور خدا نے مجھے سرکش بدبخت نہیں بنایا۔

اِنَّ فِیْھَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ۔ بے شک وہاں تو بڑی زبردست قوم رہتی ہے۔

کَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قَلْبِ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ۔ اس طرح خدا ہر متکبر سرکش کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے۔

اور کبھی بھی محض دوسرے پر استبداد کرنے والے کو بھی جبّار کہتے ہیں۔ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِجَبَّارٍ اور جب لفظ جبّار باری تعالیٰ کی صفت ہو۔ جیسا کہ اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ تو اس سلسلہ میں اس کے اشتقاق میں اہل لغات کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ جَبَرْتُ الْفَقِیْرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں فقیر کی حالت کو درست کرنا۔ اور اس کو فقر سے بے نیاز کرنا۔ تو چونکہ باری تعالیٰ لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے اور حالتیں درست کرتے ہیں اس لیے حق تعالیٰ کو جبّار کہا جاتا ہے۔ اور ایک رائے یہ ہے کہ چونکہ اللہ اپنے ارادے کے سامنے مقہور کر لیتا ہے۔ اس لیے اس کو الجبّار کہا جاتا ہے۔

الجبّار: بڑے ڈیل ڈول موٹے تازے آدمی کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ جو قد بُت کے لحاظ سے کافی لمبا چوڑا ہو۔ ای عظام الاجسام طوالاً (قرطبی)۔ قال الزجاج: الجبّار من الآدمیین الذی یُجبِرُ الناسَ عَلٰی مَا یُرِیْدُ[1]

[1] ابن جوزی

یہ جبار قوم عمالقہ تھی جو عاد و ثمود کی نسل شمار
کیے گئے ہیں۔ واللہ اعلم

یَتِیْھُوْنَ - یَتِیْھُوْنَ فِی الْاَرْضِ
وہ اس سرزمین پر سر مارتے پھریں گے۔
و معنی یَتِیْھُوْنَ یَحُوْرُوْنَ (ابن جوزی)
تَاہَ یَتِیْہُ تِیْھًا وَتَیْھَانًا وَھُوَ تَیَّاہٌ
حیران و متحیر ہونا۔
تَیَّھَہٗ وَتَیَّاہٗ : اَضَلَّہٗ وَضَیَّعَہٗ : حیران کرنا
پھینک دینا۔ گمراہ کرنا۔
وَقَعَ فِی التِّیْہِ : ورطۂ حیرت میں پھنس گیا۔
مَفَازَۃٌ تَیْھَاءُ : وہ جنگل جس میں مسافر کو راہ
نہ ملے۔ التِّیْہُ : حیرانی۔ گمراہی۔ جمع اَتْیَاہ
و اَتَاوِیْہ و اَتَاوِھَۃ۔ یُقَالُ تَاہَ یَتِیْہُ
اذا تحیر (راغب)
تَاہَ فِی الارض یَتِیْہُ : ذَھَبَ مُتَحَیِّرًا
وَضَلَّ (لسان العرب)

یَبْحَثُ - یَبْحَثُ فِی الْاَرْضِ :
زمین کھودتا تھا۔
البحث کے معنی کریدنا اور تلاش کرنا کے ہیں
بَحَثْتُ عَنِ الْاَمْرِ : میں نے فلاں معاملہ کی کھود
کرید کی یا تلاش کیا۔ اس کی جمع اَبْحَاث ہے۔
بَحَثَ یَبْحَثُ بَحْثًا : مٹی کے نیچے تلاش کرنا
تفتیش کرنا۔ تحقیق کرنا۔
اس مادہ سے باب فتح۔ تفعل اور انفعال اور
استفعال سب ہم معنی ہیں۔ اگر اس کے بعد عَنْ
آجائے جیسے بَحَثَ عَنْہُ یا تبحث عَنْہُ
تو تفتیش و تحقیق اور چھان بین کرنے کے معنی ہوتے
ہیں۔ مُبَاحَثَہ : باہم کسی مسئلہ کی تنقیح کرنا۔

یُوَارِیْ - لِیُرِیَہٗ کَیْفَ یُوَارِیْ سَوْاَۃَ
اَخِیْہِ - تاکہ اُسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی
لاش کو کیسے دفنائے۔
وَارٰی یُوَارِیْ مُوَارَاۃً - وَارَی الشَّیْءَ :
پوشیدہ کرنا، چھپانا۔ تَوَرّٰی عنہ : مخفی کرنا
چھپانا۔ اصل میں وَرٰی سے ہے۔ وَارَیْتُ
کذا کے معنی ہیں میں نے چھپایا۔ قرآن پاک میں
یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔
قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ
ہم نے تمہارے لیے لباس اُتارا کہ تمہارے ستر
والے بدن کو چھپاتا ہے۔ اسی سے تَوَارٰی
لازمی معنی میں آتا ہے۔ جس کے معنی چھپ جانا ہیں
حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ - یہاں تک کہ سورج
پردے میں چھپ گیا۔ اسی سے وَرّٰی (تفعیل) آتا
ہے۔ جس کے معنی توریہ کرنے کے ہیں۔ وَرَّی الْخَبَرَ
کوئی خبر توریۃً بتانا۔ یعنی اصل بات کو چھپا کر اسے
کسی ایسے طریقے پر ظاہر کرنا کہ بات بھی سچی ہو
اور جھوٹ سے بھی بچ جائے اور کسی تیسرے پر
اس کا افشا بھی نہ ہو۔ اسی سے ہے اَلْوَرٰی
جس کے معنی مخلوق کے ہیں لیکن الورٰی مطلق مخلوق
کو نہیں کہتے بلکہ بقول بعض اہل لغت کے اس کے
معنی کا لحاظ کرتے ہوئے اس مخلوق کو کہا جاتا ہے
جو فی الحال موجود ہو اور اپنی کثرت سے زمین کو چھپائے
ماضی یا مستقبل کی مخلوقات الورٰی میں شامل نہیں۔

الوَرَاءُ : یہ وَرْءٌ سے ہے جس کے معنی ہیں پچھلی جانب۔ مثلاً ایک آدمی آپ کے بعد آتا ہے۔ اس پر وراء کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے : مِنْ وَّرَاءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۔

اور وراء : سوی کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ
یہاں وراء ، سواء کے معنی میں ہے۔ پھر ان ہی معنوں کا اعتبار کر کے لفظ وراء آسمانی کتابوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ۔ اس کے سوا اور کتابوں کو نہیں مانتے ۔

اور وَرِيَ يَرِيْ وَرْيًا۔ وَرِيَ الزَّنْدُ چقماق کا پیچھے سے آگ نکالنا۔ پھر خود چقماق میں آگ کے پوشیدہ ہونے کا لحاظ کر لیا ہے۔ چونکہ آگ میں کو رگڑنے کے بعد ہی نکلتی ہے۔
اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ (راغب)
یہ بتلاؤ کہ جس آگ کو تم سلگاتے ہو۔ (ماجدی)

سَوْءَۃ ۔ اس کے لفظی معنی جسم کے پوشیدہ رکھے جانے والے حصے کے ہیں جس کا کھلا رہنا عرفاً بھی اور شرعاً بھی ناپسندیدہ اور خلاف شرافت ہو۔ یہاں مراد نعش ہے۔ اس کا کھلا چھوڑ دینا اور یوں ہی پھینک دینا نہ عرف اس کو قبول کرتا ہے نہ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے

السُّوْءُ : ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو غم اور رنج میں مبتلا کر دے۔ خواہ یہ غم دنیوی امور میں ہو یا اُخروی امور میں۔ اور عام اس سے کہ اس کا تعلق احوالِ نفسانیہ سے ہو یا بدنیہ سے ۔

بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۔ کسی عیب کے بغیر چمکتا دمکتا نکلے گا۔ یہاں سوء سے مراد برص کی بیماری ہے کہ ید موسیٰ کی چمک اور سفیدی کرامت و معجزہ کی وجہ سے ہوگی نہ کہ برص کی بنا پر۔
اَسَاءَ اِسَاءَۃً ۔ خراب کرنا۔ بگاڑنا۔ بدی کرنا۔
اَسَاءَ اِلَيْهِ : کسی کے ساتھ برائی کرنا۔
السَّوْءُ یہ بفتح السین مصدر ہے۔
رَجُلُ سَوْءٍ ۔ بدکار یا بداخلاق آدمی۔
السَّيِّئَۃُ ۔ برائی۔ بدی۔ السَّوْءَۃُ ۔ بےحیائی۔ بدخصلت۔ شرمگاہ۔ اس کی جمع سَوْءَات آتی ہے۔ يُوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ کہ تمہارے ستر ڈھانکے ۔

لغوی اعتبار سے سَوْءَۃ کے معنی بُرائی اور فساد وغیرہ ہی کے آتے ہیں۔ مگر پھر استعارہ کے طور پر عورت اور مرد کی شرمگاہوں پر بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ پھر اس کو مزید وسعت دیکر لاش اور مُردے کے معنی میں بھی اس کا اطلاق ہو جاتا ہے ۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اس ظالم نے مقتول کے کپڑے بھی اتار لیے تھے۔ لہٰذا اب نعش بالکل ننگی تھی۔ ممکن ہے قرآن نے اسی کو ظاہر کرنے کے لیے سَوْءَۃ کا لفظ اختیار کیا ہو
سَوْءَۃَ اَخِيْهِ اي جيفته لانه قد سلب ثيابه (معالم التنزیل)

عَجَزْتُ ۔ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ ۔ وائے بدنصیبی کہ میں اس سے گیا گزرا ہو گیا کہ اس کوے کی مانند ہوتا۔

قابیل بکمال حسرت کہہ رہا ہے کہ مجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا اور اتنا فہم بھی میرے اندر نہ ہو سکا کہ بھائی کی نعش کو دفن کر دیتا۔

عَجَزَ یَعْجِزُ وعَجِزَ یَعْجَزُ عَجْزًا و عُجُوزًا وَ عَجَزَانًا۔ طاقت نہ ہونا۔ کسی کام پر قدرت نہ ہونا۔ عَجَزَ عَنِ الْاَمْرِ۔ کام سے معذور ہونا عَجُزُ الانسان۔ انسان کا پچھلا حصہ۔ پھر تشبیہ کے طور پر ہر چیز کے پچھلے حصہ کو عَجُزٌ کہدیتے ہیں۔ کَاَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَۃٍ جیسے کہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

عَجُزٌ: اس کے اصل معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانا۔ یا اس کے ایسے وقت میں حاصل ہونے کے ہیں کہ موقع نکل چکا ہو۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ کسی کام کرنے سے قاصر رہ جانے پر بولا جاتا ہے اور قُدْرَۃ کی ضد ہے۔

اَلْغُرَاب۔ یہ اصل میں غَرْبٌ سے ہے۔ جس کے معنی سورج کے غروب ہونے کے ہیں۔

غَرَبَتْ۔ تَغْرُبُ غَرْبًا۔ وغُرُوْبًا۔ سورج غروب ہوگیا۔ مَغْرِب آفتاب کے غروب ہونے کی جگہ یا وقت۔ اور اجنبی اور مسافر کو بھی غریب کہا جاتا ہے اور اس چیز کو غریب کہتے ہیں جو اپنی ہم جنس چیزوں میں بے نظیر ہو اور کوّے کو غراب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی سفر معاش میں بہت دُور نکل جاتا ہے۔ اور بے پھل کے درخت کو بھی غَرْبٌ کہتے ہیں کہ وہ بھی گویا ثمرات سے دور ہے (راغب)

نَادِمِیْن۔ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ

النَّدَمُ اور النَّدَامَۃ کے معنی فوت شدہ امر پر حسرت کرنے کے ہیں۔ ہم مجلس وہم پیالہ کو ندیمان اس لیے کہتے ہیں کہ آخرکار انجام ان کا بھی حسرت و پشیمانی ہی ہوتا ہے۔

نَدِمَ یَنْدَمُ (س) نَدَمًا و نَدَامَۃً۔

نَدِمَ عَلٰی فِعْلٍ: اپنے کیے پر پشیمان ہونا۔

اَلْوَسِیْلَۃ۔ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ یعنی اللہ کا قرب تلاش کرو۔

لفظ وسیلہ، وَسْلٌ مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی ملنے اور جڑنے کے ہیں۔ یہ سین اور صاد دونوں سے تقریباً ایک معنی میں آتا ہے فرق اتنا ہے کہ وصل بالصاد مطلقاً ملنے اور جوڑنے کے معنی میں ہے اور وَسْل بالسین رغبت اور محبت کے ساتھ ملنے کے لیے مستعمل ہے۔ صحاح جوہری اور مفردات القرآن راغب اصفہانی میں اس کی تصریح ہے۔ اس لیے صاد کے ساتھ وَصِیْلَۃٌ اور وَصْلَۃٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان میل اور جوڑ پیدا کر دے۔ خواہ وہ میل اور جوڑ رغبت اور محبت سے ہو یا کسی دوسری صورت سے۔ اور سین کے ساتھ لفظ وسیلہ کے معنی اس چیز کے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے کے ساتھ محبّت و رغبت کے ساتھ ملا دے (معارف بحوالہ راغب وصحاح)

اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ ہر وہ چیز ہے جو بندہ کو رغبت و محبت کے ساتھ اپنے محبوب کے قریب

کر دے۔

لفظ وسیلہ سے مراد کیا ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن بن جوزی نے اہل تحقیق کے دو قول نقل کیے ہیں۔ ایک یہ کہ انھا القربة ۔ یعنی وسیلہ سے مراد القربة ہے ۔ ابن عباس، مجاھد، عطاء، اور فراء کا قول یہی ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا : تَقَرَّبُوا الیہ بِمَا یُرضِیْہ۔

ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ جب کہتے ہیں کہ : تَوَسَّلْتُ اِلَیْہِ تو اس کے معنی ہوتے ہیں تَقَرَّبْتُ اِلَیْہ

دوسرا قول یہ ہے کہ وسیلہ سے مراد محبت ہے ۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تَحَبَّبُوا الی اللہ

لفظ وسیلہ کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ زمخشری فرماتے ہیں الوسیلة : کل ما یُتَوَسَّلُ بہ ای یتقرب من قرابةٍ او صَنِیعَةٍ او غیر ذٰلك، فاستُعِیرتْ لما یتوسل بہ الی اللہ من فعل الطاعات و ترك المعاصی (کشاف)

الوسیلة : القُربة الزُّلفة ۔ یُقال تَوَسَّلَ الیٰ کذا ای تَقَرَّبَ (ابن قتیبہ)

امام راغب لکھتے ہیں کہ : وحقیقة الوسیلة الی اللہ تعالیٰ مراعاةُ سبیلہ بالعلم والعبادة وتحرّی مکارم الشریعة وھی کالقربة (راغب)

در حقیقت توسل الی اللہ علم و عبادت اور مکارمِ شریعت کی بجا آوری سے طریقِ الٰہی کی محافظت کرنے کا نام ہے ۔ اور یہی معنی تقرب الی اللہ کے ہیں ۔ اور اللہ کی طرف رغبت کرنے والے کو واسل کہا جاتا ہے ۔ جن لوگوں نے وسیلہ کے تحت بزرگانِ دین کی استعانت اور انبیاء و اولیاء سے استغاثہ جائز رکھا ہے اُنہوں نے عربی کے وسیلہ بمعنی قرب کو اردو کی وسیلہ بمعنی ذریعہ کا مرادف سمجھ لیا ہے ۔ اور ایسی فاحش غلطی کی ہے کہ قرآن پاک میں تحریف کے مرادف ہے ۔ اور ایسی غلطیاں ان حضرات سے نادر نہیں بلکہ کثیر الوقوع ہیں ۔ علامہ آلوسی صاحبِ روح المعانی نے بڑے بسط کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے : اما اذا کان المطلوب منہ میتاً او غائباً فلا یستریبُ عالمٌ انہ غیر جائز وانہ من البدع التی لم یفعلہا احدٌ من السلف ۔ میت یا غائب سے دعا کرانے کے ناجائز ہونے میں کسی عالم کو بھی شک نہیں ہے۔ یعنی اہل علم کے نزدیک یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ فوت شدہ بزرگوں سے دعا اور استعانت طلب کرنا ناجائز ہے ۔ اور علامہ اس پر مزید بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ : ولم یُروَ عن احد من الصحابة رضی اللہ عنھم وھم احرص الخلق علی کلّ خیر انہ طَلَبَ من میتٍ شیئاً۔

مطلب یہ ہے کہ حضرات صحابہ سے بڑھ کر نیکی اور ثواب کا حریص اور کون ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک صحابی سے بھی منقول نہیں کہ انہوں نے کسی صاحبِ قبر سے کبھی کچھ طلب کیا ہو۔

صحابہ میں سے جناب عبداللہ بن عمر کا اتباعِ سنت میں بڑا مقام ہے ۔ اُن کے بارے میں مروی ہے کہ روضۂ اطہر کی زیارت کو جاتے تو یہ الفاظ

دُعائیہ فرماتے : السلام عَلَیکَ یَا رسُولَ اللہ، اَلسَّلَامُ عَلَیکَ یَا اَبَا بکر السّلام یا ابت ثم ینصرف وَلا یزید عَلیٰ ذٰلک وَلا یَطلب من سَیّد العالمین صَلّی اللہ عَلیہ وَسلم او من ضجیعیہ المکرمین شیئاً وھُم اکرم من ضمّتہُ البسیطۃ وارفع قدرًا من سائر مَنْ احاطت بہ الافلاک المحیطۃ (ماجدی)

اَلسَّارِقُ - اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا جَزَآءًۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ

یعنی چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو اُن کے کردار کے بدلہ میں، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

السَّرِقَۃُ : مصدر ہے۔ باب ضَرَبَ سے۔ اس کے معنی خفیہ طور پر اس چیز کے لینے اور اُٹھا لینے کے ہیں جس کو اُٹھانے کا حق نہ تھا۔ اور اصطلاحِ شریعت میں کسی چیز کو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں لے لینے کے ہیں۔

السّرقۃ : اَخذُ مَا لَیسَ لَہٗ اخذہ فی خفاءٍ وَصَارَ ذٰلک فی الشرع لتناول الشئ من موضع مخصوص وقدر مخصوص (راغب)

قاموس میں ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا مال کسی محفوظ جگہ سے بغیر اس کی اجازت چھپ کر لے لے اس کو سرقہ کہتے ہیں۔ یہی اس کی شرعی تعریف ہے اور اس تعریف کی رُو سے سرقہ ثابت ہونے کے لیے چند چیزیں ضروری ہوئیں۔

اول یہ کہ وہ مال کسی فرد یا جماعت کی ذاتی مِلک ہو چُرانے والے کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو اور نہ ہی سارق کی ملکیت کا شبہ ہو۔ اور نہ ہی مال مسروقہ ایسی چیز ہو جس میں عوام کے حقوق مشترک ہوں جیسا کہ رفاہِ عام کے ادارے اور اُن کی اشیاء جیسا کہ پُل، مساجد اور ہسپتال وغیرہ۔

دوسری چیز تعریف سرقہ میں مال کا محفوظ ہونا ہے۔ یعنی مکان مقفل ہو یا چوکیدار وغیرہ موجود ہو۔ اور اگر مال محفوظ جگہ پر نہ ہو اور اس کو کوئی اُٹھا لے تو حدِ سرقہ نہیں ہے۔ تیسری چیز اثباتِ سرقہ میں یہ ہے کہ بلا اجازت ہو جس مال کے لینے یا اُٹھانے کی اجازت دے رکھی ہو وہ اس کو بالکل لے جائے تو حدِ سرقہ عائد نہ ہوگی بلکہ اجازت کا شبہ ہو تو سرقہ کی حد ساقط ہو جائے گی۔ چوتھی شرط سرقہ کے لیے یہ ہے کہ مال چُھپا کر لیا جائے۔ چونکہ اگر علانیہ لوٹا جائے تو اس کو سرقہ نہیں بلکہ ڈاکہ کہتے ہیں جس کی حد الگ ہے۔ پھر اثباتِ سرقہ کے لئے پانچویں چیز یہ ہے کہ سارق اقرار کرے یا اس پر عادل گواہ شہادت دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر چوری پر حدِ قطع ید نہیں بلکہ سرقہ کی تمام شرائط ثابت ہونے کے بعد حد ہوگی۔

قد ثبت عندنا ان الحکم متعلق بمعنی غیر الاسم یجب اعتبارہ فی ایجابہ وھو الحرز والمقدار۔ (جصاص)

اَلسُّحْتُ - اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔ حرام خور

اَلسُّحُتُ: اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے ہر حرام خوری کو شامل ہے۔ السحت: الحرام و ما خَبُثَ مِنَ المَکَاسِبِ (قاموس)

وھو کُلّ ما لا یحلّ کسبہ (مدارک)

انہ کلّ کسبٍ لا یحلّ۔ (ابن جوزی)

سُحت: کے لفظی معنی کسی چیز کو جڑ بنیاد سے کھود کر برباد کرنے کے ہیں۔ اسی معنی میں قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ فَیُسْحِتَکُمْ بِعَذَابٍ یعنی اگر تم اپنی مجرمانہ حرکتوں سے نہ رکے تو اللہ ایسے عذاب سے تم کو برباد کر دے گا۔ یعنی تمہاری جڑ بنیاد اور نسل ہی کو ختم کر دے گا۔

قرآن کریم میں سُحت سے مراد بالاتفاق رشوت ہے و ماکانوا یأخذون الرشا علی الاحکام وتحلیل الحرام (کشاف)

ھو الرشوۃ (ابن کثیر) وفی الحدیث ھو الرشوۃ فی الحکم۔ (مدارک) یعنی رشوت لے کر فیصلہ کرنا سُحت میں شامل ہے۔

(قرطبی)

رشوت کو سُحت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف لینے دینے والے کو برباد بلکہ پورے ملک و ملت کی جڑ اور بنیاد اکھاڑ دیتی ہے اور امن عامہ کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ جس ملک یا محکمہ میں رشوت چل جائے وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور قانون ملک ہی وہ چیز ہے جس سے ملک و ملت کا امن رکھا جاتا ہے۔ وہ معطل ہو گیا تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے اور نہ آبرو نہ مال۔ اس لیے شریعت نے سُحت کو اشد جرم قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ رشوت خور حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا مجرم ہوتا ہے۔ وسُمّی المال الحرام سُحتًا لانہ یسحت الطاعات ای یذھبھا (قرطبی)

اور اس دروازے کو بند کرنے کے لیے امراء اور حکام کو جو ہدیے جاتے ہیں اور تحفے تحائف پیش کیے جاتے ہیں ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دے کر حرام کر دیا گیا ہے۔

وعن ابن مسعود: قال السحت ان یقضی الرجل لاخیہ حاجۃ فیھدی الیہ ھدیۃ فیقبلھا۔ (قرطبی)

حدیث میں ہے یأتی علی الناس زمانٌ یُستحل فیہ السحت بالھدیۃ۔ یعنی لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ رشوت کو ہدیہ کی آڑ میں حلال بنائیں گے رشوت کی تعریف شرعی یہ ہے کہ جس کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو اس کا معاوضہ لیا جائے۔

(معارف القرآن)

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ جب حاکم رشوت لے تو اس کو فوراً معزول کیا جائے گا۔ وقال ابوحنیفۃ: اذا ارتشی الحاکم یُعزل فی الوقت۔ (قرطبی)

اَلْعَیْنُ ۔ عین کے معنی آنکھ کے ہیں۔ اس کی جمع اَعْیُن آتی ہے۔ جیسا کہ وارد ہے: لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِھِمْ ان کی آنکھوں کو مٹا دیں گے وَاَعْیُنُھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ پھر عین کے معنی حفاظت اور نگہبانی کے بھی آتے ہیں فُلَانٌ بِعَیْنِیْ کے معنی

ہیں فلاں میری حفاظت میں ہے۔ فَاِنَّكَ
بِاَعْيُنِنَا تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔
لفظ عَيْنٌ عربی زبان میں کثیر المعانی ہے۔ اس کا
اطلاق بہت چیزوں پر ہوتا ہے۔

اَلْاَنْفُ ۔ انف اصل میں ناک کو کہتے ہیں اور
مجازاً کسی چیز کے بلند حصّہ کو کہتے ہیں۔ انف الجبل
پہاڑ کی چوٹی۔

اَلْاُذُنُ ۔ الاُذُنُ بِالْاُذُنِ۔ اُذُن کان
کو کہتے ہیں اس کی جمع آذان آتی ہے۔ قرآن میں ہے
وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا

مُهَيْمِنًا ۔ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ۔ اُن پر محافظ ہے
مُهَيْمِن کے لفظی معنی محافظ و نگہبان کے ہیں۔
اَلْمُهَيْمَنَة : الحِفظُ وَالارتقابُ (ابن جریر)
قال قتادة : معناه الشاهد: وقيل :
الحافظ ۔ و قال الحسن : المصدّق (قرطبی)
حافظ ابن کثیر نے ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد
لکھا ہے کہ یہ تمام اقوال قریب المعنی ہیں۔ ان میں
کوئی منافات نہیں ہے۔ اور لفظ مھیمن وسعتِ
معنوی کے لحاظ سے تمام کو شامل ہے۔ اور قرآن
پاک تمام کتابوں کا خاتم اور سب سے اکمل واعظم اور
سب کو شامل ہے۔ هذه الاقوال كلها
متقاربة المعنى، فان اسم المهيمن يتضمن
هذا كله فهو امين وشاهد وحاكم على
كل كتاب قبله جعل الله هذا الكتاب العظيم
الذى انزله آخر الكتاب وخاتمها اشملها
واعظمها واكملها حيث جمع فيه محاسن
ما قبله وزاده من الكمالات ماليس فى
غيره فلهذا اجعله شاهداً وامينا وحاكماً
عليها كلها (ابن کثیر)

یہ ذکر کردہ تفسیر اسوقت ہے جبکہ مُهَيْمِنًا کو اسم فاعل
بکسر المیم پڑھا جائے۔ لیکن ایک دوسرا قول بعض اہل علم
کی طرف منسوب ہے کہ مُهَيْمَنٌ مفعول ہے اور اس سے
مراد ذاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ قول
ابن ابی حاتم نے عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء خراسانی،
اور حضرت مجاھد کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس صورت
میں معنی یہ ہوں گے کہ مھیمناً علیہ: محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو قرآن پر نگران بنایا ہے۔ عَلَيْه کی ضمیر کا مرجع
قرآن ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نقل میں کہیں غلطی ہوگئی
ہے۔ چونکہ یہ معنی عربی قواعد کے اعتبار سے کمزور ہیں۔
چنانچہ حافظ ابن کثیر اپنے استاد ابن جریر کا اس پر کلام
نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ وهذا تاويل بعيد
من المفهوم فى كلام العرب بل هو خطأ
و ذلك ان المهيمن عطف على المصدّق
فلا يكون الا صفة لما كان المصدّق صفة به
ولو كان الامر كما قال مجاهد ، قال تعالىٰ :
وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ
یعنی من غیر عطف۔ اگر مراد وہ ہی ہوتی جو مجاہد وغیرہ
سے منقول ہے تو مصدّق اور مھیمن میں حرف واو کا
عطف نہ ہوتا۔ عطف کے بعد دونوں صفتیں ایک ہی
موصوف کی ہوں گی اور وہ قرآن ہے (ابن کثیر)
اللہ رب العزت نے قرآن پاک کی صفات کا ذکر کیا ہے

ایک یہ کہ بالحق وہ بذاتِ خود صحیح اور سچی ہے۔ اور دوسری مُصَدِّقًا کہ وہ اپنی پہلی آسمانی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور تیسری صفت مُهَيْمِن ہے جو تمام صفات کو حاوی ہے۔ صفت مصدّق اور مُهَيْمِن ان دونوں کے لانے سے قرآن پاک کی دو خاص حیثیتوں کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ ایک یہ کہ سابقہ تمام کتب کے ضروری احکام اس میں آگئے ہیں اور دوسری یہ کہ قرآن پاک دوسری کتب پر بطور نگہبان بھی ہے۔ یعنی ان کی تحریفات و تصحیفات کے لیے ایک معیار ہے جو احکام اس کے مطابق ہوں گے انہیں سچا قرار دیا جائیگا۔ اور جو اس سے ہٹ جائیں انہیں ہٹا دیا جائے گا اور وہ ناقابلِ قبول ہوں گے۔ فماوافقه منها فهوحق وماخالفه منها فهو باطل (ابن کثیر)

صرفی تحقیق : مبرد کی تحقیق یہ ہے کہ صرفی اعتبار سے اس میں تعلیل ہوئی ہے۔ اصل میں مُهَيْمِن مُؤَيْمِنٌ تھا، ہمزہ کو ھاء سے بدل کر مُهَيْمِن بنا دیا گیا ہے جیسا اَرَقْتُ الماءَ سے هَرَقْتُ الماءَ۔ زجاج اور بوعلی بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ اور اس کی تعلیل کے بعد گردان یوں ہوگی ؛ هَيْمَنَ يُهَيْمِنُ هَيْمَنَةً وَهُوَ مُهَيْمِنٌ۔ اس صورت میں یہ اَمِيْنًا علیہ کے معنی میں ہوگا۔ اس کا اصل اشتقاق اٰمَنَ غيره مِنَ الخوفِ ہے۔ دوسرے کو ہر خوف و خطر سے مامون کر دینا۔ اٰمَنَ کی اصل ااُمَنَ اور اسم فاعل مُؤَأْمِنٌ دو ہمزوں سے آتا ہے۔ دوسرے ہمزہ کو ثقل اجتماع کی وجہ سے یاء بنا دیا گیا تو اب مُؤَيْمِن ہوگیا۔ پھر پہلے ہمزہ کو ھاء سے تبدیل کر دیا گیا جیسا کہ هَرَاقَ اور اَرَاقَ۔

هَيْمَنَ عَلَى الشَّيْءِ يُهَيْمِن اذا كان له حافظًا (قرطبی) هَيْمَنَ الطَّائِرُ عَلٰى فِرَاخِهٖ۔ پرندہ کا بچوں پر پھیلا کر ان کو اپنی حفاظت میں لے لینا۔ قرآن پاک نے تورات و انجیل پر بازو پھیلا کر ان کو تحریف سے محفوظ کر لیا اور ان کے احکام سب اپنے اندر سمیٹ لیے۔ یہ صرف تعلیل قرطبی سے منقول ہے لیکن صاحبِ جمل علامہ سلیمان بن عمر العجیلی فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے اور خواہ مخواہ کا تکلف ہے جس کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ صاحبِ جمل کے نزدیک اس کی اصل هَيْمَنَةٌ ہے (واللہ اعلم)

شِرْعَةً ۔ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ہر ایک کے لیے ہم نے ایک دستور اور ایک راستہ بنایا ہے۔ اس میں دو راستوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایک وہ راستہ ہے جس پر اللہ تعالےٰ نے ہر انسان کو مسخر کر رکھا ہے کہ انسان اسی راستہ پر چلتا ہے جس کا تعلق مصالحِ عباد اور شہروں کی آبادی سے ہے۔ اور آیت وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا۔ اور ہر ایک کو دوسرے پر درجے بلند کیے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔ اس میں اسی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا راستہ دین کا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے مقرر فرما کر انھیں حکم دیا کہ انسان اپنے اختیار سے اس پر چلے جس کے بیان میں شرائع کا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں نسخ

ہوتا ہے۔ اور جس پر آیت ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى
شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا۔ پھر ہم نے تمھیں
دین کے کھلے راستہ پر (قائم) کردیا تو اسی راستہ
پر چلے چلو۔ دلالت کرتا ہے (راغب)
حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ شریعت
وہ راستہ ہے جس کو قرآن نے خود متعین کیا۔ اور
منہاج وہ راستہ ہے جسے سنت نے واضح کیا۔
الشِرعة : اس راستہ کو کہتے ہیں جو بالکل واضح
اور کھلا ہو اور الشِرعة والشَّرِيْعَة دونوں کا
ایک معنی ہیں۔ اصطلاحِ اسلام میں اس سے مراد
وہ راستہ ہے جس میں انسان کی فلاح اور نجات ہو۔
الشِرعة والشريعة : الطريقة الطاهرة
التي يُتوصل بها الى النجاة (قرطبی)
اور لغوی اعتبار سے شرعہ اس راستے کو کہا
جاتا ہے جو پانی کی طرف لے جائے اور انسان اس
سے سیراب ہو شَرَعَ فِی الْمَاءِ کے معنی پانی میں
گھس جانے کے ہیں۔
الشَّرِيعَة فی اللغة الطريق الذی يتوصل
منه الى الماء (قرطبی)
الشارع : عام راستہ کو کہا جاتا ہے جس میں
چلنے کی کوئی ممانعت نہ ہو۔ شرع الباب:
دروازہ سڑک کی طرف کھولنا۔ شِرعَة اور شَرِيْعَة
دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ اسلامی قانون اور
احکام خداوندی۔ شِرْعَة کی جمع شِرَعٌ وشُرَعٌ
وشِرَاعٌ آتی ہے۔ اور شَرِيْعَة کی جمع شرائع
آتی ہے۔ قال ابن قتيبة : الشِرعة والشريعة
واحدٌ (ابن جوزی)
اسی طرح شِرعَة اور منہاج بھی ہم معنی ہیں۔
ان الشريعة والمنهاج واحدٌ (ابن جوزی)
البتہ شِرعہ اور منہاج میں بعض حضرات نے ایک
لطیف فرق یہ بیان کیا ہے کہ شرعہ بھی اگرچہ واضح
اور صاف مستقیم راستہ ہی کے لیے بولا جاتا ہے
لیکن اس میں کبھی اغلاق بھی ہو جاتا ہے۔ منہاج وہ
راستہ ہے جو ہمیشہ واضح رہے۔ اسی لطیف فرق
کی بناء پر ان کا ایک دوسرے پر عطف کیا گیا ہے۔
اگرچہ لفظی اختلاف بھی جوازِ عطف کے لیے کافی ہے۔
شرعتُ لهٗ طَرِيقًا۔ واضح راستہ مقرر کرنا۔
شَرَعٌ شِرَعٌ شَرِيعَةٌ۔ تمام الفاظ کھلے اور کشادہ
راستہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور قانونِ الٰہی
ان سے بطور استعارہ کے مراد ہوتا ہے۔
اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا
یعنی ہفتے کے دن مچھلیاں بالکل سامنے پانی کی اوپر والی
سطح پر آجاتی تھیں۔ اور شُرَّعًا یہ شارع کی جمع ہے
اور شارعة کی جمع شَوارِع آتی ہے۔
والشريعة فی كلام العرب : المشرعة التي
يقصدها الناس فيشربون ويستقون منها
وقيل الشريعة : الطريقة ثم استُعير
ذلك للطريقة الالٰهية المؤدية الى
الدين والمنهاج الطريق الواضح (جمل)
اَلدَّآئِرَةُ : اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ۔ دائرہ
سے مراد گردشِ زمانہ ہے۔ کوئی اتفاقی
مصیبت مثلاً قحط، گرانی، شکستِ جنگ وغیرہ

قال ابن قتیبۃ: نخشٰی اَنْ یَدُوْرَ عَلَیْنَا
بمکروہ (ابن جوزی)

یہ دورٌ سے ہے جس کے معنی پھرنے کے ہیں۔
اسم فاعل مونث ہے۔ دائرۃ: خطِ محیط کو کہتے ہیں
اس مناسبت سے اس کا استعمال مصیبت اور چکر
کے متعلق ہوتا ہے۔

لَوْمَۃَ۔ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ

اور وہ کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ نہ کریں گے
لَامَ یَلُوْمُ لَوْمًا۔ لُمْتُہٗ: کے معنی کسی کو برے
فعل کے ارتکاب پر برا بھلا کہنے اور ملامت کرنے
کے ہیں۔ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ
فَذٰلِکُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْہِ۔
صفتِ مفعولی مَلُوْمٌ آتی ہے۔
فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ (۲۳-۶)
علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ آیت لَا یَخَافُوْنَ
لَوْمَۃَ لَآئِمٍ میں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کی امامت
کا اثبات ہے۔ فَدَلَّ بِھٰذَا عَلٰی تَثْبِیْتِ
اِمَامَۃِ اَبِیْ بکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ
عنہم لِاَنَّھُمْ جَاھَدُوْا فِی اللہِ عَزَّ وَجَلَّ
فی حیاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وقاتلوا المرتدین بعدہٗ (قرطبی)

مُقْتَصِدَۃٌ۔ مِنْھُمْ اُمَّۃٌ مُّقْتَصِدَۃٌ

مُقْتَصِدَۃ: یہ اقتصاد سے ہے۔ جس کے معنی
ہیں عمل میں اعتدال اختیار کرنا۔
والاقتصاد: الاعتدال فی العمل (قرطبی)
اُمَّۃٌ مُّقْتَصِدَۃٌ: سیدھے راستے پر قائم جماعت

اَلْقِسِّیْسِیْن۔ القِسّ والقِسِّیْس، کے

معنی روسائے نصاریٰ میں سے خدا پرست عالم اور
مشائخ کے ہیں۔ اصل میں قَسٌّ کے معنی ہیں رات
کو کسی چیز کی تلاش اور جستجو کرنا۔ محاورہ ہے:
تَقَسَّسْتُ اَصْوَاتَھُمْ بِاللَّیْلِ میں نے رات کو ان کی
آوازوں کی جستجو کی۔ القسقاس والقسقس کے معنی
رات کے وقت رہنمائی کرنے والے کے ہیں (راغب)
وقال قطرب: القِسِّیْسُ: العالم بلغۃ
الرّوم۔ (ابن جوزی)

رِمَاحٌ۔ رِمَاحٌ رُمْحٌ کی جمع ہے بمعنی نیزے

رَمَحَہٗ: نیزے سے مارنا۔

الْکَعْبَۃَ۔ جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیَامًا لِّلنَّاسِ۔

الکعبۃ: اصل میں ہر اس مکان کو کہتے ہیں جو ٹخنے
کی صورت و شکل پر چوکور بنا ہوا ہو۔ اسی سے
بیت الحرام کو الکعبۃ کے نام سے پکارا گیا ہے۔
اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ذو الکعبات کے نام سے
ایک عمارت زمانۂ جاہلیت میں بنو ربیعہ نے بنائی،
جس کو وہ اپنی عبادت کا درجہ دیتے تھے۔
قرآن پاک میں الحرام کی قید لگا کر اسی ذوالکعبات
کو باطل قرار دیا ہے۔ کَعْبُ الرَّجُلِ (ٹخنہ)
جو پاؤں اور پنڈلی کے درمیان جوڑ پر پاؤں کے
دونوں طرف ابھری ہوئی ہڈی کو کہتے ہیں۔ اسی سے
نوخیز لڑکی کو اِمْرَأَۃٌ کَاعِبٌ کہتے ہیں جس کا
سینہ ابھر چکا ہو۔ یہ دراصل کِعَابَۃ سے ماخوذ ہے
جس کے معنی عورت کی چھاتی ابھرنے کے ہیں۔

اس کی جمع کواعب آتی ہے۔ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا۔ ہم عمر نوجوان لڑکیاں۔ الكعبة كل بيت على هيئته فى التربيع (راغب) یعنی کعبہ ہر اُس مکان کو کہتے ہیں جو ٹخنے کی طرح چوکور بنا ہو۔ وسُمِّيت الكعبةُ كعبةً لانها مُرَبَّعة، واكثر بُيُوت العرب مُدَوَّرة وقيل انما سُمِّيتْ كعبة لِنُتُوئِها وبروزها فكل ناتئ بارزٍ كعبٌ (القرطبی) ص۳۲۲ ج ۶

لفظ کعب بلند اور مرتفع کے معنوں کے اعتبار سے بلندی مرتبہ اور شرف پر بھی بولتے ہیں۔ جیسا کہ أَعْلَى اللهُ كَعْبِي بِكُم۔ اللہ میرا مرتبہ تم سب سے بلند کرے۔

والكعبة: لغةً كل بيتٍ مُرَبَّع وسُمِّيت الكعبة كعبةً لذلك واصل اشتقاق ذلك من الكعب الذى هو أحد اعضاء الآدمى (جلالین)

بَحِيْرَة - وہ جانور جس کا دودھ بتوں کے نام پر وقف ہوتا، کوئی دوسرا اس کو استعمال نہ کر سکتا تھا۔ صرف مہمانی ان کے دودھ سے خارج تھی باقی استعمال ممنوع تھا۔ ان کے استعمال کا حق ان کے صنم کدوں کے مجاوروں کو تھا

سَآئِبَة - وہ جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانے کے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وہ جس کی فصل چاہے چرلے اور برباد کرے اُن کو روکنا باعث ملامت تھا۔

وَصِيْلَة - جو اونٹنی مسلسل مادہ بچے ایک خاص مقدار میں جنے۔ بعض کے نزدیک مقدار زیادہ ہے اور بعض کے نزدیک کم۔ اُس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن اُس کی آزادی اس بات پر موقوف تھی کہ درمیان میں کوئی نر اور مذکر بچہ نہ ہو۔

حَامِي - یہ نر اونٹ ہوتا تھا جب ایک خاص مقدار میں اونٹنیوں سے جفتی کر چکا ہو تو وہ اس مقدس خدمت کے انجام دینے کے صلہ میں اس قابل سمجھا جاتا تھا کہ اب اس کو آزاد کر دیا جائے۔

ان چاروں الفاظ کے صحیح مصداق میں اختلاف ہے ہم نے سعید بن مسیب کی روایت کے مطابق معنی عرض کیے ہیں۔ علامہ عثمانی اور مفتی اعظم نے بھی اسی روایت کو اختیار کرکے یہی معنی لکھے ہیں۔

تَحْبِسُوْنَ - تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ

الحبس کے معنی ہیں کسی کو روکنا۔ منع کرنا۔ قید کرنا۔ اُٹھنے سے باز رکھنا۔ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ یعنی تم ان کو نماز کے بعد روک لو۔ اُٹھنے نہ دو۔

اور حَبَسٌ اس جگہ کو کہتے ہیں جو پانی روکنے کے لیے بنائی گئی ہو۔ اور التحبيس کے معنی ہیں کسی چیز کو ہمیشہ کے لیے وقف کر دینا۔ اس کی جمع احباس آتی ہے۔ الحُبُسُ بالضم اسم مصدر ہے بمعنی مالِ وقف هٰذا حبيسٌ فى سبيل الله یہ اللہ کی راہ میں وقف ہے حدیث میں ہے: ان خالدًا جَعَل أدْرَاعَهٗ واعتده حُبُسًا فى سبيل الله۔ خالد نے اپنی زرہوں اور ہتھیاروں کو وقف کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، حج کے موقع پر فرمایا: لَعَلَّهَا تَحْبِسُنَا شاید صفیہؓ ہم کو روک رکھے گی۔

عُثِرَ - فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا۔ عَثَرَ يَعْثُرُ عِثَارًا وعُثُورًا کے معنی پھسل جانے اور گر پڑنے کے ہیں۔ اور مجازًا عَثَرَ عَلٰى كَذَا کے معنی کسی بات پر بغیر قصد کے مطلع ہو جانے

کے آتے ہیں فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا کا مطلب
یہ کہ اگر معلوم ہوجائے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب
کیا ہے۔

جب باب افعال میں اس کو لے جائیں تو معنی کسی
کو خبر دینے اور آگاہ کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن پاک میں
ہے وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ اور اسی طرح
ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے آگاہ کردیا۔ یا باخبر
کردیا (راغب)

عَثَرَتِ النَّاقَةُ اونٹنی نے ٹھوکر کھائی۔
عَثَرْتُ عَلَيْهِ۔ مجھ کو اس کی اطلاع ہوگئی۔
حدیث افک میں ہے فعثرت أُمُّ مسطح فِي
مِرْطِهَا۔ مسطح کی ماں اپنے ازار میں الجھ گئی۔
عَثْيَرٌ۔ گرد وغبار۔
واصل العُثُور: الوقوع والسقوط على
الشيء (قرطبی) عثر على كذا اطلع عليه (قرطبی)

الطِّينُ ۔ پانی میں ملی ہوئی مٹی کو طین کہتے ہیں۔
گو پانی بعد میں خشک ہوجائے اور اس کا اثر زائل
ہوجائے طِنْتُ كَذَا و طَيَّنْتُهُ کے معنی دیوار وغیرہ
کو گارا لگانے کے ہیں مِنْ طِينٍ لَازِبٍ چپکنے
والی مٹی سے۔ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ (۲۸-۱۲۸)
فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ (۲۸-۱۲۸)
طَانَهُ اللهُ عَلَى الْخَيْرِ۔ اللہ اس کو نیک بنائے۔
طَانَ يَطِينُ طِينًا۔ طَانَ الْحَائِطَ دیوار کو
پلستر کرنا۔ گارے سے لیپنا۔
الطِّينَةُ نیچر، فطرت۔ یابس الطِّينة تندمزاج
خشک مزاج۔ اکھڑ۔ لہٗ طِينة طَيِّبَة۔ اس کی
طبیعت نرم ہے۔ نیک مزاج۔ خوش اخلاق ہے۔

الْأَبْرَصُ ۔ برص کا مریض۔ یہ ایک
جلدی بیماری ہے جو انسان کی جلد میں لاحق ہوتی
ہے اور جسم کا اوپر کی سطح والا حصہ سفید ہوجاتا ہے۔
اس سے تمام اعضا۔ کمزور ہوجاتے ہیں۔ اردو میں اس
بیماری کا نام پھلبہری ہے۔ جسم میں سیاہ اور سفید دھبے
ہوتے ہیں۔ ابرص: کوڑھی۔ برص کی بیماری والا۔

الْمَائِدَةُ ۔ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ
يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ ۔
المائدۃ یہ مَيْدٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں
کسی بڑی چیز کا متحرک اور مضطرب ہونا جیسا کہ زمین
أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ تاکہ تم لوگوں کے بوجھ سے جنبش نہ
کرے۔ ایک طرف کو مائل نہ ہوجائے۔
مَادَ يَمِيدُ مَيْدًا ایک طرف کو مائل ہونا۔ حرکت
کرنا۔ مَادَتِ الْأَغْصَانُ شاخوں کا مضطرب ہونا۔
ایک طرف کو پتوں یا پھل کے بوجھ سے مائل ہوجانا،
جھک جانا۔ مَادَ الرَّجُلُ: تکبر اور غرور سے سر
ہلا ہلا کر چلنا۔ ماد الرجل: زیارت کرنا۔ اور تمايد
کے معنی ہیں نشاط اور فرحت سے جھومنا۔
المائد: جھکنے والا۔ چکر لگانے والا۔
ميدان الدابة: جانوروں کا کھلے میدان میں
پھرنا۔ چرنا۔
المائدۃ: کے معنی طعام کے بھی ہیں اور خوان کے
بھی جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔
المائدة في المشهور الخوان الذي عليه الطعام
ويقال لكل واحدةٍ منهما مائدةٌ (روح)

المائدة : الخوان الذی علیہ طعام (قرطبی)
قطرب کا قول یہ ہے کہ خوان پر جب تک طعام نہ ہو اس
کو مائدہ نہیں کہا جاتا بلکہ خِوان بالکسر یا خُوان بالضم
کہتے ہیں۔ وقال قطرب : لا تکون المائدة
مائدةً حتی یکون علیہا الطعام۔ فان
لم یکن علیہ الطعام قیل خوان (قرطبی)
اس کا اصل ماخذ ماد یمید سے ہے، جس کے معنی
ہیں کھانا کھلانا۔

ابوعبیدہ کا قول ہے کہ مائدہ فاعلۃٌ
کے وزن پر ہے بمعنی مفعولۃٌ۔ جیساکہ فِیْ عِیْشَۃٍ
رَّاضِیَۃٍ میں راضیۃٍ بمعنی مَّرْضِیَۃٍ ہے۔ اور
مَاءٍ دَافِقٍ بمعنی مدفوق کے ہے۔
مَادَنِیْ : مجھے اس نے کھانا کھلایا۔ بعض کے
نزدیک مائدہ رات کے کھانے کو کہا جاتا ہے
اور خِوان کو مائدہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس پر کھانا
حرکت کرتا ہے۔

المائدة : الطبق الذی علیہ الطعام و
یقال لکل واحدة منہما مائدة (راغب)
تمیّدت المرأة : عورت کا ناز و نخرے سے
ٹھمک ٹھمک کر چلنا۔ صاحب جمل فرماتے ہیں کہ المائدہ
اصل میں اسی خوان کو کہا جاتا ہے جس پر طعام موجود
ہو۔ اور اگر طعام موجود نہ ہو تو مائدہ نہیں بلکہ اس کو
خوان کہتے ہیں۔ یہ مشہور ہے۔ اور اہل لغات کی
اکثریت اور ایک عظیم گروہ اسی کا قائل ہے۔
مگر راغب نے جو فرمایا کہ مائدہ اس طعام کو کہا جاتا
ہے جس پر کھانا چنا ہوا ہو اور پھر خود طعام کو بھی
مائدہ کہا جاتا ہے۔ یہ جمہور کے خلاف ہے۔ فخالف
لما علیہ المعظم۔ اس طرح کے نظائر کلام عرب میں
کافی پائے جاتے ہیں کہ جب دو چیزیں اکٹھی اور یکجا ہوں
تو ان کا نام الگ ہوتا ہے اور جدا جدا ہو تو نام بھی
الگ اور جدا ہوتا ہے۔ جیساکہ کاس ہے جب اس
میں شراب ہوگی تو کاس کہیں گے ورنہ قدح کا لفظ
بولا جاتا ہے۔ اسی طرح سجل اس ڈول کو کہیں گے
جس میں پانی ہو اور اگر خالی ہو تو اس کو دلو کہا جاتا ہے۔
اسی طرح قلم کا لفظ بھی اسی وقت بولا جاتا ہے جب وہ
تراشا ہوا ہو ورنہ انبوب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح
مائدہ بھی اسی وقت کہا جائے گا جب اس پر کھانا لگا
ہوا ہو ورنہ خوان کہا جائیگا (جمل ص۵۴۲ ج۱)
المائدة : ھو الخوان علیہ طعام (ابن کثیر)
تو حاصل یہ کہ مائدہ نہ صرف دسترخوان کا نام ہے اور نہ
تنہا کھانے کا۔ بلکہ اس دسترخوان کو مائدہ کہا جائے گا
جس پر کھانا لگا ہوا ہو۔

عِیْدًا ۔ تَکُوْنُ لَنَا عِیْدًا۔ عید اُس
اس خوشی اور سرور کو کہتے ہیں جو بار بار لوٹ کر آتے۔
العیدُ السُّرُورُ العائد۔ (کشاف)
یُستعمل العید فی کل یومٍ فیہ مسرّة (راغب)
ای یکون یوم نزولہا عیدًا (مدارک)
یعنی ہم اس کو اپنی خوشی کا تہوار بنالیں۔ یہ اصل میں
عَادَ یَعُوْدُ عَوْدًا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کسی
کام کو ابتداء کرنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف پلٹنا۔
خواہ پلٹنا بذاتہ ہو یا قول و عزم سے ہو۔ اسی سے اصطلاح
شریعت میں یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ کو عید کہتے ہیں۔

چونکہ وہ بار بار لوٹ کر آتے ہیں۔ اور المعاد: لوٹنے کی جگہ اور زمانہ کو معاد کہتے ہیں۔ اَلَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ۔ یہاں معاد سے مراد بعض کے نزدیک مکہ مکرمہ ہے۔ اور بعض نے معاد سے مراد مقام جنت لیا ہے۔ العادۃ۔ طبیعت کسی فعل یا کام کو بار بار کرنا حتیٰ کہ وہ طبعی فعل کی طرح سہولت سے انجام پا جائے۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ کو عید کہنے کی وجہ بعض کے نزدیک یہ ہے کہ اُس دن ہر انسان اپنی اپنی بساط اور حیثیت کی طرف لوٹتا ہے۔ جس کا اظہار ان کے طعام و لباس سے ہوتا ہے۔ کوئی خوش لباس ہے اور کوئی غریب و مسکین معمولی لباس میں ہے، کوئی مہمان نواز ہے، کوئی مہمان۔ کوئی رحم کرتا ہے، کسی پر رحم کیا جاتا ہے۔

العُوْدُ: ہر پتلی اور باریک لکڑی کو کہتے ہیں۔ اور اس لکڑی کو بھی جس سے دھونی دی جائے۔

بحمدہ تعالیٰ سورۃ مائدہ کے مشکل الفاظ سے آج ربیع الاول سنہ مطابق ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو فراغت ہوئی

شرح الفاظ القرآن من سورۃ الانعام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خلق : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۔ ہر تعریف اللہ ہی کے لئے ہے ۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ۔ خَلَقَ یہاں ایجاد اور ابداع کے معنی میں ہے ۔ یعنی نیست سے ہست کرنے کے معنوں میں ہے ۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں : ای اخترع واَوْجَدَ وَاَنْشَأَ وَابْتَدَعَ ، والخلق یکون بمعنی الاختراع ویکون بمعنی التقدیر ۔ یہاں دونوں مراد ہوسکتے ہیں ۔ چاہے خلق بمعنی اختراع لیا جائے یا بمعنی تقدیر ۔ اصل میں خلق کے معنی کسی چیز کو بنانے کے لئے پوری طرح اندازہ لگانے کے ہیں ۔ اور پھر یہیں سے خلق بمعنی اِبداع آجاتا ہے ۔ جس کے معنی ہیں بغیر مادہ کے کسی چیز کو پیدا کرنا ، اس کو وجود میں لانا ۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ میں خلق بمعنی ابداع ہی ہے ۔ کیونکہ دوسرے مقام پر ہے : بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ پھر لفظ خلق کا اطلاق ایک چیز کو دوسری چیز سے بنانے پر بھی ہوتا ہے ۔ جیسا کہ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وخَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ ۔ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ ۔

یہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ خَلَقَ کے ابتدائی معنی یعنی کسی چیز کو بغیر مادہ کے پیدا کرنا ۔ یہ صرف خدائے پاک کے لئے مخصوص ہیں ۔ کسی دوسرے میں یہ معنی ملحوظ نہیں ۔

ابن فارس نے لکھا ہے کہ خلق کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اندازہ لگانا ۔ اور کسی چیز کا استعمال کے بعد ہموار ، صاف اور چکنا ہو جانا ۔ اسی سے بہت پرانی چیز کو خلق کہتے ہیں کیونکہ وہ گھس کر صاف ہو جاتی ہے اور اس کی روئی زائل ہو جاتی ہے ۔

الارض : زمین ۔ ہر وہ چیز جو نیچے ہو ارض کہلاتی ہے ۔ اس کا مقابل سمآء ہے ۔ اَرْضُ النَّعْلِ : جوتے کے تلے ۔ شَدِیْدُ الْاَرْضِ : گھوڑے کے مضبوط قوائم ۔ اس کی جمع آراض ، اُرُوض اور ارضات وغیرہ آتی ہے ۔ قرآن کریم میں اس کی جمع استعمال نہیں ہوئی ۔ اَرَضَتِ الْاَرْضُ زمین کا سرسبز و شاداب ہونا ۔

جَعَلَ : جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ
اہلِ تفسیر کی کثیر جماعت نے لکھا ہے کہ : جَعَلَ
یہاں خَلَقَ کے معنی میں ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ صرف
ایک مفعول کی طرف متعدی ہے۔

قال النحاس : جعل بمعنی خلق واذا
کانت بمعنی خلق لم تتعدّ الاّ الی مفعولٍ
واحدٍ (قرطبی) امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اس
آیت میں جَعَلَ خَلَقَ کے معنی کے سوا کسی دوسرے
معنی میں جائز ہی نہیں۔ فتح القدیر میں ابن عطیہ کا
قول یہ نقل کیا گیا ہے۔ جَعَلَ بمعنی خَلَقَ لیا جائے
جب معطوف علیہ اور معطوف میں صحیح تعلق اور ربط
پیدا ہوتا ہے۔ اور لفظ و معنی کی مطابقت ہوتی ہے
اس صورت میں جمع کا عطف جمع پر صحیح ہوگا۔

یَعْدِلُوْنَ : ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا
بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۔ العدالة والمعادلة
کے لفظ میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں
اور معنی اضافی کے اعتبار سے استعمال ہوتے
ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کے برابر اور ہم وزن۔
عَدْلٌ اور عِدْلٌ دونوں قریب المعنی ہیں۔
البتہ عَدْل کا لفظ معنوی چیزوں کے لئے
استعمال ہوتا ہے جیسے کہ احکام شرعیہ۔

قرآن پاک میں ہے : اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ
صِيَامًا ، یا اس کے برابر روزے رکھنا۔ اور
عِدْل اور عَدِیْلٌ کا لفظ ان چیزوں کے لئے
بولا جاتا ہے جن کا ادراک حواسِ ظاہرہ سے ہوتا
ہے۔ جیسے وہ چیزیں جن کا تعلق ناپ تول یا
وزن وغیرہ ہوتا ہے۔ تو عدل کے معنی ہوئے
دو چیزوں کا برابر ہونا۔ لہٰذا آیت بِرَبِّهِمْ
يَعْدِلُوْنَ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کے
ساتھ دوسروں کو اُس کا نظیر اور مثیل ٹھہراتے ہیں۔
اور یہ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ کے ہم معنی ہیں۔

قَرْنٌ : اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ
قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ ۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم
نے ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو فنا کر دیا ہے۔
لفظ قَرْن ایک زمانہ میں موجود لوگوں اور ایک
جماعت پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ قرن لفظی اعتبار
سے واحد ہے لیکن معنیً جمع ہے۔ جیسا کہ قوم اور رہط
وغیرہ۔ یہ ہی وجہ ہے کہ بعد کے جملے مَكَّنّٰهُمْ میں
ضمیر جمع لائی گئی ہے۔ اس کی جمع قرون آتی ہے جو
قرآن پاک کے بار بار استعمال کی ہے۔ وَلَقَدْ
اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (۱۰-۱۳)
وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ (۱۷-۱۷)
وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۔
قَرَنَ يَقْرِنُ قَرْنًا ۔ قَرَنَ الشَّیْءَ بالشَّیْءِ
ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ باندھنا۔ ملانا
قرن الثورین ۔ دو بیلوں کو جوتنا۔ قَرَنَ
الفَرَسَ ۔ گھوڑے کے پچھلے پاؤں کا اگلے قدموں
کے نشانات پر پڑنا۔ گویا وہ اگلے اور پچھلے قدموں
کو ملا رہا ہے۔

الاقتران : دو یا دو سے زائد چیزوں کا مجتمع ہونا
اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ "یا یہ ہوتا کہ
فرشتے اس کے پاس جمع ہو کر آتے"۔ جب اس کو تفصیل

میں لایا جائے تو اس میں مبالغہ کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ وَاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ خوب جکڑے ہوئے باندھے ہوئے۔ القَرِيْن ہم پلہ، ہم عمر، بہادری اور دیگر صفات میں دوسروں کے برابر۔ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ۔ میرا ایک ہم نشین تھا۔ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ اور اس کا ہم نشین فرشتہ کہیگا کہ (اعمال نامہ) میرے پاس ہے۔ یہاں قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جس کو دوسری جگہ شہید اور گواہ کہا گیا ہے۔

قرین کی جمع قرناء ہے۔ قرآن میں ہے: وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ یہاں قرن سے مراد وہ امم ماضیہ مراد ہیں جنہیں اللہ نے عبرت ناک سزائیں دیں اور تمرد و عصیان کے سبب انھیں ہلاک کیا۔ اصل میں یہ اقتران سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہونا۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ: القرنُ: الاُمّة من النّاس۔ والجمع القرون۔ ایک شعر میں لفظ قرن کو انہی معنی میں بیان کیا گیا ہے ؎

اذا ذَهبَ القرنُ الذی کنتَ فیهم
وخُلّفتَ فی قرنٍ فأنتَ غریبُ

اس شعر میں ایک زمانہ میں موجود لوگوں کو قرن کہا گیا ہے۔ چونکہ یہ پہلے زمانہ کے ساتھ بھی اور اپنے بعد کے ساتھ بھی ملے ہوئے اور وابستہ ہیں۔ فالقرن کل عالم فی عصره (قرطبی)

القرن کا لفظ کتنی مدت پر بولا جاتا ہے، اس میں کچھ اختلاف ہے۔ بعض نے ساٹھ بعض نے ستر اور بعض نے اسّی سال کو قرن قرار دیا ہے۔ مگر اکثر اصحابِ حدیث کا قول یہ ہے کہ قرن ایک سو سال کی مدت کو کہا جاتا ہے۔ اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن بُسر کو فرمایا تَعِيْشُ قَرْنًا تم ایک قرن زندہ رہوگے۔ تو ان کی زندگی ایک سو سال ہوئی۔

مِدْرَارًا: وَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا

مِدْرَارًا مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی کثرت کے ساتھ لگاتار برسنے والی بارش کے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے المذکار اس عورت کو کہتے ہیں جو زیادہ لڑکے جنے اور المئناث اس عورت کو کہتے ہیں جس سے لڑکیاں زیادہ پیدا ہوں۔ اصل میں یہ دَرٌّ یا دِرَّةٌ سے ہے۔ جس کے معنی دودھ کے ہیں۔ دَرَّ اللَّبَنُ يَدُرُّ دودھ کا زیادہ ہونا پھر بطور استعارہ کے بارش کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ دَرَّ الحَلِيْبُ: دودھ زیادہ ہونا۔ دَرَّ الدّنیا علیٰ اهلها: دنیا کا اپنے اہل پر فراخ ہونا۔ دَرَّ النَّبَاتُ: سبزی کا پھوٹنا۔

مدرار: بناءٌ دال علی التکثیر (قرطبی)

اصله من الدرّ والدِرّة ای اللبن۔ و يُستعار ذلك للمطر استعارةً (راغب)

المدرار، المِغزار (کشاف)

ادرّ اللّٰه لك اخلاف الرزق: اللہ تم کو رزق کی فراوانی سے نوازے۔ لِلّٰهِ دَرُّه اس کی خوبی اللہ ہی کے لئے ہے۔ المِدْرَار:

الکثیر الدر۔ یقال سحابٌ مِدرارٌ اذا تتابع امطارہ۔ (کبیر)

قِرْطَاس : وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ اور اگر ہم آپ پر کوئی نوشتہ لکھا ہوا کاغذ پر اتارتے

القرطاس : ہر لکھی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ اور مراد اس سے صحیفہ ہے۔ اس کی جمع قراطیس آتی ہے۔ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ (۶ - ۹۱) قَرْطَسَ : نشانہ پر پہنچنا۔ القِرطَاسُ: الصَّحِيفة (قرطبی) اور قرطاس : جوان اور خوب صورت لڑکی کو بھی کہتے ہیں۔ سادے کاغذ پر بھی قرطاس کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیثِ قرطاس میں ہے ایتونی بقرطاسٍ اور بعض روایات میں اِیْتُوْنِیْ بِدَوَاۃٍ وَقِرطَاسٍ

سَكَنَ : وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ سَکَنَ یہاں حرکت کی ضد نہیں ہے۔ بلکہ حرکت کو بھی شامل ہے۔ اور یہ ثبت کے معنی میں ہے تمام موجودات کے لئے صرف دو ہی ظرف ہو سکتے ہیں ایک ظرفِ مکان اور دوسرا ظرفِ زمان۔ ظرف مکانی کا ذکر قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں کیا جا چکا ہے۔ اور یہاں ظرف زمانی کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موجودات کا تعلق ظرف مکان کے ساتھ ہو جب اور ظرفِ زمان کے ساتھ ہو جب، سب خدا کی ملک ہیں چاہے وہ ساکن ہوں یا متحرک۔

علامہ فخر الدین رازی فرماتے ہیں: ذکر فی الآیۃ الاولی السمٰوٰت والارض اذ لامکان سواھما وفی ھٰذہ الآیۃ ذکر اللیل والنھار اذ لا زمان سواھما۔ فاخبر سبحانہ انہ مالک للمکان والمکانیات ومالک للزمان والزمانیات وھٰذا بیان فی غایۃ الجلالۃ

یعنی پہلی آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ ظرف مکان ان کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور اس آیت میں لیل و نہار کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ ان کے سوا کوئی ظرف زمان نہیں تو اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کے پجاریوں کو بتایا کہ جس طرح مکان و مکانیات کا مالک صرف اللہ ہے اسی طرح زمان اور زمانیات کا مالک بھی صرف وہی ایک خدا ہے۔ اس تقسیم ظرفیت کے اعتبار سے احاطہ کامل کا اظہار فرما دیا گیا ہے۔

سکن: معناہ ھَدَأَ واستقرّ والمراد ما سکن وما تحرّک (قرطبی)

بعض اہل علم نے یہاں سَکَنَ کو بمعنی خَلَقَ قرار دیا ہے۔ اور خَلَقَ تمام مخلوقات کو شامل ہے چاہے وہ ساکن ہوں یا متحرک۔ علامہ قرطبی نے اسی قول کو احسن قرار دیا ہے۔ سکن فلانٌ مکان کذا۔ اس کے معنی ہیں کسی جگہ رہائش اختیار کرنا۔ اسی اعتبار سے رہائش گاہ کو مسکن کہتے ہیں جس کی جمع مساکن ہے۔ لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ (۴۶ - ۲۵)

وَلِتَسْكُنُوْا فِيْهِ : تاکہ تم اس میں آرام کرو اور وہ چیز جس سے سکون حاصل ہو اس کو سَکَنٌ

(بفتح الکاف) کہتے ہیں وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ
مِنْ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا۔
اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ۔
السُّکنیٰ: بغیر کرایہ اور اجرت کے کسی کو مکان
بطور رہائش کے دینا۔ اور ایک مکان میں مشترک
رہنے والے لوگوں کو سَکْنٌ (بسکون الکاف)
کہا جاتا ہے۔ یہ ساکِنٌ کی جمع ہے۔ اور ساکن
کی جمع سُکّان (بضم السین) بھی آتی ہے۔ اور
سَکّان (سین کے فتح کے ساتھ) کشتی کے پتوار
کو کہتے ہیں جس سے کشتی کو ٹھہرا دیا جاتا ہے۔
چھری کو سِکّین کہتے ہیں۔ چونکہ وہ بھی مذبوح
کو ساکن کر دیتی ہے۔ سِکّین یہ سکون سے
فِعّیلٌ کے وزن پر اسم مشتق ہے۔ حدیث میں
ہے: ان سمعت بالسکین الا فی ھذا
الحدیث ماکنا نسمیھا الا المدیۃ
میں نے چھری کے لئے سکین کا لفظ اسی حدیث
میں سنا ہے۔ ہم تو چھری کو مدیہ کہا کرتے تھے
سَکَنَ الیہ خوش ہونا۔ کسی کے پاس ٹھہرنا
سکن عن الوجع: درد دور ہونا۔
سَکُنَ (ک) سُکُونَۃً۔ مسکین ہونا۔

یُطْعِمُ: وَھُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ
ھو یُطْعِمُ۔ ساری مخلوق کے لئے ساری کائنات
حیات کے لئے رزق کا سامان وہی اللہ بہم پہنچاتا
ہے۔ وَلَا یُطْعَمُ: عقیدۂ شرک پر ایک کاری
ضرب ہے کہ وہ محتاج نہیں۔ اس کو کسی طرح
کے چڑھاووں کی ضرورت نہیں۔

الطَّعْمُ: غذا کھانے کو کہتے ہیں۔ اور جو غذا
اور کھانا کھایا جاتا ہے اُس کو بھی طَعْمٌ
اور طَعَامٌ کہتے ہیں۔ وَطَعَامُہٗ مَتَاعًا لَّکُمْ۔
اور حدیث میں خالص گیہوں کو بھی طعام کہا گیا ہے
اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم اَمَرَ بِصَدَقَۃِ
الفِطْرِ صَاعًا مِن طَعَامٍ او صَاعًا مِن
شَعِیرٍ۔ یہاں طعام سے مراد گندم ہے۔
قرآن پاک میں لفظ طعام کثرت کے ساتھ استعمال ہوا
ہے۔ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ (۶۹-۳۶)
وَ طَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ (۷۳-۱۳)
طَعَامُ الْاَثِیْمِ (۴۴-۴۴) اور آیت
وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ میں طعام بمعنی
اِطعام ہے۔ طَعِمَ طَعْمًا و طَعَامًا چکھنا۔
طَعِمَ عَلَیْہِ: کسی پر قدرت حاصل کرنا۔ طاقت
پانا۔ طَعِمَ الغُصْنُ: ایک درخت کی ٹہنی کا
دوسرے درخت کی ٹہنی کے ساتھ اُلجھ جانا۔ اور
طَعَمَ (ف) طعمًا پیٹ بھر کے کھانا۔
الطَّعْمُ: تناول الغذاء ویسمّٰی ما
یُتناول منہ طَعْمٌ (راغب)
طَعْمٌ: یہاں رزق کے معنی میں ہے ای وھو
الرَّزّاقُ لخلقہ من غیر احتیاج الیھم (ابن کثیر)
ای یَرزُقُ ولا یُرزَقُ۔ دلیلہ قولہ تعالیٰ:
مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ
یُّطْعِمُوْنِ (قرطبی) سعید بن جبیر، مجاہد اور
اعمش وغیرہم نے وَھُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ
یعنی دوسرے فعل کو سمع سے اور پہلے کو افعال سے

پڑھا ہے۔ اور امام قرطبی نے اسی قرأت کو قرأتِ حسنہ
کہا ہے۔ اس قرأت کے مطابق مطلب آیت کا یہ ہوگا
کہ وہ اپنے عباد کو رزق دیتا ہے۔ اور وہ خود بے نیاز
ہے ان تمام حوائج سے جن کی مخلوق محتاج ہے۔
ای انه یرزق عباده وهو سبحانه غیر محتاج
الی ما یحتاج الیه المخلوقون من الغذاء (قرطبی)

کَاشِفَ : وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ
فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ۔ اور اگر خدا آپ کو سختی
میں ڈالنا چاہے تو سوائے اس کے کوئی سختی کو دور کرنے
والا نہیں ہے۔
الکشفُ : یہ کشفتُ الثوب عن الوجه۔ کا
مصدر ہے۔ جس کے معنی چہرہ وغیرہ سے پردہ اٹھانے
کے ہیں۔ اور مجازاً غم و اندوہ کے دور کرنے پر بھی
بولا جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں دو لفظ جناب
باری تعالیٰ کی طرف منسوب ہوئے ہیں۔ ایک امساس
اور دوسرا کشف۔ لغوی اعتبار سے ان دونوں کا
تعلق مادیات اور جسمانیات سے ہے۔ امساس
اور کشف دونوں مجازی معنی میں ہیں۔ چنانچہ امام
قرطبی نے لکھا ہے : المسّ والکشف من
صفات الاجسام وهو هنا مجاز وتوسّع
قرآن پاک میں لفظ کشف کی نسبت جناب
باری کی طرف جہاں بھی ہوئی وہاں مجازی معنی ہی ملحوظ
ہیں۔ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ (۶ - ۴۱)
لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا
عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ
اور آیت کریمہ یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ
"جس دن پنڈلی سے پردہ اٹھا دیا جائے گا۔" کے
بارے میں بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ قامتِ
الحربُ علی ساقٍ کی طرح کا محاورہ ہے یعنی
شدت اور سختی ظاہر ہونے سے کنایہ ہے۔
کَشَفَ (ضرب) کشفًا و کاشفةً۔ کشف
الشئ وعن الشئ ظاہر کرنا۔ کھولنا۔
کَشَفَ اللّٰهُ غمّه : اللہ تعالیٰ اس کے غم کو زائل
کرے۔ اور کَشَفَتْهُ الکواشف یعنی اسے رسوا
کر دیا۔ الکاشِفُ صفت فاعلی جمع کَشَفَة۔
الکاشفة مصدر بھی ہے اور کاشف کا صیغہ مؤنث
بھی ہے۔ جمع کواشفُ۔ اور الکشّاف : یہ
اسم مبالغہ ہے۔ کہتے ہیں : هو کشّاف الغُمَم
وہ غموں کا زائل کرنے والا ہے

الْقَاهِرُ : وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ
اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ القَهْرُ کے
معنی کسی پر غلبہ پا کر اسے ذلیل کرنے کے ہیں۔ اور
ان دونوں یعنی غلبہ اور تذلیل میں سے ہر ایک کے معنی
میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے۔
وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ
قَاهِرُوْنَ (۷ - ۱۲۷)
فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ : یتیم کو ذلیل
نہ کرو۔ اَقْهَرَهٗ : کسی پر ایسے شخص کو مسلط
کرنا جو اس کو ذلیل کر دے۔
اَلْقَهْرُ : الغَلَبَةُ وَالتَّذْلِیْلُ مَعًا (راغب)
والقَهْرُ : الغلبةُ والقاهرُ : الغالبُ (قرطبی)
قہر کے معنی اگرچہ غلبہ و مقدرت حاصل کرنے کے ہیں

مگر قہر کے اندر معنی زائد ہیں جو قدرت اور غلبہ میں نہیں۔ چنانچہ امام قرطبی لکھتے ہیں: وفی القھر معنی زائد لیس فی القدرۃ۔ وھو منع غیرہ عن بلوغ المراد (قرطبی)

اَقْھَرَہٗ: کسی کو مغلوب پانا۔

اقھر الرجلُ: کسی کا معاملہ ذلت کی طرف راجع ہونا

القھرۃ: اضطرار۔ مجبوری

قَھَرَ قَھْرًا (ف) غالب آنا۔

اَیّ : قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ۔

اَیٌّ: کئی معانی کے لئے آتا ہے۔ ۱۔ شرط کیلئے اس وقت دو فعلوں کو جزم دیتا ہے۔ جیسے اَیًّا تَضْرِبْ اَضْرِبْ جس کو تو مارے گا میں ماروں گا ۲۔ استفہام کے لئے، جیسے: اَیُّکُم اَتٰی۔ تم میں سے کون آیا۔ ۳۔ موصول، جیسے: سَلِّم عَلٰی اَیُّھم اَفضل۔ جو ان میں سے افضل ہے اس کو سلام کر۔ ۴۔ کمال کے معنی پر دلالت کرنے کے لئے، اس وقت نکرہ کی صفت بن کر آتا ہے۔ جیسے: زیدٌ رجلٌ اَیّ رجلٍ زید فاضل آدمی ہے۔ ۵۔ منادیٰ معرّف باللّام کے شروع میں تنبیہ کے لئے، جیسے: یااَیُّھا الرجل اور یااَیَّتُھا المرأۃ (منجد)

اگر اس کے بعد آنے والا اسم جامد ہو تو وہ اس کا بدل ہوتا ہے جیسے: الرجل اور مشتق ہو تو صفت ہوتا ہے جیسے: یااَیُّھا الفاضل۔

فَوْقَ : فَوْقَ عِبَادِہٖ۔

فوق کا تعلق یہاں اوپر کی سمت سے نہیں بلکہ مرتبہ اور حکومت کی بلندی سے ہے۔ وَجَبَ حمل تلک الفوقیۃ علی فوقیۃ القُدرۃ لاعلی فوقیۃ الجھۃ (کبیر) ومعنی فَوْقَ عِبَادِہٖ فوقیۃ الاستعلاء بالقھر والغلبۃ علیھم۔ ای ھم تحت تسخیرہ لافوقیۃ مکان۔ (قرطبی) یہ اسی طرح ہے جیسا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ السُّلطانُ فوق رعیّتِہٖ۔

وَقْرًا : وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا۔

وَقْرًا بھاری ہونا۔ بہرہ ہونا۔ بہرا کرنا۔

وقرٌ اور وُقُورٌۃ: عظمت اور وقار کے ساتھ گھر بیٹھنا۔ وَقَارَۃ۔ وَقَارٌ اور قِرَۃٌ سنجیدگی۔ وزنی ثابت ہونا۔ اسی سے توقیر ہے۔ عظمت اور تعظیم کرنا۔ زخمی کرنا۔ بھاری کرنا۔

وَقْرٌ اور وِقْرٌ بفتح الواو وکسرھا۔ دونوں کے معنی ثِقل اور بھاری پن کے ہیں لیکن خاص کر کانوں کے بہراپن کے لئے لفظ وَقْرٌ بالفتح استعمال ہوتا ہے۔

وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرٌ (۴۱-۵)

وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرٌ (۶-۳۵)

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ۔

غرضیکہ کانوں کے بہراپن کے لئے قرآن پاک نے تقریباً چھ مرتبہ مختلف سورتوں میں لفظ وَقر بالفتح استعمال کیا ہے۔ ثقل اور عام بوجھ کے لئے لفظ وِقر بکسر الواو بولا گیا ہے۔ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا (ذاریات) ایک مقام پر تفعیل سے عظمت کے

معنی میں آیا ہے۔ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (الفتح)
اور سورۂ نوح میں وَقَار مصدر بمعنی عظمت بولا گیا ہے۔ مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا تم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کی عظمت کا اعتقاد نہیں رکھتے۔
وَقَرَ يَقِرُ (ض) ووَقِرَ يَوْقَرُ ووَقُرَ يَوْقُرُ ضرب فتح سمع تین ابواب سے مستعمل ہے لیکن بعض اہل فن نے فتح سے انکار کیا ہے جیسا کہ ابوزید وغیرہ۔ کہ وہ اس کو سمع سے مانتا ہے، فتح سے انکار کرتا ہے۔ اور صفت مفعولی اس سے مَوْقُورَةٌ آتی ہے۔ وَقِرَتْ أُذُنه : ثَقُلَتْ اوذهبَ سَمْعُهُ كُلّه وصَمّتْ أُذُنه (منجد)
وَقْرٌ : کا لفظ گدھے یا خچر وغیرہ کے ایک بوجھ پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ وَسْقٌ کا لفظ اونٹ کے بوجھ کے ساتھ خاص ہے۔ اَوْقَرْتُهٗ کے معنی بوجھ لادنے کے ہیں۔ نَخْلَةٌ مُوْقِرَةٌ ومُوْقَرَةٌ : پھل سے لدی ہوئی کھجور۔
فُلَانٌ ذُوْوَقْرٍ : فلاں بُردبار آدمی ہے۔
وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ۔ اس میں بعض کا کہنا ہے کہ قِرْنَ، وقار بمعنی سکون سے ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وقرتُ اَقِرُ وَقْرًا سے ہے۔ جس کے معنی بیٹھ رہنا کے ہے۔
فِيْ صَدْرِهٖ وَقْرٌ اس کے دل میں غصہ اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ التَعَلّمُ فِي الصِّغَرِ كَالْوَقْرَةِ فِي الْحَجَرِ۔ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ جس نے بدعتی کی عزت کی اس نے اسلام کو گرا دینے کے لئے مدد کی۔
عليكم باتقاء الله والوقار۔
الوَقْرُ : الثقل فى الاذن (راغب)
وقرًا : اى ثقلاً۔ والوِقْرُ : الحِمْلُ (قرطبی)
وَقْرًا : ثقلاً يمنع من السمع (مدارک)
حاصل یہ کہ وقر کا مادہ ثقل اور بوجھ کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔
الوَقِيْر : بکریوں کے ریوڑ کو کہتے ہیں۔ چونکہ کثرت کی وجہ سے بارڑے پر ان کا ثقل اور بوجھ ہوتا ہے اور مالک کے لئے باعث عزت و وقار۔

اٰيَة : علامت۔ نشانی۔ جمع آیات:

علامات، نشانیاں، احکام خداوند، مظاہر قدرت معجزات انبیاء۔ آیت کے اصل معنی ظاہری نشانی کے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کی آیات کو آیات کہا جاتا ہے کہ وہ گویا ختم کلام کی علامت ہیں۔ آیت کے معنی جماعت کے بھی آتے ہیں اس لئے بعض نے اس کی وجہ تسمیہ یہ قرار دی ہے کہ چونکہ آیت حروف کی ایک جماعت پر مشتمل ہوتی ہے اسلئے آیت کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ یہ اعجاز قرآنی کی نشانیاں ہیں اس لئے ان کو آیت کہا گیا ہے جاء القوم بآيتهم قوم جماعت یا گروہ کی صورت میں آئی۔

اَسَاطِيْرُ : يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔

اَسَاطِير۔ اساطیر کا اصل مادہ سَطْرٌ ہے۔ اور السَّطْرُ : قطار کو کہتے ہیں خواہ کسی کتاب

کی سید یا آدمی یا درختوں وغیرہ کی۔ اور سَطَرَ فلانٌ
کے معنی ہیں ایک ایک سطر کرکے لکھنا۔ جیسا کہ قرآن
میں ہے نٓ ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝
وَ کِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (۵۲-۲)
کَانَ ذٰلِكَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۳۳-۶)
اور سطرٌ کی جمع اَسْطُرٌ سُطُوْرًا اور اَسْطَارٌ
آتی ہے۔ اَسَاطِیر کی واحد کیا ہے۔ اس میں اہل
لغت کا اختلاف ہے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ
اس کی واحد اَسْطَارٌ ہے۔ جیسا کہ اَبْیَاتٌ
کی ابا بِیتُ۔ اور اخفش کا قول یہ ہے کہ اُسْطُوْرَۃٌ
کی جمع ہے۔ جیسا کہ اُحْدُوْثَۃ کی جمع احادیث
اور اُسْطُوْرۃ وہ بات ہے جو بے اصل و بے
بنیاد ہو۔ یعنی ماضی کے غلط قصے۔ نحاس نے
اس کو اُسْطُوْر کی جمع قرار دیا ہے جیسا کہ عُثْکُول
بعض اہل لغت کا قول یہ ہے کہ جمع الجمع ہے کہ سَطْرٌ کی جمع
اَسْطَار اور پھر اسطار کی جمع اساطیر بنائی گئی
ہے۔ بہرحال واحد کچھ ہو مراد سب کے نزدیک متعین
ہے۔ جیسا کہ صاحب قرطبی نے جوہری وغیرہ کے حوالہ
سے نقل کیا۔ قال الجوہری: الاساطیر:
الاباطیل والتُّرھات۔
امام راغب نے اساطیر کو اُسْطُوْرہ کی جمع
قرار دیا ہے (قرطبی۔ راغب۔ جمل)
و اصلہ: السَّطْرُ بمعنی الخط (البیضاوی)
سَطَرَ یَسْطُرُ سَطْرًا: لکھنا۔
سَطَرَہٗ بالسَّیف: تلوار سے کاٹنا۔
سَطَرَ الرَّجُلَ: کسی کو پچھاڑ دینا۔ غالب آنا
سَطَّرَ (تفعیل) بے اصل باتیں۔ سَطَّرَ علیہ:
کسی کے بارے میں تُرّہات ہانکنا۔
اشعث نے حسن بصری سے قرآن پاک کی کوئی آیت
غلط بیان کرکے دریافت کی تو حضرت حسن بصریؒ
نے فرمایا کہ: انك واللہ ما تُسَطِّرُ علیّ بشیءٍ
قسم خدا کی تو مجھ کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ یعنی
کوئی بات نہیں بنا سکتا۔ یہ سطر فلانٌ علی فلانٍ
سے ماخوذ ہے۔ یعنی اُس نے فلاں شخص سے غلط باتیں
بنائیں۔ مِسْطَر: لکھا ہوا کاغذ۔ اور کاغذ پر
لکیریں ڈالنے کا آلہ

یَنْءَوْنَ : وَھُمْ یَنْھَوْنَ عَنْهُ وَیَنْءَوْنَ
عَنْهُ۔ نَاٰی یَنْاٰی نَاْیًا۔ بُعد اور دُوری
کہتے ہیں نأی عن فلان کسی سے دور ہونا۔
اور ناءی مُناءَۃً دور کرنا۔
ناءی الرجلَ دور کرنا ہٹانا بصفت (ناءٍ) مؤنث
نَاءِیَۃٌ۔ اَنْاٰی فلانًا عنہ۔ دور کرنا۔
یہ دونوں طرح متعدّی ہوتا ہے، بنفسہ اور حرف
کے ذریعہ بھی۔ جیسا کہ نأیتُہ و نأیتُ عنہ
اور ہمزہ کے ذریعہ مفعول ثانی کی طرف بھی متعدّی ہوتا
ہے۔ جیسا کہ اَنْأَیْتُہٗ عَنْہُ۔
فی المصباح نأی نَأْیًا، من باب سعی: بَعُدَ
یتعدّی بنفسہ وبالحرف وھو الاکثر فیقال
نأیتُہ ونأیتُ عنہ ویتعدّی بالھمزۃ
الی الثانی فیقال اَنأیتُہ عنہ (جمل) النَّأْیُ:
البُعْدُ (قرطبی) مطلب یہ کہ قرآن سے دوسروں
کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی اُس سے دور رہتے ہیں۔

عنه کی ضمیر دونوں جگہ قرآن کی طرف ہے۔

نَاءَ یَنُوْءُ وَیَنَاءُ ۔ نَأٰ بِجَانِبِهٖ : پہلو پھیر لینا۔ ابو عبیدہ کے نزدیک نَاءَ مثل نَاعَ کے ہے۔ جس کے معنی اُٹھنے کے ہیں۔ وَاَنَاْتُهٗ کے معنی اُٹھانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے : مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ ۔ اور نَأٰی بِجَانِبِهٖ : پہلو پھیر لینا ہے ابو عمر کا قول ہے کہ : نأی بروزن نعی ہے ۔ جس کے معنی اعراض کرنے کے ہیں ۔ اور ابو عبیدہ کے نزدیک نأی ینأی کے معنی دُور ہونے کے ہیں۔ اور اسی سے باب افتعال سے اِنْتَأٰی افتعل کے وزن پر آتا ہے۔ اور مُنْتَأًی کے معنی مکان بعید کے ہیں۔ نُؤْیٌ : خیمے کے گرد کی نالی جو پانی کو دور نکالنے کے لئے بنائی جاتی ہے ۔ نَأٰی بِجَانِبِهٖ : پہلو تہی کرنا۔ اور اسی لحاظ سے یَنْئَوْنَ عَنْهُ کا ترجمہ ہوگا وہ خود بھی قرآن پاک سے پہلو تہی کرتے ہیں ۔

السَّاعَة : حَتّٰٓی اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً ۔ اَلسَّاعَةُ : اجزائے زمانہ میں جزء قلیل کا نام ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے : لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ اور پھر ساعة بول کر اس سے مراد قیامت لی جاتی ہے۔ جیسا کہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ ۔ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۔

قیامت کو دراصل سرعت حساب میں تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے جیسا کہ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِیْنَ ۔ بعض نے کہا وہ ساعات جن سے مراد قیامت ہوتی ہے، تین ہیں :

۱۔ الساعة الکبرٰی یعنی لوگوں کو دوبارہ زندہ کرکے محاسبہ کے لئے اُٹھانا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : لاتقوم الساعة حتی یظهر الفحش والتفحش وحتی یُعبد الدرهم والدینار ۔ قیامت نہیں قائم ہوگی جب تک کہ فحش اور بے حیائی کھلم کھلا نہ ہونے لگے اور درہم و دینار کی عبادت نہ ہونے لگے۔

۲۔ الساعة الوسطٰی جو ایک قرن کے گذر جانے سے عبارت ہے ۔ حضور علیہ السلام نے حضرت عبداللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا : اِن یطل عمر هٰذا الغلام لم یمت حتی تقوم الساعة چنانچہ یہ صحابی طویل عمر پاکر تمام صحابہ کرام کے بعد فوت ہوئے ۔

۳۔ الساعة الصغرٰی جو ہر انسان پر بحیثیت انفرادی واقع ہوتی ہے۔ اس سے مراد موت ہے چونکہ یہ ہر انسان کے لئے قیامت ہے۔ اور اس آیت کریمہ میں ساعة صغرٰی ہی مراد ہے ۔

سُمّیت القیامة بالساعة لسُرعة الحساب فیها (قرطبی)

الساعة جزء من اجزاء الزمان ویُعبر به عن القیامة ۔ (راغب)

المراد بالساعة وقت مقدّمات الموت فلمّا کان الموت من مبادئ الساعة سُمّی

باسمها (جمل)

بَغْتَةً: بَغَتَ يَبْغَتُ بَغْتًا۔ بَغْتَةً و بَاغِتَةً کسی کے پاس یک بیک اور اچانک آجانا۔ ناگاہ آنا۔ کہتے ہیں لستُ آمنٌ مِن بغتات العَدُوِّ میں دشمن کے اچانک حملہ سے بے خوف نہیں ہوں۔ بغتات جمع ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ اچانک ظہور ہی کے معنی میں آیا ہے لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً۔ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً البغتُ: مُفَاجَاةُ الشئ من حَيْثُ لَا يُحْتَسَبُ (راغب) بَغْتَةً فَجَاْةً (قرطبی)

فَرَّطْنَا: قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فيها۔ پکار اٹھیں گے۔ ہائے افسوس ہماری کوتاہی پر جو ہم اس کے بارے میں کرتے تھے۔

فَرَطَ يَفْرُطُ فُرُوطًا۔ فرط کے معنی قصدًا آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ فرط منه قول: بغیر سمجھے بوجھے بات کہنا۔ فَرَطَ مِنْهُ شيءٌ کسی چیز کا جاتے رہنا فَرَطَ فِى القَوْل: بات میں جلدی کرنا۔ پیش دستی کرنا فَرَطَ يفرُطُ فَرطًا وفراطَةً (ص ن)

فَرَطَ القَوْمَ: قافلہ کے لئے گھاس پانی کا انتظام کرنے کے لئے آگے جانا۔ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انا افرطكم على الحوض میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔

اَفْرَطَ: زیادتی یا کمال کے لحاظ سے حد سے بڑھ جانا۔ جلدی کرنا۔ تفریط جانب نقصان اور کمی میں حد سے گزر جانا۔ چھوٹے بچے کی دعا جنازہ میں کہتے ہیں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا۔

ایک حدیث میں فَرَطًا لِاَبَوَيْهِ ہے۔

قرآن پاک میں ہے اَن يَفْرُطَ عَلَيْنَا۔ کہیں وہ ہم پر زیادتی نہ کریں۔ فَرَسٌ فَرَطٌ۔ تیز رفتار گھوڑا۔ مافَرَطْتُ فِى كذا۔ میں نے فلاں معاملہ میں کوتاہی نہیں کی۔ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتَابِ ہم نے کتاب لوح محفوظ میں لکھنے میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا۔ مَا فَرَّطْتُ فِى جَنْبِ اللهِ مطلب یہ ہے کہ اس کوتاہی پر افسوس جو میں نے خدا کے حق میں کی ہے اور سورۂ یوسف میں ہے مَا فَرَّطْتُمْ فِى يُوْسُفَ، جو قصور تم یوسف کے حق میں کر چکے ہو۔ اسی طرح وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا اس کا کام حد سے گزر گیا تھا۔ یعنی وہ حد اعتدال سے ہٹ کر ظلم و تعدی پر اتر چکا تھا۔

يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا۔ یہاں فرط باب تفعیل سے ہے۔ کافر و مجرم اس بات پر کف افسوس مل رہا ہے کہ جو اعمال آگے بھیجے ہیں وہ ناکام اور بے مراد ہیں۔ اس صورت میں فيها کی ضمیر قیامت کی طرف راجع ہوگی۔ فَرَّطْنَا کے معنی بعض نے تخلفنا بھی کئے ہیں۔ یعنی افسوس کہ دنیا میں ہم نے اچھے اعمال چھوڑ دیئے اس صورت میں ضمیر کا مرجع دنیا ہوگا۔

فَرَّطْنَا: معناه ضَيَّعْنَا واصله التقدّم (قرطبی)، فَرَطَ: اذا تقدّم تقدّمًا بالقصد (راغب) فَرَّطْنَا فيها الضمير للحياة الدنيا، جيئ بضميرها وان لم يجر لها الذكر لكونها مَعْلُوْمَةً (الكشاف)

او للشاعۃ علی معنی قصدنا فی شانہما وفی الایمان بہا (کشاف)

التفریط: التقصیر فی الشئ مع القدرۃ علی فعلہ (جمل)

اَوْزَارٌ: اَوْزَارَھُمْ عَلٰی ظُھُوْرِھِمْ

وَزَرَ یَزِرُ وِزْرًا ووَزْرًا - وَزَرَ الشئ: کسی بھاری چیز کو اٹھانا و وَزِرَ یَوْزَرُ (س) وَزَرًا گناہگار ہونا۔ وُزِرَ فُلَانٌ۔ گناہ سے منسوب کیا گیا اَلوِزْرُ مصدر ہے بھاری پن۔ بوجھ۔ کپڑوں کی گٹھڑی۔ الوَزَرُ بفتح الواو پہاڑ میں جائے پناہ اونچا پہاڑ۔ الوَزَرُ کے معنی پہاڑ میں جائے پناہ کے کئے گئے ہیں اور آیت کریمہ کَلَّا لَا وَزَرَ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ اِلْمُسْتَقَرُّ میں وَزَرٌ جائے پناہ ہی کے معنی میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خبردار کہیں پناہ نہیں ہے۔ اس روز تیرے خدا ہی کے پاس جانا ہوگا۔ الوِزْرُ جس کے معنی گناہ اور بار گراں کے ہیں اسی سے لیا گیا ہے یعنی الوَزَرُ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی پہاڑ میں جائے پناہ کے ہیں اور پھر جس طرح مجازًا اس کے معنی بوجھ کے آتے ہیں اسی طرح وِزر بمعنی گناہ بھی آتا ہے۔ اسی وِزر کی جمع اوزار ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔

لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَھُمْ کَامِلَۃً یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ۔ اسی سے الوزیر ہے جو امور مملکت کا بوجھ اٹھائے المُوَازَرَۃُ۔ باب مفاعلۃ ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

الوَزَرُ: المَلْجَأُ الذی یُلتجأُ الیہ مِنَ الجبل۔ قال کَلَّا لَا وَزَرَ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ اِلْمُسْتَقَرُّ۔ والوِزْرُ الثقل تشبیھًا بِوَزَرِ الجبل (راغب)

واصلہ من الوَزَرِ: وھو الجبل (قرطبی)

حدیث میں جنازہ کے ساتھ نکلنے والی عورتوں کے بارے میں آپ نے فرمایا اِرْجِعْنَ مَأْجُوْرَاتٍ غَیْرَ مَوْزُوْرَاتٍ یعنی ثواب لیکر لوٹو نہ کہ گناہ لیکر۔

لَعِبٌ: وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ۔ اور دنیوی زندگی حقیقت میں سوائے کھیل تماشہ کے کچھ نہیں۔ یہاں اس دنیا کی مذمت ہے جو مقصود بنالی گئی ہو۔ اور فکر آخرت کو چھوڑ کر دنیا ہی کو اپنا مقصد زندگی بنا لیا گیا ہو ورنہ تو حصولِ آخرت کا مدار ہی دُنیا پر ہے۔ چونکہ یہ دار العمل ہے۔

اللَّعِبُ: اس مادہ کی اصل لُعَاب ہے۔ جس کے معنی منہ سے رال بہنے کے ہیں اور بہنے والی رال کو بھی لُعَاب کہتے ہیں۔ لَعَبَ یَلْعَبُ لعبًا کے معنی منہ سے رال بہنے کے ہیں اور سَمِعَ سے لَعِبَ لَعِبًا: کوئی کام بغیر کسی صحیح مقصد کے کرنا وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَھُمْ لَعِبًا وَّلَھْوًا جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ سمجھ رکھا ہے ان سے بچو۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِیْنَ

لعاب النحل: شہد کو کہتے ہیں۔ لُعاب الشمس

وہ چیز جو دھوپ میں مکڑی کے جالے کی طرح دکھائی دے۔

لَعِبٌ۔ لَعْبٌ۔ لِعْبٌ اور تَلعابٌ۔ کھیلنا۔ بے فائدہ کام کرنا۔ کھلونا بنانا۔ لفظ لَعْبٌ بسکون العین منہ سے رال بہنے کے معنی میں عام ہے اور لَعِبٌ بکسر العین یہ بے مقصد کام کرنے کے معنی میں عام طور پر مستعمل ہے کل شیٔ یجترّ فلُعابه حَلَالٌ جو جانور جگالی کرے اس کا لعاب حلال ہے۔ اصل الکلمة: اللعاب وهو البزاق السائل. وقد لَعَبَ يَلعبُ لعبًا، سَالَ لُعَابُه ولَعِبَ فُلَانٌ إِذَا كَانَ فِعلهُ غير قاصِدٍ مقصداً صحيحًا (راغب)

اللعبُ معروفٌ والتلعابه الكثير اللعب والملعبُ المكان اللعِب (قرطبی)

ليس من اللعب واللهو ما كان من امور الآخرة فان حقيقة اللعب مالا يُنتفع به واللهو ما يُلتهٰى به (قرطبی)

اَللَّهْوُ: کھیلنا۔ بازی لگانا۔ دیوانہ۔ عاشق ہونا۔ مانوس ہونا۔ اصل میں لَهْوٌ ہر اس کام کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم اور با مقصد امور سے ہٹا دے اور باز رکھے۔ یہ لَهَوْتُ بکذا و لَهَيتُ عن كذا سے اسم ہے۔ جس کے معنی مقصد سے ہٹ کر بے فائدہ کاموں میں وقت گزار دینا ہے۔ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ۔ حدیث میں ہے اِذَا استأثر الله بشیٔ فَالْهَ عنه۔ یعنی اللہ تعالیٰ جو چیز اپنے کسی بندے کو عنایت فرمائے تو تُو اس کا خیال مت کر۔ یعنی اس پر حسد یا رشک کرنے میں وقت ضائع نہ کر۔

اللّهو: ما يشغل الانسان عما يعنيه ويهمّه راغب۔ وكل ما شَغَلَكَ فقد اَلْهَاكَ (قرطبی)

نَفَقًا نَفَقَ يَنفُقُ نَفَاقًا ونَفِقَ (س) نفقًا۔ کسی چیز کا کم ہو جانا، ختم ہو جانا

نَفَقَ الشیءُ: چیز ختم ہو گئی۔ کسی چیز کے ختم ہو جانے یا کم ہونے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں چیز کے بک جانے یا فروخت ہو جانے کی وجہ سے کہتے ہیں نفق البیعُ: سامان فروخت ہو گیا۔

اسی سے نفاق الایّم: بیوہ عورت سے نکاح کے طلب گاروں کا بکثرت پیغامِ نکاح دینا

نفق القوم: بازار کا پُر رونق ہونا۔

۲۔ مرجانے سے بھی چیز ختم ہو جاتی ہے۔ نَفَقَتِ الدَّابَّةُ نُفُوقًا: جانور کا مرجانا۔

۳۔ خرچ کرنے سے بھی چونکہ مال چلا جاتا ہے اور کم ہو جاتا ہے اس لئے خرچ کرنے پر بھی نفق کا لفظ بولا جاتا ہے۔ نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ: دراہم خرچ ہو گئے۔ اسی سے النَّفَقُ: جس کے معنی ایسی سرنگ کے ہیں جس کے دونوں طرف منہ کھلے ہوں۔

نافقاء الیربوع: جنگلی چوہے کا بل۔

نافق الیربوع ونفق کے معنی ہیں چوہا بل میں ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل گیا۔ اور یہیں سے معنی کو وسعت دے کر شریعت

میں دو رُخا پن اختیار کرنے پر بھی لفظ نفاق بولا گیا
اور منافق جو شریعت میں ایک طرف سے داخل ہوتا ہے
اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے
النَّفَقُ : الطریق النافذ والسّربُ فی الارض
النافذ فیه   راغب

سُلَّمًا : السُّلم : اصل میں ہر اس چیز کو کہتے
ہیں جس کے ذریعہ بلند مقامات پر چڑھا جاتا ہے۔ تاکہ
سلامتی ہو۔ پھر سَبَبٌ کی طرح ہر اس چیز کو سُلَّم
کہا گیا ہے جو کسی بلند مقام پر چڑھنے کا وسیلہ ہو
اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ (۵۲ - ۳۸)
یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر آسمان
سے باتیں سن آتے ہیں۔ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ
یا آسمان میں کوئی زینہ تلاش کر سکو۔ شاعر کا قول ہے

ولو نال اسباب السّماء بسُلّم
گو سیڑھی لگا کر آسمان پر کیوں نہ چڑھ جائے۔
(موت سے نہیں بچ سکتا)

سُلّم یہ سلامۃ سے مشتق ہے۔ گویا یہ انسان
کو سلامتی تک پہنچاتی ہے۔
جمہور اہل لغت کے نزدیک یہ مذکر ہے۔ اگرچہ
فراء نے اس کی تانیث کا بھی قول کیا ہے۔ مگر امام
قرطبی فرماتے ہیں کہ فراء کا یہ قول بلا سند ہے۔
السُّلَّمُ : المدَرَجُ (قاله قتادة) وقال
الزجاج وهو مشتق من السّلامة كانّه
يُسَلِّمك الى الموضع الذى تريد (قرطبی)
والسُّلَّم : المدرَجُ الذى يُرتقى عليه وهو
مُذكّر لا يؤنّث (فتح القدير)
والسُّلّم مایتوصل به الی الامکنة العالیة
فیُرجی به السّلامة ثم جعل اسمًا لکل ما
یُتوصّل به الی شیءٍ رفیع (راغب)
والسُّلّم : قیل المِصعَدُ وقیل المدرج
وقیل السبب (جمل) المِصعَدُ جمع مصاعد
آلة تُیَسّر بالکهرباء توضع فی المنازل ذات
الطبقات المتعددة لاصعاد الناس (منجد)

مُبْلِسُوْنَ : اِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ
وہ دھک سے رہ گئے۔ اردو محاورہ میں کہا جا سکتا
ہے کہ اچانک ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔
مُبلِس یہ ابلاس سے ہے، جس کے معنی ہیں
سخت مایوسیوں کے باعث غمگین ہونا۔ اَبْلَسَ
فُلَانٌ وہ مایوس ہونے کی وجہ سے غمگین ہو گیا
ابلیس بھی اسی سے مشتق مانا گیا ہے۔ جس کا اصل
نصیب بھی مایوسی اور خدا کی رحمت سے بُعد ہے
اَبْلَسَ فُلَانٌ بے دلیل ہو کر خاموش ہو جانا
يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ.
اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ.
اَبْلَسَ : بے خبر ہونا، شکستہ دل ہونا۔ ابلس من
مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا۔
اَبْلَسَ فی امرہ : اپنے کسی کام میں حیران ہونا۔
صیغہ صفت کا بَلِسٌ و مُبْلِسٌ۔ ابلسه : متحیّر
کر دینا۔ اَلْبَلَسُ : بے خبر آدمی۔
المُبْلِسُ : الباهتُ الحزين الآيس من الخير
لا يحير جوابًا لشدّة ما نزل به من سوء
الحال (قرطبی) اَبْلَسَ الرجلُ : سَكَتَ۔

اَخَذَ : اَخَذَ یَاخُذُ اَخْذًا
پکڑ لینا ۔ لے لینا ۔ اُخِذَ بِذَنْبِہٖ گناہ کی سزا دی
یہ عطا کی ضد ہے ۔ الأخذ کسی چیز کو احاطہ میں
لے لینا ۔ الأخیذ : قیدی ۔ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ
رَبِّكَ ۔ تیرے رب کی پکڑ ایسے ہی ہوتی ہے ۔

خَزَائِن : قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ
خَزَآئِنُ اللّٰهِ ۔ آپ کہدیجئے کہ میں تم سے
یہ تو نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں
خَزَنَ یَخْزُنُ خَزْنًا ۔ اِخْتَزَنَ المَالَ :
مال جمع کرنا ۔ اختزن السّر : بھید چھپانا ۔
اختزن اللسان : زبان کو روکنا ۔ اختزن
الطریق : قریب ترین راستہ اختیار کرنا ۔ اور
خَزُنَ (ک) خَزُنَ اللَّحمُ : گوشت کا بدبودار
ہونا ۔ اَخْزَنَ (افعال) محتاجی کے بعد خوشحال
ہونا ۔ الخَزْنُ : کے معنی ہیں کسی چیز کو خزانے میں
محفوظ کردینا ۔ پھر یہیں سے وسعت دے کر اس
کو ہر چیز کی حفاظت کے معنی میں استعمال کیا جاتا
ہے ۔ الخِزَانَۃُ والخزینۃُ : ذخیرہ جمع کرنے
کی جگہ ، اسٹور گودام وغیرہ ۔ اس کی جمع خزائن
آتی ہے ۔ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
(۶۳-۷) وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ
اللّٰهِ ۔ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے
خزانے ہیں ۔ یہاں خزائن اللہ سے مقدورات
مراد ہیں جو خدا تعالیٰ نے لوگوں سے روک رکھی
ہے ۔ کیونکہ لفظ خزن میں منع کے معنی پائے جاتے
ہیں ۔ اور بعض اہل علم کا قول ہے کہ خزائن اللہ
سے مراد اللہ کی وسیع جود وقدرت ہے ۔
الخازن : اسم فاعل ہے ۔ خَازِنُ الامیر
امیر کے مال کا خزانچی اور اس کو خرچ کرنے والا
اس کی جمع خَزَنَۃ آتی ہے ۔ قرآن پاک میں ہے
وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا ۔ مخزن : ذخیرہ کرنے
کی جگہ ۔ جمع مخازن ۔ والخزانۃ مایُخزَنُ
فیہ الشیٔ ۔ وخزائن اللہ مقدوراتہ ۔
(قرطبی ۔ راغب)

تَطْرُدُ : وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ
طَرَدَ یطرُدُ طَردًا وطِرَادًا : دور کرنا
ایک طرف کرنا اور سمع سے طَرِدَ یَطْرَدُ طَرَدًا : کھوج
لگانا ۔ شکار کا پیچھا کرنا ۔
اَلطَّرْدُ : کے اصل میں معنی ہیں کسی کو حقیر و ذلیل
سمجھ کر دور کر دینا ۔ ہٹا دینا ۔ طَرَدْتُهٗ :
میں نے اس کو بھگا دیا ۔ قرآن میں ہے :
وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ
اے میری قوم اگر میں ان کو نکال دوں تو خدا سے
مجھے کون بچائیگا ۔
اَطْرَدَہُ السُّلْطَانُ وَطَرَدَہٗ : بادشاہ نے
اس کو شہر بدر کر دیا ۔ (مفردات القرآن)

مَفَاتِح : وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ
لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۔ لفظ مفاتح جمع ہے ۔ اس کا
مفرد مَفْتَح ۔ بفتح میم بھی ہو سکتا ہے ۔ جو خزانوں
کے لئے بولا جاتا ہے ۔ اور مِفْتَح بکسر میم بھی
ہو سکتا ہے ۔ جس کے معنی کنجی کے ہیں ۔ لفظ

مفاتح میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے۔ اس لئے بعض مفسرین اور مترجمین نے اس کا ترجمہ خزانوں سے کیا ہے اور بعض نے کنجیوں سے اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ کیونکہ کنجیوں کا مالک ہونے سے بھی خزانوں کا مالک ہونا مراد ہوتا ہے۔

(معارف القرآن)

والمفاتح جمع مفتح وھو المفتاح وقرئ مفاتیح وقیل ھی جمع مَفتح بفتح المیم وھو المخزن (کشاف)

مفاتح : اصل میں فتح سے ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی سے بندش اور پیچیدگی کا ازالہ کرنا۔ اور انغلاق وابہام کو رفع کرنا۔ پھر یہ دو قسم پہ ہوتا ہے ایک تو وہ جس کا ادراک آنکھ سے ہوسکے جیساکہ فتح الباب وغیرہ اور فتح القفل، دروازہ کھولنا۔ فتح المتاع : سامان کو کھولنا۔ جیساکہ قرآن پاک میں ارشاد ہے : وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ۔ جب انہوں نے اسباب کھولا۔ اسی طرح کی اور امثلہ فتح حسّی کی قرآن کریم میں بہت ہیں۔ دوسری فتح کی قسم وہ ہے جس کا ادراک قوتِ بصیرت سے ہوسکے، ظاہری آنکھ کی رویت کو اس میں مجال نہیں جیساکہ غموم و ہموم کی فتح۔ پھر یہ فتح عام ہے دنیا کے اعتبار سے ہو یا آخرت کے۔ قرآن میں ہے : فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ۔ اسی طرح فرمایا : لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ۔ اسی طرح علوم و معارف کے حقائق کی مشکل کشائی پر بھی کہتے ہیں، فُلَانٌ فَتَحَ مِنَ الْعِلْمِ بَابًا مُغْلَقًا : یعنی فلاں نے علم کا بند دروازہ کھول دیا۔ یعنی اس میں جو علمی اشکالات تھے ان کو حل کردیا۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ہم نے آپ کو فتح دی، فتح بھی صریح و صاف (ترجمہ فتح)

اسی سے ہے الفاتحۃ : اور فاتحہ ہر چیز کے شروع اور مبدأ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ اس کے بعد کو شروع کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی ابتدائی سورت کو بھی الفاتحہ کہنے کی یہی وجہ ہے۔ کہ وہ مبدأ قرآن ہے۔ فتح علیہ کذا : کسی کو کوئی بات بتانا۔ امام کو لقمہ دینا۔

فتح القضیۃ : جھگڑا چکانا۔

حاصل یہ کہ اسی فتح سے مفتح اور مفتاح بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں وہ آلہ جس کے ساتھ کسی چیز کو کھولا جائے مفاتح اس کی جمع ہے۔ اور بعض اہل قرأت نے مفاتیح بھی پڑھا ہے۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ میں مفاتیح سے وہ وسائل مراد ہیں جن کے ذریعہ اس غیب تک رسائی ہوتی ہے جس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں کیا گیا ہے فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ۔

ای ما یتوصل بہ الی غیبہ المذکور فی قولہ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ مفاتح مفتح کی جمع ہے، اور اس کو فصیح لغت قرار دیا ہے۔ ومفاتح

جمع مفتح (بالفتح) هذه اللغة فصيحة ویقال مفتاح ویجمع مفاتیح۔ والمفتح عبارة عن مایحل غلقا محسوسًا کان کالقفل او معقولاً کالنظر (قرطبی)

تَسۡقُطُ : وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعۡلَمُهَا : اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے۔

سَقَطَ یَسۡقُطُ سُقُوطًا وَمَسۡقَطًا۔ اس کے اصل معنی کسی چیز کے اوپر سے نیچے گرنے کے ہیں۔ چاہے یہ سقوط کسی جسم و جرم کا ہو یا مرتبہ کا۔ سَقَطَ علی الارض زمین پر گرنا۔ سَقَطَ مِنۡ عَیۡنِیۡ میری نظر سے گر گیا یعنی میرے نزدیک وہ ذلیل ہے۔ سَقَطَ فی الکلام غلطی کرنا۔ سَقَطَ النجم : ستارہ کا غروب ہونا۔ السَّقَطُ : بے کار اور بے خیر چیز۔ جمع اَسۡقَاط۔ السَّقَطُ : شبنم یا برف۔ اور اَلسِّقۡطُ : حمل کا مدت سے پہلے ساقط ہو جانا۔ مَسۡقَطٌ : (ظرف مکان) گرنے کی جگہ۔ جمع مَسَاقِط۔ مسقط راس الرجل : انسان کی جائے پیدائش۔ سَقۡطٌ اور سُقَاطَةٌ دونوں کے معنی ہیں نکمی اور بے وقعت چیز۔ رَجُلٌ سَاقِطٌ کمینہ آدمی۔ اَسۡقَطَتِ الۡمَرۡاَةُ عورت نے ناتمام حمل گرا دیا۔ اس میں اوپر سے نیچے گرنا اور ردی ہونا دونوں معنی پائے جاتے ہیں وَلَمَّا سُقِطَ فِیۡۤ اَیۡدِیۡهِمۡ یہاں سُقِطَ سے مراد پریشان اور نادم ہونا وَاِنۡ یَّرَوۡا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا اور فَاَسۡقِطۡ عَلَیۡنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ۔ اَلَا فِی الۡفِتۡنَةِ سَقَطُوۡا۔ یہاں سقوط سے مراد قدر و منزلت کے اعتبار سے گرنا ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ خدا کا علم وسیع کائنات کی تمام جزئیات اور کلیات پر محیط ہے۔

وَرَقَةٍ : درخت کے پتے۔ اس کی جمع اوراق ہے۔ وَرَّقَتِ الشَّجَرُ درخت کا پتے دار ہونا اور الوَارِقَةُ اس درخت کو کہتے ہیں جو خوبصورت اور سبز ہو اور عامٌ اوراقٌ : قحط سالی۔ اسی طرح اورق فلانٌ کے معنی ہیں نامراد و ناکام ہونا۔ گویا درخت ہے جس کے پتے ہیں مگر پھل نہیں ہے۔

الوَرۡقُ ، والوُرۡقُ : الوَرِقُ (بکسر الراء) چاندی کا سکہ۔ الوَرِقُ ، را کے کسرہ کے ساتھ خاص کر چاندی کے سکے کو کہا جاتا ہے۔ قرآن میں فَابۡعَثُوۡۤا اَحَدَکُمۡ بِوَرِقِکُمۡ هٰذِهٖۤ تو اپنے میں سے کسی ایک کو یہ سکہ دے کر بھیجو۔

وَرَقَ یَرِقُ وَرۡقًا : وَرَقَ الشَّجَرَ : درخت کا پتے دار ہونا۔ وَرَقَ الرَّجُلُ : مالدار ہونا۔ اَلۡوِرَاقَةُ : کاغذ سازی کا پیشہ۔ (منجد۔ مفردات)

حَمَامَةٌ وَرۡقَاءُ : خاکستری رنگ کی فاختہ یا کبوتری۔

رَطۡبٍ : تر۔ نرم۔ نمناک۔ یہ یَابِسٌ کی ضد ہے۔ جس کے معنی ہیں خشک چیز۔

رَطِبَ ورَطُبَ سَمِعَ اور کَرُمَ ۔ دونوں ابواب لازم آتا ہے ۔ رَطِبَ يَرْطَبُ ورَطُبَ يَرْطُبُ رُطُوبَةً وَرَطَابَةً : تر ہونا، نرم ونازک ہونا۔ رَطُبَ الْبُسْرُ : پختہ ہونا ۔ الرُّطَبُ: سبز گھاس، تازہ سبزی، تازہ کھجور ۔
واحد رُطَبَة جمع رِطَاب وأرْطَاب ۔
لفظ رُطَبٌ تازہ کھجور کے ساتھ مخصوص ہے قرآن پاک میں ہے : تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (مریم) الرَّطْبُ خلاف الیابس ۔

يَابِسٌ : يَبِسَ يَيْبَسُ وَيَيْبِسُ يَبْسًا وَيُبْسًا ۔ خشک ہونا ۔ سوکھ جانا ۔
اوزانِ صفت یہ ہیں : يَبْسٌ يَبِسٌ، يَابِسٌ، يَبُوسٌ ۔ ہر سوکھی چیز کو یابس نہیں کہاجاتا بلکہ يُبْس کا لفظ وہاں بولاجاتا ہے جہاں تری کے بعد خشکی پیدا ہوتی ہو۔ ترگھاس جب خشک ہوجائے تو اس کو يَبْس بسکون الباء کہاجاتا ہے اور جس جگہ پہلے پانی ہو اور پھر سوکھ گیا ہو اس کو بھی يَبَس (بفتح الباء) کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے : فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۔ یعنی دریا میں لاٹھی مارکر ان اسرائیلیوں کے لئے خشک راستہ بناؤ۔ اور پنڈلیوں کے پتلے حصے، جن پر گوشت نہیں ہوتا اليَبَسان کہتے ہیں۔ يَبَسَان تثنیہ کا صیغہ ہے ۔ يَبِسَ ما بينهُمَا ۔ آپس کے تعلقات ٹوٹ گئے ۔ اَيْبِسْ ۔ امر کا صیغہ ہے ۔ اَيْبِسْ يا رَجُلُ : چپ رہو ۔ حَجَرٌ يَابِسٌ، سخت پتھر ۔ يَابِس فاعل ہے جمع يُبَّسٌ ۔

احتاحت جَعِيمُ اليَبْس سوکھی گھاس کے گھٹے تباہ ہوگئے ۔ حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا : لعلہ ان يُخفف مالم يَيْبَسَا : شاید جب تک یہ ڈالیاں نہ سوکھیں، ان کا عذاب ہلکا ہو۔
يَبِسَ الشئ يُيبَسُ واليَبْسُ يابس النبات وهوماكان فيه رطوبةٌ فذهبت ۔
(مفردات القرآن)

الرطبُ ماينبُتُ واليابس مالاينبُتُ (جمل)

كَرْب : قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ۔ اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تمہیں نجات دیتا ہے ان سے بھی اور ہر غم سے یہاں نفسِ انسانی کی کمزوری کا بیان ہے کہ ہر غم ورنج اور تمام مصائب سے نجات خدا دیتا ہے مگر انسان ہے کہ اس ذات صمد کے ساتھ پھر بھی دوسروں کو شریک بنائے بیٹھا ہے ۔
كَرَبَ يَكْرُبُ كَرْبًا ۔ كَرَبَ الحَبْلَ کے معنی ہیں رسّی باٹنا ۔ كَرَبَهُ الغَمُّ : سخت غم اور رنج ہونا ۔ كَرْبٌ کے اصل معنی ہیں سخت رنج وغم ۔ قرآن پاک میں ہے : فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ (انبیاء)
قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ (انعام)
فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ (ایضا)
قرآن پاک میں یہ لفظ کل چار مرتبہ ذکر ہوا ہے ۔
الكربُ : الغَمُّ الشديد (راغب)
الكُرْبَةُ : یہ غُمَّةٌ کی طرح ہے ۔ یہ كرب الارض سے مشتق ہے ۔ جس کے معنی

زمین میں ہل چلانا۔ اس کو کھود کر نرم کرنا۔ غم سے بھی چونکہ طبیعت الٹ پلٹ ہو جاتی ہے اس لئے اسے کرب کہا جاتا ہے۔

الکربُ : الغمّ یاخذ بالنفس یُقال منه رجُلٌ مکروبٌ ۔ قال عنترة :

ومکروبٍ کشفتُ الکربَ عنه
بطعنةٍ فیصلٍ لمّا دعانی

والکُرْبَة : مشتقة من ذلك (قرطبی)

اکتراب یا اِکْرِیباب : ساق ہونا، سخت ہونا، رنجیدہ ہونا۔

یَلْبِسَکُمْ : اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا۔

لَبِسَ الثوبَ کے معنی ہیں کپڑا پہننا۔ اور اَلْبَسَهٗ کے معنی دوسرے کو کپڑا پہنانا۔

وَ یَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا : وہ سبز کپڑے پہنا کریں گے۔

اللباسُ واللَّبُوسُ واللِّبْسُ : وہ چیز جو پہنی جائے۔ لفظ یَلْبِسُ لَبْسٌ کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی چھپا لینے اور ڈھانپ لینے کے ہیں۔ اسی معنی سے لباس ان کپڑوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کے بدن کو ڈھانپ لیں اور اسی وجہ سے التباس بمعنی شبہ و اشتباہ استعمال ہوتا ہے۔ جہاں کسی کلام کی مراد مستور ہو صاف اور کھلی ہوئی نہ ہو۔ کہتے ہیں فی الامر لُبْسَةٌ یعنی اس معاملہ میں اشتباہ ہے۔

قرآن میں ہے وَلَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ اور جو شبہ وہ اب کرتے ہیں اسی شبہ میں پھر ڈال دیتے ہیں۔

وھٰذا اللبسُ بان یخلطَ امرَھُم فیجعلَھم مختلفی الاھواءِ (قرطبی)

شِیَعًا : اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا۔

الشّیاعُ کے معنی منتشر ہونے اور تقویت دینا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے شَاعَ الخَبَرُ : خبر پھیل گئی اور زور پکڑ گئی۔ شَاعَ القومُ : قوم منتشر اور زیادہ ہو گئی۔ شیّعتُ النّارَ بالحطبِ : ایندھن ڈال کر آگ تیز کرنا۔ اور لفظ شِیَعٌ جمع ہے اس کی واحد شیعة آتی ہے، جس کے معنی ہیں کسی کا پیرو اور تابع ہونا۔ قرآن مجید میں ہے وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ یعنی نوح علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں ابراہیم علیہ السلام اسی لئے عرف اور محاورہ میں لفظ شیعہ ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو کسی خاص مقصد کے لئے جمع ہو جائے اور اس غرض اور مقصد میں ایک دوسرے کی معاون ہو۔ جس کا بامحاورہ ترجمہ آجکل کی زبان میں فرقہ یا پارٹی ہے۔ اسی لئے آیت کا ترجمہ یہ ہو گیا کہ عذاب کی ایک قسم یہ ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے۔ (معارف القرآن)

اسی لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا : لا ترجعوا بعدی کُفّارًا یضربُ بعضُکُم رقابَ بعضٍ

قرآن پاک میں لفظ شِیْعَة کئی مقامات پر وارد ہوا ہے هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ

هُدُوءٍ۔ اور اسی طرح فرمایا: وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا۔ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ۔ اور ہم نے تمہارے ہم مذہبوں کو ھلاک کر دیا۔

شیعہ: اسلامی فرقوں میں سے ایک ایسا فرقہ جس کے تمام عقائد وافکار اس اسلام کے خلاف ہیں جو صحابہ کرام سے منقول ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ تحریف قرآن کے قائل ہیں اور خلفاء ثلاثہ یعنی خلافتِ صدیقؓ، خلافت عمرؓ وعثمانؓ کے منکر ہیں۔ حضرت علیؓ کو خلیفہ بلا فصل کہتے ہیں

اَشْيَاع بھی شيعة کی جمع ہے۔ اَلشِّيَاعُ: اَلْاِنْتِشَارُ والتقوية (راغب)

شِيَعًا: معناه فِرَقًا وقيل يجعلكم فِرَقًا يُقَاتِل بعضكم بعضًا (قرطبی) وذلك بتخليط امرهم وافتراق أمراءهم على طلب الدنيا (ايضًا) او يخلطكم فِرَقًا مختلفين على اهواءٍ شتّى (كشاف)

تُبْسَلَ: وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ اور اس قرآن کے ذریعہ سے ان کو سمجھایئے بھی کہ کوئی شخص اپنے کئے کے بدلہ میں پھنس نہ جائے اللہ کے سوا اس کا کوئی کارساز ہوگا نہ سفارشی۔ یومٌ باسلٌ: سخت دن۔ البَسْلُ کے معنی کسی کو اکٹھا کرنا۔ اور روکنا کے ہیں۔ اکٹھا کرنا کے مفہوم کے پیش نظر استعارۃً ترشروئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ترش روئی کرنے والے کو بَاسِل اور مُبْتَسِلُ الوَجْه کہا جاتا ہے۔ بَاسِل: ترش رُو۔ اور روکنے کے معنی کے پیش نظر حرام اور گروی چیز کو بَسْلٌ کہتے ہیں گویا بسل حرام کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ لیکن بسل اور حرام دونوں میں معنوی لحاظ سے ایک لطیف فرق صاحب مفردات نے یہ بیان کیا ہے کہ حرام عام ہے جو ممنوع عنہ حکمی اور قہری دونوں کو شامل ہے اور بسل وہاں بولا جاتا ہے جہاں کوئی چیز جبرًا روک دی گئی ہو۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا میں یہ ہی مراد ہے۔

بَسَلَ بَسَالَةً وبَسَالًا بہادر ہونا۔ صفت بَسُوْلٌ آتی ہے اور بَاسِلٌ کی جمع بُسْلٌ وبُسَلَاءُ وبُسُلٌ بھی آتی ہیں۔ بَسَلَ يَبْسُلُ بُسُوْلًا، بَسَلَ الرَّجُلُ۔ غصہ یا بہادری سے کسی کا تیوری چڑھانا۔ بَسَلَهٗ ملامت کرنا۔ کسی چیز کو جائز قرار دینا۔ اَبْسَلَ اللّٰهُ الشَّيْءَ اللہ کا کسی چیز کو حرام قرار دینا۔ البَسْل: سختی۔ حلال۔ حرام۔ اس میں واحد جمع مذکر اور مؤنث مساوی ہیں۔ کہا جاتا ہے هٰذا بَسْلٌ عَلَيْكَ یہ چیز تم پر حرام ہے۔ شیر کو بَاسِل کہتے ہیں چونکہ وہ بھی اپنا شکار دوسروں سے بچاتا ہے۔ بہادر اور جری آدمی کو باسل کہتے ہیں چونکہ وہ اپنے اوپر دوسروں کو غلبہ پانے سے روکتا ہے۔ اس کی جمع جبکہ باسل سے مراد شیر ہو بواسل آتی ہے۔ بَسَالة: دلیری۔

اَنْ تُبْسَلَ: ای توهن وتُسلم لِلهلكة

عن مجاهد۔ والابسال : تسلیم المرء للھلاک ۔ ھٰذا ھو المعروف فی اللغۃ۔ کہتے ہیں ۔ ابسلتُ ولدی : ارھنتہٗ ۔ عوف بن الاحوص اپنے بچوں کو بنی قشیر کے سپرد کرنے کے بعد حسرت کے ساتھ کہتا ہے :

و ابسالی بَنِیَّ بِغَیرِ جُرمٍ
بَعَونَاہُ ولا بدمٍ مُراقٍ قرطبی

واصل الابسال : المنع ۔ والباسل: الشجاع لامتناعہ من قرنہ (کشاف)

واصل البسل فی اللغۃ : التحریم والمنع ومنہ ھٰذا عَلَیکَ بَسلٌ ای حَرَامٌ ممنوعٌ (خازن) وقال ابوالسعود : و اصل الابسال والبَسل المنع (جمل)

تُبسَلَ نَفسٌ ای تسلم للھلاک (جلالین)

اَبسَلَہٗ : اسے ھلاکت اور تباہی کے حوالہ کر دیا

اَبسَلَہٗ لِعَمَلِہٖ : اُسے اس کے عمل کے حوالہ کر دیا کہ اپنے کیے کی سزا بھگتے ۔

اٰزَرَ : وَاِذ قَالَ اِبرٰھِیمُ لِاَبِیہِ اٰزَرَ : اور جب حضرت ابراہیم نے اپنے والد آزر کو کہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ تاریخ اور تورات کی تصریح کے مطابق یہ ہے : ابراھیم (خلیل اللہ) بن تارخ بن ناحور بن سروج بن ارغو بن فالج بن عابر بن شالخ بن ارفکشاذ بن سام بن نوح (علیہ السلام)

مگر قرآن عزیز نے ان کے والد کا نام آزر بتایا ہے ۔ جیسے کہ اوپر ذکر کردہ آیت میں مذکور ہے ۔ عام اہل تفسیر نے اُن کا زمانہ حضرت نوح ، ہود اور صالح علیہم السلام کے بعد اور مسیح علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل بیان کیا ہے ۔ آپ کی دو بیویاں مشہور ہیں ایک حضرت سارہ جن کے بطن سے حضرت اسحٰق پیدا ہوئے ۔ دوسری زوجہ مبارکہ کا اسم حضرت ہاجرہ ہے ۔ ان کے بطن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے ۔ جن کی اولاد سے شرفِ بشریت، سرتاجِ انبیاء صاحبِ لولاک، خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہور پذیر ہوئے ۔

لفظِ آزر کی تحقیق : چونکہ تاریخ اور تورات جناب ابراہیم کے والد کا نام تارخ بتاتی ہیں اور قرآن عزیز " آزر" اس لیے علماء اور مفسرین نے اس مسئلہ کی تحقیق میں دو رائیں اختیار کی ہیں ۔ ایک یہ کہ ایسی صورت اختیار کی جائے کہ دونوں ناموں کے درمیان مطابقت ہو جائے اور یہ اختلاف جاتا رہے ۔

دوسری یہ کہ تحقیق کے بعد فیصلہ کن بات کہی جائے کہ ان دونوں میں کون صحیح اور کون غلط یا دونوں صحیح ہیں ۔ مگر دو جدا جدا ہستیوں کے نام ہیں ۔ پہلے خیال کے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں نام ایک شخصیت سے وابستہ ہیں اور تارخ علم اسمی (اسمی نام) ہے ۔ اور آزر علمِ وصفی (وصفی نام) ہے ۔ ان میں سے بعض کہتے

ہیں کہ آزر عبری زبان میں محبِّ صنم کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ تارخ بت تراش تھا اور بت تراشی اور بُت پرستی دونوں وصف موجود تھے۔ اس لئے آزر کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور بعض کا گمان ہے کہ آزر کے معنی اعوج یعنی کم فہم، بے وقوف اور پیرِ فرتوت کے ہیں۔ اور چونکہ تارخ میں یہ باتیں موجود تھیں اس لئے اس وصف سے موصوف کیا گیا۔ قرآن عزیز نے اسی مشہور وصفی علَم کو بیان کیا ہے۔ سہیلی نے روض الانف میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

اور دوسرے خیال کے علماء کی تحقیق یہ ہے کہ آزر اُس بت کا نام ہے تارخ جس کا پجاری اور مہنت تھا۔ چنانچہ مجاھد سے روایت ہے کہ قرآن عزیز کی مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ : وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اٰزَرَ اِلٰهًا۔ ای اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً، کیا تو آزر کو خدا مانتا ہے۔ یعنی بتوں کو خدا مانتا ہے۔

اور صنعانی کی رائے بھی اس کے قریب قریب ہے۔ غرض ان دونوں کے نزدیک لفظِ آزَرَ لفظ اَبِيْهِ کا بدل نہیں ہے بلکہ بت کا نام ہے۔ اور اس طرح قرآن عزیز میں گویا حضرت ابراہیم کے والد کا نام مذکور نہیں۔

۳ تیسرا ایک مشہور قول یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ اور چچا کا نام آزر تھا چونکہ آزر نے ان کی تربیت کی تھی اور والد کی طرح پالا تھا اس لئے قرآن عزیز نے آزر کو باپ کہہ کر پکارا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اَلْعَمُّ صِنْوُ اَبِيْهِ کہ چچا باپ ہی کی طرح ہے۔

علامہ عبدالوہاب نجار کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں سے مجاھد کا قول قرینِ قیاس اور قابلِ قبول ہے اس لئے کہ مصریوں کے قدیم دیوتاؤں میں ایک نام ازوریس بھی آتا ہے جس کے معنی خدائے قوی و معین کے ہیں۔ اور اصنام پرست اقوام کا شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ قدیم دیوتاؤں کے نام ہی پر جدید دیوتاؤں کے نام رکھ لیا کرتے تھے۔ اس لئے اس بت کا نام بھی قدیم مصری دیوتا کے نام پر رکھا گیا اور حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ تھا۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ تمام تکلفات باردہ ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے جب صراحت کے ساتھ آزر کو اَبِ ابراہیم یعنی ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا ہے تو پھر محض علماء انساب اور بائبل کے تخمینی قیاسات سے متأثر ہو کر قرآن کریم کی یقینی تعبیر کو مجاز کہنے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر خواہ مخواہ قرآن عزیز میں نحوی مقدرات ماننے پر کونسی شرعی اور حقیقی ضرورت مجبور کرتی ہے۔ برسبیلِ تسلیم اگر آزر عاشقِ صنم کو کہتے ہیں یا بُت کا نام ہے تب بھی بغیر تقدیر کلام اور بغیر کسی تاویل کے یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ ان ہر دو وجہ سے آزر کا نام آزر رکھا گیا۔ جیسا کہ اصنام پرست اقوام کا قدیم سے دستور رہا ہے کہ وہ کبھی اپنی اولاد کا نام بتوں کا غلام ظاہر کر کے رکھتے تھے اور کبھی خود بُت ہی کے نام پر رکھ دیا کرتے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ آدار کالدی زبان میں

بڑے پجاری کو کہتے ہیں۔ اور عربی میں یہ ہی آزر
کہدیا۔ تارخ چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا
پجاری تھا اس لئے آزر ہی کے نام سے مشہور
ہوگیا حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا۔ اور جبکہ
لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآن عزیز نے بھی اسی نام
سے پکارا۔ آگے علامہ حفظ الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں
کہ: پس بلاشبہ تاریخ کا تارخ، آزر ہی ہے۔
اور وہ علم اسمی ہے نہ کہ علم وصفی۔ اور تارخ یا
غلط نام ہے اور یا آزر ہی کا ترجمہ ہے جو تورات
کے دوسرے اعلام کی طرح ترجمہ نہ رہا بلکہ اصل بن
گیا۔ (قصص القرآن جلد ۱ ص ۱۳۲ تا ۱۳۵)

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ یہ تمام تکلفات
ہیں جن کی طرف توجہ اُسی وقت کی جاسکتی ہے،
جب اس بات پر کوئی حجتِ قاطعہ موجود ہو کہ جناب
ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا،
آزر نہیں تھا۔ حالانکہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں
ہے۔ اور قرآن پاک کے ذکر کردہ نام پر قوی دلیل موجود
ہے اور وہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ۔ مشرکین یہ
تمام باطل اقوام اس بات کی تاک میں رہتی تھیں کہ
کوئی ثبوت ایسا ہاتھ لگ جائے جس کو لے کر
وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کریں۔ تو اگر
قرآن کی ذکر کردہ نسبت جناب ابراہیم کی طرف
مشکوک ہوتی تو یہ قومیں ایک ہنگامہ برپا کرتیں
حالانکہ نزولِ قرآن کے وقت کسی ایک نے بھی یہ اعتراض
نہیں کیا کہ حضرت ابراھیم کے والد کا نام آزر نہیں،
بلکہ تارخ تھا۔ وحیث لم یکذبوہ علمنا ان
هٰذا النسب صحیح۔ (کبیر)

قرآن پاک کے عظیم عالم حسن بصریؒ کا قول
بھی یہ ہی ہے کہ کان اسم ابیہ آزر۔ (قرطبی)
(آزر) اسم ابی ابراھیم علیہ السلام (کشاف)

اَصْنَامٌ: اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً

الصَّنَم: کے معنی بت کے ہیں جو کہ چاندی
پیتل یا لکڑی وغیرہ کا بنا ہوا ہو۔ اعرب لوگ
ان چیزوں کے مجسّمے بنا کر ان کی پوجا کرتے اور انہیں
تقربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ صنم کی جمع اصنام
آتی ہے۔ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً کہ تم بتوں
کو کیوں معبود بناتے ہو۔ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ
میں تمہارے بتوں کا بندوبست کروں گا۔
وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ۔ بعض
حکماء نے کہا ہے کہ وہ چیز جو ماسوا خدا کے پجتی ہے
وہ صنم ہے۔
صَنَمَ الرَّجُلُ: آدمی نے آواز دی۔ اور اہل
تصوّف کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی
دنیا کی چیزوں میں مشغول ہوا اور اس طرح مشغول ہوا
کہ اللہ کو بھلا دیا۔ اور وہی دنیا اس کی صنم ہوگئی
الصَّنَمُ: جُثَّةٌ مُتَّخَذَةٌ مِنْ فِضَّةٍ او
نُحَاسٍ او خشب کانوا یعبدونها متقربین
به الی الله وجمعه اصنامٌ (راغب)
اصنام: جمع صنم وهو التمثال والوثن
بمعنى وهو الذی یُتخذ من خشب او حجارةٍ
او حدیدٍ او ذهب او فضةٍ علی صورة الانسان
(خازن)

جَنَّ : فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۔

اَلْجَنُّ : کے اصل معنی کسی چیز کو حواس سے پوشیدہ کرنے کے ہیں ۔ چنانچہ محاورہ جَنَّهُ اللَّيْلُ وَاَجَنَّهُ اس کو رات نے چھپا لیا ۔

جُنَّ عَلَيْهِ: وہ مجنون یعنی اس پر دیوانگی کا اثر ہو گیا ۔ معلوم ہوا کہ جَنَّهٗ کے اصل معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اور اَجَنَّهٗ باب افعال سے ہو تو اس کے معنی ہوں گے چھپانے کے لئے کوئی چیز دینا جیسا کہ قَبَرْتُهٗ وَاَقْبَرْتُهٗ وَسَقَيْتُهٗ وَاَسْقَيْتُهٗ جَنَّ عليه كذا کسی چیز نے اسے چھپا لیا ۔

لہٰذا آیت کا ترجمہ یہ ہوا کہ جب رات نے اُن کو پردہ تاریکی میں چھپا دیا تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا ۔

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ : اَلْجَنَّةُ ۔ اَلْجِنَّةُ اَلْجُنَّةُ ۔ اَلْجَنِيْنُ ۔ اَلْمِجَنُّ وَالْجِنُّ ۔ ان سب کے معنی تقریبًا ایک ہی ہیں ۔

جَنَّهُ اللَّيْلُ وَاَجَنَّهُ اللَّيْلُ دونوں لغتیں ہیں ۔ جَنَّهٗ اى سَتَرَهٗ بظلمته ۔ ومنه الجَنَّةُ وَالجِنَّة والجُنَّة والجنين والمِجَنُّ والجنُّ كله بمعنى الستر (قرطبی)

اصل الجنّ ستر الشئ عن الحاسة (راغب)

وجَنَّ سَتَرَ (جمل)

ج اور ن کے مادہ میں خفا اور پوشیدگی کا مفہوم بنیادی طور پر پایا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ چھپا لینا اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں ۔

كَوْكَبًا : رَاٰ كَوْكَبًا : انہوں نے ایک تارہ دیکھا ۔ كَوْكَبَ الْحَدِيْدُ لوہا چمک اُٹھا ۔

اَلْكَوَاكِبُ ظاہر ہونے والے ستارے ۔ ستاروں کو کواکب اسی وقت کہا جاتا ہے جب وہ ظاہر اور نمودار ہوں ۔ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ گویا وہ موتی کی طرح چمکتا ہوا تارہ ہے ۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِالْكَوَاكِبِ بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں سے زینت دی ۔ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ اور جب آسمان کے ستارے جھڑ پڑیں گے ۔

محاورہ ہے : ذهبوا تحت كل كوكب یعنی وہ منتشر ہو گئے ۔ (راغب)

اَفَلَ : فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۔

لیکن جب وہ ستارہ غروب ہو گیا تو بولے میں ڈوب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا ۔ یعنی جو ہستیاں خود غیر ثابت اور تغیر پذیر ہیں اُن کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ عزت و وقعت کی کیسے ہو سکتی ہے ۔ عدمِ محبت سیاقِ عبادت میں صاف عدمِ معبودیت کے مرادف ہے ۔

اَفَلَ يَاْفِلُ وَاَفَلَ يَاْفُلُ وَ اَفِلَ (سمع) سے اُفُوْلًا ۔ اَفَلَ الْقَمَرُ : چاند کا غروب ہونا ۔ صفت آفِلٌ جمع اُفَّلٌ واُفُوْلٌ ۔ تَاَفَّلَ : تکبر کرنا ۔ بھیڑ بکری کے چھوٹے بچے کو اِفال کہتے ہیں ۔ اور اونٹ کے کمزور اور چھوٹے بچے آفیل کہا جاتا

ہے۔ جمع افائل۔ الأفولُ : غیبوبۃ النیّرات کالقمرِ والنُّجوم (راغب)
اَفَلَ : غَابَ ۔(مدارک)
اَفَلَ یاْفِلُ اُفُولًا اذا غاب (قرطبی)
فی المصباح : اَفَلَ الشئُ اَفْلاً واُفُولاً من بابَیْ ضرب ونصر : غاب۔ ومنه اَفَلَ فُلانٌ عن البلدِ اذا غاب عنها (محل)

بَازِغًا : فَلَمَّا رَاَی الْقَمَرَ بَازِغًا
پھر جب چاند کو دیکھا چمکتے ہوئے۔
بَزَغَ یَبْزَغُ بَزْغًا وبُزُوغًا : بَزَغَتِ الشَّمسُ سورج نکلنا۔ کرّم سے اس کے معنی خوش طبعی اور ظرافت کے آتے ہیں۔ بَزَغَ الغُلامُ بَزْغَۃً خوش طبع ہونا۔ ظریف ہونا۔ صفت بَزِیْغٌ آتی ہے۔ بَزَغَ یَبْزُغُ بُزُوغًا اِذَا طَلَعَ (قرطبی)
بَازِغًا ای طالعًا منتشر الضوء (راغب)

نُوْحٌ : حضرت نوح علیہ السلام۔ جن کو حضرت آدم علیہ السلام کے بعد نبوت ورسالت سے سرفراز کیا گیا۔ صحیح مسلم باب شفاعت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے اس میں یہ تصریح ہے :

اے نوح تو زمین پر سب سے پہلا رسول بنایا گیا (قصص القرآن)

نوح بن لامک حضرت ابراہیم کے اجداد میں سے مشہور پیغمبر ہیں۔ توریت میں جو نسب نامہ درج ہے اس کے اعتبار سے حضرت ابراہیم حضرت نوح کی گیارہویں پشت میں ہیں تو آپ کا وطن وہی تھا جو تاریخ کے اس ابتدائی دور میں نسلِ انسانی کا وطن تھا یعنی عراق کا دوآبہ۔ دجلہ وفرات۔

آپ کا زمانہ قیاس وتخمینی طور پر ۲۹۴۸ ق م تا ۱۹۴۸ ق م سمجھا گیا ہے (ماجدی)

نوح۔ دراصل یہ نَاحَ یَنُوحُ کا مصدر ہے جس کے معنی بلند آواز کے ساتھ گریہ کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے : ناحَتِ الحمامۃُ نَوْحًا۔ فاختہ کا نوحہ کرنا۔ نوح کے اصل معنی عورتوں کے ماتم کدہ میں جمع ہونے کے ہیں اور تناوح سے مشتق ہے جس کے معنی تقابل کے ہیں۔ جیسا کہ جبلان متناوحان دو متقابل پہاڑ۔ ریحان متناوحان دو متقابل ہوائیں النوائح : نوحہ گر عورتیں المنوح : مجلسِ گریہ۔ (راغب)

حضرت نوح کی بعثت سے قبل تمام قوم خدا کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے یکسر ناآشنا ہو چکی تھی اور حقیقی خدا کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی۔ غیر اللہ کی پرستش اور اصنام پرستی کا دور تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت انہی کی ہدایت کے لئے کی گئی۔

دَاوٗدَ : وَمِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ وَاَیُّوْبَ وَیُوْسُفَ وَمُوْسٰی وَهٰرُوْنَ
حضرت داؤد علیہ السلام سلسلہ بنی اسرائیل کے اولوالعزم نبی اور رسول ہیں۔ انہوں نے شاہ وقت طالوت کی کمان میں جالوت جیسے جابر کو قتل کرکے اپنی شجاعت وصداقت کا سکہ

پوری قوم پر بٹھا دیا تھا۔ آگے چل کر خدا نے انہیں نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا۔ اور زبور کے نام سے ایک الہامی کتاب اُن ہی پر اُتری۔ یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد ہیں۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ان کا نسب نامہ یوں نقل کیا ہے:

داؤد بن ایسا (ایشی) بن عوبد بن عامر (یا عابر) بن سلمون بن نحشون بن عویناذب (یا عمی ناذب) بن ارم (یا رام) بن حصرون بن فارص بن یہودا بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام (قصص القرآن)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کا سن وفات ۹۲۲ ق م لکھا ہے۔ واللہ اعلم

سُلَیْمٰن: حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں۔ اس لئے ان کا نسب یہودا کے واسطے سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ قرآن عزیز میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر سولہ جگہ آیا ہے۔ ان میں چند جگہ کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ اور اکثر جگہ مختصر طور پر انعامات اور فضل و کرم کا تذکرہ ہے۔ جو خدا کی جانب سے ان پر اور اُن کے والد حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوتے رہے۔ قرآن پاک میں اُن کے والد جناب داؤد علیہ السلام کا نام بھی سولہ ہی مرتبہ مذکور ہے۔ حضرت سلیمان بن داؤد طبقہ انبیاء میں سے بڑی شان و شوکت کے بادشاہ گزرے ہیں۔ بیت المقدس کی تعمیر انہوں نے ہی کی۔ ان کا سن وفات ۹۳۲ ق م اندازہ کیا گیا ہے۔

داؤد عجمی نام ہے۔ عجمہ اور علمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے۔ داود لم ینصرف لانّہ اسمٌ اعجمیٌ (قرطبی)

اَیُّوْبَ: قرآن میں حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر چار سورتوں میں آتا ہے۔ ۱ سورۃ نساء ۲ انعام ۳ انبیاء ۴ ص۔ نساء اور انعام میں تو انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں نام مذکور ہے نساء میں وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ۔ اور انعام میں ہے۔ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ۔ سورۃ انبیاء اور ص میں مجمل تذکرہ ہے۔ اور صرف اس قدر قرآن پاک نے بتایا ہے۔ کہ اُن پر آزمائش اور امتحان کا ایک سخت وقت آیا اور مصائب و بلیات نے چہار جانب سے اُن کو گھیر لیا۔ مگر وہ صبر و شکر کے ماسوا حرف شکایت تک زبان پر نہیں لائے اور اُن کو خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا اور مصائب کے بادل دور کرنے کے لئے ان کو فضل و عطا سے مالا مال کر دیا۔ سفر ایوب میں ہے کہ ابتلا سے نجات پانے کے بعد ایوب (علیہ السلام) ایک سو چالیس سال زندہ رہ کر انتقال کر گئے (قصص القرآن)

آپ کا شمار انبیائے عرب میں ہے۔ مسکن شمال عرب میں علاقہ فلسطین کی مشرقی سرحد تھا۔

بائبلی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے پانچویں پشت میں تھے۔ اسرائیلی روایتوں میں آپ کی عمر ۲۱۰ سال بیان کی گئی ہے (ماجدی)

یُوسُفَ : حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں ملک کنعان میں پیدا ہوئے اور بعد کو مصر کے بادشاہ ہوئے۔ ان کا زمانہ عبدالماجد صاحب دریابادی نے ۱۹۱۰ق م تا ۱۸۰۰ق م لکھا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا نام قرآن عزیز نے چھبیس مرتبہ ذکر کیا ہے۔ جن میں چوبیس جگہ صرف سورۂ یوسف میں اور ایک جگہ سورۂ انعام اور ایک جگہ سورۂ غافر میں ذکر آیا ہے۔ اور ان کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ پردادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کے نام پر بھی قرآن عزیز کی ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ جو اُن کے واقعات سے متعلق عبرت و موعظت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔

مُوسٰی :

موسٰی بن عمران صاحب تورات۔ بنی اسرائیل کے نجات دہندہ مشہور ترین پیغمبر ۱۵۲۰ق م تا ۱۴۰۰ق م۔ جو لوگ لفظ موسٰی کو عربی مانتے ہیں ان کے نزدیک یہ موسی الحدید سے منقول ہے۔ جس کے معنی استرے کے ہیں اور اَوْسَيْتُ رَأْسَهٗ کے معنی میں ہے یعنی میں نے استرے سے اس کا سر مونڈھ ڈالا (راغب)

هٰرُوْنَ : ہارون بن عمران حضرت موسٰی کے بڑے بھائی۔ عمر میں تین سال بڑے۔ زمانۂ نبوت دونوں بھائیوں کا ایک ہے۔ ہارون یہ عجمی ہے۔ کلام عرب میں یہ مادہ مستعمل نہیں۔[1]

زَكَرِيَّا : قرآن عزیز میں حضرت زکریاؑ کا تذکرہ چار سورتوں میں اٹھارہ مرتبہ آیا ہے۔ آل عمران میں پانچ مرتبہ۔ انعام میں ایک مرتبہ سورۂ مریم میں دس مرتبہ۔ انبیاء میں دو مرتبہ ان میں سے سورۂ انعام میں تو صرف فہرست انبیاء میں نام ذکر کیا گیا ہے اور تین سورتوں میں مختصر تذکرہ منقول ہیں۔

تنبیہ :۔ قرآن عزیز جن زکریا علیہ السلام کا ذکر کر رہا ہے یہ وہ نہیں ہیں جن کا مجموعہ تورات کے صحیفہ زکریاؑ میں ہے۔ اس لئے کہ تورات میں جن زکریا کا تذکرہ ہے، ان کا ظہور (دارا یوس) دارا کے زمانہ میں ہوا ہے چنانچہ زکریا نبی کی کتاب میں ہے۔ دارا کے دوسرے برس کے آٹھویں مہینے میں خداوند کا کلام زکریا بن برخیا بن عدو کو پہنچا۔ اور دارا بن گشتاسپ کا زمانہ حضرت مسیح کی ولادت سے پانچ سو سال قبل ہے۔ کیونکہ وہ کیقباد بن کیخسرو کے انتقال کے بعد ۵۲۱ق م میں تخت نشین ہوا ہوا ہے۔ اور قرآن عزیز نے جن زکریا کا ذکر کیا ہے وہ حضرت مسیح کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے مربی اور حضرت مسیح کے معاصر ہیں۔ ان کے اور یحیٰی علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی

[1] راغب

نہیں ہے۔ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے والد ہیں۔ (قصص القرآن)

اسمٰعِیْل : یہ نام دو لفظوں اسمع اور ایل سے مرکب ہے عبرانی میں ایل اللہ کے مرادف ہے اور عربی کے اسمع اور عبرانی کے شماع کے معنی ہیں "سُن"۔ چونکہ اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم کی دعا سُن لی اور ہاجرہ علیہا السلام کو بشارت ملی۔ اس لیے ان کا یہ نام رکھا گیا۔ عبرانی میں اس کا تلفظ شماع ایل ہے۔ (قصص القرآن)

اِلْیَاس : قرآن عزیز میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۂ انعام کی آیت ۸۵ اور دوسرا سورۃ والصافات میں۔ سورۂ انعام میں تو صرف نام ذکر ہے۔ لیکن والصافات میں ان کے متعلق مختصر تذکرہ ہے۔ اکثر مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ حضرت ہارون کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ علامہ قرطبی نے ضحاک کا قول یہ نقل کیا ہے کہ الیاس علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ دوسری کتابوں میں ان کو الیاہ نبی کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ الیاس عربی نام نہیں ہے بلکہ عجمی ہے۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ الیاس اعجمیؐ۔

اَلْیَسَعَ : حضرت الیسع علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ ہیں۔ اوائلِ عمر میں انہی کی رفاقت میں رہے اور ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لئے حضرت یسع علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ قرآن پاک نے ان کا ذکر دو مرتبہ کیا ہے۔ دونوں جگہ مختصر نام ہی کا تذکرہ ہے۔ حالات اور دعوت و تبلیغ پر قرآن نے کوئی بحث نہیں کی۔ اَلْیَسَعُ : یہ نام بھی عجمی ہے اور اہل زبان نے اس کو دو طرح پڑھا ہے جمہور قُرّاء نے تو اَلْیَسَعَ یعنی لام کے سکون اور یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن قُرّاء کوفہ اور کسائی نے اَللَّیْسَعَ پڑھا ہے۔

یُوْنُسَ : حضرت یونس بن متیٰ نینوی (موجودہ نقشہ میں موصل) کے پیغمبر تھے۔ ان کا زمانۂ رسالت ۸۲۵ق م تا ۷۸۴ق م ہے۔ (ماجدی)

لُوْطًا : لوط بن ہاران۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ جہاں اب بحرِ لوط یا بحرِ مردہ واقع ہے، اسی کے کنارے آپ کی نافرمان، مجرم پیشہ قوم آباد تھی۔ اس کی ہلاکت عذابِ الٰہی سے کہا جاتا کہ ۲۰۶۱ق م واقع ہوئی۔ (ماجدی)

یہ لَاطَ الشئ بقلبی یَلُوطُ لَوطًا ولیطًا سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کی محبت دل میں جاگزیں ہو جانا۔ حدیث میں ہے: اَلْوَلَدُ اَلْوَطُ بِالْکَبِدِ کہ اولاد سے جگری محبت ہوتی ہے ھٰذا امرٌ لایَلْتَاطُ بِصَفَرِیْ یہ بات میرے دل کو نہیں بھاتی۔ لُطْتُ

الحوضَ بالطین لَوطًا : میں نے حوض کو گارے کا پلستر کیا۔ لیکن یہ اشتقاق اسی وقت صحیح ہوگا جبکہ اسم لوط عربی نام ہو۔ اور اگر یہ نام عجمی ہو جیساکہ ابراہیم اور اسحٰق تو پھر یہ اسم غیر مشتق ہوگا اور اس کا منصرف ہونا ساکن الاوسط ہونے کی وجہ سے ہے۔

قال النقاش لوط من اسماء الاعجمیۃ ولیس من العربی (قرطبی)

غَمَرَات : وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ۔

اَلْغَمْرُ کے اصل معنی کسی چیز کے اثر کو زائل کر دینے کے ہیں۔ اسی سے غَمْرٌ غَامِرٌ اُس زیادہ پانی کو کہتے ہیں جس کا سیلاب ہر قسم کے اثرات کو چھپا کر زائل کر دے۔ شاعر نے کہا ہے

وَالْمَاءُ غَامِرٌ خِدَادَھَا

اور پانی اپنے گڑھوں کو چھپانے والا تھا

اسی مناسبت سے فیاض آدمی اور تیز رو گھوڑے کو بھی غَمْرٌ کہا جاتا ہے۔ جس طرح تشبیہ کے طور پر اسے بحر کہدیا جاتا ہے۔ اور اس کثیر پانی کو بھی غَمْرَۃٌ کہا جاتا ہے جس کی انتہا نظر نہ آئے اور غَمْرَۃٌ جہالت کے لئے بھی ضرب المثل ہے۔ جو آدمی پر چھا جاتی ہے۔ اور اس کی عقل و معرفت کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ اور قرآن نے فَاَغْشَیْنٰھُمْ وغیرہ الفاظ سے اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قرآن پاک میں یہ لفظ تقریباً چار مرتبہ استعمال ہوا ہے: ۱ بَلْ قُلُوْبُھُمْ فِیْ غَمْرَۃٍ مِّنْ ھٰذَا وَلَھُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِکَ (المؤمنون)

۲ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ غَمْرَۃٍ سَاھُوْنَ

۳ فَذَرْھُمْ فِیْ غَمْرَتِھِمْ حَتّٰی حِیْنٍ

۴ وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ۔

غمرات جمع ہے۔ جس کے معنی شدائد اور سختیوں کے ہیں کیونکہ وہ بھی انسان پر ہجوم کر کے اس کو بدحواس کر دیتے ہیں۔ موت کے شدائد کو بھی غمرات اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی اس آخری وقت میں انسان کی زندگی کے اثرات کو زائل کرنے والے ہوتے ہیں اور آخرت کا غلبہ ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اشتدّ بہ حتّٰی غُمِرَ علیہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنی شدت ہوئی کہ آپ بے ہوش ہو گئے۔ یعنی بیماری کے اثرات نے آپ کو نڈھال کر دیا۔

یا اللہ میں تیرے سے ڈوب کر مرنے سے پناہ مانگتا ہوں۔ اعوذ بک من موت الغمر

ابو طالب کے بارے میں ارشاد ہے: وَجَدْتُّہٗ فِیْ غَمَرَاتٍ مِّنَ النَّارِ میں نے اس کو دوزخ کے گہرے مقاموں میں پایا۔ جن کی آگ نے

اس کو چھپا رکھا تھا۔ اور غُمْرَةٌ کے معنی زعفران ملنے کے آتے ہیں۔ کہتے ہیں تَغَمَّرْتُ بِالطِّيبِ میں نے اپنے چہرہ پر خوشبو ملی۔ یعنی زعفران لگایا۔ جنگ کی تیزی اور شدت کو بھی غمرۃ کہا جاتا ہے۔ غَمْرَةُ الْحَرْبِ شدت جنگ۔

غَمَرَاتُ الْمَوْتِ جَمْعُ غَمْرَةٍ وهى شِدَّةُ الْمَوْتِ وغَمْرَةُ كُلِّ شَىْءٍ كَثْرَتُهُ ومُعْظَمُهُ۔

فغَمَرَاتُ الْمَوْتِ عِبَارَةٌ عما يصيبهم هناك من انواع الشدائد (كبير)

فاصل الغمرة ما يغمر من الماء فاستعيرت للشدة الغالبة۔ (كشاف)

اصل الغمر: ازالة اثر الشئ ومنه قيل للماء الكثير الذى يزيل اثر سيله (راغب)

والغمرة الشدة واصلها الشئ الذى يغمر الاشياء فيغطيها۔ (قرطبى)

غَمْرَةٌ کی جمع غُمَرٌ آتی ہے۔

غَمْرَةُ الشئ سختی۔ اس کی جمع غَمَرَاتٌ وغِمَارٌ بھی آتی ہے۔ غُمَرُ النَّاسِ: لوگوں کی جماعت جس میں آدمی چھپ جائے اور اس کی انفرادیت کا اثر زائل ہو جائے۔ اغتمر الماء الشئ۔ پانی کا کسی چیز کو ڈبو دینا۔ ف عل غامِرٌ۔ بہت پانی۔ المغمور مفعول کا وزن ہے گمنام غیر مشہور آدمی۔

اَلْهُوْن: اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ آج تمہیں ذلت کا عذاب ملے گا۔

هَانَ يَهُوْنُ هَوْنًا: هَانَ الْاَمْرُ عَلَيْهِ کام کا آسان و نرم ہونا۔ کہتے ہیں هُنْ عندى اليوم۔ یعنی میرے پاس ٹھہرو اور آرام کرو۔

هَانَ يَهُوْنُ هُوْنًا وهَوَانًا ومَهَانًا ومَهَانَةً۔ هَانَ الرَّجُلُ: حقیر و ذلیل ہونا اور مسکین ہونا

اور هَوَّنَ تَهْوِيْنًا هَوَّنَ عَلَيْهِ الْاَمْرَ ہلکا کرنا۔ هَوَّنَ الشئ کسی چیز کو ہیچ جاننا۔

قرآن پاک میں لفظ هون دو طرح استعمال ہوا ہے ایک یہ کہ انسان کا کسی ایسے موقع پر نرمی اختیار کرنا جہاں اس کی سبکی نہ ہو یہ قابل ستائش ہے قرآن پاک نے اس کو ممدوح قرار دیا ہے۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم ہو کر چلتے ہیں۔ حدیث میں ہے: اَلْمُؤْمِنُ هَيِّنٌ لَيِّنٌ مومن متواضع اور نرم مزاج ہوتا ہے۔ يَمْشِىْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَوْنًا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نرمی اور آہستگی کے ساتھ چلتے تھے۔ اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا اپنے دوست سے درمیانی دوستی رکھو۔ اِمْشِ عَلٰى هِيْنَتِكَ نرمی سے چلو۔

دوسرا استعمال اس کا هَانَ يَهُوْنُ هُوْنًا ہے۔ جس کے معنی ذلت و رسوائی کے ہیں۔ یعنی دوسرا انسان مسلط ہو کر اسے نرم و سبکسار کر دے یہ قابل مذمت ہے۔ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ

فَاَخَذَتْهُمْ صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ (۴۱-۱۷)

وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۔
وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ (۲۲-۱۸)
هَانَ الامرُ علىٰ فلانٍ ۔
یعنی صلہ علیٰ کے ساتھ ۔ اس کے معنی کسی معاملہ
کے آسان ہونے کے ہیں ۔ وَهُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۔
یہ مجھے آسان ہے ۔ وَ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۔ اور تم اُسے
ایک ہلکی بات سمجھتے ہو

خَوَّلْنٰكُمْ ۔ وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ
وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۔ اور اپنے پیچھے چھوڑ آئے
جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا ۔
خَالَ يَخُوْلُ خَوْلًا وَخِيَالًا ۔ خَالَ المَوَاشِي
مویشی کی نگہبانی کرنا ۔ نگرانی کرنا ۔ خال فلانٌ علىٰ
اَهلِه ۔ اپنے اہل وعیال کے امور کا انتظام کرنا ۔
ان کے لئے کافی ہونا ۔ خَالَ يَخَالُ خَوَلًا
تنہائی کے بعد غلاموں والا ہونا (منجد)
اور خَوَّلَ تَخْوِيْلًا کے معنی ہیں کسی کو کوئی چیز عطا
کرنا ۔ مالک بنانا یا بخشنا ۔ تخویل کے اصل معنی
تو غلام وخدام عطا کرنے کے ہیں اور بعض کے
نزدیک تخویل کے معنی ایسی چیز کے عطا کرنے کے
ہیں جس کی نگہداشت کی ضرورت پڑے ۔ اور یہ
فلانٌ خَالُ مالٍ او خَائِلُ مَالٍ کے محاورہ سے
ماخوذ ہے ۔ یعنی فلاں مال کی خوب نگہداشت کرنے
والا ہے ۔ اور الخال اس کپڑے کو بھی کہتے ہیں
جو وحشی جانوروں کو ڈرانے کے لئے کھیت میں لٹکا
دیا جاتا ہے (ماخوذ از راغب)
خَوَّلْنٰكُمْ ای اعطیناکم و ملّکناکم
والخول ما اعطاه الله للانسان من
العبيد والنعم (قرطبی)

فَالِقُ : اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى
الفَلق کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے اور اس کے
ایک ٹکڑے کو دوسرے سے الگ کرنے کے ہیں ۔
محاورہ میں کہتے ہیں فَلَقْتُهٗ میں نے اسے پھاڑ دیا
فَانْفَلَقَ چنانچہ وہ چیز پھٹ گئی ۔
فَلَقَ يَفْلِقُ فَلْقًا ۔ فَلَقَ الشئَ ۔ پھاڑنا ۔
فَلَقَ اللّٰهُ الصُّبْحَ : رات کی تاریکی کو پھاڑ کر
صبح نمودار کی ۔ فَلَّقَ اور فَلَقَ دونوں کے ایک
ہی معنی ہیں ۔ تَفَلَّقَ اور انْفَلَقَ کے معنی ہیں پھٹنا
الفَلْق مصدر ہے بمعنی شگاف جمع فلوق
اور الفَلَقُ مخلوق ۔ تمام کائنات ۔
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۔
فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۔

حُسْبَانًا : وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۔ اور اُس نے
رات کو راحت کی چیز بنایا اور سورج اور چاند کو
حساب سے رکھا ہے ۔ یعنی مصالح خلق کے مطابق
ایسے حساب سے رکھا ہے کہ نہ اس میں کمی آئے نہ
زیادتی ۔ حُسبان بالضم یہ مصدر ہے ۔
حساب کرنے اور شمار کرنے کے معنی میں آتا ہے ۔
مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آفتاب و ماہتاب کے
طلوع وغروب اور ان کی رفتار کو ایک خاص حساب
سے رکھا ہے ۔ جس کے انسان سالوں، مہینوں،
دنوں اور گھنٹوں کا بلکہ منٹوں اور سیکنڈوں کا

حساب بآسانی لگا سکتا ہے۔
ومعنی حسباناً ای بحساب یتعلق بہ
مصالح العباد (قرطبی)
اخفش کا قول ہے کہ حسبان حساب کی
جمع ہے جیسے کہ شہاب کی شہبان۔ اور دیگر نحاۃ
کے نزدیک یہ مصدر ہے حَسَبَ یَحْسُبُ (ن)
حِسَبًا و حِسَابًا و حُسْبَانًا۔ گننا۔ شمار کرنا۔
حَسِبَ (س۔م) سے گمان کرنا۔ خیال کرنا اور
حَسُبَ (ک) حُسْبًا و حَسَابَۃً: شریف الاصل
ہونا۔ صفت حسیبٌ جمع حُسَبَاء۔ الحَسَبُ
مصدر اس کے معنی کافی ہونے کے آتے ہیں۔ کہتے
ہیں حسبك درھمٌ تم کو ایک درہم کافی ہے۔
حُسبان کے معنی نور اور روشنی کے بھی کئے گئے
ہیں حُسْبَانًا ای ضیاءً اور حسبان کے معنی
آگ اور عذاب کے بھی قرآن پاک نے بیان کئے ہیں۔ جیسا
کہ ارشاد ہے وَيُرْسِلُ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ
السَّمَاءِ۔ دراصل حسبان ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں
جس پر محاسبہ کیا جائے اور پھر اس کے مطابق
بدلہ دیا جائے۔ حدیث میں ہے: اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنَا
عذابًا وَحُسْبَانًا۔
وَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا
وانما هو في الحقيقة ما يحاسب عليه
فيجازى بحسبه (راغب)
وقال صاحب الكشاف: الحُسبانُ بالضم
مصدرُ حَسَبَ كما ان الحِسبان بالكسر
مصدر حَسِبَ ونظيره الكفران والغفران
والشكران۔ (کبیر)

مُسْتَقَرٌّ: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ
نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ۔
مستقر قرار سے بنا ہے۔ اس جگہ کو کہتے ہیں جو
کسی چیز کے لئے جائے قرار ہو اور مُسْتَوْدَع
وَدِيْعَةٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کو کسی کے
پاس عارضی طور سے چند روز رکھ دینے کے ہیں۔ تو
مُسْتَوْدَع اس جگہ کو کہا جائے گا جہاں کوئی چیز
عارضی طور پر چند روز رکھی جائے۔ (معارف)
ابن مسعود کے نزدیک مستقر سے مراد زمین میں ٹھہرنا ہے
اور مستودع سے مراد قبر میں ٹھہرنا ہے۔ اور
ابن عباس کا قول ہے کہ مستقر سے مراد دنیا ہے۔
حاصل یہ ہے کہ جس جگہ سے انسان منتقل ہو جائے
وہ اس کا مستقر تام نہیں ہو سکتا۔
قَرَّ فِي مَكَانِهٖ يَقِرُّ قَرَارًا (ض)
کے معنی کسی جگہ جم کر ٹھہر جانے کے ہیں۔ اصل میں یہ
قُرٌّ سے ہے جس کے معنی سردی کے ہیں جو سکون
کو چاہتی ہے۔ جیسا کہ اس کے برعکس حَرٌّ ہے
جس کے معنی گرمی کے ہیں اور یہ حرکت کو چاہتی
ہے۔ آیت کریمہ ہے: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ
اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔ بعض نے کہا ہے
کہ اصل میں یہ اِقْرَرْنَ ہے۔ ایک راء کو تخفیف
کے لئے حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ آیت
فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ کی اصل ظَلَلْتُمْ ہے
ایک لام کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے۔
اَلْقَرَارُ: جائے قیام، ٹھہرنے کی جگہ۔

بِئْسَ الْقَرَارُ : خطرناک جگہ، بُری قیام گاہ۔
مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ ۔ اس کو ذرا بھی قرار نہیں۔
یہاں قرار کے معنی ثبات کے ہیں۔
الإِقْرَارُ : کسی چیز کو ٹھہرا دینا۔ نُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ
ہم ارحام میں ٹھہراتے رہتے ہیں۔
اِسْتَقَرَّ فُلَانٌ قرار پکڑنے کا قصد کرنا۔ اور
اسْتَقَرَّ کبھی بمعنی قَرَّ بھی آجاتا ہے۔ جیسے
استجابَ بمعنی اَجَابَ۔ اور شرعًا اقرار یہ ہے
کہ آدمی پر جو دوسرے کا حق ہے اس کی خبر دے کہ
فلاں کا مجھ پر فلاں حق ہے۔
الاقرار فی الشرع هو اخبار بحق لآخر علیه
(التعریفات)

يَفْقَهُونَ : قَدْ فَصَّلْنَا الْآيٰتِ لِقَوْمٍ

يَّفْقَهُوْنَ ۝ ہم نے دلائل کھول کر بیان کر دیئے
ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔
لفظ یَعلَمُوْنَ اور یَفْقَهُوْنَ میں اہل علم نے
ایک لطیف فرق بیان کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جس
مقام پر آیات کی دلالت واضح ہو اور زیادہ دقتِ
نظر کی ضرورت نہ ہو وہاں قرآن پاک لفظ یعلمون
لاتا ہے اور جہاں دلالت خفی ہو اور دقتِ نظر کی
طالب ہو وہاں قرآن پاک میں لفظ یفقهون لایا جاتا ہے
اور راسخین فی العلم کو متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔
چنانچہ یہاں بھی سورہ انعام کی آیت ۹۷ کو
یَعْلَمُوْنَ پر ختم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی مراد میں واضح
اور صریح ہیں۔ اور آیت ۹۸ کو لفظ یَفْقَهُوْنَ پر
ختم کیا گیا ہے۔ چونکہ جن دلائلِ قدرت کو اس میں
ذکر کیا گیا ہے ان کی دلالت خفی ہے جو دقتِ نظر کی
طالب ہے۔ صاحبِ مدارک لکھتے ہیں : انما قیل
يَعْلَمُوْنَ ثُمَّ يَفْقَهُوْنَ هنا لانّ الدلالة
ثَمَّ اظهر وهنا أدق (مدارک)
الفقه : کے معنی علم حاضر سے علم غائب تک
پہنچنے کے ہیں اور علم سے اخص ہے
فَمَا لِهٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ
حَدِيْثًا (النساء آیت ۷۸) ان لوگوں کو
کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ (فتح محمد)
دوسرے مقام پر ارشاد ہے : وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ
تَسْبِيْحَهُمْ۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے
علم الفقہ : احکام شریعت کے جاننے کا نام
ہے فَقُهَ الرَّجُلُ فَقَاهَةً فقیہ بن جانا۔
فَقِهَ (س) فَقْهًا وَفَقَهَةً کسی چیز کو سمجھ لینا۔
لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ۔ تاکہ دین میں درک
حاصل کریں۔ تفقّه سے ہے جس کے معنی
علم دین میں گہری سمجھ پیدا کرنا ہیں۔
فَقِهَ فِقْهًا وتَفَقَّهَ الشيءَ اَوالكلامَ سمجھنا۔
کہا جاتا ہے : فَقِهَ عَنهُ الكلام اس نے اس کی
گفت گو کو سمجھ لیا اور فَقُہَ (ک) سے فقهًا
فَقُهَ الرَّجُلُ۔ علم میں غالب آنا۔ الفِقْهُ
مصدر ہے۔ اَلفَقِيْهُ بہت ذکی اور سمجھدار عالم۔
جمع فُقَهَاء۔
الفقهُ : هو التوصّلُ الى علمٍ غائبٍ بعلمٍ
شاهدٍ وهو اخصّ من العلم (راغب)

خَضِرًا : فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا۔

نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا - خَضِرَ يَخْضَرُ خَضَرًا سبز ہونا - خَضَرَ الزرعُ : کھیتی کا سرسبز و شاداب ہونا - خَضَرَ يَخْضُرُ (ن) - خَضَرَ النخل : کاٹنا - اَخْضَرَ الرَّبِيْعُ النَّبَاتَ : سیرابی کا نباتات کو سبز و شاداب کر دینا - قرآن پاک میں ہے : فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً تو زمین سبز ہو جاتی - ثِيَابًا خُضْرًا : سبز رنگ کے کپڑے، خُضْرًا کا واحد اخضر ہے - الخُضْرَةُ : ایک قسم کا رنگ ہوتا ہے جو سفیدی اور سیاہی کے درمیان ہوتا ہے - مگر سیاہی غالب ہوتی ہے - اسی وجہ سے اَخضر اور اسود ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں - اِخْضَرَّ اللیلُ رات سیاہ ہو گئی اَخضرَ الزَّرْعُ کھیتی سبز ہو گئی - اور خُضْرَةٌ کی جگہ دُهْمَةٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے - حدیث میں ہے : اِيَّاكُم وخضراء الدِّمَن تم کوڑے کی سبزی سے بچو - یعنی ایسی عورت سے نکاح کرنے سے جو بظاہر تو خوبصورت ہو مگر سیرت کے اعتبار سے بدخُلق ہو - المُخَاضَرَةُ کچے پھلوں اور سبزیوں کی بیع کرنا - حدیث میں ہے : نهى عن المخاضرة - آپ نے کچے پھلوں کے بیچنے سے منع کیا ہے - کیونکہ ہو سکتا ہے کہ باغ پر کوئی آفت آجائے - اور مشتری کا نقصان ہو جائے -

الخَضِر : در اصل تمام قسم کے پھلوں اور سبزیوں کو کہا جاتا ہے - امام قرطبی فرماتے ہیں : الخضر: رطب البقول (قرطبی) بعض حضرات نے کہا ہے کہ خَضِر کا لفظ قرآن پاک میں خاص کھیتوں کے لئے بولا جاتا ہے اور عام لوگوں کی کلام میں خضر سے مراد سبزیاں اور ترکاریاں ہوتی ہیں

و قال اللیث : الخضر فی کتاب اللہ هو الزرع و فی الکلام کل نبات من الخضر - (کبیر)

قِنْوَان : قَنَىٰ يَقْنُو قَنْوًا و قُنْوَانًا و قُنُوًّا و اقتنى المالَ : جمع کرنا، اپنے لئے خاص کرنا - قَنَا يَقْنُو قَنْوًا - قَنَا اللّٰهُ الشئ : پیدا کرنا - قَنَا لَوْنُ الشئ : نہایت سُرخ ہونا - قَنَىٰ يَقْنِي و قَنِيَ يَقْنَى و قَنِيَ (س) قَنْوًا قَنَىٰ و قَنَّىٰ (تفعیل) و اَقْنَىٰ (افعال) و استقنیٰ (استفعال) الحیاءَ شرم و حیا کو لازم پکڑنا - قَنْوٌ : کے معنی ہیں جمع کرنا - کمانا - پیدا کرنا - لازم کرنا قَنًا: بلند ہونا اور اِقناء : بارش کا بند ہونا - عطا کرنا - القِنْو اور القُنْو کے معنی ہیں کھجور یا انگور کا خوشہ - اس میں جمع اور تثنیہ کا وزن قِنْوَان آتا ہے - فرق صرف یہ ہے کہ جمع میں نون مرفوع اور تثنیہ میں مکسور ہوتا ہے -

قناة : نیزے کی لکڑی اور برچھ کو بھی کہتے ہیں چونکہ یہ بھی قِنو کے مشابہ ہوتے ہیں - وہ نالی جس میں پانی بہتا ہوا اس کو طول میں نیزے کی لکڑی کے ساتھ تشبیہ دے کر قناۃ کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل قَنَيْتُ الشئ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کا ذخیرہ کرنے اور جمع کرنے کے ہیں - اور نالی میں چونکہ پانی جمع ہوتا ہے اس لئے اس کو قناۃ کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک یہ قَانَاهُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مل جل جانے کے ہیں

اور قنا جس کے معنی ناک کے بلند ہونے کے ہیں، وہ بھی قنا بمعنی نیزے سے ماخوذ ہے۔ حدیث میں ہے کان النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم اقنی العرنین آپ بلند بینی تھے۔ محیط میں ہے قَنَاَنِیْ الانف کہ ناک کا اوپر کا حصہ بلند ہو اور درمیانی حصہ محدّب ہو۔ مرد کو اقنی الانف اور عورت کو قَنْوَاءُ کہتے ہیں۔ کعب ابن زہیر کا شعر ہے

قنواءُ فی حُرَّتَیْهَا للبصیر بها
عتقٌ مبین وفی الخدّین تسهیلٌ

لمبی ناک والی اس کے دیکھنے والے کو آزادی اور شرافت معلوم ہوتی ہے اس کے رُخسارے بھرے ہوتے ہیں۔ یعنی برابر ہموار نہ کہ پھولے ہوئے۔ گویا قنوار کے معنی لمبی ناک والی کے ہیں۔

اَقْنَاءٌ بھی قِنْوٌ کی جمع ہے۔ حدیث میں : انہ خرج فرأی اقناءً معلّقۃً قنو منها حَشَفٌ آپ برآمد ہوئے تو آپؐ نے کھجوروں کے چند خوشے لٹکے ہوئے دیکھے، ایک خوشہ اُن میں سے خراب تھا۔

سورہ نجم میں ہے : وَاَنَّهٗ هُوَاَغْنٰى وَاَقْنٰى اور یہ کہ وہی غنی کرتا ہے اور پھر وہی اس سرمایۂ غنی کو باقی رکھتا ہے۔ یعنی دھن دولت دیتا بھی ہے اور پھر اس کو باقی بھی وہی رکھتا ہے۔ کسی غیر خدا کو نہ دینے میں دخل نہ باقی رکھنے میں شرکت۔

قِنْوَانٌ دَانِیَۃٌ کھجوروں کے لٹکے ہوئے گچھے۔ عرب کے مالدار ہونے کی علامت کھجوروں کی کثرت تھی نخلستان ان کی مالداری کا جزوِ اعظم تھے۔ اس اعتبار سے قِنَی کے معنی مالدار ہونے اور خوش ہونے کے ہوگئے۔ خواہ کسی ذریعہ سے مال و مسرت کا حصول ہو۔ ایک کہاوت مشہور تھی : من اُعطی مائۃ من المعز فقد اُعطی القِنٰی ومن اُعطی مائۃ من الابل فقد اُعطی المُنٰی۔ جس کو سو بکریاں مل گئیں اس کو دولت مل گئی اور جس کو سو اونٹ مل گئے اس کی تو سب مرادیں ہی پوری ہوگئیں (لسان)

القِنْوُ : العِذق (راغب) والقنوان جمع قِنْوٍ (قرطبی۔ کشاف)

قناء الحائط : دیوار کی وہ جانب جس پر سایہ آجاتا ہو۔ اور القَنْوَۃُ : کمائی۔

تنبیہ : سورہ نجم کی آیت میں جو لفظ اَقْنٰى آیا ہے یہ باب افعال کے مادہ اِقناء سے ہے۔ اس کی اصل قَنیٌ ہے یعنی یہ ناقص یائی ہے۔ القُنْیَۃُ : جو کچھ آدمی کمائی سے حاصل کرے

یَنْعِهٖ : اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ اس کے پھل کی طرف دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو۔ مطلب یہ ہے کہ اس نظام کی طرف فکر و عبرت کی نگاہ سے دیکھو کہ درختوں پر پھل کیونکر لگتا اور پکتا ہے ای اُنظُر نظر الاعتبار لا نظر الابصار المجرّد عن التفکر (قرطبی)

یَنَعَ، یَنْعٌ، یُنُوْعٌ پک جانا۔ توڑنے کے لائق ہوجانا۔ یَنْعٌ اور یَنْعَۃٌ سرخ عقیق۔ دم یانع : سُرخ ہونا۔ حدیث میں ہے : ان جاءت به اُحَیْمَرَ مثل الیَنَعَۃِ

اگر چھوٹا سُرخ بچہ عقیق کی طرح جنے۔
مِنَّا مَنْ اَيْنَعَتْ ثَمَرَتُهٗ فَهُوَ يَهْدِبُهَا
بعض لوگ تو ہم میں ایسے ہیں کہ ان کا میوہ پک گیا وہ اس کو چن رہے ہیں۔ حجّاج نے خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اِنِّیْ اَرٰی رُؤُسًا قَدْ اَيْنَعَتْ وَحَانَ قِطَافُهَا۔ میں دیکھتا ہوں کہ بہت ساری کھوپڑیاں پک چکی ہیں اور ان کے کاٹنے کا وقت قریب ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سے قابلِ قتل ہیں۔
ینیع اور یَانِع کے معنی ہیں پختہ۔ پکا ہوا۔
محاورہ ہے اَلتَّمْرُ يَانِعٌ وَالنَّاطُوْرُ غَيْرُ مَانِعٍ کھجور پختہ اور تیار ہے اور نگہبانِ باغ کا روکتا نہیں
يَنَعَ يَيْنَعُ (ف) وَيَيْنِعُ (ض) مصدر يَنْعًا وَيُنْعًا وَيُنُوْعًا۔ ینع وایبنع اِيْنَاعًا (افعال) پھل کا پکنا۔ صیغہ صفت یانع جمع يَنْعٌ۔
اليُنُوْعُ خون کی سُرخی۔
اِلٰى يَنْعِهٖ ای الٰی حَالِ نَضْجِهٖ۔ قیل ھو جمع یانع کتَاجِرٍ جمع تَجْرٍ (مظہری)
يَنِيْعٌ اور يَانِعٌ پختہ۔
يَنَعَ وَاَيْنَعَ اِذَا نَضَجَ وَاَدْرَكَ (قرطبی)

اَلْاَبْصَارُ : لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔

اَبْصَارٌ: بَصَر کی جمع ہے جس کے معنی ہیں نگاہ اور دیکھنے کی قوت اور ادراک کے معنی ہیں پالینا۔ پکڑ لینا۔ احاطہ کرلینا۔ حضرت عباس رض نے اس جگہ ادراک کی تفسیر احاطہ کرلینا بیان فرمائی ہے۔

اَبْصَارٌ : آنکھیں بینائیاں۔ بَصَرٌ کا لفظ آنکھ اور بینائی دونوں پر بولا جاتا ہے اور بینائی چاہے آنکھ کی ہو یا دل کی دونوں کو بَصَرٌ کہا جاسکتا ہے۔ عام طور پر سر کی آنکھوں سے دیکھنے پر جو لفظ بولا جاتا ہے وہ بَصَرٌ ہے اور قلب کی قوتِ نورانیہ سے حقائقِ اشیاء اور ان کے بواطن کو پالینے پر لفظ بصیرۃ بولا جاتا ہے۔
آیت کے معنی یہ ہوئے کہ ساری مخلوقات جنّ و انس اور ملائکہ تمام حیوانات کی نگاہیں مل کر بھی اللہ جل شانہ کو اس طرح نہیں دیکھ سکتیں کہ یہ نگاہیں اس کی ذات کا احاطہ کرلیں اور اللہ تعالیٰ پوری طرح تمام مخلوقات کو دیکھتے ہیں۔
بَصَرَ يَبْصُرُ وَبَصِرَ يَبصَرُ بَصَرًا وَبَصَارَةً دیکھنا۔

لَطِيْفٌ : لطیف عربی لغت کے اعتبار سے دو معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے ایک بمعنی مہربان اور دوسرے بمقابل کثیف کے۔ یعنی وہ چیز جو حواس کے ذریعے محسوس و معلوم نہ ہوسکی ہو۔

خَبِيْرٌ: خبیر کے معنی ہیں باخبر۔ تو اس جملے کے معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ لطیف ہیں اسلئے حواس کے ذریعہ ان کا ادراک نہیں کیا جاسکتا اور خبیر ہیں اسلئے کہ ساری کائنات کا کوئی ذرّہ ان کے علم و خبر سے باہر نہیں ہے۔
یعنی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ لِاَنَّهٗ لَطِيْفٌ

وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ لِاَنَّهٗ خَبِيْرٌ

(قالہ المظہری)

اور اگر اس جگہ لطیف کے معنی مہربان کے لئے جاویں تو وہ اشارہ اس طرف ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ ہمارے ہر قول و فعل بلکہ ارادہ اور خیال سے بھی باخبر ہیں جس کا اقتضاء یہ تھا کہ ہم گناہوں کی پاداش میں پکڑے جاتے مگر چونکہ وہ مہربان ہے اس لئے وہ ہر گناہ پر مواخذہ نہیں کرتا۔

لفظ الطیف کی لغوی تحقیق لَطَفَ يَلْطُفُ لُطْفًا نرمی۔ مہربانی۔ شفقت۔

اللطیف من الکلام دقیق اور بامعنی کلام۔

اللطیف: اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے کائنات کا نشوونما اس قدر مخفی طور پر انجام دینے والا کہ محسوس بھی نہ ہو

لَطَفَ بِهٖ لُطْفًا وَ لِطْفًا۔ مہربانی کرنا۔

لَطَفَ اللّٰهُ بِالْعَبْدِ توفیق دینا۔

لَطُفَ لَطَافَةً (ک) چھوٹا ہونا۔ باریک ہونا صفت (اللطیف) لَطُفَ كَلَامُهٗ کلام کا نرم ہونا لَطَفَ الشَّيْءَ نرم بنانا۔

لطف اور لطافت سے مراد کبھی حرکت خفیفہ اور دقیق امور کا سرانجام دینا ہوتا ہے اور لطائف سے مراد وہ امور ہوتے ہیں جن کا ادراک انسان حواس سے نہ کر سکتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے لطیف ہونے کے معنی یا تو یہ ہیں کہ وہ انسانی حواس کے ادراک سے مافوق اور بالاتر ہیں اور یا اس کو اس لئے لطیف کہا جاتا ہے کہ وہ دقیق امور تک واقف ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذات اقدس کو لطیف اس لئے کہا جاتا ہو کہ وہ اپنے بندوں کو ہدایت دینے میں نہایت نرم انداز اختیار کرتا ہے۔ اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ: خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ: میرا رب جو کچھ چاہتا ہے حسن تدبیر سے کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کام کو حسن تدبیر سے سرانجام دیتے ہیں

اللُّطْفُ فِي الْفِعْلِ: الرفق فيه۔ واللُّطْفُ من اللّٰه تعالى التوفيق والعِصمة (قرطبی)

فی القاموس هو البَرُّ بعباده المُحْسِنُ الٰى خلقه بايصال المنافع اليهم۔

اللطفُ: الرِّفق فى العمل۔ هو لطيفٌ بعباده اى رؤوفٌ (مقاییس)

بَصَائِر: قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ لفظ بَصَائِر بَصِيْرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں عقل و دانش یعنی وہ قوت جس کے ذریعے انسان غیر محسوس چیزوں کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ بَصَائِر سے مراد آیت میں وہ دلائل اور ذرائع ہیں جن سے انسان حق اور حقیقت کو معلوم کر سکتا ہے۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس حق بینی کے ذرائع اور وسائل پہنچ چکے ہیں یعنی قرآن آیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آئے، آپ کے معجزات آئے

(معارف القرآن)

بصیرۃ کا استعمال صرف دل کی بینائی کے لئے ہوتا ہے

آنکھ سے دیکھنے اور نظر کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔
(لغات القرآن)

بصائر : الحجج البینۃ التی یحصل بہا البصیرۃ (مظہری)

بصائر : عبرت آموز دلائل۔ مظاہر قدرت ای آیات و براھین یبصر بہا و یستدل۔ جمع بصیرۃ وھی الدلالۃ (قرطبی)

تَسُبُّوا : وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ

سَبَّ یَسُبُّ سَبًّا۔ سَبَّۃٌ : سخت گالی دینا۔ مقعد میں نیزہ مارنا اور السَّبُّ گالی دینے والا السَّبِیْبُ مصدر ہے جس کے معنی ہیں بہت گالی اور مغلظات بکنا۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے : جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو اپنی حاجتوں میں پکارتے ہیں ان کو بُرا نہ کہو کیونکہ یہ لوگ بھی از راہِ جہالت خدا کو بُرا کہیں گے۔ ان کے اللہ کو گالیاں دینے کا یہ معنی نہیں کہ وہ صریح الفاظ میں خدا کو (معاذ اللہ) گالیاں دیں گے۔ کیوں کہ اس طرح کوئی مشرک نہیں کرتا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ جوش میں آکر شانِ الٰہی میں گستاخی کریں گے اور ایسے الفاظ کہیں گے جو عظمتِ باری کے خلاف ہوں گے۔

السَّبُّ : الشَّتْمُ الوَجِیْعُ (راغب)

زُخْرُف : یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے ہیں دھوکہ کے لئے تاکہ لوگوں کو فریب دے کر

الزخرف : اصل میں اُس زینت کو کہتے ہیں جو ملمع سے حاصل ہو۔ اسی سے سونے کو بھی زخرف کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ زیبائش کے کام آتا ہے قرآن میں ہے اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَہَا زمین سبزہ سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ یا آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھر ہو۔ زُخْرُفَ الْقَوْلِ کے معنی ہیں ملمع کی ہوئی باتیں۔ اصل میں زخرف الکلام ان باتوں کو کہتے ہیں جو بظاہر تو چرب اور عمدہ معلوم ہوتی ہوں مگر درحقیقت وہ غلط اور جھوٹ ہوں جیسے کہ الف لیلہ اور قصہ امیر حمزہ وغیرہ۔

حدیث میں ہے : لم یدخل الکعبۃ حتی اَمَرَ بالزُّخْرُفِ فَنُحِّیَ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں اس وقت تک داخل نہیں ہوئے جب تک آپ کے حکم سے مورتیں اور نقش جو سونے کے پانی سے بنائے گئے تھے مٹا نہ دیئے گئے۔

حدیث ہی میں آپ کا ارشاد ہے :۔ نَھٰی ان تُزَخْرَفَ الْمَسَاجِدُ آپ نے مساجد کو سونا چڑھا کر آراستہ کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ مساجد کی غیر ضروری آرائش سے نماز میں خلل واقع ہوتا ہے۔ وکل شئ حسنٍ مُمَوَّہٍ فھو زُخْرُفٌ
(قرطبی)

زخرف القول یعنی باطل القول۔
والزخرف ھو الباطل من الکلام الذی قد زین ووشی بالکذب (بغوی)

زَخْرَفَہٗ خوبصورت بنانا آراستہ کرنا۔ زخرف الکلام

باتوں کو جھوٹ سے آراستہ کرنا۔
زخرف الارض : زمین کی سبزیوں کے رنگ
الزخارف : کشتیاں ۔ زخارف الماء : پانی کے راستے۔
المزخرف : المزین (فتح القدیر)
الزخرف : الزینۃ المزوقۃ ومنہ قیل للذہب زخرف (راغب)

تَصْغٰی : وَلِتَصْغٰٓی اِلَیْہِ اَفْئِدَۃُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ

الصَّغْوُ : کے معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔
صغت النُّجُوْمُ والشمس : ستاروں کا مائل بغروب ہونا۔
صغا یصغو ویصغی صَغْوًا وصَغِیَ یَصْغٰی صَغًی وصُغِیًّا۔ صفت صَغْواء جمع صَوَاغٍ مائل ہونا باب افعال بھی اسی سے استعمال کیا گیا ہے۔
اصغٰی اصغاء : اصغٰی الی حدیثہ کسی کی بات کی طرف کان لگانا۔ صغیتُ الاناء واصغیتہ برتن کو جھکا دینا۔ ایک طرف کو مائل کر دینا۔
اسی سے ہے صاغیۃ الرجل آدمی کے نوکر چاکر۔ حمایتی۔ طرفدار۔ کہتے ہیں : اکرموا فلانًا فی صاغیتہ۔ یعنی اس کی قوم میں عزت کرو۔ اور الصِّغو (بکسر الصاد) کنویں کا کنارہ چمچہ کا گڑھا اور الصَّغْوُ کے معنی تالو یا آنکھ میں کجی کے ہیں۔ وَ لِتَصْغٰی اِلَیْہِ اَفْئِدَۃُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ اور وہ (ایسے کام) اس لئے بھی کرتے تھے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اِن کے دل اُس کی طرف مائل رہیں (ولتصغٰی الیہ) ولتمیل الیہ (ابن کثیر)
الصَّغوُ : المیل (راغب) تصغی تمیل اصلہ المیل الی الشئ بغرض من الاغراض ومنہ صغت النُّجُوْمُ : مالَتْ لِلغُرُوْبِ
وقال صاحب الکشاف : ای ولتمیل الی ما ذکر من عداوۃ الانبیاء و وسوسۃ الشیاطین
الصغو فی اللغۃ معناہ المیل (کبیر)

یَقْتَرِفُوْا : وَلِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ

اور تاکہ یہ مرتکب ہونے لگیں اُس کے جس کے یہ مرتکب ہو رہے ہیں۔
القَرفُ اور الاقترافُ دونوں کے اصل معنی درخت سے چھال اتارنے اور زخم کا چھلکا اتارنے کے ہیں۔ اور القِرفُ من الارض وہ مٹی جو سبزی وغیرہ اکھاڑتے وقت زمین سے الگ ہو کر سبزیوں کی جڑوں کے ساتھ لگ جاتی ہے۔
ابن فارس نے مقاییس اللغہ میں قَرفٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کا خلط ملط ہو جانا اور کسی چیز کو اوپر ڈال لینا۔ پہن لینا بیان کئے ہیں۔ اور رَجُلٌ قُرَفَۃٌ کماؤ مرد۔ اور جو کھال اور چھلکا اتارا جاتا ہے اس کو قِرفٌ کہا جاتا ہے۔ اور اقتراف باب افتعال، کمانے اور اکتساب کے معنی میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور اکتساب حسن اور سیئ دونوں کے لئے آیا ہے۔ البتہ برے اکتساب کے معنی میں یہ زیادہ استعمال ہوتا ہے۔
کہتے ہیں الاعترافُ یُزِیل الاقتراف کہ اعتراف جرم

[1] قرطبی

جرم کو مٹا دینا ہے۔ قرآن پاک میں ہے :
سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ وہ عنقریب اپنے
کئے کا بدلہ پائیں گے۔ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا
اور جو مال تم کماتے ہو۔

بُرے اکتساب کے معنی کے اعتبار سے لفظ قرف
کسی پر تہمت لگانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے
قرفتُ فُلَانًا بكذا۔ میں نے فلاں پر تہمت
لگائی۔ قَرَفَ يَقْرُفُ قَرْفًا۔ قرف لِعِيَالِهٖ
اہل وعیال کے لئے کمانا اور جب اس کا صلہ علیٰ
ہو تو معنی بغاوت اور دشمنی کے ہوتے ہیں۔ قَرَفَ
عَلَى القَوْمِ۔ قوم کے خلاف بغاوت کرنا
قَرَفَ الرَّجُلُ۔ جھوٹ بولنا۔ اقترف المال
مال حاصل کرنا اقترف الذنب گناہ کا ارتکاب
کرنا۔ عن ابن عباس وَلِيَكْتَسِبُوْا مَا هُمْ
مَا هُمْ مُكْتَسِبُوْنَ۔
وقال السُّدی وابن زید وَلِيَعْمَلُوا مَا
هُمْ عَامِلُوْنَ (ابن کثیر)

الاقتراف : هو الاكتساب (کبیر)
ابن عباس۔ سُدّی اور ابن زید سے بھی یہی معنی
منقول ہیں۔ يقال خَرَجَ يَقْتَرِفُ اَهْلَه اى
يَكْتَسِبُ لَهُمْ۔ واصله اقتطاع قِطْعَةٍ
من الشئ (قرطبی) حدیث میں ہے :
ان كُنْتِ قَارَفْتِ ذَنْبًا فَتُوْبِي اِلَى اللهِ
یہ کلمات جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
حضرت عائشہؓ سے اس وقت فرمائے جب منافقین
نے ان پر تہمت لگائی۔ کہ اے عائشہ اگر تیرے
سے گناہ ہو گیا ہو تو خدا سے معافی مانگ لے۔
سورۂ نور کا نزول اسی واقعے سے تعلق رکھتا ہے۔

مُبَدِّلَ : لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔

مبدّل تبدیل سے ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک
چیز کو دوسری جگہ رکھنا۔ یہ عوض سے عام ہے
کیونکہ عوض میں پہلی چیز کے بدلہ میں دوسری چیز
لینا شرط ہوتا ہے۔ لیکن تبدیل مطلق تغیّر
کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام
کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ بدلنے کی صورتیں
مختلف ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی اس میں
غلطی ثابت کر دے اس لئے اس کو بدل دیا
جائے۔ دوسری یہ کہ کوئی دشمن زبردستی اس
کو بدل ڈالے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام ان سب سے
بلند و بالا ہے۔ اس کا خود وعدہ ہے :
اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود حق
تعالیٰ کی طرف سے اس کو منسوخ کر کے بدل دیا
جائے۔ سو انقطاع وحی کے بعد اس کا بھی کوئی
احتمال نہیں۔ اس لئے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ
نے فرمایا اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے
کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر ہیں اور قرآن
آخری کتاب ہے اس کے بعد تنسیخ کا کوئی احتمال
نہیں۔ مبدّل : باب تفعیل سے فاعل کا
صیغہ ہے۔ تبدیل مصدر ہے۔

تبدّل۔ تبدیل۔ ابدال۔ استبدال۔
سب کا معنی ہے تغیّر حالت۔ خواہ اس طرح ہو

کہ اصل چیز باقی رہے صرف حالت بدل جائے یا اصل چیز ہی بدل جائے وہ جاتی رہے اس کے بدلے دوسری چیز آجائے۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ۔ ظالموں نے اصل بات بدل دی اس کی جگہ دوسری بات لے لی۔

يَخْرُصُوْنَ: اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ یہ تو بس اٹکل ہی کی پیروی کرتے ہیں اور محض گمان میں پڑے رہتے ہیں۔ وحی الٰہی کے نور مبین علم قطعی کے سوا دنیا میں عقل و علوم کے نام سے جو کچھ بھی ہے۔ چاہے وہ ارسطو کی منطق ہو، چاہے کینٹ کے مقولات۔ سب ظن و تخرص ہی کے حکم میں داخل ہیں (ماجدی)

خَرْصٌ: جھوٹ بولنا۔ گمان سے بات کہنا اندازہ کرنا۔ بند کرنا۔ درست کرنا۔ خَرِصٌ: بھوکا ہونا۔ خَرَّاصٌ: جھوٹا۔ کذاب۔ خُرْصٌ: شاخ، چھڑ، نیزہ۔ جمع خِرْصَانٌ۔

خَرَصَ يَخْرُصُ خَرْصًا: جھوٹ بولنا۔

خَرَصَ فِي الْاَمْرِ: تخمینہ لگانا۔ اندازہ سے بات کہنا۔ خَرَصَ النَّخْلَةَ: اس نے درخت خرما پر کھجوروں کا اندازہ کیا۔ تخمینہ لگایا۔ خرص الشیٔ درست کرنا۔ مصدر الخَرْصُ: اندازہ۔ تخمینہ کہتے ہیں کم خرص ارضك تمہاری زمین کا اندازہ اور تخمینہ کیا ہے۔ الخَرْصُ: اصل میں ہر وہ بات ہے جو ظن اور تخمینہ سے کہی جاتی ہے عام اس سے کہ وہ اندازہ صحیح ہو یا غلط۔ کیونکہ تخمینہ کرنے والا نہ تو علم یا غلبۂ ظن سے بات کرتا ہے اور نہ سماع کی بناء پر کہتا ہے بلکہ اس کا اعتماد گمان پر ہوتا ہے۔ جیساکہ تخمینہ کرنے والا پھلوں کا تخمینہ کرتا ہے۔ اور پھر اس طرح کی اٹکل پچو باتوں کو کذب اور کرنے والے کو جھوٹا کہتے ہیں۔ اگرچہ اٹکل باز کی بات واقع کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔

عام طور پر لفظ خرص پھلوں کے اندازہ کرنے پر بولا جاتا ہے اور جن پھلوں کا اندازہ کیا جاتا ہے ان کو خِرْصٌ کہتے ہیں۔ یہ بمعنی مَخْرُوْصٌ ہے۔ جیسے کہ نقضٌ بمعنی منقوض۔

اس اٹکل اور اندازے میں چونکہ خطا اور غلطی کا امکان ہوتا ہے اس لئے کذب کو بھی خَرْص کہتے ہیں۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ اٹکل وگمان سے باتیں بنانے والے مارے جائیں گے۔ اس سے واضح ہوا کہ قرآن کریم کی کوئی تعبیر بھی جو حدیث نبوی سے ثابت نہ ہو خرص میں داخل ہے۔

اصل الخرص: الحزر والتخمين ومنه خرص النخلة وسُمّي الكذبُ خرصًا بما يدخله من الظنون الكاذبة (جمل)

واصل الخرص: القطع ومنه خرص النخلة يخرص اذا حزره ليأخذه منه الزكوٰة فالخارص يقطع بما لا يجوز القطع به اذ لا يقين منه۔ (فتح القدير)

صَغَارٌ: سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ۔ جو لوگ مجرم ہیں انہیں ضرور اللہ

کے پاس پہنچکر ذلّت نصیب ہوگی اور عذاب سخت بھی۔ اس شرارت کی پاداش میں جو وہ کیا کرتے تھے۔ یعنی ایسے سرکشوں کو حشر میں ذلّت تو نصیب ہوگی ہی اس کے علاوہ عذاب شدید بھی ان کا حصّہ ہے۔ لفظ صغارٌ حاصل مصدر ہے جس کے معنی ہیں ذلّت ورسوائی۔ معنی اس جملے کے یہ ہیں کہ یہ حق کے مخالف جو آج اپنی قوم میں بڑے اور رئیس کہلاتے ہیں، عنقریب اِن کی بڑائی اور عزت خاک میں ملنے والی ہے۔ اور خدا کی جانب سے ان کو آخرت میں بھی اور دنیا میں عذاب عظیم ملنے والا ہے۔ لفظِ صِغر اور کِبر ایک دوسرے کے متضاد اور مقابل ہیں، ایک دوسرے کے اعتبار سے ان کا استعمال ہوتا ہے۔ ایک ہی شے اپنے مافوق کے اعتبار سے بڑی اور ماتحت کے اعتبار سے چھوٹی ہوسکتی ہے۔ صِغر اور کِبر کا لفظ کبھی زمان اور عمر کا اعتبار کرکے بھی بولے جاتے ہیں۔ جس کی عمر زیادہ ہو اس کو کبیر اور جس کی عمر کم ہو اس کو صغیر کہتے ہیں۔ اور کبھی جُثّہ کا اعتبار کرکے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور قدر و منزلت کے اعتبار سے بھی اس کا استعمال عام ہے۔ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ اور لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا اسی طرح وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ ان تمام آیات میں قدر و منزلت میں صِغر و کِبر مراد ہے صَغِرَ، صِغَرًا کے معنی چھوٹا ہونے کے ہیں جو الکبیر کی ضد ہے اور صَغُرَ صَغَرًا وصَغَارًا کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں۔ اور وہ کم مرتبہ آدمی جو اپنی پستی پر قانع ہو اس کو صَاغِر کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ۔ یعنی ذلیل ہوکر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں تاکہ حکومت کے خلاف سر نہ اٹھا سکیں۔

وَالصَّغَارُ: الضَّيمُ والذلُّ والهوانُ وكذٰلِكَ الصُّغر (بالضم) والمصدر الصَّغَر (بالتحريك) واصله مِنَ الصِغر دُون الكِبَر (قرطبی) وهو الذلّة الدائمة (ابن کثیر)

الصَّغَارُ هو الذل والهوان (جمل)

رِجْسٌ: كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔

الرِّجس: پلید، ناپاک۔ اس کی جمع ارجاسٌ آتی ہے۔ رجلٌ رِجسٌ و رجال ارجاسٌ۔ ناپاک لوگ۔

مَعْشَرَ: يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ۔

مَعْشَر۔ عَشَرَ يَعْشُرُ عَشْرًا سے ہے جس کے معنی ہیں دس میں سے ایک لینا اور معشر دس دس کی ایک جماعت پر بولا جاتا ہے۔ جاءُوا عُشَارَ۔ اور مَعْشَرَ دس دس ہوکر آتے ہیں یہ دونوں کلمے عُشَار اور مَعْشَرَ وصفیت اور عدل کی وجہ سے غیر منصرف ہیں۔ یہاں مَعْشَر سے مراد جماعت ہے۔ مَعْشَرٌ واحد اور جمع مَعَاشِر يقال جاء القوم معشر او مَعْشَرَ مَعْشَرَ: عَشْرةً عَشْرَةً او مَعْشَرةً مَعْشَرةً [1]

مَعْشَر: آدمی کا کنبہ۔ گروہ۔ جماعت۔

[1] الوسیط، طبع تہران

فَصَّلْنَا : قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ
ہم نے آیتوں کو خوب کھول کھول کر بیان کر دیا ہے
ان لوگوں کے لئے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔
آیاتِ قرآن یوں تو سب کے حق میں مفصل ہیں
ان میں کوئی ابہام ہے ہی نہیں البتہ نفع ان لوگوں
کا نصیب ہے جو ھدایت کے طلبگار ہیں۔
فَصَّلْنَا : یہ تفصیل سے بنا ہے۔ تفصیل کے
معنی ہیں کہ مضمون کا تجزیہ کر کے ایک ایک فصل کو الگ
الگ بیان کیا جائے اس طریقہ پر کہ مضمون ذہن نشین
ہو جاتا ہے اس لئے تفصیل کا حاصل صاف صاف
بیان کرنا ہو گیا۔ جس میں کوئی ابہام یا اجمال باقی
نہیں چھوڑا۔ فَصَّلْنَا : ہم نے کھول کر بیان کر دیا

نُوَلِّیْ : وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ
الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ
صاحب مدارک نے اس لفظ کی تشریح کرتے
ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ نَتْبع بعضھم بَعْضًا
فی النَّار او نُسلّط بَعْضھُمْ عَلٰی بَعْضٍ اَوْ
نَجْعَلَ بَعْضَھُمْ اَوْلیاء۔ یعنی ہم ظالموں کو
بعض کے پیچھے دوزخ میں داخل کریں گے۔ یا
بعض کو بعض پر مسلط کر دیں گے یا بعض کو بعض
کا دوست اور مددگار بنا دیں گے۔ صاحب مدارک
اس لفظ کی تین تشریحات کی ہیں پہلی کے اعتبار
سے اس کا ماخذ موالاۃ ہوگا۔ دوسری کے
اعتبار سے وِلایۃ ہوگا بمعنی حکومت۔ غلبہ۔ تسلط
اور تیسری تشریح پر اس کا ماخذ وَلایۃ بمعنی
دوستی ہے۔ لفظ نُوَلِّی کے عربی لغت کے
اعتبار سے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک ملا دینے
اور قریب کر دینے کے ہیں اور دوسرے مسلط کر دینے
کے ہیں۔ اہل تفسیر سے دونوں معنیٰ منقول ہیں۔
حضرت سعید بن جبیر اور قتادہ وغیرہ نے پہلا ترجمہ
اختیار کر کے آیت کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ قیامت
کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں اجتماعی وحدتیں یعنی
لوگوں کی جماعتیں اور پارٹیاں نسلی یا وطنی اور رنگ
و زبان کی بنا پر نہیں بلکہ اعمال و اخلاق کی بنا پر
ہوں گی یعنی اچھے اخلاق و اعمال والے انہیں لوگوں
کے ساتھ ہوں گے جن کے اعمال اور اخلاق اچھے
ہوں گے اور اس کا مشاھدہ تو دنیا میں بھی ہوتا رہتا
ہے کہ نیک طبیعت انسان کا طبعی طور پر میلان اچھے
لوگوں کی طرف ہوتا ہے۔ اور دوسرے ترجمے کے
اعتبار سے حضرت عبد اللہ بن عباس۔ عبد اللہ بن زبیر
مالک بن دینار نے آیت کی تفسیر یہ بیان کی ہے
کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو دوسرے بعض ظالموں پر
مسلط کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک ظالم کو دوسرے
ظالم کے ہاتھ سے پٹواتا رہتا ہے۔ (معارف)
یہ مضمون اپنی جگہ پر بالکل صحیح اور درست ہے
اور قرآن و حدیث کی کثیر تصریحات کے مطابق ہے
ایک حدیث میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ
وسلم کا ارشاد ہے کما تکونون کذلک یُؤمّر
عَلَیْکُمْ یعنی جیسے تم ہو گے ویسے ہی حکام
بھی تم پر مسلط ہوں گے۔ اور یہ تَوْلیۃ سے
جمع متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ اصل مادہ و۔ ل۔
ی ہے۔

ذ ر ا : وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا۔

اَلذَّرْءُ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا ارادہ کیا اُسے ظاہر کر دیا اور اس کو وجود عطا کر دیا۔ ذَرَءَ اللّٰہُ الْخَلْقَ کے معنی ہیں خدا نے اشخاص کو وجود دیا، ان کو موجود کر دیا۔ وَلَقَدْ ذَرَءْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں۔ وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ اور چار پایوں کے بھی جوڑے بنائے۔ اسی طریق پر تم کو پھیلاتا رہتا ہے۔

تَذْرُوْهُ الرِّيَاحُ میں ایک قرأت تَذْرَءُهُ الرِّيَاحُ بھی ہے۔ اَلذُّرْءَةُ بڑھاپے یا نمک کی سفیدی کو بھی کہتے ہیں (راغب)

ذَرَءَ يَذْرَءُ ای خلق (قرطبی)

رَجُلٌ اَذْرَءُ : سفید بالوں والا آدمی۔

ذَرْءٌ کے معنی پیدا کرنے، ظاہر کرنے اور پھیلا دینے کے ہیں۔

یُرْدُوْا - لِيُرْدُوْهُمْ - يُرْدُوْا۔ یہ اِرْدَاءٌ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں ہلاک کرنا۔ اصل میں اَلتَّرَدِّی کے معنی ہلاکت کے ہیں اور اَلتَّرَدِّی بابِ تفعّل سے اس کے معنی اپنے آپ کو ہلاکت کے لئے پیش کرنا۔ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى اور جب وہ جہنم میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى۔ اور وہ اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے پڑا اور اگر ایسا کرو تو تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے۔ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ خدا کی قسم تو تو قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتا۔

اَلْمِرْدَاةُ۔ وہ پتھر جس سے دوسرے پتھر توڑے جائیں۔

رَدٰى يَرْدِيْ رَدْيًا وَرَدْيَانًا۔ رَدَى الشَّيْءَ توڑنا۔ رَدَاهُ : دھکا دینا۔ رَدَاهُ بِالْحِجَارَةِ : پتھروں سے مار کر اس کو گرا دیا۔ رَدَاهُ بِحَجَرٍ : پتھر مارنا۔ رَدَى الْجَارِيَةُ لڑکی کا ایک قدم پر اچک اچک کر چلنا۔ کہا جاتا ہے مَا اَدْرِيْ اَيْنَ رَدٰى : مجھے معلوم نہیں وہ کہاں گیا۔ رَدِيَ يَرْدٰى رَدًى : ہلاک ہونا۔ گرنا۔ رَدّٰى وَاَرْدٰى۔ ہلاک کرنا۔

حدیث میں ہے آپؐ نے فرمایا : مَنْ نَصَرَ قَوْمَهٗ عَلٰى غَيْرِ الْحَقِّ فَهُوَ كَالْبَعِيْرِ الَّذِيْ رَدٰى فَهُوَ يُنْزَعُ بِذَنَبِهٖ۔ یعنی جو شخص اپنے اہل قوم کی ناحق پر امداد کرے یعنی اہل قوم اور برادری کے لوگ اگرچہ باطل پر ہوتے ہوں مگر پھر بھی یہ شخص قومی جذبات سے مغلوب ہو کر قانونِ حق توڑ دیتا ہے تو اس کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جو کنویں یا گڑھے میں گر گیا ہو اب اس کو دُم پکڑ کر نکالیں تو بھلا دُم پکڑ کر کہیں اونٹ کنویں سے نکلتا ہے!

مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص گمراہی کے گڑھے میں گر گیا ہے۔ اب اگر اس کو نکالنا چاہیں تو نہایت دشوار ہے۔ اس میں جہالت

تعصب اور برادر پروری کی ممانعت ہے۔

الاِرْدَاءُ : الاِهلاکُ (قرطبی)

یُرْدُوْا : یہ لفظ ناقص یائی ہے۔

حَصَادٌ : كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۔ اس کے پھلوں میں سے کھاؤ جب وہ نکل آئیں اور (شرعی) حق کاٹنے کے دن ادا کر دیا کرو۔ یعنی جب پھل اور فصل کو کاٹو تو اس میں سے غرباء اور مساکین کو بھی دیا کرو۔

حَصَادٌ : کھیتی کٹنے یا پھلوں کے توڑنے کے وقت کو کہتے ہیں اس میں حَقَّهٗ کی ضمیر ہر کھانے کی چیز کی طرف عائد ہے جن کا ذکر ما قبل میں اسی آیت میں مذکور ہے۔

الحَصْدُ والحَصَادُ کے معنی کھیتی کاٹنے کے ہیں اور زمن الحِصَاد والحَصَادُ یہ زَمَنُ الجِدَادِ وَالجَدَادِ کی طرح۔ یعنی حرف حا کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ دونوں طرح مستعمل ہے وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ میں وہ کھیتی مراد ہے جو اپنے صحیح وقت پر کاٹی گئی ہو اور آیت کریمہ : اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ میں حصید سے مراد وہ کھیتی ہے جو بے وقت اور بغرض فساد اور تباہی کے کاٹی گئی ہو۔ اور حَصَدَهُمُ السَّيْفُ کا محاورہ بھی اسی سے ماخوذ ہے یعنی تلوار نے انہیں تباہ کر دیا۔ اور آیت کریمہ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ میں حَصِيْدٌ سے مراد تباہ و برباد شدہ بستیاں ہیں جیسا کہ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور سورہ قٓ میں وَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ حَبَّ الحَصِيْد سے مراد اناج ہے۔ حدیث میں ہے وَهَلْ يُكِبُّ النَّاسَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ۔ لوگوں کو دوزخ میں اوندھے منہ صرف وہی گرائے گا جو اُن کی زبانوں نے کاٹا ہوگا۔

یہاں زبان کے حصائد کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ اور حبلٌ مَحْصُوْدٌ وہ رسّی جو مضبوط بانٹی گئی ہو۔ تَحَصَّدَ القَوْمُ : لوگوں کا ایک دوسرے سے قوت حاصل کرنا۔ اور آیت کریمہ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (انبیاء) میں حَصِيْدًا خَامِدُوْنَ سے مراد متمرد اور نافرمان قوم کی ہلاکت ہے۔ کہ آخر وقت میں اُن کی آہ و فریاد اُن کے کچھ کام نہ آئی اور وہ اسطرح نیست و نابود کر دیئے گئے جیسی کٹی ہوئی کھیتی یا بجھی ہوئی آگ۔

ع اب نہ خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

حَصَدَ يَحْصُدُ (ن-ن) حَصْدًا حِصَادًا وَحَصَادًا۔ وَاحْتَصَدَ الزَّرْعَ : کھیتی کو درانتی سے کاٹنا۔ اسی سے مقولہ ہے من حَصَدَ الشَّرَّ حَصَدَ النَّدَامَةَ جس نے برائی بوئی اس نے ندامت کاٹی۔ اَلْمِحْصَدُ : درانتی۔

شَجَرَۃٌ حَصْدَاءُ بہت پتّوں والا درخت
وَاٰتُوْا حَقَّہٗ یَوْمَ حَصَادِہٖ کی فقہی ابحاث
کثیر ہیں۔ ان کو تفسیر ابن کثیر اور قرطبی وغیرہ میں
دیکھا جائے۔

حَمُوْلَۃً : وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَۃً
وَّفَرْشًا۔ حَمُوْلَۃ بہ فتح حاء وہ جانور
جس پر لوگ جو بوجھ لادیں جیسے رَکُوْبَۃٌ جس پر
لوگ سواری کریں۔ اس کی جمع حُمُوْلات آتی ہے۔
والحمولۃُ المائرۃ لَھُمْ لاغیۃ۔ جو اونٹ
غلّہ لاتے ہیں ان کا شمار نہیں وہ لغو ہیں۔ یعنی
ان میں زکوٰۃ نہیں۔

من کانت لہٗ حُمُولَۃٌ (بالضم) یأوی
الی شبعٍ فلیصم رمضان حیث ادرکہٗ
یعنی جس کے ساتھ کھانے پینے کا سامان اور
بار ہوں اور وہ سیر ہوکر منزل میں رہتا ہو تو وہ
رمضان کا روزہ رکھے جہاں بھی رمضان شروع
ہو جاتا ہے کیونکہ ایسے شخص کو کوئی تکلیف نہیں
(لغات الحدیث)

محیط میں ہے کہ حَمُوْلَۃٌ حِمْلٌ بالکسر کی جمع
ہے مراد اس سے بوجھ ہے جو لادا گیا ہو۔ اور
تاء تاکید جمع کے لئے ہے۔ اور صاحب نہایہ
نے لکھا ہے کہ حُمُوْلٌ بغیر حرف تاء کے وہ
اونٹ ہیں جن پر ہوادج ہوں چاہے عورتیں
اس میں سوار ہوں یا نہ ہوں۔

الحمولۃ : حَمْلٌ سے ہے جس کے معنی ہیں
بوجھ اٹھانا یا لادنا۔ اس کا استعمال بہت سی
چیزوں کے متعلق ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا
استعمال بہت سی چیزوں کے متعلق ہوتا ہے
اس لئے گو صیغہ فعل یکساں رہتا ہے۔ مگر
بہت سے استعمالات میں بلحاظ مصادر کے فرق کیا جاتا
ہے۔ چنانچہ وہ بوجھ جو حسّی طور پر اٹھائے جاتے ہیں
جیسا کہ کوئی چیز پیٹھ پر لادی جائے اس پر حِمل
بکسر الحاء کا لفظ بولا جاتا ہے اور جو بوجھ باطن
یعنی کوئی چیز اپنے اندر اٹھائی ہوتی ہے اس پر
حَمْلٌ کا لفظ بولا جاتا ہے جیسا کہ پیٹ کے
بچے کو حَمل (بفتح الحاء) کہا جاتا ہے اور پھر تشبیہ
کے طور پر درخت کے پھل کو حَمْلٌ کہدیا جاتا ہے
جیسا کہ قرآن پاک میں ہے وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَۃٌ اِلٰی
حِمْلِھَا لَا یُحْمَلْ مِنْہُ شَیْءٌ اور کوئی بوجھ میں
دبا ہوا اپنا بوجھ بٹانے کو کسی بلائے تو اس میں کچھ نہ
اٹھائے گا۔

مفردات القرآن میں ہے کہ اصل میں حَمْلٌ کے
معنی پیٹھ پر بوجھ لادنے کے ہیں پھر بطور استعارہ عورت
کے حمل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ
الحمولۃ اُسے کہتے ہیں جس پر بوجھ لادا گیا ہو۔ اور یہ
قَتُوْبَۃ اور رَکُوْبَۃ کی طرح ہے اور جو بوجھ لدا
گیا ہو اس کو حُمُوْلَۃ بالضم کہتے ہیں۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حمولۃ فعولۃ کے
وزن پر ہے فاعل اور مفعول دونوں معنی میں استعمال
ہوتا ہے۔ اگر حمولۃ فاعل کے معنی میں ہو تو اس
میں مذکر و مؤنث دونوں برابر ہوتے ہیں جیسے کہ
رَجُلٌ صَرُوْرَۃٌ وامراۃ صَرُوْرَۃ ان کو کہا جاتا ہے

جنہوں نے بچہ نہ دیا ہو۔ اس صورت میں اس کی
جمع بھی نہیں ہوگی۔

اور اگر حمولہ مفعول کے معنی میں ہو تو بذریعہ حرف
ھاء مؤنث ومذکر میں فرق کیا جائے گا جیسا کہ حَلُوبَۃ
اور رَکُوبَۃ

اما الحمولۃ فالابل والخیل والبغال والحمیر
وکل شیئ یحمل علیہ (ابن کثیر عن ابن عباس)
والحمولۃ ما اطاق الحمل والعمل (قرطبی)
والحَمُولَۃُ: ما اطاق الحمل علیہ (جمل)

الضَّأْنِ: ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ مِنَ الضَّأْنِ
اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ۔

اَلضَّأْنُ کے معنی بھیڑ اور دُنبہ کے ہیں۔ اَضْأَنَ
الرَّجُلُ بہت بھیڑ بکریوں والا ہو گیا۔ بعض نے
کہا کہ ضأن کا واحد ضَائِنَۃ ہے یعنی ضأن
جمع ہے اور ضائن ضعیف پیٹ لٹکا ہوا ضأن
کی جمع ضَوَائِن بھی آتی ہے اور ضائنۃ کی جمع
ضَوَائِن ہے۔ کسی صاحب علم کا مقولہ ہے مثل
قُرّاء ھٰذا الزمان کمثل غَنَمٍ ضوائنَ
ذات صُوفٍ عجافٍ۔ اس زمانہ کے قاریوں کی
مثال ایسی ہے جیسے بھیڑیں بال بڑے بڑے لیکن
اندر سے دبلی پتلی۔

ضأن اُن بھیڑ بکریوں پر بولا جاتا ہے جن کے اوپر
بال ہوں۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ ضَأْنٌ جمع ہے
ضائن کی۔ اس کی مؤنث ضائنۃ آتی ہے جس کی
جمع ضوائن ہے اور بعض کا قول یہ بھی ہے کہ ضأن
کی کوئی واحد نہیں ہے اور بعض کے نزدیک ضأن کی
جمع ضَئِين ہے جیسے کہ عبد کی جمع عبید ہے۔
(قرطبی راغب)

المعز: بکریوں کو کہتے ہیں اور المعیز بکریوں کا
ریوڑ جیسا کہ ضئین بھیڑوں کے ریوڑ پر بولا جاتا
ہے۔ رجلٌ مَاعِزٌ سخت جسم والا آدمی۔
الاَمْعَز والمَعْزَاء سخت زمین۔
استمعز فی امرہ کسی کام میں کوشش کرنا[1]۔
مَعْزٌ جمع ہے۔ اس کی واحد ماعز ہے۔ جیسا کہ
صاحب کی جمع صَحْبٌ ہے۔ اور مؤنث ماعزۃ
ہے۔ اس کی جمع مواعز آتی ہے اور مَعَّاز
بکریوں والا۔ آجڑی۔ اور المَعْزُ کا لفظ عین
کے سکون کے ساتھ خود واحد کا وزن بھی ہے
اس کی جمع مَعِيْزٌ ہے۔ چنانچہ امرؤ القیس کہتا ہے

ویمنحها بنو شمجی بن جَرْمٍ
مَعِيزَهُمُ حَنَانَكَ ذا الحَنَانِ (قرطبی)

ظُفُر: وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا
حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ۔

ظُفُر سے مراد یہاں ناخن ہیں اور ذی ظفر
سے مراد تمام وہ جانور ہیں جن کے ناخن ہوں۔
ذی ظفر سے مراد یہاں ذی مخلب ہے۔
یعنی وہ جانور جو پنجہ دار اور شکاری ہوں۔ اور
ظفر انسان اور جانور دونوں کے ناخنوں کو
کہا جاتا ہے۔ پرندہ کا ناخن چونکہ اس کا اوزار ہوتا
ہے اسی مناسبت سے ظفر کا لفظ سلاح اور
ہتھیار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
کہا جاتا ہے فلان کلیل الظفر فلاں کند ہتھیار

[1] راغب

یعنی کمزور ہے۔ (راغب)
لفظ ذی ظفر کے تحت پرندوں میں تو کل وہ جانور آجاتے ہیں جن کے بجائے انگلیوں کے پنجے ہوتے ہیں جیسے چیل، گدھ، باز، شکرہ وغیرہ اور چرندوں میں وہ سارے جانور شامل ہیں جن کے سُم ہوتے ہیں جیساکہ گھوڑا، گدھا، خچر، اونٹ وغیرہ۔
وھو من البھائم مالم یکن مشقوق الاصابع (ابن جریر) قال عبداللہ ابن مسلم انہ کل ذی مخلب من الطیر وکل ذی حافر من الدواب ثم قال کذلک قال المفسرون (کبیر) قال مجاھد وقتادۃ ذی ظفر مالیس بمنفرج الاصابع من البھائم والطیر (قرطبی) وھو کل مالیس بمفتوح الاصابع۔
(جصاص عن ابن عباس)

شُحُوم: حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا۔
شُحُوم: یہ شَحْم کی جمع ہے بمعنی چربی۔ اور کان کے نرم حصہ کو جس میں بالیاں پہنی جاتی ہیں شحمۃ الاذن کہتے ہیں۔ چونکہ چربی کی طرح یہ حصہ نرم ہوتا ہے۔ اور شحمۃ الارض گرگٹ اور کیچوا وغیرہ جانور جو زمین میں گھس کر رہتے ہیں۔ اور اُس آدمی کو جو گھر میں چربی بہت رکھتا ہو رَجُلٌ مُشْحِمٌ کہتے ہیں۔ اور جو چربی خور ہو اس کو رَجُلٌ شَحِمٌ اور چربی سے لوگوں کی ضیافت کرنے والے کو شَاحِمٌ کہتے ہیں۔ اور موٹے تازے صاحب کو شَحِيْمٌ کہتے ہیں۔ لَحَّامٌ شَحَّامٌ: گوشت فروش۔ ایک مثال ہے مَا كُلُّ بَيْضَاءَ شَحْمَةٌ ولا كل سوداء تمرة۔ یعنی ہر سفید چیز چربی نہیں ہوتی اور نہ ہر کالی چیز کھجور ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے۔ وَمِنْهُمْ مَنْ يَبْلُغُ الْعَرَقُ إِلَى شَحْمَةِ أُذُنَيْهِ۔ بعضے لوگوں کا پسینہ (قیامت کے روز) ان کے کانوں کی لو تک ہوگا۔
والشحم: مادۃ السمن وھوالابیض الدھنی المسمّن وجمعہ شحوم
علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ ان پر گردے اور اوجھ کی چربی حرام تھی۔ قال قتادۃ یعنی الثروب وشحم الکلیتین الثروب یہ ثرب کی جمع ہے۔ اس چربی کو کہتے ہیں جو نرم ہو اور گردوں پر ہو (قرطبی) یعنی ثرب اُس نرم چربی کو کہتے ہیں جو گردوں پر ہو۔

الْحَوَايَا: انتڑیاں۔ یہ حَوِيَّةٌ کی جمع ہے جس کے معنی آنت کے ہیں اور حَوِيَّةٌ اس کمبل کو بھی کہتے ہیں جو اونٹ کی کوہان کے اردگرد لپیٹا جاتا ہے۔ یہ حَوَيْتُ حَيًّا و حَوَايَةً سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے آتے ہیں۔
الْأَحْوٰى: کالا۔ سیاہ مائل بہ سبزی۔ یہ حُوَّةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی سبزی مائل سیاہی کے ہیں اور اس کا باب حَوِيَ يَحْوَى اِحْوَوَاءٌ آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوٰى۔ پھر اس کو سیاہ رنگ کا کوڑا کردیا۔ یہاں اَحْوٰی سے مراد وہ گھاس ہے جو پرانی ہو کر سیاہ ہو جائے۔ (راغب)
حَوِيَ يَحْوَى حَوًى (س) اور اِحْوَاوَى

اِحْوَاءٌ دونوں کے معنی سبزی مائل سیاہ ہونے یا سیاہی مائل سُرخ ہونا ہیں۔ صفت اَحْوٰی اور مؤنث حَوَّاء جمع حُوٌّ اور حَوٰی یَحْوِیْ (ض) سے جمع کرنے اور قبضہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ حوی الشیئ: قبضہ کرنا اَلْحَیَّۃ: سانپ کا کنڈلی مارنا اور الحَاوِیْ: سپیرا، سانپ پر منتر پڑھنے والا اور اَلْحِوَاءُ مکانات کا ایک دوسرے کے پاس پاس ہونا گھروں کا مجموعہ جیسے گوٹھ وغیرہ۔ آنتوں کو الحوٰی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر فضلات کو جمع کرتی ہیں اور اِن پر حاوی ہوتی ہیں۔ انہیں معانی کا اعتبار کرکے رحم کو بھی حِوَاءٌ کہا جاتا ہے۔ روایت میں ہے کہ ان ابنی ھٰذا کان بَطْنِی لَہٗ حِوَاءً یہ میرا بچہ ہے جس کے لئے میرا پیٹ ظرف تھا۔ ابن فارس نے مقاییس اللغۃ میں اس کے بنیادی معنی جمع کرنے کے بیان کئے ہیں حَوَیْتُ الشیئ اذا جَمَعْتَہٗ (مقاییس)

المنایا علی الحوایا یہ ایک مثل ہے اس شخص کے لئے بولی جاتی ہے جو خود اپنی موت کے لئے کوشاں ہو۔ تَحَوّٰی کے معنی سکڑنے اور گول ہونے کے ہیں۔ الحَوَایَا: اس کی واحد کیا ہے؟ اس میں اہل لغت کے چند اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ الحَوَایَا کا واحد حَاوِیَاءٌ ہے۔ جیسا کہ قَاصِعَاءٌ وقواصع دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا واحد حَاوِیَۃ ہے جیسا کہ ضَارِبَۃٌ کی جمع ضوارب۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کی واحد حَوِیَّۃ ہے جیسا کہ سَفِیْنَۃٌ کی جمع سَفَائِن۔

الحَوَایَا: ھی المباعر عن ابن عباس وغیرہ وھو جمع مَبْعَرٍ سُمّی بذلک لاجتماع البعر فیہ (قرطبی) قال الواحدی وھی المباعر والمصارین واحدتھا حاویۃ وحویّۃ۔ قال ابن العربی ھی الحویّۃ او الحاویۃ (کبیر)

الحوایا: الامعاء جمع حَاوِیَاء وحاوِیَۃ (جلالین)

هَلُمَّ: قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا۔ آپ فرما دیں کہ اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس پر گواہی دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔ ھَلُمَّ یہ اسم فعل ہے جس کے معنی کسی چیز کی طرف بلانے کے ہیں۔ اس کی اصل میں اہل زبان کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل ھَا، لُمَّ ہے اور یہ ھَلَمْتُ الشیئ سے مشتق ہے جس کے معنی اصلاح کرنے کے ہیں ھا کا الف حذف کرنے کے بعد ھَلُمَّ ہوا ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس کی اصل ھَلْ اُمَّ ہے گویا یہ اصل میں ھَلْ لَکَ فِی کَذَا اُمَّۃٌ کا مخفف ہے اہل حجاز کے نزدیک اس میں واحد جمع اور مذکر مؤنث سب برابر ہیں۔ البتہ اہل نجد اس میں فرق کرتے ہیں اور دوسرے افعال کی طرح اس میں علامت سے واحد، جمع اور مذکر مؤنث کے الفاظ میں امتیاز کرتے ہیں جیسا کہ ھَلُمَّ

هَلُمَّا. هَلُمِّي. هَلْمُمْنَ وغیرہ۔ جو حضرات
هَلُمَّ کو فعل امر قرار دیتے ہیں وہ اس کی دوسرے
افعال کی طرح تصریف کرتے ہیں اور تاکید کے
دونوں نون بھی داخل کرتے ہیں اور جو حضرات
هَلُمَّ کو اسم فعل امر کہتے ہیں وہ اس کی تصریف
نہیں کرتے اور نہ ہی نون تاکید لگاتے ہیں چونکہ
یہ نون افعال کا خاصہ ہے۔

لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اہل حجاز ہی کی لغت
میں وارد ہوا ہے وَالْقَآئِلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ
هَلُمَّ اِلَیْنَا اور حرف هَلُمَّ بمعنی هَاتِ
بھی استعمال ہوتا ہے هَلُمَّ الطَّعَامَ کھانا لاؤ
(قرطبی۔ راغب۔ کشاف)

یہاں هَلُمَّ اسم فعل بمعنی اَحْضِرُوا ہے (جلالین)
وهَلُمَّ الی الطعام ای اَقبِل علی الطعام

اِمْلَاق : وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ
اِمْلَاقٍ اور اپنی اولاد کو افلاس کے خوف سے
قتل مت کرو۔ چونکہ معیشت اور رزق کی ذمہ داری
اللہ تعالیٰ پر ہے۔

املاق باب افعال کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں
مفلس ہو جانا۔ محتاج ہونا اور فقر و فاقہ کے
خوف میں مبتلا ہو جانا۔ اصل مصدر مَلْق ہے :
مٹا دینا۔ دوستی کرنا۔ مہربانی کرنا۔ زبان سے دوستی
جتانا۔ تملّق : خوشامد کرنا۔ عاجزی کرنا۔
انملاق : چکنا ہونا۔ نکل بھاگنا۔ امتلاق
نکالنا۔ مَلِقَ (س) ملقًا وَمَلِقَ لهٗ وَمَالَقَهٗ
چاپلوسی کرنا۔ خوشامد کرنا۔ مَلَقَ (ت)
مَلْقًا نرم کرنا۔ مَلَقَ الشیئ نرم کرنا۔ مَلَقَ
الثَّوْبَ دھونا۔

یہاں املاق کے معنی فقر کے ہیں۔

الاملاق : الفقر (قرطبی) اَمْلَقَ ای افتقرَ
و اَمْلَقَهٗ ای اَفْقَرَهٗ۔ فهو لازم و متعدی
(قرطبی) و اصل ذلك ان یقال املق ما
عنده من المال ای انفقه فَلَّنَی به عن
الفقر (معجم الفاظ القرآن)

الْفَوَاحِشَ : وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا
ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ یعنی بیحیائی کے جتنے
طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ
علانیہ ہو یا پوشیدہ۔

فواحش فاحشۃ کی جمع ہے اور لفظ فحشاء
اور فاحشۃ و فحش سب مصدر ہیں جن کا
اردو میں ترجمہ بے حیائی سے کیا جاتا ہے۔ اور
قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ہر ایسے برے کام
کے لئے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں جس کی برائی اور فساد
کے اثرات برے ہوں اور دور تک پہنچیں۔

امام راغب نے مفردات القرآن اور ابن اثیر نے نہایہ
میں یہی معنی بیان کئے ہیں۔ قرآن میں جا بجا فحش اور
فحشاء کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ ایک آیت
میں ارشاد ہے : يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ
ایک دوسری جگہ ارشاد ہے حَرَّمَ رَبِّيَ
الْفَوَاحِشَ۔ فحش اور فحشاء کے اس مفہوم
عام میں تمام بڑے گناہ داخل ہیں خواہ افعال
سے ہوں یا اقوال سے۔ اور ظاہر سے متعلق ہوں یا

باطن سے۔ بدکاری اور بے حیائی کے جتنے کام ہیں وہ
بھی سب اس میں داخل ہیں اس لئے عام زبانوں پر
یہ لفظ بدکاری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
حاصل یہ کہ قرآن پاک نے لفظ فواحش بول کر تمام
معاصی سے انسان کو روکا ہے۔
نهی عن جميع انواع الفواحش وهي المعاصي (قرطبی)
خلاصہ یہ کہ آیت فواحش کے اصل مفہوم کے اعتبار
سے تمام ظاہری اور باطنی گناہوں کو اور مشہور عام
مفہوم کے اعتبار سے بدکاری اور بے حیائی کے جتنے
طریقے ہیں سب کو شامل ہے۔
الفحش: اس کے اصل معنی زیادت اور کثرت کے
ہیں پھر یہیں سے قانونِ قدرت کے توڑنے پر اس کا
استعمال ہونے لگا ہے اور فحش اس جرم اور گناہ
کو کہا جاتا ہے جس کی شناعت حد سے بڑھ جائے

صدف: فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا
صَدَفَ عَنْه کے معنی ہیں اعراض کرنا کسی کی طرف
سے منہ موڑ لینا۔ اَلصَّدَفُ اصل میں پہاڑ کی چوٹی
سیپ اور اونٹ کی ٹانگوں میں کجی کو کہتے ہیں۔
قرآن پاک کی اسی سورت انعام میں یہ لفظ کئی بار
استعمال ہوا ہے۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ
ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ آیت ۴۶
سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا[1]
صَدَفَ: اَعْرَضَ (قرطبی)
صَدَفَ عَنْهُ: کسی سے سخت گریز کرنا۔

قِيَمًا: دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ
حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔
قِيَمْ مصدر ہے قیام کے معنی میں ہے اور مراد
اس سے قائم رہنے والا مستحکم ہے۔ یعنی یہ دین محکم
ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی مضبوط بنیادوں
پر قائم ہے۔ کسی کے شخصی حالات نہیں۔
اہل تفسیر نے عام طور پر اس (لفظ قیم) کا ترجمہ
درست، ٹھیک، سیدھا وغیرہ کیا ہے۔ لیکن
قیّم کو بمعنی مقوم لیکر اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ایسا
دین جو معاد و معاش اور دنیا و آخرت کو درست
کرنے والا ہے۔
قال صاحب الكشاف: القيّم من قام، كسيّد من ساد (كبير)
وقال الزجاج هو مصدر بمعنى القيام (كبير)
معناه دينًا مستقيمًا لا عوج فيه (قرطبی)
دِيْنًا قِيَمًا میں قِيَمًا بمعنی ثابت مُقَوِّمٌ کے
معنی میں ہے یعنی ایسا دین جو لوگوں کے معاشی اور
اخروی معاملات کی اصلاح کرتا ہے اس میں ایک
قرأت قَيِّمًا یعنی بکسر القاف وفتح الیاء بھی ہے
عام اور مشہور قرأت قِيَمًا ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ
الْقَيِّمُ۔ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ یہاں
قَيِّمَة سے مراد امتِ عادلہ ہے جیسا کہ آیت كُنْتُمْ
خَيْرَ اُمَّةٍ اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔
فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ یہاں قیمۃ سے مراد ہے
کہ کتب سماویہ کے معانی و مطالب پر قرآن حاوی ہے

نُسُكِيْ: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ
وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

[1] آیت ۱۵۷

نسک کے معنی قربانی کے بھی آتے ہیں اور حج کے ہر فعل کو بھی نُسک کہتے ہیں۔ اعمالِ حج کو مناسک کہا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ مطلق عبادت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے ناسک بمعنی عابد بولا جاتا ہے۔ اِس جگہ اس میں سے ہر ایک معنیٰ مراد لیے جا سکتے ہیں اور مفسرین صحابہ و تابعین سے یہ تفسیریں منقول بھی ہیں۔ مگر مطلق عبادت کے معنی اِس جگہ مناسب معلوم ہوتے ہیں بمعنی آیت کے یہ ہو گئے کہ میری نماز اور میری تمام عبادات اور پوری زندگی اور پھر موت یہ سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے
(معارف القرآن)

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ نُسک نَسِیکَۃٌ کی جمع ہے اور نسیکہ سے مراد ایامِ حج اور عمرہ میں قربانی کرنا ہے۔ مجاہد، ضحاک اور سعید بن جبیر کا قول بھی یہی ہے۔ اس تقدیر پر معنی کلام یہ ہوئے اِنَّ صَلَاتِی وَذَبِیحَتِی فِی الْحَجِّ وَالْعُمْرَۃِ۔ اور حسن کے نزدیک نُسُک سے مراد دین ہے اور زجاج نحوی کا قول یہ ہے کہ نُسُک سے مراد عبادت ہے۔ مَنْسَکٌ سین کے فتح سے مصدر میمی ہے قربانی کرنا اور بکسر سین ظرف مکان ہے قربانی کی جگہ اور شریعت۔ جمع مَنَاسِک۔
نَسَكَ نَسِكَ نَسْكًا۔ یہ باب نصر سے آتا ہے نَاسِكٌ بمعنی عَابِدٌ آتا ہے۔
اور ایک گروہ اہلِ علم کا یہ کہنا ہے کہ نُسُک تمام عبادات کو شامل ہے۔ وقال قوم النُّسُكُ فی هٰذهِ الآیة جمیع اعمال البر۔
(قرطبی)

تمت شرحُ الفاظ القرآن
من سورۃ الانعام بحمد اللہ تعالیٰ
وصلاتہ علی محمد وعلی آلہ
وصحبہ وسلم
تسلیماً کثیراً

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شرح الفاظ القرآن من سورۃ الاعراف

حَرَجٌ : فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنذِرَ بِهِ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ

حَرِجَ حَرَجًا : ضَاقَ یعنی وہ تنگ ہوا اور حَرْجٌ بسکون الراء اسم ہے

امام رازیؒ نے حرج کے دو معنی نقل کئے ہیں ایک تنگی اور دوسرے شک کے پہلی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اگر کفار لوگ تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ تنگی محسوس نہ کریں۔

دوسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا آپ کے دل میں کوئی شک نہ ہو۔ شک کو حرج اس لئے کہا گیا چونکہ شکی یعنی شک کرنے والے کے دل میں بھی شک کی وجہ سے ضیق اور تنگی ہوتی ہے۔ حَرَجٌ اور حَرَاجٌ کے اصل معنی مجتمع یعنی جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور پایا جاتا ہے اسلئے تنگی اور گناہ کو بھی حَرَج کہا جاتا ہے۔ حَرِجَ صَدْرُهُ سینہ تنگ ہوجانا۔

قَآئِلُونَ : وَكَم مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ۔

اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں تباہ کردیا اور ان پر ہمارا عذاب رات کو پہنچا یا وہ دوپہر کو آرام میں تھے یعنی عذاب الٰہی نے دن کو غفلت اور بے فکری میں آپکڑا۔

قَآئِلُونَ جمع ہے قائل کی۔ قیلولہ کرنے والے کو کہتے ہیں۔ اور قیلولہ کہتے ہیں دوپہر کے وقت تھوڑا سا لیٹنے کو۔ قیلولہ میں نیند کا آنا ضروری نہیں ہوتا۔ یعنی من القائلة وهي القيلولة وهي نوم نصف النهار وقيل الاستراحة نصف النهار اذا اشتد الحرّ وان لم يكن معها نوم (قرطبی) وقال الازهری القيلولة عند العرب الاستراحة نصف النهار اذا اشتد الحرّ وان لم يكن مع ذلك نوم (کبیر)

اور قَآئِلُونَ یہاں غافلون کے معنی میں ہے والمعنى جاءهم عذابنا وهم غافلون (قرطبی)

قال يَقِيلُ قيلًا و مَقَالًا و قيلولةً دوپہر کو کچھ دیر کے لئے سستانا۔

اَلْمَقِيلُ : آرام گاہ۔ جائے استراحت۔

أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا یعنی اہل جنت آرام گاہ کے اعتبار سے اہل جہنم سے افضل اور اعلیٰ ہوں گے۔

بَيَاتًا : مصدر ہے موقع حال میں واقع ہے۔
بَيَاتًا مصدر واقع موقع الحال بمعنی بائتین
(کشاف۔ کبیر)
رات میں آپڑنا۔ شبخون مارنا۔
بَاتَ يبيتُ بَيتًا و بَيَاتًا۔ رات میں سوتے دشمن پر حملہ کرنا۔

اَلْوَزْنُ : وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ٕالْحَقُّ

اور اُس روز یعنی قیامت کے دن اعمال وعقائد کا وزن واقع ہونے والا ہے تاکہ عام طور پر ہر ایک کی حالت ظاہر ہو جائے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ لوگ اس سے دھوکہ نہ کھائیں کہ وزن اور تول تو ان چیزوں کا ہوا کرتا ہے جن میں کوئی بوجھ اور ثقل ہو۔ انسان کے اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے ان کا کوئی جسم و جرم نہیں جس کا تول ہو سکے پھر اعمال کا وزن کیسے ہوگا کیونکہ اوّل تو مالک الملک قادرِ مطلق ہر چیز پر قادر ہے یہ کیا ضروری ہے کہ جس چیز کو ہم نہ تول سکیں حق تعالےٰ بھی نہ تول سکیں اس کے علاوہ آج کل تو دنیا میں وزن تولنے کے لئے نئے نئے آلات ایجاد ہو چکے ہیں جن میں نہ ترازو کی ضرورت ہے، نہ اس کے پلوں کی اور نہ ڈنڈی اور کانٹے کی۔ آج تو ان آلات کے ذریعہ وہ چیز بھی تولی جاتی ہے جن کے تولنے کا آج سے پہلے کسی کو تصوّر بھی نہ تھا۔ ہوا تولی جاتی ہے، گرمی سردی تولی جاتی ہے۔ ان کا میٹر بھی ان کی ترازو ہوتی ہے اگر حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے انسانی اعمال کا وزن کرلیں تو اس میں کیا استبعاد ہے۔ اس کے علاوہ خالق کائنات کو اس پر قدرت ہے کہ ہمارے اعمال کو کسی وقت جوہری وجود اور شکل وصورت عطا فرمادیں۔ (معارف القرآن)

یہاں الوزن سے مراد بالاتفاق اعمالِ انسانی کا تولا جانا ہے۔ البتہ وزن کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول یہ ہے کہ توزن صحائف اعمال العباد یعنی وہ صحائف تولے جائیں گے جن میں اعمال لکھے ہوئے ہوں گے۔ امام قرطبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نفسِ اعمال تولے جائیں گے۔
وقال مجاهد : المیزان الحسنات والسیئات باعیانها۔ جمہور اہلِ سنّت کا قول یہ بھی ہے کہ نفسِ اعمال کا وزن ہوگا۔ کیونکہ بلا وجہ حقیقت کو چھوڑ کر مجازی معنی لینا درست نہیں۔ (قرطبی)
وقد اجتمعت الامّة فی الصدر الاول علی الاخذ بهٰذه الظواهر من غیر تاویل واذا اجمعوا علی منع التاویل وجب الاخذ بالظاهر وصارت هٰذه الظواهر نصوصًا (قرطبی)
الوزن کے معنی ہیں کسی چیز کی مقدار معلوم کرنا اور یہ وَزَنْتُهُ وَزْنًا و زِنَةً کا مصدر ہے اور عرفِ عام میں وزن اُس خاص مقدار کو کہتے ہیں جو ترازو یا ناپ وغیرہ کے ذریعے معین کی جاسکے
وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ۔
وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ۔
وَ اَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ۔
اور اس میں ہر ایک مناسب چیز اُگائی ہیں

بعض نے کہا ہے کہ موزون سے سونا چاندی وغیرہ معدنیات مراد ہیں اور بعض نے ہر قسم کی موجودات مراد لی ہیں اور آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو اعتدال اور تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے جیسا کہ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ وَزَنْتُ لِفُلَانٍ وَوَزَنْتُهٗ کے معنی کسی کو تول کر دینے کے ہیں جیسا کہ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (راغب) حدیث میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَنْصِبُ مِيْزَانًا لَهٗ لِسَانٌ وَكِفَّتَانِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَتُوْزَنُ اَعْمَالُ الْعِبَادِ۔

وزن يزن وَزْنًا وزِنَةً: وَزَنَ الشَّيْءَ تولنا وَزُنَ يَوْزُنُ (ک) وَزَانَةً بوجھل ہونا صفت وازِنٌ۔ وَزَنَ وَوَازَنَ اپنا دل لگانا۔ وَزَنَ نَفْسَهٗ عَلٰى كَذَا دل لگانا مشغول ہونا وَازَنَهٗ وِزَانًا وموازنةً۔ مقابل اور برابر ہونا وَازَنَ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ۔ دو چیزوں کا وزن معلوم کرنے کے لئے آمنے سامنے کرنا۔

الوزن جمع اوزان۔ المیزان ترازو جمع موازین فلانٌ وزين الرأي: فلاں سنجیدہ رائے والا ہے۔ سمجھدار۔

ثَقُلَتْ: فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

الثِّقْلُ یہ خِفَّةٌ کی ضد ہے۔ اور اس کے معنی بھاری اور انبار ہونے کے ہیں اور وہ چیز جو وزن اور اندازہ میں دوسری پر بھاری ہو اسے ثقیل کہتے ہیں۔ اصل وضع کے اعتبار تو یہ اجسام کے بھاری ہونے پر بولا جاتا ہے لیکن مجازاً معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: اَثْقَلَهُ الْغُرْمُ وَالْوِزْرُ۔ اسے تاوان یا گناہ کے بوجھ نے دبا لیا۔ قرآن پاک میں ہے: اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ کہا جاتا ہے فِيْ اُذُنِهٖ ثِقْلٌ یعنی اس کے کانوں میں بھاری پن ہے۔ یعنی اس کی قوت سماعت کمزور ہے۔

الثِّقْلُ و الخِفَّة متقابلان فكل ما يترجح على ما يُوزَنُ به او يُقَدَّرُ به يُقال هو ثَقيلٌ (راغب)

مَوَازِيْنُ یہ میزان کی جمع ہے۔

میزانٌ اصل میں مِوْزَانٌ تھا۔ واو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدل گئی۔ بعض کے نزدیک موازین موزون کی جمع ہے۔

مَكَّنّٰكُمْ: وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ اور بلاشبہ ہم نے تم کو زمین میں ٹھہرنے کی جگہ دی۔

مَكَّنْتُهٗ وَمَكَّنْتُ لَهٗ میں نے اسے تسلط یا قدرت دی فَتَمَكَّنَ چنانچہ اس نے قدرت حاصل کر لی۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار دیا تمہاری حکومت کو مضبوط کیا۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ (۴۶-۲۶)

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ: کیا ہم نے ان کو جگہ نہیں دی۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔

اَمْكَنْتُ فُلَانًا مِن فُلَانٍ کے معنی کسی دوسرے پر قدرت دینے کے ہیں۔ مکان اور مکانۃ جگہ اور حالت کو کہتے ہیں جیسا کہ اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ یعنی تم اپنی جگہ پر عمل کئے جاؤ۔
خلیل کا قول ہے کہ لفظ مکان (صیغہ ظرف) مفعل کے وزن پر آتا ہے اور یہ کَوْنٌ سے مشتق ہے اور پھر کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے اسے مکان ہی کا حکم دے کر اس سے تمکّن وغیرہ کے صیغے اور مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ اور المکان اہل لغت کے نزدیک اُس جگہ کو کہتے ہیں جو جسم پر حاوی ہو اور متکلمین کے نزدیک یہ من قبیل العرض ہے۔ اور جسم حاوی اور محوی دونوں کے اجتماع سے عبارت ہے۔ اس کی صورت یہ کہ جسم حاوی کی سطح (باطن) جسم محوی کی سطح پر محیط ہو۔ تو گویا ان کے نزدیک ان دونوں جسموں کے مل جانے کا نام مکان ہے۔ قرآن میں ہے مَكَانًا سُوًى۔ ایک ہموار مکان۔ مَكَانًا ضَيِّقًا تنگ مکان (راغب)

مَعَايِشَ : وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ اور ہم ہی نے تمہارے لئے اس میں زیست کا سامان پیدا کر دیا بہت ہی کم تم لوگ شکر کرتے ہو۔
عَاشَ يَعِيْشُ عَيْشًا وَمَعِيْشَةً وَمَعَاشًا وَعِيْشَةً۔ زندہ رہنا۔ تَعَيَّشَ اسباب زندگی کے لئے کوشش کرنا۔ العائش فاعل ہے۔ کہا جاتا ہے هُوَ رَجُلٌ عَائِشٌ اس کی حالت اچھی ہے۔ عَايَشَهٗ ساتھ زندگی گذارنا۔
عَيَّشَهٗ وَاَعَاشَهٗ : زندہ رکھنا۔
العیش : مصدر ہے، زندگی۔ کھانا اور العیّاش بتکلف زندگی بسر کرنے والا، ناجائز کاموں میں قصداً پڑنے والا۔ روٹی فروخت کرنے والا۔
العَيْش : خاص کر اُس زندگی کو کہتے ہیں جو حیوان میں پائی جاتی ہے اور یہ لفظ الحیاۃ سے اخص ہے کیونکہ الحیاۃ کا لفظ حیوان۔ باری تعالٰی اور ملائکہ سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ مختلف جگہوں میں وارد ہوا ہے۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ہم نے اُن میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا ہے۔
فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ۔ وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ حدیث میں ہے لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ۔
العیش : الحیاۃ المختصۃ بالحیوان وھو اخص من الحیوۃ لان الحیاۃ تقال فی الحیوان وفی الباری وفی الملک و یشتق منہ المعیشۃ یتعیش منہ راغب
المعایش جمع مَعِیشَۃ ای یُتعیّش بہ من المطعم والمشرب وما تکون بہ الحیاۃ وقال الزجاج المعیشۃ ما یتوصل بہ الی المعاش (قرطبی) اور معیشۃ اکثر نحاۃ کے نزدیک مَفْعَلَۃٌ کے وزن پر ہے (قرطبی)
جمع میں نحاۃ کے دو قول ہیں۔ ایک ہمزہ کے ساتھ

یعنی مَعَائِش اور دوسرا یا کے ساتھ یعنی معایش۔ صاحبِ کشاف نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ الوجہ تصریح الیاء (کشاف) وجہ اس کی یہ ہے کہ یاء اصلیہ ہے یعنی کلمہ کا جزء ہے۔ ہاں اگر زائد ہوتی تو معائش بالہمزہ جائز ہوتی۔ آیتِ کریمہ کا حال یہ ہے کہ مساوی ضروریاتِ زندگی جن کی انسان اور حیوان کو حاجت ہوتی ہے حق تعالیٰ نے ان کو زمین میں ودیعت رکھ دیا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہمہ وقت ہر حال میں خدا کا شکر کرے گا مگر وہ غفلت میں پڑ کر اپنے خالق و مالک کے احسانات کو بھول جاتا ہے اور خدا کا شکر صحیح طور پر بجا نہیں لاتا۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا اور جو فرد یا قوم میرے قرآن سے گریز کرے گی تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا۔

قرآن پاک کا واضح فیصلہ ہے کہ جو قوم خدا کے فیصلوں کے سامنے گردن فراز ہوگی وہ ساری زندگی مال کی طلب، جاہ کی حرص، ترقی کی حرص و ہوس میں مارے مارے پھرے گی۔ تجربہ اور مشاہدہ گواہ ہے کہ آخر تنگ سے بے فکر لاکھوں پتی زندگی کی ناکامیوں سے تنگ آ کر خودکشی کر جاتے ہیں

اَغْوَيْتَنِيْ : قَالَ فَبِمَا اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ شیطان نے کہا جیسا کہ (خدایا) تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی ضرور بیٹھوں گا ان کی تاک میں تیری سیدھی راہ پر۔

تحقیق : غَوٰى يَغْوِيْ غَيًّا وَغَوِيَ يَغْوٰى غَوَايَةً گمراہ ہونا۔ ناکام و نامراد ہلاک ہونا۔ اور جب اس کو باب تفعیل یا افعال سے استعمال کیا جائے تو متعدی معنی دیتا ہے جیسا کہ غَوّٰى وَاَغْوَى الرجلَ۔ استغوی الرَّجُلَ اغوا کرنا۔ گمراہ کرنا۔ الغَيَّة گمراہی اور بکسر الغین بھی گمراہی اور ضلالت کے معنی میں آتا ہے۔ اِنَّهٗ وَلَدُ غَيَّةٍ وہ حرامزادہ ہے۔ اس میں اسم فاعل الغاوی آتا ہے جس کی جمع الغاوُن اور غواۃ آتا ہے۔ المغواۃ ظرف مکان گمراہی کی جگہ جمع مغاوٍ آتی ہے۔

اصل میں الغَيُّ اس جہالت کو کہتے ہیں جو غلط اعتقاد پر مبنی ہو کیونکہ جہالت کبھی کسی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہے۔ اور کبھی عقیدہ کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ اور وہ جہالت جو عقیدہ پر مبنی ہو اس کو غَيٌّ کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے : مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ تمہارے رفیق نہ رستہ بھولے اور نہ بھٹکے ہیں۔ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ۔ اور آیت کریمہ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا سو عنقریب ان کو گمراہی کی سزا ملے گی۔ اس میں غَيٌّ سے مراد عذاب ہے۔ اور عذاب کو غَيٌّ اس لئے کہا گیا ہے کہ گمراہی عذاب کا سبب بنتی ہے لہٰذا عذاب کو غَيٌّ کہنا مجازی ہے۔ یعنی کسی شے کو اس کے سبب کے نام سے موسوم کر دینا جیسے کہ نبات کو ندّی (طراوت) کہہ دیتے ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ یہ لوگ عنقریب ہی

اپنی گمراہی کا نتیجہ پالیں گے مگر مآل کے لحاظ سے دونوں معنی کا حاصل ایک ہے۔

الغایۃ : جھنڈے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں پر سایہ کرتا ہے۔ پھر کسی چیز کی انتہا کو بھی غایۃ کہنے لگے کیونکہ جھنڈا فوج کا آخری سہارا اور ان کے وجود کا آخری نشان ہوتا ہے۔ واضح ہے کہ غایۃ کا مادہ غ۔ ی۔ ی ہے اور غَیّ کی اصل غ۔ و۔ یَ ہے۔ الغَوِیُّ : گمراہ غلط رو۔ اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ۔ تو صریح گمراہ ہے۔ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى۔ صاحب مفردات علامہ راغب نے لکھا ہے کہ اس آیت میں غَوٰی کے معنی ہیں آدم نے جہالت کا ارتکاب کیا اور بعض نے اس کے معنی خَابَ کے بھی کئے ہیں۔ یعنی انھوں نے سراسر نقصان اٹھایا جیساکہ شاعر نے کہا ہے

وَمَنْ یَغْوِ لَا یَعْدَمْ عَلَى الغَیِّ لَائِمًا

اور اگر ناکام ہو جائے تو ناکامی پر ملامت کرنیوالوں کی کمی نہیں ہے۔

اور بعض نے غَوٰی کے معنی فَسَدَ عَیْشُهٗ کئے ہیں۔ یعنی اُس کی زندگی تباہ ہو گئی۔ اور یہ غوی الفصیل سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے بچے نے بہت زیادہ دودھ پی لیا۔ جس سے اس کو بدہضمی ہو گئی۔

اَلغَیُّ جَهْلٌ مِن اعتقادٍ فاسدٍ (راغب)

تفسیر قرطبی میں ہے : اَلإغْوَاءُ : اِلقاءُ الغَیِّ فِی القلب کہ اغواء کے معنی ہیں دل میں گمراہی کو پیدا کر دینا۔ اور اغواء کے معنی ہلاک کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اس صورت میں اَغْوَیْتَنِیْ کے معنی ہوں گے اَهْلَكْتَنِی بِلَعْنَتِكَ اِیَّایَ (قرطبی)

غَوٰی کے معنی ضَلَّ اور خَابَ کے بھی لغتِ عرب میں مشہور ہیں جیساکہ صاحب لسان العرب اور امام قرطبی نے اس کی تصریح کی ہے۔ تو اگر غَوٰی خَابَ کے معنی میں ہوگا تو اس کا اردو ترجمہ ہوگا نقصان میں پڑ گیا۔ اور اگر غوی ضلّ کے معنی میں لیا جائے تو معنی ہوں گے بہک گیا۔

اَقْعُدَنَّ : لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ۔

القُعُودُ : یہ قیام معنی کھڑا ہونا کی ضد ہے۔ قَعْدَةٌ (بفتح القاف) صیغہ مرّۃ ہے۔ یعنی ایک بار بیٹھنا اور قِعدۃ (بکسر القاف) بیٹھنے کی حالت کو کہتے ہیں اور القعود یہ جمع ہے۔ اس کی واحد قَاعِدٌ ہے۔ قرآن میں ہے : فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا اور اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا اور مَقْعَدٌ ظرف مکان ہے اس کی جمع مَقَاعِد آتی ہے۔ قرآن میں ہے : اِذْ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ۔

لفظ قَعَدَ کا صلہ جب حرفِ لام آتا ہے تو اس کے معنی گھات میں بیٹھ جانے کے ہوتے ہیں۔ یعنی چھپ کر کسی کی انتظار میں لگے رہنا جیساکہ شکاری جال لگا کر دور کہیں ایسی جگہ بیٹھ جاتا ہے جہاں اس کو شکار نہ دیکھ سکے۔

وَیُعَبَّرُ عَنِ التَّرَصُّدِ لِلشَّیءِ بِالقُعُودِ لَه۔ راغب یعنی قَعَدَ لَهٗ کے معنی کسی چیز کے لئے گھات

لگا کر بیٹھنے کے بھی آتے ہیں۔

امام قرطبی لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ کے معنی یوں بیان فرماتے ہیں ای بالصد عنه وتزیین الباطل حتی یھلکوا کما ھلك او یضلوا کما ضل او یخیبوا کما خیب (قرطبی)

قَعَدَ يَقْعُدُ قُعُوْدًا: جلس من قیام او اضطجاع

شمائل: ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ۔ یعنی ان پر ہر طرف سے حملہ کروں گا۔ انہیں ہر سمت سے گھیر لوں گا۔ کوشش کا کوئی دقیقہ ان کے گمراہ کرنے میں اٹھا نہ رکھوں گا

اہل تفسیر نے ان چاروں جملوں کی الگ الگ تفسیر کی ہے۔ مِنْ بین اَيْدِيْهِمْ سے مراد دنیا لی گئی ہے اور مِنْ خَلْفِهِمْ سے دین۔ گویا ابلیس یہ کہہ رہا ہے کہ میں دنیا کی راہ سے بھی حملہ کروں گا اور دین کے راستہ سے بھی۔

حکماء اسلام نے اول الذکر سے مراد انسان کی قوت خیالی لی ہے اور آخر الذکر سے قوت وہمی۔ عَنْ اَيْمَانِهِمْ سے مراد نیکی سے روکنا اور عَنْ شَمَآئِلِهِمْ سے مراد بدی پر جرأت دلانا لیا گیا ہے گویا ابلیس اعلان کر رہا ہے کہ میں انہیں ایک طرف تو نیکیوں سے روکوں گا اور دوسری طرف جرم پر اکساؤں گا تاکہ انسان کو ایک اخلاقی جرم بنایا جائے اور دوسری طرف بے دین اور ملحد بنا کے خدا سے دور کر دیا جائے۔

مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ: مِنْ دنیاھم۔ وَمِنْ خَلْفِهِمْ: من اٰخرتهم۔ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ: یعنی حسناتهم۔ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ یعنی سیآتهم (قرطبی۔ کبیر)

تفسیر ابن عباس میں ہے: مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ: من قبل الاٰخرة ان لاجنة ولانار ولا بعث ولاحساب۔ وَمِنْ خَلْفِهِمْ: ان الدنیا لا تفنی وآمرهم بالجمع والبخل والنساء وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ: من قبل الدین، فمن کان علی الھدی اشبه علیه حتی یخرج منه ومن کان علی الضلالة ازین له حتی یثبت علیها۔

الشمال: بایاں۔ یہ یمین کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے: عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ۔ نیز وہ چھوٹی چادر جس سے بائیں جانب ڈھانپ لی جائے۔ اس کو بھی شمال کہتے ہیں۔ اور الاشتمال بالثوب کپڑے کو اسطرح لپیٹنا کہ اس کا بالائی سرا بائیں جانب ڈالا جائے۔ حدیث میں ہے نهی عن اشتمال الصماء کہ اشتمال صماء سے روکا گیا ہے۔ یعنی کپڑے کو اس طرح لپیٹ لینا کہ کسی طرف ہاتھ نہ نکل سکے۔ شامَلَ واَشْمَلَ کے معنی شمال کی جانب میں جانے کے ہیں۔ جیسا کہ اَجْنَبَ جنوب کی جانب میں طرف جانا۔

عرب میں عام طور پر الشمال (بکسر الشین) اس ہوا کو کہتے ہیں جو کعبہ کی بائیں جانب چلتی ہے۔ اور اس میں ایک لغت شَمال (بالفتح) بھی ہے۔ شَمَلَ يَشْمُلُ شُمُوْلًا۔ شَمَلَتِ الرِّيْحُ: شمالی ہوا

کا چلنا۔ شَمِلَ بِہٖ بائیں جانب لینا۔
الشمال : واحد ہے۔ جمع شمائل آتی ہے۔
طبیعت، عادت، سیرت۔ کہتے ہیں لیس مِن
شِمالی ان اعمل بشمالی : میری عادت نہیں کہ
اُلٹے ہاتھ سے کام کروں۔
الشَّمَالَة : وہ جگہ جس میں شکاری شکار سے
چھپتا ہے

مَذْءُومًا : قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا
مَّدْحُورًا (خدا نے کہا) نکل جاؤ یہاں سے
ذلیل راندے ہوئے۔
ذَامَهٗ يَذْءَمُهٗ ذَأْمًا اور ذَمَّهٗ (ف)
اور ذَامَهٗ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی چیز کو
حقیر اور مذموم گرداننا۔
اَلذَّأْمُ بتخفیف المیم کے معنی عیب کے ہیں۔ اور
مذءوم اور مذموم کے معنی ایک ہی ہیں۔
قال ابن زید : مَذْءُومًا و مَذْمُومًا سواء
(قرطبی) وفی الکبیر : اَلذَّءَمُ : الاحتقار
وقال الفراء : ذَءَمْتُهٗ اِذَا عِبْتَهٗ (کبیر)
ذَامَهٗ ذَأْمًا : عیب لگانا۔ رسوائی کرنا اور حقارت
کرنا۔ دھتکارنا۔ اَذْأَمَهٗ اِذْاَمًا عَلٰی كَذَا
مجبور کرنا۔ اور اَلذَّأْمُ اور اَلذَّامُ کے معنی
عیب ہی کے ہیں۔ ضرب المثل ہے : قَدْ
لَا تَعْدَمُ الْحَسْنَاءُ ذَأْمًا : کبھی خوبصورت
عورت بھی عیب سے پاک نہیں ہوتی۔ حدیث میں ہے :
علیکم السام والذام : حضرت عائشہ رضؓ
نے یہودیوں کے جواب میں اُس وقت یہ کلمات
فرمائے تھے جب انھوں نے السَّلَامُ علیکم
کی جگہ تحریفًا السّام علیکم کہا۔ جناب
صدیقہ کا مقصد یہ تھا کہ ذلت اور رسوائی تمہیں
پر پڑے۔ ذَامَ يَذِيْمُ ذَيْمًا و ذَأَمَ يَذْءَمُ
ذَأْمًا دونوں کے معنی ایک ہیں۔

مَدْحُورًا : الدَّحْرُ وَالدُّحُورُ کے معنی
دھتکار دینے اور دور کر دینے کے ہیں۔
مَذْءُومًا مَّدْحُورًا : ذلیل، دھتکارا ہوا۔
دوسرے مقام پر ہے فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا
مَّدْحُوْرًا (۱۷ - ۳۹) وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ
جَانِبٍ دُحُوْرًا (۳۷ - ۹)
امام قرطبی لکھتے ہیں : المدحور المُبْعَدُ
المَطْرُودُ۔ عن مجاهد وغیرہ واصله
الدفع (قرطبی) الدَّحْرُ : الطَّرْدُ والابعاد
دَحَرَهٗ يَدْحَرُهٗ دَحْرًا و دُحُورًا کسی کو دفع کرنا۔
دور کرنا۔ مَدْحُورًا اسم مفعول ہے۔ وہ شخص جس
کو ذلیل و حقیر سمجھ کر مجلس سے اٹھا دیا جائے۔
دَحَرَهٗ (ف) دَحْرًا، دُحُورًا و مَدْحَرَةً :
نکالنا۔ ہٹانا۔ روکنا۔ دور کرنا۔ صفت فاعل دَاحِرٌ
وصف مفعولی مَدْحُورًا۔
دَحْرَجَ : لڑھکانا۔ اور تَدَحْرَجَ
وَالدَّحْرُ : اَلطَّرْدُ وَالِابْعَادُ۔ يُقَالُ
دَحَرَهٗ يدحره دَحْرًا و دُحُورًا۔ ومنه
ويقذفون مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُورًا (جمل)[1]
مَدْحُورًا : مُبْعَدًا عَنِ الرَّحْمَةِ (جلالین)

وُوْرِيَ : لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُوْرِيَ عَنْهُمَا

[1] جمل

مِنْ سَوْاٰتِهِمَا ۔ (وُرِیَ) ماغُطّی (ابن عباس)
وارٰی مواراۃً چھپانا۔ واری الشئ یا واریتُ عن
کذا کے معنی ہیں کسی چیز کو چھپانا۔ تواری یہ لازم ہے جس
کے معنی ہیں چھپ جانا۔ قرآن میں ہے: حَتّٰی تَوَارَتْ
بِالْحِجَابِ۔ یہاں تک کہ آفتاب پردے میں
چھپ گیا۔ الوری: یہ مصدر ہے پیٹ کے اندر کی
پیپ۔ پھیپھڑوں کا زخم۔ ان کو وریٰ اسی لئے
کہتے ہیں کہ دراصل یہ پوشیدہ امراض ہیں اور
الورٰی کا اسم ہے بمعنی مخلوق اور ابوالورٰی
زمانہ۔ مخلوق کو الوری اس لئے کہا جاتا ہے کہ
اپنے اشخاص سے زمین کو چھپائے ہوئے ہیں۔
وری الزندُ یری وریًا کے معنی چقماق کے
پیچھے سے آگ نکالنے کے ہیں۔ تو گویا کہ اس میں آگ
کے پوشیدہ ہونے کے معنی کا لحاظ رکھا گیا ہے
اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ۔ بھلا دیکھو تو جو
آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔

سَوْاٰت: یہ سَوْءَۃٌ کی جمع ہے۔ اُن اعضاء
انسانی کو سوءۃ کہا جاتا ہے جن کے کھلنے سے
انسان فطرتًا برا اور قابل شرم سمجھتا ہے۔
اصل میں ہر وہ چیز جو انسان کو غم اور فکر میں مبتلا
کردے اس کو سوءٌ کہا جاتا ہے خواہ یہ غم میں
ڈالنے والی شئی دنیوی امور میں سے ہو خواہ اُخروی
میں سے۔ اور پھر عام اس سے کہ اس کا تعلق احوال
نفسانیہ میں سے ہو یا بدنیہ کے یا ان امورِ خارجیہ
جن کا تعلق انسان کے مال و جلال کے چلے جانے سے
ہو یا کسی قریبی عزیز و رشتہ دار کے فوت ہو جانے سے ہو

ان تمام احوال میں انسان پر غم طاری ہوتا ہے،
اس کو سُوء کہا جاتا ہے۔ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ
وہ کسی مرض کے بغیر چمکتا ہوا نکلے گا۔ اور ہر وہ چیز
جو قبیح ہو اس کو سُوآی کہتے ہیں۔ یہ لفظ الحُسنٰی
کے مقابل آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے ثُمَّ
کَانَ عَاقِبَةَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآی۔ یعنی جن
لوگوں نے برائی کی ان کا انجام بھی برا ہوا۔
اس کے مقابلے میں آیا ہے: لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا
الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ جن لوگوں نے نیکوکاری کی ان
کے لئے بھلائی ہے اور اس سے زیادہ اور بھی۔
اور مرد اور عورت کے مقام حیاء کے لئے لفظ
سَوْءَۃٌ (بفتح السین) بطور کنایہ کے بولا جاتا ہے
چونکہ طبعی طور پر انسان ان اعضاء کے کشف سے
برا محسوس ہوتا ہے اور پھر بالعکس غیر اختیاری طور پر
اترنا تو ظاہر ہے کہ باعثِ غم ہے۔
کَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ اپنے بھائی کی لاش
کو کیسے چھپائے۔ یُوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ۔ بَدَتْ لَهُمَا
سَوْاٰتُهُمَا۔ (۷۔۲۲)
السّوءُ: کل مایغم الانسانَ (راغب)
وکنی عن الفرج بالسَّوْأۃ (راغب)
سوأتهما (من عوراتهما) وسُمّی الفرج عورۃ
لان اِظْهَارَهٗ یَسُوْءُ صاحبه (قرطبی)
سَاءَ یَسُوْءُ سواء: ساءَ الشئ قبیح ہونا، برا
ہونا (لازم) سَاءَ یَسُوْءُ سَوَاءً وَسَوَاءَةً
وَمَسَاءَةً۔ سَاءَ الْاَمرُ فُلَانًا۔ غمگین کرنا۔ بیجا
سلوک کرنا۔ سَاءَ بِهٖ ظَنًّا بدگمانی کرنا۔

سَوَّءَ عَلَيْهِ عَمَلَهٗ : الزام دینا۔ عیب لگانا۔
سَاءَ اِسَاءَۃً۔ سَاءَ الشَّئَ خراب کرنا۔ بگاڑنا۔
سَاءَ اِلَیْہِ کسی کے ساتھ برائی کرنا۔ رَجُلُ سَوْءٍ
بدکار آدمی

ذَاقَ : فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَۃَ بَدَتْ لَھُمَا سَوْاٰتُھُمَا : پھر جب دونوں نے شجرۂ ممنوعہ کا پھل
چکھا بے پردہ ہوگیا دونوں کے روبرو، ان کے پردہ کا
بدن اصل میں ذوق کے معنی تھوڑی چیز کے کھانے کے
ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کی زیادہ مقدار کے کھانے پر لفظ
ذَوْق نہیں بلکہ اَکْلٌ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ
ذَوْقٌ اور اَکْلٌ کا فرق عرفی ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار
سے لفظ ذوق کثیر و قلیل دونوں پر بولا جاتا ہے۔
اس لئے قرآن پاک میں اکثر جگہوں پر عذاب کے لئے
ذوق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً لِیَذُوْقُوا
الْعَذَابَ۔ وَقِیْلَ لَھُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ۔
ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ۔ اور کبھی
لفظ بطور استعارہ کے ابتلاء و اختیار کے معنی
میں بھی آتا ہے۔ فُلَانٌ ذَاقَ کَذَا وَاَنَا اَکَلْتُہٗ
یعنی فلاں نے تو ابھی چکھا ہے اور میں اسے کھا چکا
ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میں اس سے زیادہ باخبر ہوں
قرآن پاک میں ہے : فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ
وَالْخَوْفِ (۱۶-۱۱۲) قرآن پاک کی مذکورہ آیت میں
لفظ ذَاقَ اپنے عرفی معنی میں ہے یعنی تھوڑا سا کھانا
اَیْ اَکَلَا مِنْھَا اَکْلًا یَسِیْرًا۔ (روح)
اَیْ اَکَلَا مِنْھَا (قرطبی) وَجَدَا طُعْمَھَا
آخِذَیْنِ فِی الْاَکْلِ مِنْھَا (کشاف)
وذلکَ یَدُلُّ عَلٰی اَنَّھُمَا تَنَاوَلَا الْیَسِیْرَ قَصْدًا
اِلٰی مَعْرِفَۃِ طَعْمِہٖ (کبیر)
ذاقا : ای طَعِمَا من ثمرھا وفیہ دلیل علٰی
انّھما اکلا الیسیر من ذلک قصدًا الی معرفۃ
طعمہ۔ لان الذوق یَدُلُّ عَلَی الاکل الیسیر (جمل)
الذوق : وجود الطعم بالفم واصلہ فیما
یَقِلُّ تَنَاوُلُہٗ دُوْنَ مَا یَکْثُرُ۔ (راغب)
ذَاقَ یَذُوقُ ذوقًا وذواقًا ومذاقًا : ذاق
الشئَ کسی شے کو چکھنا اذاق اذاقۃً : چکھانا۔
الذَّوقُ والذائقۃُ۔ قوتِ ذائقہ۔ کہتے ہیں :
ما ذُقتُ ذَوَاقًا یعنی میں نے چکھا تک نہیں۔
ذاق الشئَ ذوقًا وذَوَاقًا ادرک طَعْمَہٗ فی
فمہ۔

طَفِقَا : وَطَفِقَا یَخْصِفَانِ عَلَیْھِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّۃِ۔
طَفِقَ، جَعَلَ اور اَخَذَ کی طرح افعال
شروع میں سے ہے۔ فھو من افعال الشروع
یہ طَفِقَ اور طَفَقَ دونوں طرح آتا ہے۔ مگر
طَفِقَ بکسر الفاء زیادہ فصیح ہے (روح)
طفق یفعل کذا ای جَعَلَ (مدارک)
طَفِقَ وطَفَقَ (س۔ من) طَفقًا وطُفُوقًا
طَفَقَ المواضع، کسی جگہ کو لازم پکڑنا۔
طفق بمُرادِہٖ مقصد میں کامیاب ہوا۔ اپنی مراد
کو پالینا طفق کا استعمال ہمیشہ مثبت کلام میں
ہوتا ہے۔ منفی کلام میں اس کا استعمال کبھی نہیں
ہوتا لہذا طَفِقَ یَفْعَلُ کَذَا تو درست ہوگا مگر

مگر ماطَفِقَ یَفعَل کذا درست نہیں ہوگا۔ قرآن پاک میں طفق تین مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اور تینوں جگہ مثبت ہے۔ فَطَفِقَ مَسۡحًا بِالسُّوۡقِ وَالۡاَعۡنَاقِ (ص) طَفِقَا (اعراف وطٰہٰ) طَفِقَ یفعل کذا کقولک اخذ یفعل کذا (راغب) وحکی الاخفش طفق یطفق مثل ضرب یضرب یقال طفق ای کذا اخذ فی الفعل (قرطبی) فَطَفِقَ الحجر ضربًا حضرت موسٰی علیہ السلام نے پتھر کو مارنا شروع کر دیا۔

یَخۡصِفَانِ : وطَفِقَا یَخۡصِفَانِ۔ خَصَفَ (ض) خَصۡفًا واَخۡصَفَ (افعال) واختَصَفَ (افتعال) خَصَفَ النَّعلَ : جوتا سینا۔ جوتے میں پیوند لگانا۔ خَصَفَ الشیٔ علی الشیٔ : چپکانا کہا جاتا ہے : هُمۡ یَخۡصِفُوۡنَ اَقۡدَامَ الۡقَوۡمِ بِاَقۡدَامِهِمۡ۔ یعنی وہ لوگ قوم کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اور ان کی حرف بحرف پیروی کرتے ہیں۔ الخصفۃ : کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی ٹوکری۔ گاڑھا کپڑا (ج خَصَفٌ و خِصَافٌ) الخصّاف بڑا جھوٹا۔ موچی۔ خَصۡفَۃٌ (بسکون الصاد) چمڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کے اوپر اس جیسا دوسرا ٹکڑا رکھ کر جوتا سیا جاتا ہے روایت میں ہے۔ کَانَ النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یَخۡصِفُ نعلہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتا خود مرمت کرلیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں خَصَفۡتُ النَّعلَ بِالۡمِخۡصَفِ سُتالی کے ساتھ جوتا سینا۔ خصف الخصفۃ زنبیل بُننا خَصۡفٌ کے اصل معنی جوتے کو سُتالی کے ساتھ ٹانکنا ہے واصل معنی الخصف الخرز فی طاقات النعل ونحوها بالصاق بعضها ببعض۔ وقیل اصلہ الضم والجمع (روح) وطَفِقَا یَخۡصِفَانِ عَلَیۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ یعنی آدم وحوّا اپنے بدن کو جنّت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ اپنے جسم پر پتے چپکانے لگے۔

حضرت عباس کا ایک شعر ہے

من قبلها طبت فی الظلال و فی

مستودع حیث یُخصف الورق

حضور علیہ السلام کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے آپ سایوں میں بسر کرتے تھے۔ اور ایسے مقام میں یعنی بہشت میں جہاں پتے جوڑے جاتے ہیں۔

کھجور کے بنے ہوئے بوریے کو بھی خَصَفَہ کہتے ہیں۔ لاباس بالصلوٰۃ علی الخصفۃ یعنی کھجور کے بوریئے پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے مقصد یہ ہے کہ جب جناب آدم علیہ السلام وحوّا کا جنتی لباس اتر گیا تو انہوں نے جنت کے پتوں کو ایک دوسرے سے چپکا چپکا کر اپنے جسم کو ڈھانپنا شروع کیا۔

رِیۡشًا : یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِكُمۡ وَرِیۡشًا :۔ اے بنی آدم ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے۔ جو تمہارے پردے والے جسم کو چھپاتا

ہے۔ اور موجب زینت بھی ہے۔

رِیْشًا۔ اس لباس کو کہتے ہیں جو آدمی زینت وجمال کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مراد یہ کہ صرف ستر چھپانے کے لئے تو مختصر لباس کافی ہوتا ہے مگر ہم نے تمہیں اس سے زیادہ لباس اسلئے عطا کیا کہ تم اس کے ذریعہ زینت وجمال حاصل کرسکو اور اپنی ھئیت کو شائستہ بنا سکو۔

آیت نمبر ۲۳ و نمبر ۲۶ دونوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ لباس وحجاب مقاصد شرعی سے ہے۔ اور برہنگی ونیم برہنگی کا فلسفہ خواہ اسکی تبلیغ یورپ اور امریکہ سے ہو رہی ہو یا اسکی ترویج وحشی اور غیر مہذب قوموں میں سے ہو بہر حال ایک غلط فلسفہ ہے جس سے انسانیت اور خاص کر نسوانیت کو پامال کردیا گیا ہے۔ ریش اور ریاش جو لباس ظاہر ہو۔ بعض کا کہنا ہے کہ ریش لباس فاخرہ کو کہا جاتا ہے۔

ریش اصل میں پرندے کے پروں کو کہتے ھیں اور کبھی یہ لفظ بازوں کے پروں پر بولا جاتا ہے۔ اور چونکہ پرندے کے پر اس کیلئے بمنزلہ لباس کے ہوتے ہیں۔ اسلئے استعارہ کے طور پر لفظ ریش لباس کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ پھر اس میں خوبصورتی اور جمال کی وجہ سے اور وسعت دے کر ہر اُس چیز پر بولے جانے لگا جو انسان کے لئے باعث آسائش ہو۔

الرِّیْشُ للطائر معروف وھو لباسہ وزینتہ کالثیاب للانسان فاستعیر للانسان لانہٗ لباسہ وزینتہٗ (خازن)

ابن عباس نے ریش سے مراد مال لیا ہے۔ مجاہد۔ ضحاک، سدی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ اس قول کی وجہ بھی یہی ہے کہ مال ذریعہ زینت ہے کہتے ہیں، تَرَیَّشَ الرجلُ اِذا تَمَوَّلَ۔ اور گھر کے عام مال ومتاع کو بھی ریش کہدیا جاتا ہے۔ چونکہ وہ مکان کی زینت ہیں۔ زمخشری لکھتے ہیں۔ والریش: لباس الزینۃ (کشاف)

والذی علیہ اکثر اھل اللغۃ ان الریش ماستر بہ من لباسٍ اومعیشۃٍ (قرطبی)

ولکون الریش للطائر کالثیاب للانسان اُستعیر للثیاب (راغب)۔ رَاشَ۔ یَرِیْشُ۔ رِیْشًا۔ مال وسامان جمع کرنا۔ رَاشہ کھلانا پہنانا۔ رَاشَہٗ مالاً۔ کسی کو مال دینا۔

حضرت عثمان غنیؓ اور ابن عباسؓ کی روایت میں ریش کی جگہ ریاش بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں اسمیں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ ریاش جمع ہو جیسا کہ شعب کی جمع شعاب۔ دوسرا یہ کہ ریاش مصدر ہو کہتے ہیں۔ راشہ اللہ ریشًا و ریاشًا۔ ای انعم اللہ۔

لِبَاسُ التَّقْوٰی: لِبَاسُ التَّقْوٰی سے مراد حضرت ابن عباس اور عروۃ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تفسیر کے مطابق عمل صالح اور خوف خدا ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ: قسط کے معنی انصاف واعتدال کے ہیں۔ اور اس جگہ قسط سے

مراد وہ عمل ہے جو افراط و تفریط سے خالی ہو یعنی نہ اسمیں کوتاہی ہو اور نہ مقررہ قاعدہ اور حد سے تجاوز ہو۔ جیسا کہ تمام احکام شرعیہ کا بھی یہی حال ہے اسلئے لفظ قسط کے مفہوم میں تمام عبادات اور طاعات اور تمام احکام شرعیہ داخل ہیں۔ والمراد بہ ھنا: علی ما نقل عن ابی مسلم: جمیع الطاعات والقرب (روح)۔ القسط دراصل اس حصہ کو کہتے ہیں جو حق اور عدل پر مبنی ہو۔ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۔ اور قسط کے معنیٰ دوسرے کا حق مارنے کے بھی آتے ہیں اس لئے یہ ظلم و جور کے معنیٰ میں بھی استعمال ہونے لگا۔ اَلْاِقْسَاط (افعال) کے اصل معنیٰ کو اسکا حق دینے کے ہیں۔ اسی چیز کا نام عدل و انصاف ہے۔ اسی بنا پر اہل علم نے کہا ہے۔ قَسَطَ الرَّجُلُ کے معنیٰ ظلم کرنے کے ہیں اور اقسط کے معنی عدل کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا۔ القاسط یہ قسط سے فاعل ہے۔ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ اور انصاف کا خیال رکھو بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (ماجدی)

والاقساط: العدل فی القسمۃ والحکم (لسان) یہاں المقسط اقساط سے ہے۔ معنیٰ عدل و انصاف ہیں۔ علامہ آلوسی بغدادی نے امام طبرسی کا حوالہ دیتے ہوئے نقل کیا ہے۔ القسط کے اصل معنیٰ (المیل) یعنی کسی طرف جھکاؤ کے ہیں۔ تو اگر یہ جھکاؤ حق کی طرف ہو تو عدل اور باطل کی طرف ہو تو ظلم و جور ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ضحاک سے روایت ہے کہ قسط سے مراد یہاں توحید ہے۔ لیکن اکثر اہل تفسیر کا قول یہ ہے کہ القسط سے مراد یہاں تمام امور شرعیہ میں عدل و استقامت ہے۔ (روح) قَسَطَ يَقْسِطُ قِسْطًا وَقُسُوطًا: ظلم کرنا حق سے ہٹ جانا صفت قاسط جمع قُسَّاط وقَاسِطُوْن۔ قَسَطَ يَقْسُطُ ۔ قِسْطًا واقسط الوالی منصف ھو اقسط فی حکمہ وَاقسط بینھم والیھم: فیصلہ میں انصاف کرنا۔ المقسط۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ جس کے معنیٰ عادل کے ہیں۔ فی اسماء اللہ تعالی الحسنٰی۔ المُقْسِطُ: ھو العادل۔ یقال اَقْسَطَ یُقْسِطُ فھو مُقْسِطٌ۔ اذا عدل۔ وَقَسَطَ يَقْسِطُ فھو قَاسِطٌ اذا جار۔ فکأنّ الهمزةَ لِلسَّلْب (لسان)۔

زِيْنَةٌ: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: اے اولاد آدم ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔

یہاں زینت سے مراد لباس زینت یعنی نماز کے وقت اچھے کپڑے پہننا ہیں۔ المراد من الزینۃ لبس الثیاب (کبیر)

لِبَاسَ زِيْنَتِكُمْ (مدارک)

زَانَ يَزِيْنُ زَيْنًا ۔ زانَ الشیٔ خوبصورت

بنانا۔ آراستہ کرنا۔ زَیَّنَهٗ تَزْیِیْنًا وَازَانَهٗ ازانۃً وَازْیَنَهٗ اِزْیَانًا

الزِّیْنَۃُ : وہ شئی جس سے زینت اور آراستگی کی جائے۔ زینت حقیقی وہ ہوتی ہے جو انسان کے لئے کسی حال میں معیوب نہ ہو، نہ دنیا میں نہ آخرت میں اور وہ چیز جو ایک حیثیت سے زینت ہو لیکن دوسری حیثیت سے موجب زینت نہ ہو اس کو حقیقی زینت نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ ایک پہلو کے اعتبار سے اسے زینت کہہ سکتے ہیں۔

امام راغب لکھتے ہیں کہ زینت کی اجمالاً تین قسمیں ہیں: ایک زینتِ نفسیہ جیسے علم اور اعتقاداتِ حسنہ جو نفسِ انسانی کے لئے باعثِ آرائش بنتے ہیں۔ دوسری زینتِ بدنیہ، جیسے قوت اور طولِ قامت وغیرہ جو جسم کے لئے خوبصورتی کا سبب بنتی ہے۔ تیسری زینتِ خارجیہ جیسے مال، جاہ وغیرہ جو انسان کے لئے باعثِ زینت بنتے ہیں۔ چنانچہ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹-۷) سے مراد زینتِ نفس ہے۔ اور آیت کریمہ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ (۷-۳۲) آیت میں دونوں احتمال ہیں۔ بعض نے اس کو زینتِ خارجیہ پر محمول کیا ہے اور بعض نے نفسیہ پر۔ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ (۲۸-۷۹) اس آیت میں زینت سے مراد دنیوی مال و جاہ ہے۔ زَانَهٗ کَذَا وَزَیَّنَهٗ کے معنی کسی چیز کے حُسن کو ظاہر کرنے کے ہیں۔ بالفعل آراستہ کر کے یا بذریعہ قول کے یعنی کسی چیز کو لوگوں کی نظر میں بھلا کر کے بیان کرنا۔ لباس کو لفظ زینت سے تعبیر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ نماز میں افضل و اولیٰ یہ ہے کہ صرف ستر پوشی پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق لباس زینت اختیار کیا جائے

اِسْرَاف : وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا

اور کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ اسراف کے معنی حد سے تجاوز کرنا ہیں۔

الاسراف هو مجاوزة حَدّ الاستواء (لسان)

پھر تجاوز کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ حلال سے تجاوز کر کے حرام تک پہنچ جائے۔ اور حرام چیزوں کو کھانے پینے برتنے لگ جائے اس کا حرام ہونا بھی ظاہر ہے۔ دوسرے یہ کہ حلال کی ہوئی چیزوں کو بلاوجہ شرعی حرام سمجھ کر چھوڑ دے۔ جس طرح حرام کا استعمال جرم و گناہ ہے۔ اسی طرح حلال کو حرام سمجھنا بھی قانونِ الٰہی کی مخالفت ہے۔ جو اسراف سے خالی نہیں ہے۔ صاحبِ احکام القرآن جصاص لکھتے ہیں۔ فتارۃً یکون بمجاوزۃ الحلال الی الحرام وتارۃ یکون بمجاوزۃ الحد فی الانفاق۔

سَرِفَتِ الْاُمُّ وَلَدَهَا : ماں نے اپنے بچے کو زیادہ دودھ پلا پلا کر اس کی صحت خراب کر دی۔

السَّرَفُ : اعتدال کی حد کو چھوڑنا۔ میانہ روی کو نظر انداز کرنا۔ کسی چیز کا اس طرح ضائع ہو جانا کہ جو فائدہ اس سے مقصود تھا وہ حاصل نہ ہو۔

سَرَفُ الْمَاءِ : وہ پانی جو زمین پر اس طرح بہ جائے کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی اسراف ہے کہ بھوک و پیاس سے زیادہ کھائے پیئے۔ اسی لئے فقہاء نے پیٹ بھر کر کھانے کو ناجائز لکھا ہے۔ پھر یہ

بھی اسراف میں داخل ہے کہ باوجود قدرت واختیار کے ضرورت سے اتنا کم کھائے کہ بدن بھی کمزور ہونے لگے اور واجبات و فرائض کی ادائیگی میں حرج ہونے لگے۔ قرآن پاک نے وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ خرچ میں نہ زیادتی ہو نہ کمی۔ نہ افراط ہو نہ تفریط۔ لَا تُسْرِفُوْا ای بالافراط فی الطعام والشراب کما ذهب الیه کثیر (روح)

السَّرَفُ وَالْاِسْرَافُ : مجاوزة القصد (لسان)

اور ہر وہ خرچ جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو وہ اسراف ہے۔ خرچ تھوڑا ہو یا زیادہ (ایضاً)

فحش : قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ والاثم والبغی

والفحش والفحشاء والفاحشة۔ اُس قول یا اُس فعل کو کہتے ہیں جو قباحت میں حد سے بڑھا ہوا ہو۔

ما تزاید قبحه من المعاصی (روح)

الفواحش : الاعمال المفرطة فی القبح (قرطبی)

الفواحش جمع فاحشة۔ الفاحشة : ماتبالغ فی فحشه وقبحه من الذنوب (فتح القدیر)

الفحش والفحشاء والفاحشة : ماعظم قبحه من الاعمال والاقوال (راغب)

بَطَنَ : اصل میں بَطْنٌ کے معنی پیٹ کے ہیں۔ اس کی جمع بطون آتی ہے۔ قرآن میں ہے : اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ (۵۳ - ۳۲)

اور البطن بسکون الطاء۔ یہ ظَہر کی ضد ہے اور ہر چیز کی نیچے کی جہت کو بطن اور اوپر کی جہت ظَهر کہا جاتا ہے۔

بَطَنَ يَبْطُنُ (ن) بُطُوْنًا وبَطْنًا : پوشیدہ ہونا۔ صفت باطِنٌ۔

بَطَنَ (ن) الْاَمْرَ : معاملہ کی تہ کو جاننا۔ بطانة الثوب کپڑے کا استر۔ بطانة الرجل۔ کسی کا راز داں ہونا۔ اہل و عیال۔ اس کی مزید تفصیل سورہ آل عمران میں گذر چکی ہے

علامہ آلوسی بغدادی نے نقل کیا ہے کہ آیت کریمہ ماظَهَرَ مِنْهَا سے مراد مَردوں کا عورتوں کے ساتھ اختلاط ہے اور وما بَطَنَ سے مراد رات کو عورتوں کا بے پردہ طواف کرنا ہے (روح)

الْاِثْم : اثم اور اثام وہ اعمال و افعال جو انسان کو خیر اور بھلائی کے کاموں سے روکنے والے ہوں۔ اور آیت کریمہ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ : خمر اور میسر میں اثم کبیر کے یہ معنی ہیں کہ ان کا تناول اور ارتکاب انسان کو ہر قسم کے افعال خیر سے روک دیتا ہے (راغب) لغوی تحقیق سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے

اَثِمَ يَاْثَمُ اِثْمًا واَثَامًا ومأثمًا : گناہ کرنا۔ صفت اثیم وجمعه اُثَمَاءُ، و اٰثِمٌ جمع اَثَمَةٌ۔ الاثم : جمع آثام۔

لغوی اعتبار سے تو معلوم ہو چکا ہے کہ اثم ہر گناہ کو عام ہے۔ عامٌ لکل ذنب (کشاف) لیکن آیت کریمہ میں اِثم سے مراد عامۃ المفسرین کے نزدیک شراب ہے۔ چنانچہ ابن عباس اور حسن بصری سے یہی معنی منقول ہیں۔ اور اہل لغت

میں سے اصمعی سے بھی اثم کے معنی شراب کے منقول ہیں۔ اور شعراء عرب نے بھی اپنے کلام میں اِثم سے مراد شراب لی ہے۔ چنانچہ ایک اسلامی شاعر کہتا ہے

نهانا رسول الله ان نقرب الزنا،
وأن نشرب الاثم الذى يوجب الوزرا

اسی طرح ایک دوسرا شاعر کہتا ہے

شربتُ الاثم حتی ضل عقلی
کذاك الاثم یذهب العقول

ان دونوں اشعار میں اثم سے مراد شراب ہے البتہ ابن الانباری اور ابوبکر نے انکار کیا ہے۔ ابن انباری کہتا ہے کہ کلام عرب میں اثم سے مراد شراب کبھی نہیں لی گئی۔ نہ تو زمانہ جاہلیت ہی میں اور نہ اسلام میں۔ اور ذکر کردہ دونوں شعروں کو انہوں نے موضوع قرار دیا ہے۔ صحیح بات وہ ہے جو صاحب روح المعانی نے ذکر کی ہے کہ شراب کو اثم مجازاً کہا گیا ہے کیونکہ شراب اثم کا سبب ہے۔

والمشهور أن ذلك من باب المجاز لأن الخمر سبب الاثم (روح)

امام فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ یہاں آیت کریمہ میں اثم سے مراد شراب لینا ضروری ہے۔ چونکہ قرآن پاک نے وَ إِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ میں اثم سے مراد شراب لی ہے۔ و أما الاثم فيجب تخصيصه بالخمر (کبیر)

لیکن ابوحیان کہتے ہیں کہ یہاں اثم سے مراد شراب اس لئے نہیں ہو سکتی کہ آیت مکی ہے۔ اور شراب کی حرمت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

وقال الجوهرى فى الصحاح: وقد سُمّى الخمر اثمًا (قرطبی) واللہ اعلم۔

البغی: بغی کے معنی کسی چیز کی طلب میں درمیانہ روی کی حد سے تجاوز کی خواہش کرنا کے ہیں۔ خواہ تجاوز کرسکے یا نہ اور بغی کا استعمال کمیت اور کیفیت یعنی قدر و وصف دونوں کے متعلق ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ بَغیتُ الشیئَ وابتغیتُہ: کسی چیز کے حاصل کرنے میں جائز حد سے تجاوز کرنا۔ قرآن پاک میں ہے لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ۔ یہ اس سے پہلے بھی حد سے زیادہ فتنہ کے خواہشمند رہے ہیں۔

بَغَتِ المَرْأَةُ بغاء: عورت اپنی حدودِ عفت سے آگے بڑھ گئی اور زنا کی مرتکب ہوئی۔

انْبَغَی الشیئُ: کسی چیز کا سہل اور آسان ہو جانا۔ مہیا ہو جانا۔

ماینبغی: یہ درست نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔ جائز نہیں سورہ یٰس میں ہے مَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ۔ چونکہ شاعری مقام نبوت سے فروتر ہے اسلئے شاعری کا علم ہی آپ کو نہیں دیا گیا۔

بغی ۔ دو قسم پر ہے ایک محمود ہے یعنی حد عدل سے تجاوز کر کے مرتبۂ احسان کو پہنچ جائے اور فرض سے تجاوز کر کے تطوع بھی بجا لائے۔ دوسرا مذموم ہے اور یہ حق سے تجاوز کر کے باطل یا شبہات میں واقع ہونا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الحق بيّنٌ والباطل بيّنٌ وبين ذلك مشتبهات

وَمَن رَتَعَ حَولَ الحمٰی أوشك ان یقع فیہ۔ حق بھی واضح ہے اور باطل بھی واضح ہے لیکن ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں، اور جو جانور چراگاہ کے اردگرد کھائے گا کچھ بعید نہیں کہ چراگاہ میں چرنے لگے۔

اور چونکہ بغیؔ محمود اور مذموم دونوں طرح ہوتا ہے اس لئے آیت کریمہ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الاَرضِ بِغَیرِ الحَقِّ میں عقوبۃ کو بغیؔ بغیر الحق کے ساتھ مقید کیا ہے (راغب)

بَغَا یَبغُو۔ بَغوًا (ن) بغا الشیء: کسی چیز کو غور سے دیکھنا۔ بغا علیہ: کسی پر تعدی کرنا۔ زیادتی کرنا۔ صیغہ صفت بغوؔ آتا ہے۔ اور کچے پھل کو بھی البغوۃ کہا جاتا ہے۔ البَغوۃُ مِنَ الثِّمَارِ شگوفہ جو سفید نکلا ہو۔

بغٰی یبغی (ض) بُغَاءً وبغیًا وبُغًی وبَغیَۃً بغی الشیءَ طلب کرنا۔ بغی الرجل: حق سے ہٹ جانا۔ نافرمانی کرنا۔ بغی علیہ دراز دستی کرنا۔ ظلم کرنا۔ اس باب سے صفت کا صیغہ باغٍ آتا ہے۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ۔ اس کی جمع بُغاۃ اور بُغیانٌ آتی ہے۔ اَلْبَغیُ: ظلم وخیانت۔ گناہ۔ فساد۔ بہت بارش ہونا۔

البِغیۃُ والبُغیۃُ والبُغاء: مطلوب ومرغوب

اَلبَغِیُّ: بدکار عورت۔ اس کی جمع بغایا۔

المَبْغٰی والمَبْغَاۃُ طلب کرنے کی نوعیت۔ کہا جاتا ہے بَغَیْتُ المال من مبغاتہ میں نے مال کو اس کے موقع سے تلاش کیا۔

البغیُ: الظلم والکبر (کشاف)

والبغیُ: الظلم وتجاوز الحدِّ فیہ (قرطبی)

والبغی: الظلم والاستطالۃ علی الناس (روح)

لفظ اثم کے تحت وہ تمام گناہ آ گئے ہیں جن کا تعلق انسان کا اپنی ذات سے ہے۔ اور (بغیؔ) میں وہ تمام گناہ داخل ہیں جن کا تعلق دوسروں کے معاملات اور حقوق سے ہو (معارف)

یَلِجَ : لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ۔

حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ۔ یہ ایک محاورہ ہے جس سے مراد مطلق ایک امر محال عادی کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ یعنی نہ اونٹ سوئی کے ناکے سے نکل سکے گا نہ فلاں فعل ہوگا۔

علامہ آلوسی بغدادی فرماتے ہیں کہ وقد کثر فی کلامہم مثل ہٰذہ الغایۃ فیقولون لا افعل کذا حتی یشیب الغراب ومرادھم لا افعل کذا ابدًا (روح) یعنی میں یہ کام اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک کوا سفید نہ ہو جائے۔

میرے استاذ مفتی اعظم ادام اللہ ظلہم[1] نے لکھا ہے: لفظ یلج ولوج سے بنا ہے۔ جس کے معنی

[1] ان سطور کی تحریر تک حضرت رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے۔ آپ کی وفات ۱۰ شوال ۱۳۹۶ھ میں ہوئی۔ حضرت ہی کی نظر شفقت نے مجھے ذوق دیدہ ریزی بخشا ہے۔

ہیں تنگ جگہ میں گھُستا۔ اور جمل اونٹ کو کہا جاتا ہے اور سَم سوئی کے رَوزن کو۔ معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس وقت تک جنّت میں داخل نہیں ہوسکتے جب تک اونٹ جیسا عظیم الجُثّہ جانور سوئی کے رَوزن میں داخل نہ ہوجائے۔ مطلب یہ کہ جسطرح سوئی کے رَوزن میں اونٹ کا داخل ہونا عادۃً محال ہے اسطرح ان کا جنّت میں جانا محال ہے۔

(معارف القرآن)

الولوج کے معنی الدُّخُول کے ہیں (کبیر)

ولوج اور دخول میں فرق یہ ہے کہ دخول مطلق ہے اور عام ہے اور ولوج اس سے خاص ہے۔ ایسی جگہ میں داخل ہونے پر بولا جاتا ہے جو تنگ ہو اور دخول اور ادخال مشکل ہو۔

الولوج الدُّخُول بشدّةٍ وبذلك يُقال هو الدخول في ضيق فهو أخصّ من مطلق الدخول (جمل) الولوج۔ الدخول في مضيق (راغب)

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ۔ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔

اس آیت میں اُس نظامِ کائنات پر متنبہ کیا گیا ہے جو اس عالم میں رات کے دن اور دن کے رات میں داخل ہونے کی صورت میں قائم ہے۔ اور مطالعِ شمسی کے حساب سے رونما ہوتا رہتا ہے۔

اَلْوَلِيْجَةُ: اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو انسان اپنا معتمد بنا لیتا ہے لیکن وہ اس کی قوم میں سے نہیں ہوتا۔ دوسری قوم کا محرمِ راز بننا چونکہ دشوار اور مشکل ہوتا ہے۔ غالباً اس کو اسی لئے ولیجۃ کہتے ہیں۔ محاورہ ہے فلانٌ وليجةٌ في القوم یعنی وہ قوم میں داخل ہو جائے، اور ان میں سے نہ ہو۔ قرآن میں ہے: وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً۔

وَلَجَ يَلِجُ وُلُوْجًا وَلِجَةً۔ وَلَجَ الْبَيْتَ: گھر میں داخل ہونا (افعال) داخل کرنا۔ اس کا مصدر ایلاج آتا ہے۔ **اَلْوَلَجُ**: ریگستانی راستہ۔ **تَوْلِيْجٌ**: اپنی زندگی میں مال واسباب اولاد کو تقسیم کر دینا تاکہ اس سے کوئی سوال نہ کرے۔

اَلْجَمَلُ: حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ۔ جمل اونٹ کو کہتے ہیں۔ هُوَ زَوْجُ النَّاقَةِ (قرطبی) اسکی جمع جِمال واَجْمال وجَمالات وجمائل آتی ہے۔

سَمٌّ: سَمِّ الْخِيَاطِ۔ سَمّ سوئی کے ناکا کا سوراخ۔ زہر۔ یہ تینوں حرکات کے ساتھ منقول ہے سَمٌّ، سِمٌّ، سُمٌّ (کشاف کبیر) بدن پر باریک سوراخ پر سمٌّ کا اطلاق ہوتا ہے اس کی جمع سُمُوم آتی ہے۔ سمّ قاتل بھی اسی سے ہے چونکہ یہ بدنِ انسان کے تمام مساموں کو متاثر کرتا ہے، جس سے انسان کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کو سم قاتل کہتے ہیں۔ اس کی جمع سِمامٌ آتی ہے (قرطبی)

وكل ثقبٍ في البدن لطيف فهو سمٌّ وجمعه سموم ومنه قيل: السمُّ القاتل، لانه ينفذ بلطفه في مسام البدن حتى يصل الى القلب (کبیر)

یعنی زہر قاتل کیونکہ اپنی لطیف تاثیر سے بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور سارا بدن اس سے متاثر

ہوکر فاسد ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ دل کو بھی مجروح کر دیتا ہے۔ السمّ القاتل میں سمّ مصدر فاعل کے معنی میں ہے۔

السّموم : گرم ہوا جو زہر کی طرح جسم کو متاثر کرتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے : وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (۵۲-۲۷) فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ (۵۶-۴۲) وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵-۲۷) اس کی جمع سمائم آتی ہے۔

سَمَّہ :(ن) کے معنی ہیں کسی چیز میں گھس جانا۔

السّامّۃ : وہ لوگ جو معاملہ میں گھس کر اس کی تہ تک پہنچ جائیں (مفردات) حدیث میں ہے : نَعُوْذُ بِاللّٰہِ من شَرِّ السّامّۃ والعامّۃ : ہم خدا کی پناہ چاہتے ہیں خاص اور عام کے شر سے بیضُ السّام : چھپکلی کے انڈے۔ سمُّ الفار : سنکھیا۔

اَلْخِیَاط : کپڑا سینے کی سوئی کو کہتے ہیں۔

الخیاط : ما یُخاط بہ (کبیر) اس کو مِخیَطٌ بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ اِزار کو مِئزَرٌ اور لحاف کو مِلحَف وغیرہ کہا جاتا ہے (قرطبی) (دیکھئے البقرہ لفظِ خیط) خاط الی مقصدہ : وہ سیدھا اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔ الخیّاطُ : درزی کپڑے سینے والا۔ الغواش : یہ غاشیۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ڈھانپ لینے والی چیز۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اوڑھنا بچھونا سب جہنم ہو گا۔

ان دونوں الفاظ کی تحقیق سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے

نَزَعْنَا : وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ [1]۔ نزع الشیٔ کے معنی کسی چیز کو اس کی قرارگاہ سے کھینچنے کے ہیں۔ جیسا کہ کمان درمیان سے کھینچا جاتا ہے۔ نزعٌ کا استعمال اعراض اور جواہر دونوں میں ہوتا ہے۔ یہاں لفظ نزعٌ کا استعمال اعراض ہی کے لئے ہوا ہے۔ چونکہ محبت اور عداوت دونوں عرض ہیں۔ نَزَعَ فلانٌ کذا : کے معنی کسی چیز کو چھین لینے کے ہیں۔ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (عمران) نزعُ الشیٔ قلعہ من مکانہٖ کھینچا

غِلّ : غِلّ کے معنی کینہ اور پوشیدہ دشمنی کے ہیں۔ فَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ غلّ یغلّ غلاًّ (ض) سے ہے۔

الغلول کے معنی ہیں خیانت کرنا۔ اور یہ غلّ (ن) یغُلُّ سے ہے اور اغلّ (افعال) کے معنی ہیں خیانت کے ساتھ متصف ہونا۔ اَغللتُ فلانًا کے معنی دوسرے کو خیانت کے ساتھ متہم کرنے کے ہیں وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ۔ ایک قرأت میں اَن یُغَلَّ ہے جو کہ اغللتہ سے ہے۔ یعنی یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا نبی خیانت کیساتھ متہم کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جنتی لوگوں کے دلوں میں اگر ایک دوسرے کی طرف سے کوئی رنجش ہوگی تو ہم اس کو اُن کے دلوں سے نکال دیں گے۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے بالکل خوش اور بھائی بھائی ہو کر جنت میں جائیں گے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ میں اور عثمان۔ طلحہ اور زبیر انہیں لوگوں میں ہوں گے جن کے حق میں فرمایا گیا ہے وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ

[1] آیت ۴۳

مِّنْ غِلٍّ ۔ (کبیر)

وقال الرازی : الغِلُّ الحقد ۔ قال اھل اللغۃ : وھو الذی یغل بلطفه الی صمیم القلب ای یدخل ، ومنه الغلول وھو الوصول بالحیلة الی الذنوب الدقیقة ۔

غِلٌّ کی جمع غِلَال آتی ہے (قرطبی)

حدیث میں ہے ولاصدقۃ من غُلُول : یعنی چوری کے مال کا صدقہ قبول نہیں ۔

صلح حدیبیہ میں آپ نے فرمایا وَلَا اِغْلَالَ وَلَا اِسْلَالَ نہ خیانت اور چوری ہوگی نہ علانیہ شمشیر کشی ہوگی ۔

هَدٰىنَا : وقَالَ الحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۔ الھِدَایَة : کے معنی لطف کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں ۔ اسی سے ھَدِیَّۃٌ ہے جس کے معنی اس تحفہ کے ہیں جو بغیر معاوضہ کے دیا جائے ۔ انسان کو حضرت حق نے چہار اطراف ہدایت عطا کی ہے ایک عقل فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے سے کی ہے اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمیع مکلفین کو شامل ہے ۔ فرمایا رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۔ (۲۰ - ۵۰)

دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل اور کتب نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ نجات کی طرف دعوت دی ہے ۔ جیسا کہ ارشاد ہے وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۔ اور ہم نے ان میں سے بعض کو دین کا پیشوا بنا دیا تھا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے ۔

سوم ہدایت بمعنی توفیق خاص کے آیا ہے ۔ جو پہلے سے ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے ۔ چنانچہ فرمایا وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔

چہارم ھدایت سے آخرت میں جنت کی طرف رہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے ۔ چنانچہ فرمایا : سَیَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ وَیُصْلِحُ بَالَهُمْ اور آیت زیر بحث میں فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۔ خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہاں کا راستہ دکھایا اور اگر خدا ہم کو یہاں کا راستہ نہ دکھاتا تو ہم راستہ نہ پا سکتے تھے ۔

ھدایت کی یہ چاروں اقسام ترتیبی درجات کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ یعنی جیسے پہلے درجہ کی ہدایت حاصل ہوگی وہ دوسرے درجہ کی حیثیت پر فائز نہیں ہو سکتا بلکہ وہ شرعاً مکلف بھی نہیں رہتا ۔ اسی طرح جیسے دوسرے درجہ کی ھدایت حاصل نہ ہوگی وہ تیسرے اور چوتھے درجہ کی ھدایت سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا لیکن جس کو چوتھے درجے کی ہدایت حاصل ہوگی تو اسے پہلے تینوں درجوں کی ہدایت لازماً حاصل ہوگی ۔

اسی طرح تیسرے درجے کی ہدایت کا حصول دوسرے اور پہلے درجے کی ہدایت کے حصول کا مستلزم ہوگا ۔ اس کے برعکس درجہ اولیٰ کا درجہ ثانیہ کو اور درجہ ثانیہ کا حصول درجہ ثالثہ کو مستلزم نہیں ہے ۔

ایک انسان کسی دوسرے کو دعوت الی الخیر اور رہنمائی کے ذریعے ہی ہدایت کر سکتا ہے باقی اقسام ہدایت اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ لہٰذا جن آیات میں ہدایت کی نسبت پیغمبر یا دوسرے انسانوں کی طرف کی گئی ہے وہاں راہِ حق کی طرف رہنمائی کرنا مراد ہے۔

والانسان لا یقدر أن یھدی أحدًا الا بالدعاء وتعریف الطرق دون سائر انواع الھدایات (راغب)

امام راغب اصفہانی نے لفظ ہدایت کی جو تشریح کی ہے نہایت مفید اور اہم ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ لفظ ہدایت عام ہے۔ اس کے درجات مختلف ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ ملنے کا نام ہے۔ اس لئے تقرب الی اللہ کے درجات بھی جتنے مختلف اور غیر متناہی ہیں اسی طرح ہدایت کے بھی درجات بے حد متفاوت ہیں۔ ادنیٰ درجہ ہدایت کا کفر و شرک سے نجات اور ایمان ہے۔ جس سے انسان کا رُخ غلط راستہ سے پھر کر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتا ہے۔ پھر بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جس قدر فاصلہ ہے اس کو طے کرنے کے ہر درجہ کا نام ہدایت ہے۔ اس لئے ہدایت کی طلب سے کسی وقت کوئی انسان یہاں تک کہ انبیاء و رُسل بھی مستغنی نہیں ہیں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر تک اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی تعلیم جس طرح امت کو دی خود بھی اس دعا کا اہتمام جاری رکھا۔ کیونکہ تقرب الی اللہ کے درجات کی کوئی انتہا نہیں۔ یہاں تک کہ جنت کے داخلہ کو بھی اس آیت میں لفظ ہدایت سے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ ہدایت کا آخری مقام ہے۔

معنی (ھدٰنا اللہ) انہ اعطی القدرۃ، و ضم الیھا الداعیۃ الجازمۃ وصیّر مجموع القدرۃ و تلک الداعیۃ موجبًا لحصول تلک الفضیلۃ (کبیر)

(ھدٰنا) والمراد الھدایۃ لما أدّی الیہ من الاعمال القلبیۃ والقالبیۃ مجازًا وذلک بالتوفیق لھا وصرف الموانع عن الاتصاف بھا (روح) ص۱۲۱ ج

مطلب یہ کہ یہاں تک پہنچنے کا جو طریقہ تھا ایمان اور اعمال وہ ہم کو بتلایا اور اس پر چلنے کی توفیق دی۔ اور اس راہ پر چلنے کی جتنی رکاوٹیں تھیں وہ محض اپنے فضل سے دور کر دیں۔

عِوَجًا : اَلَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ وَیَبْغُوْنَھَا عِوَجًا۔

اَلْعِوَجُ کے معنی کسی چیز کے سیدھا کھڑے ہونے کی حالت سے ایک طرف جھک جانے کے ہیں۔ جیسے عَجْتُ الْبَعِیْرَ بِزِمَامِہٖ میں نے اونٹ کو اس کی مہار کے ذریعے ایک طرف موڑ دیا محاورہ ہے فلانٌ مَا یَعُوْجُ عَنْ شَیْءٍ یَھُمُّ بِہٖ یعنی فلاں اپنے ارادہ سے باز نہیں آتا۔

علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ العَوَجُ بڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے سہولت سے دیکھا جا سکے جیسے کھڑی چیز میں ہوتا ہے۔

مثلاً لکڑی وغیرہ اور العِوج بکسر العین، اس
ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو صرف عقل و بصیرت سے
دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ صاف میدان کی ناہمواری
یا معاشرہ میں دینی اور معاشی ناہمواریاں کہ ان کا
ادراک ظاہر ہے کہ عقل و بصیرت سے ہی ہو سکتا ہے
قرآن میں ہے وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔ اس میں
کسی طرح کی کجی اور پیچیدگی نہیں رکھی گئی۔
اَلعَوَجُ : العطفُ عن حالِ الانتصاب (مفردات)
علامہ آلوسی بغدادی نے ایک اور فرق بیان کیا ہے
کہ عِوَج بکسر العین اُس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو دین
میں ہو۔ اور عَوَجٌ بالفتح اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو
خلقت میں ہو۔ لیکن ترجیح ان کے نزدیک بھی امام
راغب ہی کے قول کو معلوم ہوتی ہے۔
فی ساقه عَوَجٌ (بالفتح) اس کی ٹانگ میں ٹیڑھا
پن ہے و فی دینه عِوَجٌ (بالکسر) اس کے دین میں
کجی ہے۔ عَاجَ يَعُوجُ عَوْجًا و مَعَاجًا۔ اقامت
کرنا۔ ٹھہرنا۔ مڑ جانا۔ رجوع کرنا۔ التفات کرنا۔
عاج لگانا یعنی ہاتھی کے دانت لگانا۔ تعوّج
اور اعوجاج ٹیڑھا ہونا۔ عَاجَ بالمکان :
اقامت کرنا۔ عَاجَ فلانًا بالمکان : مقیم کرانا،
عَوِجَ يَعْوَجُ عَوَجًا : عَوِجَ العودُ : لکڑی کا
ٹیڑھا ہونا۔ عَوِجَ الانسان : بدخلق ہونا۔
صفت اَعْوَجُ۔ حدیث میں ہے : کان لَهٗ
مشطٌ من عاجٍ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
ایک کنگھی تھی جو عاج کی تھی یعنی ہاتھی دانت کی

حِجَابٌ : وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى
الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ
الحَجْبُ والحجاب : کسی چیز تک پہنچنے سے روکنا
اور درمیان میں حائل ہونا اور وہ پردہ جو دل اور
پیٹ کے درمیان حائل ہے۔ اسے حجاب الجوف
کہتے ہیں۔ اور (وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ) اور بہشت
اور دوزخ کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔ اس میں حجاب
سے مراد وہ پردہ نہیں ہے جو ظاہری نظر کو روک
لیتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ آڑ ہے جو جنت کی
لذتوں کو اہل دوزخ تک پہنچنے سے مانع ہوگی۔
اسی طرح اہل جہنم کی اذیت کو اہل جنت تک
پہنچنے کو روک دے گی۔ جیسا کہ قرآن پاک کی
ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ
بِسُوْرٍ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ
قِبَلِهِ الْعَذَابُ۔ اور آیت کریمہ مَا كَانَ
لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ
حِجَابٍ۔ یہاں پردے کے پیچھے سے کلام کرنے
کے معنی یہ ہیں کہ جس سے اللہ تعالیٰ کلام کرتے ہیں
وہ ذاتِ الٰہی کو دیکھ نہیں سکتا۔
اور حاء اور جیم کے حرف جہاں بھی جمع ہوں وہاں
ان کے اندر منع کرنے اور روکنے کا مفہوم پایا جاتا
ہے۔ (ابن فارس) اور آیت حَتّٰى تَوَارَتْ
بِالْحِجَابِ میں حجاب سے مراد یہ ہے کہ حتیٰ کہ
سورج غروب ہوگیا۔ اور دربان کو الحاجب اسلئے
کہتے ہیں کہ وہ حکام تک پہنچنے سے روک دیتا ہے
اور بھنوؤں کو حاجبان کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی
آنکھوں کے لئے بمنزلہ سلطانی دربان کے ہوتی ہیں

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ای بین النار والجنۃ حاجزٌ ای سورٌ (قرطبی) الحجب والحجابُ: المنع من الوصول۔ یُقال حَجَبَهٗ حجبًا وحجابًا (راغب) مطلب یہ کہ بطور دیوار کے ایک پردہ حائل ہو جائے گا جس کا خاصہ یہ ہوگا کہ نہ جنّت کی نعمتوں اور لذّتوں کا اثر دوزخ تک اور نہ دوزخ کی سختیوں اور تکلیفوں کا اثر جنّت تک پہنچ پائیگا اس پر یہ سوال پیش کرنا کہ پھر اس دیوار کے ہوتے ہوئے بھی اہل جنّت و دوزخ میں مخاطبت کیونکر ہوسکے گی۔ عالم آخرت کی فضا کو تمام تر اس عالم عنصری کے مادی قوانین کا پابند و محکوم سمجھ لینا ہے علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ وامورُ الآخرۃ لا تقاس بأمورِ الدنیا (روح) یہ آڑ تو صرف اتنی ہوگی کہ ایک مقام کی لذت دوسرے مقام والوں کو محسوس نہ ہو۔ یہ کوئی مرئی دیوار نہ ہوگی کہ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں۔ اور بقول صاحب روح کے کہ آخرت کے معاملات کو دنیا کے معاملات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

حدیث میں ہے ان اللہَ یغفر العبدَ مالم یقع الحجاب قیل یارسول اللہ وما الحجاب قال ان تموت النفس وھی مشرکۃ: اللہ بندے کو بخش دیتا ہے جب تک آڑ نہ ہو جائے لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آڑ سے کیا مراد ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ آڑ یہ ہے کہ آدمی مشرک ہونے کی حالت میں مرے۔

اَعْرَافٌ : وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ

یہاں الاعراف سے دیوار مراد ہے جو جنّت اور دوزخ کے درمیان حائل ہے۔ فانہ سُورٌ بین الجنۃ والنار (مفردات القرآن) اعراف کیا چیز ہے اس کی تشریح سورۃ حدید کی آیات سے ہوتی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے، ایک کھلے کافر و مشرک، ان کو تو پل صراط مستقیم پر چلنے کی نوبت بھی نہ آسکے گی پہلے ہی جہنم کے دروازے سے اسمیں دھکیل دیئے جائیں گے۔ دوسرے مومنین، ان کے ساتھ نور ایمان کی روشنی ہوگی۔ تیسرے منافقین، یہ چونکہ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ لگے رہے، وہاں بھی شروع میں ساتھ لگے رہیں گے اور پل صراط پر چلنے شروع ہوں گے، اُس وقت سخت اندھیری سب کو ڈھانپ لے گی۔ مومنین اپنے نور ایمان کی وجہ سے آگے بڑھ جائینگے اور منافقین پکار کر انہیں کہیں گے ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی میں سے فائدہ اٹھائیں۔ اس پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی کہنے والا کہے گا پیچھے لوٹو، وہاں روشنی تلاش کرو۔ مطلب یہ ہوگا کہ یہ روشنی ایمان اور عمل صالح کی ہے جس کے حاصل کرنے کا مقام پیچھے گذر گیا ہے۔ جن لوگوں نے وہاں ایمان و عمل صالح کے ذریعہ یہ روشنی حاصل نہیں کی ان کو آج روشنی کا فائدہ نہیں ملے گا۔ اسی حالت میں منافقین اور مومنین کے درمیان ایک دیوار کا حصہ حائل کر دیا جائیگا جس میں ایک دروازہ ہوگا بس دروازے کے باہر تو سارا عذاب ہی عذاب ہوگا۔ اور

دروازہ کے اندر جہاں مومنین ہوں گے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مشاہدہ اور جنت کی فضا سامنے ہوگی۔ یہی مضمون اس آیت کا ہے يَوْمَ يَقُولُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا۔

اس آیت میں وہ حصار جو اہل دوزخ کے درمیان حائل کر دیا جائے گا۔ اس کو لفظ سُوْر سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ لفظ دراصل شہر پناہ کے لئے بولا جاتا ہے جو بڑے شہروں کے گرد غنیم سے حفاظت کے لئے بڑی مضبوط، مستحکم، چوڑی دیوار سے بنائی جاتی ہے ایسی دیواروں میں فوج کے حفاظتی دستوں کی کمین گاہیں بنی ہوتی ہیں جو حملہ آوروں سے باخبر رہتے ہیں۔

سورۃ اعراف کی آیتِ مذکورہ میں وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۔ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ ۔ ابن جریر اور دوسرے ائمہ تفسیر کی تحریر کے مطابق اس آیت میں لفظ حجاب سے وہی حصار مراد ہے۔ جس کو سورہ حدید کی آیت میں سور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سور کے بالائی حصے کا نام اعراف ہے۔ اور آیت اعراف میں بتایا گیا ہے کہ محشر میں اس مقام پر کچھ لوگ ہونگے جو جنت اور دوزخ دونوں طرف کے حالات کو دیکھ رہے ہوں گے اور دونوں طرف رہنے والوں سے مکالمات اور سوال و جواب کریں گے۔

(معارف القرآن مفتی اعظم)

اعراف لغت میں کسی چیز کے بلند اُبھرے ہوئے اور ممتاز حصوں کو کہا جاتا ہے۔ والاعراف في اللغة: المكان المشرف - جمع عُرف (قرطبی)

وعلى الاعراف: وعلى اعراف الحجاب وهو السور المضروب بين الجنة والنار وهي اعاليه جمع عرف استعير من عُرف الفرس وعُرف الديك (کشاف) واما الاعراف فهو جمع عُرف وهو كل مكان عال مرتفع (کبیر)

اى اعراف الحجاب اى اعاليه وهو السور المضروب بينهما جمع عرف مستعار من عُرف الدابة والديك وقيل العُرف ما ارتفع من الشئ اى اعلى مواضع منه لانه اشرف واعرف مما انخفض منه (روح)

بعض حضرات نے اعراف کے معنی معرفت سے کئے ہیں۔ اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ محشر میں کچھ لوگ اہل جنت اور دوزخ کی معرفت یعنی پہچاننے پر مامور ہوں گے۔ اور آیتِ کریمہ کے اگلے جملے يَعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ سے بھی اس کی تائید معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بعض دوسری آیات اور روایاتِ حدیث کی بنا پر اہل تفسیر کا اجماع اس پر ہے کہ اعراف خاص مقام کا نام ہے۔

والحق انه مكان (روح) بعض کا قول یہ بھی ہے کہ حجاب اور اعراف ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور آیت میں الاعراف سے مراد حجاب ہے جس کا ذکر سابق میں ہو چکا ہے۔ اسی اعراف کو معرّف باللام لایا گیا ہے۔ گویا اعراف پر الف لام عہد کا ہے

جیسا کہ فعصیٰ فرعونُ الرسولَ میں الرسول پر الف لام عہد کاہے۔ وجعل بعضھم نفس الاعراف ھو نفس الحجاب المتقدم ذکرہ عبّر منہ تارۃً بالحجاب وتارۃ بالاعراف قال الواحدی ولم یذکرغیرہ ولذلک عرّف الاعراف لانہ عنی بہ الحجاب (جمل) وھی جمع عُرف وھو اسم للمکان المرتفع (بغوی) الاعراف جمع عرف وھو کل مکان مرتفع من الارض (خازن) والاعراف فی اللغۃ: المکان المرتفع (فتح القدیر شوکانی)

المعرفۃُ والعرفان کے معنی ہیں کسی چیز کی علامات وآثار پر غور وفکر کرنا۔ اس کا ادراک کرلینا یہ علم سے اخص ہے یعنی کم درجہ رکھتا ہے۔ اور یہ الانکار کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے یہی وجہ ہے فلانٌ یعرف اللّٰہ تو کہا جاتا ہے مگر ایک مفعول کی طرف متعدی ہونے کی صورت میں فلانٌ یعلم اللّٰہ استعمال نہیں ہوتا کیونکہ انسان ذاتِ الٰہی کا علم حاصل کرہی نہیں سکتا۔ البتہ کائنات اور آثارِ قدیمہ پر غور وفکر کرکے اس کی صفات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اللّٰہ یعرف کذا نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ معرفت کا درجہ علم سے کم ہے اور پھر لفظ معرفہ اُس ادراک پر بولا جاتا ہے جو غور وفکر کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جس سے ذاتِ باری بلند وبرتر ہے۔ دراصل معرفہ کا لفظ عَرَفْتُ کذا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں میں نے اُس کی بُو پالی۔ العَرْفُ: الرّائحۃ اور یا اَصَبْتُ عَرْفَہٗ سے، جس کے معنی ہیں میں نے اس کو رخسار پر مارا۔ پھر یہیں سے لفظ پہچاننے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسا کہ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ۔

معرفہ کے مقابلہ انکار اور علم کے مقابلہ میں جہل استعمال ہوتا ہے۔ یَعْرِفُوْنَ نِعْمَۃَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَھَا۔

عَرَّفَہٗ: کسی چیز کو خوشبودار بنادیا، معطر کردیا عَرَّفَھَا لَھُمْ۔ یہ جنت کے بارے میں فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جنت کو خوشبو سے بسا دیا ہے اور ان کے لئے آراستہ کردیا ہے (واللہ اعلم)

تِلْقَآءَ: وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُھُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ۔

تِلْقَآءٌ: یہ دراصل لِقَآءٌ کا مصدر ہے لیکن عربی لغت میں تِفعالٌ کے وزن نہایت قلیل الاستعمال ہیں۔ صرف چند مصادر اس وزن پر مستعمل ہیں۔ ایک تو یہی تِلقاء اور دوسرا تِبیانٌ۔ بعض اہل تفسیر نے زِلْزَال کو بھی انہی قلیل الوقوع مصادر میں شمار کیا ہے۔ التِّبیان وزن پر اسم کثیر الوقوع ہے جیسا کہ تِقصارٌ وتِمثالٌ اور مصادر عموماً تَفعالٌ کے وزن پر آتے ہیں۔ جیسا کہ تَیْسَارٌ وتَھْمامٌ وتَذکارٌ۔ قرآن پاک میں ظرف مکان بمعنی جہۃ اللقاء کے استعمال ہوا ہے۔ یعنی ملاقات کی جگہ۔ کہتے ہیں جَلَسَ تِلْقَاءَہٗ: وہ اس کے مقابل بیٹھا۔ فَعَلَ الْاَمْرَ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِہٖ: اس نے اس کام

خود بخود کیا۔ بغیر اس کے کہ اس کو کوئی مجبور کرے۔
ای جھۃ اللقاء وھی جھۃ المقابلۃ ولم
یأتِ مصدر علی تفعال غیر حرفین:
تلقاء وتبیان۔ والباقی بالفتح مثل تَیسار
وتَذکار وتَھمام۔ واما الاسم بالکسر
فیہ فکثیر (قرطبی) وھو فی الاصل مصدر
ولیس فی المصادر وماھو علی وزن
تِفعال بکسر التاء غیرہ وغیر تبیان۔
وزلزال ثم استعمل ظرف مکان بمعنی جھۃ اللقاء
والمقابلۃ (روح)
یُستعمل (تلقاء) ظرف مکان کما ھنا و یستعمل
مصدرًا کالتبیان ولم یجئ من المصادر
علی التفعال بالکسر غیر التلقاء والتبیان
والزلزال (جمل) واصل معنی (تلقاء) جھۃ
اللقاء وھی جھۃ المقابلۃ ولم یأتِ
مصدر علی تفعال بکسر اولہ غیر مصدرین
(فتح القدیر) وھو فی الاصل مصدر استعمل
ظرفًا (کبیر)

جَمْعٌ: قَالُوْا مَآ اَغْنٰی عَنْکُمْ جَمْعُکُمْ
وَمَا کُنْتُمْ تَسْتَکْبِرُوْنَ۔ (اصحاب الاعراف
کہیں گے کہ) کہ تمہارے کچھ کام نہ آیا تمہارا جتھا اور
تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا۔ جمعٌ: اکٹھا ہونا۔ جمع ہونا
اکٹھا کرنا۔ جمعٌ: فوج۔ جَمَعَ یَجْمَعُ کا مصدر ہے۔
جَمَعَ: اس نے جمع کیا، فراہم کیا۔ جمعٌ یہاں
جماعت کے معنوں میں ہے۔ اس کی جمع جُموعٌ آتی
ہے۔ جھۃ: گروہ۔ اور مصدر بھی ہو سکتا ہے
تو تقدیر کلام یوں ہوگی ما اغنٰی عنکم
جمعکم المال۔ لفظ جمعٌ، جمیعٌ، مجموعٌ اور
جماعۃٌ سب قریب المعنی ہیں۔
جمعکم: اتباعکم او اشیاعکم او جمعکم المال
فھو مصدر، مفعولہ مقدر (روح)
یعنی مصدر ہونے کی صورت میں اس کا مفعول
مقدر ہوگا جیسا کہ عبارتِ بالا سے معلوم ہو رہا ہے

حَثِیْثًا: یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ
حَثِیْثًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ڈھانپ دیتے ہیں رات
کو دن پر اسطرح کہ رات جلدی کے ساتھ دن کو
آلیتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ رات اور دن کا یہ
انقلاب عظیم کہ پورے عالم کو نور سے اندھیرے
میں یا اندھیرے سے نور میں لے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ
کی قدرتِ قاہرہ کے تابع اتنی جلدی اور آسانی
سے ہو جاتا ہے کہ ذرا دیر نہیں لگتی (معارف)
حثّ: ترغیب دینا۔ برانگیختہ کرنا۔ اُبھارنا۔
حثیث: جلدی، تیزی۔ حِثَاث: تھوڑی
سی نیند۔ الحثّ: الاستعجال والسُّرعۃ،
(فتح القدیر)
قال اللیث: الحثّ: الاعجال۔ یقال
حثثتُ فلانًا فاحتثّ فھو حثیث و
محثوث، ای مجد سریع (کبیر)
الحثّ: الاعجال والسرعۃ (قرطبی)
حثیث دراصل اُس جلدی اور تیزی کو کہا جاتا
ہے جس میں کوئی فتور اور خرابی نہ ہو۔ یعنی جلدی
اور تیزی، کام پر غلط اثر نہ ڈالے اور قائم شدہ

نظام میں کوئی خلل نہ ڈالے۔ چنانچہ صاحبِ قرطبی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا : ای یطلبہ دائماً من غیر فتور (قرطبی)
فجھزنا احث الجھاز : ہم نے جلدی سے کچھ تیاری کرلی۔ وَلّٰی حَثِيْثًا : جلدی سے مڑا۔ حثیث فعیل بمعنی فاعل ہے یعنی حاثا کے معنی میں ہے۔ یعنی دوڑتا ہوا۔ اور یا بمعنی مفعول یعنی محثوث ، جسے رغبت دی گئی

طَمَعًا : وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ
اور اللہ کو پکارتے رہو ڈر کے ساتھ بھی اور آرزو کے ساتھ بھی۔ بیشک اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے بہت نزدیک ہے۔

لفظ دعاء عربی زبان میں کسی کو حاجت روائی کے لئے پکارنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور مطلق یاد کرنے کے معنی میں بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں۔

الطمع : کے معنی نفسِ انسانی کا کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ مائل ہونا۔ طَمِعٌ و طَامِعٌ۔ اسی طرح مائل ہونے والا۔ اور عموماً چونکہ طمع کی بنا خواہشِ نفسانی پر ہوتی ہے ، اس لئے کہا جاتا ہے کہ الطمع طبع والطبع تدنس الاھاب ، طمع بھی ایک قسم کی آلودگی ہے جو انسان کے نفس کو ملوث کر ڈالتی ہے (مفردات)

اہل تفسیر کا بیان ہے کہ طمع کسی ایسی محبوب چیز کی توقع کرنا ہے جو مستقبل میں حاصل ہوسکتی ہو
الطمع: تَوَقُّعُ محبوبٍ يَحْصُلُ لَهٗ (روح)
والطمع : توقع محبوب یحصل فی المستقبل (جمل) والطمع توقع حصول الامور المحبوبة (فتح) والطمع توقع المحبوب . قالہ القشیری (قرطبی) طَمَعٌ۔ طَمَاعٌ۔ طَمَاعِيَةٌ حرص کرنا۔ لالچ کرنا۔ مطماع : بڑا حرص کرنے والا۔ اور مَطْمَعٌ : جس چیز کی طمع ہو۔

حاصل آیت : آیت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت قریب ہے نیک عمل کرنے والوں سے اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگرچہ بوقت دعاء خوف امید کی دونوں ہی حالتیں ہونی چاہئیں لیکن ان دونوں حالتوں میں سے امید ہی کی جانب راجح ہے۔ کیونکہ رب العالمین اور رحیم الرحماء کے جود و احسان میں ان میں نہ کوئی کمی ہے نہ بخل۔ وہ برے سے برے بلکہ شیطان کی بھی دعا قبول کرسکتا ہے۔ ہاں اگر عدم قبولیت کا کوئی خطرہ ہوسکتا ہے تو وہ اپنی بداعمالی اور نحوست سے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہونے کے لئے محسن یعنی عمل ضروری ہے۔ (معارف)

سَحَابًا : حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ۔
السحب : الجر کسحب الذیل والانسان علی الوجہ۔ سحب کے اصل معنی کھینچنے کے ہیں۔

چنانچہ دامن زمین پر گھسیٹ کر چلنے یا کسی انسان کو منہ کے بل گھسیٹنے پر سحب کا لفظ بولا جاتا ہے اسی سے بادل کو سحاب کہتے ہیں یا تو اس لئے کہ ہوا اس کو کھینچ کر لے چلتی ہے۔ اور یا اس لئے کہ وہ خود پانی کو کھینچ کر لاتا ہے۔ اور یا اس بنا پر کہ وہ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھسٹتا ہوا چل رہا ہے قرآن میں ہے : یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ۔ دوسری جگہ ارشاد ہے : یُسْحَبُوْنَ فِی الْحَمِیْمِ (مفردات)

السحاب : بادل کو کہا جاتا ہے۔ خواہ پانی سے بھرا ہو یا خالی۔ اس لئے خالی بادل کو سحابٌ جَھَامٌ کہا جاتا ہے۔ سَحَابًا ثِقَالًا کے معنی ہیں بھاری بادل یعنی جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں بھاری بادلوں سے مراد پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں جو ہوا کے کاندھوں پر سوار ہو کر اوپر جاتے ہیں۔ اور اس طرح یہ ہزاروں من وزنی پانی ہوا پر سوار ہو کر اوپر پہنچ جاتا ہے۔

السَّحاب : یہ اسم جنس ہے جمع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کی واحد اور جمع میں تاء کے ذریعہ فرق کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کی واحد سَحَابَۃ آتی ہے (سحائب بھی اس کی جمع ہے۔ سَحَبَ یَسْحَبُ۔ زمین پر گھسیٹنا۔ کہتے ہیں جَاءَ یَسْحَبُ ذَیْلَہ وہ مغرورانہ چال سے آیا اتراتا ہوا آیا۔

سَحَابًا ای غیمًا سمّی بذلک لانسحابہ فی الھواء وھو اسم جنس جمعی یفرق بینہ وبین واحدہ بالتاء (روح) سحاب : مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

السحاب یذکر ویؤنث (فتح) وکذا کل جمع بینہ وبین واحدتہ ھاء۔ وتجوز نعتہ بواحد فتقول سحابٌ ثقیل وثقیلۃ (قرطبی)

والسحابُ جمع سحابۃ وھو الغیم فیہ ماء او لم یکن فیہ ماء (خازن)۔

لفظ سحاب چونکہ اسم جنس ہے اس لئے ضمیر کے استعمال میں لفظ کی رعایت کر کے ضمیر واحد بھی استعمال کی جا سکتی ہے جیسا کہ خود اسی جگہ قرآن پاک میں لفظ کی رعایت کر کے (سُقْنٰہُ) میں ضمیر واحد لائی گئی ہے اور معنی کا اعتبار کر کے صفت جمع لائی گئی ہے۔ یعنی سَحَابًا ثِقَالًا۔ چونکہ ثقال ثقیل کی جمع ہے

سُقْنٰہُ : سُقْنٰہُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ۔ تو اس کو کسی خشک بستی کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں۔

سَوْق : کے معنی کسی جانور کو ہانکنے اور چلانے کے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ جب ہواؤں نے بھاری بادلوں کو اٹھا لیا تو ہم نے ان بادلوں کو ہانک دیا، ایک مرے ہوئے شہر کی طرف۔ مرے ہوئے شہر سے مراد وہ بستی ہے جو پانی نہ ہونے کے سبب ویران ہو رہی ہے جس کو بنجر زمین کہا جاتا ہے۔

سوق الابل کے معنی اونٹ کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں۔ یہ سُقْتُہٗ (ن) کا مصدر ہے اور انسقاق (انفعال) کے معنی ہنکانے کے بعد چل پڑنے کے ہیں۔ اور ان جانوروں کو جو ہنکائے جاتے ہیں سَیِّقَۃ کہا جاتا ہے اور عورت کو مہر ادا کرنے کے لئے سقتُ المھر الی المرأۃ کا محاورہ ہے۔ چونکہ

عرب لوگ عام طور پر مہر میں اونٹ دیا کرتے تھے۔
اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ۔ یہاں المساق کے معنی خدا کی طرف چلنے کے ہیں (راغب)

خَبُثَ : وَالَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا۔

المخبث والخبیث ہر وہ چیز جو ردّی اور خسیس ہونے کی وجہ سے بُری معلوم ہو۔ خواہ وہ چیز محسوسات سے ہو یا معقولات سے تعلق رکھتی ہو۔ اصل میں خبث ردی اور ناکارہ چیز کو کہتے ہیں جو بمنزلہ لوہے کی میل کے ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے

سَبَكْنَاهُ وَنَحْسِبُهُ لُجَيْنًا
فَاَبْدَى الْكِيْرُ عَنْ خَبَثِ الْحَدِيْدِ

ہم نے اس کو اس خیال سے ڈھالا کہ یہ چاندی ہے لیکن بھٹی میں ڈالنے سے معلوم ہوا کہ یہ لوہے کا میل ہے۔ یہ اعتقاد باطل، کذب اور فعل قبیح سب کو شامل ہے۔ قرآن میں ہے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ یہاں الخبائث سے مراد وہ چیزیں ہیں جو انسان کو فطرۃً نامرغوب ہوتی ہیں۔ كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبَائِثَ یہاں خبائث عملی مراد ہے۔ لذت اندرونی کے لئے ایک مرد کا دوسرے مرد کی طرف مائل ہونے سے کنایہ ہے۔
وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ۔ یہاں خبیث اور طیّب سے مراد جیّد اور ردی ہے۔ یعنی یتیموں کے مال کو اس طرح برباد نہ کرو کہ اچھی چیزیں خود رکھ کر ان کے بدلے نکمی چیزیں ان کے مال میں لگا دو۔ خَبُثَ سے مراد یہاں وہ زمین ہے جو پتھریلی اور بنجر ہو۔ والخبیث الذی فی تربتہ حجارۃ اوشوك (قرطبی)

نَكِدًا : وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا۔

اَلنَّكِدُ: ہر وہ ہر چیز جو صعوبت و مشکل سے ہو اور پھر بے فائدہ ہونے کے علاوہ مقدار میں بھی کم ہو۔ اسی سے سخت خُو کو جو سائل کو مشکل سے دینے پر راضی ہو نَكِدٌ و نَكَدٌ کہا جاتا ہے اور کم دودھ دینے والی اونٹنی کو ناقۃ نکداء کہتے ہیں۔
مطلب یہ کہ اگرچہ بارانِ رحمت کا فیض ہر شہر پر زمین پر یکساں ہوتا ہے لیکن نتائج وثمرات کے اعتبار سے زمین کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک عمدہ اور اچھی زمین جس میں نشو ونما کی پوری صلاحیت ہے۔ اس میں تو ہر طرح کے پھول پھل ثمرات نکلتے ہیں اور فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ دوسری وہ سخت اور کھاری زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس میں اول تو کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اور پھر جتنا پیدا ہوتا ہے وہ بھی بے کار اور خراب ہوتا ہے۔
النَّكِد كل شئ خرج الى طالبه بتعسّرٍ (مفردات) وهو العسر الممتنع من اعطاء الخير (قرطبی) والنَّكد: الذى لاخير فيه (کشاف) والنَّكدُ: العسر الممتنع من اعطاء الخير على جهة البخل۔ وقال الليث النكد: الشؤم واللؤم وقلة العطاء۔ ورجل

انکد۔ وقال الشاعر:

واعط ما اعطیتہ طیبا۔ لاخیر فی
المنکود والناکد (کبیر)

نَکِدَ ینکدُ نکدًا۔ نَکِدَ العیش: گزران کا تنگ ہونا۔ نکد الرجل: تنگ گزران والا ہونا۔ نَکِدَ البئرُ: کنویں کا پانی کم ہونا۔

عطاءٌ مُنَکَّدٌ و منکودٌ: تھوڑا عطیہ۔

نَکَدٌ کی جمع اَنکادٌ و مَناکیدُ آتی ہے۔

وَلَا دَرُّھَا بِمَاکِدٍ اَوْ نَاکِدٍ: اس کا دودھ ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے نہ کثیر ہے۔

ارضون نِکادٌ: بہت کم پیداوار والی زمینیں

قرآن پاک میں نکد کا مادہ صرف ایک مرتبہ آیا ہے

ناقۃٌ نَکْدَاءُ: وہ اونٹنی جس کا دودھ نہ ہو یا نہ ہونے کے برابر ہو

اَلْمَلَاُ: قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔

لفظ مَلَاُ قوم کے سرداروں اور برادریوں کے چودھریوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کھلی گمراہی میں ہیں کہ ہمارے باپ دادوں کے دین سے ہمیں نکالنا چاہتے ہیں۔

اَلْمَلَاُ اس جماعت کو کہتے ہیں جو کسی امر پر مجتمع ہو تو نظروں کو ظاہری حسن و جمال اور نفوس کو ہیبت و جلال سے بھر دے (راغب) الاشراف و السادة۔ (کشاف)

نَاصِحٌ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ۔

النُّصْحُ: کسی ایسے فعل یا قول کا قصد کرنے کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کی خیر خواہی ہو۔

قرآن پاک میں لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ
یا تو یہ نَصَحْتُ لَهُ الْوُدَّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی سے خالص محبت کرنے کے ہیں۔ اور ناصح العسل: خالص شہد کو کہتے ہیں اور یا یہ نَصَحْتُ الجلد سے ماخوذ ہے جس کے معنی چمڑے کو سینے کے ہیں۔ اور ناصح درزی کو بھی کہتے ہیں۔ اور نِصَاح وہ دھاگہ جس سے کپڑا سلائی کیا جاتا ہے۔ (مفردات)

النُّصْحُ: اخلاص النیة من شوائب الفساد فی المعاملة۔ بخلاف الغش۔

نَصَحْتُہ و نَصَحْتُ له: نصحًا و نصیحةً و نَصَاحَةً۔ رجلٌ نَاصِحُ الجَیْبِ ای نقی القلب۔ یعنی صاف دل آدمی کو ناصح الجیب کہتے ہیں۔ (قرطبی)

واصل النصح فی اللغة: الخلوص (روح)

وفی الحدیث الدین النصیحة۔

انتصاح: نصیحت قبول کرنا۔

وحقیقة النصح الارسال الی المصلحة مع خلوص النیة من شوائب المکروہ (کبیر)

لفظ نصیحت عام طور پر حرف لام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں نَصَحْتُ لَهٗ و نصحتُ لك

اگرچہ نَصَحتُكَ اور نَصَحتُ لَهُ بھی جائز ہے
والنصح : ارادۃ الخیر لغیرہ کما یرید لنفسہ (جمل) والنصح : تحرّی فعلٍ او قولٍ فیہ صلاح صاحبہ (مفردات)

عَجِبْتُمْ : اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ۔

العجب اور تعجّب، اُس حیرت کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا سبب نہ معلوم ہونے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ اسی بنا پر حکماء کا کہنا ہے کہ لفظ عجب کا اطلاق ذاتِ باری پر نہیں ہوتا ہے۔ چونکہ وہ تو علّام الغیوب ہے۔ کسی چیز کا سبب اُس پر مخفی نہیں۔ کہتے ہیں : عجبتُ عجبًا : میں نے تعجب کیا اور عجیبٌ ہر وہ چیز جس سے تعجب پیدا ہو اور اس جیسی چیز عام طور پر نہ دیکھی جاتی ہو اس کو عجیبٌ کہا جاتا ہے۔ جیساکہ فرمایا گیا کہ سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا۔ (کہنے لگے) ہم نے عجیب قرآن سُنا کہ اِس قرآن کا نہ تو سبب ہی معلوم ہے اور نہ اِس جیسا قرآن پہلے دیکھا ہے۔ اور بطور استعارہ کے ہر بھلی چیز کے لئے بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں : اَعْجَبَنِي كَذَا یعنی فلاں چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ عرب کا ایک مقولہ ہے۔ العجب کل العجب بین جمادیٰ و رجب۔ یعنی بڑا عجیب کام وہ ہے جو جمادی الاخریٰ اور رجب کے درمیان ہو۔ اس مقولہ کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے بھائی کی خوب صورت بیوی سے زنا کیا اور ان دونوں کے درمیان جمادی الاخریٰ میں جنگ ہوئی جبکہ اس ماہ میں عرب کے نزدیک جنگ حرام تھی۔

حدیثِ جبریل میں ہے فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْئَلُهُ وَ يُصَدِّقُهُ۔ ہم کو اُس شخص پر تعجب ہوا جو خود ہی سوال کرتا ہے اور پھر خود ہی تصدیق کرتا ہے۔ تعجب کی وجہ یہ ہے کہ سوال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہیں جانتا ہے اور تصدیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خوب جانتا ہے۔

اٰلَآء : فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کیا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اٰلَآء یہ جمع ہے۔ اس کی واحد میں چار لغات ہیں اِلًى جیساکہ اِنًى کی جمع آناءٌ۔ اِلْيٌ و اَلْوٌ و اَلًى۔ اس لفظ کی پوری تحقیق انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ رحمٰن میں ملے گی۔

وَقَعَ : قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ۔

الوقوع : کے معنی کسی چیز کے ثابت ہونے اور نیچے گرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے، کہتے ہیں : وقع الطیرُ وُقوعًا : پرندہ نیچے گر پڑا۔ اور الواقعۃ : اُس واقعہ کو کہتے ہیں جس میں شدت اور سختی ہو۔ قرآن پاک میں اس مادے سے جس قدر مشتقات استعمال ہوئے ہیں وہ زیادہ تر شدائد اور عذاب واقع ہونے کے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔ (مفردات)

ومعنی وَقَعَ ای وَجَبَ : یقال وقع القولُ

والحکم ای وَجَبَ (قرطبی) قرآن میں ہے فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَى اللّٰهِ (نساء)
وقعتِ الابلُ: اونٹ بیٹھ گئے۔ وَقَعَ رَبِيعٌ بالاَرْضِ: موسم بہار کی پہلی بارش برسی
وقائع العرب: عربوں کے ایام جنگ۔ وقیعۃ ہتھوڑا۔ وقع یقع وقوعًا۔ وَقَعَ الشیُٔ مِنْ یَدِی۔ چیز کا ہاتھ سے گر جانا۔ وقع الحق: حق کا ثابت ہونا۔ اور وقع فی فلان کا مطلب ہے کسی کو عیب لگانا۔ غیبت کرنا۔ گالی دینا۔
صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: واصل استعمال الوقوع فی نزول الاجسام واستعمالہ ھُنا مجاز من اطلاق السبب علی المسبب (روح)

دَابِرٌ: وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ۔
دابر: چیز کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ جڑ کاٹ دینے سے مراد یہ ہے کہ ان کا استیصال کر دیا۔ اور ان کا نام ونشان تک دنیا میں نہ چھوڑا۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے: لم یبق لھم بقیۃ (قرطبی)
والدابر: الآخر۔ ای اھلکناھم بالکلیۃ و دمرناھم عن آخرھم (روح)
وقطع الدابر ھو الاستیصال۔ فدل بھٰذا اللفظ انہ تعالیٰ ما ابقٰی منھم احدًا۔ و دابر الشیٔ آخرہ (کبیر)

دُبُر: یہ قُبُل کی ضد ہے۔ پُشت اور مقعد کو کہتے ہیں۔ قُبُل اور دُبُر یہ دونوں لفظ بطورِ کنایہ بول وبراز کے لئے بولے جاتے ہیں۔
اس میں دُبْرٌ اور دُبُرٌ دو لغت ہیں۔ اس کی جمع اَدْبَار آتی ہے۔ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ۔ فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْاَدْبَارَ۔
دَبَرَ (ن) دَبْرًا و دُبُورًا۔ دَبَرَ النَّهَارُ: دن کا ختم ہونا۔ دَبَرَ الْحَدِيثَ عَنْ فُلَانٍ: کسی کے مرنے کے بعد اُس کی بات نقل کرنا۔ بیان کرنا۔
دَبَّرَ الْاَمْرَ: کسی امر میں سوچ بچار کرنا۔ دَبَّرَ عَلٰى هَلَاكِهٖ: کسی کی ہلاکت کے لئے حیلہ کرنا۔ تَدَبَّرَ الْاَمْرَ: کسی امر کے نتائج پہ غور کرنا۔ دَبَرَ يَدْبُرُ دُبُورًا: پُشت پھیرنا۔ اور قطع الدابر: کسی قوم کو بیخ وبُن سے اکھاڑ دینے سے کنایہ ہے۔ وَقَطَعْنَا دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا کے معنی ہوں گے کہ ہم نے جھٹلانے والی قوم کا نام ونشان مٹا دیا اُن کے بعد ان کی نسل بھی باقی نہ رہی

نَاقَةٌ: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً
یہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی ہے تمہارے حق میں ایک نشان ہے۔ نَاقَةُ اللّٰهِ میں ناقۃ کی اضافت اللہ کی طرف ایسے ہی ہے جیسے کہ بیت اللہ میں بیت کی اضافت اللہ کی طرف۔ اس سے مراد مضاف کی عظمت وشرافت کا اظہار ہوتا ہے۔ قرطبی میں ہے:
واُضیفت الناقۃ الی اللہ تعالیٰ علی جھۃ اضافۃ الخلق الی الخالق وفیہ معنی التشریف

والتخصیص۔ قرطبی
واضیفت الی اسم اللہ تعظیماً لھا و تفخیماً لشانہا (کشاف)
نَاقَ یَنُوق نَوقاً: چربی کو گوشت سے جدا کرنا۔ نَوَّقَ تَنویقاً۔ نَوَّقَ الجَمَلَ: اونٹ کو اچھی طرح سدھانا۔
ناقۃٌ مُنَوَّقَۃ: سدھائی ہوئی اونٹنی۔
ناقۃ کی جمع نانق ونافات وانواق۔ و اَیْنُق۔ وَ وَجَدَ اَیْنُقَہ: اُس نے اپنی اونٹنیاں کو پالیا۔

سھول: وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَکُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُھُوْلِھَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا۔ (سورۃ الاعراف)

ترجمہ: اور اللہ کی یاد کرو، جب اس نے تم کو قوم عاد کے بعد زمین کا خلیفہ بنا دیا۔ اور تمہیں زمین پر ٹھکانا دیا۔ تم اُس کے نرم حصوں پر محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو۔

قوم ثمود بڑی صناع۔ سنگ تراشی اور فن تعمیر میں بڑی مشہور ہوئی ہے۔ قرآن پاک کے طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم دنیاوی علوم وفنون کی ماہر تھی۔ اور خاص کر جن علوم پر فن تعمیر اور قصر سازی مبنی ہے، ان پر اس قوم کو خاص مہارت حاصل تھی۔ جیسا کہ علم ریاضی، ہندسہ، انجنیری وغیرہ۔ اور آیت کے جملے فَاذْکُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰہِ سے اس طرف اشارہ بھی ہوتا ہے۔

السَّھْلُ: کے معنی نرم زمین کے ہیں۔ اسکی جمع سُھُوْلٌ آتی ہے۔ اور اَسْھَلَ کے معنی نرم زمین میں جانے کے ہیں۔ اور رَجُلٌ سَھْلِیٌّ کے معنی میدانی علاقہ کے رہنے والے کے ہیں۔ نرم خُو اور خوش اخلاق آدمی کو رَجُلٌ سَھْلُ الخُلُق کہتے ہیں۔ اور سُھَیل ایک مشہور ستارے کا نام ہے۔ (مفردات)

سھلٌ اصل میں حُزنٌ کی ضد ہے جس کے معنی زمین کی سختی کے ہیں۔
السّھلُ خلاف الحزن وھو موضع الحجارۃ والجبال (روح)
سُھُولَۃٌ اور سَھَالَۃٌ: نرمی، آسانی۔
تَسَاھُل۔ مساھلۃ: سُستی کرنا۔ نرمی کرنا چشم پوشی کرنا۔ اَھْلاً وَّسَھْلاً۔ یہ ایک محاورہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہت اچھی جگہ آئے، آپ کو یہاں ہر طرح کی سہولتیں اور آرام ملے گا۔ اَلْاِسْھَال: دست آنا۔ نرمی کے معنی یہاں بھی موجود ہیں۔
سَھُلَ۔ سَھُلَ الاَمْرُ: کام کا آسان ہونا۔ صیغہ صفت سَھْلٌ ہے

قُصُوْرًا: یہ قَصْرٌ کی جمع ہے۔ اونچی عالیشان عمارت اور محل کو کہا جاتا ہے۔ القِصَرُ: یہ طول کی ضد ہے۔ اور یہ دونوں اسمائے اضافی اور نسبتی سے ہیں۔ یعنی طول وقصر کا اعتبار ایک دوسرے کی نسبت سے ہوتا ہے۔ ایک چیز طویل ہے مگر دوسری چیز کے اعتبار سے قصیر بھی ہو سکتی ہے

قَصرتُ کذا کے معنی کسی چیز کو کم کرنے کے ہیں۔ اور تقصیر کے معنی کوتاہی اور سستی کے ہیں۔ قصرتُ کذا کے معنی سکڑنے اور کسی چیز کے بعض اجزاء کو بعض کے ساتھ ملانے کے بھی آتے ہیں۔ قَصرٌ اسی سے ماخوذ ہے۔
قَصرٌ واحد ہے۔ قرآن میں ہے: وَقَصرٍ مَّشِيدٍ اس کی جمع قصور ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُورًا۔ وَتَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا۔ (مفردات)

تَنْحِتُونَ: یہ نَحتٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی سخت پتھروں اور لکڑی وغیرہ کو کاٹنے اور تراشنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ مادہ چار جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور چاروں جگہ سنگ تراشی کے معنوں کے لئے آیا ہے۔
۱ وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا۔ اعراف
۲ وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا فَارِهِينَ (شعراء)
۳ قَالَ أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ (الصافات)
۴ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ الْجِبَالَ آمِنِينَ (الحجر)
لغت میں نحتٌ کے معنی سنگ تراشی اور لکڑی چیرنے کے برابر مستعمل ہیں۔ اور نُحاتۃ۔ ان ریزوں کو کہتے ہیں جو کاٹتے ہوئے گرتے ہیں اور انسانی فطرت کو اس لحاظ سے کہ انسان کی ساخت اس کے مطابق بنائی گئی ہے، نَحِيتَة کہا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ اس میں پیوست کی گئی ہے غریزۃ کہلاتی ہے۔ نَحتَ الحجرَ والخشبَ ونحوهما من الأجسام الصلبة (راغب)

والنحتُ معروف فی کل صلب (روح)
قرآن پاک میں نَحَتَ ضَرَبَ سے مستعمل ہے۔ لیکن چونکہ اس کا عین کلمہ حرف حلقی ہے اسلئے بعض قراء نے فتح سے بھی پڑھا ہے۔
نَحتَ العُودَ۔ لکڑی تراشنا۔ مِنحَتٌ: لکڑی تراشنے کا آلہ۔ جمع مناحتُ ومناحیت
النحتُ: نجرُ الشیءِ الصلب (جمل)

تَعْثَوْا: وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ۔ اور زمین پر فساد نہ پھیلاتے پھرو۔
العُثِيُّ کے معنی ہیں شدید فساد مچانا۔
العَيْثُ شدّة الفساد (قرطبی)
العیث اور عیثی دونوں جَذَبَ اور جَبَذَ کی طرح قریب المعنی ہیں۔ صاحب مفردات نے ایک لطیف فرق ان دونوں میں یہ نقل کیا ہے کہ العَيْث کا لفظ زیادہ تر حسّی فساد پر بولا جاتا ہے اور عَثِيٌّ یا مشدّدہ کے ساتھ حکمی فساد پر بولا جاتا ہے۔ عَثِيَ يَعْثَى عَيْثًا سے ہے۔ قرآن پاک میں اسی باب سے مستعمل ہے۔ وعلی هذا وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (راغب)
عَثِيَ يَعْثَى عِثِيًّا وعَثَى يَعْثُو عُثُوًّا۔ وعَاثَ يَعِيثُ عَيْثًا وعُيُوثًا ومَعَاثًا والأول لغة القرآن (قرطبی)

عَقَرُوا: فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ۔
العُقرُ: کے معنی حوض یا مکان کے اصل اور وسط کے ہیں۔ اور اس سے عَقرٌ (بفتح العین)

بھی کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے مَا غُزِیَ قَوْمٌ
فِی دَارِھِمْ اِلَّا ذَلُّوا۔ کسی قوم پر ان کے
گھروں کے وسط میں حملہ نہیں کیا جاتا، مگر وہ ذلیل
ہوجاتی ہے۔ عَقَرْتُهُ کے معنی ہیں جڑ پر مارنا
جیسے رَأَسْتُهُ کے معنی ہیں نے اس کے سر پر
مارا۔ عَقَرْتُ النخل اسی سے ہے یعنی کھجور کی
جڑ پر مارنا۔ عقرت البعیر: اونٹ کی
کونچیں کاٹ دیں۔ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ۔ تو اس نے
جسارت کی اور اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں۔
عَقَرَ یَعْقِرُ عَقْرًا۔ زخمی کرنا۔ کونچیں کاٹنا۔
اَلعَقْرُ: الجَرحُ وقیل قطع عَضْوٍ یُؤثّر
فِی النَّفْس (قرطبی) والعَقرُ قطع عرقوب البعیر
(غ) اَلعَقْرُ: الجَرْحُ وقیل قَطعُ عضْوٍ
یُؤثّر فی تَلَفِ النَّفس (فتح القدیر)

عَتَوْا: عَتَا یَعْتُوا عُتُوًّا عُتِیًّا عِتِیًّا
حکم عدولی کرنا۔ تکبر کرنا۔ حد سے گزرنا۔ صفت
عَاتٍ اس کی جمع عُتَاةٌ وعُتِیٌّ۔ عَتَا عن
الادب۔ ادب کو قبول نہ کرنا۔ اَلعَاتِی فاعل
ہے۔ بمعنی سرکش ومتمرد۔ لیلٌ عَاتٍ۔ سخت اندھیری
رات قرآن پاک میں ہے:

۱ وَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا
۲ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ (اعراف)
۳ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ (اعراف)
۴ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ
عُتُوًّا كَبِیْرًا (الفرقان)
۵ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ (الذاریات)
۶ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ (ملک)
۷ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِیًّا (مریم)
۸ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ
عَاتِیَةٍ (الحاقہ)
۹ اَیُّهُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا (مریم)

بعض اہل تفسیر نے یہاں عِتِیًّا کو مصدر کہا
ہے۔ اور بعض اہل علم کے نزدیک یہ عَاتٍ کی
جمع ہے۔ اور العَاتِی کے معنی ہیں سنگدل اور
اجڈ۔ عتا یعتو عُتُوًّا: ای استکبر وتعتّی
فلان: اذا لم یُطِع (قرطبی)
قال مجاهد: العُتُوّ: الغُلو فی الباطل (کبیر)
مَلِكٌ عَاتٍ: سخت دل بادشاہ۔
بئس العبدُ عبدٌ عَتَا وطغٰی: برا ہے وہ
بندہ جو سرکشی اور غرور کرے۔

الرَّجْفَةُ: فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ
فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ
پس انہیں زلزلے نے آپکڑا سو وہ اپنے گھروں
میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ الرَّجْفُ: اضطراب
شدید کو کہتے ہیں۔ رَجَفَتِ الاَرضُ اَوِ البَحرُ
کے معنی زمین یا سمندر میں زلزلہ آنے کے ہیں
بَحرٌ رَجَّافٌ: متلاطم سمندر۔ اور الارجاف
(باب افعال سے) جھوٹی افواہیں پھیلانا۔ چونکہ
ان کے ذریعہ سے بھی دل میں اضطراب پیدا ہوتا ہے
ایک مثل ہے۔ الاراجیف ملاقیح الفتن کہ
جھوٹی افواہیں فتنوں کی جڑ ہیں۔ قرآن پاک میں ہے
وَالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ۔ جو لوگ مدینہ میں

افواہیں پھیلاتے ہیں۔ الاراجیف: بناوٹی
خبریں۔ الرجفۃ: زلزلہ، بھونچال۔
رَجَفَ یرجُفُ رجفًا زور سے حرکت
دینا۔ رَجَفَ الرَّجُلُ: بے چین ہونا۔ ارجف
الریح الشجر: ہوا نے درخت کو ہلا ڈالا۔
الارتجاف: کانپنا۔ رجفۃ اصل میں اس
حرکتِ شدید کو کہتے ہیں جس میں آواز بھی ہو۔
یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ سے مراد وہ شدید
زلزلہ ہے۔ جس میں چیخ و آواز ہو۔ شاعر کا شعر
ہے ولمّا رایتُ الحجّ قد آن وقتُہٗ
وظلّت مطایا القوم بالقوم ترجفُ
و اَصْلُہٗ حَرَکَۃٌ مَعَ صَوْتٍ (قرطبی)

جٰثِمِیْنَ : یہ جثوم مصدر سے مشتق
ہے جس کے معنی ہیں بے حس و حرکت ہوکر
ایک جگہ پڑ جانا یا بیٹھ رہنا۔ معنی یہ ہیں کہ جو
جس حال میں تھا وہیں ڈھیر ہوگیا (معارف)
اصل میں جثم (ن۔ض) جثما وجُثُومًا
کے معنی ہیں پرندہ کا زمین پر سینہ کے بل گرنا۔
جَثَمَ الطائِرُ: پرندہ سینہ کے بل گر پڑا۔
اسی سے استعارہ کے طور پر فَاَصْبَحُوْا فِیْ
دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ فرمایا ہے۔
جٰثِمِیْنَ ای لاصقین بالارض علیٰ رکبھم
و وجوھھم (قرطبی)
الناس جُثَّمٌ ای قعودٌ لاحَرَاکَ بھم
(کشاف) جُثَّمٌ جاثِمٌ کی جمع ہے
واصل الجثوم : البروک علی الرکب
وقال ابوعبیدۃ : الجثوم للناس والطیر
بمنزلۃ البروک للابل (رح)
حدیث میں ہے نھی عن المجثّمۃ۔ آپ نے
جانوروں کو باندھ کر تیروں وغیرہ سے مارنے سے
منع فرمایا ہے۔
جثوم عام ہے، آدمیوں اور جانوروں تمام
کے لئے بولا جاتا ہے مگر اکثر اس کا استعمال خرگوشوں
میں ہوتا ہے۔ واصل الجثوم للارنب۔ ظرف
مکان مجثَمٌ ہے (قرطبی)
وقال ابن جریر الطبری: جاثمین یعنی
سقوطاً صرعیٰ لایتحرّکون لانھم لاارواح
فیھم قد ھلکوا (طبری ص۱۶۴ ج ۸)

غٰبِرِیْنَ : فَاَنْجَیْنٰہُ وَاَھْلَہٗٓ اِلَّا
امْرَاَتَہٗ کَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ
الغابر اس کو کہتے ہیں جو ساتھیوں کے
چلے جانے کے بعد پیچھے رہ جائے۔ قرآن پاک میں
دوسری جگہ ہے: اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ
مگر ایک بڑھیا پیچھے رہ گئی۔
اس آیت کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ غابرین
سے مراد عمر رسیدہ لوگ ہیں
وابوعبیدۃ یذھب الی أن المعنی من
المعمّرین، ای انھا قد ھرمت (قرطبی)
اور بعض نے حضرت لوط علیہ السلام کے مخالفین
مراد لئے ہیں۔ (جو سدوم میں) پیچھے رہ گئے تھے
اور جناب لوط علیہ السلام کے ساتھ ہجرت کرنے
سے انہوں نے گریز کیا تھا۔ اسی سے غُبْرَۃ ہے

جس کے معنی اس دودھ کے ہیں جو تھنوں میں رہ جاتا ہے۔ اس کی جمع اغبار آتی ہے غبّر اللیل رات کا بقیہ۔ غبّر الحیض۔ حیض کا بقیہ

الغبار : اس گرد کو کہتے ہیں جو مٹی اڑنے کے بعد فضا میں باقی رہ جاتی ہے۔ یہ دُخانٌ اور غُبَار یعنی (فُعَالٌ) کے وزن پر ہے جس کے معنی ہیں شے کا بقیہ حصہ۔ غَبَرَ الغُبَار : کے معنی ہیں گرد کا بلند ہونا۔ غبار اُڑنا۔

علامہ راغب صاحب مفردات القرآن نے لکھا ہے کہ غابر بعض کے نزدیک ماضی اور مستقبل دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ لفظ غابر ان حضرات کے نزدیک اضداد میں سے ہے۔ علامہ قرطبی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے

غبرالشئ اذا مضی و غبرالشئ اذا بقی وھو من الاضداد (قرطبی) اس قول کو صحیح مان لینے کے بعد یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ غبار بھی چونکہ زمین سے اُٹھ کر اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے غابر بمعنی ماضی آجاتا ہے اور دوڑتے ہوئے غبار چونکہ پیچھے رہ جاتا ہے اس لحاظ سے غابر بمعنی مستقبل آجاتا ہے۔

لیکن علامہ قرطبی نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ جو لفظ ماضی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ عابر عین مہملہ کے ساتھ ہے۔

وقال قوم : الماضی عابر بالعین غیر معجمۃ والباقی (مستقبل) غابر بالغین معجمۃ حکاہ ابن فارس فی المجمل۔ (قرطبی)

اور غبار سے غَبَرَۃٌ مشتق ہے اور اس کے معنی یا تو اس گرد و غبار کے ہیں جو کسی چیز پر جم جاتا ہے اور خاکستری رنگ کی چیزوں کو بھی غَبَرَۃ کہا جاتا ہے۔ آیت کریمہ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْہَا غَبَرَۃٌ میں بطور کنایہ مایوس اور حسرت آگیں چہرے مراد ہیں جو غم کی وجہ سے افسردہ نظر آئیں گے جیسا کہ ظَلَّ وَجْہُہٗ مُسْوَدًّا میں چہرے کے سیاہ پڑ جانے سے مراد غمناک ہونا ہے۔ دَاھِیَۃٌ غَبْرَاءُ بڑی بھاری مصیبت۔ یہ ایک محاورہ ہے جس کے اشتقاق میں چند احتمال ہیں ایک یہ کہ : یہ محاورہ غَبَرَ الشئ سے ماخوذ ہے جس کے معنی غبار میں واقع ہونے کے ہیں۔ گویا مصیبت بھی انسان کو غبار آلود کر دیتی ہے اور ہوش بھی سنبھالنے نہیں دیتی اور دوسرا احتمال یہ کہ غُبْرٌ سے مشتق ہو جس کے معنی باقی رہنے کے ہے۔ اس اعتبار سے غَبْرَاءُ اس مصیبت کو کہا جائیگا جو باقی رہے اور گزرنے کا نام نہ لے۔ اور یا یہ غَبَرَۃُ اللَّوْن سے ماخوذ ہے۔ جس طرح کہ دَاھِیَۃٌ زَبَّاءُ کا محاورہ ہے۔ اور یا کہ غُبْرَۃ اللَّبَن سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں تھنوں میں بقیہ دودھ۔ ان سب اشتقاقات کے اعتبار سے غبراء اس مصیبت کو کہا جاتا ہے جو باقی رہے اور گزر جانے کے بعد بھی اپنے آثار باقی چھوڑ دے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ اکثر غابر کا لفظ لغت میں مستقبل کے معنوں میں مستعمل ہے۔

فما وُنِیَ مُحَمَّدٌ مُذ اَن غَفَر
لَہُ الالٰہُ مامضیٰ وَمَا غَبَر

اس شعر میں غَبَرَ مَضٰی کے مقابل ہے
غَبَرَ یَغْبُرُ غُبُوْرًا : گذر جانا، ٹھہر جانا، گرد آلود ہونا۔ غَبِرَ (س) غَبَرًا۔ غَبِرَ الجُرْحُ : زخم کا فساد کے باوجود بھر جانا اور پھر بعد میں پھوٹ پڑنا۔ غَبَّرَ الشیءَ (تفعیل) کسی چیز کو غبار آلود کرنا۔ محاورہ میں کہتے ہیں غَبَّرَ فِی وَجْہِ فلان دوڑ میں کسی سے آگے نکل جانا گویا اس کے چہرے کو غبار آلود کر دینا۔ الغُبَیْرَاءُ : باجرہ۔ جوار کی شراب۔ ایک خاص قسم کی گھاس۔ الغَابِر : اسم فاعل بمعنی گذشتہ و باقی ماندہ۔ کہتے ہیں ھُوَ غَابِرُ بَنِی فُلَانٍ : وہ فلاں خاندان کا تتمہ ہے

مَدْیَن : وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا
مدین شہر کا نام ہے۔ اپنے بانی و مؤسس خاندان مدین بن ابراہیم کی طرف منسوب ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کی بیوی قطورا سے متولد ہیں۔ یہ ملک طولاً خلیج عقبہ (عیلانہ) کے سواحل پر دہانہ خلیج سے .... ساحل بحر احمر دارض ثمود و حجاز تک جہاں ثمود و جرہم و عرب اسماعیل آباد تھے، واقع تھا (ارض القرآن)

شُعَیْب : وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا۔ حضرت شعیب علیہ السلام محمد بن اسحٰق کی کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مدین کی اولاد میں سے ہیں اور لوط علیہ السلام سے بھی رشتہ قرابت رکھتے ہیں۔

مَدْیَن : (جیسا کہ اوپر گذرا) ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں ان کی نسل اور اولاد بھی مدین کے نام سے مشہور ہو گئی اور جس بستی میں ان کا قیام تھا اس کو بھی مدین کہتے ہیں۔ گویا مدین ایک قوم کا نام بھی ہے اور شہر کا بھی۔ یہ شہر آج بھی شرق اُردن کی بندرگاہ معان کے قریب موجود ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ موسیٰؑ کے قصہ میں ارشاد ہے وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ اس میں بھی بستی مراد ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے حُسن بیان کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا تھا۔ حافظ عماد الدین بن کثیر نے محمد بن اسحٰق کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سُریانی زبان میں حضرت شعیب علیہ السلام کا نام یَثْرُوْن ہے (ابن کثیر)

اَلْکَیْلُ : فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا۔
الکیل : کے معنی غلّہ ناپنے کے ہیں۔ اور یہ کِلْتُ لہ الطّعام : لام کے صلہ کے ساتھ، کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اس کے غلّہ ناپنے کی ذمہ داری سنبھالی اور کِلْتُ الطعام (بغیر لام) کے معنی ہیں کہ میں نے اس کو غلّہ ناپ کر دیا۔ اور اِکْتَلْتُ عَلَیْہِ کے معنی ہیں میں نے اس سے ناپ کر لیا۔ فرمایا اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ۔ فَاَوْفِ لَنَا الْکَیْلَ۔ وَنَزْدَادُ کَیْلَ بَعِیْرٍ۔ یہاں الکیل سے مراد ایک اونٹ کا بوجھ ہے۔
الکیل : کیل الطعام (مفردات)

الکیل : سے مراد یہاں آلۂ کیل یعنی ناپنے کا
آلہ (مکیال) ہے یا وہ چیز جو ناپی جائے۔
أُرید بالکیل آلۃ الکیل وھو المکیال او سمّی
ما یُکال بہ بالکیل (کشاف)
کیل۔ مکال اور مکیل کے معنی ہیں ناپنا گز
سے ہو یا پیمانہ سے۔ المکیال: پیمانہ جس سے
ماپا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے: المکیال مکیال
اھل المدینۃ والمیزان میزان اھل مکۃ۔
کِیَالَۃٌ: ماپنے تولنے کا پیشہ۔
کیّال: تولنے اور ماپنے کا پیشہ کرنے والا
کَالَ یَکِیْلُ کَیْلاً و مَکَالاً: غلہ کی مقدار کو
کسی پیمانے سے ناپنا۔ یہ بھی دو مفعولوں کی طرف
متعدی ہوتا ہے جیسا کہ کلتُ زیداً الطعام
اور کبھی اس کے مفعولِ اول پر لام داخل ہوتا ہے
جیسے کہ کلتُ لزید الطعام

بَخْسٌ : وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
اَشْیَآءَھُمْ۔
بَخَسَہٗ (ف) بخساً گھٹانا۔ مقولہ ہے:
لا تَبْخَس اخاک حقہ تو اپنے بھائی کا
حق نہ گھٹا۔ بَخَسَ عَینَہٗ: آنکھ پھوڑ دینا
تباخس القوم: لوگوں کا ایک دوسرے کو
نقصان پہنچانا۔ اَلْبَخْسُ مصدر ہے ب خ س
قرآن پاک میں ہے: وَشَرَوْہُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ
یعنی ان کو گھٹیا قیمت پر فروخت کر دیا۔
اصل میں بَخْس کے معنی کوئی چیز ظلم سے ناحق کم
کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک کی آیت
وَھُمْ فِیْھَا لَا یُبْخَسُوْنَ میں اسی طرف اشارہ ہے
البخس: النقص، وھو یکون فی السلعۃ
بالتعییب والتزھید فیھا او المخادعۃ عن
القیمۃ (قرطبی ص۲۴۸ ج ۷)
یقال بخس فلان فی الکیل والوزن اذا
نقصہ و طففہ (خازن)
البخس: نقص الشیٔ عن سبیل الظلم
(مفردات) حدیث میں ہے: یأتی علی الناس
زمان یُستحل فیہ الربا بالبیع والخمر
بالنبیذ والبخس بالزکوٰۃ۔ ایک ایسا زمانہ
آنے والا ہے جب لوگ سود کو بیع اور شراب کو
نبیذ اور بخس کو زکوٰۃ کہکر حلال کرلیں گے۔ یعنی
ناجائز محصولات رعایا سے لیکر اس کو زکوٰۃ کا نام
دیدیں گے۔

یَغْنَوْا : اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَاَنْ
لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا، اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا
کَانُوْا ھُمُ الْخٰسِرِیْنَ۔ جن لوگوں نے
شعیبؑ کو جھٹلایا تھا وہ ایسے مرمٹے کہ گویا
وہ ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے (غرض) جن
لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا گھاٹے میں وہ ہی
رہے کہ بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔
الغنٰی کے اصل معنی ہیں تونگری اور بے نیازی
غَنِیَ فی مکانِ کذا کے معنی ہیں کسی جگہ
مدتِ دراز تک اقامت کرنا، گویا وہ دوسری
جگہوں سے بے نیاز ہے۔ اسی سے مجازی معنی
بسنے اور آباد ہونے کے ہیں لَمْ یَغْنَوْا فِیْھَا سے

مراد یہ ہے کہ ایسے مٹا دیئے گئے کہ گویا صدیوں سے وہاں کوئی بستا ہی نہ تھا۔

المَغْنٰی: یہ اسم مصدر اور ظرف مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جمع مَغَانِی ہے۔ لفظ غِنٰی کے ایک معنی کسی مقام میں خوش عیشی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ بعض اہل لغت نے یہاں یہی معنی مراد لئے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ جن مکانات میں آرام و عیش کی زندگی گزارتے تھے وہ عذاب الٰہی کے بعد ایسے ہو گئے گویا کبھی یہاں آرام و عیش کا نام ہی نہ تھا۔ یقال غَنِیَ بالمکان۔ یَغْنیٰ غِنًی وغِنیانًا اِذَا قَامَ بِہٖ دَھْرًا طویلًا وقیدہ بعضھم بالاقامۃ فی عیشٍ رغدٍ (روح)

اٰسٰی: فَکَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ۔
تو میں کافر قوم پر کیونکر افسوس کروں۔
قوم کی انتہائی سرکشی اور نافرمانی سے مایوس ہو کر شعیب علیہ السلام نے قوم کے حق میں بد دعا فرما دی مگر جب اس کے نتیجے میں قوم پر عذاب آیا تو پیغمبرانہ شفقت و رحمت کے سبب دل دکھا تو اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے قوم کو خطاب کر کے فرمایا کہ: میں نے تو تم کو تمہارے رب کے احکام پہنچا دیئے تھے، تمہاری خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا مگر میں کافر قوم کو کہاں تک غم کروں۔
اٰسٰی: یہ اصل میں اَأْسٰی۔ صیغہ واحد متکلم ہے دوسرا ہمزہ الف سے بدل دیا گیا ہے۔

اَسِیَ (س) اَسًی غمگین ہونا۔ صفت آسٍ۔ جمع اَسْیَانُوْن۔ مؤنث آسیۃ و اسیانہ، جمع آسیات واَسَایَا و اَسْیَیَان۔ اُسًی: ای احزن۔ اسیتُ علی الشئ آسی واُسًی وانا آسٍ (قرطبی) اَلْاَسٰی بمعنی حزن آتا ہے۔ اصل میں اس کے معنی کسی فوت شدہ چیز پر غم کھانا۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ فرمایا فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ۔
شاعر نے کہا ہے اَسِیْتُ لِاَخْوَالِی رَبِیْعَۃَ میں نے اپنے اخوال ربیعہ پر افسوس کیا (مفردات)
اَسِیَ یہ ناقص واوی ہے کیونکہ محاورہ میں غمگین آدمی کو اَسْوَانُ کہا جاتا ہے۔ مُوَاسَاۃٌ: غمخواری کرنا۔ معاش اور روزی میں اپنے برابر رکھنا۔
آسِیَۃ ستون کو بھی کہتے ہیں اس کی جمع اواسی آتی ہے۔ حدیث میں ہے: اوثقَ نَفْسَہ اِلٰی آسِیَۃٍ من اواسی المسجد۔ مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا۔

اَلضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ: ثُمَّ بَدَّلْنَا مَکَانَ السَّیِّئَۃِ الْحَسَنَۃَ حَتّٰی عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰھُمْ بَغْتَۃً وَّھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۔
مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب کبھی ہم کسی قوم کی طرف اپنے رسول بھیجتے ہیں اور وہ ان کی بات نہیں مانتے تو ہماری عادت یہ ہے کہ اول ان کو دنیا ہی میں مالی اور جانی تنگی و بیماری وغیرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں تاکہ وہ کچھ ڈھیلے ہو جائیں اور انجام پر نظر کر کے اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ اس کے بعد

دوسری آزمائش مال و دولت اور آل و اولاد کی وسعت اور بیماری کے بجائے صحت و سلامتی عطا کرکے کی جاتی ہے۔ اس امتحان کا حاصل یہ تھا کہ مصیبت کے بعد راحت اور مال و دولت ملنے پر وہ خدا کے شکرگزار رہوں اور اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں لیکن یہ غفلت شعار مادی راحتوں میں اور لذتوں میں بدمست اس سے ہوشیار نہ ہوئے، بلکہ یہ کہنے لگے کہ فقر و فاقہ اور امراض و مصائب کا آنا کوئی نئی بات نہیں ہے اور نہ ہی ان کو کوئی اچھے بُرے اعمال سے تعلق ہے۔ بلکہ یہ تو زمانہ کی عادت ہے کہ کبھی رنج کبھی راحت کبھی بیماری، کبھی صحت کبھی تنگی کبھی فراخی ہوا کرتی ہے۔ قَدْ مَسَّ اٰبَآءَ نَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ یعنی اس طرح کے حوادث تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادوں کو بھی پیش آچکے ہیں ای وماذٰلک اِلَّا مِن عَادَۃِ الدَّھْرِ یُعَاقِبُ فی الناس بین الضَّرَّاءِ والسَّرَّاءِ ویداولھا بینھم۔ (روح)

توجب یہ لوگ دونوں طرح کے امتحانوں میں ناکام رہے اور ہوش میں نہ آئے تو پھر ہم نے ان کو اچانک اس طرح عذاب میں پکڑ لیا کہ ان کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔ بُؤسٌ اور بأساء کے معنی فقر و فاقہ اور ضَرَّاء و ضَرٌّ کے معنی بیماری و مرض کے آتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جابجا اسی معنی میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی اس کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ بُؤسٌ اور بأساء مالی نقصان کے لئے بولا جاتا ہے۔

اور ضرٌّ والضَّرَّاء جانی نقصان کے لئے بولا جاتا ہے۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

بِالْبَأْسَآءِ ای بالبؤس والفقر۔ والضَّرَّآءِ بالضرر والمرض و بذلک فسّرھما ابن مسعود وھو معنی قول من قال البأساء فی المال والضَّرَّاء فی النفس۔ (روح)

سَیِّئَۃٌ : بُرائی۔ گناہ۔ اس کی اصل سَیْوِئَۃٌ تھی واو کو ی سے بدل کر یا کا یا میں ادغام کردیا گیا ہے۔ سَیِّئَۃٌ سے مراد فقر و فاقہ اور بیماری و دیگر مصائب کی بدحالی ہے۔

حَسَنَۃٌ سے مراد اس کے بالمقابل مال میں وسعت و فراخی اور بدن میں صحت و سلامتی ہے۔ دیکھئے البقرہ کے لفظ حَسَنَۃ کے تحت۔

عَفَوْا : یہ عَفْوٌ سے بنا ہے جس کے ایک معنی بڑھنے اور ترقی کرنے کے بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے: عَفَا النَّبَاتُ : گھاس یا درخت بڑھ گئے عفا الشحمُ والوبرُ : جانوروں کی چربی اور بال بڑھ گئے۔ اس معنی سے اس جگہ عفو کے معنی ہیں بڑھ گئے اور ترقی کر گئے۔ عَفَوْا اضداد میں سے ہے جس کے معنی بڑھنے کے بھی آتے ہیں۔ قرآن میں یہی مراد ہیں اور گھٹنے کے بھی آتے ہیں۔ عفا من الاضداد۔ عفا: کثر وعفا: دَرَسَ (قرطبی) لیکن لفظ عفا بڑھنے کے معنوں میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اور قرآن پاک نے انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

وفی المصباح وعفا الشیءُ کَثُرَ وفی التنزیل

حتیٰ عَفَوْا ای کَثُرُوْا (جمل)

بَرَکٰتٍ : وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۔ یعنی اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے ۔

برکات : بَرَکَة کی جمع ہے اور بَرْكٌ سے ماخوذ ہے ۔ برك کے معنی اونٹ کے سینہ کے ہیں جس پر وہ جم کر بیٹھ جاتا ہے ۔ اور اونٹ کے سینہ کو بِرْكَةٌ کہا جاتا ہے ۔ کہتے ہیں بَرَكَ البعيرُ : اونٹ اپنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا ۔ پھر اس سے معنی لزوم کا اعتبار کرکے ابترکوا فی الحرب کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنا ۔ دشمن کے ساتھ ڈٹ کر لڑنا بُرُ کاء الحرب و بَرُوکاءُ ها : سخت میدان جنگ میں جہاں صرف بہادر ٹھہر سکتے ہوں ۔

ابترکت الدابة : چوپائے کا جم کر کھڑا ہو جانا

بِرکة ۔ حوض ۔ وہ جگہ جہاں پانی جمع ہو ۔

البَرَکَة کے معنی کسی شے میں خیر الٰہی ثابت ہونے کے ہیں اور برکت کے معنی خیر الٰہی سے کسی چیز میں زیادتی کے بھی ہیں ۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے برکت کا ظہور دنیا میں دو طرح سے ہوتا ہے کبھی تو اصل چیز واقع میں بڑھ جاتی ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں ایک معمولی برتن کے پانی سے پورے قافلہ کا سیراب ہونا یا تھوڑے کھانے سے ایک مجمع کا شکم سیر ہو کر کھانا ۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر چیز میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی ، مقدار اتنی ہی رہتی جتنی تھی لیکن اس سے کام اتنے نکلے جتنے اس سے دوگنی چوگنی چیز سے نکلتے ۔ اور اس کا مشاہدہ عام طور پر کیا جاتا ہے کہ کوئی برتن ۔ کپڑا گھر یا گھر کا سامان ایسا مبارک ہوتا ہے کہ اس سے آدمی عمر بھر راحت اٹھاتا ہے اور پھر بھی قائم رہتا ہے ۔ اور بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ بناتے ہی ٹوٹ گئیں اور اگر ثابت بھی رہیں تو اس سے کوئی نفع حاصل نہ ہوا اور اگر نفع بھی ہوا تو بہت تھوڑا ۔ اور یہ برکت انسان کے مال میں بھی ہوتا ہے جان میں بھی ۔ کام میں بھی اور وقت میں بھی ۔ بعض مرتبہ ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی قوت اور طاقت اور صحت کا سبب بن جاتا ہے ۔ اور بعض مرتبہ بڑی سے بڑی طاقت والی غذا اور دوا کام نہیں دیتی ۔ اسطرح بعض اوقات میں بھی بڑی برکت ہوتی ہے تو ایک گھنٹہ میں اتنا کام ہو جاتا ہے کہ دوسرے اوقات میں چار گھنٹوں میں بھی نہیں ہوتا ان تمام صورتوں میں اگرچہ مقدار میں نہ مال بڑھا ہے اور نہ وقت ، مگر برکت کا ظہور اس طرح ہوا کہ اس سے کام بہت نکلے ۔ (معارف القرآن)

مبارك : ہر وہ چیز جس میں خیر و برکت پائی جاتی ہو ۔ قرآن میں وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ (انبیاء) وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ (انعام) كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ (ص)

اور خیر الٰہی چونکہ غیر محسوس طریقہ پر صادر ہوتی ہے

اور بے شمار طریقوں پر پائی جاتی ہے۔ اس لئے ہر اُس چیز کو جس میں غیر محسوس طور پر زیادتی محسوس ہو اس کو مبارک یا برکت کہدیتے ہیں۔ اور حدیث میں جو مروی ہے کہ لا ینقص مال من صدقۃ کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا تو اس سے بھی اس قسم کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ نقصان حسی کی نفی نہیں جیسا کہ بعض بدنصیبوں نے اعتراض کیا ہے کہ اگر صدقہ سے کم نہیں ہوتا تو ترازو سے تول کر دیکھ لو (مفردات القرآن)

واصل البرکۃ ثبوت الخیر الالٰہی فی الشئ۔ وقال البغوی اصل البرکۃ المواظبۃ علی الشئ (جمل)

ضُحًی : اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓی اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًی وَّهُمْ یَلْعَبُوْنَ

الضحٰی: کے اصل معنی دھوپ کے پھیل جانے کے اور دن چڑھ آنے کے ہیں۔ پھر اُس وقت کو ضحٰی کہا جاتا ہے۔ جس میں دھوپ پھیل جائے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔ وَاَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًی۔ تَضَحّٰی۔ ضُحٰی کا کھانا کھانا، جیسے تغدّٰی دوپہر کا کھانا کھانا۔ لیلۃ اِضحیانۃ اور ضحیاء: چاندنی رات۔ اُضْحِیَّۃٌ کی جمع اَضَاحِیّ اور ضَحِیَّۃٌ کی جمع ضَحَایَا اور اَضْحَاۃٌ کی جمع اَضْحٰی آتی ہے۔ ان سب کے معنی قربانی کے ہیں۔ اور شرعاً قربانی بھی چونکہ نماز عید کے بعد چاشت کے وقت دی جاتی ہے اس لئے اسے اُضْحِیَّۃٌ کہا جاتا ہے (مفردات)

ضُحٰی ای ضحوۃ النھار وھی فی الاصل ضوء الشمس اذا ارتفعت (ابوالسعود)

الضحٰی: اشتداد الشمس وامتداد النھار (جمل)

لفظ ضحٰی کو اگر ضمہ کے ساتھ پڑھا جائے تو مقصور ہوگا یعنی اس صورت میں اس کو الف مقصورہ کے ساتھ پڑھنا ہوگا۔ اور اگر بفتح الضاد پڑھیں تو الف ممدودہ کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ جیسے ضحاء۔ یُقَالُ ضُحٰی وضَحَاءٌ اذا ضممتہ قصرتہ واذا فتحتہ مددتہ (جمل)

ضحا یضحوا ضحوًا وضُحِیًّا۔ ضحا الرجل: دھوپ کھانا۔ ضحا الطریق: راستہ کا ظاہر ہونا۔ کہا جاتا ہے ضَحَا ظِلُّہ: وہ مر گیا ضَحِیَ یَضْحٰی ضَحًی وضَحَاءً: دھوپ لگنا سورج سے تکلیف اٹھانا

یَهْدِ: اَوَلَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ۔

هَدٰی یَهْدِیْ کے معنی نشاندہی کرنے اور بتلانے کے آتے ہیں۔ اس جگہ اس کا فاعل وہ واقعات ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ موجودہ زمانہ کے لوگ جو پچھلی قوموں کے ہلاک ہونے کے بعد ان کی زمینوں مکانوں کے وارث بنے یا آئندہ بنیں گے کیا ان کو پچھلے عبرت ناک واقعات نے یہ نہیں بتلایا کہ کفر وانکار اور احکام خداوندی کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں جسطرح ان کے مورث اعلیٰ یعنی پچھلی قومیں برباد و ہلاک ہو چکی ہیں اسطرح اگر

یہ بھی جرائم کے مرتکب رہتے تو ان پر بھی اللہ تعالیٰ
کا قہر و عذاب آ سکتا ہے

حَقِیْقٌ : حَقِیْقٌ عَلٰٓی اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَی
اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ۔ مجھ پر واجب ہے کہ خدا کی طرف
سے جو کچھ کہوں سچ کہوں۔

بعض نے کہا ہے کہ حقیقٌ یہاں بمعنی جدیرٌ
یعنی سزاوار ہے اور بعض نے بمعنی واجب لکھا ہے۔
ایک قرأت میں حَقِیْقٌ عَلَیَّ بھی ہے۔ لفظِ حق کی
تحقیق گذر چکی ہے۔

ثُعْبَانٌ : فَاَلْقٰی عَصَاہُ فَاِذَا ھِیَ
ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ۔ تو جناب موسیٰ نے اپنے
لاٹھی کو ڈال دیا۔ تو وہ دفعۃً ایک صاف اژدھا
بن گیا۔

ثُعبان بڑے اژدھے کو کہا جاتا ہے۔
اور اس کی صفت مُبِیْن ذکر کر کے بتلا دیا کہ اس
لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی ایسا واقعہ نہ تھا
کہ کسی اندھیرے یا گوشہ پردہ میں واقع ہوا ہو۔
جس کو کوئی نہ دیکھے جیسے عموماً شعبدہ بازوں یا
جادوگروں کا طرز ہوتا ہے بلکہ یہ واقعہ بھرے
دربار میں پیش آیا۔

ثعبان : یہ دراصل ثعبَ الماءُ سے ماخوذ
ہے جس کے معنی ہیں پانی کا جاری ہونا، بہنا
ثَعَبَ الْمَطَرُ : بارش کا بہتا ہوا پانی یا
برساتی نالے۔ حدیث میں صلّٰی وجُرحُہٗ
یَثعَبُ دَمًا۔ حضرت عمرؓ نے نماز پڑھی در آں
حالیکہ آپؓ کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔

مُثعَبٌ : حوض۔ پانی بہنے کی جگہ۔ اس کی جمع
مثاعبٌ آتی ہے۔ سالتْ مثاعبُ الماءِ :
ندی نالے بہہ نکلے۔

سانپ بھی چونکہ زمین پر اس طرح چلتا ہے
جیسے پانی بہہ رہا ہوتا ہے اس لئے اس کو
ثعبان کہا گیا ہے۔ ثُعبَۃٌ گرگٹ کو بھی کہا جاتا
ہے۔ یہ چونکہ شکل و صورت میں سانپ کے
مشابہ ہوتا ہے اس لئے اس کو ثُعبۃٌ کہا جاتا ہے،
اور چونکہ سانپ سے چھوٹا ہے اس لئے نام میں تخفیف
کی گئی ہے (راغب)

ثُعبان اگرچہ مذکر و مؤنث دونوں پر بولا
جاتا ہے مگر عام طور پر اس کا استعمال بڑے اور
مذکر سانپ کے لئے ہوتا ہے۔

والثعبان : الحیۃ الضخم الذکر وھو
اعظم الحیات (قرطبی)

نَزَعَ : وَنَزَعَ یَدَہٗ فَاِذَا ھِیَ بَیْضَآءُ
لِلنّٰظِرِیْنَ۔

نَزْعٌ کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں سے
کسی قدر سختی کے ساتھ نکال لینے کے ہیں۔ مراد
یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ
کھینچ کر نکالا (مزید تحقیق گذر چکی ہے)

بیضاء : کے لفظی معنی سفید کے ہیں اور ہاتھ
کا سفید ہو جانا برص کی بیماری کی وجہ سے
بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے دوسری جگہ پر فرمایا
مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ یعنی ہاتھ کا سفید ہونا بیماری
کی وجہ سے نہ ہوگا بلکہ یہ معجزۂ الٰہی ہوگا۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ سفیدی بھی کوئی معمولی نہ تھی بلکہ عبد اللہ بن عباس کی روایت کے مطابق ہاتھ کی چمک سے پوری فضا روشن ہوجاتی تھی۔ الید البیضاء سے مراد باجماعِ امت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ ممتاز معجزہ ہے جس نے اپنی قدرتی چمک سے حکومتِ فرعونیہ کو متزلزل اور پورے ملک کے ساحروں اور دانشوروں کو سرنگوں کردیا تھا۔ یدِ موسوی کی یہ کیفیت ان کی نبوت ورسالت پر ایسی دلیل تھی جس کا کوئی جواب نہ تھا پھر یہیں سے الید البیضاء ان دلائل وبراھین پر بولے جانے لگا ہے جو مخالف کو لاجواب کردیں۔

اَرْجِهْ: قَالُوْا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ۔ لوگوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دیجئے اور ہرکارے شہر شہر بھیجئے۔

لفظ اَرْجِهْ مہموز ہے۔ اِرْجَاءٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ڈھیل دینے مہلت دینے اور امید دلانے کے ہیں۔ ابن عباس کا قول ہے کَانَ النَّاسُ یَرِدُوْنَ مِنْہُ اَرْجَاءَ وَادٍ رَحْبٍ: لوگ امیر معاویہ کے پاس آتے تھے تو گویا ایک کشادہ میدان کے کناروں پر آتے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بڑے متحمل مزاج سخی داتا تھے۔

رَجَا یَرْجُوْ رَجَاءً وَرَجْوًا وَرَجَاوَۃً: امیدوار رہنا۔ رجا الشیئَ: امید کرنا، خوف کرنا۔

اَرْجَیَ الْاَمْرَ: مؤخر کرنا۔

اَرْجِهْ کے معنی بعض حضرات نے اَحْبِسْہُ کے لئے ہیں یعنی یہ کہ اس کو قید کرلو۔ لیکن اہلِ تحقیق نے ان معنی کا انکار ایک تو اس لئے کیا ہے کہ ارجاء لغتِ عرب میں حبس کے معنی میں مستعمل نہیں اور پھر دوسرے اس لئے بھی کہ موسوی معجزات کو دیکھ کر فرعون قید کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مفسر قتادہ سے اَرْجِهْ کے معنی حبس کے لیتے ہیں بعض حضرات نے اَرْجِهْ کو رَجَا یَرْجُوْ سے مانا ہے جس کے معنی امیدوار رہنے کے ہیں تو اَرْجِهْ کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو لالچ اور طمع دو۔ اَرْجِهْ اَیْ اَطْمِعْہُ (قرطبی)

تَلْقَفُ: فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ

لَقِفْتُ الشَّیْئَ اَلْقَفُہٗ وَتَلَقَّفْتُہٗ کے معنی کسی چیز کو ہوشیاری اور حذاقت سے لینا کے ہیں اور یہ منہ اور ہاتھ دونوں سے لینے کے لئے بولا جاتا ہے، لہٰذا آیت فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ فوراً جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو ایک ایک کرکے نگلنے لگا۔

لَقِفَ (س) لَقْفًا وَلَقَفَانًا۔ وَالْتَقَفَ الشَّیْئَ چیز کو جلدی سے لے لینا۔ لَقِفَ الْحَوْضُ: حوض کا اندر سے گر کر وسیع ہونا۔ اَللَّقَفُ: کنویں یا حوض کا کنارہ۔ جمع اَلْقَاف۔

اَللَّقَافَۃُ: ہوشیاری، مہارت۔ صفت لَقِفٌ وَلَقِیْفٌ: ہوشیار اور دانا آدمی۔

روایت میں ہے تَلَقَّفْتُ التَّلْبِیَۃَ مِنْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ میں نے لبّیک خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے سن کر حاصل کی ہے۔

روایتِ حفص عن عاصم جو مشہور ہے اس میں تو تَلْقَفُ لَقِفَ سے لام کے سکون اور حرف قاف کی تخفیف سے پڑھا گیا ہے یعنی لَقِفَ یَلْقَفُ سے تَلْقَفُ صیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔ اور باقی قراء نے قاف کی تشدید کے ساتھ تَلَقَّفُ پڑھا ہے۔ ان کے نزدیک یہ باب تفعّل سے ہے۔ مضارع میں ایک تاء کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور جن حضرات نے تَلْقَفُ قاف کی تخفیف سے پڑھا ہے ان کے نزدیک اس کا مصدر اَللَّقْفُ ہے۔ تَلْقَفُ اور تَلْقَمُ دونوں کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں۔ فرق ان دونوں میں اتنا ہے کہ تلقف منہ اور ہاتھ دونوں سے لینے پر بولا جاتا ہے اور لَقِمَ کا استعمال منہ سے لینے پر کیا جاتا ہے۔

ایک شاعر نے کہا ہے:

انتَ عصا موسى التي لم تزلْ
تلقم ما يأ فِكه السّاحرُ

اس شعر میں تلقم تلقف کے معنی میں ہے۔ (کبیر، قرطبی، مفردات)

رَجُلٌ لَقِفٌ سَرِيعُ الاخذ (کبیر)

يَأْفِكُونَ: اَفَكَ يَأْفِكُ اَفْكًا وَاُفُوكًا جھوٹ بولنا۔ سمع اور ضرب دونوں ابواب سے ایک معنی میں آتا ہے۔ اَفَكَهٗ عن رَأْيِهٖ: کسی کو اپنی رائے سے پھیر دینا۔ الاِفْكُ: دراصل ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رُخ سے پھیر دی گئی ہو اسی بنا پر ان ہواؤں کو جو اپنا اصلی رُخ چھوڑ دیں مُؤْتَفِكَة کہا جاتا ہے۔ اور وہ بستیاں جن کو خدا نے مع رہنے والوں کے اُلٹ دیا مُؤتفکات کہتے ہیں۔ جھوٹ بھی چونکہ اصلیت اور حقیقت سے پھرا ہوتا ہے اس لئے اس پر اِفک کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ (النور) جن لوگوں نے یہ بہتان تراشا ہے تم ہی لوگوں میں سے ایک جماعت ہے۔

معنى الافك في اللغة: قلبُ الشئ عن وجهه ومنه قيل للكذب إفك لانّه مقلوبٌ عن وجهه (کبیر)

الافك: كل مصروفٍ عن وجهه الذى يحق ان يكون عليه۔ (مفردات)

والافك: صرفُ الشئ وقلبه عن الوجه المعتاد (روح)

اَلطُّوفَانُ: فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ

الطوفان: عربی لغت میں ہر شدید و ملک گیر حادثہ و ابتلاء کو کہتے ہیں۔ الطوفان كلّ حادثة تحيط بالانسان (راغب)

قال الزجاج: الطوفان من كل شئ ما كان كثيرًا محيطًا مطبقًا بالقوم كلّهم (کبیر)

طوفان اسم جنس ہے طَوَافٌ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد چکر لگانا، گھومنا اَلطَّائِفُ: چوکیدار کو کہتے ہیں۔ چونکہ وہ بھی حفاظت کی خاطر رات کو چکر لگاتا رہتا ہے۔

طَافَ بِهٖ يَطُوْفُ: چکر لگانا۔ گھومنا۔ قرآن پاک میں ہے يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ

اسی سے بطور استعارہ جن خیال اور حادثہ وغیرہ کو بھی طائف کہتے ہیں۔ اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ۔ یہاں طائف سے مراد وہ شیطان ہے جو انسان کا شکار کرنے کے لئے اس کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔

طَیفٌ: خیال یا تصور جو بیداری یا نیند میں آئے عظیم حوادث کو بھی طوفان اسی لئے کہتے ہیں کہ عام لوگ اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ لفظ طوفان بعض کے نزدیک جمع ہے۔ اس کی واحد طُوفَانَۃٌ ہے قال الاخفش: واحدتہ طوفانۃ (قرطبی)

بعض اہل لغت کے نزدیک طوفان مصدر ہے لہٰذا اس کی واحد تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ فھو اسم جنس من الطواف۔ وقیل انہ فی الاصل مصدر کنقصان۔ (روح)

مشہور مفسرین کے نزدیک طوفان سے مراد پانی کا طوفان ہے۔

اَلْجَرَادُ: یہ جمع ہے اس کی واحد جَرَادَۃٌ ہے۔ بمعنی ٹڈی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ

جَرَدَ (ن) جَرْدًا وجَرَدَ العُودَ: لکڑی کو چھیلنا۔ جَرَدَ الجِلْدَ: کھال سے بال اتارنا۔ اور جَرِدَ (س) جَرَدًا: چٹیل ہونا۔ جَرِدَ المَکَانُ: کسی جگہ ٹڈی کا گرنا۔ تَجَرَّدَ: ننگا ہونا۔ جُرِدَتِ الارضُ: کسی جگہ، کھیتی یا سبزی کو ٹڈی کا چر جانا۔ اَلْجُرْدَۃُ: ننگا پن۔ اور اَلْجَرْدَۃُ: جیم کی زبر اور سکون را، پھٹا پرانا کپڑا

الجُرَادَۃُ: لکڑی کی چھیلن۔ اَلْجَرِیْدُ: کھجور کی ٹہنی جس سے پتے صاف کر دیئے گئے ہوں۔

الجراد: میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اصل ہو اس سے جَرَدَ الارضَ مشتق ہو جس کے معنی ہیں ٹڈی نے زمین پر سے گھاس چٹ کر گئی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جَرَاد خود جَرْدٌ سے مشتق ہو جس کے معنی ننگا کرنے کے ہیں اور چونکہ جراد زمین کی روئیدگی کو ننگا کر دیتی ہے، اس لئے ٹڈی کو جراد کہا گیا ہے

ارضٌ مَجْرُودَۃٌ: اس زمین کو کہا جاتا ہے جس کا سبزہ ٹڈیوں نے کھا کر صاف کر دیا ہو۔

واحد جرادۃ: سُمّی بہ لِجَرْدِہ ما علی الارض (روح) ویصح ان یُقال سُمّی ذٰلک لجردہ الارض من النبات (راغب)

حدیث میں ہے اھل الجنۃ جُرْدٌ مُرْدٌ: بہشتی لوگ بے داڑھی مونچھ کے ہوں گے

اَلْقُمَّلَ: جوئیں۔ چھوٹیں مکھیاں۔ گھن۔ اناج کو لگ جانے والا کیڑا۔ چیچڑی۔

رَجُلٌ قَمِلٌ: وہ آدمی جس کو جوئیں پڑ جائیں۔ پستہ قد عورت کو قَمَلَۃٌ کہتے ہیں۔ القُمَّل جمع ہے اس کی واحد قُمَّلَۃٌ ہے۔ اَلْقَمْلُ: بتخفیف کے ساتھ جمع ہے۔ اس کی واحد قَمْلَۃٌ ہے بسکون میم (قرطبی)

الضَّفَادِعَ: یہ ضِفْدَعٌ کی جمع ہے۔ مینڈک۔ جمع ضفدع وھی المعروفۃ التی تکون فی الماءِ (قرطبی)

كَشَفْتَ: كَشَفَ (ض) كَشْفًا۔ كَشَفْتُ

من الوجه: چہرہ وغیرہ سے پردہ اٹھانا۔
کھولنا۔ اور مجازاً غم واندوہ کے دور کرنے پر بولا جاتا
ہے۔ کشف عنه الغم: اس کے غم کو دور کر دیا

ینکثون: فلما کشفنا عنهم الرجز
الی اجل هم بالغوه اذا هم ینکثون

النکث: کے معنی کسی کپڑے یا سوت وغیرہ کے
ادھیڑنے کے ہیں تاکہ اس کو دوبارہ بنایا جاسکے
نکث اور نقض دونوں قریب المعنی ہیں اور استعارۃً
نکث نقض عہد یعنی عہد شکنی وغیرہ کے معنی میں
استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: وان
نکثوا ایمانهم: نکیثة ہر اس مشکل کو
کہتے ہیں جس میں انسان عہد شکنی پر مجبور ہوجاتے
واصل النکث: نقض طاقات الصوف المغزول
لیغزل ثانیا (روح)

انتقمنا: فانتقمنا منهم فاغرقنهم
فی الیم۔ انتقام کے معنی محاورۂ عرب میں عذاب
سے کسی نعمت کو سلب کر لینے کے ہیں۔
الانتقام: فی اللغة سلب النعمة بالعذاب۱؎

الیم بحر ناپیداکنار جس کی گہرائی اور عمق
کا پتہ نہ لگایا جاسکے۔ یہ تیمم سے مشتق ہے جس کے
معنی ہیں قصد کرنا۔ سمندر سے نفع حاصل کرنے والے
بھی اس کا قصد کرتے ہیں۔
یممت کذا و تیممت: قصد کرنا۔
فالقیه فی الیم: تو اسے دریا میں ڈال دینا
وقال صاحب الکشاف: والیم، البحر
الذی لا یدرک قعره، وقیل هو لجة البحر
ومعظم ماءه واشتقاقه من التیمم
لان المستنفعین یقصدونه (کشاف)

دمرنا: دمرنا ما کان یصنع فرعون
وقومه۔
التدمیر: کے معنی ہیں کسی پر ہلاکت لا ڈالنا
فدمرنٰهم تدمیرا: اور ہم نے انھیں ہلاک
کر ڈالا۔ ثم دمرنا الاخرین: پھر ہم نے
دوسروں کو ہلاک کر ڈالا۔ دمر الله علیهم
خدا نے ان پر تباہی ڈال دی۔ اس میں دمرنا کا
مفعول محذوف ہے (راغب)
دمر یدمر دمورا و دمارا: ہلاک ہونا
دمرهم و دمر علیهم: ہلاک کرنا۔ پوری
طرح برباد کر دینا۔ قال اللیث، الدمار:
الهلاك التام۔ (کبیر)
یقال دمر القوم یدمرون دمارا ای
هلکوا (کبیر)

جاوزنا: وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر
اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا۔
جاز یجوز جوزا وجوازا ومجازا: جاز
المکان وجاز بالمکان: کسی جگہ سے آگے
گزر جانا۔ جاز الامر: جائز اور درست
ہونا۔ جاوز المکان: کسی سے آگے بڑھ جانا
جوز الطریق کے معنی راستہ کے وسط
کے ہیں۔ اسی سے جاز الشیء ہے جو کسی چیز کے
جائز یا خوشگوار ہونے کی ایک تعبیر ہے، گویا اس
نے وسط طریق کو لازم پکڑا۔ جاوز الوادی

۱؎ کبیر

اذا قطعہ وخلفہ وراءہ (کبیر)

اَلْجَوْزَاءُ : آسمان کے ایک برج کا نام ہے کیونکہ وہ بھی وسطِ آسمان میں ہے۔ وجاوزنا بِبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ ۔ یہ بحر احمر کا شمالی کنارہ ہے جہاں سے بنی اسرائیل کو گزارا گیا ہے پھر یہاں سے گزر کر بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں فروکش ہوئے تھے۔

مُتَبَّرٌ : اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ : یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یہ تباہ ہو کر رہے گا اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں سب بھی بالکل باطل۔

تَبَرَ يَتْبِرُ (ض) تَبْرًا : ہلاک کرنا۔ توڑنا تَتَبِرَۃً : ہلاک کرنا۔ توڑنا۔ التَّبَارُ : ہلاکت تباہی۔ التَّابُوْرُ : فوجی دستہ۔ اس کی جمع توابیر آتی ہے۔ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا (نوح) وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۔ قال اللیث : التبار : الھلاک۔ یقال تبر الشئ یتبر تبارًا۔ والتتبیر الاھلاک (کبیر) التِّبْرُ : سونے کے ریزے۔ التبار : الھلاک (قرطبی) مُتَبَّرٌ : ای مُدَمَّرٌ مُھْلَکٌ کما قال ابن عباس (رح) وَالتَّتْبِيْرُ : الاھلاک (خازن)

تَجَلّٰی : فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ ۔

التجلی کے معنی ہیں ظاہر ہونا۔ ہویدا ہونا۔ جلوہ بار ہونا اور یہ تجلی کبھی تو بالذات ہوتی ہے جیسا کہ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى اور دن کی (قسم) جب نمایاں طور پر روشن ہو جائے۔ اور کبھی تجلی بذریعہ امر اور فعل کے ہوتی ہے جیسا کہ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ۔ اور صوفیہ کرام کے نزدیک تجلی کے معنی کسی چیز کو بالواسطہ دیکھنے کے ہیں جیسے کوئی چیز بواسطہ آئینہ دیکھی جائے اسی لئے تجلی کو رؤیت نہیں کہہ سکتے۔ خود اسی آیت میں اس کی شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رؤیت کی نفی فرمائی ہے اور تجلی کا اثبات

تجلی یہ جَلْوَۃٌ سے بنا ہے ناقص واوی ہے جس کے اصل معنی ہیں کسی چیز کا نمایاں طور پر واضح اور ظاہر ہونا جَلَوْتُ الْعَرُوْسَ جلوًا وجلاءً دلہن کو بناؤ سنگار کر کے خاوند کے سامنے پیش کرنا۔ جَلَا الْاَمْرَ : کسی امر کو واضح کرنا۔ جَلَوْتُ السَّيْفَ : تلوار کو صیقل کرنا فقال الزجاج (تجلی) ای ظھر وبان

(کبیر۔ قرطبی۔ راغب)

دَكًّا : دَكَّ يَدُكُّ دَكًّا : کوٹنا۔ توڑنا گرانا۔ برابر کرنا۔ دَكَّ الْاَرْضَ : زمین کی اونچ نیچ نکال کر اس کو ہموار کرنا۔ نَاقَةٌ دَكَّاءُ وہ اونٹنی جس کی پیٹھ ہموار ہو، کوہان ابھرا ہوا نہ ہو۔ وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۔ وَدُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا۔ اسی سے دکان ہے جس کے معنی ہموار چبوترہ کے ہیں۔ اَلدَّكْدَاكُ : نرم ریت

أَرْضٌ دَكَّاءُ: ہموار زمین۔ اس کی جمع دُكٌّ آتی ہے۔ اَلدَّكُّ مصدر ہے، اس کی جمع دُكُوكٌ اور دُكٌّ کی جمع دِكَكَةٌ آتی ہے الدَّكَّاءُ اس کی جمع دَكَّاوات آتی ہے۔
یہاں دَكًّا مصدر مفعول ہے یعنی مَدْكُوكٌ کے معنی میں ہے۔ لفظ دَكٌّ اور دَقٌّ دونوں قریب المعنی ہیں (جَعَلَهُ دَكًّا) ای مَدْكُوكًا مصدر بمعنی مفعول كَضَرْبِ الْاَمِيْرِ (کشاف)
وَالدَّكُّ وَالدَّقُّ اخوان كالشك والشق
(کشاف۔ روح)
اَلدَّكُّ بفتح الدال: الارض اللينة السَّهْلَةُ (راغب)

خَرَّ: وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا۔

خَرَّ يَخِرُّ (ن) وَخَرَّ يَخُرُّ خَرًّا وخُرُوْرًا وَخَرِيْرًا: کسی چیز کا آواز کے ساتھ اوپر سے نیچے کی طرف گرنا۔ قرآن پاک میں ہے فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ۔ جب عصا گر پڑا تو جنوں کو معلوم ہوا۔ كَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ۔
الخَرِيْرُ: اس پانی کی آواز کو بھی کہتے ہیں جو اوپر سے نیچے گر رہا ہو۔
خَرُّوْا سُجَّدًا: یہ دو معنی دے رہا ہے۔ ایک گرنا اور دوسرا ان سے تسبیح کی آواز کا پیدا ہونا۔ اور اس کے بعد وَسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ سے اس پر تنبیہ کی ہے کہ ملائکہ کا سجدہ ریز ہونا اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ تھا۔ نہ کسی اور امر کے ساتھ۔

خُرُوْرٌ اور سُقُوْطٌ دونوں قریب المعنی ہیں۔ البتہ اتنا فرق بعض کے نزدیک ہے کہ خرور میں گرنے کے ساتھ آواز ہوتی ہے اور سقوط میں آواز کا ہونا ضروری نہیں بلکہ عام ہے (روح۔ مفردات)
ایک صحابی کا قول ہے بايعته على ان لا اخر الا قائما: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس اقرار پر بیعت کی کہ جب گروں گا تو اسلام پر قائم رہ کر گروں گا یعنی ایمان ہی پر مروں گا۔ یا یہ کہ ہر معاملہ درستی کے ساتھ کروں گا غبن اور بددیانتی نہیں کروں گا۔
الخرور: السقوط (جمل) فمعنى خر سَقَطَ سُقُوْطًا يُسْمَعُ منه خَرِيْرٌ (راغب)

صَعِقًا: خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا۔

الصَّاعِقَةُ اور الصَّاقِعَةُ دونوں قریب المعنی ہیں دونوں میں فرق یہ ہے کہ صَقْعٌ کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق بولا جاتا ہے اور صعق اجسام علوی کے بارے میں۔ اصل میں صاعقہ کے معنی ہیں فضا میں سخت آواز کا پیدا ہونا۔ پھر اس آواز کے آثار کا ظہور تین قسم پر ہوتا ہے: ایک موت، جیسے فرمایا فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہاں صَعِقَ موت کے معنی میں ہے۔ فَسَّرُوْهُ بالموت (کبیر) اسی طرح يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ: ای یموتون۔ یہاں بھی صعق موت ہی کے معنی میں ہے۔ اسی طرح فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ: تم کو موت نے آپکڑا۔ یہاں بھی صاعقہ موت کے معنی میں ہے

دوسرے معنی صاعقہ کے عذاب کے ہیں جیسا کہ فرمایا فَاَنْذَرْتُکُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ۔ یہاں صاعقہ عذاب کے معنی میں ہے

تیسرا معنی اس کا آگ اور بجلی کی کڑک وغیرہ کے آتے ہیں جیسا کہ فرمایا فَیُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ۔

فان الصاعقة هي الصوت الشديد من الجو ثم يكون منه نار فقط، او عذاب او موت۔ وهي في ذاتها شيء واحد وهذه الاشياء تاثيرات منه (راغب)

آیت کریمہ وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا میں صعق سے مراد بے ہوش ہو کر گر پڑنا ہے۔ والمراد انه سقط مغشيا عليه عند ابن عباس (کبیر)

بعض اہل تفسیر نے صَعِقًا کے معنی یہاں موت کے لئے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ قرآن پاک کا جملہ فَلَمَّآ اَفَاقَ اس معنی کی تائید نہیں کرتا۔ چونکہ لفظ افاق حیات بعد الموت پر مسموع نہیں بلکہ اس کا اطلاق غشی کے بعد ہوش میں آنے اور مرض کے بعد صحت کے حاصل ہونے پر ہوتا ہے

صَعِقَ۔ صَعْقٌ۔ صَعْقَةٌ اور تَصْعَاقٌ غش آنا۔ آواز سن کر بے ہوش ہو جانا۔

صَعِقَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ: ان پر بجلی گری۔

الصَّعُوْقُ: غشی والا۔ اچانک مرنے والا۔

قال صاحب الكشاف: صعق اصله من الصاعقة ويقال لها الصاعقة من صعقه اذا ضربه على رأسه (کبیر)

اَفَاقَ: فَلَمَّآ اَفَاقَ: یعنی جب آپ کے ہوش بجا ہوئے اَفَاقَة کے معنی ہیں عقل و فہم کا سلب ہونے کے بعد واپس لوٹنا اور بحال ہونا

الافاقة: رجوع العقل والفهم الى الانسان بعد ذهابها۔ (روح)

والافاقة: لا تكون الا عن غشي (ابن کثیر)

والافاقة: رجوع الفهم الى الانسان بعد السكر او الجنون والقوة بعد المرض (راغب)

اَفَاقَ: فَوْقٌ (اجوف) سے ماخوذ ہے۔

اور لفظ فوق: مکان، زمان، جسم، عدد اور مرتبہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور کئی معنوں پر فوق کا لفظ بولا جاتا ہے۔

۱۔ بلندی۔ جیسے فرمایا وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ۔

۲۔ بلندی کی جانب کے معنی میں جیسا کہ اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ

۳۔ کسی عدد پر زیادتی کے معنی ظاہر کرنے کے لئے جیسا کہ فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ

۴۔ جسمانیت کے لحاظ سے بڑا ہو یا چھوٹا۔ جیسا کہ مَثَلًا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا

۵۔ بلحاظ فضیلت دنیوی کے جیسا کہ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ، اخروی بلندی کے اعتبار سے جیسے وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ

۶۔ فوقیت بمعنی غلبہ اور تسلط: وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ۔

فَاقَ یَفُوْقُ فَوْقًا وَفَوَاقًا۔ فاق الشئ بلند ہونا

فَاقَ اَصْحَابَهٗ بِالْفَضْلِ وَالْعِلْمِ۔ ہم عصروں پر بڑھ جانا۔ فَائِق : فاعل ہے۔ ہر انواع میں خالص اور عمدہ شیٔ۔ اس کی جمع فَائِقُون اور فَوَقَۃٌ آتی ہے

اَلْوَاحٌ : وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی تختیاں لکھی لکھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کی گئی تھیں۔ ان ہی تختیوں کے مجموعہ کا نام تورات ہے۔ ان آیات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب باری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور لکھی ہوئی تختیاں انہیں عطا کی گئیں لیکن اس کلام کی حقیقت کیا تھی اور کتابتِ الواح کیسے ہوئی۔ آیا حق تعالیٰ نے محض اپنی قدرت سے تحریر فرمائیں یا دستِ موسوی استعمال کیا گیا، آیت میں اس کی کوئی وضاحت نہیں۔ اس میں جتنے احتمالات عقلیہ ایسے ہوں جو شریعت کے کسی حکم کے خلاف نہ ہوں، سب کی گنجائش ضرور ہے مگر ان احتمالات میں سے کسی ایک کو بلا دلیل کے متعین کرنا درست نہیں۔

واعلم انه ليس في لفظ الآية ما يدل على كيفية تلك الالواح وعلى كيفية تلك الكتابة۔ فان ثبت ذلك التفصيل بدليل منفصل قوى وجب القول به والا وجب السكوت (کبیر)

قرآن پاک میں ہے: وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۔ یہاں الواح سے مراد کشتی کے پھٹے، تختے ہیں۔ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ لوحِ محفوظ کی اصل کیفیت کیا ہے اس کو ہم صرف اسی قدر جان سکتے ہیں جو احادیث میں مروی ہیں، اسی کو دوسری آیت میں کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ

اللَّوح کے معنی پیاس کے بھی آتے ہیں۔ اسی سے اس جانور کو جس کو پیاس جلدی لگتی ہو دَابَّةٌ مِلْوَاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور لُوحٌ لام کے ضمہ کے ساتھ آسمان و زمین کے درمیانی خلا کو بھی کہتے ہیں لیکن اکثر علماءِ لغت کے نزدیک فتح لام کے ساتھ بمعنی پیاس اور ضمہ لام کے ساتھ ارض و آسمان کی درمیانی خلا کو کہا جاتا ہے۔ (راغب)

لَاحَ يَلُوْحُ لَوْحًا : ظاہر ہونا۔ نمودار ہونا۔ اشارہ کرنا۔ دیکھنا۔ چمکنا۔ اللَّوْحُ تختی۔ جمع الواح۔ تختی کو لوح اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں معنی چمکتے ہیں۔ واصل اللوح بفتح اللام۔ فكان اللوح تلوح فيه المعانی (قرطبی)

حُلِيّ : وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۔ اور موسیٰ کی قوم نے ان کے (طور پر) جانے کے بعد ایک بچھڑا اپنے زیوروں سے بنایا (یعنی) ایک قالب، جس کی ایک آواز تھی۔

جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تورات کے لئے تشریف لے گئے تو ان کی چالیس دن کی غیر حاضری اور عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اسرائیلیوں نے پہلے تو ایک بچھڑے کی سنہری مورت بنائی، جس کے اندر سے آواز نکلتی تھی اور بعد میں اسی کو خدا مان کر پوجنا شروع کر دیا (اعاذنا اللہ من ذالک)

الحُلِیُّ : (بضم الحاء) زیورات کو کہا جاتا ہے ۔ اور یہ حَلْیٌ بفتح الحاء ۔ کی جمع ہے جیسے ثَدْیٌ کی جمع ثُدِیٌّ (بضم الثاء) ہے

والحلی اسم ما یُتحسّن به من الذهب والفضة (کبیر) حَلِیَ یَحْلٰی کے معنی ہیں آراستہ ہونا (لازم) اور حَلّٰی کے معنی ہیں آراستہ کرنا۔ قرآن پاک میں ہے : یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ۔ دوسری ایک آیت میں ہے حُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۔ انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ (زخرف) جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا

اس کی اصل حَلُوْیٌ ہے۔ واو کو یاء میں مدغم کرکے حرف لام کو مجاورتِ یاء کی بنا پر کسرہ دیا گیا ہے۔ پھر اہل کوفہ نے تو لام کے کسرہ کی مناسبت سے حرف حاء کو بھی مکسور پڑھا ہے یعنی حِلِیٌّ ۔

اہل مدینہ اور بصری نحاۃ نے اپنی اصل پر اس کو حرف حاء کے ضمہ سے پڑھا ہے ۔ والاصل حَلُوْیٌ ثم اُدغمت الواو فی الیاء فانکسرت اللام لمجاورتها الیاء وتکسر الحاء لکسرة اللام وضمّها علی الاصل (قرطبی)

جَسَدًا : جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۔

لفظ جسدٌ جسم ہی کے معنوں میں ہے فرق صرف اتنا ہے کہ جسد اس جسم کو کہتے ہیں جس میں گوشت اور خون وغیرہ ہو اور کھانے پینے کی حاجت رکھتا ہو اور جسم عام ہے اور پھر لفظ جسد ان اجسام پر بولا جاتا ہے جن کا کوئی لون اور رنگ ہو اور جسم بے لون اجسام پر بھی بولا جاتا ہے جیسے پانی اور ہوا وغیرہ ۔

والجسد اسمٌ للجسم الذی یکون من اللحم والدم (کبیر)

مشہور نحوی لغوی خلیل کے نزدیک جسد کا اطلاق انسانی وجود پر ہوتا ہے ۔ لون کا اعتبار کرکے زعفران کو جِسَادٌ کہتے ہیں۔ اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے کو ثوبٌ مُجَسَّدٌ کہا جاتا ہے (راغب) جَسِدٌ اور جاسِدٌ خون جو خشک ہو المُجَسَّد: وہ بنیان جو جسم کے متصل ہو۔ جَسَدٌ کی جمع اجسادٌ آتی ہے جسد الدم به خون کا چپکنا ۔ صیغہ صفت جَسِدٌ وجاسِدٌ آتا ہے

خُوَارٌ : جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ :

خَارَ یَخُوْرُ خُوَارًا ۔ یہ لفظ دراصل گائے بیل کی آواز کے ساتھ متصف ہے ۔ پھر استعارۃً اونٹ اور ہرنی اور دیگر حیوانات کی آوازوں پر بھی بولا جاتا ہے ۔ ارض خوارة : دو بلندیوں کے درمیان پست زمین ۔

الخوران : بہائم کی آواز۔ جانوروں کے گوبر کا راستہ ۔ خَوِرَ یَخْوَرُ خَوَرًا : بزدل، کمزور اور ضعیف ہونا (قرطبی ۔ راغب ۔ جمل)

سُقِطَ : وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ

یہ ایک محاورہ ہے جس کے معنی نادم اور شرمندہ ہونے کے ہیں ۔ یُقال للنادم والمتحیر قد سُقِطَ فِیْ یَدِهٖ (قرطبی)

السقوط : کے اصل معنی ہیں کسی چیز کا اوپر سے

نیچے کی طرف گرنا۔ اَسْقَطَتِ الْمَرْأَۃُ عورت نے ناتمام حمل گرادیا۔ اور ناتمام حمل جو گر جائے اس کو سَقَطٌ یا سِقْطٌ کہتے ہیں۔

اَسِفًا : وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰی اِلٰی قَوْمِہٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۔

اَسَفٌ : حزن اور غضب کے مجموعہ کا نام ہے کبھی اسف کا لفظ حزن اور غضب میں سے ہر ایک پر انفرادًا بھی بولا جاتا ہے۔

اصل میں اسف کے معنی جذبہ انتقام کے ہیں۔ یعنی جذبۂ انتقام سے دم قلب کا جوش مارنا۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمزور پر ہو تو پھیل کر غضب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اگر اپنے سے قوی آدمی پر ہو تو منقبض ہو کر حزن بن جاتی ہے۔ ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ حزن اور غضب کی حقیقت کیا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ لفظ دو ہیں مگر ان کی اصل ایک ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سے کمزور سے جھگڑتا ہے تو غیض و غضب کا اظہار کرتا ہے اور جب قوی سے جھگڑتا ہے تو واویلا کرتا ہے۔

اور آیتِ کریمہ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ کے معنی یہ ہیں کہ جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کیا اور غَضْبَانَ اَسِفًا کے معنی غضب ناک ہی کے ہیں۔

الاسف : الحزن والغضب معًا۔ و حقیقتہ ثوران دم القلب شھوۃ الانتقام (راغب۔ کبیر۔ قرطبی)

صفت اَسِفٌ واسِیفٌ واسفانٌ واَسُوْفٌ

اَسِفَ (س) اَسَفًا۔ اَسِفَ عَلَیْہِ : کسی پر غصہ ہونا۔ افسوس کرنا۔ غمگین ہونا۔ آسَفَہٗ اِیْسَافًا غصہ دلانا۔ غمگین کرنا۔ الاَسُوْفُ : جلد غمگین ہونے والا۔ الاَسِیْفُ : غمگین جمع اُسَفَاءُ مؤنث اَسِیْفَۃٌ۔ اَرْضٌ اَسِیْفَۃٌ۔ بنجر زمین۔ ناقابل کاشت

یَجُرُّ : وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْہِ یَجُرُّہٗ اِلَیْہِ : جَرَّ یَجُرُّ جَرًّا۔ جَرَّ اِلَیْہِ

کسی کو اپنی طرف بلانا کھینچنا۔ جَرَّ الْاِبِلَ : اونٹ کو آہستہ ہانکنا۔

تُشْمِتْ : فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ :

تو ایسا نہ کر کہ دشمن مجھ پر ہنسیں۔

اَلشَّمَاتَۃ کے معنی دشمن کی مصیبت پر خوش ہونے کے ہیں اور یہ شَمِتَ بِہٖ فَھُوَ شَامِتٌ کا مصدر ہے۔ اَشْمَتَ اللّٰہُ بِہِ الْعَدُوَّ کے معنی ہیں اللہ اس کو ایسی مصیبت میں ڈالے جس سے اس کے دشمن خوش ہوں۔ اور تشمیت کے معنی چھینکنے والے کو دعا دینے کے ہیں۔ گویا ازالہ شماتت کی دعا ہے۔ جیسا کہ تمریض کے معنی ازالہ مرض کے ہیں۔

الشَّمَاتَۃُ : الفرح ببلیّۃ من تعادیہ و یعادیك (راغب)

الشَّمَاتَۃُ : السرور بمایصیب اخاك من المصائب فی الدین والدنیا (قرطبی)۔

حدیث میں کسی کی مصیبت پر خوش ہونے سے منع کیا گیا ہے

اور حضور علیہ السلام شماتتِ اعداء سے خدا کی پناہ مانگتے تھے۔ حدیث بخاری میں ہے:
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ سُوْءِ الْقَضَاءِ و درك الشقاءِ وشماتةِ الاَعْدَاءِ۔ ایک حدیث میں ہے: لا تظهر الشماتة باخيك فيعافيه الله ويبتليك کہ اپنے بھائی کی مصیبت پر خوش نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا اس کو عافیت عنایت کر دے اور تجھے مصیبت میں پھنسا دے (قرطبی)
کسی شاعر نے کہا ہے

اذا ما الدّهرُ جَرّ علیٰ اُناسٍ
کلاکِلَهٗ اَناخَ بآخرينا
فقُل للشامتين بنا اَفيقوا
سَيَلقَی الشامتون کما لَقينا

والشماتة: سرور العدو بما يصيب المرء من مكروهٍ (روح) واصل الشماتة الفرحُ ببليّةِ مَنْ تُعادِيه ويُعادِيك. يُقال شمت فلانٌ بفلان اذا سُرّ بمكروهٍ نزل به (جمل)

سَكَتَ: وہ تھم گیا۔ اس نے خاموشی اختیار کی سکوتٌ سے ماضی کا صیغہ۔ سکوت کلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور سکوت بھی چونکہ سکون ہے اس لئے وَلَمَّا سَكَتَ عَنْهُ الْغَضَبُ میں سکوت بطور استعارہ کے سکون کے معنی میں ہے۔ سَكَتَ ای سَكَنَ واصل السكوتِ: السكون والامساك (قرطبی ص۲۹۲ ج ۷)

نُسْخَةٌ: وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ۔ اور اس نسخہ (تورات) میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لئے جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس نسخہ کے مضامین ہدایت سے بھرے ہوئے اور رحمت کی طرف لے جانے والے تھے۔

النَّسْخُ: اس کے اصل معنی ایک چیز کو زائل کر کے دوسری کو اس کی جگہ لانے کے ہیں۔ جیسے دھوپ کا سائے کو اور سائے کا دھوپ کو زائل کر کے اس کی جگہ لے لینا۔ یا جوانی کے بعد بڑھاپا آنا۔ انہی معنی کا اعتبار کر کے بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اصل الواح ٹوٹ گئی تھیں اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ان شکستہ الواح کی نقل عطا کی۔ ایسی نقل کو یہاں نسخہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اہل تحقیق کے نزدیک یہ تعبیر زیادہ موزوں نہیں۔ اصل میں جس طرح نقل پر نسخہ کا لفظ بولا جاتا ہے اسی طرح اصل کتاب پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ صاحب فتوحاتِ الٰہیہ لکھتے ہیں: فالنسخ يطلق على الكتابة كما يطلق على النقل والتغيير۔ (جمل)
صاحب تفسیر قرطبی علامہ محمد بن احمد انصاری فرماتے ہیں والنسخ نقل ما فی كتاب الى كتاب آخر ويُقال للاصل الذی كتبت منه نسخةٌ و للفرع نُسخةٌ۔ (قرطبی)
ان معنی کے اعتبار سے کسی تعبیر کی حاجت نہیں۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں: والنسخ والكتابة (روح)

کہتے ہیں: اِنْسَخ مَا یَقُولُ فُلَانٌ ای اُثْبُتْہ فی کتابك - فلاں صاحب جو ارشاد کریں اس کو اپنی نوٹ بک میں لکھ لو
ویقال للاصل الذی کان النقل منہ نسخۃ وللمنقول نسخہ ایضاً - (فتح القدیر)
نُسْخَۃٌ: فُعْلَۃٌ کے وزن پر بمعنی مفعول یعنی منسوخ کے ہے اور اضافت بمعنی فی ہے مطلب یہ ہے کہ جو کتاب حضرت موسیٰؑ کو لکھی ہوئی دی گئی اس میں ہدایت اور رحمت کے احکام تھے۔
والنسخۃ فعلۃ بمعنی مفعول کالخطبۃ (کشاف) نسخۃ واحد ہے. اس کی جمع نُسَخ آتی ہے

اِخْتَارَ: وَاخْتَارَ مُوسٰی قَوْمَہٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا (الخ)
اِخْتَارَ افتعال میں سے ہے، جس کے معنی کسی بہتر چیز کو طلب کر کے گزرنے کے ہیں۔ اور کبھی یہ لفظ اختیار، کسی چیز کو بہتر سمجھنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ گو وہ چیز نفس الامر میں بہتر نہ ہو۔ آیت کریمہ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰھُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ میں ان کے بلحاظ خلقت کے بہتر ہونے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں دوسروں پر فوقیت بخشنا مراد ہو۔ (راغب)
اِخْتَارَ اصل میں اِخْتَیَرَ تھا۔ حرف یا متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے بدل گیا ہے۔ اسی تعلیل کی وجہ سے اس باب سے صیغہ فاعل اور مفعول دونوں ایک ہی وزن مُخْتَارٌ پر آتے ہیں۔ جبکہ فاعل کی اصل مُخْتَیِرٌ (بکسر الیاء) اور مفعول کی اصل مُخْتَیَرٌ (بفتح الیاء) ہے۔ تعلیل مذکور کی وجہ سے مُخْتَارٌ ہو گیا ہے۔ متکلمین کی اصطلاح میں مختار کا لفظ ہر اس فعل پر بولا جاتا ہے جس کے کرنے میں انسان پر کوئی جبر واکراہ نہ ہو (راغب)
اِخْتَارَ اصل میں خیر سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں وہ چیز جو سب کو مرغوب اور پسند ہو۔ اور یہ شر کی ضد ہے۔
الاختیار: افتعال من لفظ الخیر یقال اختار الشیءَ اذا اَخَذَ خَیْرَہٗ و خِیَارَہٗ (کبیر)

اُمِّیٌّ: اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ۔
اُمّی سے مراد ان پڑھ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی استاد سے

پڑھا نہیں تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُمّی سے مراد اُمّ القریٰ والا یعنی مکّی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امت والا ہو۔ سب کا حاصل ایک ہی ہے۔ یعنی بے پڑھا لکھا ہونا۔ یہ تینوں احتمالات صاحب مفردات نے نقل کئے ہیں۔

قیل منسوب الی الامّة الذین لم یکتبوا لکونه علی عادتهم۔ وقیل سُمّی بذلك لانّه لم یکن یکتب ولا یقرءُ وقیل سُمّی بذلك نسبته الی اُمّ القریٰ (راغب)

قال الزجاج معنی الاُمّی الذی هو علی صفة اُمّة العرب۔ فالعرب اکثرهم ماکانوا یکتبون ولا یقرءون والنبی علیه السلام کان کذلك (کبیر)

الاُمّیّ: الذی لا یکتب ولا یقرأ (روح)

وقال ابن عباس رضی الله عنه کان نبیّکم صلی الله علیه وسلم اُمّیاً لا یکتب ولا یقرأ ولا یحسب (قرطبی)

وقال قطرب: الاُمّیّة: الغفلة والجهالة فالاُمّی منه (راغب)

اُمّی کے لفظی معنی ان پڑھ کے ہیں، جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ عام قوم عرب کو قرآن میں اُمّیین اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا۔

اور اُمّی ہونا کسی انسان کے لئے کوئی صفتِ مدح نہیں بلکہ ایک عیب سمجھا جاتا ہے مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و معارف اور خصوصیات، حالات اور کمالات کے ساتھ اُمّی ہونا آپ کے لئے بڑی صفتِ کمال بن گئی ہے۔ کیونکہ اگر علمی، عملی و اخلاقی کمالات کسی پڑھے لکھے آدمی سے ظاہر ہوں تو وہ اس کی تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن ایک اُمّی محض سے ایسے بیش بہا علوم اور بے نظیر حقائق و معارف کا صدور اس کا ایک کھلا ہوا معجزہ ہے۔ جس سے کوئی پرلے درجے کا معاند و مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا۔

(معارف القرآن)

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

اُمّی اس کو کہتے ہیں جس نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ساری مخلوق سے زیادہ علم دیا تھا۔

(تعلیم الاسلام حصہ اوّل)

اَغْلَال : وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔

اَغْلَال غُلٌّ کی جمع ہے۔ اس ہتھکڑی کو غل کہتے ہیں جس کے ذریعے مجرم کے ہاتھوں کو اس کی گردن کے ساتھ باندھ دیا جائے اور وہ

بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ مراد اس سے وہ احکامِ شاق اور دشوار واجبات ہیں جو اصل دین میں مقصود نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل پر بطورِ سزا کے لازم کر دیئے گئے تھے۔ (موضح)

عَزَّرُوْا : فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ

سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت (عزت) کی اور اس کی مدد کی اور اس نور کے تابع ہوئے جو اس کے ساتھ اترا ہے۔

عَزَّرُوْهُ : تعزیر سے مشتق ہے اور تعزیر کے اصل معنی شفقت کے ساتھ منع کرنے، حفاظت کرنے کے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے عَزَّرُوْهُ کے معنی تعظیم و تکریم کے بتلائے ہیں اور مبرد نے کہا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم کو تعزیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

التعزیر : النصرۃ مع التعظیم (راغب)

عَزَّرُوْهُ : ای وَقَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ (قرطبی)

صاحب کشاف لکھتے ہیں کہ تعزیر کی اصل منع کرنا اور روکنا ہے۔ حد شرعی سے کم سزا کو بھی تعزیر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس سزا کا مقصد بھی مجرم کی اصلاح اور امورِ منہیہ سے روکنا اور منع کرنا ہوتا ہے تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آپ سے دشمنوں کو روکیں کہ وہ قوت نہ پا جائیں، دشمن کو غلبہ نہ ہو۔

وَعَزَّرُوْهُ : ومنعوہ حتی لا یقوی علیہ عدوہ۔ واصل العزر المنع ومنہ التعزیر للضرب دون الحد لانہ منع عن معاودۃ القبیح (کشاف) و اصل التعزیر المنع و النصرۃ۔ وتعزیر الشیٔ تعظیمہ واجلالہ ودفع الاعداء عنہ وھو قولہ وَنَصَرُوْهُ ای علی اعدائہ (جمل)

حدیث میں ورقہ بن نوفل کا قول ہے:

اِنْ بُعِثَ وانا حیٌّ فسَاُعَزِّرُهٗ۔ کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم میری زندگی ہی میں پیغمبر ہو گئے تو میں ان کی ضرور مدد کروں گا۔

عَزَّرَ : اور کئی معنوں میں بھی آتا ہے۔ مثلاً ملامت کرنا۔ پھیر دینا۔ جماع کرنا۔ مجبور کرنا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص پر بنو اسد کے لوگوں نے کچھ غلط الزام لگائے تو انہوں نے فرمایا

اصبحتْ بَنُوْ اسدٍ تُعَزِّرُنِیْ علی الاسلام کہ اب بنی اسد کے لوگ مجھے اسلام پر ملامت کرتے ہیں۔

اِنْبَجَسَتْ : فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا۔ بَجَسَ الماءُ وانبجس۔ پانی پھوٹ کر بہ نکلا۔ یہ اِنْفَجَرَ کے ہم معنی ہے مگر انبجاس عام طور پر اس مقام پر بولا جاتا ہے جب کسی تنگ مقام سے پانی بہ نکلا ہو۔ اور

اور انفجار کا لفظ عام ہے۔ یعنی وہ کسی تنگ مقام سے پانی نکلنے پر بھی بولا جاتا ہے اور وسیع پر بھی۔ یہی وجہ ہے قرآن پاک میں ایک مقام پر لفظ فَانْبَجَسَتْ لایا گیا ہے اور دوسرے مقام پر فَانْفَجَرَتْ آیا ہے۔ یعنی تنگ مقام پتھر سے پانی بہہ نکلنے پر دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں اور جہاں یہ معنی ملحوظ نہیں ہیں وہاں صرف فَجَّرَ کا لفظ بولا گیا ہے جیسے وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا - وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا۔

بَجَسْنَا کا لفظ استعمال نہیں ہوا (راغب)

فَانْبَجَسَ بمعنی فَجَّرْتُهٗ فَانْفَجَرَ (جمل)

وقال صاحب الکشاف (فَانْبَجَسَتْ) اِنْفَجَرَتْ. والمعنی واحدٌ وھو الانفتاح بسعةٍ وکثرة (کشاف)

وَالتَّبَجُّسُ: اتساع الانفجار (حاشیہ کشاف)

والانبجاسُ: الانفجار (فتح)

فَانْبَجَسَتْ انْفَجَرَتْ (خازن)

امام رازی نے بعض اہل لغت سے ایک لطیف فرق انبجاس اور انفجار میں نقل کیا ہے۔ اور صاحب روح المعانی نے اس قول کو علامہ طبرسی کی طرف منسوب کیا ہے۔ کہ انبجاس پانی کے تھوڑے نکلنے کو اور انفجار پانی کے جوش سے نکلنے کو کہتے ہیں تو ایسی صورت میں دونوں میں وجہ تطبیق یہ ہوگی کہ یہاں انبجست میں پانی کے نکلنے کی ابتدا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور سورہ بقرہ میں انفجرت سے پانی کی آخری شکل کا بیان ہے۔ یعنی پانی کی ابتدا آہستہ نکلنے سے ہوئی اور آخر میں جوش مارنے لگا۔ (واللہ اعلم)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے مقام پر ہم معنی استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ کشاف کے حوالہ میں مذکور ہے۔

حِيْتَان: اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا۔

جبکہ وہ لوگ سبت کے بارہ میں احکام سے تجاوز کر رہے تھے جبکہ ان کے سبت کے روز ان کی مچھلیاں ظاہر ہوتی تھیں۔

حیتان جمع ہے اس کی واحد حوت آتی ہے قرآن پاک میں ہے: نَسِيَا حُوْتَهُمَا اپنی مچھلی بھول گئے۔ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ: پھر اس کو مچھلی نے نگل لیا۔ حوت: بڑی مچھلی کو کہتے ہیں اور پھر چونکہ مچھلی رُخ بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے حَاوَتَنِي فلانٌ: اس نے مجھے مچھلی کی طرح دھوکہ دیا۔

والحیتان: السمك، واکثر ما تستعمل العرب الحوت فی معنی السمکة (کشاف)

حات یحوت حَوْتًا وحَوَتَانًا: حات الطیرُ

والوحش : پرندہ یا کسی وحشی جانور کا کسی چیز پر جھپٹ کر کاٹنا۔ منڈلانا۔ حاوَتَہ: دھوکہ دینا حاوَتَہ عن کذا۔ مدافعت کرنا۔ حوت کی جمع احوات اور حِوَتَۃ بھی آتی ہے۔ اور بروجِ سماوات میں سے ایک بُرج کا نام بھی حوت ہے ابن فارس نے تڑپنے اور مضطرب ہونے کے معنی بیان کئے ہیں۔ وھو من الاضطراب والروغات (مقاییس)

شُرَّعًا: یہ شارع کی جمع ہے۔ ظاہر ہونا۔ جھانکنا۔ کھلا ہونا۔ نمایاں ہونا۔ اَشْرَعَ نَاقَتَہٗ فی المَاءِ : اپنی اونٹنی کو پانی میں اتار دیا۔ اسی طرح شَرَّعْتُھَا فِی المَاءِ : میں نے ان کو پانی میں گھسیڑ دیا۔ حدیث میں ہے کانت الابواب شارعۃ الی المسجد : دروازے مسجد کی طرف کھلے ہوتے تھے۔ لوگ ان میں سے گزر کر مسجد میں آتے تھے۔ عرب کے لوگ کہتے ہیں شِرَاعِ الانف : لمبی ناک والے۔ الشَّرْعُ : اس راستہ کو کہتے ہیں جو واضح اور کھلا ہونے کے ساتھ ساتھ سیدھا بھی ہو اور یہ اصل میں شرعتُ لہٗ طریقًا : واضح راستہ مقرر کرنا، کا مصدر ہے اور بطور اسم کے بولا جاتا ہے اور اسی سے واضح راستہ کو شَرْعٌ وشَرِیْعَۃٌ وشِرْعٌ کہا جاتا ہے۔ پھر بطور استعارہ کے طریق الٰہیہ پر یہ لفظ بولے جانے لگے ہیں اور شارعۃ الطریق کی جمع شوارع آتی ہے۔ شُرَّعًا : ظاھرۃ علی وجہ الماء۔ یقال شرع علینا فلانٌ، اذا دنا منّا واشرف علینا (کشاف، وروح وقال اللیث : حیتان شُرَّعٌ، رافعۃ رؤسھا قرطبی ومثلہ فی الفتح

وقال صاحب رموز القرآن الفخر الرازی فی تفسیرہ الکبیر : ای ظاھرۃ علی الماء۔ وشُرَّعٌ جمع شارع وشارعۃ وکل شیٔ دانٍ من شیٔ فھو شارع (کبیر)

غالبًا دین اسلام کو بھی شرعہ اور شریعت کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ انسان کی عقل سلیم اور اس کی فطرت کے قریب ہے۔

تفسیر ابن عباس میں ہے : شُرَّعًا : جماعات جماعات من غمر الماء الی الشاطئہ۔ گروہ در گروہ پانی کی گہرائیوں سے نکل کر اس کی سطح پر آجاتی تھیں۔ کناروں کے ساتھ تیرتی پھرتی تھیں۔

شُرَّعًا : ای شوارع فی الماء۔ وھو جمع شارع (غریب القرآن ابن قتیبہ)

عَتَوْا : فَلَمَّا عَتَوْا عَمَّا نُھُوْا عَنْہُ عَتَا یَعْتُوْ عُتُوًّا وعِتِیًّا : حکم عدولی کرنا۔ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّھِمْ۔ وَ عَتَوْ عُتُوًّا کَبِیْرًا۔ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ اور آیت کریمہ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا میں عِتِیٌّ

کے معنی جوانی سے گزر کر بڑھاپے کی اس حالت
کو پہنچ جاتا ہے جہاں اصلاح اور امداد کی بظاہر
کوئی امید نہیں ہوتی۔

فَلَمَّا عَتَوْا: فلما تکبروا (کشاف) ای
فلما تجاوزوا فی معصیۃ اللہ (قرطبی)
العتو: عبارۃ عن الاِباء والعصیان۔ کبیر
(دیکھیے عتیا)

قَطَّعْنَا : وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا
ہم نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں بکھیر دیا۔
مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہودی قوم کے ٹکڑے
ٹکڑے کر کے زمین کے مختلف حصوں میں متفرق کر دیئے
قطعنا: مصدر تقطیع سے مشتق ہے۔ کسی ایک چیز کو
کئی حصوں میں جدا جدا کر کے تقسیم کرنا۔ ٹکڑے
کرنا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم کا
ایک جگہ مجتمع ہونا اور اکٹھا ہونا ایک نعمت ہے
اور مختلف حصوں میں منتشر ہو جانا عذابِ الٰہی ہے۔
(اعاذنا اللہ من ذلک)

خَلَفَ : فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ
وَرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى
لفظ خَلَفَ خلافت سے مشتق ماضی کا صیغہ ہے
جس کے معنی ہیں قائم مقام اور خلیفہ ہوا۔
خَلَفَ يَخْلُفُ خَلَفًا۔ صحیح جانشین ہونا۔
قائم مقام ہونا۔ اپنے اصل پیش رو کے نقش قدم پر چلنا

اسی سے دوسرا مصدر خَلْفًا آتا ہے بسکون اللام
جو قائم مقام اور خلیفہ کے معنی دیتا ہے۔ یہ مفرد
اور جمع دونوں میں یکساں بولا جاتا ہے۔ لیکن
خَلَفٌ بفتح اللام اور خَلْفٌ بسکون اللام،
ان دونوں مصدروں میں اہل تفسیر نے ایک فرق
بیان کیا ہے۔ لفظ خَلْفٌ اکثر برے خلیفہ پر بولا
جاتا ہے۔ جو اپنے بڑوں کے طرز کے خلاف
برائیوں میں مبتلا ہو۔ اور خَلَفٌ بفتح اللام اس
کے مقابل نیک اور قابل خلیفہ کو کہا جاتا ہے،
جو اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلے۔ اور ان کے
مقصد کی تکمیل کرے۔ اس لفظ کا اکثر استعمال
اسی طرح ہے۔ کہیں کہیں اس کے خلاف بھی
استعمال ہوتا ہے۔

وقال احمد بن یحییٰ: الناس کلھم
یقولون خَلَفٌ صدقٌ وخَلْفُ سوءٍ
وخَلْفٌ للسوء لاغیر (قرطبی)

بعض اہل لغت کے نزدیک خَلْفٌ بمعنی ذم
یہ خُلف یا خُلوف سے ماخوذ ہے جس کے معنی
بدبو اور فساد کے ہیں۔ ردی اور بیکار شے کو
خَلْفٌ کہا جاتا ہے۔ ایک مشہور ضرب المثل ہے
سَكَتَ اَلْفًا وَنَطَقَ خَلْفًا۔ ہزاروں باتوں
میں تو چپ رہا مگر جب بولا تو ردی بات کی۔
اگرچہ بعض حضرات نے اس کا دعوی کیا ہے کہ خَلَف

بفتح اللام اچھے قائم مقام اور خَلْفٌ بسکون اللام
بُرے جانشین کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ مگر
تحقیق کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے
کی جگہ بولے جاتے ہیں۔ لبید کہتا ہے

ذھب الذین یُعاش فی اکنافھم
وبقیت فی خَلْفٍ کجلد الأجرب

لبید نے یہاں خَلْفٌ بسکون اللام سے مراد
بُرے لوگ لئے ہیں۔ اور ایک دوسرا شاعر کہتا ہے

اناوجدنا خلفاً بئس الخَلَفْ
اغلق عنّا بابه ثم حَلَفْ
لا یدخل البواب الامن عرف
عبداً اذا ماناء بالحِمل

یہاں خلفاً بفتح اللام سے بُرے لوگ مراد
لیے گئے ہیں۔ اس لئے امام فخر الدین رازی نے
لکھا ہے وحاصل الکلام: ان من اھل
العربیة من قال الخلَف والخلْفُ قد
یذکر فی الصالح والردی ومنھم من یقول
الخلف مخصوص بالذم (کبیر)

عَرَضَ : یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ ھٰذَا
الْاَدْنٰی ۔ لفظ عرض سامان کے معنی میں بولا
جاتا ہے جو نقد کے بدلہ میں خریدا جاتا ہے۔
اور کبھی مطلقاً مال کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے
خواہ نقد ہو یا سامان۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ اس
جگہ یہ بھی عام معنی مراد ہیں۔ اور اس جگہ لفظ
مال کو لفظ عرض سے تعبیر کرنے میں اس طرف
اشارہ ہے کہ دنیا کا مال کتنا ہی ہو، ناپائیدار
اور عارضی ہے۔ کیونکہ عرض کا لفظ اصل میں جوہر
کے بالمقابل ناپائیدار چیز کے لئے مستعمل ہوتا ہے
جس کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہوتا بلکہ
وہ اپنے وجود میں دوسری چیز کا تابع ہو۔ اسی
لئے عارض کا لفظ بادل کے معنی میں آتا ہے
کیونکہ اس کا وجود قائم رہنے والا نہیں۔ جلد زائل
اور ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ھٰذَا
عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا اسی معنی کے لئے آیا ہے۔
لفظ عرض میں اہل تفسیر نے ایک فرق بیان
کیا ہے اور وہ یہ کہ لفظ عَرَضٌ بفتح الراء جمیع
متاع دنیا پر بولا جاتا ہے۔ چاہے نقد یعنی درہم
ودنانیر ہوں یا ان سے خریدا ہوا سامان ہو۔
لیکن لفظ عَرْضٌ بسکون الراء خاص دنیاوی
ساز وسامان کے لئے بولا جاتا ہے۔ درہم و
دنانیر پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا ۔

قال ابو عبیدہ: جمیع متاع الدنیا عرضٌ
بفتح الراء ۔ یقال: الدنیا عَرَضٌ حاضرٌ
یاکل منھا البر والفاجر واما العرض
بسکون الراء فما خالف العین۔ اعنی
الدرھم والدنانیر وجمعه عروض (کبیر)

تو گویا ہر عَرَض، غَرَض ہے لیکن ہر غَرَض عَرَض نہیں ہے۔

والعَرَضُ : متاع الدنیا بفتح الراء و باسکانها ماکان من المال سوی الدرهم والدنانیر (قرطبی)

وقال صاحب روح المعانی : والعَرَضُ مالا ثبات له۔ و منه استعار المتکلمون العرض بمقابل الجوهر، و فی النهایة : العرض بفتح الراء متاع الدنیا و حطامها۔ و قال ابوعبیدہ : هو غیر النقدین من متاعها و بالسکون المال والقیم (روح)

اَلْاَدْنٰی : یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰی

لفظ ادنیٰ کے اشتقاق میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ دُنُوٌّ بمعنی قرب سے مشتق ہو۔ اس صورت میں ادنیٰ کے معنی اقرب کے ہو جائیں گے۔ اس کا مؤنث دنیا آتا ہے جس کے معنی قریب کے ہیں۔ آخرت کے مقابلہ میں یہ جہاں انسان کے زیادہ قریب ہے اس لئے اس کو ادنیٰ اور دنیا کہا جاتا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ دَنَاءَۃٌ سے مشتق ہو۔ جس کے معنی ذلت کے ہیں اس صورت میں ادنیٰ کے معنی ذلیل و حقیر کے ہو جائیں گے۔ دنیا اور اس کے تمام اسباب بمقابلہ آخرت کے حقیر و ذلیل ہیں اسی لئے اس کو ادنیٰ اور دنیا کہا گیا۔ (معارف)

والادنی إما من الدُنُوّ بمعنی القرب لانه عاجل قریب۔ و إما من دُنُوّ الحال و سقوطها و قلتها (کشاف)

وعنه نُقل فی الکبیر والادنی ماخوذ من الدنو وهو القرب۔ و قیل ان الادنی ماخوذ من الدناءة والسقوط (التح القدیر)

نَتَقْنَا : وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ

لفظ نَتَقْنَا جمع متکلم کا صیغہ ہے نتقٌ سے مشتق ہے جس کے معنی کھینچنے اور اٹھانے کے ہیں۔ سورہ بقرہ میں اسی معنی میں رَفَعْنَا کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے مفسرین نے یہاں بھی نتق کی تفسیر رفع سے کی ہے

نتقنا معناہ رَفَعْنَا (قرطبی)

والنتق : الرفع کما روی عن ابن عباس والیه ذهب الاعرابی (روح)

نَتَقَ (ن۔ض) نَتْقًا کھینچنا۔ جھاڑنا۔ پھاڑنا۔ ہلانا۔ بلند کرنا۔ اکھاڑنا۔

نَتَقَ الجِرَابَ : توشہ دان جھاڑنا۔ اور نَتَقَ الجلد : کھال کھینچنا۔

نَتَقَ الشیءَ : کسی چیز کو بلند کرنا۔ پھیلانا پھاڑنا۔ کثیر الاولاد عورت کو بھی امراۃ ناتق کہتے ہیں۔ گویا وہ بچے پھینکتی ہے۔ عام لوگ

پِتے کو بھی نتق ونتاق کہتے ہیں - اور نتق (ن ین) نُتُوقًا کے معنی موٹا ہونے کے آتے ہیں

حدیث میں ہے : علیکم بالابکار فانھن انتق ارحاما : تم کنواری عورتوں سے نکاح کیا کرو کیونکہ ان سے اولاد بہت ہوتی ہے -

البیت المعمور نتاق الکعبۃ من فوقھا بیت المعمور کعبہ کو اوپر سے سایہ کئے ہوئے ہے -

اِنْسَلَخَ : وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ

اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا۔ سو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہی میں داخل ہوگیا۔

انسلاخ کا لفظ اصل میں جانور کے کھال کے اندر سے یا سانپ کا کیچلی کے اندر سے نکل جانے کے لئے بولا جاتا ہے - محاورہ ہے : سَلَخْتُہٗ فَانْسَلَخَ میں نے اس کی کھال کھینچی تو وہ کھچ گئی - پھر اس سے استعارہ کے طور پر زرہ اتارنے اور مہینہ کے گزر جانے پر استعمال ہونے لگا ہے - سَلَخْتُ دِرْعَہٗ : میں نے اس کی زرہ اتار لی - سَلَخَ الشَّھْرُ وَانْسَلَخَ : مہینہ گزر گیا - قرآن میں فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ : جب عزت کے مہینے گزر جائیں - نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ : ہم اس میں سے دن کو کھینچ لیتے ہیں - محاورہ ہے اسود سالخ سَلَخَ جِلْدَہٗ : نر سیاہ سانپ نے اپنی کیچلی اتار دی -

سَلَخَ یسلخ (ف) سَلْخًا - سَلَخَ الْخَرُوْفَ بکری کے بچہ کی کھال اُتارنا -

اس جگہ علم آیات کو ایک لباس یا کھال کے ساتھ تشبیہ دے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ شخص علم و معرفت سے بالکل جدا ہوگیا - مطلب یہ ہے کہ جب تک کہ علم آیات اور ذکر اللہ اس کے ساتھ تھا شیطان کا قابو اس پر نہ چل سکتا تھا جب علم آیات سے جدا ہوگیا تو شیطان نے اس پر قابو پالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہ ہوگیا -

وحقیقۃ السلخ کشط الجلد وازالتہ بالکلیۃ عن المسلوخ عنہ (روح)

والانسلاخ : الخروج (قرطبی)

ومعنی انسلخ : خرج منھا - یقال لکل فارق شیئا بالکلیۃ انسلخ منہ (کبیر)

السَّلْخُ : نزع جلد الحیوان - (راغب)

سَالِخٌ : کالے نر سانپ کو کہا جاتا ہے، جو ہر سال کیچلی اتارتا ہے - اور سَلْخٌ مہینہ کا آخری دن جیسے غُرَّہ مہینے کا پہلا دن -

یَلْھَثْ : اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْھَثْ اَوْ تَتْرُکْہُ یَلْھَثْ۔ لفظ لھث کے اصل معنی یہ ہیں کہ زبان نکال کر سختی کے ساتھ سانس لیا جائے۔ (معارف)

واللھث ادلاع اللسان بالنفس الشدید (روح)

لھث یلھث لھثاً ان یدلع لسانہ من العطش (راغب) وقال اللیث: اللھث: ھو ان الکلب اذا نالہ الاعیاء عند شدۃ العدو وعند شدۃ الحر فانہ یدلع لسانہ من العطش (کبیر)

وفی السمین: یقال لھث یلھث بفتح العین فی الماضی والمضارع لھثاً ولھاثاً بفتح اللام وضمھا وھو خروج لسانہ فی حال راحتہ و اعیائہ (جمل)

ہر جاندار اپنی زندگی میں اس کا محتاج ہے کہ اندر کی گرم اور زہریلی ہوا کو باہر پھینکے اور باہر سے تازہ ہوا حلق اور ناک کے راستہ سے اندر لے جائے۔ اسی پر جاندار کی زندگی کا مدار ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کے لئے اس اہم کام کو ایسا آسان کر دیا ہے کہ بلا ارادہ اور بلا محنت اس کی ناک کے نتھنوں سے اندر کی ہوا باہر اور باہر کی تازی ہوا اندر جاتی ہے۔ اس میں سانس کو کوئی زور لگانا پڑتا ہے اور نہ کسی اختیاری عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ قدرتی اور فطری طور پر یہ کام مسلسل خود بخود ہوتا رہتا ہے۔

جانداروں میں صرف کتا ایسا جانور ہے جس کو اپنے سانس کی آمد و رفت میں زبان نکال کر زور لگانا پڑتا ہے۔ اور دوسرے جانداروں کی یہ کیفیت صرف اس وقت ہوتی ہے جب ان پر کوئی تکلیف دے یا وہ تھک جائیں یا کوئی اتفاقی محنت ان پر پڑ جائے۔

(معارف القرآن)

کہتے ہیں کہ کتے کی یہ حالت اس کے ضعفِ قلب کی وجہ سے ہوتی ہے۔

لا یقدر (الکلب) علی نفض الھواء المسخن وجلب الھواء البارد بسھولۃ لضعف قلبہ و انقطاع فؤادہ (روح)

یُلْحِدُوْنَ : وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝

اِلْحَاد : کے معنی لغت میں میلان اور درمیانی راہ سے ہٹ جانے کے ہوتے ہیں۔ اسی سے قبر کی لحد کو لحد کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ درمیان سے ہٹی ہوئی ہے۔ لَحَدَ الْقَبْرَ وَاَلْحَدَہٗ : قبر میں لحد بنانا۔ قرآن کریم میں لفظ الحاد قرآن کریم کے صحیح معنی کو چھوڑ کر

ادھر ادھر کی تاویل و تحریف کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ (معارف)

لَحَدَ بلسانہ الی کذا: زبان سے کسی طرف جھکنا غلط بات کہنا۔ مفردات القرآن میں ہے کہ الحاد دو قسم کا ہوتا ہے ایک شرک باللہ کی طرف مائل ہونا دوسرا شرک بالاسباب کی طرف مائل ہونا۔ اول قسم کا الحاد ایمان کے منافی ہے اور انسان کے ایمان وعقیدہ کو باطل کر دیتا ہے۔ دوسری قسم کا الحاد ایمان کو تو باطل نہیں کرتا لیکن اس کی اصل کو کمزور کر دیتا ہے (راغب)۔

الالحاد: المیل وترك القصد، یقال الحد الرجل فی الدین والحَدَ: اذا مال (قرطبی)

قال اهل اللغة: معنی الالحاد فی اللغة: المیل عن القصد، قال ابن السکیت: الملحد: العادل عن الحق المُدْخِل فیه ما لیس منه و قال ابو عمرو من اهل اللغة: الالحاد: العدول عن الاستقامة والانحراف عنها (کبیر)

الاِسْتِدْرَاجُ: وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

اور جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں انھیں ہم رفتہ رفتہ لیتے جا رہے ہیں اس طرح کہ انہیں خبر ہی نہیں۔

استدراج کے معنی درجہ بدرجہ، آہستہ آہستہ کوئی کام کرنے کے ہیں۔ اصطلاحِ قرآن و سنت میں استدراج اس کو کہا جاتا ہے کہ بندہ کے گناہ پر دنیا میں کوئی تکلیف ومصیبت نہ آئے بلکہ جوں جوں وہ گناہ میں آگے بڑھتا جائے دنیاوی مال واسباب اور بڑھتے جائیں جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنی بدکرداری پر کسی وقت تنبیہ نہیں ہوتی اور غفلت سے آنکھ نہیں کھلتی، اور اپنے بُرے اعمال اس کو بُرے نظر نہیں آتے کہ وہ اُن سے باز آنے کی فکر کرے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو دنیا میں بھی یہ شخص کسی عذاب میں دفعۃً پکڑ لیا جاتا ہے اور کبھی موت تک یہ سلسلہ چلتا ہے اور بالآخر موت ہی اس کی مستی اور بے ہوشی کا خاتمہ کرتی ہے اور دائمی عذاب اس کا ٹھکانہ بن جاتا ہے (معارف)

الاستدراج: هو الاخذ بالتدریج منزلة بعد منزلة (قرطبی)

لفظ استدراج کے ماخذ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ الدرجہ اس کا ماخذ ہو۔ درجہ کا لفظ منزل کے ہم معنی ہے مگر درجہ اور منزلہ میں فرق یہ ہے کہ منزلہ کو درجہ اس وقت کہتے ہیں جب اس میں صعود یعنی نیچے سے اوپر کی طرف چڑھنے کا اعتبار کیا جائے ورنہ بسیط جگہ پر امتداد کے اعتبار سے اس کو درجہ نہیں

کہتے۔ اور کبھی اس کا اطلاق منزلتِ رفیعہ اور بلند مرتبہ پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ) اور منزلۃ میں استنزال اور ھبوط کا اعتبار ہوتا ہے یعنی اوپر سے نیچے کی طرف اترنا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ استدراج الدَّرْجُ سے ماخوذ ہو جس کے معنی ہیں طَيُّ الشَّيْءِ: کسی چیز کو لپیٹنا۔ کتاب یا کپڑے کی تہہ اور لپیٹے ہوئے مراسلہ یا کپڑے کو بھی درج کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ درج بمعنی موت بھی آجاتا ہے۔ جیسے کہ طَوَتْهُ الْمَنِيَّةُ میں طی کا لفظ موت کے لئے مستعار ہے۔

وَالدَّرْجُ لَفُّ الشَّيْءِ وطيه جُزْأً فَجُزْأً (کبیر) يقال أَدْرَجْتُهُ ودَرَّجْتُهُ ومنه أَدْرَجَ الْمَيِّتَ فِي أَكْفَانِهِ: میت کو کفن کے کپڑوں میں لپیٹنا (قرطبی)

استدراج: درج سے ہو تو۔ دَرَجَةٌ سے ہو تو معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے دفترِ حیات کو سمیٹتے اور بساطِ زندگی کو لپیٹتے آرہے ہیں جس کی انہیں خبر نہیں۔

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کسریٰ کے خزانے لاکر ڈالے گئے تو انہوں نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَكُونَ مُسْتَدْرَجًا۔

درج الصَّبِيُّ: بچے کا آہستہ آہستہ چلنا۔

أُمْلِي: وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ اور میں انہیں مہلت دیئے چلا جاتا ہوں، بے شک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے أُمْلِي إِمْلَاءٌ سے ہے جس کے معنی ڈھیل دینے کے ہیں۔ إِمْلَاءٌ کی نقیض اعجال جلدی کرنا آتی ہے۔ طویل زمانہ اور مدتِ دراز کو مَلِيٌّ کہتے ہیں۔ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا۔ یعنی تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے دُور ہو جا۔ اسی سے عرصۂ دراز کے لئے مَلْوَةٌ اور مِلْوَةٌ ومَلَاوَةٌ من الدهر کا محاورہ بولا جاتا ہے

اَلْإِمْلَاءُ فی اللغۃ: الامهال والاطالة المدّة۔ (کبیر) والاملاء: الامداد ومنه قيل للمدة الطويلة ملاوة من الدهر (راغب)

مَلِيٌّ غیر معلوم زمانہ جس کی حد معلوم نہ ہو مَضَى مَلِيٌّ مِنَ النَّهَارِ دن کا ایک حصہ گزر گیا۔ مَلَوَان: دن رات

استملاء: مہلت مانگنا۔ کہتے ہیں: لَبِثْتُ مَلِيًّا۔ میں بڑی دیر تک ٹھہرا رہا

والاملاء: الامهال والتطویل (جمل)

مَلَا يَمْلُو مَلْوًا۔ تیز چلنا۔ دوڑنا۔

مَلَّاهُ اللهُ عُمْرَهُ۔ عمر دراز کرنا

أَمْلَى إِمْلَاءٌ (افعال) أَمْلَى عَلَيْهِ الزَّمَنُ:

لمباہونا انتظرتہٗ ملیًّا۔ میں نے اس کی بڑی مدت تک انتظار کی۔ الملا: صحرا۔ وسیع اور کھلا میدان۔ جمع املاءٌ
املیتُ الکتٰب تحریر لکھوانا۔
تُمْلٰی عَلَیْهِ بُکْرَةً وَّاَصِیْلًا اور وہ صبح و شام اس کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔
فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ۔ تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوائے (البقرہ)

مَتِیْنٌ : اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ ۔

متین، مَتَانَةٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں مضبوط اور قوی ہونا۔ اَلْمَتْنَان: پیٹھ کے دونوں حصے جو ریڑھ کی ہڈی کے اردگرد ہوتے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو بھی متن کہتے ہیں۔ اور مضبوط پشت والے آدمی کو متین کہتے ہیں۔ اسی سے حبل متین کا محاورہ ہے بمعنی مضبوط رسّی۔ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ
مَتُنَ (ک) مَتَانَةٌ: مضبوط و قوی ہونا۔
مَتَنَ (ن۔ض) متنًا و مُتُونًا۔ متن بالمکان، اقامت کرنا۔ اَمْتَنَ: پیٹھ پر مارنا۔ مَتَّنَ الشیئَ: مضبوط بنانا۔ مَتْنُ الشیء: چیز کا ظاہری حصہ۔ مَتْنُ الکتاب۔ کتاب کی اصل عبارت بغیر شرح و حاشیہ کے۔ متنا الظّھر بیٹھ کے ہر دو رُخ و پہلو۔ اس کی جمع مُتَانٌ و مُتُونٌ آتی ہے۔
والمتینُ من المتانة بمعنی الشدة والقوّة (روح) والمتنُ من کل شیٔ ھو القوی (کبیر) متینٌ ای شدید قویٌّ واصلہ من المتن وھو اللحم الغلیظ الذی عن جانب الصلب (قرطبی)

مَلَکُوْت : اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔

لفظ ملکوت: ملک کے معنی میں مبالغہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں ملک عظیم۔ بڑی بادشاہت۔ والملکوت: الملک العظیم (روح) ملکوت ملک ہی سے ماخوذ ہے۔ حرف واو اور تا مبالغہ کے لئے زائد کئے گئے ہیں۔ جیسے کہ جَبَرُوْت اور رَهَبُوْت وغیرہ۔

مُرْسٰی : یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ۔

مُرْسٰی کے معنی ٹھہرنے اور قائم ہونے کے ہیں۔ لفظ مُرسٰی مصدر میمی ہے اور ظرف زمان اور ظرف مکان کا قول بھی بعض اہل تفسیر نے نقل کیا ہے۔
رَسَا الشیئَ کے معنی ہیں کسی چیز کا کسی جگہ پر ٹھہرنا اور استوار ہونا۔ اور اَرْسٰی (افعال)

کے معنی ہیں کسی چیز کو ٹھہرانا۔ استوار کرنا۔ جمانا۔ رَسَا الشیءُ : چیز کا ثابت ہونا۔ ایک جگہ پر جم جانا۔ گڑ جانا۔ اِرْسَاءٌ کا لفظ مطلق ٹھہرنے۔ جم جانے یا کسی چیز کے ثابت ہونے یا کرنے پر نہیں بولا جاتا بلکہ کسی مضبوط اور ٹھوس شئ کے اثبات و استقرار کے لئے بولا جاتا ہے۔

الرَّاسِی : بڑی بھاری دیگ جو ایک جگہ جمی رہے مؤنث راسیۃٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ۔ وَرَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ اور اونچے اونچے پہاڑ۔ یہاں پہاڑوں کو ان کی مضبوطی اور ثبات کی وجہ سے رواسیَ کہا گیا ہے وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا اور پہاڑوں کو گاڑ دیا۔ معنی اثبات کے اعتبار سے پہاڑوں کو اوتاد بھی کہا جاتا ہے جیسے وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا۔

وهو مصدر میمی من ارساه اذا اَثْبَتَهٗ وَاَقَرَّهٗ ای متی اِثباتُها وتقریرها ولا یکاد یستعمل الارساء الا فی الشیء الثقیل (روح)

وَالْاِرساءُ : الاثبات یقال رَسٰی یَرْسُوْ اذا ثبت۔ فکان الرسو لیس اسمًا لمطلق الثبات بل هو اسمٌ لثبات الشیءِ اذا کان ثقیلًا (کبیر)

وقال الطیبی : الرُّسُوُّ انما یستعمل فی الاجسام الثقیلۃ (جمل)

المَرْسَاۃ : کشتی یا جہاز کا لنگر۔ اس کی جمع مَرَاسٍ آتی ہے۔ کہتے ہیں اَلْقَی مَرَاسِیَہٗ وہ رہ پڑا القت السَّحَابُ مَرَاسِیَهَا بادل جما اور خوب برسا۔ رَسٰی بین القوم قوم کے درمیان صلح کرائی، اختلاف کو مٹا دیا۔ رَسٰی عَنہ حَدِیثًا کسی سے حدیث بیان کرنا المَرسٰی بفتح المیم بندرگاہ۔ جمع مَرَاسٍ رَسَتْ اَقْدَامُهُمْ : ان کے پاؤں جم گئے۔ جیسے رَسَخَتْ اَقْدَامُهُمْ وثَبَتَتْ اَقْدَامُهُمْ ۔ وکل شیءٍ ثقیل رُسُوُّہٗ : ثباته واستقراره (کشاف)

رسی الشیءُ یرسو : ثبت۔ الی ان قال فالمرسی یقال للمصدر والمکان والزمان والمفعول (راغب)

يُجَلِّيْهَا : لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ

یہ تجلیہ سے مشتق ہے جس کے معنی کھولنے اور ظاہر کرنے کے ہیں۔

والتجلیۃ اظهار الشیءِ : یقال جَلّٰی فلان الخبر۔ اذا اظهره واوضحه (قرطبی)

والتجلیۃ: الکشف والاظہار (روح)

حَفِیٌّ: یَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا

حَفِیٌّ کے معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عالم اور باخبر کے بیان کئے ہیں۔ اور اصل میں اس شخص کو حفی کہا جاتا ہے جو سوالات کرکے کسی معاملہ کی پوری تحقیق کرلے۔ (معارف)

الاحفاءُ: کے اصل معنی کسی چیز کے مانگنے میں اصرار کرنے کے یا کسی کی حالت دریافت کرنے کیلئے بحث اور کاوش میں لگے رہنے کے ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اَحفیتُ السُّؤال واَحفیتُ فُلَانًا فی السوال۔ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: اِنْ يَّسْــَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا یعنی اگر وہ تم سے مال طلب کریں اور تمہیں مجبور کریں تو تم بخل کرنے لگو۔

حَفِیَ حفاً وحَفوۃً کے معنی ہیں زیادہ چلنے سے پاؤں کا چھل جانا۔ اسی سے اَحفَیتُ الشارِبَ مونچھوں کو اچھی طرح کاٹ کر صاف کرنا۔ پھر انہیں سے اس عالم کو الحفیُّ کہتے ہیں جو مسائل میں خوب بحث و تمحیص کے بعد پختہ محقق ہوچکا ہو۔

تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ آپ سے تو یہ لوگ یوں قیامت کے وقتِ وقوع کا حال دریافت کرتے ہیں جیسے آپ نے اس کی پوری تحقیق کرلی ہو۔ حالانکہ وقوعِ قیامت کے صحیح وقت کو کوئی بھی نہیں جانتا۔

بعض اہل تفسیر کی رائے ہے الحفی حَفَاوَۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں شفیق، مہربان اور شفقت سے پیش آنے والا۔ اس صورت میں الحفی کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ سے یہ یوں پوچھتے ہیں جیسا کہ آپ ان پر بڑے مہربان ہیں اور ان کے ہر سوال کا جواب اس شفقت اور لطف سے انہیں دیں گے

اَلْحَفِیُّ: یہ فعیل کے وزن پہ ہے اس کی جمع حُفَوَاءُ آتی ہے۔ خوب چھان بین کرنے والا، سوال میں اصرار کرنے والا۔ کسی چیز کا مکمل علم رکھنے والا، عزت و اکرام اور اظہارِ خوشی میں مبالغہ کرنے والا۔

قال ابن فارس: الحفی: العالم بالشئ۔ والحَفِیُّ: المستقصی فی السوال (قرطبی) فحفی فعیل من حَفِیَ عن الشئ اذا بحث عن تعرف حاله (روح)

الاحفاء: فی السؤال التزع فی الالحاح فی المطالبۃ او فی البحث عن تعرف الحال والحفی: العالم بالشئ (راغب)

صَامِتُوْنَ : سَوَآءٌ عَلَیْکُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ

صامتون ، صامت کی جمع ہے ۔ صَمَتَ (ن) صَمْتًا وصُمُوْتًا وصُمَاتًا ۔ خاموش رہنا ۔ صَمَّتَہٗ واَصْمَتَہٗ ۔ خاموش کرنا ۔ صَمَّتَتِ الْمَرْاَۃُ وَلَدَھَا ۔ عورت کا بچے کو کچھ کھلا کر چپ کرانا ۔ بہلانا ۔ الصُّمَاتُ ، مصدر ، خاموشی پیاس کی شدت ۔ صَامِتٌ : وہ مال جو خاموش رہے ۔ جیسے سونا ، چاندی ، جواہرات وغیرہ ۔ عرب کے لوگ کہتے ہیں : مَالَہٗ صَامِتٌ وَلَا نَاطِقٌ ۔ وہ بالکل نادار ہے ، اس کے پاس نہ خاموش مال ہے اور نہ بولنے والا

اَلْمُصْمِتُ : (فاعل) کہتے ہیں : ھو یشکو الی غیر مُصْمِتٍ یعنی جو اس کی آواز نہ سنے ، اس کی شکایت کرنا ۔ اور الْمُصْمَتُ (مفعول) ٹھوس چیز کو کہتے ہیں ۔ حَائِطٌ مُصْمَتٌ وہ دیوار جس میں فرجہ نہ ہو ۔ کہتے ہیں :

صَمَتَ العلیلُ : بیمار کی زبان بند ہو گئی ۔

اِلْزَمِ الصَّمْتَ تَسْلَمْ : خاموشی کو لازم پکڑ لے تو سلامت رہو گے ۔

الصمتُ : السکوتُ ، یقال صَمَتَ یَصْمُتُ بالفتح فی الماضی والضم فی المضارع ۔ (جمل)

یَبْطِشُوْنَ : اَمْ لَھُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِھَا ۔

البطش : کے معنی کوئی چیز زبردستی لے لینا کے ہیں ۔ جمل میں ہے : البطش ھو الاخذ بعنفٍ وفی الروح قال : البطش : الاخذ بقوۃٍ

قرآن پاک میں ہے : وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ اور جب تم کسی کو پکڑتے ہو ، ظالم بن کر پکڑتے ہو ۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ ۔ بیشک تیرے رب کی گرفت بڑی مضبوط ہے ۔

یَدٌ بَاطِشٌ سخت گیر ہاتھ ، مضبوط بازو ۔

بَطَشَ بَطْشًا ضرب سے آتا ہے (جمل)

البطش : تَنَاوُلُ الشئِ بصَولۃٍ (راغب)

بطش علیہ ، اس پر حملہ کیا ۔ اس پر لوٹ پڑا ۔

بَطَشَ بِہٖ : اس پر تیزی سے حملہ کیا ۔

یَدٌ بَاطِشَۃٌ : سخت گیر ہاتھ ۔

اَلْعَفْوُ : خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰھِلِیْنَ ۝ عادت کر درگزر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنارہ کر جاہلوں سے ۔

یہ آیت کریمہ اخلاقِ قرآنی کا ایک جامع ہدایت نامہ ہے ۔ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ عفو کے کئی معنی ہو سکتے ہیں ۔ اور اس موقع پر ہر معنی کی گنجائش ہے ۔ اس لئے علماءِ تفسیر نے اس آیت کی تفسیر میں

مختلف راہیں اختیار کی ہیں۔ تفسیر ابن کثیرؒ میں ہے۔ عفوؔ کہا جاتا ہے ہر ایسے کام کو جو انسان کے ساتھ بغیر کسی کلفت کے اور بغیر محنت و مشقت ہو سکے۔ امام راغبؒ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے۔ وقولہ: خُذِ الْعَفْوَ: ای ما یَسْھُلُ قصدہٗ وتناولہٗ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ قبول کر لیا کریں ہر اس چیز کو جو لوگ آسانی سے کر سکیں۔

امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں: قال اھل اللغۃ: العفو: اَلْفَضْلُ وما اُتی من غیر کلفۃ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ واجباتِ شرعیہ میں لوگوں کو اعلیٰ معیار کا مطالبہ نہ فرمائیں بلکہ وہ جس پیمانہ پر آسانی سے عمل پیرا ہو سکیں اتنے ہی درجہ کو قبول کر لیا کریں۔

ایک روایت حافظ ابن کثیرؒ نے عن الزبیر نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے پر فرمایا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے لوگوں کے اعمال و اخلاق میں سرسری اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا ہے اور میں نے عزم کر لیا ہے لاٰخُذَنَّہٗ منھُمْ ما صَحِبتُھُم کہ جب تک میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں ایسا ہی عمل کروں گا۔

دوسرے معنی عفو کے معافی اور درگذر کے بھی آتے ہیں۔ علماء تفسیر کی ایک جماعت نے اس جگہ یہ معنی بھی مراد لئے ہیں۔ اس صورت میں عفو کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ گناہگاروں خطا کاروں کے گناہ وقصور معاف کر دیا کریں۔

امام رازی نے حضرت عکرمہ سے روایت بیان کی ہے کہ جب یہ آیت اُتری تو آپ نے اس کا مطلب جبرئیل سے پوچھا تو جبرئیل امین نے اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا: یا محمد! ان ربّکَ یقولُ ھو اَنْ تَصِلَ من قَطَعَكَ وتعطی مَنْ حَرَمَكَ وتعفُو عَمَّنْ ظَلَمَكَ کہ جو شخص آپ پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کریں اور جو آپ کو کچھ نہ دے آپ اس کی بخشش کریں اور جو آپ سے قطع تعلق کرے آپ اس سے ملیں۔

اہل علم نے کہا ہے کہ جبرئیل کی یہ تفسیر الفاظِ آیت کے بالکل مطابق ہے۔ علامہ قرطبی نے سفیان بن عیینہ عن شعبی کی روایت کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کے جواب میں حضرت جبرئیل نے فرمایا کہ ان الفاظ کے مطالب ومعانی میں اللہ تعالےٰ سے پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔ لا ادری حتیّ اسألَ العالم کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں جب تک جاننے والے سے نہ پوچھ لوں۔ ایک روایت میں ہے لا ادری حتی اسألَ ربّی۔ معلوم ہوا کہ جبرئیل نے آیت کی تفسیر حضرت قدوس سے پوچھ کر بیان کی ہے۔ چنانچہ اس روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں فذھب فمکث ساعۃً

ثم رجع فقال الخ لفظ عفو کے پہلے اور
دوسرے معنی میں اگرچہ کچھ تھوڑا سا فرق ہے
لیکن حاصل دونوں کا ایک ہے کہ لوگوں کے
اعمال واخلاق میں سرسری طاعت و فرمانبرداری
کو قبول فرمالیا کریں ۔ خُذِ الْعَفْوَ: ای ما
عَفَا وسَهُلَ وتَيَسَّرَ مِنْ اَخْلَاقِ النَّاسِ
(روح المعانی)

عَفَا يَعْفُو عَفْوًا: عَفَا عنه ۔ وعَفَا له ذنبه
وعفا عن ذنبه معاف کرنا سزا نہ دینا ۔
عَفَى يَعْفِي عَفْيًا ۔ بالوں کو چھوڑ دینا تاکہ لمبے
ہو جائیں ۔ اعتفی اعتفاءً کسی کے پاس طلب
معروف کے لئے جانا ۔ قصد کرنا ۔ عَفَاهُ
واعتفاه ۔ کسی کے پاس جو کچھ ہے وہ لینے
کا قصد کیا ۔ عَفَتِ الدَّارُ ۔ گھر کے نشانات
مٹ گئے گویا ان کے آثار نے خود مٹ جانے
کا قصد کیا ۔ یہاں اصل میں اس کا مفعول ترک
کر دیا گیا ہے اور عن کا متعلق محذوف ہے ۔ اس
یوں ہے ای قصدتُ ازالة ذنبه صارفًا
عنه لهذا عفو کے معنی درگزر کرنے کے ہوئے
جیسے فرمایا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ جو درگزر کرے
اور معاملہ کی صفائی کرے ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ
پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معاف کر دیا ۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ
اس آیت میں عفو سے مراد ہر وہ چیز ہے جو
ضرورت سے زائد ہو اور اس کے خرچ کرنے میں
کوئی بار محسوس نہ ہو ۔

عَفُوٌّ بڑا درگزر کرنے والا اور بخشنے والا ہے

نزغ : وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ

الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ۔ اگر کوئی وسوسہ آپ کو شیطان کی طرف
سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں ۔ وہ
خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے ۔
النزغ : کے معنی کسی کام کو بگاڑنے کے لئے
اس میں دخل انداز ہونے کے ہیں ۔ سورۃ یوسف
میں ہے ۔ مِنْ بَعْدِ اَنْ نَزَغَ الشَّيْطٰنُ
بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۔ لفظ نزغ ۔ نسغ اور
نخس قریب المعنی ہیں یعنی طعنہ دینا ۔ جانور کے
پہلو یا پیٹھ پر نوکدار لکڑی یا کیل چبھونا تاکہ
وہ تیز چلے ۔ شیطان کا نزغ یہ ہے کہ وہ انسان
کے دل کو وسوسے کے ذریعے معاصی کی طرف مائل کرے
بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ نزغہ شیطانی سے
مراد یہاں طبیعت میں اس غصہ واشتعال کا پیدا ہونا
اور اس کے مقتضاء پر عمل کرنا ہے جو شریروں اور
جاہلوں کی اشتعال انگیزیوں سے پیدا ہوتا ایک طبعی

امر تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو
دین کی دعوت و تبلیغ اور اصلاح احوال میں بڑا
خلل واقع ہوتا۔ النزغ والنسغ والنخس
بمعنی: وہ و ادخال الابرة و طرف العصا
وما یشبہ ذلك فی الجلد (روح)
وفی فتح القدیر واصل النزغ الفساد (فتح)
نَزَغَ بینہ ای فسد کسی کے درمیان پھوٹ
ڈال دینا۔ نزغ کے معنی اغواء کے بھی آتے ہیں
اعلم ان نزغ الشیطان عبارۃ عن
وساوسہ و نخسہ فی القلب بما یسول للانسان
من المعاصی واصلہ الازعاج بالحرکۃ
الی الشر (کبیر)

اَنْصِتُوْا: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا
لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔
اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف
کان لگایا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر
رحمت کی جائے (ترجمہ ماجدی)
الانصات اَنْصَتَ انصاتًا و نَصَتَ
ینصِتُ نَصْتًا کسی کی بات کو چپ کر کے
توجہ کے ساتھ سننا
انتصات بھی نصت کے ہم معنی ہے۔
تَنَصَّتَ خاموش بنا۔ اِسْتَنْصَتَ کسی کی بات
سننے کے لئے چپ چاپ کھڑا ہونا۔ اسم
النُّصْتۃ آتا ہے بمعنی خاموشی۔
الانصات: السکوت والاستماع۔ یُقال
نَصَتَ واَنْصَتَ وانتصت بمعنی واحد
(کبیر۔ قرطبی)
انصات: ایسی خاموشی کو کہتے ہیں جو سننے ہی کی
غرض سے ہو اور یہ سننا بھی بطور ادب کے ہو۔
لفظ انصات خاص کر قرآن سننے کے لئے
بولا جاتا ہے۔ علامہ جصاص احکام القرآن میں
لکھتے ہیں۔ قال اهل اللغة: الانصات:
الامساك عن الكلام والسكوت لاستماع
القرآن (جصاص)
الانصات دونوں طرح استعمال ہوتا ہے
اَنْصَتَہ اور انصت لہ شعر

قال الامام علیکم امر سیدکم
فَلَمْ نُجِبْ وانصتنا کما قالا

اور دوسرا شعر ہے

اذا قالت حزامؓ فانصتوا لها
فانّ القول مَا قَالت حزامؓ

ترجمہ۔ جب حزام بات کرے تو اس کی بات
خاموشی سے سنو۔ چونکہ بات وہی ہے جو
حذام کہے۔
بعض نے کہا ہے کہ انصات کے معنی جواب
دینے کے ہیں لیکن یہ اس لئے صحیح نہیں کہ جواب

تو انصات یعنی سننے کے بعد ہوتا ہے اور اگر اس معنی میں استعمال بھی ہو تو آیت میں اس امر پر ترغیب ہوگی کہ کان لگا کر سنو تاکہ اس کو قبول کرنے پر قوت حاصل ہو (راغب)

اَنْصِتُوْنِیْ میری بات کو چپ ہو کر سنو۔

غُدُوّ ۔ اٰصَال : وَاذْكُرْ رَّبَّكَ

فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ۔ اپنے پالنے والے کا ذکر اپنے دل میں کیا کر عاجزی اور خوف کے ساتھ اور چلانے کی آواز سے نہیں صبح اور شام کو۔ اور اہل غفلت میں شامل نہ ہو جانا۔

غُدُوٌّ ۔ غُدْوَۃٌ کی جمع ہے۔ اس کی جمع غَدَوَاتٌ بھی آتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ غدوّ مصدر ہو۔ غَدَا یَغْدُوْ غُدُوًّا وَغُدْوَۃً دونوں طرح مصدر آتا ہے۔ طلوع فجر سے طلوع شمس تک کے وقت کو غُدْوَۃٌ کہتے ہیں۔ اور مصدر چونکہ واحد اور جمع میں برابر استعمال ہوتا ہے اس لئے آگے آصال کا لفظ جمع لایا گیا ہے۔

آصال : علامہ ازہری کا کہنا ہے کہ اٰصَال اُصُل کی جمع ہے اور اُصُل خود جمع ہے اصیل کی۔ تو گویا اٰصال جمع الجمع ہے۔ وجہ اس کی ہے کہ فعیل کی جمع افعال کے وزن پر مستعمل نہیں ہے اس لئے اصیل کی جمع اُصُلٌ فُعُل کے وزن پر بنا کے پھر اُصُلٌ کی جمع اٰصال بنائی گئی۔ لیکن یہ قول محل نظر ہے۔ اس لئے کہ خود قرآن پاک میں فعیل کی جمع افعال مستعمل ہے جیسے یمین کی جمع اَیْمَانٌ۔ اور اُصُلٌ واحد بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے

ولا باحسن منها اذ دنا الاُصُلُ

اَصِیل : عصر کے بعد سے غروب تک کا وقت ہے اس کی جمع اُصُلٌ۔ آصال و اَصَائِل آتی ہے۔ اور کبھی اس کی جمع اُصلان بھی آتی ہے جیسے بَعِیْرٌ کی جمع بُعْرَان۔ پھر جمع کی تصغیر اُصَیْلان بنا کر نون کو لام سے بدل دیتے ہیں اور اُصَیْلَال کہتے ہیں۔ نابغہ کہتا ہے :

وقفتُ فیہا اُصَیلاً لا اُسَائلُها
عَیَّتْ جوابًا و ما بالربع من احد۔ قرطبی

اٰصال دراصل اَصْلٌ سے ماخوذ ہے۔

اصل الشئ : کسی چیز کی اُس بنیاد اور جڑ کو کہتے ہیں کہ اگر اس کا ارتفاع فرض کیا جائے تو شئ کا باقی حصہ معدوم ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ۔

اور تَاَصَّلَ کذا کے معنی ہیں کسی چیز کا جڑ پکڑنا۔ اسی سے خاندانی اصل اور مجد کو اصیل کہا جاتا ہے محاورہ ہے۔ فلانٌ لا اصل له ولا فصل :

یعنی اس کا کوئی حسب ونسب نہیں ہے۔ دن کے آخری حصہ کو اصیل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دوسرے دن کی اصل سے ملا ہوتا ہے۔ چونکہ شرعی اعتبار سے دوسرے دن کی ابتداء غروبِ آفتاب سے ہوتی ہے۔

فسمّی آخر النهار اصيلاً لكونه ملاحقاً مما هو الاصل لليوم الثاني (کبیر)

استیصال: جڑ سے اکھاڑ دینا

استأصل الله الكفار۔ اللہ نے کافروں کو جڑ سے اکھیڑ دیا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

۳، ذوالحجۃ ۱۳۹۵ھ

۷۵-۱۲-۷

شرح الفاظ القرآن من سورۃ الانفال مدنیۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انفال: یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ والرسول تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا تو کہہ دے مال غنیمت اللہ اور رسول کا ہے۔

لفظ انفال نفلؔ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں فضل و انعام، نفلی نماز روزہ۔ صدقہ کو بھی نفل اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ کسی پر لازم و اجب نہیں۔ کرنے والے اپنی خوشی سے کرتے ہیں۔

اصطلاح قرآن و سنت میں لفظ نفل اور انفال مال غنیمت کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کفار سے بوقت جہاد حاصل ہوتا ہے۔ مگر قرآن کریم میں اس معنی کیلئے تین لفظ استعمال کئے گئے ہیں انفال۔ غنیمت۔ فیٔ۔ ان تینوں کے معنی تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف ہیں۔ فرق معمولی اور مختلف ہونے کی وجہ سے بعض اوقات ایک لفظ دوسرے کی جگہ مطلقاً مال غنیمت کے لئے بھی استعمال کرلیا جاتا ہے۔ غنیمت عموماً اس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ و قتال کے کفار سے ملے۔ خواہ وہ چھوڑ کر بھاگ جائیں یا رضامندی سے دیدینا قبول کرلیں۔ نفل اور انفال کا لفظ اکثر اُس انعام کے لئے بولا جاتا ہے جو امیر جہاد کسی خاص مجاہد کو اس کی کارگزاری کے صلہ میں علاوہ حصہ غنیمت کے بطور انعام کے عطا کرے یہ معنی تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ ابن عباس نے نقل کئے ہیں (ابن کثیر)
اور کبھی مطلقاً مال غنیمت کو بھی نفل اور انفال کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اکثر مفسرین نے یہی عام معنی نقل کئے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے یہی عام معنی نقل کئے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لئے کوئی اختلاف نہیں۔ اور اس کی بہتر تشریح و تفسیر وہ ہے جو

ابو عبید نے اپنی کتاب الاموال میں کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اصل لغت میں نفل کہتے ہیں فضل انعام کو۔ اور اس امت مرحومہ پر اللہ کا یہ خصوصی انعام ہے کہ جہاد و قتال کے ذریعہ جو اموال کفار سے حاصل ہوں اُن کو مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا (معارف القرآن)

والنفل ما ینفله الغازی ای یعطاه زائدًا علی سهمه من المغنم (کشاف)

والانفال واحده نَفَلٌ (بتحریک الفاء) والنَّفْل بسکون الفاء الزیادة علی الواجب وهو التطوع (قرطبی)

والغنیمة سمیت لانها زیادة من الله لهذه الامة مما کان محرمًا علی غیرها (تفسیر کبیر)

واصل ذلك من النفل ای الزیادة علی الواجب (راغب) الانفال: بفتح النون کفَرَسٍ وافراسٍ والمراد بها الغنائم وسمیت انفالًا والنفل هو الزیادة لزیادة هذه الامة بها علی الامم السابقة (جل)

الانفال: الغنائم واحدها نفل۔

(غریب القرآن ابن قتیبہ)

لفظ نفل اس کے علاوہ اور کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قسم کھانا۔ دفع کرنا۔ انفال: انعام دینا۔ انتفال۔ طلب کرنا۔ بیزار ہونا

نافلة: زائد علی الواجب شی عطیہ۔

اس کی جمع نوافل آتی ہے اور نوافل ان عبادتوں کو کہا جاتا ہے جو فرائض کے علاوہ ہوں۔

حدیث میں ہے: ان الغنائم کانت محرمةً علی الامم قبلنا فنفلها الله تعالٰی هذه الامة۔

ترجمہ آیت: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ

ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل سہم جاتے ہیں۔ اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ اِن کا ایمان زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ اپنے خدا پر ایمان رکھتے ہیں

الوجل ۔ کے معنی دل ہی دل میں خوف محسوس کرنے کے ہیں۔ اور یہ باب وَجِلَ یَوْجَلُ کا مصدر ہے جس کے معنی ڈرنے یا گھبرانے کے آتے ہیں۔ قرآن میں ہے اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ یعنی ہمیں تو تم سے خوف سا محسوس ہوتا ہے۔

لَا تَوْجَلْ ۔ ڈریئے نہیں۔ اس کی مؤنث وجلاء نہیں آتی بلکہ وَجِلَة آتی ہے جیسے فرمایا:

وَ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ۔ ان کے دل ڈرتے
ہیں ۔ وَجِلَ کے مضارع میں چار لغات ہیں
یوجل ویاجِل وییجل وَیِیجَلُ حرف یا کا
کسرہ ۔ وَجَلٌ اور مَوْجَلٌ مصدر ہیں ۔ ظرفِ
مکان مَوْجِلٌ آتا ہے ۔ جن حضرات نے یَاجَلُ
پڑھا ہے انہوں نے حرفِ واو کو ماقبل
مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے بدل دیا
ہے ۔ اور یَوْجَل یہ قرآن پاک کی لغت ہے،
قَالُوْا لَا تَوْجَلْ ۔ اور یِیْجَلُ یہ بنی اسد
کی لغت ہے ۔ وہ حرف مضارع کو اکثر کسرہ
دیتے ہیں اور کہتے ہیں انا اِیْجَلُ ونحن
نِیْجَلُ و اَنْتَ تِیْجَلُ ۔ اور جن حضرات نے
یَیْجَلُ ۔ یا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے انہوں
نے بھی بنی اسد ہی کی لغت پر اس کی بنیاد
رکھی ہے ۔ فرق صرف اتنا کیا ہے کہ حرف
مضارع کو فتحہ دیا ہے

والوَجَل : الخوف (قرطبی) ۔ الوجَلُ :
الخوف والفزع ۔ فتح ۔

الوجل دراصل مطلق خوف کو نہیں کہتے ،
بلکہ وَجَل اس خوف کو کہا جاتا ہے جو بڑوں کی
جلالتِ شان اور ان کی ہیبت وعظمت کی
وجہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وَجِلَ
بفتح الجیم بھی آتا ہے اس کا مضارع یَیْجَل
آتا ہے

یُسَاقُوْنَ : کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی
الْمَوْتِ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ ۔

سَاقَ یَسُوْقُ سَوْقًا وسِیَاقًا وسیاقَةً
جانور کو پیچھے سے ہانکنا جیسے قَوْد آگے
سے کھینچنا ۔ صیغہ صفت سَائِق اور جمع ساقۃ
وسُوَّاق وسائقون آتی ہیں اور صفت مفعولی
مَسُوْقَة ۔ محاورہ ہے سَاقَهٗ مَسَاق
غیرہ اور اس کے ساتھ غیروں کا سا معاملہ
کیا ۔ ساق الحدیث حدیث بیان کرنا
ساق الیه المال : مال پیش کرنا ۔
یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ ۔ یہ ایک محاورہ ہے
جو مشکل امور میں بولا جاتا ہے ۔ جہاں کوئی
سخت مہم پیش ہو اور اس کا بندوبست
کرنا بہت دشوار ہو ۔ سوقٌ کی تصغیر سُوَیْقَة
آتی ہے ۔ ساق پنڈلی کو کہا جاتا ہے ۔
اس کی جمع سُوْقٌ وسِیقان آتی ہے ۔
سَاقُ الشَّجَرَةِ : درخت کا تنا ۔ سیاق
الکلام اسلوب کلام کو کہتے ہیں ۔
وقعت هذه العبارة فی سیاق الکلام ۔ یہ
عبارت سلسلہ کلام میں آگئی ہے ۔

الشَّوْكَة : وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ
الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ ۔

شوکتہ کے لفظی معنی چبھنے والے کانٹے کے ہیں مجازاً اس سے مراد قوت وشدت اور اسلحہ وغیرہ ہوتی ہے۔ شوک کانٹا اور تشبیہ کے طور پر بچھو کے ڈنک کو بھی شوک کہا جاتا ہے اور کانٹے والے درخت کو شجرۃ شاکۃ وشائکۃ کہدیتے ہیں۔ شاکت الثدیٔ عورت کا سینہ ابھر آیا۔ شائک جمع شائکۃ والشوك آتی ہے کانٹے دار۔ رجلٌ شائکُ السلاح، مسلح آدمی۔ پھر قلب کرکے شاکی السلاح کہہ دیتے ہیں ارضٌ شاکۃ کانٹوں والی زمین۔ والشوکۃ: السلاح (قرطبی) والشوکۃ فی الاصل واحدۃ الشوك المعروف ثم استعیرت للشدۃ وتطلق علی السلاح ایضًا (روح)

تَسْتَغِيْثُوْنَ : اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُرْدِفِیْنَ ۔

جب تم لگے فریاد کرنے اپنے رب سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ میں مدد کو بھیجونگا تمہاری ہزار فرشتے لگاتار آنے والے۔

الغَوْثُ : کے معنی ہیں مدد اور نصرت کرنا غاثہ یَغُوْثُہ (اجوف واوی) غوثًا و اغاث اغاثۃً مدد کرنا۔ اور اَلْغَیْثُ کے معنی بارش کے ہیں یہ غَاثَ یَغِیْثُ غَیْثًا سے ہے غاث اللہ البلاد ملک میں بارش برسانا۔ اِسْتَغَثْتُہُ (استفعال سے) کے معنی کسی کو مدد کے لئے پکارنے کے ہیں اور بارش طلب کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اسْتَغَثْتُہُ کے معنی جب مدد طلب کرتا ہوں تو اس کا مطاوع اَغَاثَنِیْ آتا ہے۔ اور جب اس کے معنی بارش طلب کرتا ہوں تو اس کا مطاوع غَاثَنِیْ آئے گا۔ اور غَوَّثْتُ بھی غوثٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں میں نے اس کی مدد کی اور آیت کریمہ اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ کے معنی ہیں جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے۔ الاستغاثۃ : فریاد کرنا۔ مدد کیلئے پکارنا۔ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ هُوَ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَی الَّذِیْ هُوَ مِنْ عَدُوِّهٖ : اسرائیلی نے فرعون کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لئے پکارا۔

آیت کریمہ : وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوْهَ میں دونوں احتمال ہیں۔ غوثٌ سے بھی ہوسکتا ہے جس کے معنی مدد مانگنے کے ہیں اور غیثٌ سے بھی ہوتا ہے، جس کے معنی ہیں پانی مانگنا۔ اسی طرح یُغَاثُوْا (فعل مجہول) کے بھی دونوں معنی

ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ غوث سے ہو تو یہ اَغَاثَ (افعال) کا فعل مجہول ہوگا۔

اَلْغَیْثُ کے معنی بارش کے ہیں۔ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُهٗ۔ تغویثٌ: واغوثاہ کہنا۔ فریاد کرنا۔ غَوَّثَ الرَّجُلُ کے معنی یہ بھی ہیں: اَللّٰھُمَّ اَغِثْنَا۔ اے اللہ ہماری مدد کر

یَا غِیَاثَ الْمُسْتَغِیْثِیْنَ۔ اے سب کی فریاد سننے والے۔

غَوْثٌ۔ غُوَاثٌ۔ غَوَاثٌ اسم ہیں بمعنی مدد

اَلْاِسْتِغَاثَۃُ: طَلَبُ النُّصْرَۃِ۔

الغوثُ۔ النصر (قرطبی) الغوث یقال فی النصرۃ والغیثُ فی المطر (راغب)

والاستغاثۃ کما قال غیر واحد: طلب العوث (روح)

لفظ غوث متعدی بنفسہ ہوتا ہے۔ اور قرآن پاک میں جہاں بھی یہ واقع ہوا ہے متعدی بنفسہ ہوا ہے۔ وھو متعدٍّ بنفسہ ولم یقع فی القرآن الا کذلك (روح)

البتہ اشعار میں حرف بآء کے ذریعہ بھی اس کا تعدی کیا گیا ہے۔ جیسا کہ

حتی استغاث بمآءٍ لا رشاء لـه
من الاباطح فی حافاته البرك

قرآن پاک میں ہے: وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ کَالْمُھْلِ۔ یہاں بھی یُغَاثُوْا حرف بآء کے ذریعہ متعدی ہے۔

اور قرآن پاک میں صرف ایک جگہ یہ جہاں حرف بآء کے ذریعہ استعمال ہوا ہے۔

مُرْدِفِیْنَ : بصیغہ اسم فاعل۔ اس کے معنی ہیں پیچھے لگانے والے۔ اس میں غالباً اس طرف اشارہ ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں کا نزول متواتر یکے بعد دیگرے ہوتا رہا تھا۔ ایک جماعت اتر گئی پھر اس کے بعد دوسری پھر تیسری۔ ای یردف بعضھم بعضًا (ابن کثیر)

الرِّدْفُ: اصل میں ہر وہ چیز ہے جو دوسرے کی تابع اور اس کے پیچھے ہو۔ رَدفُ المَرْأَۃِ عورت کے سرین۔ التَّرادُفُ: یکے بعد دیگرے آنا۔ ایک دوسرے کی پیروی کرنا۔

الرَّادِف: پچھلا۔ متأخر اور المُرْدِفُ: اپنے آگے والا، جس نے اپنے پیچھے کسی کو سوار کیا ہو

ابو عبیدہ کے نزدیک رَدِفَ اور اَرْدَفَ یعنی مجرد و مزید دونوں ایک ہی معنی دیتے ہیں۔

وحکی ابوعبیدۃ انّ رَدِفَنِي واَرْدَفَنِي واحدٌ۔ (قرطبی) اس لئے انہوں نے اس کی معنی بعد میں آنے والے کئے ہیں یعنی اَرْدَفَ بعضھم بعضًا۔

ابوعبیدہ کے علاوہ بعض دوسرے اہل علم نے

مُرْدِفِیْن کے معنی یہ کئے ہیں کہ دوسرے
فرشتوں کو پیچھے لانے والے۔

ایک قرأت میں مُرْدَفِیْن بفتح الدال بھی پڑھا
گیا ہے۔ اس قرأت پر یہ اِرْدَاف سے مجہول کا
صیغہ ہے اور اَلْف کی صفت ہے اور
مُمِدُّکُمْ کی ضمیر سے حال بھی ہوسکتا ہے۔
(ای مُمِدُّکم فی حال اردافکم بالف من الملٰئکۃ)[1]

اور ایک قرأت میں مردّفین بتشدید دال،
باب افتعال سے پڑھا گیا ہے۔ پھر صرفی قاعدہ کے
مطابق اس میں تعلیل کی گئی ہے۔ اس کی اصل
مُرْتَدِفِیْن ہے۔ تاء کو دال میں ادغام کرکے
اس کی حرکت دال کو دے دی گئی ہے۔
(قرطبی۔ راغب)

رَدَفَ يَرْدُفُ رَدْفًا ورَدِفَ (س) رَدْفًا۔
رَدَفَهٗ و رَدِفَ لَهٗ پیچھے ہونا۔ الرَّدِيْفُ
سوار کے پیچھے سوار ہونیوالا۔ جمع رِدَافٌ و
رُدَفَاءُ۔ مُرْدِفِين ای رادفين۔ يُقال
رَدَفْتُهٗ وَاَرْدَفْتُهٗ: اذا جئتَ بعدہٗ
(غریب القرآن)

نُعَاس: اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ
النعاس، کے معنی اونگھ یا ہلکی نیند کے آتے ہیں۔
اور لفظ نعاس، سکون اور اطمینان کے معنی
میں بھی آتا ہے جیساکہ سورہ آل عمران کی آیت
اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى، میں بعض نے کہا ہے کہ
اس سے مراد سکون اور اطمینان ہے۔
والنُّعَاسُ حالة الامن الذی لا یخاف (قرطبی)
والنعاس اوّل النوم قبل ان یثقل (روح)
النعاس: النوم القليل (راغب)
نعس (ف۔ن) نعسًا۔ نعس الرَّجُل
اونگھنا۔ صفت نَاعِسٌ جمع نُعُسٌ۔
مؤنث نَاعِسَةٌ جمع نَاعِسَاتٌ ونواعس
نَعَسَ جِسْمُهٗ جسم کمزور ہوگیا۔ اور نعست
السُّوْقُ بازار کا ٹھنڈا ہوجانا۔

الاعناق: سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ
وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ۔
عُنُق گردن۔ اس کی جمع اعناق ہے۔
وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ
عُنُقِهٖ (اسرائیل) وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً
اِلٰى عُنُقِكَ (اسرائیل) فَطَفِقَ مَسْحًا
بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (ص) وَاُولٰٓئِكَ
الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ (رعد) فَظَلَّتْ
اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (شعراء)
عَنِقَ يَعْنَقُ عَنَقًا بمعنی گردن والا ہونا۔

[1] قرطبی

رجلٌ اعنقُ: بمعنی لمبی گردن کا آدمی۔
امرأۃ عنقاء زنِ دراز گردن۔
اَعْنَقْتُہٗ کَذَا میں نے اس کی گردن میں فلاں چیز ڈالدی۔ اسی سے محاورہ ہے
اِعْتَنَقَ الْاَمْرَ یعنی کسی کام کی ذمہ داری اٹھالینا
اعناق سے مراد یہاں سر ہیں۔
فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ کے معنی ہیں ان کے سروں پر مارو (تاکہ ان کے دماغ درست ہوں) سر چونکہ بلند ہوتے ہیں لہذا اسی سے بطور استعارہ کے قوم کے سرداروں کو بھی اعناق کہدیتے ہیں۔
اعناق القوم لیڈر، سردار، علماء۔
چنانچہ آیت کریمہ فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ میں رؤسائے قوم مراد ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ پھر ان کے سردار عاجز اور مجبور ہو کر اس کے آگے جھک جائیں۔
وقیل لاشراف القوم اعناق۔ وعلیٰ هٰذا قوله: فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (راغب)
بکری کا بچہ جو ایک سال سے کم ہو اسے بھی عَنَاق کہتے ہیں۔ کتبِ حدیث میں ہے، جناب صدیق اکبرؓ کا مشہور قول ہے:

لو منعونی عَنَاقًا کانوا یُؤَدُّوْنَہٗ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علیہ۔
عَنْقَاء مُغْرِب: ایک خیالی پرندہ کا نام ہے جس کا وجود دنیا میں نہیں پایا جاتا۔

اَلْبَنَانَ

اَلْبَنَانَ: بنانٌ جمع ہے، اس کی واحد بنانۃٌ آتی ہے بمعنی انگلیاں یا ان کے اطراف یہ اَبَنَّ بالمکان کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی جگہ اقامت پذیر ہو جانا اور چونکہ جائے رہائش کی اصلاح انگلیوں سے ہوتی ہے اس لئے ان کو بنان کہا جاتا ہے۔
اَبَنَّتِ السَّحَابَۃُ: بادل کا کئی روز تک رہنا
البَنَانَۃ: بفتح الباء ہرا بھرا باغ۔
بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ اس آیتِ کریمہ میں انگلیوں کی درستگی سے اپنے قدرت کا اظہار کیا ہے۔ اور چونکہ انگلیاں ذریعۂ طاقت ہیں اور مدافعت و مقابلہ کا ذریعہ بھی ہیں، اس لئے فرمایا وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ کہ ان کے پور پور توڑ کر رکھ دو۔
البَنَّۃُ: بو، اچھی ہو یا بری
قال ابن الانباری: البنان، اطراف الاصابع من الیدین والرجلین والواحد بنانۃ۔ روح
وقال الراغب: ھی الاصابع۔ وسمیت بذلك

لان بها اصلاح الاحوال التی بھا یمکن للانسان ان یبین ای یقیم - من ابن بالمکان وبن اذا قام - حاصل یہ کہ بنان انگلیوں کو بھی کہا جاتا ہے اور ان کے پوروں کو بھی۔ اشعار عرب میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ عنترہ شاعر کہتا ہے :

وکان فی الھیجاء یحمی ذمارھا
ویضرب عند الکرب کل بنان

اس میں بنان سے مراد انگلیوں کے پور ہیں۔ آگے کہتا ہے

وان الموت طوع یدی اذا ما
وصلت بنانھا بالھندوانی

یہاں بنانھا میں بنان سے مراد انگلیاں ہیں

زَحْفًا : یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۔

الزَّحْفُ : اصل میں اس کے معنی پاؤں کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا کے ہیں جیسا کہ بچہ چلنے کے قابل ہونے سے قبل سرین اور گھٹنے گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے۔ پھر اسی سے بطور استعارہ کے لشکر کثیر کو بھی زحف کہتے ہیں چونکہ یہ بھی اپنی کثرت کی بنا پر آہستہ آہستہ چلتا ہے گویا کہ وہ گھسٹ گھسٹ کر چل رہا ہے۔ اور زاحف اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ سے ہٹ کر گرے اور پھر اُچٹ کر نشانہ پر جا پڑے۔

التَّزَاحُف : ایک دوسرے کے قریب ہونا۔

ازدحف القومُ : ایکدوسرے کی طرف بڑھنا

اَلزَّحْفُ : الدنو قلیلاً قلیلاً واصله الاندفاع علی الالیۃ ثم سمی کل ماش فی الحرب الی آخر زحفا (قرطبی۔ کبیر۔ راغب) آیت میں لفظ زحف سے مراد دونوں لشکروں کا مقابلہ اور اختلاط ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ایسی جنگ چھڑ جانے کے بعد پشت پھیرنا اور میدان سے بھاگنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں (معارف)

والزحفُ : الجیش الدھم الذی یُری لکثرته کانه یزحف ای یدب دبیبا (کشاف)

اصل الزحف للصبی ۔ وھو ان یزحف علی إسته قبل ان یقوم (کبیر)

قال ثعلب : الزحفُ المشی قلیلاً الی الشئ ۔ (کبیر)

مُتَحَرِّفًا : وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ ۔ تحرّف کے معنی ہیں کسی ایک جانب مائل ہو جانا۔ تحرّف عنه وانحرف واحرورف

کسی سے الگ ہو کر ایک طرف ہو جانا۔

واصل الانحراف: الزوال عن جهة الاستواء

(روح) اسی سے تحریف ہے

تحریف کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک جانب

کر دینا۔ تحریف القلم: قلم کو ٹیڑھا قط

لگانا۔ تحریف الکلام کے معنی ہیں کلام کو اس

کے موقع سے پھیر دینا کہ اس میں دو احتمال پیدا

ہو جائیں ... الزوال عن جهة الاستواء

مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ

متحیز کے معنی انضمام اور ملنے کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اپنی جماعت سے مل کر قوت

حاصل کرنے کی نیت سے میدان چھوڑے تو یہ

جائز ہے۔

حاز یحوز حوزا و حیازة و احتاز احتیازا

حاز و احتاز الشئ۔ اکٹھا کرنا۔ جمع کرنا۔

احتاز الشئ: کسی چیز کو اپنے لئے مخصوص کرنا

حاز الابل: اونٹ کو تیزی [illegible] سے

ہانکنا۔ حاز الرجل: آدمی کا آہستہ چال

سے چلنا۔ تحوز کنارہ کش ہونا علیحدہ

ہونا۔ کہا جاتا ہے دخل علیہ فما تحوز له

وہ اس کے پاس آیا اور اس کے لئے علیحدہ نہیں ہوا

الحیز والحیز جگہ، مکان۔ کہتے ہیں: ھذا فی

حیز التواتر یعنی اس کا ثبوت تواتر کے درجہ

میں ہے۔ الحوزاء: لڑائی۔ جنگ۔

الحوزة۔ کنارہ طبیعت۔ تحوز اور تحیز

دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی انضمام اور ملنا

متحیز کا وزن بعض نے متفعل لکھا ہے لیکن یہ

صحیح نہیں ہے۔ اس کا وزن مُتَفَيْعِلٌ ہے اصل میں

مُتَحَيْوِزٌ ہے واؤ کو یاء بنا کر یاء میں مدغم کر دیا

گیا ہے۔ والتحوز والتحيز: الانضمام

وتحوزت الحية: انطوت۔ سانپ کا

کنڈلی مارنا (جمل)

قال ابو عبيدة: المتحيز: المتنحي وهما

لغتان التحيز والتحوز۔

قال الواحدي: واصل هذا الحوز وهو

الجمع۔ يقال حزته فانحاز وتحوز و

تحيز اذا انضم واجتمع۔ ثم سمي التنحي

تحيزا لان المتنحي عن جانب ينفصل

عنه ويميل الى غيره (كبير)

وقال الزمخشري: ووزن متحيز متفيعل

لا متفعل لانه من حاز يحوز، فبناء متفعل

منه متحوز (كشاف۔ جمل۔ روح)

مُوْهِنُ: ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ

الْكٰفِرِيْنَ (بات یہ ہے کہ) اس میں کوئی شک نہیں

۵ قرطبی

کہ خدا کافروں کی مکاریوں کو رسوا کرے گا۔
موھن وھن سے ہے جس کے معنی ہیں جسمانی یا اخلاقی کمزوری ظاہر کرنا۔
الوھن ضعف من حیث الخلق او الخلق (راغب) وَهَنَہ و اَوْهَنَہ کمزور کرنا۔
وَهِنَ يَوْهَنُ وَهْنًا۔ کام یا بدن میں کمزور ہونا رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي اے میرے خدا میری ہڈیاں بھی بڑھاپے کے سبب کمزور ہو گئی ہیں۔ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ (کافر) قوم کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرنا۔
نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے مُوَهِّنُ یعنی توھین سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے مُوهِنُ افعال سے بتخفیف الھاء پڑھا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

لَوْ : وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ۔ اور اگر اللہ جانتا انہیں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا
یعنی اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خیر دیکھتے تو ان کو اعتقاد کے ساتھ سننے کی توفیق بخش دیتے اور اگر بحالتِ موجودہ کہ ان میں طلبِ حق نہیں ہے حق بات سنا دے تو وہ منہ موڑتے ہوئے بھاگ نکلیں گے
حرف لَوْ۔ لغوی اعتبار سے چھ طرح پر مستعمل ہے ۱ ماضی میں شرط کے معنی کے لئے جیسے لَوْ جَآءَنِي لَاَكْرَمْتُهُ اگر وہ میرے پاس آتا تو میں اس کی عزت کرتا
۲ زمانہ مستقبل میں شرط کے معنی کے لئے جیسے لو تلتقي اصداؤنا بعد موتنا کاش کہ ہمارے اصداء موت کے بعد ملتے۔
۳ مصدریہ بمعنی اَنْ، لیکن یہ نصب نہیں دیتا اور عموماً یہ وَدَّ يَوَدُّ کے بعد آتا ہے جیسے وَدُّوا لو تأتيهم وہ چاہتے ہیں کہ تو ان کے پاس آئے۔
۴ تمنا کے لئے اس وقت اس کا جواب منصوب اور فاء کے ساتھ آتا ہے جیسے لو تأتينا فتحدثني کاش تو میرے پاس آتا۔ مجھ سے باتیں کرتا۔
۵ عرض کے لئے مثل اَلَا۔ اس کا جواب بھی منصوب اور فا کے ساتھ آتا ہے جیسے لو تنزل عندنا فتصيب خيرًا اگر تو ہمارے پاس آتا تو بہتری پاتا
۶ تقلیل کے لئے جیسے تَصَدَّقُوا ولو بظلفٍ مُحْرَقٍ تم خیرات کرو خواہ جلا ہوا کھر ہی کیوں نہ ہو۔
لو : قيل هو لامتناع الشيء لامتناع غيره

ویتضمن معنی الشرط (راغب)
بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ حرف لَوْ ایک چیز کا دوسری کے امتناع کے سبب ناممکن ہونے کے معنی میں آتا ہے اور شرط کے معنی کو متضمن ہوتا ہے جیسا کہ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ کہہ دو اگر تم میرے رب کے خزانوں کے مالک ہوتے تو پھر تو بڑا بخل کرتے کسی کو کچھ نہ دیتے اور سب اپنے لئے ذخیرہ اندوزی کر لیتے مگر چونکہ تم خدائی خزانہ کے مالک نہیں ہو اس لئے روک بھی نہیں سکتے اور نہ بخل کر سکتے ہو

یَحُوْلُ : وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۔

حال یحول حَوْلاً و حُؤُوْلاً : حال الشیئُ ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا۔
حَوَّلَہٗ تَحْوِیْلاً : ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل کرنا۔ زائل کرنا۔ الحال : کیفیت، ہیئت، صفت۔ جمع اَحْوَال واَحْوِلَة۔ حالۃ الشیئ : چیز کی حالت۔ جمع حالات۔ حالات الدّھر : گردشہائے ایام
الحول : اس کے معنی دراصل کسی چیز کے متغیر ہونے اور دوسری چیز سے الگ ہونے کے ہیں۔ معنی تغیر کے اعتبار سے حَالَ الشَّیْئُ یَحُوْلُ حُؤُوْلاً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز کے متغیر ہونے کے ہیں اور معنی انفصال کے اعتبار سے حال بینی و بینک کذا کا محاورہ ہے۔ یعنی میرے اور تیرے درمیان فلاں رکاوٹ بن گئی۔ حائل ہو گئی۔ اور آیت کریمہ اِنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ میں باری تعالیٰ کے مقلب القلوب ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق انسان کے دل میں ایسی بات ڈال دیتا ہے جو اس کو اس کے مقصد سے پھیر دیتی ہے۔

خَآصَّةً : وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً

لفظ خاصّۃ عامّۃ کی ضد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس فتنہ سے اپنا بچاؤ کر دیہ خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر واقع نہیں ہوگا جو تم میں گنہگار ہیں بلکہ وہ سب پر واقع ہوگا۔
التخصیص والاختصاص والخصوصیۃ والتخصص قریب المعنی ہیں۔ کسی چیز کے بعض افراد کو دوسروں سے الگ کر کے ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا۔

یَتَخَطَّفَ : تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَكُمُ

النَّاسُ ۔ تم ڈرتے ہو کہ کہیں لوگ تمہیں اُچک نہ لیں ۔ خَطَفَ یخطف و یَخْطَفُ (س۔ من) خَطْفًا و اختطف اختطافًا : کسی چیز کو تیزی سے اچک لینا۔ الخطفُ : الاخذ بسرعۃ (قرطبی) اِلَّا من خَطِفَ الْخَطْفَۃَ ۔ یہاں خطفہ کرنے والوں سے مراد شیاطین ہیں جو ملأ اعلیٰ کی باتیں چوری چوری سننے کی کوشش کرتے تھے ۔

یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ البقرہ

الخطّاف : ایک پرندہ ہے پرواز کرنے میں کسی چیز کو اُچک لیتا ہے۔ لوہے کا وہ آلہ جس سے کنویں کے اندر ڈول گرا ہوا نکالا جاتا ہے۔ اور اس لوہے کو بھی خطاف کہتے ہیں جس پر چرخی گھومتی ہے جمع خطاطیف (راغب)

اختطافٌ ، تَخَطُّفٌ ، خطفٌ ۔ تینوں قریب المعنی ہیں۔ التخطف کالخطف الاخذ بسُرعۃ

لَا تَخُوْنُوْا : یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔

خَانَ یَخُوْنُ خَوْنًا وَخِیَانَۃً وَمَخَانَۃً ۔ وَخَانَۃً ۔ امانت میں خیانت کرنا۔ بدعہدی کرنا۔ کم کرنا۔ خَوَّنَہٗ وَتَخَوَّنَ مِنْہُ : آہستہ آہستہ کم کرنا۔

خیانت اور نفاق دونوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خیانت کا لفظ عہد اور امانت کا پاس نہ کرنے پر بولا جاتا ہے اور نفاق دین میں بولا جاتا ہے ۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ خَوْنٌ کے معنی کم کرنے کے ہیں جیسا کہ وَفَا کے معنی پورا کرنے کے آتے ہیں پھر یہیں سے امانت اور وفا کی ضد میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چونکہ خیانت میں دوسرے کا حق کم کرنا اور مارنا پایا جاتا ہے

معنی الخون : النقص کما ان معنی الوفاء التمام ومنہ تخوّنہ : اذا تنقصہ ، ثم استعمل فی ضد الامانۃ والوفاء (کشاف ، کبیر)

واصل الخون النقص کما ان اصل الوفاء التمام واستعمالہ فی ضد الامانۃ ایاہ لتضمینہ (بیضاوی) روح)

امام راغب نے مفردات میں خیانت کیلئے یہ بھی قید لگائی ہے وہ مخفی طور پر ہو کہ مخون کو اس کی اطلاع بھی نہ ہو

اعتبر الراغبُ فی الخیانۃ ان تکون سرًّا (روح)

وقال الراغب فالخیانۃ مخالفۃ الحق

بنقض العهد فی السّر۔ یعنی خیانت کے معنی خفیہ طور پر عہد شکنی کر کے حق کی مخالفت کرنے کے ہوئے

عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ

یہاں اختیان کے معنی خیانت کے لئے حیلہ کرنے کے ہیں۔ کیونکہ صحابہؓ سے نفس خیانت کا صدور نہیں ہوا تھا بلکہ محض اختیان کا ارتکاب کیا تھا جس کے معنی قصد خیانت کے لئے جذبات کے حرکت میں آنے کے ہیں۔ اسی معنی کی طرف اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ میں اشارہ پایا جاتا ہے چونکہ اگر خیانت کا ارتکاب پایا جاتا تو آیت میں تَخُوْنُوْنَ اَنْفُسَکُمْ ہوتا۔ اسی لئے امام راغب نے لکھا ہے کہ الاختیان مُرَاوَدَۃُ الخِیَانَۃ

فُرْقَانًا : فرقان اور فرق دونوں مصدر ایک معنی کے ہیں۔ محاورات میں فرقان اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دو چیزوں میں واضح طور پر فرق اور فصل کر دے۔ اسی لئے فیصلہ کو فرقان کہتے ہیں کیونکہ وہ حق اور ناحق میں فرق واضح کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کو بھی فرقان کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی معنی کیلئے غزوۂ بدر کو یَوْمُ الْفُرْقَانِ کے نام سے موسوم کیا ہے (معارف)

علامہ راغب نے لکھا ہے کہ الفرقان۔ الفرق سے زیادہ ابلغ ہے کیونکہ اس کا استعمال حق اور باطل کو الگ الگ کرنے پر بولا جاتا ہے اور الفرق عام ہے۔ فرقانًا : فصلًا بین الحق والباطل۔

یَمْکُرُ : وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے تفسیر مظہری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ لفظ مکر کے معنی عربی لغت میں یہ ہے کہ کسی حیلہ و تدبیر کے ذریعہ اپنے مقابل شخص کو اس کے ارادے سے روک دیا جائے۔ پھر یہ کام کسی نیک مقصد کے لئے ہو تو یہ مکر محمود ہے اور اچھا ہے اور اگر کسی برے مقصد کے لئے کیا جائے تو مذموم اور برا ہے۔ اس لئے یہ لفظ انسان کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لئے صرف ایسے ماحول میں استعمال ہوتا ہے جہاں کلام کے سیاق اور تقابل کے ذریعہ مکر مذموم کا شبہ نہ ہو سکے (معارف القرآن)

والمکر۔ التدبیر فی الامر فی خفیۃ (زیلعی)

والمکر۔ الاحتیال فی ایصال الضرر للغیر[1]

اَسَاطِیْرُ : اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ۔

اساطیر : پہلے لوگوں کی پراگندہ اور منتشر

---

[1] جمل

باتیں جن کا آپس میں کوئی جوڑ اور ربط نہ ہو اور نہ
ہی ان کے صدق و کذب کی صحیح دلیل ہو۔
الاساطیر : الاحادیث لا نظام لها (روح)
لفظ اساطیر عموماً ماضی کے غلط قصے کہانیوں کے لئے
بولا جاتا ہے اس لئے اہل تفسیر اساطیر کا ترجمہ اور
وضاحت اکاذیب سے کرتے ہیں
سَطَرَ يَسْطُرُ سَطْرًا : لکھنا۔ کاٹنا۔ بے سند
باتیں کرنا۔ السطر : اصل میں قطار کو کہتے ہیں عام
ہے قطار کتاب کی سطروں کی ہو، درختوں کی ہو یا
آدمیوں کی۔
واصل السطر : الصف من الشيء كالكتاب
والشجرة وغيره (روح ، راغب)
سَطَرَ فلانٌ كذا : کے معنی ہیں ایک ایک سطر
کر کے لکھنا۔ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۔
قلم اور اہل قلم کے لکھنے کی قسم۔
سطر کی جمع اسطر و سطور و اسطار آتی ہے
اساطیر کی واحد مبرد کے قول کے مطابق اُسطورۃ
ہے، جیسے اراجیح کی واحد اُرجوحۃ۔ اور احادیث
کی واحد اُحدوثۃ ہے۔
صاحب روح المعانی مفتی بغداد نے لکھا ہے
سطر کی جمع اَسْطُر و سُطُور اور اسطار ہے
اور ان کی جمع الجمع اساطیر ہے۔ آیت کریمہ لَسْتَ
عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ (غاشیہ) اور اَمْ هُمُ
الْمُسَيْطِرُونَ (الطور) میں لفظ مُسَیطِر
تَسَيْطَرَ عَلَىٰ كَذا وَسَيْطَرَ عَلَيْهِ سے مشتق ہیں
جس کے معنی ہیں کسی چیز کی حفاظت کے لئے اس
پر سطروں کی طرح سیدھا کھڑا رہنا۔ اس لئے
لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ کے معنی یہ ہوئے
کہ آپ ان پر (نگہداشت کے لئے) مقرر نہیں
یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ آیت : وَمَا اَنْتَ
عَلَيْهِمْ بِحَفِيظٍ ۔
کہتے ہیں : لستَ علیَّ بِمُسَيْطِرٍ : تو مجھ پر
مسلّط نہیں یعنی مجھ پر غالب یا میرا حاکم نہیں
ہے۔ سَطَّرَ فلان على فلان : جھوٹی ملمع دار
باتیں بنانا۔

مُكَاءً : وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ
إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً ۔
مَكَا يَمْكُو مَكْوًا وَمُكَاءً : پرندہ کا منہ سے
سیٹی کی سی آواز نکالنا۔ صاحب کشاف نے
لکھا ہے کہ المکاء : فُعَال بوزن الثغاء
والرغاء۔ من مكا يمكو اذا صفر (کشاف)
الثُّغَاءُ : بکری کی آواز اور الرُّغَاءُ : اونٹ کی
آواز کو کہتے ہیں۔ اور اسماء اصوات اکثر فُعَال
کے وزن پر آتے ہیں۔ شاذو نادر ہی کوئی اسم صوت

اس کے خلاف آتا ہے جیسا کہ النِّدَاءُ۔ یہ فعالٌ کے وزن پر آتا ہے وھو فعالٌ بضم اوّلہ کسائر اسماء الاصوات فانھا تجیٔ علی فعال اِلّا ما شذّ کالنِّداء (روح)

المکَّاءُ : (بتشدید الکاف) ایک پرندہ ہے جو سیٹی کی طرح آوازیں نکالتا ہے حجاز میں کثرت سے پایا جاتا ہے، ایک عرب شاعر کہتا ہے

اذا غرد المکّاءُ فی غیر روضۃٍ
فویلٌ لِاَھلِ الشاءِ وَالحُمُرَاتِ

مَکَتْ اِستُہٗ : گوز مارنا مَکَتِ استُ الدَّابۃِ اذا انفخت بالریح۔

تَصْدِیَۃٌ : بلا مفہوم کی آواز : امام راغب فرماتے ہیں کہ " تصدیٰ اس آواز کو کہتے ہیں جو کسی شفاف مکان سے ٹکرا کر واپس لوٹے پھر اسی پر اس صوت کو تصدیۃً کہنے لگے جو بے مفہوم ہونے میں صدیٰ کے مشابہ ہو۔

آیت کریمہ : وَمَا کَانَ صَلَاتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً : مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں کی نمازیں خانہ کعبہ کے قریب سیٹی اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہیں، اور ان کی نمازیں بے معنی ہونے میں پرندوں کی چہچہاہٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

والمکاءُ والتَّصْدِیَۃُ : اَلتَّصفِیر والتصفیق : مُکاءٌ سیٹی بجانا اور تصدیۃ تالی بجانا۔ صدّیٰ یُصَدِّی تَصْدِیَۃ اِذَا صَفَقَ : تالی بجانا تھپکی لگانا ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارنا، سعد بن جبیر اور ابن زید نے تصدیۃ کو صَدٌّ سے مانا ہے۔ صَدّہ عن کذا کے معنیٰ ہیں ہٹانا روکنا منع کرنا

اس صورت میں تصدیۃ کی اصل تَصْدِدَۃٌ ہوگی ایک دال کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔

التَّصدِّی : صدائے بازگشت کی طرح کسی کے درپے ہونا تصدّی لَہٗ درپے ہونا تَصَدَّی لِلْاَمْر : کسی معاملہ کے لئے متوجہ ہونا قرآن میں ہے اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی : جو پرواہ نہیں کرتا آپ اس کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔

الصَّدٰی : ایک بڑے سر کا جانور ہے جس کو ہمارے اطراف میں اس کو اُلّو کہتے ہیں عربی میں اس کو ہامہ بھی کہتے ہیں جاہلی عربوں کا خیال تھا کہ اگر مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کے سر سے ایک اُلّو پیدا ہوتا ہے اور وہ پکارتا رہتا ہے کہ مجھے پلاؤ مجھے پلاؤ تا آنکہ اس کا بدلہ لیا جائے اور اس کے قاتل کو قتل

کیا جائے غالباً اس غلط نظریہ کی بنا پر قدیم عربوں میں برسوں تک جنگ و جدال رہتا تھا۔ مشہور محاورہ ہے۔

اَصَمَّ اللّٰہُ صَدَاہُ : خدا اسکی آواز کو بند کرے۔ اس کو ہلاک کرے۔ صدًی: پیاس صَدْیَانُ : پیاسا آدمی۔ صَدْیاءُ وَصَادِیَۃٌ پیاسی عورت صَمَّ صَدَاہُ اس کی گونج خاموش ہوگئی۔ جیسے محاورہ ہے: فلاں کی بولتی بند ہوگئی۔ وقال صاحب الکشاف۔ التصدیۃ: التصفیق۔ تفعلۃ من الصدی او من صدّ یصُدّ (کشاف)

وقال الرازی وفی اصلھا قولان: الاول۔ انھا من الصّدٰی وھو الصوت الذی یرجع من جبل۔ والثانی۔ قال ابوعبیدہ۔ اصلھا تصْدِدَۃٌ فابدلت الیاء من الدال (کبیر)

المکاء الصفیر والتصدیۃ التصفیق (ابن کثیر)

یَرْکُمَہٗ : فَیَرْکُمَہٗ جَمِیْعًا فَیَجْعَلَہٗ فِیْ جَھَنَّمَ : رَکَمَ یَرْکُمُ۔ رَکْمًا۔ ڈھیر لگانا کسی چیز کو اوپر نیچے رکھنا۔ تَرَاکُمٌ وَ اِرْتِکَامٌ : تہ بتہ رکھنا۔ تَرَاکَمَ لَحْمُ فلان فلاں فربہ ہوگیا ہے اس پر گوشت کی تہیں چڑھی ہوئی ہیں سَحَابٌ مَرْکُوْمٌ تہ بتہ بادل

الرُّکَامُ : اوپر نیچے رکھی ہوئی چیزیں۔ ثُمَّ یَجْعَلُہٗ رُکَامًا۔ پھر اسے تو بر تو کر دیتا ہے اسی سے ریت کے ٹیلے کو رُکام کہا جاتا ہے مُرْتَکَمُ الطریق شارع عام کو کہتے ہیں جس میں آمد و رفت کے نشانات بکثرت ہوں (راغب)

یُقَالُ رَکَمَہٗ اِذَا جَمَعَہٗ وَضَمَّ بَعْضَہٗ اِلٰی بعض والرکام: الرمل المتراکم وبابہ نصر (رجل) نَاقَۃٌ مُرْتَکِمَۃٌ : فربہ اور موٹی اونٹنی۔ فَیَرْکُمَہٗ جَمِیْعًا : ای یجعلہ رُکَامًا بعضہ فوقَ بعضٍ۔ (غریب القرآن)

نِعْمَ : نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ: نعم کلمہ مدح ہے جو بئس فعل ذم کے مقابل استعمال ہوتا ہے۔ نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّہٗ اَوَّابٌ۔ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰھَا فَنِعْمَ الْمٰھِدُوْنَ۔

اَلْعُدْوَۃُ : اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ بِالْعُدْوَۃِ الْقُصْوٰی وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ۔

عُدْوَۃٌ : کے معنی ایک جانب اور کنارہ کے آتے ہیں۔ وَالْعُدْوَۃُ : جانب۔ الوادی (قرطبی) اور یہ عَدْوٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں حد سے بڑھنا۔ تجاوز کرنا۔ واصلہ من العدو والتجاوز (روح)

لفظ عُدْوَةٌ کو تینوں حرکات کے ساتھ پڑھا گیا ہے
یعنی عُدْوَةٌ۔ وعَدْوَةٌ۔ وعِدْوَةٌ۔ عُدْوَةٌ
بالضم کی جمع عُدًی اور عِدوۃ بکسر العین
کی جمع عِدًی ہے جیسے لِحیۃٌ کی جمع لِحًی اور
فِریَۃٌ کی جمع فِرًی۔ و الجمع عُدًی و
عِدًی۔ (کبیر و قرطبی)

اَلدُّنْیَا : دُنْیَا اَدْنیٰ سے بنا ہے جس کے
معنی ہیں قریب تر اور لفظ دُنْیَا ادنیٰ کی تانیث
ہے اس کی اصل دَنَا یَدْنُوْ ہے۔ اس جہاں کو
بھی دنیا اسلیے کہا جاتا ہے کہ وہ عالم آخرت سے
قریب تر ہے۔ (معارف)

اَلْقُصْوٰی : اقصیٰ سے بنا ہے اقصیٰ کے
معنیٰ ہیں بعید تر اور قُصْوٰی اقصیٰ کی تانیث
ہے، قَصَا یَقْصُوْ قَصْوًا وَ قُصُوًّ و قصاءً و
قصاءً : دور ہونا۔ قصیٌّ بعید کو کہا جاتا ہے۔
مَکَانًا قَصِیًّا (مریم) محاورہ ہے قاصانی
فقصوتُہٗ اس نے مجھ سے دوری اختیار کی
میں اس سے زیادہ دور ہو گیا۔
قصوتُ عنہ : میں اس سے دور ہوا۔ المکان
الاقصیٰ: دور دراز جگہ۔ الناحیۃ القصویٰ:
کسی چیز کا آخری کنارہ۔
عُدْوَۃٌ دنیا سے مراد یہاں وہ جانب ہے جہاں
صحابہ کرام کو لے کر آپ نے بدر میں پڑاؤ ڈالا یہ مقام
چونکہ مدینہ منورہ کے قریب تھا اس لئے اسکو
عدوۃ دنیا کہا گیا ہے یعنی مدینہ کی طرف والی
جانب۔ اور عدوۃ قُصْوٰی سے مراد وہ مقام
ہے جہاں کفار کا لشکر جمع تھا یہ جانب چونکہ مدینہ
سے دور تھی اس لئے اس کو عدوۃ قصوٰی فرمایا
قصوات البعیر کے معنی اونٹ کا کان قطع کرنے
کے آتے ہیں ناقۃ قُصْوَاءُ کان کٹی اونٹنی۔

اَلرَّکْبُ ۔ وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ : رَکِبَ
یَرْکَبُ رُکُوْبًا وَ مَرْکَبًا : حیوان کی پیٹھ پر سوار ہونا
رَکِبَ الدَّابَّۃَ : وَعَلَی الدَّابَّۃِ : دونوں
طرح آتا ہے لِتَرْکَبُوْھَا وَزِیْنَۃً ۔ تاکہ تم
ان پر سوار بھی ہو اور اس کے علاوہ موجب
زینت بھی ہیں۔ رَکِبَ الْبَحْرَ سمندر کا سفر
کرنا۔ فَاِذَا رَکِبُوْا فِی الْفُلْكِ ۔
لغوی اعتبار سے تو لفظ رکب کا لفظ شتر
سوار کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔
و لا تقول العربُ رکب الا للجماعۃ
الراکبی الابل۔ وحکی ابن السکیتُ وَ
اکثر اھل اللغۃ : انہ لا یقال راکب و
رکب الا للذی علی الابل۔ و لا یقالُ
لمن کان علی الفرس او غیرھا راکب
(قرطبی) والرکب اختص فی التعارف
بِمُمْتَطِی البعیر (راغب) راکبٌ کی جمع

رکب۔ رُکْبَانٌ اور رُکُوبٌ آتی ہے۔

اَسْفَلَ: اَسْفَلَ یہ اَعْلٰی کی ضد ہے جیسے سُفْلٌ۔ عُلُوٌّ کی ضد ہے سَفُلَ سَفُوْلًا فَھُوَ سَافِلٌ کے معنی پست اور حقیر ہونے کے آتے ہیں ثُمَّ رَدَدْنَاہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ پھر ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پست حالت کی طرف لوٹا دیا اَسْفَلَ کی تانیث سُفْلٰی آتی ہے اور اعلٰی کی عُلْیَا۔ وَجَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی وَکَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا۔ وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ: قافلہ ابوسفیان تم سے نیچے جا رہا تھا۔

فَشِلْتُمْ: وَلَوْ اَرَاکَھُمْ کَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ فَشِلَ یَفْشَلُ (س) فَشَلًا۔ کمزوری ہمت ہار جانا۔ تَفَشَّلَ الْمَاءُ: پانی بہہ پڑا۔

بَطَرًا: وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ بَطِرَ (س) بَطَرًا: زیادہ نعمت میں پڑ کر اترا جانا بہک جانا۔ بَطِرَ الْحَقَّ: تکبر کے سبب قبول حق سے انکار کر دینا صفت بَطِرٌ آتی ہے اَبْطَرَہٗ کے معنی دہشت میں ڈالنا ہے۔

بَطِرَتْ مَعِیْشَتَھَا: جو اپنی فراخی معیشت پر اترا رہے تھے بَطَرَ یَبْطُرُ: پھاڑ دینا شق کرنا کہ طرح کا دولت پر فخر و غرور بطر ہے۔

بَیْطَارٌ: ڈنگر ڈاکٹر۔

اَلْبَطَرُ: دَھَشٌ یَعْتَرِی الْاِنْسَانَ مِنْ سُوْءِ اِحْتِمَالِ النِّعْمَۃِ وَقِلَّۃِ الْقِیَامِ بِحَقِّھَا وَصَرْفِھَا اِلٰی غَیْرِ وَجْھِھَا۔ (راغب)

وہ دہشت جو خوشحالی کے غلط استعمال۔ حق نعمت میں کوتاہی اور نعمت کے غلط طور پر صرف کرنے سے انسان کو لاحق ہوتی۔ قال الزجاج اَلْبَطَرُ: الطغیان فی النعمۃ۔ (کبیر)

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ: اگر خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کی مرضی کے مطابق خرچ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں تو اس کو شکر کہتے ہیں اور اگر ان نعمتوں کو اپنے ہمسروں پر ذریعہ فخر و غرور بنائے تو یہ بطر ہے۔

مُغَیِّرًا: ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ غَیَّرَ تَغْیِیْرًا۔ غَیَّرَ الشَّیْءَ: دیت دینا۔ خون بہا دینا۔ تَغْیِیْر کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک یہ کہ صرف کسی شے کی شکل وصورت کو بدلا جائے جیسے غَیَّرْتُ دَارِیْ یعنی میں نے اپنے گھر کی شکل و صورت کو بدل دیا۔ دوم یہ کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے تبدیل کر لینا جیسے غَیَّرْتُ غُلَامِیْ وَدَابَّتِیْ میں نے اپنے غلام یا جانور کو دوسرے سے تبدیل کر لیا مقصد

یہ کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی حالت اس سے مختلف نہ کرے جو نزول نعمت کے وقت تھی اور اپنے اندر بجائے ایمان وطاعت کے کفر و خباثت پیدا کرے خدا کسی قوم کو سزا نہیں دیتا اور اس کے بہتر حالات کو برے حالات میں نہیں بدلتا۔

الدَّوَابّ : اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ؛

لفظ دوابّ دابّة کی جمع ہے اصل لغت کے اعتبار سے ہر زمین پر چلنے والے کو دابہ کہا جاتا ہے مگر عرف و محاورہ میں صرف چوپایہ جانوروں کو دابہ کہتے ہیں دَبَّ يَدِبُّ (ض) دَبًّا و دَبِيْبًا آہستہ آہستہ چلنا۔

شَرِّدْ : فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ. لفظ شَرِّدْ امر کا صیغہ ہے جو مصدر تَشْرِيْد سے بنا ہے جس کے معنی کسی کو اضطرابی کی حالت میں بھگا دینے اور منتشر کر دینے کے ہیں والتشريد عبارة عن التفريق مع الاضطراب۔ (کبیر) والتشريد في اللغة: التبديد والتفريق (قرطبی)

شَرَدَ الْبَعِيْرُ کے معنی ہیں اونٹ کا بدک کر مالک سے بھاگ جانا۔

فُلَانٌ طَرِيْدٌ شَرِيْدٌ : فلاں راندہ درگاہ ہے

شَرَّدْتُ بَنِيْ فُلَانٍ کے معنی ہیں میں نے ان کی اجتماعیت کو ختم کر دیا اور ان کو مختلف بلاد میں متفرق کر دیا۔ صیغہ صفت شَارِدٌ جمع شَرَدٌ جیسے خادمٌ کی جمع خَدَمٌ ہے۔

شوارد اللغة : زبان کے غریب اور نادر الفاظ

شَرُوْدٌ۔ وہ پانی جس کو ہوا مکان کے اندر پھینک دے۔ شَرَدَ يَشْرُدُ شَرْدًا، بدکنا۔ شَرَّدَهٗ تَشْرِيْدًا ڈرا کر بھگانا۔ شَرِّدْ شَمْلَهُمْ اي فَرِّقْ جَمْعَهُمْ : ان کے اتحاد کو توڑ دے۔

فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ : کا مطلب یہ ہے کہ انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پشت پناہ ہیں ان کو بھی عبرت حاصل ہو اور آئندہ عہد شکنی کی جرأت نہ کریں۔

رِبَاط : وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ.

لفظ رباط مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور مربوط کے معنی میں بھی پہلی صورت میں اس کے معنی ہونگے گھوڑے باندھنا اور دوسری صورت میں بندھے ہوئے گھوڑے حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ دشمن کے مقابلے میں قوت دفاع کو بڑھانا۔

رَبْطُ الفرس کے معنی گھوڑے کو کسی جگہ پر حفاظت کے لئے باندھنے کے ہیں اسی سے رباطُ الجیش ہے فوج کا کسی جگہ پر متعین کرنا اور وہ مقام جہاں حفاظتی دستے رہتے ہوں اسے رباط کہا جاتا ہے۔

اَسْرٰی : مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ

لفظ اَسْرٰی۔ اَسْرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں قید میں جکڑ لینا یہ اَسَرْتُ الْقَتَبَ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں میں نے پالان کو مضبوط باندھ دیا اور قیدی کو اسیر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ رسی سے باندھا ہوا ہوتا ہے۔ يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا : پھر اس شخص کو جو گرفتار اور قید ہو کر آئے اسیر کہا جاتا ہے چاہے باندھا ہوا ہو یا نہ۔

امام فخر الدین رازی نے زجاج نحوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ لفظ اَسْرٰی جمع ہے اور اُسَارٰی اس کی جمع الجمع ہے۔

زجاج کہتے ہیں کہ ولا اعلم احدا قرأ اُسَارٰی : لیکن صاحب کشاف نے ذکر کیا ہے کہ بعض اہل علم نے اُسَارٰی بھی پڑھا ہے اور خود قرآن پاک میں بھی دوسری جگہ لفظ اُسَارٰی آیا ہے وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ (البقرہ) اَسْرٰی جمع اَسِيْرٍ مثل قتيلٍ وقتلى وجريحٍ وجرحى (قرطبی)

يُثْخِنَ : حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ : اثخان کے معنی لغت میں کسی کی قوت وشوکت کو توڑنے میں مبالغہ سے کام لینے کے ہیں۔ اسی معنی کی تاکید کیلئے لفظ فی الارض لایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دشمن کی شوکت کو خاک میں ملا دیا جائے (مفار) قالوا ان المراد منه ان يبالغ في قتل اعدائه (کبیر) ثَخُنَ (ک) ثَخَانَةً وَ ثُخُوْنَةً : موٹا ہونا سخت ہونا۔ صفت ثَخِيْنٌ : ثَخُنَ الشَّيْءُ. کسی چیز کا اتنا گاڑھا ہو جانا کہ بہنے سے رک جائے اور بطور استعارہ کہا جاتا ہے اَثْخَنْتُهٗ ضَرْبًا وَاسْتِخْفَافًا : میں نے اسے اتنا مارا کہ وہ اپنے مقام سے حرکت نہ کر سکا۔ اَثْخَنَتْهُ الْجِرَاحَاتُ الانسان کو زخموں کا چور چور کر دینا نڈھال کر دینا۔ اَثْخَنَهُ الْمَرَضُ بیماری کا انسان کو کمزور کر دینا۔ وكان قد اثخن : ابوجہل زخموں کی وجہ سے بدر میں چور چور ہو چکا تھا اَوْطَأَكُمْ اِثْخَانُ الْجِرَاحَةِ : تم کو زخموں کی کثرت نے روند ڈالا

وَمَعْنَى الْاِثْخَانِ : كثرة القتل والمبالغة فيه۔ (کشاف)

الاثخان : كثرة القتل (قرطبی) وقيل الاثخانُ القوةُ والشدةُ (قرطبی)

واصل معنی الثخانۃ الغلظ والکثافۃ فی الاجسام۔ استعیر للمبالغۃ فی القتل و الجراحۃ لانہا لمنعہا من الحرکۃ صیّرتہ کالثخین الذی لایسیل (روح)

لَوْلَا: لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔

لَوْ حرف شرط اور لَا نافیہ سے مرکب ہے لفظاً کوئی تغیر نہیں پیدا کرتا۔ دو جملوں پر داخل ہوتا ہے۔ اسمیہ اور فعلیہ پہلے جملہ کا ایک جز ضرور محذوف ہوتا ہے۔ خواہ خبر ہو یا فعل۔ رمانی۔ ابن الشجری شلوبین اور ابن مالک کا قول ہے کہ لَوْلَا کے پہلے جملہ کی خبر اگر عام ہو جیسے کائن ثابت وغیرہ تو واجب الحذف ہے اگر عمومی خبر نہ ہو بلکہ کسی مادہ کیساتھ مقید ہو مثلاً آکل۔ شارب قائم قاعد ذاھب ماشی وغیرہ اور بغیر ذکر کے معلوم نہ ہوسکے تو ذکر واجب ہے۔ جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ لَوْلَا قَوْمُكِ حَدِيثٌ عَهْدُهُمْ بِالْإِسْلَامِ لَهَدَمْتُ الْكَعْبَةَ۔ اگر تمہاری قوم نئی نئی اسلام میں داخل شدہ نہ ہوتی تو میں کعبہ کو ڈھا دیتا (اور دوبارہ ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کرتا) اور ذکر کے بغیر اگر خبر معلوم ہوسکتی ہو تو ذکر و حذف دونوں جائز ہیں۔ ابن الشجری نے اسکی مثال دی ہے۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ۔ اگر عَلَیْکُمْ۔ فضل اللہ کے متعلق ہو تو خبر محذوف ہوگی ورنہ نازل کے متعلق ہو کر فضل اللہ کی خبر ہو جائیگی۔ اگر لَوْلَا ضمیر پر داخل ہو تو ضمیر مرفوع ہونی ضروری ہے۔ لَوْلَآ اَنْتُمْ لَکُنَّا مُؤْمِنِیْنَ مبرد کے نزدیک ضمیر کا مرفوع ہونا ضروری نہیں۔

۲ تحضیض اور عرض کیلئے بھی لَوْلَا آتا ہے۔ یعنی فعل پر سختی کیساتھ ابھارنا یا نرمی سے کسی کام کی طلب کرنا اول تحضیض ہے دوسرا عرض۔ اسوقت لَوْلَا کے بعد مضارع آجاتا ہے۔ خواہ لفظاً یا معناً۔ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہَ کیوں نہیں اللہ سے معافی مانگتے۔ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ۔

۳ ڈانٹ اور توبیخ کرنے کیلئے بھی لَوْلَا مستعمل ہے اسوقت ماضی پر داخل ہوگا۔ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْہِ بِاَرْبَعَۃِ شُہَدَآءَ۔ کیوں نہ لائے اس پر چار گواہ۔ فَلَوْلَا نَصَرَہُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قُرْبَانًا اٰلِہَۃً۔ اللہ کو چھوڑ کر جنکو انہوں نے حصول قرب کیلئے معبود بنا رکھا تھا انہوں نے انکی مدد کیوں نہ کی۔ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ قُلْتُمْ جب تم نے یہ بات سنی تھی تو کیوں نہیں کہدیا۔ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَہُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا جب انہوں نے ہمارا عذاب

دیکھ لیا تھا۔ تو کیوں زاری نہ کی۔ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَا۔ جب جان حلق تک پہنچ جاتی ہے تم اس وقت دیکھتے ہوتے ہو اور ہم بہ نسبت تمہارے میت سے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے پس اگر تم کو اعمال کا بدلہ ملنا نہیں ہے تو اس (جاتی ہوئی جان) کو لوٹا کیوں نہیں لیتے۔

۴ ہروی کا قول ہے کہ لَوْلَا استفہام کے لئے بھی آتا ہے۔ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ اور لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ۔ جمہور اھل ادب کے نزدیک اوّل آیت میں عرض کے لئے ہے اور دوسری آیت میں توبیخ کیلئے۔

۵ ہروی نے یہ بھی کہا کہ لَوْلَا کبھی نافیہ ہوتا ہے جیسے فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ یونس کی قوم کے علاوہ کوئی دوسری آبادی ایسی نہیں ہوئی کہ (عذاب دیکھنے کے بعد) ایمان لے آئی ہو۔ اور ایمان سے اسکو فائدہ پہنچا ہو۔

اخفش، کسائی، فراء، علی بن عیسیٰ، نحاس اور کثیر مفسرین نے اس جگہ لولا کو توبیخ کیلئے قرار دیا ہے۔ اور توبیخ کیلئے نفی کا مفہوم ذیلی اور ضمنی طور پر آگیا نفی کے علاوہ لَوْلَا کی کوئی مستقل قسم قرار دینا غلط ہے۔ زمخشری نے کشاف میں اس آیت کی تشریح کے ذیل میں لکھا ہے والجملة فی معنی النفی جملہ نفی کے معنی میں ہے لَوْلَا للنفی نہیں کہا اس سے بھی معلوم ہوا کہ لولا نفی کے لئے نہیں آتا بلکہ نفی کے معنی کو متضمن ہو جاتا ہے۔

اُولُوْ : وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ او

۱ اور رشتہ دار آپس میں حق دار زیادہ ہیں ایک دوسرے کے اللہ کے حکم میں تحقیق اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔

لفظ اُولُو۔ عربی زبان میں صاحب کے معنی میں آتا ہے جس کا ترجمہ اردو میں والے سے کیا جاتا ہے۔ اولو العلم علم والے اولوا العقل عقل والے اور اولوا الامر حکم والے۔ اس لئے اولوا الارحام کے معنی ہوئے ارحام والے اور ارحام رحم کی جمع ہے اس کی تحقیق گزر چکی ہے رحم اصل میں اس عضو کو کہا جاتا ہے جس کے اندر بچہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اور چونکہ رشتہ داری کا تعلق رحم کی شرکت سے قائم ہوتا ہے اس لئے اولوا الارحام۔ رشتہ داروں کے معنی ہیں

استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ایک رحم سے تعلق رکھنے والے

اَلَّفَ : وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ : اور ان کے دلوں میں الفت پیدا کردی۔ تالیف سے جس کے معنی الفت پیدا کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ ہے مضارع کا صیغہ يُؤَلِّفُ استعمال ہوتا ہے ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ : پھر وہ بادل کے مختلف اجزا کو جمع کر دیتا ہے ایک دوسرے میں مدغم کر دیتا اَلَّفْتَ بَيْنَهُمْ میں نے ان میں ہم آہنگی پیدا کردی

مُؤَلَّفٌ : وہ مجموعہ جس کے مختلف اجزا کو یکجا کر دیا گیا ہو۔ مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبُ : وہ لوگ جن کے دلوں میں اسلام کی عظمت تو بیٹھ چکی تھی مگر مالی مجبوریوں کی وجہ سے اسلام کے حلقہ بگوش نہ ہو سکے تھے اسلام نے ان کی مدد کرنے کا حکم دیا کہ ان کا مالی تعاون کرکے دائرہ اسلام میں آنے کی راہ ان کیلئے آسان کریں۔ (دیکھئے لفظ اِیلاف وَاَلَّفَ)۔

شرحُ الفاظ القرآن مِن سُورۃ التوبۃ وھی مدنیۃ

بَرَاءَۃٌ : بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖۤ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

بَرَاءَۃ کے معنی ہیں ترک موالات ورفع امان جیساکہ صاحب احکام القرآن نے لکھا ہے :

البراءۃ : ھی قطع الموالات وارتفاع العصمۃ وزوال الامان (جصاص)

وقال الرازی معنی البراءۃ : انقطاع العصمۃ (کبیر)

واصل البراءۃ فی اللغۃ : انقطاع العصمۃ (خازن)

لفظ بَرَاءَۃٌ پر تنوین تفخیم کے لئے ہے ۔

التنوین للتفخیم (روح)

بَرَأَ یَبْرَأُ بَرْأً وبُرُوْءً کسی چیز کو عدم سے پیدا کرنا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کی صفت ہے البارئ بمعنی خالق یعنی پیدا کرنے وا

مٹی کو البرأ کہتے ہیں اور اس سے پیداشدہ مخلوق کو بَرِیَّۃٌ کہتے ہیں بمعنی مخلوق۔ خَیْرُ الْبَرِیَّۃ۔ بہترین مخلوق۔ شَرُّ الْبَرِیَّۃ بدترین مخلوق۔ بریّۃ کی جمع برایا آتی ہے بَرِئَ (س) بُرُوْءً وبَرَاءً وبَرَاءَۃً : نجات پانا، خلاصی حاصل

کرنا۔ کسی ناپسندیدہ امر سے اپنے آپ کو علیحدہ کرلینا بَرِئَ من العیب اوالدّین کسی عیب یا قرض سے خلاصی پانا۔ اسی سے صیغہ صفت بَرِیْءٌ آتا ہے ۔ قرآن میں ہے : وَاَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ جمع بَرِیْئُوْنَ وبُرَاءُ۔ اَنْتُمْ بَرِیْئُوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ اِنَّا بُرَآءُ مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ

امام راغب لکھتے ہیں : البُرْءُ والبَرَاءُ والتّبرّی : التفصّی مِمّا یکرہ مجاورتہٗ یعنی کسی امر سے نجات حاصل کرنا۔ بَرَأْتُ مِنَ الْمَرَضِ بیماری سے شفایاب ہونا۔ بَرِأْتُ من فلان۔ میں اس سے بیزار ہوں۔

بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین کی مسلسل عہد شکنیوں کی وجہ سے اب ان کے ساتھ کیے گئے وعدوں کو توڑا جاتا ہے۔ چونکہ اب خدا اور اس کا رسول ان سے بیزار ہو چکے ہیں ۔ وقیل معناہ ھنا التّباعد ممّا تکرہ

مجاورته (جمل) وقال الشوکانی برأتُ من الشیٔ اَبْرأُ بَرَاءَةً وانا بریٔ: اذا ازلتہٗ عن نفسك وقطعت سبب مابینك وبینہ (فتح القدیر)

چونکہ اس سورت کے ابتدا میں بسم اللہ نہیں ہے اس لئے اتباعاً للقرآن یہاں ترک کی گئی ہے۔

سِیْحُوْا: فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِی الْكٰفِرِیْنَ ۝

سَاحَ یَسِیْحُ سَیْحًا وسِیَاحَةً: زمین پر چلنا پھرنا سَاحَ فُلَانٌ فِی الْاَرْضِ زمین پر چکر کاٹنا دور دراز کے ملکوں کی سیر وسفر کرنا۔ آثار قدرت کو دیکھنے کے لئے گھومنا پھرنا۔ سَاحَ الماء۔ پانی کا سطح زمین پر بہہ نکلنا سَائِحٌ وسَیْحٌ صفت آتی ہے۔ مَاءٌ سَائِحٌ۔ جاری بہنا۔

واصل السّیاحة۔ السّیر: فتح۔

واصل السیاحة: الضربُ فی الارض والاتساع والبعد عن المدن وموضع العمارة (کبیر۔ خازن)

سِیْحُوْا ای سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (قرطبی)

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ سیاحت کے اصل معنی پانی کا جاری ہونا اور بہہ نکلنا ہے۔ پھر اس سے زمین پر سیر اور چلنے کو سیاحت اور چلنے والے کو سیّاح کہتے ہیں

واصل السیاحة جریان الماء وانبساطه ثم استُعملت فی السیر علی مقتضی المشیة (روح)

السّاحة کھلے مکان کو کہا جاتا ہے اور ساحة الدّار کے معنی ہیں گھر کا صحن جیسا کہ حکم ہے فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ۔ اور سَاحَةٌ: اس میدان کو کہتے ہیں جو گھروں کے باہر ہوتا ہے

اَذَانٌ: وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ

اَذَنْتُهٗ بِكَذَا واَذَّنْتُهٗ اطلاع کرنا۔ اعلان کرنا۔

اَذان: اسم ہے جو ایذان مصدر کے قائم مقام ہے فالاذان یقوم مقام الایذان وهو المصدر الحقیقی (کبیر) اور لفظ اذان لغوی اعتبار سے بالاتفاق اعلان اور اطلاع کے معنی میں آتا ہے۔

الاذان: اعلامٌ لغة من غیر خلاف (قرطبی)

الاذان فی اللغة: الاعلام ومنه الاذان للصلوٰة (خازن) والاذان بمعنی الایذان وهو الاعلام کما ان الامان والعطاء بمعنی الایمان والاعطاء (فتح۔ کشاف)

اذان اصل میں اُذُنٌ سے ماخوذ ہے۔

اُذُنٌ کان کو کہا جاتا ہے۔ اَذَنَہٗ اَذْنًا،
کان پر مارنا۔ گوشمالی کرنا۔ اُذِنَ فُلَانٌ
کے معنی ہیں فلاں شخص کان کی بیماری میں مبتلا ہو گیا
تو اذان کا مطلب ہوا وہ ندا، اور اعلان جو
لوگوں کے کانوں تک پہنچایا جائے۔ صاحب
روح المعانی نے علامہ طبرسی کے حوالہ سے ذکر
کیا ہے کہ ان اصلہ من النداء الذی
یُسمع بالاُذن بمعنی اذنتہ اَوصلتہ الی
اُذنہ (روح)

شرعی اصطلاح میں اذان اس ندا اور
پکارنے کو کہا جاتا ہے جو نماز کے لئے مؤذن
مخصوص الفاظ میں پکارتا ہے۔ اور
مِئْذَنَۃٌ: وہ مینار جہاں اذان دی جاتی ہے
اَذِنَ اِلَیْہِ کے معنی ہیں کسی کی بات کو کان لگا کر
غور سے سُننا۔ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّھَا وَحُقَّتْ
اور وہ (زمین) اپنے رب کا فرمان غور سے
کان لگا کر سنے اور اُسے واجب بھی ہے۔

مَرْصَد: وَاقْعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ
اور ہر گھات کی جگہ پر ان کی تاک میں بیٹھو۔
رَصْدٌ: تاکنا۔ انتظار کرنا، گھات میں بیٹھنا
رَاصِدٌ: چوکیدار، نگہبان۔ رَقِیْبٌ
شیر۔ چونکہ یہ بھی شکار کی تاک میں رہتا ہے

اِرْصَادٌ: تیار کرنا۔ بدلہ دینا۔ اَرْصَدَ لَہٗ
شَیْئًا: تیار کرنا۔ مہیا کرنا۔ اَرْصَدَ لَہٗ خَیْرًا
اَوْ شَرًّا: کسی کو اچھا یا بُرا بدلہ دینا۔ اور
اَرْصَدَ لَہُ الحساب: حساب پیش کرنا۔
تَرَصُّد: انتظار کرنا۔ رَصَدٌ: عرف میں
اُس عمارت کو کہتے ہیں جو اجرام فلکی کے مطالعہ
کے لئے بنائی گئی ہو، جس کو رصدگاہ بھی کہا
جاتا ہے۔ تَرَصَّدَ: کسی کو گھات میں لگانا
اور اَرْصَدْتہٗ کے معنی ہیں کسی کو گھات
لگانے کے لئے مقرر کرنا۔ اَرْصَدَ لَہٗ: کے
معنی پناہ دینا بھی آتے ہیں۔ وَاِرْصَادًا
لِمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ
اور ان لوگوں کو پناہ دیں جو اللہ اور اس کے
رسول کے ساتھ پہلے لڑ چکے ہیں۔

یہاں لفظ اِرصاد پناہ دینے کے معنی میں
استعمال ہوا ہے۔ اس آیت کے ضمن میں
مفتی اعظم (مد اللہ ظلہ) نے لکھا ہے کہ اس مسجد
سے یہ کام بھی لینا تھا کہ یہاں اللہ اور رسولؐ
کے دشمنوں کو پناہ ملے۔ (معارف ص ۴۶۲ ج ۴)
بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ رصد جب اپنے
مفعول کی طرف بلا واسطہ حرف کے متعدی ہو تو
اس کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی کے لئے خیر کی خاطر

گھات میں یا انتظار میں رہنا۔ جیسے رَصَدتُہٗ وارصدتہٗ۔ اور جب بذریعہ حرف لام کے متعدّی ہو تو معنی یہ ہوتے ہیں کہ نقصان کی خاطر کسی کی تاک میں رہنا۔ اور آیت اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ اسی قبیل سے ہے۔

قال ابو زید یقال رَصَدتُہٗ واَرْصَدتُہٗ فی الخیر وارصدتُ لہ فی الشر (قرطبی)

ارصدتُ لہ العقوبۃ میں نے اس کیلئے عذاب تیار کیا ہوا ہے۔ رَصَدٌ : بمعنی فاعل اور مفعول دونوں کے لئے آتا ہے اور واحد و جمع دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کی آیت ہے : یَسْلُکُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا۔ یہاں رَصَدًا سے مراد پہرا دینے والے نگہبان فرشتے ہیں۔ اور واحد و جمع دونوں کا احتمال ہو سکتا ہے۔ مَرْصَدٌ ظرفِ مکان ہے وہ جگہ جہاں گھات لگانے کے لئے بیٹھا جائے۔ لفظِ مرصاد بھی مَرْصَدٌ کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن مِرْصَاد اس جگہ کو کہتے ہیں جو دشمن کی گھات کے لئے مخصوص ہو جیسے اِنَّ جَھَنَّمَ کَانَتْ مِرْصَادًا لِّلطَّاغِیْنَ۔ وَاِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ۔

مَرْصَدٌ بھی عام طور پر اُسی جگہ کو کہتے ہیں جو دشمن کی گھات اور تاک کے لئے تیار کیا گیا ہو

المرصد : الموضع الذی یُرْقَب فیہ العَدُوّ۔ عامر بن طفیل کہتا ہے

ولقد علمتُ وما اخالک ناسیًا
انّ المنیّۃ للفتٰی بالمَرْصَدِ

اور عدی کہتا ہے

اَعاذل اِن الجہل من لذّۃ الفتٰی
انّ المنایا للنفوس بمَرْصَد

المرصد : الموضع الذی یُرقب فیہ العدو من قولھم رَصَدتُ فلانًا اَرْصُدُہٗ اذا ترقبتہ (کبیر) والمرصد: موضع الرصد (مفردات القرآن)

بعض اہل لغت نے لفظ مَرْصَد کو مصدر میمی بھی کہا ہے۔ اس صورت میں کُلَّ مَرْصَدٍ مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا یعنی اُرْصُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ۔ مطلب یہ کہ کافروں کی پوری طرح ناکہ بندی کرو۔ ان کے تاک میں دم کرو تاکہ ان کی کافرانہ سرگرمیاں ماند پڑ جائیں۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو کافروں کی دشمنانہ چالوں سے آگاہ رہنا چاہیئے۔

اِسْتَجَارَ : وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ۔ اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ چاہے تو اس کو پناہ دیدیں تاکہ وہ اللہ کا حکم سن لے ۔

اِسْتَجَارَ (استفعال) استجرتہ فَاَجَارَنی ۔ میں نے اس سے مدد مانگی تو اس نے میری مدد کی استجار فُلَانًا وبہ ۔ فریادرسی چاہنا ۔ پناہ لینا ۔ استجارہ : طلب منہ ان یحفظہ فَاَجَارَہ (اجل) پناہ طلب کی تو اس نے اسے پناہ دے دی ۔

جَارَ يَجُوْرُ جَوْرًا ۔ جار عن الشیٔ کسی چیز کی طرف بے التفاتی کرنا ۔ ہٹ جانا ۔ کہتے ہیں ۔ جَارَ عَنِ الطریق ۔ راستہ سے ہٹ گیا ۔ راہِ مستقیم سے ہٹ گیا ۔ جَارَ عَلَيْہِ : کسی پر ظلم کرنا ۔ صیغہ صفت الجائر ۔ ظالم

وَمِنْهَا جَائِرٌ ۔ اور بعض راستے سیدھی راہ سے مڑے ہوئے ہیں ۔ الجَارُ : پڑوسی ۔ ہمسایہ ۔ ہر وہ شخص جس کا مکان اور سکونت گاہ دوسرے کے قریب اور متصل ہو ۔

جَارٌ : اصل میں اسماء متضائفہ میں سے ہے ۔ جو اپنے معنی ایک دوسرے کے تقابل سے دیتے ہیں جیسے اَخٌ وصَدِیقٌ کے الفاظ ہیں کہ اخوت وصداقت دونوں کی طرف سے ہوتی ہے ۔ کیونکہ کسی کا پڑوسی ہونا اسی وقت متصور ہوگا جب دوسرا بھی اس کا پڑوسی ہو ۔ پھر چونکہ ہمسائیگی کے حقوق عقلاً وشرعاً ثابت اور ضروری ہیں ۔ ایک ہمسایہ کا حق دوسرے ہمسایہ پر ہوتا ہے اس بنا پر ہر وہ شخص جس کا حق بڑا ہو اس کو دوسرے کا جار کہتے ہیں ۔ قرآن پاک کی آیات میں اسی طرف اشارہ ہے وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ اور پھر چونکہ ایک پڑوسی دوسرے کا حامی اور مددگار ہوتا ہے اس لئے قرآن پاک میں جَارٌ بمعنی حامی بھی آیا ہے جیساکہ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں ۔

اَجَارَ يُجِيْرُ (افعال) اِجَارَةً ۔ اَجَارَہٗ مِنَ الْعَذَابِ : عذاب سے بچانا ، مدد کرنا ۔ قرآن پاک میں ہے وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ وہ پناہ دیتا ہے ، اس کے بالمقابل کوئی دوسرا پناہ نہیں دے سکتا ۔ (مؤمنون)

فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ

لفظ جَارٌ میں قرب کے معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جَارَہٗ وجَاوَرَہٗ وتَجَاوَرَ وغیرہ افعال استعمال ہوتے ہیں یعنی کسی کے قرب وجوار میں رہنا ۔

لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا (احزاب) وہ اس شہر میں عرصہ قلیل کے سوا تمہارے قریب نہیں رہیں گے ۔ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (الرعد) زمین کے متصل قطعات ۔ جَاوَرَہٗ مُجَاوَرَةً وجِوَارًا وجُوَارًا جَاوَرَ الْمَسْجِدَ ۔ مسجد میں اعتکاف کرنا ۔ حدیث

میں ہے کہ آپ (علیہ السلام) یجاور بحراء :
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے قبل غارِ حرا
میں رہے یعنی بغرضِ عبادت بتخلیہ اکثر وہاں قیام فرمایا
کرتے تھے۔
حَارَ عَنِ الطَّرِيقِ میں، صلہ عن کی وجہ سے حق سے
پھر جانے کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اسی سے
اس عورت کو جَارَةٌ کہتے ہیں جو دوسری کی سوکن
ہو۔ چونکہ عورت اپنی سوکن[1] سے بہت حسد و کینہ رکھتی
ہے۔

**عَهْدٌ : كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ
عِنْدَ اللَّهِ** (التوبہ)

عہد اس صورت معاملہ اور معاہدے کو کہتے ہیں
جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے اور میثاق
ایسے معاہدے کو کہتے ہیں جو قسم کے ساتھ اور مستحکم کیا
جائے (معارف)

عَهْدٌ : قول و قرار۔ پیمان۔ معاہدہ۔ جمع عہود
عہد اللہ یعنی خدائی عہد و پیمان۔ کبھی اس طرح
ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ بات کو ہماری عقلوں میں بٹھا
دیتا ہے۔ اور کبھی یہ شکل ہوتی ہے کہ اس کے پیغمبر
کتاب و سنت کے ذریعہ اس بات کا ہم کو حکم دیتے
ہیں اور کبھی خود اپنے التزام کی بنا پر ایک شئی
جو اصل شرع کے اعتبار سے ہم پر لازم نہ تھی اب
لازم ہو جاتی ہے جیسے کہ نذر وغیرہ۔ چنانچہ آیاتِ
ذیل میں یہ عہد کی آخری قسم ہی مراد ہے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ عٰهَدَ اللّٰهَ (اور ان میں سے کچھ
ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ قول کیا تھا)
اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
(کیا جب کبھی کوئی قول کر لیتے ہیں تو ان کا کوئی نہ کوئی
فریق اس کو اٹھا کر رکھ دیتا ہے)

عَهِدَ : اس نے تاکید کی، اس نے عہد کیا۔
اس نے اقرار کیا (سمع) عَهْدٌ سے جس کے معنی تاکید
کرنے اور عہد کرنے اور دیکھتے رہنے کے ہیں۔ ماضی
کا صیغہ واحد مذکر غائب۔
امام جعفر بیہقی نے تاج المصادر میں مذکورہ بالا
ہر سہ معنی نقل کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ یہ باب
کسی چیز کی نگرانی اور اس کی دیکھ بھال کرتے رہنے
پر دلالت کرتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ پہلے معنی کی
صورت میں اس کا تعدیہ بذریعہ الیٰ ہوتا ہے۔ چنانچہ

---

[1] دو یا دو سے زیادہ عورتیں اگر ایک مرد کے نکاح میں ہوں تو وہ باہم ایک دوسرے کی سوکنیں کہلاتی ہیں۔ لفظ سوکن مرکب ہے سَو اور کن سے۔ لفظ کن اصل میں کنی ہے۔ کنی کہتے ہیں ثابت چاولوں میں ملے ہوئے ٹوٹے کو۔ محاورۃً کہتے ہیں ان چاولوں میں کنی نہیں ہے۔ پھر یہیں سے یہ لفظ عیب کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔
اور چونکہ عورت اپنی دوسری ساتھن کے جو اس کے ساتھ شریکِ نکاح ہے عیب نکالتی رہتی ہے اس لئے اس کو سوکنی کہا گیا یعنی سو عیب نکالنے والی اور بعد میں کثرت استعمال کی وجہ سے حرف یا گر گیا سوکن ہو گیا۔

امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں فرماتے ہیں:
عَہِدَ فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ کے معنی آتے ہیں کسی سے عہد لینے اور اس پر قائم رہنے کی تاکید کرنے کے۔ ارشاد ہے وَلَقَدْ عَہِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ اور ہم نے عہد لیا تھا آدم سے اَلَمْ اَعْہَدْ اِلَیْکُمْ (کیا میں نے تاکید نہ کی تھی تم کو)
علامہ حسین بن محمد الدامغانی نے عہد کے چند معانی نقل کئے ہیں۔ ایک الامانۃ جیسے لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔ یعنی الامانۃ۔
۲۔ عہد بمعنی میثاق۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے: قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰہِ عَہْدًا۔ یعنی موثقًا
۳۔ امر۔ جیسے سورہ طٰہٰ میں ہے وَلَقَدْ عَہِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ یعنی ہم نے آدم کو حکم دیا۔
۴۔ عہد بمعنی حلف۔ سورۃ النحل میں ہے: وَاَوْفُوْا بِعَہْدِ اللّٰہِ اِذَا عٰہَدْتُّمْ۔ یعنی بالحلف اذا حلفتم۔
۵۔ العہد: التوحید۔ سورۂ مریم میں ہے: اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عَہْدًا۔ یعنی التوحید والعمل الصالح والایمان
۶۔ الوفاء بالامانۃ۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَمَا وَجَدْنَا لِاَکْثَرِہِمْ مِّنْ عَہْدٍ۔ ای وفاء امانۃٍ (قاموس القرآن)
العہد: حفظ الشئ ومراعاتہ (مجموعہ قواعد الفقہ)

یَرْقُبُوْنَ : فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّۃً اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُعْتَدُوْنَ۔

رَقَبَ یَرْقُبُ (ن) رُقُوْبًا وَرَقُوْبًا وَرِقَابَۃً نگرانی کرنا۔ نگہبانی کرنا۔ انتظار کرنا۔ ڈرانا۔
رقب النجم: ستاروں کی دیکھ بھال کرنا
رَقَبَہٗ: گردن میں رسّی ڈالنا۔ گردن پر مارنا۔
اصل میں رَقَبَۃ گردن کو کہتے ہیں۔ پھر رقبۃ کا لفظ مجازًا انسان مراد لیا جاتا ہے اور عرفِ عام میں لفظ رقبہ غلام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ۔
رقبۃ کی جمع رِقَاب آتی ہے اور رقبتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اس کی حفاظت کی۔
آیت کریمہ لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّۃً کے معنی ہیں یہ کفار کسی مسلمان کے بارے میں نہ تو قرابت کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں اور نہ عہد و پیمان کا۔ اسی سے نگرانی کرنے والے کو رقیب کہتے ہیں۔ اسلئے کہ رقیب لوگوں کی گردنوں پر نظر رکھتا ہے اور پھر خود اپنی گردن بھی بار بار اٹھا کر لوگوں کی طرف بغرض حفاظت دیکھتا رہتا ہے۔ قرآن میں فرمایا وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّیْ مَعَکُمْ رَقِیْبٌ۔ تم بھی منتظر رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

تَرَقُّبٌ (تفعل) کوئی کام کرنے کے بعد اس کے نتیجہ کا انتظار کرنا فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قتل کے بعد شہر سے نکل پڑے اور ڈرتے تھے کہ دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

يَرْقُبُوْنَ يُحَافِظُوْن۔ والرقيب: الحافظ قرطبی قال الليث رقب الانسان يرقبه رقبة ورقوبًا وهو ان ينتظره۔ و رقيب القوم حارسهم (وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ای لم تحفظه (کبیر) واصل المرقوب النظر بطريق الحفظ والرعاية

اِلًّا: لفظ اِلٌّ عربی لغت میں کئی معنی دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ علماء لغت کے اس میں مختلف اقوال ہیں۔ اِلٌّ: عہد و پیمان۔ قسم، قرابت داری کینہ۔ چلانا۔ ناامید ہونا۔

ابو عبیدہ بن زید ستری کہتے ہیں اِلًّا سے مراد عہد ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس معنی کی تائید میں حضرت حسان بن ثابت کا ایک شعر نقل کیا ہے

وجدناهم كاذبا الهم

وذو الال والعهد لا يكذب

ترجمہ: ہم نے ان کو عہد کا جھوٹا پایا۔ حالانکہ عہد و پیمان کرنے والا جھوٹ نہیں بولتا۔

یہاں اِلَّهُمْ اور الْاِلِّ دونوں سے مراد عہد لیا گیا ہے۔ ۲ فراء کہتے ہیں کہ اِل سے مراد قرابت اور باہمی رشتہ داری ہے۔ چنانچہ حسان بن ثابت کا ہی شعر ہے۔ فرماتے ہیں

لعمرك ان الك من قريش

كالّ السقب من رأل النعام

ترجمہ: تیری جان کی قسم تیری قرابت قریش سے ایسی ہے جیسی کہ اونٹنی کے بچے کی قرابت شترمرغ کے بچے سے ہے۔

یہاں حضرت حسان اِلّکَ میں اِل سے مراد قرابت لے رہے ہیں

۳ صاحب قاموس کے حوالہ سے جمل میں ہے کہ اِلٌّ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ حلف اور عہد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ علامہ فخرالدین رازی نے اس معنی کی تائید میں اوس بن حجر کا شعر نقل کیا ہے، اوس کہتے ہیں:

لولا بنو مالك والال مرقبة

ومالك فيهم الآلاء والشرف

اگر بنو مالک نہ ہوتے اور قسم جس کی پابندی کی گئی ہے اور بنو مالک میں ہی بخششیں ہیں اور شرافت۔

۴ چوتھا قول بعض اہل لغت کا یہ ہے کہ یہ لفظ اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق کے سامنے جب مسیلمہ کذاب کے ہذیان پڑھے گئے تو انھوں نے فرمایا اِنَّ هٰذَا الْكَلَامَ لَمْ يَخْرُجْ مِنْ اِلٍّ یعنی یہ کلام اللہ کی بارگاہ سے نہیں نکلا۔ لیکن زجاج نحوی نے اس کا انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں اسماء حسنیٰ

سماعی ہیں، قرآن واحادیث سے معلوم ہیں کسی ایک کو بھی یا اِلّ کہتے ہوئے نہیں سنا گیا۔ مگر زجاج کا انکار اس لئے قابلِ التفات نہیں کہ لفظ اِلّ کو اسماء حسنیٰ میں شمار کرنے والوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ یہ عربی ہے، بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ لفظ اِلّ عبرانی ہے اور عبرانی زبان میں اِلّ اور ایل اسماء حسنیٰ میں سے ہیں جیسا کہ اسرائیل یعنی عبداللہ اور جبرائیل واسرافیل وغیرہ

قرطبی میں علامہ ازہری کا قول نقل کیا گیا ہے کہ عبرانی زبان میں اللہ کا اسم ہے۔ اسم اللہ بالعبرانیۃ (قرطبی)

قال الازھری ایل من اسماء اللہ عزوجل بالعبرانیۃ فجائز ان یکون عُرِّبَ فقیل اِلٌّ۔

(کبیر ص۱۵۷ ج۲۳ وقرطبی ص۷۹ ج۸ طبع قاہرہ)

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ اِلٌّ اصل میں اَلِیل سے ماخوذ ہے الیل بجلی کو کہتے ہیں پھر اسی سے ہر صاف اور چمکیلی چیز کو اِلٌّ کہتے ہیں اَلَّ یَؤُلُّ الاًّ واَلَّ یَئِلُّ اَلِیلاً (ض) اَلَّ لونُہٗ رنگ کا صاف اور چمکیلا ہونا۔ اَلْاَلَّۃُ: برچھا۔ تیز دھار ہتھیار

واصلہ من الالیل یقال اَلَّ لونہ یَؤُلُّ الاًّ ای صَفَا ولَمَعَ (قرطبی ص۷۹ ج ۸)

زجاج کا ایک قول صاحب کبیر نے نقل کیا ہے کہ زجاج کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اِلّ کے معنی لغوی اعتبار سے تحدید الشئ کے ہیں یعنی کسی چیز کا تیز ہونا۔ اَلَّ الفرسُ: گھوڑے کا تیز چلنا۔ اُذُنٌ مُؤَلَّلَۃٌ: تیز کان۔ اَلْاَلَّۃُ۔ چمکدار اور تیز برچھا۔ طرفہ بن العبد اپنی ناقہ کی تعریف میں کہتا ہے

مؤللتان تعرف العتق فیھما
کسامعتی شاۃ بحومل مفرد

علامہ راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ اصل میں اِلّ اس صاف ظاہری اور بدیہی حالت کو کہتے ہیں جس کا انکار ممکن نہ ہو۔ عہد و پیمان اور قرابت داری بھی ایسی حالتیں ہیں جن کا انکار کسی سلیم الطبع کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ان پر بھی لفظ اِلّ بولا جاتا ہے اور عام مفسرین کے نزدیک اِلّ کے معنی عہد و قرابت کے ہیں۔ حلف اور قسم کو اِلّ اس لئے کہتے ہیں کہ عربوں کی عادت تھی کہ جب حلف لیتے تو اس پر آوازیں بلند کرتے تاکہ سب کو معلوم اور ظاہر ہو جائے

لانھم کانوا اذا تحالفوا رفعوا اصواتھم ثم استعیر للقرابۃ لان بین القرابۃ عقدًا اشد من عقد التحالف (روح)

اِلٌّ کی جمع قلت آلٌّ آلّ ہے۔ یہ اصل میں اَءْلُلٌ ہے اَفْلُس کے وزن پر۔ ہمزہ ثانیہ قبل مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے بدل گیا ہے

اورلام کو لام میں مدغم کرکے آلٌّ بنایا گیا ہے۔ اور
جمع کثرت اِلالٌ آتی ہے جیسے ذِئْبٌ کی جمع ذِئَابٌ
اوربعض نے کہا ہے اَلٌّ بالفتح کے معنی مایوسی اور ناامیدی
کے ہیں۔ حدیث میں ہے عَجِبَ رَبُّکُمْ مِنْ اَلِّکُمْ وَقُنُوْطِکُمْ
خدا نے تمہاری ناامیدی اور مایوسی پر تعجب کیا۔

ذِمَّۃ : ذِمَّۃ و مَذِمَّۃ وہ عہد و
پیمان جس کا ضائع کرنا باعثِ ندامت و مذمت
ہو۔ اس کی جمع ذِمَمٌ و ذِمَامٌ آتی ہے۔
فالذمۃ العہد جمعہما ذِمَمٌ و ذِمَامٌ
کل امرٍ لزمک وکان بحیث لو ضیّعتہ
لزمتک مذمتہ (کبیر)
ذَمَّ یَذُمُّ ذَمًّا کسی کی مذمت کرنا۔ صفت مفعول
مَذْمُوْمٌ اور ذَمِیْمٌ آتی ہے۔ مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا
اوربعض کے نزدیک ذمہ بمعنی ضمان کے ہے۔
کہتے ہیں ھو فی ذِمَّتِی ای ضمانی۔ وہ میری
ضمان اور ذمہ داری میں ہے اسی سے اہلِ ذمہ کو
ذمی کہا جاتا ہے کہ وہ اہلِ اسلام کی ضمان میں آجاتا
ہے۔

نَکَثُوْا : وَاِنْ نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ عَھْدِھِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ
فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّۃَ الْکُفْرِ (آیت ۱۲)
اگر وہ توڑ ڈالیں اپنی قسمیں عہد کرنے کے بعد
اور عیب لگادیں تمہارے دین میں تو لڑو کفر کے
سرداروں سے۔ یعنی اگر یہ لوگ اپنے معاہدوں
اور قسموں کو توڑ ڈالیں اور مسلمان بھی نہ ہوں بلکہ
بدستور تمہارے دین اسلام پر طعن و تشنیع کرتے
رہیں تو ان کے کفر کے پیشواؤں کے ساتھ جنگ
کرو۔ (معارف القرآن)

نَکَثَ یَنْکُثُ نَکْثًا۔ نکث الحبل، رسی کھولنا
اصل میں نکث کے معنی کمبل یا سوت وغیرہ ادھیڑنے[1]
کے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک کی آیت کریمہ میں ہے
کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا
اور یہ قریب قریب نقض کے ہم معنی ہے۔ اور
عہد شکنی میں یہ بطور استعارہ کے استعمال ہوتا ہے
النَّکْثُ النقضُ واصلہ فی کل ما فُتِل
ثم حُلّ، فھی فی الایمان والعھود مستعارۃ
النَّکْثُ نکث الاکسیۃ والغزل قریب من
النقض واستعیر لنقض العھد (راغب)
اَلنُّکَاثَۃ رسی کا کھلا ہوا حصہ۔ اَلنِّکْثُ:
دوبارہ کاتنے کے لئے ادھیڑا ہوا کمبل یا خیمہ۔
جمع اَنْکَاثٌ آتی ہے۔ اَلنَّکِیْثَۃُ: طبیعت،
نفس، قوت۔ پوری پوری کوشش۔ مشکل کام
قَالَ قولاً لا نکیثۃ فیہ۔ اس نے ایسی بات
کہی جس میں خلاف وعدگی نہیں۔ صَرَفَ فیہ نکیثتہٗ
اس میں اس نے پوری پوری کوشش کی ذو نکیثۃٍ
حَسَنَۃٍ۔ اچھی طبیعت والا۔ جمع نکائث۔

[1] قرطبی

طَعَنُوْا : وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ ۔

الطَّعنُ : کے معنی ہیں نیزہ، سینگ وغیرہ کسی تیز اور نوکیلی چیز کے ساتھ زخم کرنے کے ہیں۔ تَطَاعنوا واطّعَنُوا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو نیزہ مارا۔ پھر استعارہ کے طور پر کسی پر الزام لگانے یا اس کی بدگوئی کرنے کے معنی میں طعن کا لفظ استعمال ہوتا ہے (راغب) وھو (ای الطعن) ھُنا استعارۃ (قرطبی)

بعض اہل لغت کا کہنا ہے کہ طَعَنَ یطعُنُ بضم العین کے معنی ہیں کسی کو نیزے وغیرہ سے زخمی کرنا۔ اور طَعَنَ یَطعَنُ بفتح العین کے معنی ہیں بُری کلام سے کسی کو زخمی کرنا۔ دُکھ پہنچانا۔ (قرطبی)

طعن کے لغوی معنی نیزے مارنے کے ہیں۔ طعن کا اطلاق سنجیدہ، علمی، عقلی، اختلافی رائے وعقیدہ پر نہیں ہوتا۔ طعن کہتے ہیں ایسی بات کو جو دل کو چھید دے، زخمی کر دے۔ طعن فی الدین سے مقصود تحقیق کسی درجہ میں بھی نہیں ہوتی بلکہ دین کی توہین، اہل دین کی دل آزاری (ماجدی)

حدیث میں ہے فَطَعَنَ بَعْضُ فی اَمَارَتِہٖ ۔ بعض لوگوں نے حضرت اُسامہ کے امیر ہونے پہ طعن کیا تو آپ نے فرمایا ان تَطعَنُوا فی اَمَارَتِہٖ فَقَدْ طَعَنْتُمْ فی اَمَارَۃِ اَبِیْہِ من قبل (قرطبی بحوالہ مسلم کتاب الفضائل)

یَعْمُرُ : اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۔

مطلب یہ ہے کہ مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مساجد کی تعمیر کریں، کیونکہ مساجد ہی صرف وہ جگہیں ہیں جو ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں اور کفر و شرک اس کی ضد ہیں۔ وہ عمارتِ مسجد کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ مسجدوں کو آباد کرنے کا حق صرف انہی لوگوں کو ہے جو اللہ پر اور یوم الآخرۃ پر ایمان رکھتے ہیں۔ عمارتِ مسجد کا لفظ جو آیت میں آیا ہے کئی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ظاہری در و دیوار کی تعمیر، دوسرے مسجد کی صفائی اور ضروریات کا انتظام، تیسرے عبادات کے لئے مسجد میں حاضر ہونا۔ عمرہ کو اسی لئے عمرہ کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت اللہ کی زیارت کے لئے حاضری ہوتی ہے (معارف)

العمارۃ : کے معنی آباد کے ہیں۔ یہ خراب اور ویرانگی کی ضد ہے۔ کہتے ہیں : عَمَرَ اَرْضَہٗ یَعْمُرُھَا عِمَارَۃً : اس نے اپنی زمین کو آباد کیا۔ عَمَّرْتُہٗ فَعَمَرَ : میں نے اس کو آباد کیا تو وہ آباد ہوا۔ صفت مفعولی مَعْمُوْرٌ آتی ہے۔ بمعنی آباد شدہ۔ آباد کی ہوئی جگہ۔ البیتُ المَعْمُوْرُ : آباد کیا ہوا گھر، جہاں فرشتوں کی ہر وقت چہل پہل رہتی ہے

اَلتَّعْمِیْرُ : تفعیل سے کے معنی ہیں بالفعل کسی کی عمر بڑھانا اور یہ صفت خدا تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ یا عَمَّرَکَ اللہ کہنا یہ دعائیہ کلمہ ہے یعنی اللہ تیری عمر دراز کرے۔ اَلْعُمُرُ وَالْعَمْرُ : اس مدتِ حیات کو کہتے ہیں جس میں روح بدن میں آباد رہتا ہے اور یہ بقاء سے فروتر ہے۔ چنانچہ طَالَ عُمُرُہٗ کے معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ اس کا بدن روح سے آباد ہے لیکن طَالَ بَقَاءُہٗ اس مفہوم کا مقتضی نہیں کیونکہ بقاء فناء کی ضد ہے اور چونکہ بقاء کو عمر پر فضیلت ہے اس لئے حق تعالیٰ بقاء کے ساتھ تو متصف ہوتا ہے مگر عمر کے ساتھ بہت کم۔ (راغب)

عُمُرٌ اور عَمْرٌ دونوں کے معنی ایک ہیں البتہ قسم کے موقع پر عَمْر (بفتح العین) بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے لَعَمْرُکَ اِنَّھُمْ لَفِیْ سَکْرَتِھِمْ یَعْمَھُوْنَ۔

دُوْنَ : پست۔ نیچے۔ ھُوَ دُوْنَہٗ وہ اس سے درجہ میں کم ہے۔ آگے مَشٰی دُوْنَہٗ وہ اس کے آگے چلا۔ مِنْ دُوْنِ اَنْ یَّفْعَلَ بغیر اس کے کہ وہ ایسا کرے۔ مِنْ دُوْنِ اللہِ اللہ کے سوا۔ دُوْن۔ فَوْقَ کی نقیض ہے۔

قال القرطبی و دون نقیض فوق۔ وھو تقصیر عن الغایۃ ویکون ظرفًا۔ والدون: الحقیر الخسیس۔ (قرطبی ص۲۳۳ ج۱)

مذہب مشہور پر دُوْن معرب نہیں ہوتا۔ بعضے کہتے ہیں کہ معرب ہوتا ہے۔ چنانچہ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِکَ (الجن) دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ پیش کے ساتھ بھی اور زبر کے ساتھ بھی۔ اور اسم بھی واقع ہوتا ہے بمعنی غیر کے جیسے اِتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اٰلِھَۃً یہاں دُوْنِہٖ بمعنی غَیْرِہٖ یعنی اُس کے سوا کے ہے۔

زمخشری نے کہا ہے کہ غیرہ کے معنی کسی کے ورے کے ہیں۔ اور حالت کا فرق بتانے کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے زَیْدٌ دُوْنَ عَمْرٍو زید عمرو سے نیچے ہے۔ یعنی شرافت اور علم میں اس سے نیچے ہے اور اس کے معنی میں وسعت دے کر اس کا استعمال حد سے بڑھنے کے لئے بھی کیا جاتا ہے جیسے اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی مسلمانوں کی رفاقت سے کافروں کی رفاقت کی طرف تجاوز نہ کرو۔ (لغات القرآن)

دَانَ یَدُوْنُ دَوْنًا خسیس ہونا۔ کمزور ہونا

وَلِیْجَۃ : وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللہِ وَلَا رَسُوْلِہٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَۃً۔

وَلِیْجَۃٌ : کے معنی دخیل اور بھیدی کے ہیں اور اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دوسری قوم کا ہو اور آپ نے اس کو اپنا معتمد اور مشیر بنا لیا ہو۔ اسی معنی میں اس سے قبل لفظ بِطَانَۃ گذر چکا ہے

جس کے اصل معنی کپڑے کے ہیں جو دوسرے کپڑے کے نیچے بطن اور بدن کے ساتھ متصل ہو۔ مراد اس سے ایسا آدمی ہوتا ہے جو گہرا دوست ہونے کی وجہ سے اندر کے رازوں کا واقف ہو۔

لفظ ولیجہ۔ فلانٌ وَلِیجَۃٌ فِی القَوم کے محاورے سے لیا گیا ہے یعنی وہ جو قوم میں داخل ہوجائے اور ان میں سے نہ ہو۔ الوُلُوج کے معنی کسی تنگ جگہ میں داخل ہونے کے ہیں جیسا کہ آیت کریمہ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ

وَلِیجَۃٌ بِطَانَۃٌ ومُدَاخلۃٌ۔ قال ابو عبیدۃ کلّ شئ ادخلتہ فی شئ لیس منہ فھو ولیجۃ وقال ابن زید الولیجۃ: الدخیلۃ (قرطبی)

لفظ ولیجۃ اگرچہ واحد جمع دونوں کے لئے برابر استعمال ہوتا ہے مگر بسا اوقات اہل لغت اس کی جمع الوُلَجَاءُ اور وَلَائِجُ بھی استعمال کرتے ہیں۔ واضح الولائج: دین اسلام کی تمام باتیں واضح اور کھلی ہیں۔ وقد یُجمع علی ولائج (جل۔ روح)

اِقْتَرَفْتُمُ : وَاَمْوَالٌ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ۔

القَرْفُ والاِقْتِرَافُ: کے معنی درخت سے چھال اتارنے اور زخم سے چھلکا کردینے کے اور جو چھلکا چھیلا جاتا ہے اس کو قِرْفٌ کہتے ہیں اور بطور استعارہ دونوں پر اقتراف کا اطلاق ہوتا ہے جیسے آیت کریمہ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ، وہ عنقریب اپنے کئے کی سزا پالیں گے۔

علامہ راغب نے لکھا کہ اِقتِراف کا اکثر استعمال بُری کمائی پر ہی ہوتا ہے جیسا کہ محاورہ ہے: الاعترافُ یُزیلُ الاِقتِرافَ: اعتراف جرم جرم کو مٹا دیتا ہے۔

واصل الاقتراف اقتطاع الشئ من مکانہ الی غیرہ (قرطبی۔ روح)

الاِقتِرافُ: الاکتسابُ (کبیر)

واستُعیرت الاقتراف للاکتساب (راغب)

کَسَادٌ : تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا۔

کَسَدَ یَکسُدُ وکَسُدَ یَکسُدُ (ن۔ک) کَسَادًا وکُسُودًا۔ کَسَدَ الشئُ: گاہکوں کی کمی کی وجہ سے کسی چیز کا رائج نہ ہونا۔ مندا پڑجانا۔ کَسَدَت السُّوقُ: بازار کا مندا پڑجانا۔ چیز وقت پر بکنے سے رہ جانا۔

رَحُبَتْ : وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ۔

الرَّحب (اسم) جگہ کی وسعت کو کہتے ہیں۔ اسی رحبۃ المسجد ہے جس کے معنی مسجد کے

کھلے صحن کے ہیں اور رَحْبَتُ الدَّار کے معنی گھر
وسیع ہونے کے ہیں۔ پھر رَحْبٌ کا لفظ بطور استعارہ
پیٹ یا سینہ کی وسعت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے
جیسے رَحِبُ البطن: خوب کھانے والا (پیٹو)
اور رَحِبُ الصَّدْر فراخ سینہ۔ عالی ظرف۔
بلند حوصلہ والا۔ اور اس کے بالکل برعکس لفظ
ضیق: تنگیٔ قلب کے لئے بطور استعارہ کے استعمال ہوتا
ہے ضَیِّقُ الصَّدر: تنگ سینہ۔ رَحبُ الرَّاحَۃِ
سخی داتا۔ اور رحیب الفناء اس شخص کو کہتے ہیں
جس کے نوکر چاکر زیادہ ہوں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے
مَرْحَباً وَاَھْلاً: تو نے کشادہ جگہ پائی اور اپنے
گھر والوں میں آیا ہے۔

مَرْحَبٌ: یہودیوں کے پہلوان کا نام تھا جو حضرت
محمد بن مسلمہ نے قتل کیا تھا۔ اگرچہ بعض نے کہا ہے
کہ مرحب کو حضرت علیؓ نے قتل کیا، مگر پہلی روایت
زیادہ درست ہے۔

مَرْحَباً: یہ ایک اُنس اور محبت کا کلمہ ہے جو
میزبان، صاحب خانہ یا ایک دوست آنے والے
دوست کو کہتا ہے۔ تاکہ وہ خوش ہو اور جذبۂ
خیرسگالی اور زیادہ بڑھے۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ الرُّحْبُ بضم الراء
کے معنی وسعت اور کشادگی کے ہیں اور رُحْبُ
الصَّدْر اسی سے ہے جس کے معنی ہیں بڑے
حوصلہ کا آدمی۔ دلیر۔ اور الرَّحْبُ:
بفتح الراء۔ واسع۔ صیغہ صفت کے معنی میں بھی
آتا ہے۔ الرُّحْبُ بضم الراء: السَّعۃُ
والرَّحْبُ بفتح الراء: الواسع۔ قرطبی فتح القدیر
رَحُبَ یَرْحُبُ رَحْباً و رَحَباً و رَحَابَۃً:
رَحُبَ المکان: جگہ کا فراخ ہونا۔

نَجَسٌ: اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ
مشرک تو نرے ناپاک ہیں۔ (ماجدی)
لفظ نَجَسٌ بفتح جیم نجاست کے معنی میں آتا ہے
اور نجاست کہا جاتا ہے ہر گندگی کو جس سے
انسان کی طبیعت نفرت کرے۔

امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ اس میں
وہ نجاست بھی شامل ہے جو آنکھ، ناک یا ہاتھ
سے محسوس ہو اور وہ بھی جو علم و عقل کے ذریعے سے
معلوم ہو۔ اس لئے لفظ نجس اس گندگی اور
غلاظت کو بھی شامل ہے جو ظاہری طور پر محسوس
ہو۔ اور اس معنوی نجاست کو بھی جس کی بنا پر
شرعاً وضو یا غسل واجب ہو جاتا ہے جیسے جنابت
یا حیض و نفاس کے ختم ہونے کے بعد کی حالت۔
اور وہ باطنی نجاست بھی جس کا تعلق انسان کے
قلب سے ہوتا ہے جیسے عقائدِ فاسدہ اور اخلاقِ
رذیلہ۔ (معارف القرآن)
نَجَّسَہٗ کے معنی ہیں کسی چیز کو پلید کر دینا اور اس کے

نجاست کو دور کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اسی سے
تنجیس العرب ہے یعنی تعویذ گنڈا۔ جو شیطانی نجاست
کو دور کرنے کے لئے بچے کے گلے میں لٹکاتے تھے۔
اور تعویذ گنڈے کرنے والوں کو نُجُس بضم النون
کہتے ہیں۔ تعویذات کے ذریعہ شیطانی اثرات کو
زائل کرنے والے۔

نَجَسٌ یہ نَجِسَ (س) نَجَسًا کا مصدر ہے۔ واحد
تثنیہ جمع میں یکساں استعمال ہوتا ہے اور اسی طرح
مذکر و مؤنث میں بھی کہتے ہیں رَجُلٌ نَجَسٌ وامرأۃٌ
نَجَسٌ ورَجُلانِ نَجَسٌ ونساءٌ نَجَسٌ اور نَجُسَ
(ک) سے مصدر نَجَاسَۃٌ آتا ہے، گندہ ہونا۔
نَجَّسَہٗ واَنْجَسَہٗ ناپاک کرنا۔ صیغہ صفت نَجَسٌ
و نَجِسٌ و نَجُسٌ و نِجْسٌ وغیرہ آتے ہیں۔ جمع انجاس
ہے۔ لفظ نِجْسٌ بکسر النون اس وقت استعمال ہوگا جب
اس کے ساتھ رِجْسٌ کا لفظ بھی لایا جائے۔

وقال اللیث: النَّجَسُ: الشیءُ القَذِرُ
من الناس ومن کل شیءٍ (کبیر)

وقال صاحب الکشاف: اَلنَّجَسُ مصدر
نَجِسَ نَجَسًا وقَذِرَ قَذَرًا۔

وقال الامام محمد بن احمد القرطبی:
فاَمّا النِّجْسُ بکسر النون وجزم الجیم فلا
یقال الا اذا قیل معہ رِجْسٌ۔ فاذا اُفرِد
قیل نَجِسٌ۔ (قرطبی)

عَیْلَۃً : وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً۔

عَیْلَۃٌ: بفتح العین، عَالَ یَعِیْلُ کا مصدر ہے
بمعنی تنگدستی۔ صفت عائل اور جمع عَالَۃٌ
آتی ہے۔ ایک قدیم شاعر کہتا ہے:

وما یدری الفقیر متی غناہ
وما یدری الغنیُّ متی یعیلُ

اصل میں اَلْعَوْلُ: ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو انسان
کو گرانبار کر دے یا اُس کے لئے مشکلات پیدا
کر دے۔ محاورہ ہے ما عالک فھو عائلٌ لی
جو چیز تجھ پر بار ہے وہ مجھ پر بھی گرانبار ہے۔ اسی
سے عَوْلٌ ہے۔ جس کے معنی حق استحقاق سے
زیادہ لیکر ناانصافی کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا

اس میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔
یہاں عَوْل سے مراد عدل کے خلاف بے انصافی
ہے۔ کہتے ہیں عَالَ الْحَاکِمُ حاکم نے ظلم کیا
انصاف کو ترک کیا۔ عَالَ الْمِیْزَانُ: میزان کا
ایک پلہ جھک گیا۔ عَالَ الرَّجُلُ: کے معنی
ہیں وہ کثیر الاولاد ہوگیا۔ آیت کریمہ میں لفظ عَیْلَۃ
سے مراد معاشی مشکلات ہیں۔ اِنْ خِفْتُمْ
عَیْلَۃً کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں معاشی مشکلات
کا اندیشہ ہو تو سمجھ لو کہ نظام معاش تمام کا تمام
خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنی مشیت سے تمہیں

غنی کر سکتا ہے

العیلۃ : الفقر، یقال عَالَ الرجُلُ یَعِیلُ اذا افتقر (قرطبی)

فی المصباح العَیلَۃُ بالفتح الفَقرُ وھی مصدر عال یعیل (جمل)

والعیلہ : الفقر، والمعنی ان خِفتُمْ فَقرًا بسبب منع الکفار (کبیر)

حضرت علقمہ اور عبداللہ ابن مسعود اور بعض دوسرے اصحاب نے عَیلَۃً کی بجائے عَائِلَۃً پڑھا ہے اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ مصدر ہو جیسے کہ قَالَ یَقِیلُ سے قَائِلَۃً مصدر آتا ہے۔ اسطرح عَافِیَۃً ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ عَائِلَۃً اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہو۔ اس صورت میں یہ محذوف موصوف کی صفت ہوگا یعنی اِنْ خِفتُمْ حَالًا عَائِلَۃً

الْجِزْیَۃَ : حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ۔

جزیہ کے لفظی معنی بدلہ اور جزاء کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اس سے مراد وہ رقم ہے جو کفار سے قتل کے بدلہ میں لی جاتی ہے (معارف)

وھی فی الشرع مایعطیہ المعاھد علی عھدہ (فتح) جَزٰی یجزی جزاءً۔ کافی ہونا بدلہ دینا۔ لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا

الجزاء : اسم ہے کسی چیز کا بدلہ جو کافی ہو، جیسے خیر کا بدلہ خیر سے اور شر کا بدلہ شر سے۔

جَازَیْتُکَ فُلَانٌ : فلاں تجھے کافی ہے۔ جَزَیْتُہٗ کذا بکذا : میں نے فلاں کو اس کے عمل کا ایسا بدلہ دیا۔ زمینوں کے وصول شدہ ٹیکس کو جزیہ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کی جان مال کی حفاظت کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔

عَنْ یَّدٍ : اس میں عَنْ بمعنی سبب اور یَد بمعنی قوت و غلبہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ یہ جزیہ کا دینا بطور اختیاری چندہ یا خیرات کے نہ ہو بلکہ اسلامی غلبہ کو تسلیم کرنے اور اس کے ماتحت رہنے کی حیثیت سے (معارف)

یُضَاھِئُوْنَ : ذٰلِکَ قَوْلُھُمْ بِاَفْوَاھِھِمْ یُضَاھِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ۔

المضاھاۃ : کے معنی مشابہت اور مشاکلت کے ہیں۔ یُضَاھُوْنَ : یُشَاکِلُوْنَ کے معنی میں ہے یعنی دوسروں کے مشابہ اور ہم شکل ہونا۔ اس میں دو قرأتیں ہیں۔ ایک تو عاصم کی قرأت ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے یُضَاھِئُوْنَ ھاء کے بعد ہمزہ ہے۔ دوسری قرأت عام دوسرے قراء کی ہے وہ یُضَاھُوْنَ بغیر ہمزہ کے پڑھتے ہیں۔ معنوی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے بعض اہل لغت کا قول ہے کہ ضَاھَأْتُ وَضَاھَیْتُ دونوں طرح

پڑھا جاتا ہے ۔ بنو ثقیف کی لغت میں ضَاھَأْتُ ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور صاحب جمل نے بعض اہل لغت کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اصل تو اس میں ہمزہ ہے ۔ یعنی ہمزہ اس کا اصلی ہے اور یا ء اس سے فرع ہے جیسا کہ تَوَضَّأْتُ سے تَوَضَّیْتُ اور قَرَأْتُ قَرَیْتُ اور اَخْطَأْتُ سے اَخْطَیْتُ ۔ حدیث میں ہے اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ الَّذِیْنَ یُضَاھُوْنَ خَلْقَ اللّٰہِ یہاں یُضَاھُوْنَ سے مراد مُصَوِّر ہیں (جمل)

ضَھِیَتْ تَضْھٰی ضَھًی ۔ ضَھِیَتِ الْمَرْأَۃُ کَانَتْ لَا تَثْدِیْ لَھَا وَلَا لَبَنَ ۔ عورت کا بغیر پستان اور دودھ کے ہونا ضَھِیَتِ الْاَرْضُ زمین کا بنجر ہونا ۔ اِمْرَأَۃٌ ضَھْیَاءُ وہ عورت جو پستان اور دودھ نہ ہونے کی وجہ سے مردوں کے مشابہ ہو ۔ ضَھْیَاءُ کی جمع ضُھًی ہے

علامہ قرطبی نے ابن ولاد کا قول نقل کیا ہے اِمْرَأَۃٌ ضَھْیَاءُ مہموز ہے اور اسے مقصور بھی پڑھا جائے گا اور سیبویہ نے ہمزہ کو زائد قرار دیا ہے ۔ چونکہ جب جمع بنائی جاتی ہے تو نساء ضُھًی کہتے ہیں ، ہمزہ حذف ہو جاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ہمزہ زائد ہے (قرطبی)

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ جن کا خیال یہ ہے کہ یُضَاھِئُوْنَ اِمْرَأَۃٌ ضَھْیَاءُ سے ماخوذ ہے غلط ہے کیونکہ ضَاھَأَ میں ہمزہ اصلیہ ہے اور ضَھْیَاءُ کا ہمزہ حَمْرَاءُ کی طرح زائد ہے[1]

المضاھاۃ : المشابھۃ ، قال الفراء یقال ضاھیتہ ضھیا ومُضَاھَاۃً ھٰذا قول اکثر اھل اللغۃ فی المضاھاۃ ۔ وقال شمر : للمضاھاۃ : المتابعۃ (کبیر) مشابہت اور متابعت ۔ دونوں قریب المعنی ہیں ۔

یُطْفِئُوْا : یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَیَاْبَی اللّٰہُ (کفار) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (دین) کو اپنے منہ سے بجھا دیں حالانکہ اللہ کو نامنظور ہے ۔

طَفِیَ یَطْفَأُ طُفُوْءًا : طَفِئَتِ النَّارُ : آگ کا بجھنا ۔ طَفِئَتْ عَیْنُہٗ : آنکھوں کی روشنی جاتے رہنا ۔ اَطْفَأَ (افعال) پھونک مار کر بجھانا

[1] بہرحال اس کی اصل میں اختلاف ہے ۔ بعض نے اس کو ناقص یائی قرار دیا ہے ۔ ان کے نزدیک اس سے فعل ضَاھَیْتُ آئیگا ۔ اور بعض نے اس کو مہموز اللام قرار دیا ہے ۔ ان کے نزدیک فعل ضَاھَأْتُ آئے گا ۔ المُضَاھَأَۃ : مشاکلۃ الشئ بالشئ ۔ ایک شئ کا دوسری شئ کے مشابہ اور ہم رنگ ہونا ۔

اِنْطَفَئَتِ النَّار آگ کا بجھنا۔ اسم فاعل مُطفِئٌ قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد ہے یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے چراغ کی روشنی کو منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں۔ یہ آیت سورۃ الصف کی ہے۔ علامہ راغب اصفہانی صاحب نے ان دونوں آیت میں معنوی اعتبار سے لطیف فرق بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ والفرق بین الموضعین ان فی قولہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا یقصدون اطفاء نور اللّٰہ و فی قولہ لیطفئوا یقصدون اَمْرًا یتوصلون بہ الی اطفاء نور اللّٰہ کہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اَنْ یُّطْفِئُوْا کے معنی نور الٰہی کو بجھانے کا قصد کرنے کے ہیں۔ اور لِیُطْفِئُوْا کے معنی ایسے امر کا قصد کرنے کے ہیں جو اطفاء نور کا سبب بن سکے۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے اطفِئُوا المَصَابِیْحَ چراغ گل کا کر دیا کرو مِطفَاۃٌ وَ طَفَایَۃٌ فائرانجن آگ بجھانے کا آلہ۔

یَکْنِزُوْنَ : وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو آپ انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیں۔

کَنَزَ یَکْنِزُ (ض) کَنْزًا کے معنی دولت جمع کر کے اس کو محفوظ کر دینے کے ہیں۔ یہ اصل میں کَنَزْتُ التَّمْرَ فِی الْوِعَاءِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھجور کو باردان میں بھر کر محفوظ کر لینے کے ہیں اور کھجور اندوختہ کرنے کے موسم کو زَمَنُ الکناز کہا جاتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دولت جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں مگر خدا کی راہ میں اس کو خرچ نہیں کرتے۔ یکنزون یدّخرون کے مرادف ہے لیکن حدیثِ نبوی اور اصطلاح شرعی میں کنز سے مراد وہ مال لیا گیا ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے اور جس کی زکوٰۃ ادا ہوتی ہو اس پر کنز کا اطلاق نہیں ہوتا محدث بیہقی نے نافع مولیٰ ابن عمرؓ صحابی سے روایت کی ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا ہو وہ کنز نہیں۔ چاہے وہ زمین کے سات طبقات کے نیچے گڑا ہوا ہو اور جس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی وہ کنز ہے چاہے سطح زمین پر بکھرا پڑا ہو۔ بخاری کتاب الزکوٰۃ کی روایت ہے مَا اُدِّیَ زَکَاتُہٗ فَلَیْسَ بِکَنْزٍ۔ علامہ جصاص صاحب احکام القرآن نے لکھا ہے ھو فی الشرع مَا لَمْ یُؤَدَّ زَکَاتُہٗ علامہ زمخشری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا ہو چکی ہو

نہیں۔ چاہے وہ مدفون ہی کیوں نہ ہو اور جو مال نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کنز ہے خواہ علیٰ ظہر الارض ہو (کشاف) معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے جس مال کو مذموم قرار دیا ہے وہ جمع نہیں بلکہ صرف وہ جمع ہے جس میں مصارفِ خیر سے گریز کیا گیا ہو۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے لفظوں سے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ بقدر ضروری اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کا باقی ماندہ جمع کیا ہوا مال کنز نہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ زکوٰۃ نکالنے کے بعد جو مال باقی رہے اس کا جمع کرنا کوئی گناہ نہیں لفظ کنز کے لغوی معنی کسی چیز کو جمع کرنے اور بعض کو بعض کے ساتھ ملانے کے ہیں۔ سونے چاندی وغیرہ پر اس کا اطلاق مخصوص نہیں ہے بلکہ کنز کا لفظ مطلق جمع وضم کے لئے آتا ہے حدیث میں ہے: حدیث صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو فرمایا أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ مَا يَكْنِزُ الْمَرْءُ، الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ۔ یعنی مرد کے لئے بہتر خزانہ نیک عورت کے ساتھ نکاح کرنا ہے جو اس کے دین میں تعاون کرے۔ الكنز في اللغة الضم والجمع ولا يختص ذلك بالذهب والفضة (قرطبی) صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کنز کے لئے زیر زمین دفن ہونا شرط نہیں بلکہ مطلق جمع کرنا اور اس کی حفاظت کرتے رہنا کافی ہے۔

ولا يشترط في الكنز الدفن بل يكفي مطلق الجمع والحفظ (روح)

اصل الكنز في كلام العرب هو الجمع وكل شيء جمع بعضه الى بعض فهو مكنوز (کبیر)

کنز: علم و حکمت کے مکتوب مصحف پر بولا جاتا ہے چنانچہ علامہ دامغانی لکھتے ہیں: الكنز المصحف من العلم وقوله تعالى: وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا۔ قيل انه كان فيه لوح ذهب فيه علم وحكمة (قاموس القرآن وقرطبی ص۱۲۸ ج۱۱)

يُحْمٰى: يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ

الحمي: وہ حرارت جو جواہر جیسے آگ سورج وغیرہ سے حاصل ہو اور وہ بھی جو بدن میں قوت حارہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے: فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ: گرم چشمے میں۔ ایک قرأت میں حامیۃ کی بجائے حَمِئَة ہے معنی دونوں کے الگ ہیں۔ چونکہ حَمِئَةٌ اور حَمَأٌ سیاہ بدبودار مٹی کیچڑ وغیرہ کو کہتے ہیں۔ علامہ ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے اس کے معنی الطِّيْنُ السُّوْدُ نقل کیا ہے۔ یعنی سیاہ کیچڑ

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ کے معنی یہ ہیں کہ ناجائز جمع کئے ہوئے مال و دولت پر دوزخ

کی آگ جلائی جائے گی تاکہ اس کو گرم کرکے سیٹھ صاحب بہادر کی ضیافت کی جائے۔

حَمِیَ (س) حَمْیًا وحُمِیًّا وحُمُوًّا: حَمِیَت النارُ آگ کا بہت تیز گرم ہو جانا۔ حَمِیَ علیہ کسی پر سخت ناراض ہو جانا۔ حُمَیّا الکأسِ: شراب کی تیزی پر بولا جاتا ہے اور انسان کی قوت غضبیہ جوش میں آنے کی وجہ سے حد سے نکل جائے تو اسے حَمِیَّۃٌ کہا جاتا ہے۔ حَمِیْتُ علیٰ فُلانٍ کے معنی ہیں میں فلاں پر غصہ ہوا۔ حَمِیَّۃَ الجاھِلِیَّۃِ جاہلیت کی ضد۔ پھر استعارۃً حَمِیَّۃ کا لفظ حفاظت کے معنی میں بولتے ہیں۔ حَمَیْتُ المکانَ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی کسی جگہ کی حفاظت کرنے کے ہیں۔ ھٰذا شَیْءٌ حِمیً یہ محفوظ چیز ہے حَمَیْتُہٗ حِمَایَۃً میں نے اس کی حمایت کی یعنی اس پر حملہ کرنے والوں کو روک دیا حَمَیْتُ القَوْمَ المَاءَ میں نے قوم کو پانی سے روک دیا۔ پانی کو محفوظ کر لیا۔ حَمْوٌ: حرارت، گرمی اور عزیز واقارب کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے عورت کیلئے خاوند کا بھائی عزیز باپ وغیرہ، حَمْأٌ ہیں۔ حَمْأٌ: دیور، اس کی مؤنث حَمَاۃٌ آتی ہے دیورانی۔ جٹھانی، نند وغیرہ۔

بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ حَمْوٌ خاص کر عورت کے بھائی۔ باپ۔ چچا وغیرہ کو کہتے ہیں اس کی جمع اَحْمَاءٌ آتی ہے۔ اور بعض اہل لغت نے یہ بھی لکھا ہے کہ اَحْمَاءٌ عورت کے ان رشتہ داروں کو کہا جاتا ہے جو خاوند کی طرف سے ہوں جیسے ساس، سسر، دیور وغیرہ۔ کیونکہ یہ بھی عورت کی حفاظت کرتے ہیں۔

تُکْوٰی: کَوٰی یَکْوِی کَیًّا:

جسم کو داغنا کَوٰی فُلَانًا: لوہے وغیرہ سے داغنا

اَلْکَیُّ: اِلْصَاقُ الحَارِّ من الحَدِیْدِ وَالنَّار بالعضو حَتّٰی یَحْتَرِقَ الجلد۔ (قرطبی)

کَاوٰی مُکَاوَاۃً: ایک دوسرے کو گالی دینا۔

کاوی الرجل: باہم گالی گلوچ کرنا۔

اِکْتَوَی الرَّجُلُ: اپنے آپ کو داغ دینا، اپنی ذات کی بے جا تعریف کرنا۔

اَلْکَیَّۃُ: یہ کَوٰی کا اسم مرّہ ہے۔ اور اُس جگہ کو بھی کَیَّۃٌ کہتے ہیں جہاں داغ لگایا جائے۔ اَلْکَوَّاءُ: یہ فعّال کے وزن پر اسم مبالغہ ہے بدزبان اور ہجو اسی آدمی۔

اَلْمِکْوَاۃُ: داغ لگانے کا لوہا۔ استری۔ جمع مَکَاوِیْ آتی ہے۔ مَکْوِیٌّ: استری کیا ہوا۔

جِبَاہٌ: فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ۔

جِبَاہٌ: جمع ہے۔ اس کی واحد جِبْھَۃٌ آتی ہے پیشانی کا وہ حصہ جو سجدے کی حالت میں زمین پر لگتا ہے۔ یہ حصہ چونکہ باقی تمام اعضاء انسانی

سے بلند ہے پھر اسی سے استعارۃً قوم کے بڑے سرداروں کو جبھۃ القوم کہتے ہیں۔ گھوڑے پر جبھۃ کا لفظ بولا جاتا ہے، چونکہ گھوڑا عزت دشرف کی نشانی ہے۔ گویا اس میں بھی بلندی کے معنی ملحوظ ہیں۔ حدیث میں ہے لیس فی الجبھۃ صَدَقَۃٌ: یعنی گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے اور ثریا ستارے کو جبہۃٌ کہتے ہیں۔ گویا وہ برج اسد کے لئے بمنزلہ پیشانی کے ہیں والجباہ جمع الجبھۃ وھو مستوی ما بین الحاجب الی الناصیۃ (قرطبی)

اَلْجُبْھَۃُ: موضع السجود من الراس (راغب) جَبْھَۃٌ کی ایک جمع جَبُھَاتٌ بھی آتی ہے۔

جنوب: فَتُکْوٰی بِھَا جُنُوْبُھُمْ

جُنُوْبٌ جمع ہے اسکی واحد جَنْبٌ آتی ہے بمعنی پہلو۔ قرآن پاک میں ہے: یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ۔ ہائے اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

اَلنَّسِیْٓءُ: اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ۔ مہینوں کا آگے پیچھے کرنا کفر میں زیادتی ہے۔ اَلنَّسِیْٓءُ میں علماء لغت کے دو قول ہیں ایک یہ کہ اَلنَّسِیْٓءُ کے اصل معنی کسی چیز کو مؤخر کر دینے کے ہیں چنانچہ نَسَأْتُ الاِبِلَ عَنِ الْحَوْضِ اَنْسَأُھَا نَسْأً وَاِنْسَاءً: کے معنی ہیں اونٹ کو حوض سے

ہٹا دینا، پیچھے کر دینا۔ اَنْسَأْتُہٗ اِنْسَاءً میں اس کو پیچھے کر دیا اَلنَّسِیْئَۃُ اور اَلنَّسِیْٓءُ اس ہی سے اسم آتے ہیں۔ کہتے ہیں اَنْسَأَ اللّٰہُ فُلَانًا اَجَلَہٗ وَنَسَأَ فِیْ اَجَلِہٖ یعنی خدا اس کو موت سے مؤخر کرے، اس کی عمر دراز کرے ابوعلی فارسی کہتے ہیں کہ نَسِیْءٌ یہ نَذِیْرٌ اور نَکِیْرٌ کی طرح مصدر ہے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ نَسِیْءٌ مَنْسُوْءٌ کے معنی میں ہو جیسا کہ قَتِیْلٌ بمعنی مَقْتُوْلٌ۔ اس صورت میں نَسِیْءٌ فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول ہوگا مگر آیت کریمہ میں نَسِیْءٌ کو بمعنی مفعول یعنی منسوء لینا معنوی اعتبار سے دشوار ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر نسیٔ کو منسوء کے معنی پر محمول کیا جائے تو تقدیر عبارت یہ ہو گی کہ اِنَّمَا الْمُؤَخَّر زیادۃ فی الکفر۔ حالانکہ معلوم ہے کہ مؤخر شہر ہے اور شہر اور ماہ میں کفر کی کوئی بات نہیں ہے تو چونکہ نسیٔ کو منسوء کے معنی میں لینے سے نتیجہ غلط نکلتا ہے۔ اس لئے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ النَّسِیْٓءُ مصدر انساءٌ کے مقام مقام ہے جس کے معنی کسی چیز کو مؤخر کر دینے کے ہیں تو النَّسِیْٓءُ سے مراد یہ ہے کہ ایک حرمت والے مہینہ کو ایسے مہینے کی طرف مؤخر کر دینا جو حرمت کا نہیں۔

ابن کثیر نے نَسِیئ کو نَسْئٌ نَفْعٌ کے وزن پر پڑھا ہے اور حقیقی مصدر یہی ہے۔

علامہ ازہری کا قول امام قرطبی نے نقل کیا ہے نسیئ اَنسَأتُ الشیئ سے اسم ہے جو مصدرِ حقیقی کے قائم مقام ہے۔ ابن کثیر سے مروی ہے کہ بعض قراء نے اَلنَّسِیُّ ہمزہ کے ترک اور حرف یاء کی تخفیف سے پڑھا ہے۔ قرأتِ ورش میں عموماً ہمزہ کو یا سے تبدیل کر دیتے ہیں جس کا مطلب قرأت میں تسہیل پیدا کرنا ہوتا ہے جیسے اَرْجَأتُ کو اَرْجَیْتُ پڑھتے ہیں اور بعض نے اَلنَّسِیُّ یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ دوسرا قول علامہ قطرب کا ہے وہ کہتے ہیں کہ اَلنَّسِیُٔ کے اصل معنی زیادہ کے ہیں چنانچہ نَسَأَ فی الاَجَل وَاَنسَأَ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی چیز زیادہ ہو جائے نَسَأَتِ الْمَرْأَۃُ کے معنی ہیں کہ حاملہ ہونے کی وجہ سے عورت میں زیادتی ہو گئی۔ اسطرح نَسَأْتُ النَاقۃ کے معنی ہیں کہ میں نے اونٹنی کو ہنکایا تاکہ وہ رفتار تیز کرے۔ اور ہر اس زیادتی پر نَسِیُّ کا لفظ بولا جاتا ہے جو کہ چیز میں پہلے سے نہ ہو بلکہ بعد میں پیدا ہو جیسے کہ عورت کا حاملہ ہونے کی وجہ سے زیادہ ہونا یا دودھ کا پانی ڈالنے کی وجہ سے زیادہ ہونا۔

امام فخر الدین رازی نے علامہ واحدی کا فیصلہ نقل کیا ہے کہ اَلنَّسِیُٔ کے اصل معنی تاخیر ہی کے ہیں اور حاملہ عورت کو نَسَأَتِ الْمَرْأَۃُ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا حیض مؤخر ہو جاتا ہے اور نَسَأْتُ النَاقۃ کا مطلب یہ ہے کہ اونٹنی کو اس لئے پیچھے کر لینا تاکہ اس کی حسنِ رفتار دوسری اونٹنیوں سے ممتاز رہے۔ مصدر میمی مَنْسَأَۃ آتا ہے بمعنی تاخیر کرنا۔ حدیث میں ہے: من اَحَبَّ ان یُنسأُ فی اجلہ فَلْیَصِل رَحِمَہ۔ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی عمر دراز ہو اس کو چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے۔ اعزہ کے ساتھ نیک سلوک کرے۔

اَلنَّسِیْئَۃ ادھار کا لین دین کرنا۔ حدیث میں ہے: انما الربٰو فی النَّسِیْئَۃ۔

امرأۃ نَسْئٌ یا نَسُوْءٌ وہ عورت جس کا حیض رُک گیا ہو اور حمل کی امید ہو۔ صنفِ نازک کو نِسَاء غالباً اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ مرتبۃً مَردوں سے مؤخر ہیں۔

مِنْسَأَۃ: اسم آلہ ہے بمعنی عصا اور لاٹھی کے آتا ہے۔ چونکہ عصا بھی موخر کرنے اور پیچھے ہٹانے کا آلہ ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں نَسَأْتُہٗ میں نے اس کو لاٹھی سے ہنکا کر پیچھے کر دیا۔ نَسَأَ یَنْسَأُ نَسأً فھو نَاسِئٌ۔

اسم فاعل نَاسِئٌ کی جمع نَسَأَۃ آتی ہے جیسے فَاسِقٌ

کی جمع نَسَقَۃٌ آتی ہے (قرطبی)
میرے استاذ مفتی اعظم لکھتے ہیں کہ لفظ نَسِیٌ مصدر ہے جس کے معنی پیچھے ہٹا دینے اور موخر کردینے کے ہیں۔
(معارف القرآن)

لِیُوَاطِئُوْا : وَیُحَرِّمُوْنَہٗ عَامًا لِّیُوَاطِئُوْا عِدَّۃَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ۔ یعنی تاکہ وہ پوری کرلیں گنتی ان مہینوں کی جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ محض گنتی پوری کرلینے سے تعمیل حکم نہیں ہوتی بلکہ جو حکم جس مہینہ کے لئے دیا گیا ہے اُسی مہینہ میں اس کو پورا کرنا ضروری ہے (معارف)
اصل صیغہ یُوَاطِئُوْنَ ہے لام کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا ہے (قرطبی)
وَطِئَ الشَّیْءَ فَھُوَ وَطِیْءٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا پامال ہونا اور اَلْوِطَاءُ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو پاؤں تلے روندی جائے۔ وَطِئْتُہٗ بِرِجْلِیْ وَطْأً وَوَطْأَۃً وَوِطَاءَۃً۔ (فتح) اس طرح تَوَطَّأَتْہُ (تفعل) کے معنی ہیں کسی چیز کو پاؤں تلے روندنا۔
قرآن پاک کی آیت اِنَّ نَاشِئَۃَ اللَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْأً کے معنی ہیں رات کو عبادت گذاری کیلئے اُٹھنا نفس بھی کو پامال کرتا ہے۔ متفق علیہ روایت ہے : اَللّٰھُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَکَ عَلٰی مُضَرَ اور وَطِئَ اِمْرَأَتَہٗ ہمبستری سے کنایہ ہے۔ مگر کثرتِ استعمال کی وجہ سے عرفاً میں بمنزلہ لفظ صریح کے ہوگیا ہے۔ اور الْمُوَاطَاۃُ کے معنی موافقت کے آتے ہیں اور اس کے اصل معنی دوسرے کے نشانِ قدم پر قدم رکھنے کے آتے ہیں۔
حدیث میں ہے : الا اُخبرکم باحبکم الیَّ واقربکم مجالس یوم القیامۃ اَحَاسِنُکُمْ اَخْلَاقًا اَلْمُوَطَّئُوْنَ اَکْنَافًا۔ کیا میں تمہیں نہ بتلا دوں کہ جن کی مجالس قیامت کے دن میرے نزدیک ہوں گی، وہ وہ لوگ ہیں جو بہتر اخلاق والے ہیں اور جن کے کنارے نرم ہیں، لوگ ان کو روندتے ہیں یعنی خوش اخلاق اور کریم النفس ہونے کی وجہ سے لوگ ان کے پاس اُترتے ہیں۔
ایک روایت میں ہے اُرٰی رُؤْیَاکُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ۔ میں دیکھتا ہوں تمہارے خواب ایکدوسرے سے متفق ہوگئے۔
اسی طرح ایک حدیث میں ہے فَتَوَاطَیْتُ اَنَا وَحَفْصَۃُ : میں اور حفصہ دونوں اس پر متفق ہوگئے۔
تَوَاطَأَ الْقَوْمُ عَلٰی کَذَا۔ قوم کا کسی بات پر متفق ہونا (قرطبی۔ راغب۔ کبیر)
وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَھُمْ وَدِیَارَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْھَا (احزاب) اور (اللہ نے) تمہیں ان کی زمین کا قبضہ دینے کا فیصلہ کردیا ہے جس پر ابھی تک تمہارے پاؤں نہیں پڑے۔ یعنی ابھی تک تم ان مقامات تک پہنچے نہیں ہو، لیکن

اللہ نے اپنے علم ازلی میں تم کو اس کا مالک بنا دیا ہے۔
وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ۔ اور جو چلنا وہ چلے کافروں کو غیض میں لانے والا اور دشمن سے انھیں جو کچھ حاصل ہوا (اُس پر) ان کے لیے (ایک ایک) نیک عمل لکھا گیا۔ مَوْطَأٌ اور مَوْطِئٌ قدم رکھنے کی جگہ۔ مُوَطَّأٌ (مفعول) رَجُلٌ مُوَطَّأُ الْأَكْنَافِ: شریف آدمی۔ اچھے اخلاق والا۔ مہمان نواز۔

اَلِيمًا : إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔

اَلِيمٌ کلام عرب میں مُؤلِمٌ کے معنی میں آتا ہے بمعنی درد دینے والا۔ فعیل کا وزن عام طور پر مُفْعِلٌ کے معنی میں آتا ہے۔ جیسا کہ سَمِيعٌ مُسْمِعٌ عرب کا شاعر ذوالرُّمّہ اپنی ناقہ کی تعریف میں کہتا ہے۔

وَتَرْفَعُ مِنْ صُدُورِ شَمَرْدَلَاتٍ
يَصُكُّ وُجُوهَهَا وَهَجٌ أَلِيمٌ

اَلَمٌ کے معنی سخت تکلیف اور درد کے ہیں۔ أَلِمَ يَأْلَمُ أَلَمًا فَهُوَ أَلِمٌ۔ قرآن پاک میں ہے فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ تو جس طرح تم شدید درد پاتے ہو اسی طرح وہ بھی شدید درد پاتے ہیں اور آلَمْتُ فُلَانًا إِيلَامًا: کسی کو تکلیف پہنچانا۔ اَلِيمٌ کی جمع أُلَمَاءُ آتی ہے۔ جیسے کریم کی جمع کُرَمَاء اور جیسے شریف کی جمع شرفاء اور اَلَمٌ کی جمع آلام آتی ہے بمعنی مصائب۔

اَلِيمٌ في كلام العرب معناه مُؤلِمٌ اى مُوجِع (قرطبی) والايلام، الايجاع۔
والالم، الوجع (قرطبی)

اَلْأَلَمُ: الوجعُ الشديدُ (راغب)

اَلْغَار : ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ

غَارٌ: سے مراد یہاں غارِ ثور ہے۔
غار کھوہ اور پہاڑ کی گہرائی۔ اس کی جمع اَغْوَار و غِيرَان ہے۔ اَلْغَوْرُ کے معنی نشیبی زمین کے ہیں۔ غَارَ الرَّجُلُ وَأَغَارَ: نشیبی زمین میں چلے جانا۔ غَارَتْ عَيْنُهُ غَوْرًا وَغُؤُورًا۔ آنکھ کا اندر کو دھنس جانا۔ أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غَوْرًا یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے۔
کنایہ کے طور پر بطن اور فرج دونوں کو غاران کہتے ہیں۔ اَلْمَغَارُ: لوٹنے کی جگہ۔ ظرف مکان جمع مَغَارَات آتی ہے۔ قرآن میں ہے: لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا۔ اور غَارَتِ الشَّمْسُ غِيَارًا کے معنی سورج کے ڈوب جانے کے ہیں۔ (راغب)

الغَارُ : ثقبٌ فی الجبل (قرطبی)

الغَورُ : پست زمین ۔ زمین میں جذب ہونے والا پانی۔ گڑھا۔ کہتے ہیں فُلَانٌ بعید الغَور یعنی فلاں گہرے نظر کا آدمی ہے۔

غَارَ یَغُورُ غَورًا فَهُوَ غَائِرٌ : پستی کی طرف آنا پانی کا زمین میں جذب ہوجانا

کَلِمَة : وَجَعَلَ کَلِمَةَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی وَکَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا

اور اللہ نے کافروں کی بات نیچے کردی اور اللہ کی بات اونچی رہی۔ کَلِمَةٌ واحد ہے اس کی جمع کَلِمٌ بکسر اللام آتی ہے۔ علم لغت کے مشہور امام فراء نے کَلِمَةٌ میں تین لغت بیان کئے ہیں کِلْمَةٌ و کَلْمَةٌ لام کے سکون کے ساتھ اور کاف کی زیر کے ساتھ اور کَلِمَةٌ بفتح الکاف وسکون اللام جیسے کَبِدٌ وکِبْدٌ وکَبْدٌ اسی طرح وَرِقٌ دورِق و وَرْقٌ ہے۔ قرطبی

کَلْمٌ : اصل میں اس تاثیر کو کہتے ہیں جس کا ادراک قوت سامعہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور کَلْمٌ بمعنی زخم کا ادراک قوت باصرہ سے ہوتا ہے۔

کَلَمْتُهٗ : کے معنی ہیں میں نے اس کو ایسا زخم لگایا جس کا نشان ظاہر ہوا۔ کَلَامٌ : کا اطلاق منظم و مرتب الفاظ اور ان کے معانی دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ

کَلِمَةُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے مراد قریش مکہ کا وہ فیصلہ ہے جو انہوں نے دار الندوہ میں اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا اور کلمۃ اللہ سے مراد خدا کا وعدۂ نصرت ہے جس کی طرف قرآن پاک کی کئی آیات میں اشارہ کیا ہے۔ کما قال وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ

خِفَافًا : اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا :

نکل پڑو خواہ تھوڑے سامان سے ہو یا زیادہ سامان سے۔ علامہ قرطبی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ خفاف وثقال میں اہل علم نے دس اقوال نقل کئے ہیں پہلا قول حضرت ابن عباسؓ سے ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اِنْفِرُوْا ثُبَاتٍ یعنی متفرق جماعتوں میں جہاد کو نکلو۔ دوسرا قول بھی حضرت عبداللہ اور قتادہ سے منقول ہے کہ اِنْفِرُوْا نَشَاطًا وغَیرَ نَشَاطٍ ۔ یعنی خوشی سے یا تنگ دلی سے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ خفیف سے مراد غنی اور ثقیل سے مراد فقیر ہے۔ چوتھا قول خفیف سے مراد شاب و نوجوان اور ثقیل سے مراد شیخ وضعیف ہے۔ حضرت حسن بصری سے یہی منقول ہے۔ پانچواں قول خفیف سے مراد مشغول اور ثقال سے مراد غیر مشغول۔ چھٹا یہ کہ ثقیل وہ انسان ہے جو صاحب عیال ہو اور خفیف وہ جو صاحب عیال نہ ہو۔ ساتواں یہ کہ ثقیل وہ ہے جس کی جائیداد ہو جسے

وہ چھوڑنا پسند نہ کرتا ہو۔ اور خفیف وہ جو اس قسم کے جھنجھٹوں سے بری ہو۔ آٹھواں یہ کہ خفاف پیدل چلنے والے اور ثقال گھوڑے سوار۔
نواں یہ کہ خفاف سے مراد وہ لوگ ہیں جو جہاد میں آگے جانے والے ہیں جیسے مقدمۃ الجیش وغیرہ۔ اور ثقال پورے لشکر کو کہتے ہیں۔ دسواں یہ کہ خفاف سے مراد بہادر ہے اور ثقیل بزدل۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ والصحیح فی معنی الآیۃ ان الناس اُمروا جملۃً صحیح یہ ہے کہ تمام لوگ اللہ کی طرف سے اس بات کے پابند ہیں کہ جب کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی ضرورت پڑے تو کوئی مسلمان بھی پس وپیش نہ کرے، چاہے وہ کسی حال میں بھی ہو۔ (قرطبی ص۱۵۰ ج ۸)

اور آیت کریمہ اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ (انفال ۶۶) اب اللہ نے تم پر تخفیف کر دی۔

علامہ حسین بن محمد الدمغانی نے لکھا ہے کہ مادہ خَفَّفَ پانچ معانی میں استعمال ہوتا ہے۔
۱ الھین ۲ الشان ۳ التیسیر ۴ النقصان ۵ الخفّۃ۔ اُن میں سے خفیف الھین کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت حَمْلًا خَفِيْفًا ای ھَیِّنًا۔ شُبّان کے معنی میں جیسا کہ آیت توبہ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا اور التَّخفِیفُ التَّیسِیرُ کے معنی میں جیسے کہ سورہ نساء کی آیت يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ای یُھَوِّنَ عَلَیکُمْ۔ چوتھا تخفیف بمعنی عذاب میں کمی کرنا۔ جیسے سورہ حٰم المؤمن میں اُدْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ جس سے مراد ہے عذاب میں ایک دن کی کمی کرنا۔ الخِفَّۃُ وزن میں کمی کرنا جیسے آیت کریمہ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ
(قاموس القرآن للدامغانی)

اور الخُفُّ جانور کے کھر جیسے اونٹ گائے وغیرہ الخِفَافُ جوتے۔ خَفَّ ہلکا ہونا۔ کم عقل ہونا خَفَّفَ المَطَرُ بارش کم برسی۔ خَفَّتْ حَالُہٗ اس کی حالت پتلی ہوگئی۔ فِیہِ خِفَّۃٌ اس میں کم عقلی ہے، خَفَّفَ اس نے تخفیف کی۔ اِسْتَخَفَّہٗ اس کو کم درجہ کا سمجھا۔ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ (الزخرف ۵۴) اس نے اپنی قوم کو مغلوب کر لیا اور انہوں نے اس کا کہا مان لیا۔ (ترجمہ ماجدی)
خَفِیفُ الرُّوحِ: لطیف مزاج۔

قَاصِدًا : لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ۔

القَصْدُ: راستہ کا سیدھا ہونا۔ چنانچہ محاورہ ہے قَصَدتُ قَصْدَہٗ میں اس کی طرف سیدھا گیا۔ قَصَدَلَہٗ کسی کی طرف توجہ کرنا وقَصَدَ اِلَیہِ: کسی پر اعتماد کرنا۔ اسی سے اقتصاد ہے

جس کی دو قسمیں ہیں ایک محمود علی الاطلاق
جس میں افراط اور تفریط نہ ہو جیسے سخاوت
جو اسراف اور بخل کے درمیانی درجہ کا نام ہے
اور شجاعت جو لاپرواہی اور بزدلی کے درمیانی
درجہ کو کہتے ہیں۔

قَصَدَ فِی مَشْیِہٖ : سیدھا ہو کر چلا۔
اسی معنی کے لحاظ سے قرآن پاک میں ہے :
وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ اپنے چلنے میں اعتدال رکھو
اقتصاد کی اسی نوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا
قَصَدَ فُلَانًا عَلَی الْاَمْرِ کے معنی ہیں کسی کو کام پر
مجبور کر دینا۔ بولا جاتا ہے اِقْصِدْ بِذَرْعِكَ
اپنے نفس پر قابو رکھو۔ اِقْتَصَدَ فِی الْاَمْرِ
کام میں درمیانہ روی اختیار کرنا۔

دوسرے قصد کا لفظ کنایہ کے طور پر اس
چیز پر بولا جاتا ہے جس کے محمود اور مذموم ہونے
میں شبہ ہو۔ یعنی نہ تو بالکل بری ہو اور نہ ہی اعلیٰ
درجے کی محمود اور مذموم کے بین بین ہو۔ یعنی
عدل و جور کے مابین ہو۔ قرآن پاک میں اسی معنی
کے اعتبار سے ارشاد ہے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ
لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ۔ تو کچھ ان میں
سے نفس پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں۔
چنانچہ آیت کریمہ وَسَفَرًا قَاصِدًا میں قَاصِدًا
سَفَرًا کی صفت ہے جس کے معنی ہوں گے معتدل
سفر جو نہ بہت دور ہو نہ بالکل قریب (راغب)
سَفَرًا قَاصِدًا : ای متوسطاً بین القرب و
البعد (روح) وَسَطاً مُقَارِبًا (کشاف)
قال الزجاج : ای سَهْلاً قَرِیْبًا (کبیر)
لیکن امام راغب فرماتے ہیں قاصد کے معنی قریب کے
کرنا صحیح نہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ متوسط
شئ وہ ہے جو افراط و تفریط سے خالی اور کثرت
وقلت کے درمیان میں ہو۔ مقتصد یا قاصد اس لئے
کہا جاتا ہے کہ ایسی چیز کی طرف ہر آدمی کا قصد ہوتا
ہے۔ ایک حدیث میں ہے اَلْقَصْدَ اَلْقَصْدَ
تبلغو : میانہ روی اختیار کرو مراد پاؤ گے
یہ حدیث علم الاخلاق کی جامع ہے جس میں حکم دیا گیا
ہے کہ انسان کو اپنے تمام امور میں درجۂ توسط اور
اعتدال کو اختیار کرنا چاہیئے۔ قَصْدُ السَّبِیْلِ کے
معنی ہیں سیدھی راہ جو انسان کو بلا خطرا اپنے
مقصود تک پہنچا دے۔ قرآن میں اسی معنی میں فرمایا
گیا ہے وَعَلَی اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ : سیدھی
راہ کی ہدایت اللہ ہی دے سکتا ہے۔

اَلشُّقَّةُ : وہ راستہ جس کا طے کرنا راہ رو
کے لئے دشوار ہو۔ امام راغب فرماتے ہیں :
وَالشُّقَّةُ : النَّاحِیَةُ الَّتِیْ تَلْحَقُكَ الْمَشَقَّةُ
فِی الْوُصُوْلِ اِلَیْهَا۔ یعنی وہ منزل مقصود جس

تک بامشقت پہنچا جائے۔

اَلشِّقُّ : وہ مشقت جو تنگ و دَو سے بدن یا نفس کو لاحق ہوتی ہے جیسا کہ الانکسار کا لفظ بطور استعارہ نفس کی درماندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ۔ زحمتِ شاقہ کے بغیر اپنے مقام تک نہیں لے جا سکتے۔

اصل میں شَقَّ یَشُقُّ شَقًّا کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے یا متفرق کر دینے کے ہیں اسی سے ہے شَقَّ عَصَا الْقَوْمِ : قوم کی جمعیت کو متفرق کر دیا، ان کے اتحاد کو توڑ دیا۔ شَقَّ فُلَانٌ الْعَصَا : فلاں جماعت سے الگ ہو گیا۔

اَلشَّقُّ : شگاف کو کہتے ہیں۔ شَقَقْتُهٗ بِنِصْفَیْنِ : میں نے اس کو دو برابر برابر ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قرآن پاک میں ہے : ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا : پھر ہم نے زمین کو چیرا۔ پھاڑا۔ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ : اور چاند شق ہو گیا۔ یعنی دو ٹکڑے ہو گیا۔ بعض نے اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے معنی وضح الامر کئے ہیں یعنی معاملہ صاف اور واضح ہو گیا۔ یعنی معجزہ شق قمر سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت واضح ہو گئی۔

اَلشِّقَاقُ : مفاعلت کے معنی مخالفت کے آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شِقَاقِیْ کے معنی ہیں میری مخالفت تم کو برانگیختہ نہ کرے۔

وَلٰکِنْ بَعُدَتْ عَلَیْهِمُ الشُّقَّةُ : میں لفظ شُقَّہ سے مراد دُور دراز کے ملکوں کی طرف سفر کرنا ہے۔ جیسا کہ ابوعبیدہ وغیرہ نے بیان کیا ہے ان الشُّقَّۃ : السفر الی ارض بعیدۃ۔ قرطبی

رَیْب : وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ۔ اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، سو اپنے شک میں پڑے ہوئے حیران ہیں۔

رَیْبٌ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق ابتدا میں وہم ہو مگر بعد میں تھوڑے سے غور و فکر سے اس کا ازالہ ہو جائے اور جانب صحیح متعین ہو جائے۔ رَیْبٌ وارتیابٌ کا تعلق اصل میں اعتقاد کے ساتھ ہوتا ہے اور اعتقاد کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اعتقاد جازم ہو تو پھر دیکھنا ہوگا کہ اعتقاد جازم خارج میں واقع کے مطابق ہے یا نہیں اگر واقع کے مطابق نہیں تو اس کو جہل کہا جائے گا اور اگر اعتقاد واقع کے مطابق ہے تو اگر یہ مطابقت ادلہ یقینیہ سے ہے تو اس کو علم کہا جاتا ہے اور اگر اعتقاد کی بنیاد محض اتباع پر ہے تو اس کو اعتقاد المقلِّد کہتے ہیں۔

اور دوسری قسم اعتقاد کی یہ ہے کہ اعتقاد غیر جازم ہو اور اگر اس اعتقاد غیر جازم کی کوئی

ایک طرف راجح ہو تو اس کو ظن کہتے ہیں اور جانبِ مرجوح کو وہم اور اس اعتقاد غیر جازم کی دونوں طرفیں مساوی اور برابر ہو جائیں تو اس کو ریب اور شک کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں[1] انسان نفی اور اثبات کا فیصلہ کرنے سے قاصر اور عاجز ہو جاتا ہے (از کبیر ملخصًا)

یَتَرَدَّدُوْنَ : تردّد کے معنی ہیں حیران و سرگرداں ہونا۔ دل کا آگے پیچھے کرنا (ماجدی)

رَدَّ یَرُدُّ رَدًّا : ہٹا دینا، روکنا۔ ٹال دینا۔

رَدَّ عَلَیْہِ الشَّیْءَ : کسی کی کوئی چیز پھیر دینا۔ واپس کردینا۔ تَرَدَّدَ فِی الْاَمْرِ : کسی کام میں متردد ہونا۔

ثَبَّطَہُمْ : ان کو روک دیا۔ باز رکھا۔

ثَبَّطَہٗ عَنِ الْاَمْرِ : اس کو کسی بات سے روک دیا

اَلثَّبِطُ : اناڑی سست رفتار۔ کام دیر سے کرنے والا۔ فَثَبَّطَہُمْ پس ان کو روک دیا ای حَبَسَہُمْ عَنْکَ وَخَذَلَہُمْ (قرطبی ۱۵۱/۸)

تَرَبَّصُوْنَ : قُلْ ہَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ۔ آپ کہہ دیجئے تو تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں کسی ایک کی انتظار میں ہو۔

تَرَبُّصٌ : کسی کی بھلائی یا برائی کا انتظار کرنا۔ خواہ وہ انتظار وقت، سامانِ تجارت کی گرانی کا ہو جیسا کہ تَرَبَّصَ لِسِلْعَۃٍ : مال کی گرانی کا انتظار کرنا یا انتظار کسی شے کی ارزانی کا ہو یا کسی امر کے واقع ہونے کا یا زائل ہونے کا انتظار ہو۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اَنْ یَّتَرَبَّصَ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ۔ وہ تمہارے حق میں گردشِ زمانہ کا منتظر ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ۔ طلاق عورتیں انتظار کریں۔ و قال اهل المعانی: التربص التمسك بما ینتظر به مجیء عینه (کبیر)

التربص : الانتظار والتمهل (روح)

التربص : الانتظار۔ یقال تربص بالطعام ای انتظر به الی حین الغلاء (قرطبی) اناج کو اس غرض سے گداموں میں اسٹاک کر لینا کہ مہنگا ہو جائے تو فروخت کریں گے یہ بھی تربص ہے۔

التربص : الانتظار بالشیء۔ (راغب)

کُسَالٰی : وَلَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَہُمْ کُسَالٰی۔ اور یہ لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر ہار جی کے ساتھ (ماجدی) گویا نماز میں کاہلی اور سستی نفاق کی علامت ہے۔ اصل میں اَلْکَسَلُ کے معنی کسی ایسے معاملہ میں سستی اور گراں باری ظاہر

---

[1] لفظ ریب حوادث کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ طور میں ارشاد ہے : نَتَرَبَّصُ بِہٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ۔ مجاہد کے قول کے مطابق اس سے مراد حوادثِ زمانہ ہیں۔ اور رِیْبَۃٌ کا لفظ حسرت و ندامت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ رِیْبَۃً فِیْ قُلُوْبِہِمْ (التوبہ) یعنی حَسْرَۃً فِیْ قُلُوْبِہِمْ (قاموس القرآن للدامغانی)

کرنے کے ہیں جس میں ایسا کرنا نہ چاہئے۔ یہی وجہ
ہے کہ کسلان اور سستی کو ہر عقلمند مذموم ہی کہتا ہے
کَسِلَ یَکْسَلُ کَسَلاً۔ سمع سے بمعنی سست ہونا
صیغہ صفت کَسِلٌ وکَسْلَانٌ آتا ہے۔ کسلان ہی
کی جمع ہے کُسَالیٰ وکَسَالیٰ بضم الکاف وفتحہا۔
جیسا کہ سُکَارٰی جمع ہے سَکْرَانٌ کی اور حَیَارٰی
جمع ہے حَیْرَانٌ کی (کشاف۔ کبیر۔ راغب)
اَلْکَسَالَۃُ: بیکاری۔ الکَسُولُ: بڑا سست۔
اِمْرَأۃٌ مِکْسَل: سست عورت جو ناز پروردہ
ہونے کی وجہ سے اپنے گھر میں ہی پڑی رہے۔

تَزْھَقُ: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ
بِھَا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَتَزْھَقَ اَنْفُسُھُمْ
وَھُمْ کٰفِرُوْنَ۔ اللہ تو یہی چاہتے ہیں کہ ان
کو بذریعہ کثرتِ نعم کے دنیا میں عذاب دیتا رہے
اور ان کی روحیں اس حالت میں نکلیں کہ یہ کافر ہوں۔
زَھَقَ یَزْھَقُ زَھْقًا وَزُھُوْقًا: کسی چیز کا
مشکل کے ساتھ نکلنا۔ زَھَقَتْ نَفْسُہٗ کے معنی
ہیں کسی چیز پر رنج وغم سے اس کی جان نکل گئی۔
قرآن پاک میں ہے: قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ
الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا۔
چونکہ باطل کی جب تک سرکوبی نہ کی جائے جاتا
نہیں اس لئے باطل کی طرف زھوق کی نسبت
قرآن پاک نے کی ہے جس سے اشارہ اس طرف
مقصود ہے کہ باطل دشواری اور مشکل سے جاتا ہے
سورہ انبیاء میں اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے
ارشاد فرمایا گیا ہے کہ بل نقذف بالحق
علی الباطل فیدمغہ۔ بلکہ ہم حق کو باطل کے
سر پر مارتے ہیں تو وہ اس کا مغز پھاڑ دیتا ہے۔
وقال صاحب روح المعانی واصل الزھوق
الخروج بصعوبۃ (روح)
زَھَقَتْ نفسہ: خرجت من الاسف علی
الشئ (راغب)
زَھَقَ یَزْھَقُ زُھُوْقًا: زَھَقَ العظمُ ہڈی
کا گودے دار ہونا۔ اور زھق النفس کے معنی ہیں
روح کا جسم سے نکل جانا۔ زھق الشئ: کسی چیز کا
باطل اور ہلاک ہونا۔ صیغہ صفت زَاھِقٌ آتا ہے۔
بمعنی باطل۔ فربہ۔ موٹا۔ جھوٹ اور کذب کو بھی
زاھق کہتے ہیں۔ زاھق کی جمع زُھُقٌ وزُھُوقٌ
آتی ہے۔ مُزْھِقٌ قَاتِلٌ اور مُزْھَقٌ مقتول
اسی [illegible] زَھَاقٌ بفتح الزاء اور زِھَاقٌ
بکسر الزاء بمعنی مقدار اور تقریباً کے آتا ہے۔
کہتے ہیں عندی زَھَاقُ مائۃ دینار: میرے
پاس تقریباً سو دینار ہیں۔

مَلْجَأً: لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَأً اَوْ مَغٰرٰتٍ
اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَیْہِ وَھُمْ یَجْمَحُوْنَ
یہ اگر کوئی سی بھی پناہ گاہ پاتے یا کوئی غار یا کوئی

جگہ گھس بیٹھنے کی تو یہ ضرور مُنہ اٹھا کر اُدھر کو چل پڑتے۔ یعنی اسلام کو مجبوراً اپنائے ہوئے ہے ورنہ اگر گلوخلاصی کی صورت ان کے لئے بن پڑے تو یہ اسلام سے صاف نکل جائیں۔

لَجَأَ يَلْجَأُ لَجَأً وَلُجُوْءً (ف) وَلَجِئَ (س) اِلْتَجَأَ (افتعال) لَجَأَ اِلَيْهِ وَاِلْتَجَأَ: پناہ لینا۔ اِلْتَجَأَ اِلَى الْحِصْنِ اَوْغَيْرِهٖ: قلعہ وغیرہ میں پناہ لینا

تَلْجِئَةٌ: باب تفعیل کا مصدر ہے لَجَّأَ تَلْجِئَةً کے معنی ہیں مال کو بعض ورثا کے لئے خاص کر دینا۔ وراثت سے زیادہ دینا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نعمان کے والد بشیر رضؓ کو فرمایا: هٰذِهٖ تَلْجِئَةٌ فَاَشْهِدْ عَلَيْهِ غَيْرِىْ۔ یعنی یہ تو تلجئہ ہے، مراد ایک وارث کو دوسرے ورثاء سے زیادہ دلانا ہے۔ یہ آپؐ نے اس وقت فرمایا جب نعمانؓ کو ان کے والد بشیرؓ نے دوسرے بیٹوں سے زیادہ دلایا اور حضورؐ کو گواہ بنانا چاہا تھا تو آپؐ نے اس پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اس تقسیم پر میرے سوا کسی دوسرے کو گواہ بناؤ۔ اور لفظ تلجئہ کسی ایسے فعل پر مجبور کرنے پر بھی بولا جاتا ہے جس کا ظاہر باطن کے خلاف ہو۔

اللَّجَأُ: مصدر ہے اور مَلْجَأٌ کے معنی میں بھی آتا ہے جمع اَلْجَاءٌ۔ واحد لَجَأَةٌ اور اَلْمَلْجَأُ کی جمع مَلَاجِئُ آتی ہے جائے پناہ، حصن، قلعہ۔ بخاری کتاب الدعوات میں براء بن عازب کی روایت ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوتے وقت یہ دعا پڑھ لیا کرو اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْهِىْ اِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِىْ اِلَيْكَ وَاَلْجَأْتُ ظَهْرِىْ اِلَيْكَ رَهْبَةً وَّرَغْبَةً اِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجٰى مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ الخ (بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۳۴ نور محمدی)

اَلْجَأْتُ ظَهْرِىْ اِلَيْكَ سے مراد ہے میرا تیرے اوپر بھروسہ و اعتماد ہے۔ اَلْجَأْتُ اَمْرِىْ اِلَى اللّٰهِ۔ میں نے اپنا کام اللہ پر چھوڑ دیا۔ لَجَأَ اِلَيْهِ کے معنی ہیں کسی کی پناہ لینا یا کسی کی پناہ میں آجانا اور لَجَأَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں اس کو چھوڑ کر دوسرے کی پناہ لینا۔ تَلَجَّأَ من القَوْمِ قوم سے جدا ہو کر دوسروں کی پناہ لی۔

لَجَأْتُ اِلَيْهِ لَجَأً (بالتحریک) وَمَلْجَأً وَالْتَجَأْتُ اِلَيْهِ: بمعنًى (قرطبی)

وَاَلْجَأْتُهٗ (افعال) اِلَى الشَّئِ: اى اضطررته

والملجأ: الحصن (قرطبی)

لفظ ملجأ مصدر، ظرف مکان اور ظرف زمان تینوں کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن یہاں بظاہر ظرف مکان ہے (جمل)

اصل میں لَجَأَ يَلْجَأُ کے معنی ہیں مجبوری اور خوف کی بناء پر کسی دوسرے کی طرف امداد اور حفاظت کے لئے جھکنا۔

مَغَارَاتٍ: یہ غَارَ يَغِيْرُ (ض) سے مَغَارَةٌ

کی جمع ہے۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اَغَارَ (افعال) یُغِیْرُ سے مُغَارَۃٌ (بضم العین) کی جمع ہو۔ اور مَغَارَۃ: ہر وہ مقام جس میں انسان داخل ہو کر اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ اور مُغَارَۃ ظرف مکان ہے۔ وہ جگہ جہاں لوٹ ڈالی جائے۔

قال ابن عباس المغارات: الغیران والسرادیب[1] وھی المواضع التی یستتر فیھا (قرطبی)

مَغَارَۃ، غار کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن بعض اہل لغت نے ان دونوں میں فرق بیان کیا ہے۔ جیساکہ صاحب روح المعانی نے نقل کیا ہے کہ غار پہاڑ میں ہوتا ہے، مَغَارَۃ زمین میں۔ بعض اہل قرآت نے مُغَارَات پڑھا ہے یعنی میم کے ضمہ کے ساتھ، افعال سے۔ کہتے ہیں اَغَارَ الرَّجُلُ: آدمی نے اپنے آپ کو تہہ میں داخل کر لیا۔ یا لشیئ زمین میں چلا گیا۔ آیت کریمہ میں مغارات سے مراد وہ جگہیں ہیں جہاں انسان اپنے آپ کو چھپا سکے۔

اَمکِنَۃٌ یغیرون فیھا اشخاصھم (روح)

مُدَّخَلًا: یہ باب افتعال سے ہے۔

اِدَّخَلَ یَدَّخِلُ اِدِّخَالًا: کسی جگہ میں مشقت کے ساتھ داخل ہونا۔ یہ مُفْتَعَلٌ کے وزن پر ہے۔ تا، کو دال سے بدل کر دال کو دال میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ قراء میں سے بعض نے مَدْخَلًا ثلاثی مجرد سے میم کے فتح کے ساتھ ظرف مکان کا صیغہ پڑھا ہے، داخل ہونے کی جگہ۔ وھی قراۃ ابی اسحٰق والحسن (روح) اور ابوسلمہ بن محارب نے باب افعال سے مُدْخَلًا (بضم المیم وفتح الخاء) پڑھا ہے۔ اس صورت میں مراد وہ مکان اور جگہ ہوگی جہاں داخل کیا جائے تو مَدْخَلٌ بفتح المیم والخاء۔ وہ مکان جہاں انسان اپنی منشاء اور رضا سے داخل ہو۔ مُدْخَلٌ میم کے ضمہ سے، مراد وہ مقام ہے جہاں داخل کیا جائے۔ پھر اگر یہ ادخال عزت سے ہے تو مُدْخَلٌ کریم ہے۔ قرآن پاک میں ہے رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ اے پروردگار مجھے اچھی طرح داخل کیجیو۔ مُدْخَلًا کَرِیْمًا۔ وہ جگہ جہاں عزت و احترام سے داخل کیا جائے۔ مراد اس سے جنت ہے بعض اہل تفسیر نے ان تینوں الفاظ کو مترادف قرار دیا ہے۔ مگر امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ ان تینوں کے محامل الگ الگ ہیں۔

قال: فالملجأ یحتمل الحصون، والمغارات یحتمل الکھوف فی الجبال، والمدخل السَّرَبُ تحت الارض (کبیر)

یَجْمَحُوْنَ: وَھُمْ یَجْمَحُوْنَ۔

جَمَحَ یَجْمَحُ جَمْحًا وَجِمَاحًا وَجُمُوْحًا: گھوڑے کا

[1] سرادیب: سرداب کی جمع ہے بمعنی تنگ مکان (جمل)

تیزی کے ساتھ دوڑے جانا اور سوار کے قابو سے باہر ہو جانا۔ پھر یہیں سے آدمی کی سرکشی کرنے پر بولے جانے لگا ہے۔ وَهُمْ يَجْمَحُونَ کا معنی یہ ہیں کہ اگر ان کو کوئی تھوڑا سا بھی سہارا ملتا کہیں سے تو وہ سرپٹ دوڑ پڑتے اور اُس سہارے کی طرف یوں بھاگتے جیسے بدکے ہوئے گھوڑے ہوں۔ يَجْمَحُونَ ای يسرعون. والمعنی لو وجد واشيئا من هذه الاشياء المذكورة لولوا اليه مسرعين هربا من المسلمين (قرطبی)

جَمَحَ الفَرَسُ براكبه۔ گھوڑا اپنے سوار کو لے کر بھاگ نکلا۔ سوار کے قابو سے باہر ہو گیا۔ اعمش کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے يَجْمَحُونَ کو يَجْمِزُونَ پڑھا ہے تو جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے يَجْمَحُونَ کو يَجْمِزُونَ کیوں پڑھا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ يَجْمَحُونَ يَجْمِزُونَ اور يَشْتَدُّونَ تینوں کے ایک ہی معنی ہیں[1] (الکشاف ۲۸۱)

بخاری کتاب الغسل کی حدیث نمبر ۳ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ جب پتھر ان کے کپڑے لے کر بھاگا تو حضرت موسیٰ اُس کے پیچھے دوڑے۔ فَجَمَحَ مُوسٰى على اثره يقول ثوبي يا حجر (بخاری)

جمح فی اثرہ: کسی کے پیچھے بھاگنا۔ جَمَحَتِ المَرْأَةُ زَوْجَهَا عورت خاوند کے گھر سے بھاگ گئی۔

يَلْمِزُ: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ

اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ (تقسیم) صدقات میں آپ پر طعن کرتے ہیں۔ یعنی تقسیم صدقات میں عدل سے کام نہیں لیا جاتا۔

لَمَزَ يَلْمِزُ (ض۔ ن) لَمْزًا عیب لگانا۔ آنکھ سے اشارہ کرنا اور ساتھ ہی خفی آواز سے منہ سے کچھ بڑبڑانا۔ لَمَّازٌ او لُمَزَةٌ بہت نکتہ چینی کرنے والا۔ عیب گیر۔ چغل خور۔ لُمَّازٌ بضم اللام سامنے غیبت کرنے والا۔ اللُّمَّازُ: المغتابون بالحضرة (منجد) يَلْمِزُهُ و يَلْمُزُهُ نصر اور ضرب دونوں ابواب سے آتا ہے۔ کسی کی غیبت کرنا اور کسی پر عیب لگانا۔ قرآن پاک میں اس کا استعمال ضرب ہی سے ہوا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ۔ اور وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ۔ اصل میں لَمْزٌ کے معنی پوشیدہ طور پر کسی پر عیب لگانے اور آنکھ سے اشارہ کر کے کسی کی برائی کرنے کے ہیں۔ واللمز فی اللغة العيب فی السر (قرطبی)

---

[1] جمز یجمز: جلدی کرنا اور جمز یجمز (ن) سخت ہونا۔ (حاشیہ کشاف)

وقال الجوهری: اللمز العيب واصله
الاشارة بالعين (قرطبی)
لَمزٌ اور ھمزٌ دونوں قریب المعنیٰ ہیں۔ بعض اہل
لغت نے ان دونوں الفاظ میں یہ فرق بیان کیا
ہے کہ لمز کے معنیٰ ہیں منہ در منہ برائی بیان کرنا۔
اور ھمز کے معنیٰ پیٹھ پیچھے برائی کرنا اور بعض کا قول
اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایک فرق یہ بیان کیا گیا ہے
کہ ھُمزہ: لوگوں کا عیب گیر اور لمزہ: لوگوں کے
نسب پر طعن کرنے والا۔ زجاج کے نزدیک معلوم
ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔
قال الزجاج: لَمَزْتُ الرجلَ اَلمِزُہٗ۔ وکذا
ھَمَزْتُہٗ اَھْمِزُہٗ ھَمْزًا اذا عَیَّبْتَہٗ۔
والھُمَزَۃُ اللُّمَزَۃُ الذی یغتاب الناس
وَیُعَیِّبُھُمْ وھٰذا یدلّ علی انّ الزجاج
لَمْ یُفَرِّق بَیْنَ الھَمْز واللَّمْز (کبیر)
حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اکثر مفسرین
نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ھمز کے
معنیٰ غیبت یعنی کسی کی پیٹھ پیچھے اس کے عیوب
کا تذکرہ کرنا ہے اور لمز کے معنیٰ آمنے سامنے
کسی کو طعنہ دینا اور برا کہنے کے ہیں (معارف)
یَلمِزُونَ یُعِیبُونَ (بخاری) اور بخاری کتاب الادب
میں ہے یھمز ویلمز یعیب ویغتاب۔
الرِّقَاب: وَفِی الرِّقَابِ وَالغَارِمِینَ
اس میں رِقَابٌ رقبۃ کی جمع ہے۔ اصل میں گردن
کو کہتے ہیں۔ عرف میں اس شخص کو کہتے ہیں کہا جاتا
ہے جس کی گردن کسی دوسرے کی غلامی میں مقید ہو[1]
اَلْغَارِمِینَ: یہ غارم کی جمع ہے جس کے معنی
مدیون یعنی قرض دار کے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے
نزدیک غارم اس مدیون کو کہا جاتا ہے جس پر
اتنا قرض ہو کہ سزاءً اس کو قید کیا جاسکے
انما الغارم من علیہ دینٌ یُسجن فیہ۔ قرطبی
والغارمین ھم الذین رَکِبَھُمُ الدَّینُ
ولا وفاء عندھم بہ (قرطبی)
غَرِمَ (س) غُرْمًا وغُرْمًا وغَرامۃً ومَغْرَمًا
غَرِمَ فی التجارۃ: تجارت میں ٹوٹا ہونا۔ وہ
مالی نقصان جو کسی قسم کی خیانت یا جنایت کا ارتکاب
کئے بغیر انسان کو اٹھانا پڑجائے۔
اُغْرِمَ فُلَانٌ غَرَامَۃً: کے معنی ہیں فلاں کو
تاوان پڑگیا۔ سورہ واقعہ میں ہے اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ
بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ۔ غریم کا لفظ قرضدار
اور قرضخواہ دونوں پر بولا جاتا ہے۔
اصل میں ہر اس مشکل کام کو غرم کہتے ہیں جو
انسان کو لاحق ہو کر مشقت اور گراں باری میں
مبتلا کردے۔ امام فخر الدین رازی نے
زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ اصل الغرم
فی اللغۃ لزوم ما یشقّ (کبیر)

[1] معارف

عذابِ دوزخ کو بھی غَرام اس لئے کہتے ہیں کہ وہ انسان کے لیے بڑی مشکل ہے۔ اسی سے ہر امرِ شاق کو غَرام کہہ دیا جاتا ہے۔ عشق و محبت کو بھی غَرام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صاحبِ عشق و محبت کو امرِ شاق میں ڈال دیتا ہے۔ مغرم بالنساء اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو عورتوں کا پرستار ہو۔ یعنی مارے محبت کے ان کے پیچھے پیچھے گھومتا رہے چونکہ دَین اور قرض بھی انسان پر نہایت شاق اور گراں ہوتا ہے اس لئے اسے بھی غَرام کہا جاتا ہے۔ وسُمّی الدَّینُ غَرامًا لکونه شاقًا علی الانسان ولازمًا له (کبیر)

الغُرمُ ما ینوب الانسان فی ماله من ضَررٍ لغیر جنایة او خیانةٍ (مفردات)

غریم کی جمع غُرماء اور غُرّام آتی ہے۔

والغُرمُ: اصله لزوم شیٔ شاق (جمل)

اصل الغرم فی اللغة لزوم مایشق علیه النفس وسُمّی الدین غُرمًا لکونه شاقًا علی الانسان (خازن)

نَخُوْضُ: اِنَّمَا کُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ۔

ہم تو محض مشغلہ اور خوش طبعی کرتے تھے۔ خَاضَ یَخُوْضُ خوضًا، نَصَرَ سے آتا ہے جس کے اصل معنی پانی میں اُترنے اور اس کے اندر چلے جانے کے ہیں اور پھر بطور استعارہ کسی کام میں مشغول ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور زیادہ تر اس کا استعمال فضول کاموں میں وقت ضائع کرنے پر ہوتا ہے ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔ پھر ان کو چھوڑ دو کہ وہ اپنی بیہودگیوں میں کھیلتے رہیں (راغب)

والخوض الدخول فی الماء۔ ثم استعمل فی کل دخول فیه تلویث واذی (قرطبی)

یُؤْتُوْنَ: وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَیُطِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ اور زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

لفظ ایتاء لغت میں ایسے عطا کرنے پر بولا جاتا ہے جس میں دینے والا لینے والے کو شے کا مالک بنا دے قرآن پاک میں یہ لفظ صدقاتِ واجبہ کے ادا کرنے پر بولا جاتا ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں الایتاء: الاعطاء وخص وضع الصدقة فی القرآن بالایتاء۔ یعنی ایتاء کے معنی عطا کرنے کے ہیں اور قرآن میں صدقہ واجبہ ادا کرنے کو ایتاء کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس لفظ سے فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے کیونکہ عطا کرنے کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ اس چیز کا مالک بنا دیا جائے۔

صدقات و زکوٰۃ کے علاوہ بھی لفظ ایتاء قرآن میں مالک بنا دینے کے معنی میں ہی بیان ہوا ہے مثلاً وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ۔ یعنی عورتوں کو حق مہر دیدو۔ تو ظاہر ہے کہ حقِ مہر کی ادائیگی

جب ہی تسلیم ہوتی ہے جب مہر کی رقم پر عورت
کا مالکانہ قبضہ ہو جائے (معارف ملخصًا)

لَا تَعْتَذِرُوْا : لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيْمَانِكُمْ

تَعْتَذِرُوْا : یہ باب افتعال سے ہے اور عُذْرٌ سے
ماخوذ ہے۔ عُذْرٌ وہ حجت جس کی بنا پر عذر
بیان کیا جائے۔ اس کی جمع اَعْذَارٌ آتی ہے عُذر
کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔

اوّل یہ کہ ارتکابِ جرم کا قطعًا انکار کر دیا
جائے۔ دوسری یہ کہ وجہ جرم بیان کرے جس سے
اس کی برأت ہو سکے۔ سوم یہ کہ جرم کے بعد
آئندہ ارتکابِ جرم نہ کرنے کا وعدہ کرے۔
اس آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے۔
جس سے معلوم ہوا کہ توبہ عذر کی ایک قسم
ہے تو ہر توبہ کو عذر کہا جائیگا مگر ہر عذر کو
توبہ نہیں کہا جائے گا۔

لفظ عُذْرٌ غلبہ اور تسلّط کے معنی میں بھی استعمال
ہوتا ہے۔ جنگ کے موقع پر کہا جاتا ہے لِمَنِ
العُذْرُ : غلبہ کس کو حاصل ہے۔

يَعْتَذِرُوْنَ إِلَيْكُمْ : وہ تم سے عُذر بیان
کریں گے۔ قُلْ لَا تَعْتَذِرُوْا ان کو کہہ دیجئے
عذر بیان نہ کریں۔ اَلْمُعَذِّرُ تفعیل سے جو اپنے
آپ کو معذور ظاہر کرے مگر معذور نہ ہو۔

وَجَاءَ الْمُعَذِّرُوْنَ میں اس طرف اشارہ
ہے کہ جھوٹے عذر بیان کرتے ہوئے آئے
اور جو واقعی صحیح عذر بیان کرنے والا ہو اس کو
مُعْذِرٌ (افعال) کہتے ہیں۔ امام راغب نے
ابن عباس کا قول نقل کیا ہے۔ لَعَنَ اللّٰهُ
الْمُعَذِّرِيْنَ وَرَحِمَ الْمُعْذِرِيْنَ یعنی
جھوٹے عذر پیش کرنے والوں پر خدا کی لعنت
اور صحیح عذر پیش کرنے والوں پر خدا رحم کرے۔

عَذَرَ يَعْذِرُ عُذْرًا : اس میں دو لغت ہیں حرف
ذال کے فتح اور ضمہ دونوں سے مستعمل ہے۔ عُذْرٰی
مَعْذُوْرَةٌ اور مَعْذِرَةٌ بھی مصادر ہیں۔
قرآن پاک میں ہے مَعْذِرَةً إِلٰى رَبِّكُمْ کہ میں
تمہارے رب سے عذر قبول کرنے کی درخواست پیش کرتا ہوں
أَعْذَرَ : افعال سے جب استعمال ہوتا ہے تو اس کے
معنی ہوتے ہیں عذر خواہی کر کے اپنے آپ کو معذور
ثابت کر دینا۔ اَعْذَرَ مَنْ اَنْذَرَ کے معنی ہیں جس
نے ڈر سنایا وہ معذور ہے۔

اِعْتَذَرْتُ اِلَيْهِ کے معنی ہیں میں نے اس کے
سامنے عذر بیان کیا اور اَعْذَرْتُهُ میں نے اس
کا عذر قبول کیا۔ قرطبی نے ابن الاعرابی کے حوالہ
سے نقل کیا ہے کہ عذر کے اصل معنی قطع کرنے اور
کاٹنے کے ہیں۔ اور عَذَرْتُ اِلَيْهِ کے معنی ہیں
قَطَعْتُ مَا فِيْ قَلْبِهِ مِنَ الْمَوْجِدَةِ : یعنی میں نے

اس کی دل کی ناراضگی کو کاٹ دیا۔ اسی سے عُذْرَۃُ الغُلَامِ ہے۔ اس ماس کو کہا جاتا ہے جو ختنہ کے وقت کاٹ دیا جاتا ہے۔ اور عُذْرَۃُ الجَارِیَۃِ: بکارت۔ اسی کنواری عورت کو عَذْرَاء کہتے ہیں۔ اس کی جمع عذاری آتی ہے۔ حدیث میں ہے مَالَكَ وَلِلعَذَارِی وَلِعَابِهِنَّ: تجھ کو کنواری لڑکیوں اور ان کے کھیل کود سے کیا کام (بخاری کتاب النکاح) مَعْذِرَۃٌ: عذر۔ بہانہ۔ اس کی جمع مَعَاذِرُ آتی ہے اور مِعْذَارٌ کی جمع مَعَاذِیرُ آتی ہے بمعنی بہانہ۔ عذر۔ مُعْتَذِرٌ: عذر چاہنے والا اسی کی مناسبت سے اعتذرتِ المیاہ: پانی کے سرچشے خشک ہو گئے اور اِعْتَذَرَتِ المَنَازِلُ: مکانوں کے نشانات مٹ گئے۔ عَذِرَۃٌ: نجاست اور گندگی کو کہا جاتا ہے۔ اور اُس عورت کو عَاذِرَۃ کہتے ہیں جس کو استحاضہ کا خون آتا ہو۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ اصل میں عَذِرَۃٌ کے معانی مکانات کے سامنے کھلے میدان کے ہیں اور اُس نجاست کو عَذِرَۃٌ کہتے ہیں جو اُن میدانوں میں لوگ ڈال دیتے ہیں۔ بعض کتب حدیث میں ہے: اَلیَهُودُ اَنْتَنُ خَلْقِ اللّٰهِ عَذِرَۃً کہ یہودی خدا کی ساری مخلوق سے زیادہ صحنوں کو گندہ رکھنے والے ہیں۔ عَذِرَۃٌ پلیدی اور گندی اشیاء اور ردی چیزیں۔ تَعَذَّرَ عَلَیْهِ الاَمرُ کام کا دشوار ہونا۔ عُذْرٌ: برأت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ حدیث میں ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ لَمَّا نَزَلَ عُذْرِی (ابوداؤد) یعنی جب مسئلہ اِفک میں خدا نے مجھے بری کر دیا۔

اعتَذَرَ اور اَعْذَرَ: ہم معنی استعمال ہوتے ہیں یعنی عذر والا ہونا۔ لبید کہتا ہے:

الی الحول ثم اسم السلام علیکما
من یبك حولاً کاملا فقد اعتذر

اہل تفسیر نے لفظ اعتذار میں اہل لغت کے دو قول نقل کئے ہیں ایک یہ کہ اعتذر کے معنی گناہ کے اثر کو زائل کرنے کے ہیں اور اعتذرت المنازل سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مکانات پرانے ہو گئے اور ان کے نشانات مٹ گئے۔ کہتے ہیں مررت بمنزل معتذر: میرا گذر ایسے مکان پر ہوا جس کے نشانات مٹ چکے تھے۔ تو چونکہ عذر کرنے والا اپنے گناہوں کا گویا کہ ازالہ کرتا ہے اس لئے اس کو معتذر کہتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اعتذار کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں اور اعتَذَرَتِ المِیَاہُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں پانی کے چشمے بند ہو گئے پانی بہنے سے کٹ گیا۔ تو چونکہ عذر ملامت کو قطع

کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ اس مناسبت سے اسے عذر کہتے ہیں۔ فالعذر لما کان سببًا لقطع اللوم سُمّی عُذرًا (کبیر) واحدی کہتے ہیں کہ یہ دونوں قول قریب المعنی ہیں۔ چونکہ گناہ کا اثر محو کرنا اور ملامت کا قطع کرنا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے وھما علی ما قال الواحدی متقاربان (روح)

اغْلُظْ : وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۔ ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

غَلَظَ يَغْلُظُ (ن) ويَغْلِظُ (ض) وغَلُظَ (ک) غِلَظًا وَغِلْظَةً وَغَلْظَةً وغُلْظَةً وغِلَاظَةً موٹا ہونا۔ سخت ہونا۔ کھردرا ہونا۔ گاڑھا ہونا۔ صیغہ صفت اس میں سے غلیظ کے وزن پر آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران) اس کی جمع غِلَاظٌ آتی ہے قرآن میں ہے عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ غَالِظٌ کے وزن پر بھی صیغہ صفت آتا ہے۔ اس کی جمع غَلَظَةٌ (بفتح اللام) آتی ہے۔

غِلظۃٌ یہ رقت کی ضد ہے اصل میں ان کا تعلق اجسام کے ساتھ ہوتا ہے۔ معانی میں ان کا استعمال کبیر اور کثیر کی طرح بطور استعارہ ہوتا ہے۔

امام راغب نے غلظۃ کے معنی خشونۃ کئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مفردات کے نزدیک غِلظۃٌ سے مراد سخت مزاجی ہے۔ چونکہ خشونۃ کا تعلق مزاج ہی سے ہوتا ہے وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ای خشونۃً (راغب) لیکن یہ ملحوظِ نظر رہے کہ سخت مزاجی اور بدمزاجی میں بہت بڑا فرق ہے۔ بدمزاجی عیب اور نقص ہے جبکہ مزاج کی سختی عدل و انصاف کے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔

وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ میں لفظِ غِلظ کے اصل معنی یہ ہیں کہ مخاطب جس طرزِ عمل کا مستحق ہے اس میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے۔ یہ لفظ رَأْفَةٌ کے مقابل استعمال ہوتا ہے جس کے معنی رحمت اور نرم دلی کے ہیں۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اس جگہ غلظت سے مراد عملی غلظت ہے کہ ان پر احکامِ شرعیہ جاری کرنے میں کوئی رعایت نہ برتی جائے کلام اور زبان میں غلظت اختیار کرنا مراد نہیں کیونکہ وہ سنتِ انبیاء کے خلاف ہے، وہ کسی سے سخت کلامی اور سب و شتم نہیں کرتے تھے۔ قرطبی نے ایک حدیث نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذَا زَنَتْ اَمَةُ اَحَدِكُمْ فَلْيَجْلِدْهَا الْحَدَّ وَلَا يُثَرِّبْ عَلَيْهَا۔ یعنی اگر تمہاری کوئی باندھی زنا کی مرتکب ہو تو اس پر حدِ شرعی جاری کرو، اور اس پر طعن و تشنیع نہ کرو۔ مقصد یہ کہ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ سے مراد احکامِ شرعیہ

کے جاری کرنے میں عدمِ رعایت ہے۔ گفتگو اور خطاب میں غلظت ہرگز مراد نہیں اور نہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ کفار اور منافقین سے گفتگو اور خطاب میں غلظت اختیار فرمائی ہو (معارف)

اِسْتَغْلَظَ : کے معنی ہیں موٹا ہونے یا سخت ہونے کے لئے تیار ہونا۔ اور کبھی شئی کے موٹا ہو جانے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ۔ پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

الغِلَظُ نَقِيضُ الرَّأفَةِ، وهي شِدَّة القلبِ على احلال الأمر بصاحبه (قرطبی)

ومعنى الغِلظ خشونة الجانب (قرطبی)

لفظ تغلیظ کسی پر سختی کرنے کے معنی میں آتا ہے بخاری کتاب التفسیر میں ہے اَتَجْعَلُوْنَ عَلَيْهَا التَّغْلِيْظَ۔ کیا تم حاملہ عورت پر سختی کرتے ہو کہ اس کی عدت کو وضع حمل کے بعد قرار دیتے ہو۔ چونکہ حاملہ عورت کی عدت وضع حمل کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ وضع خاوند کے مرنے کے فوراً بعد ہو جائے۔ مسئلہ کی تحقیق فقہ کی کتابوں میں ہے۔

مُطَّوِّعِيْنَ : اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ

الْمُطَّوِّعِيْنَ۔ مُطَّوِّعِيْنَ اصل میں مُتَطَوِّعِيْنَ ہے تا کو طا میں مدغم کر دیا گیا۔ یہ تفعّل سے اسم فاعل ہے۔ منطوع۔ وہ جو ایسا نیک کام کرے جو اس پر واجب نہیں (قرطبی) یہ اصل میں طَوْعٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دل و جان سے کسی کی تابعداری کرنا اور مطیع ہو جانا اس کا مقابل کُرْہٌ آتا ہے جس کے معنی ہیں ناگواری کے ساتھ کسی کام کو انجام دینا۔

طَاعَةٌ بزیادۃ التاء کے معنی بھی یہی ہیں لیکن طاعۃ کا لفظ عام طور پر کسی کے بجا لانے پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ، وَطَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ۔

مُطَاعٌ : سردار۔ جس کی پیروی اور اتباع کی جائے مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ۔ سردار اور امانت دار ہے اور جب اس کو باب تفعّل میں لے جائیں یعنی تَطَوُّع بنائیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں تکلیف اٹھا کر بھی حکم بجا لانا۔ استطاعۃ : یہ بھی طَوْعٌ سے استفعال ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کو سر انجام دینے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ موجود ہوں۔ مگر محققین کے نزدیک استطاعۃ تام نام ہے اُن اسباب و ذرائع اور صلاحیتوں کے حاصل ہونے کا جن کے ذریعہ انسان کو کام کرنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے اور وہ چار چیزیں ہیں :

۱۔ فاعل ۲۔ فعل کا تصور ۳۔ مادہ جو فعل کے
اثر کو قبول کرے ۴۔ آلہ۔ اگر فعل کسی آلہ کا محتاج ہو
تو اس آلہ کا فراہم ہونا اور کسی شخص کو ان چیزوں میں
سے کوئی چیز حاصل نہ ہو تو اس کو غیر مستطیع کہا جائیگا۔
طَاعَ اور اَطَاعَ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔
البتہ بعض نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ طَاعَ کے معنی
ہیں خوشی سے اطاعت کرنا اور اَطَاعَ عام ہے
اسی طرح اِسْتَطَاعَ اور اَسْطَاعَ ہم معنی ہیں۔
قرآن میں ہے۔ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ
وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا۔

اَلْمُخَلَّفُوْنَ : فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ
بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ خوش ہوگئے
پیچھے رہنے والے اپنے بیٹھ رہنے سے جدا ہو کر
رسول اللہ سے۔ (عثمانی)
مُخَلَّفُوْنَ مُخَلَّفٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں
متروک یعنی جس کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس میں اشارہ
اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ تو یہ سمجھ کر
خوش ہو رہے ہیں کہ ہم نے اپنی جان کو مصیبت
میں ڈالنے سے بچا لیا اور جہاد میں مسلمانوں کا ساتھ
نہیں دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
ان بدنصیبوں کو نا اہل قرار دیکر شرکتِ جہاد کی
فضیلت سے خود روک دیا ہے اور انھیں اس قابل
ہی نہیں سمجھا کہ یہ جہاد کی فضیلت کو پا سکیں۔
تو یہ تارکِ جہاد نہیں متروکِ جہاد ہیں۔
والمُخَلَّفُ: المتروك (قرطبی)
خَلَّفَ الشَّيْءَ: پیچھے چھوڑنا، متروک کرنا، موٴخر کرنا۔

مَقْعَدٌ : یہ لفظ یہاں مصدر میمی ہے
بمعنی قعود کے۔ قَعَدَ يَقْعُدُ قُعُوْدًا و مَقْعَدًا
اصل میں یہ قیام کی ضد ہے۔ لغوی معنی یہ ہیں
کہ کھڑے ہونے سے بیٹھنا اور یہ اضداد میں سے
ہے۔ چونکہ کبھی اس کے معنی کھڑے ہونے کے بھی
آتے ہیں۔ قَعَدَ قُعُوْدًا قَامَ (منجد)
قَعَدَ بِهٖ بٹھانا۔ قَعَدَ مِنْ حَاجَتِهٖ: موٴخر کرنا۔
یہ بھی احتمال ہے کہ مَقْعَد یہاں ظرف مکان کے
معنی میں ہو یعنی بمعنی جائے قیام۔ اس کی جمع
مَقَاعِد آتی ہے مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (آل عمران)

خِلَافَ : خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ لفظ
خلاف کے یہاں معنی پیچھے اور بعد کے ہیں۔ اور
ظرفیت کی بنا پر منصوب ہے۔ اور بقول ابوالبقاء کے
اس میں مَقْعَدٌ مصدر ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے
جیسا کہ صاحب روح المعانی نے فرمایا ہے کہ اس کا
عامل فَرِحَ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد پر چلے جانے کے بعد آپ
پیچھے رہ جانے پر خوش ہو گئے ہیں۔ مفتی بغداد
اور صاحب کشاف نے اسی کو اختیار کیا ہے۔
دوسرے معنی خلاف کے مخالفت کرنے کے ہیں

جیسا کہ صاحب قرطبی نے ذکر کیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرکے گھر میں بیٹھ گئے اور خوش ہو گئے

یَضْحَکُوْا : فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا وَّلْیَبْکُوْا کَثِیْرًا سو وہ تھوڑے دن ہنس لیں اور (آخرت میں) بہت دن روتے رہیں۔

یہ دونوں صیغے لِیَضْحَکُوْا اور لِیَبْکُوْا صورۃً اگرچہ امر ہیں لیکن مراد ان سے محض خبر ہے چونکہ اس خبر کا وقوع یقینی اور حتمی ہے۔ اس لئے بصیغۂ امر بیان کئے گئے ہیں۔ قاضی بیضاوی اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں اخرجہ علی صیغۃ الامر للدلالۃ علی انہ حتم و واجب (بیضاوی)

ضَحِکَ (س) ضَحْکًا وضِحْکًا: خوشی اور انبساط کیوقت اس طرح ہنسنا کہ چہرے کے دانت ظاہر ہوجائیں۔ اور چونکہ ہنستے وقت سامنے کے دانت ظاہر ہوجاتے ہیں اسلئے ان کو ضَوَاحِکْ کہتے ہیں اور بطور استعارہ کے ظاہر ہونے کے معنی میں بھی لفظ ضحک کا استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں ضَحِکَتِ الارضُ عَنِ النَّبَاتِ زمین کا نبات اگانا۔ ضَحِکَ الطَّرِیْقُ: راستہ کا ظاہر ہونا۔ ضَحِکَ الشَّیْبُ برأسہٖ سر میں بڑھاپے کے آثار کا نمودار ہونا۔

اور بطور استعارہ کے ضَحِک تمسخر کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے چنانچہ ضَحِکْتُ مِنْہُ کے معنی ہیں میں نے اس کا مذاق کیا اور آیت کریمہ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ میں یَضْحَکُوْنَ مذاق اڑانے کے معنی میں ہے۔ اسم فاعل ضَاحِک کے وزن پر آتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے فَتَبَسَّمَ ضَاحِکًا۔

نوٹ : لفظ ضحک کی پوری تحقیق (انشاء اللہ العزیز) سورہ ہود کی آیت وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

لِیَبْکُوْا : یہ اصل میں یبکون تھا لام امر کیوجہ سے نون اعرابی گر گیا ہے۔ بَکٰی یَبْکِیْ بُکًی وبُکَاءً غم کے ساتھ آنسو بہانا اور رونا۔ بکٰی کے دو مصدر ہیں ان دونوں میں بعض اہل لغت نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ اگر رونے میں آواز غالب ہو تو اس کو بُکَاءً (ممدود) کہا جاتا ہے جیسے کہ رُغَاءٌ اور ثُغَاءٌ۔ اور اس طرح دوسرے اسمائے اصوات جو صوت کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ اور اگر غم غالب ہو تو اس کو بُکًی (بالقصر) کہا جاتا ہے۔ صیغۂ صفت کا بَاکٍ آتا ہے۔ اس کی جمع بُکَاۃٌ ہے اور باکی کی جمع بَاکون اور بُکِیٌّ آتی ہے۔ قرآن میں ہے: وَخَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا۔

بُکِیًّا: اصل میں بُکُوْیٌ ہے، فُعُوْلٌ کے وزن پر جیسے سَاجِدٌ وسُجُوْدٌ۔ رَاکِعٌ ورُکُوْعٌ اور قَاعِدٌ وقُعُوْدٌ واؤ کو یاء سے تبدیل کرکے یاء میں مدغم کردیا گیا ہے جیسے جَاثٍ وجُثِیٌّ وعَاتٍ وعُتِیٌّ۔

بکٰی کے اصل معنی تو غم اور حزن کی بناء پر آنسو

بہانے کے ہیں۔ سَالَ دَمْعُہٗ حَزَنًا (منجد)
مگر کبھی آنسو بہانے اور کبھی صرف غم کھانے کے معنی
میں مستعمل ہوتا ہے (راغب) اور بکاء کے ساتھ آنسو
بہانا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ فَمَا
بَکَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ میں یہی معنی مراد ہیں
بَکَّاءٌ: بہت رونے والا۔ بخاری شریف میں ہے:
کَانَ اَبُوْبَکْرٍ رَجُلًا بَکَّاءً لَا یَمْلِکُ عَیْنَیْهِ: ابوبکر
بڑے رونے والے آدمی تھے، ان کو اپنی آنکھوں پر قابو
نہیں تھا یعنی ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہتے تھے
بَاکِیَۃٌ: رونے والی، اس کی جمع بَاکِیَاتٌ اور بواکی
ہے۔ حدیث ابن ماجہ میں ہے ولکن حمزۃ لا بَوَاکِیَ
لہ۔ لیکن حمزہ کو کوئی رونے والی نہیں ہے[1]۔
تَبَاکٰی: بتکلف رونا۔ حدیث میں ہے فان لم
تجدوا بکاءً فتباکوا۔ اگر رونا نہ آئے تو رونے
کی صورت ہی بنالو۔
مَبْکٰی: رونے کی جگہ۔ ظرف مکان ہے۔ امام باڑہ
جمع مَبَاکٍ ماتم گاہیں۔

قَبْرِہٖ: وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ اِنَّهُمْ کَفَرُوْا
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوجیے
انہوں نے بلاشبہ خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے
قبر کے معنی میت کو دفن کرنے کی جگہ کے ہیں۔
القبر فی المشہور مدفن المیت (روح) قَبَرَ (ن ض)
قَبْرًا ومقبرًا۔ میت کو قبر میں دفن کرنا۔ اور اَقْبَرَہٗ
کے معنی ہیں کسی کے لئے قبر تیار کرنا تاکہ اس کو دفن
کیا جاسکے۔ یعنی قبر کا مہیا کرنا جیسے اَسْقَیْتُہٗ کے
معنی ہیں پینے کے لئے پانی مہیا کرنا۔ ثُمَّ
اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ۔ پھر اس کو موت دی پھر ان کو
قبر میں دفن کیا۔ بعض نے یہ معنی بھی بیان کئے ہیں
کہ اس کو الہام کیا کہ کس طرح دفن کیا جائے۔
مقبرۃ: قبرستان، جہاں مُردے دفن کئے جاتے
ہیں۔ اس کی جمع مقابر آتی ہے۔ حَتّٰی زُرْتُمُ
الْمَقَابِرَ۔ اور قبر کی جمع قُبُوْرٌ آتی ہے۔
قرآن پاک میں ہے اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ۔
اَلْقَبْرُ اَوَّلُ مَنَازِلِ الْاٰخِرَۃِ۔ قبر آخرت کے
منازل میں سے پہلی منزل ہے۔ لَا تَجْلِسُوْا عَلَی
الْقُبُوْرِ قبروں پر بیٹھو نہیں نَهٰی عَنْ زَائِرَاتِ
الْقُبُوْرِ وَلَعَنَ الْمُتَّخِذِیْنَ عَلَیْهَا الْمَسَاجِدَ
وَالسُّرُجَ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں
کو قبروں کی زیارت سے منع فرمایا اور ان لوگوں
پر لعنت فرمائی جو قبروں پر سجدے کرتے ہیں اور ان
پر چراغاں کرتے ہیں۔
قُبَّرَۃٌ: ایک قسم کی چڑیا ہے
آیت کریمہ عبداللہ بن اُبَی منافق کے واقعہ کے بعد
نازل ہوئی ہے۔ اس آیت کے نزول کے بعد منافقین کا
جنازہ پڑھنا قطعًا ممنوع ہوگیا۔ اور حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس کے بعد کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں

[1] ابن ماجہ۔ باب ما جاء فی البکاء علی المیت۔

پڑھائی۔ حضرت عمر احتیاطاً کسی مجہول الایمان آدمی کے جنازے میں اس وقت تک شریک نہ ہوتے جب تک حضرت حذیفہ جنازے میں شریک نہ ہوتے۔ چونکہ حضرت حذیفہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے منافقین کے نام اور حالات سے آگاہ کر دیا تھا اسی لئے ان کا لقب صاحب سر رسول اللہ ہے

خَوَالِف : رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہ جانے والوں کے ہمراہ رہ جائیں۔ الخوالف سے مراد یہاں بعض اہل تفسیر کے نزدیک عورتیں ہیں چونکہ یہ خالفۃ کی جمع ہے اور فاعل کی جمع فواعل کے وزن پر نہیں آتی۔ عورتوں کی اصل اور فطری ذمہ داری چونکہ گھریلو امور کی نگرانی ہوتی ہے اسلئے وہ گھر میں بیٹھنے والیاں کہلاتی ہیں۔ شریعت نے جو مشاغل مرد کے ساتھ مخصوص کئے ہیں ان میں سے ایک جہاد ہے۔ عورتوں کو اس سے شریعت نے الگ رکھا ہے اور ان کی فطری کمزوریوں کی باعث ان پر یہ فریضہ عائد نہیں کیا گیا۔ آیت میں لفظ خوالف کے ضمن میں ان لوگوں پر طنز ہے جو جہاد سے جی چراتے ہیں کہ اچھے خاصے مرد ہو کر عورتیں بنے جاتے ہو۔ یہ عورتوں کے ساتھ تشبیہ دینا مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ منافقین پر بڑا گراں گزرا (کبیر)

خَالِفَةٌ : اس آدمی کو بھی کہتے ہیں جس میں کوئی بھلائی اور خیر نہ ہو بلکہ اخلاق رذیلہ میں ملوث غیر شریف ہو کہتے ہیں فُلَانٌ خَالِفَةُ اَهْلِهٖ یعنی وہ اپنے خاندان اور اہل والوں پر نہیں مرتبہ میں ان سے کم ہے۔ وقد يقال للرجل : خالفةٌ و خالفٌ ايضًا اذا كان غير نجيبٍ (قرطبی)

نحاس کہتے ہیں کہ اصل میں یہ خَلَفَ اللَّبَنُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دودھ کا کھٹا ہو جانا۔ فاعل کی جمع فواعل کے وزن پر صرف دو الفاظ کی آتی ہے ایک فارس کی جمع فوارس اور دوسری هالك کی جمع هَوَالِك

الْخَيْرَاتُ : اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ اور انہی کے لئے خوبیاں ہیں۔

لفظ خیرات مطلق ہونے کی وجہ سے دنیوی اور اخروی دونوں عالموں کی خوبیوں کا جامع ہے۔ تناول منافع الدارين (مدارك وكبير)

بعض نے کہا ہے کہ خیرات سے مراد یہاں نیک سیرت اور خوبصورت جنتی حوریں ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے فِيْهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ۔

بعض اہل لغت کے نزدیک خَيْرَاتٌ کی اصل خَيِّرَاتٌ (بتشدید الیاء) ہے تخفیف کے لئے ایک یاء کو حذف کر کے خَيْرَاتٌ بنایا گیا ہے۔ یہ خَيْرَةٌ کی جمع ہے جس کی اصل خَيِّرَةٌ ہے۔ ایک یا کو حذف کیا گیا ہے جیسا کہ هَيِّنَةٌ وهَيْنَةٌ۔ کہا جاتا ہے هٰذا خيرُ الرِّجَالِ وهٰذِهٖ خيرةُ النِّسَاءِ (راغب قرطبی)

مُعَذِّرُوْنَ: وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ۔ اور دیہاتیوں میں سے بہانہ باز لوگ آئے کہ انہیں اجازت مل جائے۔ (ماجدی)

مُعَذِّرِیْنَ یہ مُعَذِّرٌ کی جمع ہے مُعَذِّر ایسے عذر کرنے والے کو کہتے ہیں جس کے پاس حقیقۃً کوئی عذر نہ ہو اور وہ محض بہانہ کر رہا ہو۔ (ازہری)

بغوی نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ مُعَذِّرِیْنَ وہ لوگ ہیں جو عذر نہ رکھتے ہوں اور عذر پیش کریں۔

اَلْمُعَذِّرُ هو المظهرُ لِلْعُذْرِ اِعْتِلَالًا من غير حقيقة له في العذر وهو لا عذر له۔۔۔۔ والمعذرين الذين يَعْتَذِرُوْنَ بلا عذر (لسان)

هو الذين لا عذر لهم ولكن يتكلفون عُذْرًا (تاج) بلکہ معتذر اور مُعَذِّر کے درمیان فرق یہ ہے کہ معتذر کا عذر ممکن ہے کہ صحیح ہو اور ممکن ہے کہ غلط ہو لیکن مُعَذِّر کا عذر ہمیشہ غلط ہی ہوگا۔ اعتذر يكون مُحقًّا ويكون غير مُحِقٍّ والمعذِّر الذين ليس بمحق يعتذر بلا عذر (لسان)

قال الازهرى قد يكون المعذر غير محق وهُمُ الذين يعتذرون بلا عُذْرٍ (تاج)

المعذرون، کو اہل قرأت نے دو طرح پڑھا ہے اَلْمُعْذِرُوْنَ بسکون العین و تخفیف الذال۔ المدرج اور ضحاک۔

اور اسی طرح ابو کریب نے عن ابی بکر عن عاصم کی سند سے بھی یہی قرأۃ نقل کی ہے۔

جوہری کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ بھی یونہی پڑھا کرتے تھے اور قسم کھا کر کہتے ہیں کہ واللہ هكذا اُنْزِلَت۔ کہ خدا کی قسم یہ آیت اس طرح اتری ہے۔ لیکن ابن عباسؓ کی طرف اس نسبت کا مدار کلبی پر ہے جو محدثین کے نزدیک غیر ثقہ ہے۔ عرب کہتے ہیں۔ قَدْ اَعْذَرَ مَنْ اَنْذَرَ: جس نے ڈر سنا یا وہ بے عذر ہو گیا اس نے عذر اپنے سر سے اتروایا۔

دوسری مشہور قرأت اسمیں اَلْمُعَذِّرِیْنَ (بتشدید الذال) ہے اس میں پھر دو قول ہیں ایک یہ کہ مُعَذِّرُوْنَ اصل باب افتعال سے ہے جس کی اصل مُعْتَذِرُوْنَ ہے تاء کو ذال میں تبدیل کر کے ادغام کر دیا گیا ہے اور حرف تاء کی حرکت عین کو دے دی گئی ہے جیسا کہ سورہ یٰس کے جملہ وهم يَخِصِّمُوْنَ (بفتح الخاء) کو پڑھتے ہیں ان حضرات کے نزدیک معتذر اس کو کہا جائے گا جس کا عذر صحیح ہو جیسا کہ لبید کا شعر ہے۔

إلى الحول ثم اسم السلام عليكما
ومن يبك حولا كاملا فقد اعتذر

فقد اعتذر ای جاء بعذرٍ صحیحٍ (کبیر)
دوسرا قول یہ ہے کہ، مُعَذِّرُوْن، مُفَعِّلُ کے وزن پر تَعْذِیْرٌ سے ماخوذ ہے یعنی یہ باب تفعیل سے ہے اس صورت میں ان حضرات کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مُعَذِّرٌ وہ ہے جس کے پاس حقیقۃً کوئی عذر نہ ہو بلکہ وہ محض بہانہ بناتا ہو۔
کہتے ہیں عَذَّرَ فلانٌ فی امرکذا تَعْذِیْرًا یعنی اس نے کام میں کوتاہی کی پوری طرح اسے کیا نہیں۔ تو مُعَذِّر کا مطلب یہ ہوا کہ عذر میں کوتاہی کرنے والا۔ بہانہ باز۔

چنانچہ ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ لَعَنَ اللّٰہُ المُعَذِّرِیْنَ: اللہ مُعَذِّرِیْنَ پر لعنت کرے۔ (قرطبی)
اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
کان الامر عندہ بالتشدید ھو المظھر للعذر اعتلالا من غیر حقیقۃ لہ فی العذر (قرطبی)

ابوالعباس محمد بن یزید کہتے ہیں اس کی اصل معتذرون قرار دینا درست نہیں وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں ادغام ماننا پڑتا ہے جس کی وجہ سے التباس واقع ہوتا ہے، اور اسماعیل ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ، خلیل کے قول کے مطابق یہاں ادغام نہیں ہے چونکہ سیاق کلام کی دلالت اس پر ہے کہ مُعَذِّرِیْنَ فعل مذموم کے مرتکب ہیں جبکہ اعتذار میں یہ بھی احتمال ہے کہ ان کا عذر صحیح ہو جیسا کہ اوپر گزرا۔ (واللہ اعلم)

اَعْرَابٌ: اَعْرَابٌ۔ یہ لفظ عربی کی جمع نہیں ہے بلکہ اسم جمع ہے جو دیہات کے باشندوں کے لیے بولا جاتا ہے اس کا مفرد بنانا ہو تو اعرابی کہتے ہیں جیسے انصار کا مفرد انصاری آتا ہے۔ (معارف)
اعرابی کی دوسری جمع اعاریب بھی آتی ہے جس کو عرب کے فصیح شعراء نے اپنے کلام میں اختیار کیا ہے۔ وجمع الاَعْرَابِیُّ۔ اَعْرَابٌ واعاریبُ
(قرطبی) (کبیر)

اور اعراب کا اطلاق بدوی دیہاتی لوگوں پر ہوتا ہے۔ ھم اھل البدو (کشاف)
الاعراب سُکَّانُ البَادِیَۃِ خاصۃ۔ (قرطبی)
صَارَ ذٰلِکَ اِسمًا لِسُکَّانِ البَادِیَۃِ (راغب)
عرب کے شہری لوگ اپنے آپ کو اعراب کہلانا پسند نہیں کرتے جبکہ دیہاتی اور بدوی کو جب عربی کہا جائے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اگر کسی شہری کو یا اعرابی کہا جائے تو وہ ناراض ہوگا اور اگر کسی دیہاتی کو یا عربی کہا جائے تو وہ خوش ہوگا۔ علامہ راغبؒ فرماتے ہیں کہ۔ اَلعَرَبُ وَلَدُ اسمٰعیل علیہ السلام۔ وَالاَعْرَابُ جَمْعُہٗ فی الاصل وصار ذالک اسما لسکان البادیہ۔ اور اعرابی بھی اسکا مفرد

ہے، فرق دونوں میں یہ ہو گیا ہے کہ لفظ عرب کا اطلاق شہریوں پر اور اعرابی کا دیہاتیوں پر ہوتا ہے۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ اعراب، عرب کی جمع نہیں بلکہ سیبویہ کے قول پر یہ اسم جمع کا صیغہ ہے جس کی کوئی واحد نہیں اسی لئے جب کسی کو اعراب کی طرف منسوب کرنا ہو تو اسی صیغہ اصل کے آگے صرف حرف یاء کا اضافہ کرکے اعرابی کہتے ہیں اور مراد اس سے مفرد لیا جاتا ہے اور مفہوم اسے بادیہ نشین ہوتے ہیں۔

عرب کی وجہ تسمیہ : عرب کو عرب کیوں کہتے ہیں؟ اس کے مختلف جواب دیئے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ عرب، اعراب سے مشتق ہے جس کے معنی زبان آوری اور اظہار ما فی الضمیر کے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ : اَلثَّیِّبُ تُعْرِبُ عَنْ نَفْسِهَا، کہ ثیبہ عورت خود اپنے دل کی بات ظاہر کرے گی۔ تو عرب چونکہ زبان آور اور فصیح ہیں اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو عرب اور اپنے ماسوا کو عجم کہا عجم کے معنی ہیں بے زبان جو ما فی الضمیر کو پوری فصاحت سے ظاہر نہ کر سکے۔

علامہ رازی لکھتے ہیں کہ میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ بعض حکماء نے تجزیہ کے طور پر یہ کہا ہے کہ رومیوں کی حکمت ان کے دماغوں میں ہے اسی لئے وہ عجیب، وغریب اشیاء کی ترکیب دیتے ہیں اور ہندوؤں کی حکمت اوہام میں ہے اور یونانیوں کی حکمت ان کے دلوں میں ہے اس لئے وہ عجیب وغریب مباحث چھیڑتے ہیں اور عرب کی حکمت ان کی زبان میں ہے الفاظ میں شیرینی اور کلام میں حلاوت رکھتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں، کہ حقیقت میں یہ صرف نکتہ آفرینی ہے اور دقت رسی ہے، دنیا میں ہر قوم اپنی زبان کی اسی طرح جوہری ہے جسطرح عرب۔

دوسری وجہ علمائے انساب نے بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس ملک کا پہلا باشندہ یعرب بن قحطان تھا جو یمنی عربوں کا جدِ اعلیٰ تھا لیکن یہ قول کئی وجوہات کی بناء پر صحیح معلوم نہیں ہوتا ایک اسلئے کہ تاریخی اعتبار سے یعرب، عرب کا پہلا باشندہ نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ لفظ عرب کسی عربی قاعدہ لسانی کے موافق یعرب کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا اور پھر تیسری وجہ یہ کہ یعرب یمن کا باشندہ تھا تو اگر اسی کی مناسبت سے ملک کا نام عرب ہوا تو پہلے خود یمن یعنی جنوبی عرب کو عرب کہنا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس لفظ عرب شمالی عرب کیلئے مستعمل ہوتا ہے۔

عرب کی وجہ تسمیہ میں تیسرا قول اہل جغرافیہ

کاہے جس کو اکثر اہل علم نے صحیح تسلیم کیا ہے وہ
یہ کہ عرب کا پہلا نام عَرَبَةٌ تھا جو بعد میں کثرت
استعمال میں تخفیفاً عرب بولا جانے لگا ہے اور پھر
بعد میں اس ملک کے رہنے والوں کو بھی عرب کہنے
لگے عرب کے شعراء نے بھی اس کا قدیم نام یہ
ہی ذکر کیا ہے اسد بن حاصل کہتا ہے

وعربةٌ أرضٌ جَدٌّ في الشرا هذها
كما جَدَّ في شُرْبِ النُّقَاخِ ظماءٌ

اور اسلام کے بعد تک بھی یہ نام معروف تھا
چنانچہ ابو سفیان کلبیؓ مدح رسولؐ میں کہتے ہیں ۔

أبونا رسولُ اللهِ وابنُ خليلهِ
بعَرَبَةَ بَوَّأنا فنعم المركبُ

رہا یہ سوال کہ اس ملک کا نام عرب کیوں ہوا
تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام سامی زبانوں میں عربہ
کا لفظ صحراء اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے اور خود
عربی زبان میں اس مفہوم قدیم کے بقایا موجود ہیں
عَرَابَہ کے معنی بدویت کے اور اَعْرَاب اہل
بادیہ اور صحرانشینوں کے لئے اب تک مستعمل ہے ۔
چونکہ عرب کا ملک زیادہ تر بیابان اور بے
آب و گیاہ ہے اور خاص کر وہ حصہ جو حجاز سے
بادیہ عرب و شام اور سینا تک پھیلا ہوا ہے
اس لئے اس کا نام عربہ اور اعراب قرار پایا
جو رفتہ رفتہ عرب میں تبدیل ہوگیا ۔

قرآن مجید میں حضرت اسماعیل کی سکونت کے
ذکر میں وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ یعنی وادی ناقابل
کاشت ، اس کو کہا گیا ہے اکثر لوگ اسکو عرب
کی حالت کا بیان سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے
کہ یہ لفظ عربہ کا بعینہٖ ترجمہ ہے چونکہ اس عہد
میں اس غیر آباد ملک کا کوئی نام نہ تھا اسلئے خود
لفظ غیر آباد اسکا نام پڑ گیا ۔ واللہ اعلم ۔
مزید تحقیق کیلئے ارض القرآن کا مطالعہ کیا جائے ۔
لفظ عرب کی تصغیر عُرَيْبٌ آتی ہے ۔
عبدالمومن بن عبدالقدوس کہتا ہے ۔ شعر

وَمَكْنُ الضباب طعام العُرَيْبِ
وَلَا تشتهيه نفوس العجم

مکن سے گوہ وغیرہ کے انڈے مراد ہیں ۔
العرب العاربہ خالص عرب جنکا تعلق
اسماعیل سے ہو ۔ اور العرب العرباء
بھی مستعمل ہے ۔ اور العرب المستعربہ
جو بعد میں آکر عرب میں بسے اور عرب کہلانے
لگے ۔ لفظ عربی کی جمع قشیری کے قول کے
مطابق عَرَبٌ آتی ہے ۔
اعراب الکلام : کلام کی فصاحت کو واضح کرنا
اور علماء نحو کی اصطلاح میں اعراب کا لفظ
کلمات کی آخری حرکات و سکنات پر بولا جاتا
ہے عَرَبِيٌّ بتشدید الیاء فصیح کلام کو کہا جاتا ہے ۔

قُرْآنًا عَرَبِيًّا واضح اور فصیح قرآن، اور اِمْرَأَۃٌ عَرُوْبَۃٌ وہ عورت جو اپنے خاوند سے اظہار محبت کرے اسکی جمع عُرُبٌ آتی ہے۔

قرآن میں ہے عُرُبًا اَتْرَابًا۔ تَرٰی اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ آیت ۹۲

دَمْعٌ: آنسو۔ دَمَعَتِ الْعَيْنُ۔ آنکھ آنسو سے تر ہوگئی۔ لَهٗ عَيْنٌ دَامِعَۃٌ اسکی آنکھ آنسو بہانے والی ہے۔ مَكَانٌ دَامِعٌ تر جگہ جہاں نمی ہو۔ اِمْرَأَۃٌ دَامِعَۃٌ جو عورت فرطاً تُرسے فوراً رو پڑے۔ جَفْنَۃٌ دَامِعَۃٌ لبالب بھرا ہوا قدح۔ تَرٰی اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ۔ آپ انکی آنکھیں دیکھیں گے کہ اُن میں آنسو بہہ رہے ہیں۔ (توبہ: ۹۲ - المائدۃ: ۸۳)

اَجْدَرُ: اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ: اور گنوار بہت سخت ہیں کفر میں اور نفاق میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ سیکھیں وہ قاعدے جو نازل کیئے اللہ نے اپنے رسول پر۔ (ترجمہ عثمانی)

وَاَصْلُهٗ مِنْ جَدَرَ الْحَائِطُ وَهُوَ رَفْعُهٗ بِالْبِنَاءِ: فَقَوْلُهٗ هُوَ اَجْدَرُ بِكَذَا اَیْ اَقْرَبُ اِلَيْهِ وَاَحَقُّ بِهٖ۔ (قرطبی)

جَدَرَ يَجْدُرُ جَدْرًا۔ جَدَرَهٗ: لائق اور کام کے مناسب بنانا: جَدَرَ الْجِدَارَ: دیوار سے گھرنا۔ اور جَدُرَ (ک) جَدَارَۃً: لائق اور اہل ہونا۔ اس سے صفت کا صیغہ جَدِیْرٌ فَعِیْل کے وزن پر آتا ہے۔ کہتے ہیں: فُلَانٌ جَدِيْرٌ بِكَذَا: فلاں اس کام کیلئے قابل اور لائق ہیں۔ اسکی جمع جُدَرَاءُ اور جَدِيْرُوْنَ آتی ہے۔

الجدار: اور الحائط، دونوں دیوار کے معنی میں مستعمل ہیں لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جدار اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ بلند اور زمین کی سطح سے اونچی ہے اور الحائط اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ مکان کا احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ جدار کی جمع جُدُرٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے اَوْ مِنْ وَّرَاءِ جُدُرٍ۔ اور جَدَّرْتُ الْجِدَارَ کے معنی ہیں دیوار کو اتنا اونچا کرنا کہ اس کے سایہ میں بیٹھا جاسکے۔

اور جَدَرَ الرَّجُلُ: کسی کا دیوار کی اوٹ میں ہوجانا۔ پھر یہیں سے ارتفاع اور بلندی کے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے جَدَرَ الشَّجَرُ کہا جاتا ہے درخت کی کونپل کا نکل آنا۔ فعل تعجب اسمیں مَا اَجْدَرَهٗ وَاَجْدِرْ بِهٖ۔

آتا ہے. وہ اس کے لئے کس قدر زیبا ہے (راغب)
اور جُدِرَ الصبیُّ بچے کو چیچک نکل آئی۔ اسمیں بھی ارتفاع کے معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔
اَلْجَدِیْرُ: لائق اور سزاوار، جسکی طرف کام کی انتہا ہو جیسے دیوار تک پہنچ کر انتہا ہو جاتی ہے۔
الجدیر: المنتھی لانتھاء الامر الیہ انتھاءَ الشیئِ الی الجِدَار (راغب، جمل)
دیہاتی لوگ قدرتی طور پر عموماً تندخو اور سخت مزاج ہوتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے۔ مَنْ سَکَنَ الْبَادِیَۃَ جفا۔ اور مجالس علم وحکمت سے دور رہنے کیوجہ سے علم وعرفان کی روشنی بہت کم قبول کرتے ہیں۔

اَلدَّوَائِر: وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ؕ

وہ تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں انہیں پر بُری مصیبتیں واقع ہوں۔
الدوائر: دائرۃ کی جمع ہے۔ عربی لغت کے اعتبار سے دائرۃ اس بدلی ہوئی حالت کو کہتے ہیں جو پہلی اچھی حالت کے بعد بُری ہو جائے۔ (معارف القرآن)
بعض اہل تفسیر نے نقل کیا ہے کہ دائرہ وہ مصیبت ہے جس سے نجات نہ ہو سکے اور دائرہ کی طرح انسان کو گھیر لے۔ الدَّوائِرُ

ھی المصائبُ التی لاَ مَخْلَصَ منھا تحیط بہ کما تحیط الدائرۃ۔ (بحر)
یہ دَارَ یَدُوْرُ دَوْرًا نًا سے ماخوذ ہے جسکے معنی چکر لگانے اور گھومنے کے ہیں۔ گردشِ زمانہ کو دائرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسان پر چکر لگاتا رہتا ہے۔ اور الدَّار منزل یا مکان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ چار دیواری سے گھرا ہوتا ہے۔ دَارُالسَّلَام: سلامتی کا گھر اور دَارُالْبَوَار: ھلاکت کا گھر۔
وَالدَّائِرَۃ: عبارۃٌ عن الخط المحیط۔ ثُمَّ عُبّر بھا الحادثۃُ (راغب)
والدَّوائِر: جمع دائرۃ، وھی الحالۃ المنقلبۃ عن النِّعمۃ الی البَلِیَّۃِ (قرطبی)
اور اگر بُری حالت کے بعد اچھی حالت عود کر آئے تو اسے دَوْلَۃٌ کہتے ہیں۔
دائرہ: مصیبت اور نائبہ کا اسم ہے جو اصل میں مصدر ہے جیسا کہ: کاذبۃ عافیۃ مصدر ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دَارَ یَدُوْرُ سے اسم فاعل ہو (روح)
واصلھا دَاوِرَۃٌ لاِنَّھا مِنْ دَارَ یَدُوْرُ اَیْ اَحَاطَ۔ فقلبتِ الواوُ ھمزۃً (جمل)

اَلسَّوْءُ: لفظ سَوْء اصل میں مصدر ہے

اور اس کا اطلاق ہر ضرر اور شر والی چیز پر کیا جاتا

ہے اور بعض اھل تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ دائرۃ
کی صفت ہے اور یہ اضافۃ موصوف الی صفتہ
کے قبیل سے جس سے جیسے مقصود مبالغہ ہوتا ہے جیسا کہ
رَجُلُ صِدْقٍ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اضافت بیانیہ
ہو چونکہ لفظ دائرۃ معنی سوء کا مقتضی ہے۔

علمائے قرأت میں سے ابن کثیر اور ابو عمرو نے یہاں
اور اسی طرح سورہ الفتح میں عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ
السُّوْءِ میں دونوں جگہ ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے
تو ضمہ کی صورت میں یہ اسم ہونگے مصدر نہیں
ہونگے۔

علم لغت کے مشہور امام فراء نے ان دونوں
میں یہی فرق کیا ہے کہ السُّوْ بالضم اسم
اور بالفتح مصدر ہے۔ ابو البقاء کا قول یہ
ہے کہ السُّوْء یہ مصدر ہے۔ اور سُؤْتُہٗ
سَوْءً وَمَسَاءَۃً وَمَسَائِیَۃً سے ماخوذ ہے
اور اگر بالفتح پڑھا جائے تو اس سے مراد فساد
اور ردائۃ ہوتی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ سوء
بالضم اور سوءٌ بالفتح دونوں اسم کے
معنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ (روح)

معنوی اعتبار سے بڑا لطیف فرق علامہ راغب
نے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔ اَلسُّوْءُ
کُلّ مَا یَغُمُّ الانسانَ من الامور الدنیویۃ
والاخرویۃ یعنی سُوْءٌ ہر وہ چیز ہے
جو انسان کو غم میں مبتلی کر دے اسکو سُوْءٌ
کہتے ہیں، خواہ وہ دنیوی امور کے قبیل سے ہو
یا اُخروی۔ اور دائرۃ السَّوْءِ کے تحت لکھتے
ہیں: مَا یَسُوْءُ ھُوَ فِی العاقبۃ (راغب)
یعنی سَوْءٌ ہر وہ چیز جو انجام کار غم کا موجب
ہو۔ قرآن پاک میں سَاءَتْ مَصِیْرًا اور
سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا: اسی قبیل سے ہیں۔
قال الفراء السَّوْء بالفتح مصدر سُؤْتُہٗ
سَوْءً۔۔۔ والسُّوْءُ (بالضم) اسم لا
مصدر (قرطبی) اکثر اھل لغت کا رجحان
اسی طرف ہے کہ سوء بالضم اسم اور بالفتح
مصدر ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ دو مقامات پر
بالاتفاق لفظ سَوْء کو فتح کے ساتھ پڑھا
جائیگا، ایک سورہ مریم میں ماکان ابوک
امْرَأَ سَوْءٍ۔ اور دوسرا وظننتم ظَنَّ السَّوْءِ۔
وجہ اسکی یہ ہے کہ سوء بالضم اسم ہے
جس سے مراد عذاب ہے تو اسکو ضمہ کے ساتھ
پڑھا جائے تو تقدیر کلام یہ نکلتی ہے کہ: مَاکَانَ
اَبُوْكِ اِمْرَأَ عَذَابٍ۔ اور یہ غلط ہے اور اسی
طرح ظَنَّ السَّوْءِ میں ضمہ پڑھنے کی صورت میں
تقدیر کلام ظن العذاب ہوگی جو خلاف مراد
ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہوسکتی۔ (کبیر)

صلوٰۃ : اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ بیشک آپکی دعا اُن کیلئے موجب تسکین ہے۔ صلوۃ کے معنی دعا دینے، تحسین وتبریک. تعظیم کرنے اور نشو نما دینے کے آتے ہیں۔ صَلَّيْتُ عَلَيْهِمْ میں نے اسکو دعا دی. اسکو بڑھایا۔ حدیث میں ہے۔ اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ اِلٰى طَعَامٍ فَلْيُجِبْ وَاِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ. یعنی تم میں سے کسی کو دعوت دی جائے تو قبول کرو اور اگر کوئی روزے سے ہو تو وہ صرف دعا کرکے چلا آئے۔ ایک دوسری روایت میں ہے جسکو مسلم وبخاری دونوں نے ذکر کیا۔ کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا اتاہ قومٌ بصدقتہم قال: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ فاتىٰ ابو اوفى بصدقتہٖ فقال اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ اَبِي اَوْفٰى۔

شریعت میں لفظ صلوٰۃ مخصوص عبادت کیلئے بولا جاتا ہے جو مخصوص شرائط وارکان کے ساتھ اوقات معینہ میں ادا کی جاتی ہے۔ لفظ صلوٰۃ کئی طرح استعمال ہوتا ہے۔ اگر صلوٰۃ اللّٰہ کیطرف سے ہو تو اس کے معنی نزول رحمت اور خیر وبرکت عطا کرنے کے ہوتے ہیں جیسا کہ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ اور اگر ملائکہ کی طرف سے ہو یا نبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی طرف سے ہو تو اسکی معنی دعائے برکت کے ہوتے ہیں اور یہاں بھی لفظ صلوٰۃ خیر وبرکت کی دعا ہی کے معنی میں ہے الصَّلٰوۃ ھنا الرحم والترحم (قرطبی)

وقد مر البحث۔

سَكَنٌ : سَكَنٌ، لفظ سَكَنٌ کو بسکون الکاف بھی بعض حضرات نے پڑھا ہے جس کے معنی قتادہ کے قول کے مطابق وقار کے ہیں. اور مشہور قرأت اسمیں بفتح الکاف ہے وہ چیز جسے انسان کے دل کو تسکین حاصل ہو۔ والسَّكَنُ مَا تَسْكُنُ بِهِ النفوس وتطمئن بہ القلوب۔ (قرطبی)

اَبَدًا : خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا : اَبَدَ يَأْبِدُ اُبُوْدًا۔ بالمکان: کسی جگہ ٹھرنا، اقامت کرنا۔

اَبَدَ الشاعرُ: ایسے مشکل اور غریب الفاظ لانا جن کا معنی سمجھنا دشوار ہو۔ اَبَدَ اُبُوْدًا۔ اَبَدَ الحیوانُ: حیوان کا جنگلی اور وحشی ہونا۔ اَبِدَ (س) علیہ غضبناک ہونا کسی پر غصہ کرنا اور تَاَبَّدَ المَكَانُ مکان کا ویران اور غیر آباد ہو کر جنگلی جانوروں کا مسکن بن جانا اَلْاَبَدُ: زمانہ۔ جمع آباد واُبُوْدٌ آتی ہے۔ ازلی۔ ہمیشہ رہنے والی چیز کو کہا جاتا ہے۔

لَآ آتِيهِ اَبَدَ الْآبَادِ وَاَبَدَ الدَّهْرِ۔
یعنی میں اس کے پاس کبھی نہیں آؤں گا۔
اَبَدًا : ظرف زماں ہے جو مستقبل میں نفی و اثبات کی تاکید کے لیے آتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے لَآ اَفْعَلُهٗ اَبَدًا یعنی میں اس کو ہرگز نہیں کروں گا۔ اَوَابِدُ : وہ پرندے جو موسم سرما و گرما میں ایک ہی جگہ رہیں۔
اَوَابِدُ الْكَلَامِ : نادر اور بے مثال۔
اَبَدًا : غیر منقطع۔ دائم اور مسلسل رہنے والے زمانہ پر بولا جاتا ہے اور مطلق دھر اور زمان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور ایسے زمانے کو کہتے ہیں جو طویل ہو۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ : اَبَدًا ظرف زمان ہے جو قلیل و کثیر دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جیسے لفظ حِین اور وَقت۔ اور آیت کریمہ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۔ وہ اس کی آرزو کبھی نہیں کریں گے۔ سے مراد یہ ہے کہ وہ ابتدائے عمر سے لیکر آخر عمر تک موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ (القرطبی ص ۳۳ ج ۲)

علامہ راغب فرماتے ہیں کہ : اَلْاَبَدُ : ایسے زمانہ دراز کے پھیلاؤ کو کہتے ہیں جس کے لفظ زمان کی طرح ٹکڑے نہ کیے جا سکیں یعنی جس طرح زمان كذا (فلاں زمانہ) کہا جاتا ہے اَبَدُ كذا نہیں بولتے۔ اس لحاظ سے اس کا تثنیہ اور جمع نہ بننا چاہیے اس لئے کہ اَبَدٌ تو ایک ہی مسلسل رہنے والے زمانہ کا نام ہے لیکن بعض اوقات اسے ایک خاص مدت مراد لیکر اس کی جمع آباد بنا لیتے ہیں بعض اهل لغت کا خیال ہے کہ آباد جمع مُوَلَّدٌ ہے قدیم عربوں کے کلام میں اس کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

وحشی اور جنگلی جانوروں کو اَوَابِدُ کہتے ہیں۔ واحد۔ آبِدٌ اور مؤنث آبِدَةٌ اصمعی لغوی کہتے ہیں کہ : وحشی حیوانات کبھی طبعی موت نہیں مرتے بلکہ ان کی موت حوادث میں واقع ہوتی ہے (لسان)

وقال الجوهري : الاَبَدُ : الدهر. والجمع آبَادٌ وَاُبُوْدٌ (الصحاح)

اَسَّسَ : اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ۔

اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ : کے معنی ہیں اس نے عمارت کی بنیاد رکھی اور بنیاد کو اُسٌّ اور اَسَاسٌ کہا جاتا ہے اُسٌّ کی جمع اِسَاسٌ (بکسر الهمزه) اور اَسَاسٌ کی جمع اُسُسٌ آتی ہے۔ محاورہ ہے كَانَ ذٰلِكَ عَلٰى اُسِّ الدَّهْرِ و على وجه الدهر، یعنی وہ قدیم زمانہ سے ہے۔ والاُسُّ، اصل البناء۔ وكذالك

الأَسَاسُ، وَجَمْعُ الْاُسِّ اِسَاسٌ مِثْلُ عُسٍّ وَعِسَاسٍ وجمع الأُسَاسِ، أُسُسٌ مثل قَذَالٍ وَقُذُلٍ، وَجَمع الْأُسَسِ، آسَاسٌ مثل سبٍ وَ اَسْبَابٌ۔

(قرطبی۔ راغب)

اَسَّ الدَّارَ اَسًّا : گھر کی بنیاد رکھنا۔ اَسَّ بَیْنَ النَّاسِ۔ لوگوں کے درمیان فساد برپا کر دینا اَسَّسَ البیت گھر کی بنیاد رکھنا اور تَاَسَّسَ۔ بنیاد پڑنا والتأسیس وضع الأساس وھو اصل البناء وَ اَوَّلُہٗ۔ وَیُسْتَعْمَلُ بمعنی الاحکام (روح)

اُسٌّ میں تین لغت ہیں اَسٌّ بفتح الھمزۃ و اِسٌّ بکسر الھمزہ وَاُسٌّ بضم الھمزہ ذالك لانّہٗ اَوّلُ مَنْ اَسَّ القتل (ترمذی) یہ اسلیے کہ وہ پہلا شخص ہے جسنے قتل کی بنیاد رکھی۔

بُنْیَانٌ : یہ مصدر ہے جیسا کہ غفران اور مفعول کے معنی میں اور مَبْنِیٌّ کے حکم میں ہے اور مصدر بطور مجاز کے مفعول کے معنی میں عام مستعمل ہے جیسے کہ ضرب الامیر اور نَسْجُ زَیدٍ : بمعنی مضروب اور منسوج ہے۔ صاحب کبیر نے واحدی کا قول یہ نقل کیا ہے کہ : بنیان میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ بنیانۃٌ کی جمع ہو چونکہ عام طور پر واحد میں بنیانۃ بولتے ہیں اور یہی قول صاحب روح المعانی نے ابو علی سے نقل کیا ہے۔

وعن ابی علی اَنَّ البنیان جَمْعٌ وَاحِدُہٗ بُنْیَانَۃٌ۔ اس صورت میں یہ اسم جنس ہوگا ولعلَّ مُرادہ اسم جنس جمعی (روح)

حدیث میں ہے اِنَّ المؤمن للمؤمن کالبنیان (بخاری) بَنَیٰ یَبْنِیْ بَنْیًا وَبِنَاءً وَبُنْیَانًا وَبِنَایَۃً : بَنَیَ البیت گھر کی تعمیر کرنا۔ اور بَنَیٰ علیٰ اھلہ: بیوی کے پاس جانا۔

صاحب مفردات فرماتے ہیں کہ : اَلْبُنْیَانُ وَاحِدٌ لا جَمْعٌ، کہ بنیان واحد ہے جمع نہیں ہے جیسا کہ آیت کریمہ لَا یَزَالُ بُنْیَانُھُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَۃً فِیْ قُلُوْبِھِمْ۔ اور آیت کریمہ کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ سے معلوم ہوتا ہے۔ (فافہم)

شَفَا : عَلیٰ شَفَا جُرُفٍ : شفا کنویں اور کھائی وغیرہ کے کنارے کو کہتے ہیں یہ ضرب المثل ہے جو ہلاکت کیلئے بولی جاتی ہے کہتے ہیں اَشْفیٰ فلان علی الھلاك کہ فلاں ہلاکت کے قریب پہنچ گیا۔ شفا کا تثنیہ شَفَوَانِ اور جمع اشفاءٌ ہے۔

شفی المریض بیمار صحت وسلامتی کے قریب پہنچ گیا۔ (راغب، روح)

قال ابوعبیدہ الشفا، الشفیر، وشفا الشئی حرفہ کبیر۔ الشفا، الحرف و الحد۔ (قرطبی) اس کی بحث آل عمران میں گذر چکی ہے۔

جُرُفٍ : عَلٰی شَفَا جُرُفٍ: جرف دریا کے اس کنارے کو کہتے ہیں جو پانی کے دباؤ کی وجہ سے کٹ کٹ کر بہہ رہا ہو۔ کہتے ہیں جَرَفَ الدَّهْرُ مَالَهٗ زمانے نے اسکا مال تباہ کر دیا۔ اور رَجُلٌ جُرَافٌ: کثیر الجماع۔ والجُرُفُ: مَا یَتَجَرَّفُ بِالسُّیُوْلِ مِنَ الاَوْدِیَةِ، هُوَجَوانبه التی تَحْفِرُہٗ بالماء (قرطبی)

جرف اور اجتراف کے معنی ہیں کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینا۔ واَصْلُه مِنَ الجَرْفِ وَالاِجْتِرَافِ. و هو اِقْتِلَاعُ الشئی مِنْ اَصْلِهٖ ۔(قرطبی)

والجرف ھوما اذا سال السیل وَ اِنْحَرَفَ الوادی ویبقی علیٰ طرف السیلِ طِیْنٌ واہٍ مشرفٌ علی السقوط ساعۃ فساعۃ، فذالک الشئی ھو الجرف۔ (کبیر)

الجرف بسکون الراء، اس کی جمع اَجْرُفٌ آتی ہے نہر کا کنارہ جس کو پانی نے ڈھا کر کھوکھلا کر دیا ہو۔ سَیْلٌ جُرَافٌ: وہ سیلاب جو سب کچھ بہا لے جائے۔ جِرْفَةٌ: روٹی کا ٹکڑا اس کی جمع جِرَفٌ آتی ہے طَاعُوْنٌ جَارِفٌ تباہ کن طاعون۔

لفظ جُرْف حرفِ راء کے جزم اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

هَارٍ : هَارَ البِنَاءُ تَهَوَّرَ: کے معنی ہیں عمارت کا منہدم ہو جانا اور یہ بھی بمعنی اِنْهَارَ کے ہیں اور بِئْرٌ هَائِرٌ ویران کنویں کو کہتے ہیں اور رَجُلٌ هَارٌ وَهَائِرٌ کمزور آدمی جس کی طاقت ویران ہو چکی ہو۔ هَارَ یَهُوْرُ هَوْرًا فَهُوَ هَارٌ وَهَائِرٌ وَیُقَالُ هَاوِرٌ وهَایِرٌ اگر اسکی اصل هَاوِرٌ ہو تو یہ اَجوف واوی ہوگا اور اگر هَایِرٌ ہو تو اجوف یائی ہوگا، حرف واو یا حرف یاء کو ہمزہ بنا کر پھر ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے تو یہ فَالٌ کے وزن پر هَارٌ ہو گیا اس صورت میں گویا یہ محذوف العین ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ قَاضٍ کی طرح منقوص ہے اصل اس کی هَاوِرٌ ہے حرف واو کو حرف راء کے بعد منتقل کر کے

واؤ کو یا بنا کر قَاضٍ کی طرح تعلیل کر کے یاء کو حذف کر دیا گیا ہے هَارٍ ہو گیا اس صورت میں اس کا اعراب حرکات مقدرہ کے ساتھ ہو گیا علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ هَارٍ کی اصل هَوِرٌ ہے اور یہ فَعِلٌ کے وزن پر ہے ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے حرف واؤ الف سے بدل گیا ہے لہذا اس کا الف، الف فاعل نہیں ہے بلکہ یہ عین کلمہ ہے والفہ لیست بالف فاعل انما ھی عینہ واصلہ هَوِرٌ۔ (کشاف)

هَوْرٌ: گرانا، گرجانا، پھٹ جانا۔
تَهْوِيْرٌ: گرا دینا ہلاکت میں ڈال دینا اور تَهَوُّرٌ گر جانا۔ ہلاکت کے مقام میں پرواہ نہ کر کے گھس جانا۔ حدیث میں ہے۔ مَنْ اَطَاعَ رَبَّهٗ فَلَا هَوَارَةَ عَلَيْهِ: جو شخص اپنے خدا کی اطاعت کرے اس پر کوئی ہلاکت نہیں۔
تَهَوَّرَ الْقَلِيْبُ بِمَنْ عَلَيْهِ: کنواں ان لوگوں کو لے کر جو اس کے اوپر تھے گر گیا۔ اور تَهَوَّرَ اللَّيْلُ کے معنی ہیں رات کا اکثر حصہ گزر گیا۔

اَلسَّآئِحُوْنَ : اَلْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ.

اَلسَّاحَةُ: کے معنی ہیں فراخ اور کھلی جگہ کے ہیں۔ مکان کا صحن بھی چونکہ کھلا ہوتا ہے اس اعتبار سے اس کو ساحةُ الدَّار کہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ وسیع اور کھلی جگہ میں جاری رہنے والے پانی کو بھی سائح کہا جاتا ہے اور سَاحَ فُلَانٌ فِی الْاَرْضِ. کے معنی ہیں پانی کی طرح زمین میں سفر کرنا قرآن میں ہے۔ فَسِيْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ۔

اس ہی لئے ہمیشہ سفر کرنے والے کو سَآئِحٌ اور سَيَّاحٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ میں لفظ سَآئِحُوْنَ سے مراد کیا ہے اس میں اہل تفسیر نے چند اقوال نقل کیے ہیں۔

جمہور مفسرین کے نزدیک سَآئِحُوْنَ سے مراد روزہ دار ہیں اصل میں یہ سِيَاحَةٌ سے ماخوذ ہے کیونکہ روزہ دار کھانے پینے وغیرہ لذات و مرغوبات سے بے تعلق ہو کر روحانی مدارج اور ملکوتی مقامات کی سیر کرتا ہے اس لیے اسکو سائح کہا گیا گویا یہ اپنی زندگی کے سفر کو اطاعت الٰہی میں گذار رہا ہے۔
سفیان ثوری، عبداللہ بن مسعود سے نقل کرتے ہیں کہ سائحون سے مراد صائمون ہیں اسی طرح کی ایک روایت سعید بن جبیر اور عوفی نے ابن عباس سے بھی نقل کی ہے اور علی ابن ابی طلحہ نے حضرت عباس سے جو روایت

نقل کی ہے اس میں تو یہاں تک ہے کُلُّ ماذکر فی القرآن من السیاحۃ ھوالصائمون۔ علامہ ابن جریر نے حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے۔ قالت سیاحۃ ھذہ الاُمّۃ الصیام۔ اور یہی قول ہے مجاہد، سعید بن جبیر، عطاء، عبدالرحمٰن اسلمی، ضحاک، ابن مزاحم، اور سفیان بن عیینہ وغیرھم کا ہے۔

ابن جریر نے ابوھریرہ سے نقل کیا ہے کہ: قال رسول اللہ صلی اللہ وسلم السائحون ھم الصائمون۔ یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے لیکن حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ھذا الموقوف اصح، یعنی یہ موقوفاً بھی صحیح نہ ہے۔ پھر جن حضرات نے سائحون سے مراد روزہ دار لیئے ہیں ان میں سے بعض کہتے ہیں آیت کا مصداق وہ لوگ ہیں جو رمضان شریف کے روزے رکھتے ہیں۔ ومذھب الحسن ان السائحین ھٰا ھُنا ھم الذین یصومون الفرض۔

(فتح القدیر۔ کبیر)

اور اکثر اہل علم نے اس سے مراد وہ لوگ لیے ہیں جو ہمیشہ روزہ رکھنے والے ہیں وجہ اسکی یہ ہے کہ سیاحۃ کے اصل معنی ھمیشہ زمین پر سفر کرتے رہنے کے ہیں جیسا کہ پانی زمین پر چلتا رہتا ہے اسی سے استعارۃً ان اطاعت گزاروں کو سائحین کہا جائیگا جو ہمیشہ روزے رکھنے والے ہوں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن پاک کا نظم بھی اسی کی تائید کرتا ہے البتہ سائح کے وسیع معنی ہیں وہ لوگ بھی داخل ضرور ہیں جو صرف فرض روزے ادا کرتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ سائحون سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر اپنے گھر بار اور ملک و دولت کو ترک کر کے دارالسلام میں سکونت اختیار کی۔ وقال عبدالرحمٰن ابن زید ابن اسلم۔ ھم المھاجرون۔ (ابن کثیر)

تیسرا قول یہ ہے کہ سائحون سے مراد مجاہدین ہیں جو ہر وقت دین کی سربلندی کی خاطر اپنی جان کو قربان کرنے کے لیئے تیار رہتے ہیں۔ چنانچہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں ابوامامہ کی روایت کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: سیاحۃ اُمّتیَ الجہادُ فی سبیل اللہ۔ بعض حضرات نے کہا ہے سائحون سے مراد، دین کے راہ میں طالب علم ہیں جو وطن، کنبہ، راحت و آسائش وغیرہ سب کو ترک کر کے علم کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ وعن عکرمۃ انہ قال: ھم طلبۃ العلم۔ (ابن کثیر۔ کبیر)

ایک پانچواں قول یہ ہے کہ سائحون سے مراد وہ لوگ ہیں جو توحید باری اور اسکی ملکوت وعظمت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ لفظ۔ س ی ح ۔ تمام اقوال کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔

السیاحہ: اصلھا الذھاب علی وجہ الارض کما یسیح الماء۔ (قرطبی)

اصل السیاحۃ الاستمرار علی الذھاب فی الارض کالماء الذی یسیح۔ (کبیر)

اَوَّاہٌ: اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَاَوَّاہٌ حَلِیْمٌ:
بے شک ابراھیم بڑے ہی نرم دل بُردبار تھے۔

اَوَّاہٌ مبالغہ کا صیغہ فَعَّالٌ کے وزن پہ ہے اور۔ اَوْہٌ سے ماخوذ ہے (اَوَّاہٌ) فَعَّالٌ من اَوِہَ (کشاف)

عربی میں اَوَّاہٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ تَأَوُّہٌ کرنے والا ہو۔ اور تَأَوَّہَ کے معنی ہیں حزن وغم ظاہر کرنے کیلئے اَوْہ زبان پر لانا ہر وہ کلمہ جو تأسف اور حزن کا اظہار کرتا ہو اس کو تأوُّہ سے تعبیر کرتے ہیں علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لفظ اَوَّاہٌ کے پندرہ معانی نقل کیے ہیں جو سب معانی متقاربہ ہیں مثلاً کثرت سے آہ کرنے والا، بکثرت دعا کرنے والا، اللہ کے بندوں پر رحم کرنے والا

ابن مسعود سے یہی معنی منقول ہیں۔

ابن عباس کا قول یہ ہے کہ اَوّاہ حبشی لغت کا لفظ ہے جو مومن کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے ایک قول یہ ہے کہ اوّاہ خاشع اور متضرع کے معنی میں ہے۔ حدیث سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت زینبؓ نے حضورؐ سے کچھ اس انداز سے گفتگو کی کہ آپ کا رنگ بدل گیا حضرت عمرؓ نے حضرت زینبؓ کو منع کیا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعوھا فانھا اَوَّاھَۃٌ تو اس لفظ کی تفسیر بھی صحابہ نے حضور سے دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ اَوَّاھَۃٌ کے معنی خاشعۃٌ کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ سے صحابہ کرام مانوس نہیں تھے ورنہ اَوَّاھَۃٌ کی تفسیر کا سوال نہ فرماتے اس سے ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جن کے نزدیک یہ لغت حبشہ کا لفظ ہے۔

اصل یہ ہے کہ حزن وغم کے وقت انسان کا روح قلبی گھٹتا ہے اور قلب میں ایک سخت حرارت پیدا ہوتی ہے اور بے ساختہ زبان پر لفظ آہ یا اُوہ آجاتا ہے پھر اسی سے اَوَّاہٌ ماخوذ کیا گیا ہے جو ان معانی پر دلالت کرتا ہے جن سے خشیت، تضرع اور حلم وغیرہ کا اظہار ہو۔
آہَ یَؤُہُ اَوْھًا۔ قَامَ یَقُوْمُ کی طرح نَصَرَ

بیضمر سے آتا ہے چونکہ حضرت ابراہیم جامع الصفات
رسول ہیں اور اَوَّاہ ایک ایسی صفت ہے جسمیں کئی
معانی پائے جاتے ہیں، اس لئے اس کے مصداق
ہیں اقوال کا کچھ اختلاف ہوا ہے۔ اور مآل
سب کا ایک ہے۔

ابوالعباس کہتے ہیں کہ جب کسی کام کو روکنا
مقصود ہوتا ہے تو اس وقت اِیۡهًا کہا جاتا ہے
یعنی بس کرو اور اگر کام پر ترغیب دینا ہو تو وَیْهًا
بولتے ہیں اور اظہار تعجب کے لئے وَاهًا بولتے
ہیں جیسے وَاهًا لِرِيحِ الْجَنَّةِ واہ واہ بہشت
کی خوشبو ہیں اور واہا للہ کے معنی ہیں اس کو
شاباش ہے ابن ماجہ کی حدیث ہے الیك
مخبتاً لك اَوَّاها ایک حدیث میں حضور دعا
کے الفاظ میں فرماتے ہیں رَبِّ اجعلنی
الیك اَوَّاهًا (ابن ماجہ) ایک حدیث
میں ہے وَلِمَن اُبْتُلِيَ فَصَبَرَ فَوَاهًا لَهُ یعنی
جو شخص آزمائش اور مصیبت میں ڈالا گیا
اور اسنے صبر کیا تو اسکو شاباش ہے کہ اسنے
ثابت قدم رہ کر اپنی بندگی کا ثبوت دیا۔

ضَاقَتْ : ضَاقَتْ: وہ تنگ ہوگئی۔
ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ۔ اور تم پر زمین
باوجود اپنی فراخی کے تنگی کرنے لگی۔
ضَاقَ: وہ تنگ ہوا۔ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا:
اس نے ان کے بارے میں اپنی طاقت کو تنگ
پایا۔ اپنے کو انکی مدافعت میں ناقابل پایا۔
ضَيْقٌ: تنگ دلی، تکلیف، رنج۔ وَلَا تَكُ
فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ. آپ کافروں کی
محض تدبیروں سے دل تنگ نہ ہوجیئے۔
ضَيَّقَ عَلَيْهِ: کسی کو تنگ کرنا۔ پریشان کرنا۔
وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ۔
(الطلاق ۶) اور ان کو تنگ کرنے کیلئے تکلیف مت
پہنچاؤ۔ ضَائِقٌ اسم فاعل وہ جو تنگ ہو۔

تحقیق لفظ ظَنٌّ

وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ۔
اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ سے کہیں پناہ
نہیں مل سکتی بجز اسی کی طرف کے۔

لفظ۔ ظن۔ عربی لغت میں کئی معانی میں
استعمال ہوتا ہے اور بعض اہل لغت نے
اس کو اضداد میں سے قرار دیا ہے خاص کر لفظ
ظَنّ کا استعمال علم الیقین شک ووہم، اور
تہمت کے معنی میں ہوتا ہے۔

صاحب تاج العروس نے لغت کی مشہور
کتاب "البصائر" کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ
قرآن پاک میں لفظ ظن چار معنوں میں استعمال
ہوا ہے یقین، شک، یعنی جب ایک چیز کے
ہونے نہ ہونے کے دونوں احتمال مساوی ہوں

اور کسی کو ترجیح نہ دی جاسکے۔ تیسرا تہمت۔ چوتھا وھم و گمان کے معنی میں آیا ہے۔

نمبر ۱۔ قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا اللّٰہِ: یہاں پر یظنون بمعنی یقین کے ہے چونکہ وھم و گمان کے معنی میں یہاں کسی طرح درست نہیں وجہ یہ ہے کہ کہنے والے خدا رسیدہ اور پیغمبر کے صحبت یافتہ ہیں جو خدا کی ذات پر پختہ اور غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں۔

امام ابو عبداللہ القرطبی اس آیت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ: الظن بمعنی الیقین: ظن یہاں یقین کے معنی میں آیا ہے

نمبر ۲۔ ظن بمعنی تہمت: وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ اسمیں ایک قرأت بظنین حرف۔ظاء۔ سے ہے اس کے معنی ہیں کہ اللہ کا رسول انبائے غیب پر متہم نہیں اور ظِنَّۃٌ۔ تہمت کے معنی میں مستعمل ہے۔

والظِنَّۃُ، التھمۃُ ایک شاعر کہتا ہے۔

اما وکتاب اللہ لا عن شَنَاءَۃٍ
هُجِرْتُ ولکن الظنین ظنین

یعنی اللہ کی کتاب کی قسم، مجھے اس لئے چھوڑا نہیں گیا کہ مجھے اس سے واقعی عداوت تھی بلکہ مجھے اسمیں متہم کیا گیا ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں۔

(قرطبی)

نمبر ۳۔ ظن بمعنی شک: مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

اس آیت کریمہ میں ان منافقین اور کفار کا حال بیان کیا ہے جن کا ایمان خدا اور رسول پر نہیں اور انہیں اس بات میں شک تھا کہ خدا اپنے رسول کی مدد کریگا، نہیں کریگا اس لئے یہاں ظن بمعنی شک لیا گیا ہے۔

نمبر ۴۔ کبھی ظن کا استعمال محض تخمینے اور اٹکل کے معنی میں بھی ہوتا ہے جیسا کہ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ: یہاں ظن کا معنی وہ بے سروپا بات ہے جسے انسان صرف اپنے وھم و گمان سے فرض کرے جسکی صحت پر کوئی دلیل نہ ہو اور اس کے بعد لفظ یخرصون سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ صاحب کشاف نے اس آیت کے تحت بیان کیا ہے۔ الظن: الوھم یعنی یہاں ظن کا معنیٰ وہم و گمان ہے۔

اصل میں کسی چیز کی علامات سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اسے ظن کہتے ہیں الظن اسم لما یحصل عن اَمارۃٍ (راغب)

علامات اگر قوی ہوں تو ان سے جو نتیجہ حاصل ہوگا وہ علم کا فائدہ دیتا ہے۔ اور اگر علامات بالکل کمزور اور ضعیف ہوں تو

ان سے حاصل شدہ نتیجہ محض وہم ہے یہی وجہ ہے کہ جب نتیجہ قوی ہو جائے اور علم کا درجہ حاصل کرے یا اسکو علم کے درجہ میں فرض کر لیا جائے۔ اگرچہ حقیقتاً وہم و گمان سے آگے نہ ہو۔ تو اس کے بعد حرف اَنَّ مشددہ یا اَنْ مخففہ لایا جاتا ہے۔ مگر جب وہ ظن اتنا کمزور ہو کہ وہم و گمان کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے تو صرف اس کے اَنْ مخففہ کا لایا جاتا ہے جو کسی قول یا فعل کے عدم کے ساتھ مختص ہوتا ہے جیسا کہ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ۔ یہاں بعض اہل تفسیر کی رائے یہ ہے کہ ظن بمعنی گمان ہے اور وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ میں ظن بمعنی یقین ہے اور وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ۔ میں لفظ اَنَّ مشددہ ہے جو ظن بمعنی یقین کے ساتھ مخصوص ہے جس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ انہوں نے اپنی جگہ پر یقین کر لیا تھا لیکن انکا یہ یقین بے اصل تھا جو چیز کی علامات سے غلط نتیجہ اخذ کرنیکا ثمرہ ہے اور کبھی ظن بمعنی یقین ہوتا ہے لیکن اس کے بعد لفظ اَنْ مخففہ استعمال ہوتا ہے جو عام طور پر ظن بمعنی گمان کے بعد آتا ہے چنانچہ زیر بحث آیت۔ وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ : میں ظن بمعنی یقین ہے اور امام ابو عبداللہ القرطبی۔ امام رازی۔ جار اللہ زمخشری نے بھی یہاں ظن بمعنی علم و یقین ہی لیا ہے اور صاحب جلالین نے بھی یہاں ظن کی تفسیر یقین ہی کے ساتھ کی ہے (واللہ اعلم)

وَالظَّنِيْنُ : الرجل المتَّهَمُ۔ وَالظِّنَّةُ : التُّهَمَةُ وَالجمع الظِّنَنُ۔ (صحاح)

ظَمَاٌ : ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ۔

ظِمْاٌ : حرفِ ظاء کے کسرہ اور میم کے سکون سے۔ وہ وقفہ جو دو مرتبہ پانی پینے کے درمیان ہو۔ اور اس وقفہ میں عارض ہونے والی پیاس کو ظَمَاٌ کہتے ہیں۔ ظَمِئَ يَظْمَئُ ظَمْأً وَ ظَمَاَةً : سخت پیاسا ہونا وَهُوَ شِدَّةُ العطش۔ يُقالُ ظَمِئَ فلانٌ اِذا اشتدّ عطشُهُ۔ (کبیر)

اور ظَمِئَ اِلَيْهِ کے معنی ہیں کسی کا مشتاق ہونا صیغہ صفت ظَمِئٌ و ظَامِئٌ اور ظَمْآنٌ : صفت مؤنث ظَمِئَةٌ و ظَمْاٰی آتی ہے۔ مؤنث و مذکر دونوں کی جمع اَظْمَاءٌ آتی ہے۔ اِنَّكَ لَا تَظْمَاُ فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۔

اس میں پیاس کی شدت اور دھوپ کی تیزی کی نفی ہے ظِمْءٌ کی جمع اَظْمَاءٌ آتی ہے الاَسَدُ الظَّمَاءُ پیاسے شیر ظِمْءُ الْحَيَاةِ : پیدائش سے موت تک کا وقت۔ (صحاح)

يَنَالُ : وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا۔

النَّوْلُ : کے معنی تناول کے ہیں اور یہ نِلْتُ

کذا النُّوْلُ نوْلاً سے آتا ہے اور اگر اس کو باب افعال میں لیجا کر اَنَلْتُہٗ کہیں تو اس کے معنی کسی چیز کے عطا کرنے کے ہوتے ہیں نِلْتُ اصل میں نَوَلْتُ ہے اور اجوف واوی ہے محاورہ ہے وما کان نو لك ان تفعل کذا یعنی ایسا کرنے میں تمہاری بہتری نہیں ہے۔ نَالَ ینول نوالا ونولا۔ نال فلاناً العطیۃ وبالعطیۃ: عطیہ بخشا۔ نَالَنِیْ بالخیر۔ اس نے مجھ کو بھلائی پہنچائی محاورہ ہے نَالَ لَہٗ ان یفعل کذا اس کے لئے ایسا کرنے کا وقت آگیا ہے۔

نَیْلاً: وَلَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا۔

نَالَ یَنِیْلُ وَیَنَالُ نَیْلاً ونَالَۃً ونَالاً یہ اجوف یائی ہے ہر اس چیز کو نَیْلٌ کہتے ہیں جو انسان اپنے ہاتھ سے پکڑے نال المطلوب کے معنی ہیں۔ مطلب پانا۔ حاصل کرنا، صیغہ فاعل نَائِلٌ اور مفعول مَنِیْلٌ کے وزن پر آتا ہے امر کا صیغہ نِلْ و نَلْ دونوں طرح آتا ہے نَیْلٌ بفتح نون مطلب کو کہتے ہیں لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ تم کبھی نیکی حاصل نہ کرسکو گے۔ لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا۔ کچھ بھلائی حاصل نہ کرسکے۔

بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ نیلاً اجوف واوی ہے نَالَ یَنُوْلُ سے ہے اس صورت میں نَیْلاً کی اصل نَوْلاً ہوگی واؤ کو علیٰ غیر القیاس یاء سے بدل دیا گیا ہے۔

اکثر اہل تفسیر کے نزدیک نَیْلاً قَتْلاً اور اَسْرًا کی طرح مصدر ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ مفعول کے معنی میں ہو۔ یَنَالُوْنَ فعل اور اس کی ضمیر فاعل ہوگی۔ ای لا یَنَالُوْنَ شَیْئًا من الاشیاء (روح)

علامہ قرطبی فرماتے ہیں نَیْل یائی ہے اور ینالون واوی ہے نُلْتُ اَنُوْلُ مِنَ العطیۃ، مِنَ الواو والنَّیل من الیاء (قرطبی)

وَادِیًا: وَلَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا:

وادی پہاڑوں اور ٹیلوں کے درمیان کا فاصلہ جو سیلاب بہنے کی جگہ ہو

والوادی: کل منفرج بین جبال وآکام یکون منفذاً للسیل۔ (کشاف)

والوادی کل مفرج بین جبال وآکام یکون مسلکاً للسیل (کبیر)

وادی: اصل میں اسم فاعل ہے جو وَدْیٌ سے ماخوذ ہے۔ جو سیل کے معنی میں یعنی بہنے والے پانی کے معنی میں آتا ہے۔ بعد میں اس کا استعمال اس جگہ اور محل میں ہونے لگا ہے جہاں پانی بہتا ہے۔

وھو فی الاصل اسم فاعل من وَدَی اذا سَالَ
فھو بمعنی السیل نفسہ ثم شَاعَ فی محلہ (روح)
پھر اس سے دو پہاڑوں کے درمیان جو کشادہ
میدان ہوتا ہے اس کو بھی وادی کہتے ہیں۔ قرآن پاک
میں ہے اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی یعنی آپ
یہاں بڑے مقدس میدان میں ہیں (راغب)
وادی کی قیاسی جمع تو وَوَادِیُ آنی چاہئے لیکن
ایک ہی مقام پر دو واؤں کا اجتماع اہل عرب کے
نزدیک ثقیل ہے اس لئے اس کی جمع اَوْدِیَۃٌ واَوَادٍ
واَوْدَاہٌ واَوَادِیُ استعمال ہوتی ہیں۔ نحاس
امام اللغۃ کہتے ہیں کہ فاعل کی جمع اَفْعِلَۃ کے وزن پر
سوائے وادی کی جمع اَوْدِیَۃٌ کے اور کوئی میرے
علم میں نہیں (قرطبی) لیکن امام راغب اور صاحب
روح المعانی نے دو صیغے اور بھی نقل کئے ہیں جن کی
جمع افعلۃ کے وزن پر آتی ہے حالانکہ واحد فاعل
کے وزن پر ہے۔ ایک ناجِ کی جمع انجیۃ اور دوسرا
نادٍ کی جمع اَنْدِیَۃٌ۔ البتہ ان تینوں کے سوائے علامہ
بغدادی بھی فرماتے ہیں کہ کوئی چوتھا اسم ایسا نہیں کہ
واحد فاعل ہو اور جمع اَفْعِلَۃ کے وزن پر ہو۔
استعارہ کے طور پر مذہب۔ طریقہ اور اسلوبِ
بیان پر بھی واد کا لفظ بولا جاتا ہے۔ محاورہ ہے
فُلَانٌ فی وادٍ غیر وادیك : فلاں کا مسلک
آپ سے جداگانہ ہے۔ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ۔
میں وَادٍ سے مراد مختلف اسالیب سخن ہیں (راغب)
پھر اس میں مزید وسعت دے کر مطلق زمین کے
معنی میں بھی بولتے ہیں اور یہاں یَقْطَعُوْنَ
وَادِیًا میں یہ ہی معنی مراد ہیں۔
المراد بہ ھنا مطلق الارض (جمل)

یَتَفَقَّھُوْا : لِیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ

اصل میں یہ یَتَفَقَّھُوْنَ ہے۔ لام امر کی وجہ
سے نون اعرابی گر گیا ہے یہ باب تفعّل سے ہے
جس میں محنت و مشقت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔
مراد یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے میں پوری
محنت و مشقت اٹھا کر مہارت حاصل کریں۔
اس کا اصل مجرد مادہ فقہ ہے جس کے معنی سمجھ
بوجھ کے ہیں۔ اسی لئے امام اعظم نے فقہ کی تعریف
یہ کی ہے کہ انسان کرنے اور نہ کرنے کے کاموں
کو سمجھ لے۔ تو تفقہ فی الدین کے معنی یہ ہونگے
کہ انسان علم دین میں سمجھ بوجھ پیدا کرے۔
بحمدہ تعالیٰ سورۃ توبہ کے الفاظ کی تحقیق آج
بروز جمعۃ المبارک مورخہ ۱۰ ربیع الاول مطابق ۱۲
مارچ ۱۹۷۶ء پوری ہوئی۔

شرح الفاظ القرآن من سورۃ یونس

تِلْكَ : الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۔ یہ آیات ہیں پکی کتاب کی ۔
لغوی اعتبار سے تلک اسم اشارہ واحد مؤنث غائب کے لئے ہے۔ اِشَارَةٌ اِلٰى غَائِبٍ مُؤَنَّثٍ (قرطبی)
لیکن یہاں یہ ھٰذِہٖ کے معنی میں ہے اور اس سے اشارہ اسی سورت کی آیات کی طرف ہے جن کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ اور تِلْكَ کا استعمال ھٰذِہٖ کے معنی میں کلام عرب میں پایا جاتا ہے۔ اعشیٰ کہتا ہے

تلكَ خليلي منه و تلكَ رکابی
هُنَّ صُفرٌ اولادها کالزبیب

تلكَ خلیلی سے مراد ھٰذِہٖ خلیلی ہے (قرطبی) یہ معنی اقرب اور اصوب ہیں چونکہ آگے کتاب کی صفت حکیم جو قرآن ہی کی صفت ہے، جیساکہ خود قرآن پاک میں اس کی صفت کے طور پر ارشاد ہے: اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ۔ اور پھر اس لئے بھی ھٰذِہٖ کے معنی میں زیادہ انسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کسی چیز ذکر نہیں ہے جس کو تلک کا مرجع قرار دیا جائے۔

الْحَكِيْمِ : فعیل کے وزن پر اسم فاعل بمعنی حاکم کے ہے یعنی لوگوں کے درمیان حق کا فیصلہ کرنے والا ہے اور حلال وحرام میں امتیاز کرتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکیم مُحْكَمٌ کے معنی میں ہو جیساکہ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات کا تو کہنا یہ ہے کہ قرآن پاک کی صفت میں جہاں بھی حکیم کا لفظ آیا ہے وہ مُحْكَمٌ ہی کے معنی میں ہے

الحکیم : المحکم بالحلال والحرام و الحدود والاحکام (قرطبی)

قَدَمَ صِدْقٍ : اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔ لفظ قَدَمَ صِدْقٍ کے اصل معنی تو وہی ہیں جو اردو میں سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی جس کی جمع اقدام آتی ہے ۔ قرآن میں ہے وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۔ اور اس سے تقدم کا لفظ بنا ہے جو تأخر کی ضد ہے

فلانٌ متقدمٌ علی فلان : یعنی فلاں کا درجہ اس سے افضل ہے اور متقدم اس چیز کو بھی کہا جاتا ہے جس پر دوسری چیز کا وجود موقوف

ہو جیسے کہ الواحد متقدم علی العدد، کہ واحد عدد پر متقدم ہے۔ کیونکہ واحد کے بغیر عدد کا وجود ناممکن ہے۔ اور القِدَمُ کے معنی کسی چیز کے زمانہ ماضی میں موجود ہونے کے ہیں۔ اس کے بالمقابل لفظ بقاء ہے جس کے معنی ہیں مستقبل میں کسی شئی کا موجود ہونا۔ اور القدیم کا لفظ قِدم باعتبار زمانہ یعنی پرانی چیز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ۔

چونکہ انسان کی سعی وعمل اور اس کے سبب ترقی کا ذریعہ قدم ہوتا ہے اس لئے بلند مرتبہ کو مجازاً قدم کہا جاتا ہے اور لفظ قدم کی اضافت صدق کی طرف کرکے بتلایا کہ یہ بلند مرتبہ جو ان کو ملا ہے یا ملنے والا ہے وہ حق اور یقینی بھی ہے اور قائم اور باقی رہنے والا لازوال بھی۔ تو لفظ قدم کو صدق کی طرف مضاف کرنے سے اس میں یقینی ہونے کا مفہوم بھی شامل ہوگیا ہے اور کامل مکمل اور لازوال ہونے کا بھی۔ اس لئے اس مرکب جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑا درجہ ہے جو یقینی ملے گا۔ اور وہ ایک لازوال دولت ہوگی۔

مقامَ صِدْقٍ لازوال عنہ (زاد المسیر عن عطاء)

بعض حضرات مفسرین نے یہ فرمایا کہ یہاں لفظ صِدْق لاکر اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ جنت کے درجاتِ عالیہ صرف صدق وسچائی اور اخلاص کے ذریعہ حاصل ہوسکتے ہیں، صرف زبانی جمع خرچ مفید نہ ہوگی۔

بعض اہل تفسیر نے قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد انسان کے اعمال حسنہ لئے ہیں اور بعض اہل علم کا قول یہ بھی ہے کہ قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں چونکہ قیامت کے دن آپ اپنی امت کی شفاعت کریں گے

یُدَبِّرُ : ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ۔ یُدَبِّرُ تدبیر۔ تفعیل سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے غور وفکر کرنا۔ مراد یہ ہے کہ جسطرح وہ خالق کل ہے اسی طرح وہ حاکم کل بھی ہے۔ خلق جہاں کے بعد وہ کوئی معطل نہیں ہوگیا ہے کہ اس کے بندے غیروں کے سامنے دستِ سوال پھیلا کر ذلیل ورسوا ہوتے پھریں، بلکہ وہ مستوی علی العرش تمام عالموں کا انتظام خود اپنے دستِ قدرت سے انجام دیتا ہے یُدَبِّرُ یہاں قضا وقدر کے معنی میں ہے۔ اس کا مادہ دُبُرٌ ہے۔ قال مجاھد یقضیہ ویقدّرہ وحدہ (قرطبی)

ضِیَاءً۔ نُوْرًا : هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ۔

ضیاء اور نور دونوں کے معنی چمک اور روشنی
کے ہیں۔ اسی لئے بہت سے ائمہ لغت نے ان دونوں
الفاظ کو مترادف قرار دیا ہے۔ علامہ زمخشری،
رازی اور صاحب روح المعانی کے کلام سے معلوم
ہوتا ہے کہ نور اور ضیاء دونوں لفظوں میں روشنی
کے معنی مشترک ہیں مگر لفظ نور عام ہے، قوی اور
ضعیف روشنی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جبکہ
ضیاء کا اطلاق قوی اور تیز روشنی پر ہوتا ہے۔

ان النور کیفیۃ قابلۃ للاشد والاضعف
والضیاء اقوی من النور (کشاف)

فالضیاء ما یضیئ الاشیاء والنور ما یبین
فیخفی۔ (قرطبی)

قرآن کریم نے شمسی اور قمری روشنیوں میں
فرق و امتیاز کو متعدد جگہ مختلف عنوانات سے
بیان فرمایا ہے۔ سورۃ نوح میں ہے: وَجَعَلَ
الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا
سورۂ فرقان میں ہے وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا
مُّنِيرًا۔ سراج کے معنی چراغ کے ہیں۔ اور چونکہ
چراغ کی روشنی اور اس کا نور ذاتی ہوتا ہے کسی
دوسری چیز سے حاصل کردہ نہیں ہوتا ہے اسلئے
بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ضیاء کسی چیز کی ذاتی
روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس روشنی کو کہا جاتا ہے
جو کسی دوسری چیز سے مستفاد ہو۔ مگر اس فرق
کی کوئی اصل نہ تو لغت ہی میں ہے اور نہ ہی قرآن
پاک نے اس کا کوئی قطعی فیصلہ کیا ہے۔ جن حضرات
نے یہ کہا ہے کہ نُورُ القمر مُستفادٌ مِنْ نُورِ الشمس
صرف یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر کہا ہے۔

لفظ ضیاء میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ ضَوْءٌ
کی جمع ہو جیسے کہ سَوْطٌ کی جمع سِیَاطٌ اور حَوْضٌ کی
جمع حِیَاضٌ آتی ہے۔ لغت کے مشہور امام زجاج
نے ضیاء کو ضَوْءٌ کی جمع قرار دیا ہے۔ اس صورت
میں ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ روشنی کے
سات مشہور رنگ اور قسمیں جو دنیا میں پائی
جاتی ہیں آفتاب ان تمام اقسام کا جامع ہے
جن کا ظہور بارش کے بعد عموماً قوس قزح کی صورت
میں ہوتا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضیاء
ضَاءَ يَضُوءُ کا مصدر ہو جیسے قَامَ قِيَامًا
وصَامَ صِيَامًا، اور اس کا مصدر ہونا زیادہ
قرینِ قیاس ہے۔ کیونکہ شمس مؤنث ہے۔ اس کی
صفت مؤنث آنی چاہئے جیسا کہ خود قرآن پاک
میں ہے فَلَمَّا رَاَى الشَّمْسَ بَازِغَةً، اور
مصدر مؤنث و مذکر دونوں میں برابر ہوتا ہے
اس لئے مصدر میں تانیث کی ضرورت نہیں ہوتی
علامہ قرطبی فرماتے ہیں ولم يؤنث لانه
مَصْدَرٌ، اور پھر خود نظم قرآن سے بھی ضیاء
کا مصدر ہونا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ القمر کی صفت نور ہے جو بالاتفاق واحد ہے مگر لفظ ضیاء کو اگر جمع بھی تسلیم کیا جائے تو جب بھی کوئی خلافِ قیاس نہیں ہے جس سے معنی میں کوئی بگاڑ پیدا ہوتا ہو۔

قَدَّرَ : وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ ۔ قَدَّرَ تقدیر سے بنا ہے، تقدیر کے معنی کسی چیز کو زمانہ یا مکان یا صفات کے اعتبار سے ایک مخصوص مقدار اور پیمانہ پر رکھنے کے ہیں۔ رات اور دن کے اوقات کو ایک خاص پیمانہ پر رکھنے کے لئے قرآن کریم نے فرمایا وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ، مکانی فاصلے اور مسافت کو ایک خاص پیمانے پر رکھنے کے لئے دوسری جگہ ملک شام اور سبا کی درمیانی بستیوں کے متعلق فرمایا وَقَدَّرْنَا فِیْهَا السَّیْرَ، اور عام مقادیر کے متعلق فرمایا : وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۔

(معارف القرآن)

اور قَدَّرَهٗ جب باب تفعیل سے ہو تو اس کے معنی کسی کو قدرت اور طاقت عطا کرنے کے بھی آتے ہیں جیسے کہ محاورہ ہے قَدَّرَنِیَ اللّٰهُ عَلٰی كَذَا وَقَوَّانِیْ علیه : اللہ نے مجھے اس پر قدرت عطا فرمائی ۔ تو تقدیر الٰہی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو قدرت بخشنا ہے۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو مقدار مخصوص اور طرزِ مخصوص پر بنانا۔ جیسا کہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے اس لئے کہ فعلِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں اول ایجاد بالفعل یعنی ابتداء ہی سے کسی چیز کو ایسا کامل وجود عطا کرنا کہ جب تک مشیتِ الٰہی اس کے فنا کی مقتضی نہ ہو اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے جیسے کہ اجرامِ سماویہ اور ما فیہا کی تخلیق کہ قیامت تک ان میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔

دوم یہ کہ اصول اشیاء کو بالفعل اور ان کے اجزاء کو بالقوۃ وجود عطا کرنا اور ان کو اس انداز کے ساتھ مقدر کرنا کہ اس کے خلاف ظہور پذیر نہ ہوں جیسا کہ خرما کی گٹھلی سے کھجور کا درخت ہی پیدا ہوگا اور مادۂ رجولیت سے انسان ہی پیدا ہوگا اس کے خلاف نہ ہوگا۔ پس تقدیرِ الٰہی کے دو معنی ہوئے۔ ایک یہ کہ کسی چیز کے متعلق نفی یا اثبات کا حکم لگانا کہ یہ ہوگا اور یہ نہ ہوگا جیسا کہ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ، یعنی خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر دیا ہے ، میں یہی معنی مراد ہیں ۔ دوم یہ کہ کسی چیز کو قدرت اور طاقت عطا کرنا۔ مزید تفصیل کے لئے مفردات القرآن للراغب کا مطالعہ فرمایا جائے۔

یَرْجُوْنَ : اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ۔ لفظ رجاءٌ لغوی اعتبار سے اضداد میں سے ہے، اس کے معنی اندیشہ اور امید دونوں کے آتے ہیں اور مطلق توقع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے

اور اس کے حقیقی معنیٰ کسی خیر کی توقع کرنے کے ہیں۔ شعراء عرب نے اس لفظ کو خوف اور طمع دونوں میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ابو ذؤیب کہتا ہے۔

اذا لسعتہ النحل لم یرج لسعہا
وخالفہا فی بیت نوب عواسل

لفظ رجاء کو امید و طمع کے معنی میں استعمال کرتے ہوئے ایک دوسرا شاعر کہتا ہے

ایرجو بنو مروان سمعی وطاعتی
وقومی تمیم والفلاۃ ورائیا

حاصل یہ کہ رجاء کا لفظ اضداد میں سے ہے جو خوف اور طمع دونوں معنوں آتا ہے (قرطبی)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ رجآء بمعنی خوف اسی وقت آتا ہے جب نفی کے تحت ہو جیسا کہ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰہِ وَقَارًا۔ لیکن یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے بلکہ جہاں بھی قرینہ خوف کے معنی کا مقتضی ہوگا وہاں خوف کے معنی مراد لئے جاسکتے ہیں چاہے حرف جحد سے خالی ہی کیوں نہ ہو۔ سورۃ عنکبوت میں ہے: فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ تو انہوں نے کہا کہ اے میری قوم خدا کی عبادت کرو اور آخرت کے دن سے ڈرو۔

دَعْوٰی: دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ

یہاں لفظ دعوٰی اپنے مشہور معنی میں نہیں ہے جو کوئی مدعی اپنے حریف کے مقابلہ میں کیا کرتا ہے بلکہ اس جگہ لفظ دعوٰی، دعاء کے معنی میں ہے۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اہل جنت کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ کلمہ سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ کہیں گے، یہ سنتے ہی فرشتے ان کے مطلب کی چیز لاکر حاضر خدمت کردینگے گویا یہ کلمہ اہل جنت کی ایک اصطلاح ہے جس کے ذریعے وہ اپنی خواہش کا اظہار کرینگے اور ملائکہ ہر مرتبہ اس کو پورا کریں گے۔ دَعْوٰھُمْ ای دعاؤھم لان اللّٰھم نداء للہ (کشاف) اس کی لغوی تحقیق گزر چکی ہے۔

عَاصِف: جَآءَتْھَا رِیْحٌ عَاصِفٌ۔

ریح عاصف یعنی سخت تیز اور تند ہوا۔ مراد وہ ہوا ہے جو جہاز کے مخالف ہو۔ العصفُ اور العصیفۃ کھیتی کے وہ پتے جو کاٹ لئے جاتے ہیں۔ اور ان نباتات کو بھی عصیفہ کہتے ہیں جو خشک ہو کر چورہ چورہ ہو جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ۔ اور سورۃ فیل میں ہے کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ جیسے کھایا ہوا بھوسا اور رِیْحٌ عَاصِفٌ وعَاصِفَۃٌ ومُعْصِفَۃٌ اس ہوا کو کہتے ہیں جو ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر بھس کی طرح بنا دے۔ اور مجازًا عصفت بھم الرِّیْحُ کے معنی ہیں وہ ہلاک اور برباد ہوگئے۔ (راغب)

عَصَفَتِ الرِّیحُ وَاَعْصَفَتْ: ہوا کا سخت اور تیز ہونا۔ والعَاصِفُ الشدید (قرطبی)

لفظ ریح چونکہ مذکر ہے اس لئے صفت عاصف مذکر لائی گئی ہے۔ واصل العصف الکسر (روح) واصل العصف، السُّرعة، یُقال ناقة عاصف وعصوف سریعة (کبیر)

سَهْمٌ عاصِفٌ : وہ تیر جو نشانہ پر نہ لگے ادھر اُدھر جھک جائے۔ عَصُوفٌ اور عصیفٌ بمعنی آندھی اور اعصافٌ: ہلاک کرنا۔ عَصَفَتِ الحرب بالقَوْمِ : قوم کو لڑائی نے برباد کردیا۔ عَصَفَ الدَّهرُ بھم : زمانے نے انھیں ہلاک کردیا۔ العَصْفُ : کھیت کے پتے۔ عَصَفَ (ض۔ ن) دونوں ابواب سے آتا ہے۔

زُخْرُف : حَتّٰى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا۔ الزُّخْرُف : اصل میں اس زینت کو کہتے ہیں جو ملمع سے حاصل ہوتی ہے جیسے دلہن کا حسن زیورات اور کپڑوں وغیرہ سے سونے کو زُخرُف اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ زیبائش کے کام آتا ہے۔ زُخرُفُ الکلام : وہ کلام جو بظاہر عمدہ ہو لیکن اصل میں جھوٹ اور غلط ہو۔ جھوٹ کو بھی زُخرُف اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کو ظاہر میں چرب لسانی کرکے سچ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حدیث میں ہے کل حَدِیثٍ لا یوافق کتاب اللہ فھو زخرف۔ جو بات کتاب اللہ کے موافق نہ ہو وہ جھوٹ ہے۔

زُخْرُف اور تَزَخْرُف سے مراد کسی چیز کا کمال حسن ہوتا ہے۔ والزُّخْرُفُ کمال حُسْن الشئ (قرطبی) التزخرف عبارة عن کمال حسن الشئ (کبیر) الزُّخْرُفُ: الزینة المُزَوَّقة (راغب)

تَغْنَ : كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ۔

تَغْنَ یہاں غنی بالمکان سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کسی جگہ قیام کرنے کے ہیں۔ اور مَغَانی لغت میں مکانات کو کہتے ہیں جہاں انسان بستے ہوں۔ والمغانی فی اللغة، المنازل التی یعمرھا الناس (قرطبی) غَنَاءٌ بفتح الغین، تونگر ہونا۔ اکتفا کرنا۔ تَغْنِیَةٌ لے کے ساتھ آواز نکالنا۔ کسی کو مالدار بنانا۔ اشعار میں کسی عورت کے حسن وجمال اور اس کے ساتھ معاشرت کا ذکر کرنا۔ غِنَاءٌ بکسر الغین۔ گانا۔ غُنَاءٌ: گانے کے ساتھ تالی بھی بجانا۔ اور اَغْنَاءٌ : جہیز، شادی کا سامان۔

اَغْنیٰ عنہ : دور کرنا۔ ہٹانا۔ محاورہ ہے ھٰذا لایُغنی عنك شیئًا : یہ تجھے کوئی فائدہ نہیں دیگا۔ كَأَنْ يَغْنَ بِالْأَمْسِ : یہ ایک محاورہ ہے اس وقت بولتے ہیں جب کوئی چیز برباد اور فنا ہوجائے۔ قال اللیث : یُقال للشئ اذا فنی كَأَنْ لَّمْ یَغْنَ بِالْأَمْسِ (کبیر)

اس آیتِ کریمہ میں حق تعالیٰ نے دنیا کی بے ثباتی
کو ایک مثال میں پیش کیا ہے۔

یَرْهَقُ : وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ
رَهِقَ يَرْهَقُ رَهَقًا: بے وقوف ہونا۔ زبردستی
کرنا۔ رَهِقَهُ الأمرُ: کسی معاملے نے اس کو بزور
دبالیا۔ رَهِقَهُ اور أَرْهَقَهُ مجرد اور مزید فیہ
دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ جیسے رَدِفَهُ وَ
أَرْدَفَهُ۔ فیہ رَهَقٌ کے معنی ہیں اس میں
نادانی اور بدچلنی ہے۔ يُرْهِقُ بَعْضُهَا بَعْضًا
ایکدوسرے پر جلدی کرنا۔ فی سیف فُلَانٍ رَهَقٌ
فلاں کی تلوار میں بڑی پھرتی ہے۔ قرآن پاک میں
لفظ رهق کا استعمال قریب ہونے اور ڈھانپ لینے
کے معنی میں آیا ہے۔ اور بعض اہل لغت کا قول یہ
ہے کہ رهق کے اصل معنی مقاربۃ کے ہیں۔
وقال بعضھم: اصل الرهق المقاربة
(اصل) اسی سے اس لڑکے کو مُراهِق کہتے ہیں جو
بلوغ کے قریب پہنچ گیا ہو۔ قیل معناه يَلْحَقُ
ومنه قيل غلامٌ مراهقٌ اذا لحق بالرجال[1]

قَتَرٌ : قَتَرَ يَقْتُرُ (ن ومن) قُتُورًا وقَتْرًا
اس کے معنی بہت کم خرچ کرنے کے ہیں جس میں بخل
پایا جائے۔ یہ اِسراف کی ضد ہے۔ اور دونوں صفات
مذموم ہیں۔ قرآن میں ہے وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا
لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا۔ قَتَرَ عَلَى
عِيَالِهِ: اپنے اہل وعیال میں خرچ کرنے میں
تنگی کرنا۔ فاعل قَاتِرٌ و قَتُورٌ۔ قَتَّرْتُ
الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو کم کرنے کے ہیں۔ اسی لئے
المقتر اس فقیر کو کہتے ہیں جو نان ونفقہ کی تنگی کا
شکار ہو چکا ہو۔ قرآن میں ہے وَعَلَى الْمُقْتِرِ
قَدَرُهُ۔ تنگدست پر اپنی حیثیت کے مطابق ہے
مُقْتِرٌ اصل میں قُتَارٌ و قَتَرٌ سے ہے: اس کو
کہتے ہیں جو کسی چیز کے بھوننے یا لکڑی وغیرہ کے
جلانے سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر اسی سے استعارۃً
گرد وغبار کو بھی قَتَرٌ کہتے ہیں اور یہاں یہی معنی مراد
ہیں۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں۔

مُتَوَّجٌ برداء الملك يتبعه
موجٌ ترى فوقه الرايات والقترا

قَتَرٌ: غبار (قرطبی)
اصل میں قتر سے مراد وہ غبار ہوتا ہے جو دھوئیں
کی طرح سیاہ ہو۔ صاحب کشاف فرماتے ہیں
قتر، غبرة فيها سواد (کشاف) مسند احمد کی
ایک روایت میں ہے، فلما رأت خيل قريش
قَتَرَةَ الجيش خالفوا عن طريقهم۔
ایک دوسری روایت میں ہے، فاذاهم
بقَتَرَةِ الجيش، یکایک وہ لشکر کے گرد و
غبار میں تھے۔ اور قُتَارٌ اس دھوئیں یا غبار کو
کہتے ہیں جو ہنڈیا سے اُبلنے کے وقت اٹھتا ہے

[1] قرطبی

حدیث میں ہے لَا تُؤْذِ اَخَاكَ بِقُتَارِ قِدْرِكَ
یعنی اپنی ہنڈیا کی بو سے اپنے ہمسائے کو تنگ
نہ کرو، کوئی ایسی چیز نہ پکاؤ جس سے محلہ والے
بلبلا اٹھیں۔ القتر والقترۃ، الغبار معہ
سواد و منہ غبار القدر وقیل القتر،
التقلیل (جمل) قَتَرٌ قَتْرَةٌ وقَتَرَةٌ، تینوں
کے معنی ایک ہی ہیں۔ اصل میں قَتَرٌ جمع ہے اس
کی واحد قَتَرَةٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے تَرْهَقُهَا
قَتَرَةٌ وَلَا ذِلَّةٌ۔ مطلب یہ ہے کہ اہل جنت
خوش نصیب جماعت ہیں، دوزخ کا دھواں یا گرد وغبار ان کے
قریب بھی نہ آئیگا۔ قَتَرٌ کا لفظ ناامیدی اور چہرے کی اس
حالت کو بھی کہتے ہیں جو رنج وغم کی وجہ سے چہرے پر ظاہر ہوتی
ہے جس کو افسردگی بھی کہتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ اہل جنت
کو آخرت میں کسی کی کوئی افسردگی نہ ہوگی۔

یَهِدِّیْ: اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْ اِلَّآ اَنْ یُّهْدٰی
یَهِدِّیْ اصل میں یھتدی ہے تاء کو دال بنا کر
ادغام کردیا ہے۔ والاصل فیھا یھتدی
اُدغمت التاء فی الدال وقلبت حرکتھا
علی الھاء (قرطبی)

تَاْوِیْلٌ: وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ
تاویل سے مراد اس جگہ مآل اور انجام ہے۔
مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی غفلت اور
بے فکری سے قرآن میں غور نہیں کیا۔ اور اس کی
تکذیب کے انجام بد کو نہیں پہچانا۔ اس لئے
تکذیب میں لگے ہوئے ہیں مگر موت کے بعد
ہی سب حقائق کھل جائیں گے اور اپنے کئے
کا مآلِ بد ہمیشہ کے لئے گلے کا ہار ہوجائے گا۔
(معارف القرآن)

لَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ۔ ای ولم یأتھم
حقیقۃ عاقبۃ التکذیب من نزول
العذاب بھم۔ (قرطبی)

اِیْ: اِیْ وَرَبِّیْ۔ ہاں میرے رب کی قسم
اِیْ حرف جواب ہے بمعنی نَعَمْ اور یہ ہمیشہ قسم
سے پہلے آتا ہے اِیْ کلمۃ تحقیق وایجاب
وتاکید بمعنی نعم (قرطبی)

النَّدَامَةَ: وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا
الْعَذَابَ۔ اور وہ پشیمانی کو چھپائیں گے جب
عذاب کو دیکھیں گے۔ ندامت کا یہ اخفاء مزید
فضیحت اور رسوائی کے خوف سے ہوگا۔ اور ندامت
سے مراد ندامت کے ظاہری آثار ہیں جیسے کہ رونا
پیٹنا اور ہاتھوں کا کاٹنا اور اخفاء ندامت کی
حالت شروع شروع میں ہوگی ورنہ بعد کو اس پر
قادر نہ ہوں گے۔

اَلنَّدَمُ وَالنَّدَامَةُ: کے معنی کسی فوت شدہ
امر پر حسرت کھانے کے ہیں۔ صاحب قرطبی
لکھتے ہیں الندامۃ: الحسرۃ لوقوع شئ او

فوت شئ (قرطبی) امام راغب فرماتے ہیں
النَّدمُ والنَّدامَة : التحسر من تغير
رأي فاتَتِ (راغب) نَدِمَ (س) نَدَمًا
وَنَدَامَةً : نَدِمَ و تَنَدَّمَ علی مافعل
اپنے کئے پر پشیماں ہونا۔ نَادِمٌ، فاعل۔ جمع
نَادِمُونَ وَنُدَّام ۔ اور ندمان کی جمع
نَدَامیٰ آتی ہے ۔ حدیث میں ہے مَرحَبًا
بالقَومِ غیر خزایا ولا ندامیٰ شاباش
ہے اس قوم کو یہ ذلیل ہوتے نہ شرمندہ۔ اپنی خوشی
سے مسلمان ہوتے۔
اور نادم کی جمع بھی ندامیٰ آتی ہے ۔ نَدِیم، مُنَادَمَۃٌ
اور ندامٌ۔ رفاقت شراب۔ شراب پینے کی رفاقت
ایک حدیث میں ہے اعوذ بِكَ مِنَ
الذنوب التی تورث النَّدَمَ۔ میں اس گناہ
سے پناہ چاہتا جو اپنے بعد ندامت بطور وراثت
کے چھوڑ جائے
مَوْعِظَةٌ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ
مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي
الصُّدُورِ -اے لوگو! بالیقین تمہارے
پاس نصیحت تمہارے پروردگار کے پاس سے
آگئی ہے اور شفاء بھی ان بیماریوں کے لئے
جو سینوں میں ہوتی ہیں ۔ (ماجدی)
موعظہ اور وعظ کے اصلی معنی ایسی چیزوں کا
بیان کرنا ہے جن کو سن کر انسان کا دل نرم
ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے ، دنیا کی غفلت
کا پردہ چاک ہو اور آخرت کی فکر سامنے آجائے
(معارف القرآن)
مَوْعِظَةٌ اور عِظَةٌ دونوں اسم ہیں۔
صُدُورٌ: صَدْرٌ کی جمع ہے۔ جس کے معنی
سینہ کے ہیں اور مراد اس سے قلب ہے۔
شِفَاءٌ : شفاء کے معنی بیماری دور ہونے
کے ہیں۔ الشِّفَاءُ مِنَ الْمَرَضِ : سلامتی
سے ہمکنار ہونا ۔ یہ مرض سے صحت یاب ہونے
کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے ۔
قرآن پاک میں ہے : هُدًى وَشِفَاءٌ ۔
فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ ۔ شَفَى يَشْفِي شِفَاءً (ض)
شَفَى اللهُ فُلَانًا مِن مَرَضِهِ ۔ اللہ تعالیٰ کا کسی
کے مرض کو کھو دینا وھو ازالۃ ما فیھا من رجس
ودنس (ابن کثیر)
شَأْنٌ : وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا
مِنْهُ مِن قُرْآنٍ ۔ شأن کے معنی حالت اور
اس اتفاقی معاملہ کے ہیں جو کسی کے مناسب حال
ہو۔ اس کا اطلاق صرف اہم امور پر اور حالات پر
ہوتا ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ وہ ہر وقت
کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے۔ اور وہ اپنی مخلوق
کی طرف ہمہ وقت متوجہ ہے۔

شأن الرأس، کھوپڑی کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ جس سے انسان کا قوام ہے۔ اس کی جمع شؤون آتی ہے۔ الشأن، الحال والامر الذی یتفق ویصلح راغب فی شأن، ای فی عمل من الاعمال (جوزی) محاورہ ہے ماشأنت شأنہ: میں نے اس کی کوئی خبر گیری نہ کی یا اس کی کوئی فکر نہ کی، ماء الشئون: آنسو۔ ضمیر الشان: وہ ضمیر جو جملہ کے شروع میں آئے اور اس کی تفسیر واقع ہو جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں ھُوَ ضمیر شان ہے۔ الشأن: الخطب والامر۔ (قرطبی) الشأن: الخطب (کبیر) ماشأن فلان فلان کا کیا حال ہے۔ شأن شأنا: قدر و منزلت والا ہونا۔ ماشأن شأنک: اس نے تمہاری کوئی پرواہ نہ کی۔ من شأنہ کذا: و من شأنہ ان یفعل کذا: ایسا کرنا اس کی فطرت میں ہے۔ والشأن: الامر واصلہ الھمز بمعنی القصد، من شأنت شأنہ اذا قصدت قصدہ (کشاف)

لفظ شأن اصل میں مصدر ہے اور کبھی اس کی ہمزہ کو الف سے بدل کر شان پڑھتے ہیں (روح) یہاں مصدر بمعنی مفعول ہے، وھو مصدر بمعنی المفعول ہے (جمل)

وکان من شأن العرب البول قائماً: عربوں کی عادت میں کھڑے ہو کر موتنا بھی تھا۔ یہ روایت ابن ماجہ کتاب الطہارۃ کی ہے۔ اسلام میں کھڑے ہو کر موتنا گناہ قرار دیا گیا ہے۔

یَعْزُبُ: وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ۔

عَزَبَ يَعْزُبُ وَ يَعْزِبُ (ن۔ض) عُزْبَۃ و عُزُوبَۃ: بے شوہر کے ہونا۔ مجرد ہونا۔ عورتوں سے دور ہونا۔ غائب ہونا۔ صیغہ صفت عَازِبٌ آتا ہے۔ العازبۃ: بیوی جمع عوازب۔ عَزَبٌ: وہ مرد جو عورت نہ رکھتا ہو۔ اس کی جمع عُزَّابٌ آتی ہے جیسے کافر کی جمع کُفَّار ہے۔ اور عَزَبَۃٌ: بے شوہر عورت۔ کنواری اس کی جمع عَزَبَاتٌ ہے۔ حدیث میں ہے شِرَارُکُمْ عُزَّابُکُمْ: تم میں بُرے وہ لوگ ہیں جو عیال و اطفال نہ رکھتے ہوں۔ عَزُوبَۃٌ وہ زمین جو چراگاہ سے دور ہو اور اس میں گھاس کم ہو۔ عَزَبَتِ الْاَرْضُ: زمین ویران ہو گئی گویا سبزے سے دور ہو گئی۔ اور العازب: اس آدمی کو کہتے ہیں جو گھاس کی تلاش میں اپنے اہل و عیال سے دور نکل جائے۔ عَزَبَ عَنْہُ حِلْمُہٗ، اس کی عقل جاتی رہی۔ اس کی مت ماری گئی۔

عُزبۃ : عورتوں سے دور رہنا۔ حدیث بخاری میں ہے فی اشتھینا النساء فاشتدّ علینا العُزبۃ بخاری ج ۲ ص ۳۲۵، ای فقد الازدواج والنکاح (حاشیہ بخاری)، وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ : اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

الروض العازب وہ چراگاہ جو دور ہو۔

قَوْمٌ مُعْزِبُوْنَ : وہ لوگ جن کے اونٹ چرنے کے لئے دور نکل گئے۔ عَزَبَ طُهْرُهَا اس کا خاوند غائب ہو گیا۔ ایک حدیث میں ہے : من قرأ القرآن فی اربعین یومًا فقد عَزَبَ، یعنی جس نے قرآن کو چالیس دن میں ختم کیا اس نے دیر کر دی۔ یعنی شروع کرنے کا زمانہ ختم کرنے کے زمانے سے دور ہو گیا۔ مسلم کتاب النکاح میں ایک حدیث ہے فَطَالَتْ عَلَيْنَا العُزْبَۃ یہاں بھی عُزْبَۃٌ کے معنی عورتوں سے دور ہونا ہے۔ ابن ماجہ کتاب الصدقات میں ہے ورجل خاف اللہ علی نفسہ العُزبۃ۔

العُزْبَۃ : التجرد، فی القاموس العَزَبُ محرکۃ من لا اهل له والاسم العُزْبَۃ والعُزُوبۃ۔

العازب : المتباعد فی طلب الکلاء عن اهله[1] ای ما یبعد وما یغیب (روح۔ کشاف)

قال ابن عباس یغیب (قرطبی)۔

وقال ابن قتیبۃ ما یبعد وما یغیب (جوزی)

اصل العزب من البُعد، یقال کلاءٌ عازبٌ اذا کان بعید المطلب وعزب الرجل باهله اذا ارسلها الی موضع بعید من المنزل والرجل سمی عزبًا لبعده عن الاهل وعزب الشئ عن علمی اذا بعد (کبیر)

ومعنی یعزب یغیب (فتح القدیر)

غُمَّةٌ : ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً

غُمَّةً : غَمَّ یَغُمُّ غَمًّا اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو چھپا لینے کے ہیں اسی سے الغمّی ہے جس کے معنی اس غبار اور ایسی تاریکی کے ہیں جو چیزوں کو چھپا لیں اور شدّتِ جنگ کو بھی الغمّی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں پر چھا جاتی ہے۔ اور بادل چونکہ سورج کی شعاعوں کو چھپا لیتا ہے اسی لئے اس کو بھی غَمَامٌ کہتے ہیں۔ جیسے کہ اَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ۔ غُمَّ الھلالُ کے معنی ہیں چاند ابر کے نیچے آ گیا، مطلع ابر آلود ہو گیا۔ حدیث میں ہے، فانْ غُمَّ عَلَيْكُم فَاَكْمِلُوا العِدَّۃ۔ اگر تم پر چاند مخفی ہو جائے یعنی نظر نہ آئے تو مہینہ تیس کا پورا کرو۔

وَلَا غُمَّةَ فِیْ فرائض اللہ۔ اللہ کے احکام

[1] راغب

اللہ کے احکام میں کوئی اخفاء اور چھپاؤ نہیں ہے
غَمٌّ اور غُمَّۃٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حزن و
کرب۔ هُوَ فِی غُمَّۃٍ : وہ غم اور پریشانی میں
ہے۔ یَغُمُّ فِکرَہٗ : وہ اپنی فکر اور اندیشہ
کو چھپاتا ہے۔ مسند احمد کی روایت میں ہے
انّ ھٰذہ الاٰیۃ حین اُنزلت غمّت اصحاب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غمًّا شدیدًا
غُمَّۃُ الامر : کے معنی ہیں کسی معاملہ کا پیچیدہ
اور مشتبہ ہو جانا۔ غُمَّ علیہِ الخبرُ : اس پر یہ خبر
پوشیدہ رہی۔ غَمٌّ : رنج۔ اس کی جمع غموم
آتی ہے۔ غَمَام اور غَمَامَۃ دونوں کے معنی ایک
ہی ہیں۔ قرآن میں ہے وَظَلَّلْنَا عَلَیکُمُ الغَمَامَ
اور حدیث میں ہے وعلیہ غَمَامَۃٌ تظلّہ۔
ثُمَّ لَا یَکُن اَمرُکُم عَلَیکُم غُمَّۃً پھر
تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ نہ رہے، جو کچھ کرنا ہے
کھلے بندوں کر گزرنا۔ چرانے چھپانے کی کوئی
ضرورت نہیں ہے۔ جب کوئی انسان اپنے
معاملہ میں حیران ہو اور اس کو کوئی صورت معاملہ
کے حل کرنے کی نہ ملے تو کہتے ہیں انّہ لفی غُمّۃ
من امرہ ای لم یھتد لہٗ۔
ابو الھیثم کہتے ہیں کہ غُمّۃ کے معنی یہاں مُبْھَمًا کے
ہیں۔ اور یہ غُمَّ علینا الھلال سے ماخوذ ہے
چنانچہ کلام عرب کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے

لعمری ما امری علیّ بغُمّۃٍ
نھاری ولا لیلی علیّ بسرمدٖ (کبیر)
والغُمَّۃُ : التغطیۃ من قولھم غُمّ
الھلال اذا استتر (فتح القدیر۔ قرطبی)
والغُمَّۃُ : السترۃ من غَمَّہٗ اذا سترہٗ[1]
اَلغَمُّ سترالشیٔ (راغب)
غُمَّۃً ای مستورًا ومنہ حدیث وائل ابن
حجر، لاغُمّۃ فی فرائض اللہ (روح)

فِرعَون : اصل میں یہ لفظ فارا۔ اوہ
تھا۔ مصری زبان میں فارا کے معنی محل اور اوہ
کے معنی اونچا بڑا تھا۔ فاراوہ: محل کبیر عالی
اس سے مراد شاہ مصر کی ذات ہوتی تھی۔
جیسے خلافتِ عثمانیہ کے زمانے میں باب عالی
سے مراد خلیفہ کی ذات ہوتی تھی۔ یورپ کی
زبانوں میں بھی لفظ فرعون آیا ہے۔
حضرت یوسف کے زمانے میں فرعون کا نام
اپوفس تھا۔ حضرت موسیٰ کو جس فرعون نے
پرورش کیا تھا اس کا نام رعمیس دوم یا
رعمسیس تھا، یونانی اس کو سوسٹریس کہتے تھے
اور عبرانی فرعون التسخیر۔ رعمیس کے بیٹے
منفتاح کے زمانے میں حضرت موسیٰ کی بعثت
ہوئی، اس سے مقابلہ ہوا اور یہی ۱۴۹۱ء قبل مسیح
میں غرق ہوا (معجم القرآن)

[1] کشاف

تلفت : قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔

لَفَتَ يَلْفِتُ لَفْتًا۔ لَفَتَ الشيءَ: کسی چیز کو دائیں یا بائیں موڑنا۔ لَفَتَ رِدَائَہٗ عن عُنُقِہٖ عَطْفَہٗ۔ یعنی کو گردن پر موڑنا۔ اور لَفَتَہٗ عن کذا۔ کسی چیز سے موڑنا۔ پھیر دینا۔ اسی سے التفات (افتعال) ہے جس کے معنی رُخ موڑنا اور کسی کی طرف توجہ کرنے کے ہیں۔

لَفَّتَ، تفعیل اور التفتَ کے معنی ایک ہی ہیں لَفَّتَ اور التفتَ الیہ کسی، کسی کیطرف منہ پھیر کر دیکھنا، توجہ کرنا، کسی کا خیال رکھنا۔

ابن ماجہ میں ہے: فَتَلَفَّتَ النَّاسُ يَمِيْنًا وَ شِمَالًا۔ ترمذی کی ایک روایت میں ہے و اذا التفتَ التفتَ معًا بینَ کتفیہ۔ جب آپ کسی طرف متوجہ ہوتے تو پوری طرح التفات فرماتے کہ کندھے بھی مڑ جاتے۔ یعنی صرف گردن پھیر کر نہیں دیکھتے۔

لَفُوْتٌ: وہ عورت جو دوسری طرف بھی راغب ہو۔ اپنے پہلے خاوند کی اولاد سے پیار کرنے والی۔ ایک روایت میں ہے:

لَا تَتَزَوَّجَنَّ لَفُوْتًا: لفوت عورت سے شادی نہ کر۔ چونکہ وہ پہلے خاوند کی اولاد کی طرف متوجہ رہے گی اور دوسرے خاوند کی پوری طرح خدمت نہ کرسکے گی۔ لَفَاتٌ: بے وقوف۔ احمق انسان۔ اسی سے لَفُوْتٌ اُس آدمی کو بھی کہتے ہیں جو متمرد اور سرکش ہو۔ حضرت عمرؓ کا ایک قول ہے وَ اَنْهَزُ اللَّفُوتَ وَ اَضُمُّ العَتُوْدَ۔ یعنی میں لفوت کو مارتا ہوں، جو نافرمانی کرے اور عتود کو ملا دیتا ہوں۔ عَتُوْدٌ بکری کا وہ بچہ جو ماں سے بھاگ نکلے۔

امام رازیؒ نے ازہری کا قول یہ نقل کیا ہے کہ لَفَتَ اور فَتَلَ دونوں کے معنی موڑنے کے ہیں اور یہ مقلوب ہیں۔ لیکن علامہ آلوسی بغدادی فرماتے ہیں کہ ان میں کوئی قلب وغیرہ نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان معنی اور اشتقاق کی مناسبت ہے۔ اور کئی اہل لغت نے ان دونوں کو اخوان لکھا ہے۔ لہٰذا ان میں سے کوئی بھی دوسرے سے مقلوب نہیں ہے۔

ولا يدعى فيه قلب حتى يرجع احد اللفظين في الاستعمال على الآخر (جل) لَفَتَہٗ يَلْفِتُہٗ إذَا لَوَاهُ (قرطبی)

قال الرازی: اللَّفْتُ في اصل اللغة الصرف عن امر و اصلہ اللیّ (کبیر) و قال صاحب الکشاف، لِتَلْفِتَنَا لِتَصْرِفَنَا۔ وَ اللفتُ و الفتلُ اُخوان و مطاوعهما الالتفاتُ والانفتال (کشاف)۔ اللفتُ و الفتلُ

اخوان (بیضاوی)

بَدَنٌ : فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۔

بَدَنَ يَبْدُنُ بَدَنًا وَبُدُوْنًا (ن) وبَدُنَ (ک) بَدَانَةً وبَدَانًا کے اصل معنی موٹا اور فربہ ہونے کے ہیں۔ قربانی کے جانور کو بھی بُدنہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ فربہ ہوتا ہے۔ صیغہ صفت بَادِنٌ و بَادِنَۃ کے وزن پر آتا ہے۔ کہتے ہیں اِمْرَأَةٌ بَادِنَةٌ وبَادِنٌ موٹی عورت۔ بَدُنَ کی طرح بَدَّنَ تفعیل کے معنی بھی موٹا ہونے کے آتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے : لَا تُبَادِرُوْنِي بِالرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ فَاِنِّي قَدْ بَدَّنْتُ کہ میں اب بوڑھا اور عمر رسیدہ ہوگیا ہوں اسلئے رکوع اور سجدہ میں مجھ سے پہلے نہ کھڑے ہوا کرو۔ اسی طرح کی روایت مسند احمد کی ہے تَتَابَدْنَ وتَعْقِلَ يَقْرأُ مَا شَاءَ الله ۔

البَدَنُ، جَسَدٌ کے ہم معنی استعمال ہوتا ہے بعض اہل لغت کے نزدیک بدن کا اطلاق سر کے سوا باقی دوسرے جسم پر ہوتا ہے۔ ان دونوں یعنی بدن اور جسم میں فرق یہ ہے کہ بدن باعتبار عظمتِ جُثّہ کے بولا جاتا ہے۔ اور جسد باعتبار رنگ۔ ثوبٌ مجسَّدٌ کے معنی ہیں رنگین کپڑا۔ بدنٌ کی جمع ابدانٌ آتی ہے بخاری شریف کی روایت میں ہے۔ وشربوا حتّٰی صلحت اَبْدَانُهُمْ (بخاری کتاب الطب)

بَدَنٌ : چھوٹی زرہ جو بدن کے ساتھ مل جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے پوچھا : ماعندك ؟ قال فرسي وبَدَني، یعنی میرے پاس ایک گھوڑا اور ایک زرہ ہے بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ بدن کا اطلاق بے روح جسم پر ہوتا ہے، اکثر اہل تفسیر نے یہاں بدن سے مراد فرعون کا لاشہ ہی لیا ہے لہذا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ غرق دریا کے بعد تیری نعش کو کنارے لگا دیں گے تاکہ بعد کے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔

جدید تحقیقات نے بھی اس کی تاکید کی ہے کہ فرعون کی لاش آج تک محفوظ ہے اور یہ لاش قاہرہ کے عجائب خانہ میں موجود ہے، مورخین اور ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ لاش رعمیس ثانی کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابل وہم عصر ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ الفاظ قرآنی کی صحت اس کے ثبوت پر موقوف نہیں ہے ممکن ہے کہ آثار قدیمہ کے محققین کو مغالطہ ہوگیا ہو۔ بعض اہل تفسیر نے لفظ بدن سے مراد زرہ کی ہے۔ وجہ اس کی یہ کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے غرق ہونے کا یقین نہ تھا لہذا ان کے قلوب کو مطمئن کرنے کے لئے فرعون کی زرہ جو موتیوں اور یواقیت سے مزین تھی، دریا سے باہر نکالدی پھر بنی اسرائیل کو یقین ہوگیا کہ ہمارا دشمن غرق ہوگیا ہے۔

ملخص قرطبی، راغب، زاد المسیر، جمل

خِزْیٌ : اَلْخِزْیُ ذلت رسوائی۔ ایسی حرکت جس کے ارتکاب سے انسان شرمسار ہو۔ احساس ندامت۔ فعل خَزِیَ یَخْزٰی : ذلیل ہونا۔ محاورہ ہے اَخْزِھَا بِالْبِرِّ اس کو نیکی سے شرمندہ کرو۔ برائی سے نہیں خَزِیَ مِنْہُ وہ اس کی طرف سے نادم ہوا۔ ایک دعا کے الفاظ ہیں اَللّٰھُمَّ احْشُرْنَا غَیْرَ خَزَایَا وَلَا نَادِمِیْنَ اے اللہ حشر میں ہمیں اس حالت میں زندگی عطا کرنا کہ اپنے کیے پر ہم شرمسار اور نادم نہ ہو۔ قرآن میں ہے لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے۔ خَزَیْتُہٗ تو نے اسے رسوا کر دیا۔ خَزِیَ یَخْزٰی خِزْیًا ، وہ شرمندہ ہوا ، ذلیل ہوا۔ وخَزِیَ خَزَایَۃً حیا کرنا۔ اسم التفضیل خِزْیٌ سے اَخْزٰی آتا ہے۔ قرآن میں ہے وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَخْزٰی۔ اَخْزٰی یُخْزِی (افعال) ذلیل کرنا۔ اس کا اسم فاعل مُخْزٍ آتا ہے

شَكٌّ : فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ۔

لفظ شک کے اصل معنی ایک شئی کو دوسری شئی کے ساتھ ملانے کے ہیں۔ اور یہ شَكَّ الْجَوَاھِرَ فِی الْعِقْدِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں موتیوں کو ہار میں پرونا۔ اور شَكَكْتُ الصَّیْدَ شکار کرنے کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں کو باندھنا۔ شکاک البیوت : مکانات کا ایک صف میں ملے ہوئے ہونا۔ اور شکائک : وہ افراد جو قوم میں مل گئے ہوں حالانکہ وہ اس قوم کے ہیں نہیں شَكَّ الرَّجُلُ فِی السِّلَاحِ کے معنی ہیں کہ آدمی نے اسلحہ کو اپنے جسم سے پیوستہ کر لیا۔ تو جب یہ کہا جاتا ہے کہ شَكَّ فُلَانٌ فِی الْاَمْرِ۔ تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ دو چیزوں کے درمیان رُک گیا ہے کہ دونوں میں ہر ایک جانب اختیار اور ترک میں مساوی ہیں۔ شَكَّ عَلَیْہِ الْاَمْرُ کا معنی معاملہ کے مشتبہ ہو جانے کے ہیں۔ اور شَكَّ فِی الْاَمْرِ کسی معاملہ میں شبہ ہونا۔

صاحب قرطبی نے لکھا ہے کہ : شک کے لغوی معنی ضیق اور تنگی کے ہیں۔ اور یہ شَكَّ الْخَیَّاطُ الثَّوْبَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں درزی کا کپڑے کو دُور دور ٹانکے لگانا۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ اَلشَّكُّ : اِعْتِدَالُ النَّقِیْضَیْنِ عند الانسان وتساویھما دو نقیضوں کا ذہن میں برابر اور مساوی ہونے کا نام شک ہے۔ پھر شک یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ ان دونوں کی علامتیں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں یا اس لئے کہ دونوں میں سے کسی پر دلیل نہیں ہوتی۔ اور یہ شَكَكْتُ الشَّیْءَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز میں شگاف ڈال دینا یا چاک کر ڈالنا تو شک کے معنی شگاف

ڈال دینے کے ہوئے اور کسی شئ کے اس طرح ہونے کے ہوئے کہ اس میں رائے کو قرار حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس پر اعتماد ہو سکتا ہے

وقال صاحب احکام القرآن القرطبی و الشك فی اللغۃ اصلہ الضیق یقال شكّ الثوب ای ضمّہ بخلال حتی یصیر کالوعاء[1]

قال الواحدی: الشَكُّ فی وضع اللغۃ ضم الشئ الی بعض (کبیر)

شكّ الخیاطُ الثوبَ: باعد بین الغرزتین[2] درزی کا دور دور ٹانکے لگانا۔

بحمد اللہ سورۃ یونس مکمل ہوئی

ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ مطابق یکم اپریل ۱۹۷۶ء

شرح الفاظ القرآن من سورۃ ھود

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٓرٰ۔ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ
فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝

اُحْکِمَتْ۔ احکام سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کلام کو ایسا درست کیا جائے جس میں کسی لفظی اور معنوی غلطی یا فساد کا احتمال نہ رہے اس بنا پر اس اعتبار سے اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ کے معنی یہ ہوں گے کہ حق تعالیٰ نے ان آیات کو ایسا بنایا ہے کہ ان میں کسی لفظی یا معنوی فساد اور خلل یا باطل کا کوئی امکان و احتمال نہیں۔ یہ احکام البناء سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں تعمیر کو مضبوط بنانا۔

ای جُعِلَت محکمۃ کلہا لا خلل فیہا ولا باطل قرطبی عن قتادۃ۔ و الاحکام منع القول من الفساد۔ (قرطبی) اس معنی کے اعتبار سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ محکم یہاں منسوخ کے مقابلہ میں ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کی آیات کو مجموعی لحاظ سے محکم غیر منسوخ بنایا ہے۔ تورات اور انجیل کی طرح کوئی کتاب ان کو منسوخ نہیں کر سکی۔ البتہ قرآن پاک کی بعض آیات خود قرآنی آیات سے منسوخ ہو سکتی ہیں اور یہ اس کے محکم ہونے کے منافی نہیں ہے۔

صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ اُحْکِمَتْ میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ حُکْمٌ (بضم الکاف) کرُمَ سے ماخوذ ہو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ قرآن کی آیات کو پُر از حکمت بنایا گیا ہے۔ اس کی تائید قرآن پاک کی دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ آیات الکتاب الحکیم۔ اور یہ دونوں معنی صحیح ہیں۔ چونکہ قرآن پاک کی آیات محکم بھی ہیں جس میں کسی طرح کا کوئی خلل نہیں اور پُر از حکمت احکام بھی اس میں موجود ہیں۔ لہٰذا ان ہر دو معانی کے لحاظ سے قرآن محکم ہے۔

حَکَمٌ کے اصل معنی کسی چیز کی اصلاح کے لئے اسے روک دینے کے ہیں۔ اسی اعتبار سے لگام کو حکمۃ الدابۃ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جانور کو قابو میں رکھتا ہے۔

احکمت السفینہ کے معنی ہیں میں نے نادان کو نادانی سے روک دیا۔ ایک شاعر کہتا ہے

اَبَنی حنیفۃ احکموا سفھاءکم
انی اَخاف علیکم ان أغضبا

کہ اے بنی حنیفہ اپنے نادانوں کے منہ میں لگام دو۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں تمہارے خلاف بھڑک نہ اٹھوں، لہذا تم قبل از وقت سمجھ جاؤ۔ تو قرآن پاک اس اعتبار سے بھی محکم ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ہر طرح کی بے اعتدالیوں سے روک دیتا ہے۔ اسی سے حاکم ہے جس کی جمع حکّام آتی ہے۔ لوگوں کو بے راہ روی سے روکنے والے۔ عدل وانصاف کے ذریعہ ظلم وعدوان سے لوگوں کی حفاظت کرنے والے۔

فُصِّلَتْ : تفصیل کے اصل معنی یہ ہیں کہ دو چیزوں کے درمیان امتیاز کیا جائے اور کلام کو واضح اور کھول کر بیان کیا جائے۔ جیساکہ کُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰہُ تَفْصِیْلًا۔ اور ہم نے ہر چیز کو خوب کھول کر بیان کر دیا ہے تمام احکام الگ الگ کر کے بتا دیئے ہیں۔ اصل میں فَصْلٌ کے معنی دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اس طرح علیحدہ کر دینے کے ہیں کہ ان کے درمیان فاصلہ ہوجائے اسی سے مَفَاصِلُ ہے جو مَفْصَلٌ کی جمع ہے جس کے معنی جوڑ کے ہیں۔ اور سورۂ یوسف میں وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ کے معنی یہ ہیں کہ جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا اور یہ فَصَلَ الْقَوْمُ عن مکان کذا سے ماخوذ ہے۔ فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عقائد۔ عبادات۔ معاملات۔ معاشرت اور اخلاق وغیرہ کے مضامین کو الگ الگ کر کے بیان کر دیا ہے اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ لوح محفوظ سے قرآن پاک کو حسب ضرورت علی الاقساط اُتارا گیا ہے تاکہ اس کا حفظ اور اس پہ عمل دونوں آسان ہوجائیں۔ یَوْمُ الْفَصْلِ کفر وایمان میں فیصلے کا دن۔ مراد قیامت ہے۔ الفصل اِبَانَۃُ اَحَدِ الشیئین من الآخر حتی یکون بینھما فُرْجَۃٌ (راغب) حدیث میں ہے : وکان کلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصلاً۔ آپ کا کلام بالکل واضح اور صاف ہوتا تھا۔ اَمْرٌ فَصْلٌ : قطعی فیصلہ جس سے حق وباطل بالکل ممتاز ہوجائے۔

مَتَاعٌ : یُمَتِّعْکُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا۔

مَتَعَ (ف) مُتُوْعًا۔ مَتَعَ الشیءُ : کے اصل معنی ہیں کسی شئی کا دراز ہونا۔ بڑھنا۔ بلند ہونا۔ مَتَعَ النَّھَارُ : دن بلند ہوگیا۔ مَتَعَ النَّبِیْذُ : نبیذ کا بہت سُرخ ہوجانا۔ مَتَعَ الرَّجُلُ : سخی اور خوش طبع آدمی کہ لوگ اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

المتاع : عرصہ دراز تک فائدہ اٹھانا۔ محاورہ ہے متعه الله بكذا اللہ تعالیٰ اس کو دیر تک اس کو فائدہ اٹھانے کا موقع دے۔ تمتع به اس نے عرصہ دراز تک اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم خدا کی طرف جھکے رہے تو وہ دنیا میں تمہارے لئے عزت و شرف، وسعتِ رزق اور کشادہ زندگی کو مقدر کر دیگا تاوقتیکہ تم خود خدا سے ہٹ جاؤ۔ واصل الامتاع الاطالة (قرطبی)

المتوع : الامتداد والارتفاع (راغب)

صیغہ صفت کا ماتِعٌ کے وزن پر آتا ہے۔ ہر عمدہ اور بہت اعلیٰ چیز کو کہتے ہیں۔ رجلٌ ماتعٌ بہت عمدہ اور بھلی عادتوں کا آدمی۔

شرابٌ ماتعٌ : عمدہ اور بہترین شراب۔ عام طور پر شرابٌ ماتعٌ سے مراد سرخ رنگ کی شراب ہوتی ہے۔ چونکہ سرخ شراب کہتے ہیں کہ بہت عمدہ ہوتی ہے۔

دَآبَّة : وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا

دابہ کے معنی یہاں مطلق جانور کے ہیں، ہر قسم کے حیوانات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ پرندے جانور بھی اس میں داخل ہیں۔ کیونکہ ان کا آشیانہ بھی کہیں نہ کہیں زمین پر ہی ہوتا ہے اور دریائی جانور بھی دابہ میں شامل ہیں کیونکہ ان کا تعلق بھی زمین ہی سے ہے۔ اصل میں لفظ دابّة دَبِيْبٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں زمین پر آہستہ آہستہ رینگ کر چلنا۔ اس لئے اس کا ابتدائی لغوی اطلاق حشرات الارض پر ہوتا ہے

صاحب کبیر زجاج کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ اَلدَّآبَّة اسم لكل حيوان لان الدابة اسمٌ ماخوذ من الدبيب واطلق على كل حيوان ذي رُوحٍ (كبير)

عرب کی اصطلاح میں یہ لفظ گھوڑے کیساتھ مخصوص ہوگیا ہے۔ مگر یہاں اس سے مراد لغوی معنی ہیں۔

دَبَّ يَدِبُّ دَبًّا و دبيبًا۔ دَبَّ الصَّغِيْرُ: بچے کا گھٹنے کے بل چلنا۔ ودَبَّ الْجَيْشُ دبيبًا: لشکر کا آہستہ چلنا۔ دَبَّتْ عَقَارِبُهُ : اس کی چغلخوریاں اور ریشہ دوانیاں چل پڑیں پھیلنے لگیں۔

وكل حيوانٍ في الارض دَابَّةٌ (جمل)

والدابة اسمٌ لكل حيوانٍ يَدِبُّ (جوزی)

والدابة كل حيوانٍ يَدِبُّ (قرطبی)

لفظ دابّة کا اطلاق جس طرح مذکر اور مؤنث پر ہوتا ہے اسی طرح ذوی العقول اور غیر ذوی العقول پر بھی ہوتا ہے۔

الدابۃ اسم لکل حیوان ذی روح ذکراً کان او انثیٰ عاقلاً کان او غیرہ (روح)

رِزْق: رزق لغت میں ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے جاندار اپنی غذا حاصل کرے اور جس کے ذریعہ اس کی روح کی بقاء اور جسم میں نما یعنی فربہی اور بڑھوتری ہوتی ہے۔ امام قرطبی لکھتے ہیں: الرزق: حقیقتہ ما یتغذی بہ الحیّ، ویکون فیہ بقاء روحہ ونماء جسدہ (قرطبی)

موجودہ صدی کے بہترین مفسّر اور قرآن پاک کے رمز شناس مفتی اعظم، صاحبِ معارف القرآن لکھتے ہیں کہ: رزق کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جس کا رزق ہو وہ اس کا مالک بھی ہو کیونکہ تمام جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے مگر وہ اس کے مالک نہیں ہوتے۔ ان میں مالکیت کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی، اسی طرح چھوٹے بچے اپنے رزق کے مالک نہیں ہوتے مگر رزق ان کو ملتا ہے (معارف)

رزق کے اس عام معنی کے اعتبار سے علماء نے لکھا کہ رزق حلال بھی ہو سکتا ہے اور حرام بھی، کیونکہ جو شخص کسی دوسرے کا مال ناجائز طور پر لے کھائے تو یہ مال غذا تو اس کی بن گیا مگر حرام طور پر بنا۔ اگر یہ اپنی حرص میں اندھا ہو کر ناجائز طریقے استعمال نہ کرتا تو جو رزق اس کے لئے مقرر تھا، وہ جائز طور پر اس کو ملتا (معارف)

لفظ رزق کے اصل معنی تو وہ ہی ہیں جو اوپر اجلّہ علماء سے نقل ہوئے ہیں اس کی جمع اَرْزَاقٌ آتی ہے۔ اس کے بعد اس کا اطلاق اس عطیہ پر ہوتا ہے جو جاری رہنے والا ہو خواہ دنیوی ہو یا اخروی۔ اور استعارۃً انسان کی قسمت اور اس کے نصیبہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۔ یہاں رزق بمعنی حصہ اور نصیبہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنا نصیبہ یہ ہی بنا لیا ہے کہ نعمتِ الٰہی کی تکذیب کرتے پھرو۔

اُمَّة: وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ۔

امّۃ انسان کی وہ جماعت جن کے مابین دینی یا جغرافیائی اور عصری رشتہ ہو لیکن یہاں لفظ امّۃ اپنے حقیقی معنی میں نہیں ہے بلکہ مجازی معنی مدت اور وقت مراد ہے اور باجماع صحابہ اور بالاتفاق تمام مفسرین نے یہاں امّۃ کے معنی وقت ہی کے لئے ہیں۔ (الامۃ ھنا المدّۃ من الزمان قالہ ابن عباس وقتادۃ ومجاھد والجمھور حاشیہ ماجدی)

وقال الامام القرطبی، الی اُمّۃ۔ الی اَجَلٍ معدودٍ وحینٍ معدود، فالامّۃ ھنا المدّۃ قالہ ابن عبّاس ومجاھد وقتادۃ

وجمھور المفسرین، واصل الأمة الجماعة، فعبّر عن الحین والسنین بالامّة لان الامّة تکون فیھا (قرطبی)

دراصل لفظ امۃ مشترک ہے جس کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔ ۱۔ امۃ بمعنی جماعۃ جیساکہ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ۔

۲۔ انبیاء علیہم السلام کے پیروکار۔ جیساکہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا۔

۳۔ اس خوش بخت انسان کو بھی اُمۃ کہا جاتا ہے جو صفاتِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ کا جامع ہو جس میں لوگ اس کی اقتدا کرتے ہوں ان ابراھیم کَانَتْ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيفًا۔

۴۔ امت کا لفظ دین اور ملت کے معنی میں بھی قرآن پاک نے استعمال کیا ہے جیسا اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓى أُمَّةٍ۔

۵۔ امۃ بمعنی حین یعنی مدت اوقت اور عرصہ دراز جیساکہ سورہ یوسف میں ہے: وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ۔ ۶۔ انسان کے قدوقامت پر بھی اُمَّۃٌ کا لفظ بولا جاتا ہے، کہتے ہیں فلان حَسَنُ الامۃ ای القامۃ۔ ۷۔ امۃ کا لفظ بمعنی اُمّ بھی آتا ہے۔ کہتے ہیں: ھٰذہٖ اُمَّۃُ زَیْدٍ ای اُمُّ زَیْدٍ[1]

والمراد بالامّۃ المعدودۃ الاجل للعلوم[2]

معلوم ہوا کہ لفظ امۃ کے حقیقی معنی تو انسانوں کی جماعت اور فرقہ کے ہیں۔ استعارۃً ایام اور شہور پر اور سنین کی جماعت پر بھی بولا جاتا ہے۔ صاحب روح المعانی نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: ای طائفۃٍ من الایام قلیلۃ (روح

یَئُوسٌ: اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ

یَئُوسٌ، یَائِسٌ صیغہ صفت کے معنی میں ہے اس کا مصدر اَلْیَأْسُ آتا ہے جس کے معنی مایوسی اور ناامیدی کے ہیں۔ اور یَئِسَ مجرد اور اِسْتَيْأَسَ مزید فیہ دونوں کے معنی ایک ہی آتے ہیں جیساکہ عَجِبَ اور اِسْتَعْجَبَ قرآن میں ہے قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ۔

جس طرح کافروں کو مُردوں کے جی اُٹھنے کی امید نہیں اسی طرح ان کو آخرت کے آنے کی بھی امید نہیں ہے فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا

اور لفظ یَئِسَ جاننے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیساکہ: اَلَمْ تَيْأَسُوْا انّی ابن فارس زَهْدَم۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں فارس زھدم کا بیٹا ہوں۔ قرآن میں ہے اَفَلَمْ يَايْئَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا۔ یہاں اکثر اہل تفسیر نے یَایْئَسُ کے معنی یَعْلَم سے کئے ہیں۔ مگر یہ اس کے حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ لازم معنی ہیں کیونکہ کسی چیز کے انتفاء کا علم اس سے ناامید ہونے کو مستلزم ہے

[1] زاد المسیر [2] قرطبی جزء ۹ صفحہ ۱۰ طبع جدید ۱۳۸۷ھ القاھرہ

اَلْیَأْسُ اَحَدُ الرَّاحَتَیْنِ ناامیدی دو
راحتوں میں سے ایک ہے۔ مقولہ ہے: السِّلُّ
دَاءُ یَأْسٍ، سِل ناامیدی کی بیماری ہے۔
قرآن پاک میں ہے وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ
اللّٰہِ۔ وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ
مِنْ نِّسَآئِکُمْ۔

یَئِسَ س۔ یَیْئَسُ وَیَیْئِسُ (ح) یَأْسًا
وَیَأَسَۃً یعنی سَمِعَ اور حَسِبَ دونوں ابواب
سے آتا ہے۔ صفتِ فاعلی یَائِسٌ اور یَئُوْسٌ
آتی ہے۔ جمع یُئُوْسٌ بضم الیاء ہے۔ صفت
مفعولی مَیْئُوْسٌ امر کا صیغہ اس باب سے اِیْأَسْ۔
نہی لَاتَیْأَسْ تفضیل اَیْأَسُ ظرف مَیْأَسٌ۔
اَیْأَسَ اِیْئَاسًا افعال۔ کسی کو ناامید کردینا
اس باب سے امر کا صیغہ اَیْئِسْ آتا ہے۔
حدیث میں ہے فَاَیْئِسْہُ مِنَّا کَمَا اَیْئَسْتَہٗ
مِنْ رَحْمَتِکَ تو اس کو ہم سے ایسا ناامید
کردے جیسا تو نے اس کو اپنی رحمت سے
مایوس کیا ہے۔

یَئُوْسٌ: مِنْ یَئِسَ یَیْأَسُ (س) وحکی
سیبویہ یَئِسَ یَیْئِسُ علی فَعِلَ یَفْعِلُ (قرطبی)

اَخْبَتُوْا: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰی رَبِّھِمْ اُولٰٓئِکَ
اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ۔ بے شک جو لوگ ایمان
ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور اپنے
پروردگار کی طرف جھکے وہ اہل جنت ہیں۔
یعنی اپنے پروردگار کا خشوع اور انقیاد دل میں
پیدا کیا۔ (ماجدی)

اِخْبَاتٌ کا اصل مادہ خَبْتٌ ہے جس کے معنی
نشیبی اور نرم زمین کے ہیں۔ اسی سے اِخبات
(افعال) نرمی اور تواضع کے معنی میں استعمال
ہونے لگا ہے۔ صیغہ صفت فاعلی مُخْبِتٌ ہے
جس کی جمع مُخْبِتُوْنَ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:
وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ۔ خَبَتَ ذِکْرُہٗ: کسی کا چرچا
مٹ جانا۔ شہرت ختم ہوجانا۔ اَخْبَتَ اِلَی اللّٰہِ
خدا کے سامنے عاجزی کرنا۔ خَبْتَۃٌ تواضع
فروتنی۔ خَبِیْتٌ حقیر اور کم درجہ کی شئے۔
ھُوَ خبیتُ النفس: وہ شکستہ دل ہے۔ کم درجہ
کا آدمی ہے۔

والاِخبَاتُ ھو الخشوع والخضوع وھو
ماخوذٌ من الخبت وھو الارض المطمئنۃ
ولفظ الاخبات یتعدی باِلیٰ وباللام
فاذا قلنا اَخْبَتَ فلانٌ الی کذا فمعناہ
اطمأنَّ الیہ واذا قلنا اَخبتَ لہٗ فمعناہ
خشع لہ (کبیر) وقال صاحب روح المعانی
واصل الاخبات نزول الخبت وھو المنخفض
من الارض (روح)

لہ کبیر

الإخباتُ، الخشوع للمخافة الثابتة فی القلب، واصل الإخباتِ الاستواء من الخبت وھوالارض المستویۃ الواسعۃُ فالإخبات: الخشوع والاطمینان (قرطبی)

اَرَاذِل : ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّأْیِ

الرَّذْلُ وَالرُّذَالُ : وہ چیز جو ذنی اور ردی ہو۔ اور اس کے ردی ہونے کی وجہ سے لوگ اس سے بے اعتنائی برتیں۔ وَمِنکُم مَنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ : اور تم میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو بالکل گھٹیا حالت کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ میں لفظ اَرْذَلُوْنَ اَرْذَلُ کی جمع ہے جس کے معنی حقیر اور ذلیل لوگ ہیں۔

صاحبِ کبیر نے علامہ واحدی لغوی کا قول نقل کیا ہے کہ اَرْذَل یہ رَذْلٌ کی جمع ہے وہ چیز جو منظر اور حالت میں سب سے کم درجہ کی ہو۔ اور اَرْذُل کی جمع اَرَاذل آتی ہے۔ جیسے اکابِرُ واَحَاسِنُ۔ علامہ واحدی کے قول کے مطابق اَرَاذِلُ جمع الجمع ہوگی۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اراذل جمع اَرْذُل واَرْذَل جمع رَذْلٍ مثل کلب واَکْلُبٍ واکالیب (قرطبی)

صاحبِ جمل نے لکھا ہے کہ اراذل میں دونوں احتمال ہیں ایک تو یہی ہے کہ یہ جمع الجمع ہو۔ یعنی رَذْلٌ کی جمع اَرْذُلٌ (بضم الذال) اور اَرَاذِلُ اَرْذُلٌ کی جمع ہو۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ اَرَاذِلُ : اَرْذَلُ واحد کی جمع ہو جیسے اَکْبَرُ کی جمع اَکَابِر اور ابرق کی جمع اَبَارِق۔ رَذُلَ (ک) وَرَذِلَ (س) رَذَالَۃً وَرُذُوْلَۃً حقارت کے قابل ہونا اور رَذَلَہٗ (ن) رَذْلًا و اَرْذَلَہٗ : رذیل کرنا، ناپسند کرنا، اسم تفضیل اَرْذَل اَرَاذِلُ اسی کی جمع ہے۔ جمع سالم اَرْذَلُوْنَ آتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ اَرَاذِل ارذل کی جمع ہے حقیر و ذلیل کو کہا جاتا ہے جس کی قوم میں کوئی حیثیت اور عزت نہ ہو۔ معارف

بَادِیَ الرَّأْیِ : نظر بظاہر دیکھنے میں۔ پہلی نظر میں معلوم ہو جانے والی حقیقت۔ ادنیٰ درجہ کے لوگ۔ بادی ظاہر۔ کھلم کھلا۔ بَدْوٌ سے اسم فاعل ہے۔

تَزْدَرِیْ : لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُکُمْ

تَزْدَرِیْ کا اصل مادہ زَرْیٌ ہے۔ زَرٰی یَزْرِیْ زَرْیًا وَزِرَایَۃً وَمَزْرِیَۃً عیب لگانا، عتاب کرنا۔ زَرَیْتُ علیہ زِرَایَۃً کے معنی ہیں کسی پر عیب لگانا۔ اور اَزْرَیْتُ بِہٖ اور اِزْدَرَیْتُ (افتعال) کے معنی ہیں کسی کو حقیر اور بے وقعت جاننے کے ہیں۔ کہتے ہیں اَزْرَیْتُ بہ اِزْرَاءً : میں نے اس کو بے حقیقت جانا۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ تَزْدَرِیْ اصل میں تزترى (افتعال) ہے حرف تاء کو دال سے تبدیل کر دیا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ حرف زاء مجہورہ ہے اور تاء مہموسہ۔ لہٰذا تا کو زاء کے بعد واقع ہونے کی وجہ سے دال سے تبدیل کر دیا گیا (قرطبی)

تَزْدَرِیْ اَعْیُنُکُمْ اصل میں تَزْدَرِیْھِمْ اَعْیُنُکُمْ ہے، تَزْدَرِیْ کا مفعول حذف ہے معنی یہ ہے کہ تم انہیں نظرِ حقارت سے دیکھتے ہو یقال اَزْرَیْتُ عَلَیْہِ اذا عِبْتَہٗ۔ وَزَرَیْتُ عَلَیْہِ اِذَا حَقَّرتہ (قرطبی)

وقولہ تَزْدَرِیْ اصلہ تَزْتَرِی فقلبت تاء الافتعال دالاً (جمل)

واصل الاِزْدِرَاء اَلْاِعَابَۃ (روح المعانی)

مسند دارمی کے مقدمہ میں ہے، کَفٰی اِزْرَاءً عَلٰی قَوْمٍ ان تُخَالِفَ اَفْعَالَھُمْ۔

فَارَ : وَفَارَ التَّنُّوْرُ۔

فَارَ یَفُوْرُ فَوْرًا کے معنی سخت جوش مارنے کے ہیں۔ فَارَتِ الْقِدْرُ : ہانڈی کا جوش مارنا۔

فَارَتِ الْمَاءُ پانی کا زمین سے پھوٹنا

فَارَ الْعِرْقُ : رگ کا پھڑکنا، مضطرب ہونا۔

اَلْفَوْرُ مصدر ہے بمعنی جلدی۔ کہا جاتا ہے رَجَعَ مِنْ فَوْرِہٖ : بلا توقف بہت جلدی واپس ہوا۔ فَوْرُ کُلِّ شَیْءٍ : ہر چیز کا اول۔

ایک محاورہ ہے: فعلتُ کَذَا مِنْ فَوْرِیْ میں نے جلدی میں اور جوش میں آکر ایسا کر لیا۔ قرآن میں ہے۔ وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا یعنی کافر تم پر دفعۃً جوش کے ساتھ حملہ کر دیں۔

والفوران : الغلیان (قرطبی)

الفور، شدۃ الغلیان (راغب)

ایک حدیث میں ہے ان شِدَّۃَ الحَرِّ من فور جھنم : گرمی کی تیزی دوزخ کے جوش مارنے سے ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے : اِذَآ اُلْقُوْا فِیْھَا سَمِعُوْا لَھَا شَھِیْقًا وَّھِیَ تَفُوْرُ

تَنُّوْرٌ : لفظ تنور کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سطح زمین کو بھی تنور کہتے ہیں، روٹی پکانے کے تنور کو بھی تنور کہا جاتا ہے، زمین کے بلند حصہ کے لئے لفظ تنور بولا جاتا ہے۔

اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا کہ اس جگہ تنور سے مراد سطح زمین ہے اس سے پانی اُبلنے لگا۔ بعض نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور مقام، عین وردہ، ملک شام میں وہ مراد ہے۔ اس سے نکلنے لگے۔

بعض نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا تنور جو کوفہ میں تھا وہ مراد ہے، اکثر مفسرین حضرت حسنؒ، مجاھد، شعبی، حضرت عبد اللہ بن عباس وغیرھم نے اسی کو

اختیار کیا ہے۔ اور شعبی تو قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہ تنور شہر کوفہ کے ایک گوشہ میں تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی مسجد کوفہ کے اندر بنائی تھی، اسی مسجد کے دروازہ پر یہ تنور تھا، حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ جب آپ یہ دیکھیں کہ آپ کے گھر کے تنور سے پانی اُبلنے لگا تو سمجھ لیں کہ طوفان آگیا۔ مفسر قرطبی لفظ تنور کے سات معنی بیان کرکے ان میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ، اگرچہ تنور کے معنی میں مفسرین کے اقوال مختلف نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب طوفان کا پانی اُبلنا شروع ہوا تو روٹی پکانے کے تنور سے بھی نکلا، سطح زمین سے بھی اُبلا، ملک شام کے عَیْنُ الْوَرْدَۃ سے بھی پھوٹ پڑا جیسا کہ قرآن نے خود تصریح فرمائی ہے فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا۔

(معارف القرآن۔ قرطبی۔ روح المعانی)

مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ وَفَارَ التَّنُّوْرُ فقرہ کے صحیح معنی صرف اس قدر ہیں کہ زمین سے پانی نے جوش مارنا شروع کیا، تنور کے معنی صرف سطح زمین یا بلند سطح زمین کے ہیں یا چشمہ پھوٹنے کی جگہ کے ہیں۔

ابن عباس صحابی اور متعدد تابعین سے یہی معنی مروی ہیں۔

التنور وجہ الارض (ابن جریر عن ابن عباس) وجہ الارض (ابن جریر عن الضحاک وعکرمہ) التنور وجہ الارض وکل مفجر ماء ومحفل ماء الوادی (قاموس) التنور اشرف الارض وارفعها (ابن جریر)

ان حوالوں کو ذکر کرنے کے بعد جس کا حاصل ایک ہی ہے، فرماتے ہیں کہ اہل لغت نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ لفظ اصلاً عربی نہیں ہے بلکہ فارسی ہے۔ معرب ہوکر آیا ہے۔ چنانچہ لغت عرب کی مشہور کتاب کا حوالہ نقل کرتے ہیں فَارِسِيٌّ مُعَرَّبٌ (ل ان) لفظیست مشترک میان فارسی وعربی وترکی۔ برہان قاطع۔ تاج العروس کے حوالہ سے مولانا نے لکھا ہے کہ دیباج۔ دینار۔ سندس استبرق وغیرہ کی طرح اس باہر سے آئے ہوئے لفظ کو بھی عرب اپنا چکے ہیں۔ ماجدی حاشیہ ۵۸ ہود

علامہ ابن جوزی نے بھی اپنے استاد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ تنور فارسی ہے اور عرب اس نام کے سوا تنور کا کوئی اور نام نہیں جانتے۔ اسم فارسی معرب لا تعرف لہ العرب اسما غیر هذا۔ (زاد المسیر)۔

علامہ آلوسی نے لکھا ہے تنور، نور سے ماخوذ ہے

اوراس کا وزن تَفْعُولٌ ہے لہٰذا لفظ تنور کی اصل تَنْوُوْرٌ ہے، پہلی واؤ کو ہمزہ سے عوض کر کے تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے، پھر اس حذف ہمزہ کے عوض نون کو مشدد کیا گیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ: مشہور یہ ہے کہ لفظ تنور ان الفاظ میں سے ہے جو عربی اور عجمی میں متفق ہو گئے ہیں جیسے صابون اور سموز وغیرہ۔ (روح)

یہ ہی تعلیل صاحب جمل نے بھی سمین کے حوالہ سے ذکر کی ہے۔ جو حضرات اس لفظ کو عجمی قرار دیتے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ اس کا وزن فَعُّولٌ ہے اور کلام عرب میں کوئی ایسی بناء نہیں ہے کہ نون کے بعد حرف راء آیا ہو۔ لہٰذا ان حضرات کے نزدیک نرجس بھی عجمی ہے جو معرّب ہو گیا ہے۔

چنانچہ قرطبی میں ہے کہ ولیس فی کلام العرب نون قبل راء۔ حافظ ابن کثیر نے تنور کی جمع تنانیر استعمال کی ہے حتّٰی فَارَ الماء من التنانیر التی ھی مکان النار (ابن کثیر)

مَجْرٰی : بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا

مَجْرٰی کے معنی ہیں جاری ہونا، چلنا (معانی) یہ مصدر میمی بھی ہو سکتا ہے اور اسم زمان اور ظرف مکان اور مفعول بھی

مُرْسٰی: اسی طرح لفظ مُرسٰی بھی مصدر میمی صیغہ ظرف زمان و مکان اور اسم مفعول بھی آتا ہے۔ مَجْرٖىهَا ای مسیرها (غریب القرآن ابن قتیبہ)

رَسَا الشیءُ یَرْسُو رَسْوًا و رُسُوًّا کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے اور استوار ہونے کے ہیں۔ اور اَرْسٰی (اِفعال) کے معنی ٹھہرانے اور استوار کرنے کے ہیں۔ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا۔ پہاڑوں کو زمین گاڑ کر ٹھہرایا۔ والرّسُوُّ: الاثبات والاستقرار

مَوْج : وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ

الموجُ : سمندر سے پانی کی جو لہر مغرب کی طرف سے اٹھتی ہے اس کو موج کہا جاتا ہے۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے مَوْجٌ، مَوْجَةٌ کی جمع ہے والجمع جمع مَوْجَةٍ وھی ما ارتفع عن جملة الماء الکثیر عند اشتداد الریح (فتح القدیر)

الموج جمع مَوْجَةٍ وھی ما ارتفع من جملة الماء الکثیر عند اشتداد الریح (قرطبی)

الموج فی البحر ما یعلو من غوارب الماء (راغب)

وفی الکشاف: الموج ما یرتفع فوق الماء عند اضطرابه و زخیره (کشاف)

زخر: کے معنی امتداد اور ارتفاع کے ہیں۔

زخر الوادی اذا امتد جدًّا وارتفع (حاشیہ کشاف)

ماج یموج مَوْجًا وَمَوَجَانًا موج کی طرح مضطرب ہونا۔ قرآن پاک میں ہے وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ۔

مَاجَ الْبَحْرُ وَتَمَوَّجَ سمندر کا جوش مارنا۔ مَاجَ الْقَوْمُ

ہ حل،

قوم کا مضطرب ہونا۔ مَاجَ عن الحقّ حق سے پھر جانا
مَوجۃُ الشَّبَاب آغازِ جوانی۔ ابتدائی جوانی کا جوش
مَوج کی جمع اَمواج بھی کثیر الاستعمال ہے۔

مَعْزِلٍ : وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ : معزل، عزل
سے ظرف مکان ہے بمعنی الگ اور دور ہوجانا۔
المعزل في اللغة معناه موضع منقطع عن غيره
واصله من العزل وهو التنحية والابعاد كبير
مادہ عزل کی تحقیق سورہ نساء میں گزر چکی ہے۔

اِبْلَعِيْ : وَقِيْلَ يٰاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ
يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ
وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ ۔
اِبْلَعِيْ یہ بَلَعَ يَبْلَعُ (ن) بَلِعَ يَبْلَعُ (س) بَلْعًا
دونوں ابواب سے بمعنی نگلنا کے آتا ہے۔ بَلَعْتُ الشَّيْءَ
وَابْتَلَعْتُهُ کے معنی کسی چیز کو نگل لینا کے ہیں۔
بَلَّعَ (تفعیل) کے معنی ہیں ظاہر ہونا۔ بَلَّعَ الشَّيْبُ
فِي رَأْسِهِ سر میں بڑھاپے کے آثار کا ظاہر ہو جانا
بَلَّاعَة بَالُوعَةٌ پانی کو جذب کرنے کی جگہ
گندی نالی۔ موری وغیرہ۔ اصل میں بَلْعٌ کے
معنی کسی چیز کو بغیر چبائے نگل جانے کے ہیں۔
يقال بلع الماء يبلعه بلعًا اذا شربه وابتلع
الطعام ابتلاعًا اذا لم يمضغه۔ (کبیر)
یہاں بَلْعٌ سے مراد پانی کا جذب کر لینا ہے۔
قال صاحب الكشاف: والبلع عبارة عن
عن النشف (کشاف) وفی الجمل: والبلع عبارة
عن تغوير الماء وشربه في بطنها۔
والبالوعة الموضع الذي يشرب الماء (قرطبی)
جمع بَوَالِيعُ وبَلَالِيعُ بُلَعَةٌ : چکی کا سوراخ
اس کی جمع بُلَعٌ آتی ہے بضم الباء وفتح اللام
حدیث میں ہے: يسئالك اول النهار وَ
آخِرَه وَلَا يَبْلَعُ رِيْقَه (بخاری)

اَقْلِعِيْ : یہ اِقْلَاع سے ہے جس کے معنی ہیں تھم جانا
رُک جانا اور روک دینا۔ اَقْلَعَ عَنْ كَذَا: باز
رہنا۔ چھوڑنا۔ اقلع الحُمّٰی عن فلانٍ کسی کا بخار
اترنا۔ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ کے معنی یہ ہوں گے کہ
اے آسمان بارش سے رُک جانا۔
اَلْاِقْلَاعُ : الامساك (جمل۔ کشاف)

غِيْضَ : وَغِيْضَ الْمَآءُ ۔ غَاضَ يَغِيْضُ
غَيْضًا ومَغَاضًا : غَاضَ الْمَآءُ : پانی کا کم ہونا
اغاض الماء پانی کم کرنا اغاض الثمن قیمت گھٹانا
نرخ کم کرنا۔ غاض نقص کی طرح لازم اور متعدی
دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ غاض الشئ
غيضًا واغاضه غيره : شیٔ کا از خود کم ہونا۔
اور کسی دوسرے کا اس کو کم کر دینا۔
غِيْضَ الْمَآءُ کے معنی ہیں پانی خشک ہو گیا۔
وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ سے مراد وہ نطفہ ہے جس کو رحم
بگاڑ کر اس پانی کی طرح ضائع کر دیتا ہے جسے زمین

اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ (راغب)

الجُودِی : وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ۔

تورات میں جُودی کو اِراداط کے پہاڑوں میں بتایا گیا ہے، اِراداط درحقیقت جزیرہ کا نام ہے، یعنی اس علاقہ کا نام ہے جو فرات و دجلہ کے درمیان دیار بکر سے بغداد تک مسلسل چلا گیا ہے[1] جودی پہاڑ آج بھی اس نام سے قائم ہے، اس کا محلِ وقوع حضرت نوح علیہ السلام کے وطن اصلی عراق، موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے قریب آرمینیہ کی سرحد پر ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے جس کے ایک حصہ کا نام جودی ہے۔ اسی کے ایک حصہ کو ارارط کہا جاتا ہے (معارف القرآن)

مولانا حمید الدین صاحب فراہی کی تحقیق یہ ہے کہ کوہِ تین اور کوہِ جودی ایک ہی پہاڑ کے دو نام ہیں۔ الجودی جبلٌ بقرب موصل (قرطبی)

جبل بالجزیرۃ بقرب الموصل (جلالین)

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ جودی کوئی خاص پہاڑ نہیں بلکہ ہر پہاڑ کو جودی کہا جاتا ہے۔

وھو جبل بالموصل (روح۔ کشاف) قیل ھو اسمٌ جبل بین الموصل والجزیرۃ (راغب)

اِعْتَرَاءٌ : اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ۔ ہمارا قول تو یہ ہے کہ ہمارے کسی دیوتا ہی نے تم کو شامت میں مبتلا کر رکھا ہے جس کی وجہ سے تم خبطی ہو گئے ہو، یہ جاہلی ذہنیت کی صحیح ترجمانی ہے۔

عَرَاهُ و اعْتَرَاهُ کے معنی ہیں کسی کے سامنے آنا قصد کرنا۔ اعتراءٌ: عارض لاحق ہونا۔ کوئی مشکل آپڑنا۔ عَرَاهُ الْاَمْرُ وَاعْتَرَاهُ: اِذَا اَلَمَّ بِہٖ قرطبی

عَرِيَ يَعْرٰى (س) عريۃ وعُريًا۔ عَرِيَ مِنْ ثوبہٖ۔ ننگا ہونا۔ قرآن پاک میں ہے: اِنَّ لَكَ اَنْ لَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى یہاں تم نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے۔

نَاصِيَة : مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا۔ ناصیہ کے معنی پیشانی کے ہیں اور پیشانی کے اوپر جو بال ہوتے ہیں انہیں بھی ناصیۃ کہا جاتا ہے، نَصَوْتُ فُلَانًا وَانْتَصَيْتُهٗ وَ نَاصَيْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اس کو پیشانی کے بالوں سے پکڑا۔ اخذِ ناصیہ: دراصل ایک محاورہ ہے جس سے طاقت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا میں اخذِ ناصیہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چلنے پھرنے والی چیز پر پوری قدرت اور طاقت حاصل ہے۔ پھر استعارۃً قوم کے شریف النسب سردار کو بھی ناصیہ کہتے ہیں۔ ناصیۃ القوم: قوم کا سردار۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا: ای الا ھو مالک لھا قادرٌ

[1] قصص القرآن

عَلَيهَا يصرف كيف يشاء ۔
النَّاصِيَة : مقدمُ الرأس وتطلق على الشعر
النابت عليها ۔ (روح)
والناصية ۔ قُصاص الشعر فی مقدم الرأس
محاورہ ہے مَا نَاصِيَة فلانٍ إلا بيد فلان ۔
یعنی فلاں کو فلاں پر اتنا اختیار ہے جس طرح چاہے
اور جس طرف چاہے اس کو پھیر دے ۔ (قرطبی)
نَصَا يَنْصُو نَصْوًا ؛ نصا الرجلَ : پیشانی کے
بالوں سے پکڑنا ۔ نصَا فلانٌ الثوب : کپڑے
اتارنا ۔ ناصیۃ کی جمع نواصٍ وناصیات آتی ہے ،
اور نواصی الناس : لوگوں کے بڑے بزرگ ۔
ایک مشہور حدیث ہے ۔ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ ۔
مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے البرکۃ فی
نواصی الخیل ، گھوڑوں کی پیشانی میں برکت ہے

جَحَدُوْا : الجحود : الانکار مع العلم[1]
جَحَدَہ جحدًا وجُحودًا : کفر کرنا ، جھٹلانا ۔ جَحَدَہٗ
وجَحَدَ بحقہ : کسی کی حق سے دانستہ انکار کرنا ۔

عَنِيْدٍ : وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ
عَنَدَ يَعْنُدُ س ۔ عَنُدَ ک ۔ عُنُوْدًا ۔ عَنَدَ
عن الطریق : راستہ سے ہٹ جانا ۔ ایک طرف
مائل ہونا ۔ تجاوز کرنا ۔ صفت عَنِيْدٌ ۔ اس کے معنی
ہیں ، جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر اترانے والا ۔
اسم فاعل عاند ، میانہ روی سے ہٹنے والا ۔ اس کی جمع
عُنُدٌ وعَوانِد آتی ہے ۔
عَنَدٌ بمعنی جانب بھی آتا ہے ۔ کہتے ہیں یمشی
وَسَطًا لا عَنَدًا : وہ راستہ کے بیچ میں چلتا ہے
ہٹ کر نہیں چلتا ۔ سَحَابَۃٌ عَنُوْدٌ : موسلا دھار
بارش ۔ عَقَبَۃٌ عَنُوْدٌ : دشوار گزار گھاٹی ۔ رَجُلٌ
عَنُوْدٌ : ساتھیوں سے الگ تھلگ اترنے والا
اسی طرح مُعَانِدٌ : متکبر اور مغرور کو کہا جاتا ہے ۔
ابوعبیدہ نے عَنُوْدٌ ۔ عَانِدٌ ۔ عَنِيْدٌ اور مُعَانِدٌ
کے ایک معنی بیان کئے ہیں یعنی مخالفت سے پیش آنے
والا ۔ امام رازیؒ نے عنیدٌ معاند ۔ عُنُودٌ کے ایک
ہی معنی قرار دیئے ہیں ۔
علامہ راغبؒ نے ان الفاظ میں فرق بیان کیا ہے کہ
عَنِيْدٌ : اس کو کہتے ہیں جو حق سے عناد اور مخالفت
رکھے اور عنودٌ وہ جو صحیح راہ سے ہٹ جائے ۔
چنانچہ بعیرٌ عَنُوْدٌ ، کہتے ہیں عَنِيْدٌ نہیں کہتے
اور بعیرٌ عَنُوْدٌ وہ اونٹ جو اصل راہ سے ہٹ
کر چلے ۔ ایک فرق ان الفاظ میں یہ بھی بیان کیا
گیا ہے کہ عُنُوْدٌ بضم العین کے معنی راستہ سے
ایک جانب مائل ہوجانے کے ہیں چاہے حسی راستہ
سے ہو یا حکمی سے ۔ اور عَنُوْدٌ بفتح العین کے معنی حکمی راستہ
سے ہٹنے کے ہیں ۔ عَنَدَ عَنِ الطَّرِيقِ ۔ اس نے
راستہ سے عدول کیا ۔
عَانِدٌ کی جمع عُنَّدٌ نون کی تشدید سے ہے اور

[1] صحاح

اور عَنُودٌ کی عُنُدَۃٌ - نون کے سکون سے ۔ اور عَنِیدٌ کی جمع عِنْدٌ آتی ہے ۔ ابوداؤد شریف کی حدیث ہے ، اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَنِی عَبْدًا کَرِیْمًا وَلَمْ یَجْعَلْنِی جَبَّارًا عَنِیْدًا : اللہ تعالیٰ نے مجھے نیک اور خلیق بندہ بنایا ہے مغرور اور دانستہ حق سے انحراف کرنے والا نہیں بنایا ہے ۔ اور حضرت عمر کا مقولہ ہے ، اَضُمُّ الْعَنُودَ ، میں الگ اونٹ کو گلہ سے ملا دیتا ہوں ۔

العَنِیدُ : الطاغی المتجاوز فی الظلم من قولھم عَنَدَ یَعنِدُ من ۔ اذا حاد عن الطریق الحق من جانب الی جانب (جمل)

العنید : المعجب بما عنده (راغب)

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ العَانِدُ : اضداد میں سے ہے ۔ یہ کسی چیز کو لازم پکڑنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس سے جدا اور الگ ہونے کیلئے بھی ، چنانچہ اس کا اشتقاق بھی ان دو مختلف معنوں کے اعتبار سے مختلف ہوگا ۔ جیسا کہ لفظ البَیْنُ دو مختلف اعتباروں سے وصل کے معنی بھی دیتا ہے اور جدائی کے معنی میں بھی آتا ہے ۔

علامہ ابن جوزی نے ابن قتیبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ عنید عاند اور عنود تینوں کے معنی حق کی مخالفت کرنے والے کے ہیں ۔ فاما العنید فھو الذی لا یقبل الحق (ابن جوزی)

عرق عاندٌ : دمِ استحاضہ کی وہ رگ جو خون بہاتی رہتی ہے ۔ حدیث میں ہے انما ھو عِرْقٌ عَانِدٌ : یعنی یہ ایک رگ ہے جو خون بہاتی ہے ، یہ حیض کا خون نہیں ہے ۔

والعنید : الطاغی الذی لا یقبل الحق ولا یذعن له ۔ (قرطبی)

العنید : الجائر عن القصد الباغی الذی یرد الحق مع العلم به (النہایہ لابن اثیر)

ضَحِکَتْ : وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ اور ان (حضرت ابراہیمؑ) کی بیوی (سارہ) کھڑی تھیں پس وہ ہنسیں ، خوشگوار حیرت کے وقت ہنسی کا آجانا طبعی امر ہے اور عورتیں عام طور پر حیرت کے مواقع پر ضبطِ نفس پر قابو بھی نہیں پا سکتیں

لفظِ ضحک کی تعریف

اصل الضحك انبساط الوجه من سرور یحصل للنفس (جمل) خوشی اور سرور سے چہرہ کا چمکنا اور دانتوں کا ظاہر ہونا ۔ اتنا ہنسنا کہ اگلے دانت ظاہر ہو جائیں - اگلے دانت چونکہ ہنستے وقت ظاہر ہو جاتے ہیں اس لئے ان کو ضَوَاحِک کہتے ہیں اور لفظ ضحک کا استعمال مجرد سرور اور تعجب کے لیئے بھی ہوتا ہے ، چاہے ظہورِ اسنان نہ بھی ہو ۔ لفظ ضحک کے اصلی معنی ظہور کے ہیں ، کہتے ہیں

ضَحِكَ الشَّيْبُ بِرَأْسِهٖ سر میں سفید بالوں کا ظاہر ہونا۔ بڑھاپے کے آثار نمودار ہونا۔ ضَحِكَ الطَّرِيْقُ، راستہ کا ظاہر ہونا۔ ضَحِكَ السَّحَابُ : بادل ٹپکنا نمودار ہونا۔ ضحك به : کسی کے ساتھ کشادہ روئی سے پیش آنا۔ ضَحِكَتِ الطلعة : شگوفہ کا کھلنا پھوٹنا۔ ضَحِكَ الحَوضُ : حوض کا لبالب بھر جانا۔ پانی کا کناروں تک ظاہر ہو جانا۔ مُضَاحَكَۃ ایک دوسرے سے دل لگی کرنا، باہم محبت کا اظہار کرنا۔ اہل تفسیر اس مقام پر لفظ ضَحِكَتْ کی تفسیر میں دو مختلف قول رکھتے ہیں۔ ایک بڑی جماعت نے ضَحِكَتْ کی تفسیر معنی متعارف یعنی ہنسنے سے کی ہے کہ جناب سارہ اپنے خاوند اور فرشتوں کی گفتگو سے اس وقت ہنس پڑی۔ جب جناب ابراہیم سے خوف و خطر زائل ہو گیا بہرحال وجہ ضحک میں اختلاف ہے۔ اس کو تفسیر کبیر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دوسری تفسیر اس مقام پر اہل علم نے ضَحِكَتْ کی حَاضَتْ، سے کی ہے۔ اور یہ تفسیر مجاہد، عکرمہ اور عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ملائکہ نے بشارت دی کہ خلیل اللہ علیہ السلام کے گھر اولاد ہو گی تو بطور علامت حضرت سارہ پر حیض کے آثار ظاہر ہو گئے چونکہ اگر حیض نہ آئے تو اولاد نہیں ہوتی۔ اور حیض آنا اس بات کی علامت ہے کہ عورت میں تولید کی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ ضَحِكَتِ الارنبُ کے معنی یہ ہی ہوتے ہیں کہ مادہ خرگوش کو حیض آگیا۔ مگر ابوعبیدہ، ابو عبید اور مشہور امام لغت فراء نے اس کا انکار کیا ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ ضحک، حیض کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ اس کے اصل معنی وہ ہی ہیں جو پہلے مذکور ہوئے۔ اور وہ ہیں، اِنْبِسَاطُ الْوَجْهِ مِنْ سُرُوْرِهٖ وَالتَّبَسُّم عند الفرح لیکن جمہور اہل لغت نے اس معنی کا اثبات کیا ہے۔ اور کلامِ عرب سے استدلال بھی پیش کیا ہے، چنانچہ ابن جوزی نے ابن قتیبہ کا قول نقل کیا ہے کہ ضَحِكَتِ الْاَرْنَبُ سے مراد اہل عرب کے نزدیک حَاضَتِ الْاِرْنَبُ ہوتی ہے۔

صاحب فتح القدیر علامہ محمد بن علی شوکانی متوفی سنہ ۱۲۵۰ھ نے عربی شاعر کا ایک شعر نقل کیا ہے۔

وضَحِكَ الْاَرَانِبُ فوق الصّفا
کمثل دم الجوف یوما اللقا

اس شعر کا دوسرا مصرعہ کمثل دم الجوف اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ضَحِكَ الارانب سے مراد حَاضَتِ الْاَرانب ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ واضح وہ اشعار ہیں جو صاحب روح المعانی نے ذکر کیے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے

اِنّی لآتی العروس عند طُهورِهَا
وأهجُرهَا يَوماً اذا تك ضاحكا

یہاں لفظ ضاحک، طہور کے مقابلہ میں آرہا ہے
شاعر کہتا ہے کہ میں دُلہن کے پاس ایامِ طہر
میں جاتا ہوں اور جب وہ ایامِ حیض میں ہوتی ہے
تو میں اس سے الگ رہتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ ضحک
حیض کے معنی میں آتا ہے۔ لہٰذا ابو عبیدہ، ابو عبید
اور فراء کا یہ کہنا جیسا کہ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے
کہ لم نسمع من ثقۃ انّ معنی ضَحِکَتْ
حَاضَتْ، دلیلِ نفی نہیں ہو سکتی۔ اور جبکہ ابن عباس
ابن عمر، مجاہد اور عکرمہ جیسے اجلّہ علماء سے یہ
معنی منقول بھی ہوں۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں امرأۃ
ضاحک، مراد اس سے حائضہ عورت ہوتی
ہے۔ اور جمہور اہلِ لغت چونکہ مثبت ہیں اور اس معنی
کے قائل ہیں لہٰذا مثبت کو نافی پر اُصولاً ترجیح ہونی
چاہیے۔ علامہ آلوسی بغدادی لکھتے ہیں کہ واثبت
ذلک جمہور اللغویین والمثبت مقدّمٌ علی
النافی، ومن حَفِظَ حجۃٌ علی من لم
یحفظ (روح)

اور علامہ زمخشری جیسے امامِ لغت نے
بھی ضَحِکَتْ کے معنی حَاضَتْ تسلیم کئے ہیں۔
قُراء مکہ میں سے محمد بن زیاد اعرابی نے ضَحَکَتْ، باب
فتح سے بفتح الحاء فی الماضی پڑھا ہے۔ امام آلوسی
لکھتے ہیں کہ مجمع البیان کی عبارت سے بھی یہ متبادر
ہوتا ہے کہ ضحک بمعنی حیض کا مصدر ضَحْکًا بفتح الضاد
وسکون الحاء آتا ہے۔

اور بعض اہلِ لغت کا تو یہ دعوٰی ہے کہ
ضَحَکَ بفتح الحاء فی الماضی حیض کے معنی کے لئے
خاص ہے۔ اور صاحبِ روح المعانی نے اس کو
قابلِ اعتماد بھی قرار دیا ہے لہٰذا محمد بن زیاد کی قرأت
سے جمہور اہلِ لغت کی تائید ہوتی ہے کہ ضَحِکَتْ کے
معنی حَاضَتْ کے ہیں۔ فالقراءۃ المذکورۃ تؤیّد
تفسیر ضحکت علی قرأۃ الجمہور بحاضت
(روح - ص ۹۸ ج ۷)

لفظ ضِحك کا حقیقی معنی جیسا کہ ہم نے اوپر عرض
کیا ہے کہ وہ ظہورِ شئ کے ہیں، باقی معانی اسی
استعارہ کے طور پر مراد لئے گئے ہیں، سُرور اور
فرح کے وقت چہرۂ انسانی پر خوشی کے آثار ظاہر
ہوتے ہیں اس لئے اس کیفیت کو ضحک سے تعبیر
کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حیض میں ضحک ظہورِ دم
سے استعارہ ہے۔ لیکن علامہ راغب صاحبِ
مفردات القرآن فرماتے ہیں: وقول من قال
حاضَتْ فلیس ذلک تفسیرًا لقولہ فَضَحِکَتْ
کما تصوّرہ بعض المفسرین فقال ضحکت
بمعنی حاضَتْ وانما ذکر ذلک تنصیصًا
لحالہا وانّ اللہ تعالیٰ جعل ذلک امارۃ
لما بُشّرتْ بہ فحاضتْ فی الوقت لیعلموا انّ
حملہا لیس بمنکر (راغب)

مطلب یہ ہے کہ جن حضرات نے ضَحِکَتْ کے معنی حَاضَتْ بیان کئے ہیں انہوں نے ضَحِکَتْ کی تفسیر نہیں کی جیساکہ بعض مفسّرین کو مغالطہ لگ گیاہے اور انہوں نے ضَحِکَتْ کے معنی حَاضَتْ کر دیئے ہیں۔ بلکہ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہؓ کی حالت بیان کرنا مقصود ہے کہ جب انہیں خوش خبری سنائی گئی تو بطورِ علامت اسی وقت حیض آگیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کی قوتِ تولید بحال ہو گئی ہے۔ چونکہ جب تک عورتوں کو حیض آتاہے وہ حاملہ ہو سکتی ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیساکہ سورہ انبیاء میں حضرت زکریا علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا کہ وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ یعنی ہم نے ان کی زوجہ کو تولید کے قابل بنا دیا

علامہ محمد بن احمد انصاری القرطبی صاحب تفسیر الجامع لاحکام القرآن نے ضحک کی دو تفسیریں بیان کی ہیں ایک یہ کہ الضِّحْكُ انكشاف الأسنان۔ اور دوسری یہ کہ و یجوز ان یکون الضِّحْكُ اشراق الوجہ اسی سے بطورِ تشبیہ بادل کی چمک کو بھی ضحک سے تعبیر کرتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے انّ اللہ سبحانہ یبعث السحاب فیضحک احسن الضِّحك۔ یہاں انجلاء برق کو ضحك سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ضحکت السّمرۃُ اذا سال صمغھا (بیضاوی) یعنی ببول کے درخت سے گوند ٹپکنے لگی۔ واللہ اعلم

حَنِيْذٌ : فَمَا لَبِثَ اَنْ جَاۤءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ - تو تھوڑی دیر بھی نہ ٹھہرے کہ تلا ہوا بچھڑا لے آئے۔

حَنِيْذٌ، مَحْنُوْذٌ کے معنی میں صفتِ مفعولی ہے حَنِيْذٌ : وہ گوشت جو کسی گڑھے میں دو گرم اور تپتے ہوئے پتھروں میں رکھ کر پکا لیا گیا ہو۔ عرب بادیہ نشینوں کی یہ عادت تھی کہ گوشت کی لزوجت اور چکناہٹ کو کم کرنے کے لئے ایک گڑھا کھود کر اس میں گرم پتھروں کے درمیان گوشت کو دم دیتے، جس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ایک تو گوشت میں لذت پیدا ہو جاتی اور دوسرے یہ کہ لزوجت اور زائد چربی نکل جاتی۔

حَنَذَ يَحْنِذُ حَنْذًا او تَحْنَاذًا۔ حَنَذَ اللَّحْمَ گوشت بھوننا۔ پکانا۔ اصل میں حَنَذْتُ الفَرَسَ سے ماخوذ ہے جس کے گھوڑے کو ایک دو چکر دوڑا کر اس پر جھول ڈال دینا تاکہ اس کو خوب پسینہ آئے، ایسے گھوڑے کو حنیذ اور محنوذ کہتے ہیں۔ حَنَذْتُ الفرسَ اَحنذہٗ حَنذًا وھو ان تحضرہ شوطًا او شوطین ثم تظاھر علیہ الجلال فی الشمس لیعرق

فھو محنوذٌ وحنیذٌ۔ قرطبی ومثلہ عند الراغب گھوڑے کے ساتھ یہ عمل دراصل اس لئے کیا جاتا ہے کہ زائد چربی اس پر سے پگل جائے اور گھوڑے میں تیز رفتاری پیدا ہوجائے۔ اس لئے عرب شعراء گھوڑوں کی تعریف میں ان کی لاغری کو مقام مدح میں بیان کرتے ہیں۔ حنذتہ الشمسُ اس کو سورج نے جھلسا دیا۔ حَنَاذِ مبنی علی الکسر۔ سورج آیت میں لفظ حنیذ سے مراد بھنا ہوا بچھڑا ہے۔

حنیذٌ، ای مشوی بین حجرین (راغب)

مشویٍ فی اخدودٍ بالرضف۔ (کشاف)

رضف سے مراد گرم پتھر ہے۔

مشویٍ، وقیل ھو المشوی بحرّ الحجارۃ من غیران تمسہ النار (قرطبی)

اَوْجَسَ: واَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً۔

وَجَسَ یَجِسُ وَجْسًا۔ پوشیدہ ہونا۔ مخفی طور پر دل میں کچھ کھٹکا محسوس کرنا۔ وَجْس: صوتِ خفی اور آہٹ کو بھی کہا جاتا ہے۔ وجست الاذن کان کا آہٹ محسوس کرنا۔ حدیث میں ہے دخلتُ الجنّۃ فسمعتُ فی جانبھا وجسًا فقیل ھٰذا بلال میں جنت میں داخل ہوا تو اس کے ایک کنارہ سے کچھ آہٹ محسوس ہوئی تو بتایا گیا کہ یہ آہٹ بلال کی ہے۔

الوَجْسُ کے ایک معنی یہ ہیں کہ ایک بیوی سے آدمی تمتع کرے اور دوسری بیوی اس کی آہٹ محسوس کر رہی ہو۔

اَوْجَسَ ایجاسًا۔ اوجس الرجل: دل میں کچھ کھٹکا محسوس کرنا، دل میں چھپانا۔ اَوْجَسَ القلبُ فَزَعًا: دل کا گھبراہٹ محسوس کرنا۔ اَوْجَسَتِ الاُذُنُ: کان کا آواز سننا۔ قرآن پاک میں ہے فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا۔

مفردات میں ہے کہ وَجْس اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی خطرہ کے بعد دل میں پیدا ہوتی ہے، اور جو چیز اس کا مبدأ بنتی ہے اسے ھَاجِسْ اور اس کے بعد کی حالت کو واجس کہا جاتا ہے۔ اور تَوَجُّسٌ کے معنی ہیں کان لگا کر سننے کی کوشش کرنا۔ تَوَجَّسَتِ الاُذُنُ کان کا آہستہ آواز سننا۔ اور تَوَجَّسَ الصَّوتَ: ڈرے آواز سننا

الوجسُ: اَلصَّوتُ الخفیُّ (راغب)

اَوْجَسَ: ای اَحَسَّ فی نفسہٖ (فتح)

صاحب کشاف نے اَوْجَسَ کے معنی اَضْمَرَ سے کئے ہیں، یعنی دل میں چھپانا۔ اور علامہ قرطبی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

اصل میں وَجْسٌ وَجِیْسٌ اور وُجُوْسٌ کے معنی دخول کے ہیں۔ حدیث النفس کو بھی وجس اور

اور ایجاس اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ انسان کے
دل میں داخل اور مضمر ہوتی ہیں۔
الایجاس: حدیث النفس واصلہ من الدخول
کان الخوف داخلہ، والوجیس ما یعتری
النفس اوان الفزع۔ (جمل)
والوجوس: الدخول (قرطبی)
واصل الوجوس: الدخول، کأنّ الخوفَ
دخل قلبہ (معالم التنزیل بغوی)
والوجوسُ: ھو رعبُ القلب (خازن)
وفی البیضاوی، الایجاس: الادراک و
قیل الاضمار۔ صاحبِ خازن نے جو تعریف
کی ہے وہ سب سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ
قرآن پاک کی آیت فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ
سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ وجوس رعبِ قلب
سے تعبیر ہے۔ چونکہ رَوْعٌ کے معنی خوف قلب کے
ہیں۔ اور قرآن پاک میں وجوس اور رَوع دونوں
صفاتِ قلب ہی بیان ہوئی ہیں۔
واعلم انّ الرَّوْعَ ھو الخوف وما اوجس من
الخیفۃ۔ (کبیر)

الرَّوْعُ : فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ
جب ابراہیم علیہ السلام سے خوف زائل ہو گیا۔
رَاعَ یَرُوعُ رَوْعًا و رُوُوْعًا۔ رَاعَ منہ: کسی
سے ڈرنا۔ اور رَاعَ یَرِیعُ رُوَاعًا: واپس ہونا
ارتاعَ وتَرَوَّعَ منہ ولہٗ: ڈرنا اور ارتاعَ
لِلْخَیرِ: خیر سے خوش ہونا۔
رَوْعٌ بفتح الراء کے معنی ڈر اور خوف کے آتے ہیں
کہتے ہیں اَللّٰھُمَّ اٰمِنْ مِنْ رَوْعَاتِی۔ یا اللہ!
مجھ کو ڈروں سے بیڈر کر دے۔ رَوْعَات
رَوعۃ کی جمع ہے تَرْوِیعٌ ڈرانا۔ ابوداؤد میں ہے
لایحلّ لمسلمٍ ان یُرَوِّعَ مُسْلِمًا کسی مسلم کیلئے
یہ جائز نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو خوف زدہ
کرے۔ رُوْعٌ بضم الراء، دل کو کہتے ہیں۔
حدیث میں ہے انّ رُوحَ القدس نَفَثَ فی رُوعِی
روح القدس نے میرے دل میں بات ڈال دی۔
اصل میں رُوْعٌ کے معنی خوف پیدا ہونے کی جگہ
کے ہیں۔ الرُّوْعُ بضم الراء النفس وھی محل
الرَّوْع (روح) الرَّوع بفتح الراء الخوف وبضمہا
القلب (جمل) الرَّوْعُ ھو الخوفُ (کبیر)
الرَّوْعُ اصابۃ الرُّوْعِ (راغب)
الرَّوْعُ الخوفُ، یقال ارتاع اذا خاف، قال النابغۃ

فارتاع من صوتِ کلّابٍ فبات بہ
طوعَ الشوامت من خوفٍ ومن صَرَدٍ (قرطبی)

بمثلہ قال الشوکانی صاحب فتح القدیر

ذَرْعًا : وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا : ذَرَعَ یَذْرَعُ
ذَرْعًا۔ ذَرَعَ الثَّوْبَ کپڑے کو ہاتھ سے ناپنا
ذَرَعَ عند الرَّجُلِ سفارش کرنا۔ ذَرَعَ بالمشی

چلنے میں بازوؤں کو حرکت دینا۔ اصل میں ذَرْع ہاتھ کے پھیلاؤ کو کہتے ہیں۔ پھر اس میں توسّع کرکے قوت اور طاقت مراد لی جاتی ہے۔

ذَرَعَ البَعِیْرُ بِیَدَیْہِ فِی المَسِیْرِ یَذْرَعُ اونٹ کا چلنے میں لمبے لمبے اور دُور دُور قدم رکھنا۔ قدم پھیلا پھیلا کر چلنا۔ اور جب اونٹ پر بہت سے زیادہ بوجھ لاد دیا جائے تو قدموں کی مقدار کم ہو جاتی ہے، لہٰذا ضیق الذّرع قِلّتِ وسعت اور قصرِ طاقت سے کنایہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔

اَبْطَرْتُ فلاناً ذَرْعَہ: یعنی میں نے اس کی طاقت و ہمت سے زیادہ اس کو تکلیف دی۔ کَسَرَ ذٰلِکَ من ذَرْعِی: اس نے میری ہمت توڑ دی، میرے عزم کو روک دیا۔ کان ذریع المشی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدم بڑھا کر چلتے تھے۔

اَکَلَ اَکْلاً ذَرِیْعًا: جلدی جلدی کھانا۔

مَوْتٌ ذَرِیْعٌ: وسیع موت، جلدی کی موت بخاری میں ہے وھم یموتون موتاً ذریعاً اور وہ جلدی جلدی مر رہے تھے، اور موت بڑے وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔

بعض حضرات نے ذَرْعٌ سے مراد صدر اور قلب لیا ہے۔ یعنی فرشتوں کے بصورتِ انسان آنے پر ان کا دل تنگ ہوا، قوم کی خرابیاں اصل وجہ ضیق تھیں۔ لیکن ترجیح اسی کو ہے کہ ضیق الذرع ضیق الوسع سے کنایہ ہے۔

فَضِیقُ الذَّرْعِ عبارۃٌ عن ضیقِ الوسعِ[1]

لیس ھٰذا فِی ذَرْعِی: یہ کام میری وسعت میں نہیں۔ اسی طرح لیس ھذا فی یدی کے معنی بھی یہ ہی ہیں کہ یہ کام میری قدرت سے خارج ہے میرے بس کا نہیں ہے۔ قال الازھری الذَّرْعُ یُوضَعُ مَوْضِعَ الطَّاقَۃِ والوسع، والاصل فیہ انّ البعیر یذرع بیدیہ فی سیرہ ذرعاً علی قدرِ سَعَۃِ خطوہ فاذا حمل علیہ اکثر من طوقہ ضاق ذرعہ من ذلک وضعُف ومدّ عنقہ فجُعل ضیق الذرع عبارۃ عن ضیق الوسع والطاقۃ۔ خازن، جمل، کبیر

ذرع اور ذراع - دونوں کے ایک معنی ہیں۔ کہتے ہیں، مالی بہ ذرعٌ ولا ذراعاً، ای مالی بہ طاقۃ

وقال صاحب الکشاف: کانت مساءۃ لوط وضیق ذرعہ لانہ حَسِبَ انھم انس فخاف علیھم خبث قومہ وان یعجز عن مقاومتھم ومدافعتھم (کشاف)

یقال ضُقتُ بالامرِ ذَرْعاً اذا لم تُطِقْہ ولم تقو علیہ، واصل الذرع انما ھو بسط الید فکانک تُرِیْدُ۔ مَدَدْتُ یدی الیہ فلم تَنَلْہ۔ (حاشیہ کشاف)

سِیْٓءَ: سِیْٓءَ بِھِمْ۔ سَاءَ یَسُوْءُ، سَاءَہٗ

---

[1] قرطبی

یسوء کا لازم اور متعدی دونوں طرح آتا
ہے۔ غمگین ہونا۔ ساء الامر فلانا: غمگین کرنا
سیئ کی اصل سوِیَ ہے اور عین کلمہ اس کا واو
ہے، واو کی حرکت نقل کر کے سین کو دیدی گئی،
بعد میں واؤ ساکن یاء سے بدل گئی ہے۔ (قرطبی کبیر)

عَصِیْبٌ: هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ۔ آج بڑا
سخت دن ہے، یہ دن مشکل ہے۔ چھٹکارے
کی کوئی صورت دکھتی نہیں۔

عَصَبَ یَعْصِبُ عَصْبًا وعَصَبًا۔ عَصَبَ الشَّیْءَ:
کسی چیز کو لپیٹنا۔ باندھنا۔ لفظ عَصَبٌ میں اصل
میں بندش اور شدت کے معنی پائے جاتے ہیں
اسی سے اُن پٹھوں کو عَصَبٌ کہتے ہیں جو انسان
کے جوڑوں کو تھامے ہوئے ہیں۔ لحمٌ عَصِبٌ
بہت پٹھوں والا گوشت۔ اور العَصْب: بکری
کو کہا جاتا ہے۔ اَلْعِصَابَۃُ: وہ پٹی جو سر درد
کی وجہ سے ماتھے پر سختی سے باندھی جاتی ہے تاکہ
درد میں افاقہ ہو۔ اور عِصابۃ: انسانوں اور
گھوڑوں کی جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ عِصَابَۃٌ کی
جمع عَصَائِبُ آتی ہے۔

عَصَبَۃٌ: باپ کی طرف سے رشتہ دار۔
اس کی جمع عَصَبَاتٌ آتی ہے۔ بھائی بہنیں
وغیرہ۔ اَلْعُصْبَۃُ: وہ جماعت جو ایک دوسرے
سے مربوط ہو، تمام افراد ایک دوسرے کے حامی
اور مددگار ہوں۔ قرآن پاک میں ہے: وَنَحْنُ
عُصْبَۃٌ۔ حالانکہ ہم ایک مضبوط جماعت ہیں۔
اور سورۂ نور میں: اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ
عُصْبَۃٌ مِّنْكُمْ میں لفظ عُصْبَۃٌ کے معنی
ایک ایسی جماعت کے ہیں جو ایک دوسرے کے
خیالات کی حامی ہو۔ اور سورۂ قصص میں لَتَنُوْٓءُ
بِالْعُصْبَۃِ میں عصبۃ سے مراد طاقت ور جماعت
ہے۔ عَصِیْبٌ: پھیپھڑوں کو بھی کہا جاتا ہے
چونکہ وہ انتڑیوں کے ساتھ لپٹے ہوئے ہوتے
ہیں۔ اَلْمَعْصُوْبُ: وہ جس کو حیوان کی آنت
کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا گیا ہو۔ پھر
توسع کے طور پر ہر مضبوطی کے ساتھ باندھنے
پر لفظ عَصَب بولنے لگے ہیں۔ اہل عرب کہتے
ہیں لَاَعْصِبَنَّكُمْ عَصْبَ السَّلَمَۃِ: میں تمہیں
سلمہ درخت کی طرح باندھ کر چھوڑوں گا۔
سلمہ ایک درخت ہے جس کے پتوں سے چمڑا
صاف کیا جاتا ہے۔ جب اس کے پتے جھاڑنے
مقصود ہوتے ہیں تو درخت کی ٹہنیوں کو ملا کر
باندھ لیتے ہیں۔ فلانٌ شدید العَصَب و
معصوب الخَلْق: مضبوط جوڑ بند والا آدمی
خازن میں ہے کہ یَوْمٌ عَصِیْبٌ: اس عِصابۃ
سے ماخوذ ہے جو سر پر باندھی جاتی ہے۔
ماخوذٌ من العِصَابَۃِ التی تشد بہ الرأس [1]

[1] خازن

قال ابو عبیدۃ: العصیبُ، الشدید الذی یعصِبُ الناسَ بالشر (زاد المسیر) یُقال یومٌ عَصِیبٌ، وعَصَوصَبَ اذا کان شدیدًا، من قولك عصَبتَه اذا شددته (کشاف)

آیت میں لفظ عَصِیبٌ مفعول کے معنی میں ہے یعنی آج ایسا دن ہے جس کے اطراف کو ملا کر اس سے باندھ دیا گیا ہے، وہ اس میں گھرے ہوئے ہیں اور نجات کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

عرب کہتے ہیں یَومٌ ککفّۃ حابلٍ وحلقۃِ خاتمٍ۔ ایسا دن ہے جو شکاری کے جال اور انگوٹھی کے حلقہ کی طرح تنگ ہے۔

• وانّك اِن لّا تُرضِ بکر بنَ وائلٍ
یکن لك یومٌ بالعراق عصیبٌ

اگر تو نے بکر بن وائل کو راضی نہ کیا تو عراق میں تیرا دن سخت ہوگا۔ یعنی بکر بن وائل تجھ پہ سختی کریگا۔ رَجُلٌ معصوبٌ ای مجتمع الخلق (قرطبی)

امام اللغۃ راغب فرماتے ہیں ومعصوبُ الخلق ای مُدمجُ الخِلقۃ۔ مُدمج، دمج الشیئُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا کسی چیز میں مضبوطی سے گڑھ جانا۔

یُھرَعُونَ: وَجَآءَہٗ قَومُہٗ یُھرَعُونَ اِلَیہِ۔ ھرِعَ واُھرِعَ کے معنی سختی اور تخویف سے ہانکنے کے ہیں۔ اور ھرِعَ برُمحِہٖ فتھرّعَ کے معنی نیزے کو کسی کی طرف سرعت کے ساتھ سیدھا کرنے کے ہیں اور ھَرِیعٌ تیز رَو، اور چلّا کر رونے والا۔ الھَرِیعُ اور الھَرَعۃُ: چھوٹی جوں کو کہتے ہیں۔ (راغب)

اور وَجَآءَہٗ قَومُہٗ یُھرَعُونَ اِلَیہِ کا ترجمہ یوں کریں گے کہ ان کی قوم کے لوگ ان کے پاس سرپٹ اور بے تحاشا دوڑتے ہوئے آئے۔ یُھرَعُونَ: صیغہ جمع مذکر غائب مضارع مجہول ہے، بابِ افعال سے اس کا مصدر اِھراعٌ آتا ہے۔ بمعنی تیز دوڑنا، دوڑے چلے جانا۔ اور ھَرَعٌ بفتح الرا، سَعٌ کا مصدر ہے، تیز چلنا، خون بہنا، سمع سے جب اِھراعٌ بنائیں گے تو دوڑنے کے معنی ہوں گے۔

امام فخر الدین رازیؒ نے لفظ یُھرَعُونَ میں اہل لغت کے دو قول نقل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یُھرَعُونَ ان افعال میں سے ہے جن کا فاعل معلوم نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ مجہول ہی استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ اُولعَ فُلانٌ فی الاَمرِ واُرعِدَ زیدٌ وزُھِیَ عمروٌ، یہ زَھوٌ سے ماخوذ ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ فعل کا بغیر فاعل کے واقع ہونا درست نہیں۔ چونکہ لکلّ فعلٍ فاعلٌ کے اصولِ مسلّمہ کے تحت خلاف ہے۔ اور وہ افعال جو قول اوّل میں بطور مثال ذکر کئے گئے ہیں، حاصل یہ انکے

فاعل حذف کیے گئے ہیں اور ان کی اصل تقدیر یہ ہے اُولِعَ زَیْدٌ اَتَہٗ اَوْلَعَہٗ طَبْعُہٗ، و اُرْعِدَ الرَّجُلُ اَرْعَدَہٗ غَضَبُہٗ و زُھِیَ عَمْرٌو معناہ جَعَلَہ مَالُہٗ زَاھِیًا۔ اسی طرح اُھْرِعَ کی تاویل یہ ہوگی کہ اَھْرَعَہٗ خَوْفُہٗ او حِرصُہٗ

قرّاء کی ایک جماعت نے ھَرِعَ سے یَھْرَعُوْنَ بفتح الیاء، صیغہ واحد جمع مذکر غائب مضارع معروف پڑھا ہے وقرأت فرقۃٌ یَھْرَعُوْنَ بفتح الیاء مبنیاً للفاعل من ھَرِعَ (جمل)

اُھْرِعَ الرَّجُلُ: کم عقل ہونا، غصہ، کمزوری شدتِ بخار یا ٹھنڈ وغیرہ سے کانپنا۔ جلدی دوڑایا جانا۔ صیغہ صفت اس کا مُھْرَعٌ آتا ہے۔

الھَرَاعُ والھَرَعُ، جلدی اور تیزی کی چال جس میں اضطراب اور کپکپی ہو۔ رَجُلٌ ھَرِعٌ: تیز رفتار آدمی، جلدی رونے والا۔ مؤنث ھَرِعَۃٌ۔ علمائے تفسیر نے اہل لغت کے دو قول نقل کئے ہیں ایک یہ کہ اِھْرَاع اس دوڑ کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے تھرتھراہٹ اور کپکپی پائی جائے اَلْاِھْرَاعُ ھُوَ الْاِسْرَاعُ مَعَ الرِّعْدَۃِ (کبیر)

یہ قول کسائی اور فراء وغیرہ کا ہے۔ یقال اُھْرِعَ الرَّجُلُ اِھْرَاعًا ای اُسْرِعَ فِی رِعْدَۃٍ (قرطبی) دوسرا قول یہ ہے کہ اِھْرَاعٌ عَدوِ شدید کو کہتے ہیں، کپکپی وغیرہ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ھُوَ الْعَدْوُ الشَّدِیْدُ (کبیر)

علامہ قرطبی نے ان اقوال کے علاوہ کچھ اور اقوال بھی نقل کئے ہیں، ایک یہ ہے کہ اھراع درمیانی چال ہے۔ یُھْرَعُوْنَ: قَوْمُہٗ، کی ضمیر سے حال ہے ای جَاءُوْا مُھْرَعِیْنَ اِلَیْہِ (روح)

ھَرْعٌ مصدر (فتح) تیز چلانا، ھَرَعٌ مصدر بفتح الراء (سمع) تیز چلنا۔ اِھْرَاعٌ (افعال) دوڑنا

تُخْزُوْن : وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ

اور تم مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو۔

یہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا، اور انھیں عرف عام کا واسطہ دلایا، کیونکہ مہمانوں کے سامنے سبکی عُرفاً بھی معیوب تھی۔

تُخْزُوْنِ: اِخْزَاءٌ (افعال) سے صیغہ جمع مذکر فعل مضارع معروف کا ہے۔ نون وقایہ۔ ی واحد متکلم کی ضمیر ہے۔ خِزْیٌ خَزِیَ یَخْزٰی کا مصدر ہے۔ ذلت، خواری، رسوائی۔

حدیث میں ہے فاِنَّ الْغُلُوْلَ خِزْیٌ عَلٰی صَاحِبِہٖ۔ واَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا (مسند احمد)

قرآن پاک میں ہے لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا دنیا میں ان کے لئے رسوائی ہے۔

خَزِیَ الرَّجُلُ خِزْیًا: ذلیل ہونا۔ خوار ہونا۔ رسوائی دو طرح کی ہوتی ہے ایک یہ کہ انسان کو خود اپنی ذات سے لاحق ہو اور دوسری یہ کہ کسی

دوسرے کی طرف سے ہو۔ علامہ راغب نے ان
دونوں میں فرق یہ کیا ہے کہ جو رسوائی انسان کو خود
اپنی طرف سے لاحق ہو اسے حیائے مفرط کہا جاتا ہے
اس کا مصدر خَزَایۃٌ آتا ہے۔ صفت مذکر کا صیغہ
خزیان اور مؤنث خزایا آتی ہے۔ حدیث میں ہے
اللّٰھُمَّ احشُرنَا غَیرَ خَزَایَا وَلَا نَادِمِیْنَ۔ خدایا
ہمیں اس حالت میں زندہ نہ کرنا کہ ہم شرمندہ
اور نادم ہوں۔

اور جو رسوائی دوسروں کی طرف سے لاحق ہو
وہ ذلت کی ایک مذموم قسم ہے۔ اَخْزٰی یہ باب
افعال سے ہے خِزْیٌ اور خَزَایۃٌ دونوں سے آتا ہے
لہٰذا آیت کریمہ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ مناسب یہ ہے
کہ خِزْیٌ سے ہو۔ معنی یہ ہوں گے کہ اس دن خدا
پیغمبر اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں رسوا نہیں
کریگا۔ خَزِیَ (ض) یَخْزِی خَزْیًا، شرمندگی میں
ڈالنا۔ رسوا کرنا، فضیحت کرنا۔ بہت زیادہ رسوا کرنا
خُزْیَۃٌ: وہ عادت جس سے انسان کو ذلیل ہونا پڑے
خَزِیَ الرَّجُلُ خَزَایَۃً ای استحیا، مثل
ذلّ وھانَ وخَزِیَ خِزْیًا اذا افْتَضَحَ (قرطبی)
اگر تُخْزُوْنِ خِزْیٌ مصدر سے ماخوذ ہو تو معنی ہوں گے
لا تَفْضَحُوْنِ فِیْ شَاْنِھِمْ لوگو مجھے مہمانوں کے
بارہ میں رسوا نہ کرو، کیونکہ مہمان کی رسوائی صاحبِ خانہ
کی رسوائی ہے۔

اور اگر یہ خَزَایۃٌ سے ماخوذ ہو تو معنی ہوں گے
لا تُخْجِلُوْنِی فیھم مجھے مہمانوں کے سامنے شرمندہ
نہ کرو۔ واصل معنی خزی، لَحِقَہٗ انکسارٌ اِمَّا
من نفسہ وھو الحیاء المفرط واما من غیرہ
وھو الاستخفاف والتفضیح (روح المعانی)
والمعنی لا تفعلوا باضیافی فعلاً یلزمنی
الاستحیاء منہ۔ والعرب تقول قد خَزِیَ
الرجلُ یخزی خزایۃً اذا استحیٰ (زاد المسیر)

ضَیْفِیْ : میرے مہمان۔ یہاں ایک مضاف
محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے لا تُخْزُوْنِ فی
حَقِّ ضَیْفِیْ۔ حق مضاف، ضَیف مضاف الیہ
مضاف کی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، یہ تمام حرف
فی کے مجرور ہو کر تُخْزُوْنِ کے متعلق ہوں گے۔
تُخْزُوْنِ اصل میں تُخْزُوْنَنِی ہے لا نہی کی وجہ
سے نون اعرابی گر گیا ہے اور صیغہ میں موجودہ نون،
نونِ وقایہ ہے۔

لغاتِ قرآنی کے ماہر عالم، علامہ راغب اصفہانی
لکھتے ہیں اصل الضیف المیل، کہ لفظ ضیف
کے اصل معنی کسی ایک طرف جھکنے اور مائل ہونے
کے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ضِفْتُ اِلٰی کذا،
یعنی میں ایک جانب مائل ہوا اور اَضَفْتُ کذا الی
کذا، میں نے اسے ایک طرف مائل کر دیا۔ اور

ضَافَتِ الشمس للغروب وَتَضَيَّفَتْ سورج
کا مائل بغروب ہونا اور تیر جب نشانہ سے ہٹ
کر پڑے تو کہتے ہیں ضَافَ السَّهْمُ عَنِ الهدف
وَتَضَيَّفَ یعنی تیر نشانہ سے چوک گیا، ایک
طرف کو جا پڑا۔ اور ضیف اصل میں اسے کہا جاتا
ہے جو تمہارے پاس ٹھہرنے کے لئے اتر کر مائل ہو
مگر عرف میں ضیافت کا لفظ مہمان نوازی کیلئے
استعمال ہونے لگا ہے۔ لفظ ضیف اصل میں
مصدر ہے ضَافَ يَضِيفُ ضَيْفًا کا، ضَافَ اليه
مائل ہونا، کسی کے پاس مہمان بن کر آنا اور بعد
میں خود مہمان ہی کو ضیف کہنے لگے ہیں۔ المَضِيْفُ
مہمان خانہ اور المِضْيَافُ، بڑا مہمان نواز۔
علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ لفظ ضیف اصل میں چونکہ
مصدر ہے اس لئے تثنیہ جمع اور مذکر و مؤنث
سب پر یکساں بولا جاتا ہے، اگرچہ تثنیہ اور جمع
بھی بنانا جائز ہے لیکن اکثر استعمال پہلی ہی صورت
کا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے

لا تعدمی الدھرَ شِفارَ الجازِرِ
للضیفِ والضیفُ اَحَقُّ زائرِ

یہاں الضیف سے مراد شاعر نے جمع یعنی
اضیاف لیا ہے۔
امام رازی فرماتے ہیں کہ الضَیفُ یہاں اضیافٌ
کے قائم مقام ہے جیسا کہ آیت کریمہ اوالطفل
الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا میں لفظ طفل اطفال کے
قائم مقام ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ضیف مصدر
ہے جو جمع تثنیہ سے مستغنی ہوتا ہے، مصدر ہونے
کی صورت میں قائم مقام بنانے کی ضرورت ہی نہیں
رہتی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، رِجَالٌ صَوْمٌ
یہاں لفظ صوم مصدر ہے۔ علامہ سلیمان
بن عمر صاحب فتوحاتِ الٰہیہ لکھتے ہیں کہ ضیف
اصل میں مصدر ہے بعد میں اس کا اطلاق رات کو
آنے والے مہمان پر ہونے لگا ہے۔ اس لئے تثنیہ
جمع اور مذکر و مؤنث پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔
علامہ محمود آلوسی نے وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ کی تفسیر
یوں بیان فرمائی ہے والضیف فی الاصل مصدر
ولذا اذا وُصف به المثنی والمجموع لم
یطابق علی المشهور۔ (روح المعانی)

جو حضرات لفظ ضیف کی جمع اور تثنیہ
بناتے ہیں وہ یوں بناتے ہیں۔ ضَيْفٌ، ضَيْفَانِ
ضُيُوْفٌ وَاَضْيَافٌ۔ ایک حدیث میں ہے:
نَهٰى عَنِ الصَّلٰوةِ اِذَا تَضَيَّفَتِ الشَّمْسُ لِلْغُرُوْبِ
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت نماز پڑھنے
سے منع فرمایا ہے جب سورج ڈوبنے کی طرف
مائل ہو۔ سورۃ الحجر میں ہے: قَالَ هٰٓؤُلَاۗءِ
ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ۔

تفسیر بیضاوی کے محشی علامہ شیخ زادہ

نے لکھا ہے کہ ضیف اصل میں ضاف یضیف کا مصدر ہے جس کے معنی کسی کے پاس مہمان بن کر آنے کے ہیں پھر خود مہمان ہی کو یہ نام دیدیا گیا۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ وسمّی الضّیفُ ضَیفاً لاضافته الیك ونزوله علیك (قرطبی) والضیف من مال الیك نزولاً بك و صارت الضیافة متعارفة فی القری واصل الضیف مصدر ولذلك استوی فیه الواحد والجمع فی غالب کلامهم۔ (جمل بحوالہ خازن)

رَشِیْد : اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ کیا تم میں ایک مرد بھی نہیں نیک چلن۔ (شیخ الہند)

رَشَدَ یَرْشُدُ رُشْدًا وَرَشَادًا : ہدایت پانا، راہ راست پر چلنا، رَشَدَ اَمْرُہٗ ہدایت یافتہ ہونا، اَرْشَدَہٗ (افعال) اِلٰی کذا، راہنمائی کرنا ہدایت کرنا۔ اِسْتَرْشَدَہٗ ہدایت چاہنا۔

وَلَدُ رِشْدَۃٍ۔ راء کے کسرہ سے، حلال زادہ شرعی نکاح سے پیدا شدہ۔ اس کی ضد وَلَدُ زِنْیَۃٍ ہے۔

الرَّشْدُ والرُّشْدُ : یہ اَلْغَیّ کی ضد ہے ہدایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ کئی مقامات پر آیا ہے فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا۔ اگر تم ان میں کچھ سمجھداری دیکھو۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَہٗ مِنْ قَبْلُ۔ لیکن جو رُشد یتیم میں ہے اس میں اور رُشدِ ابراہیم میں بڑا فرق ہے۔ یتیم کے رُشد سے مراد یہ ہے کہ وہ مال کی حفاظت کے قابل ہو جائے اور وہ رشد جو جناب ابراہیم علیہ السلام کو عنایت ہوا اس سے مراد نبوت اور امور نبوت کو ادا کرنے کی قوت ہے اور دین و دنیا دونوں کی ہدایت ہے لفظ رشید میں علماء تفسیر کے دو قول ہیں۔

ایک یہ کہ رشید بمعنی مُرْشِدٌ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ تم میں کوئی بھی نیک چلن آدمی نہیں ہے جو حق بات کہے اور اس اوباش ٹولے کو میرے مہمانوں سے دفع کرے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رشید بمعنی مُرْشَد (بفتح الشین) ہے مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کو خدا نے ہدایت کی ہو کہ وہ اس عملِ قبیح سے باز آئے (کبیر)

صاحبِ خازن علامہ علی بن محمد المتوفی ۷۲۵ھ لکھتے ہیں کہ ای صَالِحٌ سَدِیْدٌ عاقلٌ۔ معلوم ہوا کہ علماء کے نزدیک لفظ رشید یہاں مُرْشِدٌ کے معنی میں ہے۔ اور محمد بن اسحٰق کا قول یہ نقل کیا ہے رَجُلٌ یَاْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰی عَنِ الْمُنْکَرِ اس سے معلوم ہوا کہ محمد بن اسحٰق کے نزدیک بھی رشید بمعنی مُرْشِد ہے۔ صاحبِ جلالین نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

علامہ راغب اصفہانی نے رَشَدٌ بفتح الراء والشین اور رُشْدٌ بضم الراء وسکون الشین میں بعض علماء سے فرق نقل کیا ہے کہ رَشَدٌ، رُشْدٌ سے اخص ہے، کیونکہ رُشْدٌ امورِ دنیویہ اور اخرویہ دونوں پر بولا جاتا ہے اور رَشَدٌ کا استعمال صرف امورِ اُخرویہ میں ہے اور رَاشِدٌ اور رَشِیْدٌ دونوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

رَشِیْدٌ (فعیلٌ) بمعنی فاعل رُشْدٌ سے ماخوذ ہے نیک چال، بھلا آدمی، شائستہ۔

رَشَادٌ: نیکی، بھلائی خیر۔ وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ۔ یہاں سبیل الرشاد سے مراد مصلحت کی راہ ہے۔

قال الانباری: یجوز أن یکون الرشید بمعنی المُرشِد، فیکون المعنی الیس منکم مُرْشِدٌ یعظکم ویعرّفکم قبیح ما تأتون؟ فیکون الرشید من صفۃ الفاعل، ویجوز ان یکون الرشید بمعنی المرشد۔ فیجری رشید مجری مفعول (ابن جوزی)

اٰوٰی: اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُكْنٍ شَدِيْدٍ یا جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ گاہ میں، لوط علیہ السلام کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے کہ کاش کوئی طاقت ور اور مضبوط پناہ دینے والا ہوتا یعنی کنبہ، برادری جتھا یہاں ہوتا۔

آوِیْ، اِیْوَاءٌ سے مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہے، میں جا بیٹھوں گا، میں فروکش ہو جاؤں گا وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ۔ جب برادرانِ یوسف مصر پہنچ کر دربار میں حاضر ہوئے تو، اٰوٰی الیہ اخاہ، انہوں نے اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس جگہ دی (یوسف)

وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ مؤمن اور ان کو ایک ٹیلہ پر جہاں ٹھہرنے کا موقع تھا اور شاداب اور جاری پانی تھا، جگہ دی:

سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ میں ابھی تہر کر پہاڑ پر جا بیٹھوں گا

فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ غار میں چل کر پناہ لو، فلاں غار میں چل بیٹھو، اُوْوٗا یہ اِیْوَاءٌ سے امر کا صیغہ ہے۔ اَوَوْا بفتح الواو، جمع مذکر ماضی کا صیغہ ہے انہوں نے جگہ دی، فروکش کیا۔

اَوٰی یَاْوِیْ اُوِیًّا (ض) اترنا۔ فروکش ہونا اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ۔ جب جوان پہاڑ میں پناہ گزیں ہوئے۔ المأوٰی، یہ اَوٰی یَاْوِیْ اُوِیًّا و مَاْوًی کا مصدر ہے، کسی جگہ پر ٹھہرنا یا نزول کرنا یا پناہ حاصل کرنا، اَوٰی اِلٰی کذا کسی کے ساتھ مل جانا، منضم ہو جانا۔

قال ابو عبیدۃ: قولہ (آوی) من قولھم اَوَيْتُ اِلَيْكَ، فَاَنَا آوِيْ اُوِيًّا۔ والمعنی صِرْتُ اِلَيْكَ وَانْضَمَمْتُ۔ (زاد المسیر)

اَوٰی یأوٰی کا مصدر جب اَوِیَۃٌ اور اِیَۃٌ ، یا
مَاْوَاۃٌ ہوں تو اس کے معنی ہوتے ہیں نرم دل
ہونا۔ رحم کھانا۔ ترس کھانا۔ حدیث میں ہے
کان یُصَلِّی حتّٰی کُنْتُ اٰوِیْ لَہٗ آپ اتنی
طویل اور لمبی نماز پڑھا کرتے تھے کہ مجھے آپ پر ترس
آتا کہ بڑھاپے میں اتنی مشقت !

رُکْن : کسی چیز کی وہ جانب جس کے سہارے
پر وہ قائم ہوتی ہے، یا وہ جانب جس کا سہارا اور
آسرا لیا جائے۔ رُکنٌ کہلاتی ہے، اس کی جمع
ارکان آتی ہے پھر استعارۃً قوت اور زور دار
قبیلہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے، مضبوط اور محکم قلعہ
کو بھی رُکن کہتے ہیں۔

الرُّکْنُ ، فی الاصل الناحیۃ من البیت
او الجبل (صحاح) والرُّکُنُ ، بسکون الکاف
ومنہا الناحیۃ من جبل وغیرہ ویجمع علی
ارکان وارکن (جمل) رُکْنُ الشیٔ جانبہ
الذی یُسْکَنُ الیہ (راغب)

رَکَنَ یَرْکُنُ (ن) ورَکِنَ ، رُکُونًا۔ رَکَنَ الیہ
کسی کی طرف مائل ہونا، جھکنا
رَکَنَ اِلَیْہِ وارْکَنَ : کسی پر بھروسہ کرنا، اعتماد کرنا
رُکْنُ الشیٔ : کسی چیز کا بنیادی پہلو۔ کہتے ہیں
فلانٌ رکنٌ من ارکانِ قومہ۔ یعنی وہ اپنی قوم
کے شرفاء میں سے ہے۔ رَکَّنَہٗ : کسی کو باوقار
سنجیدہ بنانا، تَرَکَّنَ : مضبوط ہونا۔ رَکَنَ یَرْکَنُ
فتح سے بھی استعمال ہوتا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ
ن و س ہو۔ وَلَا تَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا
یہ رَکِنَ (س) سے ہے۔ ارکان العبادات
سے مراد وہ جوانب ہوتے ہیں جو اُن کا مبنی
بنتے ہیں اور جن کے ترک سے عبادات باطل
ہو جاتی ہیں۔

فَتَوَلّٰی بِرُکْنِہٖ (ذاریات) اس نے اپنی
قوت کے زعم میں سرتابی کی، یہاں لفظ رُکن مضاف
اور ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ہے
رُکن کے معنی یہاں قوت اور دنیاوی جاہ وحشمت
کے ہیں، حرف باء تعدیہ کے لئے ہے۔ الباءُ
للتعدیۃ حینئذٍ بمعنی فقوّیٰ بجندہٖ
والرُّکْنُ ما یَرْکَنُ الیہ الانسان من مال
وجند۔ (مدارک) اور اگر یہاں رُکن ، قوم
کے معنی میں لیا جائے تو حرف باء مصاحبۃ کیلئے
ہوگا۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ اس نے
مع اپنے قوم کے سرکشی کی۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں ایک شبہ ہوتا ہے
کہ جناب لوط کا رکن شدید سے کیا مطلب
ہے، کیا حضرت لوط علیہ السلام (العیاذ باللہ)
خدا کی قدرت پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے جو کسی
رکن شدید کی پناہ کے طالب ہوئے ؟

اس شبہ کا ازالہ بخاری کی ایک روایت نے کر دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، یغفر اللّٰہ للوطٍ ان کان یاوی الیٰ رکن شدیدٍ ھو ربّہ وخالقہٗ۔ اللہ تعالیٰ لوط کی بخشش کرے (وہ اس درجہ پریشان ہوگئے) کہ رکن شدید کے طالب ہوئے، اوران کے لئے ان کا رکنِ شدید ان کا پروردگار اوران کا خالق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام خدا کو بھول کر کسی اور قوت کی پناہ کے طالب نہ تھے بلکہ وہ اس درجہ پریشان کیے گئے کہ وہ اس وقت قابلِ رحم حالت میں تھے، اس وقت ان کی یہ تمنا ہوئی، کاش اللہ تعالیٰ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اسی وقت ان بدبختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا دیتا۔

اَلْمِرْکَنُ: ٹب۔ نہانے کا بڑا طشت، نَغْتَسِلُ مِنْ مِرْکَنٍ وَاحِدٍ، ہم ایک ہی ٹب میں نہالیتے ہیں۔

اَسْرِ: فَاَسْرِ بِاَھْلِکَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ

سو لے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات سے (موضح)

اَسْرِ صیغہ امر واحد مذکر حاضر ہے۔ لیکن ہے کس باب سے۔ اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اِسْرِ، سَرٰی یَسْرِیْ سُرًی وَسَرْیَۃً وَمَسْرًی (ض) سے امر کا صیغہ ہے۔ لہٰذا ان حضرات نے اسر کے ہمزہ کو وصل کے ساتھ، فَاسْرِ، پڑھا ہے۔ چنانچہ نافع اور ابن کثیر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ جن حضرات نے یہاں اَسْرِ، ہمزہ وصل کیساتھ پڑھا ہے ان کی دلیل وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ ہے یَسْرِ اصل میں یَسْرِیْ تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اَسْرِ صیغہ امر کا اِسْرَاءٌ (افعال) سے ہے لھٰذا ان کے نزدیک ہمزہ قطعی ہے اور جمہور کی قراءت بھی یہی ہے۔

سَرٰی یَسْرِیْ سُرًی کے معنی ہیں رات کو چلنا، رات کو سفر کرنا۔ اس معنی میں سَرٰی اور اَسْرٰی (افعال) دونوں ایک ہی معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں اور حرف باء کے ساتھ متعدی ہوتے ہیں جیسے سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ۔ سَرٰی بِہٖ، رات کو سفر کرانا، رات کو لے جانا۔ سَارِیَۃٌ: رات کو طلوع ہونے والا ستارہ۔ نابغہ کہتا ہے:

اَسْرَتْ عَلَیْہِ مِنَ الْجَوْزَاءِ سَارِیَۃٌ
تزجی الشمالُ علیہ جامدَ البَرَدِ

اس میں نابغہ نے اَسْرَتْ (افعال) اور ساریۃ (ض) سے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح ایک شاعر کہتا ہے

حتی النضیرۃ رَبَّۃَ الخِدْرِ ÷ اَسْرَتْ الیک ولم تکن تَسْرِی

ترجمہ :

بعض حضرات نے ان دونوں ابواب میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ، اَسْریٰ (افعال) کے معنی ہیں رات کے پہلے حصہ میں سفر کرنا، اور سَریٰ (ض) کے معنی ہیں رات کے آخری حصہ میں سحر کے قریب قریب سفر کرنا اور جو سفر دن کو کیا جاتا ہے اس پر سَارَ یَسِیْرُ کا اطلاق ہوتا ہے۔

وَالسُّرٰی السَّیْرُ فی اللیل، یقال سَریٰ یَسْرِی اذا سَارَ باللیل واسری بفلان اذا سیّر به باللیل (کبیر)

فَاَسْرِ بالقطع اذا سار من اوّل اللیل وسری اذا سار من آخره (قرطبی)

اَسْریٰ لاوّل اللیل وسریٰ لِاٰخره (جمل)

وقیل انّ اَسْریٰ للمسیر من اول اللیل، و سَریٰ للمسیر من آخره (فتح القدیر)

بالقطع من الاسراء .... وقد جاء سَریٰ وهما بمعنی واحد عند ابی عبیدۃ والازهری، وعن اللیث اَسریٰ سار اوّل اللیل وسریٰ یسری، سار آخره (روح)

وقال الراغب، السُّریٰ سیر اللیل یقال سَریٰ واسریٰ سُرِیَ عنه : اس کا غم و غصہ جاتا رہا۔ یا جو بے ہوشی اس پر طاری تھی اس سے افاقہ ہوا۔ سَرَّیْتُ عن قلبه : میں نے اس کے دل کا رنج دور کر دیا۔

اَسْرِ : میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ سَریٰ یَسْرِیْ سے افعال نہ ہو جس کے معنی رات کو چلنے کے ہیں بلکہ یہ سَرَاۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کشادہ اور کھلے میدان کے ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ آپ رات ہی کو اپنے لوگوں کو لیکر نکل جائیں اور کسی کھلے میدان میں جا ٹھہریں۔

چونکہ اس قوم کو صبح سے قبل ہلاک کر دیا جائیگا

اُسْریٰ اور اَسْریٰ، اَسِیْرٌ کی جمع ہیں بمعنی قیدی

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ۔ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ۔

قِطْعٍ : بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ۔ آخر رات کی تاریکی، آخر رات کا ایک حصہ، اول رات کے تہائی کو بھی بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ کہا جاتا ہے۔ قَطْعٌ کے معنی کسی چیز کو بالکل علیحدہ کر دینے کے ہیں۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ۔ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا

قِطْعٌ : درخت سے کٹا ہوا لکڑی کا ٹکڑا، اس کی جمع اَقْطُعٌ، اَقْطَاعٌ و قِطَاعٌ آتی ہے۔

قِطَعٌ : یہ قِطْعَةٌ کی جمع ہے۔ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (الرعد) اس سے مراد زمین کے مختلف الخواص اور مختلف الاحوال ٹکڑے ہیں

قال صاحب الکشاف، بقاع مختلفۃ مع کونہا متجاورۃ متلاصقۃ

کَاَنَّمَا اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا (یونس) یہاں رات کے سیاہ ٹکڑے مراد ہیں۔ قَطَّعَ (تفعیل) مصدر تَقْطِیْعٌ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کردینا۔ قَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ان کی انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردیگا۔ قَطَّعْنَ انہوں نے (اپنے ہاتھ) کاٹ ڈالے

علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ قِطْعٌ یہاں قِطْعَۃٌ کے معنی میں ہے۔ محاورہ ہے مضٰی قِطْعٌ من اللیل یعنی رات کا ایک حصہ گزر گیا، مراد اس سے قِطْعَۃٌ ہے۔ ابن الانباری کہتے ہیں قِطْعٌ جب قِطْعَۃٌ کے معنی میں ہو تو اس سے مراد رات ہی ہوگا اور اگر کوئی یوں کہے کہ عِنْدِیْ قِطْعٌ من الثوب اور مراد اس سے قِطْعَۃٌ ہو تو محاوراتِ عرب کے خلاف ہے۔ وقال ابن الانباری، ذکر القِطْعِ بمعنی القِطْعَۃِ مختصٌّ باللیل۔ (زاد المسیر)

سِجِّیْل: وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ اور برسائے ہم نے پتھر اس (ارضِ لوط) پر کنکر کے تہہ بہ تہہ، یعنی یکے بعد دیگرے پتھر پہ پتھر برسائے شروع کردیئے گئے اور یہ موسلا دھار بارش کی طرح برستے رہے

سِجِّیل لغتِ عرب میں کنکری کو کہتے ہیں۔ یعنی اگر مٹی کو آگ میں پکایا جائے تو پکنے کے بعد اس میں پتھر کی سی سختی پیدا ہوجاتی ہے، اسی مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹھیکریوں کا نام عربی سجّیل اور فارسی سنگ گِل ہے بلکہ بعض علماء لغت نے تو یہ تصریح کی ہے کہ سجّیل فارسی کے مرکب لفظ سنگ گِل کی تعریب ہے۔ یعنی مٹی سے بنا ہوا پتھر۔ چونکہ یہ لفظ لغتِ عرب میں شامل ہوچکا تھا اس لئے قرآن پاک میں بھی اس کا استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں لوط علیہ السلام کے واقعہ میں لفظ حِجَارۃ کی دو طرح تفسیر کی گئی ہے۔ ایک حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ، اور دوسرے حِجَارَةً مِّنْ طِیْنٍ (ذاریات) مٹی کے پتھر۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ سجّیل سے مراد سکھائی ہوئی مٹی کا پتھر ہے جیسے ہمارے ہاں جھاواں کہتے ہیں۔ علامہ سیوطی نے بھی سجّیل کو فارسی لفظ ہی بیان کیا ہے۔ اخرج الفریابی عن مجاهد قال: السجّیل بالفارسیۃ اوّلها حجارۃ وآخرها طین۔

(الاتقان ج ۱ ص ۱۳۹ طبع قاہرہ)

سجّیل بکسرِ سین سنگ گِل کا معرب کیا ہوا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں ایسی کنکریں جو تر مٹی کو آگ میں پکانے سے بنتی ہے (معارف ج ۸)

صاحبِ خازن نے ابن عباس اور سعید بن جبیر کا

قول بھی یہ ہی نقل کیا ہے کہ (سجیل) کی اصل سنگ
اور گل ہے اور یہ فارسی کا معرب ہے۔ قیل ھی کلمۃ
معربۃ من سنگ گل بدلیل قولہ حجارۃ من طین[1]
وھی بالفارسیۃ حجارۃ من طین[2]
قیل ھی کلمۃ معربۃ من سنکل بدلیل
قولہ حجارۃ من طین (کشاف)۔ طین طبخ
بالنار (جلالین) قال القاضی البیضاوی
واصلہ سنک گل فعرب۔ قیل ھی کلمۃ معربۃ
من سنککل بدلیل قولہ حجارۃ من طین (کشاف)
علامہ ابن ھشام لکھتے ہیں کہ یونس نحوی اور
ابوعبیدہ نے مجھے لفظ سجیل کے بارہ میں خبر
دی ہے کہ اہل عرب کے نزدیک سجیل، الشدید
الصلب، یعنی سخت مضبوط چیز کے معنی میں استعمال
ہوتا ہے۔ چنانچہ رؤبہ ابن العجاج کہتا ہے کہ

ومسھم ما مس اصحاب الفیل
ترمیھم حجارۃ من سجیل

امام بخاری بھی اسی قول کو اختیار کرتے ہوئے
لکھتے ہیں کہ سجیل: الشدید الکبیر وفی
بعض النسخ الشدید الکثیر۔
تفسیر قرطبی میں اس قول کو نحاس کی طرف
منسوب کیا گیا ہے۔ قال النحاس: السجیل
الشدید الکثیر۔ قرطبی۔
لغوی نحاس کے نزدیک لفظ سجیل اور سجین
دونوں ہم معنی ہیں۔ قرب مخرج کی وجہ سے حرف
لام نون سے بدل جاتا ہے چنانچہ تمیم بن مقبل کہتا ہے

ورجلۃ یضربون البیض ضاحیۃ
ضربا تواصی بہ الابطال سجینا

یہاں ضربا کی صفت سجینا واقع ہو رہی ہے
یعنی ضربا سجینا ای ضربا شدیدا۔
لیکن اس قول کو عبداللہ بن مسلم نے یہ کہکر رد
کر دیا ہے کہ ابن مقبل کے قول میں لفظ سجین فعیل
کے وزن پر سجنت سے ہے جس کے معنی حبست
کے ہیں یعنی میں نے بند کر دیا۔
ابوعبیدہ کے قول پر نحاس کے کہنے کے مطابق
یہ شبہ ہوتا ہے کہ سجیل اگر شدید کے معنی میں ہے
تو حجارۃ سجیلا ہونا چاہئے تھا، موصوف اور
صفت کے درمیان حرف من کا حائل ہونا کوئی
معنی نہیں رکھتا چونکہ حجارۃ من شدید کلام عرب
میں غیر مسموع ہے۔
لفظ سجیل کے انہی معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اہل علم
کی ایک معتد بہ جماعت کا قول یہ ہے کہ لفظ
سجیل عربی کا لفظ ہے۔ علامہ قرطبی نے بعض
کا قول نقل کیا ہے کہ ھو من لغۃ العرب، کہ یہ
عربی لغت کا لفظ ہے۔
قتادہ اور عکرمہ فرماتے ہیں کہ السجیل الطین
بدلیل قولہ: لنرسل علیھم حجارۃ من طین

[1] حقانی جلد ۲۔ [2] ابن کثیر ج ۲ ص ۴۵۵

اور حضرت حسن کا قول ہے کہ حجر کی اصل مٹی ہے اس مٹی پر جب طویل زمانہ گزرتا ہے تو اس میں صلابت اور شدت پیدا ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ پتھر بن جاتا ہے۔ اور عرب لوگ ہر شدید اور سخت چیز کو سجیل کہتے ہیں۔ آجر یعنی پختہ اینٹ کو بھی اسلئے سجیل کہتے ہیں کہ پکنے کے بعد اسمیں شدت اور صلابت پیدا ہو جاتی ہے۔

وقال قتادۃ وعکرمۃ: السجیل الطین بدلیل قولہ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ۔ وقال الحسن: کان اصل الحجارۃ طیناً فشُدِّدت، والسجیل عند العرب کل شدید صلب (قرطبی)

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ سجیل آسمانِ دنیا کا نام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پر آسمانِ دنیا سے پتھر برسائے گئے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ سجیل سموات میں ایک پہاڑ ہے یہ پتھر وہاں سے برسائے گئے اور اس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں بتلایا ہے۔ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِن جِبَالٍ فِيهَا مِن بَرَدٍ۔ لفظ سجیل میں امام رازی نے دس اقوال نقل کئے ہیں۔ اکثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ عربی ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ سجیل عربی لفظ ہے مگر اکثر علماء تفسیر نے ترجیح پہلے قول کو ہی دی ہے کہ سجیل سنگ گل کا معرب ہے۔ والسجیل: الطین المتحجر وھو کما اخرج عبد بن حمید عن ابن عباس ومجاھد معرب سنک کل (روح)

سجیل: الحجارۃ من الطین الیابس (قصص القرآن)

مزید تفصیل کے لئے قرطبی، کبیر اور قصص القرآن کا مطالعہ فرمائیے　واللہ اعلم

نَضِيدٌ یہ اسم مفعول ہے بمعنی تہ بر تہ۔

نَضَدٌ (بتحریک الضاد) طے کیا ہوا سامان۔ منتخب سامان۔ آبائی بزرگی۔ بزرگ۔ جمع انضاد

نَضْدٌ مصدر بسکون الضاد۔ باب ضرب۔ تہ بر تہ کرنا۔ نَضِيدٌ تہ بر تہ۔ نَضِيدَةٌ تکیہ۔

نَضَدْتُ المتاعَ بعضَہ علی بعضٍ۔ سامان کو ایسے قرینے سے ایکدوسرے پر رکھنا کہ شیٔ واحد کی طرح ہو جائے اور پھر اس سامان کو بھی نضید اور منضود کہتے ہیں جو قرینہ سے رکھا ہوا ہو۔ مجازاً گھرے بادل کو بھی نَضَدٌ کہا جاتا ہے۔ (راغب)

مَنْضُودٍ: قال ابن عباس: متتابع۔ وقال الربیع نُضِدَ بعضُہ علی بعض حتی صار جسداً واحداً (قرطبی) نَضَدْتُ اللَّبِنَ: اینٹوں کو ایکدوسرے پر رکھنا۔ اَنْضادُ الجبالِ: تہ بہ تہ پہاڑیاں۔ اَلنَّضِيدَةُ: بھری ہوئی چیز جیسے تکیہ کہ روئی سے بھرا ہوتا ہے جمع نَضَائِدُ حدیث میں ہے لَتَتَّخِذُنَّ نَضَائِدَ الدِّيبَاجِ

تم ریشمی کپڑے کے تکیے بناؤ گے۔

والنضد جعل الشی بعضه فوق بعض (جمل) یرسل بعضه فی اثر بعض متتابعًا (کشاف)

قال الواحدی هو مفعول من النضد وهو موضع الشی بعضه علی بعض. کبیر

وهو وضع الشی بعضه فوق بعض (خازن)

وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ (ق)

اور کھجوریں بھی ان کا خوشہ ہے تہ بہ تہ (ترجمہ عثمانی)

وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ: طلح کیلے کا درخت۔ منضود جس کے پھل تہ بہ تہ ہوں۔ جیسے کیلے کے گچھوں میں ہوتے ہیں۔ (معارف القرآن)

مَدْيَن: وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا

اور مدین کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ (ترجمہ ماجدی)

مَدْيَن اسم معرفہ علم ہے۔ یہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ان کی بیوی قطورہ کے بطن سے ہیں۔ یہ اپنی قوم کے ہمدرد اور رہنما بزرگ گزرے ہیں بعد میں انہوں نے جس شہر کو آباد کیا وہ شہر مدین کہلایا۔

مدین اس شہر کا محل وقوع بحر احمر کا ساحل عرب تھا۔ کوہ طور کے جنوب و مشرق میں شمالاً جنوبًا عرض البلد ۲۹ درجہ ۲۹ دقیقہ اور ۲۷ درجہ ۳۹ دقیقہ کے درمیان۔ حضرت ابراھیم کی ایک بیوی قطورہ تھیں انہی کے بطن سے ایک صاحبزادہ مدین نامی تھے۔ شہر جب آباد ہوا تو قدیم دستور کے مطابق انہی کے نام سے موسوم ہوا (حاشیہ ماجدی)

وهم قبیلة من العرب کانوا یسکنون بین الحجاز قریبًا من معان (ابن کثیر)

مدین عرب کے ایک قبیلہ کا نام ہے جو حجاز اور شام کے درمیان معان کے قریب رہتے تھے۔

مفسرین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں یا دو جداجدا قبیلے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی رائے اور تحقیق یہ ہے کہ ایکہ اور مدین ایک ہی قبیلہ کے نام ہیں جو باپ کی نسبت سے مدین اور زمین کی طبعی اور جغرافی حیثیت سے اصحاب ایکہ کہلائے۔ سید سلیمان ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ اصحاب مدین اور ایکہ دونوں الگ الگ قبیلے ہیں۔ ان دونوں کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل لفظ ایکہ میں ذکر کی جائیں گی (ان شاء اللہ)

اَلْقِسْط: بِالْقِسْطِ: عدل کے ساتھ۔

اسم مصدر بمعنی انصاف۔ ای اَتِمُّوْا ذلك بالعدل[1]

بالقسط ای بالعدل (خازن) ای بالعدل من غیر زیادة ولا نقصان (روح)

القسط هو النصیب بالعدل (راغب)

[1] ابن جوزی۔

لَا تَبْخَسُوْا: وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ
اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان نہ کرو۔
لَا تَبْخَسُوْا۔ صیغہ جمع مذکر حاضر فعل نہی مضارع معروف از باب فَتَحَ يَفْتَحُ۔
البَخْسُ: کے معنی کوئی چیز ظلم سے کم کرنا کے ہیں کہتے ہیں لَا تَبْخَسْ اَخَاكَ حَقَّهُ تو اپنے بھائی کا حق نہ مار۔ بَخْسٌ اور بَاخِسٌ ناقص اور حقیر چیز کو بھی کہتے ہیں۔ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ۔ یہاں بخس کے معنی ناقص اور حقیر کے ہیں (راغب)
اَلْبَخْسُ: الھَضْمُ والنقص (کشاف)

رَھْط: وَلَوْلَا رَھْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ۔ اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو ہم سنگسار کر ڈالتے اور ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں۔
رَھْطٌ: تین سے لے کر دس تک مردوں کی جماعت جس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔
والرھط: من الثلاثة الی العشرة وقیل الی السبعة (کشاف) اس کی کوئی واحد نہیں آتی، البتہ جمع آتی ہے اَرْھُطٌ اور اَرْھَاطٌ اور جمع الجمع اَرَاھِط وَاَرَاھِيط۔
رھط کی طرف اگر عدد کی اضافت کریں تو اس سے اشخاص و افراد مراد ہوتے ہیں۔ جیسے عِشْرُوْنَ رَھْطًا، یعنی بیس اشخاص، قرآن میں ہے تِسْعَةُ رَھْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ (نمل) نو آدمی ملک میں فساد کرتے تھے۔
امام راغب فرماتے ہیں کہ الرھط: العصابة دون العشرة وقیل یقال الی الاربعین: یعنی رہط دس سے کم آدمیوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کا اطلاق چالیس تک کی جماعت پر ہوتا ہے۔
قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ رھط کا اطلاق تین یا سات سے دس تک پر ہوتا ہے اور نفر کا اطلاق تین سے دس تک پر ہوتا (بیضاوی)
رھط: گروہ و جماعتِ مردان (غیاث اللغات فارسی)
مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی لکھتے ہیں کہ قرآن نے اس کا استعمال قوم اور برادری کے معنی میں بھی کیا ہے جس سے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ چالیس اشخاص تک کی جماعت کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔ (لغات القرآن)
لفظ رھط میں شدت اور سختی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اسی سے رَھِيْطٌ اور تُرْھُوْطٌ: پیٹو آدمی کو کہتے ہیں جو خوب دبا کے کھانے والا ہو رَھَطَ يَرْھَطُ (ف) بڑے بڑے لقمے کھانا۔
واصله علی ما نُقل عن الزمانی الشدّةُ ومنه الرھیط لشدّة الاکل (روح)
امام قرطبی لکھتے ہیں کہ رھط آدمی کی وہ

جماعت و برادری ہے جس سے وہ سہارا لیتا ہے
راھطاء: چوہے کے بل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اس میں پناہ لیتا ہے اس کی جمع رَھَاطِی آتی ہے۔
و رَھْطُ الرجل عشیرته الذی یتمدد الیهم ویتقوّی بهم (قرطبی۔ فتح)
رُھْط کی تصغیر رُھَیْط آتی ہے۔
مسلم کتاب الایمان میں ہے فرأیتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و معه رُھَیط۔

رَجْمٌ: وَلَوْلَا رَھْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ
اور اگر تیرے کنبہ کا (لحاظ) نہ ہوتے تو ہم تم کو سنگسار کر چکے ہوتے۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ کنبہ کا لحاظ اس لئے نہ تھا کہ وہ ان سے ڈرتے تھے بلکہ اس لئے کہ حضرت لوط کی دوسری برادری ان بدکردار لوگوں کے دین ہی کی متبع تھی۔ لیکن جناب صالح علیہ السلام کا جواب قرآن نے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب صالح علیہ السلام کی برادری کا ان کو واقعی خوف تھا۔ اَرَھْطِیٓ اَعَزُّ عَلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ سے اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

رَجْمٌ: سنگسار کرنا۔ قتل کرنا۔ بے سوچے سمجھے منہ سے بات نکالنا۔ لعنت کرنا۔ دھتکارنا دھتکارنا۔ رَجْمٌ مصدر ہے۔ رَجَمَ یَرْجُمُ کا۔ اصل میں رجم کے معنی رِجَامٌ (پتھروں) سے مارنے کے ہیں اور بقیہ تمام معانی مستعار ہیں (لغات القرآن)

رَجْمٌ: سنگ زدن۔ سنگسار کردن و نفرین و بگمان سخن گفتن۔ درآمدن و دشنام دادن[1]۔
الرَّجْمُ فی اللغة عبارة عن الرمی (کبیر)
الرِّجَامُ: اصل میں پتھر کو کہتے ہیں۔ پھر اسی سے رَجْمٌ پتھر مارنے کے معنی میں لیا گیا ہے اور جس کو پتھروں کے ذریعہ سے سنگسار کیا جاتا ہے اسے مرجوم کہتے ہیں۔ اس کی جمع مَرْجُوْمِیْن آتی ہے۔ قرآن میں ہے۔ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ۔ پھر استعارہ کے طور پر جھوٹے گمان، توہم۔ اور سب وشتم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ رَجْمًا بِالْغَیْبِ، اٹکل پچو۔ بے تکی باتیں۔ الرَّجِیْمُ: مَلْعُوْنٌ فعیل بمعنی مفعول۔ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ تو وہاں سے نکل جا کہ راندہ درگاہ ہے۔
رَجْمٌ کی جمع رُجُوْمٌ آتی ہے، آلاتِ سنگساری
رَجْم اصل میں مصدر ہے اور جس چیز کے ذریعہ سنگسار کیا جائے اس کے لئے بطور اسم مستعمل ہے (لغات القرآن) پھر رجم چونکہ قتل کا سبب ہے اس لئے قتل پر بھی لفظ رجم بولتے ہیں۔ اور یہاں رجم بمعنی قتل ہے۔
ولما کان ھذا الرجم سبباً للقتل لاجرم

[1] غیاث اللغات

سَمَّوْا القتل رجمًا (کبیر)

لرجمناك لقتلناك (قرطبی)

الرِّجَامُ: الحجارة۔ والرجمُ: الرّمیُ بالرجام (راغب)

ظِهْرِيًّا: وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا۔ اوراس کو ڈال رکھا تم نے پیٹھ پیچھے بھلا کر (ترجمہ تھانویؒ)

ظِهْرِيٌّ: ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے پس پشت ڈال کر بھولی بسری کر دیا جائے۔ صاحب کشاف لکھتے ہیں ظِهْرِيٌّ ظَهْرٌ کی طرف منسوب ہے اور کسرہ نسبت کے تغیرات میں سے ہے جیسے کہ اَمْسِ کی طرف نسبت کرتے ہیں تو اِمْسِیٌّ بولتے ہیں۔ قال صاحب الکشاف: والظِّهْرِی منسوبٌ الی الظَّهْر والکسر من تغییرات النسب ونظیرہ قولھم فی النسبة الی الامس اِمْسِیٌّ بکسر الھمزة (کشاف۔ کبیر)

وقال صاحب روح المعانی: وروی عن ابن عباس والحسن وغیرھما: والظِّهْرِیُّ منسوبٌ الی الظهر واصلہ المرمی وراء الظھر۔ ظَهَرَ الشیءُ: کسی چیز کا زمین کے اوپر اس طرح ظاہر ہونا کہ نمایاں طور پر نظر آئے۔ یہ بطن کی ضد ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا زمین کے اندر مخفی ہونا۔ پھر ہر اس چیز کو جس کا ادراک آنکھ یا بصیرت سے ہو سکے ظاہر کہدیا جاتا ہے۔ بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ ظھور کے معنی خفا کے بعد نمودار ہونے کے ہیں۔ ظَهَرَ لی رَأْیٌ مجھے یہ رائے ظاہر ہوئی یعنی پہلے معلوم نہ تھی اب معلوم ہوگئی۔ ظَهَرَ بِعِلْمِہٖ: اپنے علم پر فخر کرنا ناز کرنا۔ لفظ ظَهَرَ ظاہر ہونے اور پھیل جانے کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: خشکی اور تری میں (لوگوں کے اعمال کے سبب) فساد پھیل گیا۔ ظَهَرَ الفسادُ ای کَثُرَ وشاعَ (راغب)

ظَهِیْرٌ: ہم پشت و یاری (منتخب)

وَمَا لَہٗ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِیْرٍ۔ اور ان میں سے کوئی خدا کا مددگار بھی نہیں۔

وکان الکافرُ علٰی رَبِّہٖ ظَهِیْرًا: کافر اپنے رب کی مخالفت میں ہو رہا ہے۔ یعنی خدا کی مخالفت میں شیطان کا مددگار ہے وقال للحسن: ظَهِیْرًا ای معینًا علی المعاصی (قرطبی) اس معنی کے اعتبار سے ظہیر مُظَاهَرَةٌ سے فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت فاعلی کا صیغہ ہے۔ یہ صیغہ واحد۔ جمع۔ مذکر اور مؤنث سب میں یکساں طور پر مستعمل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فَعِیْلٌ اور فَعُوْلٌ دونوں میں مذکر و مؤنث یکساں طور پر استعمال

کہے جاتے ہیں جیسا کہ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ بلاشبہ ہم (دونوں) رب العالمین کے فرستادہ ہیں۔ یہاں رسول مفرد ہیں اور وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَھِیْرٌ۔ یہاں ظہیر فعیل بمعنی مفعول ہے اور اس سے مراد مظہور ہے۔ یعنی پُشت کے پیچھے ڈالا ہوا اور معنی آیت وَکَانَ الْکَافِرُ عَلٰی رَبِّہٖ ظَھِیْرًا کے یہ ہوں گے کہ خدا کے نزدیک کافر کی کوئی قیمت نہیں اسے ذلیل و حقیر اور بے وقعت کر کے پسِ پُشت ڈالا ہوا ہے اور اس کا کفر خدا کے نزدیک بے قدر و قیمت ہے۔

محاورہ ہے ظَھَرْتُ بِکَذَا یعنی میں نے اس کو پسِ پُشت ڈال دیا۔ ظَھَرْتُ بِہٖ اَیْ جَعَلْتُہٗ خَلْفَ ظَھْرِیْ وَلَمْ اَلْتَفِتْ اِلَیْہِ (قرطبی)۔ ظَھَرَ فُلَانٌ بِحَاجَتِیْ اس نے میری حاجت کو ہلکا جان کر پسِ پُشت ڈال دیا، اس کی طرف التفات نہیں کیا۔ مشہور شاعر فرزدق کہتا ہے

تمیم ابنَ قیسٍ لاتکوننّ حاجتی
بظھرٍ فلا یعیا علیّ جوابُھا

یعنی میری حاجت کو بے وقعت جان کر پسِ پُشت نہیں ڈال دینا۔

ھٰذا معنی قول ابی عبیدۃ۔ وظھیر بمعنی مظھور (قرطبی)

صاحبِ قرطبی اور بعض دوسرے مفسرین اور اہل لغت نے ایک توجیہ اور نقل کی ہے کہ رَبِّہٖ میں ضمیر الٰہ حق کی طرف نہیں بلکہ کافر کے معبودِ باطل کی طرف ہے اور وہ صنم اور بُت ہے۔ اس توجیہ پر آیت کا مطلب یہ ہے کہ کافر اپنے خدا پر غالب ہے۔ چونکہ اس کا خدا جامدِ محض ہے جسطرح چاہتا ہے اس کو تراش لیتا ہے اور جب دیکھا کہ خدا پرانا ہوگیا ہے تو پھینک دیا اور نیا بنا لیا۔

ظَھِیْرَۃٌ : دوپہر، نیمروز، وقتِ ظہر، ٹھیک دوپہر میں جو گرمی کی شدت ہوتی ہے وہ ظھیرۃ کہلاتی ہے۔ ابن الاثیر اور ابن سیدہ نے تصریح کی ہے کہ موسمِ سرما میں دوپہر کو ظھیرہ نہیں کہتے۔ قرآن کریم میں اس سے قیلولہ کا وقت مراد ہے۔ اس کی جمع ظھائر ہے (لغات القرآن)

وقت القائلۃ وقت التجرد ایضًا وھی الظھیرۃ، لان النھار یظھر فیھا اذا علا شعاعہ واشتدّ حرّہٗ (قرطبی)

اَلظَّھِیْرَۃُ : شِدَّۃُ الْحَرِّ وھو انتصاف النھار (مجمل)

اَلْوِرْدُ : یَقْدُمُ قَوْمَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَاَوْرَدَھُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ

وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا پھر ان کو دوزخ میں جا اُتاریگا اور بُری ہے وہ جگہ اُترنے کی جہاں یہ اُتارے جائیں گے۔ (ماجدی)

اَلْوِرْدُ : اسم ہے گھاٹ، اُترنے کی جگہ، گھاٹ

کا پانی۔ یہاں اَلْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ میں وِرْدٌ سے مراد اُترنے کی جگہ کے ہیں۔ الوُرُوْدُ: مصدر ہے جس کے معنی پانی کا قصد کرنے کے ہیں، وَرَدْتُّ الْمَاءَ میں نے پانی کا قصد کیا۔

اَلْوَارِدُ: صفتِ فاعل ہے۔ پانی پر پہنچنے والا۔ اور مَوْرُوْدُ: پانی کو کہتے ہیں جس پر قصد کر کے پہنچا جائے۔ اور یہ ضَرَبَ سے استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ۔ اور جب مدین کے پانی کے مقام پر پہنچے۔

اور اِیْرَادٌ (افعال) کے معنی ہیں کسی کو پانی پر وارد کرنا۔ کہتے ہیں اَوْرَدَ الْاِبِلَ عَلَى الْمَاءِ: اُس نے اونٹوں کو پانی پر وارد کیا۔ پھر توسّعاً لفظِ وِرْدٌ ہر جگہ کا قصد کرنے پر بولے جانے لگا ہے۔ اسی طرح اِیْرَادٌ بھی ہر جگہ پہنچانے پر بولا جاتا ہے جیسا کہ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ (فرعون) انھیں دوزخ پر جا اُتاریگا۔ دنیا میں اُس ظالم نے اپنے قوم کو دریا بُرد کیا اور آخرت میں حوالہ دوزخ کریگا۔

ابن الانباری کہتے ہیں کہ اَلْوِرْدُ یہاں اَلْوُرُوْدُ مصدر کے معنی میں ہے اور اہلِ عرب وِرْد بول کر وہ جگہ مراد لیتے ہیں جہاں پر اُترا جائے۔ قال ابن الانباری: الورد مصدر معناه الورود، تجعله العرب بمعنى الموضع المورود۔ (زاد المسیر)

اور صاحبِ مفردات فرماتے ہیں کہ اَلْوِرْدُ: اس پانی کو کہتے ہیں جو وارد ہونے کے لئے تیار کیا گیا ہو اور یہ صدر کی ضد ہے جس کے معنی لوٹنے کے ہیں۔ الورد: الماء المرشح للورود والورد خلاف الصدور (راغب)

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ لفظ وِرْدٌ تین طرح استعمال ہوتا ہے یعنی کبھی ورود کے معنی اور کبھی وارد (فاعل) کے معنی ہیں، اگر بمعنی وُرُود ہو تو یہ مصدر ہوگا اور اگر بمعنی وارد ہو تو جمع ہوگا جیسا سورۃ مریم میں ہے وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا۔ یہاں لفظ وِرْد وارد کی جمع ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنم کی طرف پیاسے ہنکائے جائیں گے، جمع وَارِدٍ بمعنی مَاشٍ عطشان (جلالین) والورد، الجماعة يَرِدُوْنَ الْمَاءَ (جمل)

اور کبھی وِرْد بمعنی مَوْرُوْد بھی آتا ہے۔ وقد يكون بمعنى المورود عليه كالماء الذى يُوْرَدُ عليه (کبیر)

اور الوارِدُ: اس شخص کو بھی کہتے جو قافلے کے آگے جا کر پانی لائے۔ سورۃ یوسف میں ہے: فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ، انہوں نے پانی لانے کے لئے سقا بھیجا۔ اور وہ شخص جو پانی پر پہنچ جائے اسے بھی وَارِد کہتے ہیں

بعض حضرات کے نزدیک لفظ وُرُوْد میں
پانی کے اندر اترنا بھی شرط ہے گویا لفظ ورود
دو مفہوموں سے مرکب ہے، ایک پانی پر جانا۔ اور
دوسرے اس میں اُترنا ۔ اور بعض اہل لغت کے
نزدیک ورود کے معنی پانی پر جانا ہے اس میں
اُترنا شرط نہیں ہے ۔ قرآن کریم کی آیت کریمہ
وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا، تم میں سے کوئی شخص
ایسا نہ رہے گا مگر اسے اس پر سے گزرنا ہوگا۔
کے متعلق جو لوگ ورود میں دخول کو شرط قرار دیتے
ہیں ان کے نزدیک مطلب یہ ہوگا کہ جہنم میں
نیک و بد سب داخل ہوں گے مگر اہل ایمان اور
صالحین پر اس کا اثر نہ ہوگا جیسا کہ جناب ابراہیمؑ پر
آگ کا کچھ اثر نہ ہوا۔ علامہ آلوسی نے علماء تفسیر کے
جم غفیر اور اہل سنت کا نظریہ یہ بیان کیا ہے کہ
جہنم میں ایک دفعہ سب کو داخل ہونا ہوگا۔
مگر اہل اللہ کو دوزخ سے کوئی رنج نہ پہنچے گا۔
چنانچہ وَارِدُھَا کے تحت علامہ فرماتے ہیں کہ
ای داخلھا کما ذھب الیہ جمع کثیر من
سلف المفسرین واھل السنۃ ۔ اور اہل تفسیر
کا ایک بڑا گروہ اس طرف گیا ہے کہ وُرُوْدٌ میں دخول
ضروری نہیں ہے۔ اس لئے اِلَّا وَارِدُھَا میں
ورود سے مراد صرف مُرور یعنی گزرنا اور محض پہنچنا
ہے ۔ چنانچہ صاحب روح المعانی نے ابن الانباری

اور بیہقی کے حوالے سے حسنؒ سے روایت
بیان کی ہے کہ ورود سے مراد صرف دوزخ
پر سے گزر جانا ہے، داخل ہونا نہیں ہے ۔
الوُرُوْدُ المُرُوْرُ عَلَیْھَا من غیر دخول (روح)
لیس المراد من الورود الدخول والمراد
الحضور والرؤیۃ (معالم) وقال بعضھم
الورود الدنو من جھنم وان یصیروا
حولھا (کبیر) خود قرآن میں لفظ ورود کئی مقامات
پر مطلق پانی پر پہنچنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔
جیسا وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ اسی طرح
فَاَرْسَلُوْا وَارِدَھُمْ ۔
واخرج عبد بن حمید عن عبید بن عمیر
ان الورود الحضور والقرب کما فی قولہ
وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ (روح)
المَوْرُوْد : اسم مفعول واحد مذکر، ورود سے
ماخوذ ہے، اُترنے کی جگہ یعنی ظرف مکان ۔
والمورود الماء الذی یُورَدُ والموضع الذی
یُورَدُ وھو بمعنی مفعول ۔ (قرطبی)
کہتے ہیں کہ گلاب کا پھول دوسرے تمام پھولوں
سے پہلے آتا ہے اس لئے اس کو وَرْدٌ کہا جاتا ہے
اور پھر ہر پھول کو وَرْدٌ کہتے ہیں ۔ وِرْدٌ : بخار اور
المورود وہ جس کو باری کا بخار آئے ۔ وَرْدَۃٌ :
ہلاکت، چونکہ آثار قیامت کے طور پر آسمان سرخ

ہو جائے گا جو مشکل اور ہلاکت کا دن ہوگا۔
فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ - تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائیگا۔

اَلرِّفْدُ : بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ

الرِّفْدُ : بکسر الراء اس کے معنی عطاء اور مدد کے ہیں۔ اور رَفْدٌ مصدر ہے جس کے معنی مدد دینے اور عطا کرنے کے ہیں اور مِرْفَدٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس میں عطیہ ڈال کر دیا جائے۔ عام طور پر پیالوں میں ڈال کر خیرات دی جاتی ہے۔ اس لئے مِرْفَدٌ بمعنی پیالہ آتا ہے اور رَفَدْتُہ کے معنی عطیہ دینے کے آتے ہیں۔

بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ بہت ہی برا عطیہ جو انہیں دیا جائیگا۔ الرَّفُوْدُ : اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو ایک دفع میں دودھ کا پیالہ بھر دے۔ لہٰذا یہ فعول بمعنی فاعل ہے۔ رَفَدَ الحَائِطَ : دیوار کو سہارا دینا۔ رَفَدَہٗ : تعظیم کرنا، سردار بنانا۔ تَرَافَدَ القَوْمُ : ایکدوسرے سے تعاون کرنا۔ الرِّفَادَۃُ : زخم کی پٹی۔ زین یا کجاوے کے سہارے کی چیز۔ اور الرِّفَادَۃ : اس فنڈ کو بھی کہا جاتا تھا جو قریش نادار حاجیوں کی خدمت میں خرچ کرتے تھے۔ اَلمَانِعُ رِفْدَہٗ اپنی عطا کو روکنے والا۔ یَرْفِدُوْنَ ذَا الْحَاجَۃِ : محتاج کی مدد کرتے ہیں۔

اَلرِّفْدُ : المعونۃُ وَالعطیۃُ وَالرَّفْدُ (بالفتح) مصدر (راغب) قال ابن قتیبۃ الرِّفْدُ : العطیۃ یقول اللغۃ بئس العطیۃ رَفَدْتُہٗ اَرْفِدُہٗ اذا اعطیتہ واعنتہ صاحب قرطبی نے نقل کیا ہے کہ الرَّفْدُ بفتح الراء عطیہ کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ اور بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ سے مراد ہے بئس العطاء والاعانۃ۔ علامہ ماوردی نے اصمعی لغوی سے نقل کیا ہے الرَّفْدُ بفتح الراء القَدَحُ۔ یعنی رَفد پیالے کو کہتے ہیں اور الرِّفْدُ بکسر الراء وہ چیز جو پیالے میں ڈال کر دی جائے۔ اور الرِّفد کے ایک معنی زیادہ ہونے کے بھی آتے ہیں۔ تو اس اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ ان فرعونی کافروں کو غرق کرنے کے بعد جو زیادتی ہوگی وہ بہت بری ہوگی اور وہ بری زیادتی آگ ہے۔

صاحب روح المعانی نے ابوحیان سے یُقال سے نقل کیا ہے کہ رَفَدَ الرَّجُلَ یَرْفِدُہٗ رَفْدًا وَرِفْدًا اس وقت کہتے ہیں جب کسی آدمی کی مدد کی جائے اور اس کو کوئی عطیہ دیا جائے، اور یہ رَفَدَ الحَائِطَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دیوار کو سہارا دینا۔ تو عطیہ اور معونہ کو بھی رفد اس لئے کہتے ہیں کہ یہ آدمی کے لئے سہارا بنتے

له زاد المسیر

ہیں۔ اور لیث لغوی کہتے ہیں کہ رِفدٌ کے
اصل معنی بخشش اور مدد کے ہیں اور اسی سے
قریش کے اس فنڈ کو رِفَادَۃ کہا جاتا تھا جس
سے وہ نادار حجّاج کی امداد کرتے تھے (روح)
وقال الرازی اَلرِّفْدُ ھو العطیۃ واصلہ
الذی یعین علی المطلوب (کبیر)
المرفود : اسم مفعول واحد مذکر،
انعام دیا گیا۔ مدد کیا گیا۔ المَرفُودُ المعطیٰ[له]
الرِّفدُ المَرفُودُ سے مراد یہاں لعنت ہے
جو دنیا میں کفار پر کی جاتی ہے چونکہ لعنت کفار
کے لئے زیادتی عذاب کا ذریعہ ہے اس لئے
اس کو رِفد کہا گیا ہے۔ وذلك ان اللَّعْنَةَ
فی الدنیا رِفدٌ للعذاب ومددٌ له (کشاف)

حَصِیْدٌ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى
نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِیْدٌ۔
حَصِیْدٌ کٹی ہوئی کھیتی۔ یہ حَصَادٌ سے فعیل
کے وزن پر بمعنی مفعول ہے۔ صفتِ مشبہ کا صیغہ
ہے اسکی جمع حَصْدیٰ و حِصَادٌ آتی ہے جیسے مریض
کی جمع مَرضیٰ و مَرَاضٌ آتی ہیں۔ (روح)
اَلحَصَدُ : الخَرَابُ قالہ ابن عباس (قرطبی)
آیتِ کریمہ میں لفظ حصد سے مراد وہ تباہ و
برباد شدہ بستیاں ہیں جنہیں قانونِ الٰہی چھوڑنے
کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اس زمین سے کھیتی
کی طرح کاٹ دیا۔ علامہ قرطبی نے ذکر کیا ہے کہ
ذوی العقول کی جمع حَصْدیٰ کے وزن پر آتی ہے
جیسے قَتِیل کی جمع قَتْلیٰ

وَمَا ظَلَمْنَا : وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ۔
ظَلَمْنَا صیغہ جمع متکلم مصدر ظلم ھُمْ ضمیر منصوب
متصل مفعول ہے۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔
امام قرطبی نے ظلم کی تعریف یہ کی ہے۔
اصل الظلم فی اللغة وضع الشئ فی غیر
موضعه (قرطبی)

تَتْبِیْبٌ : وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ
نقصان میں ڈالنے کے سوا اُن کے حق میں اور کچھ
نہ کرسکے۔ تَتْبِیْبٌ : تباہ و برباد کرنا۔ سدا گھاٹے
اور نقصان میں رہنا۔ تفعیلٌ کے وزن پر مصدر ہے
تَبَّ یَتُبُّ تَبًّا و تَبَابًا و تَبِیْبًا : مسلسل
خسارے میں رہنا۔ تَبًّا لَهٗ : خدا اسے خائب و
خاسر کرے۔ خدا اسے غارت کرے۔
تَبَّ لَهٗ کے معنی ہیں کسی کو تَبًّا لَك کہنا۔
تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ : ابولہب کے ہاتھ
ٹوٹ جائیں۔ تَبَّتْ یَدَاهُ ایک محاورہ جو
مقابلہ سے عاجز ہونے پر بولا جاتا ہے،
کیونکہ کسرِ ید کسی کا زور توڑنے اور عاجز
کردینے کی ایک تعبیر ہے، قد الزمانی کہتا ہے
وتَرکنا دیار تغلب قفرًا ۔ وکسرنا من الغواۃ الجناحا

[له] زاد المسیر

ترجمہ: ہم نے بنی تغلب کی زمین کو چٹیل میدان بنا کر چھوڑ دیا، اور ان کے سرکشوں کے بازو توڑ دیئے۔

تو تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ کا مطلب یہ ہوگا کہ ابولہب مقابلہ سے عاجز ہو گیا۔

التَّبَابُ: الهلاكُ والخسران (قرطبی)

ہلاکت وزیانکاری (غیاث اللغات)

التبابُ الخُسران وهو اسمٌ من تَبَّهُ۔ والتتبيبُ التخسير (جمل)

اصل میں تباب گھاٹے اور نقصان کے معنی دیتا ہے اور بطور کنایہ ہلاکت کے لئے بولا جاتا ہے۔ ابوجہل نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا۔

زَفِيْرٌ: لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ

اس میں اُن کی چیخ و پکار پڑی رہے گی (ترجمہ ماجدی)

زفیر اور شہیق یہ دونوں گدھے کی آوازیں ہیں۔ زفیر اس کی شروع کی آواز، شہیق اس کے آخر کی آواز۔ قال الضحاك ومقاتل والفراء الزفير اول نهيق الحمار والشهيق آخره (بحر)

قال اهل اللغة من الكوفية والبصرية الزفير بمنزلة ابتداء صوت الحمار والشهيق بمنزلة آخر نهيقه (روح۔ ماجدی)

مطلب یہ ہے کہ اہل دوزخ طرح طرح کی بڑی بڑی دردناک آوازوں سے چیختے چلاتے رہیں گے زفیر کے اصل معنی سانس کی اس قدر تیزی کے ہیں کہ اس سے سینہ پھول جائے۔

اِزْدَفَرَ (افتعال) فُلَانٌ كَذَا، کسی چیز کو مشقت سے اُٹھانا جس سے سانس پھول جائے۔ پانی لانے والی لونڈیوں کو زَوَافِر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مشقت کی وجہ سے ان کا سانس پھول جاتا ہے۔ وقال صاحب الکشاف: والزفير اِخراج النفس والتهيق رَدُّهُ۔ صاحب کشاف نے بطور استشہاد کے شماخ شاعر کا ایک شعر نقل کیا ہے جس میں وہ حمار وحشی کی تعریف میں کہتا ہے

بعيدُ مَدَى التطريب اوّل صوته
زفيرٌ ويتلوه شهيقٌ مُحَشْرَجُ

مَدَى سے مراد مسافت اور غایت ہے، اور تطریب سے مراد تردید الصوت ہے۔ اور زفیر سے مراد اِخراجُ النفس بشِدّةٍ اور مُحَشْرَجٌ اسم مفعول ہے، اس آواز کو کہتے ہیں جو سینہ اور حلق سے جان کنی کے وقت پیدا ہوتی ہے۔

زَفَرَ يَزْفِرُ زَفْرًا وَزَفِيرًا۔ زَفَرَتِ النَّارُ: آگ کے بھڑکنے کی آواز سنائی دینا۔ زَفَرَ الحِمَارُ: گدھے کا ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگنا۔[۱]

[۱] راغب

قال صاحب الخازن: اصل الزفیر تردید النفس فی الصدر حتی تنتفخ منه الضلوع والشھیق ردّ النفس الی الصدر (خازن)

ابوالعالیہ کا قول یہ ہے کہ زفیر حلق کی آواز اور شہیق پیٹ کی آواز کو کہتے ہیں۔ (خازن۔ قرطبی)

شَہِیْقٌ: شہیق کے معنی سانس کھینچنے کے ہیں۔ یہ جَبَلٌ شَاهِقٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی بلند پہاڑ کے ہیں۔ جبل شاهِقٌ ای طَوِیْلٌ۔ زفیر اور شہیق دونوں مصیبت کے ماروں کی آوازیں ہیں۔ والزفیر والشھیق من اصوات المحزونین۔ (قرطبی)

سُعِدُوْا: نیک بخت بنائے گئے (فتح) سَعْدٌ سے جس کے معنی نیک بخت کرنے کے ہیں۔ ماضی مجہول کا صیغہ مذکر غائب۔

علامہ ابوجعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں سَعْدٌ اور سَعُوْدٌ کے معنی مبارک ہونے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے سَعَدَ یَوْمُنَا (ہمارا دن مبارک ہوا)۔ نیز سَعْدٌ کے معنی ہیں نیک بخت کرنے کے اور اس معنی میں اہل لغت نے اختلاف کیا ہے زجاج، زہری اور فارابی نے تو اس کو جائز رکھا ہے۔ اور ارشادِ الٰہی وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا (اور لیکن جو لوگ نیک بخت کئے گئے) سے بضم سین، استدلال کیا ہے۔ اور سیبویہ، نیز محققین اہل لغت نے اس سے انکار کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ (اس بیان میں) عرب کا محاورہ اَسْعَدَ اللّٰہُ ہے اور یہ روا نہیں کہ سُعِدُوْا سَعَادَۃٌ سے (بمعنی نیک بخت ہونا) ہو۔ کیونکہ سَعَادَۃٌ شَقَاوَۃٌ کی طرح سے لازم ہے اور اس کی قرأت کے بارے میں سیبویہ نے کہا ہے کہ یہ لغت قیاس سے خارج ہے۔ یا باب فَعَلَ اور فَعَلْتُہٗ سے ہوگی (یعنی لازم بھی اور متعدی بھی) جیسے کہ غَاضَ (وہ گھٹ گیا) اور غِضْتُہٗ (میں نے اس کو گھٹا دیا) اور اسی طرح سے سَعَدُوْا (وہ نیک بخت ہوا) اور سَعَدْتُہٗ (میں نے اس کو نیک بخت کیا) اور مَسْعُوْدٌ میں ان کے لئے کوئی دلیل نہیں کیونکہ جائز ہے یہ مثل اَجَنَّہُ اللّٰہُ فَھُوَ مَجْنُوْنٌ کے ہو (یعنی باب اسعاد سے مستعمل ہو) سَعَدَہُ اللّٰہُ یَسْعَدُہٗ سَعْدًا اللہ نے اس کی مدد کی اور امور خیر کی اس کو توفیق دی۔ سَعِدَ یَسْعَدُ سَعْدًا وَسَعَادَۃً وہ مبارک اور بابرکت ہوا۔ اَلْاِسْعَادُ والمُسَاعَدَۃُ معاونت کرنا باہم ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ سعید وہ شخص ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ اس کے مقابل کا لفظ شَقِیٌّ ہے بمعنی بدبخت خدا اور رسول کا نافرمان۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں السعید الذی کتبت علیه السعادۃ۔ سعید وہ شخص ہے جس کے حق میں

لہ قرطبی

نیکی لکھ دی گئی ہو۔ گویا وہ فطرتاً نیک اور صالح ہے

مَجْذُوْذٌ : عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۔ یہ عطیہ اور بخشش غیر منقطع کبھی نہ ختم ہونے والا ہوگا ۔ ایسا نہ ہوگا کہ کچھ روز بعد کسی مرد صالح کو، کورٹ مارشل کے ذریعہ جنّت آوٹ کر دیا جائے یا کر دیا جائے اور جُذَاذًا جِذٌّ بکسر الجیم کی جمع ہے بمعنی ٹکڑے ٹکڑے ۔ مَجْذُوْذٌ کاٹا ہوا، ٹکڑے کیا ہوا، توڑا ہوا جَذَّ يَجُذُّ جَذًّا کاٹنا۔ توڑنا۔ اَلْجَذُّ کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور کاٹنے کے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں ۔ پتھر اور سونے کے ریزوں کو جُذَاذ کہتے ہیں ۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد ہے فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا ، پھر اُن کو (حضرت ابراہیم نے) توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور کپڑے چیتھڑے کو جُذَّةٌ کہتے ہیں۔ محاورہ ہے مَا عَلَيْهِ جُذَّةٌ اس کے بدن پر چیتھڑا بھی نہیں ہے (راغب)

جَذَّهٗ يَجُذُّهٗ جَذًّا ای قَطَعَهٗ (کبیر۔ قرطبی)

جُذَاذُ النخل : کھجور کے کٹنے کا وقت ۔ نَهٰى عن الجذاذ ۔ قربانی میں کان کٹے ہوئے جانور دینے سے آپؐ نے منع فرمایا ۔ وَالجَذُّ : الكسرُ والقطع جَذَذْتُ الشئ کسرتُه وقطعتُه (قرطبی ج۹ ص۱۱۲)

تَرْكَنُوْا : وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۔ اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں پھر تم کو لگے گی آگ (معارف) یعنی ظالموں کی طرف ادنیٰ میلان بھی نہ رکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ تمہیں بھی جہنم کی آگ لگ جائے۔

لَا تَرْكَنُوْا : مصدر رکون سے بنا ہے جس کے معنی کسی طرف خفیف سے میلان اور جھکاؤ اور اس پر اعتماد و رضا کے ہیں ۔ اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ظلم و جور میں خود مبتلا ہونے کو تو دین و دنیا کی تباہی سب ہی جانتے ہیں مگر ظالموں کی طرف ادنیٰ سا جھکاؤ اور میلان ان سے راضی ہونا، ان پر اعتماد کرنا ان کو اسی بربادی کے کنارے لگا دیتا ہے ۔ (معارف القرآن)

الركون حقيقةُ الاستناد والاعتماد والسكون الى الشئ والرضا به (قرطبی)

ابن زید کا قول یہ ہے کہ رکون سے مراد یہاں مداھنت ہے کہ ظالموں کے ظلم کو دیکھے اور یہ خوش ہوتا رہے یا یہ کہ ظالموں کی برائیوں کو دیکھے اور ان کو روکے نہیں ۔

زُلَفًا : وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۔ اور قائم کرو نماز کو دونوں طرف دن کے اور کچھ ٹکڑوں میں رات کے ۔ زُلَفًا (یہاں) زُلْفَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ایک حصہ اور قطعہ کے ہیں (معارف)

زَلَفَ يَزْلُفُ (ن) زُلْفًا و زَلَفًا ۔ زَلَفَ و ازْدَلَفَ : قریب ہونا ۔ اِزْدَلَفَ اِلَيْهِ

کسی کے قریب ہونا۔ اَزْلَفَہٗ، قریب کرنا۔ حدیث میں ہے اِزْدَلِفْ اِلَی اللّٰہِ بِرَکْعَتَیْنِ دو رکعتوں کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل کرو۔

امام راغب لکھتے ہیں کہ الزُّلْفَۃُ کے معنی قرب اور مرتبہ کے ہیں چنانچہ فَلَمَّا رَاَوْہُ زُلْفَۃً کے معنی بعض نے یہ بیان کئے ہیں کہ جب وہ اہل ایمان کے مراتب قرب کو دیکھیں گے اور وہ خود اس سے محروم بعض نے کہا ہے کہ زُلْفَۃً سے عذاب کا قرب مراد ہے۔ زُلْفَۃٌ کا استعمال عام طور پر مراتبِ محمودہ میں ہوتا ہے عذاب پر لفظ زُلفہ کا استعمال بطور تہکم کے ہیں۔ لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی تاکہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ مُزْدَلِفَہ کو بھی اسی لئے مزدلفہ کہتے ہیں کہ حجاج عرفات سے لوٹنے کے بعد اس رات مزدلفہ میں منیٰ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور زُلَفًا مِّنَ اللَّیْلِ سے مراد رات کے مختلف حصے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ والزُّلَفُ السَّاعَاتُ القریبۃ بعضھا من بعض (قرطبی)

امام بغوی لکھتے ہیں کہ یہ اسم ہے بوصف مصدر اس میں جمع تثنیہ واحد اور مذکر و مؤنث سب برابر ہیں۔ وھو اسم یوصف بہ المصدر یستوی فیہ المذکر والمؤنث والواحد والاثنان والجمع (بغوی علی حاشیۃ الخازن)

ابن القعقاع اور ابن اسحٰق وغیرہ نے زُلُفًا بضم اللام پڑھا ہے۔ یہ زَلِیْفٌ کی جمع ہے۔ زَلَفُ اللَّیْلِ کے معنی ہیں رات کی گھڑیاں۔ ساعاتِ شب۔ قال ابو عبیدۃ الزُّلَفُ الساعات۔ واحدھا زُلْفَۃٌ۔ (زاد المسیر)

بَقِیَّۃٍ : فَلَوْلَا کَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ اُولُوْا بَقِیَّۃٍ یَّنْھَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِی الْاَرْضِ۔ پس کاش تمہارے پیشتر کے امتوں سے ایسے سمجھدار لوگ ہوتے جو منع کرتے ملک میں فساد پھیلانے سے۔ اُولُوْا بَقِیَّۃٍ کے معنی اصحابِ خیر اور اصحابِ فضل کے بھی کئے گئے ہیں اور اصحابِ فہم کے بھی۔ قال صاحب الکشاف اولوا فضل وخیر۔ وقال صاحب روح المعانی ذو خصلۃ باقیۃ من الرأی والعقل۔ اور اگر بقیہ کو فضل کے لئے اسم مانا جائے تو پھر اُولُوْا بَقِیَّۃٍ کے معنی ذُوْ فضل ہوں گے۔

فضل کو بقیہ اس لئے کہا گیا ہے کہ انسان اپنے میں سب سے اچھی چیز کو باقی رکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اسی لئے عرب والے بولتے ہیں فلان من بقیۃ القوم یعنی فلاں آدمی قوم میں عمدہ ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بقیہ، تقیہ کی طرح مصدر ہو۔ اس صورت میں اولوا بقیۃ معنی کے ذُوْ بَقَاء کے ہوں گے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنی

جانوں کو عذاب سے بچائیں اور محفوظ رکھیں۔

(لغات القرآن۔ کشاف)

وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ

بقیۃ سے مراد ان دونوں بھائیوں کے کچھ آثار ہیں۔ یہ تورات کی کچھ الواح اور حضرت موسیٰ ؑ کی نعلین اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ وغیرہ چیزیں تھیں۔

بقیۃ: فعیلۃ کے وزن پر بقاءٌ سے صفتِ مشتبہ کا صیغہ ہے۔ اور تا مبالغہ کی ہے اس صورت میں مراد اس سے جید الشیٔ یعنی عمدہ چیز ہوگی۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے جیساکہ صاحبِ کشاف نے نقل کیا ہے کہ یہ بقاءٌ سے مصدر بمعنی بَقْوٰی ہو جیساکہ تقیۃ بمعنی تقویٰ

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اہل الرائے اور سمجھدار لوگوں کو لفظ اُولوا البقیۃ سے تعبیر کیا ہے، بقیۃ کا لفظ باقیماندہ چیز کیلئے بولا جاتا ہے۔ اور انسان کی عادت ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتی ہے اس کو ہر حال میں اپنے لئے محفوظ اور باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے ضرورت پڑنے پر دوسری ساری چیزیں قربان کر دیتا ہے مگر اس کو نہیں دیتا اس لئے عقل و بصیرت کو بقیۃ کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزیز ہے (معارف القرآن)

اُتْرِفُوْا: وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ۔ اور جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے وہ جس نازو نعمت میں تھے، اُسی کے پیچھے پڑے اور (عادی) مجرم ہوگئے (ماجدی)

اُتْرِفُوْا: اِتْرَافٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ مذکر غائب ہے بمعنی وہ آرام دیئے گئے۔

تَرِفَ (س) يَتْرَفُ تَرَفًا: خوش حال ہونا۔ آسودہ ہونا۔ اَلتُّرْفَةُ: عیش و عشرت میں فراخی کو کہتے ہیں۔ اُتْرِفَ فُلَانٌ فَهُوَ مُتْرَفٌ آسودہ حالی اور کثرتِ دولت کی وجہ سے بدمست ہونا۔ اَتْرَفَ الرَّجُلُ: کسی کا سرکشی پر اصرار کرنا۔ صَبِيٌّ مُتْرَفٌ: نازپروردہ، صحتمند بدن والا۔ اَلتُّرْفَةُ: النعمۃ۔ وصَبِيٌّ مُتْرَفٌ اذا کان منعم البدن۔ والمترف الذی اَبْطَرَتْهُ النعمۃ وسَعَةُ المعیشۃ (کبیر)

والترف: التنعم (خازن)

وفی القاموس التُّرْفَة بالضم النعمۃ والطعام الطیب، واَتْرَفَتْهُ النِّعْمَةُ، اَطْغَتْهُ (جمل)

یعنی عیش نے اس کو بے راہ کر دیا۔ اَتْرَفَ زَيْدٌ (لازم) زید نا فرمانی پر جم گیا۔ مُتْرَفٌ: عیش پرست۔ خوش حال۔ امیر۔ اُتْرِفَ زَيْدٌ فَهُوَ مُتْرَفٌ: زید کو خوش حالی دی گئی

...میں دو خوش رہا ہے۔

تَمَتُّعٌ (تفعّل) عیش و راحت یا زندگی گزارنا۔

اِستَتَرَفَ: بدکار اور نافرمان ہو گیا

اَمْلَئَنَّ: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو جنات اور انسان سب سے۔

مَلَأَ يَمْلَأُ (ف)، مَلْأً وَمَلْأَةً وَمِلَاءَةً: بھرنا

مَلَأَ الْاِنَاءَ مَاءً: برتن کو پانی سے بھرنا،

اَمْلَئَنَّ، مَلْأٌ سے ہے بھرنے اور پُر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ صیغہ واحد متکلم با نون تاکید ثقیلہ

فُؤَادٌ: نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ۔ ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں۔

فُؤَادٌ: واحد۔ اس کی جمع اَفْئِدَةٌ آتی ہے بمعنی دل۔ لغت میں تَفَؤُّدٌ کے معنی ہیں روشن ہونا، دل چونکہ علم و عرفان کا مرکز اس لئے اس کو فؤاد کہا جاتا ہے

علامہ راغب فرماتے ہیں فؤاد قلب ہی کے معنی میں آتا ہے مگر قلب کو فؤاد اس وقت کہا جاتا ہے جب اس میں روشن ہونے کے معنی ملحوظ ہوں۔

فَأَدْتُ اللَّحْمَ کے معنی ہیں گوشت کو آگ پر بھون لینا

لَحْمٌ فَئِيْدٌ: بھنا ہوا گوشت

الحمد للہ سورہ ھود آج مورخہ ۱۸؍۵؍ ۱۹۷۶ء

کو پایۂ تکمیل کو پہنچی

شَرۡحُ الفَاظِ القُرۡآن مِنۡ سُوۡرَۃِ یُوۡسُف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡقَصَصِ : نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ
ہم نے جو آپ پر یہ قرآن وحی سے بھیجا ہے تو ہم ہی اس کے ذریعہ سے آپ سے ایک بہترین قصہ بیان کرتے ہیں۔ (ماجدی)

اَلۡقَصُّ : کے معنی نشانِ قدم پر چلنے کے ہیں۔
قَصَصۡتُ اَثَرَہٗ : میں اس کے نقشِ قدم پر چلا، اور قَصَصٌ کے معنی نشان کے آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے فَارۡتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا پھر وہ دونوں اپنے قدموں کے نشان پر واپس لوٹے۔ وَقَالَتۡ لِاُخۡتِهٖ قُصِّیۡهِ اور انہوں نے موسیٰؑ کی بہن سے کہا کہ موسیٰ کا سراغ تو لگانا۔ اسی سے تَقۡصِیۡصٌ ہے جس کے معنی اس گھاس کے ہیں جس کے باقی ماندہ نشان سے کھوج لگایا جاسکے۔ اگر قَصَّ یَقُصُّ قَصَصًا کا استعمال حرف عَلٰی کے ساتھ ہو تو اس کے معنی قصہ اور واقعہ بیان کرنے کے ہوتے ہیں جیساکہ وقَصَّ عَلَیۡهِ

الۡقَصَصَ : حضرت موسیٰ نے ان کو اپنا قصہ بیان کیا۔ ورنہ اس کے معنی نقش قدم پر چلنے کے ہوتے ہیں۔ اسی سے حکایت گو کو قَصَّاص کہتے ہیں۔ چونکہ وہ وہ واقعات بیان کرنے میں اصل واقعہ کی پیروی کرتا ہے۔ اسی سے قِصَاصٌ ہے جس کے لفظی معنی مماثلت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کیا اس پر بھی اُتنا ہی کیا جائے وَلَكُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰٓاُولِی الۡاَلۡبَابِ وَالۡجُرُوۡحَ قِصَاصٌ۔

اس آیت میں لفظ قصص میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ بمعنی اقتصاص ہو، جیساکہ کہا جاتا ہے: قَصَّ الۡحَدِیۡثَ یَقُصُّهٗ قَصًّا وَقَصَصًا : قصہ بیان کرنا۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہوگی نَقُصُّ علیک احسن الاقتصاص۔ اس تقدیر پر حُسن کا تعلق بیان کے ساتھ ہوگا۔ مطلب یہ کہ ہم یہ بیان آپ کو بڑی بلاغت اور فصاحت کے ساتھ سناتے ہیں۔ اگرچہ یہ قصہ یوسف کتب

سابقہ میں بیان ہوا ہے مگر ان کے بیان میں اور قرآن کے بیان میں بڑا فرق ہے۔ قال صاحب الکشاف: القصص علی وجہین یکون مصدرًا بمعنی الاقتصاص ویکون فَعَلًا بمعنی مفعول کالنّفض (بمعنی المنفوض) والحَسَب بمعنی الحسیب۔ یہ فَعَلًا کے وزن پر بمعنی مفعول کے ہوگا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ قصصًا تسمیۃ المفعول بالمصدر کے قبیل سے ہو جیسا کہ خلق بمعنی مخلوق اور صَیْدٌ بمعنی مَصِیْدٌ کہتے ہیں اَللّٰہُ رَجَاؤُنَا اَیْ مَرْجُوُّنَا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے ھٰذَا الکتابُ عِلْمُ فُلَانٍ۔ اور مراد علم سے معلوم ہوتا ہے ای مَعْلُوْمُہٗ۔ اس صورت میں قصصٌ بمعنی مقصوص ہوگا اور حسن کا تعلق اس صورت میں بیان کے ساتھ نہیں بلکہ قصّہ کے ساتھ ہوگا۔

جناب یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو قرآن پاک نے احسن قصص کیوں فرمایا ہے۔ علماء نے اس کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس ایک واقعہ میں جس قدر عبر و نصائح اور مواعظ و حکم ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعہ میں یکجا میسّر نہیں ہیں۔ درحقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب و غریب اور زمانہ کے عروج و زوال کی زندہ یادگار ہے۔ یہ ایک فرد کے ذریعہ قوموں کے بننے اور بگڑنے، گرنے اور ابھرنے کی بولتی تصویر ہے، یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلہ کے ایک ایسے فرد یگانہ اور انمول موتی کی حیرت زا تاریخ ہے جس کو خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے اعجاز نے اس زمانہ کی بڑی سے بڑی متمدن قوم کی رہنمائی اور ان پر حاکمانہ اقتدار کے لئے چن لیا تھا۔

پس جبکہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بے نظیر عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں تھیں مثلاً رشد و ہدایت کی اہمیت، ابتلاء اور آزمائشوں پر صبر و استقامت، رضا و تسلیم کے مظاہرے، افراد و اقوام کے عروج و زوال کے وقائع، خدا تعالیٰ کے عدل و رحم کی کرشمہ سازیاں اور بشری لغزشیں اور ان کے انجام و مآل، عصمت اور ضبطِ نفس کی عجوبہ کاریاں، تو بلاشبہ وہ احسن قصص ہے اور کتاب ماضی کا وہ حسین ورق جو اپنی شانِ زیبائی میں یکتا اور فرد کہلانے کا مستحق ہے۔[1]

اور پھر ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان صورت میں جن جن افراد کا ذکر کیا گیا ہے، مآل کے اعتبار سے سب کے سب سعادتمند ہیں۔ کتبِ تفسیر و تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود عزیزِ مصر بھی مسلمان ہوگیا تھا اور زلیخا کا تائب ہونا بھی معلوم ہوتا ہے اور جناب یوسف علیہ السلام کے اپنے بھائی بھی تائب ہوئے اور رضائے الٰہی کو پالیا۔

[1] قصص القرآن

القصص: اتباع الخبر بعضه بعضاً واصله في اللغة: المتابعة (کبیر). فمعنى القصص الخبر المستقل على المعاني المتتابعة۔
(کبیر آل عمران)

واصل القصص تتبع الشيء (قرطبی)

والاصل في معنى القصص اتباع الخبر بعضه بعضاً، واصله في اللغة من قص الحديث اذا تتبعه۔ (خازن)

أَوْحَيْنَا: بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ

أَوْحَيْنَا: ایحاءٌ سے جمع متکلم کا صیغہ، حرف ما مصدریہ ہے جس نے اَوْحَيْنَا فعل کو معنی میں مصدر کے کر دیا۔ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ: اى بوحينا: فما مع الفعل بمنزلة المصدر (قرطبی)

یُوْسُف: اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ

یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم پیمبرزادہ خود بھی پیمبر تھے، شرفِ نبوت خاندان میں تین پشتوں سے چلا آرہا تھا، زمانہ ۱۹۱۰ تا ۱۸۰۰ قبل مسیح ہے۔ مولد و مسکن ارض فلسطین وادی حبرون تھا جسے اب الخلیل کہتے ہیں اور جو یروشلم سے ۱۸ میل جنوب و مغرب میں واقع ہے۔ والدہ ماجدہ کا نام راحیل تھا (ماجدی)

یوسف عبرانی نام ہونے کی وجہ سے صاحب کشاف کے نزدیک غیر منصرف ہے اور قرأتِ مشہورہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ اس صورت میں اس کے منع صرف کے دو سبب یہ ہیں ایک عجمی اور دوسرا علم۔ بعض حضرات نے اس کو عربی نام قرار دیا ہے۔ اور اس کا اصل ماخذ آسف یُوسِفُ و اُوْسِفَ یُوْسَفُ مان کر غیر منصرف ہونے کی وجہ ایک وزن فعل اور دوسرا معرفہ ہونا قرار دیا ہے۔ لیکن علامہ زمخشری اس کو صحیح تسلیم نہیں کرتے

یٰٓاَبَتِ: اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ

لفظ اَبَتِ، میں تین لغت ہیں ایک اَبَتِ دوسری اَبَتُ بضم التاء، تیسری قرأت اَبَتَ بفتح التاء۔ ابو عمرو، نافع، حمزہ، کسائی اور عاصم ان تمام حضرات نے یا اَبَتِ بکسر التاء پڑھا ہے۔ اگر آپ اسے یا اَبَتِ بکسر التاء پڑھیں گے تو اس کی اصل یا اَبِیْ ہوگا۔ یاء اضافت کو حذف کرکے اس کے عوض میں تائے تانیث لائی گئی ہے۔ اصلہ یا اَبِی، فعوض عن الیاء، تاء التانیث (روح) وهي عند البصريين علامة التانيث ادخلت على الأب في النداء خاصة بدلاً من ياء الاضافة (قرطبی)

تاء تأنيث وقعت عوضاً من ياء الاضافة (کشاف)

صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ اس کے تاء تانیث ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جب اس پر وقف کیا جاتا ہے تو یہ تانیث ھاء سے بدل جاتی ہے تو

اَبَتِ پر وقف کریں گے تو یہ بھی ھاء سے تبدیل ہوگی

حتیٰ کہ سیبویہ کے
نزدیک تو اَبَتِ پر سوائے ھاء کے وقف کرنا
جائز ہی نہیں ہوگا۔ اور پھر دوسری بات یہ بھی ہے
کہ جب یا اَبَہْ کہیں گے تو اس کے معنی وہی ہوں گے
جو یا اَبِی کے ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسم مذکر پر تاء
تانیث کیسے لائی گئی چونکہ تاء تانیث مذکر پر
داخل کرنے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ اسے مؤنث
بنایا جائے

جواب یہ ہے کہ یہ شبہ علم نحو کے اصول سے
ناواقفیت کی بناء پر پیدا ہوا ہے۔ تاء تانیث
کلام عرب میں اسم مذکر پر داخل ہوتی ہے اور اسم
مذکر ہی رہتا ہے، جیسے حَمَامَۃٌ ذکرٌ وشاۃٌ ذکرٌ ورجلٌ
ربعۃٌ ، رجلٌ نکحۃٌ وغلام یفعۃٌ ، یَفَعَۃٌ : وہ لڑکا جو
قریب البلوغ ہو۔

ایک اور سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ تاء تانیث کو
یائے اضافت کے ساتھ کونسی مناسبت ہے جس کی
وجہ سے تاء کو یاء کا عوض بنانا جائز ہوا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تاء تانیث اور یاء دونوں
اسم کے آخر میں آتی ہیں اور دونوں حروف زیادت
ہیں۔ لہذا ایک کا دوسری کا عوض بننا
درست اور جائز ہے لان تاء التانیث والاضافۃ
یتناسبان فان کل واحد منهما زیادۃ
مضمومۃ الی الاسم فی آخرہ (کشاف)

سوال: یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ تاء
تانیث تو اضافت کے عوض میں آئی ہے لیکن
اس پر زبر کیسی ہے۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ یہ کسرہ وہی ہے
جو یا اَبِی میں حرف یاء سے پہلے باء کے نیچے تھا،
جب یاء کو حذف کر کے اس کے عوض میں تاء تانیث
لائی گئی تو باء کا کسرہ تاء کی طرف سرکا دیا گیا
ہے۔ اب چونکہ تاء تانیث اپنے ماقبل میں فتحہ چاہتی
ہے اس لئے باء کو فتحہ دیا گیا ہے۔

بعض حضرات نے فراء نحوی کا یہ قول نقل کیا ہے
کہ یا اَبَتِ کا کسرہ حذفِ یاء پر دلالت کرنے
کے لئے ہے۔ چونکہ جب کہنے والا یا اَبَتِ کہتا
ہے تو یاء محذوف منوی ہوتی ہے۔ لیکن ابو اسحٰق
نے اس قول کی تردید کی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے
کہ اس میں عوض اور معوض منہ کا جمع ہونا لازم آتا
ہے اور یہ درست نہیں۔ اس لئے یا اَبَتِی کہنا
باتفاق نحاۃ جائز نہیں ہے

ایک اور سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاء تانیث
ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے ساکن ہونی چاہئے
تھی مگر یہاں ایسا نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے

کہ یہاں تاء اسم پر داخل ہے اور اسماء چونکہ اعراب میں اصل ہوتے ہیں تو ان کی اِس اِصالۃ فی الاعراب کا تقاضا یہ ہے کہ متحرک ہوں ہاں البتہ حرف یاء اسم پر داخل ہونے کے باوجود بھی اس لئے ساکن ہوتی ہے کہ یہ حرفِ لین ہے جبکہ تاء حرف صحیح ہے۔

دوسری قرأت : ابوجعفر، الاعرج، عبداللہ بن عامر نے یَاَبَتَ بفتح التاء پڑھا ہے۔ نحاۃِ بصرہ کا کہنا ہے کہ ان حضرات نے یا اَبَتِیْ میں تعلیل کی ہے۔ یاء کو الف سے بدل کر یا اَبَتَا کیا ہے۔ پھر الف کو حذف کرکے حرف تاء کو فتح دیدیا ہے۔ (قرطبی)

بعض حضرات نے قطرب لغوی سے نقل کیا ہے کہ یَااَبَتِ اصل میں یَا اَبَۃً تنوین کیا تھا ہے، حرف نداء کی وجہ سے تنوین حذف کردی گئی ہے۔ لیکن یہ قول اس لئے قابلِ قبول نہیں کہ ہوسکتا کہ منادیٰ منصوب سے تنوین حذف نہیں ہوتی جیسے یاضاربًا رجلاً (روح)

تیسری قرأت: قراء اور بعض دیگر نحاۃ نے یَااَبَتُ بضم التاء بھی پڑھا ہے۔ ان حضرات نے بغیر کسی تاویل و تعلیل کے اَبَتُ کو اسم قرار دیکر اسماء مؤنثہ کی طرح حرفِ نداء داخل ہونے کی وجہ سے یَااَبَتُ پڑھا ہے، انہوں نے حرف تاء کے عوض و معوض ہونے کا خیال نہیں کیا۔ واما من ضم فقد رأی اسمًا فی آخرہ تاء تانیث فاجراہ مجری الاسماء المؤنثۃ بالتاء فقال یا اَبَتُ (کشاف)

یہ مسئلہ چونکہ علم نحو کا ہے اس لئے اگر مزید تحقیق مطلوب ہو تو کتبِ نحو کا مطالعہ کیا جائے صاحبِ کشاف نے بھی اس کی تحقیق نہایت لطیف انداز میں کی ہے۔

رَاَیْتُ : اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُھُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ

رَاَیْتُ : میں نے دیکھا، واحد متکلم ماضی کا صیغہ ہے یہ الرؤیات ماخوذ ہے مراد خواب دیکھنا ہے رَاٰی یَرٰی، رَاْیًا و رُؤْیَۃً آنکھ یا عقل سے دیکھنا۔ یہ مہموز العین اور ناقص یائی ہے کیونکہ اس سے اسم مشتق رُؤْیَۃٌ آتا ہے یَرٰی کی اصل یَرْاٰی ہے مضارع میں ہمزہ کو حذف کرکے یرٰی۔ ترٰی۔ نرٰی کہتے ہیں۔ واصل یری یرأی ولا تستعمل علی اصلھا الانادرًا۔ (منجد)

بیداری کی حالت میں دیکھنے اور بحالتِ خواب دیکھنے میں فرق یہ ہے کہ بیداری میں حقیقۃً بذریعۂ بصر اس شیٔ کا ادراک ہوتا ہے اور خواب میں اس شیٔ کا تصور قلب میں ہوتا ہے، اس توہم پر کہ بذریعۂ حاسۂ بصر اس کا ادراک ہو رہا ہے حالانکہ بذریعۂ

حاسہ ادراک نہیں ہوتا (لغات القرآن)
ورأیتُ من الرؤیا، لامن الرؤیة، لأنّ
ماذکرہ معلوم انہ منام (کشاف)

رَاَوُا: وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ (یونس)

رَاَوْا اصل میں رَأَیُوْا تھا، ی متحرک ماقبل اس کا
مفتوح اس یار کو الف سے بدلا، اب الف اور
واو دو ساکنین جمع ہوئے، الف کو حذف کردیا

اَلرُّؤْیَا: لَا تَقْصُصْ رُؤْیَاکَ عَلٰی اِخْوَتِکَ۔ الرُّؤْیَا: بمعنی خواب کے ہے،
اور یہ ہمزہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور کبھی ہمزہ
حذف کرکے الرُّوْیَا بھی کہہ دیتے ہیں۔ فُعْلٰی
کے وزن پر ہونے کی وجہ سے خواب کے لئے اسم
بھی ہے۔ یہ رَأٰی یَرٰی کا مصدر ہے اور اس کا
الف تانیث کا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کو غیر منصرف
پڑھا جاتا ہے۔ الرُّؤْیَا: مصدر رَأٰی فی
المنام، رُؤْیَا علی وزن فُعْلٰی کالسُّقْیَا وَالبُشْرٰی
وَالفہ للتانیث ولذلک لم ینصرف (قرطبی)
قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ رُؤْیَا رُؤْیَۃ ہی کی طرح
ہے کہ رؤیا خواب میں دیکھنے کے ساتھ مخصوص ہوگیا
ہے۔ ایک فرق ان دونوں میں حرفِ تانیث کا بھی
ہے کہ رُؤْیَۃ میں حرف تانیث تا ہے۔ اور الرؤیا
میں الف مقصورہ، جیسے قُرْبَۃ اور قُرْبٰی۔
قُرْبَۃ: مصدر تقرب معنوی کے لئے آتا ہے۔ اور
القُرْبٰی: تقرب نسبی پر دلالت کرتا ہے، تو جس طرح
یہ دو الگ الگ مصدر دو الگ معنوں کے لئے آتے
ہیں اسی طرح رُؤْیَۃ اور رؤیا بھی دو الگ الگ معنوں
میں استعمال ہوتے ہیں۔

لفظ رأی کا مصدر جب رؤیا، الف کے ساتھ
آئے تو اس کے معنی خواب دیکھنے کے آتے ہیں،
جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے معلوم ہوا۔ علامہ رازی
کشاف کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ الرؤیا
بمعنی الرؤیۃ الا انہا مختصۃ بما کان
منہا فی المنام دون الیقظۃ (کبیر)

صاحبِ غیاث اللغات لکھتے ہیں کہ: رؤیا
بضم اول وسکونِ واو کہ دراصل ہمزہ است
و یای تحتانی، بمعنی آنچہ درحالتِ خواب دیدہ
میشود۔ (غیاث اللغات)

اور قرآن پاک کی آیت وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا
الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ میں لفظ رؤیا سے مراد منام
اور خواب لیکر واقعہ معراج کو بعض کم فکر حضرات
نے روحانی قرار دے ڈالا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے
کہ لفظ رؤیا کا اطلاق جس طرح حالتِ منام
پر ہوتا ہے۔ اسی طرح بیداری کی حالت میں
دیکھنے پر بھی کلام عرب میں اس کا استعمال نادر
نہیں ہے چنانچہ عربی کی مشہور ترین لغت

لسان العرب میں اس کی تصریح ہے، وقد جَاءَ الرُّؤْیَا فی الیقظۃ، کہ بلاشبہ رؤیا بیداری میں عینی مشاہدہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اور صاحب لسان نے جاہلی شاعر راعی کے قول کو سند میں پیش کیا ہے۔

فکبر للرؤیا وھش فؤادہ
وبشر نفسًا کان قبل یلومھا

اس نے تکبیر کہی اور اس کا دل مسرت سے لبریز ہوگیا اور اس نے اپنے نفس کو پہلے ملامت کر رکھا تھا، خوش خبری دی اس منظر کو دیکھ کر جس کا اس نے عینی مشاہدہ کیا۔ اسی طرح عربی کا مشہور شاعر متنبی کہتا ہے

ورؤیاک احلی فی العیون من الغمض

کہ تیرا دیدار (میری) آنکھوں میں نیند سے بھی زیادہ لذیذ ہے۔

ان مستند اقوال کے بعد رؤیا کو صرف خواب کی حالت میں مخصوص کردینا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے، امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ھی رؤیا عین اُرِیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ اُسری بہٖ، اس لغوی حقیقت کے آشکارا ہوجانے کے بعد ابن عباسؓ کی مذکورہ روایت سونے پر سہاگہ ہے، کیونکہ وہ لغت عرب کے امام بھی ہیں اور ترجمان القرآن بھی۔

خواب کی حقیقت: خواب کی حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی جس وقت نیند یا بیہوشی کے سبب ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہوجاتا ہے تو اس کو اس کی قوت خیالیہ کی راہ سے کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں اسی کا نام خواب ہے۔

پھر اس کی تین قسمیں ہیں۔ خواب میں انسان مختلف صورتیں اور واقعات دیکھتا ہے، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں جو صورتیں انسان دیکھتا ہے وہی خواب میں متشکل ہوکر نظر آجاتی ہیں، دوسری قسم یہ کہ کبھی شیطان کچھ صورتیں اور واقعات اس کے ذہن میں ڈالتا ہے۔ یہ دونوں قسمیں باطل ہیں ان کی نہ کوئی اصلیت ہے اور نہ کوئی تعبیر، پہلی قسم کو حدیث النفس اور دوسری قسم کو تسویل شیطانی کہا جاتا ہے۔ تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک الہام ہے جو اپنے بندہ کو متنبہ کرنے یا خوشخبری دینے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے بعض چیزیں اس کے قلب و دماغ میں ڈال دیتا ہے۔ مگر اس صحیح قسم میں بھی کبھی کچھ عوارض شامل ہوکر اس کو فاسد اور ناقابل اعتبار بنادیتے ہیں۔ یہ تیسری قسم جب عوارض سے

محفوظ ہو تو رؤیا صادقہ کہلاتی ہے جسے نبوت کے اجزاء میں سے ایک جزء قرار دیا گیا ہے
لم یبق من مبشرات النبوۃ الا الرؤیا[1] ۔
آیت کریمہ کے جملہ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ سے ایک مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ غیر ناصح اور نا سمجھ کو خواب نہ بیان کرنا چاہیئے اور نہ غیر عالم کو تعبیر دینا چاہیئے ۔

ابن العربی کہتے ہیں کہ خواب میں انسان وہی چیزیں دیکھ سکتا ہے جن کا ادراک حالتِ یقظہ میں صحیح اور ممکن ہو۔ اسی خواب میں کسی کو ایک حالت میں کھڑا ہوا اور بیٹھا ہوا نہیں دیکھ
قال ابن العربی ولا یری فی المنام الا ماصح ادراکہ فی الیقظۃ (قرطبی)
روح المعانی کی عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ خواب میں مرئی اشیاء کی طرح غیر مرئی اشیاء کا واقع ہونا بھی ممکن ہے والرؤیا مصدر رأی۔ الحلمیۃ الدالۃ علی ما یقع فی النوم سواء کان مرئیا ام لا علی ماھو المشھور (روح)

ضَلَالٍ: إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۔
لفظ ضلال کے لغوی معنی گمراہی کے ہیں مگر یہاں گمراہی سے مراد دینی گمراہی نہیں، ورنہ ایسا خیال کرنے سے یہ سب کافر ہو جاتے۔ کیونکہ یعقوب علیہ السلام برگزیدہ پیغمبر ہیں۔ ان کی شان میں ایسا خیال قطعاً کفر ہے (معارف القرآن)
امام قرطبی لکھتے ہیں اخوۃ یوسف کی مراد دینی گمراہی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ہمارے والدان دونوں کی محبت میں مغلوب ہیں۔ اور ہم سب پر ان کو ترجیح دے کر تدبیر صحیح سے ہٹ گئے ہیں
بل ارادوا لفی ذھاب عن وجہ التدبیر[1]
علامہ جمال قرشی لکھتے ہیں کہ ضلال بالفتح ضائع ہونا گم ہونا اور مغلوب ہونا۔ کہا جاتا ہے ضلّ الماءُ فی اللبن یعنی پانی اتنا مغلوب ہو گیا کہ دودھ میں اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔ اور اسی سے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے یوسف کے بھائیوں نے جو کہا کہ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ کہ ہمارے والد صاحب تو ان دونوں کی محبت میں مغلوب ہیں۔ جناب موسیٰ نے فرمایا فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ یعنی میں نے یہ کام اسوقت کیا جب میں عصبیتِ دین میں مغلوب تھا (لغات القرآن)
اصل میں ضلال کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانے کے ہیں چاہے یہ ہٹنا عمداً ہو یا سہواً، قلیل ہو یا کثیر، تو جس سے بھی کسی قسم کی کوئی خطاء سرزد ہو اس کے لئے لفظ ضلال استعمال کرنا صحیح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء

[1] ابوداؤد

کی طرف بھی اس کی نسبت کی جاتی ہے اور کفار کی طرف بھی

اِطْرَحُوْا: اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَخْلُ لَکُمْ وَجْهُ اَبِیْکُمْ۔ یوسف کو قتل کر ڈالو یا انہیں کسی سرزمین پر ڈال آؤ تو تمہارے لئے تمہارے باپ کا رخ خالص ہو جائے گا۔ (ماجدی)

طَرَحَ (ف) طَرْحًا: طَرَحَ الشیءَ پھینکنا، دور کرنا، طَرْحٌ مصدر ہے۔ وہ مقام جو دور دراز ہو اس کو الطَّرُوحُ کہا جاتا ہے، محاورہ ہے۔ رَاَیْتُهٗ مِنْ طَرَحٍ: میں نے دور سے دیکھا اور اَلطَّرُوحُ پھینکی ہوئی چیز جس کی کسی کو ضرورت نہ ہو (راغب) والطَّرْحُ رَمْيُ الشیءِ و اِلقَاءُهٗ و یقال طَرَحْتُ الشیءَ اَبْعَدْتُهٗ (روح)

غَیٰبَتِ: وَاَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ

غیابۃ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو چھپالے اور غائب کردے اسی لئے قبر کو بھی غَیَابَۃ کہا جاتا ہے۔ الغیابۃ: کے معنی نشیبی زمین کے ہیں اور اسی سے گھنے جنگل کو غابہ کہتے ہیں۔ غَابَ یَغِیْبُ غِیَابًا و غِیَابًا و غَیَابَةً۔ غَابَ الشیءُ فِی الشیءِ: چھپنا۔

غَیَّبَهٗ غَیَابَةُ اس کو اس کی قبر نے چھپالیا۔ آیت میں غیابۃ الجب سے مراد تاریک کنواں ہے جس میں گہرائی کی وجہ سے اندھیری ہو۔ غَیَابَةُ الوَادِی: پہاڑی وادی کی گہرائی اور تاریک گڑھا۔ مثل ہے وَقَعْنَا فِیْ غَیَابَةٍ ہم زمین کی ایسی گہرائی میں پہنچ گئے کہ اوپر والی ہر چیز اوجھل ہوگئی۔ والغیابۃ کُلُّ مَوْضِعٍ سترشیئاً وَغَیَّبَهٗ عَنِ النظر (خازن) والمراد بھاھنا غورالبئر الذی لا یقع البصر علیہ (فتح القدیر)

اَلْجُبُّ: جُبّ ایسے کوئیں کو کہتے ہیں جس کی مَنْ بنی ہوئی نہ ہو (معارف)

والجُبُّ: البئر التی لیست بمطوّیۃ (کبیر) ای بئر لم تطو (راغب)

اس کنوئیں کو جُبّ یا تو اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ جَبُوْب یعنی سخت زمین میں کھدا ہوا تھا اور یا اس لئے کہ وہ گہرا گڑھا تھا۔ اصل میں الجُبّ (ن) کے معنی کسی چیز کو اس کے اصل سے کاٹ دینے کے ہیں جیسے جَبُّ النَّخْلِ کھجور کو گابھا دینا۔ اور زَمَنُ الصِّرَامِ کی طرح زمن الجِبَاب کا محاورہ بھی مشہور ہے جس کے معنی کھجور کو گابھنے کا موسم ہے۔ مَجْبُوْبٌ وہ مرد جس کا آلۂ تناسل جڑ سے کاٹ دیا گیا ہو۔ جُبُّ الطَّلْعَۃِ: کھجور کے خوشے کا غلاف۔

جُبَّۃٌ: مشہور کپڑا ہے جس کی آستینیں کٹی
ہوئی ہوتی ہیں۔ لفظ جُبّ کا اطلاق اسی کنوئیں
پر ہوگا جس کی منڈھیر نہ بنی ہوئی ہو اور نہ لپائی
وغیرہ کی گئی ہو اور جب منڈھیر بن جائے اور لپائی
ہوجائے تو اس کو بئر کہا جاتا ہے۔ الجُبُّ کی
جمع جِبَبۃٌ و جِبَاب و اَجْبَاب وغیرہ آتی ہے (قرطبی)

یَلْتَقِطْ : یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَۃِ [1]
تاکہ کوئی راہ چلتا مسافر نکال لے جائے۔
لفظ التقاط لُقْطَۃ سے بنا ہے۔ لُقطہ اس گری
ہوئی چیز کو کہتے ہیں جو کسی کو بغیر طلب مل جائے
غیر جاندار چیز ہو تو اس کو لُقطہ اور جاندار کو فقہاء
کی اصطلاح میں لقیط کہا جاتا ہے۔ انسان کو
لقیط اسی وقت کہا جائیگا جب وہ بچہ ہو۔
عاقل، بالغ نہ ہو۔ قرطبی نے اس لفظ سے
استدلال کیا ہے کہ جس وقت یوسف علیہ السلام
کو کوئیں میں ڈالا گیا تھا اس وقت وہ نابالغ
بچے تھے۔ نیز یعقوب علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ان کے
بچہ ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مجھے خوف
ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے، کیونکہ بھیڑیئے کا
کھا جانا بچوں کے معاملہ میں متصوّر ہے۔ (معارف)
الالتقاط تناول الشئ من الطریق و منه
اللقیط واللقطۃ (کبیر) وقال ابن عرفه
الالتقاط وجود الشئ علی غیر طلب (قرطبی)
الالتقاط اخذ شئ مشرف علی الضیاع
کذا قیل۔ و فی مجمع البیان: هو ان یجد
الشئ و یأخذه من غیر ان یحتسبه (روح)
اور آیت کریمہ: فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ [2]
بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ انسان کو لقیط
اس وقت کہا جائے گا جب وہ بچہ ہو

اَلسَّیَّارَۃُ : قافلہ، کاروان، چلنے
والے مسافر۔ سَیَّارٌ کا مؤنث جو کہ سَیْرٌ سے
صفت کا صیغہ ہے اس کی تانیث جمع کے معنی
کے لحاظ سے ہے (لغات القرآن)
سَارَ یَسِیْرُ سَیْرًا و مَسِیْرًا و مَسِیْرَۃً زمین پر چلنا
سفر کرنا۔ زمین پر چلنے والے مسافر کو سَائِرٌ
اور سَیَّارۃ کہا جاتا ہے۔ وَجَآءَتْ سَیَّارَۃٌ
ایک قافلہ وارد ہوا۔ سیّارہ کے معنی ہیں
قافلہ (معارف)
اَلسَّیَّارَۃُ: الجمع الذی یسیرون فی الطریق
للسفر۔ (قرطبی) والسیارۃ: الجماعۃ الذی
یسیرون للسفر (کبیر) والسیارۃ: الجماعۃ [3]
السیارۃ: بعض الاقوام الذین یسیرون
فی الطریق (کشاف)
سَیَّارَۃٌ: بمعنی قافلہ و کاروان۔ والسَّیَّارَۃُ
جمع سَیَّار (جمل)

یَرْتَعْ : اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَرْتَعْ

[1] بیان القرآن [2] القصص [3] راغب

وَيَلْعَبْ وَ إِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ۔ بھیج اس کو
ہمارے ساتھ کل کو، خوب کھائے اور کھیلے
اور ہم تو اس کے نگہبان ہیں (ترجمہ معارف)
رَتَعَ (ف) رَتْعًا ورُتُوْعًا ورَتْعَۃً کے اصل معنی
جانوروں کے چَرنے کے ہیں پھر استعارہ
کے طور پر انسانوں کے جی بھر کر کھانے پینے
پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ یَرْتَعْ وَیَلْعَبْ کے معنی
ہیں جنگل کی پھل پھلاری کھائے اور کھیلے کودے
اور بطور تشبیہ کے غیبت کرنے کے معنی میں آتا
ہے وإذا خَلَوا اِلیّ رَتَعَ : جب تنہائی میں
اس کے پاس ہوتے ہیں تو میرا گوشت کھانے
لگ جاتا ہے ۔ رَاتِعٌ صفت فاعلی ہے ۔ اگر
جانور مراد ہوں تو اس کی جمع رِتَاع آتی ہے۔
اور اگر انسان مراد ہوں تو جمع رَاتِعون آتی
ہے (راغب) رَتْعَۃٌ : فراخی اور ارزانی کے
معنی میں بھی آتا ہے ، فِی شِبَعٍ ورِیٍّ وَرَتْعٍ
خوب سیری ، تازگی اور ارزانی کی حالت ۔
رَاتِع کی جمع رُتَّع اور رُتُع بھی آتی ہے ۔
مَرْتَعٌ چراگاہ ۔ جمع مراتِع ۔ مُرْتِع : چرانے
والا ۔ حدیث میں ہے مَنْ یَرْتَعْ حَوْلَ الْحِمٰی
یُوْشِکُ اَنْ یُخَالِطَہٗ : جو چراگاہ کے گرد چرے گا
وہ قریب ہے کہ اس کے اندر بھی گھس جائے یعنی اگر
ممنوعات کے قریب ہوگا تو ان کا ارتکاب
کر گزرے گا ۔ ترمذی کی روایت ہے : وإذا
مَرَرْتُمْ بریاض الجنۃ فَارْتَعُوْا جب تم
بہشت کی کیاریوں پر گزرو تو خوب کھاؤ ۔
اصل میں حدیث میں رَتَعَ سے مراد خدا کی
حمد و ثنا ہے ۔ چونکہ صحابہؓ کے جواب میں
آپؐ نے فرمایا وامّا الرّتع : قال سُبْحَانَ اللّٰہِ
والحمدُ للّٰہ (ترمذی ۔ دعوات)
و اصل الرتعۃ: الخصبُ والسَّعَۃُ ،
ہرا بھرا اور کشادہ ہونا (کشاف)
واصل معنی الرتع ان تاکل وتشرب ماتشاء
فی خصب وسَعَۃ (روح)
الرتع : التمتع فی الفواکہ .... والاصل
فی الرتع : اکل البھائم فی الخصب من
الربیع ویُستعار للانسان اذا اُرید بہ
الاکل الکثیر (جمل)

ذِئْبٌ : وَاَخَافُ اَنْ یَّاْکُلَہُ الذِّئْبُ :
اور مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں اس کو بھیڑیا کھا جائے
ذِئْبٌ کے معنی بھیڑیئے کے ہیں جمع ذِئَاب
اَذْؤُبٌ اور ذُؤْبَانٌ ۔ ذُئِبَ فُلَانٌ :
اس کی بکریوں میں بھیڑیا پڑ گیا ۔ اَرْضٌ
مَذْأَبَۃٌ : بہت بھیڑیوں والی زمین (راغب)
ارض فلسطین کے جنگلوں میں بھیڑیئے اب تو
خال خال رہ گئے ہیں ، لیکن قدیم زمانہ میں

یہ وہاں کے جنگلوں میں خاص طور سے آباد تھے۔[1]

ذَئَبَ یَذْئَبُ ذَأْبًا : ذَئَبَ الشَّیْءَ : جمع کرنا ذَئَبَ الدَّابَّۃَ جانور کو ہانکنا ذَئَبَہٗ : خوف دلانا دھتکارنا، مذمت کرنا۔ ذَئِبَ (س) وذَئُبَ (ک) مصدر ذَآبَۃٌ، مکاری اور خباثت، بھیڑیئے کی طرح کرنا۔ تَذَائَبَتِ الرِّیْحُ علیہ : ہوا کا ہر طرف سے چلنا کبھی ادھر سے آنا کبھی ادھر سے آنا۔

امام قرطبی نے احمد بن یحیٰی کا قول یہ نقل کیا ہے کہ ذئب تَذَائَبَتِ الریح سے ماخوذ ہے، یہ ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ہوا کا چاروں طرف سے چلنا چونکہ بھیڑیا بھی ریوڑ میں ہر طرف پڑتا ہے اس لئے اس کو ذئب کہا گیا۔ وَالذِّئْبُ ماخوذٌ من تَذَائَبَتِ الرِّیْحُ اذا جاءت من کل وجہ (قرطبی)

قرطبی کے حاشیہ پر اصمعی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ تذائبت الریح یہ الذئب سے مشتق ہے لیکن چونکہ ذئب اسم جامد ہے اور اسما جامدہ سے افعال کا اشتقاق خلاف قیاس ہے۔ اس لئے یہ اشتقاق درست نہیں ہے۔

اَوْحَیْنَا : اَوْحَیْنَآ اِلَیْہِ اور ہم نے یوسف پر وحی کی۔ اس وحی سے وحی اصطلاحی مراد نہیں ہے جو حضرات انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے، یہ وحی الہام کے معنی میں ہے جو غیر نبی کو یا نبی کو قبل از نبوت ہوتی رہتی ہے۔ (ماجدی)

لیکن امام قرطبی نے حسن قتادہ، مجاھد، ضحاک وغیرہ کا قول یہ نقل کیا ہے کہ یہ وحی اصطلاحی اور وحی نبوت ہے اور جناب یوسف علیہ السلام کو کوئیں میں نبوت عطا کر دی گئی۔ امام قرطبی کا اپنا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ لکھتے ہیں کہ اَوْحَیْنَآ اِلَیْہِ دلیل علی نبوتہ فی ذالک الوقت (قرطبی) ایحاءٌ سے جمع متکلم ماضی کا صیغہ ہے۔

قَمِیْصٌ : وَجَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِہٖ بِدَمٍ کَذِبٍ۔ قمیص کرتہ، جمع قُمُصٌ و اَقْمِصَۃٌ قُمْصَانٌ۔ تقمّصہ : قمیص پہنانا قَمَصَ (ن۔ض) البَعِیْرُ : اونٹ کا جست کرنا۔ (راغب)

نَسْتَبِقُ : اِنَّا ذَھَبْنَا نَسْتَبِقُ۔ یہ باب افتعال کے مصدر استباق سے جمع متکلم مضارع کا صیغہ ہے اصل مادہ سَبْقٌ ہے جس کے معنی ہیں دوڑنا۔ مولانا تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ہم دوڑنے میں لگ گئے اور حضرت مفتی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے ذَھَبْنَا نَسْتَبِقُ ہم لگے دوڑنے آگے نکلنے کو (معارف)

سَبْقٌ : آگے بڑھنا (ض) استباق اور تسابُقٌ آگے بڑھنے میں مقابلہ کرنا۔ امام راغب لکھتے

[1] ماجدی

ہیں کہ السَّبْقُ کے اصل معنی چلنے میں آگے بڑھ جانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا پھر وہ حکم الٰہی کو سننے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور استباق تسابق کے معنی میں آتا ہے جس کے معنی ہیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا۔ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ ہم ایک دوسرے سے دوڑنے میں مقابلہ کرنے لگے اور آیت وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وہ دونوں دوڑتے ہوئے دروازے پر پہنچے۔ اور مجازاً ہر شئی میں آگے بڑھ جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا مَا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ تو یہ ہم سے اس کی طرف سبقت نہ کرتے۔

اصل السبق التقدم (راغب)

صاحب کشاف فرماتے ہیں نَسْتَبِقُ، نَتَسَابَقُ کے معنی میں ہے۔ اور افتعال اور تفاعل مشترک ہیں جیسا کہ انتضال اور تناضل اور ارتماء و ترامی، معنی یہ ہیں کہ ہم دوڑنے میں ایکدوسرے سے آگے بڑھنے لگے یا یہ کہ تیراندازی میں ایکدوسرے پر بازی لینے لگے بعض تفسیر نے نَسْتَبِقُ کی تفسیر نَنْتَضِلُ سے کی ہے جس کے معنی تیراندازی کے ہیں۔ تیراندازی میں سبق کی اصل یہ ہے کہ دو آدمی تیر پھینکیں تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کس کا تیر دور جا گرتا ہے (کبیر)

سَوَّلَتْ : قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ تم نے اپنی طرف سے ایک بات بنالی ہے۔

التَّسْوِيْلُ : کے معنی نفس کے اس چیز کو مزین کر کے دکھانے کے ہیں جس پر وہ حریص بھی ہو، اور اس کے قبح کو خوشنما بنا کر پیش کرنے کے ہیں۔ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ شیطان نے انہیں یہ کام مزین کر کے دکھایا۔ اور السُّؤْلُ اس حاجت کو کہا جاتا ہے جس پر نفس حریص ہو جیسا کہ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى، السُّؤْلُ اور الْاُمْنِيَةُ کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں لیکن اُمنیہ کا لفظ اس خواہش پر بولا جاتا ہے جو تا حال انسان کے دل میں ہو اور السُّؤْل اس حاجت کو کہتے ہیں جو طلب بھی کی جا چکی ہو۔ گویا سُؤْل کا درجہ اُمنیہ کے بعد کا ہے۔ (راغب)

قال الراغب : هو تزيين النفس لما تحرص عليه وتصوير القبيح بصورة الحسن (روح)

سُؤْل : التماس درخواست سُؤْلَكَ تیری حاجت تیرا سوال۔ سُؤل اس حاجت کو کہتے ہیں جس کی طبیعت کو حرص ہو۔ صاحب کشاف لکھتے ہیں کہ سُؤل بروزن فُعْلٌ ہے جیسے خُبْزٌ بمعنی مخبوز اور اُكْلٌ بمعنی مأکول۔

دَلْوٌ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ۔ دَلَوْتُ الدَّلْوَ کے معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ اور اَدْلَيْتُهَا کے معنی ڈول بھر کے نکالنے کے ہیں۔

ابو منصور نے لکھا ہے کہ اَدْلیٰ کے معنی ڈول کنوئیں میں ڈالنے کے ہیں۔ فَاَدْلیٰ دَلْوَہٗ کے معنی ہیں اس نے کنوئیں میں ڈول لٹکایا۔
اَدْلیٰ دَلْوَہٗ : اِذْ اَرْسَلَہَا لِیَمْلَأَھَا، و دَلَاھَا ای اخرجھا۔ دَلَا یَدْلُو دَلْوًا اصل میں واوی ہے۔ ثقل کی وجہ سے واؤ کو یٰ سے بدل دیا گیا ہے (قرطبی، راغب)

اَسَرُّوْہُ : وَاَسَرُّوْہُ بِضَاعَۃً : اَسَرُّوا اِسْرَارٌ سے ہے کسی بات کو چھپانا۔ یہ اعلان کی ضد ہے۔ قرآن میں سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً ۔ اِسْرَارٌ اصل میں اضداد میں سے ہے جس طرح اس کے معنی بات کو پوشیدہ کرنے کے آتے ہیں اسیطرح ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اَسْرَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہیں اَخْفَیْتُہٗ ، میں نے اسے چھپایا۔ وَاَسْرَرْتُہٗ : اَظْھَرْتُہٗ میں نے اسے ظاہر کیا، بتا دیا۔ فرزدق کہتا ہے

ولما رای الحجاج جرّد سیفہٗ
اَسَرَّ الحَرُوری الّذی کان اَضْمَرَا

یہاں اَسَرَّ۔ اَضْمَرَ کے مقابلہ میں ہے جس سے اَسَرَّ کے معنی اظہار متعین ہو جاتے ہیں۔ فرزدق کہتا ہے کہ: جب اس نے حجاج کو دیکھا کہ اس نے تلوار سونت لی ہے تو حروری نے وہ بات ظاہر کر دی جو وہ دل میں چھپا رہا تھا۔

اِسرارٌ الی الغیر : کسی سے بھید کی بات کہنا، جسطرح دوسروں سے اخفاء کو مقتضی ہے، اسی طرح اس شخص کے سامنے اظہار کو مستلزم ہے جس سے وہ بھید کہا جاتا ہے لہذا اَسْرَرْتُ الی فلان (دوسروں سے راز کی بات کہنا) میں من وجہ اخفاء، اور من وجہ اظہار کے معنی پائے جاتے ہیں۔ لہذا اَسَرُّوْہُ بِضَاعَۃً کے ایک معنی یہ بھی محتمل ہیں کہ قافلہ والوں نے جناب یوسف کو سامانِ تجارت ظاہر کیا۔ اور اگر اسرار کو مشہور معنی پر رکھا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ قافلہ والوں نے جناب یوسف علیہ السلام کو مالِ تجارت ظاہر نہ کر کے چھپالیا۔ عام اہل تفسیر نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔ اَسَرُّوا کی ضمیر کا مرجع بعض اہل تفسیر نے اخوۃ یوسف کو قرار دیا ہے جیساکہ ابن عباس سے مروی ہے۔ اس مرجع کے اعتبار سے اَسَرُّوا کے معنی اَظْھَرُوا کے زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اخوۃ یوسف نے اپنے بھائی کو مالِ تجارت ظاہر کیا، کہ یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ اپنا غلام بتا کر قافلہ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا (واللہ اعلم)

بِضَاعَۃً : البِضَاعَۃُ : مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لئے الگ کر لیا گیا ہو۔
اَبْضَعَ وَابْتَضَعَ بِضَاعَۃً : سرمایہ یا پونجی جمع کرنا

الگ کرنا۔ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا یہ ہماری پونجی ہمیں واپس کردی گئی۔
بَضَعَ (ف) بَضْعًا : کاٹنا۔ نشتر سے چیرنا
مِبْضَعٌ : نشتر۔ چھری۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ بضاعۃ : اصل میں بَضْعٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹنا۔ تو مالِ تجارت چونکہ فروخت کے لئے الگ کیا ہوا ہوتا ہے اس لئے اس کو بضاعۃ کہا گیا۔ بضاعۃ کی جمع بضائع آتی ہے۔
بِضْع : دس سے کم عدد پر بولا جاتا ہے بعض کے نزدیک تین سے نو تک اس کا اطلاق ہوتا ہے اور بعض کے خیال میں پانچ سے نو تک کا عدد اس میں داخل ہے۔ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بضع سنین سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک سات سال کی مدت ہے۔ اور سورہ روم میں لفظ بضع سے مراد دس سال سے کم کی مدت ہے
الباضع : لوگوں کا سامان اٹھانے والا (کلی وغیرہ) قال صاحب الکشاف: والبضاعۃ ما بُضِعَ من المال للتجارۃ ای قُطِعَ (کشاف)
البِضَاعَةُ : القطعۃ من المال تجعل للتجارۃ من بضعتُ الشیٔ اذا قطعتہ (جمل)
شَرَوْا : وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ

لفظ شراء عربی میں خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں بھی دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ ضمیر اگر برادرانِ یوسف کی طرف عائد کی جائے تو فروخت کرنے کے معنی میں ہوں گے اور اگر قافلہ والوں کی طرف عائد کی جائے تو خریدنے کے معنی ہوں گے۔
مطلب یہ ہے کہ بیچ ڈالا برادرانِ یوسف نے، یا خرید لیا قافلہ والوں نے یوسف علیہ السلام کو (معانی)
شَرَيْتُ بمعنی اشتریتُ، شریتُ بمعنی بعتُ لغۃً (قرطبی)
دَرَاهِمَ : دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ۔
دراھم، دِرْهَمٌ کی جمع ہے۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ عرب تجار کی عادت یہ تھی کہ بڑی رقموں کے معاملات وزن سے کیا کرتے تھے اور چھوٹی رقمیں جو چالیس سے زیادہ نہ ہوں ان کے معاملات گنتی سے کیا کرتے تھے، اس لئے دراھم کے ساتھ معدودۃ کے لفظ نے یہ بتلا دیا کہ دراھم کی مقدار چالیس سے کم تھی۔ ابن کثیر نے بروایتِ عبداللہ بن مسعود لکھا ہے کہ چالیس درھم کے بدلہ میں سودا ہوا۔ (قرطبی، کشاف، ابن کثیر۔ معارف)
زَاهِدِيْنَ : یہ زَاهِد کی جمع ہے جو زُهد سے مشتق ہے۔ زہد کے لفظی معنی بے رغبتی اور بے توجہی کے آتے ہیں۔ محاورات میں دنیا کے مال و دولت سے بے رغبتی اور اعراض کو کہا جاتا ہے

معنی آیت کے یہ ہیں کہ برادرانِ یوسف اس معاملہ میں دراصل مال کے خواہش مند نہ تھے، ان کا اصل مقصد تو یوسف علیہ السلام کو باپ سے جدا کرنا تھا، اس لئے تھوڑے سے دراھم میں معاملہ کر لیا (معارف)

امام راغب لکھتے ہیں کہ الزھید: کے معنی حقیر چیز کے ہیں اور کسی چیز سے بے رغبتی کرنے والے کو زاھد فی الشئ کہا جاتا ہے۔ والزُّهدُ قِلّةُ الرغبۃ (قرطبی)

الزهد قِلّة الرغبۃ فی الشئ (زاد المسیر)

واصل الزُّهد قلّة الرغبۃ (جمل)

بَخْسٍ: امام راغب نے لکھا ہے کہ البخس، کے معنی ظلم سے کسی چیز کو کم کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ بَخْسٍ یہاں مصدر ہے اور اسم مفعول کے معنی میں ہے اور بعض نے مصدر بمعنی اسم فاعل لیا ہے، اسم فاعل کی صورت میں بخس بمعنی ناقص اور مفعول کی صورت میں بخس بمعنی منحوس ہوگا یعنی منقوص جس کو قصداً گھٹا دیا گیا ہو۔

مِصْرَ: وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ مصر علم غیر منصرف، خاص ملک کا نام ہے۔ اور آیت کریمہ، اُدْخُلُوْا مِصْرًا میں بھی مصر سے مراد مشہور مصر شہر ہے۔ تخفیف کے طور پر اسے منصرف کر دیا گیا ہے۔

امام راغب لکھتے ہیں کہ ہر محدود شہر کو مصر کہتے ہیں اور مَصَّرْتُ مصرًا کے معنی ہیں شہر بسانا۔ آباد کرنا۔ مسند دارمی میں ہے: اِنَّ النَّاسَ يُمَصِّرُوْنَ اَمْصَارًا وَاِنَّ مِصْرًا مِنْهَا يُقَالُ لَهُ الْبَصْرَةُ لوگ شہروں کو آباد کریں گے اور ان میں سے ایک شہر کو بصرہ کہا جائیگا۔

راغب فرماتے ہیں کہ دراصل مصر دو چیزوں کے درمیان حد کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ھجر شہر میں مکانات کے بیع ناموں کی شرط میں یہ الفاظ خاص طور پر لکھے جاتے ہیں، اشتری فُلَانٌ الدَّارَ بِمُصُوْرِهَا فلاں نے یہ مکان اس کی حدودِ اربعہ کے ساتھ خرید کیا۔ ایک شاعر کہتا ہے

وجاعل الشمس مِصْرًا لَا خِفَاءَ بِهٖ
بين النَّهَارِ وبَيْنَ الليل قد فَصَلَا

بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو رات اور دن کے درمیان حدِ فاصل بنا رکھا ہے۔

الماصِر: دو پانیوں کے درمیان حدِ فاصل کو کہتے ہیں، مَصَرْتُ النَّاقَةَ، کے معنی ہیں اونٹنی کو انگلیوں کی طرف سے دوہنا، اسی سے محاورہ ہے لَهُمْ غَلَّةٌ يَمْتَصِرُوْنَهَا۔ ان کے پاس غلہ ہے جسے وہ تھوڑا تھوڑا کر کے استعمال کرتے ہیں۔

رَاوَدَتْ : وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ - اور پھسلایا یوسف کو اس عورت نے جس کے گھر میں وہ رہتے تھے اس کے نفس کے معاملہ میں اور دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی آ میرے پاس آ۔

(ترجمہ قصص القرآن)

رَاوَدَتْ : یہ رَاوَدَ يُرَاوِدُ مُرَاوَدَةً سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اس کے معنی ارادوں میں باہم اختلاف اور کشیدگی کے ہیں یعنی ایک کا ارادہ کچھ ہو اور دوسرے کا ارادہ کچھ ہو۔

اور رَاوَدتُّ فلانًا عَنْ كَذَا کے معنی کسی کو اس کے ارادے سے پھسلانے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ جیسے کہ اسی سورت میں دوسری جگہ ارشاد ہے هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَفْسِيْ، اس (عورت) نے مجھے میرے ارادہ (عفت) سے پھیرنا چاہا۔

اصل میں یہ رَادَ يَرُوْدُ رَوْدًا سے ہے جس کے معنی نرمی کے ساتھ کسی چیز کی طلب میں بار بار آمد و رفت کے ہیں اور فعل رَادَ، اِرْتَادَ اور اِسْتَرَادَ تینوں قریب المعنی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے اِذَا بَالَ اَحَدُكُمْ فَلْيَرْتَدْ لِبَوْلِهٖ جب تم میں سے کوئی پیشاب کرے، تو اس کے لیے نرم جگہ تلاش کرے۔ اسی سے رائد ہے، اس شخص کو کہتے ہیں جو جماعت سے آگے بڑھ کر دانہ چارہ اور گھاس وغیرہ کی تلاش کرے، اس کی جمع رُوَّادٌ آتی ہے جیسے کہ رَأَيْتُ الرُّوَّادَ تدعوا الی زِيَادَتِهَا میں نے رائدوں کو دیکھا کہ وہ اس کی زیارت کی طرف بلاتے ہیں۔ مؤنث رائدۃ آتی ہے۔ جیسے الحُمّٰى رائدة الموت : بخار موت کا پیغام لانے والا ہوتا ہے۔

اسی سے مِروَدٌ ہے، سُرمہ لگانے کی سوئی (سرمچو) چونکہ آنکھ میں سرمہ لگاتے وقت نہایت نرمی سے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

مسند دارمی کتاب الحدود میں ہے كما يغيبُ المِروَدُ فی المكحلَة یعنی جیسے سرمہ سلائی سرمہ دانی میں چھپ جاتی ہے۔

اسی سے رُوَيْدَ : اسم فعل ہے جس کے معنی ہیں ڈھیل دینا، مہلت دینا، نرمی سے چھوڑ دینا۔

حدیث میں ہے رُوَيْدَكَ رِفقًا بالقوارير یعنی عورتوں کی سواریوں کو آہستہ چلا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک انجشہ نامی غلام بڑا خوش آواز تھا جب وہ حُدی گاتا تو اونٹنیاں مست ہو کر تیز چلتیں تو آپ کو خطرہ ہوا کہ کہیں عورتیں گر نہ جائیں، یا یہ کہ خود عورتیں ہی مفتون نہ ہو جائیں۔ اس وقت یہ حدیث ارشاد فرمائی یہ اسم کی صفت بھی واقع ہوتا ہے، جیسے سَيْرًا رُوَيْدًا

نرم رفتار۔ و اصل المراودۃ : الارادۃ والطلب برفقٍ ولین والترود والتریاد طلب الکلاء (قرطبی)

المراودۃ : مفاعلۃ، مِن رَادَ یَرُوْدُ اذاجاء و ذھب۔ (کشاف)

والمُرَاوَدَۃُ : المطالبۃ مِن رادیرود اذا جاء و ذَھَبَ لطلب شیٔ (جمل د روح)

یہاں مراودت باب مفاعلۃ سے ہے جس کے خواص میں سے اشتراک ہے یعنی دو شخصوں کا مل کر کسی کام کو کرنا۔ ہر ایک ان میں سے فاعل بھی ہو اور مفعول بھی جیسے قَاتَلَ زَیدٌ وعَمرٌو زید اور عمرو نے باہم لڑائی کی۔ اس خاصہ کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ امرأۃ عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام سے فعل کا مطالبہ کیا اور ان کو اپنی طرف مائل کیا، اور جناب یوسف نے ترک فعل کا مطالبہ کیا اور اسے خدا کا خوف دلایا۔

اَنَّھَا طلبتْ منہ الفعل وھو طلب منھا الترکَ۔ اور یہ بھی بالکل جائز ہے کہ باب مفاعلۃ یہاں صرف مبالغہ کے معنی دینے کے لئے لایا گیا ہو، مطلب یہ کہ امرأۃ عزیز نے جناب یوسف کو اپنی طرف مائل کرنے میں پوری قوت صرف کر دی اسمیں جناب یوسفؑ کی کمال نزاہت کا پہلو پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ یہاں باب مفاعلہ کا تحقق صرف ایک جانب سے ہے،

دوسری جانب سے صرف اس کا سبب ہے جیسا کہ مطالبۃ الدائن و ماطلۃ المدیون، یعنی قرض خواہ کا مطالبہ کرنا اور مدیون کا ٹال مٹول کرنا، یہ دونوں صیغے باب مفاعلہ سے ہیں، اور صرف ایک طرف سے فعل کا تحقق ہو رہا ہے لیکن چونکہ دوسری جانب سے فعل کے سبب کا تحقق ہو رہا ہے اس لئے دونوں پر مفاعلۃ کا اطلاق کر دیا گیا ہے۔ تحقیق اس کی یہ ہے کہ کسی چیز کے سبب کو خود چیز اور شیٔ کے قائم مقام کر کے اس شیٔ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ مقولہ مشہور ہے کما تَدِین تُدان یعنی کما تَجزِیْ تُجزٰی، کہ جیسا بدلہ دیگا ویسا ہی پائیگا یہاں ابتداء کرنے والے کا فعل جزاء نہیں لیکن چونکہ جزاء اور بدلہ کا سبب ہے اس لئے اس کو بھی جزاء سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ کی اصل تقدیر عبارت یہ ہے اِذَا اَرَدْتُّمُ الْقِیَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ اور اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ کی تقدیر عبارت اِذَا اَرَدْتَّ قِرَاءَۃَ الْقُرْاٰنِ ہے۔

مذکورہ بالا معروضات سے واضح ہو گیا کہ قرآن پاک

اور کلام عرب میں یہ قاعدہ کثیر الوقوع ہے کہ
سبب کو شئی کے قائم مقام کر کے پھر خود سبب
ہی پر اس شئی کے اسم کا اطلاق کر دیا جاتا ہے
جیسا کہ مطالبۃ الدائن اور مماطلۃ المدیون ایک
طرف سے مطالبہ ہے اور دوسری جانب سے مماطلۃ
ہے جس کا سبب مطالبہ ہے۔ چونکہ غریم یعنی
مدیون ٹال مٹول اس لئے کرتا ہے کہ اس سے مطالبہ
ہو رہا ہے اور خود مطالبہ کا سبب مماطلۃ ہے۔ چونکہ
مطالبہ اسلئے ہو رہا ہے کہ غریم ٹال مٹول کرتا ہے اور دوسری طرف
جانب سے فعل کا سبب، تو سبب کو بھی فعل کے قائم مقام
کر کے اس پر اسم فعل کا اطلاق کر کے مطالبہ اور
مماطلہ مفاعلہ سے بول دیا گیا، گو یا کہ دونوں سے
فعل کا صدور ہو رہا ہے۔ اسی طرح مُرَاوَدَۃ ہے
امرأۃ العزیز کی طرف سے فعل ہے اور جناب یوسف
علیہ السلام کی طرف سے اس فعل کا سبب ہے، اور
وہ ان کی خداداد خوبصورتی اور حسن وجمال ہے، تو
سبب فعل کو فعل کے قائم مقام کر کے صاحب سبب
پر بھی اس کا اطلاق کر دیا گیا ہے حالانکہ جناب یوسف
علیہ السلام کی طرف سے کسی طرح کی کوئی مراودت
نہیں ہے اسی لئے اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ:
ھی مفاعلۃ من واحد (روح، جمل وغیرہ)
الرَّوْدُ: التردد فی طلب الشئ برفق۔
والمُرَاوَدَۃُ: ان تنازع غیرك فی الارادۃ،
فترید غیر ما یرید او ترود غیر ما یرود [له]

غَلَّقَتِ: غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ۔ واحد مؤنث
غائب ماضی معروف باب تفعیل کے مصدر تغلیق سے
بنا ہے بمعنی خوب بند کرنا۔ اس کا مادہ مجرد غَلْقٌ
ہے یہ بھی متعدی ہے باب تفعیل میں پہنچ کر معنی میں
کثرت یا قوت ہو گئی یعنی بہت بند کرنا یا مضبوطی
سے بند کرنا۔ مطلب یہ کہ امرأۃ العزیز نے بہت
دروازے بند کئے یا مضبوطی کے ساتھ بند کر دیئے
امام راغب نے لکھا ہے کہ غَلْقٌ متضاد المعنی لفظ ہے
وہ جس چیز سے کھولا جائے یا بند کر دیا جائے دونوں
پر لفظ غلق کا اطلاق ہوتا ہے۔ بندش کا لحاظ کیا
جائے تو اسم آلہ مِغْلَق و مِغْلَاق آتا ہے اور
کھولنے کے مفہوم کے اعتبار سے اسم آلہ مِفْتَح اور
مِفْتَاح آتا ہے۔ (لغات القرآن)

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ فعل کی تشدید
مفعول کی کثرت ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ یعنی اس
عورت نے بہت سے دروازے بند کئے، یہ اس
صورت میں ہوگا جب یہ کہا جائے دروازے سات
یا تین سے زائد تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ دروازے
زیادہ نہیں تھے بلکہ صرف ایک یا بعض کے قول
کے مطابق دروازے دو تھے تو فعل کی تشدید
یعنی غَلَّقَتْ کا تفعیل سے آنا خود فعل کی تکثیر ظاہر
کرنے کے لئے ہوگا۔ مطلب یہ کہ امرأۃ العزیز نے

دروازے کو خوب بند کیا یا یہ کہ دروازے کو کئی مرتبہ بند کیا تاکہ یقین ہو جائے کہ باہر سے کوئی آدمی آئے گا نہیں۔ اور ابواب کی جمع یا تو اسلئے ہے کہ دروازے کے ہر ہر جزء کو مستقل باب کے قائم مقام کر دیا گیا ہے یا پھر تعددِ اغلاق کو بمنزلہ تعددِ ابواب رکھا گیا ہے۔ (روح)

قرطبی فرماتے ہیں: کہ غَلَّقَ (تفعیل) کا استعمال کثرت کے لئے ہوتا ہے۔ اور اَغْلَقَ (افعال) کثرت اور قلت دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ غلق للکثیر، ولا یُقال غَلَقَ البابَ، واغلق یقع للکثیر والقلیل (قرطبی)

هَيْتَ: وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ۔

یہ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ هَيْتَ اور لَكَ، هیت اسم فعل بمعنی امر ہے یعنی آ۔ لَكَ میں لام جار، ک مجرور فعل محذوف سے متعلق ہے یعنی لَكَ اَقُولُ میں تجھ سے کہتی ہوں جلد آ۔ تفسیر سراج میں خطیب نے لکھا ہے کہ واحدی کا قول ہے کہ هَيْتَ لَكَ پورا اسم فعل ہے جیسے رُوَيْدَ صَه اور مَه اس کا معنی ہے هَلُمَّ، آ اور لا

هِيْتٌ: پست زمین۔ هاتِ بکسر التاء اسم فعل بمعنی امر لا۔ تَهْيِيْتٌ آواز دینا۔ بلانا۔ (لغات القرآن)

هَيْهَاتَ: یہ اسم فعل بمعنی ماضی بَعُدَ اور بمعنی مصدر بھی یعنی بُعْدٌ دونوں میں آتا ہے۔ اس میں تین لغات ہیں۔ ابوجعفر نے اَمْسِ اور هٰؤُلَاءِ کی طرح هیہاتُ مبنی بر ضمہ پڑھا ہے اور اکثر اہل علم اَيْنَ اور كَيْفَ کی طرح هیہات کہتے ہیں۔

علامہ راغب فرماتے ہیں کہ کلمہ هیہات کسی چیز کے بعید از قیاس ہونے کو بتانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ هَاتِ یہ بھی اسم فعل ہے بمعنی لاؤ۔ اس کا تثنیہ هَاتِيَا اور جمع هَاتُوا آتا ہے۔ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ۔

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ: هَيْتَ لَكَ: هَلُمَّ۔ اَقْبِلْ اور تَعَالَ وغیرہ کے معنی میں ہے۔ اس کا نہ مصدر ہے نہ تصریف۔ هَيْتَ لَكَ، ای هَلُمَّ وَاَقْبِلْ وتَعَالَ ولا مصدر له ولا تصریف (قرطبی)

نحاس کہتے ہیں کلمہ هَيْتَ میں سات لغات ہیں، لیکن تمام لغات میں سب سے جید اور سند کے اعتبار سے صحیح روایت وہ ہے جو اعمش نے ابووائل کے واسطہ سے عبداللہ ابن مسعودؓ سے نقل کی ہے۔ ابووائل کہتے ہیں کہ میں نے ابن مسعودؓ کو هَيْتَ لَكَ پڑھتے ہوئے سُنا تو میں نے عرض کیا کہ بعض لوگ هِيْتَ لَكَ ها کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، تو ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں تو اسی طرح پڑھتا ہوں جیسے مجھے سکھایا گیا ہے۔ ابوجعفر کہتے ہیں کہ بعض نے اس روایت کو عن عبداللہ ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر کیا ہے۔ یعنی روایت کو مرفوع کیا ہے۔

اور اس کی تصدیق خود ابن مسعودؓ کے قول اِنَّمَا اَقْرَأُ كَمَا عُلِّمْتُ میں موجود ہے۔

ابن مسعودؓ نے جو قرأت کما عُلِّمْتُ فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب مرفوع کی ہے وہ ھَا اور تاء دونوں کے فتح سے ہے اور یہی قرأت صحیح طور پر ابن عباس، سعید بن جبیر، حسن، مجاھد اور عکرمہ وغیرہ سے ثابت ہے۔ اسی قرأت کو ابو عمرو ابن العلاء، عاصم، اعمش، حمزہ اور کسائی وغیرہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ ابن مسعودؓ اس پڑھنے کو قرآن میں قطع و برید شمار فرماتے ہیں۔ ان کا قول ہے لا تقطعوا فی القرآن، فانما ھو مثل قول احدکم: ھَلُمَّ و تَعَالَ ۲ ابی اسحٰق نحوی نے قالت ھِیْتِ لَکَ بفتح الھاء اور بکسر التاء پڑھا ہے۔

۳ ابو عبدالرحمٰن السُّلمی اور ابن کثیر نے ھَیْتُ لَکَ ھا کے فتح اور تا کے ضمہ سے پڑھا ہے۔

مشہور شاعر طرفہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہتا ہے۔

لَیْسَ قَوْمِی بِالْاَبْعَدِیْنَ اِذَا مَا
قَالَ دَاعٍ مِنَ الْعَشِیْرَۃِ ھَیْتُ

یہ تین قرأتیں ہیں جن میں تغیر صرف آخری حرف تاء میں ہوا ہے اور حرف ھا ہر سہ صورت میں فتح کر

۴ ابو جعفر، شیبہ، نافع ھِیْتَ لَکَ پڑھا ہے۔ بکسر الھاء و فتح الھاء۔

۵ یحیٰ بن وثاب نے ھِیْتُ لَکَ پڑھا ہے بکسر الھاء و بعدھا یاءٌ ساکنۃٌ والتاء مضمومۃٌ

۶ حضرت علی اور ایک روایت میں ابن عباس مجاھد اور عکرمہ نے وقالت ھِئْتُ لک پڑھا ہے بکسر الھاء و بعدھا ھمزۃٌ ساکنۃ والتاء مضمومۃ

۷ ابن عامر اور اہل شام نے ھِئْتَ لَکَ بکسر الھاء وبالھمزۃ و بفتح التاء پڑھا ہے۔ (قرطبی)

ھَیْتَ دراصل ایسا کلمہ ہے جس کے ذریعہ سے آدمی کو کسی چیز پر برانگیختہ کیا جاتا ہے۔

وھی کلمۃ حثٍّ و اقبالٍ علی الاشیاء (قرطبی)

فھو اسم فعل امر مبنیٌّ علی الفتح کاَیْنَ (روح)

زجاج نحوی کا قول ہے کہ سب سے بہتر قرأت ھَیْتَ لَکَ ہے۔ اور طرفہ شاعر نے بھی اپنے کلام میں ھَیْتَ ہی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ طرفہ کا شعر ہے

لَیْسَ قومی بالاَبْعَدِیْنَ اذا ما
قال داعٍ من العشیرۃ ھَیْتَ (بفتح الھاء

قال الزجاج: اجود القرآت ھَیْتَ بفتح الھاء والتاء (قرطبی)

مَعَاذَ : قَالَ مَعَاذَ اللّٰہِ اِنَّہٗ رَبِّیْ

معاذ: عَوْذٌ سے مصدر ہے اور فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔ عَوْذٌ کے معنی ہیں کسی کی پناہ لینا۔ محاورہ ہے عَاذَ فلانٌ بفلانٍ۔ فلاں نے اس کی پناہ لی۔ قرآن میں ہے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ

اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ
نصب علی المصدر، یقال عُذتُ عوذاً وعیاذاً
وعیاذۃً ومعاذاً ای اعوذ باللہ عزوجل
معاذاً مِمَّا ترِیدِیْنَ منّی (روح)

معاذ : مصدر میمی اور اسم منصوب ہے۔ پناہ۔
عوذؔ اور معاذؔ کسی کی پناہ پکڑنی اور کسی سے
وابستہ ہوجانا۔ مَعَاذَ اللہِ کے معنی ہیں اللہ کی پناہ
یعنی یہ گناہ کا کام ہے ہم اس کے کرنے سے اللہ
کی پناہ مانگتے ہیں (لغات القرآن)
وھو مصدر ای اعوذُ باللہ معاذاً فیحذف
المفعول ویُنتصب المصدرُ بالفعل المحذوف

ھَمَّ: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ لَوْلَآ اَنْ
رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔ اور البتہ اس عورت نے
یوسف سے ارادہ بد کیا اور وہ بھی ارادہ کرتے
اگر اپنے پروردگار کی برھان کو نہ دیکھ لیتے۔
(ترجمہ قصص القرآن)

عربی زبان میں لفظ ھَمّ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے
ایک کسی کام قصد وارادہ کرلینا اور دوسرا محض
دل میں وسوسہ اور غیر اختیاری خیال پیدا ہوجانا
پہلی صورت گناہ میں داخل اور قابل مواخذہ ہے
ہاں اگر قصد وارادہ کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کے
خوف سے کوئی شخص اس گناہ کو باختیار خود چھوڑ دے
تو حدیث میں ہے کہ اس کے گناہ کی جگہ خدا تعالیٰ
ایک نیکی لکھدیتے ہیں اور دوسری صورت۔ کہ محض
وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آجائے اور فعل کا
ارادہ بالکل نہ ہو جیسے کہ مئی کے روزہ میں ٹھنڈے
پانی کی طرف طبعی میلان غیر اختیاری سب کو
ہوجاتا ہے حالانکہ روزہ میں ارادہ بالکل نہیں ہوتا
اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے
نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ۔

تفسیر قرطبی میں لفظ ھَمّ کا ان دونوں معنی کیلئے
استعمال کلام کے محاورات اور اشعارِ عرب کی
شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔ امام قرطبی، احمد بن
یحیی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ھَمَّتْ زلیخا بالمعصیۃ
وکانت مصرۃ وھَمَّ یُوسُفُ ولم یواقع ماھَمَّ بھا
عرب کا ایک شاعر جمیل کہتا ہے

ھَمَمْتُ بِھَمٍّ من بُثینۃ لو بَدَا
شَفَیتُ غلیلاتِ الھوی من فؤادیا

اسی طرح ایک دوسرا شاعر کہتا ہے

ھممتُ ولم افعل وکدت ولَیْتَنِي
ترکتُ علی عثمان تبکی حلائلُہ

ان دونوں شعروں میں لفظ ھم کا استعمال بغیر عزم
کے محض قلبی خیال اور وسوسہ پر ہو رہا ہے فھذا الھم
حدیث نفس من غیر عزم (قرطبی)
اس سے معلوم ہوا اگرچہ لفظ ھَمّ زلیخا اور حضرت
یوسف دونوں کے لئے بولا گیا ہے مگر ان دونوں کے

ھَمّ یعنی خیال میں بڑا فرق ہے، پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے جو گناہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کا اسلوب بیان بھی خود اس پر شاھد ہے، کیونکہ دونوں کا ھم وخیال اگر ایک ہی طرح کا ہوتا تو اس جگہ بصیغہ تثنیہ وَلَقَدْ هَمَّا کہدیا جاتا جو مختصر بھی تھا اس کو چھوڑ کر دونوں کے ھم وخیال کا بیان الگ الگ فرمایا وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ، اور زلیخا کے ہم کے ساتھ تاکید کے الفاظ لَقَدْ کا اضافہ کیا ہے اور یوسف علیہ السلام کے ھم کے ساتھ کوئی تاکید نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعبیر خاص کے ذریعہ یہی جتلانا ہے کہ زلیخا کا ھم کسی اور طرح کا تھا اور یوسف علیہ السلام کا ھم دوسری طرح کا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا میلان پیدا ہوا وہ غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ میں تھا جو گناہ میں داخل نہیں۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ کلام میں یہاں تقدیم وتاخیر ہے۔ لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ جو بعد میں مذکور ہے وہ اصل میں مقدم ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو بھی خیال پیدا ہو جاتا، اگر اللہ کی برھان وحجت کو نہ دیکھ لیتے مگر بعض مفسرین نے کلام میں تقدیم وتاخیر کو قواعد زبان کے خلاف قرار دیا ہے۔

لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ کی جزاء محذوف ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اپنے رب کی برہان اور حجت کو نہ دیکھ لیتے تو اسی خیال میں مبتلا رہتے مگر بُرھانِ رب دیکھ لینے کی وجہ سے وہ غیر اختیاری خیال اور وسوسہ بھی قلب سے نکل گیا۔ (معارف القرآن)

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ آیت هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا قرآن پاک کی اہم آیات میں سے ہے جسکی طرف پوری توجہ کی ضرورت ہے مفسرین نے آیت وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کی مختلف تفسیریں کی ہیں، لیکن ہم نے جو معنی بیان کئے ہیں وہ ہی زیادہ موزوں اور مناسب مقام ہیں۔ قرآن عزیز نے اول سے آخر تک امراۃ عزیز کی اس واقعہ میں شناعت اور حضرت یوسفؑ کی عصمت اور جلالت قدر کا تذکرہ کیا ہے۔ اسلئے یوسف علیہ السلام کے معاذ اللہ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ فرمانے کے بعد یہی معنی برمحل ہو سکتے ہیں کہ یوسف کی زبان سے برہانِ رب کو سن لینے کے بعد بھی جب عورت اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور اپنے ارادہ پر مصر رہی تو یوسف علیہ السلام نے اس کے ارادہ کو قطعًا رد کر دیا اور برہانِ رب کے سامنے اس کے ھم کی مطلق

پرواہ نہ کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ یوسف علیہ السلام اس سے بچنے کے لیے دروازے کی طرف بھاگے اور عزیزِ مصر کی بیوی نے ان کا پیچھا کیا۔

بعض اہل علم نے اس تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ لَوْلَا تصدیر کلام کو چاہتا ہے یعنی لَوْلَا کو شروع کلام میں ہونا چاہیے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ وَهَمَّ بِهَا، لَوْلَا کا جواب نہیں، دال علی الجواب ہے۔ اور ایسی صورت میں جواب مقدر محذوف ہوتا ہے۔ کلام پاک میں اس کی نظیر حضرت موسیٰ ؑ کی والدہ کے تذکرہ میں بھی موجود ہے، آیت ہے اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا۔ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کو مضبوط کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام کے راز کو ظاہر نہ کر سکیں، اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ظاہر کر دیتیں۔ دیکھئے یہاں بھی لَوْلَا سے دال علی الجواب مقدم ہے اور لَوْلَا کا جواب مقدر ہے۔ اسی طرح اس مقام پر یہ معنی ہیں کہ اگر یوسف کو بُرھانِ رب حاصل نہ ہوتی تو وہ ارادہ بد کر لیتے لیکن انہوں نے ارادہ بد نہیں کیا کیونکہ وہ بُرھانِ رب کو دیکھ چکے تھے (قصص القرآن جلد ۲ ص ۲۶۵)

هَمَّ بِالْاَمْرِ اذا قصدہ و عزم علیہ (کشاف)

هَمَّ کے معنی اصل میں اس ارادہ کے ہیں جو ابھی دل ہی میں ہو، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے کہ

وَهَمَّكَ مَا لَمْ تُمْضِهٖ لَكَ مُنْصِبٌ۔

اور جب تک تو اپنے ارادے کو پورا نہ کرے وہ تجھے بے چین رکھے گا۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ والهَمُّ ماهَمَمْتَ فی نفسك وهو الاصل (راغب)

قرآن پاک میں ہے وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا۔ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ

بُرْهَانٌ: بُرْهَانَ رَبِّهٖ۔ بُرھان دلیل، بیان، حجت بروزنِ فُعلان، جیسے رُجحان اور ثُنیان وغیرہ ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ بَرَهَ يَبْرَهُ کا مصدر ہے جس کے معنی سفید اور درخشاں ہونے کے ہیں

بُرھان اُس دلیل کو کہتے ہیں جو تمام دلائل میں زور دار ہو اور ہمیشہ اور ہر حال میں سچی ہو

صاحب مفردات القرآن نے دلیل کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں ۱ وہ ہمیشہ صدق کی مقتضی ہو اس کو برھان کہا جاتا ہے ۲ وہ جو ہمیشہ کذب کی مقتضی ہو ۳ وہ جو صدق سے زیادہ قریب ہو ۴ وہ جو کذب سے زیادہ قریب ہو ۵ وہ جس کا اقتضا صدق و کذب دونوں میں برابر ہو۔

یہ برھان کیا تھا جس کا ذکر قرآن پاک نے کیا ہے اس سلسلہ میں اہل تفسیر نے بہت کچھ بیان کیا ہے

مگر صحیح وہ ہے جس کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے
قصص القرآن میں اور حضرت مفتی صاحب نے معارف
القرآن میں اختیار کیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب
فرماتے ہیں کہ دروازہ بند ہو جانے پر عزیز کی بیوی
کو جو جواب (جناب یوسفؑ نے) دیا ایسے مقام
کے لحاظ سے اس سے بہتر جواب کیا ہو سکتا تھا
سو یہی وہ برہانِ رب تھا جو یوسف علیہ السلام
کو عطا ہوا۔ والبرهانُ صرفهٗ عن هذا
الهم حتى لم يصر عزمًا مصممًا (قرطبی)
اور جس نے عصمتِ یوسف کو بے داغ رکھا۔
یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے بڑے شد و مد سے
اس کے بعد یہ بیان کیا، کَذٰلِكَ، یونہی ہو
لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ تاکہ ہٹائیں ہم
اس سے برائی اور بے حیائی کو۔ اِنَّهٗ مِنْ
عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ بیشک وہ ہمارے
مخلص بندوں میں سے ہے۔ یعنی حضرت یوسف
کا دامن اس قسم کے ہم سے پاک رہا کہ اللہ تعالیٰ
نے ان کی عصمت و پاکی کا فیصلہ شروع ہی سے کر دیا
تھا، پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی عصمت و حفاظت
کے بعد اس کے خلاف کوئی شائبہ بھی ان میں
پایا جاتا۔ (قصص القرآن)

السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ : کَذٰلِكَ
لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اس آیت
میں حق تعالیٰ نے دو لفظ سُوْءٓ اور فحشاء کے
استعمال کئے۔ سوء کے لفظی معنی برائی کے ہیں اور
مراد اس سے صغیرہ گناہ ہے اور فحشاء کے معنی
بے حیائی کے ہیں اور مراد اس سے گناہ کبیرہ ہے
اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف
علیہ السلام کو کبیرہ اور صغیرہ دونوں قسم کے
گناہوں سے محفوظ رکھا۔ یہاں یہ بات بھی
قابلِ لحاظ ہے کہ برائی اور بے حیائی کو حضرت
یوسف علیہ السلام سے ہٹا دینے کا ذکر فرمایا ہے
یوسف علیہ السلام کو برائی اور بے حیائی سے ہٹانا
نہیں فرمایا، جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ
یوسف علیہ السلام تو اپنی شانِ نبوت کی وجہ سے
اس گناہ سے خود ہی ہٹے ہوئے تھے، مگر برائی اور
بے حیائی نے ان کو گھیر لیا تھا ہم نے اس جال کو
توڑ دیا (معارف القرآن)

قَدَّتْ : وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ
اور عورت نے چیر ڈالا کرتہ اس کا پیچھے سے۔
اَلْقَدُّ : کے معنی ہیں کسی چیز کو طولاً قطع کرنا۔
اَلْقِدُّ بمعنی مَقْدُوْدٌ ہے۔ اسی سے انسان
کے قد و قامت کو قد کہا جاتا ہے جیسا کہ
تقطیع الانسان کا محاورہ ہے۔
اور اَلْقِدَدُ : اس کا واحد قِدَّةٌ ہے مختلف
راہ روش اور جدا جدا ارادے رکھنے والے۔

گروہ۔ قرآن میں ہے کُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا۔
ہمارے مختلف مذاہب تھے۔

اَلْقَدُّ : القطع واکثر ما یستعمل فیما کان طولاً (قرطبی) یعنی قدٌّ اس چیز کے قطع کرنے پر زیادہ استعمال ہوتا ہے جس میں طول ہو۔

اَلْفَیَا : اَلْفَیَا سَیِّدَھَا لَدَی الْبَابِ۔
اَلْفَیَا : اِلْفَاءٌ سے تثنیہ کا صیغہ ہے۔
اَلْفَیْتُ کے معنی کسی چیز کو پالینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ پر ارشاد ہے بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا۔ حدیث میں ہے لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَعَلٰی عَاتِقِہٖ شَاۃٌ تَیْعَرُ۔ میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن ایسے حال میں نہ دیکھوں کہ اس کے کندھے پر بکری ممیا رہی ہو۔
لَفَا یَلْفُو لَفْوًا۔ لَفَا فُلَانًا حَقَّہٗ کسی کے حق کو کم کرنا۔ قال الراغب الفیتُ، وجدتُ
اَلْفَیَا : صَادَفَا (کشاف) اَلْفَیَا : وَجَدَا (جلالین)
اس کا مادہ مجرد لَفْیٌ ہے۔ دیکھئے سورۂ بقرہ لفظ اَلْفَیْنَا

سَیِّدُ : لفظ سید سے مراد یہاں زوج ہے
قبطی عورتیں خاوند کو سید کہتی تھیں
وعُنِی بالسید الزوج، والقبط یسمون الزوج سیدًا (قرطبی)

یُسْجَنَ : قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَھْلِکَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ
سَجَنَ یَسْجُنُ سَجْنًا : سَجَنَہٗ قید خانہ میں بند کر دینا سَجَّنَ (تفعیل) الشَّیْءَ پھاڑنا۔ السِّجْنُ بکسر السین قید خانہ۔ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ، اے میرے رب مجھے قید خانہ رہنا (اس سے) زیادہ پسند ہے۔ جمع سُجُوْن۔
السِّجِّیْن : یہ عِلِّیِّیْن کے مقابلہ میں اسمائے جہنم میں سے ہے۔ بعض کا قول ہے سِجِّیْن جہنم کے سب سے نچلے طبقے کا نام ہے۔
السَّجْنُ : الحَبْسُ فی السِّجْنِ (راغب)

شَغَفَ : قَدْ شَغَفَھَا حُبًّا۔ اس کے عشق میں دیوانی ہوگئی ہے (ماجدی) اس کی محبت میں ماری گئی۔
شَغَفٌ : دل کی وہ بیماری ہے جو دل کے اندر تک پہنچ جائے۔ داءٌ یَصِلُ اِلَی القَلْبِ (ماجدی)
الشَّغَافُ : دل کے اندرونی حصہ کو کہتے ہیں اور شَغَافٌ : پردۂ دل کے معنی میں آتا ہے، اسلئے پردۂ دل میں اتر جانے کے لئے شَغَفَ آتا ہے قَدْ شَغَفَھَا حُبًّا : اس کی محبت اس کے دل میں اتر گئی۔ شَغَفَھَا : غَلَبَھَا۔ قال الحسن الشغفُ : باطن القلب، وقال السُّدّی وابو عبیدۃ شغاف القلب غلافہ وقیل

ھو وسط القلب (قرطبی)
ابو جعفر بن محمد اور بعض دیگر حضرات نے شَعَفَهَا کی بجائے شَعَفَهَا عین معجمہ کے ساتھ پڑھا ہے ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں اَحْرَقَ حُبُّہٗ قَلْبَہٗ، کہ یوسف کی محبت نے زلیخا کے دل کو جلا کے راکھ کر دیا۔ سعید بن عروبہ نے حضرت حسن سے نقل کیا ہے کہ الشَّغَافُ حِجَابُ الْقَلْبِ وَالشَّعَافُ سُوَیْدَاءُ الْقَلْبِ۔ اگر محبت سویداء قلب تک پہنچ جاتی تو مر جاتی۔ (قرطبی)

اَعْتَدَتْ : وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا۔
اَعْتَدَتْ : عَتَادٌ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں ضرورت کی چیزوں کو پہلے سے ذخیرہ کر لینا، اِعْدَادٌ کے بھی یہی معنی ہیں۔ اسم فاعل عَتِیْدٌ آتا ہے، تیار کرنے والا۔ ھٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیْدٌ یہ اعمال نامہ میرے سامنے حاضر ہے رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ میں عَتِیْدٌ سے مراد وہ فرشتہ ہے جو انسان کے اعمال لکھنے کے لئے ہر وقت حاضر رہتا ہے۔ اور لفظ عتید جس طرح فاعل کے لئے آتا ہے اسی طرح مفعول کے معنی میں بھی آتا ہے۔ العَتَادُ : ادخار الشئ قبل الحاجة اليه كالاعداد، والعَتِيْدُ المُعِدُّ والمُعَدُّ (راغب)، واَعْتَدَتْ : من العتاد وھو كُلّ ما جعلتہ عُدَّةً لشئٍ (قرطبی)

مُتَّكَاً : اسم مکان۔ مجلس، سہارا لگانے کی جگہ جس پر ٹیک لگائی جائے، گاؤ تکیہ، مسند وغیرہ۔ تَوَكَّأَ اور اِتِّكَاءٌ کے معنی ہیں سہارا لگانا۔ قرآن میں ہے قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّاُ عَلَيْهَا۔ حضرت موسیٰ نے کہا یہ میری لاٹھی ہے جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں۔ تَوَكَّأَ عَلٰى عَصَاهُ سہارا لگانا۔ تُكَاءَةٌ : وہ چیز جس سے سہارا لیا جائے۔ اَوْكَأَهٗ اِيْكَاءً : کسی کے لئے تکیہ لگانا۔ اَوْكَأَ عَلَى الشَّئِ : سہارا لینا۔ مُتَّكَأٌ جمع متکآت : تکیے

اہل عرب مُتَّكَأً اس چیز کو کہتے ہیں جس پر کھانے پینے کے وقت سہارا لگایا جائے۔
وَالمُتَّكَأُ: مَا يُتَّكَأُ عليه عند الطعام والشراب والحديث (خازن۔ معالم)
قتیبی کہتے ہیں کہ یہ اِتَّكَأْنَا عند فلان کے محاورہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں ہم نے فلاں کے ہاں کھانا کھایا، عرب کا ایک شاعر جمیل کہتا ہے

فظللنا بنعمة واتّكأنا
وشربنا الحلال من قُلَلِہ

ہم نے عیش میں دن گذارا، کھانا کھایا اور مٹکوں سے نکال کر شراب پی۔ قُلَلٌ : قُلَّةٌ کی جمع ہے بڑے مٹکے کو کہتے ہیں۔

اِتْکَأْنَا اصل ہیں، اوتَکَأْنَا ہے پہلی تاء
واو ہے اور دوسری افتعال کی ہے۔ اصل
مادہ مجرد، وَکَأٌ ہے۔ وِکَاءٌ سربندھن، وہ
رسّی جس سے مشکیزہ کا منہ باندھا جائے۔
وھومِنَ الْاِتِّکَاءِ: المیل الی احد الشقین
واصلہ مُوْتَکَأٌ لِأنہ من تَوَکَّأْتُ فأبدلت
الواو تاءً، و اُدغمتْ فی مثلہا (روح المعانی)
مُتَّکَأً سے مراد نمارق اور وسائد (تکیے)
ہیں جن پر ٹیک لگا کر بیٹھا جاتا ہے۔ اور یہ
اِتِّکَاءٌ (افتعال) سے ماخوذ ہے جس کے معنی
ہیں ایک جانب کو جھک کر بیٹھنا، مُتَّکَأً، کی
اصل مُوْتَکَأٌ ہے اس کا فاکلمہ واو ہے حرف
واو کو تاء بنا کے ادغام کیا گیا ہے
اہل تفسیر کا اس میں اختلاف ہے کہ اس سے
مراد کیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ مُتَّکَأً سے مراد
نفس طعام ہے، اس صورت میں یہ اسم مفعول
ہوگا، اور اس کا فاعل اِعْتَدَتْ کی ضمیر ہوگی۔
ابن عباس، ابن عمر، مجاہد اور قتادہ سے
ایک روایت، مُتْکًا، کی ہے، بضم المیم وسکون
التاء وتنوین الکاف، مُتْکٌ عربی میں اترج
کو کہتے ہیں، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ متکٌ ہر
اس چیز کے لئے بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے
جسے چھری وغیرہ سے کاٹ کر کھایا جاتا ہے

اور یہ مَتَكَ الشیءَ سے ماخوذ ہے جس کے
معنی کسی چیز کو کاٹنے کے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے

نشربُ الاثمَ بالصّواعِ جهارًا
وتری المتكَ بیننا مستعارًا

سِکِّیْنًا: سِکِّین چھری، جمع سکاکین
سکونٌ سے اسم مشتق ہے فِعِّیْلٌ کے وزن پر
ہے۔ سکونٌ کے معنی حرکت کے بعد ٹھہر جانے
کے ہیں، یعنی حرکت کے بعد سکون، جس پر چھری
چلتی ہے اس کی حرکت پوری طرح سکون میں
بدل جاتی، چھری کو سکین اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ
مذبوح کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے۔
سکین، مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال
ہوتی ہے۔ فراء نحوی نے اس کی تانیث پر ایک
شعر پیش کیا ہے

فَعَیَّثَ فی السَّنامِ غداةَ قُرٍّ
بسِکِّینٍ مُوَثَّقَةِ النِّصَابِ

جوہری کہتے ہیں اس کا غالب استعمال تذکیر ہے
اور اس پر یہ شعر پیش کیا ہے

یُرَی ناصحًا فیما بَدَا فاذا خَلَا
فذلكَ سکّینٌ علی الحلقِ حاذقٌ

اصمعی کا قول ہے کہ سکین میں تذکیر کے سوا کوئی
صورت معروف نہیں ہے۔ لا یعرفُ فی السکین
الّا التذکیر قرطبی۔

رَاَیْنَ : فَلَمَّا رَاَیْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ ۔

رَاَیْنَ ، رُؤْیَةٌ سے جمع مؤنث غائب ماضی کا صیغہ ہے۔ ہ ضمیر واحد مذکر غائب ۔ اُن عورتوں نے اس کو دیکھا ۔

اَكْبَرْنَهٗ : اَكْبَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہیں کسی چیز کو بڑا خیال کرنا ۔

فَلَمَّا رَاَیْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ ۔ جب عورتوں نے اس کو دیکھا تو ان کا رعب ان پر چھا گیا (راغب)

اَكْبَرْنَهٗ ای اَعْظَمْنَهٗ وَدَهِشْنَ بِرُؤْیَةِ جمالہ الفائق الرائع (روح)

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اَكْبَرْنَ بمعنی حِضْنَ ہے۔ اور یہ اَكْبَرَتِ الْمَرْاَةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں عورت حائضہ ہوگئی ۔ عورت کو جب حیض شروع ہوجاتا ہے تو وہ صغر یعنی بچپن سے نکل کر کبر میں داخل ہوجاتی ہے اور اس پر بلوغ کے حکم نافذ ہوجاتے ہیں۔ عورت فطرۃً کچھ حُسن پرست ہے، جب حُسن کی تابانیوں کا تحمل نہ کرسکیں تو حائضہ بھی ہوجاتی ہیں ۔ متنبی کہتا ہے

خَفِ اللّٰهَ واسْتُرْ ذَا الجَمَالِ بِبُرْقَعٍ
فَاِنْ لُحْتَ حَاضَتْ فِی الخُدُورِ العَوَاتِقُ

اے ممدوح! تو خدا سے ڈر اور اپنے اس جمال کو بذریعہ برقعہ پوشیدہ رکھ، ورنہ اگر تو ظاہر ہوا تو تیرے عشق میں زنانِ نوجوان پردوں میں غلبۂ شہوت کی وجہ سے حائضہ ہوجائیں گی متنبی کے بعض مشہور نسخوں میں حاضت کی جگہ ذابت ہے، یعنی پگھل جاوینگی ۔

عبد الصمد بن علی الھاشمی نے اپنے والد کے واسطہ سے اپنے دادا سے اکبرن کے معنی حِضْنَ کے بیان[1] کئے ہیں اور اس پر ایک شعر کا کلام پیش کیا ہے

نأتی النساء علی اطہارھن ولا
نأتی النساء اذا اکبرن اکبارًا

لیکن ابوعبیدہ اور قاضی ابومحمد فرماتے ہیں کہ یہ قول ضعیف ہے، اور اس پر جو شعر پیش کیا گیا یہ بالکل بے اصل ہے ۔ طبری کہتے ہیں کہ لیس عبد الصمد من رُواۃ العلم رحمہ اللہ

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محققین نے کہا ہے کہ انہ علیہ الرحمۃ لیس من رواۃ العلم ۔

عبد الصمد حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے پوتے ہیں ۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مشہور معنی اعظمنہ ودھشن من حسنہ کے منقول ہیں ۔ اور ایک معنی انہی سے اَمْنَیْنَ وَاَمْذَیْنَ کے بھی منقول ہیں ۔

[1] حاشیہ قرطبی

اس معنی کی بھی تائید ایک شاعر کے کلام سے ہوتی ہے۔

اذا ما رأین الفحل من فوق قارةٍ [1]
صهلن واکبرن المنیّ المدفّقا

ابو عبیدہ وغیرہ نے اگرچہ اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اَکْبَرْنَ بمعنی حِضْنَ کلام عرب میں معروف نہیں ہے، لیکن یہ جائز اور ممکن ہے کہ زنانِ مصر جمالِ یوسفی کی تاب نہ لاکر حائضہ ہوگئی ہوں۔ اور قرآن پاک نے کنایۃً ان کی حالت کا ذکر اَکْبَرْنَ سے کردیا ہو۔ اس معنی کے لحاظ سے اَکْبَرْنَہٗ کی ضمیر کنایہ ہوگی اور یہ کنایہ فعل کے مصدر سے ہوگا یعنی اَکْبَرْنَ اِکْبَارًا بمعنی حِضْنَ حَیْضًا۔ اور ایسا ہوتا ہے کہ عورت پر جب خوف اور دہشت طاری ہو تو اس کو حیض قبل از وقت آجاتا ہے اور کبھی اسقاطِ حمل بھی ہوجاتا ہے۔

امام قرطبی نے علامہ ازہری کا قول نقل کیا ہے کہ یجوز اکبرت بمعنی حاضت، لانّ المرأۃ اذا حاضت فی الابتداء، خرجت من حیّز الصغر الی الکبر، قال والهاء فی اَکْبَرْنَہٗ یجوز ان تکون هاء الوقف لاهاء الکنایۃ (قرطبی)

لیکن چونکہ ہاء وقف اصل میں گر جاتی ہے اس لئے زہری کا ہاء کو ہائے وقف قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ ہائے وقف متحرک بھی نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

مزید تفصیل روح المعانی میں دیکھیں۔

قَطَّعْنَ : قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ۔

اُن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیئے۔

قطع کے لئے ضروری نہیں کہ ہاتھ بالکل جدا ہوگئے ہوں بلکہ صرف زخمی کرلینا بھی کافی ہے جمالِ یوسف کو دیکھ کر اس قدر مدہوش ہوگئیں ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور کاٹنے والی چیز کے بجائے اپنے ہاتھوں کو کاٹ ڈالا۔

قَطَّعْنَ، تَقْطِیْعٌ سے جمع مؤنث غائب ماضی معروف کا صیغہ ہے۔ اصل مادہ قَطْعٌ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو علیحدہ کردینا، جدا جدا کردینا اَلْقَطْعُ : فصل الشئ (راغب) قطّع (تفعیل) کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کردینا، جدا جدا کردینا۔ قرآن میں ہے لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ (اعراف) قَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (محمد) وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ عورتیں اس قدر اپنے آپ سے غافل ہوگئی تھیں کہ انھوں نے واقعی ہاتھوں کے ٹکڑے کر دیئے یہاں تک کہ ہاتھوں کے بعض ٹکڑے کٹ کر گر گئے۔

[1] القارۃ: الجبل الصغیر المنقطع عن الجبل وقیل الصخرۃ العظیمۃ (حاشیہ قرطبی)

قال مجاهد، قطعنها حتی القینھا (قرطبی)
مگر اکثر محققین کے نزدیک قَطَّعنَ بمعنی جَرَحنَ
کے ہے یعنی انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے
اور اہل لغت کے نزدیک ہاتھ کے زخمی ہونے
پر قطع کا لفظ بولا جاتا ہے و ذٰلك معروف
فی اللغۃ ان یقال اذا خَدَشَ الانسانُ
یَدَ صَاحِبِہٖ قَطَعَ یَدَہٗ (قرطبی)
یہ بالکل ایسا ہی ہے جیساکہ محاورہ میں کہا
جاتا ہے کہ گوشت کاٹتے ہوئے میں نے
اپنا ہاتھ کاٹ لیا ظاہر ہے کہ اس سے مراد ہاتھ کا
زخمی کر لینا ہوتا ہے نہ کہ بالکل جدا کر دینا۔
اور قَطَّعنَ کو تفعیل سے یا تو اس لئے لایا گیا ہے
تاکہ کاٹنے والیوں کی کثرت ظاہر ہو اور یا
اس لئے کہ ان سب عورتوں میں سے ہر ایک
نے اپنے ہاتھ پر مدہوشی کی حالت میں بار بار
چھری چلائی ہو اور متعدد زخم ہو گئے ہوں
والتضعیفُ للتکثیر اما بالنسبۃ لکثرۃ
القاطعات واما بالنسبۃ لکثرۃ القطع فی
ید کل واحدۃ منھن۔ (روح)

حَاشَ: حَاشَ لِلّٰہِ: حاشا یہ کلمۂ
استثناء ہے۔ یہ مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ سے
بلحاظ معنی تنزیہہ خارج کرتا ہے۔ کہتے ہیں
ضَرَبْتُ الْقَوْمَ حَاشَا زَیْدًا، سوائے زید کے
میں نے قوم مارا۔ چنانچہ صَلَّی النَّاسُ حَاشَا زَیْدًا
کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں تنزیہہ
کے معنی نہیں بنتے۔ (منجد اردو)

امام راغب فرماتے ہیں کہ ابو عبیدہ کا قول
ہے کہ حاشا کا مطلب تنزیہہ اور استثناء ہے
ابو علی فسوی کہتے ہیں کہ نہ تو حاشا اسم ہے
کیونکہ اس جیسے لفظ پر حرفِ جر داخل نہیں
ہوتا جبکہ اسم کی علامات میں ہے کہ اسم پر حرفِ
جر داخل ہو سکے۔ اور نہ ہی یہ حرف ہے کیونکہ
حرف جب تک مضاف نہ ہو اس میں سے کچھ
حذف نہیں ہوتا۔ حالانکہ حَاشَ اور حاشیٰ
دونوں طرح بولتے ہیں۔ پس بعض تو حَاشَ کو
اس باب کی اصل قرار دے کر اسے حُوشٌ بمعنی
وَحشِیٌّ سے مشتق مانتے ہیں اور اسی سے
حُوشِیُّ الکلام (وحشی کلام) ہے۔
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ حَشّٰی سے مقلوب ہے
اور اسی سے حاشیہ ہے جس کے معنی کنارے
کے ہیں، ایک شاعر کہتا، وَلَا اُحَاشِی مِنَ
الاقوام من احدٍ: لوگوں سے میں کسی کو مستثنیٰ
نہیں کرتا، یعنی میں کسی ایک کو حشا میں نہیں رکھتا
کہ تمہاری کوئی فضیلت بیان کرتے وقت اسے
مستثنیٰ رکھنا پڑے۔

امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ حاشا

سورہ یوسف کے دونوں مقامات پر اسم ہے
فعل اور حرف نہیں، اور اس کے اسم ہونے
کی دلیل یہ ہے کہ بعض کی قرأت میں اس کو
حاشًا ، لِلّٰہِ پڑھا گیا ہے ، یعنی اس پر تنوین دی
گئی ہے ۔ حالانکہ حرف اور فعل دونوں پر تنوین
داخل نہیں ہوتی اور اس کے اسم ہونے کی دوسری
دلیل یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کی قرأت میں اسے
حاشا اللّٰہ اضافت کے ساتھ پڑھا گیا ہے ،
جیسے معاذ اللّٰہ اور سبحان اللّٰہ ، نیز قراآتِ سبعہ
میں یہ لام پر داخل ہوا ہے جبکہ معلوم ہے
کہ جار ، جار پر داخل نہیں ہوتا ۔ اور قراآتِ
سبعہ میں جو تنوین متروک ہے تو اس کی وجہ یہ
ہے کہ وہ حاشا حرفیہ سے لفظوں میں مشابہ
ہے ، اس لئے مبنی ہے ۔ اسی بنا پر بعض کو
یہ شبہ ہو گیا کہ یہ اسم فعل ہے جس کے معنی اتبرأ
وتبرأتُ ، کے ہیں یعنی بیزار ہوں لیکن
اس خیال کو اس بنا پر رد کر دیا گیا کہ وہ بعض لغات
میں معرب ہے ۔ مبرد اور ابن جنی نے اس کو
فعل سمجھا ہے اور آیت کے معنی یہ بیان کئے
ہیں کہ جَانَبَ یُوسُفُ المعصِیَۃَ لِاَجْلِ اللّٰہِ
یوسف اللہ کے لئے معصیت سے دور رہے
مگر حاشا للہ کے یہ معنی دوسری آیت میں
نہیں بن سکتے ۔ فارسی کا بیان ہے کہ حاشا

فعل ہے اور حشاء سے بنا ہے جس کے معنی
ناحیہ یعنی ایک طرف اور کنارہ کے ہیں ۔ اس
اعتبار سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ صَارَ فِی
ناحیۃ یعنی وہ ایک طرف رہا جو اس پر الزام
لگایا اس سے دور اور علیحدہ رہا اور نہ اس فعل
کا ارتکاب کیا اور نہ اس سے ملوث ہوئے
قرآن کریم میں حاشا استثنائیہ ہی ہے ۔

لغات القرآن ۔ الاتقان فی علوم القرآن)
اکثر نحویوں کے نزدیک مستثنیٰ حاشا کے بعد مجرور
ہوتا ہے ، اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ حرفِ جر
ہے اور نحاۃ کی ایک جماعت نے مستثنیٰ کو
حاشا کے بعد منصوب پڑھا ہے ۔ ان کا دعویٰ
ہے کہ حاشا فعل متعدی ہے اور ضمیر مستتر
اس کا فاعل ہے لہٰذا بنا بر مفعولیت کے اس کو
منصوب پڑھا جائے گا اور معنی یہ ہیں کہ
مستثنیٰ اس چیز سے پاک ہے جو مستثنیٰ منہ
کی طرف ۔۔۔ جیسے ضرب القومَ عمرًوا
حاشا زیدًا ای برأہ اللّٰہ سبحانہ عن ضرب عمرٍو
یعنی خدا تعالیٰ نے اس کو عمرو کے مارنے سے
پاک رکھا ۔ نحاۃ کے اسی اختلاف کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے ابن حاجب نے کافیہ میں وبعد حاشا
فی الاکثر کہا ہے کہ حاشا کے بعد مستثنیٰ اکثر
مجرور ہوتا ہے ۔

نحاس کہتے ہیں کہ میں نے علی بن سلیمان کو یہ
کہتے ہوئے سُنا ہے کہ میں نے محمد بن یزید سے
سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ حاشا کے مستثنیٰ کو
نصب دینا اولیٰ ہے کیونکہ اس کا فعل ہونا
صحیح ہے اور اس کے فعل ہونے کی دلیل یہ ہے
کہ اس کے بعد حرف جر واقع ہوتا ہے۔ ابوزید
نے ایک اعرابی کی دعا نقل کی ہے، عرب بدوی
دعا مانگ رہا تھا اللھم اغفر لی ولمن
یسمع، حاشا زیداً او ابا الاصبع، یعنی
اللہ تو مجھے بھی معاف کر اور ہر اس شخص کو معاف
کر دے جو میری دعا سُنے سوائے شیطان
اور ابوالاصبع کے۔ اعرابی نے یہاں حاش
کے مستثنیٰ کو نصب دیا ہے، اسمیں چار لغات
ہیں ۱ حاشاک ۲ وحاشالک ۳ وحاش
لک وحاشًا لک (قرطبی)

واصل الکلمۃ من الحاشیۃ، والحشا
بمعنی الناحیۃ۔ تقول کنت فی حشا فلان
ای فی ناحیتہ، فقولک حاشا لزید ای
تنحّی زید عن ھذا وتباعد عنہ،
والاستثناء اخراج وتنحیۃ عن جملۃ
المذکورین (قرطبی)

علامہ بغدادی فرماتے ہیں کہ حاشا
جیسا کہ کہا گیا ہے جو استثنا بمعنی تنزیہ کے
وضع کیا گیا، پھر اس کو نقل کر کے اسم بمعنی تنزیہ
لے لیا گیا ہے اور معنی استثناء سے خالی کر دیا
گیا ہے اور اس کی منقول عنہ کی رعایت رکھتے
ہوئے تنوین نہیں دیتے وھو علی ما قیل
حرف وضع للاستثناء والتنزیہ معًا، ثم
نُقل وجعل اسمًا بمعنی التنزیہ وتجرد
عن معنی الاستثناء ولم ینون مراعاۃ
لاصلہ المنقول عنہ (روح)

قال صاحب الکشاف، حاشا، کلمۃ تفید
معنی التنزیہ فی باب الاستثناء (کشاف)
وحاشا کلمۃ یفید معنی التنزیہ (کبیر)

مَا : مَا ھٰذَا بَشَرًا۔ یہ آدمی نہیں ہے
یہ مَا نافیہ مشابہ بلَیْسَ ہے، اگر جملہ اسمیہ پر
داخل ہو تو نجدی، تہامی اور حجازی استعمال میں
لَیْسَ کی طرح اسم کو رفع اور خبر کو نصب
دیتا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے
مَا ھُنَّ اُمَّھٰتِھِمْ وہ ان کی مائیں نہیں ہیں
یہ مَا نکرہ پر بہت کم آتا ہے۔ قرآن مجید میں صرف
معرفہ پر آیا ہے۔ اگر جملہ فعلیہ پر داخل ہوتا ہے
تو لفظوں میں کوئی عمل نہیں کرتا جیسے وَمَا
تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ، تم
تم مال نہیں دیتے مگر محض اللہ کی رضا جوئی
کے لئے۔

خلیل اور سیبویہ کا قول بھی یہ ہے کہ ما بمنزلہ لَیْسَ ہے جیسا کہ تم کہو کہ لَیْسَ زَیْدٌ قَائِمًا۔ وما ھٰذَا بَشَرًا۔ اس کی خبر پر حرف بار بھی داخل کر کے پڑھا جاتا ہے۔ جیسا کہ مَا زَیْدٌ بِمُنْطَلِقٍ، یہاں بار موضعِ نصب میں ہے اور جب بار حذف کر دی جائے تو اس کی خبر منصوب ہوگی جیسے مَا زَیْدٌ قَائِمًا۔ قال صاحب الکشاف واعمال ما، عمل، لیس، ھی اللغۃ القدمی الحجازیۃ وبھا ورد القرآن (کشاف) ما بمنزلۃ لیس، لقولہ لیس زیدٌ قائمًا مَاھٰذَا بَشَرًا (قرطبی)

بَشَرًا: آدمی۔ انسان۔ اصل میں بشرۃ: کھال کی ظاھری سطح کو کہتے ہیں، اور اَدَمَۃٌ باطنی سطح کو۔ انسان کو بشر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی ظاہری کھال بالکل صاف ہوتی ہے بنسبت دوسرے حیوانات کے ان کی کھال بالوں میں چھپی ہوتی ہے۔

لفظ بشر کا استعمال واحد اور جمع دونوں کے لئے برابر ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ بَشَرَیْنِ ہے قرآن میں ہے اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں علامہ راغب فرماتے ہیں کہ مَاھٰذَا بَشَرًا بشریت کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ یوسف علیہ السلام کی عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ تو اس سے بلند و اشرف معلوم ہوتے ہیں کہ انسانی جوہر سے مرکب ہوں۔

حسن اور ابو الحویرث حنفی نے مَاھٰذَا بِشِرًى بار اور شین دونوں کے کسرہ سے پڑھا ہے، ان بزرگوں نے بِشْرًى مصدر کو مفعول بہ کے قائم مقام کیا ہے اور شِرًى بمعنی مَشْرِی ہے ای مَا ھٰذَا بِمَشْرِیٍ، کہ یہ تو زر خرید غلام نہیں ہے، یہ ہی قرأت عبد الوارث نے ابو عمرو سے بھی روایت کی ہے۔ البتہ عبد الوارث کی روایت میں ایک اضافہ یہ بھی ہے کہ ابو عمرو نے مَلَکٌ کی بجائے مَلِکٌ بکسر اللام پڑھا ہے یعنی یہ غلام نہیں بلکہ یہ تو (مستقبل کا) بادشاہ ہے۔ ما ھٰذا بِشِرًى، بکسر الباء والشین ای ما ھٰذا عبدًا مُشْتَرًى۔ فوضع المصدر موضع اسم المفعول کما قال اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ ای مصیدہ[1]

یہ قرأت بھی اگرچہ مقام کے مناسب ہے لیکن قرآن پاک کے رسم الخط کے مخالف ہے۔ اسلئے ترجیح جمہور ہی کی قرأت کو دی گئی ہے۔

اِسْتَعْصَمَ: وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ۔ اِسْتَعْصَمَ بِہٖ

[1] قرطبی۔ روح

بچانے والی چیز کا قصد کرنا، عَصْمٌ سے بنا ہے جس کے معنی روکنے اور بچانے کے ہیں۔ قرآن میں لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں۔ فَاسْتَعْصَمَ (استفعال) اس نے ایسی چیز تلاش کی جو برائی کے ارتکاب سے اس کی حفاظت کرے۔ (راغب)

استعصام لاکر جناب یوسف علیہ السلام کی کمال پاکبازی اور شدتِ احتیاط کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس بندۂ پاک طینت نے اپنی عصمت کی حفاظت کتنی سختی سے کی

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے یہ وقت سخت آزمائش کا تھا۔ شاہی خاندان کی نوجوان عورت شعلۂ حسن سے لالہ رُو، محبوب نہیں بلکہ عاشق، آرائشِ حُسن وزینت کی بے پناہ نمائش، عشوہ طرازیوں کی بارش۔ ادھر یوسف خود نوجوان حسین اور حُسن کی خوبیوں سے آشنا، دروازے بند، رقیب کا خوف، نہ ڈر، مالکہ خود ذمہ دار نگران تمام سازگار حالات نے کیا یوسف کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی عزیزِ مصر کی بیوی کی حوصلہ افزائی کی، کیا اس کے دل نے قرار چھوڑ کر بے قراری اختیار کی۔ کیا نفس نے جہانِ قلب کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی متزلزل کیا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس اُس پیکرِ عصمت، امینِ نبوت، مہبطِ وحیِ الٰہی نے دو ایسے دلکش اور محکم دلائل سے مصری عورت کو سمجھایا جو ایک ایسی ہستی سے ہی ممکن تھے جس کی تربیت براہِ راست آغوشِ الٰہی میں ہوئی ہو۔ فرمایا یہ ناممکن ہے، پناہ بخدا میں اور اس کی نافرمانی کروں جس کا اسم جلالت اللّٰہ ہے (قصص القرآن ص ۲۶۳ ج ۲)

یہ وہی اسم جلالت ہے جس کو جناب یوسفؑ نے اپنے بچاؤ کا سہارا بنایا وسُمّیت العصمة عصمةً لانها تمنع من ارتكاب المعصية[1]

صاحبِ کشاف فرماتے ہیں: الاستعصام، بناء مبالغة يدل على الامتناع البليغ والتحفظ الشديد[2]۔ استعصم: طلب العصمة و تمسك بها (روح)

اَصْبُ: اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، اور نادانوں میں داخل ہو جاؤں گا۔

صَبَا يَصْبُو صَبْوًا وَصَبْوَةً، مائل ہونا، جھک جانا صَبَا فُلَانٌ: کسی کی طرف مائل ہو کر بچوں کی طرح کام کرنے لگا۔ اَصْبَانِیْ فَصَبَوْتُ: اس نے مجھے گرویدہ کیا پس میں گرویدہ ہو گیا۔ مِن صَبَا

---

1. قرطبی 2. کشاف

یصبو اذا مال واشتاق (قرطبی)
من صبا یصبو صُبُوًّا وصَبْوَۃً اذا مال
الی الھوی (روح) اِسی سے مخصوص سمت
سے چلنے والی پُروا، ہوا کو صبا کہا جاتا ہے۔
کیونکہ اس کی ٹھنڈک اور نرم رفتاری کی وجہ
سے نفوس اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔
الصبوۃ، المیل الی الھوی ومنھا الصبا۔
لان النفوس تصبو الیھا لطیب نسیمھا و
روحھا (کشاف) صبا فلان یصبو صبوًا و
صبوۃً اذا نزع واشتاق وفعل فِعل الصبیان[1]

فَتَیٰنِ : دو نوجوان۔ یہ فتی کا تثنیہ ہے
جس کے معنی ہیں نوجوان۔ جمع فتیۃٌ مؤنث
فتاۃ، جمع فتیات۔ وقال لفتیانہ (یوسف)
اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَھْفِ۔ وَلَا تُکْرِھُوْا
فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَاءِ۔
فَتَیٰنِ، تثنیۃ فتی وھو من ذوات الیاء[2]

اَعْصِرُ : اَعْصِرُ خَمْرًا۔ میں شراب نچوڑ
رہا ہوں۔ اَعْصِرُ، عَصَرْتُ الشَّیْءَ سے واحد
متکلم کا صیغہ ہے، کسی چیز کو نچوڑنا، جوس نکالنا
العصر: مصدر، بمعنی نچوڑنا۔ معصور: وہ چیز
جو نچوڑا گیا ہو وہ شیرہ جو نچوڑ کر نکالا جاتا ہے
اسے عُصَارَۃٌ کہتے ہیں (مزید تحقیق العصر میں
دیکھئے)

خُبْزًا : اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا
میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں
الخُبْزُ: روٹی۔ خَبَزَ الخُبْزَ، روٹی پکانا۔
خَبَّازٌ : روٹی پکانے والا، نانبائی۔
نان فروش۔ اِخْتِبَازٌ : روٹی بنانا۔ اِخْتَبَزَ:
روٹی بنانے کا حکم دینا۔ خُبْزَۃٌ واحدۃٌ: ایک ٹکیہ
حدیث میں ہے کُنَّا نَاْتِی انس بن
مالک وخبازہ قائم (بخاری)
خبز القوم و تمرھم۔ لوگوں کو روٹی
بھی کھلائی اور خرما بھی۔

نَاجٍ : وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّہٗ نَاجٍ
مِّنْھُمَا اذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّکَ۔ اور ان
دونوں میں سے جس شخص کے متعلق رہائی کا یقین
تھا اس سے کہا کہ میرا ذکر اپنے آقا کے سامنے کرنا
یہاں لفظ ظَنَّ اکثر مفسرین کے نزدیک
اَیْقَنَ کے معنی میں ہے۔ چونکہ یہ تعبیر خدا کی طرف
سے وحی پا کر دی گئی تھی (قرطبی)
نَاجٍ اسم فاعل واحد مذکر، نجات پانے والا،
نجات، مصدر، نَجَا یَنْجُو نَجَاۃً و نَجَاءَۃً و نَجْوًا
نَجَا مِنْ کَذَا ؛ خلاصی پانا، نجات پانا۔ مَنْجَاۃٌ
نجاتی، نجات کا ذریعہ، جمع مَنَاجٍ،
اصل میں نَجَاۃٌ کے معنی کسی چیز سے جدا ہونے
اور الگ ہونے کے ہیں۔ محاورہ ہے نَجَا

[1] راغب [2] قرطبی

فلانٌ عن فلان۔ فلاں نے فلاں سے نجات پائی وہ اس سے الگ ہوگیا

اصل الخلاء الانفصال من الشئ (راغب)

بِضْعَ : فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ تو وہ جیل خانہ میں کئی سال تک رہے۔

البِضْعُ : بکسر الباء عدد جو دس سے الگ کرلیا گیا ہو۔ یہ لفظ تین سے نو تک بولا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک اس کا اطلاق ۵ سے اوپر اور دس سے نیچے تک ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں یہ لفظ مفرد دو مرتبہ وارد ہوا ہے ایک اسی جگہ اور دوسری مرتبہ سورہ روم میں۔ دونوں جگہ چند سال مراد ہیں جو دس سے کم ہیں۔

قال الزجاج اشتقاقه من بَضَعْتُ بمعنی قَطَعْتُ ومعناه القطعة من العدد (کبیر) البضع قطعة من الدهر وقال الهروی، العرب تستعمل البضع فیما بین الثلاث الی التسع والبضع والبضعة واحدٌ (قرطبی)

یہ لفظ تین سے لیکر نو تک صادق آتا ہے (معارف)

سِمَانٌ : وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّيْ أَرٰى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَّأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ اور بادشاہ نے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی گائے ہیں انہیں سات دبلی گائے کھائے چلی جاتی ہیں۔

سِمَانٌ : یہ سَمِنَ يَسْمَنُ سِمَنًا سے ماخوذ ہے جس کے معنی موٹاپے کے ہیں اور هُزَالٌ کی ضد ہے۔ سَمِيْنٌ فعیل کے وزن پر صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے بمعنی فربہ، موٹا۔ سِمَانٌ اسی کی جمع ہے۔ سَمْنٌ: گھی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ جسم میں موٹاپا پیدا کرتا ہے۔

أَسْمَنْتُهٗ (افعال) وسَمَّنْتُهٗ (تفعیل) کے معنی موٹا کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے: لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ۔ نہ وہ (طعام ضریع) فربہ کریگا اور نہ بھوک دفع کریگا۔

رجالٌ سِمَانٌ : موٹے آدمی۔ صاحب جمل فرماتے ہیں کہ سمان، بقرات کی صفت ہے اور یہ سَمِيْنَةٌ کی جمع ہے اور سَمِيْنٌ کی جمع بھی اسی وزن پر آتی ہے۔ رَوْضٌ سَمِيْنَةٌ وہ زمین جس میں پتھر نہ ہوں۔

قال صاحب الروح المعانی، سمان، ممتلئاً لحماً وشحماً من سَمِنَ كسَمِعَ سمانةً بالفتح وسِمَنًا كعِنَبًا فهو سامنٌ وسَمِيْنٌ۔ وذكر ان سمينًا وسمينةً تجمع على سمان فهو ككرام جمع كريم وكريمة، يقال رجال كرامٌ ونسوةٌ كرام (روح)

عِجَافٌ : اَعْجَفُ یہ صفت کا صیغہ ہے بمعنی انتہائی لاغر و کمزور اور دُبلا۔ اس کی مؤنث عجفاءُ آتی ہے اور جمع عِجَافٌ ہے۔ یہ اصل میں نَصْلٌ اعجفُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پتلے اور باریک تیر کے ہیں۔ اور اَعْجَفَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں اس کے مویشی دُبلے ہو گئے عَجَفَتْ نفسی عن الطَّعَام : میری طبیعت کھانے سے اُچاٹ ہو گئی (راغب)

حتّٰی اذا اَعْجَفَهَا رَدَّهَا فیه (ابوداؤد)

جب اس کو دُبلا کر دیا تو اسمیں پھیر دیا

علامہ فخر الدین رازیؒ لیث کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ عَجَفٌ کے معنی چربی کے جاتے رہنے کے ہیں اور یہ عَجِفَ یَعجَفُ (س) سے آتا ہے۔ مذکر کی صفت اعجفُ اور مؤنث کی عجفاء ہے۔ دونوں کی جمع عِجَافٌ ہے۔ عربی زبان میں سوائے اعجف اور عجفاء کے کوئی جمع فعال کے وزن پر نہیں آتی اور عِجَافٌ عواجف کی جمع شاذ ہے جس کو لفظ سِمَانٌ پر حمل کر کے عِجَافٌ بولتے ہیں چونکہ یہ باہم نقیضین ہیں۔ اور یہ عرب کی عادت ہے کہ وہ ایک نظیر کو دوسری نظیر اور ایک نقیض کو دوسری نقیض پر حمل کرتے ہیں۔ { کبیر طبع طہران جدید صـ۱۴۷ ج ۱۸ کشاف صـ۳۲۳ ج ۲ }

یہاں یہ مؤنث عجفاء کی جمع ہے جو خلافِ قیاس ہے۔ قاعدہ کے لحاظ سے اس کی جمع عُجْفٌ ہونی چاہیے جیسے حمراء کی جمع حُمْرٌ۔ چونکہ فَعْلَاءُ اور اَفْعَلُ کی جمع فِعَال کے وزن پر نہیں آتی (روح) یہ سَمُعَ اور کَرُمَ دونوں ابواب سے آتا ہے۔ من عَجُفَ یَعجُفُ، علی وزن عَظُمَ یَعظُمُ وروی عَجِفَ یَعجَفُ علی وزن حَمِدَ یَحمَدُ (قرطبی)

والعجاف التی قد بلغت فی الھزال الغایة (زاد المسیر من زجاج)

والعِجَافُ، جمع عَجْفاء وقیاس جمعه عُجْفٌ لان فَعْلَاءُ وافعل لا تجمعان علی فِعَال عِجَافٌ جمع عَجْفَاءُ (جلالین)[1]

خُضْرٍ : وَسَبْعَ سُنْبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ط

خُضْرٌ یہ اَخْضَرُ اور خَضْرَاءُ کی جمع ہے۔ الخُضْرَةُ یہ ایک قسم کا رنگ ہے جو سفیدی اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے مگر سیاہی غالب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اَسْوَد اور اَخْضَر کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ (راغب)

خَضِرٌ، سرسبز و شاداب۔ مؤنث خَضِرَةٌ، جمع خَضِرَات۔ حدیث میں ہے ان ھٰذا المال

[1] فتح القدیر

خضر حلوۃٌ یہ مال شیریں اور ہرا بھرا ہے (بخاری)
ان الدُّنیا حلوۃٌ خَضِرَۃٌ: یہ دنیا شیریں اور ہری بھری ہے (ترمذی، فتن)

اَخْضَر صیغۂ صفت مذکر، خَضْرَاءُ مؤنث، جمع خُضْرٌ و خَضْرَاوَاتٌ۔ اَخْضَرُ: صیغۂ صفت مذکر، خَضْرَاءُ مؤنث، جمع خُضْر و خُضْرَاوَات

یٰبِسٰتٍ: اسم فاعل جمع مؤنث اس کی واحد یَابِسَۃ آتی ہے۔ یَبِسَ الشَّیُٔ کے معنی کسی چیز کے خشک ہو جانے کے ہیں اور تر گھاس جب خشک ہو جائے تو یَبَسٌ (بفتح الباء) کہتے ہیں قرآن میں ہے فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا تو ان کے لئے دریا میں لاٹھی مار کر خشک راستہ بنا دو (راغب)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قبروں پر درخت کی دو سبز شاخیں نصب کرنے کے بعد فرمایا:
لعله ان یخفف عنھما مالم ییبسا۔ شاید جب تک یہ ڈالیاں نہ سوکھیں ان کا عذاب ہلکا ہو

اَرضٌ یَابِسۃٌ خشک زمین، بے آب وگیاہ۔ یَبِسَ مَا بَیْنَھُمَا اُن دونوں کے آپس کے تعلقات ٹوٹ گئے۔ رجلٌ یابسٌ بے خبر آدمی۔ الیبُوسَۃُ خشکی۔ اسم فاعل یابسٌ، جمع یُبَّسٌ۔

تَعْبُرُوْنَ: اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ۔ تعبیر کہو مجھ سے میرے خواب کی اگر ہو تم خواب کی تعبیر دینے والے (ترجمہ معارف)

تعبیر کے معنی ہیں خواب کا انجام بتانا اور تَعْبُرُوْنَ عَبْرٌ سے مشتق ہے جس کے اصل معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پہنچ جانا۔ گویا تاویل بتانے والا خواب کے ظاہر سے باطن تک پہنچ جاتا ہے اور صورتِ خیالیہ سے معانی نفسانیہ تک پہنچ جاتا ہے وھی الانتقال من الصورۃ الخیالیۃ الی المعانی النفسانیۃ التی ھی مثالھا (جمل)

العُبُورُ کا لفظ نہر کے عبور کرنے پر استعمال ہوتا ہے، عَبْرُ النَّھْرِ کے معنی نہر کے اس کنارے کے ہیں جہاں سے پانی میں اتر کر اس کو عبور کیا جائے یا دوسری جانب سے عبور کر کے وہاں ہوا جاتا ہے[1]

امام رازی فرماتے ہیں کہ ازہری کی روایت ہے کہ یہ عَبْرٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں نہر کا کنارہ اور عبرتُ النَّھْرَ کے معنی ہیں میں نہر کے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ خواب کی تعبیر دینے والے کو عَابِرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ خواب کے ظاہر اور باطن دونوں کناروں پر غور کر کے باطنی کنارہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی سے عبارۃٌ ہے اس کلام کو کہتے ہیں جو متکلم کے منہ سے فاصلہ عبور کر کے سامع کے کان تک پہنچ جائے۔ تَعْبُرُوْنَ، ای تعلمون عبارۃ الرؤیا۔ واصل العبارۃ مشتقۃ من

[1] راغب

عبورالنھر (فتح) حدیث میں ہے رأیتُ
النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب وعلیٌّ یُعبِّرُ
عنہ ۔ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ
دے رہے تھے اور حضرت علیؓ آپؐ کا کلام دوسروں
کو پہنچا رہے تھے جو دور ہونے کی وجہ سے
نہیں سن رہے تھے
ومعنی عبرتُ الرؤیا وعبّرتُھا أخبرتُھا بآخر ما یؤول
الیہ امرھا واشتقاقہ من عَبَرَ النھر وھو شاطئ
النھر، ذکرتُ عاقبتھا وآخر امرھا۔ وقال صاحب
الکشاف وحقیقۃ عَبَرْتُ الرؤیا ذکرتُ عاقبتھا و
آخر امرِھا۔ تعبیرِ خواب کی حقیقت اس کے انجام کو بیان کرنا ہے

اَضْغَاثٌ : قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ

بولے یہ خیالی خواب ہیں۔ اَضْغَاثٌ، یہ
ضِغْثٌ کی جمع ہے جو ایسی گٹھڑی کو کہا جاتا ہے
جس میں مختلف قسم کے خس وخاشاک، گھاس
پھوس جمع ہوں، معنی یہ تھے کہ یہ خواب کچھ ملی جلی
سی ہے جس میں خیالات وغیرہ شامل ہیں اور ہم
ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔ (معارف)
ضِغْثٌ اصل میں خشک گھاس یا شاخوں کو کہتے
ہیں جو انسان کی مٹھی میں آجائیں ۔ خُذْ بِیَدِکَ
ضِغْثًا اپنے ہاتھ میں مٹھی بھر کر گھاس لو،
حدیث میں ہے فاخذتُ سلاحھم فجعلتُہ
ضِغْثًا (مسلم، جہاد) سلمہ بن اکوع کہتے ہیں
کہ میں نے ان ڈاکوؤں کے ہتھیار لے کر ان کا
ایک گٹھا بنایا۔
واصل الاضغاث ماجمع من اخلاط النبات
وحزم (کشاف)

اَحْلَامٌ : یہ حُلُمٌ کی جمع ہے جس کے معنی
خواب کے ہیں۔ حَلَمَ یَحْلُمُ (ن) حُلْمًا، حَلَمَ فی نومہ
خواب دیکھنا۔ کہتے ہیں حَلَمَہٗ، وحَلَمَ بہٖ: اس نے
اس کو خواب میں دیکھا۔
الاَحْلَامُ جمع حُلْم والحُلُمُ (بالضم) ما یراہ
النائم (قرطبی)
حِلْمٌ (بکسر الحاء) کے معنی متانت اور بردباری
کے ہیں اور حلیم صیغہ صفت، بردبار متحمل مزاج
جو غیظ وغضب میں بھڑک نہ اٹھے اور چونکہ حلم
اور بردباری عقل کی وجہ سے ہوتی ہے اس لئے
حلم کے معنی عقل کے بھی کئے گئے ہیں۔ اس کی جمع
بھی اَحْلَامٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے اَمْ تَاْمُرُھُمْ
اَحْلَامُھُمْ۔ کیا ان کی عقلیں ان کو سکھاتی
ہیں۔ علامہ شوکانی لکھتے ہیں احلام ان جھوٹے
خوابوں کو کہا جاتا ہے جن کی کوئی حقیقت نہ ہو۔
والاحلام جمع حُلُم وھو الرؤیا الکاذبۃ
التی لاحقیقۃ لھا (فتح) اور آیت کریمہ وَمَا
نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ سے اس کی
تائید ہوتی ہے

اِدَّکَرَ : وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ۔

اِدَّکَرَ باب افتعال سے ہے۔ اصل میں اِذْتَکَرَ تھا، فائے انتعال، ذال ہونے کے باعث تا کو دال سے بدلا اور ذال کو دال سے بدل کر دال میں ادغام کر دیا (علم الصیغہ)

اِدَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ : اس کو ایک مدت کے بعد یاد آگیا۔ اِدِّکَارٌ، مصدر جو اصل میں اِذْتِکَارٌ ہے دال اور تا اگرچہ قریب المخرج ہیں مگر چونکہ ان کی صفات جدا جدا ہیں اسلئے ایک دوسرے میں ادغام درست نہیں ہے۔ چونکہ دال مجہورہ ہے اور تا مہموسہ ہے لہٰذا تا کو دال سے بدل دیا گیا تو صیغہ اِذْدَکَرَ ہوگیا۔ بعد میں ذال کو دال میں مدغم کر دیا گیا اِدَّکَرَ ہوگیا (قرطبی)

اُمَّۃٍ : لفظ اُمّۃ معنی کے اعتبار سے جمع اور باعتبار لفظ کے واحد ہے۔ نیز لفظ امّۃ کا اطلاق جس طرح جنس انسانی پر ہوتا ہے اسی طرح حیوانات کی ہر جنس پر اُمّۃ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں وَمَا دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طَآئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ علامہ شوکانی نے اپنی تفسیر میں ابن درستویہ کا قول نقل کیا ہے کہ امّت کے معنی جہاں بھی مدت کے ہوں گے وہاں اس کا مضاف محذوف ہوگا اور مضاف الیہ مضاف کا قائم مقام سمجھا جائیگا۔ اس لحاظ سے آیت کریمہ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ اور آیت وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ کی تقدیر یہ ہوگی اِلٰی زَمَنٍ اُمَّۃٍ مَّعْدُوْدَۃٍ۔ اور بَعْدَ حِیْنِ اُمَّۃٍ۔ گویا یہاں دونوں جگہ مضاف محذوف ہے جو زَمَنٌ اور دوسری جگہ حِیْنٌ ہے۔ وَالْاُمَّۃُ لَا تَکُوْنُ عَلَی الْحِیْنِ اِلَّا علی حذف مضاف واقامۃ المضاف الیہ مقامہ وقال الاخفش: ھو فی اللفظ واحد وفی المعنی جمع، وکل جنس من الحیوان اُمَّۃٌ

(فتح القدیر ص ۳۱/۳ طبع مصر)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی ایک معروف قرأت وَادَّکَرَ بَعْدَ اَمَہٍ ہے جس کے معنی بھول لینے کے ہیں۔ یعنی اس کو بھول لینے کے بعد یاد آیا۔ ایک شاعر کہتا ہے

اَمِھْتُ وَکُنْتُ لا انسٰی حدیثاً
کذاک الدھرُ یودی بالعقول

اور بعض حضرات نے بعد اَمْہٍ (بفتح الالف واسکان المیم) پڑھا ہے۔ ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ کہتے ہیں اَمِہَ (س) یَأْمَہُ اَمْھًا اِذَا نَسِیَ۔ رجلٌ اَمِہٌ ای ذاھب العقل، یعنی عقل کا اندھا۔ اشہب عُقَیلی نے بَعْدَ اِمَّہٍ پڑھا ہے جس کے معنی نعمت کے ہیں اور مراد اس

نجات کی نعمت سے ہے۔ یعنی ساقی نے یوسف کو نجات اور رہائی کے بعد یاد کیا (ماخوذ از قرطبی)

تَزْرَعُوْنَ : تَزْرَعُوْنَ دَأَبًا۔

تَزْرَعُوْنَ : تم کاشت کرو گے۔ زَرَعَ یَزْرَعُ زَرْعًا سے جمع مضارع کا صیغہ ہے زَرْعٌ کے اصل معنی اُگانے کے ہیں اور خالص اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، انسان کے کسب و ہنر کو اس میں دخل نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ میں ہے اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ۔ اس میں حرث یعنی بونے کی نسبت انسان کی طرف ہے مگر زرع کی نسبت انسان سے منفی کرکے خود حق تعالیٰ نے اپنی ذاتِ شریف کی طرف کی ہے مگر چونکہ ظاہراً اسباب انسان بھی مہیا کرتا ہے اس لئے مجازاً زَرْعٌ کی نسبت انسان کی طرف بھی ہوتی ہے (راغب)

دَأْبًا : دَأَبًا : الدَّأْب کے معنی مسلسل چلنے کے ہیں۔ دَأَبَ فِی السَّیْرِ دَأْبًا وہ مسلسل چلا، قرآن میں ہے وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا کہ وہ دونوں قانون کے تحت مسلسل چل رہے ہیں اور اس عادتِ مستمرہ کو بھی دأب کہتے ہیں جو ہمیشہ ایک حالت پر رہے قال اھل اللغۃ: الدأبُ استمرار الشیٔ علی حالۃ واحدۃٍ (کبیر)

الدَّأْبُ ادامۃُ السَّیرِ۔ والدأب العادۃ المستمرۃ دائمًا علی حالۃٍ (راغب)

دَأَبًا۔ یہاں مصدر ہے لیکن اپنے فعل سے نہیں ہے بلکہ تَزْرَعُوْنَ سے ہے۔ کیونکہ تَزْرَعُوْنَ، تَدْاَبُوْنَ کے معنی میں ہے، وھو مصدر علی غیر المصدر لان معنی تَزْرَعُوْنَ، تَدْاَبُوْنَ[1]

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ دَأْبٌ کے اصل معنی عادۃٌ کے ہیں جیسا کہ امرأ القیس کا شعر ہے

کدأبك من أُمّ الحویرث قبلها
وجارتها أُمّ الرباب بمأسلِ

ترجمہ: تیرا حال عنیزہ کے ساتھ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اس سے پہلے ام الحویرث اور اس کی پڑوسن ام الرباب کے ساتھ مقام مَأسَلْ میں تھا۔ وَاَصْلُہٗ العَادَۃُ (قرطبی)

عَامٌ : ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ

پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں خوب بارش ہو گی اور لوگ اس میں (انگور سے شراب) نچوڑیں گے۔

العام، اور السَّنَۃ کا لفظ ایک معنی میں آتا ہے البتہ ان کے استعمال میں فرق ہے کہ السَّنَۃ کا لفظ اس سال پر بولتے ہیں جو تکلیف یا

[1] قرطبی

خشک سالی ہو اُس کی جمع سنینٌ آتی ہے
قرآن پاک میں ہے وَلَقَدْ اَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ
بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ۔ اور ہم نے فرعون والوں کو
قحط سالی اور پھلوں کی پیداوار کی کمی میں پکڑا
تاکہ وہ تنبیہ حاصل کریں (ماجدی) اور "عام"
اُس سال کو کہتے ہیں جس میں خوش حالی ہو اور
لوگوں کے مال و دولت میں وسعت اور فراوانی
ہو۔ عَوْمٌ کے معنی پانی میں تیرنے کے بھی آتے
ہیں۔ چنانچہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سال کو
عام اس لئے کہتے ہیں کہ اس مدت میں سورج
تمام بُرجوں میں تیر لیتا ہے۔ اور وَكُلٌّ فِيْ
فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ میں لفظ يَسْبَحُوْنَ سے اس
توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔ (راغب)
اور سورہ عنکبوت کی آیت کریمہ میں ہے
فَلَبِثَ فِيْ قَوْمِهٖ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا
خَمْسِيْنَ عَامًا، پھر وہ اپنی قوم میں پچاس
کم ہزار برس تک رہا۔
امام راغب فرماتے ہیں یہاں ایک لطیف
نکتہ ہے جس کو ہم ان شاء اللہ اس کے
علاوہ کسی دوسری کتاب میں لکھیں گے۔
وہ نکتہ کیا ہے، علامہ موصوف نے اس کی توضیح نہیں
کی۔ البتہ علامہ آلوسی بغدادی متوفی ۱۲۷۰ھ

نے روح المعانی میں اس کا ذکر صراحۃً کیا ہے
فرماتے ہیں کہ اول میں لفظ سَنَة کو اختیار
فرمانے میں یہ نکتہ ہے کہ سَنَة کا استعمال برخلاف
لفظ عام کے سختی اور قحط سالی کے سلسلہ میں
ہوتا ہے، لہذا اس زمانہ میں دعوت کے لئے
جس میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی
قوم کے ہاتھوں وہ مصیبتیں جھیلیں کہ بیان سے
باہر ہیں، تو اس زمانہ کے لئے لفظ سَنَة ہی
بہتر رہیگا۔

قال صاحب الروح: والنكتة فى اختيار
السَّنَة اولاً أنها تُطلق على الشدة والجدب
بخلاف العام، فناسب اختيار السَّنَة
بزمان الدعوة الذى قاسى عليه السلام
فيه ما قاسى من قومه (روح ص۱۲۳ ج ۱۱)
ثم انه خص لفظ العام بالخمسين ايذاناً
بان نبى الله صلى الله عليه وسلم لمّا
استراح منهم بقى فى زمنٍ حسنٍ،
والعرب تعبر عن الخصب بالعام وعن
الجدب بالسَّنة۔ (جمل ص۳۸۰ ج ۳)
میرے استاذ مولانا عبدالرشید نعمانی دامت
برکاتہم، علامہ احمد فیومی کے حوالہ سے لکھتے
ہیں کہ عَامٌ فَعَلٌ بفتحتین کے وزن پر عَوَمٌ
تھا اسی لئے اس کی جمع اعوام آتی ہے، جیسے

سبب کی جمع اسباب ہے۔ اجوف کا قاعدہ ہے کہ جو واو، یاء متحرک ہو اور اس کا ماقبل مفتوح ہو وہ الف سے بدل جاتا ہے، اسی قاعدہ کے مطابق یہاں بھی عَوِمٌ کا واو الف سے تبدیل ہو کر عَامٌ ہو گیا ہے۔

سَنَةٌ: سال، برس۔ اس کی جمع سِنُوْن سَنَهَات اور سَنَوَاتٌ آتی ہے۔ سَنَةٌ کی اصل سَنْهَةٌ تھی جَبْهَةٌ کی طرح۔ اس کا لام کلمہ حذف کر کے اس کی حرکت نون کی طرف نقل کر دی گئی تو سَنَةٌ باقی رہ گیا۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل سَنْوَةٌ (واو کے ساتھ) پہلی صورت میں جس طرح ھاء کو حذف کیا گیا ہے دوسری میں واو کو حذف کر دیا گیا ہے

یُغَاثُ: فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ

یُغَاثُ، غَیْثٌ سے بھی ہو سکتا ہے اور غَوْثٌ سے بھی ہو سکتا ہے ...... اگر غَیْثٌ سے ہے تو یُغَاثُ کا الف یاء سے بدلا ہے اور غَوْثٌ سے ہو تو الف واو سے بنا ہے پہلی صورت میں یُغَاثُ اجوف یائی اور دوسری میں اجوف واوی ہوگا۔ غَیْثٌ مصدر ہے بارش کے لئے بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں غَاثَ اللّٰہُ الْبِلَادَ یَغِیْثُهَا غَیْثًا، اللہ نے شہروں پر بارش نازل فرمائی اور غَوْثٌ کے معنی مدد اور نصرت کے ہیں

امام راغب فرماتے ہیں کہ غَوْثٌ کے معنی مدد اور غیث کے معنی بارش کے ہیں۔ اِسْتَغَثْتُهُ، (استفعال) کے معنی کسی کو مدد کے لئے پکارنے یا اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے ہیں۔ مادہ غوثٌ اور غَیْثٌ کو جب استفعال میں لیجائیں تو دونوں کی ظاہری شکل وصورت ایک سی ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کے استعمال میں فرق یہ ہوگا کہ جب اس کے معنی مدد کے ہوں گے تو اس کا مطاوع اَغَاثَنِیْ آئیگا۔ اِسْتَغَثْتُهُ فَاَغَاثَنِیْ میں نے اس کو مدد کے لئے پکارا پس اس نے میری مدد کی۔ مگر جب اس کے معنی بارش طلب کرنے کے ہوں تو اس کا مطاوع غَاثَنِیْ (ض) آتا ہے اور غَوْثٌ غَوْثٌ بمعنی مدد کرنے سے ماخوذ ہے۔ اگر یُغَاثُ بمعنی مدد کے ہو تو یہ اَغَاثَ باب افعال سے مجہول کا صیغہ ہوگا۔ غَوَّثَ الرَّجُلُ مدد کے لئے پکارنا۔ واغوثاہ، کہنا۔ غَوْثٌ غُوَاثٌ وغَوَاثٌ اسم ہیں۔ کہتے ہیں اِسْتَغَاثَنِیْ فُلَانٌ فَاَغَثْتُهُ فلاں نے مجھ سے مدد چاہی پس میں نے اس کی مدد کی۔

الغِیَاثُ اسم ہے واو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یاء سے تبدیل ہو گئی ہے۔ اور اگر یُغَاثُ بمعنی بارش کے ہو تو یہ غَاثَ یَغِیْثُ غَیْثًا سے ہوگا۔ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ، کے معنی ہوں گے

فِیہِ یُغَاثُ النَّاسُ۔ ارضٌ مُغیثۃٌ ومَغیُوثۃٌ۔ بارش سے سیراب ہونے والی زمین۔ بارانی زمین۔ وَھُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰہَ وَیْلَکَ اٰمِنْ۔ وہ دونوں اللہ سے فریاد کر رہے تھے کہ تو ہلاک ہو ایمان لا۔ یہ اجوف واوی ہے قرآن پاک کی آیت کریمہ وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ کَالْمُھْلِ (کہف ۲۹) میں یَسْتَغِیْثُوْا میں دونوں احتمال ہیں غَوْثٌ بمعنی مدد مانگنے سے بھی ہو سکتا ہے اور غوث بمعنی پانی مانگنے سے بھی۔ اسی طرح یُغَاثُوْا میں بھی دونوں معنی محتمل ہیں۔ حدیث میں ہے اَللّٰھُمَّ اَغِثْنَا: یا اللہ ہماری مدد فرما۔ یہ اِغَاثَۃ بمعنی مدد سے ہے اور فَادْعُ اللّٰہَ یَغِیْثَنَا، اللہ سے دعا فرمائیے کہ وہ ہمارے لیے پانی برسائے۔ یہ غَاثَ یَغِیثُ سے نکلا غَیثٌ: شہد کی مکھی کو بھی کہتے ہیں۔ اسلئے کہ یہ پھولوں اور سبزیوں کو تلاش کرتی ہے گویا بارش کی تلاش میں ہے کیونکہ سبزی پھول وغیرہ بارش ہی کے آثار ہیں۔ بَرَاغِیث۔ مچھر پسوں جو بارش کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

یَغُوْثٌ: بُت جس کو بارش کا دیوتا مشرکوں نے مانا ہے۔ (دیکھئے سورۃ نوح)

قال صاحب الکشاف، یُغَاثُ النَّاسُ من الغوث او من الغیث۔ یُقال غِیثَتِ البلادُ۔ اِذا مُطِرَتْ ومنہ قول الاعرابیۃ غِثْنَا مَا شِئْنَا (کشاف)

وقال الراغب الغوثُ یقال فی النُّصرۃ والغیثُ فی المطر واستَغَثْتُہ طلبتُ الغوثَ والغیثَ فاغاثنی من الغوث وغاثنی من الغَیْث (راغب)

یُغاثُ من الاغاثۃ اوالغوث (قرطبی)

والغوث: الفرج وزوال الھمّ والکرب وعلٰی ھٰذا یکون فعلہ رُباعیًا یُقال استغاث اللہ فاَغَاثَہُ ای انقذہ من الکرب الذی ھو فیہ کالقحط (جل)

والغیث: المطر فمعنی یُغَاثُ النَّاسُ یُمْطَرُوْنَ (قرطبی)

یَعْصِرُوْنَ : وَفِیْہِ یَعْصِرُوْنَ۔ اس کے معنی اَعْصِرُ خَمْرًا کے تحت گزر چکے ہیں۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک یَعْصِرُوْنَ، عُصْرَۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی پناہ گاہ کے ہیں۔ اعتصَرْتُ بفلان وتَعَصَّرْتُ (تفعیل) کے معنی ہیں، میں نے اس کی طرف سہارا لیا، اس سے پناہ لی۔ وقیل یَعْصِرُوْنَ: ای ینجون وھو من العُصْرۃ وھی المنجاۃُ۔ قال ابوعبیدۃ

والعصَرُ بالتحريك ، الملجأ والمنجاة ، وكذلك العُصْرَة (قرطبی)

بَالُ : مَابَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِی قَطَّعْنَ اَیْدِیَھُنَّ۔ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کئے تھے۔

البال : اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جس کی فکر یا پرواہ کی جائے اور یہ مَابَالَیْتُ بِکَذَا بَالَۃً ، کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پرواہ نہ کرنے کے ہیں، قرآن پاک میں ہے کَفَّرَ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَاَصْلَحَ بَالَھُمْ ان سے ان کے گناہ دور کر دیئے اور ان کی حالت کو سنوار دیا، اسی طرح فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی تو پہلی جماعتوں (قوموں) کا کیا حال ہوا۔ انسان کے دل اور دل میں گزرنے والے خیالات کو بھی بال کہا جاتا ہے محاورہ ہے خَطَرَ بِبَالِیْ کَذَا ، میرے دل میں یہ بات کھٹکی (راغب)

بَالُ النِّسْوَۃِ ای حال النسوۃ (قرطبی)

خَطْبٌ : مَا خَطْبُکُنَّ تمہارا کیا واقعہ ہے خطبٌ : وہ معاملہ جس کے متعلق لوگوں میں کثرت سے بات چیت ہو۔ خَطْبٌ مضاف اور کُنَّ ضمیر جمع مؤنث حاضر مضاف الیہ ہے۔ نکاح کی بات چیت کو خِطْبَۃ کہتے ہیں۔ اور وہ کلام جو وعظ و نصیحت کے طور پر خُطْبَۃ کہلاتا ہے۔

فَصْلَ الْخِطَابِ : وہ کلام جس سے نزاع ختم ہو جائے کہتے ہیں ھٰذَا خَطْبٌ جَلِیْلٌ ، یہ بڑا اہم معاملہ ہے والخطب الامر والشأن الذی فیہ خطر (جمل) وھو فی الاصل مصدر خَطَبَ یَخْطُبُ وانما یُخْطَب فی الامور العظام (جمل)

لفظ خَطْبٌ عام طور پر اُن اہم معاملات پر بولا جاتا ہے جو ناپسندیدہ ہوں

مَا خَطْبُکُنَّ : ماشأنکن (کشاف۔ قرطبی)

والخطبُ الشأن العظیم الذی یحق لہ ان یخاطب فیہ صاحبہ خاصۃ۔

(فتح القدیر للشوکانی)

حَصْحَصَ : اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ حَصْحَصَ الْحَقُّ کے معنی ہیں کہ حق بات جو کسی دباؤ کی وجہ سے چھپی ہوئی تھی، اب اس دباؤ کے دور ہونے کی وجہ سے واضح ہو کر سامنے آگئی اور حَصَّ اور حَصْحَصَ ثلاثی و رباعی دونوں طرح بولا جاتا ہے جیسے کَبَّ وکَبْکَبَ اور کَفَّ وکَفْکَفَ۔ اور الحِصَّۃ کے معنی کل میں سے ایک ٹکڑے کے ہیں اور بمعنی نصیب استعمال ہوتا ہے۔ (راغب)

حَصْحَصَ یہ حَصْحَصَۃٌ سے ہے جس کے معنی ظاہر اور ہویدا ہونے کے ہے۔ امام قرطبی لکھتے ہیں:

مادہ مجرد اس کا حَصَّ ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کا استیصال کر دینا۔ اکھاڑ دینا۔ ابوالقیس بن الاَسْلَتْ کا شعر ہے

قد حصّتِ البیضۃ راسی فما
اَطعَمَ نومًا غیر تہجاع

یعنی مسلسل خود پہنے رکھنے کی وجہ سے میرے سر کے بال جھڑ گئے۔

سَنَۃٌ حَصَّاءُ: وہ سال جن میں روئیدگی کم ہو یا بالکل نہ ہو۔ حَصَّ شعرہ بال کو بالکل جڑ سے کاٹ دیا۔ و اصل الحصّ استیصال الشیٔ۔

اور سَنَۃٌ حَصَّاءُ ای جَرداءُ لا خیر فیہا۔ (قرطبی)

بعض حضرات نے کہا ہے کہ حَصْحَصَ حِصَّۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی حصہ اور نصیب کے ہیں۔ اور مطلب یہ کہ حصۂ حق اور حصۂ باطل سے جدا ہو گیا بانت حصّۃُ الحق من حِصّۃِ الباطل (جلالین)

قال اھل اللغۃ: حَصْحَصَ الحقُّ معناہ وَضَحَ وانکشف و تمکّن فی القلوب والنفوس من قولھم حَصْحَصَ البعیرُ فی بروکہ۔ اذا تمکّن و استقر فی الارض۔ قال الزجاج: اشتقاقہ فی اللغۃ من الحصّۃ، ای بانت حصّۃ الحق من حصّۃ الباطل۔ (کبیر)

اَمَّارَۃ: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ

اَمَّارَۃٌ یہ اَمْرٌ سے فَعَّالَۃٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بڑا حکم کرنے والا۔ لَاَمَّارَۃٌ: لکثیرۃ الامر (روح)

مَکِیْنٌ: اِنَّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِیْنٌ اَمِیْنٌ۔

مَکِیْنٌ، کَوْنٌ سے صفتِ مشبّہ کا صیغہ ہے، عزت اور مرتبہ والا (لغات القرآن)

مَکِیْنٌ ذا مَکَانَۃٍ (ابن کثیر)

محاورہ ہے فُلَانٌ مکینٌ عِندَ فُلَانٍ فلاں شخص فلاں کے نزدیک عزت و مرتبہ والا ہے۔ مکانۃ: مکان۔ جگہ مرتبہ جمع مکانات۔

اَمِیْن: ذا اَمَانَۃٍ (ابن کثیر)

امانت دار۔ امن والا۔ معتبر۔ اَمَانَۃٌ اور اَمْنٌ سے اسم فاعل کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور اسم مفعول کا بھی۔ کیونکہ فعیل کا وزن دونوں میں مشترک ہے۔ فراء نے اس کو بمعنی فاعل بنایا ہے اور بعض دوسرے علماء

نے بمعنی مفعول بھی لیا ہے۔
امینٌ مؤتمن علی کل شیٔ وقیل آمنٌ من کل مکروہ (روح)

جِہَاز : وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ
اور جب تیار کر دیا ان کو ان کا اسباب (معان)
الجہاز : وہ ساز و سامان جو تیار کر کے رکھا جائے اور تجہیز (تفعیل) تیار کردہ سامان کو لا دنا۔ عام طور پر جہاز اس سامان کو کہا جاتا ہے جو ضروریاتِ سفر کے لئے تیار کیا گیا ہو۔ وھی عدّۃ السفر من الزاد وما یحتاج الیہ المسافرون (کشاف)
اسی سے عورت (دلہن) کے اُس سامان کو بھی جہاز کہتے ہیں جو والدین اس کو خاوند کے گھر جاتے ہوئے دیتے ہیں۔ میت کے کفن و دفن کے ضروریات اور اس سامان کو بھی جہاز کہتے ہیں جو اس دنیا سے کوچ کرتے وقت اس کو دیا جاتا ہے۔
جَهَّزْتُ القَوْمَ تَجْهِيزًا۔ میں نے قافلہ کا سامان مہیا کر دیا، تیار کر دیا۔
واصل الجہاز ما یحتاج الیہ المسافر من زادٍ ومتاعٍ۔ (روح)
جھزتُ القوم تجھیزًا : ای تکلفتُ لھم بجھازھم للسفر (قرطبی)
لم اقتص من جھازی شیئًا میں نے اپنے سفر کا کوئی سامان نہیں کیا۔
حدیث میں ہے مَنْ جَهَّزَ جَيْشَ العُسْرَةِ فَلَهُ الجنّة (بخاری) جس نے تنگی کے لشکر کا سامان مہیا کیا اس کے لئے جنت کی بشارت ہے۔ من جھزّ غازیًا جس نے غازی کا سامان تیار کیا۔
لفظ جَہَاز : جیم کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ لیث کہتے ہیں کہ میں نے اہلِ بصرہ کو جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ ازھری کہتے ہیں کہ قراء تمام کے تمام الجَہازُ بالفتح پڑھتے ہیں اور جیم کا کسرہ بھی ایک لغت ہے جو کہ جید نہیں ہے[1]

رحال : اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ
ان کی نقدی انہیں کے سامان میں رکھ دو۔
رِحَالٌ : رَحْلٌ کی جمع ہے۔ ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اس لئے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہوا جائے۔ اونٹ پر بھی مجازاً رَحْلٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ رِحْلَۃٌ مصدر ہے جس کے اصل معنی سفر یا کوچ کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ۔
اَرْحَلْتُ البَعِيرَ کے معنی ہیں میں نے اونٹ پر پالان کسا۔ اور اونٹ جو سواری کے قابل ہو جائے

اس کو رَاحِلَۃ کہتے ہیں۔
رَاحِلَۃ: سفر کرنے میں اس کی مدد کی (راغب)
مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی دامت برکاتہ
فرماتے ہیں کہ رحلۃ: سفر کرنا۔ کوچ کرنا کجاوہ
کسنا، اصل معنی تو اس کے اونٹ پر پالان کسنے
کے ہیں، اور چونکہ اس کا مقصد کوچ اور سفر
ہوتا ہے اس لئے سفر کے معنی میں آنے لگا۔[1]
رِحَال: جمع کثرت ہے، جمع قلت اس کی اَرْحِلَۃ
آتی ہے۔

نَكْتَلْ: فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ۔
نَكْتَلْ: جمع متکلم مضارع مجزوم ہے۔ باب
افتعال سے ہے، اس کا مصدر اِكْتِيَالٌ ہے
جس کے معنی ناپ کر لے لینے کے ہیں۔ اِكْتَالَ
عَلَيْهِ: پیمانے سے ناپ کر اس سے لے لیا۔
نَكْتَلْ: اصل میں نَكْتَيِلُ ہے اور یہ نَفْتَعِلُ کے
وزن پر ہے۔ حرف یا متحرک ماقبل مفتوح ہونے
کی وجہ سے الف سے تبدیل ہو گئی۔ اور پھر التقاء
ساکنین کی بنا پر الف کو گرا دیا گیا نَكْتَلْ ہو گیا۔
ونکتل مجزوم فی جواب الامر (جمل)
واصل هذا الفعل نَكْتَيِلُ على وزن نَفْتَعِلُ
قلبت الياء الفا لتحركها وانفتاح ماقبلها
ثم حذفت لالتقاء الساكنين۔ (روح)
والاصل نَكْتَالُ، فحذفت الضمة من
اللام للجزم وحذفت الالف لالتقاء
الساكنين (قرطبی)

نَمِيْرُ: وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا۔ اور اپنے اہل و عیال
کے لئے غلہ لائیں گے۔
اَلْمِيْرَۃُ: وہ غلہ جو انسان کھانے کے لئے
فراہم کرتا ہے۔
مَارَ يَمِيْرُ مَيْرًا و اَمَارَ (افعال) اَهْلَهٗ
اہل و عیال کے لئے خوراک لانا۔
اَلْمَائِرُ: اسم فاعل ہے، خوراک لانے والا
ایک شاعر کہتا ہے

بَعَثْتُكَ مَائِرًا فَمَكَثْتَ حَوْلًا
متى يأتي غياثك من تغيث

مائر کی جمع مَيَّارٌ آتی ہے۔ مُمَايَرَۃ
مفاعلۃ کے معنی ہیں کسی کے کردار کی نقل کرنا۔
اور تَمَايُر، تفاعل کے معنی آپس میں فتنہ
برپا کرنا، فساد اٹھانا۔
خِيَرَۃٌ اور مِيَرَۃٌ کے قریب قریب ایک ہی
معنی ہیں۔
وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا، ای نجلب لهم الميرة
وهی بکسر المیم وسکون الیاء، طعام
یمتاره الانسان ای یجلبه من بلدٍ الی
بلدٍ (روح)
والمائر: الذی یاتی بالطعام۔ (فتح)

[1] لغات القرآن

مَوْثِقًا: حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ

اَلْمَوْثِقُ: مصدر میمی بمعنی مفعول ہے۔ وہ عہد و پیمان جسے حلف وغیرہ کے ذریعہ مضبوط کیا گیا ہو۔

وثق یَثِقُ (حسب) ثِقَةً و وثوقًا و موثقًا و ثق بفلان: کسی پر اعتماد کرنا۔ بھروسہ کرنا۔ صفت فاعلی وَاثِقٌ اور مفعولی مَوْثُوقٌ بہ

وثیقۃٌ: وہ عہدنامہ یا دستاویز وغیرہ جس سے کام مضبوطی سے ہو۔

مُوْثِقٌ کی جمع مَوَاثِق و میاثق ہے۔ وثاقۃٌ، یہ باب کرم کا مصدر ہے۔ کسی کام کا مضبوط ہونا۔

وَثُقَ الشَّیْءُ: کسی چیز کا ثابت و قوی ہونا۔

الوَثاق اور الوِثاقُ: وہ رسّی یا زنجیر جس سے کسی چیز کو کس کر باندھ دیا جائے اور ایثاقٌ (افعال) سے کسی چیز کو مضبوطی سے باندھنا۔

قرآن پاک میں ہے وَلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ اور نہ کوئی اس جیسا جکڑے گا۔

وثیق: مضبوط، مستحکم۔ اس کی جمع وِثَاقٌ آتی ہے۔ ثِقَۃٌ: مصدر، قابل اعتماد۔ جمع ثِقات واحد، جمع، مذکر و مؤنث میں برابر ہے۔

فالمَوْثِق مصدر میمی بمعنی للمفعول (الروح)

و المَوْثِق، الاسم (راغب)

بَاب: لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ

ہر چیز میں داخل ہونے کی جگہ کو باب کہتے ہیں۔ جیسے شہر اور مکان میں داخل ہونے کے لئے دروازے ہوتے ہیں۔ اس کی جمع اَبْوَابٌ آتی ہے، جیسا کہ قرآن پاک کی کئی آیات میں وارد ہے۔

وَادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ

جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔ اور اُدْخُلُوْا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ دوزخ کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ۔

پھر باب چونکہ داخل ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے اسی سے اس چیز کو بھی باب کہتے ہیں جو کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ بنے۔ محاورہ ہے: هٰذَا العِلْمُ بَابٌ اِلیٰ عِلْمِ کَذَا۔ یہ علم فلاں علم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

اور اسی طرح آیت کریمہ: فَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، میں اَبْوَاب سے مراد اشیاء کو حاصل کرنے کے وہ ذرائع اور اسباب ہیں جو انسان کی سرکشی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ - مِنَ الصِّحَّةِ والسَّعَةِ وصنوف النعمۃ (کشاف)

حَاجَةً : حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰهَا:
ایک ارمان تھا یعقوب کے دل میں جو انہوں نے
پورا کر لیا (ماجدی)
اَلْحَاجَةُ اس چیز کو کہتے ہیں جسکی دل میں محبت
ہو، اسکی جمع، حَاجٌ وَحَاجَاتٌ وَحَوَائِجُ
آتی ہیں، صاحب روح المعانی فرماتے ہیں
کہ بعض نے حاجۃ کی جمع حَوَائِجُ سے انکار
کیا ہے۔
حَاجَ يَحُوْجُ حَوْجًا : محتاج ہونا۔ اَحْوَجَ
وَاحْتَاجَ اِلَيْهِ : کسی کا محتاج ہونا۔ حَوْجٌ:
مصدر بمعنی سلامتی کے آتا ہے، کہتے ہیں،
حَوْجًا لَكَ : تمہارے لئے سلامتی ہے۔ اور
اَلْحُوْجُ حاء کے ضمہ سے، محتاجگی، فقر وفاقہ
اور اَلْحُوْجَاءُ کے معنی بھی حاجت ہی کے ہیں۔
کہتے ہیں مَا كَانَ فِيْ حَوْجَاءَ وَلَا لَوْجَاءَ:
یعنی اس کے دل میں کوئی حاجت نہیں تھی۔
حَوْجَاءُ کی تصغیر حُوَيْجَاءُ اور لُوَيْجَاءُ آتی ہے۔
مَالِيْ فِيْهِ حُوَيْجَاءُ وَلَا لُوَيْجَاءُ، یعنی مجھے
اسکی حاجت اور ضرورت نہیں۔
وذکر الراغب: ان الحاجة الى الشئ
الفقر اليه مع محبته (روح)

السِّقَايَةَ : جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ
رَحْلِ اَخِيْهِ : امام راغب فرماتے ہیں کہ:
سِقَايَة اور صُوَاع ایک ہی چیز کے دو نام
ہیں، پانی پینے کے لحاظ سے اسے سِقَايَة اور
ناپنے کے اعتبار سے صُوَاع کہا گیا ہے اسی کے
قریب قریب علامہ قرطبی نے بھی ذکر کیا ہے، کہ
سقاية اور صواع ایک چیز ہیں، اور یہ
ایک ایسا برتن تھا جس کے دو سرے تھے اور
درمیان میں پکڑنے کا دستہ تھا، ایک طرف
سے اس برتن سے بادشاہ پانی پیتا اور دوسری
طرف سے غلہ ناپتا تھا۔ والسقاية والصواع
شئ واحد، اناءٌ له رأسان فى وسطه
مَقْبِضٌ، كان الملك يشرب منه من
الرأس الواحد، ويكال الطعام بالرأس
الاٰخر: (قرطبی) علامہ زمخشری نے بھی
یہی لکھا ہے۔ مشربة يُسْقٰى بِهَا وهى
الصُّوَاع (کشاف)
لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ بادشاہ
عظیم ایک برتن سے پیتا بھی ہو اور اسی سے غلہ
بھی ناپتا ہو۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ،
پہلے بادشاہ اس سے پانی پیتا تھا پھر اسکو غلہ
ناپنے کے لئے خاص کر دیا گیا۔
علامہ فخر الدین رازی نے اس جواب کو
خلاف قیاس قرار دیکر رد کر دیا ہے۔ کہ بادشاہ
کے پینے کا پیالہ ہو اسکو غلہ ناپنے کے لئے خاص کر دیا

جائے اور پھر مادۃً پینے کے برتنوں اور ناپنے کے برتنوں میں ساخت کا بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔
صاحب کشاف نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ یہ برتن ایسا تھا جس سے جانوروں کو پانی پلایا جاتا تھا اور اسی سے غلہ بھی ناپ لیا جاتا۔ لیکن یہ بھی بعید از قیاس ہے کیونکہ اس سقایۃ کے بارے میں یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ یہ سونے چاندی وغیرہ کا بنا ہوا تھا، تو ظاہر ہے کہ جانوروں کو پانی پلانے کے برتن سونے چاندی یا موتیوں سے مرصع نہیں ہوتے۔ اقوال اور روایات کو جمع کرنے سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ یہ برتن تھا قیمتی۔
صاحب روح المعانی کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ سال قحط کے ہیں غلہ کے پیدا ہونے کے امکانات کئی سال بعد ہیں اسلئے رزق کے احترام کی خاطر پینے کے برتن سے ناپنا شروع کیا ہو۔ ولعزۃ الطعام فی تلک الاعوام قصد کیلہ علی ذالک (روح)۔
اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ جناب یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے احترام خاطر پینے کے برتن سے ناپنے کا حکم دیا۔ (واللہ اعلم)
سقایۃ کے بارے میں مفسرین اور لغت کے اقوال سخت پریشان کن ہیں کوئی اسکو سقٰی یسقٰی کا مصدر بتاتا ہے اور کوئی اسقٰی (افعال) اور کوئی مصدر کو بمعنی اسم فاعل بیان کرتا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ (سقایۃ) اس مقام کا نام ہے جہاں حاجیوں کو پینے کے لئے پانی دیا جاتا تھا۔ علامہ سید رضا مصری نے تفسیر المنار میں اسپر بڑی عمدہ تحقیق لکھی ہے جو درج ذیل ہے۔ فرماتے ہیں:
سقایۃ لغت میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے، اسی معنی میں ہے جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ۔ رکھدیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے۔ اسے سقایہ سے اسلئے منسوب کیا گیا اس سے پلایا جاتا تھا۔ اور صُوَاع اسلئے کہا گیا کہ اس سے صاع کی طرح ناپا جاتا تھا۔ مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے اور مذکر بھی۔ لسان میں (اور اسی طرح دوسری کتابوں میں) مذکور ہے اور سقایہ وہ مقام ہے جسمیں حج کے مواقع وغیرہ پر شراب (پینے کی چیز شربت پانی وغیرہ) تیار کیا جاتا تھا۔ مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی نے علامہ کی تحقیق پوری ذکر کردی ہے۔
السِّقَايَةُ هي المحل الذي يُتَّخَذُ فيه الشراب في الموسم (جمل)
السِّقَايَةُ وَالْعِمَارَةُ: مصدران من سَقَى وعَمَرَ كالصِّيَانَةِ وَالْوِقَايَةِ (كشاف)

السِقایۃُ مصدر کالسِّعایۃ والحِمایَۃِ، فجعل الاسم بموضع المصدر (قرطبی۔ توبہ) السقایۃ والعمارۃ مصدر اَسْقٰی وعمر، بالتخفیف (روح۔ سورہ توبہ) علامہ شوکانی نے بھی السقایۃ کو مصدر قرار دیا ہے۔ (فتح القدیر)

اہل علم مزید تحقیق کے لئے تفسیر منار کا مطالعہ فرمائیں۔

اَلْعِیْرُ : ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُھَا الْعِیْرُ:
العیر : اصل میں ان جانوروں کو کہتے ہیں جو غلہ کی باربرداری کے کام آتے ہیں، اور بعد میں ہر قافلہ کے لئے یہ لفظ عام ہوگیا۔

والعیر ما امتیر علیہ من الحمیر والابل والبغال (قرطبی)

امام راغب فرماتے ہیں کہ: العیر وہ قافلہ ہے جو غذائی سامان لاد کر لاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ غلہ بردار اونٹوں اور اس کے ساتھ جو لوگ ہوتے ہیں ان کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے، مگر کبھی اسکا استعمال صرف ان اونٹوں پر ہوتا ہے جو غذائی سامان لاد کر لاتے ہیں، اور کبھی ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو کہیں سے سامان لاتے ہیں۔ عِیْرٌ کی جمع عِیَرَاتٌ اور عِیْرَاتٌ آتی ہے۔

عَارَ یَعِیْرُ عَیْرًا : کے معنی ہیں حیرانی کے ساتھ آنا جانا۔ اس سامان لانے والے قافلہ کو غالبًا عِیْرٌ اس ہی لئے کہا گیا ہوگا کہ اس اس کو بھی دورانِ سفر آنے جانے میں حیرانی ہوتی ہے۔ والعیر الابل التی علیھا الاحمال، سمیت بذالک لانھا تعیر ای تذھب وتجیئ (روح۔ کشاف)

تَفْقِدُوْنَ : مَاذَا تَفْقِدُوْنَ:
تمہاری کیا چیز کھوگئی ہے۔
اَلْفَقْدُ کے معنی ہیں کسی چیز کے وجود میں آنے کے بعد اسکا نہ پایا جانا اور یہ عَدَمٌ سے اخص ہے کیونکہ عَدَمٌ، فقد کو بھی کہتے ہیں اور کسی چیز کے سرے سے موجود نہ ہونے بھی عدم سے تعبیر کیا جاتا ہے تَفْقِدُوْنَ یہ ضَرَبَ سے جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے فاعل فَاقِدٌ ہے وہ جسکی چیز گم ہوگئی ہو۔ اور فَقِیْدٌ مَفْقُوْدٌ کے معنی میں آتا ہے یعنی گم شدہ چیز۔ محاورہ ہے عَاشَ غَیْرَ حَمِیْدٍ وَمَاتَ غَیْرَ فَقِیْدٍ۔ برے حال میں جیا اور مرا تو اس پر کسی کو افسوس نہ ہوا۔ اور تَفَقَّدَ کے لفظی معنی کسی مجمع کے متعلق حاضر وغیر حاضر کی تحقیق کرنے کے ہیں اسلئے اسکا ترجمہ خبرگیری اور نگہبانی سے کیا جاتا ہے۔
تَفَقَّدَ الطَّیْرَ : کے معنی یہ ہوں گے کہ: حضرت

سلیمان علیہ السلام نے اپنی رعایا کے طیور کا معائنہ فرمایا اور یہ دیکھا کہ ان میں کون حاضر ہے اور کون غیر حاضر ہے۔

مَنْ تَتَفَقَّدُ يَفْقِدُ : جو شخص جستجو کریگا وہ گم کریگا۔ یعنی جو لوگوں کے حالات کو دیکھنا شروع کردے کہ کون اچھا ہے اور برا تو اسکو کوئی اچھا نہ ملیگا ہر ایک میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور پائیگا۔

اَلْفَقْدُ : عَدَمُ الشَّيْءِ بعد وجوده فهو اَخَصُّ من العدم لان العدم يقال فيه وفيما لم يوجد بعد (راغب)

وَالتَّفَقُّدُ : اَلطَّلَبُ ما غاب عنك من شيء (قرطبی)

صُوَاعٌ : نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ :

ہم شاہی پیمانہ گم پاتے ہیں۔ یا ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیمانہ۔

صُوَاعٌ پینے کا بڑا جام جسمیں شراب پی جاتی ہے، نیز صَاعٌ کو صُوَاعٌ کہتے ہیں جو ایک مشہور پیمانہ ہے اسکی جمع صِيعَانٌ آتی ہے۔

امام راغب لکھتے ہیں کہ یہ ایک برتن ہے جس سے پیا بھی جاتا تھا اور ناپا بھی جاتا تھا، اسے صَاعٌ بھی کہا جاتا ہے یہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، قرآن پاک میں یہ مؤنث استعمال ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ جملہ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا ، میں ھا، ضمیر صواع کی طرف راجع ہے۔ بعض اہل قرأت نے اسکو صُوَاغٌ غین معجمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور بعض نے صَوْغٌ پڑھا ہے، جن حضرات نے صَوْغٌ پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ صَاغَ کا مصدر بمعنی مفعول ہے، وہ چیز جسے پگھلا کر بنایا گیا ہو، اس قرأت کا مدار ان روایات پر ہے جسمیں یہ ذکر ہے کہ یہ پیمانہ سونے یا چاندی وغیرہ کو پگھلا کر بنایا گیا تھا۔ الصُّوَاعُ بوزن غراب المكيال وَهُوَ السِّقَايَةُ۔ (روح)

زَعِيمٌ : وَاَنَا بِهٖ زَعِيمٌ :

زَعِيمٌ: ذمہ دار، ضامن، اور کہنے والا، قائل۔ اول معنی کے اعتبار سے یہ زَعَامَةٌ جس کے معنی ضامن اور کفیل ہونے کے ہیں۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے زَعْمٌ سے فَعِيلٌ کے وزن پر اسم فاعل کے معنی میں ہے۔

امام راغب لکھتے ہیں کہ : زَعْمٌ، اصل میں ایسی بات نقل کرنے کو کہتے ہیں جسمیں کذب کا احتمال ہو۔ اس لئے قرآن پاک میں یہ لفظ ہر جگہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت مقصود ہوتی ہے۔ جیسے کہ : زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ بَلْ زَعَمْتُمْ۔ مگر تم یہ گمان کرتے ہو۔ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ اسی طرح

زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِہٖ ۔ اور زعامۃٌ : کے معنی
ذمہ داری اٹھانے اور ریاست کے ہیں اور کفیل
ضامن اور رئیس کو زَعِیْمٌ اسی لیے کہا جاتا ہے
کہ اسکی بات میں کذب کا احتمال ہو سکتا ہے۔
اور وَاَنَا بِہٖ زَعِیْمٌ میں زَعِیْمٌ یا تو زعامۃ
بمعنی کفالۃ سے ہے اور یا پھر زَعْمٌ بِالْقَوْلِ سے
حدیث میں ہے۔ اَلزَّعِیْمُ غَارِمٌ: جو شخص ضامن
ہو اسکو تاوان دینا پڑیگا۔ بعض اہل تفسیر نے
لکھا ہے کہ کُلُّ زَعِیْمٍ فِی الْقُرْاٰنِ کِذْبٌ: کہ
قرآن میں زَعْمٌ کا مادہ جہاں بھی ہے اس سے
مراد جھوٹ ہے۔ زَعْمٌ میں تین لغات ہیں
۱۔ زَعْمٌ ۲۔ زِعْمٌ ۳۔ زُعْمٌ۔ گمان کرنا،
جھوٹ بات کہنا۔ اہل حجاز کے نزدیک زا کا
زبر ہے اور قبیلہ اسد کے نزدیک پیش ہے
اور قبیلہ قیس کے بعض افراد کے نزدیک
زیر ہے۔ زَعَمَتِ الْحَنَفِیَّۃُ ۔ حنفیہ نے کہا
زَعَمَ سِیْبَوَیْہِ ۔ سیبویہ نے کہا۔ فِیْ
زَعْمِیْ کَذَا ۔ میرا گمان یہ ہے۔ یہاں زَعْم
بمعنی ظن اور گمان کے ہیں اور اسکا استعمال
اعتقاد کے لئے بھی ہوتا ہے جیسے زَعَمَ الَّذِیْنَ
کَفَرُوْا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا ۔ جو لوگ کافر ہیں
انکا اعتقاد یہ ہے کہ وہ ہرگز اٹھائے نہ جائینگے

وِعَاءٌ : بَدَاَ بِاَوْعِیَتِہِمْ قَبْلَ وِعَاءِ اَخِیْہِ :

وِعَاءٌ ، اسم مفرد ہے مراد وہ چیز ہے
جسمیں کوئی دوسری چیز جمع کی جائے جیسے
برتن۔ تھیلا اور بوری وغیرہ۔ اسکی جمع
اَوْعِیَۃٌ ہے جیساکہ اسی آیت میں ہے
فَبَدَاَ بِاَوْعِیَتِہِمْ - اسم فاعل وَاعِیْ
آتا ہے، وَاعِی الْیَتِیْمِ : یتیم کا سرپرست
ومحافظ۔ نگران۔ اسم فاعل مؤنث
وَاعِیَۃٌ آتا ہے۔ قرآن میں ہے : لِنَجْعَلَهَا
لَکُمْ تَذْکِرَۃً وَّتَعِیَهَآ اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ :
تاکہ ہم اس واقعہ کو تمہارے لئے یادگار بنا دیں
اور یاد رکھنے والے کان اسکو یاد رکھیں۔
اصل میں یہ وَعْیٌ ، مصدر سے ماخوذ ہے جو
مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے، عام طور
پر اسکا استعمال کسی بات کو یاد کرنے کے معنی
میں ہوتا ہے۔ وَعَیْتُہٗ فِیْ نَفْسِیْ میں نے اسکو
یاد کرلیا۔ اپنے دل میں محفوظ کرلیا۔ حدیث میں
ہے نَضَّرَ اللّٰہُ اِمْرَاً سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَوَعَاهَا
فَرُبَّ مُبَلِّغٍ اَوْعٰی مِنْ سَامِعٍ ۔ خدا اس آدمی
کو خوش رکھے جسنے میری بات سنی پھر اسکو
یاد رکھا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جسکو بات
پہنچتی ہے وہ سننے والے سے زیادہ یاد
رکھنے والا ہوتا ہے۔ اسی طرح حدیث

میں ہے۔ لایعذب اللّٰہ قَلْباً وَعَى القُرْآنَ اللہ تعالیٰ اس دل کو عذاب نہیں کریں گے جسنے قرآن یاد کیا۔ محاورہ ہے هُوَ اَوْعیٰ مِنْ فُلَانٍ: وہ فلاں سے زیادہ یاد رکھنے والا ہے۔ مَالِیْ مِنْهُ وَعْیٌ: مجھے اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ یعنی اسکو یاد کرنا ہی پڑتا ہے۔

الاِیْعَاءُ (افعال) کے معنی ساز و سامان کو ظرف میں محفوظ کرنے کے ہیں قرآن میں ہے۔ جَمَعَ فَاَوْعیٰ: مال کو جمع کیا پھر اسکو بند رکھا۔

روایت میں ہے: ذکر فی کل سَمَآءٍ انبیاءَ قَدْ سَمَّاهُمْ فَاَوْعَیْتُ مِنْهُمْ اِدْرِیْسَ فِی الثَّانِیَه: حضورؐ نے تمام آسمانوں میں انبیاء کی ملاقات کا ذکر کیا میں نے انہیں سے (صرف) حضرت ادریس کو یاد رکھا کہ وہ دوسرے آسمان میں ہیں۔

اور اِسْتِیْعَاءٌ (استفعال) کے معنی ہیں سب لینا۔ فَاسْتَوْعیٰ لَهٗ حَقَّهٗ: اس نے اپنا سارا حق لے لیا۔ وَاعِیَةٌ: چیخ و پکار کو بھی کہتے ہیں۔ سَمِعْتُ وَعَى الْقَوْمِ: کے معنی ہیں میں نے قوم کی چیخ و پکار سنی۔

الوعاء: الظرف الذی یحفظ فیه الشیٔ

(روح)

وِعَاءٌ اور وُعَاءٌ واؤ کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور دونوں لغت اسمیں صحیح ہیں وھو ما یُحْفَظُ فِیْهِ الْمَتَاعُ وَ یَصُوْنُهٗ۔ (قرطبی)

بعض حضرات نے اس کو اِعَاءٌ واؤ کی جگہ ہمزہ پڑھا ہے۔ (کشاف)

شَیْخٌ: اِنَّ لَهٗ اَبًا شَیْخًا کَبِیْرًا: اس کا ایک باپ ہے بہت بوڑھا بڑی عمر کا۔

(ترجمہ معارف)

الشیخ: کے معنی معمر آدمی کے ہیں۔ عمر رسیدہ آدمی کے چونکہ تجربات اور معارف زیادہ ہوتے ہیں، اس مناسبت سے کثیر العلم شخص کو بھی شیخ کہتے ہیں۔ شَیْخٌ بَیِّنُ الشَّیْخُوْخَةِ: وہ بہت بڑا عالم ہے

(راغب)

شَیْخًا کَبِیْرًا: سے مراد ہو سکتا ہے کہ کبیر السن ہو یعنی بڑی عمر کا بہت بوڑھا۔

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ اخوان یوسف کی مراد انکی ضعیف العمری کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انکی قدر و منزلت کو بیان کرنا ہیں کہ وہ قدر والے بزرگ ہیں۔ ای کبیر القدر (قرطبی)

نَجِیًّا: خَلَصُوْا نَجِیًّا: خَلَصُوْا کی ضمیر سے حال ہے، معنی یہ ہیں کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام سے نا امید ہوگئے تو: اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو۔ (ترجمہ معارف)

باہم مشورہ کیلئے کسی علیحدہ جگہ میں جمع ہو بیٹھے۔

نَجِیٌّ: صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ جمع اور واحد کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

وَقَرَّبْنٰہُ نَجِیًّا: ہم نے اس کو باتیں کرنے کیلئے قریب کیا۔ یہاں نَجِیًّا واحد کے لئے ہے۔

نَجِیٌّ کی جمع اَنْجِیَۃٌ آتی ہے اَلنَّجِیُّ: فعیل کے وزن پر بمعنی مُنَاجِی سرگوشی کرنے والے کے ہے۔ اَلنَّجِیُّ فعیل بمعنی المناجی (قرطبی)

قولہ، نَجِیًّا، حال من فاعل خلصوا: ای اعتزلوا فی ھذہ الحالۃ مناجین (جمل)

اَبْرَحَ: فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ:

اَبْرَحَ: بَرِحَ یَبْرَحُ بَرْحًا سے واحد متکلم کا صیغہ ہے بَرِحَ کے معنی ہیں کھلی جگہ پر جم کر ٹھہرے رہنا۔ اسی سے ہے لَآ اَبْرَحُ حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا۔

لَآ اَبْرَحَ: لَآ اَزَالُ کی طرح معنی مثبت کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ بَرِحَ اور زَالَ میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور حرف لَا بھی نفی کے لئے ہے تو نفی پر نفی کا دخول اثبات کا فائدہ دیتا ہے، اسی بنا پر قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہے لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْہِ عٰکِفِیْنَ، یعنی ہم تو اسکی پوجا پر قائم رہیں گے۔

بَرِحَ بَرَاحًا وَبُرُوْحًا ای زَالَ، فَاِذَا دَخَلَ النفی صَارَ مُثْبِتًا (قرطبی)

بَرِحَ المکان۔ کسی جگہ کو چھوڑ دینا۔ زائل ہوجانا۔ مَا بَرِحَ وَلَا بَرِحْتَ: وہ اور تو غنی رہا۔ بَرِحَ الْخِفَاءُ: ظاہر ہوجانا۔

بَرَحَ (ن) بَرْحًا: بَرَحَ الصَّیْدُ: شکار کا دائیں جانب سے گذر جانا۔ بَرَحَ الرَّجُلُ ناراض ہونا۔ بَرَّحَ (تفعیل) اللّٰہ عَنْکَ خدا تیری تکلیف دور کرے۔ ضَرْبٌ مُبَرِّحٌ: سخت مار تکلیف دینے والی۔ بَرَاحٌ: جَاءَ بِالْکُفْرِ بَرَاحًا۔ اس نے کھلم کھلا کفر کیا۔

اَلْبَرَاحُ: کشادہ اور کھلی زمین جسمیں کوئی روئیدگی وغیرہ نہ ہو۔ اور اَلْبَارِحَۃُ: وہ رات جو گذر چکی اور اَلْبَارِحَۃُ الْاُوْلٰی گذشتہ رات سے پہلی رات۔ بَرْحٌ: سختی تکلیف، جمع اَبْرَاحٌ۔ تَبَارِیْحُ: مصائب زندگی۔ تَبَارِیْحُ الشَّوْقِ: سوزشہائے زندگی، سوزشہائے عشق۔ لَا بَرَاحَ: کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ لَا تَبْرَحْ: مت ھٹ۔

لَآ اَبْرَحُ: میں یہاں سے نہیں ٹلونگا، نہیں جاؤنگا۔

سَرَقَ: اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ: آپ کے لڑکے نے چوری کی ہے۔

سَرَقَ يَسْرِقُ (ض) سَرِقًا وَسَرِقَةً: چُرانا۔ سُرِقَ الرَّجُلُ: کسی کے گھر میں چوری ہو جانا۔ اَلسَّرِقَةُ: مصدر ہے اس کے اصل معنی خفیہ طور پر اس چیز کے لے لینے کے ہیں جسکو لینے کا حق نہ ہو۔ اور اصطلاح شریعت میں کسی چیز کو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں لے لینے کے ہیں۔ (راغب)

جوہری کہتے ہیں کہ: سَرِقٌ اور سَرِقَةٌ (مکسور الراء فیہما) اس چیز کے لئے بطور اسم استعمال ہوتے ہیں جو چوری کی گئی ہو۔ اور سَرَقَ يَسْرِقُ سَرَقًا، مصدر مفتوح الراء آتا ہے۔ (قرطبی)

بعض اہل علم نے سَرَقَ کی بجائے سُرِّقَ پڑھا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر چوری کا الزام لگایا گیا ہے۔ سَارِقٌ: سَرِقَةٌ سے اسم فاعل ہے بمعنی چوری کرنے والا، جمع سَارِقُونَ ہے۔ اور سَارِقَةٌ مؤنث چوری کرنے والی عورت۔ جمع سَارِقَاتٌ وَسَوَارِقُ۔

اَسَفٰی: يَا اَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ۔ ہائے افسوس یوسف (کی جدائی) پر۔

(ترجمہ معارف)

اہل عرب حسرت اور غم کے موقعہ پر کہتے ہیں۔ یَا اَسَفٰی، یعنی، ہائے افسوس۔ یَا اَسَفٰی، کی اصل یَا اَسَفِیَ، ہے (بکسر الفاء) بعد میں تخفیف کے لئے حرف فا، کو فتح دیکر یاء متحرک ما قبل مفتوح ہونیکی وجہ سے الف سے بدل گیا ہے اسی لئے اس الف کو یاء کی شکل میں لکھا جاتا ہے۔

فتوحات الٰہیہ میں ہے فھی (الف) اسم لانھا بدل لمن اسم (یعنی یائے متکلم سے بدل ہے) والاصل یَا اَسَفِیَ بکسر الفاء و فتح الیاء، ففتحت الفاء فقلبت الیاء الفًا لتحرکھا وانفتاح ما قبلھا و لذالك تکتب ھذہ الالف یاءً لانھا منقلبۃٌ عنھا۔ (جمل)

قال الزجاج: الاصل یَا اَسَفِیَ، فابدل من الیاء الفٌ لخفۃ الفتحۃ۔ (قرطبی)

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اَسَفٌ فوت شدہ چیز پر حسرت اور حزن کے لئے بولا جاتا ہے۔ والاسف، شدۃ الحزن علی مافات۔ (قرطبی، روح)

یَا اَسَفٰی عَلٰی کذا: یہ ایک محاورہ ہے،

جس کے معنی ہیں: مجھے اس کے کھو جانے پر کس قدر افسوس اور حسرت ہے۔ اَسِفَ (س) اَسَفًا، اَسِفَ عَلَيْهِ: کسی پر غمگین ہونا، افسوس کھانا۔ لفظ اَسِيْفٌ: رقیق القلب شخص پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ کا ارشاد ہے ان ابابکر رَجُلٌ اَسِيْفٌ۔ ابوبکر چونکہ رقیق القلب ہیں اسلئے وہ فریضہ نماز انجام نہ دے سکیں گے۔

اَسَفَهٗ اِيْسَافًا: کے معنی ہیں غصہ دلانا، ناراض کرنا، قرآن میں ہے۔ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ، یعنی انہوں نے جب ہمیں (اپنی نافرمانیوں کے ذریعہ) غضبناک کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ خدا کے غضبناک کرنے سے مراد اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنا ہے۔

تَفْتَؤُا: قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ: -

مَا فَتِئْتُ وَمَا فَتَأْتُ، اَفْعَلُ كَذَا بمعنی مَازِلْتُ، میں اس کام کو برابر کرتا رہا۔ فَتِئَ عَنْهُ، رکنا، بھول جانا، کہا جاتا ہے مَافَتَأَ وَمَا فَتِئَ يَفْعَلُ كَذَا، ہمیشہ یہ کرتا رہا، یہ اَفْعَالِ ناقصہ میں سے ہے اور سوائے ماضی اور مضارع کے دوسرے افعال کا استعمال اس سے نہیں ہوتا۔

تَفْتَؤُا: اصل میں لَاتَفْتَؤُا ہے چونکہ آیت میں تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا ہے اس لئے حرف نفی حذف ہوگیا کیونکہ قسم کے ساتھ جب علامت اثبات ہوتی ہے تو وہ نفی پر محمول ہوتی ہے۔

فراء نے اسپر امراء القیس کا ایک شعر پیش کیا ہے

فقلت يَمِيْنُ اللّٰهِ اَبْرَحُ قَاعِدًا
ولو قطعوا رَاْسِيْ لَدَيْكِ وَاَوْصَالِيْ

یہاں ابرح فعل ناقص لاابرح کے معنی میں ہے
وزعم الخليل وسيبويه ان، لا، تُضْمَرُ في القسم (قرطبی)۔ قال النحويون حرف النفي هٰهُنا مضمرة على معنى قالوا: ما تفتؤ ولا تفتؤ (کبیر)

جواب قسم اصل میں نون تاکید اور لام کے ساتھ مؤکد ہوتا ہے یا ان دو میں سے کسی ایک کے ساتھ، تَفْتَؤُ میں نہ تو لام ہے اور نہ ہی نون تاکید ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ قسم اثبات پر نہیں کہی گئی کیونکہ اگر اثبات پر ہوتی تو تاللہ لَتَفْتَئَنَّ ہوتا، بلکہ یہ قسم نفی پر ہے۔ اسی سے بعض حنفیہ نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے کہ اگر کوئی یوں کہے کہ واللہ اجیئك غدًا: تو یہ آنے کی وجہ سے حانث ہوگا، نہ آنیکی وجہ سے حانث نہ ہوگا۔ (جمل)

حَرَضًا: حَتّٰی تَکُوْنَ حَرَضًا :

حَرَضٌ : مضمحل، بیمار، بیکار، جو چیز نکمی اور بیکار ہوجائے اور درخورِ اعتناء نہ رہے۔ حَرَضٌ کہلاتی ہے یہ اصل میں مصدر ہے[1]

امام راغب نے لکھا ہے کہ : اَلْحَرَضُ وہ چیز ہے جو نکمی ہو اور درخورِ اعتناء نہ رہے۔ اسلئے جو چیز قریب ھلاکت ہوجائے اسکو حَرَضٌ کہتے ہیں۔ تَحْرِیْضٌ کے معنی ہیں کسی کام کو مُزَیَّنْ کرکے اور اسے آسان صورت میں پیش کرکے لوگوں کو اسکے کرنے پر برانگیختہ کرنا گویا تحریض کے اصل معنی حَرَض کو زائل اور دور کرنے کے ہیں جیسے مَرَّضْتُہٗ کے معنی ہیں، میں نے اسکی بیماری کو دور کیا اور قَذَّیْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اس سے تنکے کو دور کیا۔ اور اَحْرَضَہُ الْمَرَضُ کے معنی ہیں بیماری نے اسکو گھلا دیا، لاغر اور کمزور کر دیا۔

اصل میں حَرَضٌ کے معنی جسم یا عقل میں مسلسل غم اور حسرت کی وجہ سے فساد پیدا ہوجانے کے ہیں۔ اور حَارِضٌ اور حَرَضٌ دونوں صفت کے صیغے ہیں، علامہ قرطبی نے لفظ حَرَض کے معنی اور مطلب میں کئی ایک اقوال نقل کئے ہیں۔

۱۔ ابن عباس اور مجاہد کہتے ہیں کہ حَرَضًا کے معنی ہیں دَنِفًا مِنَ الْمَرَضِ یعنی آپ اس غم کی شدت کے باعث موت کے قریب ہوجائیں گے دَنِفَ الْمَرِیْضُ کے معنی ہیں، مریض شدتِ مرض کی وجہ سے قریب الموت ہوگیا۔

۲۔ محمد ابن اسحٰق کہتے ہیں فاسدًا لاعقل لک، یعنی آپ غم یوسف سے اس وقت تک نجات نہ پائیں گے جب تک آپ فسادِ نگاہ و جسم کے ساتھ ساتھ اپنی عقل بھی نہ کھو بیٹھیں۔

۳۔ فراء کہتے ہیں کہ الحارض اور الحرض دونوں کے معنی فاسد الجسم والعقل کے ہیں۔

۴۔ ابن زید کہتے ہیں کہ الحرض الذی قد رُدَّ اِلٰی اَرْذَلِ العمر۔

۵۔ ربیع ابن انس کہتے ہیں کہ یابس الجلد علی العظم، یہ تمام اقوال قریب المعنی ہیں،

واصل الحرض: الفساد فی الجسم والعقل من الحزن او العشق او الھرم۔

ایک شاعر کہتا ہے ؎

اِنِّیْ امْرُؤٌ لَجَّ بِیْ حُبٌّ فَاَحْرَضَنِیْ
حَتّٰی بَلِیْتُ وَحَتّٰی شَفَّنِی السَّقَمُ

فَاَحْرَضَنِیْ : محبت نے مجھے لاغر کر دیا۔

اَلْحَرَضُ : مالا یُعْتَدُّ بِہٖ ولا خیر فیہ (راغب) فی المصباح۔

حَرِضَ حَرَضًا من باب تَعِبَ اَشْرَفَ علی

---

[1] لغات القرآن۔

الھلاك فھو حَرَضٌ۔ (جمل) حکی الواحدی عن اھل المعانی اَنَّ اَصْلَ الْحَرَضِ فساد الجسم والعقل للحزن والحب. (کبیر)

قال النحاس: یقال حَرَضَ حَرَضًا (ض) و حَرُضَ حُرُوْضًا وَحُرُوْضَۃً (ک) اِذا اَبْلَیَ وَسَقُمَ وَرجل حَارِضٌ وَحَرَضٌ، حارض اور حرض ان دونوں کے استعمال میں فرق یہ ہے کہ حرض مصدر ہے جو صفت میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے آتا ہے یہ جمع، تثنیہ، مذکر اور مؤنث سب میں برابر استعمال ہوتا ہے اور حارض کی جمع تثنیہ وغیرہ سب آتے ہیں۔ فَحَارِضٌ، یُثَنّٰی وَیُجْمَعُ وَیُؤنث، وَحَرَضٌ لَایُجْمَعُ وَلَا یُثَنّٰی لانہ مصدر،

قالہ الفراء (زاد المسیر قرطبی)۔

بعض قراء نے، حَتّٰی تَکُوْنَ حَرِضًا. بکسر الراء پڑھا ہے یہ صفت کا صیغہ ہے، اما الحرض بکسر الراء فھو الصفۃ۔ (کبیر)

اَشْکُوْا: اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ: میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے۔ یعنی میں اپنی فریاد اور رنج وغم کا اظہار تم سے یا کسی دوسرے سے نہیں کرتا بلکہ اللہ جل شانہ کی ذات سے کرتا ہوں۔

(معارف القرآن)

اَشْکُوْ، یہ شَکْوٌ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اصل میں شَکْوٌ، کے معنی چھوٹے مشکیزے کا منہ کھولنے کے ہیں، شُکْوَۃٌ، وہ برتن جسمیں دودھ یا پانی ہو۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ شَکْوٌ کے معنی شَکْوَۃٌ یعنی چھوٹے مشکیزہ کو کھولنے اور اس کے اندر کی چیز کو ظاہر کرنے کے ہیں، لھذا یہ دراصل بَثَثْتُ لَہٗ مَافِیْ وِعَائِیْ اور نَفَضْتُ مَافِیْ جِرَابِیْ کی طرح استعارہ ہے جس کے معنی دل کی بات کو ظاہر کر دینے کے ہیں۔

شَکَا یَشْکُوْ شَکْوٰی وشَکْوًا وشَکَایَۃً و شَکَاۃً، شکایت کرنا، غم کا اظہار کرنا۔ اِشْتَکٰی (افتعال) اِشْتَکٰی اِلَیْہِ، شکایت کرنا۔ تَشْتَکِیْٓ اِلَی اللّٰہِ: وہ عورت خدا سے فریاد کرتی ہے۔ اَشْکَاہُ (افعال) کے معنی کسی کو صاحب شکوہ کرنے کے ہیں جیسے اَمْرَضَہٗ، اس کو صاحب مرض کر دیا، اور یہ ازالہ شکایت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ شَکَوْنَا اِلٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حَرَّالرَّمْضَآءِ فِیْ جِبَاھِنَا وَاَکُفِّنَا فَلَمْ یُشْکِنَا. کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی پیشانیوں اور ہاتھوں میں گرمی کی شدت کی شکایت کی لیکن آپ نے ہماری شکایت کا ازالہ نہ کیا۔

شکایت کرنے والے کو شَاکِیْ اور جسکی شکایت

کرے اسکو مَشْکُوٌّ اور مَشْکِیٌ اور اس کے بیان کو شکویٰ اور جس سے شکایت کی جائے اسکو مَشْکُوٌّ اِلَیْہِ کہتے ہیں۔

شَکْوَۃٌ اصل میں اس چھوٹے مشکیزے کو کہتے ہیں جو بکرے کے شیر خوار بچہ کی کھال سے بنایا گیا ہو۔ اسکی جمع شَکَوَاتٌ آتی ہے مِشْکٰوۃ اسم وہ طاق جسمیں چراغ رکھا جاتا ہے۔ امام قرطبی لکھتے ہیں کہ مِشْکٰوۃ۔ مِفْعَلَۃ کے وزن پر ہے، ڈول کی طرح چمڑے کا بنا ہوا ایک برتن ہے جسمیں پانی ٹھنڈا رکھا جاتا ہے۔

وَالْمِشْکَاۃُ وِعَاءٌ مِنْ اَدَمٍ کَالدلو یُبَرَّدُ فِیھَا المَاءُ (قرطبی ص۲۵۷/۱۲)

بَثِّیْ: بَثِّیْ. بَثٌّ: کے معنی کسی چیز کے پراگندہ کرنے اور ابھارنے کے ہیں، اسی طرح ہوا سے خاک اڑنے، غم سے بیقرار ہو جانے اور راز کے افشاء کرنے کے لئے بَثٌّ کا استعمال ہوتا ہے۔ وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَابَّۃٍ، میں بَثٌّ سے مراد اللہ تعالیٰ کا ان جانوروں کو پیدا کرنا ہے جو پہلے موجود نہ تھے۔ بَثَّ الرِّیْحُ التُّرَابَ: ہوا نے خاک اڑائی۔ اور بَثُّ النَّفْسِ: کے معنی نفس کی بیقراری اور سخت ترین غم کے ہیں۔ بَثَثْتُہٗ فَانْبَثَّ: میں نے اسے پراگندہ کیا تو وہ پراگندہ ہو گیا۔ فَکَانَتْ ھَبَاءً مُّنْبَثًّا، اسی سے ہے، یعنی پھر وہ منتشر ذرات کی طرح اڑنے لگیں۔

انسان پر جو رنج اور غم طاری ہوتا ہے اسکی دو حالتیں ہوتی ہیں، اگر تو انسان اپنے غم پر قابو پاکر چھپالے اور اس کو ظاہر نہ ہونے دے تو اسکو ھَمٌّ کہتے ہیں، اور اگر حزن وغم شدید ہو جائے اور انسان اسپر بے قابو ہو کر دوسرے کو بیان کردے تو اسکو بَثٌّ کہا جاتا ہے۔ تو گویا بَثٌّ شدید اور سخت حزن ہے اور ھَمٌّ کا درجہ اس سے سہل ہے، جسکو حزن کہا ہے، مطلب یہ کہ میں اپنی ہر مصیبت میں خدا ہی کو پکارتا ہوں چاہے چھوٹی ہو یا بڑی۔

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ: یہ بَثَثْتُہٗ، سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز کو متفرق کرنے اور بکھیر دینے کے ہیں۔ مصائب شدیدہ چونکہ انسان کے افکار کو متفرق کر دیتے ہیں اس لئے ان کو بَثٌّ کہتے ہیں، اور لغت میں بث اس مصیبت کو کہا جاتا ہے جسکے اخفاء پر انسان قادر نہ ہو۔

حقیقۃ البث فی اللُّغَۃ ما یرد علی الانسان من الاشیاء المھلکۃ التی لا یتھیأ لہ ان یُخْفِیَھَا (قرطبی)۔

قال الرازی: البث ھو التفریق (کبیر)

اصل البث: اثارۃ الشئ وتفریقہ و
بث النفس ما انطوت علیہ من الغم
والسّر۔ (جمل، روح)

امام راغب فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ میں
بَثّ سے مراد سخت اور پوشیدہ غم ہے جو وہ ظاہر
کر رہے ہیں اس صورت میں بَثّ مصدر بمعنی مفعول
ہوگا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر بمعنی فاعل ہو
یعنی وہ غم جس نے میرے فکر کو بکھیر دیا جیسا کہ تَوَزَّعَنِی
الفِکرُ۔ کا محاورہ ہے یعنی مجھے فکر نے پریشان
کر دیا۔ (راغب، کبیر) صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ
البث: اصعب الھم الذی لا یصبر علیہ
صاحبہٗ۔ (کشاف)

رَوْحٌ: وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ:
اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ (ماجدی)

رَوْحٌ: رَاحَ یَرُوْحُ سے مصدر ہے، سَمِعَ
اور نَصَرَ، دونوں سے آتا ہے، بمعنی فیض،
رحمت، راحت۔ امام راغب نے اس کے معنی
تنفس یعنی سانس لینے کے لئے ہیں اور لکھا ہے
رَوْحٌ سے وسعت کا مفہوم پیدا کیا گیا ہے چنانچہ
کہا گیا ہے قَصْعَۃٌ رَوْحَاءُ وسیع پیالہ۔
اور آیت کریمہ لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ،
مت ناامید ہو اللہ کے فیض سے، یعنی اللہ کی
کشائش اور رحمت سے کیونکہ یہ بھی رَوْح کا
ایک جزو ہے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ تنفس باعث
فرحت و راحت اور سبب رحمت ہے اور اسی کے
ذریعہ سے خوشبو کا احساس ہوتا ہے، اس لئے
فرحت و تازگی، آسائش، خوشبو، نسیم کی
خنکی اور خوش آئندہ ہوا، کے لئے اسکا استعمال
عام ہے۔

علامہ ابن جوزی نے ابن عباسؓ سے رحمت
اور ابن زید سے فرحت اور کشائش اور ابن
قاسم سے تَوَسُّع کے معنی نقل کئے ہیں۔ اصمعی
لغوی کہتے ہیں کہ رَوْح کے معنی غم کے بعد دل
کا سکون اور استراحت حاصل کرنا ہے۔ قال
قال الاصمعی: الروح: الاستراحۃ من
غم القلب (زاد المسیر)

اصل میں رَوْحٌ یا رَوَاحٌ کے معنی شام
کو چلنے کے ہیں اب اس لفظ کا استعمال مطلق
چلنے کے معنی میں کیا جاتا ہے۔ عہد حاضر میں اہل
عرب رُحْ کا لفظ بمعنی جا، تشریف لے جائیے
کہ کرتے ہیں اور اِذْھَبْ کا استعمال بہت کم ہے
یَوْمٌ رَوْحٌ: خوشگوار دن۔ لَیْلَۃٌ رَوْحَۃٌ
خوشگوار رات۔ جمع رَوْحَاتٌ۔

حکی الامام الرازی عن الاصمعی
اللغوی: اَنَّ الرَّوْحَ ما یجدہ الانسانُ

من نسیم الهواء فیسکن الیه، وترکیب الراء والواو والحاء یفید الحرکۃ والاهتزاز، فکلما یهتز الانسان له ویلتذ بوجوده فهو روح۔

مُزْجَاۃٌ: وَجِئْنَا بِبِضَاعَۃٍ مُّزْجَاۃٍ:

مُزْجَاۃٌ: اسم مفعول مؤنث ہے اسکا مذکر مُزْجیٰ آتا ہے۔ یہ باب افعال کے مصدر اِزْجَاءٌ سے ہے جس کے معنی ہیں ھنکانا، چلانا وغیرہ۔ حدیث میں ہے۔ کَانَ یَتَخَلَّفُ فِی الْمَسِیْرِ فَیُزْجِی الضَّعِیْفَ۔ آپ سفر میں پیچھے رہتے اور ناتواں کمزور کو چلاتے تاکہ وہ قافلہ کے ساتھ مل جائے۔

ایک شاعر کہتا ہے۔ ؎

وَحَاجَۃٌ غَیْرُ مُزْجَاۃٍ عَنِ الْحَاجِ۔

کہ حاجتمندوں کی بعض حاجتیں آسان اور حقیر نہیں ہوتیں کہ ان کو پورا کیا جا سکے۔

رَجُلٌ مُّزْجیٰ: ہنکایا ہوا۔ یعنی بے قدر آدمی۔ اَلتَّزْجِیَۃُ: کے معنی کسی چیز کو دفع کرنے کے ہیں تاکہ وہ چل پڑے جیسے کہ بادلوں کو ہوا کا چلانا۔ قرآن پاک میں ہے یُزْجِی سَحَابًا، اللہ ہی بادلوں کو چلاتا ہے اور یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ: تمہارے لئے سمندروں میں جہازوں کو چلاتا ہے۔ اور اَزْجَیْتُ رَدِیَّ

التَّمْرِ: کے معنی ہیں میں نے نکمی کھجور کو پھینکدیا، اور زَجَا (ن) لازم ہے۔ اَزْجیٰ کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔ زَجَا الْخَرَاجُ: خراج سہولت سے جمع ہوگیا۔ صفت فاعلی کا صیغہ اس سے زَاجٍ آتا ہے خَرَاجٌ زَاجٍ وہ خراج جو سہولت سے جمع ہوجائے۔

وَالْاِزْجَاءُ السَّوْقُ بِدَفْعٍ۔ (قرطبی)

آثَرَ: لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا۔

البتہ پسند کرلیا تجھ کو اللہ نے ہم سے (معارف)

اٰثَرَ: یہ باب افعال کے مصدر ایثار سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو اس کے افضل ہونے کی وجہ سے دوسری چیز پر ترجیح دینا اور پسند کرنا اسی سے آثَرْتُہٗ ہے جس کے معنی ہیں میں نے اسے پسند کرلیا۔ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلیٰ اَنْفُسِہِمْ: وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں۔ (راغب) اسم فاعل مُؤْثِرٌ آتا ہے، مجرد اَثَرٌ ہے۔ اَثَرْتُ الْحَدِیْثَ: حدیث بیان کرنا، فاعل اٰثِرٌ، اور صفت مفعولی مَاثُوْرٌ: حَدِیْثٌ مَاثُوْرٌ: مشہور حدیث جسکو لوگ ہر زمانہ میں نقل کرتے ہیں۔ لَا یَبْقیٰ مِنْکُمْ اٰثِرٌ: تم میں سے کوئی خبر

دینے والا باقی نہ رہے، یہ حضرت علی نے خارجیوں
کے لیئے بددعا کی۔ مَاثَرَۃٌ: یا مَاْثُوْرَۃٌ پسندیدہ
فعل اسکی جمع مَآثِرُ آتی ہے بمعنی انسانی
مکارم جو نسلاً بعد نسل روایت ہوتے چلے آتے
ہیں، پھر اسی سے بطور استعارہ آثَرَ کو بمعنی
فضیلت لے لیا جاتا ہے، لَقَدْ آثَرَكَ اللّٰهُ:
اَیْ فَضَّلَكَ اللّٰهُ: اللہ نے آپکو فضیلت بخشی،
اَثَرُ الشَّیْءِ: بقیہ علامت، کسی شی کا حاصل
ہونا جو اصل شئی کے وجود پر دال ہو اسکی
جمع آثار ہے، قرآن پاک میں ہے فَانْظُرْ
اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ، تم رحمت الٰہی کے نشانات
پر غور کرو۔

اَثَرْتُ التُّرَابَ: کے معنی مٹی اڑانے کے ہیں،
اسکا مصدر اِثَارَۃٌ اور فاعل مُثِیْرٌ ہے دراصل
باب افعال سے ہے، اسکا عین کلمہ حرف یاء ہے
اسکی اصل اَثْیَرَ ہے، یاء کی حرکت نقل
کرکے ثاء کو دی گئی پھر یاء ماقبل مفتوح
ہوجانے کی وجہ سے الف سے بدل گئی اور الف
التقاء ساکنین کی بناء پر گر گیا (قرطبی)
اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَثَرْتُ التُّرَابَ: میں
عین کلمہ واو ہو، یعنی اسکی ماضی اَثْوَرَ ہو۔
تعلیل دونوں کی ایک ہی ہے۔ مُثِیْرَۃٌ: وہ بیل
اور گائے وغیرہ جو ہل جوتے جاتے ہیں کیونکہ وہ
بھی مٹی اڑاتے ہیں وَلَا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ:
وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو جو زمین کو جوتتی
ہو۔ اَلثَّوْرُ: بیل، یہ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے

خَاطِئِیْنَ: وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِیْنَ:
یہ خَطِئَ یَخْطَئُ سے ہے بمعنی عمداً غلطی کرنا
اور اَخْطَاءٌ (افعال) کے معنی بلا عمد غلطی کرنا۔
چونکہ جناب یوسف کے حق میں بھائیوں کی غلطی عمداً
تھی اسلیئے خَطِئَ سے اسم فاعل خٰطِئِیْنَ لائے ہیں،
یُقَالُ خَطِئَ اِذَا كَانَ عَنْ عَمْدٍ۔ وَاَخْطَأَ اِذَا لَمْ یَكُنْ عَنْ عَمْدٍ
مُخْطِئٌ: اسکو کہتے ہیں کہ اس کا ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہے مگر غلطی
سے برا کام ہو جاتا ہے۔ اور الخاطی بالارادۃ برا کام کرنے
والے کو کہتے ہیں، قرآن پاک میں ایسے ہی
لوگوں کے لیئے فرمایا گیا ہے: لَا یَاْكُلُهٗٓ اِلَّا
الْخٰطِئُوْنَ: کہ اس خوراک کو جو کہ دوزخ میں
دی جائیگی گناہ گاروں کے سوا کوئی نہ کھائے گا

تَثْرِیْب: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ:
کچھ الزام نہیں تم پر آج (معارف)
تَثْرِیْبٌ: سرزنش، الزام، گناہ پر ڈانٹنا، جھڑکنا
بروزن تفعیل مصدر ہے (لغات القرآن)
ثَرَبَ یَثْرِبُ ثَرْبًا: ملامت کرنا، کسی کے
فعل کو برا بتانا، ثَرْبٌ: وہ چربی باریک
جو مینڈھے کی اوجھڑی اور آنتوں پر آجاتی ہے
کہتے ہیں: اَثْرَبَ الْكَبْشُ: مینڈھے کے

اور آنتوں پر چربی چڑھ گئی۔ اسکی جمع ثُرُوْبٌ اور اَثْرُبٌ آتی ہے۔ اَثَارِبُ جمع الجمع ہے۔
نھی عن الصلوٰۃ اذا صارت الشمس کالاَثَارِبِ۔
تَثْرِیْبٌ کے معنی ثَرْبٌ کو زائل کرنے یعنی چربی اُتارنے کے ہیں، چربی اتارنے سے جانور نہایت لاغر اور کمزور ہو جاتا ہے، پھر یہیں سے لفظ تثریب اس عار اور ملامت کے لئے مستعار لیا گیا ہے جس سے انسان کی عزت وآبرو داغدار ہو جائے حدیث میں ہے:
اِذَا زَنَتْ اَمَۃُ اَحَدِکُمْ فَلْیَضْرِبْھَا وَلَا یُثَرِّبْھَا۔ جب تم میں سے کسی کی باندی زنا کرے تو وہ حد لگائے اور پھر اس کو زنا پر ملامت نہ کرے۔
قال الرازی: واصل التثریب من الثرب وھو الشحم الذی ھو غاشیۃ الکرش ومعناہ ازَالَۃُ الثرب کما ان التجلید ازالۃُ الجلد (کبیر)
ایک شاعر بشر نامی کہتا ہے۔

عَفَوْتُ عَنْھُمْ عَفْوَ غَیْرِ مُثَرِّبٍ
وَتَرَکْتُھُمْ لِعِقَابِ یَوْمٍ سَرْمَدٍ

تُفَنِّدُوْنَ: اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنَ۔ میں یقینا یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں اگر تم مجھے سٹھیا ہوا نہ کہو۔
مولانا عبد الماجد دریا بادی حاشیہ تفسیر پر لکھتے ہیں کہ فند وہی شئی ہے جسے اردو میں سٹھیا جانا کہتے ہیں۔ یعنی کبر سنی کی بنا پر عقل وحواس میں فتور آجاتا ہے۔
تُفَنِّدُوْنَ: مصدر تَفْنِیْدٌ سے جس کے معنی جھوٹ کمزوری، عاجزی، جہالت اور غم کی طرف منسوب کرنے کے ہیں۔
امام راغب لکھتے ہیں کہ اَلْفَنَدُ کے معنی رائے کی کمزوری کے ہیں، اسی سے تَفْنِیْدٌ ہے جس کے معنی کمزور رائے یا فاتر العقل بنانے کے ہیں اور اِفْنَادٌ کے معنی بہکی بہکی باتیں کرنے کے ہیں۔ وَالْفَنَدُ: ضعف الرائے من کبرٍ۔ وَالتَّفْنِیْدُ: اللوم وتضعیف الرائے۔ (قرطبی)
واصل التفنید من الفند وھو ضعف الرائے (جمل) وقال صاحب الکشاف: والتفنید: النسبۃ الی الفند، وھو الخرف وانکار العقل من ھرم۔
فَنِدَ (س) فَنَدًا: بڑھاپے کی وجہ سے ضعیف العقل ہونا، کہتے ہیں اَفْنَدَ الْکِبَرُ اسکو بڑھاپے نے ضعیف العقل کر دیا۔
علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ: ضعیف العمر مرد کو

تو شَيْخٌ مُفَنَّدٌ : (سٹھیایا ہوا بوڑھا) کہا جاتا ہے لیکن بڑھیا عورت کو عَجُوزٌ مُفَنَّدَةٌ : نہیں کہا جاتا، کیونکہ یہ عنفوان شباب ہی میں صاحبۃ الرائے نہیں تھی کہ بڑھاپے میں ناتز العقل ہوتی۔

يقال شيخ مُفَنَّدٌ ولا يقال عجوز مفندة : لا نها لم تكن في شبيبتها ذات رائ فتنفد في كبرها۔ (کشاف)

بَدْوٌ : وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ : آپ کو صحرا سے لے آیا : بَدْوٌ : کے معنی اصل میں ظاہر ہونے کے ہیں، اس لئے ہر وہ مقام جہاں کی سب چیزیں ظاہر ہوں بَدْوٌ کہلاتا ہے جنگل میں بھی سب چیزیں کھلی اور ظاہر ہوتی ہے اسکا نام بَدْوٌ ہو گیا۔ یہ حَضَر کے مقابلہ کا لفظ ہے کنعان اسوقت مصر کے مقابلہ میں جو تہذیب و تمدن کا مرکز تھا ایک دیہات ہی کی حیثیت رکھتا تھا، اور پھر جناب یعقوب چونکہ صاحب مال مویشی تھے اسلئے باہر کھلی آبادی میں رہتے تھے۔

بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے : بَدْو : اس جگہ کا نام ہے جہاں حضرت یعقوب عراق سے منتقل ہو کر تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ جمیل شاعر نے اس جگہ کو اپنے کلام میں بیان کیا ہے۔ ؎

وَاَنْتِ الَّتِيْ حَبَّبْتِ شَغْبًا اِلٰى بَدَا
اِلَيَّ وَاَوْطَانِيْ بِلَادٌ سِوَاهُمَا

اور محاورہ ہے۔ بدا القوم بَدْوًا : قوم بدا میں آئی۔ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ : اِلٰى جاء بكم من مكان بدا (قرطبی)

قال ابن الانباری : ان بدا اسم موضع معروف (روح)

اَلْحِقْنِيْ : وَاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ، اَلْحِقْ، اِلْحَاقٌ سے امر کا صیغہ ہے، مجھے ملا دے، مجھ کو شامل کر دے، نون وقایہ۔ یَ۔ ضمیر واحد متکلم۔

حَرَصْتَ : وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ اور اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں اگرچہ آپکا کیسا ہی جی چاہے۔

الْحِرْصُ کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کرنے میں پوری کوشش کرنا۔ ومعنى الحرص : طلب الشئ باقصى ما يمكن من الاجتهاد (کبیر)

الحرص، طلب الشئ باختيار (قرطبی)

باب اسکا ضرب ہے۔ جب یہ لالچ اور کسی چیز کی طلب کے معنی میں ہو تو حرف عَلٰى کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ دوسرا مفہوم اسمیں کسی چیز کو پھاڑنے اور چھیلنے وغیرہ کا پایا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے حَرَصَ القصَّارُ الثوبَ: دھوبی نے کپڑا پھاڑ دیا۔

اِسْتَايْئَسَ: حَتّٰى اِذَا اسْتَايْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا۔ یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا۔ تھا۔ یعنی مدت دراز گذرنے کے باوجود کفار پر عذاب نہ آنے سے پیغمبر یہ خیال کرکے مایوس ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کے اجمالی وعدۂ عذاب کا جو وقت ہمنے اپنے اندازے سے اپنے ذہنوں میں مقرر کر رکھا تھا اس وقت میں کفار پر عذاب نہ آئیگا اور حق کا غلبہ ظاہر نہ ہوگا۔ اور ان پیغمبروں کو گمان غالب ہو گیا کہ وعدۂ الٰہی کا اپنے اندازے سے وقت مقرر کرنے میں ہمارے فہم نے غلطی کی ہے (معارف)

اِسْتَايْئَسَ: یہ باب استفعال کے مصدر اِسْتِيْئَاسٌ سے واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اصل مادہ مجرد۔ اَلْيَاْسُ۔ ہے جس کے معنی ناامید ہونے کے ہیں، يَئِسَ (مجرد) اور اِسْتَيْاَسَ باب استفعال، دونوں ہم معنی ہیں جیسے عَجِبَ اور اِسْتَعْجَبَ اسی طرح سَخِرَ وَاسْتَسْخَرَ، لہذا اِسْتَيْئَسَ بمعنی يَئِسَ ہے۔ (راغب، قرطبی۔ ص ۲۴۱/۹ج)

والاِسْتِفْعَال بمعنی المجرد (روح)

كُذِبُوْا: وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا۔ اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا،

لفظ كِذْبٌ: صِدْقٌ کے مقابلہ میں ہے اصل میں یہ دونوں قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں، خواہ اسکا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے، وعدہ کے قبیل سے ہو یا وعدہ کے قبیل سے نہ ہو، الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں پھر قول میں بھی خبر کے لئے آتے ہیں، دیگر اصناف کلام میں ان کا استعمال نہیں ہوتا مگر کبھی ضمنی طور پر دیگر اصناف کلام میں بھی آجاتے ہیں، جیسے استفہام، امر، دعاء وغیرہ۔ مثلاً اَزَيْدٌ فِى الدَّارِ۔ کیا زید مکان میں ہے، یہ بظاہر استفہام کلام ہے مگر ضمناً اس میں خبر کے معنی پائے جاتے ہیں، یعنی یہ کہ متکلم زید کی حالت سے بے خبر ہے۔ (راغب)

لفظ۔ كُذِبُوْا کا حاصل اپنے تخمینہ اور خیال کا غلط ہونا ہے جو ایک قسم کی اجتہادی غلطی ہے۔ (معارف القرآن)

کلام اگر واقع کے مطابق نہ ہو تب بھی

کاذب ہے اور عقیدے کے مطابق نہ خواہ
واقع کے مطابق ہو تب بھی کاذب کا اطلاق
اس پر ہوتا ہے جیسے کہ اِنَّ الْمُنَافِقُوْنَ
لَکَاذِبُوْنَ ، میں اسی معنی کے لحاظ سے
منافقین کو کاذب قرار دیا گیا ہے حالانکہ
ان کا قول واقع کے مطابق تھا۔
لفظ کُذِبُوْا ۔ میں تین احتمال ہیں جنمیں
دو مشہور ہیں ۱؎ ایک قرأت کُذِّبُوْا
(تکذیب) سے مجہول کا صیغہ ہے، یہ قرأت
جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی
کی ہے اور یہ وہ قرأت ہے جس سے قرآن پاک
کی آیت بالکل بے غبار ہو جاتی ہے اور معنی
میں کوئی سُقم نہیں رہتا، عروہ ابن زبیر
نے اس آیت کے بارے میں حضرت عائشہؓ
سے سوال کیا کہ یہ کُذِبُوْا ہے یا کُذِّبُوْا بالتشدید
ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ یہ کُذِّبُوْا
(تشدید) ہے۔ اس پر ابن زبیر نے ایک
شبہ کا کیا اظہار کیا کہ پھر ظَنُّوْا اَنَّهُمْ
قَدْ كُذِّبُوْا میں لفظ ظن۔ کے کیا معنی
ہوں گے، کیونکہ انبیاء کو اپنی کافر امتوں
کی تکذیب کا یقین تھا، جناب عائشہؓ
نے فرمایا کہ میری حیات کی قسم انبیاء کو تکذیب
کا یقین تھا، ابن زبیر نے کہا کہ اگر اس آیت کو
وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا (ذال کی
تخفیف سے) پڑھیں تو؟ اس پر حضرت عائشہؓ
نے فرمایا خدا کی پناہ انبیاء خدا کی ذات سے
اس طرح کبھی تصور بھی نہیں کرتے کہ خدا
ان سے ایک وعدہ کرے اور وہ جھوٹ ہو
بلکہ اصل یہ ہے کہ آیت سے مراد انبیاء کے
نو مسلم پیروکار ہیں۔ جب خدا کے کئے ہوئے
وعدہ نصرت کو دیر ہو گئی اور انبیاء کافر قوم کے
ایمان سے مایوس ہو گئے، ادھر ایمان لانے
والوں کو آزمائشوں اور مشکلات کا سامنا کرنا
پڑ رہا تھا ان حالات کو دیکھ کر اللہ کے رسولؐ
کو خیال ہونے لگا کہ اب یہ ماننے والا گروہ
بھی تکذیب کر دیگا اتنے میں خدا کی مدد آ گئی
اور حق کا فیصلہ کر دیا گیا۔
دوسری قرأت کُذِبُوْا۔ ذال کی تخفیف
کے ساتھ ہے۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں
نے کُذِبُوْا تخفیف سے پڑھا ہے۔ مطلب یہ کہ
رسولوں نے خیال کیا کہ وعدۂ نصرت کے بارے میں
ان سے معاذ اللہ جھوٹ کہا گیا۔ جب ابن عباسؓ
سے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ انسان
تھے اور بشری تقاضا کے مطابق اُن کو یہ خیال گذرا
لیکن جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے جناب عائشہ
نے ان معنی کا شدت شدت کے ساتھ انکار کیا ہے

ابن عباسؓ سے اس آیت کے ایک دوسرے معنی بھی مذکور ہیں وہ یہ کہ : رُسل کو مدت دراز تک دعوت دینے کے باوجود جب مایوسی ہوئی اور اُمت کافرہ کو یہ خیال ہوگیا کہ رسولوں نے جو ڈراوے بتائے تھے وہ جھوٹ ہیں تو خدا کی امداد آپہنچی۔ اس صورت میں ظَنُّوْا اور کُذِبُوْا دونوں کی ضمیریں کفار کی جانب ہیں یعنی کفار نے یہ خیال کرلیا کہ انبیاء کی طرف سے جو کچھ اِن کو کہا گیا تھا وہ جھوٹ تھا ایک قریشی نے سعید بن جبیر سے سوال کیا کہ اے ابو عبد اللہ مجھے اس حرف کُذِبُوْا کے بارے میں کوئی تسلی بخش ارشاد فرمائیے، میں جب اس آیت کو پڑھتا ہوں تو خیال کرتا ہوں کہ کاش میں اس سورت کو نہ پڑھتا ابن جبیر نے فرمایا کہ : نعم حَتّٰی اِذَا اسْتَایْئَسَ الرُّسُلُ مِن قَومِهِم اَنْ تُصَدِّقُوْهُمْ وَظَنَّ الْمُرْسَلُ اِلَيْهِمْ اَنَّ الرُّسُلَ قَدْ كَذَبُوْا ۔ یعنی مرسل الیہم نے خیال کیا کہ رسولوں نے (معاذ اللہ) ان سے جھوٹ بولا ہے۔

مجاہد نے اسی تاویل کی رُو سے وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كَذَبُوْا معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ یعنی کفار نے یہ خیال کیا کہ رسولوں نے جھوٹ بولا ہے۔

اہل تفسیر نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے، اس آیت کی تفسیر میں جو راہ حضرت مفتی صاحب نے اختیار کی ہے، وہ سب سے زیادہ بہتر ہے ہم ذیل میں حضرت کی تحقیق نقل کرتے ہیں۔ لفظ کُذِبُوْا کا حاصل اپنے تخمینہ اور خیال کا غلط ہونا ہے جو ایک قسم کی اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے البتہ انبیاء اور دوسرے مجتہدین میں یہ فرق ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جب کوئی اجتہادی غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُن کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتے بلکہ ان کو باخبر کرکے حقیقت کھول دیتے ہیں، دوسرے مجتہدین کا یہ مقام نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ صلح حدیبیہ اس مضمون کے لئے کافی شاہد ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ اس واقعہ کی بنیاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خواب ہے جو آپ نے دیکھا کہ آپ مع صحابہ کے بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی بحکم وحی ہوتا ہے۔ اس لئے اس

واقعہ ہونا یقینی ہو گیا۔ مگر خواب میں اس کا
کوئی خاص وقت اور مدت نہیں بتلائی
گئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے
اندازہ سے خیال فرمایا کہ اسی سال ایسا
ہوگا، اس لئے صحابہ کرام میں اعلان کرکے
ان کی خاصی تعداد کو ساتھ لیکر عمرہ کے لئے
مکہ معظمہ کو روانہ ہو گئے۔ مگر قریش مکہ نے
مزاحمت کی اور اس وقت طواف وغیرہ کی نوبت نہ آئی
بلکہ اسکا مکمل ظہور دو سال بعد ۸ھ میں
فتح مکہ کی صورت سے ہوا۔ اور اس واقعہ
سے معلوم ہو گیا کہ جو خواب آپ نے دیکھا تھا
وہ حق اور یقینی تھا مگر اس کا وقت جو قرائن
یا اندازہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے مقرر فرما لیا تھا اسمیں غلطی ہوئی مگر
اس کا ازالہ اسی وقت ہو گیا۔

اسی طرح لفظ کُذِبُوْا کا بھی مفہوم ہے،
کہ کفار پر عذاب آنے میں دیر ہو گئی اور
جو وقت اندازہ سے انبیاء علیہ السلام
نے اپنے ذہن میں مقرر کیا تھا اس وقت
عذاب نہ آیا تو ان کو یہ گمان ہوا کہ ہم نے
وقت مقرر کرنے میں غلطی کی ہے، یہ تفسیر
حضرت عبد اللہ بن عباس سے منقول
ہے اور علامہ طیبی نے لکھا ہے کہ یہ روایت
صحیح ہے کیونکہ صحیح بخاری میں ذکر کی
گئی ہے۔

اور بعض قراتوں میں کُذِّبُوْا، تشدید،
کے ساتھ ہے جو مصدر تکذیب سے مشتق
ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ
انبیاء نے جو اندازہ سے وقت عذاب
مقرر کیا تھا اس وقت پر عذاب نہ آنے
سے ان کو یہ خطرہ ہو گیا کہ اب جو مسلمان
ہیں وہ بھی ہماری تکذیب نہ کرنے لگیں کہ
جو کچھ ہمنے کہا تھا وہ پورا نہیں ہوا ایسی
حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ
پورا کر دکھایا منکروں پر عذاب
آپڑا اور مومنین کو اس سے نجات
ملی اس طرح ان کا غلبہ ظاہر ہو گیا۔
(معارف القرآن)

بحمدہ تعالیٰ سورہ یوسف کے
لغات پورے ہو گئے۔
۱۲ر رمضان المبارک مطابق
۹ـ۹ـ۷۶ بروز جمعرات۔
عبد الرشید

شَرحُ اَلفاظِ القُرآنِ مِن سُورَۃِ الرَّعدِ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عَمَدٍ : اَللّٰهُ الَّذِىْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ۔

اَلْعَمَدُ ۔ کے معنی کسی چیز کا قصد کرنے اور اسپر ٹیک لگانے کے ہیں اور العماد وہ چیز ہے جس پر ٹیک لگائی جائے یا بھروسہ کیا جائے ۔ اور آیت کریمہ : اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۔ میں وہ چیزیں مراد ہیں جن پر انہیں بھروسہ تھا۔

عَمَدْتُ الشَّیْءَ : کے معنی ہیں کسی چیز کو سہارا دیکر کھڑا کرنا۔ عَمَدْتُ الْحَائِطَ میں نے دیوار کو سہارا دیکر کھڑا کیا ۔ اور اَلْعُمُوْدُ : اس لکڑی اور بلی کو کہتے ہیں جس کے سہارے خیمہ کھڑا کیا جاتا ہے اور اس ستون کو بھی عُمُوْدٌ کہتے ہیں جس پر مکانات وغیرہ کی چھتیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ اسکی جمع عُمُدٌ اور عَمَدٌ آتی ہیں۔ قرآن پاک کی آیت فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ : میں ایک قرأت عُمُدٍ : کی بھی ہے، یعنی آگ کے لمبے لمبے ستون (راغب)

عِمَادٌ اور عُمُوْدٌ وہ لکڑی جسپر سہارا لگاکر کھڑا ہوا جائے۔ هُوَ رَفِيْعُ الْعِمَادِ : وہ شریف انسان ہے۔ وہ دراز قامت ہے۔ حدیث ہے۔ زَوْجِیْ رَفِيْعُ الْعِمَادِ۔ یعنی میرا خاوند بڑا شریف اور سخی ہے اور عالی خاندان کا ہے لوگ اپنی مشکلات میں اس کا سہارا لیتے ہیں ۔

اور عَمِيْدٌ : وہ سردار جس پر معاملات میں لوگ اعتماد اور بھروسہ کریں ۔

عَمِيْدُ الْجَيْشِ : فوج کا سردار، فوج کا افسر۔ اور تَعَمَّدَ (تَفَعَّلَ) کے معنی ہیں قصدًا کوئی کام کرنا، قرآن میں ہے ۔ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا ۔ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۔

تَرَوْنَهَا : کی ضمیر میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ضمیر منصوب کا مرجع سمٰوات کو مانا جائے اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ، اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔ رؤیت سمٰوات کا ثبوت اور وجود عمد کی نفی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ۔ تَرَوْنَهَا کی ضمیر، ھا ۔ عَمَدٍ : کی طرف ہو اور جملہ تَرَوْنَهَا،

اس صورت میں عَمَدٍ کی صفت ہوگا۔
ترجمہ یہ ہوگا کہ : خدا نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تمہیں نظر آئیں۔
اس صورت میں نفی عَمَد کی نہیں بلکہ رُویت کی ہوگی۔ یعنی عمد تو ہیں مگر تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اور مراد عمد سے حق تعالیٰ کی قدرتِ حفظ و تدبیر ہے اور ظاہر ہے کہ یہ انسان کیلئے غیر مرئی ہے۔
امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں کہ : وَقَدْ دَلَّلْنَا عَلٰی اَنَّ هٰذِهِ الْاَجْسَامَ اِنَّمَا بَقِيَتْ وَاقِفَةً فِي الْجَوِّ الْعَالِي بِقُدْرَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَحِيْنَئِذٍ يَكُوْنُ عَمَدُهَا هُوَ قُدْرَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی (کبیر) وَقَالَ الْقُرْطُبِی۔ اَلْعَمَدُ جمع عَمُوْدٍ۔

یُدَبِّرُ: یُدَبِّرُ الْاَمْرَ :

یہ تَدْبِیْرٌ سے واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ تَدْبِیْرٌ کے معنی ہیں انجام کو سوچنا، انتظام کرنا، کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے غور و فکر کرنا۔ فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا : وہ فرشتے جو امورِ دنیا کا انتظام کرتے ہیں۔ اور مُدَبَّرٌ وہ غلام جو آقا کے مرنے کے بعد آزاد ہو۔ اور دَبِیْرٌ (فَعِیْلٌ) پیچھے کے معنی میں آتا ہے۔ اسکی ضد قبیل ہے کہتے ہیں ھُوَ لَا یَعْرِفُ قَبِیْلَهٗ مِنْ دَبِیْرِهٖ : وہ آگے پیچھے کی تمیز نہیں رکھتا یعنی پکا جاہل ہے۔
دُبُرٌ اور دُبْرٌ : پشت، مقعد، ہر چیز کا پچھلا حصہ۔ انجام۔ اسکی جمع اَدْبَارٌ ہے۔ قرآن میں ہے۔ فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ : ان سے پیٹھ نہ پھیرنا یعنی اُن سے شکست کھا کر بھاگ نہیں جانا۔
تُدَبِّرُ الْاَمْرَ : کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ انسان کی تدبیر کسی چیز کو نہ پیدا کر سکتی ہے نہ بنا سکتی ہے۔ تمام اشیاء عالم کا نظام تدبیر قدرت سے چلتا ہے۔

مَدَّ : وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ :

اور وہ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا۔
مَدٌّ کے اصل معنی کسی چیز کو کھینچنے اور بڑھانے کے ہیں اسی سے عرصہ دراز کو مُدَّةٌ کہتے ہیں۔
زمین کا پھیلانا اس کے کرہ ہونے کے منافی نہیں کیونکہ گول چیز جب بہت بڑی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ الگ الگ ایک پھیلی ہوئی سطح ہی نظر آتا ہے اور قرآن کریم کا خطاب عام لوگوں سے انہی کی نظروں کے مطابق ہوتا ہے۔ ظاہر دیکھنے والا اس کو ایک پھیلی ہوئی سطح دیکھتا ہے۔ اس لئے اس کو پھیلانے سے تعبیر کر دیا گیا۔ امام راغب۔ ابو عبیدہ اور مجدالدین فیروز آبادی نے لکھا ہے کہ کسی چیز

اور بھلائی میں افزونی کرنے کے موقع پر امداد (افعال) اور اس کے مشتقات کا استعمال ہوتا ہے۔ اور دکھ اور شر کی زیادتی کو بیان کرنا ہوتا ہے تو نصر سے یعنی ثلاثی مجرد سے بولا جاتا ہے، یعنی مادہ ایک ہی ہے لیکن استعمال میں فرق ہے۔ خیر میں زیادتی کیلئے ثلاثی مزید اور شر و عذاب اور تکلیف میں زیادتی کے لئے ثلاثی مجرد کا استعمال کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے۔ وَاَمْدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ۔ اور جس طرح کے میوے اور گوشت کو ان کا جی چاہیگا ہم ان کو عطا کریں گے۔ وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ۔ اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائیگا۔

ثلاثی مجرد کا استعمال، وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا۔ وَيَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔

اصل میں قرآن پاک کو یہاں زمین کی کیفیت پر بحث نہیں کرنا بلکہ یہ بات واضح کرنی ہے کہ زمین خدا کی پیدا کردہ ایک مخلوق ہے یہ کوئی دیوی دیوتا نہیں ہے یہ محض خدا کا پھیلایا ہوا ایک فرش ہے جس پر اسکی مخلوق آزادی سے چل پھر سکتی ہے مَدَّ و، امتداد کرویّت کی نفی لازم نہیں آتی۔

امام فخرالدین رازی ساتویں صدی ہجری کے مفسر ہیں وہ خود لکھتے ہیں کہ زمین کی کرویت مسلم ہے اسمیں مکابرہ فضول ہے، اور جن حضرات نے زمین کے مسطح ہونے کا قول کیا ہے ان کا قول مشکل ہے۔

فرماتے ہیں: ثبت بالدلائل انّ الارض كرة فكيف يمكن المكابرة فيه (کبیر)

آگے فرماتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ کرہ نہایت ہی جسامت والا ہے اس لئے بشری آنکھ کے سامنے اسکا جتنا ٹکڑا آتا ہے سطح ہی نظر آتا ہے اور اسکی کرویت غیر مشاہد رہتی ہے۔

المد: هو البسط الى ما لا يدرك منتهاه

(کبیر عن ابی بکر الاصم)

و قال الراغب اصل المد الجر ومنه المُدّة للوقت الممتد۔

قال الاصم۔ المدُّ البسط الى ما لا يرى منتهاه۔ (روح)

يَتَفَكَّرُوْنَ: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ یعنی ان چیزوں کے اندر خدا کے خلق و تدبیر اسکی قدرت و حکمت کی بہت سی نشانیاں ہیں لیکن ان نشانیوں تک انہیں لوگوں کی عقلیں پہنچتی ہیں جو ان پر غور و فکر کرتے ہیں، لاابالی لوگ

ان سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کرسکتے۔

اَلْفِکْرَۃُ: اس قوت کو کہتے ہیں جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے، اور لفظ تفکر، (تفعّل) کے متعلق صاحب مفردات القرآن نے لکھا ہے کہ تفکر اسی وقت ہوسکتا ہے جب اسکی صورت دماغ میں آسکے جیسے زمین، آسمان، اور اسی طرح سارا جہاں، اگر دماغ میں صورت نہ آسکے تو ایسے مقام میں تفکر کا استعمال صحیح نہیں ہے اسی لئے حدیث میں ہے: تَفَكَّرُوْا فِي آلَآءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي اللّٰهِ: کہ اللہ تعالیٰ نعمتوں اور اسکی آیات پر غور کرو اسکی ذات کو نہ سوچو کہ وہ کیسی ہے، چونکہ ذات باری لامحدود ہے انسان کی محدود فکر میں وہ نہیں سماسکتی۔ فِکْرٌ، فَکْرٌ، فِکْرَۃٌ، فِکْرٰی، سب اسم مصدر ہیں بمعنی سوچ وچار۔

وَالْفِکْرُ: ھُوَ تصرف القلب فی طلب الاشیاء (جمل)

بعض اُدَباءِ عرب کا خیال ہے کہ فکر اصل میں فَرْکٌ سے مقلوب ہے۔ لیکن فکر کا استعمال معانی میں ہوتا ہے جس کے معنی معاملہ کی تہ تک پہنچنے کیلئے اس کے بارے میں چھان بین کرنے کے ہیں (روح۔ راغب)

وَالمشھورُ اَنَّہ ترتیبُ اُمُوْرٍ مَعْلُوْمَۃ للتأدی الی مجھول (روح)

فکر کے مشہور معنی یہ ہیں کہ شئی مجہول تک رسائی حاصل کرنے کے لئے امور معلومہ کو ترتیب دینا۔

مُتَجٰوِرٰتٌ: وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُتَجٰوِرٰتٌ: اور زمین کھیت ہیں مختلف ایک دوسرے سے متصل۔ یعنی زمین میں بہت سے قطعے آپس میں ملے ہوئے ہونے کے باوجود مزاج اور خاصیت میں مختلف ہیں

مُتَجَاوِرَاتٌ: اسم فاعل جمع مؤنث واحد مُتَجَاوِرَۃٌ: ہے تَجَاوُرٌ مصدر ہے باب تفاعل سے بمعنی برابر برابر، باہم ملے ہوئے۔ اس لفظ کا اصل مادہ جَوْرٌ، اختلاف ادر ابواب کے سبب اس کے معنی میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ جَارٌ: ہمسایہ، مددگار، شریک تجارت، پناہ دینے والا۔ جِوَارٌ: ہمسائگی، مکان کے آس پاس کا صحن۔ جَوْرٌ: راستہ سے ہٹ جانا، پھر جانا۔ اس معنی کے لئے اس کے بعد صلہ مِنْ آتا ہے،

اِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ: میں تمہارا مددگار اور حامی ہوں۔ جَارَ عَنِ الطَّرِیْقِ۔ وہ راہ سے پھر گیا۔ جَارَ عَلَیْہِ: اس نے اسپر ظلم کیا۔

صِنْوَانٌ: صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ۔

بعض کھجوریں ایسی ہیں جو ایک ہی جڑ سے پھوٹتی ہیں اور بعض الگ الگ جڑوں سے۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ، کسی درخت کی جڑ سے جو مختلف شاخیں نکلتی ہیں ان میں سے ہر ایک کو صِنْوٌ کہا جاتا ہے، فُلَانٌ صِنْوُ اَبِيْهِ۔ فلاں اس کے باپ کا حقیقی بھائی ہے، کیونکہ باپ اور چچا ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔

صِنْوٌ کا تثنیہ صِنْوَانِ (بکسر النون) اور جمع صِنْوَانٌ آتی ہے کہا جاتا ہے۔ هُمَا صِنْوَا نَخْلَةٍ: وہ دونوں ایک ہی کھجور کی دو شاخیں ہیں یعنی اُن دونوں کی اصل واحد ہے

علامہ شوکانیؒ نے فتح القدیر میں ابو عبیدہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صِنْوَانٌ صِنْوٌ کی جمع ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جڑ ایک ہی ہو لیکن اسکی شاخیں بہت ہوں۔ پھر اسی معنی پر تمام اہل لغت اور اہل تفسیر کا اجماع نقل کیا ہے،

وھذا قول جمیع اھل اللغۃ والتفسیر (فتح)۔ قال صاحب الکشاف: اَلصِّنْوَانُ جمع صِنْوٍ، وَهِيَ النخلة لَهَا رَأْسَانِ وَأَصلهَا وَاحِد (کشاف) وفی المختار: إِذَا خَرَجَ نخلتان اَوْ ثلاثٌ من اَصْلٍ واحد فکل واحدة مِنْهُنَّ صِنْوٌ (جمل)۔ الصِّنْوَانُ: هُوَ الاُصُوْل المجتمعة فِي منبة وَاحِدٍ کالرمان والتین۔ (ابن کثیر)

والصنوان یکون الاصل واحداً و تنبت فیہ النخلتان والثلاثۃ فاکثر فکل واحدۃٍ صِنْوٌ (کبیر)۔

صِنْوٌ کی جمع اَصْنَاءٌ بھی آتی ہے، جیسے اسم کی جمع اَسْمَاءٌ۔ (کبیر)

صِنْوَانٌ: النخلتان اَوْ اکثر فی اصل واحدٍ (بخاری کتاب التفسیر)۔

بخاری شریف کے شارح حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ اصل میں صِنْوٌ کے معنی مثل کے ہیں اور مراد اس سے یہاں وہ شاخ ہے کہ اسکو اور دوسری شاخ کو ایک ہی جڑ گھیرے ہوئے ہو۔ اسی معنی میں حدیث ہے۔ عَمُّ الرجل صِنْوُ اَبِيْهِ، مرد کا چچا اس کے باپ کی طرح ہے کیونکہ ان دونوں کو ایک ہی اصل گھیرے ہوئے ہوتی ہے (لغات القرآن)

امام رازیؒ نے بھی تعلب کے حوالے سے ابن الاعرابی کا یہی قول نقل کیا ہے۔ ذکر الثعلب عن الاعرابی: الصنو المثل۔ الصنو المثل، ومنه قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم عَمُّ الرجل صِنْوُ ابیه (قرطبی)

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ: واصله المثل، معلوم ہوا کہ صِنْوٌ کے اصل معنی مثل

کے ہیں اور ایک ہی جڑ سے مختلف شاخوں کا اُگنا یہ معنی نہیں بلکہ مراد ہے۔

حضرت حسنؒ اور قتادہ نے صَنْوَانٌ بفتح الصاد پڑھا ہے۔ اس قرأت پر یہ صِنْو کی جمع نہیں بلکہ اسم جمع ہوگا چونکہ فَعْلَانٌ کا وزن جمع تکسیر کا نہیں۔ (روح)

صاحب جمل لکھتے ہیں کہ۔ صِنْوَانٌ جمع کثرت ہے جمع قلت اسکی اَصْنَاءٌ آتی ہے جیسے جَمَلٌ کی جمع اجمال۔ صنوان کے ایک معنی بعض اہل تفسیر نے گنجان بیان کئے ہیں۔ یعنی کھجور کے درخت جو بالکل گنجان اور ایک دوسرے سے متصل ہوں اور غَيْرُ صِنْوَانٍ، وہ جو الگ الگ اور متفرق ہوں۔

مَثُلٰتٌ : وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ : اور گذر چکے ہیں ان سے پہلے بہت سے عذاب۔

مَثُلٰت۔ یہاں مَثُلَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایسی سزا جو انسان کو سب کے سامنے رسوا کردے اور دوسروں کے لئے عبرت کا ذریعہ بنے (معارف)

سزا اور جرم میں مماثلت اور مشابہت ہونے کی وجہ سے مذکورہ سزا کو مثال اور مَثُلَةٌ کہا جاتا ہے۔ قصاص کو مثال کہنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ مَثْلَةٌ۔ مُثْلَةٌ اور مُثُلَةٌ۔ تینوں کے معنی ایک ہی ہیں۔

اَلْمُثْلٰی ۔ اسم تفضیل واحد مؤنث اسکا مذکر اَلْاَمْثَلُ برگزیدہ بہتر۔ وہ طریقہ جو فضیلت سے مشابہت رکھتا ہو۔ اَمْثَلُ کی جمع اَمَاثِلُ آتی۔ بزرگ اور افضل لوگ۔ شُرَفَاءُ۔

تَغِيْضُ : اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ۔ اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں رکھتی ہے ہر مادہ اور جو سکڑتے ہیں پیٹ اور بڑھتے ہیں۔

لفظ تَغِيْضُ عربی زبان میں کم ہونے اور خشک ہونے کے معنی میں آتا ہے، جیساکہ سورہ ہود کی آیت وَغِيْضَ الْمَاءُ میں ہے۔ آیت مذکورہ میں اسکے بالمقابل تَزْدَادُ کے لفظ نے متعین کردیا کہ اس جگہ معنی کم ہونے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ رحم مادر میں جو کمی بیشی ہوتی ہے اسکا صحیح علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ (معارف)

غَاضَ۔ يَغِيْضُ غَيْضًا۔ ض۔ اجوف یائی ہے غَاضَ الشَّيْءُ وَغَاضَهُ غَيْرُهُ یہ نقص کی طرح لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے لہذا اس کے معنی کسی چیز کو کم کرنے یا اس کے از خود کم ہوجانے کے ہیں۔ (راغب)

غَاضَ، کی طرح اس کا مقابل لفظ۔ اِزْدَادَ۔ بھی دونوں کی طرح لازم و متعدی استعمال ہوتا ہے

(روح)

قبل از مدت پیدا ہونے والے نا تمام بچے کو بھی غیض کہتے ہیں۔

الغیض الذی یکون سقطاً لغیر تمام۔ (کشاف)

اَلْمُتَعَالِ: عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ۔ جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا برتر۔

اَلْكَبِیْرُ کے معنی بڑا اور مُتَعَال کے معنی بالا و بلند (معارف)

اَلْمُتَعَالِ: اسم فاعل واحد مذکر حالت رفع۔ تَعَالِی مصدر، باب تفاعل۔ اصل میں اَلْمُتَعَالِی تھا حرف (ی)، کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے۔ البتہ ابن کثیر نے اَلْمُتَعَالِی باثبات الیاء ہی پڑھا ہے چاہے اس پر وقف کیا جائے یا اگلی آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ (کبیر)

اسکا اصل مادہ عُلُوٌّ ہے، ثلاثی مزید میں ثلاثی مجرد سے حرفوں کی تعداد بہرحال زیادہ ہوتی ہے جو مختلف معانی پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن کبھی کثرتِ حروف سے مجرد کے معنی میں صرف زیادتی کرنی مقصود ہوتی ہے دوسری خصوصیت پیش نظر نہیں ہوتی۔

اور یہ مقصود کبھی باب تفاعل میں بھی ہوتا ہے چنانچہ امام راغب نے صراحت کی ہے کہ مُتَعَالِ، عَالِ سے زیادہ مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی عَالِ کا معنی ہیں بزرگ، عالی مرتبہ وغیرہ، اور مُتَعَالِ کا معنی ہیں بہت بزرگ، بہت برتر۔

اَلْعُلُوُّ کسی چیز کا بلند ترین حصہ۔ یہ سفل کی ضد ہے ان کی طرف نسبت کے وقت عُلْوِیٌّ اور سُفْلِیٌّ کہا جاتا ہے۔ اور اَلْعُلُوُّ۔ بتشدید الواو۔ بلند ہونا۔ عَلَا یَعْلُوْ عُلُوًّا وَهُوَ عَالٍ یہ نَصَرَ سے ہے اور عَلِیَ یَعْلٰی عُلُوًّا فَهُوَ عَلِیٌّ (سمع سے) اسمیں سے صفت فاعلی عَلِیٌّ ہے۔ ان دونوں ابواب کے استعمال میں کچھ فرق ہے۔ عَلَا (ن) کا استعمال زیادہ تر اَمکنہ اور اجسام پر ہوتا ہے یعنی کسی جگہ کے یا جسم کے بلند ہونے پر ہوتا ہے۔ جیساکہ قرآن پاک میں ہے۔ عَالِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ: ان کے بدنوں پر دیبا کے کپڑے ہوں گے۔ بعض نے عَلَا (ن) اور عَلِیَ (س) کے درمیان ایک لطیف فرق یہ بیان کیا ہے کہ عَلٰی (بالالف) کا استعمال محمود

اور مذموم دونوں پر ہوتا ہے اور عَلِیٌّ (س) صرف مستحسن معنوں میں ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ۔ فرعون نے زمین پر سر غرور بلند کیا ہوا تھا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ۔ فرعون زمین میں متکبر اور کبر و غرور میں حد سے بڑھا ہوا تھا۔ عَالٍ کی جمع عالین آتی ہے وَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ۔ تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ جو ملک میں ظلم اور فساد نہیں چاہتے۔

اَلْعَلِیُّ یہ عَلِیَ یَعْلٰی سے مشتق ہے بمعنی بلند و برتر۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا۔ (راغب)

عَالٍ۔ اصل میں عَالِیٌ تھا۔ حرف یاء کو پہلے واؤ بنایا گیا ہے پھر واؤ ما قبل مکسور ہونے کی وجہ سے گر گیا ہے۔

مُسْتَخْفٍ : وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّیْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ : اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گلیوں میں پھرتا ہے دن کو۔ مُسْتَخْفٍ۔ چھپنے والا۔ یہ باب استفعال سے اسم فاعل ہے اس کا مصدر اِسْتِخْفَاءٌ ہے اصل میں یہ لفظ مُسْتَخْفِیٌ تھا اسکا اصل مادہ خفی ہے خِفْیَةٌ مصدر ہے باب سَمِعَ ہے۔ خِفَاءٌ اوٹ، پردہ۔ اِخْفَاءٌ (افعال) کے معنی ہیں چھپانا۔ اور خَفٰی یَخْفِی ضرب کے معنی ہیں ظاہر کرنا۔ خَفَیْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے پوشیدگی دور کر دی، یعنی ظاہر کر دیا۔ خَفَی الْمَطَرُ الْفَأرَ بارش نے چوہے کو بل سے نکال دیا۔ (منجد، راغب، لغات القرآن)

وقال الاخفش وقطرب : المستخفی باللیل الظاهر، ومنه خفیت الشیءَ وَاَخْفَیْتُهٗ ای اَظْهَرْتُهٗ (قرطبی)

گویا یہ مادہ اضداد میں سے ہے جس کے معنی چھپانے کے بھی آتے ہیں اور ظاہر کرنے کے بھی۔ لیکن آیت کریمہ میں مستخف کے معنی چھپانے کے ہیں کیونکہ آیت کا حاصل یہ ہے کہ خدا کے سامنے ظاہر و باطن سب برابر ہے اسکا علم تمام احوال کو محیط اور حاوی ہے۔ جو آدمی رات کو چھپ کر گناہ کرتا ہے اور دن کو برائت ظاہر کرتا ہے وہ خدا کے علم میں ہے۔ (مُسْتَخْفٍ بِاللَّیْلِ) ای مختف فی قعر بیتہٖ فی ظلام اللیل۔ (ابن کثیر)

سَارِبٌ : سَارِبٌ بِالنَّهَارِ۔

سَارِبٌ: کسی راستہ پر اپنی خوشی سے چلنے والا۔ غیر مقلد۔ آزادی اور بے فکری سے چلنے والا۔ خودسر۔

قال ابو رجاء: السَّارِبُ۔ الذاهب علی وجهه فی الارض۔ قال الکسائی: سَرَبَ یَسْرُبُ سَرَبًا وسُرُوْبًا اذا ذَهَبَ۔ (قرطبی)۔ والسَّارِبُ: الذاهب فی سَرَبِهٖ اَیَّ طَرِیْقٍ کَانَ (راغب)۔

سَارِبٌ: گلیوں میں چلنے والا، راہ میں چلنے والا، سُرُوْبٌ سے جس کے معنی اپنے رُخ پر چلنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ ہے اسکی جمع سَرَبٌ ہے جیسا کہ رَکْبٌ، رَاکِبٌ کی جمع ہے۔

سَرَابٌ: شدت گرما میں دوپہر کے وقت بیابان میں جو پانی کی طرح چمکتی ہوئی ریت نظر آتی ہے اسے سَرَابٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ بظاہر دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے پانی بہہ رہا ہے۔ پھر اس سے ہر بے حقیقت چیز کو تشبیہ کے طور پر سَراب کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کَسَرَابٍ بِقِیْعَةٍ یَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً۔ جیسے میدان میں سراب کہ پیاسا اُسے پانی سمجھے۔ وَسُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَکَانَتْ سَرَابًا پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہو کر رہ جائینگے۔

السَّرْبُ: مصدر ہے اس کے اصل معنی نشیب کی طرف جانے کے ہیں اور اسم کے طور پر نشیبی جگہ کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا۔ تو اس نے دریا میں سرنگ کی طرح رستہ بنالیا۔ سَرَبَ اور اِنْسَرَبَ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔

اَلسِّرْبُ اور السَّرْبُ: رستہ، ہرنوں کا گلہ، کھجور کے درختوں کا جھنڈ۔ فُلَانٌ وَاسِعُ السِّرْبِ: فلاں فراخ دل ہے، اسکی جمع اَسْرَابٌ ہے۔ طَرِیْقٌ سَرِبٌ: بہت چلتا ہوا رستہ۔ خَلِّ لَهٗ سَرْبَهٗ: اسکا رستہ چھوڑ دو۔ حدیث میں ہے اذا مات الْمُؤْمِنُ تَخَلّٰی لَهٗ سَرْبُهٗ یَسْرَحُ حَیْثُ شَآءَ۔ مومن جب فوت ہوتا ہے تو اسکا راستہ کھول دیا جاتا ہے وہ وہاں کی سیر کرتا ہے۔ کَاَنَّهُمْ سِرْبُ ظِبَاءٍ۔ گویا وہ ہرنوں کا ایک گلہ ہیں۔

مُعَقِّبٰتٌ: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ۔

مُعَقِّبٰتٌ: یہ صفت ہے اسکا موصوف محذوف ہے یعنی۔ اَرْوَاحٌ مُعَقِّبٰتٌ۔ یہ

مُعَقِّبَۃٌ کی جمع ہے، اس جماعت کو جو دوسری جماعت کے پیچھے متصل آئے مُعَقِّبَۃٌ یا مُتَعَقِّبَۃٌ کہا جاتا ہے۔ مراد اس سے وہ فرشتے ہیں جو باری باری ہر انسان پر خدا کی طرف سے نگرانی کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔

مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ کے لفظی معنی ہیں دونوں ہاتھوں کے درمیان۔ مراد انسان کے سامنے کی جہت اور سمت ہے۔

حدیث میں ہے۔ مُعَقِّبَاتٌ لَا یَخِیْبُ قَائِلُهُنَّ۔ یہاں مُعَقِّبَات سے مراد تسبیحات ہے کیونکہ وہ ایک کے بعد دوسری پڑھی جاتی ہے۔ یا یہ کہ ہر نماز کے بعد انہیں پڑھا جاتا ہے۔ (حاشیہ قرطبی)

علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ: مُعَقِّبَاتٌ کی اصل مُعْتَقِبَاتٌ ہے حرف تاء کو قاف بنا کر قاف کو قاف میں مدغم کر دیا گیا ہے جیسے کہ مُعَذِّرُوْنَ اصل میں مُعْتَذِرُوْنَ ہے۔ و الاصل مُعْتَقِبَات۔ فَاُدْغِمَتِ التاء فی القاف۔ کقوله وجاء المعذرون یعنی مُعْتَذِرُوْنَ۔ (کشاف ص ۵۱۷ ج ۲)

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ مُعَقِّبَاتٌ اصل میں جمع الجمع ہے ثم مُعَقِّبَاتٌ جمع الجمع (قرطبی)

صاحب لغات القرآن لکھتے ہیں کہ مُعَقِّبَاتٌ اسم فاعل مؤنث جمع الجمع۔ مُعَقِّبٌ واحد ہے۔ مُعَقِّبَۃٌ جمع ہے تعقیب مصدر ہے۔

(بحوالہ بیضاوی۔ کبیر)

علامہ آلوسی نے نقل کیا ہے کہ: صاحب کشاف نے یہ جو کہا ہے کہ مُعَقِّبَاتٌ کی اصل مُتَعَقِّبَاتٌ ہے یہ ان کا وہم ہے کیونکہ صرفیوں نے تصریح کی ہے کہ قاف اور کاف ایک دوسرے میں بھی مدغم نہیں ہوتے اور اسی طرح یہ دونوں حرف کسی دوسرے حرف میں بھی مدغم نہیں ہوتے (روح)

یُغَیِّرُ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ:

یُغَیِّرُ: واحد مذکر غائب۔ اسکا مصدر تَغْیِیْرٌ ہے۔ وہ نہیں بدلتا۔

تغییر کا استعمال دو طرح ہوتا ہے۔ ایک صرف کسی چیز کی صورت کو بدلنا جیسے غَیَّرْتُ دَارِیْ۔ یعنی میں نے گھر کی شکل وصورت تبدیل کر دی، نقشہ بدل دیا۔ دوم کسی دوسری چیز سے تبدیل کر لینا جیسے غَیَّرْتُ غُلَامِیْ اَوْ دَابَّتِیْ میں نے اپنا غلام یا جانور دوسرے سے تبدیل کر لیا۔

آیت کریمہ میں دوسری صورت مراد ہے یعنی اچھی حالت کو بری حالت سے تبدیل کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت امن کو مصیبت میں اس وقت تک تبدیل نہیں کرتے جب تک وہ قوم خود ہی اپنے اعمال و احوال کو برائی اور فساد میں تبدیل نہ کردے۔

اس آیت کا جو عام طور پر یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ کسی قوم میں اچھا انقلاب اس اس وقت تک نہیں آتا جب تک وہ خود اس اچھے انقلاب کے لئے اپنے حالات کو درست نہ کرے اسی مفہوم میں یہ شعر مشہور ہے ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا

یہ بات اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر آیت مذکورہ کا یہ مفہوم نہیں، اور اسکا صحیح ہونا بھی ایک عام قانون کی حیثیت سے ہے کہ جو شخص خود اپنے حالات کی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتا اللہ کی طرف سے بھی اسکی امداد و نصرت کا وعدہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وعدہ اسی حالت میں ہے جب کوئی خود بھی اپنی اصلاح کی فکر کرے (معارف)

السَّحَابُ: وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ: وہ بھاری بادل اٹھاتا ہے۔

سَحَابٌ: ابر کو کہتے ہیں خواہ وہ پانی سے بھرا ہو یا خالی۔ اس لئے خالی بادل کو سَحَابٌ جَہَامٌ کہا جاتا ہے۔

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ سَحَابٌ، سَحَابَۃٌ کی جمع ہے۔ سُحُبٌ اور سَحَائِبُ بھی اسکی جمع آتی ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ سَحْبٌ کے اصل معنی کھینچنے کے ہیں چنانچہ دامن زمین پر گھسیٹ کر چلنے یا کسی انسان کو منہ کے بل گھسیٹنے پر سَحْبٌ بولتے ہیں۔ اسی سے بادل کو سَحَابٌ کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لئے کہ ہوا اسے کھینچ کر لے چلتی ہے یا اس لئے کہ وہ پانی کو کھینچ کر لاتا ہے اور یا اس بنا پر کہ وہ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھسٹتا ہوا چل رہا ہے۔

السَّحَابُ۔ جمع، والواحدہ سَحَابَۃٌ، وسُحُبٌ وسَحَائِبُ فی الجمع ایضاً (قرطبی ص ۲۹۵ ج ۹)

(السحاب) اسم الجنس، والواحدہ سَحَابَۃٌ

(کشاف)

الثِّقَالُ: اَلثِّقَالُ: بوجھل، بھاری، گراں بار۔ علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے کہ ثِقَالٌ، ثَقِیْلَۃٌ کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے سَحَابَۃٌ ثَقِیْلَۃٌ۔ وسَحَابٌ ثِقَالٌ۔ جیسا کہ اِمْرَأَۃٌ کَرِیْمَۃٌ۔ و نِسَاءٌ کِرَامٌ۔ اَلثِّقَالُ۔ جمع ثَقِیْلَۃٍ۔ لأنک تقول سَحَابَۃٌ ثَقِیْلَۃٌ وسَحَابٌ ثِقَالٌ۔ (کشاف)

اَلثِّقَلُ: یہ خِفَّۃٌ کی ضد ہے بمعنی بھاری ہونا اور ہر وہ چیز جو وزن یا اندازہ میں دوسری پہ بھاری ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے جمع اَثْقَالٌ ہے وَتَحْمِلُ اَثْقَالَکُمْ. تمہارے بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں. ثَقِیْلٌ صفت کا صیغہ ہے اسکی جمع ثُقَلَاءُ، ثِقَالٌ اور ثُقْلٌ آتی ہے. اَثْقَالٌ یہ ثِقْلٌ کی جمع ہے.

رَعْدٌ : وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ.

رَعْدٌ: گرج. کڑک. گرجنے والا. یہ اصل میں مصدر ہے بمعنی کڑکنے اور گرجنے کے. اس کا فعل باب نصر اور فتح سے آتا ہے.

امام بغوی نے تصریح کی ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک رعد اس فرشتہ کا نام ہے جو ابر کو ہانکتا اور چلاتا ہے. جامع ترمذی میں ہے کہ یہودیوں نے آپؐ سے سوال کیا کہ رعد کیا ہے تو آپ نے جواب فرمایا کہ وہ فرشتہ ہے جو بادلوں پر متعین ہے. (لغات القرآن)

رعد عرف و محاورہ میں بادل کی آواز کو کہا جاتا ہے جو بادلوں کے باہمی ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے. بادل کی گرج اور کڑک کے لئے لفظ رعد بطور اسم استعمال ہوتا ہے.

رَعَدَتِ السَّمَاءُ وَبَرَقَتْ بادل گرجا اور چمکا.

اَلصَّوَاعِقَ : اَلصَّوَاعِقَ

یہ صاعقہ کی جمع ہے، زمین پر گرنے والی بجلی کو صاعقہ کہا جاتا ہے. (معارف)

امام راغب لکھتے ہیں کہ صَاعِقَۃٌ اور صَاقِعَۃٌ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں البتہ اتنا فرق ہے کہ صَقْعٌ کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق بولا جاتا ہے اور صَعْقٌ اجسام علوی کے بارے میں دونوں کے معنی ہولناک دھماکہ کے ہیں. بعض اہل لغت نے صاعقہ کی تین اقسام بیان کی ہیں اول بمعنی موت اور ہلاکت جیسے کہ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ دوم بمعنی عذاب جیسے اَنْذَرْتُکُمْ صَاعِقَۃً مِّثْلَ صَاعِقَۃِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ. سوم بمعنی آگ اور بجلی کی کڑک وغیرہ کے جیسا کہ فَیُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِھَا مَنْ یَّشَآءُ.

لیکن یہ تینوں چیزیں صاعقہ کے آثار ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی تو فضا میں سخت آواز کے ہیں، پھر کبھی تو اس آواز سے صرف آگ ہی پیدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آواز عذاب اور کبھی موت کا سبب بن جاتی ہے، یعنی دراصل وہ ہے ایک ہی چیز باقی سب چیزیں اس کے آثار ہیں.

(ترجمہ راغب)

اَلْمِحَالِ : وَھُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ.

لفظ مِحَال بکسر میم حیلہ و تدبیر کے معنی میں ہے اور عذاب اور عقاب اور قدرت کے معنی بھی۔ مطلب یہ کہ اللہ بڑی قوی تدبیر کرنے والا ہے جس کے سامنے کسی کی کوئی چال کامیاب نہیں ہو سکتی۔

مَحَلَ بِہٖ مَحْلاً وَمِحَالاً کے معنی کسی کے خلاف بری تدبیر کرنے کے ہیں۔ آیت کریمہ میں لفظ مِحال بعض کے نزدیک مَحَلَ بِہٖ۔ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ مگر بعض کے نزدیک مِحَال میں میم زیادہ ہے اور یہ دراصل اَلْحَوْلُ اور اَلْحِیْلَۃَ سے مشتق ہے۔ مَحَلَ بِہٖ اِلیٰ السلطان کے معنی بادشاہ کے پاس چغلی کھانے کے ہیں۔ (راغب)

ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ: المِحال کے معنی مکر کے ہیں اور جب اسکی نسبت اللہ تعالیٰ طرف ہو تو اس کے معنی تدبیر بالحق کے ہوتے ہیں، اور ابوزید نے مِحَال کے معنی نَقْمَۃٌ یعنی عذاب اور سزا کے بیان کئے ہیں۔ ازہری کہتے ہیں المحال کے معنی قوت و شدت کے ہیں، اور مَحْلٌ۔ شِدَّۃٌ کے معنی میں ہے۔ اور مِحَالٌ میں حرف میم اصلی ہے اور مَا حَلْتُ فُلَانًا۔ کے معنی ہیں میں نے اسپر قوت حاصل کر لی یہاں تک کہ ظاہر ہو گیا کہ طاقت والا ہم میں سے کون ہے۔

ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ مِحَال کے معنی سخت اور پختہ تدبیر کے ہیں اور اصل میں یہ حِیْلَۃٌ سے مشتق ہے اور اسکا میم زائد ہے نہ کہ اصلی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیساکہ مکان کا میم کہ یہ کَوْنٌ سے مشتق ہے۔ ازہری کہتے ہیں کہ ابن قتیبہ سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ اسمیں میم اصلی نہیں ہے۔ بلکہ یہ میم اصلی ہے۔ چونکہ فِعَالٌ کے وزن پر جو حرف ہو اور اسکا پہلا حرف میم مکسور ہو تو وہ میم اصلی ہوتا ہے نہ کہ زائد، جیساکہ مِهَادٌ، و مِلَاكٌ اور مِرَاسٌ وغیرہ۔ اور مِفْعَلٌ جب ثلاثی مجرد سے ہو تو حرف واؤ ظاہر ہو کر آتا ہے جیسے کہ مِزْوَدٌ و مِحْوَلٌ و مِحْوَدٌ (قرطبی)

اعرج نے، شَدِیْدُ الْمَحَالِ، بفتح المیم پڑھا ہے یہ حَالَ یَحُوْلُ مَحَالاً سے مشتق ہے جس کے معنی حیلہ اور تدبیر کرنے کے ہیں کہتے ہیں ھو اَحْوَلُ مِنْ ذِئْبٍ یعنی وہ بھیڑیئے سے بھی حیلہ اور تدبیر میں سخت ہیں۔

قال ابو عبیدہ: اَلْمِحَالُ والمماحلہ المماکرہ والمغالبہ (قرطبی)

شَدِیْدُ الْمِحَالِ: کا ایک ترجمہ خفیہ تدبیر سے کام کرنے والا اور داؤ کرنے والا بھی ہے۔

ذُوالرُّمَّۃ: کا قول ہے اَعَدَّ لَہُ الشَّغَازِبَ وَالْمِحَالاَ۔ میں اس کیئے لئے تدبیریں اور داؤ

فراہم رکھتا ہوں۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ مِحَال، مکر، فریب، طاقت، رنج، عذاب اور دشمنی وغیرہ کے معنی میں آتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ مِحَال، مَحَالَۃ، کی جمع ہے اور محالہ پشت کے مہرے کو کہتے ہیں مراد قوت ہے۔ بعض اہل لغت نے مِحَال کا مادہ مَحَلٌ قرار دیا ہے۔ مَحَل کے معنی ہیں سخت دغا۔ فریب، کھوٹ۔ کہتے ہیں مَحَلَ بِفُلَانٍ ، فلاں شخص کے متعلق اسنے بادشاہ سے چغلی کھائی اور بدی کا ارادہ کیا۔ تَمَحَّلَ الشَّیْءَ : کسی چیز کو حیلہ اور فریب سے حاصل کرنا۔ مَحْلٌ قحط اور خشک سالی کے معنی میں بھی آتا ہے مَحَلَ الزَّمَانُ کے معنی ہیں خشک سالی ہو گئی قحط پڑ گیا۔ (لغات القرآن) رَجُلٌ مَحِلٌ : بیکار آدمی۔ مَاحِلٌ چغلی کھانے والا۔ حدیث میں ہے۔ اَلْقُرْاٰنُ شَافِعٌ مُشَفَّعٌ وَمَاحِلٌ مُصَدَّقٌ : قرآن ایسی سفارش کرنے والا ہے جو قبول ہو گی اور ایسی چغلی کرنے والا ہے جسکی تصدیق ہو گی۔

اَوْدِیَۃٌ : فَسَالَتْ اَوْدِیَۃٌ بِقَدَرِھَا۔

اَوْدِیَۃٌ : وادی کی جمع ہے۔ اس جگہ کو وادی کہتے ہیں جہاں پانی بہتا ہو۔ اسی سے دو پہاڑوں کے درمیان کی زمین کو وادی کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى۔ آپ یہاں پاک میدان میں ہیں۔ پھر اسکا اطلاق اس پانی پر ہوتا ہے جو اَوْدِیَۃ میں بہتا ہے اور، الوادی، وَدٰی سے اسم فاعل ہے بمعنی جاری ہونا۔ الوادی الموضع الذی یسیل فیہ الماء بکثرۃ۔ وھو اسم فاعل من وَدٰی اذا سال (روح) کسی پر مصیبت کے وقت کہتے ہیں سال بِھِمُ الْوَادِی ، یعنی وہ ہلاک ہو گئے۔ مصائب کا سیلاب انہیں بہا لے گیا والاودیۃ جمع الوادی، وَسُمِّیَ وَادِیًا لِخُرُوْجِہٖ وَسَیَلَانِہٖ ، فالوادی علی ھذا اسم للماء السائل۔ (قرطبی)

زَبَدًا : فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا۔

زَبَدًا ، میل کچیل، خس و خاشاک، کوڑا کرکٹ وغیرہ۔ اَزْبَدَ الْمَاءُ : کے معنی ہیں پانی کے اوپر جھاگ آ گیا۔ اَلزَّبَادُ، پھول یا کلی جو جھاگ کی طرح سفید ہوتی ہے۔ ہانڈی اُبلتے وقت جو جھاگ آتی ہے اس کو بھی زَبَدٌ کہتے ہیں۔ خازن میں ہے کہ اَلزَّبَدُ

مایعلو علی وجه الماء عند الزیادۃ کالحبب وکذالك ما یعلو علی القِدر عند غلیانها۔ (جمل۔ خازن)

مشابہت لون کی بنا پر مکھن کو زبد کہا جاتا ہے اور المِزْبَدُ مکھن نکالنے کا آلہ۔ مَدَّهانْ زَبَدًا، هو الغثاء الذی یطرحه الوادی اذا جاش ماؤه واضطربت أمواجه (روح)

رَابِيًا : یہ زَبَدًا کی صفت ہے ایسی جھاگ جو پانی کے اوپر ہو (رابیا) ای طالعا عالیا مُرتَفِعًا فوقَ المَاءِ۔ (قرطبی)

یہ رُبُوٌّ سے ماخوذ ہے، رَبْوٌ، رُبُوَّةٌ، رَبَاوَةٌ ٹیلہ، بلند۔ اِلٰی رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ۔ رَبَا فُلَانٌ۔ فلاں اونچی جگہ پر چلا گیا۔ اَرْبٰی عَلَیْهِ : کسی پر بلند ہونا۔ سانس پھولنے کو بھی رَبْوٌ کہتے ہیں چونکہ یہ بھی پھول کر اوپر چڑھتا ہے، رَبَا الفَرَسُ : گھوڑے کا سانس پھولنا۔ اور الرِّبَا : جو اصل مال پر بڑھوتی لی جائے اسکو رِبَا، کہتے ہیں یعنی سود۔ رَبَّیْتُ الوَلَدَ فَرَبَا۔ میں نے بچے کی پرورش کی چنانچہ وہ بڑھ گیا۔

جُفَاءً : فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَاءً۔ سو جھاگ تو نکما ہو کر جاتا رہتا ہے۔

جُفَاءٌ : ناکارہ، ناچیز، وہ جھاگ اور کوڑا جو نالے کے بہاؤ میں دونوں کناروں پر آ کر جم جاتا ہے یا دیگچی کے ابھان کے ساتھ اوپر آ کر جم جاتا ہے، یہ اسم ہے۔

اَجْفَأَتِ القِدْرُ زَبَدَهَا، ہنڈیا نے اپنا اُبال پھینک دیا، یہ اصل میں جَفْوٌ سے ماخوذ ہے، جَفَا الوَادِی غُثَاءَہٗ، وادی نے خس و خاشاک ڈال دیا۔ ذَهَبَ جُفَاءً، وہ رائگاں گیا۔

قال الفراء : الجفاء۔ الرمی والاطراح یقال جفاء الوادی غثاءه یجفوه جفاء اذا رماه، والجفاء اِسْمٌ للمجتمع منه المنضم بعضه الی بعض (کبیر)

جُفَاءٌ : میں ہمزہ واؤ کا بدل ہے۔ بعض اہل لغت کا قول ہے کہ ہمزہ اصل ہے اور جَفْأٌ مہموز اللام سے ماخوذ ہے، آیت میں لفظ کے معنی کے اعتبار سے یہی مادہ قرین قیاس ہے کیونکہ مادہ جَفْوٌ کے اصل معنی ہیں کسی چیز کا ایک جگہ قرار نہ پکڑنا، جفا علیه کذا۔ کسی پر کچھ گراں ہونا۔ اور جَفَأَ النَّهرُ جُفَاءً دریا کا جھاگ اور کوڑا کرکٹ ڈالنا۔ لہذا جُفَاءٌ کا ہمزہ بدل نہیں بلکہ اصل ہوگا۔ (واللہ اعلم)

یَمْکُثُ : وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔ اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے

سو وہ باقی رہتا ہے زمین میں۔ یعنی اپنی نفع رسانی کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جھاگ جس طرح کچھ دیر کے لئے اصل چیز کے اوپر آجاتی ہے لیکن آخر وہ بے کار سمجھ کر پھینک دی جاتی ہے اور اصل چیز باقی رہ جاتی ہے، اسی طرح گو باطل چندن کے لئے حق پر غالب آجائے لیکن انجام کار باطل مغلوب ہوکر رہیگا اور حق باقی اور ثابت رہتا ہے۔

اَلْمُکث: کے معنی کسی چیز کے انتظار میں ٹھہرے رہنے کے ہیں۔ امام راغب کی اس تعریف کے مطابق اس کے اندر دو مفہوم پائے جاتے ہیں ایک ٹھہرنا اور توقف کرنا۔ اور دوسرا انتظار کرنا۔ مَکَثَ یَمْکُثُ مَکْثًا ومَکَثًا و مَکُوْثًا و مُکْثَانًا تمام مصادر ہیں،

مُکْثٌ اور مِکْثٌ اسم مصدر ہیں بمعنی دیر۔ مَکَثَ بِالْمَکَان۔ دیر کرنا اَمْکَثَہٗ: ٹھہرانا، اَلْمَکِیْثُ: ٹھہرنے والا۔ سنجیدہ و صابر آدمی۔ سست آدمی کو بھی مَکِیْثٌ کہدیتے ہیں چونکہ کاہل بھی کام کرنے سے رکا رہتا ہے۔

مَاکِثٌ۔ اسم فاعل جمع مَاکِثُوْنَ۔

عَلَانِیَۃً : عَلَانِیَۃً: کھلم کھلا، عَلَانِیَۃً۔ اَعْلَنَ: اعلان کرنا۔ ظاہر کرنا۔ اَعْلَنْتُ، میں نے کھلم کھلا کہا۔ اعلان کیا۔ اَعْلَنْتُہٗ اَنَا: میں نے اسے آشکارا کردیا۔ یہ اَسْرَرْتُ کی ضد ہے۔

یَدْرَءُوْنَ : وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ یَدْرَءُوْنَ۔ دَرْءٌ جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے بمعنی دفع کرنا، ٹالنا، دور کرنا،

دَرْءٌ، کجی، پہاڑ پر سے کسی چیز کا نیچے کو گرنا، دور سے تیزی کے ساتھ سیلاب کا آجانا۔ دَرْءٌ اور دَرْءَۃٌ مصدر (متعدی فتح) دفع کرنا۔ حدیث میں ہے۔ اِدْرَءُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُہَات۔ شبہات ہوں تو سزا کو ساقط کردو۔

دُرُوْءٌ، مصدر لازم ہے۔ آجانا، ستارہ یا آگ کا روشن ہونا مدارا ۃ ظاہر میں خاطر داری کرنا۔ رأس العقل بعد الایمان مداراۃ الناس۔ ایمان کے بعد عقلمندی یہ ہے کہ لوگوں کی مدارات کرے ان سے خوش خلق اور دلجوئی سے پیش آئے۔ سَیْلٌ دَرْءٌ اچانک آنے والی سیل۔ بہنے والا پانی۔ دَرَءَ عَلَیْنَا فُلَانٌ: فلاں شخص دفعۃً ہم پر نمودار ہوا۔

آیت کریمہ کا اصل مقصد اہل عقل کی علامات کو بیان کرنا ہے۔ اور ان میں سے ایک یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ ہے۔ کہ لوگ برائی

کو بھلائی سے دشمنی کو دوستی سے، ظلم کو عفو و درگذر سے دفع کرتے ہیں برائی کے جواب میں برائی سے پیش نہیں آتے۔ (معارف)

عَدْنٍ : جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ۔ ہمیشگی کے باغ جن میں وہ (خود بھی) داخل ہوں گے اور (وہ بھی) جو جنت کے لائق ہوں گے ماں باپوں میں سے (ماجدی)

عَدْنٌ : کے معنی کسی جگہ قرار پکڑنے اور ٹھہرنے کے ہیں کہا جاتا ہے عَدَنَ بِمَکَانِ کذا۔ یعنی اس نے فلاں جگہ قیام کیا، اسی سے اَلْمَعْدِنُ ہے، کان، کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی جواہرات کے ٹھہرنے کی جگہ ہوتی ہے، حدیث میں ہے۔ اَلْمَعْدِنُ جُبَارٌ (راغب)

وَعَدْنٍ، مَاخُوْذٌ من عدن بالمکان، اذا اقام فیه (قرطبی ص۳۱۱ ج۹)

٭ قیل العدن: الاقامة. وَعَدَنْتُ البَلَدَ توطنتهُ. یعنی میں نے اس شہر کو اپنا وطن بنا لیا۔ والعادن، الناقة المقیمة فی المرعیٰ۔ (قرطبی ص۳۹۶ ج۱۰) یعنی اس ناقہ کو عادن کہتے ہیں جو چراگاہ ہی میں رکھی جاتی ہو۔

حضرت مفتی صاحبؒ[1] فرماتے ہیں کہ، عدن کے معنی قیام و قرار کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ان جنتوں سے کسی وقت انکو نکالا نہ جائیگا بلکہ ان میں ان کا قرار و قیام دائمی ہوگا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ عدن وسط جنت کا نام ہے جو جنت کے مقامات میں بھی اعلیٰ مقام ہے۔

طُوْبٰى : طُوْبٰى لَهُمْ : ان کے لئے خوشحالی ہے، بعض نے کہا ہے کہ طوبیٰ جنت میں ایک درخت کا نام ہے اور بعض کا قول ہے کہ طُوْبٰى، سے مراد ہر قسم کی خوش گواریاں ہیں جو جنت میں ان کو حاصل ہوں گی، بقائے عزت، غنا وغیرہ جن کے زوال کا اندیشہ نہ ہوگا۔

[1] میں جس شخصیت مقدسہ کو آج سے ایک دن پہلے تک بڑی محبت سے مدظلہ لکھتا تھا اور اس کے ساتھ اپنے دل میں ایک خاص قسم کا سرور محسوس کرتا رہا۔ آج بڑے صدمے کے ساتھ اس سہارائے اسلام کے لئے کلمہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہوئے آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ چونکہ حضرت ۱۰ شوال ۱۳۹۶ھ مطابق ٦-١٠-٧٦ کو اس دارِ فانی کا سفر ختم کرکے جنتِ عدن کی طرف رخصت ہوگئے ہیں۔

فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

طَابَ يَطِيبُ طَيِّبًا فَهُوَ طَيِّبٌ. طَابَ الشَّيْءُ،
کے معنی کسی چیز کے پاکیزہ اور حلال ہونے کے ہیں،
اور طَیِّبٌ، اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے
انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس
بھی، اور شریعت کی رو سے اَلطَّعَامُ الطَّيِّبُ:
اَلطَّعَامُ۔ اس کھانے کو کہتے ہیں جو جائز طریق سے حاصل
کیا جائے اور جائز جگہ سے جائز اندازہ کے
مطابق لیا جائے، کیونکہ جو غذا اس طرح حاصل
کی جائے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خوش
گوار ثابت ہوگی۔ ورنہ دنیا کی خوش گوار چیزیں
آخرت میں نقصان دہ ثابت ہوں گی، اس
بنا پر قرآن طیب چیزیں کھانے کا حکم دیتا ہے (راغب)
علامہ فخر الدین رازی نے لفظ طوبیٰ، کی تفسیر
کے تحت تین اقوال نقل کئے ہیں۔ پہلا قول یہ
ہے کہ طوبیٰ جنت کے درخت کا نام ہے، اور
جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح
کی کئی روایات ہیں جنمیں طوبیٰ شجرۂ جنت
کا نام بتایا گیا ہے۔

دوسرا قول اہل لغت کا ہے۔ لغوی حضرات
کا قول یہ ہے کہ طوبیٰ طَابَ کا مصدر ہے
جیسا کہ بُشریٰ اور زُلفیٰ، اور معنی طُوبیٰ لَكَ
کے اَصَبْتَ طَيِّبًا۔ کے ہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ طُوبیٰ، عربی کا لفظ
نہیں ہے کہ اسکا اشتقاق وغیرہ مان کر اس کے
معنی متعین کئے جائیں بلکہ یہ لفظ غیر عربی ہے
پھر ان میں سے کچھ یہ کہتے ہیں کہ حبشی زبان
میں طوبیٰ جنت کو کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں
کہ ہندی زبان میں بستان وغیرہ کو طوبیٰ
کہا جاتا ہے۔

امام نے ان اقوال کو کمزور قرار دیا ہے
کہ قرآن پاک میں عجمی زبان کے الفاظ
ہیں اور جبکہ اس لفظ کا عربی میں اشتقاق
بھی بالکل ظاہر ہو تو اسکو غیر عربی قرار دینے
کی کوئی وجہ نہیں۔

علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں کہ طوبیٰ کو
طَابَ کا مصدر بتایا گیا ہے جیسے بُشریٰ اور
زُلفیٰ اور واؤ مُوسِرٌ اور مُوقِنٌ کی طرح یاء
سے تبدیل شدہ ہے، طوبیٰ کی اصل جیسا کہ
علامہ قرطبی نے نقل فرمایا ہے طُيبیٰ ہے بروزن
فُعْلیٰ، یاء ساکن ماقبل مضموم تھا اسلئے یاء کو
واؤ سے بدل لیا گیا۔

ابوالحسن بنائی کا بیان ہے کہ طُوبیٰ،
طَيِّبَةٌ کی جمع ہے جیسے كَيِّسَةٌ کی جمع كُوسیٰ۔
لیکن ابو حیان نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ
فُعْلیٰ، اوزان جمع میں سے نہیں ہے، ہاں
یہ ہو سکتا ہے کہ شاید جمع کہنے سے ابوالحسن کی

مراد اسم جمع ہو۔ (روح)

علامہ قرطبی نے ترجیح اسی کو دی ہے کہ طُوْبیٰ شجرہ جنت کا علم ہے، اور علم ہونے کی وجہ سے اس پر الف لام داخل نہ ہوگا۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طوبیٰ، اَطْیَبُ کی تانیث ہو جسکے معنی بہت عمدہ اور بہت پاکیزہ کے ہیں۔ اس صورت میں یہ طَیِّبٌ سے افضل التفضیل ہوگا۔ صیغہ واحد مؤنث کا۔

صاحب جلالین نے دو احتمال نقل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ طوبیٰ طیب سے مصدر ہو اور دوسرا یہ کہ جنت کے درخت کا نام ہو۔ مصدر ہونیکی صورت میں یہ اجوف یائی ہوگا اور اسکی اصل طُیْبیٰ ہوگی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مکوزہ اعرابی نے، اسکو طِیْبیٰ بکسر الطاء پڑھا ہے تاکہ اسکی اصل یاء سلامت رہے۔ (کشاف)

مَآب : مَآبٍ۔ یہ لفظ مصدر میمی بھی ہے اور اسم زمان اور مکان بھی۔ آبَ یَؤُوْبُ سے اَوْبٌ، اِیَابٌ اور مَآبٌ مصدر آتے ہیں۔ اَوْبٌ کے معنی رجوع کے بھی آتے ہیں لیکن رجوع اور اَوْبٌ میں یہ فرق ہے کہ اَوْبٌ کا لفظ حیوان کے ارادۃً لوٹنے پر بولا جاتا ہے اور رجوع عام ہے جو حیوان اور غیر حیوان دونوں کے متعلق بولا جاتا ہے۔

اَلْاَوْبُ: ضَرْبٌ مِنَ الرُّجُوْعِ وَذَالِكَ ان الْاَوْبَ لا یقال الا فی الحیوان الذی له ارادة والرجوع یقال فیه و فی غیرہ (راغب)

یعنی اَوْب کا استعمال کسی با ارادہ حیوان کے لوٹنے پر بولا جاتا ہے اور رجوع عام ہے۔

اسی سے اَوَّابٌ ہے جیسا کہ تَوَّابٌ گناہوں کو ترک کرکے خدا کی جانب رُخ کرنے والا۔ وَ الْاَوَّابُ کالتَّوَّابِ، وھو الراجع الی اللّٰہِ تعالیٰ بترك المعاصی و فِعلِ الطاعاتِ (راغب)

آبَ، اِذَا رَجَعَ (قرطبی)

امام رازی کے قول سے مفہوم ہوتا ہے کہ مَآب ظرف مکان ہے فرماتے ہیں کہ: فالمراد حسن المرجع والمقر (کبیر)

مَتَاب : عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْهِ مَتَابِ۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف مجھے واپس جانا ہے۔

مَتَاب اصل میں مَتَابِیْ، تھا یاء متکلم مضاف الیہ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ بمعنی میرا رجوع، میرا واپس ہونا۔ تَوْبٌ، تَوْبَۃٌ، تَابَۃٌ، تَتْوِبَۃٌ: تمام مصادر ہیں، اور مَتَابٌ مصدر میمی ہے۔ نَصَرَ سے،

والیہ متاب، ای مرجعی غدًا (قرطبی)
کل کو اسی کی طرف مجھے لوٹنا ہے۔
اَلتَّائِبُ: توبہ کرنے والا۔ توبہ قبول کرنے والا۔ بندہ خدا کے سامنے توبہ کرتا ہے اور اللہ توبہ قبول فرماتا ہے اسلئے تائب کا لفظ اللہ اور بندے دونوں کیلئے بولا جاتا ہے،
اسیطرح اَلتَّوَابُ، بھی اللہ اور بندے دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، بندہ کی صفت ہو تو اس کے معنی بکثرت توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں، اور خدا کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ ذات جو بکثرت اور بار بار بندہ کی توبہ قبول فرمائے۔
اَلنَّدَمُ تَوْبَۃٌ گناہ پر شرمندہ ہونا توبہ ہے۔
تَوَّابٌ عَلَی الْعِبَادِ: خدا بندوں کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ مَنْ تَابَ تَابَ اللّٰہُ عَلَیْہِ۔ تابوت وہ صندوق جسمیں تورات کو رکھا جاتا تھا۔

یَایْئَسْ: اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا۔

یَایْئَسِ: یہاں اکثر اہل تفسیر کے نزدیک علم کے معنی میں ہے، جسطرح یایئس ناامیدی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح عرب کے بعض قبائل میں یہ بمعنی علم بھی مستعمل ہے

جیسا کہ قبیلۂ النخع اور ھوازن اور بعض دوسرے قبائل بھی یائس کو بمعنی علم استعمال کرتے ہیں
امام رازی فرماتے ہیں کہ اکثر مفسرین کا قول یہی ہے۔ اس سلسلہ میں کلام عرب کے دو شعر بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ چنانچہ سُحَیْمُ ابن وثیل الریاحی کہتے ہیں کہ۔

اَقُوْلُ لَھُمْ بِالشِّعْبِ اِذْ یَاْسِرُوْنَنِیْ
اَلَمْ تَیْاَسُوْا اَنِّیْ ابْنُ فَارِسِ زَھْدَمِ

اور رباح بن عدی کہتے ہیں کہ۔

اَلَمْ یَیْاَسِ الْاَقْوَامُ اَنِّیْ اَنَا ابْنُہٗ
وَاِنْ کُنْتُ عَنْ اَرْضِ الْعَشِیْرَۃِ نَائِیًا

ان دونوں شعروں میں یَیْاَسْ کو بمعنی علم استعمال کیا گیا ہے۔
مشہور نحوی اور لغوی کسائی کہتے ہیں کہ میں نے کلام عرب میں یَئِسْتُ کے معنی عَلِمْتُ نہیں پائے۔ قال الکسائی: ماوجدتُ العرب تقول یَئِسْتُ معنی عَلِمْتُ البتۃ (کبیر)
علامہ بغدادی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ فراء نحوی بھی کسائی کا اس مسئلہ میں ہم خیال ہے۔
علامہ فرماتے ہیں کہ انکا انکار بے محل ہے کیونکہ جسنے یاد رکھا اس کا کلام حجت ہے اس پر جس نے یاد نہیں رکھا۔
علامہ راغب فرماتے ہیں کہ اسکی تفسیر بعض

مفسرین نے یعلم کے ساتھ کی ہے، مگر اس سے یہ
نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اس کے حقیقی معنی ہیں، بلکہ
یہ اس کے لازم معنی ہیں کیونکہ کسی چیز کے انتفاء
کا علم اس سے ناامید ہونے کو مستلزم ہوتا ہے
لہذا یہاں بھی بلحاظ قرائن یہ کہا جا سکتا ہے کہ
یَیْأَسُ بمعنی یعلم ہے۔

صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ: ومعنی
(أَفَلَمْ يَيْأَسِ) أفلم يعلم، معلوم ہوتا ہے
علامہ زمخشری کے نزدیک یعلم، ییئس، کے
حقیقی معنی ہیں اور صاحب روح المعانی نے بھی
اس کی وضاحت کی ہے، فرماتے ہیں، و
الظاهر أنّ استعمال اليأس في ذالك
حقيقةً (روح)۔

لیکن زیادہ ارجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسکی
مجازی معنی ہیں، وقيل مجاز لانه متضمن
معنى العلم فان الآيس عن الشيئ
عالم بانه لا يكون. (روح، کشاف)
حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ اور اسیطرح دیگر کئی
صحابہ کرام اور تابعین نے اسکو (أَفَلَمْ
يَتَبَيَّنْ) پڑھا ہے۔ اور یہ قرأت دراصل
(افلم ییئس) کی تفسیر ہے۔

بعض روایات میں حضرت عبداللہ ابن
عباس کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے
أَفَلَمْ يَيْأَسْ، کو أَفَلَمْ يَأْسِ الَّذِيْنَ
آمَنُوْا پڑھا ہے اور جب اُن سے سوال کیا
گیا کہ مصحف میں تو ییئس ہے، تو انہوں نے
فرمایا کہ۔ انما كتبه الكاتب وهو ناعس
مستوي السينات: اس روایت میں ابن
عباس کی طرف منسوب کرکے قرآن پاک
میں تحریف کا شبہ پیدا کرنے کی ناپاک
کوشش کی گئی ہے، صاحب کشاف فرماتے
ہیں کہ اس طرح کی کوئی بات بھی اللہ کی کتاب
کے بارے میں نہیں سنی جا سکتی اور نہ ہی
اسکی تصدیق کی جا سکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ
کا فیصلہ ہے کہ: لا يأتيه الباطل من
بين يديه ولا من خلفه۔ اور پھر
اس طرح کی غلطی کے بارہ کیونکر تصور کیا
جا سکتا ہے جبکہ صحابہ قرآن پاک کے علوم و
معارف کے ماہر ہیں اور خدا کے دین کے
نگہبان و محافظ بھی ہیں۔ اور پھر خاص کر جب
مسئلہ بھی خالص لغت کا ہو تو یہ نہیں گمان
کیا جا سکتا ہے کہ اجلہ صحابہ کرام سے یہ
مخفی رہ گیا ہو۔

صاحب کشاف اسکی تردید کرتے ہوئے
فرماتے ہیں کہ: اللہ کی قسم یہ ایسا جھوٹ ہے
جسمیں کوئی شک نہیں۔ وهذه والله فرية

مانیہا مریبۃ (کشاف)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت قرآن پاک کو مجروح کرنے اور صحابہ کرام کو محرف ثابت کرنے کے لئے کسی ملحد رافضی نے تراشی ہے، اور بعض غیر ثقہ حضرات نے اسکو اپنی کتب میں نقل کر دیا ہے، ورنہ حقیقۃً یہ روایت بالکل بے بنیاد ہے چنانچہ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ فھو قول زندیق بن ملحد۔ (روح) یہ قول کسی ملحد کے بیٹے زندیق کا ہے۔

وَاقٍ : وَمَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ۔ اور انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں۔

وَاقٍ : وَقْیٌ سے اسم فاعل ہے بمعنی بچانے والا۔ اصل میں وَاقِیٌ تھا۔ امر اسمیں سے قِ۔ آتا ہے جیسا کہ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ تثنیہ قِیَا اور جمع قُوْا آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔

وَقٰی یَقِیْ وِقَایَۃً وَوَقْیًا وَوَاقِیَۃً وَوَقْیٌ۔ وَقٰی فُلَانًا۔ کسی کی حفاظت کرنا۔ اذیت سے بچانا۔ وَقَیْتُ الشَّیْءَ وِقَایَۃً وَوِقَاءً: کسی چیز کو مضر اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بچانا۔ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ۔ خدا نے ان کو اس دن کی تکلیف سے بچا لیا (راغب)

دَائِمٌ : اُكُلُهَا دَائِمٌ : اس کا پھل ہمیشہ رہیگا۔ دائم: دَوَامٌ۔ سے اسم فاعل ہے جس کے معنی ہمیشہ ایک حالت پر برقرار رہنے کے ہیں جمع دَائِمُوْنَ ہے۔ قرآن پاک میں ہے وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ۔ یہ نصر اور ضرب دونوں سے آتا ہے۔ الماء الدائم: کھڑا پانی حدیث میں ہے۔ لا یبولن احدکم فی الماء الدائم۔ دام الشیءُ، کسی چیز کا عرصہ دراز تک ٹھہرے رہنا۔ قرآن پاک میں ہے وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ اور جب تک میں ان میں رہا۔ اس مادہ کی تحقیق گذر چکی ہے۔

اَجَلٍ : لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ہر ایک وعدہ ہے لکھا ہوا اجل کے معنی مدت معینہ اور میعاد کے آتے ہیں اور کتاب اس جگہ بمعنی مصدر ہے یعنی، تحریر معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی میعاد اور مقدار اللہ تعالیٰ کے پاس لکھی ہوئی ہے اس نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت پیدا ہوگا اور اتنے دن زندہ رہیگا، کہاں کہاں جائیگا کیا کیا کام کریگا کس وقت اور کہاں مریگا۔

يَمْحُوا : يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ۔ خدا جسکو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب

اَلْمَحْوُ: کے معنی کسی چیز کے اثر اور نشان کو زائل کر دینے کے ہیں۔ کہتے ہیں مَحَوْتُ الْکِتَابَ: ای اَذْھَبْتُ اَثَرَہٗ، یعنی تحریر کو مٹا دینا۔

اُمٌّ: وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ:

ام الکتاب: کے لفظی معنی اصل کتاب کے ہیں۔ مراد اس سے وہ لوح محفوظ ہے جسمیں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز کی اصل کو اُمّ کہا جاتا ہے اور اہل عرب ہر اس چیز کو ام کہتے ہیں جو اصل کی طرح ہو۔ الاُمُّ: اصلُ الشیء والعرب تسمی کلّ ما یجری مجری الاصل للشیٔ اُمًّا لَہٗ (جمل)

معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے ثابت اور باقی رکھتا ہے۔ اس محو و اثبات کے بعد جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اللہ کے پاس محفوظ ہے جس پر نہ کسی کی دسترس ہے، نہ اسمیں کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے (معارف)۔

تمام آسمانی کتابوں میں دو قسم کی آیات ہیں ایک وہ جن کے معنی بالکل صاف اور واضح ہیں۔ یعنی ان میں لغت اور ترکیب کے اعتبار سے کسی قسم کا اجمال اور ابہام نہیں پایا جاتا۔ اور مذہب کے عام اصول مسلّمہ کے اعتبار سے ان کے معنی قطعاً متعین ہو چکے ہیں۔ دوسری وہ آیات ہیں جن کے معنی سمجھنے میں کچھ اشتباہ اور التباس ہے یا تو اس لئے کہ عبارت میں ابہام و اجمال ہے یا اس وجہ سے کہ آیت کئی معنوں کی متحمل ہے پہلی قسم کی آیات کو محکمات اور دوسری قسم کی متشابہات کہلاتی ہیں۔ چونکہ آیات محکمات درحقیقت کتاب کی ساری تعلیمات کی اصل اور جڑ ہوتی ہیں اس لئے قرآن کریم ان کو بھی ام الکتاب کہتا ہے، اسی طرح لوح محفوظ بھی چونکہ تمام علوم کا سرچشمہ ہے اور سارے علوم و فنون اسی کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور اسی سے نکلتے ہیں بدیں وجہ اس کو بھی ام الکتاب سے موسوم کیا گیا ہے

(لغات القرآن)

اصل کلّ کتاب وھو اللوح المحفوظ (کشاف)

ھو الذی یکون اصلاً لجمیع الکتب۔ (کبیر)

(دیکھئے آل عمران ام الکتاب کے تحت)

الحمد للہ العزیز کہ سورہ رعد کے الفاظ کی تحقیق آج مورخہ ۱۴ شوال بروز ہفتہ مطابق ۹-۱۰-۷۶ کو پوری ہوئی۔ آگے سورہ ابراہیم ہے۔

عبدالرشید امام جامع مسجد بی۔ اے۔ ایف ڈرگ روڈ کراچی۔

شرحُ الفاظ القرآن من سُورۃ ابراھیم

عِوَجًا: يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا۔

اَلْعَوَجُ: اس کجی اور ٹیڑھے پن کو کہا جاتا ہے جو آنکھ سے بسہولت دیکھا جاسکے جیسے کھڑی چیز میں ہوتا ہے مثلاً لکڑی وغیرہ۔ اور العوج (بکسر العین و فتح الواو) اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو صرف عقل و بصیرت سے دیکھا جاسکے، جیسے صاف میدان کی ناہمواری کہ غور و فکر کے بغیر اسکا ادراک نہیں ہوسکتا، یا معاشرہ میں دینی اور معاشی ناہمواریاں کہ عقل و بصیرت ہی سے ان کا ادراک ہوسکتا ہے۔

اصل میں العوج کے معنی کسی چیز کے سیدھا کھڑے ہونے کی حالت میں ایک طرف جھک جانا کے ہیں، جیسے کہ عُجْتُ الْبَعِيْرَ میں نے اونٹ کو ایک طرف موڑ دیا۔

اَلْعَوَجُ: اَلْعَطْفُ عن حال الانتصاب

(راغب)

يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا: کے دو معنی ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ یہ لوگ اپنی بدباطنی اور بدعملی کے سبب اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کے روشن اور سیدھے راستہ میں کوئی کجی اور خرابی نظر آئے تو اُن کو اعتراض اور طعن کا موقع ملے۔

ابن کثیر نے یہی معنی بیان کئے ہیں، ابن کثیر فرماتے ہیں کہ: ویحبون ان تکون سبیلُ اللہِ عوجًا مائلۃ عائلۃ۔ (ابن کثیر)

دوسرے معنی اس جملہ کے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ لوگ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں یعنی قرآن و سنت میں کوئی چیز ان کے خیالات اور خواہشات کے مطابق اور موافق مل جائے تو اس کو اپنی حقانیت کے استدلال میں پیش کریں، تفسیر قرطبی نے اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ: ای يَطْلُبُوْنَ لَهَا زَيْغًا وَمَيْلًا لِمُوَافَقَةِ اَهْوَائِهِمْ، وَقَضَاءِ حَاجَاتِهِمْ وَاَغْرَاضِهِمْ۔

حضرت مفتی صاحب مد اللہ ظلال علومہم، فرماتے ہیں کہ: آج کل بے شمار اہل علم اس مرض میں مبتلا ہیں کہ اپنے دل میں ایک خیال کبھی اپنی غلطی سے کبھی کسی دوسرے سے متاثر ہوکر گھڑ لیتے ہیں پھر قرآن و حدیث میں اس کے

مؤیدات تلاش کرتے ہیں اور کہیں کوئی لفظ اس خیال کی موافقت میں نظر پڑ گیا تو اس کو اپنے لئے قرآنی دلیل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ طریقہ کار اصولاً ہی غلط ہے۔ کیونکہ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنے خیالات و خواہشات سے خالی الذہن ہو کر کتاب و سنت کو دیکھے، جو کچھ ان سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اسکو اپنا مسلک قرار دے

(معارف)

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ عِوَجٌ بکسر العین کا استعمال، دین، امر، اور زمین کے متعلق ہوتا ہے اور اسی طرح ہر اس چیز کے بارے میں جو (حسی طور پر) سیدھی کھڑی نہ ہو، اور عَوَجٌ بفتح العین، کا استعمال ان تمام چیزوں میں ہوتا ہے جو (حسی طور پر) سیدھی کھڑی ہوں جیسے دیوار، اور نیزہ وغیرہ۔

والعِوَجُ بکسر العین فی الدین۔ والامر۔ والارض، وفی کل ما لم یکن قائماً۔ و بفتح العین فی کل ما کان قائماً۔ کالحائط والرمح ونحوہ (قرطبی)

لِسَانٌ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ۔

لِسَانٌ: اسم مفرد ہے اسکی جمع مذکر اَلْسِنَۃ اور جمع مؤنث اَلْسُنٌ آتی ہے۔ اور لُسُنٌ جمع مطلق ہے۔

لسان مذکر بھی استعمال ہوتی ہے اور مؤنث بھی، اس کے مختلف معانی ہیں مثلاً زبان، قوت گویائی، بولی، لہجہ، ذکر جیسے کہ بِلِسَانِ قَوْمِہٖ: اس کی قوم کے بولی کے ساتھ اِخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ: تمہاری بولیوں کا اختلاف وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ، میری قوت گویائی کی بندش کھول دے۔ لِسَانَ صِدْقٍ ذکر جمیل۔ لِسَانُ اللّٰہِ، اللہ کا کلام۔ لِسْنٌ، بھی لِسَانٌ، کا ہم معنی ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ لسان کو قوم کی طرف منسوب کرنے کے باوجود اس لئے مفرد لایا گیا ہے کہ اس سے مراد لغت ہے اور یہ اسم جنس ہے جو جمع اور مفرد سب میں یکساں ہے۔ قال صاحب الکشاف: بلسان قومہ: بلغۃ قومہ۔

اَیَّامِ اللّٰہِ: وَذَکِّرْھُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰہِ۔

اَیّام: کا لفظ اسیطرح آتا ہے جیسے یہاں آیا ہے تو اس سے خاص بڑے بڑے اہم تاریخی اور یادگاری دن مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً ایام العرب کہیں تو عرب کی جنگیں مراد ہوگی، اسی طرح ایام اللہ سے مراد وہ یادگار تاریخی دن ہیں جنمیں اللہ تعالیٰ نافرمان قوموں پر عذاب نازل فرمانے

اور اپنے باایمان بندوں کو ان کے ظلم ستم سے نجات بخشی۔

حضرت مفتی صاحب مد اللہ ظللہ علوہم، فرماتے ہیں کہ: ایام یوم کی جمع ہے جس کے معنی دن کے مشہور ہیں، لفظ اَیَّامُ اللہ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے اور وہ دونوں یہاں مراد ہو سکتے ہیں، اول وہ خاص ایام جنمیں کوئی جنگ یا انقلاب آیا ہے جیسے غزوہ بدر و احد اور احزاب و حنین وغیرہ۔ یا پچھلی امتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات ہیں جنمیں بڑی بڑی قومیں زیر وزبر یا نیست و نابود ہوگئیں۔ اس صورت میں ایام یاد دلانے سے ان قوموں کو کفر کے انجام بد سے ڈرانا اور متنبہ کرنا مقصود ہوگا۔

دوسرے معنی ایام اللہ، کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے بھی آتے ہیں، تو ان کو یاد دلانے کا مقصد یہ ہوگا کہ شریف انسان کو جب کسی محسن کا احسان یاد دلایا جاتا ہے تو وہ اسکی مخالفت اور نافرمانی سے شرماتا ہے۔ (معارف القرآن)

ابن السکیت نے تصریح کی ہے کہ عرب اَیَّام کو وقائع کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فُلَانٌ عَالِمٌ بِاَیَّامِ الْعَرَبِ: یعنی وہ عرب کے حالات اور واقعات کا عالم ہے۔

آیتِ مذکورہ میں ایام اللہ سے مراد خدا کی وہ نعمتیں ہیں جو اُس نے بنی اسرائیل پر کیں۔ مطلب یہ کہ آپؑ انہیں خدا کے وہ دن یاد کرائیں جنمیں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمتیں نازل فرمائیں۔ مثلاً فرعون سے نجات دینا، اس کو غرق کرنا، بنی اسرائیل کو بحر سے پار اُتارنا۔ پھر ان پر سایہ کرنا۔ مَن و سلویٰ وغیرہ اتارنا۔

صَبَّارٌ: اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ۔

صَبَّارٌ: صَبر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت صبر کرنے والا، بڑا تحمل کرنے والا، بڑا قائم رہنے والا یہ فَعَّالٌ کے وزن پر ہے۔ راغب فرماتے ہیں کہ صَبَّارٌ، اس وقت کہا جاتا ہے جب کہ اسمیں ایک قسم کا تکلف اور مجاھدہ ہو۔

اصل میں صَبر کے معنی ہیں اپنے جی کو اس طرح روکے رکھنا جس طرح عقل اور شرع کا تقاضا ہے، یا عقل و شرع جس چیز سے روکنے کے مقتضی ہیں اس سے اپنے آپ کو باز رکھنا۔ صَبَّارٌ: کثیر الصبر علی بَلَاءِ

تعالیٰ۔ (روح)

شَکُوْرٌ : شَکُوْرٌ: شکر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت شکر گذار۔ (معارف)

یہ فَعُوْلٌ کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے مبالغہ کے اوزان میں سے ہے، مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے، شُکُرٌ اس کی جمع ہے، شَکُوْرٌ وہ بندہ ہے جو اطاعت الٰہی اور اس عبادت کی بجاآوری کے ذریعہ جو اس پر مقدر کی گئی ہے حق تعالیٰ کی شکر گذاری میں خوب کوشاں ہو، شَکُوْرٌ جب اسماء حسنیٰ میں سے ہو تو اس کے معنی قدر دان کے ہوں گے کہ تھوڑے کام پر بہت اجر و ثواب عنایت کرنے والا ہے۔

شکر پانچ قاعدوں پر مبنی ہے، اول شاکر کی مشکور کے لئے فروتنی۔ دوسرے اس سے محبت کرنا۔ تیسرے اسکی نعمت کا معترف ہونا، چوتھے اسکی نعمت کی بنا پر اسکی ثنا کرنا۔ پانچویں اس نعمت کو ایسی جگہ استعمال نہ کرنا جہاں وہ پسند نہ کرے۔ یہ پانچ باتیں شکر کی اساس ہیں اور انہی پر اسکی بنیاد ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی معدوم ہو تو شکر کے قواعد میں سے ایک قاعدہ مخل ہو گیا۔

شکر کے بارے میں جس نے بھی کلام کیا ہے اس کا کلام انہی پانچ اُمور کی طرف راجع اور انہی میں دائر ہے (لغات القرآن)

تَاَذَّنَ : وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ۔

لفظ تَاَذَّنَ: اذن اور اطلاع اور اعلان کرنے کے معنی میں ہے (معارف)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ تَاَذَّنَ اور اٰذَنَ دونوں اَعْلَمَ کے معنی میں ہیں یعنی اعلان کرنا دوسروں کو باخبر کرنا، اسی سے آذان ہے نماز کے لئے پکارنا۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ، یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلام عام کر دیا ہے کہ اگر تم میری نعمتوں کی قدر کی اور شکر ادا کیا اور انکو میری نافرمانیوں اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کیا اور اپنے اعمال و افعال کو میری مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو میں ان نعمتوں کو اور زیادہ کر دوں گا، اور اگر انکار و انحراف کیا تو میری گرفت بھی بہت سخت ہے، پھر تمکو کوئی بھی میری گرفت اور عذاب سے بچا نہ سکیگا۔

اِذْنٌ: حکم۔ توفیق، اجازت، قانونِ فطرت۔

خَابَ : وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۔ اور نامراد ہوا ہر سرکش ضدی۔

خَابَ : وہ نامراد ہوا۔ اس کا مطلب فوت ہوا۔ خَيْبَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی نامراد ہونے اور مطلب فوت ہونے کے ہیں۔

خَابَ سَعْيُهٗ : کے معنی ہیں اسکی کوشش ناکام رہی خَيَّبَهٗ وَاَخَابَهٗ کے معنی ہیں کسی کو ناکام ومحروم کر دینا۔ یہ ضَرَبَ سے اجوف یائی ہے اور نَصَرَ سے اجوف واوی آتا ہے جس کے معنی ہیں غریب اور محتاج ہونا۔ نَصَرَ سے مصدر خَوْبَةٌ آتا ہے بمعنی بھوک، وہ زمین جس پر چارہ نہ ہو۔

جَبَّارٌ : جَبَّارٌ : سرکش، زور کرنے والا۔ زبردست دباؤ والا۔ خود اختیار۔ جَبْرٌ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اہل لغت کی تصریح کے مطابق، جَبر کے معنی اصل میں ایک طرح کی زبردستی کے ساتھ کسی چیز کی اصلاح کرنے کے ہیں، لیکن جبر کا استعمال صرف اصلاح اور محض زبردستی کے لئے بھی آتا ہے، انسانوں میں، جَبَّارٌ، وہ شخص کہلاتا ہے جو اپنے نقص کو علو مرتب کے اس اِدِّعاء کے ساتھ پورا کرنا چاہتے جسکا وہ مستحق نہیں ہے، بایں معنی، جَبَّار، کا استعمال بطور مذمت ہی ہوتا ہے، کبھی کبھی، جَبَّار، اسکو بھی کہتے ہیں جسکا دوسروں پر دباؤ اور زور ہو، جیسا کہ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۔ اور تیرا ان پر دباؤ نہیں۔

لفظ، جَبَّار، صفات باری میں سے بھی ہے جیسے کہ، اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ اس سلسلہ میں دو قول ہیں ایک قول یہ کہ چونکہ باری تعالیٰ فیضان نعمت سے سب لوگوں کی حالتیں درست کرتا ہے اور ان کے نقصانات پورے کرتا ہے اس لئے اسکا نام جَبَّار ہے یعنی نقصانات کا پورا کرنے والا اور لوگوں کے احوال درست کرنے والا۔

عرب بولتے ہیں جَبَرْتُ الْفَقِيْرَ، میں نے فقیر کا نقصان پورا کر دیا، اسکی حالت درست کر دی۔ اسے تونگر کر دیا۔

دوسری وجہ یہ کہ وہ اپنے ارادے کے آگے سب کو مجبور کرتا ہے اسلئے وہ جبار کہلاتا ہے یعنی اپنے ارادے کے سامنے سب کو جھکا دینے والا۔

امام ابو سلیمان خطابی فرماتے ہیں کہ:

الجبار الذی جبر الخلق علیٰ ما اراد من امرہ وَنَهْيِهٖ، یقال جَبَرَهُ السلطانُ واجبرہ بالالف۔ ویقال ھو الذی جبر مفاقر الخلق وکفاھم اسباب المعاش

والرزق ویقال بل الجبار العالی فوق خلقه من قولهم تجبرت النبات۔ یعنی جبار وہ ذات ہے جس نے اپنی مخلوق کو اپنے امر و نہی پر جس طرح چاہا مجبور کردیا، چنانچہ بولتے ہیں جبرہ السلطانُ و اجبرہ (افعال سے الف کے ساتھ) یعنی بادشاہ نے اپنے حکم پر مجبور کردیا، اور بعض کا قول ہے جَبَّارٌ وہ ذات ہے جسنے اپنی مخلوق کی حاجتوں کو پورا کردیا۔ اور ان کے معاش اور روزی کے اسباب کو کافی ہوا اور بعض کہتے ہیں کہ جبار کے معنی اس ذات کے ہیں جو اپنی مخلوق سے اوپر ہے، کیونکہ سبزہ جب بلند ہوتا ہے تو تجبرت النَّبَاتُ بولتے ہیں۔ علامہ خازن نے تصریح کی ہے کہ: لفظ جَبَّار انسان کے حق میں مذموم اور حق تعالیٰ کی شان میں ممدوح ہے۔ اَلْجَبَرُوْتُ قدرت، طاقت۔ عظمت۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ: جبار اہل لغت کے نزدیک وہ ہے جو اپنے اوپر کسی دوسرے کا کوئی حق تسلیم نہ کرے۔ الجبار الذی لا یری لاحدٍ علیہ حقا، ھو عند اھل اللغۃ (قرطبی)

عَنِيْدٍ : عَنِیْدٍ: عناد رکھنے والا، مخالف، ضدی، امام ابوبکر عزیزی لکھتے ہیں کہ عَنِیْد وہ شخص ہے جو تمہارے ساتھ مخالفت سے پیش آئے۔ اور امام راغب نے اسکا ترجمہ: المعجب بما عندہ سے کیا ہے۔ یعنی جو کچھ اپنے پاس ہے، اس پر اترانے والا۔ اور علامہ ناصر بن عبدالسید مطرزی نے اس کے معنی، اس شخص کے لکھے ہیں جو حق کو جانتے پہچانتے مکرائے، یہ عُنُوْدٌ سے ہے جس کے معنی راستہ سے ادھر ادھر ہٹ جانے کے ہیں، فَعِیْلٌ کے وزن بمعنی فاعل (عَانِدٌ) صفت مشبہ کا صیغہ ہے، اسکی جمع عُنُدٌ آتی ہے۔

(لغات القرآن)

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ، عَنِیْدٌ وہ ہے جو حق کی مخالفت کرنے والا اور اسکا مقابلہ کرنے والا ہو۔ کہا جاتا ہے۔ عَنَدَ عَنْ قَوْمِہٖ ای تَبَاعَدَ عَنْھُمْ، یعنی وہ قوم سے کٹ گیا دور ہوگیا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ عَنَدٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ناحیہ یعنی کنارہ ہے۔ کہتے ہیں عَانَدَ فُلَانٌ یعنی وہ ایک طرف ہوگیا، کنارہ کرلیا۔

والعنید: المعاند للحق والمجانب له، عَنَدَ عن قومه ای تَبَاعَدَ عنهم (قرطبی)

عَنَدَ۔ ن۔ض۔ عن اصحابه عُنُوْدًا۔ سفر میں ساتھیوں سے الگ ہوجانا۔

صَدِیْدٌ : وَیُسْقٰی مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ۔ اس سے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔

صَدَّ یَصُدُّ صَدًّا وَصُدُوْدًا وَصَدِیْدًا۔

یہ نصر، اور ضرب دونوں سے آتا ہے۔ یہ لازم کے معنی میں بھی آتا ہے جس کے معنی کسی چیز کے رکنے روگردانی اور کسی کی طرف سے اعراض کرنے کے ہیں۔
صَدَّ عَنْهُ: اس نے اعراض کیا۔ وہ اس سے رک گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا: اور وہ لوگ آپ سے اعراض کرتے ہیں۔ اور کبھی متعدی بھی ہوتا ہے۔
صَدَّهٗ عَنْ كَذَا: کے معنی ہیں روکنا، منع کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ۔ اور شیطان نے ان کے اعمال کو آراستہ کیا اور ان کو سیدھے راستہ سے روک دیا۔
صَدُوْدٌ: روکنے والا بمعنی صفت فاعلی۔
اَلصَّدِيْدُ: پیپ اور غلیظ مادہ کے لئے بطور اسم کے ہے۔ پیپ کو صدید اسلئے کہتے ہیں کہ وہ چمڑے اور گوشت کے درمیان حائل ہو جاتی ہے، اور دوزخیوں کے طعام کو بطور مثال کے صدید کہا گیا ہے۔ اور صَدِيْدُ الْفِضَّةِ پگھلی ہوئی چاندی۔
وَالصَّدِيْدُ: مَاحَالَ بَيْنَ اللَّحْمِ والجلد من القيح۔ (راغب)
اس ماء صدید سے مراد کیا ہے اسمیں اہل تفسیر کے مختلف اقوال ہیں حاصل سب کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مراد اس سے جسم کے بعض حصوں سے نکلنے والا گندہ اور غلیظ مادہ ہے۔
حضرت مجاہد، قتادہ، ضحاک کا کہنا ہے کہ اس سے مراد دوزخیوں کے زخموں سے بہنے والی پیپ ہے۔ هو ما يسيل من اجساد اهل النار (روح)
بعض نے کہا ہے کہ زانیہ عورتوں کی فروج سے خارج ہونے والا گندہ پانی ہے (قرطبی) (اعاذنا اللہ)

وَرَائِهٖ: مِنْ وَّرَائِهٖ جَهَنَّمُ:

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ وَرَآء: اصل میں مصدر ہے جسکو بطور ظرف استعمال کیا جاتا ہے اسکی اضافت فاعل اور مفعول دونوں کی طرف ہوتی ہے، فاعل کی طرف اضافت ہو تو معنی ہوتے ہیں چھپانے والی چیز یعنی ایسی چیز جسکی اوٹ اور آڑ لی جا سکے۔ اس صورت میں وہ چیز آگے ہوگی اور چھپنے والا شخص اس کے پیچھے ہوگا اور دوسری صورت میں یعنی جب اسکی اضافت مفعول کی طرف ہو تو اس کے معنی برعکس ہوں گے آدمی اس چیز کے آگے اور چیز پیچھے ہوگی۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اسی لئے اس کو اضداد میں

شمار کیا گیا۔ ولذالك عُدَّ من الاضداد۔
(بیضاوی ص۴۲ طبع مصر)

اسی طرف علامہ سلیمان جمل نے اشارہ فرمایا ہے
فالوراءُ یستعمل فی الضدّینِ (جمل)

علامہ راغب فرماتے ہیں کہ: وَرَآءَ کا لفظ دونوں معنوں یعنی خلف اور بعد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور قُدَّمُ۔ بمعنی آگے کے لئے بھی۔ جو زید کے پیچھے اور بعد میں آئے، اس کے لئے وَرَآءُ زَیْدٍ: بولا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے وَمِنْ وَّرَاءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ۔ اور اسحٰق کے بعد یعقوب پوتے کی بشارت دی۔
اِرْجِعُوْا وَرَاءَکُمْ: پیچھے لوٹ جاؤ۔
مشہور شاعر نابغہ کہتا ہے۔

حَلَفْتُ فَلَمْ اَترُكْ لِنَفْسِكَ رِیْبَةً
وَلَیْسَ وَرَاءَ اللّٰہِ لِلْمَرْءِ مَذْھَبُ

وَرَآءَ اللّٰہ ای بعد اللّٰہ (قرطبی)

اور وَرَآءَ۔ بمعنی قُدّام۔ اور آگے اور سامنے کے بھی آتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ وَکَانَ وَرَآءَھُمْ مَّلِكٌ یَّاْخُذُ کُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا۔ اور ان کے سامنے کی طرف ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔

وقال الازھری: ان وراء تکون بمعنی خلف وامام فھو من الاضداد (قرطبی)
لبید شاعر کہتا ہے۔

اَلَیْسَ وَرَائِیْ اِنْ تَرَاخَتْ مَنِیَّتِیْ
لُزُوْمُ الْعَصَا تُحْنٰی عَلَیْھَا الْاَصَابِعُ

لفظ وَرَآءَ: سواء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ۔ اور جو ان کے سوا، اوروں کے طالب ہوں وہ حد سے نکل جانے والے ہیں۔

علامہ عبدالرشید صاحب نعمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: وَرَآءَ: مصدر ہے لیکن اس کے معنی ہیں۔ آڑ، حد فاصل، کسی چیز کا آگے ہونا، پیچھے ہونا۔ علاوہ اور سواء۔ ہونا۔ فصل اور حد بندی پر دلالت کرتے ہیں اس لئے سب معنی میں مستعمل ہے اسی لئے باب فتح سے وَرَأَہٗ کا معنی ہے اسکو دور کردیا۔ وَرِئَ مِنَ الطَّعَامِ کھانے سے سیر ہو گیا۔

حاصل یہ کہ وَرَآءَ: لغات اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی جس طرح پیچھے کے ہیں آگے کے بھی آتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ اَلْمَوْتُ وَرَآءَ کُلِّ اَحَدٍ: موت ہر ایک کے پیچھے لگی ہوئی ہے، یا یہ کہ موت ہر ایک کے سامنے ہے۔

قال ابوعبیدہ وابن السکیت الوراء من الاضداد یقع علی الخلف والقدام (کبیر)

لفظ وَرَآءَ : اسم لما یُوَارِیْ عَنْكَ ۔ وقدام
وخلف متوارٍ عنك ۔ فصح اطلاق ۔ لفظ
وَرَآءَ علی کل واحد منهما (کبیر)

یَتَجَرَّعُ : یَتَجَرَّعُهٗ وَلَا یَکَادُ یُسِیْغُهٗ ۔

یَتَجَرَّعُ : باب تفعل کے مصدر تَجَرُّعٌ سے
واحد مذکر کا صیغہ ہے ۂ ضمیر مفعول متصل کی ہے
وہ اس کو گھونٹ گھونٹ کرکے پیئے گا ۔ سَمِعَ سے
اسکا مصدر جَرْعٌ آتا ہے ۔ گھونٹ گھونٹ پینا ۔
اور فَتَحَ سے اس کے معنی آتے ہیں ایک مرتبہ
میں پانی کو غٹ غٹ کرکے پی جانا ۔ جَرَعَ الماءَ
یَجْرَعُ جَرْعًا وَجَرَعًا ۔ ابتلعه بمرة (منجد)
تجریع ، تفعیل سے کسی کو غصہ پلانا ۔ کہتے ہیں ۔
جَرَّعَهٗ غُصَصَ الْغَیْظِ : اس کو غصہ کے گھونٹ
پلائے ۔ اور جُرْعَةٌ : ایک گھونٹ ۔ کہتے ہیں ،
مابه حاجة الی هٰذه الجُرْعَةِ : اس کو
اس گھونٹ کی حاجت نہیں ۔ وَ اَفْلَتَ بِجُرَيْعَةِ
الذقن ۔ وہ ہلاکت کے قریب پہنچ کر بچ نکلا ۔
اَلتَّجَرُّعُ : تناول المشروب جُرْعَةً جُرْعَةً
علی الاستمرار (کبیر) ۔

یُسِیْغُ : وَلَا یَکَادُ یُسِیْغُهٗ : اور وہ اس کو
آسانی کے ساتھ گلے سے نہیں اتار سکیگا ۔

یُسِیْغُ : باب افعال کے مصدر اِسَاغَةٌ سے
ہے ۔ کسی چیز کو آسانی کے ساتھ حلق سے اتارنا ۔
نگل جانا ۔ مجرد سَوْغٌ ۔ سَاغَ یَسُوْغُ سَوْغًا
وَسَاغَ یَسِیْغُ سَیْغًا : دونوں ابواب سے
آتا ہے ۔ سَاغَ الشَّرَابُ فی الحلق کے معنی
شراب کے آسانی کے ساتھ حلق سے اتر جانے
کے ہیں ۔ تَسْوِیْغٌ کے معنی ہیں جائز رکھنا ۔
مباح بنانا ۔ سَوَّغْتُهٗ مَالًا : میں نے اس کے
مال کو خوش گوار بنا دیا یعنی مباح کر دیا ۔ اور
فُلَانٌ سَوْغُ اَخِیْهِ ۔ کا محاورہ ہے
اس بچے کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو اپنے
بھائی کے بعد جلدی ہی پیدا ہو ۔

اِسَاغَةٌ اِفعال ۔ آسانی کے ساتھ حلق سے
نیچے اتارنا ۔ مَسَاغٌ راستہ ۔ لَمْ یَجِدْ
مَسَاغًا ۔ اس کو کوئی راہ نہ ملی ، جدھر سے نکل جاتا
فَاِنَّ السَّوْغَ : اِنْحِدَارُ الْمَاءِ اِنْحِدَارَ
الشَّرَابِ فِی الْحَلْقِ بسهولة (روح)
وَقِیْلَ الْاِسَاغَةُ : الادخال فی الجوف ۔ والمعنی
لَا یُقَارِبُ ان یدخله فی جوفه قبل
ان یشربه (روح)

الاساغة فی اللغة : اجراء الشراب فی
الحلق بقبول النفس و استطابة
المشروب (کبیر)

مطلب یہ کہ غایت حرارت اور کراہیت
کی وجہ سے اس غلیظ مادہ کو گلے سے آسانی

کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی، اور بغیر
پینے بھی اسکو پیٹ میں اتار نہ سکے گا کہ پیاس سے
نجات ہو۔

رَمَادٍ: مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ: جو لوگ اپنے پروردگار
کے ساتھ کفر کرتے رہتے ہیں ان کے اعمال کی
حالت یہ ہے کہ جیسے راکھ (ماجدی) آگ
جلانے کے بعد جو راکھ باقی رہ جاتی ہے اسی کو
رَمَادٌ کہتے ہیں۔

اَلرَّمَادُ: ما یبقی بعد احتراق الشئ
(قرطبی)

رَمَدَتِ النَّارُ، کے معنی ہیں آگ بجھ کر راکھ
بن گئی۔ پھر استعارہ کے طور پر ہلاکت کے معنی میں
بھی اسکا استعمال ہوتا ہے۔ اور رَمِدَ الْمَاءُ کے
معنی ہیں کہ پانی گدلا ہوگیا۔ گویا اسمیں راکھ
پڑ گئی ہو۔ اَرْمَدُ خاکستری رنگ ثَوْبٌ اَرْمَدُ
میلا کپڑا۔ اَلرَّمَادَةُ بمعنی قحط سالی کے استعمال
ہوتا ہے۔ اَرْمَدَ الْقَوْمُ قوم کا قحط زدہ ہونا
فقیر ہونا۔ محاورہ ہے هُوَ يَنْفُخُ فِي الرَّمَادِ۔
وہ راکھ میں پھونکتا ہے یعنی بے فائدہ اور
فضول کام کرتا ہے۔ رَمَادٌ کی جمع کثرت رُمُدٌ
اور جمع قلت اَرْمِدَةٌ آتی ہے اَرْمِدَاءُ بھی اسکی
جمع آتی ہے اَفْعِلَاءُ کے وزن پر مگر یہ شاذ ہے (روح)

جَدِيْدٍ: وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ۔
جَدِيْدٌ: یہ فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول ہے
اس کا مادہ جَدٌّ ہے جس کے معنی قطع کرنے
کے ہیں۔ اصل میں کٹے ہوئے کپڑے کو ثَوْبٌ
جَدِيْدٌ کہتے ہیں اور چونکہ جس کپڑے کو کاٹا جاتا
ہے وہ عموماً نیا ہوتا ہے اس لئے ہر نئی چیز کو
جدید کہہ دیتے ہیں۔ اور وَيَاْتِ بِخَلْقٍ
جَدِيْدٍ کا مطلب یہ ہے کہ، اگر وہ چاہے
تو تمہیں ہلاک کر کے نئی مخلوق پیدا کر دے جو
اسکی اطاعت گذار ہو۔

بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ:
یہاں خلق جدید سے مراد نشاۃ ثانیہ ہے یعنی
مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا مراد ہے (راغب)
اور قرآن پاک کی آیت۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ
بِيْضٌ۔ میں جُدَدٌ جمع ہے اسکی واحد جُدَّةٌ ہے
بمعنی کھلا راستہ یعنی پہاڑوں میں بھی کھلے
کھلے راستے اور گھاٹیاں ہیں کوئی سفید کوئی
سرخ ان کے رنگ مختلف ہیں اور کوئی بہت
گہرے سیاہ ہیں۔ (ترجمہ ماجدی)

جَزِعْنَا: سَوَآءٌ عَلَيْنَا اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ۔ اب برابر ہے
ہم پہ بیقراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں خلاص
اَلْجَزَعُ: بے صبری۔ یہ حزن سے خاص ہے کیونکہ

جَزِعٌ : خاص کر اس غم کو کہتے ہیں جو انسان کو جس چیز کے وہ درپے ہو اس سے پھیر دے اور اس سے تعلق منقطع کر دے۔ اصل میں جزع کے معنی رسی کو نصف سے کاٹ دینے کے ہیں۔ اور باب انفعال سے اِنْجَزَعَ اسکا مطاوع آتا ہے جیسے جَزَعْتُهٗ فَانْجَزَعَ : میں نے اس کو کاٹا تو وہ کٹ گیا۔ اور معنی انقطاع کے تصور کی بنا پر وادی کے موڑ کو جِزْعُ الوادی کہا جاتا ہے۔ (راغب) جَزَعَ الوادی یَجْزَعُ (ن) جَزْعًا : وادی کو عرض میں طے کرنا۔ جَزَعَ لَهٗ مِنْ مَّالِهٖ جَزْعَةً : اپنے مال میں سے کسی کو کچھ حصہ دینا۔ اور جَزِعَ (س) جَزَعًا وَجُزُوْعًا : فَعُوْلٌ : کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے بمعنی گھبرا جانے والا۔ اضطراب کرنے والا۔

مَحِیْصٍ : مَالَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ۔ ای من مَلْجَاٍ ومَھْرَب، ویجوز ان یکون بمعنی المصدر و بمعنی الاسم: یقال حَاصَ فلان من کذا ای فَرَّوَزَاغَ یَحِیْصُ حَیْصًا وَحُیُوْصًا وَحَیَصَانًا۔ و المعنی مالنا وَجْهٌ نتباعد به عن النار۔ (قرطبی) ومثله فی فتح القدیر۔ حاص عنه: اس سے ہٹ گیا حَاصَ حوله: اس کے گرد منڈلایا۔

وَالْمَحِیْصُ : من حاصَ بحادَ وفرَّ، وَ هُوَ اما اسم مکانٍ کَالْمَبِیْتِ وَ ا [illegible] یف او مصدر میمی کَالْمَغِیْبِ وَالْمَشِیْبِ۔ (روح) والمحیص قد یکون مصدرًا کالمغیب والمشیب۔ ومکانًا کالمبیت والمضیق ویقال حاص عنه وحاض بمعنی واحد (کبیر۔ کشاف)۔ اصله من حَیْصٍ بَیْصٍ ای شدۃ ومنه حاص عن الحق ای حاد عنه الی شدۃ ومکروہ واَمَّا الْحَوْصُ فهو الخیاطۃ فی الجلد یقال حَاصَ عَیْنَ الصَّقْرِ۔ یعنی محیص کا لفظ اصلاً حَیْصَ بَیْصَ سے نکلا ہے جس کے معنی سختی کے ہیں اسی سے حاص عن الحق ہے یعنی حق سے اعراض کرنا اور سختی کی طرف لوٹ جانا حوص اجوف واوی کے معنی ہیں کھال کو سینا۔ کہتے ہیں حاص عین الصقر : صقرہ کی آنکھ سی دی۔ (راغب)

سورہ نساء میں اس لفظ کی تحقیق چونکہ گذر چکی ہے اسلئے یہاں صرف چند عربی حوالوں پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

مُصْرِخٌ : مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ : میں تمہارا فریاد رس نہیں ہوں۔

مصرخ : اِصْرَاخٌ سے اسم فاعل ہے، فریاد رس۔ مدد کرنے والا۔ صَرْخٌ اور صَرْخَةٌ آواز، چیخ۔ فریاد کرنا۔ صُرَاخٌ چیخ، فریاد۔ صَرِيْخٌ اور صَارِخٌ مدد خواہ اور مدد کو پہنچنے والا۔ یہ اصل میں اضداد میں سے ہے۔ مُرغ کو بھی صارخ کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ إِذَا سَمِعَ صَوْتَ الصَّارِخِ۔ بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ صَارِخٌ مدد کے لئے پکارنے والا اور مُصْرِخٌ المغیث۔ مدد کرنے والا الاصرخ فلان کے معنی ہیں فلان نے مدد کے لئے پکارا۔ اور اَصْرَخْتُهٗ میں نے اسکی مدد کی۔ صَارِخٌ اور مُسْتَصْرِخٌ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ الصَّارِخُ والمستصرخ هو الذی يطلب النصرة والمعاونة والمصرخ هو المغيث۔ اور تَصَرَّخَ: کے معنی بتکلف چیخنے کے ہیں۔ اور صَرِيْخٌ پکارنے والے کی آواز کو بھی کہا جاتا ہے اور صَرِيْخٌ بمعنی صَارِخٌ بھی آتا ہے۔

وَالصَّرِيْخُ صَوْتُ الْمُسْتَصْرِخِ۔ وَالصَّرِيْخُ اَيْضًا الصارخ وهو المغيث والمستغيث وهو من الاضداد (قرطبی) واصله من الصُّرَاخِ وهو مَدُّ الصوتِ والهمزة للسلب كَاَنَّ المغيث يُزِيْلُ صُرَاخُ المستغيثِ (روح) والاصراخُ: الاغاثة (کشاف)

فَرْعٌ : فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (آیت ۲۴) اسکی شاخیں آسمان تک بلند ہیں۔ فَرْعٌ : درخت کی شاخ۔ جمع فُرُوْعٌ فَرْعُ القوم : قوم کا سردار۔ فرع المال : مال کا نفع۔

اُجْتُثَّتْ : اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ اُجْتُثَّتْ : کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے جُثہ کو پورا پورا اٹھا لیا جائے (معارف) وحقيقةُ الْاِجْتِثَاثِ اَخْذُ الْجُثَّةِ كُلِّهَا۔ (کبیر)

جَثَّهٗ (ن) جَثًّا۔ کے معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے ہیں۔ اور اِنْجَثَّ اسکا مطاوع آتا ہے جیساکہ جَسَّ کا مطاوع اِجْتَسَّ آتا ہے۔ اور اَلْمِجَثَّةُ ہر وہ آلہ جس سے درخت کو اکھاڑا یا کھودا جائے۔ اور جُثَّةُ الشئُ کسی چیز کا ابھرا ہوا حصہ (راغب)

اَلْبَوَارُ : دَارَ الْبَوَارِ : ہلاکت کا گھر۔ البوار اصل میں۔ بَارَ الشَّئُ۔ يَبُوْرُ بَوْرًا وَبَوَارًا۔ کے معنی کسی چیز کے بہت

زیادہ مندہ پڑجانے کے ہیں۔ اور چونکہ کسی چیز
کی کساد بازاری اس کے فساد کا باعث ہوتی
ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ۔ کَسَدَ حَتّٰی فَسَدَ۔
اس لئے بَوَارٌ بمعنی ہلاکت استعمال ہونے
لگا۔ اور تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ا ایسی تجارت
جو کبھی تباہ نہیں ہوگی وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ
يَبُوْرُ: ان کا مکر ہی برباد ہوگا۔ صیغہ
صفت بَائِرٌ آتا ہے۔ وَكَانُوْا قَوْمًا
بُوْرًا: لفظ بُوْرًا۔ بَائِرٌ کی جمع ہے۔
اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بُوْرٌ مصدر
ہے جو جمع اور واحد دونوں کی صفت
واقع ہوتا ہے (راغب)

وَالْبَوَارُ: الهلاك (قرطبی)

حدیث میں ہے: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ بَوَارِ
الْاَيِّمِ۔ بے خاوند والی عورت کے نہ پوچھے
جانے سے (کوئی اُسے نکاح کا خطبہ نہ کرے)
خدا کی پناہ مانگتے ہیں، یہ اصل میں بَارَتِ
السوق سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بازار
کا مندا پڑجانا۔ بَارَ الْعَمَلُ عمل کا باطل ہونا۔
اِبْتَارَ الرَّجُلُ تجربہ کرنا۔ آزمانا۔ بَوَّرَ الْاَرْضَ
زمین کو غیر مزروعہ چھوڑ دینا۔ اَبَارَهٗ (افعال)
ہلاک کرنا۔ تَبَوَّرَ (تفعّل) اپنی جان پہ
ہلاکت کے باعث نوحہ کرنا۔

تُحْصُوْ: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ
اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔

تُحْصُوْ: اِحْصَاء سے جمع مذکر ہے لائے
نہی کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا ہے۔
اَلْاِحْصَاءُ باب افعال ہے عدد کو حاصل
کرنے کے معنی میں آتا ہے اَحْصَيْتُ كَذَا
کے معنی ہیں، میں نے اس سے شمار کیا۔
اصل میں یہ لفظ حصًی بمعنی کنکری سے
ماخوذ ہے اور اس سے گننے کا معنی اسلئے
پیدا کیا گیا ہے کہ عرب لوگ گننے میں کنکریوں
پر اس طرح اعتماد کرتے تھے جس طرح ہم
انگلیوں پر کرتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔
وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا۔ اللہ تعالی
نے ہر چیز کو گن رکھا ہے۔ یہاں لفظ اَحْصٰی
میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اِحْصَاءٌ
سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر ہو۔ دوسرا
یہ کہ اَحْصٰی افعل التفضیل ہو یعنی اس نے
ہر چیز کو خوب گن رکھا ہے۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ اِحْصَاءٌ
کے معنی اصل میں کنکریاں گننے کے ہیں،
عرب لوگوں کی عادت یہ تھی کہ جب ایک عدد
معین کو شمار کر لیتے تو ایک کنکری کو اٹھا کر
الگ رکھ دیتے اور اسی طرح دوسری کو۔

پھر اسی سے اِحْصَاء خود شمار کرنے کے معنی میں بولے جانے لگا۔

وَاَصْلُ الْاِحْصَاءِ : اَنَّ الْحَاسِبَ اِذَا بَلَغَ عَقْدًا مُعَيَّنًا مِنْ عُقُودِ الْاَعْدَادِ وَضَعَ حَصَاةً يَحْفَظُهٗ بِهَا (فتح)

وَقَالَ صاحب الروح : واصل الْاِحْصَاءِ الْعَدُّ بالحصى فان العربَ كانوا يعتمدونه فى العَدِّ كاعتمادنا فيه على الاصابع ثم استعمل لمطلق العَدِّ۔ (روح)

الْفُلْكُ : کشتی، جہاز۔ یہ لفظ جمع۔ واحد۔ مذکر۔ مؤنث سب میں ایک ہی طرح استعمال ہوتا ہے۔ اگر جمع ہو گا تو اسکا واحد فَلَكٌ ہو گا جیسے اُسْدٌ حرف سین کے جزم سے۔ اور فَلَكٌ : گھیرا۔ دائرہ۔ جمع فُلُكٌ واَفْلَاكٌ آتی ہے لفظ کی اصل اس پانی کے لئے ہے جس پر ہوا لگنے سے گول گول دائرے بن جاتے ہیں۔

فَلَكٌ : ستاروں کے مدار، مجریٰ جسمیں وہ حرکت کرتے ہیں۔ كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۔ (یٰس ۴) سب اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔

فَلَكَ ثَدْىُ الْجَارِيَةِ : لڑکی کا سینہ گول ہونا۔ صفت فَالِكٌ جمع فَوَالِكُ۔ اور فَلْكَةُ الْمِغْزَلِ : چرخے کا دمکڑا۔ فَلَكٌ : کسی چیز کا بڑا اور گول حصہ۔

سَفِيْنَةٌ : کشتی اور جہاز کے معنی میں دوسرا لفظ قرآن کریم نے سَفِيْنَة کا استعمال کیا ہے۔ سَفْنٌ کے معنی کسی چیز کی پوست اکھاڑنے اور کسی شئی کو اوپر سے چھیلنے کے ہوتے ہیں۔ یہ فَعِيْلَةٌ بمعنی فَاعِلَةٌ ہے۔ کشتی چونکہ سطح آب کو چیرتی ہوئی ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلی جاتی ہے اس لئے اسکو سفینہ کہا گیا۔ اسی مفہوم کے پیش نظر کشتی کو مَوَاخِر بھی کہا گیا ہے۔ یعنی پانی کو چیرنے والیاں۔ سورہ نحل میں گذر چکا ہے۔

وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ : (النحل)

زَرْعٍ : بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ۔

بے زراعت میدان میں۔ (ماجدی)

زَرْعٌ اصل میں زَرَعَ يَزْرَعُ کا مصدر ہے جس کے معنی کھیتی کرنے کے آتے ہیں اور یہ اسم مفعول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد کھیتی ہوتی ہے۔ یعنی زَرْعٌ بمعنی مَزْرُوْعٌ استعمال ہوتا ہے۔

صاحب مفردات القرآن فرماتے ہیں کہ، زَرْعٌ کے اصل معنی اگانے کے ہیں۔ اور یہ کھیتی اگانا دراصل قدرت کا کام ہے۔ انسان کے کسب و ہنر کو اسمیں کوئی دخل نہیں ہے، اسی بنا پر ایک آیت کریمہ میں ارشاد ہے، اَفَرَءَیْتُمْ مَا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ۔ کیا جو تم بوتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔ اسمیں بونے کی نسبت انسان کی طرف کی ہے مگر اگانے کی نسبت انسان سے نفی کر کے اسے اپنی ذات مبارک کی طرف منسوب کیا ہے۔ چونکہ انسان کھیتی کے اگنے کے اسباب مہیا کرتا ہے اسلئے کبھی مجازاً زَرْعٌ کی نسبت انسان کی طرف بھی کردی جاتی ہے۔

صفت فاعلی کا صیغہ زَارِعٌ ہے اسکی جمع زُرَّاعٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ لِيُعْجِبَ الزُّرَّاعَ۔

غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ : شہر مکہ جو ملک عرب کے صوبہ حجاز میں بحر احمر سے ۴۸ میل پر سمت مشرق میں واقع ہے، اپنی زمین کی خشکی کے لئے مشہور ہے اور زمین کے کہیں پتھریلی اور کہیں ریتلی ہونے کے باعث حضرت ابراھیم علیہ السّلام ہی کے زمانہ سے نہیں بلکہ اس سے پہلے سے لیکر اب تک ناقابل کاشت ہے۔

اَفْئِدَةٌ : فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ۔

اَفْئِدَةٌ : یہ اَلْفُؤَادُ کی جمع ہے بمعنی قلب مگر قلب کو فواد، کہنا تَفَؤُّدٌ کے معنی کے اعتبار سے ہے فَأَدْتُ اللَّحْمَ۔ کے معنی ہیں آگ پر گوشت بھونا اور لَحْمٌ فَئِيْدٌ: آگ پر بھنا ہوا گوشت۔

اس آیت کریمہ میں لفظ اَفْئِدَہ کو نکرہ اور اس کے ساتھ حرف مِنْ لایا گیا ہے جو تبعیض اور تقلیل کے لئے آتا ہے، اسلئے معنی یہ ہوئے کہ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دیجیئے۔ امام تفسیر حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اگر اَفْئِدَةَ النَّاسِ کہا جاتا ہے تو اس دنیا میں بسنے والے تمام انسان بیت اللہ پر ٹوٹ پڑتے۔ اور مسلم و غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہ ہوتا اور یہ لوگوں کے لئے باعث زحمت اور فساد ہوتا اسلئے جناب ابراھیم نے اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ فرمایا۔ قلب چونکہ علوم و عرفان کا مرکز ہوتا ہے اور معرفت حقہ سے اس کے اندر چمک اور تَنَوُّر پیدا ہوتا ہے اسلئے اسکو قلب کہا جاتا ہے۔

قال الراغب : الفؤاد، کالقلب لکن يُقال له فُؤادا اذا اُعْتُبِرَ فيه معنى التَّفَؤُّدِ اى التَّوَقُّدِ، رَجُلٌ مَفْئُوْدٌ : دل کا مریض آدمی۔

فَعَلَ: فَعَلَ يَفْعَلُ فَعْلًا: کرنا۔ بنانا، انجام دینا۔ کسی کام کو بجالانا۔ الفِعل کے معنی کسی اثر اندازی کی طرف سے اثر اندازی کے ہیں، عام اس کے وہ تاثیر عمدگی کے ساتھ ہو یا بغیر عمدگی کے۔ علم سے ہو یا بغیر علم کے۔ قصداً ہو یا بلاقصد کے۔ پھر وہ تاثیر حیوان کی طرف سے ہو یا جمادات کیطرف سے (راغب)

فَعْلٌ: بفتح الفاء مصدر ہے اور فِعل بکسر الفاء اسم ہے بمعنی کام۔ اور مصدر بھی فاء کے کسرہ سے آتا ہے۔ اگرچہ کم۔ فِعْلٌ کی جمع فِعَالٌ اور اَفْعَال۔ اور جمع الجمع اَفَاعِيل آتی ہے۔

اَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا۔ کیا یہ تونے کیا ہے۔

فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ: ان کے بڑے نے کیا ہے۔

فَاعِلٌ کام کرنے والا۔ مَفْعُوْلٌ کیا ہوا۔

فَعَّالٌ: صیغہ مبالغہ۔ خوب کرنے والا۔

تَهْوِيْ: تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ۔

اَلْهَوٰى، (س) هَوِيَ يَهْوٰى هَوًى، اس کے معنی خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ اور جو خواہشات نفسانی میں مبتلا ہو اسکو بھی هَوًى کہدیتے ہیں، کیونکہ خواہشات نفسانی انسان کو اس کے قدر و منزلت سے گراکر مصائب میں مبتلا کردیتی ہیں۔

اور هَوٰى يَهْوِيْ هُوِيًّا وَهَوِيًّا وَ هَوَيَانًا: کے معنی اوپر سے نیچے کی طرف گرنے کے ہیں۔ هَوَى الشَّيْءُ: سَقَطَ مِنْ عُلْوٍ اِلَى اَسْفَلَ (منجد) (راغب)۔ اور لفظ هَوًى، خواہشات نفسانی اور عشق و محبت پر بولا جاتا ہے اسکی جمع اَهْوَاءٌ آتی ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ نادانوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اَلثَّمَرَاتِ: ثَمَرَاتٍ: یہ ثَمَرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پھل۔ اور عادۃً ان پھلوں کو کہا جاتا ہے جو کھائے جاتے ہیں اس اعتبار سے دعاء کا حاصل یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو کھانے کے لئے ہر طرح کے پھل عطا فرمائیے۔ اور کبھی لفظ ثمرہ، نتیجہ اور پیداوار کے معنی میں بھی آتا ہے جو کھانے کی چیزوں سے زیادہ عام ہے ہر نفع آور چیز کے نتیجہ اور حاصل کو اسکا ثمرہ کہا جاسکتا ہے، مشینوں اور صنعتی کارخانوں کے ثمرات ان کی مصنوعات کہلائینگی، ملازمت اور مزدوری کا ثمرہ وہ اجرت اور تنخواہ کہلائیگی جو اس کے نتیجہ میں حاصل ہوتی، قرآن کریم کی ایک آیت میں اس دعاء میں ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ، کا لفظ بھی آیا ہے۔ اسمیں لفظ شجر کے

بجائے لفظ شئی لایا گیا ہے جس سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے ان لوگوں کے لئے صرف کھانے کے پھلوں ہی کی دعا نہیں کی بلکہ ہر چیز کے ثمرات اور حاصل شدہ نتائج کی دعا مانگی ہے جسمیں دنیا بھر کی مصنوعات اور ہر چیز کی قابل انتفاع چیزیں داخل ہیں۔ (معارف)

تَشْخَصُ : تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ:

اسمیں نگاہیں پھٹی رہ جائینگی۔ یعنی کافروں کی نگاہیں فرط حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جائینگی۔

شَخَصَ بَصَرُہٗ: اسکی آنکھ پتھرا گئی۔

اَلشَّخْصُ کھڑے انسان کا وجود جو دور سے نظر آئے اسے شَخْصٌ کہا جاتا ہے۔ شَخَصَ سَہْمُہٗ اسکا تیر نشانے سے اونچا نکل گیا۔ اور اَشْخَصَ (افعال) اونچا نکال دیا۔ اصل میں شَخَصَ شُخُوْصًا کے معنی ارتفاع کے ہیں لیکن جب یہ آنکھوں کے لئے آئے تو اس کے معنی آنکھوں کے ٹنگی ہوئی یا پھٹی ہوئی رہ جانے کے ہیں۔

یُقَالُ شَخَصَ الرَّجُلُ بَصَرَہٗ وَشَخَصَ الْبَصَرُ نَفْسُہٗ ای سَمَا وَطَمَحَ من ھَوْلِ مَا یَرٰی (قرطبی)

لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ المراد ان الا بصار تبقیٰ مفتوحۃً لا تتحرک من شدۃ الحیرۃ والدھشۃ۔ (فتح)

مُھْطِعِیْنَ : مُھْطِعِیْنَ:

اِھْطَاعٌ: کسی چیز کی طرف تیزی سے بڑھنے اور لپکنے کے معنی میں آتا ہے بالخصوص جبکہ یہ بڑھنا اور لپکنا خوف و دھشت کی بنا پر ہو۔ ھَطَعَ الرَّجُلُ بِبَصَرِہٖ۔ کے معنی ہیں اس نے نظر جما کر دیکھا۔ بَعِیْرٌ مُھْطِعٌ وہ اونٹ جو گردن اٹھا کر چلے۔ مُھْطِعِیْنَ اِلَی الدَّاعِ اس بلانے والے کی طرف دوڑتے جاتے ہوں گے (راغب)

مُھْطِعِیْنَ: باب افعال، اَھْطَعَ یُھْطِعُ اِھْطَاعًا۔ سے اسم فاعل جمع ہے اسکی واحد مُھْطِعٌ ہے۔ سر جھکائے تیزی سے دوڑنے والے۔ ھَطِیْعٌ، کشادہ راستہ۔ مُھْطِعٌ وہ جو عاجزی اور ذلت کی وجہ سے نظر نہ اٹھائے۔ بلانے والے کی طرف خاموشی سے چلے جانے والا۔ فتح سے اس کا مصدر ھَطْعٌ اور ھُطُوْعٌ آتا ہے دوڑتا ہوا آنا۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھنا، کسی چیز پر نظر جمائے رکھنا۔ (لغات القرآن)

وقال النحاس: والمعروف فی اللغۃ ان

یقال: اھطع الرجل اذا اسرع (قرطبی)
وفی الکشاف: مُھْطِعِیْنَ، مُسْرِعِیْنَ اِلیٰ الداعی، وقیل: الاھطاع ان تقبل ببصرك علی المرئی تدیم النظر الیه لا تطرف (کشاف)

مُقْنِعِیْ: اِقْنَاعٌ سے جمع مذکر کا صیغہ ہے اصل میں مُقْنِعِیْنَ ہے نونِ اعرابی اضافت کی بنا پر گر گیا ہے۔ اِقْنَاعٌ۔ سر اٹھانے یا آواز بلند کرنے کے معنی میں آتا ہے یہاں سر اٹھا کر چلنے کے معنی میں آیا ہے۔ مُقْنِعِیْ رُؤُسِهِمْ: یعنی فرطِ حیرت کی وجہ سے کسی اور طرف نہ نظر جائے گی نہ خیال۔ ایک طرف کو سر اٹھا کے دوڑتے جائیں گے۔

قَنَعَ، قُنُوعًا۔ (ف) عاجزی دکھانا اور مانگنا۔
اَقْنَعَ رَأْسَهٗ اَوْ صَوْتَهٗ۔ سر یا آواز بلند کرنا۔
اَقْنَعَ بِیَدَیْهِ فِی الصَّلٰوةِ: نماز میں ہاتھوں کو لمبا کر کے خدا سے رحم کی طلب کرنا۔ اَقْنَعَ الْاِنَاءَ: برتن کو جھکانا تاکہ اسمیں سے کوئی چیز نکلے۔
اَقْنَعَ الْاِنَاءَ فِی النَّهْرِ: برتن کو پانی کے بہاؤ کی طرف کرنا تاکہ بھر جائے۔

واقناع الرأس رفعه۔ المقنع الذی یرفعه رأسه ویقبل ببصره علی ما بین یدیه۔ (قرطبی) والاقناع رفع الرأس والنظر فی ذل وخشوع (کبیر)

طَرْفٌ: لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ وَ اَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ:

اَلطَّرَفُ: کے معنی کسی چیز کا کنارہ اور سرا کے ہیں اور اجسام اوقات دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اَطْرَافَ النَّهَارِ: دن کے کنارے۔ اور طَرَفَیِ النَّهَارِ: دن کے دونوں سرے اور کنارے سے مراد صبح وشام ہے۔ طَرْفُ الْعَیْنِ: آنکھ پلک۔ اور اَلطَّرْفُ: کا اصل معنی پلک جھپکنے کے ہیں، اور پلک جھپکنے کو دیکھنا لازم ہے اسلئے طرف بمعنی دیکھنا بھی آجاتا ہے (راغب)

قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ: شرم وحیاء کی وجہ سے نگاہیں جھکا رکھنے والی۔ یہ حورانِ جنت کی صفت ہے کہ غایت عفت کے سبب انکی نگاہیں اوپر کو نہیں اٹھتی۔ طرف کی جمع اَطْرَافٌ آتی ہے۔ خود آنکھ کو بھی طرف کہا جاتا ہے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں: طرف الرجل یَطْرِفُ (من) طَرْفًا۔ اِذَا اَطْبَقَ جَفْنَهٗ عَلَی الْاٰخَرِ، فَسُمِّیَ النظرُ طَرْفًا لِاَنَّهٗ بِهٖ یَکُوْنُ، والطرف، العین، قال عَنْتَرَةُ:

وَاَغُضُّ بَصَرِیْ مَا بَدَتْ لِیْ جَارَتِیْ
حَتّٰی یُوَارِیْ جَارَتِیْ مَاْوَاهَا
(قرطبی)

هَوَاءٌ: اصل میں هَوَاءٌ: اس فضاء اور

خلاء کو کہتے ہیں جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ لیکن محاورہ میں یہ قلب کی صفت واقع ہوتا ہے اور جو دل ڈرپوک ہو جرأتمند نہو اسکو قَلْبٌ هَوَاءٌ کہتے ہیں۔ و الهَوَاءُ فِي اللُّغَةِ: المجوّفُ الخَالِي۔ ومنه قول حسان۔ ؎

اَلَا اَبْلِغْ اَبَا سُفْيَانَ عَنِّي
فَاَنْتَ مُجَوَّفٌ نَخِبٌ هَوَاءٌ

(قرطبی)

والهواء: الخلاء الذی لم تشغله الاجرام فوصف به فقیل: قلب فُلَانٍ هَوَاءٌ اِذَا كَانَ جبانًا لا قوة فی قلبه ولا جراْة۔ و قیل: جُوف لاعُقُولَ لهم (مدارک)

اَلْقَهَّارِ: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔

قہر، کا لفظ عربی ہیں۔ اختیار، قابو، حکومت اور تسلط کے معنوں میں آتا ہے، اسی سے اَلْقَهَّارُ مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسماء حسنی میں سے جس کے معنی ہیں تمام جہان اور اسکے تمام بندے ہر آن اسکی مٹھی میں اور اسکے قابو میں ہیں وہ ان کو قابو میں رکھنے کے لئے نہ کسی مدد کا محتاج ہے اور نہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ جب وہ ان کو پکڑنا چاہے یا اکھٹا کرنا چاہے تو کوئی اسکی گرفت سے باہر نکل سکے۔

لفظ قہر میں دو معنی ایک ساتھ ملحوظ ہوتے ہیں غلبہ۔ اور تذلیل۔ اور دونوں معنوں کے لئے الگ الگ بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے کہ: هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ۔ اور آیت کریمہ اِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ۔ میں صرف غلبہ مراد ہے اور فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ، میں تذلیل مراد ہے۔ کہ یتیم کو ڈانٹ ڈپٹ کرکے ذلیل نہ کیا جائے۔ اَقْهَرَةٌ: کسی پر ایسے شخص کو مسلط کرنا جو اسکو ذلیل کرے۔ (راغب)

اَلْقَهَّارُ: تنہا سب پر غالب اور کنٹرول رکھنے والا، دوسروں کی مدد و اعانت سے بالکل مستغنی لفظ قَهَّار: کی مختلف تعبیریں اہل تفسیر نے کی ہیں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ الذی قهر كُلَّ شَيْءٍ وَغَلَبَهٗ وَدَانَتْ لَهُ الرقاب وَخَضَعَتْ لَهُ الالباب۔ صاحب معالم فرماتے ہیں: اَلَّذِيْ يفعل مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ القَهَّارُ: اَلْغَالِبُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ۔

مُقَرَّنِيْنَ: مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ۔

زنجیروں میں کس کر باندھے ہوئے، جکڑے ہوئے مُقَرَّنِيْنَ: اسم فاعل جمع مذکر منصوب۔ مُقَرَّنٌ واحد، تَقْرِيْنٌ، مصدر باب تفعیل۔ جکڑے ہوئے۔ کس کر باندھے ہوئے۔ مادہ۔ قَرْنٌ۔ مُقَرَّنِيْنَ ای مشدودین۔ (قرطبی)

اَلْاَصْفَادُ : الاصفاد : زنجیریں۔ بیڑیاں
اَغْلَالٌ اور قُیُوْدٌ۔ صَفْدٌ۔ صَفَدٌ اور
صِفَادٌ : کی جمع ہے جس کے معنی ہیں زنجیریں اور
بیڑیاں۔ وہ سنگل جس سے قیدیوں کو باندھا
جاتا ہے۔ عطیہ پر بھی لفظ صَفَدٌ بولا جاتا ہے
کیونکہ آدمی اپنے مُعطی کا عطیہ لینے کی وجہ ممنون
و شکور ہوتا ہے گویا مُحسن اور مُعطی کے عطیہ میں
بہ قید ہو گیا ہے۔ محاورہ ہے۔ اَنَا مَغْلُوْلُ
اَیَادِیْكَ وَاَسِیْرُ نِعْمَتِكَ : میں تیرے
احسانات اور نعمتوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں
اور تیرے انعام کا قیدی بن چکا ہوں۔

جب مبالغہ مقصود ہو تو باب تفعیل میں لے جا کر
صَفَّدْتُهٗ تَصْفِیْدًا : کہتے ہیں جس کے معنی ہیں میں نے
اسکو خوب مضبوط باندھا۔ باب افعال سے اس کے
معنی عطیہ دینے کے آتے ہیں۔ اَصْفَدْتُهٗ اِصْفَادًا
اَعْطَیْتُهٗ۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اِصْفَاد
اور صَفَدٌ یعنی مجرد اور افعال دونوں سے
دونوں طرح کے معنی آتے ہیں۔ عطیہ دینے کے
بھی اور قید کرنے بھی۔

اَلْاَصْفَادُ : ھی الاغلال والقیود، واحدھا
صَفْدٌ، وصَفَدٌ، ویُقال صَفَدْتُهٗ صَفْدًا
ای قیّدتُهٗ، والاسم الصَّفَدُ۔ (قرطبی)
وَالصَّفَدُ : العطیہ اعتبارًا بما قیل۔
انا مغلول ایادیك واسیر نعمتك (راغب)

سَرَابِیْلُ : سَرَابِیْلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ :
سرابیل۔ سِربال کی جمع ہے جس کے معنی
قمیص کے بھی آتے ہیں اور لباس کے مفہوم میں بھی
یہ آتا ہے یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ سرابیل
عام لباس کے معنی میں ہے۔ زرہ کو بھی سرابیل
کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ سَرَابِیْلَ
تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ
بَاْسَکُمْ :

واحدھا سربال۔ والفعل تَسَرْبَلْتُ
وَسَرْبَلْتُ غیری (قرطبی۔ راغب)

قَطِرَانٍ : قِطْرَانٍ : اہل لغت نے
کے کئی معنی یہاں بیان کئے ہیں۔ اس کے
معروف معنی تارکول کے ہیں۔ علامہ راغب
فرماتے ہیں۔ القطران : ما یتقطر من
الھناء۔ یہاں یہی معنی انسب معلوم ہوتے ہیں۔
قطران، تیل کی طرح ایک سیال مادہ ہوتا ہے
جو ابھل اور صنوبر وغیرہ کے درخت سے نکلتا ہے
اور خارشی اونٹ کو لگایا جاتا ہے۔ قَطَرَ الْاِبِلَ
اونٹ کو قطران ملنا۔ اسی سیال مادہ کو
بعض اہل لغت کے نزدیک قطران کہا جاتا ہے۔
اسکی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مادہ آگ کو بڑی سرعت
سے پکڑتا ہے اور اس پر آگ بہت تیز بھڑکتی ہے

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ مِنْ قِطْرَانٍ: یعنی قطران
الابل الذی تُهْنَأُ بہ ۔ قالہ الحسن و
ذالک ابلغ لاشتعال النار فیھم ۔
بعض اہل تفسیر نے قطران کے معنی پگھلے ہوئے تانبے
کے لکھے ہیں۔

اسمیں ایک قرأت مِنْ قِطْرٍ-آنٍ ۔ ہے یعنی
قطر اور آنٍ ۔ یہ دونوں الگ الگ جملے ہیں جو
آپس میں موصوف صفت کا تعلق رکھتے ہیں۔ آن۔ کے
معنی شدید ترین گرم کے ہیں۔ والآن: الذی
قد انتھی الی حرہ (قرطبی) اسی سے ہے
وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ۔ صاحب روح المعانی
فرماتے ہیں کہ: ھو ما یحلب من شجر
الابھل فیطبخ و تھنأ بہ الابل الجربی۔
علامہ عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ: قطران،
کے مشہور معنی تو گندک کے ہیں۔ دوسرے معنی
پگھلے ہوئے تانبے کے لئے گئے ہیں بہر حال مجرموں
کے جسم پر لباس ایسا ہوگا جو آگ کو خوب اور زیادہ
تیزی کے ساتھ قبول کرلے۔

الْأَلْبَابِ: اُولُوا الْاَلْبَابِ: اَللُّبُّ: کے معنی
عقلِ خالص کے ہیں جو آمیزش یعنی ظن و وہم اور جذبات
سے پاک ہو۔ اور عقل کو لُبّ۔ اس لئے کہتے ہیں کہ
وہ انسان کے معنوی قوی کا خلاصہ ہوتی ہے جیسا کہ
کسی چیز کے خالص حصہ کو اس کا لُبّ اور لُباب
کہدیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ لُبّ کے معنی پاکیزہ
اور ستھری عقل کے ہیں چنانچہ ہر لُبّ کو عقل کہہ سکتے
ہیں لیکن ہر عقل کو لب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ہی وجہ
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام احکام کو جن کا ادراک
عقول زکیہ ہی کرسکتی ہیں اولوالالباب کے ساتھ مختص
کیا ہے۔ (راغب)
والظاھر ان المراد باولی الالباب۔ اصحابُ
العقول الخالصۃ من شوائب الوھم مطلقا (روح)
اولوالالباب: اصحاب العقول (قرطبی)
الحمد للہ سورہ ابراھیم آج بروز جمعرات مورخہ [illegible]
کو پوری ہوئی۔
عبدالرشید خطیب جامع مسجد پی۔ اے۔ ایف
ڈرگ روڈ کراچی

شرح الفاظ القرآن من سورۃ الحجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رُبَمَا : رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ : علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ رب : حرف فی معناہ ثمانیۃ اقوال : رب حرف ہے اسمیں آٹھ اقوال ہیں ۱؎ وہ دائمی طور پر تقلیل کے لئے آتا ہے (وعلیہ الاکثرون) ۲؎ وہ دائمی طور پر تکثیر کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ۔ بہت وقت۔ بارہا بار۔ یہ آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کہ کسی طرح مسلمان ہوتے۔ لیکن اول قول کے قائلین یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ قیامت اور عذاب آخرت کی مدہوشیوں میں اس طرح غرق ہوں گے کہ انہیں ہوش ہی بہت کم آئے گا۔ اور جب ہوش آئیگی تو تمنا کریں گے۔ ۳؎ وہ تقلیل و تکثیر دونوں کے لئے مساوی طور پر مستعمل ہے۔ ۴؎ وہ اکثر تقلیل کے لئے آتا ہے اور نادراً تکثیر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۵؎ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کہ اکثر تکثیر کے لئے آتا ہے اور نادراً تقلیل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ۶؎ ان دونوں معنوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی اسکی وضع عمل میں نہیں آئی بلکہ یہ حرف ثبات ہے جو نہ تقلیل پر دلالت کرتا ہے نہ تکثیر پر۔ اور جو کچھ سمجھا جاتا ہے وہ خارجی طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ۷؎ فخر و مباحات کے موقع پر تکثیر کے لئے اور دیگر مواقع میں تقلیل کے لئے۔ ۸؎ مبہم عدد کے لئے خواہ تقلیل ہو یا تکثیر۔

(الاتقان ص ۱۶۳ ج ۱)

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اسمیں اصل یہ ہے کہ تقلیل کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی تکثیر کے لئے بھی آجاتا ہے۔ وَاَصْلُهَا اَنْ تُسْتَعْمَلَ فی القلیل وقد تستعمل فی الکثیر۔ (قرطبی)

حرف۔ رُبَّ۔ براہِ راست فعل پر داخل نہیں ہوتا جب اسکو فعل پر داخل کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس پر حرف۔ ماکافہ۔ داخل کیا جاتا ہے جیسے رُبَمَا قَامَ زَيْدٌ۔ و۔ رُبَمَا يَقُومُ زَيْدٌ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما موصوفہ ہو اور حرف رُبَمَا کے بعد کا

جملہ اسکی صفت ہو جیسا کہ رُبَمَا یَوَدُّ میں یہ احتمال ہے کہ مَا نکرہ موصوفہ بمعنی شئی ہو اور فعل یَوَدُّ اسکی صفت ہو تقدیر کلام یہ ہوگی کہ رُبَّ شَیْئٍ یَوَدُّہُ الکَافِرُ۔ رُبَّ حرف جر ہے مَاء کافہ اسکو عمل جر سے روک دیتا ہے۔ اور اسمیں فعل پر داخل ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ رب: لا تدخل علی الفعل، فاذ الحقتھا ما۔ ھیّأتھا للدخول علی الفعل۔

اس صورت میں اکثر اس کا دخول ایسے جملہ فعلیہ پر ہوتا ہے جس کا فعل ماضی ہو خواہ لفظاً موجود ہو یا معناً۔ اور آیت سابقہ میں وہ مستقبل پر داخل ہوا ہے۔ یہ اس بنیاد پر ہے گویا کہ صور پھونکا جا چکا اور قیامت آ گئی۔ یعنی مستقبل یہاں معناً ماضی ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ رُبَّ تقلیل کے لئے موضوع ہے اور زجاج کہتے ہیں کہ جو یہ کہتا ہے کہ حرف رُبَّ سے کثرت مراد ہوتی ہے تو یہ قول اہل لغت کے خلاف ہے۔ اتفقوا علی اَنَّ رُبَّ موضوعۃ للتقلیل۔ قال الزجاج: ومن قال ان رُبَّ بنی بھا الکثرہ، فھو ضد ما یعرفہ اھل اللغۃ (کبیر)[ف]

یُلْهِهِمْ: وَیُلْهِهِمُ الْاَمَلُ: اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں۔ مدت عمر کو دور از کار کی خیالی آرزوؤں اور منصوبوں میں گذارتے رہنا یہ سب خصوصیات آخرت سے غافل اور خدا فراموش قوموں کی ہیں۔

اَلْهَا یُلْهِیْ اِلْهَاءً: اَلْهَاہُ اللَّعِبُ عَنْ کذا: غافل کرنا۔ لَهِیَ بِکَذَا یَلْهٰی لَهًا: محبت کرنا۔ لَهِیَ عَنْہُ: کسی سے غافل ہونا۔ کسی کا ذکر چھوڑ دینا۔ لَهَا یَلْهُوْ لَهْوًا۔ لَهَا الرَّجُلُ: کھیلنا۔ لَهَا بِہٖ: شوقین ہونا الهاہ عن کذا: ای شغلہ۔ ولهی ھو عن الشئ یَلْهٰی۔ (قرطبی)

اَلْاَمَلُ: اَلْاَمَلُ: امید آرزو: جمع آمال طُوْلُ الْاَمَلِ یُنْسِیُ الْاٰخِرَۃَ۔ آرزو کی درازی انسان کو آخرت فراموش بنا دیتی ہے۔ ھٰذَا اَمَلُہٗ۔ یہ اسکی آرزو ہے۔ اَمَل کی حقیقت دنیا کی حرص اور اسکی آرزو محبت ہے اور آخرت سے اعراض و غفلت ہے۔ وحقیقۃ الامل: الحرص علی الدنیا والانکباب علیھا، والحب لھا والاعراض عن الاخرۃ۔ (قرطبی)

اَمَلَہٗ (ن) اَمَلًا۔ وَاَمَّلَہٗ تَامِیْلًا: امید کرنا۔ تَاَمَّلَ الْاَمْرَ وَفِیْہِ: کسی کام میں دیر تک سوچ بچار کرنا۔

ف لفظ رُبَّ کی پوری تحقیق روح المعانی میں ملاحظہ فرمائیں۔

لَوْمَا: لَوْمَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰئِكَةِ۔

لَوْمَا۔ شرطیہ ہے۔ حرفِ تحضیض ہے حرفِ توبیخ ہے وغیرہ۔

لَوْمَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰئِكَةِ: کیوں نہیں لے آتا ہم پر فرشتوں کو۔ مالقی کا خیال ہے کہ لوما حرف تحضیض کے لئے آتا ہے، لیکن مندرجہ ذیل شعر میں لوما کو امتناعیہ استعمال کیا گیا ہے۔

لَوْمَا الْاِصَاخَةُ لِلْوُشَاةِ لَكَانَ لِي
مِنْ بَعْدِ سُخْطِكَ فِي رِضَاكَ رِجَاءُ

اگر چغل خوروں کی شنوائی نہ ہوتی تو آپ کی ناراضی کے بعد رضامند ہونے کی امید ہوتی۔

لَوْمَا اور لَوْلَا۔ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں تحضیض کے لئے آتے ہیں، اسی طرح حرف هَلَّا بھی تحضیض کے لئے آتا ہے۔ فراء کا قول ہے کہ لَوْمَا میں میم، لام کا بدل ہے۔ کسائی کا قول ہے کہ لَوْمَا اور لَوْلَا دونوں برابر ہیں ان کا استعمال خبر اور استفہام میں ہوتا ہے۔ نحاس کے نزدیک لَوْمَا۔ لَوْلَا۔ هَلَّا تینوں ایک ہی معنی دیتے ہیں۔ (قرطبی)

صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ حرف لَوْ کو حرف مَا اور لَا، نافیہ کے ساتھ دو معنوں کے لئے مرکب کیا جاتا ہے ایک معنی، امتناع الشیٔ لوجود غیرہ۔ اور دوسرے معنی التحضیض، اور حرف هل حرف لَا، کے ساتھ مرکب ہوتا ہے، ما، اس کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔ ابن مقبل کا ایک شعر ہے۔

لوما الحیاءُ و لوما الدینُ عِبْتُکُمَا
ببعض ما فیکما اِذْ عِبْتُمَا عَوَرِی

اگر حیاء اور دین نہ ہوتے تو میں تم پر بعض ان عیوب کی وجہ سے جو تم میں ہیں عیب لگاتا چونکہ تم نے مجھ پر اعور ہونے کا الزام لگایا ہے۔ مجھ میں چونکہ حیاء ہے اسلئے عیب نہیں لگاتا۔

امام فخر الدین رازیؒ نے زجاج اور فراء کا قول یہ نقل کیا ہے کہ لولا اور لوما دونوں لغات ہیں جو هَلَّا کے معنی دیتے ہیں خبر اور استفہام دونوں میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔ خبر میں جیسا کہ لولا انت لفعلت کذا۔ قرآن پاک کی آیت ہے۔ لَوْلَا اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ، اور استفہام میں جیسا کہ لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ، اور آیت زیر بحث لَوْمَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰئِكَةِ۔

لَوْمَا۔ یہاں ابھارنے، اکسانے یا مطالبہ کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی کیوں نہیں ایسا کرتے۔

لو، رُكِّبَتْ مع، لا، و، ما، لمعنيين: معنى امتناع الشيء لوجود غيره، ومعنى التحضيض۔ (کشاف)

شِيَعٌ: فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ: اگلوں کے گروہوں میں (ماجدی) الشِّيَعُ جمع شیعہ کی ہے جس کے معنی کسی شخص کے پیروکار و مددگار کے بھی آتے ہیں اور

ایسے فرقہ کو بھی شِیْعَۃٌ کہا جاتا ہے جو خاص عقائد و
نظریات پر اتفاق رکھتے ہوں۔ (معارف)
والشِّیْعَۃُ: الفرقۃ۔ والطائفۃ من
الناس المتالفۃ المتفقۃ الکلمۃ۔ واصلہ
ماخوذ من الشِّیَاعِ وھو الحطب الصغار
یوقد بہ الکبار۔ والشیعۃ جمع شیعۃ
وھی الامۃ۔ (قرطبی)
کلبی کہتے ہیں کہ شِیَعٌ سے مراد یہاں فِرَقٌ
ہیں یعنی بستیاں۔ (قرطبی)

نَسْلُکُہٗ: کَذٰلِکَ نَسْلُکُہٗ فِیْ قُلُوْبِ
الْمُجْرِمِیْنَ۔ اسی طرح ہم اس (استہزاء) کو
مجرموں کے دلوں میں داخل کر دیتے ہیں۔
سَلَکَ یَسْلُکُ سَلْکًا وَسُلُوْکًا۔ اس کے اصل
معنی راستہ پر چلنے کے ہیں جیسے سَلَکْتُ الطَّرِیْقَ،
راستہ کو پکڑے ہوئے چلتے ہوئے جانا۔ یہ فعل
باب نَصَرَ سے لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال
ہوتا ہے۔ اور قرآن پاک میں بھی اسکا استعمال
لازم اور متعدی دونوں طرح ہوا ہے۔ لازم کی
مثال جیسے لِتَسْلُکُوْا مِنْھَا سُبُلًا فِجَاجًا۔ تاکہ
اس کے بڑے بڑے کشادہ راستوں پر چلو پھرو۔
اور فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا اور اپنے
رب کے صاف راستوں پر چلی جا۔ اور متعدی
کی مثال، جیسے مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ، کونسی چیز
نے تمہیں دوزخ میں داخل کیا۔

سَلَکَ وَاَسْلَکَ الشَّیْئَ فِی الشَّیْئِ: ایک چیز کو
دوسری چیز میں داخل کرنا۔
اِنْسَلَکَ فِی الشَّیْئِ: داخل ہونا مِسْلَکٌ۔ لڑی۔
مَسْلَکٌ راستہ۔ اسکی جمع مَسَالِکُ آتی ہے۔
سِلْکٌ (بکسر السین) دھاگہ۔
امام قرطبی لکھتے ہیں کہ سَلْکٌ (بالفتح) کے معنی
ہیں ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا جیسے کہ
دھاگہ کو سوئی میں داخل کیا جاتا ہے۔ وَ
السَّلْکُ: اِدْخَالُ الشَّیْئِ فِی الشَّیْئِ
کَاِدْخَالِ الْخَیْطِ فِی الْمَخِیْطِ (قرطبی)۔
یُقَالُ سَلَکْتُ الْخَیْطَ فِی الْاِبْرَۃِ وَاَسْلَکْتُہٗ
اِذَا ادخلتہٗ وَنَظَمْتُہٗ (کشاف)۔
وَالسَّلْکُ: ادخال الشیئ فی الشیئ کالخیط
فی المخیط۔ (فتح) وذکر ابو عبیدہ
وابو عبید: سَلَکْتُہٗ وَاَسْلَکْتُہٗ، بمعنی
وَاحِدٍ۔ (کبیر)۔ سَلَکَ الشَّیْئَ فِی الشَّیْئِ
فَانْسَلَکَ ای ادخلہ فیہ فَتَدَخَّلَ۔ (جمل)
حدیث شریف میں ہے۔ سَلَکَ طَرِیْقًا یَلْتَمِسُ
عِلْمًا۔ جو شخص ایک راستہ پر چلے علم کی طلب
میں۔ بخاری کتاب العلم کی ایک روایت
میں ہے: من سَلَکَ طریقا یطلب فیہ علما
سلک اللّٰہ بہ طریقا من طرق الجنۃ۔ (بخاری)

يَعْرُجُوْنَ : فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۔
اور سارے دن اسمیں چڑھتے رہیں (معارف)
عَرَجَ (ن ض) عُرُوْجًا و مَعْرَجًا : عَرَجَ فِي السُّلَّمِ : سیڑھی پر چڑھنا۔ اور عُرِجَ بِهٖ : چڑھایا جانا۔
العروج کے معنی اصل میں اوپر چڑھنا کے ہیں قرآن میں ہے تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ ۔ اور مَعَارِجُ : کے معنی سیڑھیوں کے ہیں یہ جمع ہے اسکی، اسکا مفرد مَعْرَجٌ و مِعْرَاجٌ ہے مِنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ امام راغبؒ نے لکھا ہے لیلۃ المعراج کو بھی اسی مناسبت سے معراج کی رات کہا جاتا ہے کہ اسمیں دعائیں خدا کی طرف چڑھتی ہیں جیسا اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔
عَرِجَ (س) لنگڑانا صفت اَعْرَجُ اور جمع عُرْجٌ و عُرْجَانٌ ۔ عَرَجَ يَعْرُجُ ۔ اى صَعِدَ وَالْمَعَارِجُ : اَلْمَصَاعِدُ (قرطبی)
ثُمَّ عُرِجَ بِيْ : پھر مجھکو اوپر لے جایا گیا ۔ سیڑھی کے ذریعہ اوپر چڑھایا گیا۔
سُكِّرَتْ : سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا ۔ ہماری نظربندی کردی گئی ہے ۔ (ماجدی)۔
اَلسُّكْرُ : اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان اور اسکی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے عام طور پر اسکا استعمال شراب کی مستی پر ہوتا ہے۔ اور کبھی اس حالت کو بھی سُکر سے تعبیر کر لیا جاتا ہے جو غلبہ شہوت اور شدتِ غضب کی بنا پر انسان پر طاری ہوتی ہے۔ بعض شعراء کا کہنا ہے کہ سکر دو طرح کا ہوتا ہے ایک محبت کا نشہ اور دوسرا شراب کا نشہ۔ اسی سے موت کی بیہوشی کو سکرات الموت کہا جاتا ہے۔ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۔ اور موت کی بیہوشی حقیقت کھولنے کے لئے طاری ہوگئی۔ اور السَّكَرُ (بفتح السین) نشہ آور چیز کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۔ اور آیت کریمہ اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا ۔ لفظ سُكِّرَتْ کے ماخذ میں دو قول ہیں ایک یہ کہ یہ سُكْرٌ سے ماخوذ ہے اور بعض نے سَكْرٌ سے لیا ہے۔ شراب سے انسان اور اسکی عقل کے درمیان بھی چونکہ دیوار حائل ہو جاتی ہے اس اعتبار سے سَکرٌ کے معنی پانی کو بند لگانے اور روکنے کے آجاتے ہیں اور اس بند کو جو پانی کو روکنے کے لئے لگایا جاتا ہے۔ سِکرٌ (بکسر السین) کہا جاتا ہے۔ یہ فعل بمعنی

مفعول ہے (راغب)

واصله من السَّكْرِ وهو سَدَّ الشَّقِّ لئلا ينفجر الماءُ، فكَانَّ هٰذه الابصارُ مُنِعَتْ من النظر كما يَمْنَعُ السَّكْرُ الماءَ من الجرى (كبير)

بُرُوجٌ : وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا۔

اور ہمنے آسمان میں برج بنائے۔

بُرج واحد اور بروج جمع ہے۔ برج کے قلعہ اور محل۔ مراد وہ آسمانی قلعے ہیں جو خدا نے آسمانوں میں بنائے ہیں۔ جن میں اس کے ملائکہ کی فوجیں مامور رہتی ہیں اور ان حدود اور دائروں کی نگرانی کرتی رہتی ہیں جن سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ شیاطین جن کو ہے اور نہ شیاطین انس کو۔

آئمہ تفسیر مجاہد، قتادہ۔ ابوصالح وغیرہ نے اس جگہ بروج کی تفسیر بڑے ستاروں سے کی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: حق تعالیٰ بندوں سے وہ خطاب کرتا ہے جو یہ سمجھیں ان کے عرف میں آسمان مشرق سے مغرب تک اور مغرب سے مشرق، بارہ پھانک جیسے خربوزہ، وہی بارہ برج ہیں اور سورج برس دن میں سب طے کرتا ہے موسم گرمی اور سردی اس سے بدلتا ہے اور گرمی سے مینہ آتا ہے اور مینہ سے دنیا بستی ہے، اور رونق آسمان کی ستارے ہیں۔ (موضح القرآن)

البروج : القُصُورُ والمَنَازِلُ۔ و اصلُ البروج الظهورُ، ومنه تَبَرُّجُ المرأةِ باظهار زينتها۔ وسميت بذالك لظهورها وارتفاعها۔ (قرطبی)

وقال قوم: بُرُوجًا : اى قصورًا وبيوتًا فيها الحَرَسُ، خلقها الله فى السماء (قرطبی)

اَلسَّمَاءُ : وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا :

یہاں آسمان، سے مراد فضاء آسمانی ہے جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلاء کہا جاتا ہے، اور لفظ سماء، کا دونوں معنی میں اطلاق عام معروف ہے، جرم اسماء کو بھی سماء کہا جاتا ہے، اور آسمان سے بہت نیچے جو فضاء آسمانی ہے اس کو بھی قرآن کریم میں جا بجا لفظ سماء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (معارف القرآن)

اِسْتَرَقَ : اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ۔

الاستراق، افتعال من السرقة۔ وهو أخذ الشئ بخفية (روح)۔ اسکی تحقیق گذر چکی ہے۔

شِهَابٌ : شِهَابٌ مُّبِيْنٌ۔ انگارہ

چمکتا ہوا (معارف)۔

الشہاب کے معنی بلند شعلہ کے ہیں خواہ وہ جلتی ہوئی آگ ہو یا فضار میں کسی عارضہ کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔

معنی چمک کے اعتبار سے کواکب کو بھی شہاب کہدیتے ہیں اور نیزے کی نوک کو بھی۔

قال الراغب: الشھابُ: الشُّعلَةُ الساطعةُ من النار الموقدةِ ومن العارض فی الجو۔ (راغب)

والشھابُ فی اللُّغَۃِ: النارالسَّاطِعَۃُ (قرطبی)

وَالشِّھَابُ: شُعْلَۃُ نَارٍ سَاطِعٍ (کبیر)

واصلہٗ من الشُّھْبَۃِ وَھی بیاض مختلط بِسَوَادٍ۔ (روح)

والشِّھَابُ شعلۃ نارٍ ساطعۃٍ وقد یطلق علی الکواکب والسنان لمافیھما من البریق۔ (جمل)

مَوْزُوْنٍ: وَزْنٌ سے اسم مفعول ہے تولی ہوئی، جانچی ہوئی چیز۔ وَزْنٌ: تولنا جانچنا۔ آیت کریمہ: وَاَنْبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ: میں بعض نے کہا ہے کہ شئی موزون، سے مراد سونا چاندی وغیرہ معدنیات ہیں، اور بعض کے نزدیک ہر قسم کی موجودات مراد ہیں اور آیت کے معنی یہ کیئے ہیں کہ اللہ نے تمام چیزوں کو اعتدال اور تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ جسطرح آیت کریمہ: اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ: ہمنے ہر چیز اندازہ مقررہ کے ساتھ پیدا کی ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ مَوْزُوْنٌ: ای مُقَدَّرٌ معلوم (قرطبی)

لَوَاقِحَ: وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ: لَقِحَتِ النَّاقَۃُ لَقَحًا وَلَقَاحًا (مصدر بفتح القاف) اونٹنی کا حاملہ ہونا۔ درخت کے پھلدار ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

اَلْقَحَ الفَحْلُ النَّاقَۃَ: اونٹ نے اونٹنی کو حاملہ کر دیا۔ وَاَلْقَحَ الرِّیْحُ السَّحَابَ ہوا نے بادل کو بار دار کر دیا۔ بادلوں میں پانی بھر دیا۔ اِلْقَاحٌ (افعال) اور تَلْقِیْحٌ (تفعیل) کے معنی کھجور کو پیوند کرنے کے آتے ہیں۔ اَلْقَحَ فُلَانٌ النخل ولَقَّحَھَا: فلاں نے کھجور کو پیوند لگایا، اور۔ اِسْتِلْقَاحٌ (استفعال) کے معنی ہیں پیوند لگانے کا وقت قریب آ لگنا۔

اِسْتَلْقَحَتِ النَّخْلَۃُ: کھجور پیوند کے قابل ہو گئی۔ اِلْقَاحٌ اور تَلْقِیْحٌ۔ لَقْحٌ۔ کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مادہ کا حاملہ ہو جانا۔ اور درختوں کا ہواؤں کے اثر سے پھلدار ہو جانا۔ حَرْبٌ لَاقِحٌ: شدید لڑائی۔ بھڑکتی

جنگ۔ حاملہ اونٹنی کے ساتھ تشبیہ کے طور پر شدید لڑائی کو حَرْبٌ لَاقِح کہتے ہیں چونکہ وہ بھی سخت مصائب کی حامل ہوتی ہے۔

اَلْمَلَاقِیْحُ، حاملہ اونٹنیاں۔ اور اُن بچوں کو مَلَاقِیْحُ کہا جاتا ہے جو ابھی پیٹ میں ہوں۔ لِقْحَةٌ دودھ والی اونٹنیاں اسکی جمع لِقَاحٌ اور لُقَحٌ آتی ہے۔ حدیث میں ہے۔ نِعْمَ الْمِنْحَةُ اللِّقْحَةُ۔ عمدہ عطیہ دودھ والا جانور ہے۔ لَقُوْحٌ، فَعُوْلٌ۔ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ نَاقَةٌ لَقُوْحٌ: بہت دودھ دینے والی اونٹنی۔ نُوْقٌ لَوَاقِحُ: دودھ والی اونٹنیاں۔ اَللَّقَاحُ: نر جانور کا مادہ منویہ۔ اور اس آزاد قبیلہ کو بھی لَقَاحٌ کہتے ہیں جو کسی حکومت کے زیر اثر نہ ہو۔ گویا وہ حامل ہے محمول نہیں۔

مولانا امین اصلاحی لکھتے ہیں کہ: لَقَحَ کے معنی باردار کرنے اور حاملہ کرنے کے ہیں۔ اسی سے لَاقِحَةٌ اور اسکی جمع لَوَاقِح ہے۔ رِيَاحٌ: موسمی ہواؤں کو کہتے ہیں جو بادلوں کو باردار کرتی اور بارشوں کا سبب بنتی ہیں (تدبر)

لَقْحٌ اور لَقَاحٌ: مجرد۔ لازم ہیں متعدی نہیں ہیں۔ لَقِحَتِ النَّاقَةُ (سمع) اونٹنی حاملہ ہوگئی۔ لقحت الشجرة: درخت باردار ہوگیا۔ اسلئے لواقح کا معنی ہوگا: باردار ہوائیں جو پانی سے بھرے ہوئے بادل کو اٹھاتے ہوں۔ مَلَاقِحُ کے معنی بھی یہی ہیں۔ یہ مُلْقِحَةٌ کی جمع ہے۔ (راغب)

صاحب منتہی الارب نے لکھا ہے کہ لَوَاقِحَ: حاملہ کرنے والی ہوائیں۔ یعنی لَوَاقِح کو متعدی قرار دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ لَوَاقِح لَاقِحٌ کی جمع ہے اور نادر ہے مَلْقِحَةٌ ہونا چاہیئے۔ رِيْحٌ مُلْقِحَةٌ کہا جاتا ہے۔

مولانا عبدالدائم جلالی ندوی اسکا تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: صاحب منتہی الارب کی یہ صراحت غلط ہے۔ ہوائیں حاملہ نہیں کرتی۔ پھر لَاقِحَةٌ کو مُلْقِحَةٌ کے معنی کے لئے قرار دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہوا کو حاملہ کرنے والی کیوں سمجھا جائے۔ ہوا تو خود حاملہ ہوتی ہے پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو اٹھاتی ہے۔ لِقَاحٌ کے معنی نطفہ ہے یعنی پانی۔ تعجب ہے کہ تمام اہل لغت نے مجرد کو لازم ہے لکھا ہے۔ خود صاحب منتہی الارب نے لَقِحَ کو لازم ہی کہا ہے پھر لواقح کا ترجمہ۔ حاملہ کرنے والی ہوائیں کیسے ہوگیا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ، مزید کو مجرد کا ہم معنی قرار دیدیا جائے کیونکہ اِلْقَاحٌ (افعال) کا ترجمہ اگرچہ حاملہ کرنا ہے لیکن باب

افعال کی خاصیات میں سے صاحب مأخذ ہونا بھی
ایک خاصیت ہے۔ اسلئے مُلْقِحَۃٌ کا معنی صاحب
لقاح یعنی حاملہ ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے
راغب نے ملاقح کو لواقح کے معنی میں
کہا ہے۔ (لغات القرآن)

لیکن یہ تعاقب محل نظر ہے اسلئے کہ ہواؤں
کی دو حیثیتیں ہیں ایک سمندروں سے پانی اٹھانے
کے اعتبار سے اور دوسری حیثیت پانی کو سمندروں
سے اٹھا کر بادلوں میں انڈیلنے کے اعتبار سے۔
پہلی حیثیت میں حاملہ ہیں اور دوسری حیثیت
میں مُلْقِحَۃ حاملہ کرنے والی ہیں۔ اسلئے
لَاقِحَۃ کو جن حضرات نے مُلْقِحَۃ کے معنی میں
لیا ہے انہوں نے بظاہر کوئی غلطی نہیں کی۔

اَبٰی : اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی: (آیت ۳۱)

اَبٰی یَأْبٰی: انکار کرنا۔ کسی کام کے کرنے سے باز
رہنا۔ کلام عرب میں چند الفاظ ایسے ہیں کہ عین
کلمہ حرف حلقی نہ ہونے کے باوجود فتح کے وزن پر آتے
ہیں ایک تو یہی اَبٰی یَأْبٰی اور دوسرا رَکَنَ یَرْکَنُ۔
ابن جنی کا قول ہے کہ عرب اَبٰی یَأْبٰی بکسر الباء۔ ا
ضرب سے استعمال کرتے ہیں۔ رَجُلٌ اَبِیٌّ۔ خوددار
جو ظلم برداشت کرنے سے انکار کردے۔

اَبَی الشَّیْءَ یَأْبَاہُ: کسی چیز کو ناپسند کرنا۔
شدت سے انکار کرنا۔ رَجُلٌ اَبْیَانٌ وہ آدمی
کھانا کھانے سے باز رہے۔ الإباءُ والاَبَاءُ:
کراہت، نفرت۔ کبر و نخوت وغیرہ کو کہتے ہیں۔
الاباء۔ الامتناع سے خاص ہے ہر اباء کو امتناع
تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر امتناع کو اباء نہیں۔

وَیَأْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ ( )

حدیث میں ہے۔ کُلُّکُمْ فِی الْجَنَّۃِ اِلَّا
مَنْ اَبٰی ۔ تم سب جنتی ہو سوائے اس شخص
کے جو انکار کرے۔ یعنی اطاعت الٰہی سے منحرف
ہو۔ (راغب)

**صَلْصَالٍ : وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ
مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۔**

صَلْصَالٌ: خشک مٹی کو کہتے ہیں جو خشک
ہو کر کھنکھنانے لگ جائے۔

راغب فرماتے ہیں کہ صَلْصَالٌ کے معنی اصل
میں خشک چیز سے آواز آنے کے ہیں اسی سے
صَلَّ الْمِسْمَارُ ہے جس کے معنی میخ کو کسی چیز
میں ٹھوکنے سے آواز پیدا ہونے کے ہیں۔ اور
خشک مٹی کو صَلْصَالٌ اسی لئے کہا جاتا ہے
کہ وہ ٹھوکنے سے بجنے لگتی ہے۔

وہ پانی جو مشکیزہ سے باقی رہ جاتا ہے
چونکہ کم ہونے کی وجہ سے مشکیزہ میں چھلکتا اور
بجتا ہے اس لئے اس کو صَلْصَلَۃٌ کہتے ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ صلصال : سڑی ہوئی مٹی

کو کہا جاتا ہے۔ اور صَلَّ اللَّحْمُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی گوشت کے بدبودار ہوجانے کے ہیں۔

ابن عباسؓ کا قول ہے کہ صَلْصَال وہ گارہ ہے جسمیں ریت ملی ہوئی ہوتی ہے یہ ہی جب خشک ہوجائے تو صَلْصَال بن جاتی ہے۔ اور جب آگ پر پکائی جائے تو اسکو فَخَّارٌ کہا جاتا ہے۔ اکثر اہل تفسیر اور اہل لغت نے یہ قول اختیار کیا ہے (قرطبی)

مَسْنُونٍ ؛ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ :

اَسِنَ الْمَآءُ : پانی کا سخت بدبودار ہوجانا۔ مَآءٌ آسِنٌ۔ متغیر اور بدبودار پانی۔ مِنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ اُس پانی کی نہریں جو کبھی بدبودار نہوگا۔ اَسِنَ الرَّجُلُ : پانی کی بدبو سے بیمار ہوجانا۔ بے ہوش ہوجانا۔

والمسنون۔ المتغیر۔ قال ابن عباس هو التراب المبتل المنتن۔ مثل قول مجاهد وقتادة قالا المنتن المتغیر من قولهم قد اسن الماءُ اذا تغیر (قرطبی)

حَمَاٍ ؛ اَلْحَمَاُ وَالْحَمْاَةُ (بالتسکین) سڑا ہوا بدبودار کیچڑ۔ حَمِئَتِ الْبِئْرُ حَمْاً (بالتسکین) کوئیں کا کیچڑ سے بھرجانا۔ کوئیں میں کیچڑ کا زیادہ ہوجانا۔ حَمَاْتُ الْبِئْرَ : میں نے کوئیں سے کیچڑ صاف کیا اور اَحْمَاْتُهَا

اِحْمَاءً کوئیں کو کیچڑ سے بھردینا۔

ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ حَمْاَةٌ میم کے سکون سے کَمْاَةٌ کی طرح ہے اور جمع حَمْءٌ آتی ہے اور حَمَاٌ (بفتح المیم) مصدر ہے، جیسا کہ هَلَعٌ اور جَزَعٌ (قرطبی)

پھر حَمَاٌ بدبودار مٹی کے لئے بطور اسم کے استعمال ہونے لگا ہے۔

انسانی تخلیق کا مبدأ اول کیا ہے جہاں سے حیات انسانی نے سفر شروع کیا؟ اس آیۃ نے اسکا جواب دیکر ڈارونی نظریۂ ارتقاء کا راستہ تنگ کردیا ہے۔ قرآن حکیم نے اس آیت کے ذریعہ تصریح کردی ہے کہ: زندگی کا پہلا اہتزاز اور پہلا جُرثومہ اور پہلا مقام جہاں سے جوشش حیات نے اپنے سفر کا آغاز کیا مٹی اور گارا ہے۔ اس کے بعد ایک نغمۂ روحانی سے انسان نے موجودہ منزل میں قدم رکھا ہے۔ جس سے اس کے اندر نہ صرف نظام حیات کارفرما ہوا بلکہ عقل و دانش کے داعیے بھی پیدا ہوئے جن سے کائنات میں اسکو مقام عزو شرف حاصل ہوا۔

رُوْحٌ ؛ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ:

روح کوئی جسم ہے یا جوہر مجرد، اسمیں علماء رو

حکماء کا اختلاف قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ شیخ عبدالرؤف مناوی، نے فرمایا کہ اس میں حکماء کے اقوال ایک ہزار تک ہیں۔ مگر سب قیاسات اور تخمینے ہیں، کسی کو یقینی نہیں کہا جاسکتا، امام غزالی، امام رازی، اور عموماً صوفیہ اور فلاسفہ کا قول تو یہ ہے کہ: وہ جسم نہیں بلکہ جوہر مجرد، امام رازی نے اس بارہ میں تقریباً بارہ دلائل پیش کیئے ہیں۔ مگر جمہور علمائے امت، رُوح، کو ایک جسم لطیف قرار دیتے ہیں۔ نفخ، کے معنی پھونک مارنے کے ہیں، اگر بقول جمہور روح کو جسم لطیف قرار دیا جائے تو اس کو پھونکنا ظاہر ہے۔ اور جوہر مجرد مان لیا جائے تو پھونکنے کے معنی اس کا بدن سے تعلق پیدا کردینا ہوگا۔ (معارف)

مَقْسُوْمٌ: جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ، اسم مفعول ہے بمعنی بانٹا ہوا۔ بانٹ کر علیحدہ کیا ہوا۔

جُزْءٌ مقسوم کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے جہنم کے مختلف دروازوں سے داخل ہونے والوں کے درمیان ایک خاص قسم کی درجہ بندی ہوگی۔

اَلْقَسْمُ: وَالْقِسْمَةُ (ض) کے معنی کسی چیز کے حصے کرنے اور بانٹ دینے کے ہیں۔ مثلاً قِسْمَةُ الْمِيْرَاثِ: ترکہ کو تقسیم کرنا۔ اور قِسْمَةُ الْغَنِيْمَةِ۔ مال غنیمت تقسیم کرنا۔ وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ: اور ان کو آگاہ کردو کہ ان میں پانی کی باری مقرر کردی گئی ہے۔

سُرُرٍ: عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ:
سُرُرٌ: سَرِيْرٌ، کی جمع ہے بمعنی تخت۔ جس پر سرور سے بیٹھا جائے کیونکہ یہ ارباب نعمت ہی کے پاس ہوتے ہیں اسکی جمع اَسِرَّةٌ بھی آتی ہے۔ اور سِرٌّ جس کے معنی بھید اور مخفی راز کے آتے ہیں اسکی جمع اَسْرَارٌ آتی ہے۔ اور سَرِيْرَةٌ: بھید۔ راز اسکی جمع سَرَائِرُ آتی ہے۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ۔ جس روز راز فاش ہوجائیں گے۔ کوئی اخفاء نہ رہے گا۔ وسُرُرٌ جمع سَرِيْرٌ مثل جَدِيْدٌ وجُدُدٌ۔ وقيل هو مجلس رفيع عال موطأ للسرور، وهو ماخوذ منه لانه مجلس سُرُوْرٍ۔ (جمل)

نَصَبٌ: لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ۔
نَصَبٌ: محنت۔ تھکان، اور مشقت وغیرہ کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔
نَصَبٌ: اى اِعْيَاءٌ وَتَعَبٌ (قرطبی) حدیث میں ہے۔ لَا صَخَبَ فِيْهِ وَلَا نَصَبَ

نہ وہاں شور ہوگا اور نہ تھکان اور ماندگی۔

ضَيْفِ : وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ :

اَلضَّيْفِ : دراصل اس کے معنی کسی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں۔ ضِفْتُ اِلٰى كَذَا، میں اسکی طرف مائل ہوا۔ اور اَضَفْتُ كَذَا: میں نے مائل کردیا۔ ضَافَتِ الشَّمْسُ لِلْغُرُوْبِ وَتَضَيَّفَتْ۔ سورج غروب کی طرف مائل ہوگیا۔ اسی سے اَلضَّيْفُ اس کو کہتے ہیں جو ٹھہرنے کے لئے کسی کی طرف مائل ہو۔ ضَيْفٌ اصل میں مصدر ہے واحد اور جمع میں برابر استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس کی جمع اَضْيَافٌ، وَضُيُوْفٌ، اور ضِيْفَانٌ آتی ہے۔ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ میں لفظ ضَيْف مصدر بمعنی جمع ہے کیونکہ مراد اس سے وہ تین ملائکہ ہیں جو قوم لوط کی تباہی کی اطلاع کرنے اور ساتھ ہی ایک صاحبزادے کی ولادت کی بشارت دینے آئے تھے۔ ضَيْفُ ابراهيم، الملٰئكة الذين بشروه بالولد وبهلاك قوم لوط۔ وَسُمِّيَ الضَّيْفُ ضَيْفًا لِاِضَافَتِهِ اِلَيْكَ وَنُزُوْلِهِ عَلَيْكَ۔ (قرطبی)

وَجِلُوْنَ : قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ۔

وَجِلُوْنَ : صفت مشبہ جمع مذکر اس کا واحد وَجِلٌ بمعنی خوف زدہ، ڈرنے والا۔ اور صفت مشبہ مؤنث وَجِلَةٌ آتی ہے وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ (مؤمنون) وَجِيْلٌ اور مَوْجِلٌ: نشیبی گڑھا اور مَوْجِلٌ ظرف مکان، خوف کی جگہ۔ اسکی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

خَطْبُ : قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ : پھر حضرت ابراھیم علیہ السلام نے کہا اب تم کو کیا مہم درپیش ہے اے اللہ کے فرستادو۔

لفظ خَطْبٌ کا غالب استعمال کسی اہم معاملہ اور کسی امر عظیم کے لئے ہوتا ہے۔ وَ الْخَطْبُ، اَلْاَمْرُ الْخَطِيْرُ (قرطبی) وہ معاملہ جس کے متعلق لوگوں میں کثرت سے چرچا ہو خَطْبٌ کہلاتا ہے۔

اَلْخَطْبُ: الامر العظيم الذي يَكْثُرُ فِيْهِ التَّخَاطُبُ۔ (راغب)

تَفْضَحُوْنِ : قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ :

تَفْضَحُوْنِ۔ فَضْحٌ سے جمع مذکر مضارع حاضر کا صیغہ ہے، اصل میں تَفْضَحُوْا ہے مضارع کا نون لا نہی کی وجہ سے گر گیا ہے اور موجودہ نون وقایہ ہے اور یٓ ضمیر واحد متکلم کی محذوف ہے۔

فَضَحَ : رسوا کرنا ۔ لَا تَفۡضَحُوۡنِ : مجھے رسوا نہ کرو۔ فَضَحَ يَفۡضَحُ فَضۡحًا و فَضِيۡحَةً رسوا کرنا۔ عار دلانا۔

عَمۡرٌ : لَعَمۡرُكَ اِنَّهُمۡ لَفِىۡ سَكۡرَتِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ : آپ کی جان کی قسم وہ اپنی مدہوشی میں بہکے ہوئے تھے۔ عَمۡر، اور عُمُر دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، لیکن قسم کھانے کے موقعہ پر لفظ عَمۡر بالفتح خاص ہے، اَلۡعَمۡرُ و الۡعُمُرُ وَاحِدٌ لٰكِنۡ خُصَّ الۡقَسَمُ بِالۡعَمۡرِ دُوۡنَ الۡعُمُرِ (راغب)۔ العمر بالضم والفتح، البقاء الّا ان الفتح غلب فی القسم ولا يجوز فيه الضم (ابوالبقاء)

مُتَوَسِّمِيۡنَ : اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِيۡنَ۔ بے شک اس واقعہ میں اہل بصیرت کے لئے نشانیاں ہیں۔

وَسۡم و تَوَسُّم، کے معنی فراست و فہم کے ہیں وهذا التَّوَسُّمُ هو الذی سَمَّاهُ قوم الزكانة وقوم الفراسة وقوم الفطنة۔ (راغب) اور متوسمین وہ لوگ ہیں جو نصیحت قبول کریں اور اہل عبرت وعرفان میں سے ہوں۔ (ماجدی) تَوَسُّمٌ کے معنی ہیں علامات دیکھ کر شناخت کرلینا۔ حضور اقدس کی شان میں حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا تھا۔

اِنِّىۡ تَوَسَّمۡتُ فِيۡكَ الۡخَيۡرَ اَعۡرِفُهٗ\
وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اَنِّىۡ ثَابِتُ الۡبَصَرِ

میں نے اپنی جانی بوجھی ہوئی خوبیاں آپ کے اندر پہلے ہی سے دیکھ کر شناخت کرلیا تھا، خدا گواہ ہے کہ میری نظر غلطی نہیں کرتی۔ (لغات القرآن) اَلتَّوَسُّمُ کے معنی آثار و قرائن سے کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرنا کے ہیں اور اسے علم ذکانت، فراست اور فطانت بھی کہا جاتا ہے۔

حکیم ترمذی نے اپنی کتاب نور الاصول، میں ابوسعید خدریؓ کی روایت سے مُتَوَسِّمِيۡنَ کے معنی مُتَفَرِّسِيۡنَ، نقل کئے ہیں۔ علامہ قرطبی نے مجاہد کا قول بھی یہی نقل کیا ہے۔ ابوعیسیٰ ترمذی نے بھی ابوسعید خدریؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِتَّقُوۡا فِرَاسَةَ الۡمُؤۡمِنِ فَاِنَّهٗ يَنۡظُرُ بِنُوۡرِ اللّٰهِ۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِيۡنَ۔

مُقَاتِل اور ابن زید نے مُتَوَسِّمِيۡنَ کے معنی مُتَفَكِّرِيۡنَ ذکر کئے ہیں۔ یعنی معاملات میں غور و فکر کرنے والے۔

اِتَّسَمَ (افتعال) کے معنی نشان بنانے کے ہیں۔ اِتَّسَمَ الرَّجُلُ: کے معنی ہیں آدمی نے اپنے لئے کوئی ایسی علامت مقرر کی جس سے وہ پہچانا جاسکے۔ وَاَصْلُ التَّوَسُّمِ: التَّثَبُّت والتفکر ماخوذ من الوسم، وھو التاثیر بحدیدۃ فی جلد البعیر وغیرہ (قرطبی)

اَلْاَیْکَۃِ: وَاِنْ کَانَ اَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ لَظٰلِمِیْنَ۔ اور بے شک بن والے بھی بڑے ظالم تھے۔

ایکہ: بن یعنی گھنے جنگل کو کہتے ہیں کہ مدین کے پاس ایک بَنْ تھا اس لئے ایکہ اصحاب مدین ہی کا لقب ہے، بعض نے کہا ہے کہ اصحاب ایکہ اور اصحاب مدین دو علیحدہ علیحدہ قومیں تھیں ایک قوم کی ہلاکت کے بعد شعیب علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، تفسیر روح المعانی میں ابن عساکر کے حوالے سے یہ مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے کہ: اِنَّ مَدْیَنَ وَاَصْحَابُ الْاَیْکَۃِ اُمَّتَانِ بَعَثَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَیْہِمَا شُعَیْبًا (قصص القرآن)

لفظ ایکہ کو لَیْکَۃ بھی پڑھا جاتا ہے جیسا کہ مکہ اور بکہ۔ اسکی جمع اَیْکٌ آتی ہے۔ والایکۃ: الغیضۃ وھی جماعۃ الشجر، والجمع الایک۔ (قرطبی)

عربی میں ایکہ اُن سرسبز و شاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگلوں اور بنوں میں اُگی رہتی ہیں اور جھنڈے کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ (قصص القرآن)

مفسرین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحاب ایکہ، ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں یا جدا جدا قبیلے ہیں بعض کا خیال ہے کہ دونوں جدا جدا قبیلے ہیں، مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور اصحاب ایکہ دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں آباد تھا اس لئے ان کو بن والا یا جنگل والا کہا گیا اور آیت اِنَّھُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍ۔ میں ھُمَا ضمیر تثنیہ سے یہی دونوں مراد ہیں، یعنی مدین اور ایکہ، نہ کہ مدین اور قوم لوط۔ اور دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر کا خیال یہ ہے کہ ایکہ نام کا ایک درخت تھا، اہل قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہذا اس کی نسبت سے اصحٰب مدین کو ایکہ کہا گیا۔

مولانا حفظ الرحمٰنؒ فرماتے ہیں کہ راجح یہی ہے کہ مدین اور اصحٰب ایکہ ایک ہی قبیلہ

ہے۔ (قصص القرآن ۲۱)

لیکن مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ: قرآن کی رُو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مدین اور ایکہ، دو چیزیں ہیں، کیونکہ ان دونوں قوموں کا حضرت شعیب سے سوال و جواب طرز خطاب، اور پھر آخرؔ ا بربادی اور طریقۂ بربادی بالکل مختلف ہے۔ اس بنا پر کون دعوی کرسکتا ہے کہ مدین اور اصحٰب ایکہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ (ارض القرآن ص ۲۱)

ظٰلِمِیْنَ : ظٰلِمِیْنَ : یہاں ان کے شرک وکفر اور صراط مستقیم سے انحراف کی طرف اشارہ ہے قرآن پاک کی اصطلاح میں سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ جو لوگ اسمیں مبتلا ہوتے ہیں وہ خدا کے سب سے بڑے حق توحید سے بھی انکار کرجاتے ہیں اور خود اپنی جانوں پر بھی ظلم ڈھاتے ہیں اور اس انجام سے دوچار ہوتے ہیں، جو اس ظلم کی پاداش میں قدرت کی طرف سے ان کے لئے ظاہر ہوتا ہے۔

اِنْتَقَمْنَا : فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ۔

اِنْتَقَمْنَا : باب افتعال کے مصدر اِنْتِقَامٌ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے، ہم نے سزا دی، ہم نے ان پر غلبہ پا لیا، ان سے بدلہ لے لیا۔ یہاں انتقام سے مراد وہ پاداش عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد ان کے لئے ظاہر ہوئی۔

اِنَّهُمَا : اِنَّهُمَا : یہ تثنیہ کی ضمیر ہے، اس کے مرجع میں علماء تفسیر کے دو قول ہیں۔ جن حضرات نے اصحٰب مدین اور ایکہ کو ایک قرار دیا ہے ان کے نزدیک اسکا مرجع قوم لوط اور ایکہ ہے اور جن اہل تحقیق کے نزدیک ایکہ اور مدین دو الگ الگ قومیں ہیں انہوں نے اِنَّهُمَا کا مرجع اصحٰب ایکہ اور اصحٰب مدین کو قرار دیا ہے۔

اِمَامٍ : اِمَامٍ مُّبِيْنٍ : امام سے مراد یہاں گذرگاہ، کھلی شاہراہ۔ عام چلتا راستہ ہے، چونکہ راستہ رہنما ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لئے امام کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ اور مبین، امام کی صفت ہے یعنی بالکل واضح اور کھلا راستہ جو مسافر کو آسانی سے منزل مقصود تک پہنچا دے۔

والامام اسم ما یؤتم بہ۔ قال الفراء والزجاج: انما جعل الطریق اماما لانہ یؤم ویتبع، قال ابن قتیبۃ: لان المسافر یأتم بہ حتی یصیر الی الموضع الذی یریدہ (کبیر)۔ الامُّ الطریق

الواسع۔ (ماجدی بحوالہ تاج)

اَلْحِجْرُ: وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ۔

حِجر: شمال عرب اور شام کے درمیان کے علاقہ کو کہتے ہیں یہ علاقہ قوم ثمود کا مسکن تھا جن کے اندر حضرت صالح علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔

حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ: حجر ایک وادی ہے جو حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے اسمیں قوم ثمود آباد تھی۔ (معارف)

مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں کہ: یہ حضرت صالح کی اُمت قوم ثمود کا مسکن تھا۔ شام سے مدینہ کو آنے لگیے تو سب سے پہلے ارضِ لوط پڑے گی، پھر سرزمین شعیب (مدین) ملے گی اور سب سے آخر میں علاقہ حجر یا مسکنِ قوم ثمود تینوں عبرت انگیز خطّے باہم متصل ہیں اور شاید اسی مناسبت سے تینوں کا ذکر بھی یہاں ایک ساتھ آیا ہے۔ (ماجدی)

لفظ حِجر کئی معنوں کے لئے بولا جاتا ہے، ممنوع شئی کے لئے جیساکہ هٰذَا حِجْرٌ عَلَيْكَ یہ چیز تم پر حرام اور ممنوع ہے۔ قرآن پاک میں ہے: وَحِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔ یہ ایک محاورہ ہے جو کسی مشکل پیش آنے پر بولا جاتا ہے۔ ناپسندیدہ چیز کے لئے عرب کہتے ہیں حِجْرًا لَّهٗ، وہ دور ہو۔ عقل کے لئے بھی لفظ حجر کا استعمال ہوتا ہے جیساکہ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ۔ گھوڑی کو بھی حِجر کہتے ہیں اور یہاں مراد دیار ثمود ہیں (قرطبی) اصل میں جس مکان کا احاطہ پتھروں سے بنایا جائے وہ حجر کہلاتا ہے، اسی لئے ثمود کی آبادیاں چونکہ پتھروں کو تراش کر بنائی گئی تھیں، حجر کہلائیں۔

والحجرُ وادٍ بين الحجاز والشام كانوا يسكنونه، قال الراغب: يسمى ما اُحيط به الحجارةُ حِجرًا وبه سمي حِجر الكعبة وديار ثمود۔ (روح المعانی)

يَنْحِتُوْنَ: وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ۔

نَحْتٌ: کے معنی لکڑی، پتھر یا اسی طرح کی سخت چیزوں کو تراشنے کے ہیں۔ اور کاٹنے سے جو ریزے اور تراشے کرتے ہیں انہیں نُحَاتَةٌ کہا جاتا ہے۔ تَنْحِتُوْنَ الْفِضَّةَ: تم چاندی تراشتے ہو۔ لفظ۔ لفظ نحت کی تحقیق سورہ اعراف میں گزر چکی ہے، یہاں صرف فتح القدیر کی ایک عبارت نقل کر دینا کافی ہے، النحتُ في كلام العرب البري والنجر، نحته ينحته نحتًا: اي براه، وفي التنزيل۔ اَتَعْبُدُوْنَ

مَا تَنۡحِتُوۡنَ، ای تنحتون (فتح القدیر) نَحَتَ (ض ن) و نَحِتَ (س) نَحَتَ العُوۡدَ نَحۡتًا، لکڑی چھیلنا۔

اَلۡمَثَانِیۡ: ولقد اٰتینٰك سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ۔

سَبۡعًا من المثانی، سے کیا مراد ہے اسمیں اہل علم کے کئی اقوال ہیں۔ صاحب مفردات القرآن نے آیات قرآنی اور اسکی سورتوں کو مثانی قرار دیا ہے۔ اور وجہ اسکی یہ بیان فرمائی ہے کہ: مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بار بار اسکا اعادہ اور ذکر ہوتا آئیگا۔ لیکن زمانہ کے گذرنے کے ساتھ اس کے حقائق و معارف میں نہ تو کوئی تغیر ہوگا اور نہ کوئی تبدیلی، اور نہ ہی دوسری اشیاء کی طرح یہ مائل بہ زوال ہوگا۔ اسی بنا پر خدا تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ مُتَشَابِهًا مَّثَانِیَ۔ یعنی اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے ایک کتاب باہم ملتی جلتی ہوئی اور بار بار دہرائی ہوئی، اس کے اندر احکام و اخبار، مسائل و حکایات بار بار تکرار کے ساتھ بیان کیئے گئے ہیں تاکہ کسی کو قصورِ فہم اور سمع کا عذر نہ رہے۔

مُتَشَابِهًا: یہاں کِتَابًا کی صفت ہے، مُتَشَابِه سے مراد اس جگہ متماثل ہے یعنی مضامین قرآنیہ ایک دوسرے سے مربوط اور متماثل ہیں کہ ایک آیت کی تشریح و تصدیق دوسری آیت سے ہوجاتی ہے، تضاد و تعارض کا اسمیں نام تک نہیں اور مَثَانِیَ، کِتَابًا، کی دوسری صفت ہے جو مثنیٰ کی جمع ہے جس کے معنی مکرر کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے مضامین کو ذہن نشین کرنے کیلئے بار بار دہرایا جاتا ہے (معارف) اور قرآن مجید کو مثانی کہنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بابار اعادہ کرنے سے اس کے عجائب و غرائب ختم نہیں ہوتے بلکہ ہر بار کے مطالع سے نئے نئے حقائق و معارف سامنے آتے ہیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مثانی، ثَنَاءٌ، سے مشتق ہو جسکے معنی بار بار کسی کی خوبیان کرنے کے ہیں، تو اس سے مراد اس امر پر متنبہ کرنا ہوگا کہ قرآن پاک سے ہمیشہ ایسے مضامین ظاہر ہوتے رہیں گے، جو اس کو پکڑے رہنے والوں، اس کا علم حاصل کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی تعریف کا موجب ہونگے (راغب) اکثر اہل تفسیر کے نزدیک سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ، سے مراد سورہ فاتحہ ہے۔ یہی قول حضرت عمرؓ علیؓ، ابن مسعودؓ، ابوہریرہؓ۔ حسن بصریؒ، ابوالعالیہؒ۔ مجاہدؒ، ضحاکؒ، سعید بن جبیر اور قتادہ وغیرھم علماء کا ہے ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فاتحہ پڑھنے کے

بعد فرمایا کہ ھی السبع من المثانی، اب رہی یہ بات کہ اس کو سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِی کیوں کہا گیا ہے تو اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں ایک یہ کہ سَبْعًا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی سات آیات ہیں اور مثانی کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ ہر نماز میں بار بار دُہرائی جاتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ بندہ کے لئے اور ایک حصہ خدا کی حمد و ثنا کے لیے۔ ایک وجہ مثانی کہنے کی یہ بھی ہے کہ اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں اور دوسری دفعہ مدینہ منورہ میں۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ: مثانی جمع کا صیغہ ہے۔ اس کی واحد مَثْنَاۃٌ آتی ہے۔ اور مَثْنَاۃٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو دُہرایا جائے۔ کہتے ہیں ثَنَّیْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کو دُھرا کرنا یا اس کے ساتھ ایک اور ملا کر دو کر دینا۔ جانور کے گھٹنوں کو بھی مثانی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دُہرے ہو جاتے ہیں۔ فَاَمَّا المثانی فھو صیغۃ جمع واحدہ مثناۃ۔ والمثناۃ کل شئ یُثَنّٰی ای یجعل اثنین من قولک: ثَنَّیْتُ الشیئ اذا عطفتُہ، او ضممت الیہ آخر[1]

اِخْفِضْ: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ: خفض جناح کے لفظی معنی بازو جھکانے کے ہیں۔ اور محاورہ میں اس سے مراد نرمی اور شفقت سے پیش آنے کے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنی شفقت کو پوری طرح مومنین کی طرف متوجہ کیجیے، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو۔ خافِضَۃٌ: پست کرنے والی خَافِضَۃٌ رَّافِعَۃٌ: کسی کو پست کرنے والی کسی کو بلند و سرفراز کرنے والی۔

اَلْمُقْتَسِمِيْنَ: كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ۔ جیسا ہم نے (وہ عذاب) نازل کر رکھا ہے قسما قسمی کرنے والوں پر جنہوں نے قرآن کے ٹکڑے کر رکھے تھے (ماجدی)

الْمُقْتَسِمِيْنَ اِقْتِسَامٌ سے مشتق ہے اور اس کے معنی حلف اٹھانے والوں کے ہیں۔ یعنی دشمنانِ اسلام جنہوں نے مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت باہم سازش کر کے حلف اٹھاتے تھے (ماجدی)

الْمُقْتَسِمِيْنَ باب افتعال کے مصدر اِقْتِسَامٌ سے جمع مذکر اسم فاعل کا صیغہ ہے، بانٹ لینے والے، قسمیں کھانے والے۔ اگر مقتسمین کے معنی بانٹ لینے والے ہوں تو یہ قِسْمَۃٌ سے مشتق ہوگا، اور اگر قسمیں کھانے والے

ہوں تو اس کا ماخذ قَسْمٌ ہوگا۔

عِضِیْنَ: یہ عِضَۃٌ کی جمع ہے۔ کسی چیز کا ٹکڑا۔ اس کی جمع عِضِین اور عُضُون ہے جیسا کہ ثُبَۃٌ اور ظُبَۃٌ کی جمع ثُبُون اور ظُبُون آتی ہے۔ اسی سے العُضْوُ اور العِضْوُ ہے جس کے معنی بدن کا ایک حصہ یا ٹکڑا کے ہیں۔ عَضَّیْتُہٗ تَعْضِیَۃً کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، جسم کے اعضاء کو کاٹ کر جدا جدا کر دینا۔

اہل لغت میں سے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ عِضَۃٌ کی اصل عِضْوٌ ہے یعنی اس کا لام کلمہ حرف واو ہے اور بعض کے نزدیک اس کی اصل عِضَۃٌ (بالہا) ہے اس صورت میں اس کا لام کلمہ ھاء ہوگا۔ عِضَۃٌ بالہاء کے معنی جادو کے ہیں۔ حدیث میں ہے: لَعَنَ اللّٰہُ العَاضِھَۃَ وَالمُسْتَعْضِھَۃَ: اللہ جادو کرنے والی اور جادو کرانے والی دونوں پر لعنت کرے۔

کسائی فرماتے ہیں کہ اس کی اصل عِضْوٌ بھی ہو سکتی ہے اور عِضْھَۃٌ بھی۔ لہٰذا بعض کے نزدیک عِضَۃٌ کی اصل بھی عِضْھَۃٌ ہے۔ کیونکہ اس کی تصغیر عُضَیْھَۃٌ آتی ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس کی اصل عِضْوَۃٌ ہے۔ کیونکہ اس کا تثنیہ عِضْوَانِ آتا ہے (راغب)

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ اہل لغت نے عِضِین کے واحد میں دو باتیں ذکر کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا واحد عِضَۃٌ ہے جیسا کہ عِزَۃٌ، ثُبَۃٌ اور بُرَۃٌ، ان کی جمع عِزِینَ، بُرِینَ اور ثُبِینَ آتی ہیں۔ یہ اصل میں عِضْوَۃٌ تھا۔ عَضَیْتُ الشَّیْئَ: سے ماخوذ ہے جس کے معنی چیز کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں۔ اور وہ ٹکڑا جو کاٹ دیا جائے اس کو بھی عِضَۃٌ کہا جاتا ہے یہ ناقص واوی ہے اور واو جو لام کلمہ کی جگہ پر تھی حذف ہوگئی ہے۔ تَعْضِیَۃٌ کے معنی تجزیہ اور تفریق کے ہیں۔ کہتے ہیں عَضَّیْتُ الشَّیْئَ تَعْضِیَۃً: چیز کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ عَضَّیْتُ الجَزُوْرَ وَالشَّاۃَ تَعْضِیَۃً: میں نے اونٹ اور بکری کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اور ان کو تقسیم کر دیا۔ حدیث میں ہے: لَا تَعْضِیَۃَ فِی المِیرَاثِ اِلَّا فِیمَا یَحْتَمِلُ القِسْمَۃَ یعنی ترکہ کی تقسیم میں کسی ایسی چیز کو کاٹ کر تقسیم نہیں کیا جائیگا جو کاٹنے سے بالکل برباد ہو جائے۔ جیسے تلوار وغیرہ۔ پس آیت کریمہ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ کے معنی یہ ہوئے کہ انہوں نے اس کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ کوئی جادو کہتا ہے، کوئی شاعری کا الزام دیتا ہے اور کوئی اس کو اگلوں کے قصے کہانیاں قرار دیتا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ یہ خود ساختہ کلام

ہے۔ دوسری بات اس کی واحد میں یہ
کہ اس کا واحد اصل میں عِضَۃٌ ہے جو اصل میں
عِضْھَۃٌ تھا۔ دو ھا، کا ایک جگہ اکٹھا ہونا
باعثِ ثقل تھا اس لئے ایک ھا کو گرا کر
عِضَۃٌ بولنے لگے ہیں، جس طرح کہ شَفَۃٌ کے
بارے میں بعض کا خیال ہے کہ یہ اصل میں
شَفْھَۃٌ ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ عرب
شافھتُ مشافھۃً بولتے ہیں۔ اور اسی
طرح سَنَۃٌ کے بارے میں بعض اہل لغت
کا خیال ہے کہ یہ اصل میں سَنْھَۃٌ ہے۔
اور یہ عِضَۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی
جھوٹ کے ہیں۔ حدیث ہے ایّاکُم
والعِضَۃ۔ تم جھوٹ سے بچو۔
اور ابن السکیت کا قول ہے کہ عِضَۃٌ کے
معنی ہیں کہ انسان بھتان باندھے اور کسی
چیز کے بارے میں وہ بات کہے جو
اس میں نہ ہو۔
مشہور نحوی اور لغوی خلیل کا قول بھی یہ ہی
ہے۔ اس قول پر آیت کے معنی یہ ہوں گے
کہ انھوں نے قرآن پاک کو خودساختہ بتایا۔
اور عِضَۃٌ کی جمع عِضُون ذوی العقول کے
وزن پر اس لئے آئی کہ اس میں حذف ہوا ہے
لہذا واو نون کے ساتھ جمع لا کر اس کو حذف
کا عوض کر دیا گیا ہے و اصلھا سنۃٌ فی احد الاقوال
وھو ماخوذ من العضہ بمعنی الکذب (کبیر)

قد تمّ شرحُ الفاظ القرآن من سورۃ الحجر
والحمد للہ علیٰ ذلک حمداً کثیرا۔
و یلیہ سُورۃ النحل

شرح الفاظ القرآن من سورۃ النحل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَمْرُ : اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ، آپہنچا حکم اللہ کا، سو اسکی جلدی مت کرو ۔

اَلْاَمْرُ : یہ اسم ہے ۔ کام ، حالت ، شان ، حکم ، اہم معاملہ اور اَمَرَ ۔ یَاْمُرُ (ن) کا مصدر بھی اَمْرٌ آتا ہے ۔ اس کے معنی حکم دینے کے ہوتے ہیں اَمَرَهٗ اَنْ یَّفْعَلَ کَذَا ۔ کسی کو کسی چیز کے بنانے کا حکم دینا ۔ اَمَرَ کا لفظ جملہ اقوال و افعال کے لئے بولا جاتا ہے ۔ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ ۔ اور تمام اُمور کا رجوع اُسی کی طرف ہے ۔ اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ میں امر سے مراد بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک کفر و شرک کی سزا کا فیصلہ ہے ۔ اور یہ اشارہ جنگِ بدر کی طرف ہے جس میں حق و باطل کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا ۔ اور عذاب آخرت بھی مراد لیا گیا ہے صاحبِ روح المعانی فرماتے ہیں کہ فانّ المراد بہ علی قول الجمہور یوم القیٰمۃ (روح) حضرت مفتی صاحب قدس سرّہٗ فرماتے ہیں حکم اللہ سے اس جگہ مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول سے کیا ہے کہ ان کے دشمنوں کو زیر و مغلوب کیا جائے گا اور مسلمانوں کو فتح و نصرت اور عزت و شوکت حاصل ہوگی (معارف)

اَلرُّوْحُ : یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ

روح سے مراد یہاں وحی الٰہی ہے ۔ وحی الٰہی کو روح سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس طرح جسم کی زندگی روح سے ہے ، اسی طرح روح و دل کی زندگی وحیِ الٰہی سے ہے (تدبر القرآن) لفظ روح سے مراد اس آیت میں بقول ابنِ عباس وحی اور بقول بعض مفسرین ہدایت ہے (معارف) بعض نے روح سے مراد یہاں نبوت کو لیا ہے ۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ لفظ روح میں دو قول ہیں ۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وحی ہے جیسا کہ آیتِ کریمہ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ، اور دوسرا قول یہ ہے کہ روح سے مراد جبریل امین ہے اور بالروح میں حرف باء بمعنی مع کے ہے ۔ معنی یہ ہے کہ اللہ فرشتوں کو جبرئیلؑ کی معیت میں اتارتا ہے ۔ چنانچہ قرآنِ پاک کی دوسری بہت سی آیات شاہد ہیں کہ وحی تنہا جبرائیلؑ

نہیں لاتے بلکہ اُن کی معیت میں ملائکہ کا ایک
عظیم لشکر ہوتا ہے لیکن ترجیح اس قول کو ہے کہ
روح سے مراد یہاں وحیٔ الٰہی ہے جو اللہ کا کلام ہے
بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ الملٰئکۃ کا لفظ
اگرچہ جمع ہے مگر واحد کے حکم میں ہے اور مراد
اس سے جبرائیل ہے اور الروح سے مراد وحیٔ
الٰہی یعنی قسرآنِ پاک ہے۔

دِفْءٌ: وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا

دِفْءٌ ، دِفْءٌ، گرمی اور گرمی حاصل کرنے
کی چیز، مراد اُون ہے جس کے گرم کپڑے بنائے
جاتے ہیں (معارف القرآن) دِفْءٌ، یہ بَرْدٌ
کی ضد ہے۔ رَجُلٌ دِفْآنٌ مونث دِفْآنَۃٌ،
گرمی حاصل کرنے والا۔ بَيْتٌ دَفِيْئٌ، گرم
مکان۔ یہاں آیتِ کریمہ میں دِفْءٌ سے مراد
جاڑے کا سامان ہے (راغب) دَفِئَ يَدْفَأُ
دَفْأً و دُفُوْءً وَدَفَاءَةً۔ دَفِيَ مِنَ الْبَرْدِ
گرمی ہونا، گرمی پانا، گرمی محسوس کرنا، اِدْفَاءٌ
(افعال) گرم کرنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں ایک قیدی لایا گیا جو سردی سے
کانپ رہا تھا، آپؐ نے فرمایا، اِذْهَبُوْا بِهٖ
فَاَدْفُوْهُ۔ اس کو لیجا کر گرم کرو، انہوں نے
لیجا کر اِس کو قتل کر دیا۔ وہ سمجھے کہ گرم کرنے سے
مراد قتل کرنا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ
لوگ جو قیدی لیکر آئے تھے یمنی تھے اور یمنیوں
کی زبان میں اِدْفَاءٌ قتل کے معنی میں آتا ہے
اِسْتِدْفَاءٌ (استفعالٌ) گرمی حاصل کرنا
ثُمَّ يَسْتَدْفِئُ بِيْ قبل ان اغتسل، پھر
آپ مجھ سے گرمی حاصل کرتے اور میں نے خود
ابھی غسل نہ کیا ہوتا۔ دفءٌ کی جمع اَدْفَاءٌ
آتی ہے۔ اونٹوں کے بالوں وغیرہ سے بھی
چونکہ گرمی حاصل کی جاتی ہے اس لئے انکو
بھی دفءٌ کہتے ہیں۔ مَا عَلَيْهِ دفءٌ
اس پر گرمی حاصل کرنے کا کوئی سامان نہیں،
ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت
میں ہے کہ دفءٌ سے مراد حیوانات کی نسل ہے
اور جوہری اپنی مشہور کتاب صحاح میں نقل
کرتے ہیں کہ دفءٌ عام ہے، جو اونٹ کے
نتاج یعنی بچوں، دودھ اور اُن تمام چیزوں
کیلئے بولا جاتا ہے جن سے نفع حاصل کیا جاتا ہے
جیسے اُون اور کھال وغیرہ، دِفْءٌ، یہ اسم ہے یعنی
وہ چیز جو گرم کرے گرمی پہنچائے، دِفَاءَۃٌ مصدر ہے
اور دِفْءٌ آڑ وغیرہ کو بھی کہتے ہیں۔

اُقْعِدَ فِيْ دِفْءِ هٰذَا الْحَائِطِ: وہ اس
دیوار کی آڑ یا اوٹ میں بٹھایا گیا ہے۔
اِدَّفَأَ بِهٖ (افتعال) گرم کپڑا پہننا جو گرمی
دے۔ يَوْمٌ دَفِيْءٌ، فَعِيْلٌ کے وزن پر

گرم دن۔ لیلۃٌ دفیئۃٌ، رات،
المُدْفِئَۃُ: بہت سارے اونٹوں کا گلہ،
زیادہ اور ایک جگہ جمع ہونے کی وجہ سے
ایک دوسرے کے انفاس سے گرمی لیتے ہیں
اور المُدْفاۃُ۔ وہ اونٹ جس پر اون زیادہ ہو
الدِّفْءُ: السَّخَانَۃُ، وَھُوَ یُسْتَدْفَاُ
بِہٖ فِیْ اَصْوَافِھَا وَاَوْبَارِھَا وَاَشْعَارِھَا
مُلَابِسٌ، وَلُحُفٌ وَقُطُفٌ: روی
عن ابن عباسؓ دِفْؤُھَا، وَقَالَ الجوھری
فی الصحاح الدِّفْ نِتَاجُ الابل وَاَلْبَانُھَا
وَمَا یُنْتَفَعُ بِہٖ مِنْھَا۔ (قرطبی)

تُرِیْحُوْنَ: وَلَکُمْ فِیْھَا جَمَالٌ
حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ
پ۱۴، آیت ۶
اور تم کو اُن میں عزت ہے جب شام کو چرا کر
لاتے ہو اور جب چرانے لیجاتے ہو (معارف)
تریحون، باب افعال کے مصدر اِرَاحَۃٌ
سے جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ اراحۃٌ کے
معنی شام کو گلے کو چرا کر باڑے میں لیجانے
کے ہیں۔ یہ اَرَحْتُ الْاِبِلَ سے ماخوذ ہے
اونٹوں کو بوقت شام باڑے میں لانا۔ اصل
میں رَوْحٌ سے مشتق ہے۔ رَاحَ یَرُوْحُ
رَوْحًا، کے معنی ہیں شام میں آنا یا جانا،
اور وقت کی قید کے بغیر مطلق جانے کے معنی
میں بھی آتا ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی صاحبؒ
لکھتے ہیں۔ تُرِیْحُوْنَ۔ تم شام کو چرا کر واپس
لاتے ہو۔ اِرَاحَۃٌ سے جس کے معنی شام
پڑے چوپایوں کو اپنے اپنے ٹھکانے لیجانے
کے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ
فرماتے ہیں، تُرِیْحُوْنَ، رَوَاحٌ سے ہے۔
چوپائے جانوروں کا شام کے وقت گھر کی
طرف واپس آنے کو رَوَاح کہتے ہیں (ملخصاً)
والرَّوَاحُ۔ رجوعھا (الابل) بالعشی
الی المرعی (قرطبی)

تَسْرَحُوْنَ: یہ سَرَاحٌ سے مشتق ہے
جو چوپائے جانوروں کے صبح کے وقت چراگاہ
کی طرف جانے کو سَرَاحٌ کہا جاتا ہے۔
(معارف) اَلسَّرْحُ، اصل میں ایک پھلدار
درخت ہے جس کا واحد سَرْحَۃٌ آتا ہے،
اور سَرَحْتُ الابل کے اصل معنی تو
اونٹ کو سَرْحٌ درخت چرانے کے ہیں
اس کے بعد اس میں قدرے وسعت کر کے
جانوروں کو چراگاہ میں چرنے کے لئے کھلا
چھوڑ دینے کے لئے بھی بولا جانے لگا ہے۔
اور چرواہے کو سَارِحٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی
جمع سَرْحٌ ہے۔ جیسے رَاکِبٌ کی جمع رَکْبٌ ہے

سَرَحٌ لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے
آیتِ کریمہ میں متعدی ہے۔ تَسْرَحُوْنَ،
تم صبح کو جنگل چرانے جاتے ہو۔ فتحٌ سے سَرَحٌ
کے معنی علی الصباح چرانے کے لئے جانے
کے ہیں (لغات القرآن)

الْجَمَالُ : وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ :

الجمال کے معنی حسنِ کثیر اور اعلیٰ درجہ
کی خوبصورتی کے ہیں۔ اور یہ دو قسم پر ہوتا ہے
ایک تو اس کا اطلاق اُن خوبیوں پر ہوتا ہے
جو بدن نفس یا عمل میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرا
لفظ جمال اُن خوبیوں کے لئے بولا جاتا ہے
جو کسی دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہیں،
جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ
إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ وَيُحِبُّ الْجَمَالَ مطلب
یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خیراۃ کثیرہ کا فیضان
ہوتا ہے لہٰذا جو اس صفت کے ساتھ متصف
ہوگا وہی اللہ کا محبوب ہوگا۔ علامہ قرطبی
فرماتے ہیں۔ جمال حُسن کو بھی کہا جاتا ہے اور
اُن چیزوں کو بھی جن سے خوبصورتی اور حُسن
حاصل کیا جاتا ہے الْجَمَالُ مَا يَتَجَمَّلُ
بِهِ وَالْجَمَالُ الْحُسْنُ (قرطبی)

بِشِقِّ : إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ ، مگر
جان مار کر، بِشِقِّ الانفس، جان محنت و
مشقت (معارف) الشِّقُّ۔ اس مشقت
کو کہتے ہیں جو تنگ و دو سے بدن یا نفس کو
لاحق ہوتی ہے۔ الشُّقَّةُ، وہ منزل مقصود
جس تک بہ مشقت پہنچا جائے۔ قرآن
میں ہے بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ۔ مسافت
ان کو دُور نظر آئی کہ بغیر دشواریوں کے وہاں
تک پہنچنا اُن کے لئے مشکل ہے۔

بعض اہلِ لغت نے شِقٌّ بکسر الشین
اور بفتح الشین دونوں کے ایک ہی معنی
بیان کئے ہیں۔ لیکن صاحبِ کشاف فرماتے
ہیں کہ ان دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ
کہ شقّ بالفتح شقّ يَشُقُّ کا مصدر ہے
شَقَّ الامر علیه شقًّا وَمَشَقَّةً،
کسی پر معاملہ دشوار ہونا۔ اور اصل میں
شَقٌّ کے معنی کسی چیز کو پھاڑنا ہے اور
شِقٌّ۔ بکسر الشین کے معنی نصف کے ہیں
مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنے اثقال کو بغیر
نصف قوت کے خرچ کئے منزل مقصود تک
نہیں لے جا سکتے تھے۔

تُسِيمُوْنَ : اِسَامَةٌ سے مشتق ہے
جس کے معنی ہیں جانوروں کو چرنے کے
لئے چھوڑنا (معارف) امام راغب فرماتے ہیں
السَّوْمُ کے معنی ہیں کسی چیز کی تلاش میں

جانا۔ تو لفظ سُوْمٌ دو معنوں سے مرکب ہے، ایک جانا اور دوسرا طلب۔ پھر ان میں سے ہر ایک معنی کے لئے الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سامَتِ الابل کے معنی ہیں اونٹوں کا چراگاہ کی طرف چرنے کے لئے نکل جانا۔ وہ اونٹ یا دوسرے چوپائے جو جنگل میں چر کر گزارہ کرتے ہیں انھیں سائِمَۃٌ کہتے ہیں۔ اور سُمْتُ کذا، میں نے اسکو تکلیف دی۔ یَسُوْمُوْنَکُمْ۔ وہ تم کو تکلیف دیتے تھے سِیْمَآءٌ اور سِیْمِیَآءٌ کے معنی ہیں علامت، نشانی۔

قَصْدٌ : وَعَلَى اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْھَا جَآئِرٌ، قَصْدٌ کے معنی سیدھے اور مستقیم کے ہیں۔ طَرِیْقٌ قَصْدٌ۔ سیدھا راستہ۔ قصد السبیل میں صفت، اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بندہ کو خدا تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے جو توحید کی راہ ہے۔ قَصَدْتُّ قَصْدَ کَا۔ میں اسکی طرف سیدھا گیا۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہاں ایک مضاف محذوف ہے اور اصل تقدیر کلام یہ ہے وَعَلَى اللّٰہِ بَیَانُ قَصْدِ السَّبِیْلِ اى عَلَى اللّٰہِ بَیَانُ قَصْدِ السَّبِیْلِ، فحذف المضاف وَھُوَ البیان (قرطبی)

السّبیل سے مراد یہاں اسلام ہے، وَالسَّبِیْلُ، الاسلام (قرطبی)

اَلْجَآئِرُ : ومنھا جَآئِرٌ۔ جار عن الطریق، کے معنی ہیں راستے سے ایک جانب مائل ہو کر چلنا۔ اصل راہ کو چھوڑ کر چلنا۔ پھر اس کا استعمال مطلق حق سے عدول کیلئے ہونے لگا ہے۔ وَمِنْھَا جَآئِرٌ اى وَمِنَ السَّبِیْلِ جَآئِرٌ۔ اى عَادِلٌ عَنِ الحق فلا یُھْتَدٰى بِہٖ (قرطبی) طرفہ کہتا ہے، عَدَوْلِیَّۃٌ او من سفین ابن یامِن یجور بھا الملاح طَوْرًا وَ یھتدی، ترجمہ: وہ کشتیاں عدولی طرز کی بنی ہوئی ہیں یا ابن یامن کی بنائی ہوئی کشتیوں میں سے ہے جن کو ملاح کبھی ٹیڑھا لیجاتے ہیں اور کبھی سیدھا۔

اَلْبِغَالَ : وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْھَا وَزِیْنَۃً :

اَلْبَغْلُ، خچر، وہ جانور ہے جو گدھے اور گھوڑے کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے، اسکی جمع بِغَالٌ آتی ہے۔ یہ جانور طاقتور اور شریر ہوتا ہے۔ اسی شرارت اور خباثت کے پیش نظر چالاک قسم کے آدمی کو بھی بَغْلٌ

کہدیتے ہیں۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑا خچر ہے۔

ذَرَأَ : وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ۔ ذَرَءَ، یہ ذَرْءٌ سے واحد مذکر کا صیغہ ہے۔ اس نے پیدا کیا، بکھیرا، پھیلایا۔ امام قرطبی لکھتے ہیں کہ ذَرَءَ خَلَقَ کے معنی میں ہے۔ ذرء اللہ الخلق یَذْرَءُهُمْ ذرءٌ خلقھم صفت فاعلی کا صیغہ اسمیں ذاریٌ آتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ لفظ ذُرِّيَّةٌ بھی اِسی سے ہے جس کے معنی جن و انس کی اولاد کے ہیں، اسکی جمع ذرارِی آتی ہے۔ حرف ہمزہ ثقل کی وجہ سے ترک کردیا گیا ہے۔ ذَرْءٌ اور ذَرْوٌ کے اصل معنی بکھیرنے کے ہیں اور جُدا کرنے کے ہیں۔ واصل الذَّرْءِ والذَّرْوِ، التفریق عن جمعٍ (قرطبی)، صاحب مفردات القرآن فرماتے ہیں کہ لفظ ذُرِّيَّةٌ کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ذَرْءٌ سے مشتق ہے جس کے معنی پیدا کرنے اور پھیلانے کے ہیں اور اسکی ہمزہ متروک ہوگئی ہے جیسا کہ رَوِيَّةٌ اور بَرِيَّةٌ میں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اسکی اصل ذُرْوِيَّةٌ ہے۔ تیسرا قول یہ کہ ذَرٌّ سے ہے جس کے معنی بکھیرنے کے ہیں فَعِيْلَةٌ کے وزن پر ہے۔ جمع ذراری اور ذُرِّيَّات۔ ذَرَأَ الارضَ ۔ زمین میں بیج ڈالدیا۔

طَرِيًّا : لَحْمًا طَرِيًّا ۔ الطَّرِيُّ تروتازہ۔ لَحْمٌ طَرِيٌّ ۔ تروتازہ گوشت طَرِيٌّ ۔ یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ طَرْءٌ اور طَرَاوَةٌ مصدر ہے۔ بمعنی تروتازہ ہونا۔ طَرَّيْتُ كذا فَطَرِيَ، میں نے اسے تازہ کیا چنانچہ وہ تازہ ہوگیا اور اِطْرَاءٌ اس تعریف کو کہتے ہیں جس سے محبوب کی یاد تازہ ہوجائے (راغب)، اصل میں اِطْرَاءٌ کے معنی حد سے زیادہ تعریف کرنے کے ہیں۔ حدیث میں ہے لَا تُطْرُوْنِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى عیسی ابن مریم ۔ تم میری حد سے زیادہ تعریف نہ کرو۔ جیسے کہ نصارٰی نے عیسٰی بن مریم کی کی۔ ان کو حدِّ بشریت سے خارج کرکے درجۂ الوہیت پر بٹھادیا۔ عَسَلٌ مُطَرًّى ۔ وہ شہد جو خوشبو سے معطّر کیا گیا ہو۔ لَحْمًا طَرِيًّا سے مراد یہاں مچھلی ہے۔ مچھلی کے گوشت کو لحمًا طری کہنے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ بہ نسبت دوسرے لحوم کے بہت جلد خراب ہوجاتا ہے۔ اور پھر خراب ہونے

کے بعد اسمیں مضر جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جن سے انسانی صحت پر بُرے اثرات کا اندیشہ ہوتا ہے تو گویا لحماً طریّاً میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مچھلی کا گوشت تازہ کھایا جائے۔

والاطباء یقولون: ان تناولہٗ بعد ذھاب طراوتہٖ اضرّ یکون (حاشیہ کشاف)

مَوَاخِرَ: وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ: مَوَاخِرَ۔ مَاخِرٌ کی جمع ہے، سَفِيْنَةٌ مَاخِرَةٌ۔ اپنے سینے سے سمندر کے پانی کو چیر کر چلنے والی کشتی۔ مَخَرَ الْمَاءُ الْاَرْضَ۔ پانی کا زمین کو چیرنا۔ مَخْرٌ و مُخُوْرٌ مصدر ہیں۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ مَوَاخِرَ، مَاخِرَةٌ کی جمع ہے بمعنی جاریۃ ہے۔ اور المَخْرُ کے معنی شق، یعنی پھاڑنے اور چیرنے کے ہیں۔ کشتیاں چونکہ اپنے سینے کے زور سے آبِ دریا کو چیرتی اور پھاڑتی ہوتی جاتی ہیں اس لئے انھیں مواخِر کہا گیا ہے۔ واصل المخر، الشق (روح) اصل میں مَخَرَتِ السَّفِيْنَةُ کے معنی ہیں کشتی کا آواز کے ساتھ پانی کو چیرتے ہوئے چلنا۔ واصل المخر شق الماء عن یمین و شمال مخرت السّفینۃ مَخْرًا و مُخُوْرًا اِذَا جَرَتْ تَشُقُّ الْمَاءَ مع صوت (قرطبی) علامہ طبری فرماتے ہیں اصل میں لغوی معنی مَخْرٌ کے اس آواز کے ہیں جو ہوا کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک حدیث ہے۔ اِذَا اَرَادَ اَحَدُكُمُ الْبَوْلَ فَلْيَتَمَخَّرْ، یعنی بول کے وقت ہوا کا رُخ دیکھنا چاہیئے تاکہ اس کی طرف منہ کر کے پیشاب نہ کرے بلکہ ہوا کی طرف رُخ کے بجائے پشت کر کے بیٹھے۔

مُخَرَّةٌ: منتخب چیز، برگزیدہ، مَخِيْرٌ وہ شراب جس میں پانی ملا ہوا ہو۔ اِمْتِخَارٌ افتعالٌ۔ ہر اچھی چیز کو چھانٹ لینا، تَمَخَّرَ، تَفَعَّلَ۔ ہوا کی طرف پشت کر کے کھڑا ہونا۔ ناک ہوا کے مقابل لگانا چلنا۔ خَرَجْتُ اَتَمَخَّرُ الرِّيْحَ، میں ہوا خوری کے لئے نکلا۔ اَلْمَاخُوْرُ بدکاروں اور اوباشوں کی مجلس، اور بدکاری کے اڈے کا متولی۔ بڑا لفنگا۔ انسانی شرافت کو پھاڑنے والا۔ اس کی جمع مَوَاخِيْر اور مَوَاخِر دونوں طرح آتی ہے۔ المخرۃ، منہ کی بدبو،

مَخَرَ السَّابِحُ: تیرنے والے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرا۔

اَیَّانَ : اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ۝

ترجمہ : مردے ہیں جن میں جان نہیں، اور نہیں جانتے کب اُٹھائے جائیں گے ۔ (آیت ۲۱، سورۃ النحل) (معارف القرآن)

لفظ اَیَّانَ معنی متیٰ کے قریب دیتا ہے، اور اس کا استعمال کسی شئی کا وقت دریافت کرنے کے لئے ہوتا ہے ۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ اَیَّانَ کی اصل بعض کے نزدیک ایّ اوَانٍ ہے یعنی کونسا وقت، الف کو حذف کر کے حرف واؤ کو یا بنایا گیا ہے اور پھر یا کو یا میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ اَیَّانَ، ہو گیا ہے اور بعض نے اِیَّانَ بکسر الہمزہ پڑھا ہے (روح المعانی ص۱۲ جلد۱۴)

اَسَاطِیْرُ : اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ

اَسَاطِیْرُ، اُسْطُوْرَۃٌ کی جمع ہے، اُسْطُوْرَۃٌ، کی جمع ہے ۔ اُسْطُوْرَۃ، بے اصل اور بے حقیقت بات کو کہتے ہیں، جس کی حیثیت محض افسانے کی ہو (تدبّر) یہ بھی احتمال ہے کہ اساطیر، یہ اَسْطَارٌ کی جمع ہو ۔ اور اسطار جمع ہے سَطْرٌ کی تو اس صورت میں اساطیر، جمع الجمع ہوگی سَطَرَ یَسْطُرُ سَطْرًا، سیدھی لائن لگانا سیدھا لکھنا ۔

السَّقْفُ : فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ ۔ تو اُوپر اُن پر چھت گر پڑی

سَقْفُ الْبَیْتِ، مکان کی چھت، اسکی جمع سُقُفٌ آتی ہے ۔ قرآن پاک میں ہے وَلِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ، السَّقْفُ الْمَرْفُوْعُ ۔ بلند اور اونچی چھت، مراد آسمان ہے ۔ اسی طرح سَقْفًا مَّحْفُوْظًا سے بھی مراد آسمان ہے ۔ سَقِیْفَةٌ اور مُسَقَّفٌ چھتی ہوئی جگہ ۔ سَقْفٌ کی جگہ سُقُفٌ اور سُقُوْفٌ دونوں طرح آتی ہے اور سَقِیْفٌ کی جمع بھی سُقُفٌ آتی ہے ۔ ابن فارس کے نزدیک اس کے معنوں میں بلند ہونے اور جھکا ہوا ہونیکا مفہوم پایا جاتا ہے ۔

یَتَفَیَّؤُا : یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ ۔ یَتَفَیَّؤُا یہ باب تفعیل کے مصدر تَفَیُّئٌ سے واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے ۔ اس کا اصل مادہ فیئٌ ہے ۔ مولانا تھانویؒ نے یَتَفَیَّؤُا کے معنی کئے ہیں جھکتے جاتے ہیں ۔

فَآءَ ۔ یَفِیْئُ ۔ فَیْئٌ : لوٹنا ۔ اسی سے ہے حتّٰی تَفِیْئَ اِلٰی اَمْرِ اللّٰهِ ۔ وہ سایہ جو شام کے وقت مغرب کی طرف سے مشرق

کی طرف کو جھکتا ہے۔ فَيْءٌ کہلاتا ہے۔
والفَيْءُ، الرّجوع (قرطبی)

وَاصِبٌ : وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا :
دین کے معنی یہاں اطاعت اور وَاصِبَةٌ
کے معنی دائم کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ
آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا
ہی کا ہے اور وہ ہمیشہ ہر چیز کی اطاعت
کا حقدار ہے۔
وَاصِبٌ، وُصُوْبٌ مصدر سے اسم فاعل
ہے۔ جم جانے والا۔ قائم رہنے والا۔ اور
لازوال۔ وَصْبٌ کے معنی دائمی مرض کے
ہیں۔ اور وَصِبَ (س) فُلَانٌ، فهو
وَصِبٌ، دائمی مرض میں مبتلا ہونے کے ہیں
وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ اور اُن کے لئے
عذاب دائمی ہے۔ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا کا
مطلب جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ ہوگا کہ
انسان کو ہر حالت میں اُسی کی عبادت کرنی
چاہیئے۔ مَفَازَةٌ وَاصِبَةٌ دُور تک
پھیلا ہوا بیابان جس کی انتہا نہ ہو (راغب)
صاحب کشاف نے وَاصِبٌ کے معنی واجب
اور ثابت کئے ہیں۔ اور اسی طرح دِيْنٌ وَاصِبٌ
کے معنی جزائے دائمی بھی بیان کئے ہیں۔
الواصب : الواجبُ الثَّابِتُ : لِاَنَّ
كُلَّ نِعْمَةٍ منه فالطاعة، واجبٌ لهُ
عَلىٰ كُلِّ مُنعِمٍ عليه (کشاف) یہ معنی وَصَبَ
يَصِبُ وُصُوْبًا سے ہونگے اور وَصِبَ
يَوْصَبُ۔ وصبًا کے معنی ہیں بیمار ہونا۔
مشقت اور کلفت میں پڑنا۔ اس سے صفت
فاعلی کا صیغہ وَصِبٌ آتا ہے بمعنی بیمار،
اسکی جمع وصابیٰ اور وصَابٌ آتی ہے، وقال
صاحب الروح واصبًا، ای واجبًا لازمًا،
لازوال لهٗ (روح)
وقال الرازی رحمۃ اللہ: والواصبُ، الدائمُ
يقال وصب الشیٔ يَصِبُ وُصُوْبًا۔ اذا
دام۔ ومفازةٌ واصِبَةٌ ای بَعِيْدَةٌ
لاغايَة لها، ويقال للعليل واصِبٌ
ليكون ذالك المرض لازمًا لهٗ (کبیر)

تَجْـَٔرُوْنَ : فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ :
تو اسی سے فریاد کرتے رہو (ماجدی)
جَاَرَ۔ جَاْرًا وجُؤَارًا کے معنی تضرع
اور فریاد کرنے کے ہیں۔ اصل میں الجُؤَارُ
کے معنی وحشی اور جنگلی جانوروں کا گھبرا کر آواز
نکالنے اور چیخنے کے آتے ہیں۔ اور پھر بطور
تشبیہ دُعا اور تضرع کے لئے یہ لفظ بولا جاتا
ہے۔ جَاَرَ اِلَى اللّٰهِ، بلند آواز سے دُعا
کرنا۔ گڑگڑانا۔ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ :

آج مت چلاؤ۔ آج شور نہ کرو۔ وَالْجُؤَارُ
فی الاصل صِیَاحُ الوحش واستعمل
فی رفع الصوت بالدعاء والاستغاثۃ
(روح، کشاف، راغب)
واصل الجُؤَارِ۔ رفع الصوت بالتضرع
کما یفعل الثورُ (قرطبی صفحہ ۱۳۷ جلد ۱۲)

ھُوْنٍ : اَیُمْسِکُہٗ عَلٰی ھُوْنٍ اَمْ
یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ۔ لفظ ھُوْنٍ ذلت
رُسوائی کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔
ھَانَ یَھُوْنُ ھُوْنًا، ذلیل ہونا، خوار ہونا
اور ھَانَ ھَوْنًا : سہل ہونا۔ نرم ہونا۔ آسان
ہونا۔ ھَوَّنَ الشَّیْءَ وَاَھَانَہٗ۔ کسی چیز
کو حقیر سمجھ کر اس کی اہانت کرنا۔ رُسوا کرنا۔
ھَوْنٌ بفتح الھاء مصدر ہے۔ اور ھَوْنٌ
وہ رفتار جو باوقار اور نرم ہو جس میں کوئی
اکڑ مکڑ نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے، وَعِبَادُ
الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ
ھَوْنًا۔ اور بندے رحمن کے وہ ہیں جو چلتے
ہیں زمین پر دبے پاؤں (عثمانی)

یَدُسُّ : دَسٌّ مصدر سے واحد مذکر
غائب کا صیغہ ہے۔ یَدُسُّہٗ، اُس کو
چھپا دے، اس کو دفن کر دے۔ دَسِیْسٌ
جاسوس۔ چھپکر سُراغ لگانے والا۔ جس کو
خبر لانے کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔ دَسَّ،
یَدُسُّ، دَسًّا، دسّ الشیَٔ۔ تحت التراب
کسی چیز کو مٹی کے نیچے دبا دینا۔
امام راغب فرماتے ہیں کہ دَسٌّ کے معنی
ایک چیز کو دوسری چیز میں زبردستی داخل
کر دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے دَسَسْتُہٗ
فَدَسَّ، میں نے اس کو ٹھونسا وہ ٹھنس گیا
اور دسٌّ کے معنی بعض کے نزدیک ایک چیز
کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دینے کے بھی
آتے ہیں۔ وَقِیْلَ دَسُّھَا اخفاؤُھا
عن الناس حتی لا تعرف، کالمدسوس
فی التراب لاخفائہ عن الابصار، وھذا
محتمل (قرطبی)

ظُلْمٌ : وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ
بِظُلْمِہِمْ مَّا تَرَكَ عَلَیْھَا مِنْ دَآبَّۃٍ
مولانا اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ ظلم کے
اصل معنی حق تلفی کے ہیں چونکہ شرک و
کفر سب سے بڑی حق تلفی ہے جس کا ارتکاب
کر کے بندہ اپنے رب کے سب سے بڑے
حق کو بھی تلف کرتا ہے اور خود اپنی جان
پر سب سے بڑا ظلم ڈھاتا ہے۔ اسی وجہ
سے قرآن جگہ جگہ کفر و شرک کو ظلم سے تعبیر
کرتا ہے۔ (تدبر)

علامہ راغب فرماتے ہیں کہ اہلِ لغت اور اکثر علماء کے نزدیک ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا۔ اس تعریف کا حاصل بھی حق تلفی ہی نکلتا ہے۔

مُفْرَطُوْنَ : لَاجَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ۔ اِفْرَاطٌ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ فَرَطٌ[۱] اسے کہتے ہیں کہ جو اپنے ساتھیوں سے آگے دوڑ کر انھیں پانی تک پہنچا دے۔ آگے جاکر پانی وغیرہ کا انتظام کرے۔ وہ آدمی جو آگے جاکر دانے پانی کا انتظام کرے اس کو فَارِطٌ کہا جاتا ہے، اس کی جمع فُرَّاطٌ آتی ہے۔ آگے جانیوالے، اس کا مقابل وُرَّادٌ ہے۔ وہ جماعت جو پیچھے آنے والی ہو۔ القطامی کہتا ہے

فَاسْتَعْجَلُوْنَا وَكَانُوْا مِنْ صَحَابَتِنَا
كَمَا تَعَجَّلَ فُرَّاطٌ لِوُرَّادِ

الفَارِط : الذی یتقدم الی الماءِ (قرطبی)،

مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ ان مجرموں کو سب سے آگے جہنم میں بھیجا جائے گا اور اور افراط الشئ کے معنی ہیں کسی چیز کو بھول جانا چھوڑ دینا۔ کہتے ہیں مَا اَفْرَطْتُ مِنْهُمْ اَحَدًا یعنی ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑا اَفْرَطَ الشَّیْئَ، نَسِیَهٗ وَتَرَکَهٗ : اس چیز کو بھلا دیا، چھوڑ دیا۔ یعنی کفار اور مشرکین کو دوزخ میں ڈال کر چھوڑ دیا جائے گا۔ پھر ان کی خبر نہیں لیجائے گی۔ مُفْرَطُوْنَ : متروکون منسیّون (قرطبی)

وقیل منسیون متروکون من اَفْرَطْتُ فلانًا خلفی اذا خَلَّفْتَهٗ وَنَسِیْتَهٗ (کشاف)

اِفْرَاطٌ : آگے بڑھنے میں زیادتی کرنا۔

فَرَطٌ : پہلے سے کام درست کرنے کے لئے روانہ کئے جانے والا۔

اَلْاَنْعَامَ : وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ آیت، ۶۶

اَنْعَامٌ، یہ جمع ہے نَعَمٌ کی جسکے اصل معنی تو نعمت اور خوشحالی اور بہتر حالات کے ہیں۔ اونٹ چونکہ عرب کے نزدیک بہترین مال سمجھا جاتا ہے اور صاحب الابل ہونا خوشحال ہونے کی علامت بھی ہے تو اس اعتبار سے اونٹوں پر نَعَمٌ کا لفظ بولا جانے لگا ہے۔ اسکی جمع انعامٌ ہے۔ بعد میں مزید وسعت دیکر نعم کا اطلاق دیگر مویشیوں بھیڑ بکری اور گائے وغیرہ پر بھی کرنے لگے۔ مگر لفظ انعام دیگر حیوانات پر اسی وقت بولا

[۱] آیت ۶۲

جاتا ہے جب اُنمیں اونٹ شامل ہوں (راغب)

عِبْرَۃٌ : عبرۃ کہتے ہیں معلوم سے مجہول اور مشاہد سے غیر مشاہد تک پہنچنے کو، اور ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کو پہچان لینا یہی درصل عبرت ہے جو علم کی کلید ہے جس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے وہ اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اُن کے لئے ایک دروازہ کھُل جائے تو اُس کی روشنی میں دوسرے دروازے خود کھُلتے چلے جاتے ہیں اور جو لوگ اپنی اس صلاحیت کو کھو دیتے ہیں اُنکی عقل اور بصیرت کی آنکھیں بند ہوجاتی ہیں ان کو سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی کچھ نہیں سوجھتا۔ قال الراغب وَالعِبْرَۃُ۔ مُخْتَصَّۃٌ بِالحَالَۃِ الّتی یتوصّلُ بِھَا مِنْ مَعْرِفَۃِ المُشَاھد اِلیٰ مَالَیْسَ بِمُشَاھِدٍ (مفردات)

عِبْرَۃٌ : اس فکر و بصیرت کو کہا جاتا ہے جو انسان کو جہالت اور حیرت سے نجات دلاتی ہے (فتح القدیر شوکانی) العِبْرَۃ : الدّلالۃ الموصلۃ الی الیقین المودیۃ الی العلم (خازن جلد ۳ صـ۱٦۷)

ہ : مَافِیْ بُطُوْنِہٖ : بُطُونِہٖ کی ضمیر انعام کی طرف راجع ہے۔ لفظ انعام کے جمع مؤنث ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ بُطُونِھَا ہوتا۔ جیسا کہ سورۂ مؤمنون میں اسی طرح نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِھَا فرمایا گیا ہے، امام قرطبی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ سورۂ مؤمنون میں معنی جمع کی رعایت کر کے ضمیر مؤنث لائی گئی ہے اور یہاں سورۃ النحل میں لفظ جمع کی رعایت سے ضمیر مذکر لائی گئی ہے اور محاورات عرب میں اس کی نظیر بے شمار ہیں، کہ لفظ جمع کیطرف ضمیر مفرد راجع کی جاتی ہے اور بعض اہل لغت کے نزدیک لفظ انعام اسم جنس ہے جو مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی۔ اور فرّا کہتے ہیں کہ انعام اور نَعَمٌ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ اور لفظ نَعَمٌ مذکر استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں ھٰذَا نَعَمٌ وَارِدٌ تو بُطُوْنِہٖ کی ضمیر انعام کی طرف ہے جو معنی میں نَعَمٌ کے ہے (قرطبی)

(واللہ اعلم)

فَرْثٍ : جو کچھ جانوروں کی اوجھڑی کے اندر ہوتا ہے اُسے فَرْثٌ کہتے ہیں۔

فَرَثْتُ کَبِدَہٗ : میں نے اُس کے جگر کو پارہ پارہ کر دیا۔ اَفْرَثَ فُلَانٌ اَصْحَابَہٗ، فلاں نے اپنے ساتھیوں کو مصیبت میں ڈال دیا۔ جو بمنزلہ فرث کے تھی یعنی ان پر کمر توڑ اور ریزہ ریزہ کر دینے والی مصیبت ڈالدی۔

أَفْرَتَ الْحُبُّ كَبِدَهٗ ۔ محبت نے اُس کے
دل کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور تَفَرَّتَ الْقَوْمُ
کے معنی ہیں قوم متفرق ہو گئی اور تَفَرَّتَتِ
الْحُبْلٰی۔ حاملہ عورت کا جی متلانا۔ جمع فُرُوثٌ
وَالْفَرْثُ : الزِّبْلُ الذی ینزل الی الکرش
فاذا خرج لم یسم فرثاً (قرطبی) اور
جانور جب فضلہ کو باہر پھینکتے ہیں تو اسکو فرثٌ
نہیں کہا جاتا بلکہ زبلٌ کہا جاتا ہے۔

سَائِغًا : سَائِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ، پینے
والوں کے لئے خوشگوار ہے۔ سَاغَ الشَّرَابُ
فِی الْحَلْقِ کے معنی ہیں شراب یعنی پینے والی
چیز کا حلق سے آسانی کے ساتھ اُتر جلنا اور
سَاغَہٗ کَذا، آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے
اُتارنا۔ وَلَا یَکَادُ یُسِیْغُہٗ ، اُسے آسانی
کے ساتھ حلق سے نہیں اُتار سکے گا۔ قال
القرطبی۔ سَائِغًا : ای لذیذاً ھَیِّنًا لا
یَغُصُّ بِہٖ مَنْ شَرِبَہٗ ، یُقال : سَاغَ
الشَّرَاب یَسُوْغُ سَوْغًا ، ای سھل
مدخلہ فی الحلق (قرطبی)

اَوْحٰی : وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ ،
آیت نمبر ٦٨ ۔ وحی یہاں اپنے اصطلاحی مفہوم
میں نہیں بلکہ لغوی معنی میں ہے وہ یہ کہ متکلم
مخاطب کو کوئی خاص بات مخفی طور پر اس طرح
سمجھا دے کہ دوسرا شخص اس بات کو نہ سمجھ
سکے (معارف)
وحی سے یہاں مراد وہ جبلی اور فطری وحی ہے
جو مخلوق کو اپنے اندر کی ودیعت کردہ صلاحیتیں
استعمال کرنے کے لئے فاطر فطرت و جبلت
کی طرف سے ہوتی ہے (تدبر) یہاں وحی
سے مراد باتفاق علماء الہام ہے ولا خلاف
بَیْنَ الْمُتَأَوِّلِیْنَ اَنَّ الوحی بمعنی الالھام
(قرطبی) واصل الوحی الاشارۃ السّریعۃ
(راغب)

النَّحْلِ : نَحْلٌ : لفظ نحل اسم جنس ہے
مراد اس سے شہد کی مکھیاں ہیں۔ شہد کی مکھی
فہم و فراست اور عقل و تدبر کے لحاظ سے تمام
حیوانات میں ممتاز جانور ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ
نے اس کو خطاب بھی امتیازی شان سے کیا ہے
باقی حیوانات کے بارے میں تو قانون کلی کے
طریقے پر اعطیٰ کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ
ھَدٰی فرمایا، لیکن اس ننھی مخلوق کے بارے
میں خاص کر اَوْحٰی رَبُّکَ فرمایا جس سے اشارہ
اس بات کی طرف کر دیا کہ یہ دوسرے حیوانات
کی نسبت عقل و شعور اور سوجھ بوجھ میں ایک
ممتاز حیثیت رکھتی ہے (معارف)
فرنگی ماہرین فن نے کتابوں پہ کتابیں ان مکھیوں

کی فراست و دانائی اور حُسنِ انتظام و تدبّر پر لکھ ڈالی ہیں۔ قرآنِ پاک نے اُس کی تمام خوبیوں اور سارے کمالات کو اللہ کیطرف منسوب کر دیا ہے (ماجدی)

ذُلُلًا : یہ ذَلُوْلٌ کی جمع ہے جس کے اصل معنی مطیع و منقاد کے ہیں۔ یہاں یہ سُبُل کی صفت ہے۔ اس وجہ سے اسکے معنی ہموار، سیدھے اور پٹے ہوئے راستے کے ہونگے (تدبر)۔ جمع ذلُوْلٍ : هُوَ المنقاد، ای مُطِیْعَةً مُسَخَّرَةً، (قرطبی) فھو جمع ذلُوْلٍ (روح)

اَرْذَل : وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ اور تم میں سے کچھ کو لوٹا دیا جاتا ہے ناکارہ عمر کی طرف جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باخبری کے بعد چیزوں سے بیخبر ہوجاتا ہے اَرْذَلِ الْعُمُرِ، یعنی عمر کی وہ منزل کہ جب نہ قوتِ جسمانی ہی برقرار رہے اور نہ قوتِ دماغی۔ لِکَیْ میں لام، عاقبت یا نتیجہ کا ہے (ماجدی)

رَذَالَةٌ سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ سب سے زیادہ نکما۔ جمع اَرْذَلُوْن اور اَرَاذِلُ آتی ہے، قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ (شعراء) وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (ھود)

اَرْذَلِ الْعُمُرِ۔ اس سے مراد پیرانہ سالی کی وہ عمر ہے جس میں انسان کے تمام جسمانی اور دماغی اُمور مختل ہو جاتے ہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس عمر سے پناہ مانگتے تھے ارشاد ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ سُوْٓءِ الْعُمُرِ وفی روایۃ مِنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ۔ بعض نے اَسّی سال کی عمر کو ارذلِ عمر کہا ہے اور بعض نے نوّے ۹۰ سال کو اور حضرت علیؓ سے پچھتر سال کی روایت بھی ہے (معارف)

کَیْ : لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا، حرف کَیْ، حرف تعلیل ہے۔ فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اَنْ کے مقدر ہونے کی وجہ سے نصب دیتا ہے جیساکہ جَاءَ کَیْ یَسْئَال۔ آیا تاکہ پوچھے یہ مَا استفہامیہ پر بھی داخل ہوتا ہے، جیساکہ کَیْمَا جِئْتَ، تم کیوں آئے۔ اس صورت میں یہ حرفِ جر ہوگا اور وقف کی صورت میں اس کے بعد ھار لائی جاتی ہے جیسا کہ کَیْمَه۔ لَیْمَه۔ اور حرف کَیْ کبھی

مَا مصدریہ پر بھی داخل ہوتا ہے جیسا کہ ایک شعر ہے۔

اذا انت لم تنفع فضرّ فانّما
یُرَجّی الفتی کیما یضرّ و ینفع

ترجمہ: تُو فائدہ رساں نہیں ہوتا تو ضرر ہی پہنچا۔ کیونکہ آدمی سے دو وجہ سے اُمید کی جا سکتی ہے۔ ضرر کے لئے، یا نفع کے لئے (منجد)

نوٹ: حرف کَیْ کبھی کیفَ کا بھی مخفف ہوتا ہے لیکن معنی میں کیفَ ہی کے ہوتا ہے اصل میں حرف کَیْ کسی چیز کا سبب بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ بمعنی تاکہ، اور کَیْلَا اس کی نفی کے لئے جیسا کہ فرمایا کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً (سورۃ الحشر پارہ ۲۸) تاکہ مال ان اغنیاء کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے،

قال الراغب: کَیْ عِلَّۃٌ لِفِعلِ الشیٔ وکیلا لانتفائہ نحو کیلا یکون دُوْلَۃً

مولانا اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ لِکَیْ، کا صحیح حق ادا کیجئے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قدرت کچھ لوگوں کو ارذل العمر تک پہنچا کر یہ حقیقت ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ علم و عقل اور قدرت و اختیار سب خدا ہی کا دیا ہوا ہے۔ وہی انسان جس کو اپنی عقل اور علم پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ خود بھی دیکھ لیتا ہے اور دوسرے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ وہ شیرخوار بچوں کی طرح عقل و علم اور قدرت و اختیار سے بالکل عاری ہو کر رہ گیا ہے اسکو اپنے تن بدن کا کچھ ہوش نہیں رہ جاتا وہ تمام تر دوسروں پر انحصار کرتا ہے اور اپنی ضروریات میں ان کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کی تمام علمی و عقلی صلاحیتیں اسی خدا کی طرف واپس ہو جاتی ہیں جو ان کا اصل عطا کرنیوالا ہے (تدبر) اس آیتِ کریمہ پر علامہ فخر الدین رازیؒ نے نہایت لطیف اور علمی بحث کی ہے، اس کے لئے اہلِ علم تفسیر کبیر صفحہ ۷۴ تا ۷۸ جلد ۱۹ مراجعت فرمائیں۔

حَفَدَۃً: وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً: اور دیئے تم کو تمہاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے (معارف القرآن)

حَفَدَۃٌ: جمع ہے۔ اسکی واحد حَافِدٌ آتی ہے۔ ہر اُس شخص کو حَافِدٌ کہتے ہیں جو تبرّعاً تیزی کے ساتھ مخلصانہ خدمت گذار ہو، چاہے اجنبی ہو یا قریبی رشتہ دار اور نوا سے۔ چونکہ خدمتگذاری میں مخلص

اور صادق ہوتے ہیں اس لئے لفظ حَفَدَۃ، پوتوں اور نواسوں پر بولا جاتا ہے، صاحب مفردات نے اصمعی لغوی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اصل میں حَفْدٌ کے معنی پھرتی اور جلدی کرنا کے ہیں۔ چنانچہ دعا میں ہے وَ اِلَیْکَ نَسْعٰی وَ نَحْفِدُ، ہم تیری طرف دوڑتے ہیں۔ اور سَیْفٌ مُحْتَفِدٌ: قاطع تلوار اور فُلَانٌ مَحْفُوْدٌ کے معنی ہیں فلاں مخدوم ہے۔ حَفَدَ۔ یَحْفِدُ (ض) حَفْدًا او حُفُوْدًا۔ حَفَدَ و اِحْتَفَدَ فی العَمَل۔ کام جلدی کرنا۔ حَفَدَۃٌ خدمت کرنا۔

امام رازی، واحدی کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ حَفَدٌ کے اصل معنی خدمت اور عمل میں نرمی کے ہیں۔ قال الواحدی اصل الحفدۃ من الحفد وھو الخِفّۃُ فی الخدمۃ والعمل۔ والحافد کل من یحف فی خدمتك وَھُوَ یَسْرَعُ فی العمل بِطَاعَتِكَ (کبیر)

پھر اس میں مزید وسعت پیدا کر کے تمام اُن احباب اور رفقاء پر بھی لفظ حفدۃ، کا اطلاق ہونے لگا ہے جو مخلصانہ خدمت کریں۔ اسی سے آدمی کے اُن رشتہ داروں کو بھی حَفَدَۃ کہا جاتا ہے جو اس کی بیوی کی طرف سے رشتہ دار ہوں۔ مثلاً خسر بیوی کا والد اور سالے بیوی کے بھائی وغیرہ۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ حَفَدَۃٌ سے مراد خدام و اعوان ہیں۔

اور حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول صاحب قرطبیؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ قَالَ ھُمُ الاعوانُ، مَنْ اَعَانَكَ فَقَدْ حفدك۔ ابن عرفہ کہتے ہیں کہ الحَفَدَۃ عند العرب الاعوان۔ وقال الخلیل بن احمد، الحفد عند العرب الخدم (قرطبی) اور یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

حفدٌ پھرتی سے کام کرنا، جلدی کرنا، خدمت کرنا، صفتِ فاعلی: حافدٌ خدمت گار، خادم جمع حفدۃٌ، بمعنی خدمتگاران، ایک جملہ حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان ذوالنورین بن عفان کے بارے میں فرمایا کہ اَخْشٰی حَفَدَۃً، کہ مجھے اُن کی کُنبہ پروری کا ڈر ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیسی منکرِ فاروقیت نے بڑی زبردست خباثت کی ہے جو جناب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے حضرت عثمانؓ کو مطعون کرنا چاہتا ہے۔

کَلٌّ : وَهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ : اور وہ اپنے مولا پر وبالِ جان ہے۔ لفظ کَلٌّ کئی معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چُھری تلوار وغیرہ کی پشت، ظلم وسختی، غمِ یتیم، بیکا اور بے فیض آدمی، جس سے کسی فائدے کی اُمید نہ ہو اور سب پر بار ہو۔ آیتِ کریمہ میں یہی معنی مراد ہیں۔ کَلَّ الرَّجُلُ فِیْ مَشْیَتِهٖ : آدمی کا سُست رفتار ہونا، اس کا مصدر کلالٌ آتا ہے۔ اگر اس کا استعمال تلوار اور زبان کی تیزی کم اور سُست ہونے پر کیا جائے تو اس کا مصدر کُلُوْلٌ اور کُلَّةٌ آتا ہے (راغب) کَلٌّ کے معنی اہلِ تفسیر نے ثقل اور بوجھ کے کئے ہیں۔ یعنی یہ غلام بیکار اور بے وفا ہونیکی وجہ سے اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے۔ اسی سے یتیم کو کَلٌّ کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی گویا اپنے ولی پر ایک طرح کا بوجھ ہے، ایک شاعر نے کہا ہے ؎

اَكُوْلُ لِمَالِ الْكَلِّ قَبْلَ شَبَابِهٖ
اذا كانَ عظمُ الكلّ غيرَ شديدِ

یہاں لفظ کَلٌّ سے مراد دونوں جگہ یتیم ہے۔ اسی طرح بے والد اور بے ولد، یعنی جس کے نہ اُصول ہوں نہ فروع اس کو بھی کَلٌّ کہتے ہیں کیونکہ وہ دوسرے کے سہارے پر ہوتا ہے اور چھوٹی اولاد کو بھی کَلٌّ کہتے ہیں چونکہ اس کی نگرانی اور پرورش کا سارا بار والدین پر ہے۔ کُند چُھری کو بھی کَلٌّ کہنے کی یہی وجہ ہے کہ وہ بھی ایک قسم کا بار ہے۔ کَلَّ السِّكِّيْنُ يَكِلُّ كَلًّا اي غَلُظَتْ شِفْرَتُهٗ لَمْ يَقْطَعْ (قرطبی)، كَلٌّ اى ثَقِيْلٌ وعيال (روح)، كَلٌّ، اى ثقل وعيال على من يلى اَمْرَهٗ وَيَعُوْلُهٗ (کشاف)

لَمْحٌ : وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ : اور قیامت کا معاملہ بھی ایسا ہوگا جیسا آنکھ کا جھپکنا، بلکہ اس سے بھی جلد تر، یعنی ایسا ہی آناً فاناً، عام محاورہ انسانی میں کسی چیز کے فی الفور واقع ہوجانے کا طریقِ تعبیر یہی ہے (ماجدی)

اللَّمْحُ : کے معنی بجلی کی چمک کے ہیں محاورہ ہے رَاَيْتُهٗ لَمْحَةَ الْبَرْقِ، میں نے اُسے بجلی کی چمک کی طرح دیکھا۔ لَاُرِيَنَّكَ لَمْحًا بَاصِرًا میں تم کو صاف طور پر دکھادوں گا، تم پر حقیقت کھول دونگا۔ تمہیں واضح طور پر بتا دوں گا۔

لَمْحٌ کا لفظ مشابہت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں فِيْهِ لَمْحَةٌ مِّنْ اَبِيْهِ : اس میں اپنے باپ کی مشابہت ہے۔ مَلَامِحٌ علامت

حُسن اور مشابہت، مَدَامِحُ اَبِیْہ: باپ کی مشابہت، لَمْحٌ مصدر ہے، پلک جھپکنا نظر چُرا کر دیکھنا۔ تیزی سے دیکھنا، وَاللَّمْحُ النظرُ بِسُرْعَۃٍ (قرطبی)

لَمَحَ۔ تَلْمِیْحًا۔ اِلَی الشئ: کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا۔ صیغہ صفت کے لَامِحٌ و لَمُوْحٌ و لَمَّاحٌ آتے ہیں۔ لَمْحَۃٌ ایک نظر حدیث میں ہے اِنَّہٗ کَانَ یَلْمِحُ فِی الصَّلٰوۃِ وَلَا یَلْتَفِتُ۔

جَوِ : مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ: آسمان کی فضا میں مسخر ہیں۔ الجَوُّ۔ زمین آسمان کی درمیانی فضا۔ کشادہ وادی۔ کشادہ میدان جَوُّ البَیْتِ گھر کا اندرونی حصہ۔ جَوُّ المَاءِ زمین کا وہ قطعہ جو پانی کے لئے کھودا جائے۔ جمع جِوَاءٌ اور اَجْوَاءٌ (منجد) الجَوُّ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (قرطبی) الجَوُّ: الھواء (راغب)

ظَعْنٌ : تَسْتَخِفُّوْنَهَا یَوْمَ ظَعْنِکُمْ آیت ۸۰، جنھیں تم اپنے کوچ کے دن ہلکا پاتے ہو۔ ظَعَنَ۔ یظعَنُ۔ ظَعْنًا: کوچ کرنا۔ سفر کے لئے نکلنا۔ ظعنٌ ھَوْدَجٌ کہتے ہیں اس کی جمع اَظْعَانٌ آتی ہے۔ الظعن: سیر البادیۃ فی الانتجاع[1] والتحوّل من موضع الی موضع (قرطبی)

ظَعِیْنَۃٌ : ہودج اور وہ عورت جو ہودج میں سوار ہو۔ اسکی جمع ظَعَائِنُ آتی ہے، سبعہ معلقہ کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

تبصّرْ خَلِیْلِیْ ھَلْ تَرٰی مِنْ ظَعَائِنٍ
تَحَمَّلْنَ بِالعُلْیَاءِ مِنْ فوق جُرْثُمٍ

ترجمہ: اے مرے دوست ذرا غور سے دیکھ کیا تو ان ہودج میں بیٹھنے والی عورتوں کو دیکھتا ہے جو جرثم سے اوپر بلند مقام پر اونٹوں پر بیٹھی ہوئی جا رہی ہیں۔ ہودج پر لفظ ظعن کا اطلاق اسی وقت ہوتا ہے جب اسمیں عورت سوار ہو اور اسی طرح عورت کو ظعینۃ اُسی وقت کہتے ہیں جب وہ ہودج میں بیٹھی ہو۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ بعد میں اسکا اطلاق مطلق عورت پر بھی ہونے لگا ہے اگرچہ وہ ہودج میں نہ ہو۔ صاحب منجد نے لکھا ہے کہ اظعانٌ جمع الجمع ہے۔

اَصْوَافٌ : وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ: اور ان کی اون اور ریشم اور بالوں سے تم سامان اور دیگر مفید چیزیں بناتے ہو۔ اَصْوَافٌ، یَصُوْفُ

---

[1] النجعہ والانتجاع: طلب الکلاء و مساقط الغیث (حاشیہ قرطبی)

کی جمع ہے بمعنی اُون۔ اَخَذَ بِصُوْفَةِ
قَفَاهُ۔ اُسے گدی کے بالوں سے پکڑا۔

اَوْبَارٌ : یہ وَبَرٌ کی جمع ہے۔ اُون جو
اونٹ کے بالوں سے بنتی ہے۔ اور جو لوگ
اون اور ریشم کے خیموں میں رہتے ہیں انھیں
سُكَّانُ الْوَبَرِ کہا جاتا ہے یعنی بادیہ نشین
(راغب)

اَشْعَارٌ : یہ شَعْرٌ کی جمع ہے بمعنی بال
شَعُرْتُ کے معنی بالوں پر مارنے کے ہیں
اسی سے شعرت کذا استعار ہے جس کے
معنی بال کی طرح باریک اور لطیف علم حاصل
کرنے کے ہیں اور عرفِ عام میں موزوں اور
مقفّٰی کلام کو شعر کہا جاتا ہے۔ اسکی جمع
بھی اشعارٌ آتی ہے اور شعر گو کو شاعر کہا
جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے بَلِ افْتَرَاهُ
بَلْ هُوَ شَاعِرٌ۔

اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا : اَلْاَثَاثُ۔ گھر کا
سازوسامان، مال ومتاع۔ اصل میں یہ
اَثَّ يَاُثُّ (ن)، اَثَاثًا واَثُوْثًا و
اَثَاثَةً سے مشتق ہے۔ اَثَّ الشَّعْرُ،
بالوں کا بکثرت ہونا، گنجان ہونا۔ پھر لفظ
اَثَاثٌ ہر قسم کے وافر اور بکثرت مال پر
بولا جانے لگا اور مَتَاعٌ کی طرح اسکا واحد
نہیں، اس کی جمع اثاثٌ آتی ہے۔ نِسَاءٌ
اَثَائِثُ : پُرگوشت عورتیں۔ گویا وافر
سامان کی طرح ان پر گوشت چڑھا ہوا ہے
اور تَأَثَّثَ فلانٌ کے معنی ہیں فلاں بہت
مالدار ہوگیا ہے اور قرآن پاک کی آیت ہے
اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِئْيًا : وہ سامان میں
زیادہ تھے اور خوش منظر تھے۔ صیغہ صفت
کا اثیثٌ ہے۔ امرأة القیس کہتا ہے ؎

وَفَرْعٍ يَزِيْنُ الْمَتْنَ اَسْوَدَ فَاحِمٍ
اَثِيْثٍ كَقِنْوِ النَّخْلَةِ الْمُتَعَثْكِلِ

وہ محبوبہ ایسے بال ظاہر کرتی ہے جو کمر کو
مزین کئے سخت سیاہ اتنے گھنے جیسے پھلدار
کھجور کا خوشہ۔ قال الخلیل اثاثا ای
متاعا منضمًّا بعضُه الی بعضٍ (قرطبی)
الاثاث : انواع متاع البیت مِنَ الفرش
والاکسِیَة، قال الفراء، ولا واحد لهٗ
کما ان المتاع لا واحد لهٗ۔ قال ولو
جمعت فقلت اَثِثَةٌ فی القلیل وَاُثُثٌ
فی الکثیر (کبیر) لفظ اثاث کا مفہوم اصل
میں متاع سے وسیع تر ہے اسی وسعتِ مفہوم
کو بیان کرتے ہوئے فخر الدین رازی رحمہ اللہ
خود فرماتے ہیں کہ الاقرب ان الاثاث
ما یکتسی به المرء ویستعمله فی الغطاء

والوطا والمتاع ما يفرش في المنازل
ويزين به (كبير)

آكْنَانًا : وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْجِبَالِ

آكْنَانًا : آكْنَانٌ یہ کِنٌّ کی جمع ہے، ہر وہ چیز جس میں کسی کو محفوظ کیا جائے۔ كَنَنْتُ الشَّيْءَ كَنًّا، کسی چیز کو کن میں محفوظ کر دیا۔ وَالْكِنَانُ وہ چیز جس میں کوئی چیز چھپائی جائے اسکی جمع اَكِنَّةٌ آتی ہے جیسے غِطَاءٌ کی جمع اَغْطِيَةٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً۔ اُنکے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ كَنَنْتُ، جب ثلاثی مجرد سے آئے تو اس کے معنی کسی مادی چیز کو گھر یا کپڑے وغیرہ میں محفوظ رکھنے کے آتے ہیں۔ جیسے کہ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ اور آكْنَنْتُ جب باب افعال سے آتا ہے تو اس کے معنی دل میں کسی بات کے چھپانے کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ، آیت کریمہ میں اکنان سے مراد پہاڑوں کے غار ہیں، جن میں انسان لڑائی یا بارش وغیرہ سے بچنے کے لئے پناہ لیتا ہے۔ الاكنانُ جمع كِنٍّ، وهو الحافظ مِنَ المطر والريح وغير ذلك وَهِيَ هنا الغِيرانُ فِي الجبال (قرطبی) آكنانًا جمع كِنٍّ، وَهُوَ ما يستكنّ به مِنَ البيوتِ المَنْحُوتَةِ في الجبال والغيران والكهوف (كشاف) واحد الاكنان، كِنٌّ عَلٰى قِيَاسِ اَحْمَالٍ وحِمْلٍ ولكنّ المراد كل شيء وَقٰى شيئا ويقال استكن واكتن اذا صارَ في كِنٍّ (كبير) الكِنُّ ما يحفظ فيه الشيء (راغب)

يُسْتَعْتَبُوْنَ : وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ

آیت ۸۴ ۔ اور نہ اُن سے توبہ لی جائیگی، (معارف) اور نہ اُن سے (اللہ کو) راضی کرنے کی فرمائش کیجائے گی (ماجدی)

اِسْتِعْتَابٌ کے معنی ہیں کسی کا کسی سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اس کی وجہ سے شکایت کو رفع کر کے اس کو راضی کرے۔ یہاں اس سے یہ مراد ہے کہ قیامت میں کافروں اور نافرمانوں سے فرمائش نہیں کی جائیگی کہ وہ خدا کو راضی کرنے کی کوشش کریں اسلئے کہ اُس وقت سعی اور عمل کے دروازے بند ہو چکے ہونگے اور جزا و سزا کا مرحلہ شروع ہو جائے گا (تدبر)

اہل تفسیر نے اسکے دو ترجمے کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اُن سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی

خواہش نہیں کیجائے گی۔ اور بعض دوسرے
مفسرین نے ایک ترجمہ یہ بیان کیا ہے کہ نہ انکے
عذر قبول کئے جائیں گے۔ محلی نے اپنی تفسیر میں
لکھا ہے لایطلب فیہم ان یرضوا ربھم بالتوبۃ
والطاعۃ لانھا لا تنفع یومئذٍ، اُن سے اس
بات کی طلب نہیں کی جائیگی کہ توبہ اور طاعت
کر کے اپنے رب کو رضامند کرلیں کیونکہ اس روز
یہ مفید نہ ہوگی۔ اور صاحب معالم التنزیل بغوی
لکھتے ہیں کہ لَا یُکَلَّفُوْنَ ان یرضوا ربھم لان
الآخرۃ لیست بدار تکلیف، قیامت کے دن
وہ اللہ کو رضامند کرنے کے مکلف نہ ہونگے کیونکہ
دار آخرت دار تکلیف نہیں ہے۔ صاحبِ کشاف
لکھتے ہیں۔ ولا یسترضون ای لا یقال لہم
ارضوا ربَّکُمْ من العتبی وھی الرضاء یعنی لا
یستعتبون کا معنی لا یسترضون ہے مطلب
یہ ہے کہ اُن سے نہیں کہا جائیگا کہ خدا تعالیٰ کو رضامند
کرلو، اور لفظ کا ماخذ عُتبیٰ ہے اور عتبیٰ کے معنی ہیں
رضامندی۔ مولانا عبد الکریم صاحب جِلالی فرماتے ہیں
کہ صاحبِ کشاف کی یہ وضاحت غیر واضح ہے کیونکہ
جب لا یستعتبُون کا ماخذ عُتبیٰ ہے اور عتبیٰ کے معنی
رضامندی کے ہیں تو استِعتاب کا معنی ہوا طلبِ رضا
اس صورت میں بظاہر یہ مطلب نکلے گا کہ اُنکی رضامندی
طلب نہیں کیجائیگی یعنی اُنکی ناراضگی کی پرواہ نہیں کی
جائیگی یعتبیٰ کا معنی رضامند کرنا اور ناراضگی کو دُور
کرنا نہیں ہے کہ زمخشری کا بیان کیا ہوا مطلب ای لا
یُقال لہم ارضوا ربکم مُستفاد ہو سکے۔ اسی
لئے صاحب روح البیان نے لکھا ہے کہ الاِعتاب
ازالۃ العتب ای الغضب وَالغِلظۃ و
الاستعتاب طلب ذالک، یعنی اعتاب کا معنی ہے
ناراضگی کو دُور کرنا۔ اور اِستِعتاب کا معنی ہیں طلب
اعتاب، یعنی ناراضگی کو دُور کرنے کی طلب یعنی
کسی سے خواہش کرنا کہ وہ تیری ناراضگی کو دُور کردے
اور تجھے رضامند بنالے۔ کرمانی نے اس سے زیادہ
واضح طور پر لکھا ہے کہ ھو مشتق من استعتاب
الذی ھو طلب الاعتاب ای لا یطلبون
ازالۃ العتب وھو علی غیر القیاس اذا
لاستفعال انما یبنی من الثلاثی (المجرد)
لا من المزید۔ لا یستعتبون کا مصدر
اِستِعتاب ہے، اور استعتاب کا معنی ہے
طلب اعتاب۔ اعتاب ازالۂ ناراضگی کو کہتے ہیں
یعنی اُن سے اللہ کی ناراضگی کو دُور کرنیکی طلب
نہیں کی جائے گی۔ اعتاب ثلاثی مزید سے
استعتاب کا بنانا غیر قیاسی ہے کیونکہ قیاساً
استفعال کو ثلاثی مجرد سے بنایا جاتا ہے، نہ کہ
ثلاثی مزید سے۔

غالباً زمخشری کے پیش نظر یہی ضابطہ تھا کہ

انھوں نے عتبیٰ ثلاثی مجرد سے استعتاب کو ماخوذ قرار دیا۔ اس سے قیاس کی موافقت تو ہوگئی مگر مطلب بگڑ گیا، کیونکہ عتبیٰ اور اعتاب کا مطلب ایک نہیں ہے۔ اوّل لازم ہے بمعنی رضامند ہونا، دوسرا متعدی ہے بمعنی رضامند بنانا، اور آیت میں مؤخر الذکر معنی مراد ہیں، اور آیتِ کریمہ، وَإِنْ يَسْتَعْتِبُوا فَمَا هُمْ مِنَ الْمُعْتَبِينَ (حٰمٓ السجدہ ۵) اس جگہ صاحبِ کشاف کی تفسیر زیادہ صحیح ہے جس کو محلی صاحبِ جلالین نے بھی ذکر کیا ہے اگر وہ اللہ کے رضامند ہونے کی طلب کریں گے تو ان کی یہ طلب پوری نہ ہوگی۔ یعنی اس جگہ استعتاب عتبیٰ سے بنا ہے جس کے معنی رضامندی کے ہیں۔ اعتاب سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کو رضامند بنانے کی کوشش اور طلب کسی اور سے نہیں کریں گے بلکہ اللہ ہی سے اُس کی رضامندی طلب کریں گے، واللہ اعلم (لغات القرآن)

قال المحلی، لا یطلب منہم العتبیٰ الی الرجوع الی ما یُرضی اللہ (جلالین) قال الرازی، الاستعتاب، طلب العتاب والرجل یطلب العتاب من خصمہ اذا کان علی جزم انہٗ عاتبہٗ رجع الی الرضا فاذا لم یطلب العتاب منہ دل علی انہٗ راسخ فی غضبہ وسطوتہ (کبیر) ای لا یکلفون ان یرضوا ربہم واصل الکلمۃ من العتب وھی الموجدۃ یقال عتب علیہ یعتب (ض) اذا وجد علیہ، فاذا فاوضہ ما عتب علیہ فیہ قیل عاتبہ فاذا رجع الی مسرتک فقد اعتب والاسم العتبیٰ وھو رجوع المعتوب علیہ الی ما یُرضی العاتب (قرطبی) العتب ہر اُس جگہ کو کہتے ہیں جو وہاں اُترنے کے لئے ساز گار ہو نیز دروازہ کی چوکھٹ اور سیڑھی وغیرہ کو بھی عتبۃ کہا جاتا ہے۔ اور جناب ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہے غیّر عُتبۃ بابك میں کنایۃً عورت مراد ہے اور مَعْتَبَۃٌ کے معنی اس ناراضگی اور سختی کے بھی آتے ہیں جو انسان کے دل میں کسی دوسرے کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے اور أَعْتَبْتُ ثلاثاً، ناراضگی ظاہر کرنا۔ دوم ناراضگی پر اُبھارنا۔ سوم ناراضگی کو دُور کرنا، یعنی میں نے فلاں کی ناراضگی کو دُور کر دیا۔ یعنی ہمزہ افعال سلب ماخذ کے لئے ہے۔ اسی سے ہے فَمَا هُمْ مِنَ الْمُعْتَبِينَ، اُن سے عتاب دُور نہیں کیا جائے گا۔

اور اَلْاِسْتِعْتَابُ کے معنی ہیں کسی سے رضامندی کی خواہش کرنا کہ وہ عتاب کو دُور کرکے راضی ہوجائے۔ اَسْتَعْتَبَ فلانٌ کسی سے عتاب دُور کرنے کی خواہش کی اور العتبیٰ اسم ہے بمعنی رضَا لکَ العُتبیٰ، تیرے لئے رضا ہے۔ (راغب) المُعْتَبُ راضی کیا ہوا، اِسْتَعْتَبَہٗ، اس کی رضامندی چاہی

اَلْعَدْلُ

: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ۔ (آیت ۹۰)

عدل سے مراد ہے قوائے علمی و عملی کا اعتدال توسط (ماجدی) عدل یہ ہے کہ جس کا جو حق واجب ہم پر عائد ہوتا ہے ہم بے کم و کاست اس کو ادا کردیں (تدبر) لفظ عدل کا اصلی اور لغوی معنی برابر کرنے کے ہیں۔ اسی کی مناسبت سے حکام یا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عدل کہلاتا ہے۔ قرآن کریم میں اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اسی معنی کے لئے آیا ہے اور اسی لحاظ سے لفظ عدل افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کو بھی کہا جاتا ہے اور اسی کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ لفظ عدل کی تفسیر ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے۔ یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہوں اور باطن میں اس کا وہی اعتقاد ہو۔ اور اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں لفظ عدل اپنے عام معنی میں ہے۔ اور ان سب صورتوں کو شامل ہے جو مختلف ائمہ تفسیر سے منقول ہیں۔

ابن عربی نے فرمایا ہے کہ لفظ عدل کے اصلی معنی برابری کرنے کے ہیں۔ پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہوجاتا ہے مثلاً ایک مفہوم عدل کا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظِ نفس پر اور اس کی رضاجوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے اور اسکے احکام کی تعمیل اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے دوسرا عدل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے وہ یہ کہ اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو، اسکی ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے انجام کار مضر ہوں، اور قناعت

صبر سے بلا وجہ اپنے نفس پہ بوجھ بھی نہ ڈالے تیسرا عدل، اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے۔ اسکی حقیقت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور کسی ادنیٰ یا اعلیٰ معاملہ میں کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لئے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے۔

اسی طرح ایک عدل یہ بھی ہے کہ جب دو فریق اپنے کسی معاملہ کا محاکمہ اسکے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کیطرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے، اور ایک عدل یہ بھی ہے کہ ہر معاملہ میں افراط و تفریط کی راہ ترک کرکے میانہ روی اختیار کرے، ابوعبداللہ الرازیؒ نے اسی معنی کو اختیار کرنے کے بعد فرمایا کہ لفظ عدل میں عقیدہ کا اعتدال، عمل کا اعتدال، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں۔

امام قرطبیؒ نے عدل کے مفہوم میں اس تفصیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ تفصیل بہت بہتر ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کا صرف لفظ عدل تمام اعمال و اخلاق حسنہ کی پابندی اور برے اعمال و اخلاق سے اجتناب کو حاوی اور جامع ہے (معارف)۔

اما العدل فھو عبارۃ عن الامر المتوسط بین طرفی الافراط والتفریط، وذالک امر واجب الرعایۃ فی جمیع الاشیاء (کبیر)

قال ابن عطیہ، العدل: ھو کل مفروض من عقائد وشرائع فی اداء الامانات، و ترک الظلم والانصاف و اعطاء الحق (قرطبی)

اَلْاِحْسَانِ : احسان عدل سے ایک زائد شئی ہے، یہ صرف حق کی ادائیگی ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ مزید برآں یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ دوسروں کیساتھ ہمارا معاملہ کریمانہ ہونا چاہیئے (تدبر)

احسان دو معنی کے لئے آتا ہے، ایک غیر کیساتھ بھلائی کرنے کے لئے، دوسرے کسی اچھی بات کے معلوم کرنے اور نیک کام کے انجام دینے کے لئے (لغات القرآن) الاحسانُ، اس کے معنی اچھا کرنے کے ہیں۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ فعل یا خلق و عادت کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرے۔ دوسرے یہ کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے، اور دوسرے معنی کے لئے عربی زبان میں لفظ احسان کے ساتھ حرف اِلیٰ کا استعمال ہوتا ہے جیسا کہ آیت میں ہے، احسن کما احسنَ

اللّٰہ اِلَیْكَ ، امام قرطبی نے فرمایا کہ آیت
میں لفظ عام مفہوم کے لئے مستعمل ہوا ہے
اس لئے احسان کی دونوں قسموں کو شامل ہے
پھر پہلی قسم کا احسان یعنی کسی کام کو اپنی ذات
میں اچھا کرنا یہ بھی عام ہے۔ عبادت کو اچھا
کرنا، اعمال و اخلاق کو اچھا کرنا، معاملات کو
اچھا کرنا۔ حدیث جبریلؑ میں خود آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلم نے احسان کے جو معنی بیان فرمائے ہیں
وہ احسان عبادت کے لئے ہے۔ اس ارشاد کا
خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح
کرو گویا تم ضرور خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر
استحضار کا یہ درجہ نصیب نہ ہو تو اتنی بات کا یقین
تو ہر شخص کو ہونا چاہیئے کہ حق تعالیٰ اسکے عمل
کو دیکھ رہے ہیں کیونکہ یہ تو اسلامی عقیدہ کا اہم
جزو ہے کہ حق تعالیٰ کے علم و بصر سے کائنات
کا کوئی ذرّہ خارج نہیں رہ سکتا (معارف)

الحَسَنُ ، ہر خوش کُن اور پسندیدہ چیز کو
کہتے ہیں اور اس کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ چیز
جو عقل کے اعتبار سے مستحسن ہو۔ اور دوسرے
یہ کہ خواہشِ نفسانی کی رو سے پسندیدہ ہو۔
تیسرے یہ کہ صرف نگاہ میں بھلی معلوم ہوتی ہو
اور ہر وہ نعمت جو انسان کو اسکے نفس یا بدن یا
کسی حالت میں حاصل ہو کر اسکے لئے مسرت
کا سبب بنے حسنۃٌ کہلاتی ہے، اسکی ضد سیئۃٌ ہے

الاحسان ، یہ باب افعال کا مصدر ہے دو
معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ دوسروں
پر انعام کرنا۔ دوّم یہ کہ اپنے فعل میں حُسن پیدا
کرنا۔ اور یہ چیز حُسنِ عمل اور حُسنِ علم سے پیدا
ہوتی ہے۔

الاحسانُ : مصدر، اَحْسَنَ یُحْسِنُ اِحْسَانًا
ویقال علی معنیین اَحَدُھُمَا متعدٍّ بنفسہٖ
کقولك احسنتُ کذا ای حَسَّنْتُہٗ وکَمَّلْتُہٗ
وھو منقول بالھمزۃ من حسن الشیٔ و
ثانیھما مُتَعَدٍّ بِحَرْفِ جرٍّ کقولك اَحْسَنْتُ
الی فلانٍ ای اوصلتُ الیہِ ماینتفع بہ
(قرطبی)

یہ باب افعال کا مصدر ہے۔ دینا۔ عطا کرنا،
قرآن پاک میں اس کا استعمال بیشتر صدقہ
دینے کے معنی میں ہے۔

اِیْتَاءُ : وَاِیْتَاۗئِ ذِی الْقُرْبٰى : ایتاء
کے معنی اعطاء یعنی کوئی چیز دینے کے ہیں،
لفظ قُربٰی کے معنی قرابت اور رشتہ داری کے ہیں
ذِی القربٰی کے معنی رشتہ دار، ذی رحم، ایتاءِ
ذی القُربٰی کے معنی ہوتے ہیں رشتہ دار کو کچھ دینا
یعنی انکے حقوق کی نگہداشت کرنا۔ جیسا کہ ایک
آیت میں ارشاد ہے، وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ

یعنی دو رشتہ دار کو اسکا حق (معارف)

ایتاءِ ذی القُربٰی اصل میں احسان ہی کی اہم ترین اور افضل ترین شکل ہے۔ اور جب ذاالقُربٰی غریب اور محتاج ہوں تو یہ ایتار واجب بھی ہوجاتا ہے۔

اَلْفَحْشَاءِ : فحشاء ایسی بُرائی کو کہتے ہیں جو کھلی ہو اور صریح ہو۔ یعنی علانیہ پبلک میں کی جاتی ہو۔ اسکے تحت وہ سب بُرائیاں آگئیں جو قوتِ شہوانیہ کی افراط سے پیدا ہوتی ہیں فحشاء، اسم تفضیل ہے واحد مؤنث اسکا مذکر اَفْحَشُ آتا ہے۔ اصل مادہ فُحْشٌ ہے۔ بُرا کام۔ وہ قول وعمل جسکا بُرا ہونا کھلا ہوا ہو۔

عن الفحشاءِ ای عن الافراط فی متابعۃ القوۃ الشھوانیہ (بیضاوی) و (روح) الفحش وھو کل قبیح من قول او فعل (قرطبی) المراد منہ المنع من تحصیل اللذات الشھوانیہ الخارجۃ عن إذن الشریعۃ (کبیر)

اَلْمُنْکَرِ : منکر عام ہے ہر ایسے امر کو جو شعائرِ اسلامی سے باہر ہو۔ اسکے تحت وہ سب معاصی آگئے جو قوتِ غضبیہ کے افراط سے پیدا ہوتے ہیں (ماجدی)

منکر وہ قول وفعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہلِ شرع کا اتفاق ہو اس لئے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جاسکتا (معارف القرآن) اصل میں لفظ منکر، انکارٌ سے اسم مفعول ہے جس کا انکار کیا گیا ہو۔

اشاعرہ کے نزدیک وہ قول و فعل منکر ہے جس کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہو۔ امام قرطبی فرماتے ہیں، المنکر : ما انکرہ الشرع بالنھی عنہ وَھُوَ یَعُمُّ جمیع المعاصی والرذائل والدناءات علی اختلاف انواعھا (قرطبی)

اَلْبَغْیُ : بغی وہ ظلم و سرکشی ہے جسکا ضرر دوسروں تک پہنچے۔ اسکے ماتحت وہ سب حرکتیں آگئیں جو قوتِ وہمیہ کے غلبۂ افراط سے ظاہر ہوتی ہیں (ماجدی) بغی کے اصل معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ مراد اس سے ظلم و عدوان ہے (معارف)

البغی : ھو الکبر والظلم والحقد والتعدّی وحقیقتہ تجاوز الحد (قرطبی) ان تمام الفاظ کی لغوی تحقیق چونکہ پہلے گزر چکی ہے اس لئے یہاں صرف ضروری اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

حدیث میں ہے، یَا بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ وَ یَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَقْصِرْ : اے خیر کے طالب تو آ۔ تجھ کو ثواب ملے گا۔ اور اے بُرائی کے

طلبگار تو باز آ، تیری توبہ قبول ہوگی۔

غَزْلٌ : وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (آیت نمبر ۹۲)

غَزْلٌ، مصدر بمعنی اسم مفعول ہے یعنی کاتا ہوا سوت۔ غَزَلَ۔ يَغْزِلُ۔ غزلاً غَزَلَ الصُّوْفَ، اون کاتنا۔ غَزِلَ غَزَلًا مصدر بفتح الزاء، غَزِلَ بالنساء، عورتوں سے باتیں کرنا۔ عورتوں کی خوبصورتی اور جمال کی تعریف کرنا۔ اُن سے عشق بازی کرنا۔ غَازَلَ الْمَرْاَةَ۔ عورتوں سے پیار و محبت کی باتیں کرنا۔ عشق لڑانا۔ عورتوں کو پھسلانا۔ غَزْلٌ عورتوں سے لہو و لعب کرنا۔ الغزل، ہرن کا بچہ، المِغْزَلُ تکلہ کاتنے کا آلہ، اور الغَزِيْلُ وہ جو عورتوں سے پیار و محبت کی باتیں کرے۔ اور الغَزَّال بہت کاتنے والا۔ مصدر الغزل بمعنی المفعول ای معزولها، والفعل منه غزل یغزل بکسر الزاء (روح)

اَنْكَاثًا : اَنْكَاثٌ۔ اَلنَّكْثُ

کے معنی [illegible] ہوئی چیز کو اُدھیڑنے کے ہیں جیسا کہ کمبل یا سوت [illegible] کپڑا وغیرہ۔ یہ النقض کے ہم معنی ہے اور [illegible] کے معنی میں آتا ہے۔ جیسا کہ وَاِنْ نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ۔ اور اگر وہ اپنی قسمیں توڑ ڈالیں۔ صاحب منجد لکھتے ہیں کہ نکث کے معنی ہیں پرانے ہونے کی وجہ سے ادھیڑا ہوا، تاکہ دوبارہ بنایا جا سکے۔ اس کی جمع اَنْكَاثٌ آتی ہے، النِّكْثُ جمع اَنْكَاثٌ، ما نُقِضَ من الاكسية و الاخبية ليُغْزَلَ ثانية (منجد)

نِكْثٌ بمعنی منكوثٌ ہے۔ حَبْلٌ نِكْثٌ ادھڑی ہوئی رسی۔ نكاثة رسی کا اُدھڑا ہوا سرا۔ النَّكِيْثَةُ نفس، طبیعت، کوشش مشکل کام کہتے ہیں۔ قال قولاً لانكيثة فيه اُس نے ایسی بات کہی جس میں خلاف وعدگی نہیں اور ضَرَبَ فيه نكيثة کے معنی ہیں اُس نے اس میں بے انتہا کوشش کی۔ اور وَقَعُوْا فِي النَّكِيْثَةِ وہ مشکل کام میں پھنس گئے اور ذو نكيثة حسنة اچھی طبیعت والا۔ نَكِيْثَةٌ کی جمع نَكَائِثُ آتی ہے عرب کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے ؎

وَقَرَّبْتُ بِالْقُرْبٰى وَجَدِّكَ اَنَّهٗ
متٰى يكُ اَمْرٌ لِلنَّكِيْثَةِ اَشْهَدِ

اور قرابت کی وجہ سے تیرے بخت کی قسم میں چمٹا رہا [illegible] رشتہ دار مجھ سے بھاگتے رہے۔ جب [illegible] مشکل کام ہوگا میں حاضر ہونگا

اَلنَّقْضُ والنَّكْثُ واحد، والاسم
النِّكْثُ وَالنِّقض والجمعُ الانكاثُ
(قرطبی)

دَخَلًا : تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّةٍ ، کہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دخل دینے کا بہانہ ایک دوسرے میں اس واسطے کہ ایک فرقہ ہو چڑھا ہوا دوسرے سے (معارف)

دَخَلًا ، بہانہ ، دغا، فساد، دراندازی ۔ دَخَلَ یَدْخُلُ کا مصدر ہے۔ اصل میں اس ملاوٹ کو جو فساد کے لئے ہو دَخَلٌ کہتے ہیں۔ اسی لئے قتادہ نے اکی تفسیر خیانت سے کی ہے۔ جیساکہ ابن ابی حاتم نے ان سے روایت کیا ہے۔ اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ كُلُّ شَيْءٍ لَمْ يَصِحَّ دَخَلٌ - جو چیز درست نہ ہو دَخَلٌ ہے (لغات القرآن)

اصل میں الدَّخلُ ، دَغَلٌ کی طرح اندرونی عداوت، فساد یا کسی نسب کا دعویٰ کرنے سے کنایہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے دُخِلَ فُلَانٌ فِیْ عَقْلِهٖ اَوْ جَسَدِهٖ فهو مدخول و دَخِلَ (س) دَخَلًا ۔ یعنی اس کی عقل جسم میں اصل میں خرابی پائی جاتی ہے شَجَرَةٌ مَدْخُوْلَةٌ : اندر سے کھوکھلا درخت ۔ وَالدَّخَلُ كِنَايَةٌ عَنِ الفَسَادِ وَالعَدَاوَة (الراغب) وَالدَّخَلُ وَالدَّغَلُ الخديعة والغش، قال ابوعبيدة، كُلُّ اَمْرٍ لَمْ يَكُنْ صحيحًا فهو دَخَلٌ (قرطبی) دخلٌ مکر، فریب اور فساد (تدبر)

اَرْبٰی : یہ باب نَصَرَ کے مصدر رباً سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے بمعنی زیادہ بڑھنا اور چڑھنا۔ اَرْبٰی زیادہ چڑھا ہوا۔ اَرْبٰی عَلَیْهِ کسی پر بلند ہونا، کسی کی نگرانی کرنا، رَبَّیْتُ الْوَلَدَ فَرَبَا۔ میں نے بچے کی تربیت کی چنانچہ وہ بڑھ گیا۔ الرِّبا۔ اصل میں مال پر جو بڑھوتی کی جائے وہ رِبٰو کہلاتی ہے لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی کو سود کہا گیا ہے جس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ اَرْبٰی: ای اکثر من رَبَی الشیءُ اذا کثُر، یَرْبُوْ
(قرطبی)

تَشْتَرُوْا : وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ، یعنی اللہ کے عہد کو تھوڑی سی قیمت کے بدلے میں نہ توڑو۔ یہاں تھوڑی سی قیمت سے مراد دنیا اور اسکے منافع ہیں۔ ابن عطیہ نے فرمایا کہ جس کام کو پورا کرنا کسی شخص کے ذمہ واجب ہو وہ اللہ کا عہد [illegible] ہے۔ اس کے پورا کرنے پر کسی [illegible]

بغیر لئے نہ کرنا اللہ کا عہد توڑنا ہے، اسی طرح جس کام کا نہ کرنا اُسکے ذمہ واجب ہے کسی سے معاوضہ لیکر اس کو کر دینا بھی اللہ کے عہد کو توڑنا ہے۔

اس معلوم ہوا کہ رشوت کی مروجہ صورتیں سب حرام ہیں۔ جیسے کوئی سرکاری ملازم کسی کام کی تنخواہ حکومت سے پاتا ہے تو اُسنے اللہ سے عہد کر لیا ہے کہ یہ تنخواہ لیکر مفوضہ کام کی خدمت میں پوری کرونگا، اب اگر وہ اسکے کرنے پر کسی سے معاوضہ مانگے اور بغیر معاوضہ اس کو ٹلائے تو یہ اللہ کے عہد کو توڑنا ہے۔ اسی طرح جس کام کا اسکو محکمہ کیطرف سے اختیار نہیں ہے اس کو معاوضہ لیکر کر دینا بھی عہدِ الٰہی کو توڑنا ہے اس معاوضہ کا نام رشوت ہے

رشوت کی تعریف: بحر محیط میں رشوت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے ہاخذ المال علی فعلٍ ما یجب علی الآخذ فعلہٗ او فعلِ ما یجبُ علیہ ترکُہٗ یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے اُسکے چھوڑنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کا چھوڑنا اسکے ذمہ ہے اُسکے کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے (معارف)

یَنفَدُ: مَاعِندَکُمْ یَنفَدُ وَمَاعِندَ اللّٰہِ بَاقٍ، اور جو کچھ تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے۔ نَفِدَ، یَنفَدُ (س) نَفِدًا ونفادًا ختم ہو جانا، مٹ جانا۔ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَالَهٗ مِن نَّفَادٍ، یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہوگا۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

اَلْمَالُ یَنفَدُ حِلُّهٗ وَحَرَامُهٗ
یَوْمًا وَیَبْقٰی فِیْ غَدٍ اٰثَامُهٗ
لَیْسَ التَّقِیُّ بِمُتَّقٍ لِاِلٰهِهٖ
حَتّٰی یَطِیْبَ شَرَابُهٗ وَطَعَامُهٗ

بَاقٍ، یہ بَقَآءٌ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے باقی رہنے والا۔ بَقِیَ۔ یَبْقٰی (س) بقاءً کسی چیز کا اپنی پہلی حالت پر برقرار رہنا، باقی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ باقی بنفسہٖ ہو یعنی قائم بالذات ہو، جس پر کبھی فنا طاری نہ ہو۔ یہ صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے دوسری قسم باقی بغیرہٖ ہے اسمیں تمام ماسوی اللہ شریک ہیں جس کو فنا لازمی ہے، پھر باقی باللہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بشخصہٖ جب تک اللہ چاہے باقی رہے جیسے اجرام

فلکیہ ہیں۔ دوسرے وہ جس کی نوع اور جنس تو باقی رہے مگر وہ خود فنا ہو جائے جیسے انسان اور حیوان۔ اسی طرح آخرت میں بعض چیزیں خود باقی رہیں گی۔ جیسے اہلِ جنت کہ وہ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ بعض ایسی چیزیں جو خود فنا ہو جائیں گی مگر ان کی نوع اور جنس باقی رہے گی۔ جیسے اثمار جنت (لغات القرآن، راغب)

بعض اہلِ لغت کے نزدیک بَقِیَ یَبْقیٰ بُقْیًا ضَرَبَ سے استعمال ہوتا ہے جس کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ حدیث میں ہے بَقَیْنَا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ہم حضورؐ کا انتظار مدت تک کرتے ہیں، اور اَبْقیٰ اِبْقَاءً کے معنی کسی پر رحم کرنے کے ہیں۔ ابقی علیہ اس پر رحم کیا، وکان اَبْقیٰ الرجلین فینا، وہ ان مردوں میں ہم پر زیادہ رحم کرنے والے تھے۔ ایک روایت ہے لا تُبْقِی علیٰ مَن یَضرَعُ اِلَیْہَا۔ دوزخ کے سامنے کتنی ہی عاجزی کرو وہ رحم نہیں کرے گی، قرآن پاک میں ہے لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ، نہ باقی رہنے دیگی نہ چھوڑے گی۔ یعنی رحم کی بنا پر کسی کو جلانے سے معاف نہ کرے گی۔

قَرَأْتَ : فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ، (آیت نمبر ۹۸) قَرَأْتَ، قَرْءٌ سے صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ جب تم قرآن پڑھو، یعنی پڑھنا چاہو۔ اکثر فقہاء اسلام اور محدثین کا یہی قول ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے جب پڑھنے کا ارادہ کیا جائے تو تعوذ پڑھا جائے اسی بناء پر اکثر اہلِ تفسیر نے اذا قرأت کی تفسیر اِذَا اَرَدْتَّ قرأت القرآن سے کی ہے، چنانچہ صاحبِ جلالین لکھتے ہیں ای اَرَدْتَّ قِرَاْتَہٗ اور صاحبِ جمل فرماتے ہیں کہ ھذا علی مذہب الاکثرین من الفقہاء والمحدثین من ان الاستعاذۃ تطلب قبل القرأۃ (جمل) اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اذا اکلتَ فقل بسم اللہ، مطلب یہ کہ جب تم کھانے کا ارادہ کرو تو بسم اللہ پڑھ لیا کرو جبیر بن مطعم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ سمعتُ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حِیْنَ افتتح الصّلوٰۃ، قال اللّٰھُمَّ اِنّی اعوذبك من الشیطان وھمزہ وَنفخِہٖ وَنَفْثِہٖ، اور ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتعوذ فی صلاتہٖ قبل القراءۃ (قرطبی) اور بعض اہلِ علم نے صیغۂ قرارت کی اصل کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعوّذ بعدَ القراءۃ

دوسری بات یہ کہ سَرٰی یا اِسْرٰی کا ان تمام آیات میں روح مع جسد پر اطلاق ہوا ہے۔ یعنی لوط اور موسیٰ علیہما السلام اور انکے متبعین جن کے لئے یہ حکم ہو رہا ہے کہ وہ دشمنوں سے بچکر راتوں رات ان بستیوں (مصر و روم) سے نکل جائیں، ان کا رات کے حصہ میں نکل جانا نہ خواب کی شکل میں تھا اور نہ روحانی طور پر اور نہ رویا کشفی کے طریقہ پر بلکہ عالم بیداری میں روح مع جسد کے تھا۔

پس جبکہ قرآن پاک کے ان تمام اطلاقات میں اسراء کے معنی بغیر کسی تاویل کے قابل تسلیم ہیں تو آیت سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی میں اسریٰ کو روح مع جسد تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اور اس کے تسلیم کرنے میں کیوں پس و پیش ہو اور کس لئے اس واقعہ کو فقط روحانی، منامی یا بَیْنَ النَّوْمِ وَالْیَقْظَۃِ کشفی طریقے کے ساتھ مخصوص کیا جائے جبکہ اس آیت اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا میں ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں جو اسریٰ کو قرآن کے تمام اطلاقات سے جدا معنی پر دلالت یا اشارہ کرتا ہو۔ (قصص القرآن)

بعض حضرات کا قول ہے کہ اسریٰ (باب انعال) سَرٰی یَسْرِیْ سے نہیں ہے جس کے معنی رات کو سفر کرنے کے ہیں بلکہ یہ سُرَاۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی کشادہ زمین کے ہیں اور اصل میں اس کالام کلمہ حرف واؤ ہے اسی سے شاعر کا قول ہے بِسَرْوِ حِمْیَرَ اَبْوَالُ الْبِغَالِ بِہٖ، حمیر کی کشادہ زمین جہاں خچروں کا پیشاب یعنی سیراب نظر آتے ہیں۔ پس اسریٰ کے معنی کشادہ زمین میں چلے جانے کے ہیں۔ جیسے اَجْبَلَ کے معنی پہاڑ میں چلے جانا، اور اَتْہَمَ، تہامہ میں چلے جانا، لہٰذا آیت کریمہ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ کے معنی یہ ہونگے کہ اللہ اپنے بندے کو وسیع اور کشادہ زمین میں لے گیا، اور سراۃ ہر چیز کے اشراف اور اعلیٰ حصہ کو بھی کہتے ہیں اسی سے سَرَاۃُ النہار ہے جس کے معنی دن کی بلندی کے ہیں (راغب) لیکن اہل تفسیر اور اہل لغت کا اجماع ہے کہ اسریٰ سَرٰی۔ یَسْرِیْ ناقص یائی سے ماخوذ ہے جیسا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تحقیق سے معلوم ہو چکا اور اس کے معنی رات کو چلنے ہی کے ہیں۔

اسریٰ کے معنی شب میں سفر کرنے

کا قول نقل کیا ہے - امام مالک اور بعض صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے - اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب تم قراءت کر چکو تو تعوذ پڑھ لیا کرو۔

لیکن ترجیح پہلے ہی قول کو ہے کہ تلاوت سے قبل استعاذہ ہونا چاہئے چنانچہ امام جصاص لکھتے ہیں کہ معناہ اذا قرأت فقدم الاستعاذۃ قبل القراٰن وحقیقۃ معناہ اذا اردت القراٰن فاستعذ (جصاص) صاحب تفسیر مدارک لکھتے ہیں ای اذا اردت قراءۃ القرآن فعبر عن ارادۃ الفعل بلفظ الفعل لانھا سبب لہ - قرآنی محاورات میں یہ اسلوب بیان عام ہے - مثلاً ذقلتم فاعدلو اسی طرح اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی نجوٰکم صدقۃ ان سب موقعوں پر ارادہ فعل کو فعل کے قائم مقام کی حیثیت دی گئی ہے۔

مُفْتَرٍ : قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ (آیت نمبر ۱۰۱) مفترٍ باب افتعال کے مصدر افتراء سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اس کا مادہ فَرْیٌ ہے۔ اصل میں مفترٍ مُفْتَرِیٌ تھا، حرف یاء کو حذف کر دیا گیا۔ فَرْیٌ کا معنی ہے درست کرنے کے لئے چمڑے کو تراشنا اور افتراءٌ (افتعال) کے معنی ہیں چمڑے کو تراشنا۔ خواہ خراب کرنے کے لئے ہو یا درست کرنے کے لئے، عام طور پر اسکا استعمال خراب کرنے کے معنی میں ہوتا ہے اور قرآن مجید میں اس کا استعمال شرک، ظلم اور کذب کے معنی میں ہوا ہے، ومن یشرک باللّٰہ فقد افترٰی اثما عظیما (راغب) مُفْتَرِیْ اپنی طرف سے بنا کر پیش کرنے والا، اپنے باطل نظریات و افکار کو پروان چڑھانے کے لیے قرآن و حدیث کی تاویل کرنے والا بھی مفتری ہے اور مُفْتَرٰی اسم مفعول افتراء سے، از خود ساختہ من گھڑت۔ مُفْتَرٍ: ای کاذب مختلق (قرطبی) مُفْتَرٍ. مُتَقَوِّلٌ (روح)

القُدُس : قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۔ روح القدس سے مراد یہاں جبریل امین ہیں، سابقہ الہامی کتب نے بھی یہ مبارک لقب ذکر کیا ہے اور عیسائی عقیدہ کا اقنوم ثالث ہے۔

القُدُس: اسم مفعول اور مصدر ہے، پاکی اور پاک ہونا۔ آیت میں صیغہ صفت کے معنی میں ہے موصوف کو صفت کی طرف شدت لزوم کی بنا پر مضاف کر دیا گیا ہے۔ یعنی روحٌ مقدس۔ وجعلہ بعض محققین

من اضافۃ الموصوف للصفۃ علی جعلہ
نفس القدس مبالغۃ نحو خبر سوء
و رجلُ صدق (روح)
والقدُس: الطہارۃ المراد بہ اسم
المفعول والاضافۃ من اضافۃ الموصوف
لصفۃ ای الروح القدس ای المطہر
(جمل) بعض اہلِ لغت نے القُدُس حرف
دال کے سکون سے بھی نقل کیا ہے۔

یُلْحِدُوْنَ: لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ
اِلَیْہِ اَعْجَمِیٌّ وَّھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ
یُلْحِدُوْنَ، باب افعالٌ کے مصدر الحاد
سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اِلْحَادٌ کے
معنی راہِ حق و صواب سے ہٹ جانے کے ہیں
اور مُلْحِدٌ کو اسی لئے مُلحدٌ کہتے ہیں کہ وہ راہِ
حق اور تمام ادیان سے ہٹا ہوا ہوتا ہے (ماجد)
لَحِدَ یَلْحَدُ (س) والحدَ الحادًا، دونوں
کے معنی راہِ حق سے ہٹ جانے کے ہیں۔
اللَّحْدُ: المیل، یقال لَحِدَ والحدَ ای
مال عن القصد (قرطبی) بعض قرار نے
یَلْحَدُوْنَ (بفتح الحاء) پڑھا ہے۔
لَحَدَ (ف) المیّتَ لَحْدًا: میت کو
دفن کرنا۔ لَحَدَ اللَّحْدَ و لَحَدَ لِلْمَیِّتِ
میت کے لئے لحد کھودنا۔

لَحَدَ السَّہْمُ عَنِ الْھَدَفِ: تیر کا نشانے
سے ایک طرف ہو کر گرنا۔ نشانہ خطا کرنا
لَحَدَ اِلٰی فلانٍ۔ کسی کی طرف مائل ہونا،
اور اَلْحَدَ (افعال) اِلحادًا: المیّتَ
مُردے کو دفن کرنا۔ اَلْحَدَ عن الدّین دین
سے پھرنا، دین میں کوئی راہ اختیار کرنا، جو
اصل میں دین نہ ہو۔ شریعت سے غیر ثابت
اُمور کو دین کی بنیاد بنا لینا، دین میں عیب لگانا
اِلْتَحَدَ (افتعال) عن الدین دین سے
پھرنا۔ الحاد اختیار کرنا۔ اِلْتَحَدَ اِلٰی کذا
کسی کی پناہ لینا۔ اسی سے مُلْتَحِدٌ ہے۔
جائے پناہ، اور یہ مصدر میمی بھی ہے بمعنی
پناہ۔ قرآن پاک میں ہے، وَلَنْ تَجِدَ مِنْ
دُوْنِہٖ مُلْتَحِدًا۔ اس کے سوا پس کہیں
بھی جگہ نہ ملے گی۔ امام راغب لکھتے ہیں یہ
مصدر میمی بمعنی التحاد بھی ہو سکتا ہے اور
اسم ظرف بھی۔

لَحْدٌ اور لُحْدٌ بغلی قبر کی ایک جانب
کا وہ گڑھا جس میں میت کو رکھا جاتا ہے۔
اس کی جمع اَلْحَادٌ اور لُحُوْدٌ آتی ہے، مُلْحِدٌ
جمع مَلَاحِدَۃٌ و مُلْحِدُوْن۔ کج رو،
زندیق، غلط اور بے دین نظریات کا مبلغ۔
ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی

درمیان سے ہٹ کر ایک طرف ہوجانے کے بیان کئے ہیں۔ یدل علی میلٍ عن استقامۃٍ (مقائیس) اَلْحَدَ الرجلُ، اذا مال عن طریقۃ الحق یعنی آدمی کا راہِ حق سے مڑجانا۔ لَحَدَ اِلَیْہِ، وہ اس کی طرف مڑ گیا، مائل ہوگیا۔ الاِلْحَاد کے معنی ہوتے ہیں راست روی کو چھوڑ کر ظلم کی طرف مائل ہونا، اور الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا (فصلت۔۴۰) جو لوگ ہماری آیات میں کجروی اختیار کرتے ہیں علمائے محققین نے لکھا ہے کہ یہ وعید ان تمام باطل فرقوں کو اپنے چنگل میں لئے ہوئے ہے جو آیات قرآنی کے معنی گھڑ گھڑ کر اور مسخ کر کر کے بیان کرتے ہیں۔

پوری اُمتِ اسلامیہ کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن پاک کی آیات کے جو معنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں۔ ان کو ترک کر کے تاویلات و تحریفات کی راہ اختیار کرنا الحاد ہے اسی طرح روایات اور اجماع صحابہ کو نظر انداز کر کے تفسیر آیات کا مدار صرف لغت عرب اور اشعار پر رکھ دینا بھی بے دینی ہے، اہلِ تفسیر نے اس کی تصریح کی ہے کہ ہر نص اپنے ظاہر ہی پر محمول ہوگی تاوقتیکہ کوئی دلیل قطعی تاویل کی مقتضی نہ مل جائے۔ منکرین نبوت کی ظلّی اور بروزی اور منکرین حدیث کی مرکزِ ملت اور نظام ربوبیت کی اصطلاحات اسی الحاد کا ثمرہ ہیں اسی طرح ذاتی اور عطائی کا چکر بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔

اَعْجَمِیٌّ : عُجْمَۃٌ کے معنی ابہام اور اخفاء کے ہیں اور یہ اَبَانَۃٌ کی ضد ہے، جس کے معنی واضح اور بیان کر دینا کے ہیں، اعجامٌ کے معنی مبہم کر دینا کے ہیں اِسْتَعْجَمَتِ الدار گھر سُونا اور خاموش ہوگیا۔ اس میں کوئی جواب دینے والا نہ رہا۔ العَجَمُ غیر عرب کو کہتے ہیں اور عَجَمِیٌّ اس کی طرف منسوب ہے عرب قوم چونکہ نہایت زبان آور اور فصیح اللسان تھی اس لئے اُس نے اپنا نام عرب رکھا اور اپنے ماسوا دوسری اقوام و ممالک لوگوں کو اس نے عَجَمٌ کا نام دیا، یعنی غیر فصیح، لیکن سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ صرف نکتہ آفرینی ہے۔ دنیا میں ہر قوم اپنی زبان کی اسی طرح جوہری ہے جس طرح عرب (ارض القرآن) اَعْجَمُ صیغہ صفت، رَجُلٌ اَعْجَمُ اور اِمْرَاَۃٌ عَجْمَاءُ، جو اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔ اصل عرب ہر اُس شخص کو اعجم کہتے ہیں جو کلام پر قادر نہ ہو اور مافی الضمیر کو پوری فصاحت سے

ظاہر نہ کر سکے، چاہے وہ عربی ہو یا غیر عربی، الاعجم الذی فی لسانہ عجمۃ وان کان من العرب۔ مگر عجمی یا اعجمی اُسی کو کہیں گے جس کی اصل غیر عرب ہو یعنی عجمی ہو۔ اسی سے حیوانات کو عجماءُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ناطق کی طرح الفاظ کے ذریعہ اپنی مراد کا اظہار کرنے پر قادر نہیں۔ اور اعجمتُ الکلام کے معنی ازالۂ ابہام کے بھی آتے ہیں، جیسا کہ اَشکَیتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسکی شکایت کو دُور کر دیا۔ اعجمتُ الکتاب، میں نے کتاب کے ابہام کو دُور کر دیا (قرطبی۔ راغب۔ منجد)

اُکرِہَ : مَنْ کَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ۔ اِکْرَاہٌ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو ایسے قول یا فعل پر مجبور کیا جائے جس کے کرنے پر وہ راضی نہیں۔ پھر اُسکے دو درجے ہیں، ایک درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ دل سے تو اس پر آمادہ نہیں مگر بے اختیار اور بے قابو بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے۔ یہ انکار فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ غیر ملجئ کہلاتا ہے ایسے اکراہ سے کوئی کلمۂ کفر کہنا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا۔ البتہ بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔

دوسرا درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ مسلوب الاختیار کر دیا جائے۔ اگر وہ اکراہ کرنے والوں کے کہنے پر عمل نہ کرے تو اُس کو قتل کر دیا جائیگا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ ملجئ کہلاتا ہے جسکے معنی ہیں ایسا اکراہ جو انسان کو مسلوب الاختیار اور مجبور محض کر دے ایسے اکراہ کی حالت میں کلمۂ کفر زبان سے کہہ دینا بشرطیکہ قلب ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے۔ اسی طرح دوسرے انسان کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی فعل کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو اس پر بھی گناہ نہیں۔

مگر دونوں قسموں کے اکراہ میں شرط ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس پر قادر بھی ہو اور جو شخص مبتلا ہے اسکو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اسکی بات نہ مانوں گا تو جس چیز کی دھمکی دے رہا وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا (معارف بحوالہ مظہری)

والاکراہُ یقال فی حمل الانسان علی ما یکرھہٗ (راغب) اُکْرِہَ اُس پر زبردستی کی گئی۔ یہ اکراہٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے اور آیت کریمہ لَآ اِکْرَاہَ

فی الدین - یہاں لفظ اکراہ باب افعال
کا مصدر ہے - مطلب یہ ہے کہ دین و ایمان
کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے جبر و زبردستی
جاری نہیں فرمائی بلکہ اس کو انسان کے اختیار
پر چھوڑا ہے کیونکہ دلائل رشد و ہدایت
اور کفر و ضلالت میں بخوبی امتیاز ہو چکا ہے
اب انسان کو خود اختیار ہے کہ جونسی راہ
کو چاہے اپنائے قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ

لَا جَرَمَ : لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ، (آیت نمبر ۱۰۹)

لاجرم کے معنی لابد اور لا محالہ کے ہیں -
اصلاً تو یہ کسی بات کی تاکید کے لئے آتا ہے
لیکن موقع مقتضی ہو تو اسکے اندر ایک قسم
کا زور بھی پیدا ہو جاتا ہے (تدبر القرآن)

لاجرم، یقیناً اور حقاً کے ہم معنی ہے -
اصل میں اس کا معنی لا محالہ تھا توسیع استعمال
کے بعد قسم یا حقّ فعل ماضی کے معنی میں مستعمل
ہونے لگا سیبویہ کا یہی قول ہے - مدارک
میں خلیل کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی
گئی ہے - فقال الخلیل وسیبویہ
لاجرم بمعنی حق، گویا ان دونوں بزرگوں
کے نزدیک لاجرم ایک مکمل کلمہ ہے، فراء
اور محمد بن یزید کا بھی ایک قول یہی ہے

لیکن قرآء کا ایک قول یہ نقل ہوا ہے کہ لاجرم
لابد اور لا محالہ کے معنی میں ہے خلیل سے بھی
ایک قول اسی طرح منقول ہے (قرطبی)

زجاج کہتے ہیں کہ لاجرم میں حرف لا
نفی کے لئے ہے جس سے اہل کفر و شرک کے باطل
نظریات کی تردید مقصود ہے - اور انکے ان باطل
مزعومات کا انکار کرنا ہے کہ ماسوی اللہ سے
شفاعت آخرت کی توقع ہے کیونکہ اہل شرک
کا عقیدہ یہ تھا کہ انکے اصنام انکی نفع رسانی
کرتے ہیں اس صورت میں لاجرم ایک مرکب
کلمہ ہوگا - لا اور جرم سے تو حرف لا کے معنی
ہونگے لَا يَنْفَعُهُمْ ذالك ، اور جرم بمعنی
کسب کے ہوگا اور اس کا فاعل مضمر ہوگا -
تقدیر کلام یوں ہوگی کَسَبَ ذالك الْفِعْلُ
لَهُمُ الْخُسْرَانَ ، اور انّ جرم کی وجہ سے
منصوب ہوگا - تفسیر ابو سعود میں لا کو
نافیہ اور جرم کو فعل ماضی بمعنی حق قرار دیا ہے
مطلب یہ کہ اس فعل کا غیر مفید ہونا حق ہے
بعض کے نزدیک لاجرم، بمعنی لا صدّ و لا منع
ہے - یعنی کوئی ممانعت اور رکاوٹ نہیں کوئی
روک نہیں سکتا - امام قرطبی نے یہ قول کسائی
کی طرف منسوب کیا ہے -

الجرم : کے اصل معنی درخت سے پھل

کاٹنے کے ہیں۔ جَرَمَ النَّخْلَ وَاجْتَرَمَہٗ
ای صَرَمَہٗ ۔ صفت فاعلی کا صیغہ جَارِمٌ
آتا ہے۔ جمع جِرَامٌ ، جُرَّامٌ اور جُرُمٌ آتی ہے
رَجُلٌ جَارِمٌ قوم جُرَّمٌ وجُرَّامٌ ۔ پھل کاٹنے
کے موسم کو زمن الجِرام وَالْجَرَامِ کہا
جاتا ہے جَرَمْتُ صوف الشاۃ ، میں نے
بکری سے اون اتاری ۔ جَرْمٌ کے اصل
معنی کسی چیز کو کاٹ دینے یا اس پر سے کسی چیز
کو ہٹا کر ننگا کر دینے کے ہیں جیسے درخت کا
چھلکا اُتار کر ننگا کر دینا ۔

الجَرْمُ : القطع (قرطبی) قال ابن کثیر
لاجرم ای لابد ولا عجب ان من ھذہ
صفتہٗ انھم فی الاخرۃ ھم الخٰسرون
(ابن کثیر) قال الفرّاء ، انّ لاجرم ،
بمنزلۃ قولنا لابد ولا محالۃ ، ثم کثر
استعمالھا حتی صارت بمنزلۃ حقًا ،
تقول العرب لاجرم انک محسن (جمل)

جَہَالَۃٍ : عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَہَالَۃٍ

اس آیتِ کریمہ میں لفظ جہالت استعمال فرمایا
ہے ، جہل نہیں فرمایا ۔ جہل تو علم کے بالمقابل
آتا ہے اور بے علمی بے سمجھی کے معنی میں ہے ۔
اور جہالت کا لفظ جاہلانہ حرکت پر بولا جاتا ہے
اگرچہ جان بوجھ کر کرے (معارف)

اُمَّۃً : اِنَّ اِبْرٰہِیْمَ کَانَ اُمَّۃً
قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا ، بے شک ابراہیم بڑے
مقتدا اللہ کے فرمانبردار اور اس کی طرف رُخ
کرنے والے تھے (ماجدی) لفظ اُمت چند معنی
کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ مشہور معنی قوم اور
جماعت کے ہیں ۔ حضرت ابن عباس سے اس
جگہ یہی منقول ہے اور مراد یہ ہے کہ ابراہیم
علیہ السلام تنہا ایک فرد ، اُمت اور قوم کے
کمالات و فضائل کے جامع ہیں ۔ ای قائمًا
مقام جماعۃ فی عباد اللہ (راغب)

ای کان وحدہٗ امۃ من الامم لکمالہ
فی جمیع صفات الخیر (کشاف) اور اس
آدمی کو جو اُمورِ خیر کا جامع ہو اُمۃ کہا جاتا ہے ،
والامۃ : الرجل الجامع للخیر (قرطبی)
اس طرح مقتدائے قوم کو بھی لفظ اُمت سے
موصوف کر دیتے ہیں ۔ ابو عبیدہ لغوی نے یہی
معنی مراد لئے ہیں ۔

جناب ابراہیم علیہ السلام چونکہ ہر صفتِ
کمال میں امام ہیں اس لئے ذاتِ حق تعالٰی نے
اُمۃ کا خطاب عطا کیا ہے جیسا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ
لِلنَّاسِ اِمَامًا سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر صفتِ
کمال اور عمل حسن میں دُنیا کے پیشوا ہیں ، حضرت
ابراہیم علیہ السلام کے مقتدا ہونے پر پوری دُنیا

کے تمام مذاہب اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ کی ملت کے اتباع کو عزت و فخر جانتے ہیں یہود و نصاریٰ اور مسلمان تو اُن کی عزت و تکریم کرتے ہی ہیں۔ مشرکینِ عرب بت پرستی کے باوجود اس بُت شکن کے مقتدار اور اُن کی ملت پر چلنے کو اپنا فخر جانتے ہیں۔

قَانِتًا: یہ القنوت سے صفت کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں عبادت میں ہمہ تن مصروف ہو کر ماسوی اللہ سے توجہ پھیر لینا، صفت قانتٌ جناب ابراہیم علیہ السلام کا ایک وصف خاص ہے۔ کہ دُنیا کی ہر چیز کو رضائے الٰہی پر قربان کر دیا،

حَنِيفًا: ہر مذہب و دین باطل سے ہٹ کر دینِ حق کی طرف جھکے ہوئے اور اس پر ثابت اور قائم۔ مائلاً عن دین باطل الی الدّین الحق غیر زائل عنہ (روح) اصل میں حَنَفٌ کے معنی گمراہی سے حق و استقامت کی طرف مائل ہونے کے ہیں اس کا مقابل جَنَفٌ آتا ہے حق اور استقامت سے گمراہی کی طرف جھکنا۔ الحَنِيف: وہ جو باطل کو چھوڑ کر حق پر آجائے۔ تَحَنَّفَ کے معنی راہِ حق کی تلاش کرنا۔ الحَنَفُ، ھو میل عن الضلال الی الحق والاستقامة

وَالْجَنَفُ مَيْلٌ عن الاستقامة الی الضلال۔ والحنیف ھو المائل الی ذٰلک (راغب) یہ آیت کریمہ ایک طرف تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شانِ انفرادیت کا اظہار کر رہی ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی طرح نہیں اور نہ ہی ان میں سے کسی سے انکا کوئی واسطہ ہے بلکہ ان سب سے الگ ایک حنیف اور مسلم تھے۔ دوسرے انکی جامعیتُ مرکزیت کا اظہار کر رہی ہے جو اللہ ربّ العزّت نے ان کو عطا فرمائی تھیں اسلئے وہ صرف ایک فرد ہی نہیں بلکہ ایک عظیم اُمّت کے بانی تھے اور تمام صفاتِ کمالیہ اور اعمال حسنہ کے جامع خود ایک اُمت کے قائم مقام تھے۔

علامہ رشید رضا مصری، المنار میں لکھتے ہیں کہ الحنیف فی اللغة المائل یعنی حنیف لغت عرب میں مائل ہونیوالے کو کہتے ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حنیف اس لئے کہا گیا کہ اُن کے زمانہ میں لوگ شرک و کفر میں مبتلا تھے، اُنہوں نے ملک و وطن اور شاہی اور آبائی دین ترک کر کے دینِ توحید کو اختیار کیا، اور تمام ادیانِ باطلہ سے اعلانِ برارت فرمایا۔ (المنار صفحہ ۳۸۲ ج ۱۴)

اُدْعُ : اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ؕ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلائیے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کیجئے پسندیدہ طریقے سے (ماجدی)

ادع ، دَعْوَۃٌ سے امر حاضر کا صیغہ ہے جس کے معنی بلانے اور مانگنے کے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا پہلا فرض منصبی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے۔ پھر تمام تعلیمات نبوت و رسالت اسی دعوت کی تشریحات ہیں۔ قرآن پاک میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خاص صفت داعی الی اللہ ہونا ہے جیسا کہ ارشاد ہے وداعیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وسراجًا منیرًا (احزاب آیت نمبر ۴۶) اور یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ (احقاف آیت نمبر ۳۱) اُمت پر بھی آپ کے نقش قدم پر دعوت الی اللہ کو فرض کردیا ہے۔ سورۂ عمران میں ارشاد ہے، وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ ۔ تعبیر میں کبھی اس لفظ کو دعوت الی اللہ کا عنوان دیا جاتا ہے اور کبھی دعوت الی الخیر کا عنوان دیا جاتا ہے اور کبھی دعوت الی سبیل اللہ کا، حاصل سب کا ایک ہی ہے کیونکہ اللہ کی طرف بلانے سے اُس کے دین اور صراط مستقیم ہی کی طرف بلانا ہے۔

اَلْحِکْمَۃُ : لفظ حکمت قرآن کریم میں کئی معانی کے لئے استعمال ہوا ہے اس جگہ ائمہ تفسیر نے حکمت سے مراد قرآن کریم اور بعض نے قرآن و سنت دونوں کو مراد لیا ہے۔ بعض نے کہا ہے حکمت سے مراد یہاں حجتِ قطعیہ اور دلائل و براہین ہیں۔ اور روح المعانی نے بحوالہ بحر محیط حکمت کی تفسیر یہ کی ہے کہ انھا الکلام الصواب الواقع من النفس اجمل موقع یعنی حکمت اس درست کلام کا نام ہے جو انسان کے دل میں اُتر جائے اس تفسیر میں تمام اقوال جمع ہوجاتے ہیں، اور صاحب روح البیان نے بھی تقریبًا یہ ہی مطلب ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعہ انسان مقتضیات احوال کو معلوم کرکے اُس کے مناسب کلام کرے وقت اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب پر بار نہ ہو۔ نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی

جگہ سختی اختیار کرے اور جہاں یہ سمجھے کہ صراحۃً کہنے سے مخاطب کو شرمندگی ہوگی وہاں اشارات سے کلام کرے۔ یا کوئی ایسا عنوان اختیار کرے کہ مخاطب کو نہ شرمندگی ہو اور نہ اس کے دل میں اپنے خیال پر جمنے کا تعصب پیدا ہو (معارف)

اَلْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ :

المَوْعِظَۃُ اور وَعْظ کے معنی ہیں کسی خیر خواہی کی بات کو اس طرح کہنا کہ اس سے مخاطب کا دل قبولیت کے لئے نرم ہوجائے۔ مثلاً اس کے ساتھ قبول کرنے کے ثواب و فوائد اور نہ قبول کرنے کے نقصانات و مضرات اور عذاب و مفاسد سے آگاہ کیا جائے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اگر دعوت دلائل قطعیہ کے ساتھ ہو تو حکمت ہے، اور دلائل ظنیہ سے ہو تو موعظۃ حسنۃ ہے۔ مَوْعِظَۃٌ اور عِظَۃٌ اسم مصدر ہیں بمعنی نصیحت اور وَعْظٌ مصدر ہے نصیحت کرنا۔ مَوْعِظَۃٌ مصدر بھی ہے (لغات القرآن)

جَادِلْ :

یہ مُجَادَلَۃٌ سے امر کا صیغہ ہے۔ جَادِلْہُمْ، تو اُن سے مناظرہ کر، تو ان سے جھگڑا کر۔ اس جگہ مجادلہ سے مراد بحث و مناظرہ ہے اور بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ سے مراد یہ ہے کہ اگر دعوت میں کہیں بحث و مناظرہ کی ضرورت پیش آجائے تو وہ مباحثہ بھی اچھے طریقے سے ہونا چاہیئے۔ گفتگو میں لطافت اور نرمی ہو۔ دلائل ایسے پیش کئے جائیں جو بآسانی سمجھ سکے۔ دلائل میں وہ مقدمات پیش کئے جائیں جو مشہور و معروف ہوں (معارف القرآن)

ضَیْقٍ :

وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ (آیت نمبر ۱۲۷)

ضَیْقٌ تنگ ہونا۔ یہ ضَاقَ۔ یَضِیْقُ کا مصدر ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ ضِیْقَۃٌ کا استعمال فقر۔ بخل۔ غم اور اسی طرح کے معنی میں ہوتا ہے۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ ضَیْقٌ یہ ضَیْقَۃٌ کی جمع ہے۔ اعشیٰ شاعر کہتا ہے

فلئن ربك من رحمته
کَشَفَ الضَّیْقَةَ عَنَّا وَفَسَحْ

ترجمہ:

جمہور نے لفظ ضَیْقٌ کو بفتح الضاد پڑھا ہے اور ابن کثیر نے بکسر الضاد۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ فتح اور کسرہ دونوں لغت ہیں

اور دونوں لغات مصدر میں ہیں۔ اخفش کہتے ہیں کہ ضَیْقٌ اور ضِیقٌ دونوں ضاقَ یضیقُ کے مصدر ہیں۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سینہ اُن کے کفر سے تنگ نہ ہو۔ اور فراء کہتے ہیں کہ ضَیقٌ وہ چیز ہے جس کی طرف سے دل تنگ ہو۔ اور ضِیقٌ وہ ہے جس میں تنگی اور وسعت دونوں ہو سکیں۔ جیسے گھر۔ مکان اور ثوبٌ وغیرہ اور ابن السکیت نے کہا ہے کہ ضَیقٌ اور ضِیقٌ دونوں برابر ہیں۔ کہا جاتا ہے، فِی صدرہٖ ضِیق وَضَیْقٌ، اور ابن عرفہ کا کہنا ہے کہ ضاق الرجل کے معنی ہیں بخل کرنا اور اَضَاقَ (افعال) کے معنی ہیں کہ آدمی فقیر اور بدحال ہو گیا اضاقَ الرجلُ آدمی محتاج ہو گیا۔ اور القتبی کہتے ہیں کہ ضیقٌ اصل میں ضَیِّقٌ کا مخفف ہے جیسے هَیْنٌ مخفف ہے هَیِّنٌ کا (قرطبی) ضیق میں حزن۔ غم اور ملال کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا (سورۂ ہود آیت ۷۷) انکے آنے سے غمناک اور تنگدل ہوئے، وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ، اُن پر زمین تنگ ہو گئی۔

بحمدہٖ تعالیٰ سُورۃ النحل مکمل ہوئی وللہ الحمد والمنۃ
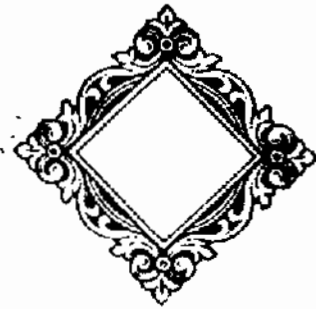
شرح الفاظ القرآن من سورۃ بنی اسرائیل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحٰنَ : سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی ،

پاک ذات ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو راتی رات مسجدِ حرام سے مسجد اقصٰی تک (ماجدی)

سُبْحَانَ : وہ ذات ہر نقص اور کمی سے پاک ہر عجز سے منزّہ اور قید اور حد بندی سے بالاتر۔ تسبیح کا لفظ لایا ہی ایسے موقع پر جاتا ہے جہاں کسی امر عظیم الشان کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ فالتسبیح انما یکون عند الامور العظام (ابن کثیر)

علامہ جلال الدین سیوطیؒ الاتقان میں لکھتے ہیں کہ سبحانَ مصدر ہے اور یہ بمعنی تسبیح آتا ہے۔ اس کے لئے دو چیزیں لازم ہیں۔ ایک منصوب ہونا اور دوسرا مضاف ہونا، مضاف خواہ اسم مفرد ظاہر کی طرف ہو، جیسے سبحانَ اللّٰہ (اللہ پاک ہے) اور سُبْحَانَ الذی اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ یا اسم ضمیر کی طرف مضاف ہو جیسے سُبْحَانَہٗ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ۔ اسی طرح سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا صاحبِ اتقان فرماتے ہیں کہ سُبحانَ ان مصادر میں سے ہے جن کا فعل مُردہ کر دیا گیا ہے وھو ممّا اُمِیْتَ فعلُہٗ یعنی ان کا فعل کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اور کرمانی کی عجائب میں ہے کہ یہ غریب ہے، یعنی اوپری سی بات ہے اس کا فاعل مُردہ کر دیا گیا ہو جو کہ مفضّل نے بیان کیا ہے کہ سبحانَ سَبَّحَ کا مصدر ہے کہ جب دعا کرے اور ذکر کے لئے اپنی آواز بلند کرے اور یہ شعر پیش کیا ہے ؂

قَبَّحَ الْاِلٰہُ وُجُوْہَ تَغْلَبَ کُلَّمَا
سَبَّحَ الْحَجِیْجُ وَکَبَّرُوْا اھلا لا

اللہ تغلب کے چہروں کو بُرا کرے جب حاجی بلند آواز سے تکبیر کہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ سبحانَ مصدر کا فعل مستعمل ہے اور ارباب افعال نے اس کو بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ سَبَّحَ کا مخفف ہے جیسے شَکَرَ۔ شُکرانًا ہے اور ایک جماعت نے اس کو بھی جائز قرار دیا،

کہ اس کا فعل سبّح (تفعیل) ہو مگر انمیں سے بعض حضرات نے اسکی تصریح کی ہے کہ یہ بعید از قیاس ہے، کیونکہ اسکی کوئی نظیر موجود نہیں ہے (لغات القرآن) امام قرطبی فرماتے ہیں کہ سُبْحَانَ اِسم ہے جو مصدر کی جگہ پر رکھا گیا ہے اور یہ غیر متمکن ہے۔ چونکہ اس پر نہ تو اعراب جاری ہوتے ہیں اور نہ الف لام داخل ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی فعل جاری ہوتا ہے۔ اور نیز چونکہ اس کے آخر میں الف نون زائدتان ہے اس لئے یہ غیر منصرف ہے۔ کہتے ہیں سَبَّحْتُ تَسْبِیْحًا وَسبحَانًا، مثل کفرت الیمین تکفیرًا وکفرانًا (قرطبی)

علامہ مجد الدین فروز آبادی نے قاموس میں سُبْحَانَ کو معرفہ لکھا ہے۔ یعنی وہ اس کو تسبیح کا عَلم جنس بتاتے ہیں جیسے برّۃ گندم کا عَلم جنس ہے۔ اور جمہور اہلِ تفسیر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ رازی فرماتے ہیں سُبْحَانَ، اسمُ عَلَمٍ لِلتَّسبیح یُقال سبّحتُ اللہ تسبِیْحًا وسُبْحَانًا فالتّسبیح ھو المصدر وسبحان اسم عَلَمٍ للتّسبیح کقولك کفرت الیمین تکفیرًا وکفرانًا (کبیر)

اسی طرح صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ جیسے طرح عثمان آدمی کے لئے اسم اور علم ہے، اسی طرح سُبْحَانَ تسبیح کا علم ہے۔ علم للتّسبیح کعثمان للرجل (کشاف)

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ سبحانَ جب تسبیح و تنزیہ کے لئے علم بن کر استعمال ہوتا ہے تو اضافت سے منقطع ہوتا ہے کیونکہ اعلام قیاسًا مضاف نہیں ہوتے اور یہ علمیت اور زیادتان کی وجہ سے غیر منصرف بھی ہوتا ہے، جیسا کہ اس شعر میں ہے ؎

قد قلت لما جاءَنِیْ فخرہٗ
سبحَان مِن عَلْقَمَۃ الفَاخِرِ

میرے پاس جب علقمہ کے فخر کی خبر پہنچی تو میں نے کہا سبحانَ اللہ علقمہ بھی فخر کرتا ہے لیکن رضی نحوی کہتے ہیں کہ اس کی علمیت پر کوئی دلیل نہیں چونکہ لفظ سبحان اکثر مضاف استعمال ہوتا ہے۔ اور جب اضافت سے منقطع ہوتا ہے تو اس کی اضافت معنوی ہوتی ہے، جیسا کہ اس شعر میں ہے ؎

سُبْحَانَہٗ ثُمَّ سُبْحَانًا نَعُوْذُ بِہٖ
وَقَبْلَنَا سَبَّحَ الجُوْدِیُّ الجَمَدَ

اور کبھی اس پر الف لام بھی داخل ہوتا ہے جیسا کہ سبحانک اللّٰھُمَّ ذُو السُّبْحَانِ علامہ راغب فرماتے ہیں کہ سُبْحَانٌ اصل میں غفران کی طرح مصدر ہے، چنانچہ آیت کریمہ ہے فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ، اور یہ شعر سُبْحَانَ مِنْ عَلْقَمَۃ الفاخر، بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں "سُبْحَانَ علقمۃ" ہے۔ اسمیں حرف مِنْ اضافت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ اور یہ زائد ہے، اور علقمہ کی طرف سبحان کی اضافت بطور تہکم ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں سُبْحَانَ مِنْ اَجَلِ عَلْقَمَۃ ہے۔ اس صورت میں اس کا مضاف الیہ محذوف ہوگا (راغب)

امام فخر الدین رازی صاحب نظم کے حوالہ سے رقمطراز ہیں کہ التسبیح کے معنی لغت میں دور تک نکل جانے کے ہیں۔ اور اس پر قرآن کریم کی یہ آیت دلالت کرتی ہے اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا، ای تباعدًا تو سبّح اللہ کے معنی ہونگے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام ان صفات سے دور اور منزہ سمجھا، جو اسکی ذات کے لئے مناسب نہیں۔ سَبَّحَ الرجل، آدمی کا معاش وغیرہ کی تلاش میں دور تک نکل جانا اور سَبَّحَ فِی الکلام، بہت کلام کرنا۔ یعنی اعتدال کی حد سے دور نکل جانا۔ صاحب منجد نے بھی سبحانَ کو مصدر قرار دیا ہے۔ اور لفظ سبحان تعجب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے سبحان من کذا، تعجب ہے اس بات سے اور اَنْتَ اَعْلَمُ مَا فِیْ سُبْحَانَكَ یعنی جو کچھ تمہارے دل میں ہے اُسے تم ہی بہتر جانتے ہو۔

علامہ عبدالحیٔ لکھنوی فرماتے ہیں کہ لفظ سُبْحَانَ کی تحقیق میں اہلِ علم کے اقوال مضطرب ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سَبَّحَ لازم کا مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے سَبَّحَ الماءُ سُبْحَانًا اذا ذھب الماءُ فی الارض والعمق، مجدالدین فیروزآبادی نے قاموس میں اور دیباچہ کشاف میں اسی کو اختیار کیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ تسبیح کے لئے ہمیشہ عَلَم ہے۔ اور یہ علم جنس ہے۔ جیسا کہ اسامۃ للاسد۔ ان حضرات نے اعشیٰ شاعر کے اس مصرعے سے استدلال کیا ہے سبحان من علقمۃ الفاخر۔

اس سے وجہ استدلال یہ ہے کہ یہاں لفظ سبحان، غیر منوّن استعمال ہوا ہے۔

جیساکہ روایت و درایت دونوں سے
معلوم ہوتا ہے اور یہ مضاف بھی نہیں جو
کہ مانع تنوین ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس کا
علم ہونا بھی متعین ہے اور غیر منصرف بھی،
کیونکہ اس میں علمیت اور الف نون زائدتان
موجود ہیں۔ لیکن یہ عَلَمِ شخص نہیں بلکہ علم جنس ہے،
فثبت انّ سبحان علم ولکنہ لیس
شخص بل ھو علم جنس (السعایہ)
اس قول پر ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر لفظ
سبحان کے لئے علمیت لازم ہوتی تو یہ مضاف
نہ ہوتا جبکہ اس کے لزوم کی نفی پر خود لفظ
سبحان اللہ دال ہے۔ علمیت کے قائل
حضرات نے اسکے کچھ جوابات دینے کی کوشش
کی ہے۔ ایک یہ کہ علم کی اضافت اسوقت
ممنوع ہوتی ہے جب اس سے معنی وصفی
کو زائل کر دیا جائے۔ لیکن جب معنی وصفی
باقی ہوں تو اضافت جائز اور درست ہے
اور اسکی نظیر اہل لغت کا یہ قول ہے کہ اعلام
کتب پر الف لام داخل کرنا جائز ہے جیسا
کہ الوقایہ، الہدایہ والنہایہ۔ اس لئے کہ
ان میں معنی وصفی موجود ہیں۔ دوسرا
جواب ان حضرات کی طرف سے یہ بھی دیا
گیا ہے کہ علم کو نکرہ بنا دینے کے بعد
اضافت درست ہو جاتی ہے جیسا کہ جَاءَنِیْ
اَحْمَدُکُمْ۔ میرے پاس تمہارا احمد آیا،
احمد معرفہ اور غیر منصرف بھی، لیکن چونکہ
اس میں معنی نکرہ کے پیدا کئے گئے ہیں اسلئے
اضافت جائز ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ سبحان اسم مصدر ہے
بمعنی التسبیح ہے اور یہ علم نہیں ہے۔ قاضی
بیضاوی نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور اپنی
عادت کے مطابق علامہ زمخشری کے نظریہ
کی تردید کی طرف اشارہ کر دیا ہے چونکہ زمخشری
سبحان کو عَلَم مانتے ہیں اور سبحان کے اسم
مصدر ہونے کو متقدمین و متأخرین میں سے
ایک بڑی جماعت نے اختیار کیا ہے واختار
کونہ اسم مصدر جمع من المحققین
ممّن قبلہ ومن بعدہٗ ایضًا۔

باقی رہا یہ کہ اعشی کے شعر کا کیا جواب بنے گا
جس میں لفظ سبحانَ کا عَلَم اور غیر منصرف
ہونا مفہوم ہوتا ہے تو اس کا ایک جواب تو
یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مضاف الیہ مقدر ہے
یعنی اس کی اصل سبحان اللہ ہے لیکن اس
جواب میں ایک واضح کمزوری ہے۔ کیونکہ
مضاف الیہ مقدر ماننے کی صورت میں
مضاف کو مبنی بر ضمہ ہونا چاہئے۔ یا پھر

مُنَوَّن ہونا چاہیئے۔ اور جہاں ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت بھی نہ ہو تو مضاف الیہ کو مقدر نہیں مانا جاتا۔

اور دوسرا جواب اسم مصدر کے قائلین نے یہ دیا ہے کہ شعر میں لفظ سبحان کا عدم انصراف ضرورتِ شعری کی وجہ سے ہے۔ دوسری بات یہ بھی کہی ہے کہ لفظ سبحان اصل میں علقمہ کی طرف مضاف ہے، لیکن یہ دونوں جوابات بھی کمزور ہیں۔ علامہ محمد بن ابی بکر بن عمر الدمامینی، المنہل الصافی شرح الوافی میں فرماتے ہیں کہ ابن حاجب نے اس کی تصریح کی ہے کہ لفظ سبحان تسبیح بمعنی تنزیہ کے علم ہے۔ اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ جب یہ مضاف ہوتا ہے تو علم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اعلام کی اضافت نہیں ہوتی۔ اور ابن حاجب کی یہ تصریح محل نظر ہے۔ چونکہ علم کیلئے اضافت تعریف مانع ہے جیساکہ زید المعارک، جب اس کو اُمت میں سے ایک فرد واحد کا علم قرار دیا جائے۔ لا علی التعیین یعنی کسی کی تعیین نہ ہو تو یہ نکرہ ہوگا۔ کان العلمیۃ انما تنافیھا اضافۃ التعریف کما زید المعارک حیث یُؤَوَّل العلم بواحد من الامۃ فیکون نکرۃً۔

لیکن اضافت بیانیہ جیساکہ حاتم طی تو یہ اضافت جائز ہے۔ سبحان اللہ میں اضافت بیانیہ کیوں جائز نہیں ہوسکتی۔

مولانا عبد الحیٔ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نہایت تعجب کی بات ہے۔ کیونکہ سبحان اللہ میں اضافتِ بیانیہ کیونکر ممکن ہوسکتی ہے وھذا العجیب جلّ افانہ کیف یمکن الاضافۃ فی سبحان اللہ بیانیۃ

اس طویل بحث کے بعد فرماتے ہیں کہ اس باب میں قابلِ قبول بات قاضی بیضاوی کی ہے جو انھوں نے سورۃ بنی اسرائیل میں لفظ سبحان کی تحقیق میں اختیار کی ہے۔ لفظ سُبحان اگرچہ سَبَّحَ کا مصدر ہے جیسے غُفران، غَفَرَ کا مصدر ہے۔ مگر یہ استعمال میں اسم بمعنی تسبیح ہے۔ جیسے کفران، تکفیر کے لئے بمعنی اسم ہے۔ اور کبھی تسبیح کے لئے علم بن کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ لفظ سُبحان ہمیشہ علم ہوتا ہے جیساکہ اعشی کے شعر میں ہے اس وقت یہ اضافت سے منقطع ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ لفظ سُبحان ہمیشہ علم ہوتا ہے یہ بھی صحیح نہیں۔ اور یہ کہنا کہ یہ ہمیشہ اسم مصدر ہوتا ہے یہ بھی درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ کبھی سُبحان علم ہوتا ہے اور کبھی اسم مصدر،

یہیں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ عوام جو اپنے بچوں کا نام عبدالسبحان کھتے ہیں یہ بالکل بے معنی ہے۔علماء پر واجب ہے کہ عوام کو اس نام سے منع کریں۔ چونکہ عبودیت اسماء الٰہی میں سے کسی کی طرف مضاف ہوتی ہے اور لفظ سبحان نہ تو اللہ کا اسم ہے اور نہ ہی وصف بلکہ یہ مصدر ہے، السعایہ (صفحہ ۱۶۳ تا ۱۶۴ جلد ۲)

سبحانٌ ، سبحان اللہ کہنا جیسے تسبیح ، اصل میں تسبیح کا معنی ہے پاکی بیان کرنا، اور سُبحانَ اللہ کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی ہر عیب سے پاکی بیان کرتا ہوں۔

اَسْرٰی : اَسْرٰی بعبدہٖ ، لفظ اسریٰ کا اصل مادہ سَ رَ یَ ہے۔ اور یہ سریٰ یسری سے ماخوذ ہے۔ لغت میں جس کے معنی ہیں رات میں چلنا۔ سریٰ یسری (مص) سُرًی و سَرِیَۃً (الخ) سار لیلاً (منجد) یعنی سریٰ یسری سَرِیَۃً میں سری کے معنی ہیں وہ رات کو چلا اور اسریٰ کے معنی بھی شب میں چلا کے آتے ہیں۔

اسریٰ اسراءً : سار لیلاً (منجد) یعنی اسریٰ کے معنی ہیں رات کو چلنا۔ یہی معنی اقرب الموارد و قاموس، لسان العرب اور تمام کتب لغت میں بصراحت مذکور ہیں اور اگر اسی لفظ اَسْریٰ کو متعدی بنانا چاہتے ہیں۔ یعنی رات کو لیجانا ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو حرف باء تعدیہ کی بڑھا دیتے ہیں، اس موقع کے علاوہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اسریٰ اور اس کے مشتقات آتے ہیں، ان تمام مقامات میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورۂ ہود میں حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ میں ہے فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ تو اپنے لوگوں کو کچھ رات رہے (یہاں سے) لے نکل۔ یہ آیت سورۂ دخان میں بھی موجود ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے۔ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ ، اور بلاشبہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو لے جا۔ اور سورۃ شعراء میں ہے وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ، اور یہی آیت سورۂ دخان میں بھی موجود ہے ان تمام آیات میں لفظ اسراء اس سیر اور چلنے کو کہتے ہیں جو رات میں پیش آئے اس لئے دن یا شام کے چلنے پر اسریٰ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

کے ہیں اور جب بؔ کے ذریعہ متعدّی
ہو جائے تو اس کے معنی ہیں شب میں کسی کو
کہیں لیجانے کے ہیں اگرچہ اس کے مفہوم میں
شب میں نکلنے یا لیجانے کا مفہوم خود داخل ہے
لیکن عام استعمال میں یہ لفظ کبھی کبھی اس
مفہوم سے مجرد ہو جاتا ہے اس وجہ سے
لیلاً کی قید سے اس بات کو مؤکد کرنا مقصود ہے
کہ یہ واقعہ شب میں پیش آیا ہے۔ (تدبر)
اَسْریٰ، اِسْرَاءٌ سے مشتق ہے جس کے
معنی رات کو لیجانا ہیں (معارف القرآن)
والاسراء: سَیْرُ اللَّیْلِ یُقَالُ سَرَیْتُ مَسْرًی
وسُرًی وَاَسْرَیْتُ اِسْرَاءً،
قال الشاعر:
ولیلۃ ذات ندًی سَرَیْتُ
وَلَمْ یَلِتْنِیْ من سُرَاھا لَیْتُ
وقیل: اسریٰ۔ سارَ من اوّل اللّیل
وسریٰ سار من اٰخِرِہٖ (قرطبی)
لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسریٰ اور سریٰ
دونوں کے معنی ایک ہیں قال اھل اللغۃ
اَسْریٰ وسَریٰ لغتان (کبیر)
وَالاسراء السَّیْرُ بِاللَّیْلِ خاصۃ کالسُّریٰ
فاسریٰ وسریٰ بمعنی (روح)
وَالاسراء قیل ھو سیر اللیل یقال
سریٰ واَسْریٰ۔ کَسَقٰی۔ وَاَسْقٰی لغتان
وقد جمع بینھما الشاعر فی قولہ وھو
حسان بن ثابت:
حَیِّ النَّضِیْرَۃَ رَبَّۃَ الْخِدْرِ
اَسْرَتْ اِلَیْکَ وَلَمْ تَکُنْ تُسْرِیْ
(فتح القدیر) اسریٰ وسریٰ بمعنی
(بیضاوی)

اَلْمَسْجِد: مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ، (آیت نمبر۱)

مسجد حرام سے مراد خانہ کعبہ کی مسجد ہے
یہی وہ پہلا گھر ہے جو زمین پر بندگانِ خدا
کی عبادت کے لئے بنایا گیا۔ اَوَّلُ بَیْتٍ
وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا،
حضرت ابوذر رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت
کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے تو
آپ نے فرمایا کہ مسجد حرام اور اس کے بعد
مسجد اقصیٰ ہے اور دونوں کی تعمیر میں تقریباً
چالیس سال کا وقفہ ہے (رواہ مسلم)
اوّل مسجدٍ وضع فی الارض المسجد الحرام
ثمّ المسجد الاقصٰی (قرطبی)
المسجد الاقصٰی، مسجد اقصیٰ سے مراد

وہ مسجد ہے جس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے زمانے میں جنوں کے ذریعہ از سرِ نو تعمیر کرایا، مسجد اقصیٰ کا تعارف قرآن پاک نے دو صفتوں سے کرایا ہے۔ ایک لفظ اقصیٰ دوسرے اَلَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ۔ اقصیٰ کے معنی ہیں دور والی مسجد اقصیٰ، مسجد حرام کے باشندوں سے جو اس کلام کے مخاطب اوّل ہیں کم و بیش چالیس دن کی مسافت پر یروشلم میں تھی اس وجہ سے اس کو مسجد اقصیٰ کی صفت سے موصوف فرمایا۔ اصل میں القصیٰ کے معنی ہیں بُعد اور دُوری اور بعید کو قَصِیٌّ کہا جاتا ہے۔ قَصَوْتُ عَنْہُ کے معنی ہیں، میں اس سے دُور رہا۔ اور اَقْصَیْتُہٗ (افعال) کے معنی ہیں، میں نے اُسے دُور کیا۔ المکان الاقصیٰ دُور دراز جگہ، قرآن مجید میں ہے وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَۃِ یَسْعٰی۔ اور اقصیٰ قصا سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے، سُمّی الاقصیٰ لبُعْدِ مَا بَیْنَہٗ وبین المسجد الحَرام (قرطبی)

ووصفہ بالاقصیٰ ای الابعد بالنسبۃ الی من بالحجاز (روح المعانی)

وسمّی بالاقصیٰ لبُعْدِ الْمَسَافَۃِ بَیْنَہٗ وبین مسجد الحرام (کبیر)

حَوْلُ : اَلَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ۔

یہ مسجد اقصیٰ کی دوسری صفت ہے جس سے مقصد اس زمین کی طرف اشارہ کرنا ہے جہاں پر یہ مسجد واقع ہے اور لفظ حَوْل سے مراد پوری سرزمین شام ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش سے دریائے فرات تک مبارک زمین بنائی ہے اور اس میں فلسطین کی زمین کو خاص تقدس عطا فرمایا ہے۔ یہ اس سرزمین کی روحانی اور مادی دونوں قسم کی زرخیزیوں کی طرف اشارہ ہے، قدیم صحیفوں میں اس سرزمین کو شہد اور دودھ کی سرزمین کہا گیا ہے جو اس کی انتہائی زرخیزیوں کی تعبیر ہے۔ روحانی برکات کے اعتبار سے اس کا جو درجہ تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جتنے انبیاء کا مولد و مدفن ہونے کا شرف بیت المقدس کو حاصل ہے اتنا کسی دوسری زمین کو نہیں لفظ حول کی لفظی تحقیق سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے،

حَوْلَہٗ، اس کے آس پاس، اس کے ارد گرد

بیت المقدس کی تعمیر: حق تعالیٰ نے جن کو ایسی مخلوق بنایا ہے جو مشکل سے مشکل اور سخت

سے سخت کام انجام دے سکتی ہے، اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ ارادہ فرمایا کہ مسجد (ہیکل) کے چار طرف ایک عظیم الشان شہر آباد کیا جائے اور مسجد کی تعمیر بھی از سرِ نو کی جائے ان کی خواہش یہ تھی کہ مسجد اور شہر کو بیش قیمت پتھروں سے بنوائیں اور اس کے لئے بعید سے بعید اطراف سے حسین اور بڑے بڑے پتھر منگوائیں، ظاہر ہے کہ اس زمانے کے رسل و رسائل کے محدود اور مختصر وسائل سلیمان علیہ السلام کی خواہش کے لئے کافی نہیں تھے اور یہ کام جن ہی انجام دے سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے یہ کام جنوں کے ہی سپرد کیا۔ چنانچہ وہ دُور دُور سے خوبصورت اور بڑے پتھر جمع کر کے لاتے اور بیت المقدس کی تعمیر کا کام انجام دیتے تھے

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلم و بخاری کی صحیح مرفوع حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، یا رسول اللہ! دنیا میں سب سے پہلی مسجد کونسی ہے، تو آپؐ نے فرمایا، مسجد حرام حضرتِ ابوذر نے پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، اس کے بعد پھر کونسی مسجد عالم وجود میں آئی، آپؐ نے فرمایا، مسجدِ اقصیٰ۔ حضرت ابوذرؓ نے تیسری مرتبہ دریافت کیا کہ ان دونوں مسجدوں کے درمیان مدت کتنی ہے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چالیس سال کی مدت ہے حالانکہ حضرت ابراہیمؑ بانیٔ مسجد حرام اور حضرت سلیمانؑ کے درمیان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ کا فاصلہ ہے۔ اس لئے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے مسجد حرام کی بنیاد رکھی اور وہ مکہ کی آبادی کا باعث بنی اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی مسجد بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور اس کی وجہ سے بیت المقدس کی آبادی وجود میں آئی۔ پھر عرصہ دراز کے بعد حضرت سلیمانؑ کے حکم سے مسجد اور شہر کی تجدید کی گئی اور جنوں کی تسخیر کی وجہ سے بے نظیر اور شاندار تعمیر عالم وجود میں آئی جو آج تک لوگوں کے لئے باعثِ حیرت ہے (قصص القرآن صفحہ ۱۰۶ ج ۲)

وَكِيْلًا : لَا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا (آیت نمبر ۲) وکیل کے معنی کارساز معتمد اور اس ذات کے ہیں جس پر کامل بھروسہ کر کے اپنے معاملات اس کے حوالہ کر دیئے جائیں (وکیلا) رَبًّا تَكِلُوْنَ اِلَيْهِ اُمُوْرَكُمْ

(کشاف) والوکیل : من یوکل الیہ الامر (قرطبی) وکیل : کارساز، نگہبان وَکُلٌ سے صفت مشبّہ کا صیغہ ہے۔

ذُرِّیَّۃَ : ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ، اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا، لفظ ذُرِّیَّۃ ـ منصوب بحرفِ ندا ہے۔ اصل میں یُوں ہے، یَا ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ، ای یا ذُرِّیَّۃَ علی النداء (قرطبی)

بعض قراء نے ذُرِّیَّۃٌ بھی پڑھا ہے یعنی مرفوع ۔ اس صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگا ۔ اور تقدیر کلام یُوں ہوگی ھُوَ ذُرِّیَّۃٌ بعض حضرات اَلَّا تَتَّخِذُوْا کو حرف یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے ، اور ذُرِّیَّۃٌ کو یَتَّخِذُوْا کی ضمیر سے بدل قرار دیا ہے (روح) اسی طرح اس کے نصب میں بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہی کہ حرفِ ندا کا یہ منادی مضاف ہونے کی وجہ سے منصوب ہو جس کو اکثر اہلِ تفسیر نے اختیار کیا ہے اور دوسری صورت یہ کہ اعنی محذوف کا مفعول ہو ای اعنی ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ

قَضَیْنَا : وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ : قَضَیْنَا کے بعد الیٰ کا صلہ عربیت کے قاعدے سے اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اَبْلَغْنَا یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ یعنی ہم نے فیصلہ کرکے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے آگاہ کر دیا تھا،

امام رازی فرماتے ہیں کہ حرف اِلٰی یہ اِیحاءٌ کا صلہ ہے کیونکہ قضینا اَوْحَیْنَا کے معنی میں ہے (وقضینا) ای اعلمناھم واخبرناھم بذالك وَاَوْحَیْنَا الیھم ولفظ الیٰ، صلۃ للایحاء، لان معنی قضینا ۔ اوحینا الیھم کذا (کبیر)

قضینا، قضاءٌ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے قضی یقضی قضاءٌ، الشیءَ کسی شے کو مضبوطی کے ساتھ بنانا۔ ضرورت کو پورا کرکے فارغ ہو جانا۔ قضی الرجل نحبہٗ آدمی اپنی زندگی کے دن پورے کرکے فارغ ہو گیا (یعنی مرگیا) قضی وطرہٗ) وہ اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ واصل القضاء الاحکام للشیءِ والفراغ منہ (قرطبی)

امام راغب فرماتے ہیں کہ یہاں قضاءٌ سے مراد قطعی طور پر اطلاع دینے اور حکماً فیصلہ کر دینے کے ہیں۔ فھذا قضاءٌ بالاعلام والفصل فی الحکم (راغب)

بَعَثْنَا : فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلٰلَ الدِّيَارِ (آیت ۵)
بعثٌ کا صلہ جب حرف علیٰ آتا ہے تو اسکے معنی اُبھارنے اور اُکسانے کے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ مسلّط کر دینا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہوتا ہے بَعَثَهٗ عَلَى الشَّيْءِ : اُس نے اس کو کسی کام کے لیے اُکسایا۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ : وَاَصْلُ الْبَعْثِ اِثَارَةُ الشَّيْءِ وَتَوْجِيْهُهٗ (راغب)
عِبَادًا لَّنَا : اس جگہ قرآن کریم نے لفظ عِبَادًا لَّنَا فرمایا ہے عِبَادَنَا نہیں کہا، حالانکہ وہ مختصر تھا۔ حکمت یہ ہے کہ کہیں بندہ کی نسبت واضافت اللہ کی طرف ہو جانا اس لئے کہ وہ سب سے بڑا اعزاز ہے جیسا کہ اسی سورۃ میں بِعَبْدِهٖ موجود ہے ۔ اور اس کے تحت یہ ظاہر کرنا اور بتانا مقصود ہے کہ اس عبد کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق ہے، اور اس کے دربار میں اس بندہ کو کمال درجہ کا شرف حاصل ہے اس لئے بغیر کسی واسطہ کے خدا کی ذات نے عبد کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ لیکن آیت مذکورہ میں جن لوگوں سے بنی اسرائیل کی سزا کا کام لیا گیا یہ خود بھی کافر تھے، اس لئے حق تعالیٰ نے انکو عِبَادَنَا کے لفظ سے تعبیر فرمانے کے بجائے عِبَادًا لَّنَا فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تکوینی طور پر تو سارے ہی انسان اللہ کے بندے ہیں مگر بغیر ایمان کے مقبول بندے نہیں ہوتے جن کی نسبت اللہ کی طرف کیجائے (معارف ملخصاً)

جَاسُوْا : فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ، یہ قتل وغارت گری سے کنایہ ہے۔ جَاسُوْا کے معنی ہیں کہ وہ تمہارے شہروں اور گھروں کے اندر گھس گئے اور ان میں خوب پھرے اور تباہی مچائی۔ اصل میں فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ میں یہود کی توہین اور تذلیل کی انتہائی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس لئے کہ جب دشمن اتنا زور آور ہو کہ وہ گھروں کے اندر گھس پڑیں تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ اُس نے عزت و ناموس ہر چیز کو تاراج کر کے رکھدیا ہے، امام قرطبی فرماتے ہیں کہ جَاسُوْا کے معنی عَاثُوْا اور قَتَلُوْا کے ہیں اسی طرح جَاسُوا، دَاسُوا، هَاسُوْا کے بھی یہی معنی ہیں ۔
قَالَ ابوزید، الحوس والجوس والعوس والهوس : الطواف بالليل (قرطبی)
فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ : اى توسّطوها وترددوا بينها ويقارب ذلك جاسوا وداسوا وقيل الجوس : طلب ذالك الشئ

باستقصاء (راغب)

الجوس: کسی چیز کی آخری حد تک اسے تلاش کر۔ الاجتیاس، رات کو گھومنا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اندر گھس جانے کے بتائے ہیں، آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے تمہارے تعاقب میں شہر کے گلی کوچوں کو چھان مارا۔

خِلٰلٌ : خِلٰلَ الدِّيَارِ، خِلٰلٌ، یہ خَلَلٌ کی جمع ہے۔ درمیان، بیچ، وسط، دو چیزوں کی درمیانی کشادگی۔ بادل اور گھروں کے درمیان کا فاصلہ جیسے قرآن میں فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهِ ۔ تم دیکھتے ہو کہ اس کے بیچ میں سے بارش برسنے لگتی ہے۔ والخلال هُوَ الفرج بين الشيئين (کبیر) ويجوز ان يكون خِلٰل جمع خَلَلٍ كجبال جمع جبلٍ (روح) لفظ خلال اسم مفرد بھی ہو سکتا ہے اور حسن بصری کی قراءت اسی بنا پر خَلَلٌ ہے خِلال، اسم مفرد، وَلِذَا قراء الحسن (خَلَلٌ) (روح)

يُتَبِّرُوا : وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا، (آیت نمبر ۷)

يُتَبِّرُوا، باب تفعیل کے مصدر تَتْبِيرٌ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ حرف لام کی وجہ سے نون اعرابی ساقط ہو گیا ہے اصل مادہ تَبْرٌ ہے جس کے معنی ہیں توڑ دینا اور ہلاک کر دینا، تباہ کر دینا۔ تَبَارٌ اور تَتْبِيرٌ (تفعیل) دونوں کے ایک ہی معنی ہیں قرآن پاک میں یہ مادہ صرف تفعیل سے استعمال ہوا ہے۔ إِنَّ هٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ، یہ لوگ جس فعل میں پھنسے ہوئے ہیں وہ برباد ہونے والا ہے اور آیت کریمہ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا، اور جس پر وہ غلبہ پائیں گے تباہ کر دیں گے، سے مراد بعض کے نزدیک بُخْتِ نصر ہے جس کے ہاتھوں سرزمین شام اور بیت المقدس کی تباہی ہوئی (واللہ علم)

حَصِيرًا : زندان خانہ، قید خانہ، یہ حَصْرٌ سے صفت کا صیغہ ہے بمعنی فاعل بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قید خانہ روکنے والا ہوتا ہے۔ اور بمعنی مفعول بھی، کیونکہ وہ رکا ہوا بھی ہوتا ہے۔ اصل میں حَصَرَ۔ يَحْصُرُ کے معنی تنگ کرنے اور احاطہ کرنے اور روکنے کے آتے ہیں، تنگدل اور بخیل کو بھی حَصِيرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ مال کو روکتا ہے

قال الجوهری ۔ يُقَال حَصَرَهُ يَحْصُرُهُ حَصْرًا ۔ ضَيَّقَ عَلَيْهِ وَاَحَاطَ بِهِ وَ

الحصیر: الضیق، البخیل (قرطبی)
بادشاہ کو بھی الحصیر کہتے ہیں کیونکہ وہ رعایا
کو روکتا ہے۔ مراد الحصیر سے یہاں آخرت کا
حلقۂ عذاب ہے جو کافروں کو گھیرے ہوئے ہوگا۔

اَقْوَمُ : اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ
هِیَ اَقْوَمُ، (آیت نمبر۹) بلاشبہ یہ قرآن
ایسے طریقے کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے
یعنی صلاح و فلاح دارین۔ دنیوی و اُخروی،
فوز و کامرانی کی راہیں اسی کتاب کی حقیقت
ترجمان سے وابستہ ہیں (ماجدی)
اقوم، کے معنی سیدھا اور مستقیم، یعنی وہ راہ
جو ٹھیک فطرت اور عقل کے مطابق اور خدا تک
پہنچنے اور پہنچانے والا ہے (تدبر)
الطریقۃ التی ھی اَسَدُّ وَ اَعْدَلُ وَاَصْوَبُ
(قرطبی) اقوم، ای اقوم الطریق واسدّ
اور اقوم الطریق سے مراد ملتِ اسلامیہ ہے
جیسا کہ ارشاد ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ
اَقْوَمُ، قِیَامٌ سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔
افعَلُ التفضیل علی ما اشار الیہ غیر
واجد (روح) اور التی موصول صفت ہے
اور اختصاراً اس کا موصوف حذف کر دیا گیا ہے
اصل تقدیر عبارت یہ ہے کہ یھدی للطریقۃ
التی ھی اقوم (روح)

عَجُوْلًا : وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا،
(آیت نمبر۱۱) عَجُوْلٌ، عَجَلٌ سے مبالغہ کا صیغہ ہے
بہت جلد باز، بڑا تاؤلا، بہت زیادہ شتابکار
(لغات القرآن)

طَائِرٌ : وَکُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ
فِیْ عُنُقِهٖ، اور انسان کا عمل ہم نے اس کے
گلے کا ہار کر رکھا ہے۔ ہر شخص کا عمل نیک ہو
یا بد، ہر حال میں ہم نے اس کے ساتھ بطور جزءِ
غیر منفک کے لازم کر دیا ہے۔ طائر، ہر مکلف
انسان کے افعال اختیاری مراد ہیں، ای عملہ
الصادر منہ باختیارہ (روح)
طائر کے اصل معنی تو پرندے کے ہیں لیکن اہل عرب
پرندوں سے چونکہ فال بھی لیتے تھے اور اپنے
زعم کے مطابق ان سے قسمت بھی معلوم کرتے، اس
وجہ سے یہ لفظ قسمت، حظ اور نصیبہ کے معنی
میں استعمال ہونے لگا (تدبر) لغوی تحقیق گزر چکی ہے

مَنْشُوْرًا : وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ
کِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا (آیت نمبر۱۳)
اور اس کے واسطے ہم قیامت میں اسکا نامۂ اعمال
نکال کر سامنے کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ
لے گا (ماجدی)
مَنْشُوْرًا، نَشْرٌ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔
نشر کے معنی کسی چیز کو پھیلانے کے ہیں۔ یہ

کپڑے اور صحیفے کے پھیلانے، بارش اور نعمت کے عام کرنے اور کسی بات کو مشہور کرنے پر بولا جاتا ہے۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ اور جب عملوں کے دفتر کھولے جائیں گے یَنْشُرْ رَحْمَتَهٗ وہ اپنی رحمت کو عام کر دیتا ہے یعنی بارش کی برکتیں پھیلا دیتا ہے (راغب)

اس کے نصب میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ مَنْشُوْرًا، یَلْقٰہُ کی ضمیر ہٗ سے حال ہو۔ دوسرا یہ کہ یہ کِتَابًا کی صفت ہو۔ یَلْقٰہُ صفت اول مَنْشُوْرًا صفت ثانی، لیکن اس صورت میں ایک قباحت ہے کہ وصف بالجملہ مقدم اور وصف بالمفرد مؤخر ہو رہا ہے جو خلاف ظاہر ہے۔ وفیہ تقدم الوصف بالجمل علی الوصف بالمفرد وھو خلاف الظاھر (روح) صاحب جلالین نے دونوں کو صفت قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یَلْقٰہُ مَنْشُوْرًا۔ صِفَتَانِ لِکِتَابًا۔

اَمَرْنَا: وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا (آیت نمبر ۱۶)

اَمَرْنَا، اَمْرٌ سے جمع متکلم ماضی کا صیغہ ہے۔ ہم نے حکم دیا۔ یہاں امرنا کے یہی مراد ہیں (لغات القرآن)

الفاظ آیت اِذَا اَرَدْنَا اور اس کے بعد اَمَرْنَا کے ظاہر سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا ہلاک کرنا ہی مقصود خداوندی تھا، اس لئے اُن کو اوّل بذریعہ انبیاء ایمان و اطاعت کا حکم دینا، پھر ان کے فسق و فجور کے عذاب کا سبب بتانا یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا، تو اس صورت میں بیچارے مجبور و معذور ہوئے لیکن شبہ بالکل غلط ہے اور قانون فطرت سے بیگانگی کا ثمرہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل و اختیار دیا ہے اور عذاب و ثواب کے راستے متعین کر دیئے ہیں۔ جب کوئی اپنے اختیار سے عذاب ہی کا عزم کرے تو عادت اللہ یہ ہے کہ وہ اُسی عذاب کے اسباب مہیا کر دیتے ہیں تو اصلی سبب عذاب کا خود اُن کا عزم اور قصد ہے کفر و معصیت کا نہ کہ محض ارادہ، اسلئے وہ معذور نہیں ہو سکتے۔

آیت مذکورہ کے لفظ اَمَرْنَا کا مشہور مفہوم وہی ہے جو اُوپر بیان کیا گیا ہے یعنی ہم نے حکم دیا، لیکن آیت کے لفظ اَمَرْنَا میں کئی قرأتیں ہیں ایک قرأت جس کو ابو عثمان ہندیؒ، ابو رجا، ابو العالیہ، مجاہد نے اختیار کیا ہے وہ اَمَّرْنَا (تفعیل) ہے جس کے معنی یہ ہونگے کہ ہمنے امیر حاکم بنایا۔ خوش عیش و سرمایہ دار لوگوں کو جو فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے اور پوری قوم کے لئے عذاب کا سبب بنے۔ حضرت علیؓ نے بھی اسی قرأت کو اختیار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے آبادی کے امراء کو امیر و وزیر بنایا تو وہ سرکشی

کرنے لگے جس کے سبب ہلاک کر دیئے گئے۔

أَمَّرْنَا: بالتشدید، وھی قراءۃ علی رضی اللہ عنہ، ای سلّطنا شرارھا فعصوا فیھا۔ فاذا فعلوا ذالک اھلکنھم (قرطبی)

حضرت علیؓ وابن عباسؓ کی ایک قرارت میں یہ لفظ آمَرْنَا (بمد الھمزہ) پڑھا گیا ہے۔ اس قرارت کو اہلِ علم کی ایک بڑی جماعت نے اختیار کیا ہے اور اس کی تفسیر اُن حضرات نے اس طرح کی ہے، ای اکثرنا جبابرتھا وأمرآئھا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے فسق وفجور کے ذریعہ پوری قوم کو عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ ابوعبیدہؓ کہتے ہیں کہ آمَرْتُہٗ (بالمد) اور اَمَرْتُہٗ (مجرد) دونوں کے معنی واحد ہیں، یعنی زیادہ کرنا اسی سے حدیث ہے کہ خَیْرُ الْمَالِ مُھْرَۃٌ مَأْمُوْرَۃٌ اَوْ سِکَّۃٌ مَأْبُوْرَۃٌ، یعنی بہتر مال پرورش کیا ہوا بچھیرا اور پیوند کیے ہوئے کھجور کے درخت ہیں تو مَأْمُوْرَۃٌ یہاں اُمِرْتُ سے ہے، اور کثرت کے معنی بایں طور ہیں کہ گھر کا مال پرورش کیا ہوا جانور زیادہ منفعت بخش ہوتا ہے۔ اسی طرح جو درخت پیوند کر دیئے جاتے ہیں وہ پھل کثرت سے دیتے ہیں، اس طرح ابن عزیز کے نزدیک بھی آمَرْنَا اور اَمَرْنَا دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ کبھی اَمَرَ مجرد بادے آمَرْنَا، مزید کے معنی دیتا ہے۔

ان دونوں قرأتوں میں سے پہلی قرارت اَمَّرْنَا کا حاصل تو یہ ہے کہ ایسے خوش عیش سرمایہ داروں کو قوم کا حاکم بنا دیا جاتا ہے، اور دوسری قرارت آمَرْنَا کا حاصل یہ ہے کہ قوم میں ایسے لوگوں کی کثرت کر دی جاتی ہے جو قومی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں۔ ان دونوں قرأتوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عیش پسند لوگوں کی حکومت یا ایسے لوگوں کی قوم میں کثرت کچھ خوشی کی چیز نہیں بلکہ عذاب الٰہی کی علامت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ اَمَرَ کے اصل معنی تو اگرچہ حکم دینا ہی ہے مگر بسا اوقات کسی کو ڈھیل دینے اور مہلت دینے کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی شخص کو بار بار افہام وتفہیم کے بعد تنگ آ کر کہتے ہیں اِفْعَلْ مابدا لکَ جو چاہے کر۔ تو بظاہر یہ امر ہی کا صیغہ ہے لیکن اسکا مفہوم امہال ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی سرکش لوگوں پر اپنی حجت تمام کر چکنے کے بعد ان کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ ہوس پوری طرح بھر لیں (معارف

قرطبی - تدبر قرآن)

مُتْرَفِيهَا: کسی قوم کے کھاتے پیتے خوشحال طبقے کو کہتے ہیں۔ اِتْرَافٌ مصدر سے اسم مفعول جمع کا صیغہ ہے۔ اصل میں مترفین تھا نون اعرابی اضافت کی وجہ سے گر گیا مطلب یہ ہے کہ ہم جس بستی کو برباد کرنیکا ارادہ کرتے ہیں تو اوّل وہاں دولتمند لوگوں کو اور اونچے طبقہ والوں کو اعمال صالحہ کا حکم دیتے ہیں۔ جب وہ نہیں مانتے اور نافرمانی کرتے ہیں تو حجت تمام ہو جاتی ہے اور ہم اس بستی کو تباہ کر دیتے ہیں،

وَالْمُتْرَفُ: الْمُنَعَّمُ (قرطبی) مُتْرَفِيهَا مُتَنَعِّمِيهَا وَجَبَّارِيهَا وَمُلُوكَهَا (روح)

تَدْمِيرًا: فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا،

تَدْمِير۔ ہلاک کرنا۔ اکھاڑنا۔ تباہی ڈالنا تفعیل کے وزن پر مصدر ہے۔ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا، وہ ہر چیز کو اپنے پروردگار کے حکم سے ہلاک کر دے گی۔ یعنی نہ وہ کسی انسان کو اور نہ حیوان کو زندہ چھوڑے گی سب کو تہہ و بالا کر دے گی۔ وَالتَّدْمِيرُ: إِدْخَالُ الْهَلَاكِ عَلَى الشَّيْءِ (راغب) دَمَرَ يَدْمُرُ دُمُورًا و دمارًا۔ ہلاک ہونا۔ دَمَرَ عَلَيْهِمْ بغیر اجازت کے داخل ہونا یا برے ارادہ سے اچانک آنا، دَمَّرَهُمْ، دَمَّرَ عَلَيْهِمْ: ہلاک کرنا۔ مَنْ سَبَقَ طَرْفُهُ اِسْتِئْذَانَهُ فَقَدْ دَمَرَ عَلَيْهِمْ۔ جس شخص نے اجازت لئے بغیر کسی گھر والوں پر نظر ڈالی اس نے گویا ان کو ہلاک کر دیا۔ یعنی اس کا گناہ ہلاک کرنے والوں کے برابر ہے۔

مَدْحُورًا: يَصْلٰهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا

مَدْحُورًا، باب نَصَرَ کے مصدر دَحْرًا و دُحُورٌ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ ہنکایا ہوا، نکالا ہوا، دُور کیا ہوا۔ دَحْرٌ کا معنی ہے دُور کرنا۔ ہنکانا۔ صفت کا صیغہ دَحُورٌ آتا ہے

الدَّحْرُ: الطَّرْدُ وَالْإِبْعَادُ يُقَالُ دَحَرَهُ دُحُورًا (راغب)

وَيُقْذَفُونَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ۔ دُحُورًا، اور ہر طرف سے ان پر آگ کے انگارے پھینکے جاتے ہیں۔ یعنی ان کو وہاں سے نکالنے اور دُور کرنے کے لئے۔

كُلًّا: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (آیت نمبر ۲۰)

ہم ہر ایک کی امداد کرتے ہیں۔ ان میں سے بھی اور ان میں سے بھی آپکے پروردگار کی بخشش میں سے۔ یعنی ہر دو فریق کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں۔

لفظ کل جب مختلف جماعتوں کے ذکر

کے بعد آتا ہے جیسے یہاں آیا ہے تو وہ معرفہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ یعنی اس سے وہ جماعتیں مراد ہوتی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہوتا ہے، مطلب یہ کہ تمہارے رب کی عطا و بخشش کا دروازہ مذکورہ دونوں جماعتوں میں سے کسی پر بھی بند نہیں۔ جو لوگ آخرت سے بالکل بے پرواہ رات دن دنیا کی طلب میں سرگرم ہیں اُن کو بھی خدا دُنیا میں سے جو کچھ اُن کے لئے مقرر کر رکھا ہے دیتا ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ انکی خدا فراموشی اور آخرت فراموشی کی سزا میں اُن کو دُنیا سے محروم کر دے۔ اسی طرح جو لوگ آخرت کے طالب بنتے ہیں خدا اس دنیا میں سے اُنکا مقرر حصہ دیتا ہے اور آخرت میں بھی وہ بھرپور حصہ پائیں گے۔ یعنی خدا تعالیٰ یہ نہیں کرتا کہ ان لوگوں کو دُنیا سے بے اعتنائی کے سبب دُنیا سے محروم کر دے (تدبر۔ ملخصاً)

کُلًّا کی تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے اصل تقدیر کلام یوں ہے۔ کُلَّ وَاحِدٍ مِّنَ الْفَرِیقَین (کشاف)

مَحْظُوْرًا : وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا، (آیت نمبر ۲۰)

مَحْظُوْرًا، حَظْرٌ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے ممنوع۔ روکی گئی۔ بند کر دی گئی۔ اَلْحَظْرُ کے معنی کسی چیز کو حَظِیْرَۃٌ یعنی احاطہ اور باڑہ میں بند کرنے کے اور جمع کرنے کے ہیں۔ اور المُحْتَظِرُ اِحْتِظَارٌ سے، باڑہ بنانے والا۔ فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۔ ایسے ہو گئے جیسے باڑہ بنانے والے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔ حَظْرٌ : بندش۔ روک۔ حرام حَظَرَ الشیئَ اور حَظَرَ علی الشیئ : اُس شئی کی روک کر دی۔ الحظیرۃ۔ لکڑیوں وغیرہ سے بنا ہوا باڑہ۔ حَظِیْرَۃَ القُدُس جنت الحَظِرُ درخت کی شاخیں، جن سے باڑہ بنایا جاتا ہے۔ وقع فی الحَظِرِ الرَّطْبِ، وہ ناقابلِ برداشت معاملہ میں پھنس گیا۔ الحظیرۃ، جمع حَظَائِرُ۔ محاورہ ہے۔ الضرورات تبیح المحظورات (المنجد۔ راغب۔ لغات القرآن) مَحْظُوْرًا۔ ای ممنوعًا محبوسًا، من حَظَرَ یَحْظُرُ حَظْرًا و حِظَارًا (قرطبی)

مَخْذُوْلًا : مخذولٌ اسم مفعول، متعدی فعل سے بنایا گیا ہے۔ بمعنی بے مدد چھوڑا ہوا۔ خَذْلٌ اور خِذْلَانٌ مصدر بے مدد چھوڑنا یہ لازم بھی ہے۔ یعنی بے مدد ہونا۔ مددگاروں سے بچھڑ جانا۔ خَذَلَتِ الظَّبْيَةُ، ہرن کا اپنے گلہ سے بچھڑ جانا۔ اسی لئے خاذل اور خذول، بے مدد اور ہزیمت زدہ شخص کو

کہتے ہیں۔ اور متعدی بھی استعمال ہوتا ہے جیسے
خَذَلَہٗ۔ اس کو بے مدد چھوڑ دیا۔ خَذَلَ عَنْہُ
اس کو بے مدد چھوڑ کر الگ ہو گیا۔
اَلْخَذُوْلُ: صیغہ مبالغہ۔ بہت زیادہ خذلان
یعنی دغا دینے والا۔ اَلْخُذَّالُ = ایسے شخص کا
عین موقع پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانا جسکے
متعلق گمان ہو کہ وہ پوری مدد کریگا وَکَانَ
الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا۔ اور شیطان
انسان کو عین موقع پر دغا دینے والا ہے۔
تَخَاذَلَ القوم۔ بعض کا بعض کی مدد کو
چھوڑ دینا۔ باہم رواداری ترک کرنا۔
مَخْذُوْلًا۔ لا ناصرلک ولا ولیا (قرطبی)

قَضٰی: وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
اِلَّآ اِیَّاہُ (آیت نمبر ۲۳) اور تیرے رب
نے حکم دے رکھا ہے کہ بجز اسی کے اور کسی کی
پرستش نہ کرنا۔
قَضٰی، یَقْضِیْ، قَضَاءً وَقَضْیًا وَقَضِیَّۃً
قَضٰی بَیْنَ الْخَصْمَیْنِ، فیصلہ کرنا۔ قَضٰی
الْاَمْرُ لَہٗ، اَوْعَلَیْہِ، کسی معاملہ کے حق میں
یا خلاف فیصلہ کرنا۔ قَضَی الشَّیْءَ۔ اطلاع دینا
اور واضح کر دینا۔
علماء متکلمین کا کہنا ہے کہ لفظ قضاء کئی
معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اوّل قضیٰ
بمعنی امر، جیسے اس آیت میں ہے، وَقَضٰی
رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ۔ یہاں قضٰی
رَبُّکَ بمعنی امر ربک کے ہے۔ اور دوم القضاء
بمعنی خلق کے بھی آتا ہے۔ جیسے آیت کریمہ
فَقَضٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ، یہاں
قضٰی بمعنی خَلَقَ ہے۔ اور سوم القضاء بمعنی
الحکم بھی آتا ہے۔ جیسے فَاقْضِ مَآ اَنْتَ
قَاضٍ۔ یعنی اُحْکُم مَا انت تحکم۔ جو تم حکم
کرنا چاہتے ہو کرو۔ اور چہارم القضاء کا لفظ
کسی کام سے فارغ ہونے کے معنی میں بھی
استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ فَاِذَا قَضَیْتُمْ
مَّنَاسِکَکُمْ، اور جب تم مناسک سے فارغ
ہو چکو۔ اور بمعنی ارادہ بھی استعمال ہوتا ہے
جیسا کہ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ
کُنْ فَیَکُوْنُ۔ اور ششم القضاء کا معنی
العہد ہے۔ جیسا کہ اِذْ قَضَیْنَآ اِلٰی مُوْسَی
الْاَمْرَ۔ ابن عباس، حسن، اور قتادہ کا قول ہے
کہ یہاں لفظ قضاء سے مراد قضاء حکم نہیں
بلکہ قضاء امر ہے، یعنی اللہ کا امر یہ ہے کہ عبادت
صرف اُسی کی کیجائے اور امر میں خلاف کا
اختیار رہتا ہے۔ اور قضاء حکم میں خلاف کا
اختیار نہیں ہوتا۔ اور آیت کریمہ فَاقْضِ مَآ
اَنْتَ قَاضٍ میں قضاء حکم مراد ہے یعنی

اُحْکُمْ مَآ اَنْتَ تَحْکُمُ ۔

ایک عظیم غلط فہمی اور اس کا ازالہ واضح رہے کہ ابن مسعود کے مصحف میں وقضٰی کی جگہ ووصّٰی پڑھا گیا ہے اور یہی قرأت ان کے ہم مشرب حضرات کی ہے جیسا کہ ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ، اسی طرح ابی بن کعب سے بھی ایک روایت اسی طرح کی ہے ابن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ قرآن پاک کی اصل آیت ووصّٰی ربّک تھی۔ ہوا یہ کہ ایک واؤ حرف صاد کے قریب ہونے کی وجہ سے اسکے ساتھ چپک گئی تو جامعین قرآن نے ایک ہی پڑھی۔ اور اسی طرح کا قول ضحاک کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے کہ مصحف کی کتابت کے وقت ایک واو صاد کے ساتھ چپک گئی تو لوگوں نے ووصّٰی کی جگہ وقضٰی پڑھنا شروع کر دیا۔ ابو حاتم نے ابن عباسؓ سے بھی ضحاک ہی کے قریب نقل کیا ہے لیکن یہ قول اور اسی قسم کی تمام روایات بلاشبہ رافضیوں اور زنادقہ کی تراشیدہ ہیں جو قرآن پاک میں تحریف ثابت کرنے اور اس پر سے امان اُٹھانے کی غرض سے گھڑی گئی ہیں، چنانچہ ابو حاتم نے شدت سے انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ قول ابن عباسؓ جیسے صحابہ سے بعید ہے (قرطبی)

ان باطل روایات کو دیکھ کر امام فخر الدین رازیؒ بھی تڑپ اُٹھے اور اپنی عظیم تفسیر میں ان روایات کا پوری شدت سے انکار کیا اور فرمایا کہ یہ روایات دین میں ایک عظیم طعن ہیں، فرماتے ہیں کہ واعلم: ان ھٰذا القول بعید جدًا، لانہ یفتح باب ان التحریف و التغییر قد تطرق الی القراٰن، ولو جوّزنا ذالک لارتفع الامان عن القراٰن و ذالک یخرجہ عن کونہ حجۃً ولا شک انہ طعنٌ عظیمٌ فی الدّین (کبیر)

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ القضاءُ کے معنی قولاً یا فعلاً کسی کام کا فیصلہ کر دینے کے ہیں۔ اور پھر قضاء قولی اور قضاء عملی میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ نمبر۱ قضاء الٰہی نمبر۲ قضاء بشری۔ قضاء الٰہی کے متعلق ارشاد ہے۔ وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ۔ اور آیت کریمہ وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ میں مراد اطلاع کر دینا ہے۔ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو اطلاع دیدی اور وحی کے ذریعہ بتا دیا تھا کہ تم زمین میں شر و فساد مچاؤ گے اور فعلاً قضاء الٰہی کے متعلق فرمایا، وَاللّٰہُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ

لَا یَقْضُوْنَ بِشَیْءٍ اور آیتِ کریمہ نَقْضِیَ
بَیْنَهُمْ میں قُضِیَ بمعنی فُصِلَ ہے یعنی
ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا (شوریٰ آیت ۱۴)
اور قضاء بشری بذریعہ قول جیسے قَضَی الحَاکم
بکذا۔ یعنی حاکم نے فلاں فیصلہ کیا۔ کیونکہ حاکم
ہمیشہ زبان کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔ اور
قضاء بشری بذریعہ فعل کے متعلق فرمایا،
فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَنَاسِکَکُمْ۔ پھر جب حج کے
تمام ارکان پورے کر چکو (مفردات القرآن)

قضاء قولی ہو یا عملی، الٰہی ہو یا بشری
بہرحال فیصلہ کر دینا یا کر لینا کسی بات کے متعلق
آخری ارادہ یا حکم یا عمل کو ختم کر دینا ضرور مفہوم
قضاء کے اندر ملحوظ ہے۔ لفظ قضا ان الفاظ
میں سے ہے جو مختلف صلات اور سیاق کی
مناسبت سے مختلف معانی دیتے ہیں۔ مثلاً
حکم کرنا۔ فیصلہ کرنا۔ اندازہ کرنا۔ واجب
کرنا۔ آگاہ کرنا۔ کسی چیز کو مضبوطی سے بنانا
ایجاد کرنا۔ قُضِیَ فُلَانٌ: وہ مر گیا۔ قَضَی وَطَرَهٗ
اس نے اپنی حاجت پوری کی۔ قَضَی دَیْنَهٗ
اپنا قرض ادا کیا۔ قَضَی الصَّلٰوۃ۔ نماز ادا
کی۔ نماز کو بے وقت کر دیا۔

الفرق بَیْنَ القَضَاءِ وَالقدر: امام راغب
فرماتے ہیں کہ قضاء الٰہی قدر یعنی تقدیر الٰہی
سے اخص ہے۔ کیونکہ قضاء کے معنی تقدیر
کو قطع کر دینے کے ہیں۔ لہٰذا قدر بمعنی تقدیر ہے
اس کا فیصلہ کرنے کا نام ہے۔ بعض علماء
نے کہا ہے کہ قدر بمنزلہ اُس چیز کے ہے جو
ماپ کے لیے تیار کی جاتی ہے اور قضاء بمنزلہ
ماپنے کے ہے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ کی ایک
روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو کہا گیا کہ،
اَتَفِرُّ مِنَ الْقَضَاءِ: کیا آپ قضاء الٰہی سے
بھاگتے ہیں، تو ابو عبیدہؓ کے جواب میں جناب
فاروق اعظم نے فرمایا، اَفِرُّ مِنْ قَضَاءِ اللّٰہِ
اِلٰی قَدَرِ اللّٰہِ۔ اس میں تنبیہ ہے کہ تقدیر جب
تک قضاء الٰہی کے مرحلہ میں داخل نہ ہو، ہو سکتا ہے
کہ اللہ تعالیٰ اس کو دعا وغیرہ کے وسیلہ سے
دُور کر دے، لیکن جب اللہ تعالیٰ قضاء یعنی
قطعی فیصلہ کر دے تو پھر اس کو کسی حیلہ سے روکنا
ممکن نہیں، جیسا کہ آیت کریمہ وَکَانَ اَمْرًا
مَقْضِیًّا۔ اور یہ کام مقرر ہو چکا ہے سے معلوم
ہوتا ہے (واللہ اعلم)

والقضاء: مَعْنَاهُ الحکم الجزم البتّ
الذی لایقبل النسخ ولفظ القضاء فی
اصل اللغۃ یرجع الی اتمام الشیء و
انقطاعه (کبیر) القضاء۔ فصل الامر
قولاً کان ذالك اوفعلاً (راغب) وقال

صاحب الکشاف : وقضی ربك امرًا امرًا مقطوعًا به (کشاف)

اُفٍّ : فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا

(آیت نمبر ۲۳ بنی اسرائیل)

اَفَّ، یَاُفُّ، اَفًّا : کرب و بیقراری میں اُف، اُف کہنا ۔ اَلْاُفْفُ، بے قراری و بےچینی

اَلْاُفُّ : اصل میں ہر گندی اور قابلِ نفرت چیز کو کہتے ہیں ۔ میل کچیل اور ناخن کا تراشہ وغیرہ، اور محاورہ میں کسی چیز سے اظہارِ نفرت کے لئے آتا ہے ۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے اُفٍّ لَّکُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ تُف ہے تم پر بھی اور جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو اُن پر بھی ۔ اُفِّفْتُ لِکَذَا ۔ کسی چیز سے کراہت ظاہر کرنا ۔ اُف کہنا ۔ اسی سے اَفَّفَ فُلَانٌ کا محاورہ ہے جس کے معنے ہیں کسی مکروہ چیز سے دل تنگ ہونا، دل برداشتگی کا اظہار کرنا ۔ کسی چیز سے گھن ظاہر کرتے وقت اُف کہا جاتا ہے ۔ چنانچہ اس معنی میں یہ کثرت سے بولا جاتا ہے ۔

ثعلب کا بیان ہے کہ اُفْفٌ جو اُفٌّ کی اصل ہے کے معنی جی میں گھٹنے اور تنگ دل ہونے کے ہیں اور اس کی اصل یہ ہے جب کسی شخص پر خاک وغیرہ آپڑتی ہے تو وہ اس کو پھونک مار کر صاف کرنے لگتا ہے ۔ اس پھونکنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ ہی اُف ہے ۔ پھر لوگوں نے اسکے معنی میں وسعت پیدا کر دی اور ہر قسم کی تکلیف پہنچنے پر اس کو بولنے لگے ۔ اصمعی کا بیان ہے کہ اُف، کان کا میل ہے اور تُف ناخن کا ۔ اور ابو عمرو بن العلاء کا قول ہے کہ اُف ناخن کا میل ہے اور تُف اسکا تراشا ہے ۔ بعض کے نزدیک لفظ اُف، اسم فعل ہے بمعنی میں ناپسند کرتا ہوں ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُف اسم صوت ہو جو تنگدلی اور گرانی کو بتلاتا ہے (فتح القدیر، کبیر، قرطبی، مفردات راغب)

اور اُف ایسے کلام اور گفتگو کو بھی کہا جاتا ہے جو ادب واحترام سے خالی ہو یا اس میں گالی گلوچ ہو ۔ وعن ابی رجاء العطاردی قال ۔ الاُف الکلام القذع الردی والخفیّ (قرطبی)

تَنْهَرْ : وَلَا تَنْهَرْهُمَا : نَهْرٌ کے معنی جھڑکنے اور ڈانٹنے کے ہیں (معارف)

وَلَا تَنْهَرْهُمَا، اور نہ جھڑک اُن کو، لائے نہی ہے ۔ نَهَرَ (فتح) الانتِهَارُ (افتعال) سختی سے جھڑکنا ۔ النهر والانتهارُ ۔

الزجرُ بِمَقَالَةٍ (راغب) نَهَرَ السائلَ، سائل کو جھڑکنا۔ اِنْتَهَرَ السَّائِلَ۔ سائل کو جھڑکنا (منجد)، النَّهرُ: الزَّجْرُ والغِلْظَةُ (قرطبی)

الذُّلِّ : جَنَاحَ الذُّلِّ : تواضع، ذلّت عاجزی۔ ذَلَّ، یَذِلُّ کا مصدر ہے۔ دوسرے کے دباؤ اور قہر کی بنا، پر جو ذلت ہو اسکو ذُلٌّ کہتے ہیں اور بغیر کسی قہر و دباؤ کے خود اپنی سرکشی اور سخت گیری کے بعد جو ذلت حاصل ہو وہ ذِلٌّ (بکسر الذال) کہلاتی ہے (لغات القرآن) ذُلٌّ کے معنی اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں۔ (تدبر)

وَ الذُّلِّ : هواللین، وقرأة الجمهور بضمّ الذّال، مِنْ ذَلَّ یَذِلُّ ذُلًّا و ذِلَّةً وَمُذَلَّةً فهو ذَالٌّ و ذلیلٌ (قرطبی)

سعید بن جبیر نے جَنَاحَ الذِّلِّ بکسر الذال پڑھا ہے جس کے معنی انقیاد و اطاعت کے ہیں۔ اور اصل میں لفظ ذِلٌّ حیوانات کی اطاعت کے لئے بولا جاتا ہے۔ صیغہ صفت کا اس میں سے ذَلُولٌ آتا ہے۔ جیسا کہ لَا ذَلُولٌ، تُثِیْرُ الْاَرْض۔ اور الذُّلُّ جو عزت و شرف کی ضد ہے اس کا تعلق انسان کے ساتھ ہے صیغہ صفت کا اس سے ذلیلٌ آتا ہے۔

(روح) ذَلَّلَ الکَرْمُ تَذْلِیْلًا، انگور کے خوشے نیچے جھکا دیئے گئے۔ (تاج)

اَوَّابِیْنَ : فَاِنَّهٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا (آیت نمبر ۲۵)

اوابین وہ لوگ جو غلطی یا لغزش صادر ہونے کے بعد حق تعالیٰ کی طرف توبہ و استغفار کے ساتھ رجوع کریں۔ ای الراجعین الیہ تعالیٰ التَّائِبِیْنَ عمّا فرط منهم ممّا لا یکاد یخلو منه البشر (روح)

یہ اَوَّابٌ : صیغہ مبالغہ بروزن فعّال کی جمع ہے، اصل میں یہ اَوْبٌ سے ہے، جس کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔

سعید بن مسیب کا قول ہے اَوَّابٌ وہ ہے جو توبہ کرے پھر توڑے پھر توڑے، پھر توبہ کرے پھر گناہ کرے پھر توبہ کرے، اور حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ اوّابٌ وہ ہے کہ جب گناہوں کو یاد کرے تو استغفار کرے۔ اٰبَ۔ یَؤُوْبُ اَوْبًا و اِیَابًا و مَاٰبًا۔ لوٹنا۔ رجوع ہونا۔ الماٰب مصدر میمی ہے اور اسم زمان اور مکان بھی وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰب، اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔ وحقیقة اللفظ انّہٗ من اٰب یَؤُوْبُ اذا رجع (قرطبی)

تَبۡذِیۡرًا : وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِیۡرًا ،
(آیت نمبر ۲۶) تبذیرًا بیجا خرچ کرنا ۔
تبذیر کے معنی تفریق اور پراگندہ کرنیکے ہیں ، اصل میں بَذۡرٌ زمین میں بیج ڈالنے اور پھینکنے کا نام تبذیر ہے اور چونکہ زمین میں بیج ڈالنا اُس شخص کی نظر میں جو مآل کار سے واقف نہ ہو بظاہر ضائع کرنا ہے اس لئے بطور استعارہ ہر اُس شخص کے متعلق انجام کو سوچے بغیر اپنے مال کو فضول ضائع کرنے لگے ، تبذیر کا استعمال ہونے لگا (لغات القرآن)

تو لَا تُبَذِّرۡ : کے معنی ہونگے تو بیجا خرچ نہ کر ۔ تو فضول خرچی نہ کر ۔ فضول خرچی کے معنی کو قرآن حکیم نے دو لفظوں سے تعبیر فرمایا ہے ۔ ایک تبذیر ، دوسرے اسراف ، تبذیر کی ممانعت تو قرآن حکیم کی اسی آیت سے واضح ہے ۔ اسراف کی ممانعت آیت وَلَا تُسۡرِفُوۡا سے ثابت ہے ۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں ۔ کسی معصیت کے کام میں یا بے موقع محل خرچ کرنے کو تبذیر اور اسراف کہا جاتا ہے ۔

اور بعض حضرات نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں اور جہاں خرچ کرنیکا جائز موقع تو ہو مگر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے اسکو اسراف کہتے ہیں ۔ اسلئے تبذیر بہ نسبت اسراف کے اشد ہے ۔ مُبَذِّرِین کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے ۔ امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ اگر کوئی اپنا سارا مال حق کے لئے خرچ کردے تو وہ تبذیر نہیں ، اور اگر باطل کے لئے ایک مُد (آدھ سیر) بھی خرچ کردے تو وہ تبذیر ہے ۔ امام مالک نے فرمایا کہ تبذیر یہ ہے کہ انسان مال کو تو حق کے مطابق حاصل کرے مگر خلافِ حق خرچ کر ڈالے ، اور اسی کا نام اسراف بھی ہے اور یہ حرام بھی ہے ۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ حرام و ناجائز کاموں میں تو ایک درہم خرچ کرنا بھی تبذیر ہے اور جائز و مباح خواہشات میں حد سے زیادہ خرچ کرنا جس سے آئندہ محتاج و فقیر ہو جانے کا خطرہ ہو جائے یہ بھی تبذیر ہے ۔ ہاں اگر کوئی شخص اصل راس المال کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کے منافع کو اپنی جائز خواہشات میں وسعت کے ساتھ خرچ کرتا ہے تو وہ تبذیر میں داخل نہیں (معارف القرآن)

التبذیر ۔ تفریق المال فیما لا ینبغی وانفاقہ علی وجہ الاسراف (کشاف)
والتبذیر فی اللغۃ افساد المال انفاقہ

فی السراف (کبیر)

فَاِنَّ التبذیر انفاق فی غیر موضعہ مأخوذ من تفریق البذر والقائہ فی الارض کیفما کان من غیر تعھد لمَوَاقِعِہٖ (روح) وفی مفردات الراغب وغیرہ انّ اصلہ القاء البذر وطرحہٗ۔ ثم استعیر لتضییع المال (روح)

مَیْسُوْرًا : فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (آیت نمبر ۲۸) مَيْسُوْرًا، اسم مفعول واحد مذکر یُسْرٌ اصل مادہ ہے۔ یُسْرٌ آسانی سہولت۔ عُسْرٌ کی ضد ہے یُسْرٌ مصدر باب ضَرَبَ، آسانی ہونا مَيْسَرَةٌ اور يَسَارٌ فراخی۔ دولتمندی۔ یُسْرٰی، فراخی ہونا، یَسِیْرٌ (تفعیل) آسانی کردینا، سہل بنادینا (راغب) قرطبی فرماتے ہیں یہ اسم مفعول بمعنی اسم فاعل، مفعول بمعنی الفاعل من لفظ الیسر کالمیمُوْنِ (قرطبی)

اِمْلَاقٍ : وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ خَشْيَةِ اِمْلَاقٍ۔ (آیت نمبر ۳۱) اور اپنی اولاد کو ناداری کی وجہ سے قتل مت کیا کرو۔ اِمْلَاق، افعال کے وزن پر مصدر ہے۔ تنگدست اور مفلس ہونا محتاج ہونا۔ وَالْاِمْلَاقُ : الفقر وعدم الملك (قرطبی)

اَمْلَقَ اِمْلَاقًا : فقیر و محتاج ہوگیا، اَنْفَقَ مَا عِنْدَهٗ مِنَ المال : اس نے اپنا سارا مال خرچ کردیا۔ یہیں سے کنایۃ املاق، فقر اور تنگدستی پر بولے جانا لگا ہے (معجم الفاظ القرآن)

خِطْاً : اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (آیت نمبر ۳۱) بیشک انکا قتل کرنا بہت بڑا جرم ہے (ماجدی) اَلْخَطْأُ وَالْخَطَاءَةُ کے معنی ہیں صحیح جہت سے عدول کرنا۔ اس عدول کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی ایسا کام بالارادہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو۔ یہ خِطْأٌ تام ہے، اس پر مواخذہ ہوگا۔ اس معنی میں فعل خَطِئَ يَخْطَأُ خِطْأً وخِطَاءَةً بولا جاتا ہے اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا میں یہی مراد ہے۔ صیغہ اسم فاعل خاطِئٌ آتا ہے۔ اس کی جمع خاطِئِیْن آتی ہے، قرآن پاک میں وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ (یوسف آیت نمبر ۹۱) اور بلاشبہ ہم خطاکار تھے دوسری قسم یہ کہ ارادہ تو اچھا تھا مگر غلطی سے برا کام ہوگیا۔ اس معنی میں فعل اَخْطَأَ (افعال) يُخْطِئُ اِخْطَاءً فَهُوَ مُخْطِئٌ بولا

جاتا ہے۔ اس میں اس کا ارادہ درست ہوتا ہے لیکن فعل غلط ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رفع عن اُمتی الخطاءُ وَ النسیان تیسری یہ کہ ارادہ تو بُرے کام کا تھا لیکن اتفاقاً نیک اور بھلا کام ہوگیا اس صورت میں اسکا فعل اگرچہ درست ہے مگر ارادہ غلط ہونے کی وجہ سے اس فعل کو مذموم کہا جائے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جس شخص سے اتفاقاً ارادہ کے خلاف فعل صادر ہوجائے تو اس کے متعلق اَخْطَأَ کہا جاتا ہے اور اگر ارادہ کے مطابق ہو تو اصاب کہا جاتا ہے۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ کبھی لفظ اخطأ کا استعمال اس شخص کے متعلق بھی ہوتا ہے، جس نے کسی غیر مستحسن فعل کا ارتکاب کیا ہو یا کسی نازیبا کام کا ارادہ کیا ہو۔ لہٰذا اصابَ الخطاءَ و اَخطاءَ الصوابَ واصابَ الصوابَ و اخطأ الخطاءَ ہر طرح کہنا درست ہوگا اور یہ لفظ مشترک ہے اس لئے متلاشی حق کو چاہیے کہ اس لفظ کے متعین کرتے ہیں خوب غور سے کام لے، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے قرطبی ص۲۵۲ جلد ۱۰ کبیر ص۱۹۲ جلد ۲۰، کشاف ص۶۶۲ جلد ۲،

اَلزِّنیٰ : وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی۔ الزنا عقد شرعی کے بغیر کسی عورت سے ہمبستری کرنا یہ اسم مقصود ہے۔ اگر اس کو ممدود پڑھا جائے تو باب مفاعلة کا مصدر بھی ہوسکتا ہے اور اگر مہموز اللام ہو تو جیسے زَنَأَ فِي الجَبَل زَنَاءً و زُنُوءً، تو اس کے معنی پہاڑ پر چڑھنے کے ہوتے ہیں (راغب)۔ زَنٰی یَزْنِيْ (ض) زِنًی وزِنَاءً وزَانٰی مُزَانَاةً وَ زِنَاءً، زنا کرنا۔ صفت فاعلی زانٍ آتی ہے قرآن پاک میں ہے اَلزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ (سورۃ النور) اصل میں یہ زانِیٌ تھا چونکہ اسم منقوص ہے اس لئے رفع اور جر کی حالت میں (ی) جو حرف علت تھی ساقط ہوجاتی ہے۔ مؤنث زانیۃٌ آتی ہے۔ زنا کرنے والی عورت، بدچلن بدکار۔ جمع زوانٍ۔ اور زانٍ کی جمع زُنَاۃٌ آتی ہے۔

زِنُوْا : وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (آیت نمبر ۳۵) زِنُوا، جمع مذکر امر حاضر کا

سے تاج العروس میں ہے کہ جو غلطی نادانستہ غیر اختیاری طور پر صادر ہوجائے وہ تو خطأ ہے۔ اور جو غلطی بالارادہ ہو اس کو خطیئۃ کہا جاتا ہے۔

صیغہ ہے اور وزنٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز کی مقدار معلوم کرنے کے ہیں، اور عرف عام میں وزن اس مقدار کو کہتے ہیں جو ترازو وغیرہ کے ذریعہ معلوم کیجاتی ہے اور آیتِ کریمہ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ، اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو۔ اور اسی طرح آیت مذکورہ میں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنے تمام اقوال و افعال میں ناپ تول میں کوئی خیانت نہ کرو ناپو صحیح پیمانے سے اور تولو ٹھیک ترازو سے یہی طریقہ بہتر اور انجام کار کے اعتبار سے اچھا ہے جو قوم ڈنڈی مارنے کو اپنا شیوہ بنالیتی ہے بظاہر اسکے کچھ افراد اپنی دانست میں نفع کماتے ہیں لیکن درحقیقت وہ عدل وانصاف کی بنیاد ہی کو ڈھا دیتے ہیں۔ ایسی قوم میں کبھی صالح معاشرہ اور صالح تمدن قائم نہیں ہوسکتا۔

تَقْفُ: وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ، (آیت نمبر ۳۶) اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو (معارف)

قَفَوْتُہٗ، قَفَوْتُ اِثْرَہٗ کے معنی ہیں، میں اُسکے پیچھے ہولیا۔ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ، یعنی جس چیز کے بارمیں تمہیں قابلِ اطمینان علم نہیں ہے اُس کے پیچھے نہ ہولیا کرو اور محض اٹکل اور گمان کی بنا پر کسی کے بارے میں کوئی بات نہ سے اُڑاؤ (تدبر)

اَلْقَفَا کے معنی گُدّی کے ہیں۔ اور قَفَوْتُہٗ کے معنی کسی کی گُدّی پر مارنے اور کسی کے پیچھے ہولینے کے ہیں یہ دونوں محاورے استعمال ہوتے ہیں۔ قَفَوْتُ اَثَرَہٗ اور اِقْتَفَیْتُہٗ کے معنی کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں، اِقْتَفَیْتُہٗ کا مصدر اِقْتِفَاءٌ ہے جس کی اصل کسی کی قفا کا اتباع کرنے کے ہیں۔ کنایہ کے طور پر کسی کی غیبت اور عیب جوئی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور قَفَّیْتُہٗ (تفعیل) کے معنی کسی کو دوسرے کے پیچھے لگانے کے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے وَقَفَّیْنَا مِنْ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ، اور ہم نے اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے یعنی پے درپے رسول بھیجے اور اَلْقَافِیَۃُ مصرعہ کے جزو آخر کو کہا جاتا ہے جس کے حرف روی کی شعر میں رعایت کی جاتی ہے۔ قَفَا۔ یَقْفُوْا، قَفْوًا وقُفُوًّا (ن) قَفَا الرَّجُلَ۔ گدی پر مارنا۔ صراحۃً فسق فجور کی تہمت لگانا۔ قفا اللہ اثرہٗ کسی کے اثر کو مٹانا۔ نَصَرَ سے ناقص واوی ہے

اور قَفٰی یَقْفِیْ قَفْیًا (ض)

قَفِی الرَّجُل - بےحیائی کی تہمت لگانا، اسکا لام کلمہ یاء ہے ۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں القَفْو کے اصل معنی بہتان اور باطل الزام لگانے کے ہیں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

نحن بنو النضر بن کنانہ لا نقفوا امّنا وَلَا نَنْتَفِیْ مِنْ اَبِیْنَا ، ہم لوگ بنو نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں ہم اپنی ماؤں پر تہمت نہیں لگاتے اور اپنے باپ سے الگ نہیں ہوتے، انہی معنوں میں کمیت کا ایک شعر ہے

فَلَا اَرْمِی الْبَرِیَّ بِغَیْرِ ذَنْبٍ
وَلَا اَقْفُوْا الْحَوَاصِنَ اِنْ قُفِیْنَا

میں کسی بے گناہ پر الزام نہیں لگاتا، اور نہ پاکدامن عورتوں پر جھوٹی تہمت دھرتا ہوں بغیر جرم واقعی کے اگرچہ لوگ کتنی ہی باتیں کرتے ہوں ۔

اصل القَفْو : البُهْتُ والقذفُ الباطِلُ (قرطبی) تَقَفُّ مَاخُوْذٌ مِنْ قولِهم قَفَوْتُ اَثَرَ فلَانٍ - اَقْفُوْا - قُفُوًّا - وَقَفْوًا اِذَا تَبِعْتَ اَثَرَهٗ (کبیر) اَلْقَافَةُ ، وہ لوگ جو نشانہائے قدم دیکھ کر لوگوں کے حالات پر استدلال کرتے ہیں ۔ کھوج لگانے والے ۔ کھوجی ۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ گدی کو بھی قفا اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ پیچھے ہوتی ہے ۔ وسمی القفاء قفاً لانہٗ مؤخر البدن کانہٗ شیئٌ یتبعہٗ ویقفوہٗ (کبیر)

مَرَحًا : وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ، (آیت نمبر ۳۷)

مَرَحٌ کے معنی خوشی کی وجہ سے اکڑ کر اور اترا کر چلنے کے ہیں ۔ جو شخص اکڑ کر اور اترا کر چلتا ہے وہ زمین پر پاؤں مارتا ہوا اور گردن کو اٹھا کر کبوتر کی طرح ہلاتا ہوا چلتا ہے، یہ متکبرین اور مغرورین کی چال ہے خدا کو پسند نہیں ۔ کبر و غرور یہ صرف خدا کی صفت ہے انسان اگر اس صفت کو اپنا لیگا تو زمین پر شر و فساد پھیلے گا اور انسان کے حق میں اصل تکبر یہی ہے جو کہ مذموم ہے ۔ لیکن اگر دشمن کے مقابلہ پر اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر ہو تو یہ تکبر محمود مطلوب ہے جس کی حدیث میں اجازت ہے ۔

مَرَحٌ کے معنی مختلف بیان کئے گئے ہیں اگر مآل سب کا ایک ہی ہے ۔ بعض اہل تفسیر نے مَرَحًا کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ انسان اپنی قدر سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے بعض نے اسکے معنی زمین پر اکڑ کر چلنے کے

بیان کئے ہیں، وَلَاتَمْشِ فَوْقَ الْاَرْضِ اِلَّا تَوَاضُعًا فکم تحتھا قوم ھمو منک ارفع، وَاِن کُنْتَ فِیْ عِزٍّ وحِرْزٍ ومنعۃٍ فکم مَاتَ من قوم ھمو منک اَمْنَعُ

مولٰنا عبدالدائم جلالی نے مَرَحًا کو ہم فعل لکھا ہے۔ باب سَمِعَ اترا اترا کر اکڑ کر۔ مَرَحٌ اترانے اور غرور آمیز اکڑنے کو کہتے ہیں، مَرِحٌ صفت مشبہ ہے۔ اترانے والا۔ مَرْحٰی تعجب کا لفظ ہے۔ اس آیت سے علماء نے رقص کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے۔ (قرطبی)

اَلْمَرَحُ شِدَّۃُ الفَرَحِ - وقیل التکبر فی المشی وقیل تجاوز الانسان قدرہ (قرطبی)

وَالْمَرَحُ شِدَّۃُ الْفَرَحِ وَالتَّوَسُّعُ فِیْہِ (روح۔ راغب۔ جمل)

مَرَحًا بتقدیر مضاف حال ہے۔ اصل یوں ہے لا تمش فی الارض حال کونک ذا مَرَحٍ (جمل) اور یہ بھی جائز ہے کہ مَرَحًا فعل محذوف کا مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہو۔ ای تمرح مَرَحًا، اور بعض نے مَرِحًا (بکسر الراء) بھی پڑھا ہے یہ صفت مشبہ ہے اس صورتیں اسکا نصب صرف حال ہونے کی وجہ سے ہوگا (روح) لیکن مصدر کی قرارت زیادہ واضح ہے۔ اور معنی میں تاکید پیدا کرنے والی ہے۔ قَالَ الزَّجَّاج مَرَحًا۔ مصدر و مَرِحًا اسم الفاعل وکلاھما جائز الاّ انّ المصدر احسن ھھنا واوکدُ (کبیر)

التَّسْبِيْح : لَا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ

(آیت نمبر ۴۴ سورۃ الاسراء)

تم نہیں سمجھتے ان کا پڑھنا۔ تسبیح کی اصل روح تنزیہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام نسبتوں اور صفتوں سے بری اور بالاتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ صفات اور شان کے منافی ہیں اس کے ساتھ جب بحمدہ کی قید لگ جاتی ہے جس طرح یہاں یُسَبِّحُ بحمدہ ہے تو اس کے اندر تنزیہ کے ساتھ اثبات کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کو تمام اعلیٰ صفات سے متصف قرار دینا۔ لفظ تسبیح اپنے عموم کے ساتھ تسبیح قالی اور حقیقی اور تسبیح حالی اور حکمی دونوں پر شامل ہے۔ مطیعین کی تسبیح حقیقی اور قالی ہوتی ہے۔ غیر مطیعین کی صرف حالی ہوتی ہے (ماجدی)

تسبیح بر وزن تفعیل مصدر ہے۔ تسبیح کے معنی ہیں اللہ کی تنزیہ اور اس کی پاکی بیان

کرنا، سَبْحٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پانی یا ہوا میں تیز گزرنے کے ہیں ۔
اس لحاظ سے تسبیح کے اصلی معنی ہوئے اللہ کی عبادت میں تیزروی کرنا ۔ بسرعت مصروف ہوجانا ۔ عربی میں جس طرح ابعاد کا لفظ، شر کے لئے استعمال ہوتا ہے، تسبیح خیر کے لئے مستعمل ہے اور قول ہو یا فعل یا نیت تسبیح کا لفظ عبادات کے لئے عام ہے ۔ آیت کی تفسیر کے لئے معارف القرآن صـ۴۷۵ جلد ۵ اور تفسیر قرطبی صـ۲۶۶ جلد ۱۰ کا مطالعہ کیا جائے ۔

رُفَاتًا : وَقَالُوٓا۟ ءَإِذَا كُنَّا عِظَٰمًا وَرُفَٰتًا أَءِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ، (آیت نمبر ۴۹) اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہوجائیں گے ہڈیاں اور چورا چورا پھر اٹھیں گے نئے بن کر (معارف)

رُفَاتٌ بوسیدہ گلا ہوا ۔ چورا ۔ جو چیز خشک گھاس کی طرح بوسیدہ ہوکر چور چور ہوجائے وہ رفات کہلاتی ہے ۔ یہ رفتٌ سے مشتق ہے جس کے معنی چورا چورا اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کے ہیں (لغات القرآن)
رَفَتَ الشیٔ کے معنی کسی چیز کو چورا چورا کر دینے کے ہیں ۔ اور جو بھوسہ وغیرہ ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جاتا ہے اسکو رُفاتٌ کہا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر رُفَاتٌ اس رسی کو بھی کہتے ہیں جو بوسیدہ ہوکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ہو (راغب) اور حضرت ابن عباس نے رُفات کے معنی غبار کے کئے ہیں ۔ قال ابن عباسؓ الرُّفَاتُ ، الغُبَارُ ۔ مجاهد : التراب والرُّفَاتُ مَا تَكَسَّرَ وَ بَلِيَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۔ كالفتات والحطام الرضاض عَنْ ابي عبيدة والكسائي والفراء و الاخفش : تقول منه ، رُفِتَ الشَّيْءُ رفتًا اى حُطِمَ فهو مَرْفُوتٌ (قرطبی)
انّ الوَرسَ يَرْفَتُ : عبداللہ بن زبیر نے کعبہ کو گرا کر اس کو ورس کی لکڑی سے بنانا چاہا تھا اس پر لوگوں نے مشورہ دیا کہ ورس کی لکڑی گل جاتی ہے اور بہت جلدی ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے ۔ حدیث میں ہے حتّٰی بلی فاکلته الارضة وعاد رفاتًا (ابن ماجه)

حَدِيدًا : قُلْ كُونُوا۟ حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا (آیت نمبر ۵۰) حدید : تیز لوہا حَدید لوہے کو بھی کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جو بذاتہ باریک ہو ۔ خواہ باعتبار خلقت کے خواہ باعتبار معنی کے ہو حَدید کہتے ہیں، اس صورت میں یہ حِدَّةٌ سے جس کے معنی تیز ہونے

کے ہیں ۔ بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے لفظ حدید مفرد ہے اس کی جمع حدائد اور حدیدات آتی ہے وَهُوَ مُفْرَدٌ وجمعه حدائد و حديدات (روح) حدید کی جمع احداد اور حداد بھی آتی ہے جیسا کہ منجد نے ذکر کیا ہے اور حدائد اور حدیدات یہ جمع حدیدۃٌ کی ہیں جس کی جمع الجمع حدائدات آتی ہے (منجد) مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبران منکرین بعث کو فرمادیں کہ تم پتھر یا لوہا بھی بن جاؤ یا اس سے بھی کوئی سخت چیز جو تمہارے خیال میں زندگی قبول کرنے کی صلاحیتوں سے بالکل خالی ہو جب بھی وہ تمہیں از سرِ نو اٹھائے گا اس کے لئے حیات بعد الموت بالکل آسان ہے ۔

يُنْغِضُوْنَ : فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ (آیت نمبر ۵۱) پھر اب مٹکائیں گے تیری طرف اپنا سر (معارف) الانغاض ، کے معنی دوسرے کے سامنے تعجب سے سر ہلانے کے ہیں ۔ نَغَضَ نَغْضَانًا کپکپی کے ساتھ سر اور دانت ہلانا ۔ النَّغْضُ بہت سر ہلانے والا شتر مرغ نر ۔ النُّغْضُ کندھے کے کنارے کی پتلی ہڈی (راغب) حدیث میں ہے واذا خاتمٌ فی نُغْضِ کتفه الایسر ، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت بائیں مونڈھے کے کنارے پر تھی ، یعنی اس پتلی ہڈی پر تھی جو مونڈھے کے کنارے پر ہوتی ہے ۔

نَغَضَ نغضًا (ن) ، ونُغُوضًا ۔ ونَغَضَانًا ، کانپنا ۔ ہلنا ۔ بیقرار ہونا ۔ نَغَضُوا اِلَى العَدُوِّ دشمن کی طرف مقابلہ کے لئے اٹھنا نَغَضَ الشئَ کسی چیز کو حرکت دینا ۔ نَغَضَ رَاْسَه تعجب یا مسخری سے سر ہلانا (منجد) نَغَضَ رَاْسَهٗ يَنْغُضُ ويَنْغِضُ نغضًا ونُغُوضًا اى تَحَرَّكَ وَاَنْغَضَ رَاسَه اى حَرَّكَه (قرطبی)

اِنْغَاضٌ کے معنی سر ہلانے کے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے اس مسکت جواب کے بعد بھی چُپ رہنے والے نہیں بلکہ اس کے بعد بھی باندازِ تکذیب و استہزار اپنے سر مٹکاتے ہوئے آپ سے سوال کریں گے یعنی يُحَرِّكُوْنَهَا عَلٰى سبيل التكذيب والاستبعاد (کبیر) ابن کثیر ص۴۵ جلد ۳

فرار کہتے ہیں انغاض الرأس کے معنی اوپر نیچے کی طرف سر ہلانے کے ہیں ۔ اسی لئے ظلیم یعنی نر شتر مرغ کو نَغضٌ کہتے ہیں کہ وہ چلتے وقت خوب سر ہلا کر چلتا ہے (کبیر)

اَلْوَسِيْلَةُ : يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ (آیت نمبر ۵۷) اپنے پروردگار کا قرب

ڈھونڈ رہے ہیں (ماجدی)

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ الوسیلۃ، فعیلۃ من وَسَلَ الیہ اذا تقرب الیہ یعنی وسیلۃ صفت کا صیغہ ہے جو فعیلۃٌ کے وزن پر ہے اور وسل الیہ سے ماخوذ ہے۔ وسل کا معنی ہے تَقَرَّب، قریب ہوگیا، علامہ سیوطیؒ نے آیت وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ کے تحت لکھا ہے مَا یُقَرِّبُکُمْ اِلَیْہِ مِنَ الطَّاعَۃِ، وسیلہ وہ چیز ہے جو تم کو اللہ کے قریب کردے یعنی طاعت، اسی طرح مذکورہ آیت کے لفظ وسیلہ کے تحت فرماتے ہیں القُرْبَۃُ بالطاعۃِ، طاعت کے ذریعہ قرب۔

امام رازیؒ اور امام سیوطیؒ نے لفظ وسیلہ کی جو تفسیر فرمائی ہے اسمیں کچھ اختلاف ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ امام رازی کے نزدیک وسیلہ فعیلہ کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے جسکے معنی ہیں قرب کا ذریعہ، قریب کردینے والا۔ اور علامہ سیوطی نے وسیلہ کو صفت بھی قرار دیا ہے اور مصدر بھی۔ ذریعۂ قرب کو بھی وسیلہ کہتے ہیں یعنی طاعت کو بھی اور قرب کو بھی جو طاعت کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے، وجہ جامع یہ ہوسکتی ہے کہ وسیلہ اصل میں مصدر ہے لیکن صفتی معنی میں مستعمل ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ وَسِیْلَۃٌ۔ سبب، دستاویز، نزدیکی مرتبہ۔ بادشاہ کے نزدیک منزلت،

امام راغب فرماتے ہیں کہ الوَسِیْلَۃُ التَّوَسُّلُ الی الشئِ بِرَغْبَۃٍ وَھِیَ اخصُّ من الوصِیْلَۃ (بالصاد) لِتَضَمُّنِھَا بمعنی الرغبۃِ۔ وسیلہ کے معنی کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنے کے ہیں اور یہ وصیلۃٌ سے اخص ہے۔ قرآن پاک میں ہے وابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ۔ دراصل توسل الی اللہ علم وعبادت اور مکارم شریعت کی بجاآوری سے طریق الٰہی کی محافظت کرنے کا نام ہے۔ اور یہی معنی تقرب الی اللہ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنیوالا واصل ہے

علامہ سیوطیؒ نے الاتقان میں حضرت ابن عباسؓ سے وسیلہ کے معنی حاجۃ کے نقل کئے ہیں۔ اور اس پر عنترہ شاعر کا شعر بھی نقل کیا ہے عنترہ کہتا ہے

انّ الرجال لہم الیك وسیلۃ

ان یّاخذوك تکحّلی وتخضّبی

(اتقان) علامہ عبدالماجد دریا آبادی فرماتے ہیں کہ وسیلۃ کے معنی قرب کے ہیں۔ اور یہی

یہاں بھی صحابہ، تابعین اور اکابر مفسرین سے مروی ہے۔ الوسیلۃ، القربۃ (ابن جریر) علامہ قرطبی نے وسیلہ سے مراد جنت لی ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے جنت بھی خود قرب الٰہی ہے۔ وَيَبْتَغُونَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ: یطلبون من اللہ الزلفۃ والقربۃ و یتضرعون الی اللہ تعالٰی فی طلب الجنۃ، وھی الوسیلۃ (قرطبی)

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ لفظ وسیلہ کے معنی ہر وہ چیز جس کو دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا جاسکے اور اللہ کے لئے وسیلہ یہ ہے کہ علم و عمل میں اللہ تعالٰی کی مرضی کی ہر وقت رعایت رکھے۔ اور احکام شرعیہ کی پابندی رکھے۔ مطلب یہ سب حضرات اپنے عمل کے ذریعہ اللہ تعالٰی کے تقرب کی طلب میں لگے ہوئے ہیں (معارف)

مولانا اصلاحی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ وسیلہ کے معنی قربت کے ہیں اور الیہ کی تقدیم سے حصر کا مضمون پیدا ہوگیا ہے۔ یعنی خدا ہی کا قرب اور اسی کا تقرب ڈھونڈو۔ جسکا طریقہ یہ ہے کہ خدا کے احکام و حدود کی پوری پوری پابندی کرو اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرو۔ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ کتاب اللہ اور شریعت ہی ہے۔ اسی وجہ سے کتاب اللہ اور شریعت کو مضبوطی سے تھامنا ہی خدا سے قرب کا واسطہ ہے، گویا آیت میں تنبیہ ہے کہ جن لوگوں نے خدا اور اس کی شریعت سے بے پرواہ ہوکر دوسروں کا تقرب ڈھونڈا، اور ان کو اپنی نجات کا ضامن سمجھے بیٹھے ہیں وہ بڑی غلط امیدوں اور بڑے ہی غلط سہاروں پر جی رہے ہیں (تدبر)

الوسیلۃ: القربۃ بالطاعۃ (جلالین) ای المتقرب بالطاعۃ (جمل) وسیلۃ: ھی القربۃ الی اللہ (کشاف) الوسیلۃ القربۃ والعبادۃ (روح) القرابۃ بالطاعۃ (بیضاوی)

وَسَلَ - يَسِلُ - وَسِيْلَةً وَوَسَّلَ (تفعیل) وتَوَسَّلَ (تَفَعُّلٌ) وَسَلَ اِلَى اللّٰهِ بِعَمَلٍ اَوْ وَسِيْلَةٍ: اللہ تک تقرب حاصل کرنا، صفت، وَاسِلٌ الوَاسِلَةُ - وَالْوَسِيْلَةُ ذریعہ تقرب الوَسِيْلَةُ مَا يَتَقَرَّبُ به الى الغير، جمع وَسِيْلٌ وَوُسُلٌ وَوَسَائِلُ (منجد)

اَلرُّءْيَا: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ

اَلْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ (آیت نمبر ۶۰)
اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو دکھلایا ہم نے، سو جانچنے کو لوگوں سے، اور ایسے ہی وہ درخت جس پر پھٹکار ہے قرآن میں (معارف القرآن)
لفظ رُءْیا عربی زبان میں اگرچہ خواب کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن اس جگہ مراد خواب کا قصہ نہیں بلکہ اس جگہ مراد رُءْیا سے ایک واقعۂ عجیبہ کا بحالتِ بیداری دکھانا ہے (معارف)

عربی بول چال میں جس طرح رؤیا کا اطلاق خواب کی حالت پر ہوتا ہے اسی طرح وہ اس رؤیت پر بھی بولا جاتا ہے جس کا مشاہدہ آنکھ بحالت بیداری کرتی ہے۔ لسان العرب میں اس کی تصریح موجود ہے، وَقَدْ جَاءَ رُؤْیا، فِی الیقظہ اور بلاشبہ رؤیا بیداری میں عینی مشاہدہ کے لئے بھی آتا ہے۔ اور اس پر صاحب لسان العرب نے جاہلی شاعر راعی کا یہ شعر بطور سند پیش کیا ہے ؎

فَکَبَّرَ لِلرُّؤْیَا وَھَشَّ فُؤَادُہٗ
وَبَشَّرَ نَفْسًا کَانَ لِنَفْسًا یَلُوْمُھَا

اُس نے تکبیر کہی اور اسکا دل مسرت سے لبریز ہوگیا۔ اور اُس نے اپنے نفس کو جسے ملامت کر رکھا تھا خوشخبری دی۔ اس منظر کو دیکھ کر جسے اُس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ اسی طرح متنبی شاعر کہتا ہے

؎ وَرُؤْیَاکَ احلٰی فی العیون من الغمض

اور تیرا دیدار میری آنکھوں میں نیند سے زیادہ لذیذ ہے۔ صحیح بخاری کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ رُؤْیَا عَیْنٍ اُرِیَهَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لیلۃ اُسْرِیَ بِہٖ (ابن کثیر) اکثر اہل علم کا قول یہی ہے کہ یہاں الرؤیا سے مراد واقعہ معراج ہے اور لغت میں لفظ رُؤیۃ اور رُؤیا دونوں برابر ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے، رأَیْتُ بعینی رُؤْیَۃً وَرُؤْیًا۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ رؤیا سے مراد خواب کا واقعہ ہے لیکن ان حضرات کا یہ قول ضعیف اور باطل ہے جیسا کہ ہم اس سورت کی ابتدائی آیات میں واضح کرچکے ہیں دیکھئے لفظ سُبْحَانَ اور اَسْرٰی والمراد بالرؤیا، مَا عَایَنَہٗ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ اسرٰی بہ من العجائب السماویۃ والارضیۃ کما اخرجہ البخاری و الترمذی۔ والنسائی وجماعۃ عن ابن عباس وھی عند کثیر بمعنی الرؤیۃ

مطلقاً وھما مصدر رأی، مثل القربی
القرابۃ (روح) ؎

وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ : شَجَرَةٌ
درخت ۔ مَلْعُوْنَةٌ پھٹکار کیا ہوا اس سے
اشارہ شجرِ زقوم کی طرف ہے جس کے متعلق
قرآن میں ہے کہ وہ دوزخ میں ہوگا اس کو
دوزخی بھوک سے بیتاب ہو کر کھائیں گے پھر
بیتاب ہو کر کھولتا پانی پیاسے اونٹوں کی طرح
پئیں گے ۔ شجرہ کے لئے ملعونۃ کی صفت
مبارکۃ کی ضد ہے ۔ ایک تو شجرہ مبارکہ ہوتا ہے
جو اپنے سائے، اپنی طراوت اور اپنے پھل ہر
چیز سے خلق کو فیوض پہنچاتا ہے ۔ اسکے برعکس
شجرہ ملعونہ ہوتا ہے جسمیں نہ سایہ نہ پھل صرف
کانٹوں کا ڈھیر، کڑواہٹ اور زہر سے بھرا ہوا
خلق خدا کے لئے ایذا اور مصیبت ہے، زقوم
کی یہی صفت ہے ۔

اَحْتَنِكَنَّ : لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ ،
(آیت نمبر ۶۲) لَاَحْتَنِكَنَّ ، باب افتعال کے
مصدر احتناکٌ سے واحد متکلم بالام تاکید
بانون تاکید ثقیلہ کا صیغہ ہے ۔ احتناک،
دھاٹی دینا لگام دینا ۔ قابو میں کرنا،
اس کے اشتقاق میں دو احتمال ہیں ایک
تو یہ کہ حَنَكْتُ الدَّابَّةَ سے مشتق ہو جسکے
معنی جانور کو لگام دینے یا رسی باندھنے کے
ہیں ۔ معنی یہ ہونگے کہ میں اولاد آدم کو لگام
دے دونگا ۔ یا ان کو اپنی حبلِ ضلالت
سے ایسا جکڑ دوں گا کہ وہ تیری ہدایت کی
طرف پلٹ کر نہ دیکھیں گے ۔ اور دوسرا
احتمال یہ ہے کہ یہ اِحْتَنَكَ الجرادُ الارضَ
سے مشتق ہو جس کے معنی ہیں ٹڈی دل نے
زمین کی روئیدگی ساری چٹ کرلی ۔ پس
آیت کے معنی یہ ہونگے کہ میں اس طرح
تباہ و برباد کروں گا جیسے ٹڈی زمین سے
نبات کو صفا چٹ کر دیتی ہے (راغب تفسیر)
امام فخرالدین رازی نے احتناک میں
دو قول نقل کئے ہیں ۔ ایک یہ کہ احتناک کلی
طور پر اخذ کر لینے سے عبارت ہے ۔ کہا
جاتا ہے احتنك فلانٌ مَا عِندَ فلانٍ من

؎ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ الرؤیا رؤیۃ کی طرح مصدر ہے ان دونوں میں
فرق صرف یہ ہے کہ رؤیا کا غالب استعمال نیند کی حالت پر ہونا اور رؤیۃ عام ہے اور لغت میں
دونوں کا استعمال ایک دوسرے میں ہوتا ہے (تحقیق الرؤیا)

مال، یعنی فلاں نے فلاں کے مال کو پوری
طرح لے لیا اور بالکلیہ اُس پر قبضہ کرلیا،
اس صورت میں آیت کے معنی ہونگے لَاَسْتَأْ
صِلَنَّهُمْ بِالْاِغْوَاء، یعنی اغواء کے ذریعہ
بیخ و بن سے اکھاڑ دوں گا۔ اور دوسرا قول
یہ ہے۔ یہ اہلِ عرب کے قول حَنَكَ الدَّابَّةَ
يَحْنَكُهَا سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں جانور
کو چلانے کے لئے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے سے
رسی یا لگام سے باندھنا۔ اس صورت میں
آیت کے معنی یہ ہونگے میں ان کو جانوروں
کی طرح اُن کے گلے میں رسی ڈال کر گناہوں
کی طرف ہنکاؤں گا (اعاذنا اللہ)
قال ابو مسلم۔ الاحتناك۔ افتعال من
الحنك (کبیر) احتناک کے معنی کسی چیز
کا استیصال اور فنا کر دینا یا پوری طرح
سے اس پر غالب آنا ہیں (معارف)

مَوْفُوْرًا: فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ
جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (آیت نمبر ۶۳)

سو دوزخ ہے تم سب کی سزا بدلہ پورا۔
مَوْفُوْرٌ۔ مکمل چیز۔ پوری شے۔ وَفْرٌ سے
اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ پورا کیا ہوا۔
اَلْوَفْرُ: مال کثیر کو کہتے ہیں جسمیں کسی چیز کی
کمی نہ ہو۔ اور وَفَرْتُهٗ وَفْرًا و وُفُوْرًا
وَفِرَةٌ کے معنی کسی چیز کو کرنے کے ہیں۔
اور وَفَّرْتُهٗ (تفعیل) کے معنی کسی چیز
کو زیادہ کرنے کے آتے ہیں۔ وَفَرْتُ عِرْضَهٗ
میں نے اس کی عزت کی، اُس کو گالی نہیں
دی یعنی اُس کی عزت کا پورا پورا خیال رکھا
امام رازیؒ فرماتے ہیں یہ لفظ لازم اور
متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، کہا
جاتا ہے۔ وَفَرْتُهٗ اَفِرُهٗ وَفْرًا وَ وَفْرَةً
فَهُوَ مَوْفُوْرٌ۔ زیادہ بڑھنا۔ سبعہ معلقہ
کا مشہور شاعر زھیر کہتا ہے ؎

ومن يجعلِ المعروفَ من دونِ عِرْضِهٖ
يَفِرْهُ ومن لَا يتقِ الشَّتْمَ يُشْتَمِ

جو اپنی عزت کے لئے احسانمندی کو آڑ بنائیگا
وہ عزت کو بڑھائے گا اور جو دوسروں کو
گالی دینے سے پرہیز نہ کرے گا اُس کو بھی
گالی دی جائے گی۔
اور لازم معنی میں جیسا کہ وَفَرَ المَالُ
يَفِرُ وُفُوْرًا فهو وَافِرٌ۔ مال کا زیادہ ہونا
يقالُ وفرتُهٗ اَفِرُهٗ وَفْرًا وَوَفرَ المالُ
بنفسه يَفِرُ وُفُوْرًا فهو وَافِرٌ۔ فهو
لازم ومتعدی (قرطبی)
وَفْرَةٌ: وہ بال جو کانوں تک ہوں —
حدیث میں ہے۔ کان شعر رسول اللہِ

صلی اللہ علیہ وسلم وفرۃ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال کانوں کی لَوتک تھے، جو بال کانوں کی لَوتک ہوں ان کو وفرہ اور پھر جو اس سے نیچے ہوں وہ جُمَّۃ اور اس سے نیچے والے لِمَّۃ جو مونڈھوں تک ہوں الیفارُ اور توفیر، بہت بڑھانا زیادہ کرنا۔ بچانا
اِستِیفَارٌ پورا لینا۔
الوَفرُ۔ المالُ التّام، یقال وَفَرتُ کذا تَمَّمتُہٗ وکَمَّلتُہٗ اَفِرُہٗ (راغب)
المَوفُورُ: الشئ التّام (منجد)

اِستَفزِز: وَاستَفزِز مَنِ استَطَعتَ مِنھُم بِصَوتِکَ وَاَجلِب عَلَیھِم بِخَیلِکَ (آیت نمبر ۶۴)

اور ان میں سے جس پر تیرا قابو چلے تو اپنی پکار سے اس کا قدم اکھاڑ دے اور ان پر اپنے سوار چڑھا لا (ماجدی)
اِستَفزِز کے معنی گھبرا دینے اور پریشان کر دینے کے ہیں۔ فاراد ان یَستَفِزَّھُم من الارض، سو اس نے چاہا کہ انکا قدم سرزمین مصر سے اکھاڑ دے۔ فَزَّنِی فلانٌ کے معنی ہیں اس نے مجھے پریشان کر کے میری جگہ سے ہٹا دیا۔ اِستَفزِز باب استفعال کے مصدر استفزازٌ سے امر کا صیغہ ہے

اصل مادہ فَزٌّ ہے جو لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ ہٹ جانا، ہٹا دینا سرک جانا۔ سرکا دینا۔ گھبرا جانا۔ حدیث شریف میں ہے لَا یُغضِبُہٗ شَیئٌ وَلَا یَستَفِزُّہٗ، کوئی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ نہ دلاتی انّ قلوب الجھال یستفزّھا الاطماع جاہلوں کے دلوں کو طمع ہلکا کر دیتی ہے وہ طمع میں آکر بیوقوف بن جاتے ہیں، اِستَفَزَّہٗ الخَوفُ، ڈر نے اس کو گھبرا دیا، اور قَعَدَ مُستَفِزًّا، وہ بے اطمینانی سے بیٹھا، غیر مطمئن ہو کر بیٹھا۔ الفِزُّ مصدر ہے۔ ہلکا پھلکا آدمی نیل گائے کا بچہ، جمع افزازٌ۔ فَزَّ یَفِزُّ (ن)، فَزًّا۔ اکیلا ہونا۔ فَزَّ عنہٗ۔ جُدا ہونا، عدول کرنا۔ فَزَّ الظّبیُ، ہرن کا گھبرانا فَزَّہٗ دھوکہ دیکر غالب آنا۔ ہوش اڑا دینا، گھبرا کر نکال لینا۔ فَزَّہٗ عن مکانہٖ، اس کے مکان سے نکالنا اور باہر سے آنا، امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ استفزز کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں۔ مراد اس جگہ حق سے قطع کرنا ہے،
وَاَصلُہٗ القطعُ: والمعنی استزلّہٗ بقطعک ایاہ عن الحق وَاستَفَزَّہٗ الخَوفُ ای استخفّہٗ (قرطبی)
وَالفَزُّ: الخَفِیفُ (کشاف) واصل معنی

الفَزّ القطعُ ومنه تَفَزّزَ الثوبُ اذا انقطع (روح) لیکن لغت میں تَفَزّزَ (دو زاؤں سے) غیر مستعمل ہے۔ لم نجد فی کتب اللغۃ (تفزّز الثوب) بزایین بھذا المعنیٰ (حاشیہ قرطبی)

البتہ تَفَزّرَ جس میں زار کے بعد حرف را مہملہ ہے کے معنی قطع ثوب کے آتے ہیں (حاشیہ قرطبی) چنانچہ منجد میں ہے۔ تفزّر الثوب، کپڑا بوسیدہ ہو کر پھٹ گیا، فلیُلاحَظ،

صَوْت: اپنی پکار سے (ماجدی)

صَوْتٌ واحد، جمع اَصْوَاتٌ آوازیں صَوت بمعنی آواز معروف ہے، شیطان کی آواز کیا ہے اسکے متعلق حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ گانے، مزامیر اور لہو و لعب کی آوازیں، یہی شیطان کی آواز ہے جس سے وہ لوگوں کو حق سے قطع کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ مزامیر موسیقی اور گانا بجانا حرام ہے۔ (معارف القرآن)

روی عن مجاھد انہ الغناء واللھو (جصاص-قرطبی) قال ابن عباس ھو الصّوت الذی یدعوا بہ ای معصیۃ اللہ وکل صوتٍ دعی بہ الی النساء فھو من صوت الشیطان (جصاص)

اَجْلِبْ : وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ :

اَجْلِبْ، لے آ، چڑھا لا، اِجْلَابٌ سے جس کے معنی اکٹھا کرنے شور مچانے اور کھینچ لانے کے ہیں۔ امر کا صیغہ ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ اصل الجلب سوق الشیئ: جَلْبٌ کے اصل معنی کسی چیز کو چلانے اور ہنکانے کے ہیں۔ اور اَجْلَبْتُ عَلَيْهِ صِحتُ عَلَيْهِ بِقَهْرٍ: کسی پر چیخ کر زبردستی آگے بڑھانا۔ اَجْلَبَ علیہ۔ اس کو آواز کی برانگیختہ کیا، ابھارا۔ اَجْلَبَہٗ اس کی مدد کی۔ جَلُوبَۃٌ وہ مال جو دوسرے ملکوں سے فروخت کے لئے آئے۔ حدیث میں ہے قدم اعرابیٌّ بجلوبۃ منزل علی طلحۃ فقال طلحۃ نھی النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبیع حاضرٌ لبادٍ[۱] جَلَبَۃٌ شور، غوغا۔ اصل الاجلاب السوق بجلبۃ (قرطبی) واجلب من الجلبۃ وھی

[۱] ایک بدوی تجارت کا مال لیکر آیا اور حضرت طلحہ بن عبد اللہ کو کہا کہ اسکا مال فروخت کر دے تو حضرت طلحہؓ نے کہا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے کہ شہری دیہاتی کا مال فروخت کرے۔

الصیاح (کشاف) جَلَبَ اور اَجْلَبَ
(افعال) دونوں ہم معنی ہیں جَلَبَ عَلٰی
فرسہٖ واجلب علیہ : صَاحَ بہٖ من
خلفہٖ واستحثّہٗ للسبق (حاشیہ کشاف)

شَارِكْ : وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ
وَالْأَوْلَادِ (آیت نمبر ۶۴) ۔
تو اُن کا شریک ہوجا، شَارِكْ مُشَارَكَةٌ
سے جسکے معنی آپس میں ایک دوسرے کے
ساتھ شریک ہونے کے ہیں امر حاضر کا
صیغہ ہے ۔

شِرْكَةٌ اور مشارَكَةٌ کے معنی دو ملکوں
کے آپس میں مل جانے کے ہیں۔ بعض نے
کہا ہے کہ کسی ایسی شئے کا پایا جانا جو دو یا
دو سے زائد کے لئے ہو خواہ وہ شئی ذات
ہو یا وصف، جیسا کہ حیوان ہونے میں انسان
اور گھوڑے کا باہم شریک ہونا، یا ایک
گھوڑے کا دوسرے گھوڑے کے ساتھ کمیت
یا مشکی ہونے میں شریک ہونا ۔

علامہ قرطبیؒ نے ابن عباسؓ کے حوالہ سے
لکھا ہے کہ شیطان کی شرکت فی الاموال یہ ہے
کہ مال ناجائز و حرام طریقوں سے کمایا جائے
اور شرکت فی الاولاد یہ کہ بچوں کے نام
مشرکانہ رکھے جائیں ۔ قرطبی

یُزْجِیْ (آیت نمبر ۶۶) اِزْجَاءٌ باب
افعال سے فعل مضارع ہے وہ چلاتا ہے
دیکھئے لفظ مُزْجَاةٌ سورۂ یوسف ۔

قَاصِفًا : (آیت ۶۹) القَاصِف، تیز
اور سخت ہوا جو درختوں اور عمارتوں کو توڑتی
ہوئی چلی جائے یہ باب ضَرَبَ کے مصدر
قَصْفٌ سے اسم فاعل ہے ۔ لغت میں قصف
کے معنی ہیں توڑ دینا، لیکن یہ معنی اسوقت
ہونگے جب ضَرَبَ سے ہو سَمِعَ سے یہ لفظ
لازم آتا ہے، جیسے قَصِفَ العُوْدُ، لکڑی
اتنی نرم ہوگئی کہ ٹوٹنے کے قابل ہوگئی ۔
قَصِفَ النَّبْتُ ، درخت کی یا سبزی کی
شاخیں لمبی ہوکر جھک گئیں کہ ٹوٹ جانیکا
اندیشہ ہوگیا ۔ اور قَصِفَتِ الشَّجَرَةُ، درخت
اتنا بوسیدہ ہوگیا کہ ٹوٹنے کا اندیشہ ہوگیا،
باب ضَرَبَ سے اسکے معنی شور کرنے اور
گرجنے کے بھی آتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے رَعْدٌ
قَاصِفٌ ، گرجنے والے بادل سخت آواز
والی گرج ۔ قَصَفَتِ الرِّيحُ السَّفِيْنَةَ، تیز
ہوا نے کشتی کو توڑ دیا ۔ القصیف، درخت
کا ٹوٹا ہوا، اور علیحدہ شدہ جزو ۔
القَاصِفُ : الريح الشديدة التي
تُكسر بشدتها ، من قصف الشئ

يَقْصِفُهٗ اى كسرهٗ بشدة، والقصف الكسر (قرطبى) القاصف: الكاسر يقال قصف الشئ يقصفهٗ قصفًا، اذا كسرهٗ بشدّة، والقاصف من الريح التى تكسر الشجرة واراد هُنا ريحًا شديدةً تقصف الفُلك (كبير)

صاحبِ کشاف فرماتے ہیں کہ قاصِفٌ وہ ہوا ہے جس میں سخت آواز ہو۔ وھی الریح التی لھا قصیفٌ وھو الصوت الشدید کانھا تتقصّف ای تتکسّر۔ وقیل التی لا تمر بشئ الا قصفتہٗ (کشاف) تکسّر الشئ، کسی چیز کو توڑنا۔ وفی بعض الروایات: فانتھی الیہ ولہٗ قصیفٌ مخافۃ ان یضربہٗ بعصاہٗ۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیکر جب بحر قلزم پر پہنچے تو وہ ایک ڈراونی آواز کر رہا تھا اس خوف سے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر اپنا عصا نہ ماریں۔ رأیتُ الناسَ مُتقصِّفِیْنَ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ایک پر ایک گر رہے تھے۔ قَصِیْفٌ ہائلٌ: ڈراونی آواز یأتیہ الموتُ فیقصِفُہٗ موت آکر اس کو توڑ ڈالتی ہے۔ قَصْفَاءُ ایک جانور کا نام ہے۔

تَبِيْعًا: ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا، (آیت نمبر ۶۹)

تَبِیْعٌ، پیچھا کرنے والا مددگار۔ تبعٌ سے فَعِیْلٌ کے وزن پر فاعل ہے۔ چونکہ مدعی دعوے کے اور مددگار مدد کے درپے ہوتا ہے اسلئے مجازاً مدعی اور مددگار کے معنی بھی آتے ہیں۔ التَبِیْعُ: المطالب (خازن)

اِمَامٌ: يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ۔ (آیت نمبر ۷۱) جس روز ہم تمام آدمیوں کو ان کے نامۂ اعمال سمیت (میدان حشر میں) بلاویں گے (ترجمہ تھانوی) اس آیت میں لفظ امام بمعنی کتاب ہے، جیسا کہ سورۂ یٰسٓ میں ہے وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ، اسمیں امامٍ مبینٍ سے مراد واضح کتاب ہے اور کتاب کو امام اسلئے کہا گیا ہے کہ بھول چوک اور اختلاف کے وقت کتاب ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور ترمذی شریف کی حدیث بروایت ابوہریرہؓ جس کو ترمذی نے حسن غریب کہا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام سے مراد اس آیت میں کتاب ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ قال

یدعیٰ احدھم فیعطیٰ کتابہ بیمینہ یعنی آیت یَوۡمَ نَدۡعُوۡا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمۡ کی تفسیر میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ اعمال اسکے داہنے ہاتھ میں دیا جائیگا اس حدیث سے یہ بھی متعین ہوگیا کہ امام بمعنی کتاب ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کتاب سے مراد نامۂ اعمال ہے اس لئے بیان القرآن میں اسکا ترجمہ نامۂ اعمال سے کیا گیا ہے۔

امام قرطبی پوری حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ والکتاب یسمّی اماما لانہ یرجع الیہ فی تعرف اعمالھم ابن عباس ضحاک۔ قتادہ اور حسن نے بھی یہی معنی مراد لئے ہیں۔ باماھم: ای بکتابھم، ای بکتاب کل انسان منھم الذی فیہ عملہ۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر آدمی کو اسکے نامۂ اعمال سمیت بلایا جائے گا۔ ابن زید نے کہا ہے کہ امام سے مراد الہامی کتاب ہے جو خدا کی طرف سے بذریعہ رسول ہم تک پہنچی۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ہر آدمی کو اُس کی اس کتاب سمیت بلایا جائے گا جسکو وہ تلاوت کرتا تھا۔ اہلِ تورات کو تورات سمیت اور اہلِ قرآن کو قرآن سمیت بلایا جائے گا۔ اور سوال ہوگا کہ تم نے ان پر کتنا عمل کیا (قرطبی)

حضرت علیؓ اور مجاہد وغیرہ مفسرین سے یہاں لفظ امام کے معنیٰ مقتدا اور پیشوا کے بھی منقول ہیں۔ ہر شخص کو اسکے پیشوا اور مقتدا کے نام سے پکارا جائے گا۔ خواہ وہ پیشوا، انبیاء و صالحین ہوں یا گمراہ و ضال یا بدعت و ضلالت کی طرف دعوت دینے والے غلط رہنما۔ (قرطبی صفحہ ۲۹۶، ۲۹۷ جلد ۱۰)

امام: مقتدا۔ پیشوا۔ یہ فِعَالٌ کے وزن پر اسم ہے بمعنی مَنۡ یُؤتَمُّ بِہٖ کے یعنی جسکا قصد کیا جائے۔ چونکہ مقتدا اور راہنما کا قصد کیا جاتا ہے اسلئے اس کو امام کہا جاتا ہے۔ امام کے لئے برحق ہونا ضروری نہیں۔ باطل پرست اور غلط رو لوگ بھی جن کی اقتدا کی جاتی ہے امام کہلاتے ہیں۔

فَتِيۡلًا : وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ٭

(آیت نمبر ۷۱) اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اصل میں فَتَلۡتُ الۡحَبۡلَ کے معنی ہیں رسّی کو بل دینا، باٹنا اور بٹی ہوئی رسّی کو فَتِيۡلٌ کہا جاتا ہے اور فتیلؔ اس باریک اور نرم تاگہ کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں پڑا ہوتا ہے اور وہ چونکہ

نہایت معمولی سا ہوتا ہے اسلئے حقیر شئے
کے لئے وہ ضرب المثل بن گیا۔ امام راغب
فرماتے ہیں کہ فَتِیلٌ اصل میں اس میل کچیل
کو کہتے ہیں جو دُو انگلیوں کے درمیان لیکر
بٹی جاتی ہے اسکی تفصیل گزرچکی ہے (دیکھئے
سورۂ نساء)

دُلُوْكِ : اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ (آیت ۷۸)
نماز قائم کیجئے آفتاب ڈھلنے کے بعد سے
رات کے اندھیرے ہونے تک۔ دُلُوْك
کے معنی جھکاؤ یا میلان کے ہیں۔ معنی
الدلوك فی کلام العرب ۔ المیل
(ابن جریر) عن ابن عباس دلوکھا
زوالھا (ابن کثیر)

قال ابوبکر۔ ھٰؤلاءِ الصحاب
قالوا ان الدلوك المیل وقولھم
مقبول فیہ لانہم من اھل اللغۃ
(جصاص) دلوك الشمس ھو زوالھا
من کبد السماء وھو اختیار الاکثرین
من الصحابہ والتابعین (کبیر)

دلوك الشمس کے دو درجے ہوتے ہیں
ایک تو اسکا عروج نصف النہار سے پستی
کی طرف مائل ہونا جیسے عام بول چال میں
دو پہر کہتے ہیں۔ دوسرا اس کا ڈھل کر
اُفق پر نظر کے مقابل آجانا۔ جسے عام بول
چال میں سہ پہر کہتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ
جمہور ائمہ تفسیر نے اس آیت کو پانچوں نمازوں
کے لئے جامع حکم قرار دیا ہے کیونکہ دلوک
کا لفظ اصل میں میلان کے معنی میں آتا ہے
اور میلان زوالِ آفتاب کے وقت شروع
ہوتا ہے۔ اور غروب کو بھی کہہ سکتے ہیں لیکن
جمہور صحابہ اور تابعین نے اس جگہ لفظ دلوک
کے معنی زوالِ آفتاب ہی کے لئے ہیں (معارف)

اہلِ تفسیر کے لفظ دلوک میں دو قول ہیں
ایک یہ کہ دلوک سے مراد زوال ہے، انہٗ
زوال الشمس عن کبد السماء۔ یہ قول
حضرت عمرؓ، ابن عمرؓ، ابوہریرہؓ اور ابن عباسؓ
کا ہے اور یہی قول تابعین میں سے ایک
بڑی جماعت کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے
کہ دلوک سے مراد غروب آفتاب ہے کہتے ہیں
دَلَکَتْ بَرَاحِ۔ سورج غروب ہوگیا۔ براح
سورج کے لئے اسماء میں سے ایک اسم ہے
ایک شاعر کہتا ہے ؎

ھٰذا مقامُ قدمی رباحِ
ذبّب حتّٰی دَلَکَتْ بَرَاحِ

ابن عطیہ کہتے ہیں الدلوک کے اصل معنی لغت میں مائل ہونے کے ہیں پھر اُس کے مختلف درجے ہیں ۔ پہلا درجہ زوال کا ہے اور آخری غروب کا ہے ۔ اور زوال سے غروب تک کا جو وقت ہے اُس کو بھی دُلوک کہتے ہیں ۔ چونکہ اسمیں سورج حالتِ میل میں رہتا ہے (قرطبی) صاحبِ کشاف نے دونوں معنی بیان کئے ہیں ۔

دلکت الشمس : غربت ۔ وقیل زالت (کشاف) امام راغب فرماتے ہیں کہ یہ اصل میں دلکتُ الشمس کے محاورے سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کوئی چیز دیکھنے کے لئے آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھ کر دھوپ کو رفع دفع کرنا ۔ اسی سے دَلکتُ الشئیَ فی الراحۃ کا محاورہ ہے جسکے معنی کسی چیز کو ہتھیلی میں لیکر ملنے کے ہیں ۔

ماوردی کہتے ہیں جن حضرات نے دُلوکَ کو غروب کے لئے اسم قرار دیا ہے تو اسلئے کہ غروب کے وقت انسان آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اسکی جائے غروب کو دیکھتا ہے توشعاعوں کی شدت کی وجہ سے آنکھیں ملتا ہے (قرطبی)

اسکا اشتقاق دلکٌ سے ہے جسکے معنی ملنے کے ہیں ۔ قال صاحب الکشاف : واشتقاقہ من الدلک، لان الانسان یدلک عینہٗ عند النظر الیھا (کشاف) دَلَکَ ، یَدْلُکُ (ن) دَلْکًا ۔ دَلکَ الشئیَ ، کسی چیز کو رگڑنا ، ملنا ۔ کُھرچنا ، دلکہ الدھر ۔ اس کو زمانے نے رگڑ کر تجربہ کار بنادیا ۔ صفت دَالِکٌ ، مدلوکٌ مفعول ہے ، البعیر المدلوک کمزور گھٹنوں والا اونٹ ، وہ شخص جو سفر سے تجربہ کار ہوگیا ہو ۔

غَسَقِ : اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ (آیت نمبر ۷۸) لفظ غسق کے معنی رات کی تاریکی مکمل ہوجانے کے ہیں ۔ امام مالکؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے غسق کی یہی تفسیر نقل فرمائی ہے (معارف) الغَاسِقُ تاریک رات ۔ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ، اور شب تاریکی کی برائی سے جب اسکی تاریکی چھا جائے ۔ غَاسِقٌ اُس چاند کو بھی کہتے ہیں جو گہن لگ کر سیاہ ہوجائے ۔ الغَسَّاق : دوزخیوں کے اجسام سے بہنے والے لہو یا پیپ ۔ الغَسَّاق ۔ نہایت ٹھنڈا سُن کردینے والا ۔ حَمِیْمٌ وَّغَسَّاق : نہایت ٹھنڈا ۔ وغَسَقَ الَّیْلِ : اجتماعہٗ وظلمتہٗ

وقال ابو عبیدہ اَسَقُ سوادُ اللیل
ابن قیس کہتا ہے ؎
انّ ھٰذا اللّیلَ قد غسقا
وَاشتَکَیتُ الھَمَّ وَالْاَرَقَا
امام قرطبی فرماتے ہیں، الغسق بفتح السین اسم ہے اور اس کے اصل معنی بہنا اور جاری ہونے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے غَسَقَتِ العَیْنُ، آنکھ سے پانی یا آنسو بہنے لگے اور غسق الجرح غسقانًا۔ زخم سے زرد رنگ کا پانی بہنا اور اغسَقَ المؤذن: کے معنی ہیں مؤذن نے مغرب کی نماز تاریک رات تک مؤخر کردی (قرطبی)
امام النحو واللغۃ کا قول صاحب تفسیر قرطبی نے نقل کیا ہے کہ الغَاسِق اصل لغت میں البارد کے معنی میں آتا ہے اور رات کو بھی غاسق اسی لئے کہتے کہ رات بہ نسبت دن کے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ قال الزجاج - الغاسِق فی اللغۃ البارد وسمی اللیل غاسِقًا لانّہٗ اَبْرَدُ من النھار (قرطبی)

قُرْاٰنٌ : اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا (آیۃ نمبر ۸۷، سورۂ بنی اسرائیل)
بیشک فجر کا قرآن پڑھنا ہوتا ہے روبرو (معارف القرآن) اس جگہ لفظ قرآن بول کر نماز مراد لی گئی ہے کیونکہ قرآن نماز کا جزو اعظم ہے۔ اکثر ائمہ تفسیر، ابن کثیر، قرطبی۔ مظہری وغیرہ نے یہی معنی لکھے ہیں،
وعَبّرَ عنھا بالقراٰن خاصۃ دون غیرھا من الصلوٰۃ، لانّ القراٰن ھُوَ اعظمُھا (قرطبی)
لفظ قرآن یہاں منصوب ہے اور اس کے نصب میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ لفظ صلوٰۃ پر عطف کرکے اَقِمِ کے تحت رکھا جائے یعنی تقدیر عبارت یوں ہوگی، اَقِمْ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ، اور دوسری صورت یہ کہ اسکا نصب تخصیص کے پہلو سے ہو یعنی اَخُصُّ بالذّکر قراٰن الفجر، اس تخصیص ذکر سے نماز فجر کی خاص اہمیت معلوم ہوتی ہے۔
مَشْھُوْدًا : یہ لفظ شہادت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں حاضر ہونا اسوقت حسب تصریح احادیث صحیحہ رات اور دن کے فرشتوں کی جماعتیں حاضر نماز ہوتی ہیں۔ اسلئے اسکو مشہود کہا گیا ہے (معارف)

تَھَجَّدْ : وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ (آیت نمبر ۷۹)
لفظ تہجد ہجود سے مشتق ہے اور یہ لفظ دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسکے معنی

سونے کے بھی آتے ہیں اور جاگنے بیدار ہونے کے بھی اس جگہ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ کے معنی یہ ہیں کہ رات کے کچھ حصہ میں قرآن کے ساتھ بیدار رہا کرو کیونکہ بہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ قرآن کے ساتھ بیدار رہنے کا مطلب نماز ادا کرنا ہے۔ اسی رات کی نماز کو اصطلاحِ شرع میں نماز تہجد کہا جاتا ہے، اور عموماً اسکا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ کچھ دیر سوکر اُٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جاتی ہے وہ نماز تہجد ہے لیکن تفسیر مظہری میں ہے کہ مفہوم آیت کا اتنا ہے کہ رات کے کچھ حصہ میں نماز کیلئے نیند ترک کردو، اور یہ مفہوم جس طرح کچھ دیر سونے کے بعد جاگ کر نماز پڑھنے پر صادق آتا ہے، اسی طرح شروع ہی میں نماز کے لئے نیند کو مؤخر کرکے نماز پڑھنے پر صادق آتا ہے اس لئے نماز تہجد کے لئے پہلے نیند ہونے کی شرط قرآن کا مدلول نہیں۔ پھر بعض روایاتِ حدیث سے بھی تہجد کے اسی عام معنی پر استدلال کیا ہے۔ امام ابن کثیر نے حسن بصری سے جو نماز تہجد کی تعریف نقل کی ہے وہ بھی اسی عموم پر شاہد ہے

اُن کے الفاظ یہ ہیں، قال الحسن البصری هو ما كان بعد العشاء ويحمل على ما كان بعد النوم (ابن کثیر) یعنی حسن بصری فرماتے ہیں کہ نماز تہجد ہر اُس نماز پر صادق آتا ہے جو عشاء کے بعد پڑھی جائے البتہ تعامل کی وجہ سے اس کو کچھ نیند کے بعد پر محمول کیا جائے گا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ نماز تہجد کے لئے بعد النوم ہونا شرط نہیں اور الفاظ قرآن میں بھی یہ شرط مذکور نہیں لیکن عموماً تعامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہی رہا ہے کہ نماز آخر رات میں بیدار ہوکر پڑھا کرتے تھے اسلئے اس کی افضل صورت یہی ہوگی (معارف)

التهجد فى اللغة السهر للصلوٰة اوالذكر الله وقيل التهجد التيقظ بما ينفى النوم (جصاص) التهجد التيقظ والسهر بعد نومه من الليل (ماجدی از ابن جریر)

مَقَامًا مَّحْمُوْدًا: عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (آیت نمبر ۷۹) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس آیت میں مقامِ محمود کا وعدہ کیا

گیا ہے۔ یہ مقام تمام انبیاء میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اسکی تفسیر میں اقوال مختلف ہیں۔ مگر صحیح وہ ہے جو احادیث صحیحہ میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ یہ مقام شفاعتِ کبریٰ کا مقام ہے۔ میدانِ حشر میں جب بنی آدم جمع ہونگے اور نبی اور پیغمبر سے شفاعت کی درخواست کریں گے تو تمام انبیاء علیہم السلام عذر کردیں گے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ تمام بنی آدم کی شفاعت کی درخواست کریں گے۔ وھو مقام الشفاعۃ عند الجمھور (مدارک)

وعن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ھو مقام الذی اشفع لامتی فیہ (ابن کثیر) الشفاعۃ للناس یوم القیامہ (قرطبی)

یہاں لفظ مقام میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ ظرف مکان ہو بمعنی کھڑا ہونے کی جگہ، صاحب لغات القرآن نے اسی کو ظرف مکان ہی کے معنی میں لیا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ مقام یہاں مصدر ہو اور مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہو۔ صاحبِ تدبر نے اسی کو اختیار کیا ہے فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک مقام ظرف کے معنی میں نہیں مصدر کے معنی میں ہے اور یہاں مفعول مطلق کی حیثیت رکھتا ہے، چونکہ لفظ بَعَثَ اور مقام میں معنی کا اشتراک موجود ہے اس لئے کہ بعث کے معنی اٹھانے اور مقام کے معنی کھڑے ہونے اور اُٹھنے کے ہیں اس وجہ سے اس کے مفعول مطلق ہونے میں کوئی قباحت نہیں (تدبر)

مُدْخَلَ وَمُخْرَجَ: اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (آیت نمبر ۸۰) مُدْخَلٌ باب افعال سے مصدر میمی ہے۔ داخل کرنا۔ مُخرج، مصدر نکالنا، اس آیت میں مُدْخَلٌ سے مراد مدینہ منورہ اور مخرج سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ مکہ مکرمہ سے نکالنا اور مدینہ منورہ میں داخل کرنا۔ یا امن کے ساتھ مکہ سے نکالنا اور پھر فاتحانہ مکہ ہی میں داخل کرنا مراد لیا گیا ہے۔

قرئ۔ مدخل و مخرج بالضم والفتح بمعنی المصدر (کشاف) المدخل والمخرج بالضم المیم، بمعنی الادخال والاخراج کقولہ: اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبَارَکًا۔ ای انزالا لا اری فیہ ما اکرہ (قرطبی)

نَاٰی : اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۔
(آیت نمبر ۸۳) تو وہ منہ موڑ لیتا ہے اور کروٹ پھیر لیتا ہے (ماجدی) نَاٰی مصدر نَأْیٌ سے ماضی کا صیغہ ہے بمعنی وہ دُور ہو گیا (ابو عبیدہ) روگردانی کی، موڑا، (ابو عمرو بن العلاء) چونکہ آیت متعدی بالباء ہے اس لئے بر قول ابو عبیدہ ترجمہ ہو گا۔ اس نے اپنے پہلو کو دُور کر لیا اور بر قول عمرو بن العلا ترجمہ ہو گا اسنے پہلو پھیر لیا۔ بعض قراتوں میں نَاءَ بِجَانِبِهٖ ہے، اسکا مصدر نَوْءٌ ہے (باب نَصَرَ) یعنی پہلو کو تکبر سے اُٹھائیگا۔ اگر نَأْیٌ کے بعد عَنْ ہو تو دُور ہونے کا معنی ضرور ہوتا ہے اِنْاءٌ (افعال) دُور کرنا۔ تناءی ۔ تفاعل سے باہم ایک دوسرے سے دُور ہونا۔ مُنْتَئٰی مقام بعید۔ نَوْءٌ خیمہ کے آس پاس کی خندق (لغات القرآن)
ومعنی نأی : ای تکبر وتباعد ونار مقلوب منہ، والمعنی بعد عن القیام بحقوق اللہ عز وجل۔
یقال۔ نأی الشئ ای بعد ونأیتہ ونأیت عنہ بمعنیً ای بعدتُ۔ وَاَنْأَیتُہٗ (افعال) فانتای ای ابعدتہ فبعد والمنتأی: الموضع البعید (قرطبی)

شَاكِلَتِهٖ : قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (آیت نمبر ۸۴)
شَاكِلَتِهٖ : اس کا ڈھنگ۔ شَاكِلَةٌ شَكْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ ہٖ ضمیر کی طرف مضاف ہے، علامہ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں کہ شاکلۃ کے معنی اُس طریقے اور روش کے ہیں جو اُس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ فرّاء کا قول بھی یہی ہے۔ اور شکلٌ سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے لست علیٰ شاکلتی ولا شکلی۔ تو میری روش اور طریقے پر نہیں۔ شکلٌ کے معنی مثل اور نظیر کے ہیں شکل بالکسر کے معنی ہیئت کے ہیں بولتے ہیں جَارِيَةٌ حَسَنَةُ الشَّكْلِ اچھی شکل کی لڑکی (لغات) فالشکل ھو المثل والنظیر والضرب کقولہ تعالیٰ وآخر من شکلہ ازواج۔ وَالشِّكْلُ (بکسر الشین) الھیئۃ (قرطبی)
امام راغب فرماتے ہیں کہ المشاکلۃ کے معنی شکل وصورت میں مشابہ ہونے کے ہیں۔ اور نِدٌّ کے معنی جنس میں شریک

ہونے کے ہیں اور شِیۡءٌ کے معنی کیفیت میں مماثلت کے ہیں۔ آیت کریمہ واٰخر من شکلہٖ ازواجٌ۔ اور اس طرح کے اور بہت سے عذاب ہونگے میں ہیئت اور فعل کے لحاظ سے مماثلت مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ شکلٌ کے معنی دلٌّ کے ہیں۔ یعنی عورت کا ناز و انداز۔ لیکن اصل میں نسبت کو کہتے ہیں جو دو ہم مشرب و ہم پیشہ لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے النَّاسُ اشکالٌ وَّاُلَّافٌ کہ لوگ باہم مشابہ اور الفت کرنے والے ہیں۔

اصل میں مشاکلۃٌ شکلٌ سے ہے اور شکلتُ الدابۃَ کے معنی ہیں۔ جانوروں کی ٹانگیں شکالٌ سے باندھنا۔ اور شکالٌ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے جانور کی ٹانگیں باندھی جاتی ہیں اور بعد میں استعارہ کے طور پر قیدتُ الکتاب کی طرح شکلت الکتاب کا محاورہ بھی استعمال ہونے لگا۔ اور آیت کریمہ قُلۡ کُلٌّ یَّعۡمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ۔ کہو کہ ہر آدمی اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے جو اسکو پابند کیا ہوتا ہے کیونکہ فطرت انسان پر سلطان قاہر کی طرح غالب رہتی ہے جیسا کہ ہم نے کتاب الذریعہ الی مکارم الشریعۃ میں بیان کر چکے ہیں اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کلٌّ مُیَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَہٗ (راغب)

وظاھر عبارۃ القاموس انّ کلاًّ من الشکل والشّکل یطلق علی المثل والھیئۃ (روح) صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ یہ طریقٌ ذو شواکل (وہ راستہ ہے جس سے بہت سارے راستے پھٹتے ہوں) سے ماخوذ ہے علٰی شاکلتہٖ اپنے طریقے مذہب، روش پر یا خلقت پر اپنی طبیعت اور مزاج پر۔ لست علٰی شکلی وشاکلتی تو میرے طریق اور مذہب پر نہیں ہے

یَنۡبُوۡعًا : حَتّٰی تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ یَنۡبُوۡعًا (آیت نمبر ۹۰)

یَنۡبُوۡعٌ اسم مفرد، جمع ینابیع ہے بمعنی چشمے، زمین۔ وہ سوت جس میں سے پانی پھوٹ کر نکلتا ہے۔ نبعٌ اور نُبُوۡعٌ مصدر الینبوع اس چشمے کو کہتے ہیں جس سے پانی اُبل رہا ہو اسکی جمع ینابیع آتی ہے اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیۡعَ فِی الۡاَرۡضِ (آیت ۲۱ سورۂ زمر) یَنۡبُوۡعًا۔ یعنی العیون، عن مجاھد

وھی یفعُولٌ، من نبَعَ یَنبعُ (قرطبی) وراغب۔

الینبوع عَیْنٌ لا یَنْضب ماؤھا (جمل) قال صاحب روح المعانی: ینبوعًا۔ مفعول من نبَعَ الماءُ کیعبوب من عب الماء اذا زخرف وکثر مَوْجُهٗ:

فالیاءُ زائدۃ للمبالغۃ: والمراد عینًا لا یَنْضُبُ ماؤھا (روح)

منبع الماء: پانی پھوٹنے کی جگہ۔ وہ چشمہ جسکا پانی بند نہ ہوتا ہو۔ اور ینبوع اس جدول کو بھی کہا جاتا ہے جس میں پانی بہتا ہو (معجم الفاظ القرآن)

کِسَفًا: اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا (آیت نمبر ۹۲)

یا تم ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرا دو جیسا کہ تم دعویٰ رکھتے ہو۔ کِسَفًا جمع کِسْفَۃٌ۔ مفرد۔ اَلسَّافُ اور کُسُوْفٌ جمع الجمع۔ ٹکڑے۔ کَسَفٌ باب ضرب سے لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی۔ کَسَفَ الثوب کپڑا کاٹ دیا۔ پھاڑ دیا۔ کَسَفَ الشمس سورج گرہن ہوگیا۔ کَسَفَ اللہ الشمس اللہ نے سورج کو گرہن کر دیا۔

تشبیہ کے طور پر یہ لفظ چہرہ یا حال کے خراب ہونے پر بھی بولا جاتا ہے۔

کَسَفَ حَالُہٗ: اس کا حال خراب ہوگیا، کاسف الحال، بدحال، خستہ حال۔

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ الکِسَفُ (بفتح السین) کِسفۃٌ کی جمع ہے۔ نافع، ابن عامر اور عاصم کی قرأت یہی ہے اور باقی قراء نے کِسْفًا (بسکون السین) پڑھا ہے۔ اخفش کہتے ہیں جس نے کِسْفًا پڑھا ہے اس نے اس کو واحد قرار دیا ہے اور جس نے کِسَفًا پڑھا ہے اُس نے اسکی جمع ہونے کا اعتبار کیا ہے۔

مہدوی کہتے ہیں کہ کِسْفٌ (بسکون السین) میں دو احتمال ہیں۔ جائز ہے کہ کِسْفۃٌ کی جمع ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مصدر ہو۔ جوہری کہتے ہیں کہ الکِسْفۃُ کے معنی الگ کئے ہوئے ٹکڑے کے ہیں۔

کہا جاتا ہے اَعْطِنِی کِسْفَۃً مِنْ ثَوْبِکَ اور بعض نے کہا ہے کہ کِسْفَۃٌ اور کِسْفٌ دونوں واحد ہیں۔ والکِسَفُ (بفتح السین) جمع کِسْفَۃ۔ وقال الجوہری الکِسْفَۃُ القِطْعَۃُ مِنَ الشَّیءِ یقالُ اعطنی کِسفۃً من ثوبک (قرطبی)

تَرْقٰی : اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ ۔ (آیت نمبر ۹۳)

یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ ۔ اور ہم تمہارے آسمان پر چڑھ جانے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ (ترجمہ ماجدی)

رَقِیَ یَرْقٰی رُقِیًّا ۔ رَقِیَ فِی السُّلَّمِ کے معنی سیڑھی پر چڑھ جانے کے ہیں ۔ اور اِرْتَقٰی (افتعال) کے معنی بھی یہی ہیں ۔ فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ ۔ تو اُن کو چاہیئے کہ سیڑھیاں لگا کر آسمان پر چڑھیں ۔ مثل مشہور ہے اِرْقَ عَلٰی ظَلْعِکَ ۔ یعنی اپنی طاقت کیمطابق چلو ۔ رُقِیًّا مصدر ہے ۔ ترقی ۔ ای تصعد ۔ یقال رَقِیْتُ فِی السُّلَّمِ ارقی رقیا و رُقِیًّا اذا صعدت وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ ای من اجل رقیک ۔ وھو مصدر نحو مضی یمضی مضیًّا وھوی یھوی ھویًّا کذالک رَقِیَ یَرْقٰی رُقِیًّا (قرطبی) امام راغب فرماتے ہیں کہ رقیۃٌ بمعنی رُقْیَۃٌ ہے جسکے معنی افسوں کرنے اور جھاڑ پھونک کرنے کے ہیں اور آیت کریمہ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ ۔ رُقِیٌّ بمعنی رُقْیَۃٌ ہے ۔ محاورہ ہے کَیْفَ رُقْیُکَ وَرُقْیَتُکَ : تمہارا افسوں کیسا ہے اسمیں رقیٌ مصدر ہے اور رُقْیَۃٌ اسم اور آیت کریمہ وَقِیْلَ مَنْ رَاقٍ اور پکارا جانے لگتا ہے کہ ارے کوئی جھاڑنے والا بھی ہے ۔ یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ اسوقت جھاڑ پھونک سے کوئی اسکی جان نہیں بچا سکے گا ۔ یہاں راقی کے معنی جھاڑنے پھونکنے والے کے ہیں اور بعض کے نزدیک مطلق طبیب مراد ہے ابن عباسؓ نے مَنْ رَاقٍ کے معنی کئے ہیں کو نسے فرشتے اس کی روح لیکر پرواز کریں ۔ یعنی ملائکہ رحمت یا ملائکہ عذاب

خَبَتْ : کُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰھُمْ سَعِیْرًا (آیت نمبر ۹۷)

جب اُن کی آگ بجھنے کو ہوگی تو ہم اور بھڑکا دیں گے (فتح محمد)

خبت النَّارُ ، آگ کا شعلہ افسردہ ہوگیا اور اس پر راکھ کا خبار یعنی پردہ سا آگیا اصل میں خبار اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے ۔ اسی بنار پر جو یا گیہوں کی بالی کے چھلکے کو بھی خِبار کہتے ہیں ۔ قال الراغب ، خبت النَّارُ : سکن لَھَبُھَا وصار علیھا خِبَاءٌ من رمادٍ ای غشاء ۔ وفی القاموس

تفسیر خبت بسکنت وطفئت وتفسیر طفئت بذهب لهبها (روح) وفسر القرطبی خبت ای سکنت عن الضحاک وغیرہ مجاہد طفئت یقال خبت النار تخبو خبوا ای طفئت واخبتها انا۔ وقال الرازی قال الواحدی الخبو سکون النار یقال خَبَتِ النّار تخبو اذا سکن لهبها و معنی خبت : سکنت و طفئت یقال فی مصدرہ الخبو واخباها۔ اخباءً (من افعال) ای اخمدها (کبیر) خَبَا۔ یَخبُو۔ خَبوًا وَخُبُوًّا۔ خبا لهبه اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ الاِستِخبَاءُ خیمہ لگانا۔ استخبی الخباءَ: خیمہ میں داخل ہونا۔ الخِبَاءُ خیمہ جمع اَخبِیَةٌ۔ اهل الخباء، وہ لوگ جو خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اَلاِختِبَاءُ چھپنا۔ خَبَاءٌ خَبِیٌّ اور خبیئۃٌ پوشیدہ چیز۔ قد خبأت لک خبأً۔ آنحضرت نے ابن صیاد کو فرمایا کہ میں نے تیرے لئے دل میں ایک چیز مخفی اور چھپا رکھی ہے۔

قَتُورًا : وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُورًا (آیت نمبر ۱۰۰) انسان ہے ہی بڑا تنگدل (ترجمہ ماجدی)

قَتُورٌ : قَترٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے کنجوس طبیعت والا۔ بخیل، قَتُورٌ اور قَاتِرٌ وہ جو اپنے اہل و عیال کو کم خرچ دے۔ قَترٌ اور قُتَارٌ کے اصل معنیٰ ہیں کسی لکڑی کا اٹھتا ہوا دھواں۔ کنجوس آدمی کو قَتُورٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ آدمی کو صرف دھواں دیکر بہلا دیتا ہے۔ اصل میں القتر کے معنی ہیں بہت ہی کم خرچ کرنا اور بُخل کرنا، یہ اسراف کی ضد ہے اور دونوں صفات مذمومہ ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا : وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا اور انسان دل کا بہت تنگ ہے اور آیت کریمہ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ، ان پر سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔ المُقتِرُ: تنگدست (راغب) قَتَرَۃٌ : غُبَارٌ۔ اندازہ (منجد) قَتَرَ يَقْتُرُ قَترًا واَقْتَرَ (افعال) اِقتَارًا و قَتَّرَ (تفعیل) تَقتِیرًا۔ قصر فی الانفاق (کبیر) خرچ میں کمی کرنا، اَقتَرَ اللہ رِزقَہٗ اللہ اسکی روزی تنگ کرے اقتر الرجل : وہ تنگدست ہو گیا القُترۃُ ۔ شکاری کی کمین گاہ جو انسان

کی بُو کو بھی شکار تک نہیں پہنچنے دیتی چونکہ شکاری کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسکی بُو بھی شکار کو نہ پہنچے۔

مَثْبُورًا : وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (آیت نمبر ۱۰۲)

اور اے فرعون میں تجھے ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔ مَثْبُوْرٌ، ثُبُوْرٌ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ بمعنی ہلاکت زدہ۔ الثُّبُوْر کے معنی ہیں ہلاک ہونا زخم کا خراب ہونا

الْمُثَابِرُ : ثَابَرَ علی الامر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے کسی کام کو مسلسل کرنے والا قرآن پاک میں ارشاد ہے دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا، لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا۔ ابن عباسؓ سے مثبُوْرًا کے معنی ناقص العقل کے منقول ہیں کیونکہ نقصان عقل بڑی ہلاکت ہے (راغب) امام قرطبی نے بھی ثُبُوْرٌ کے معنی ہلاکت وخسران کے ہی نقل کئے ہیں۔

الثُّبُوْرُ : الهلاك والخسران (قرطبی) ثَبْرٌ کا صلہ جب حرف عن ہو تو اس کے معنی روکنے کے ہوتے ہیں۔ اور ما ثَبَرَكَ عن كذا - ای ما منعك منه تجھے اس چیز سے کس نے روک دیا والثُّبُوْرُ

الهلاك (کبیر) ثُبِرَ فُلَانٌ : فلاں آدمی ہلاک ہوگیا۔

لَفِيْفًا : جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا (آیت ۱۰۴)

ہم تم سب کو سمیٹ لائیں گے۔ لَفِيْفٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ آدمیوں کا وہ بڑا گروہ جس میں مختلف قبائل کے لوگ جمع ہوں۔ طَعَامٌ لَفِيْفٌ دو یا زیادہ اقسام سے ملا ہوا کھانا۔ لَفَفْتُ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے ملا دینے کے ہیں۔ وجنّٰتٍ الفافًا گھنے گھنے باغات ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ متصل۔

الِتِفَافٌ (افتعال) ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ملجانا۔ قرآن میں ہے، وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔ لِفٌّ اور لَفٌّ وہ گروہ جسمیں ہر طرف سے ہر قسم کے لوگ آکر مخلوط ہوگئے ہوں۔ مِلَفٌّ چادر لفّ الثوب۔ کپڑا لپیٹ دیا۔

وَاللَّفِيْفُ - الجمع العظيم من اخلاط شتی من الشريف والدنی والمطيع والعاصی والقوی والضعيف وكل شیٔ خَلَطْتَهٗ بشیٔ آخر فقد

لَفَفْتُہٗ (کبیر) واللفیف ما اجتمع من الناس من قبائل شتی (کبیر) اصمعی کا قول ہے لفیف جمع ہے اس کی واحد نہیں۔ وَاللَّفِیْفُ جَمْعٌ لیس لہٗ واحد (قرطبی) اور فلانٌ لفیفُ فلانٍ کے معنی ہیں فلاں، فلاں کا دوست ہے

مُکْثٍ : وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰہُ لِتَقْرَاَہٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکْثٍ (آیت ۱۰۶) اور پڑھنے کا وظیفہ کیا ہم نے قرآن کو جُدا جُدا کر کے کہ پڑھے تو ان کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر۔ (معارف)

المکثُ والمُکثُ۔ کسی چیز کی انتظار میں ٹھہرنا۔ فَمَکَثَ غَیْرَ بَعِیْدٍ : ابھی تھوڑی دیر رہی ہوئی تھی قال لاھلہ امکثوا (جناب موسیٰ علیہ السلام) نے فرمایا اپنے گھر والوں کو کہ تم یہاں ٹھہرو، والمکثُ مثلث المیم وقرئ بالضم والفتح وَلَمْ یُقرأ بالکسر وَھُوَ لُغَۃٌ قَلِیْلَۃٌ، وزعم ابن عطیہ اجماع القراء علی الضم (روح)

الْاَذْقَانِ : اذا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (آیت نمبر ۱۰۷)

اذقانٌ جمع ذقنٌ۔ ذَقَنْتُہٗ۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پر مارا۔ ناقۃٌ ذقونٌ۔ وہ اونٹنی جو ٹھوڑی کے سہارے چلتی ہو یعنی جب چلے تو قدم لمبے لمبے اٹھا کر چلے، اور فرحت و نشاط سے گردن کو خوب ہلا ہلا کر چلے۔ الاذقنُ، لمبی ٹھوڑی والا۔ مؤنث ذقناءُ جمع ذُقْنٌ۔ حدیث میں ہے۔ تُوُفِّیَ رسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بینَ حاقنتی و ذاقنتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ٹھوڑی اور ہنسلی کے درمیان وفات پائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دُنیا سے رحلت فرمائی تو آپ کا سر انور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گود میں تھا۔ والاذقانُ جمع ذقنٍ وھو مجتمع اللَّحْیَیْنِ۔ (قرطبی)

شرح الفاظ القرآن من سورة الکھف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عِوَجًا : اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا : (آیت نمبر۱)

سب تعریف اللہ کو جس نے اُتاری اپنے بندے پر کتاب اور نہ رکھی اسمیں کجی، ٹھیک اُتاری۔ لفظ عوجؔ کے معنی کسی قسم کی کجی اور ایک طرف جھکاؤ کے ہیں۔ قرآن پاک اپنے لفظی اور معنوی کمال میں اس سے پاک ہے۔ نہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کسی جگہ ذرہ برابر کجی ہو سکتی ہے نہ علم و حکمت کے لحاظ سے (معارف القرآن)

اصل میں العوج کے معنی کسی چیز کے سیدھا کھڑا ہونے کی حالت سے ایک طرف جھک جانا جیسے عُجْتُ الْبَعِيْرَ بِزِمَامِهٖ۔ میں نے اونٹ کو اسکی مہار کے ذریعہ ایک طرف موڑ دیا محاورہ ہے فُلَانٌ مَا يَعُوْجُ عَنْ شَيْءٍ يَهُمُّ بِهٖ۔ یعنی فلاں جس چیز کا ارادہ کرلے پھر وہ اس سے باز نہیں آتا۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ، قرآن فصیح جس میں کوئی کجی نہیں نہ لفظی نہ معنوی۔

قَيِّمًا : جو مفہوم لفظ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا سے ایک منفی صورت میں بتلایا گیا ہے پھر تاکید کے لئے مضمون کو مثبت طور پر لفظ قَيِّمٌ سے واضح کر دیا ہے قَيِّمًا کے معنی ہیں مستقیماً اور مستقیم وہی ہے جسمیں کوئی کجی میلان کسی جانب نہ ہو، اور یہاں قیّمؔ سے ایک دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں یعنی نگران اور محافظ۔ اس معنی کے لحاظ سے لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کریم جیسا کہ اپنی ذات میں کامل مکمل ہر قسم کی کجی اور افراط و تفریط سے پاک ہے اسی طرح یہ دوسروں کو بھی استقامت پر رکھنے والا ہے اور بندوں کے تمام مصالح کی حفاظت کرنیوالا ہے، اب ان دونوں لفظوں کا خلاصہ یہ ہوگا کہ قرآن کریم خود بھی کامل مکمل ہے اور مخلوقِ خدا کو بھی کامل اور مکمل بنانے والا ہے (معارف بحوالہ مظہری)

قِوَام : عدل و توازن۔ وہ سامان جس کے ذریعہ زندگی گزاری جائے۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم)
یہی ہے سیدھا دین لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے (ماجدی)

عام طور پر اہلِ تفسیر نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ درست، ٹھیک، سیدھا لیکن راغبؒ نے لطیف توجیہ کی ہے یعنی ایسا دین جو معاش و معاد اور دنیا و آخرت کو درست کرنے والا ہے۔ گویا امام راغب کے نزدیک قیمٌ بمعنی مقوِّمٌ ہے۔ قَيِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ، آسمان و زمین کو قائم رکھنے والا ہے، ان کو سنبھالنے والا ہے قیّوم، وہ ذات جو اپنے آپ قائم ہو، اور دوسرے کو قائم رکھے، لفظ قیّوم صفاتِ باری میں سے ہے اور بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ اسم اعظم ہے۔

بَاخِعٌ : فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (آیت نمبر ۶)
سو کہیں تو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو پچھتا پچھتا کر (معارف)

بَاخِعٌ اسم فاعل کا صیغہ ہے غم میں گھونٹ ڈالنے والا۔ یہ بَخْعٌ سے ماخوذ ہے جسکے معنی ہیں غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالنے والا۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں رنج و غم کے ترک کرنے کی ترغیب دی گئی ہے جیسا کہ آیتِ کریمہ میں ہے۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ، ان پر حسرتوں کے باعث آپکی جان نہ نکل جائے بَخَعَ فُلَانٌ بِالطَّاعَةِ فلاں نے طاعت میں مبالغہ کیا۔ بَخَعَ فُلَانٌ بِمَا عَلَيْهِ مِنَ الْحَقِّ۔ فلاں نے سخت بیزاری کے ساتھ اپنے اوپر دوسرے کے حق کا اقرار کیا گویا یہاں سخت کراہت اور بیزاری کو خود ہلاک کرنیکے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔

اہلِ عرب کا محاورہ ہے بَخَعْتُ الاَرْضَ بِالزِّرَاعَةِ۔ میں نے زمین پر پے در پے کھیتی کی۔ بخاعٌ ایک رگ کا نام ہے جو پشت سے گردن تک آتی ہے بَخَعَ الذَّبِيحَةَ۔ جانور کا گلا اتنا کٹ گیا کہ بخاع تک پہنچ گیا۔ ایک حدیث میں ہے اَتَاكُمْ اهل اليمن هم ارقّ قلوبًا وَاَبْخَعُ طاعةً۔ یمن والے تمہارے پاس آئیں گے ان کے دل نرم ہیں اور بڑے اطاعت گزار

لوگ ہیں ۔ بخع (ن) بخعًا ۔ بخعَ نفسَهٗ
غم یا غصّہ سے اپنے آپ کو ہلاکت تک پہنچانا
بخعَ الشاۃُ ۔ بکری کو ذبح کرتے وقت
گدّی تک کاٹ دینا ۔ اور بَخِعَ (س) بُخُوعًا
و بَخَاعَۃً اقرار کرنا ۔ مان لینا ۔ بَخِعَ
بُخُوعًا و بَخَاعَۃً ۔ بَخَعَ بِالْحَقِّ حق کا
اقرار کرنا ۔ حق کو مان لینا ۔ بَاخِعٌ ای
قَاتِلٌ ۔ ھٰذا المعنی مروی عن ابن
عباس و مجاھد و ابن جبیر و السّدی
لبید ابن ربیعہ کہتا ہے ؎

لَعَلَّکَ یومًا ان فقدتَ مزارَھا
علی بعدہٖ یومًا لنفسِکَ بَاخِعٌ

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نفسَکَ : آپ غور فرمائیں کہ
نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اسقدر محنت اور
مشقت جس سے ہلاکت نفس تک کا اندیشہ
پیدا ہونے لگا ۔ کیا یہ قرآنی تعلیمات اور قانون
قدرت کی تشریح و تفسیر میں نہ تھا ؟ یقینًا
نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تگ و
دو جہاں اسلام اور ایمان قبول کرانے پر
تھی وہیں مراد خداوندی اور رموز قرآن کی
تفسیر و تشریح پر بھی تھی ، تو کیا اس مشفق
شارع قرآن کو نظر انداز کرکے فہم قرآن کا
مدار محض عقل نارسا اور لغت پر رکھنا
بددیانتی نہیں ؟

و فی البحر عن اللیث ۔ بخع الرّجل نفسهٗ
بخوعاً : قتلها من شدّۃ الوجد
فرزدق کہتا ہے ؎

الا ایّھٰذا الباخِعُ الوَجْدُ نفسَہٗ
لشیءٍ نَحَتْهُ عن یدیه المقادِرُ

بَاخِعٌ کی جمع باخعون اور بُخُعَۃٌ آتی ہے
بخعتُ لهٗ نُصْحِیْ و نفسی کا معنی یہ ہے
کہ میں نے پورے خلوص دل کے ساتھ اسکو
نصیحت کی (قرطبی ۔ روح ۔ ابن ہشام)

جُرُزًا : وَاِنَّا لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا
صَعِیْدًا جُرُزًا : (آیت نمبر ۸)
ہم اس پر کی تمام چیزوں کو ایک صاف
میدان کردیں گے (ماجدی)
جُرُزٌ ۔ وہ زمین جسمیں کچھ پیدا نہ ہوتا ہو
صعیدًا جُرُزًا ۔ بنجر میدان جس پر گھاس
اور درخت وغیرہ نہ اُگیں ۔ الجَرُوْز ، جو
دسترخوان کو صاف کر ڈالے ۔ مثل مشہور ہے
لَا تَرْضٰی شَنَانِیهِ اِلَّا بِجُرْزَۃٍ ۔ یعنی

اسکے دشمن اسکا استیصال کئے بغیر خوش نہ ہونگے۔ سَیْفٌ جُرَازٌ۔ شمشیر بُرّاں۔

الجُرُز: الارض التی لا یُنْبِتُ شیئًا ویقال سنۃ جُرُزٌ وسنون اجْرَازٌ وھی التی لا یکون فیھا مطر وتکون فیھا جَدْبَۃٌ ویَبْسٌ وشِدَّۃٌ (قرطبی)

مشہور شاعر ذوالرمۃ اپنی ناقہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

طوی النحز والاجراز ما فی بُطُوْنِھَا
فمَا بقیت الا لضلوع الجراشِعُ

حدیث میں ہے لَتُوْجَدَنَّ جُرُزًا الا یبقیٰ علیھا من الحیوان احَدٌ زمین اُجاڑ دی جائے گی اس پر کوئی جاندار نہیں رہے گا۔ جَرَزَ عَلَی المائدۃ جو کچھ دستر خوان پر تھا سب چٹ کر گیا۔ جَرَزَہُ الزّمان۔ اسکو زمانے نے ہلاک کر دیا۔ اصل میں جرزٌ کے معنی ہیں کاٹنا۔ کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینا (باب نصرَ سے آتا ہے) امام راغبؔ فرماتے ہیں۔ صَعِیدًا جُرُزًا۔ ای منقطع النّبات من اصلہ (راغب) واما الجرز فقال الفرّاء الجُرُز الارض التی لا نبات علیھا (کبیر) نَسُوْق الماء الی الارض الجُرُز۔ ہم خشک افتادہ زمین کی طرف پانی پہنچاتے رہتے ہیں (ماجدی)

مولانا نعمانی لکھتے ہیں۔ جُرُز۔ بنجر چٹیل۔ جَرزٌ سے جس کے معنی کاٹ دینے اور کھا کر صاف کر دینے کے ہیں۔ صفت مشبہ کا صیغہ ہے یعنی وہ زمین جس کے درخت اور گھاس چھانٹ دیئے گئے ہوں اور چونکہ چٹیل میدان اور بنجر زمین درختوں اور گھاس سے خالی ہے اس لئے جُرُزٌ کہلاتی ہے۔ (لغات القرآن)

صَعِیْدًا

(آیت نمبر ۸) صعیدٌ زمین خاک۔ صُعُوْدٌ سے جسکے معنی بلند ہونے کے ہیں۔ بروزن فعیل۔ صفت کا صیغہ ہے امام راغب لکھتے ہیں کہ صَعَدٌ۔ صَعِیْدٌ اور صعودٌ اصل میں ایک ہی ہیں، لیکن صعودٌ اور صَعَدٌ تو گھاٹی کے لئے بولا جاتا ہے اور بطور استعارہ ہر امر شاق کے لئے آتا ہے ارشاد باری ہے۔ وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِکْرِ رَبِّہٖ یَسْلُکْہُ عَذَابًا صَعَدًا۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے سَاُرْھِقُہٗ صُعُوْدًا (المدثر) اب

اسی سے چڑھاؤں کا بڑی چڑھائی (عثمانی) اور صَعِیدٌ روئے زمین کو کہا جاتا ہے ۔ ارشاد باری ہے صَعِیدًا طَیِّبًا ۔ تو قصد کرپاک زمین کا ۔ اور بعض علماء نے اس کے معنی غبار کے بھی کئے ہیں ۔ اسلئے ان حضرات کے نزدیک تیمم میں ہاتھوں پر غبار کا لگنا ضروری ہے علامہ علی بن محمد خازن نے اپنی تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل میں امام شافعی کا یہی قول نقل کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ربیع نے امام شافعیؒ سے صعیدٌ کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اسم صعیدٌ غبار والی مٹی کے علاوہ اور کسی چیز پر صادق نہیں آتا چنانچہ سنگریزے پر بھی خواہ وہ موٹا ہو یا باریک، صعیدٌ کا لفظ صادق نہیں آتا، اور اگر مٹی یا ڈھیلہ سنگریزہ کے ساتھ ملجائے اسطرح کہ اس پر غبار آجائے تو صعیدٌ اس غبار کو کہیں گے کہ جو اس کے ساتھ ملا ہے ۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ چونا اور سُرمہ اور گیرو سے تیمم کرے چونکہ یہ سب پتھر ہیں ۔ علامہ خازن لکھتے ہیں کہ : ھٰذا کلامُ الشافعی فی تفسیر الصعید وھو القدوۃ فی اللغۃ وقولہٗ فی ذلک حجۃٌ (خازن ص۵۲۷ ج۱) کہ لفظ صعیدٌ کی تفسیر میں یہ ہے کلام امام شافعیؒ کا اور وہ علم لغت کے مقتدا ہیں، اور ان کا قول لغت میں سند ہے اور فرّاء اور ابو عبیدہ نے بھی اسمیں امام شافعیؒ کی موافقت کی ہے اسکے معنی مٹی کے ہیں اور امام قرطبی نے علامہ ابن ہشام صاحب سیرت کا قول بھی یہی نقل کیا ہے فرماتے ہیں - قال ابن ھشام : الصَّعِیدُ : وجہ الارض وجمعہٗ صُعُدٌ اور مشہور شاعر ذوالرمہ نے بھی لفظ صعید کو اپنی ناقہ کی تعریف کرتے ہوئے اس معنی میں استعمال کیا ہے ۔ کہتا ہے ؎

کأنّہٗ بالضّحیٰ ترمی الصعید بہٖ
دبّابۃٌ فی عظام الرأسِ خُرطومُ

(قرطبی)

علامہ عبدالرشید نعمانی صاحب لکھتے ہیں کہ : لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ صعید کی یہ لغوی تشریح نہیں بلکہ فقہی تفسیر ہے جو کہ امام شافعی نے اپنے مسلک کیمطابق کردی ہے چنانچہ امام حافظ قاضی ابوبکر ابن البصری امام شافعی کا قول نقل کرکے فرماتے ہیں ھٰذا تفسیرٌ فقہیٌ علی مذھبہ والاول الذی قلنا اصوب واجری علی اللغۃ، قال اللہ تعالیٰ فتصبح

صعیدًا زلقًا، یعنی یہ اُنکے اپنے مذہب کے مطابق فقہی تفسیر ہے اور پہلے معنی جو ہم نے سابق میں بیان کئے ہیں وہ زیادہ صحیح اور لغت کے زیادہ مطابق ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے پھر ہو جائے وہ زمین صاف، اور زجاج نے جو لغت عربیت کے امام ہیں تصریح کی ہے کہ لا اعلم خلافًا بین اھل اللغۃ ان الصعید وجہ الارض سواء کان علیھا التراب ام لا وفیہ قولہ تعالیٰ صعیدًا جُرُزًا، وصعیدًا زلقًا، وانما سمی صعیدًا لانھا نھایۃ ما یصعد من الارض یعنی میں اس بارے میں اہل لغت کا کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ صعیدٌ کے معنی روئے زمین کے ہیں خواہ اس پر مٹی ہو یا نہ ہو اسی سے ارشاد الٰہی ہے صعیدًا جُرُزًا (زمین چھانٹ کر) اور صعیدًا زلقًا (زمین چٹپڑ) اور اسکا نام صعید اسلئے ہوا کہ وہ مسطح بالائی کی انتہا ہے (لغات القرآن)

امام قرطبیؒ نے جو قول ابن ہشام کا نقل کیا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صعیدٌ روئے زمین ہی کو کہا جاتا ہے غبار کا ہونا کوئی ضروری نہیں۔

سورۃ الکھف کی اس آیتِ کریمہ میں لفظ صعیدٌ سے مراد بے آب و گیاہ زمین ہے جہاں کوئی سبزہ نہ اُگتا ہو، واخرج ابن ابی شیبہ وابن المنذر وابن ابی حاتم عن قتادۃ قال الصعید التراب والجبال التی لیس فیھا زرع (فتح القدیر) قال الراغب الصعید وجہ الارض، و قال ابوعبیدۃ: ھو المستوی من الارض، وروی ذلک عن السدی (روح) اور صعیدٌ اس راستہ کو بھی کہتے ہیں جس میں کسی طرح کا سبزہ نہ ہو اسکی جمع صُعُدَاتٌ آتی ہے۔ حدیث میں ہے، ایاکم والقعود فی الصُّعُدَاتِ (قرطبی) تمہارے مکانات کے سامنے جو راستے ہیں، اُن میں بیٹھنے سے پرہیز کرو۔ اس طرح اِجْتَنِبُوْا مجالس الصُّعُدَاتِ، اسکے معنی بھی وہی ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ صُعُدَاتٌ، یہ جمع صُعُدٌ کی ہے اور صُعُدٌ یہ جمع ہے صعیدٌ کی۔ جیسے طُرُقَات جمع ہے طُرُقٌ کی اور یہ جمع ہے طریقٌ کی (واللہ اعلم)

ائمہ حنفیہ کے نزدیک صَعِیْدٌ سے مراد مٹی کی جنس ہے، جس چیز میں بھی اجزائے ارضی شامل ہوں وہ صعیدٌ کے حکم میں آجائیگا چنانچہ ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ وکان

الصعید إسمالِلاَرْضِ اقتضٰی ذالِكَ
جوازا لتیمّم بکلّ ماکان من
الارض (جصاص)

اَلْکَهْفِ : اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ
اَصْحٰبَ الْکَهْفِ وَالرَّقِیْمِ
کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا (آیت نمبر۹)

کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور
کتبہ والے ہماری نشانیوں میں کچھ تعجب کی
چیز تھے۔ پہاڑی غار جو وسیع ہو اسکو کہف
کہتے ہیں اس کی جمع کہوفٌ آتی ہے۔ الکهف
الغارُ فی الجبل وجمعهٗ کهُوفٌ (راغب)
اور جو وسیع نہ ہو اُس کو غار کہتے ہیں، والکهف
النّقبُ المتّسع فی الجبل ومالم یتّسع
فهو غارٌ (قرطبی)
اور خود پہاڑ کو بھی کہف کہتے ہیں۔ لیکن
لغت میں یہ غیر مشہور ہے (قرطبی)
الکهف الغارُ الواسع فی الجبل (کبیر)

اصحابُ الکهف: کے معنی ہوئے
غار والے، قطع نظر اس سے کہ غار کہیں کا ہو

الرَّقِیْم : رقیم لفظی اعتبار سے بمعنی
المرقوم ہے یعنی لکھی ہوئی چیز، ابن عباسؓ
اسکے معنی ایک لکھی ہوئی چیز کے بیان کرتے
ہیں جس پر بادشاہِ وقت نے اصحاب
الکهف کے نام کندہ کرکے غار کے دروازے
پر لگا دیا تھا اسی وجہ سے اصحاب کہف کو
اصحاب الرقیم بھی کہا جاتا ہے۔

قتادہ، عطیہ، عوفی، مجاہد کا قول ہے کہ
رقیم اس پہاڑ کے نیچے کی وادی کا نام ہے،
جس میں اصحابِ کہف کا غار تھا بعض نے
خود اس پہاڑ کو رقیم کہا ہے۔ حضرت عکرمہؓ
فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس کو یہ کہتے
ہوئے سُنا ہے کہ مجھے معلوم نہیں رقیم کسی
لکھی ہوئی چیز اور تختی کا نام ہے یا کسی بستی
کا۔ کعب احبار، وہب بن منبہ، حضرت
ابن عباس سے یہ روایت کرتے ہیں کہ رقیمُ
اَیلہ یعنی عقبہ کے قریب ایک شہر کا نام ہے
جو بلادِ شام میں واقع ہے۔

ان تمام اقوال کو علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر
میں ذکر کیا ہے اور معارف القرآن میں جو اقوال
مذکور ہیں قرطبی نے انکے علاوہ اور بھی اقوال
ذکر کئے ہیں۔ ابن زید کہتے ہیں کہ رقیم ایک
ایسی کتاب ہے جسکا معاملہ خدا نے ہم پر ظاہر
نہیں کیا۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ الرقیم کے
معنی گاڑھے خط کے ہیں اور بعض نے کہا ہے
کہ رقیمٌ کے معنی کتاب پر اعراب لگانے
کے ہیں۔ کتابٌ مرقومٌ، لکھی ہوئی کتاب

یہاں مرقوم کے دو معنی ہو سکتے ہیں یعنی گاڑھے اور جلی خط میں لکھی ہوئی یا اعراب اور نقطے لگائی ہوئی اور جو شخص کسی کام کا ماہر ہو اُس کے متعلق بطور ضرب المثل کہا جاتا ہے کہ فلانٌ یرقم فی الماء - یعنی وہ ماہر ہے، اور آیت کریمہ انَّ اصحٰبَ الکہفِ والرّقیم، میں بعض نے کہا ہے کہ رقیم ایک مقام کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اُس پتھر کیطرف نسبت ہے جسمیں انکے نام کندہ تھے اور گدھے کے دونوں بازوؤں پر جو نشانات ہوتے ہیں انھیں رقمتا الحمار کہتے ہیں - اور اَرْضٌ مرقومۃٌ، وہ زمین جس میں گھاس تھوڑی ہو - گویا وہ کتابت کے نشانات کی طرح ہے - حدیث میں ہے، کان یُسَوِّی بین الصفوف حتیٰ یَدَعَھَا مثل القدح اَوَ الرقیم - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوں کو تیر کی طرح یا کتاب کی سطروں کی طرح برابر اور سیدھا کرتے - مراد یہ ہے کہ کاتب جس طرح سطروں کو سیدھا اور برابر رکھتا ہے اسی طرح آپؐ صفوں کو سیدھا کرتے تھے اصحاب کہف اور رقیم ایک ہیں یا الگ الگ اور ان کا زمانہ اور تاریخ کی حیثیت کیا ہے اسکی تفصیل کا تعلق لُغات سے نہیں اسلئے ان مباحث کو ہمنے ترک کر دیا ہے - سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن میں اور علامہ حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی نے قصص القرآن میں ان ابحاث کو تفصیلاً ذکر کر دیا ہے -

فِتْیَۃٌ : اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَھْفِ (آیت نمبر ۱۰)

فِتْیَۃٌ، فتی کی جمع ہے جسکے معنی ہیں نوجوان (معارف) اسکی مؤنث فتاۃٌ آتی ہے، اور مصدر فتاءٌ ہے اور کنایہ کے طور پر یہ دونوں لفظ یعنی فتی اور فتاۃٌ غلام اور لونڈی کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں، سورۂ یوسف میں فرمایا ہے تُرَاوِدُ فَتٰھَا عن نفسہٖ اور سورۂ نساء میں ہے مِنْ فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ

ھَیِّئْ : وَھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (آیت نمبر ۱۰) اور پوری کر دے ہمارے کام کی درستی (معارف) ھَیِّئْ واحد مذکر حاضر امر معروف تَھْیِئَۃٌ اور تَھْیِیْءٌ مصدر (تفعیل) بمعنی درست کرھیّا کے معنی کسی معاملے کے لئے اسباب مہیا کرنے کے ہیں - قرآن پاک میں ہے وَیُھَیِّئْ لَکُمْ مِنْ اَمْرِکُمْ مِرْفَقًا، تمہارے

معاملے میں آسانی کے سامان مہیا کرے گا، (راغب) واصل التَّهِيئَة احداث الهَيْئَة وهي الحالة التي يكون عليها الشئ محسوسة او معقولة ثم استعمل في احضار الشئ وتَيْسِيْرِهِ اى يَسِّرْ لَنَا من اَمْرِنَا رَشَدًا (روح)

رَشَدًا : رَشَدَ يَرْشُدُ رَشَدًا و رَشَادًا و رَشِدَ يَرْشَدُ رُشْدًا فهو رَاشِدٌ و رَشِيْدٌ وهم رَاشِدُوْن: اصاب وجه الامر والطريق وَاسْتَقَامَ بيرادته الى غاياتها على سبيل السلامة ويكون ذالك في نقيض الغي والضلال والسفه (معجم الفاظ القرآن)

رَشَدًا : رَشِدَ ۔ رَشَدًا کے معنی ہیں اس نے ہدایت اور استقامت پائی ۔ رَشِدَ امرَهٗ کے معنی ہونگے اُس نے اپنے معاملہ میں ہدایت پائی ۔ وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا کا مفہوم ہوگا کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے اس راہ میں جو ہم نے اختیار کی ہے تو رہنمائی اور استقامت کا بدرقہ مہیا فرما (تدبر) الرَّشَدُ والرشاد نقیض الضلال (کبیر)

ضَرَبْنَا : فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا (آیت نمبر ۱۱) پھر تھپک دیئے ہم نے اُن کے کان اس کھوہ میں چند برس گنتی کے، فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ کے لفظی معنی کانوں کے بند کردینے کے ہیں غفلت کی نیند کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ نیند کے وقت سب سے پہلے آنکھ بند ہوتی ہے مگر کان اپنا کام کرتے رہتے ہیں آواز سُنائی دیتی ہے جب نیند مکمل اور غالب ہو جاتی ہے تو کان بھی اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں اور پھر بیداری میں سب سے پہلے کان اپنا کام شروع کر دیتے ہیں کہ آواز سے سونے والا چونکتا ہے پھر بیدار ہو جاتا ہے (معارف القرآن)

حاصل یہ ہے کہ ہم نے ان صلحاء کو اس غار میں برسوں غفلت کی نیند سُلا کے رکھا اور ضرب الاذان کنایہ ہے ۔ گہری نیند سُلانے سے ۔ وَالمراد اَنَمْنَاهُمْ انامَةً ثقيلةً لَا تُنَبِّهُهُمْ فِيهَا الاصوات بان يجعل الضرب على الاذان كناية عن الانامة الثقيلة (روح)

رَبَطْنَا : وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (آیت نمبر ۱۴) اور ہم نے اُنکے دل مضبوط کر دیئے تھے (ماجدی)

رَبَطَ عَلَى الْقُلُوْب، ایک محاورہ ہے جو کنایہ ہے دلوں کو سہارا دینے سے، رَبَطَ اللّٰہ علیٰ قلبہٖ : صَبَّرَہٗ (روح) عِبَارَۃٌ عن شدۃ عزمٍ وقوۃ صَبْرٍ (قرطبی)

شَطَطًا : لَقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًا (آیت نمبر ۱۴) تو کہی ہم نے بات عقل سے دُور۔ شَطٌّ کے معنی ہیں دُور ہونے کے، اور شَطَطٌ کے معنی تَبَاعُدٌ عَنِ الحق یعنی حق سے انحراف اور دُوری کے ہیں (تدبر) شَطَّتِ الدار واَشَطَّ۔ گھر کا دُور ہونا۔ شطّ النہر : دریا کا کنارہ جہاں سے پانی دُور ہو۔ شطّ (ض) شططًا۔ زیادتی کرنا۔ حق سے دُور ہونا۔ شطّ علیہ فی قولہ وحکمہٖ ظلم کرنا۔ شَطَّطَ زیادتی میں مبالغہ کرنا۔ شَطَّ فی سِلْعَتِہٖ۔ مقررہ انداز سے آگے بڑھنا اور بیش قیمت کرنا۔ بھاؤ بڑھا دینا۔ شَطَطًا۔ قولاً ذا شَطَطٍ رھو الافراط فی الظلم والابعاد فیہ، من شطّ اذا بعُد۔ ومنہ اَشَطَّ فی السّوم وغیرہ (کشاف)

اُوْوٗا : فَاْوٗا اِلَى الْكَهْفِ : تو چلاں غار میں چل کر پناہ لو (ماجدی)

اُوٗوا۔ تم جا بیٹھو۔ تم فروکش ہو جاؤ، اِیواءٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر (لغات القرآن) فَاْوٗا : ای التجؤا (روح)

مِرْفَقًا : وہ چیز جو آدمی کی ضرورت اور منفعت کی ہو اس کو مرفق کہتے ہیں وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ اَمْرِكُمْ مِرْفَقًا یعنی اس مرحلہ میں جس چیز کے تم محتاج ہوگے اللہ تعالیٰ وہ تمہارے لئے مہیا فرمادے گا (تدبر) وھو ما یُرْتَفَقُ بِہٖ ای ینتفع (کشاف) مِرْفَقٌ : اسم آلہ مفرد وہ چیز جسکے ذریعہ سے نفع حاصل کیا جائے اسکی جمع مرافق آتی ہے وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ، اصل میں مرافق ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کے ذریعہ یا سہارے آرام یا نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ کہنی کے سہارے بھی آدمی آرام پاتا ہے اسلئے مرفق کا اطلاق کہنی پر ہونے لگا۔ مرفقۃٌ تکیہ گاؤ۔ مرافق الدار : مکان سے فائدہ حاصل کرنے کے مقامات۔ مثلاً بیت الخلاء۔ پرنالہ دروازہ اور راستہ وغیرہ مرافق بمعنی موافق ہے۔ رِفقٌ۔ نرمی۔ نفع۔ حُسنِ سلوک۔ رِفقٌ سہل الحصول چیز۔ رِفاقۃٌ ہمسفر ہونا (سمع) رفیقٌ ہمسفر ساتھی، رُفق

علیہ اور رَفِقَ بہ - اس کے ساتھ نرمی کی،
اسکا مصدر رِفقٌ اور مَرفقٌ آتا ہے اور
چونکہ خود لازم ہے اسلئے متعدی بنانے کے
لئے فعل کے بعد حرف بار بھی آتا ہے اور
علیٰ بھی - اس صورت میں نصَرَ، کرم اور
سمع تینوں ابواب سے اسکا استعمال ہوتا
ہے لیکن اگر رَفِقَ کو خود متعدی کردیا جائے
اور رَفَقَہٗ کو ارفقہٗ کی طرح قرار دیا جائے
تو نفع پہنچانے کا معنی ہوتا ہے اور فعل
صرف باب نصر سے آتا ہے - اِرْتَفَقَ (افتعال)
کہنی یا تکیہ کے سہارے آرام کیا، کہنی بچھاکر
اُس پر رُخسار رکھا اس سے اسم فاعل مُرْتَفِقٌ
اور ظرفِ مکان مُرْتَفَقٌ کے وزن پر آتا ہے
مقام آرام وہ جگہ جہاں آرام حاصل کیا
جاسکے - قرآن پاک میں ہے، بِئْسَ
الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا (کہف،
نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا،
(آیت نمبر ۳۱)

جنت اور دوزخ دونوں پر لفظ مرتفق کا
اطلاق کیا گیا ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ دوزخ
آرام حاصل کرنے کی جگہ نہیں ہے اور جنت
بلاشبہ جائے سکون و آرام اور باعثِ
عزت و شرف ہے - اہل تفسیر نے
لکھا ہے کہ دوزخ کے لئے لفظ مرتفق کا استعمال
تقابلِ لفظی کیوجہ سے کیا گیا ہے، قاضی بیضاوی
لکھتے ہیں کہ واصل الارتفاق نصب المرفق
تحت الخد وھو لمقابلة قوله وحَسُنَتْ
مُرْتَفَقًا والافلا ارتفاق لاھل النار صاحبِ
کشاف لکھتے ہیں وھذا المشاکلة قوله
وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا والافلا ارتفاق لاھل النار
وَلَا اتِّکَاءَ اِلَّا ان یکون من قوله شعر

انی ارقت فبت اللیل مرتفقا
کان عینی فیھا الصاب مذبوح

میں بیدار رہا اور رات بھر کہنی پر سر رکھ کر
گزار دی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری
آنکھ کو ایلوا لگا دیا گیا ہے -

صاحب معجم القرآن پروفیسر عبدالرؤف
اس توجیہ کا انکار کرتے ہیں اور لکھتے ہیں
کہ جنت اور دوزخ دونوں پر لفظ ارتفاق
کا معنی ہے کہنی بچھا کر اس پر رُخسار رکھنا
یہ حالت ایک خوش عیش دولتمند کی ہوتی
ہے اور غمگین الم زدہ کی بھی اور دلیل
میں اوپر نقل کردہ شعر پیش کیا گیا ہے
اور لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
مرتفق مقام آسائش بھی ہوتا ہے اور مقام
حزن والم بھی -

علامہ عبدالرشید نعمانی صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب معجم کو شعر کا مطلب سمجھنے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مرتفق کہنی بچھا کر اس پر رخسار رکھنے والے کو کہتے ہیں اسوجہ سے کہ عموماً اس صورت میں آرام ملتا ہے اصل مادہ رفقؔ ہی ہے۔ کوئی مشتق اپنے اشتقاق سے ہٹ کر مفہوم کو ظاہر نہیں کر سکتا اس لئے مُرتَفِقٌ بھی دکھ پانیوالے کو نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اُس دُکھ رسیدہ کو کہہ سکتے ہیں جو اپنا دُکھ دُور کرنے اور کسیقدر آرام پانے کے لئے کہنی بچھا کر اس پر سر رکھ لے۔ شاعر کی بھی یہی مراد ہے، جب بیچارے کو رات بھر نیند نہیں آئی اور بےچینی بڑھتی گئی تو اُس نے کسی قدر آرام پانے کی یہ شکل پیدا کی کہ کہنی بچھا کر اس پر سر رکھ کر رات گزار دی۔ نیند نہ آئی لیکن کچھ آرام تو ملا۔ لیکن دوزخ تو ایسی جگہ نہیں کہ دوزخی کہنی بچھا کر اُس پر سر رکھ کر آرام کریں، نہ آرام حاصل کرنے کے لئے اس طرح دوزخیوں کا لیٹنا کہیں مروی ہے۔ نہ تقاضا دانشی ہے کہ وہاں ایسا ہو سکتا ہے اسلئے دوزخ پر مرتفق کا اطلاق محض تقابل لفظی کیوجہ سے ہی کیا گیا ہے۔ اور بیضاوی جیسے محقق کی تشریح ہی صائب ہے (لغات القرآن)

الرُّفْقَةُ، ہمسفر جماعت، چلتے ہوئے جسکی کہنیاں ایک دوسرے کی کہنیوں سے ٹکرائیں۔ اور الرِّفَاق۔ وہ رسّی جس سے اونٹ یا دیگر پالتو جانوروں کے پاؤں کہنیوں یعنی بازوں کو پچھلی ٹانگ کے ساتھ ملا کر باندھ دیا جاتا ہے۔

تَزَاوَرُ : وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ (آیت نمبر ۱۷) اور تو دیکھے دھوپ جب نکلتی ہے بچ کر جاتی ہے ان کی کھوہ سے داہنے کو (معارف)

تَزَاوَرُ : اصل میں تتزاور ہے، اسکے معنی ہٹ جانے، کترا جانے اور منحرف ہو جانے کے ہیں (تدبر) تَزَاوُرُ کے اصل معنی تو باہم ایک دوسرے کی زیارت کرنے اور سینہ بسینہ ملنے مقابل ہونے کے ہیں لیکن جب اسکے صلہ میں عَنْ واقع ہوتا ہے تو رُخ بچانے سینہ موڑ لینے۔ بچکر نکلنے اور کترانے کے معنی ہوتے ہیں اور یہاں آیت میں عَنْ کے آنے سے یہی معنی مراد ہیں (لغات القرآن) ابن عامر نے تَزْوَرُّ پڑھا ہے یہ تَحْمَرُّ

کے وزن پر ہے اور اسکا مصدر اِزْوِرَارٌ ہے
عاصم، حمزہ اور کسائی نے تَزَاوَرُ پڑھا ہے
یہ تَزَاوُرٌ سے تفاعل کے باب سے ہے، باقی
قُرّاء نے تَزَّاوَرُ (حرف زاء کی تشدید)
سے پڑھا ہے۔ تَتَزَاوَرُ اسی کی اصل ہے
دوسری تاء کو ساکن ہونے کی وجہ سے زاء
میں مدغم کر دیا گیا ہے معنی کے اعتبار سے
سب ایک ہی ہیں۔ والتَّزَاوُرُ: هو الميل
والانحراف، ومنه زارهٗ اذا مال اليه
والزُّوْرُ عن الصدق (کبیر)
رَجُلٌ زَائِرٌ: ملاقاتی آدمی۔ زَائِرٌ کی
جمع زَوْرٌ بھی آتی ہے جیسے سافر کی جمع
سَفْرٌ اور کبھی رَجُلٌ زَوْرٌ بھی آتا ہے۔
اس صورت میں مصدر ہوگا جیسا کہ ضَعْفٌ
کا لفظ ہے بِئْرٌ زَوْرَاءُ وہ کنواں جس کی
کھدائی میں ٹیڑھا پن ہو پھر اسی سے جھوٹ
کو الزُّوْر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جہت راست
سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ قَوْلَ الزُّوْرِ جھوٹی
بات۔ زُوْرٌ کے معنی بُت کے بھی آتے ہیں،
کیونکہ بُت پرستی بھی حق سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے
تَزَاوَرُ: تتنحى وتميل من الازورار
والتزاور: الميل (القرطبی) وَالْاَزْوَرُ
فی العین: آنکھ کا بھینگا پن

تَقْرِضُ: وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ
ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ
(آیت نمبر ۱۷) اور جب وہ چھپتی ہے تو ان
سے کترا جاتی ہے بائیں جانب اور وہ اس
غار کے کشادہ موقع میں تھے (ماجدی)
قرض کے معنی کاٹنے اور کترانے کے ہیں
اسی سے قَرَضَ المَكَانَ کا محاورہ ہے جس کے
معنی ہیں اس جگہ سے ہٹ گیا کترا گیا۔ گریز
کر گیا (تدبر)
قرضت المكان۔ ای عدلت عنه
(تقرضهم ذات الشمال) ای تعدل
عن سمت رؤسهم الى جهة الشمال (کبیر)
فَجْوَةٍ: وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ
فَجْوَةٌ، دو چیزوں کے درمیان کا خلاء،
شگاف اور گوشہ کو کہتے ہیں یہیں سے اسکا
اطلاق مکان کے صحن پر بھی ہوتا ہے اسکی جمع
فَجَوَاتٌ اور فِجَاءٌ آتی ہے۔ جیسے کہ رَكْوَةٌ کی
جمع رَكَوَاتٌ اور رِكَاءٌ آتی ہے۔ شاعر کہتا ہے
نَحْنُ مَلَأْنَا كُلَّ وَادٍ وَفَجْوَةٍ
رِجَالًا وَخَيْلًا غَيْرَ مِيلٍ وَلَا عُزْلٍ

وَالْفَجْوَةُ: المُتَّسَعُ فی المكان (کبیر)

وَالْفَجْوَةُ ۔ المتسع وجمعها فَجَوَاتٌ
وفجاءٌ مثل رَكْوَةٍ وركاء وركوات
(قرطبی) صیغہ صفت کا اَفْجٰی آتا ہے۔
رَجُلٌ اَفْجٰی، وہ آدمی جس کی دونوں ٹانگوں
کے درمیان فاصلہ ہو ۔ پنڈلیوں میں خم ہو
اِمْرَأَةٌ فَجْوَاءُ فجا، یَفْجُوا (ن)، فَجْوًا،
فجا الباب دروازہ کھولنا ۔ فجا القوس
تیر کمان کھینچنا ۔ اور فَجِیَ یفجی فَجًا
پنڈلیوں یا پیروں کے درمیان دوری کرنا
فَجّٰی الشَّیْئَ تَفْجِیَۃً کسی چیز کو ظاہر کرنا
اور فَجّٰی الشیئ عنہ دور کرنا علیحدہ کرنا
افجی الرجلُ افجاءً (افعال) بال بچوں
پر خرچ میں وسعت کرنا ۔ قال صاحب
الروح وھی ما قیل من الفجاء وھو
ماتباعد ما بین الفخذین (رح)
وھم فی فجوۃ منہ ای مساحۃ واسعۃ
(راغب) وہ پہاڑوں کے درمیان وسیع
میدان کو کہتے ہیں ۔

اَیْقَاظًا : وتحسبھم ایقاظا وَّھُمْ
رُقُوْدٌ، (آیۃ نمبر ۱۸) اور تو سمجھے وہ جاگتے
ہیں اور وہ سو رہے ہیں ۔ اَیْقَاظٌ جمع ہے
یَقُظٌ کی ۔ جاگنے والا ۔ بیدار ہونے والا یہ صفت
مشبہ کا صیغہ ہے جس کے معنی جاگنے والے
کے ہیں ۔ اَیْقَاظٌ جمع یَقِظٍ بکسر القاف ۔
کَاَنْکَادٍ وَنَکِدٍ کما فی الکشاف وبضمها
کاعضادٍ وعضدٍ کما فی الدر المصون
(روح) والایقاظ جمع یقظ ویقظان وھو
المنتبہ (قرطبی)
یَقِظَ یَیْقَظُ یَقَظًا ویَقُظَ یَیْقُظُ (ک)
یَقَاظَۃٌ : جاگنا ۔ محتاط ہونا ۔ چوکنا ۔
وصف یَقُظٌ ویَقِظٌ ویَقْظَانٌ جمع
ایقاظ مؤنث یقظی جمع یَقَاظٰی اور ایقظ
ایقاظًا (افعال) بیدار کرنا جگانا اور الیقظۃ
بیداری (منجد)

رقود : وَھُمْ رُقُوْدٌ : الرُّقَادُ
خوشگوار اور ہلکی سی نیند کو کہتے ہیں ۔
رَقَدَ یَرْقُدُ رُقُوْدًا فھو رَاقِدٌ ۔ راقد
کی جمع رُقُوْدٌ آتی ہے ۔ جیسے کہ سَاجِد کی
جمع سُجُوْدٌ ۔ اصحاب کہف کی گہری اور لمبی
نیند کے باوجود ان پر لفظ رُقود بول کر اس
طرف اشارہ کر دیا ہے کہ نیند خواہ کتنی ہی
گہری کیوں نہ ہو وہ موت کے مقابلے میں
نوم خفیف کی حیثیت رکھتی ہے ۔
مَرْقَدٌ ۔ خوابگاہ ۔ سونے کی جگہ ظرف ہے
قرآن پاک میں ہے ۔ یاویلنا من بعثنا
من مرقدنا (راغب) امام فخر الدین

رازیؒ فرماتے ہیں و مصدر سمی المفعول به کما یقال قوم رکوع و قعودٌ و سجود یوصف الجمع بالمصدر ومن قال انہا جمع راقدٍ فقد ابعد لانہ لم یجمع فاعل علی فعول (کبیر)

امام کے نزدیک رُقُودٌ، راقد جمع نہیں بلکہ مصدر ہے۔کیونکہ فاعلؒ کی جمع فعول کے وزن پر نہیں آتی۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ رُقُودٌ راقد کی جمع ہے اور جن حضرات نے اسکا انکار کیا ہے اُن کا انکار اسلئے مردود ہے کہ یہ نحاۃ کی صریح نصوص کے خلاف ہے (روح)

کَلْبٌ : وَکَلْبُہُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْہِ بِالْوَصِیْدِ (آیت نمبر ۱۸) اور اُن کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ الکلب۔ کتا۔ بھونکنے والا جانور اسکی جمع اَکْلُبٌ اور کلابٌ آتی ہے۔ اور مؤنث کَلْبَۃٌ ہے۔ کبھی کِلِیْبٌ بھی اسکی جمع آتی ہے۔ الکَلَبُ بفتح اللام کے معنی ہیں بہت حریص ہونا۔ محاورہ ہے ھُوَ اَحْرَصُ مِنَ الْکَلْبِ۔ وہ کتے سے زیادہ حریص ہے۔ اور رَجُلٌ کَلِبٌ کے معنی سخت حریص آدمی کے ہیں جمع کے لئے قومٌ کلبی کہا جاتا ہے۔ کلّابٌ اور مُکَلِّبٌ شکاری کتوں کو سدھانے والا۔ ارض مُکْلِبَۃٌ وہ زمین جسمیں کتے بہت ہوں۔ اَلْکَلْبَتَان لوہار کے ایک آلہ کا نام ہے، جس سے وہ گرم لوہے کو پکڑتا ہے کسی چیز کو پکڑنے کے لحاظ سے اس سے شکاری کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور دو کنارے ہونیکی وجہ سے تثنیہ کا لفظ اختیار کیا گیا ہے (مفردات)

الوَصِیْدُ : اس کے معنی اس احاطے کے ہیں جو مویشی کے لئے پہاڑ میں بنالیا جاتا ہے اور یہاں آیت کریمہ میں اس کے معنی غار کا صحن یا دروازے کی چوکھٹ کے ہیں۔ اسی سے اَوْصَدْتُ الْبَابَ وَ اَصَدْتُّہٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں میں نے دروازہ بند کردیا عَلَیْہِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَۃٌ اس کے معنی ہیں اسی آگ کو ان پر بند کردیا جائے گا۔ الوصِیدۃُ ۔ حجرۃ تجعل للمال فی الجبل (راغب)

الوَصِیدُ ، الفنا والجمع الوصائد وَ وُصُدٌ (قرطبی)

لفظ وصِیدٌ کا اطلاق دروازے پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

بِأَرْضٍ فَضَاءٍ لَا يُسَدُّ وَصِيدُهَا
عَلَيَّ مَعْرُوفِي بِهَا غَيْرُ مُنْكَرٍ

یہاں وصید سے مراد شاعر نے باب لیا ہے اور الوصید، اس پودے کو بھی کہتے ہیں جسکی جڑیں اوپر ہوں، زیادہ گہری نہ ہوں والوصید: النبات المتقارب الاصول (قرطبی) والوصید الفناء وقیل العتبۃ وقیل الباب۔ (کشاف) قال الزجاج الوصید فناء البیت وفناء الدار۔ کبیر
وَصَدَ يَصِدُ وَصْدًا: ثابت رہنا۔ وَصَدَ بِالْمَكَانِ: اقامت کرنا۔ وَصَدَ الثوب کپڑا بننا۔ وَصَّدَ تَوْصِيدًا کسی کو ڈرانا۔ أَوْصَدَ الْبَابَ دروازے کو بند کرنا۔ اور أَوْصَدَ عَلَى فُلَانٍ کسی کو تنگ کرنا۔ الوِصَادُ بندش اور ڈھکائی یہ لفظ مشترک الفاظ میں سے ہے۔ الوصید گھر کا صحن۔ چوکھٹ۔ غار، پہاڑ۔ قریب قریب جڑوں والی نباتات۔ دوبارہ ختنہ کیا ہوا۔ بند کیا ہوا۔ تنگ (منجد) فھو مشترك (قرطبی) الوصید اسم۔ گھر کی دہلیز کا صحن مراد غار کی دہلیز (لغات القرآن)
جس کتے کا یہاں ذکر ہے اسکے بارے میں روایات میں ہے کہ یہ جنتی ہے۔ یہ یہ صلہ ہے اہل اللہ کی وفاداری کا۔ یہیں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک کتا جب اہل اللہ کے ساتھ محبت کرتا ہے تو بارگاہِ الٰہی سے اسکو دخول جنت کا شرف حاصل ہوجاتا ہے تو کیا مقام ہوگا اُن خوش نصیب انسانوں کا جن کی وفاداریاں اور محبت کے تمام رشتے نبی آخر الزماںؐ کے قدموں میں ہوں اور جن حضرات نے اپنا گھر تمام مال و دولت قربان کردی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارہ پر اپنا وطن عزیز تک ترک کرکے مہاجرین گئے۔

فِرَارًا: لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا۔ (آیت نمبر ۱۸) تو تو اُن سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوتا (ماجدی)
اَلْفَرُّ اور الفِرَارُ کے اصل معنی ہیں جانوروں کی عمر معلوم کرنے کے لئے اُن کے دانتوں کو کھولنا۔ اسی سے فَرَّ الدَّهْرُ جَذَعًا کا محاورہ ہے یعنی زمانہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آیا۔ اِفْتِرَارٌ (افتعال) ہنسنے میں دانتوں کا کھل جانا۔
فَرَّ مِنَ الْحَرْبِ فِرَارًا۔ میدان کارزار کو چھوڑ دینا لڑائی سے بھاگ نکلنا۔ فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ، تو تم خدا کی طرف بھاگ چلو۔ أَفْرَرْتُهُ اِفْرَارًا

کسی کو بھگا دینا۔ اَلْمَفَرُّ : مصدر ظرفِ مکان ظرفِ زمان تینوں معنی میں آتا ہے۔ اَیْنَ الْمَفَرُّ کہاں ہے بھاگنے کی جگہ، یا بھاگنے کا وقت، یا یہ کہ اب بھاگنا کہاں، فراراً مصدر منصوب ہے منصوبٌ علی المصدر لانّ معنی ولّیت منہم فررتُ، (کبیر)

وَرِق : فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِیْنَةِ (آیت نمبر۱۹) تو اب اپنے میں سے کسی کو یہ روپے دیکر شہر کی طرف بھیجو۔ وَرِقٌ سے مراد وہ سکہ ہے جو دقیانوسی رومی کے زمانہ میں چل رہا تھا اور رومی سکہ پر رومی شہنشاہ کی تصویر کندہ تھی اُسی وقت کے سکے اُن کی جیبوں میں پڑے ہوئے تھے (ماجدی)

یَتَلَطَّفْ : وَلْیَتَلَطَّفْ ، اور خوش تدبیری سے کام کرے کہ کسی کو اس پر حکومت کا باغی یا مجرم ہونیکا شبہ نہ ہونے پائے (ماجدی) وَلْیَتَلَطَّفْ واحد مذکر امر حاضر غائب کا صیغہ ہے اصل مادہ تلطّف ہے۔ باب تفعّل سے ہے حُسنِ تدبیر اور مخفی دانش سے کام لیں تَلَطُّف خاکساری کرنا۔ تَلَطَّفَ بہ حیلہ کرکے بھیدوں کو معلوم کرنا۔

اَللَّطِیْفُ ، اللہ تعالیٰ کی صفات اور اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے۔ اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ ، وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۔ اللّطیف، صفۃ من صفات اللہ واسم من اسمائہ (لسان العرب) لَطَفَ (ن) یَلْطُفُ لُطْفًا۔ لطف بفلانٍ و لفلانٍ مہربانی کرنا۔

لطف اللہ بالعبد ولہٗ توفیق دینا۔ بچانا اللّطف من اللہ تعالیٰ التوفیق والعصمۃ (لسان) لَطُفَ الشیءُ قریب ہونا۔

اَعْثَرْنَا : وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ (آیت نمبر۲۱) اور اسی طرح ہم نے لوگوں کو اُن پر مطلع کر دیا، یعنی جس طرح ہم نے اپنی خاص قدرت و حکمت سے ان اصحاب کہف کو سلا دیا اور پھر جگایا تھا اسی طرح اپنی خصوصی حکمت و قدرت سے عام خلقت کو ان کے حال پر مطلع کردیا (ماجدی) اس کَذٰلِكَ کا عطف اوپر والے كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ کے اُوپر ہے یعنی جس طرح ہم نے وہ شان دکھلائی اسی طرح ہم نے یہ شان دکھلائی کہ لوگوں کو ان سے باخبر کردیا (تدبر)

عَثَرَ یَعْثُرُ عِثَارًا و عُثُوْرًا کے معنی پھسل جانے اور گر پڑنے کے ہیں مجازاً اعثر علیٰ کذا کے معنی کسی بات پر بغیر قصد کے مطلع

ہوجانا بھی آتے ہیں، اور اَعْثَرَہٗ علیٰ کذا (افعال) اُس نے فلاں کو اس چیز پر مطلع کردیا، یا اس چیز سے باخبر کردیا۔
العَثْرَۃُ : لغزش جہاد، لڑائی، گرنا جمع عَثَرَاتٌ، عَاثِرَۃٌ : حادثہ، جمع عَوَاثِر، جیسے حادثہ کی جمع حوادث آتی ہے تَعَثَّرَ لِسَانُہٗ زبان کا رُکنا۔ والعَثْرَۃُ الذّلّۃُ، ویقال عَثَرَ بِہٖ فرسُہٗ فسقط وتعثّر لسانہٗ تلعثم (لسان) العاثورُ گڑھا جو کسی کے گرنے کی خاطر کھودا جائے۔
وَقَعُوْا فی عاثور : سختی میں پڑ گئے،
حدیث میں ہے لاحلیم الّا ذو عَثْرَۃٍ، کوئی شخص عقلمند نہیں ہوتا جب تک لغزش نہ کھائی ہو عثر العِرْقُ : رگ پھڑکی۔

تُمَارِ : فَلَا تُمَارِ فِیْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا (آیت نمبر ۲۲) سو مت جھگڑ ان کی بات میں مگر سرسری جھگڑا (معارف)
مماراۃ کے معنی بحث و مناظرہ کرنے کے ہیں۔ لا تُمَارِ فعل نہی ہے کسی ایسی بات میں جھگڑنا اور گفتگو کرنا جس میں شک ہو۔
لا تُمَار تو جھگڑا نہ کر۔ اصل مصدر مِرْیَۃٌ ہے جس کے معنی کسی معاملے میں تردّد کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے فَلَا تَکُنْ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْ لِّقَائِہٖ،
المِرْیَۃُ ۔ التَّرَدُّدُ فِی الْاَمْرِ : وَالْاِمْتِرَاءُ والمُمَارَاۃُ ۔ المحاجّۃ فیما فیہ مِرْیَۃٌ (راغب)
المِرْیَۃُ والمُرْیَۃُ بالکسر والضمّ : الشک والجَدَل (لسان)، والتماری والمُماراۃ المجادلۃ علیٰ مذہب الشک والرِّیبَۃ (لسان)

سُرَادِقُ : اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (آیت نمبر ۲۹) ابو السعادات مبارک ابن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ ہر وہ شئے جو کسی شے کا احاطہ کئے ہوئے ہو خواہ چار دیواری ہو یا شامیانہ یا خیمہ وہ سُرادق ہے (لغات القرآن)
صاحب روح المعانی علامہ راغب کا یہ قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ وقد اصاب فی دعوی التعریب فلانّ عامّۃ اللغویین علیٰ ذلک، واما قولہٗ ۔ و لیس فی کلامہم اسم مفرد ثالثہ الف وبعدہ حرفان ۔ فیکذ بہٗ وُرُوْدُ علابط وقراوص وجنادف وحلاحل وکلّہا بزنۃ سرادق ۔ یعنی لفظ سرادق کے معرب ہونے میں تو راغب نے صحیح کہا ہے کیونکہ عامّہ اہل لغت اسی کے قائل ہیں لیکن یہ جو کہا ہے کہ کلام عرب کوئی ایسا

مفرد نہیں جس میں تیسرا حرف الف ہو اسکے
بعد دو حرف ہوں۔ اسی قول کی بنا پر ان
الفاظ کے ورود سے تکذیب ہوتی ہے جو
الفاظ اوپر ذکر کئے گئے ہیں۔ چونکہ یہ تمام
الفاظ سرادق کے وزن پر ہیں لہٰذا ان الفاظ
کا وارد ہونا راغب کے قول کی تکذیب
کرتا ہے۔

لیکن علامہ راغب جیسے فاضل سے ایسی
غفلت بعید ہے، لہٰذا غور کرنا چاہئے کہ انکی
مراد کیا ہے (روح) علامہ جوہری لغوی کا
قول ہے کہ سرادق واحد ہے سرادقات
کی اس سے مراد صحن کی چاردیواری ہے
اور اسی طرح ہر وہ مکان جو روئی اور کپڑے
سے بنایا گیا ہو اس کو بھی سرادق کہا جاتا ہے
بیتٌ مُسَرْدَقٌ، وہ گھر جو شامیانے کی طرز
کا بنایا جاتا ہے، کلامِ عرب کا ایک مشہور شاعر
اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے

یا حکم ابن منذر بن الجارود
سُرَادِقُ المجد علیك ممدودُ

اے منذر بن جارود کے بیٹے حکم، شرافت
اور بزرگی کے پردے تیرے اوپر تنے رہیں،
ابرویز کو جو ملک فارس میں سے تھا نعمان بن
منذر نے ہاتھیوں کے پاؤں تلے کچل کرا دیا
تھا۔ اسی مقتول ابرویز (پرویز) کا ذکر کرتے
ہوئے اسلامہ بن جندل کہتا ہے ؎

هو المدخل النعمان بيتًا سماؤه
صدور الفيول بعد بيتٍ مُسَرْدَقٍ

قال الجوهري السرادق واحد السرادقات
التي تمدّ فوق صحن الدار، السرادق
الحجرة التي تكون حول الفسطاط، قاله
القتبي وابن عزيز (قرطبی) بعض حضرات
کا قول یہ بھی ہے کہ سرادق سے مراد وہ دھواں
ہے جو قیامت میں کفار کو گھیر لیگا اور سورۃ المرسلات
کی آیاتِ کریمہ، اِنْطَلِقُوْا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ
شُعَبٍ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

سُرَادِقُهَا : قنات باندھنا، سُرَادِق :
قنات، جمع سُرادقات - قناتیں - خیمے،
حدیث میں ہے لسرادقات النار اربعة
جُدُرٍ كِثَفٍ - دوزخ کا احاطہ - چار
موٹی دیواریں ہیں - سُرادِق الجلال، عظمت
کی قناتیں۔

المُهْل : وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا
بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ (آیت ۲۹)
اور وہ فریاد کریں گے تو انکی فریاد رسی ایسے
پانی سے ہوگی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا
جو چہروں کو بھون ڈالے گا۔

يقال شَوَيْتُ اللَّحْمَ فَانْشَوٰى واشتوٰى (لسان) شَيٌّ مصدر اور شِوَاءٌ اسم ہے۔
شَوَى الماءَ يَشْوِيْهِ: اس نے پانی کو گرم کیا،
الشُّوَايَةُ والشَّوَايَةُ ہلاک شدہ قوم کے بقیہ افراد یا ہلاک شدہ مال کا بقیہ حصہ اور
الشَّوِيَّةُ: ہلاک شدہ قوم کے باقی افراد، اسکی جمع شَوَايَاہے۔ الشَّوٰى: جلد والشَّوَاةُ سر کی جلد۔ شَوَيْتُ الماءَ پانی اُبالنا۔ حدیث میں ہے لَا تَنْقُضُ الْحَائِضُ شَعرَهَا إِذَا أَصَابَ الْماءُ شَوَى رَأسِهَا یعنی حائضہ کو غسل میں سر کے بال کھولنے ضروری نہیں جب اس کے سر کی جلد تک پانی پہنچ جائے۔
كُلُّ شَيْءٍ شَوًى مَا سَلِمَ لَكَ دِينُكَ۔ ہر چیز آسان ہے جب تک تیرا دین محفوظ ہے كُلُّ مَا أَصَابَ الصَّائِمَ شَوًى إِلَّا الْغِيْبَةَ۔ اور روزہ میں، مصیبت جو آئے آسان ہے سوائے غیبت کے، غیبت ایسی مصیبت ہے کہ اگرچہ روزہ نہ ٹوٹے مگر ثواب برباد ہوجاتا ہے

أَسَاوِرَ: يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ (آیت نمبر ۳۱)
پہنائے جائیں گے ان کو وہاں کنگن سونے کے اور پہننے کے کپڑے سبز باریک اور گاڑھے ریشم کے (ترجمہ معارف) أَسَاوِر۔ کنگن عورت کا زیور وهُوَ جمع سِوَارٍ (قرطبی) بعض اہلِ لغت کا خیال ہے کہ أَسَاوِرَ أَسْوِرَةٌ کی جمع ہے اور أَسْوِرَةٌ جمع ہے سِوَارٌ اور سُوَارٌ کی۔
قطرب کہتے ہیں کہ أَسَاوِر یہ جمع ہے إِسْوَارٌ کی۔ نحاس کہتے ہیں کہ قطرب صاحبِ شذوذ ہے اس لئے اس کو یعقوب وغیرہ اہلِ لغت نے ترک کردیا ہے۔ لیکن صحاح میں ابوعمرو بن العلاء کا قول بھی یہ نقل کیا گیا ہے کہ أَسَاوِر کی واحد إِسْوَارٌ ہے۔ قد جاء فی الصحاح وقال ابو عمرو بن العلاء واحدها إِسْوَارٌ (قرطبی) جمع الجمع أَسَاوِرَةٌ آتی ہے۔
قرآن میں ہے فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسَاوِرَةٌ مِنْ ذَهَبٍ، اگر سوار چاندی کے ہوں تو اُن کو قُلْبٌ کہا جاتا ہے۔ اسکی جمع قِلَبَةٌ آتی ہے اور اگر قرن اور عاج وغیرہ کے ہوں تو وہ مَسَكَةٌ ہے اس کی جمع مَسَكٌ ہے (قرطبی۔ لسان)
سَارَ يَسُوْرُ سَوْرًا کے اصل معنی بلندی کی طرف کودنے کے ہیں۔ غصہ یا شراب کی شدت میں بھی سُوْرَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔
سورۃ الخمر وغيرها وسوارها حدّتها (لسان) سَارَ الحائط: دیوار پر چڑھنا، پھاندنا۔ سَارَ إِلَيْهِ کودنا سَارَ الشَّرَابُ

في رأسه. شراب کا سر کو چکرا دینا۔ سَوَّرَ
الْمَدِيْنَةَ شہر کے ارد گرد شہر پناہ بنانا۔
سَوَّرَ الْمَرْءَةَ عورت کو کنگن پہنانا، اور
سَاوَرَهُ مُسَاوَرَةً ایک دوسرے پر حملہ آور
ہونا۔ سُوْرَةٌ (بضم السین) مرتبہ، علامت
شرافت، دبدبہ، اونچی خوبصورت عمارت
سُوْرَةٌ مِنَ الكتاب: قرآن پاک کی ایک سورۃ
قطع آیات، لَهُ عَلَيْكَ سُوْرَةٌ: اس کو تم پر
بزرگی اور فضیلت ہے۔ جمع سُوَرٌ اور
سُوَرَاتٌ سُوْرٌ وسُوْرَاتٌ آتی ہے۔
سُوْرَةُ السُّلْطَان: بادشاہ کا دبدبہ
سُوْرَةُ الْمَجْدِ: بزرگی کا اثر۔ سُوْرَةُ الْبَرْدِ
سردی کی شدت۔ سُوَارٌ: کلائی کا وہ حصہ
جہاں کنگن پہنے جاتے ہیں۔ اور فلاں ذو
سُوْرَةٍ فِي الْحَرْبِ کے معنی ہیں، فلاں جنگ
میں تجربہ کار اور پختہ نظر ہے۔ (لسان)
سُنْدُسٍ: نہایت باریک اور نفیس کپڑا،
اس کی واحد سُنْدُسَةٌ آتی ہے۔ وَهُوَ مَا
رَقَّ مِنَ الدِّيْبَاجِ (کشاف) وهو
الرَّقِيْقُ النَّحِيْفُ (قرطبی) جو الیقی کہتے ہیں
کہ سندس فارسی کا لفظ ہے۔ باریک ریشم
کو کہتے ہیں۔ لیث کہتے ہیں کہ اہل لغت اور
مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ معرب ہے

(روح) علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ صحیح ہے
کہ یہ توافق بین اللغتین ہے۔ یہ جس طرح
عجمی زبانوں میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح
عربی میں بھی اسکا استعمال عربی زبان کی حیثیت
سے ہوتا ہے۔ چونکہ کوئی بھی ایسا لفظ جو عربی
نہ ہو قرآن نے ذکر نہیں کیا۔ والصحيح انه
وِفَاقٌ بين اللغتين۔ اذ ليس في القرآن
ما ليس من لغة العرب (قرطبی)
السندس: رقيق الديباج، وهو الحرير
المنسوج الذي يتلوّن الوانًا (معجم الفاظ
القرآن) حدیث میں ہے، بعث رسول الله
صلى الله عليه وسلم الى عمر بجبة سندس
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے
پاس ایک باریک ریشمی کپڑے کا چوغہ بھیجا۔
اِسْتَبْرَقٌ: ریشم کا زریں موٹا کپڑا۔ دیبا
(لغات القرآن) وَالْإِسْتَبْرَقُ: ما تخن
منه عن عكرمة۔ وهو الحرير (قرطبی)
ایک شاعر کہتا ہے ؎

تَرَاهُنَّ يَلْبَسْنَ الْمَشَاعِرَ مَرَّةً
وَاِسْتَبْرَقُ الدِّيْبَاجِ طَوْرًا لِبَاسُهَا

اس ذکر کردہ شعر سے معلوم ہوا کہ عرب لفظ
استبرق سے دیباج مراد لیتے ہیں۔ عام
اہل لغت و تفسیر کا اس لفظ کے بارے

ہیں بعض یہی خیال ہے کہ یہ معرب ہے۔ لسان العرب سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ لغت و تفسیر کا دو باتوں میں اتفاق ہے۔ ایک یہ کہ سندس باریک اور اعلیٰ ریشم اور استبرق موٹے اور گاڑھے ریشم کو کہا جاتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ سندس اور استبرق دونوں معرّب ہیں (لسان)

قال المفسرون فی السندس انہ رقیق فی الدیباج ورفیعہ وفی تفسیر الاستبرق انہ غلیظ الدیباج ولم یختلفوا فیہ ولم یختلف اہل اللغۃ فیھما انھما مُعَرّبانِ (لسان)

اَلْاَرَائِكَ : اَرَائِكُ ، اَرِيكَةٌ کی جمع ہے۔ مسہریاں، وہ تخت یا پلنگ جس پر تکیے لگے ہوئے ہوں اَرِيكَةٌ آراستہ مزین تخت، اَرَكَ ، يَارِكُ ، اُرُوْكًا، اَرَكَ الجَمَلُ ، اونٹ کا پیلو کے درخت کے پتے کھانا۔ اِرَاكٌ ۔ پیلو کا درخت، واحد اراكۃ جمع اُرُكٌ و اَرَائِكُ ،

امام راغب فرماتے ہیں الاَرِيكَۃُ حَجَلَۃٌ علی سریر جمعھا الارائك ۔ اریکہ حجلہ (مسہری) جو سریر یعنی تخت کے اوپر رکھا ہو۔ اس کی جمع اَرَائِک ہے۔

اسکو اَرِيكَۃٌ کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ دنیا میں اراکٌ یعنی پیلو کی لکڑی سے بنایا جاتا ہو اور یا محلِ اقامت ہونے کی وجہ سے، اور اَرَكَ بالمکان سے مشتق ہے جس کے اصل معنی کسی جگہ پر پیلو کے پتے چرنے کے لئے ٹھہرنا کے ہیں۔ پھر مطلق ٹھہرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اسلئے اہلِ جنت کے چھپر کھٹوں کو جو اہلِ جنت کی اقامت گاہ ہونگے اَرائک کہا گیا ہے۔

الارائك : جمع اَرِيكَۃٍ وھی السُّرُرُ فی الحجال وقیل الفُرُشُ فی الحجال (قرطبی) جمع اَرِيكَۃٍ کما قال غیر واحد وھو السریر فی الحجلہ فان لم یکن فیھا فلا یُسمّٰی اریکۃ (روح)

واصل الاروك الاقامۃ علی رعی الاراك ثُمَّ تجوز بہ فی غیرہ من الاقامات (روح) اَرَكَ الرجلُ بالمکان: آدمی نے ایک مقام پر قیام کیا۔

مُتَّكِئِينَ : مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْاَرَائِكِ (آیت نمبر ۳۱) مُتَّكِئِينَ کی اصل مُوتَكِئِينَ ہے اسی طرح اِتِّكَاءٌ کی اصل اِوْتِكَاءٌ ہے۔ اور تُكَاةٌ کی اصل وُكَاةٌ باب افتعال میں لیجاکر واؤ کو تار سے بدل دیا اور تار کو تار میں

اَلْمُهْلُ ۔ بضم المیم ۔ پگھلی ہوئی دھاتیں لوہا
تانبا، چاندی، قطران، زیتون کا تیل، زہر،
پیپ، روئی سی جھڑی ہوئی راکھ، مُهْلَةٌ مصدر
راکھ میں بچی ہوئی چنگاری، آہستگی، نرمی
اَلْمَهْلُ ۔ بفتح المیم کے معنی حلم وسکون کے ہیں
مَهَل فی فِعْلِهٖ کے معنی ہیں اس نے سکون سے کام
کیا ۔ اور مہلاً کے معنی رفقاً کے بھی آتے ہیں ۔
مہلاً یعنی جلدی مت کر، آہستہ کر ۔ تمہیلٌ اور
اِمْهالٌ مہلت دینا، نرمی کرنا، مبالغہ کرنا،
تمہّل ۔ ٹھہر کر کام کرنا، جلدی نہ کرنا ۔ استمہالٌ
مہلت مانگنا، نرمی چاہنا ۔ مَا يَبْلُغُ سَعْيُهُمْ مَهْلَهٗ،
ان کا دوڑنا اس کے آہستہ چلنے کے برابر نہیں،
ارضی دھاتوں سے جو چیز پگھل کر نکلتی ہے
اس کو مُہل کہتے ہیں ۔ صاحب کشاف فرماتے ہیں
والمهل : مَا اُذِيْبَ مِنْ جواہر الارض (کشاف)
اور تیل کی تلچھٹ کو بھی مہل کہتے ہیں ۔
وقيل : دُرْدِيُّ الزَّيْتِ، (کشاف)
قال ابن عباس، المهل مَاءٌ غَلِيْظٌ
مثل دُرْدِيّ الزّيت، وقال ابو عبيدة
هُوَ كُلّ مَا اُذِيْبَ من جواهر الارض
من حَدِيْد ورصاص ونحاس وقزدير
فتموّج بالغليان فذالك المهل (قرطبی)
حدیث میں ہے المهل كَعَكَرِ الزّيت

فاذا قرب اليه سَقَطَتْ فروة وجهه
دوزخ کا پانی تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا اور اتنا
گرم ہوگا کہ جب اس کو منہ کے قریب لایا جائے گا
تو منہ کی کھال گر جائے گی ۔
يَشْوِيْ : يَشْوِي الْوُجُوْهَ، چہروں کو بھون
ڈالے گا ۔ شويت اللّحم وَاشتوَيْتُهٗ کے
معنی ہیں گوشت بھوننا ۔ الشَّوٰی جسم کے
اطراف ہاتھ پاؤں وغیرہ وہ اعضا جن پر لگنے
سے عام طور پر موت واقع نہیں ہوتی، محاورہ
ہے رَمَاهُ فاشوَاهُ، اس نے تیر مارا تو اسکے
اطراف پر لگا، یعنی کسی ایسے عضو پر نہیں لگا،
جس پر لگنے سے آدمی مرجائے ۔ قرآنِ پاک
کی آیتِ کریمہ ہے نَزَّاعَةً لِلشَّوٰی (وہ شعلہ
آگ) کھال اُدھیڑ دیگا ۔ اسی سے اس معاملہ
کو بھی شوٰی کہہ دیتے ہیں جو غیر اہم ہو ۔
شوٰی يَشْوِيْ شَيًّا ۔ بھوننا شَاوٍ بھوننے
والا شِوَاءٌ بھنا ہوا گوشت مَشْوِيٌّ بھنا
ہوا تَشْوِيَةٌ اور اِشْوَاءٌ (افعال) بھنا ہوا
گوشت کھلانا اِنْشِوَاءٌ واشْتِوَاءٌ (انفعال
انتعال) بھن جانا ۔ یہ دونوں مصدر یعنی
اِنْشِوَاءٌ واشْتِوَاءٌ، شوٰی کے مطاوع
بن کر بھی استعمال ہوتے ہیں ۔ شَوَى اللَّحْمَ
فَانْشَوٰى وَاشْتَوٰى واجاز سيبويه ان

مدغم کر دیا (قرطبی) اصل مادہ وکاءٌ ہے، کسی چیز کا سربند ڈھکنا۔ اور کبھی وکاءٌ اس چیز کو بھی کہدیا جاتا ہے جس میں کوئی چیز ڈالکر اس کا منہ بند کر دیا گیا ہو۔ اسی سے اَوْكَاْتَ فلانا ہے کسی کے سے تکیہ لگانا۔ توکّاْ علی العصا۔ اس نے لاٹھی پر ٹیک لگائی، اس سے قوت حاصل کی (دیکھئے سورۂ یوسف)

کِلْتَا: کِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا (آیت نمبر ۳۳) دونوں باغ کثرت سے پھل لائے۔ کِلْتَا اور کِلَا دونوں تثنیہ کے معنی دیتے ہیں۔ چونکہ لفظاً مفرد اور معناً تثنیہ ہوتے ہیں اس لئے کبھی ان کو مفرد اور کبھی تثنیہ تصور کر لیا جاتا ہے کلا مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کلتا مؤنث کے لئے قرآن پاک میں ہے اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہنچ جائے۔ اور کِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا جب یہ اسم ظاہر کی طرف مضاف ہوں تو ان کا الف احوال ثلثہ میں باقی رہتا ہے اور اس میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، مگر جب ضمیر کی طرف مضاف ہوں تو حالت رفعی میں تو ان کا الف بحالہ باقی رہتا ہے لیکن نصبی اور جرّی میں یار سے بدل جاتا ہے جیسے جاءنی کلاھما، ورأیتُ کلیھما۔ ومررتُ بکلیھما (لسان۔ راغب)

فرّا کے نزدیک کلا اور کلتا دونوں لفظ لفظاً بھی تثنیہ ہیں اور معنًی بھی تثنیہ ہیں، اور یہ کُلٌّ سے بنے ہیں۔ اس طرح کہ لام کی تشدید کو تخفیف کر کے الف بطور تثنیہ بڑھا دیا گیا ہے لیکن فرار کے دونوں قولوں کی کلام شعرار سے تردید [illegible] ہوتی ہے چنانچہ صاحب لسان العرب علم نحو کے مشہور امام سیبویہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ کلا، کُلٌّ سے نہیں بنا، کیونکہ کُلٌّ صحیح ہے اور کلا معتل ہے۔ اور تثنیہ مؤنث کے لئے کلتا بولا جاتا ہے۔ اسی طرح فرار کا یہ کہنا کہ کلا لفظاً بھی [illegible] ہے محل نظر ہے چونکہ جاہلی اور اسلامی شعرار کا کلام [illegible] کے قول کی تغلیط کرتا ہے۔ ملک الشعرا امرأ القیس کہتا ہے، کِلَانَا اِذَا مَا نَالَ شَیْئًا اَفَاتَهٗ ومن یحترث حرثی وحرثك یھزل دونوں کی مثال اس جیسی ہے جب اس کو کوئی چیز ملتی ہے تو وہ کھو بیٹھتا ہے۔ جو شخص بھی میری اور تیری طرح کھیتی کریگا ضرور کمزور اور لاغر ہوگا۔ اس شعر کے پہلے مصرعے میں نال اور افات واحد کے

صیغے ہیں۔ اور اگر کلا لفظاً بھی تثنیہ ہوتا تو واحد کی ضمیریں کس طرح راجع ہوتیں، اس طرح جریر اموی کہتا ہے کہ ؎

کلا یومی اُمامۃَ یومُ صَدٍّ

یہاں بھی یوم صدٍّ مفرد ہے اور کلا کی خبر واقع ہو رہا ہے اور اگر لفظاً بھی کلا کو تثنیہ کہا جائے تو خبر واحد نہیں ہوسکتی۔

سیبویہ کے قول کے مطابق کلا اور کلتا کا الف علامت تانیث ہے۔ اور کلتا میں تاء بجائے واؤ کے آتی ہے۔ اصل میں کِلْوا تھا، واؤ کو تاء سے بدلکر علامت تانیث کی تاکید کر دی گئی ہے ورنہ حقیقت میں علامت تانیث الف ہی ہے۔

کلا، کلمۃ مَصُوْغَۃٌ للدلالۃ علی اثنین، کما انّ کُلاًّ، مَصُوْغَۃٌ للدلالۃ علی الجمع، قال سیبویہ: ولیس کِلا من لفظ کُلٍّ، کُلٌّ و کِلا معتلۃٌ، ویقال للانثتین کِلتا و ھٰذِہِ التاءُ یَحکُمُ علی انّ الف کلا مُنْقَلِبَۃٌ عن واوٍ لان بدال التاء من الواوِ اکثر من بدلھا من الیاء (لسان العرب)

قال سیبویہ: الف۔ کلتا۔ للتانیث والتّاءُ بدل من لام الفعل وھی واوٌ والاصل کِلْوا، وانّما ابدلت تاءً لانّ فی التّاءِ علم التانیث (قرطبی)

ابوعمر الجرمی کا قول یہ ہے کہ کلتا میں حرف تا ملحقہ ہے اور الف، فعل کا لام کلمہ ہے اس کا اصل وزن فِعْتَلٌ ہے۔ لیکن ابوعمر الجرمی کا یہ قول اگر صحیح ہوتا تو عرب نسبت میں کلتویٌّ کہتے حالانکہ نسبت میں کِلَوِیٌّ کہا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلتا کی تا ملحقہ نہیں ہے بلکہ تانیث کی ہے۔

اُکُلٌ : اٰتَتْ اُکُلَھَا (آیت نمبر ۳۳) لفظ کلتا، چونکہ لفظاً مفرد ہے اس لئے آیت کی ضمیر اور اُکُلَھا میں ہا کی ضمیر واحد لائی گئی ہے اور چونکہ معنًی کلتا تثنیہ ہے اس لئے اگر معنی کا اعتبار کرکے اٰتَتَا اُکُلَھُمَا کہا جائے تو صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ صحیح ہوگا۔ یعنی کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتَا اُکُلَھُمَا۔ لیکن بعض نحاۃ کا قول ہے کہ معنی پر حمل کر کے کلتا اور کلا کی خبر کو تثنیہ استعمال کرنا غیر قرآن میں جائز ہے قرآن میں نہیں۔

اُکُلٌ : کھجور اور درختوں کے پھل وغیرہ کو کہا جاتا ہے اور ہر وہ چیز جو کھائی جاتی ہے اُکُلٌ ہے۔ والاُکُلُ بِضَمِّ الھمزۃ، ثمرُ النخل والشجر وکُلُّ مَا یُؤْکَلُ فھو اُکُلٌ (قرطبی) اُکُلٌ۔ پھل میوہ (لغات القرآن)

اَكَلَ يَاْكُلُ اَكْلًا وَمَاْكَلًا : کے معنی ہیں کھانا تناول کرنا اور مجازًا اَكَلَتِ النَّارُ الْحَطَبَ : کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی آگ نے ایندھن کو جلا ڈالا۔ اور جو چیز کھائی جائے اس کو اُكُلٌ ، کاف کے ضمہ اور کسرہ دونوں طرح کہا جاتا ہے۔ اَكْلَةٌ مَرَّةٌ کا صیغہ ہے ایک مرتبہ کھانا (راغب) اِئْتَكَلَ الرَّجُلُ آدمی آتشِ غضب میں بھن گیا، غضب سے بھڑک اُٹھا۔

ثَمَرٌ : وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ (آیت نمبر ۳۴) ثَمَرٌ - پھل ، میوے - یہ جمع ہے اس کی واحد ثَمَرَةٌ آتی ہے۔ ثَمَرَاتٌ بھی اسی کی جمع ہے، اور ثَمَرٌ کی جمع ثِمَارٌ ہے۔ جیسے جَبَلٌ کی جمع جِبَال ۔ فراء کہتے ہیں کہ ثِمَارٌ کی جمع ثُمُرٌ آتی ہے۔ جیسے کتاب کی جمع كُتُبٌ اور ثُمُرٌ کی جمع اَثْمَارٌ ہے۔ جیسے عُنُقٌ کی جمع اَعْنَاقٌ ہے اور ثَمَرٌ اس مال کو بھی کہا جاتا ہے جو نفع دینے والا اور صاحبِ مال کے لئے بارآور ہو ۔ (ماخوذ از قرطبی) ثَمَرَ الشَّجَرُ : درخت پھلدار ہوا ۔ ثَمَرَةُ الْعِلْمِ الْعَمَلُ : علم کا پھل عمل ہے ۔

يُحَاوِرُهٗ : فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ : حَاوَرَ ، يُحَاوِرُ ، مُحَاوَرَةً گفتگو کرنا، جواب دینا ۔ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ وہ اُس سے گفتگو کر رہا تھا، اس کو جواب دے رہا تھا ۔ مُحَاوَرَةٌ کے معنی تو گفتگو کرنے کے ہیں مگر یہاں قرینہ کی وجہ سے معنی شیخی اور فخر جتانے کے ہیں ۔ اس لئے بعض اہلِ تفسیر نے یہاں يُحَاوِرُهٗ کے معنی يُفَاخِرُهٗ کے کئے ہیں وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ يُفَاخِرُهٗ (جلالین)

اصل میں یہ حَوْرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی لوٹنے اور پلٹنے کے ہیں ۔ خواہ وہ پلٹنا بلحاظ ذات کے ہو یا بلحاظ فکر اور عقائد و نظریات کے، حَارَ يَحُوْرُ حَوْرًا و مَحَارًا واپس ہونا ۔ لوٹنا ۔ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۔ یعنی ملحد کا خیال تھا کہ وہ دوبارہ زندہ ہو کر خدا کی طرف کبھی پلٹے گا ہی نہیں، لَنْ يَّحُوْرَ سے مراد دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھنا ہے ۔

والمحاورۃ : مراجعۃ الکلام من حَارَ اذا رجع ای یُرَاجِعُهٗ الکلام فی انکار البعث (روح) والمُحَاوَرَةُ : المجاوبۃ والتَّحَاوُرُ التجاوب (قرطبی)

کہا جاتا ہے كَلَّمْتُهٗ فَمَا اَحَارَ اِلَىَّ جوابًا ۔ یعنی میں نے اس سے بات کی ۔ مگر

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ الحَوْرُ۔ التَّرَدُّدُ
إمَّا بالذّاتِ وامّا بالفکر۔ والمحَاوَرَةُ
والحوارُ : المُرَادَّةُ فی الکلام (راغب)

نُطْفَةٍ : خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ
نُّطْفَةٍ (آیت نمبر ۳۷)

النُّطْفَةُ - صاف پانی تھوڑا ہو یا بہت
سمندر۔ مرد یا عورت کا نطفہ۔ جمع نِطَافٌ
و نُطَفٌ۔ النَّطَافَةُ - ڈول یا مشک میں
بچا ہوا پانی - ہر ٹپکنے والی چیز۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ
نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ - پھر ہم نے
اس کو ایک مضبوط اور محفوظ جگہ نطفہ بنا کر
رکھا۔ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ، ملے جُلے
محفوظ نطفہ سے۔ اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ
مَّنِیٍّ یُّمْنٰی۔ کنایہ کے طور پر اُس موتی کو
بھی نُطْفَۃٌ کہا جاتا ہے جو صاف ہو صَبِیٌّ
مُنَطَّفٌ وہ لڑکا جس کے کانوں میں موتی
پڑے ہوئے ہوں۔ لَیْلَةٌ نَطُوْفٌ، وہ
رات جس میں صبح تک بارش برسے۔ نَطَفَهٗ
نَطْفًا و نَطَفَهٗ و اَنْطَفَهٗ۔ کسی پر بدکاری
کا الزام لگانا عیب لگانا۔ نَطَّفَ المَرْاَۃَ
عورت کو بالیاں پہنانا۔ نَطِفَ (س) نَطَفًا
و نُطْفَةً و نُطُوْفَةً۔ عیب دار ہونا،
ملزم ٹھہرایا جانا۔ تہمت لگایا جانا۔

حدیث میں ہے۔ فجاء رجلٌ بِنُطْفَةٍ
فِیْ اِداوۃٍ : ایک آدمی تھوڑا سا بچا ہوا
پانی ڈول میں لایا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام
کے بارے میں ہے۔ یَنْطُفُ رَأْسُهٗ مَاءً
اُن کے سر سے پانی ٹپک رہا ہوگا۔ دَخَلْتُ
عَلٰی حَفْصَةَ وَنَوْسَاتُهَا تَنْطُفُ، میں
حضرت حفصہ اُم المؤمنین کے پاس گیا انکی
زلفوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ نَطِفٌ۔ پلید
نسکی آدمی۔ مُتَّہِمٌ۔ النَّطَفُ والوحرُ
العیب : یقال هُمْ اَهْلُ الرِّیَبِ و
النَّطَفِ والنَّطِفُ۔ الرَّجُلُ المریبُ
والنُّطْفَةُ : القلیل من الماء۔ وقیل
الماءُ القلیلُ یَبْقٰی فِی الدلو (لسان)
جوہری کہتے ہیں کہ لفظ نُطْفَۃٌ جب ماءِ
صافی کے معنی میں ہو تو اس کی جمع نِطَافٌ آتی
ہے۔ اور وہ نُطْفَہ جس کے معنی منی یعنی
ماء الرجل کے ہیں اسکی جمع نُطَفٌ آتی ہے (لسان)

حُسْبَانٌ : وَیُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا
مِّنَ السَّمَآءِ (آیت نمبر ۴۰)

حُسْبَانٌ۔ ایسی مصیبت جو حکم غیبی سے
بلا توسط اسباب طبعی ہو۔ مصیبت تقدیری
(ماجدی) یہ حُسْبَانَۃٌ کی جمع ہے، عذاب
کڑک۔ اولے وغیرہ، وَاحِدُهَا حُسْبَانَۃٌ

قال اخفش والقُتَیبِیُّ وابوعبیدہ وقال ابن الاعرابی : وَالحُسْبَانَۃُ السَّحَابَۃُ ۔ والحُسْبَانَۃُ الوِسَادَۃُ والحُسْبَانَۃُ الصَّاعِقَۃُ (قرطبی) اور چھوٹے چھوٹے تیروں کو بھی حُسْبَانٌ کہتے ہیں (قرطبی) حقیقت میں حُسْبَانٌ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جس پر محاسبہ کیا جائے اور پھر اسکے مطابق بدلہ دیا جائے ۔ وانما ھوفی الحقیقۃ ما یحاسب علیہ فیجازی بحسبہٖ (راغب) حدیث میں ہے اللّٰھُمَّ لَا تجعلنا عذابًا وحُسْبَانًا ۔ اے اللہ ہمکو عذاب اور حسبان نہ بنا ۔ بعض اہل تفسیر نے حُسْبَان کو حَسَبَ یَحْسُبُ کا مصدر قرار دیا ہے ۔ جیساکہ غفران اور بُطلان ہے جس کے معنی ہیں گننا ۔ شمار کرنا ۔ وَالحسبان مصدرٌ کالغفران والبطلان بمعنی الحساب ای مقدارًا قَدَّرَہُ اللّٰہُ وحَسَبَہٗ وھوالحکم بتخریبھا (کبیر ۔ کشاف)

وَالحُسْبَان : بالضم : العذاب والبلاءُ (لسان) اس آیت کریمہ میں حُسْبَان سے مراد عذابِ الٰہی ہے ۔ چونکہ عذاب الٰہی کی صورتیں متعدد ہیں اس لئے اسکی صحیح مراد معنی کو متعین کرنے میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔

اس لفظ کی تفسیر حضرت قتادہ نے مطلق عذاب سے کی ہے ۔ اور ابن عباس نے آگ سے اور بعض نے پتھراؤ سے ۔ اس کے بعد قرآن مجید میں آیا ہے اُحِیْطَ بِثَمَرِہٖ، اس میں ظاہر یہ ہے کہ اس کے باغ اور تمام مال و زر اور سامانِ عیش پر کوئی بڑی آفت آ پڑی جس نے سب کو برباد کر دیا ۔ قرآن نے صراحۃً کسی آفت کا ذکر نہیں کیا ظاہر یہ ہے کہ کوئی آسمانی آگ آئی جس نے سب کو جلا دیا ۔ جیساکہ لفظ حُسْبَان کی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے بھی آگ منقول ہے (معارف)

صَعِیْدًا زَلَقًا : صاف میدان ۔ چکنی اور چٹیل زمین جس پر کوئی سبزہ نہ ہو ۔ زَلَقٌ اس زمین کو کہتے ہیں جو سبزہ اور روئیدگی سے یک قلم محروم ہو (تدبر)

المَزْلَقُ ۔ پھسلنے کی جگہ ، لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِھِمْ ۔ اپنی نظروں سے سے تجھے تیرے مکان سے پھسلا دیں ۔ یہاں اَبْصَار کے متعلق زَلَقٌ کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے جیساکہ ایک شاعر کا قول ہے ؎

نَظَرٌ یُزِیْلُ مَوَاضِعَ الاَقدامِ ، ایسی نظر جو قدموں کو پھسلا دے ۔ زَلَقَہٗ وَ اَزْلَقَہٗ

فَزَلِقَ، اُس نے اُسے پھسلایا تو وہ پھسل گیا
یونس لغوی کا قول ہے کہ زلق اور اِزلاق کا
یہ محاورہ صرف قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے
اور اُبَیّ بن کعب نے اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ
میں اَزْلَفْنَا کو اَزْلَقْنَا (قاف) کے ساتھ
پڑھا ہے جس کے معنی ہیں ہم نے دوسرے
لوگوں کو وہاں لاکر ہلاک کر دیا (راغب)
مَکَانٌ زَلَقٌ: پھسلنے کی جگہ۔ زَلِقَ یَزْلَقُ
و زَلَقَ یَزْلِقُ (س، ض) زَلَقًا، زَلِقَتِ
القَدَم - پاؤں پھسلنا۔ زَلِقَ بِمَکَانِہٖ
کسی جگہ سے اُکتا کر ہٹ جانا۔ زَلَقَہٗ (ض)
و اَزْلَقَہٗ پھسلانا۔ زَلَقَہٗ و اَزْلَقَہٗ عن
مکانہ کسی جگہ سے ہٹانا، دور کرنا،
الزَّلِیْقُ۔ وہ بچہ جو قبل از مدت پیدا ہو گیا
ہو۔ زَلَقَ رَأْسَہٗ۔ یَزْلِقُہٗ زَلْقًا
حَلَقَہٗ۔ سر منڈانا۔ مَزْلَقَۃٌ اور مُزْلَقَۃٌ
وہ چکنی جگہ جہاں سے قدم پھسل جائے۔
صاحب قرطبی کا ارشاد ہے کہ زَلَقًا اصل
میں زَلِقَتْ رِجْلُہٗ تَزْلَقُ کا مصدر ہے
صَعِیْدًا زَلَقًا: ای ارضا مَلْسَاء لا
نبات فیھا۔ اَلزَّلَقُ: اَلزَّلَلُ (لسان)

غَوْرًا: اَوْ یُصْبِحَ مَاؤُھَا غَوْرًا،
(آیت نمبر ۴۱) یا اس کا پانی زمین کے اندر
اُتر جائے۔ الغَوْر کے معنی نشیبی زمین کے ہیں
محاورہ ہے غَارَ الرجل واغار نشیبی زمین
میں چلا جانا۔ غارت عَیْنُہٗ غَوْرًا۔ آنکھ کا
اندر کو گھس جانا۔ غَوْرٌ مصدر ہے جو اسم کی
جگہ لایا گیا ہے۔ جیسے رَجُلٌ صَوْمٌ و الغور
مصدر وضع موضع الاسم کما یقال:
رجلٌ صومٌ۔ وغار الماء یَغُوْرُ غَوْرًا
و غُؤُوْرًا۔ ای سَفَلَ فی الارض۔
غارت عَیْنُہٗ تَغُوْرُ غَوْرًا دخلت فی
الرأس (قرطبی) الغَوْرُ: پست زمین،
کسی شے کا گڑھا۔ دوری۔ محاورہ ہے
فلانٌ بعیدُ الغَوْر، دُور کی سوچنے والا،
معاملات پر گہری نظر رکھنے والا۔ مفکر۔
حدیث ہے۔ انہ سمع ناسًا یذکرون
القدر۔ فقال انکم قد اخذتم فی
شِعْبَیْنِ بَعِیْدَیِ الغَوْرِ۔ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے چند لوگوں کو سنا کہ وہ مسئلہ تقدیر
پر بحث کر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا تم ایسی
دو گھاٹیوں میں اُتر رہے ہو جو بہت گہری ہیں
یعنی ان کی تہہ تک پہنچنا دشوار ہے۔ غَوْرُ
کُلِّ شَیْءٍ قَعْرُہٗ: وعُمْقُہٗ وبُعْدُہٗ (لسان)
الغارۃُ: حملہ آور سواروں کا دستہ۔ اَغَارَ
علی القوم: قوم پر حملہ کیا۔

اُحِيْطَ : وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ ۔ بِثَمَرِهٖ
یہ جار مجرور موضع رفع میں ہیں، مطلب
یہ ہے کہ اس کا سارا مال ہلاک کردیا گیا ۔
اُحِيْطَ بِالشئی کے معنی ہیں وہ چیز تباہ کردی
گئی ۔ ویجوز ان یکون المخفوض فی
موضع رفع ۔ ومعنی اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ، ای
اُهْلِكَ مَالُهٗ كُلُّهٗ (قرطبی)

خَاوِيَةٌ : وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا
(آیت نمبر ۴۲) الخواء کے معنی خالی ہونے
کے ہیں ۔ کہا جاتا ہے خَوٰى بَطْنُهٗ مِنَ
الطَّعَامِ ۔ یعنی اس کا پیٹ طعام سے خالی
ہوگیا ۔ اور خَوَتِ الدَّارُ خَوَاءً ۔ مکان
ویران ہوکر گر پڑا ۔ اور جب ستارے کے
گرنے پر بارش نہ ہو تو کہا جاتا ہے ۔ خَوَتِ
النجوم : ستارے اپنی چال چلتے رہے مگر
بارش نہ ہوئی ۔ خوی النجم و اخوی ۔
اخوی میں بہ نسبت خوی کے زیادہ مبالغہ ہے
اور التخوِيَة ، دو چیزوں کے درمیان
خالی جگہ چھوڑنا (راغب)
خوی، یخوی، خواءً، خوی البَيْتُ :
گھر کا منہدم ہوجانا، گر جانا ۔ خَاوِيَةٌ، اسم
فاعل مؤنث کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں
اُفتادہ گری ہوئی کھوکھلی ۔ خَوَاءٌ مصدر ہے
جس کے معنی ہیں گھر کا خالی ہونا ۔ گر پڑنا اور
ڈھ جانا ۔ اندر سے کھوکھلا ہوجانا ۔ اَرْضٌ
خَالِيَةٌ ۔ ویران اور بنجر زمین، اپنے رہنے
والوں سے خالی زمین ۔ خَوَتِ الدَّارُ : تَهَدَّمَتْ
وَسَقَطَتْ ومنہ قولہ تعالیٰ ، فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ
خَاوِيَةٌ ای خالیۃٌ کما قال وهی خاويةٌ
عَلٰى عُرُوْشِهَا ای خالیۃٌ وقیل ساقطةٌ
علٰى سُقُوْفِهَا (لسان العرب)

هَشِيْمٌ : فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا : پھر وہ
ریزہ ریزہ ہوجائے (ترجمہ ماجدی) پھر کل کو
ہوگیا چورا چورا (معارف القرآن)
هَشَمَ (ض) هَشْمًا ۔ الشئی ۔ کسی چیز کو
توڑنا ۔ صیغہ صفت هَاشِمٌ توڑنے والا ۔
هَشَّمَ فُلَانًا کے معنی ہیں کسی کا اکرام کرنا
تعظیم کرنا ۔ تهشّم الشئی کسی چیز کا خود ٹوٹنا
تَهَشَّمَ الشَّجَرُ درخت کا سوکھ کر ٹوٹنا،
اصل میں هَشْمٌ کے معنی کسی سوکھی یا نرم
چیز کو توڑنے کے ہیں
الْمُحْتَظِرُ ۔ فَكَانُوا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۔ تو
وہ ایسے ہوگئے جیسا کہ باڑہ کی سوکھی ہوئی
اور ٹوٹی ہوئی باڑ ۔ اور ہڈی وغیرہ کے
توڑنے پر بھی هشم کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ اسی
سے هَشَمْتُ الْخُبْزَةَ کا محاورہ ہے ۔

جس کے معنی سوکھی روٹی توڑ کر ثرید بنانے کے ہیں۔ رجلٌ ھَشِیمٌ ضعیف البدن آدمی۔ والھَشْمُ: کسر الشئ الیابس (قرطبی) حدیث میں ہے۔ جُرِحَ وجھُہٗ صلی اللہ علیہ وسلم وھُشِمَت البیضۃ علی رأسہ۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا چہرہ زخمی ہوا اور آپ کے سر پر خود توڑا گیا۔ اور ھَاشِمَۃٌ وہ زخم جو سر کی ہڈی توڑ ڈالے۔ ھَشَمْتُ الفمَ: میں نے اسکی ناک توڑ دی۔ الھَشْمُ: کسرك الشئ الاجیف والیابس وقیل: ھو کسر العظام والرأس من بین سائر الجسد (لسان)

اَمَلًا: وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا ۝ (آیت نمبر ۴۶) اور باقی رہ جانے والے اعمال صالحہ آپکے پروردگار کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی کہیں بہتر ہیں اور اُمید کے اعتبار سے بھی کہیں بہتر ہیں۔

الاَمَلُ: اُمید۔ توقع۔ جمع آمالٌ۔ اَمَلَہٗ، اَمَلًا و اَمَّلَہٗ تأمِیلًا۔ اُمید کرنا۔ تأمَّلَ الاَمْرَ وفیہ۔ کسی کام میں دیر تک سوچ بچار کرنا الاَمَلَۃُ۔ امدادی لوگ اس کی جمع اٰمِلٌ آتی ہے۔ المأمِلُ جائے اُمید ظرف مکان جس جگہ اُمید رکھی جائے۔ حدیث میں ہے۔ طول الاَمَل یُنْسِی الاٰخِرَۃَ لمبی آرزو آخرت کو بھلا دیتی ہے۔ الاَمَلُ۔ والاَمْلُ والاِمْلُ۔ الرّجاء (لسان) الاَمَل کا استعمال عام طور پر ایسی چیزوں کی توقع پر ہوتا ہے جنکا حصول دیر سے ہونے والا ہو۔

نُغَادِرُ: فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْھُمْ اَحَدًا (آیت نمبر ۴۷) پھر نہ چھوڑیں ان میں سے ایک کو (معارف القرآن)

یعنی سارے کے سارے انسان بلا استثنا رقبروں سے اٹھا اٹھا کر میدانِ حشر میں (جمع کرلئے جائیں گے) (حاشیہ ماجدی)

الغَدْرُ۔ اس کے اصل معنی کسی چیز میں خلل واقع کرنے اور اسے چھوڑ دینے کے ہیں اسی سے بیوفائی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چونکہ ترک عہد سے بھی معاملہ میں خلل ڈالکر اسکو چھوڑا جاتا ہے۔ فلانٌ غادرٌ۔ فلاں بیوفا ہے غادِر کی جمع غَدَرَۃٌ آتی ہے۔ اسی سے غدّارٌ ہے بہت بے وفا۔ دھوکہ باز۔ عہد شکن غدیرٌ وہ پانی جو سیلاب کسی جوہڑ میں چھوڑ جائے۔ اس کی جمع غدرانٌ ہے۔ اِسْتَغْدَرَ

الغدیرُ۔ تالاب میں پانی جمع ہونا۔ اُسْتُغْدِرَ الغَدِیْرُ۔ تالاب میں پانی جمع ہوگیا۔
غَدِیْرَۃٌ۔ لمبے بال۔ زُلف، جمع غَدَائِرُ حدیث میں ہے قَدِمَ مَکَّۃَ وَلَہٗ اربعُ غَدَائِرَ۔ آپ مکہ میں جب تشریف لائے تو آپؐ کے سر پر چار زُلفیں تھیں۔ اور غَادَرَہٗ۔ غدارًا ومغادَرَۃً۔ کسی چیز کو چھوڑ دینا باقی رہنے دینا۔ آیت کریمہ۔ لَایُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَاکَبِیْرَۃً اِلَّآ اَحْصٰھَا۔ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی بات کو مگر وہ اس کو لکھ لیتی ہے۔ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْھُمْ اَحَدًا۔ تو ہم انہیں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑیں گے۔
غَدَرَ (ن۔ض۔س) غَدْرًا وغَدَرَانًا۔ غَدَرَ الرَّجُلُ وبہ۔ کسی کے ساتھ بدعہدی کرنا، خیانت کرنا۔ غَدِرَ اللَّیْلُ (س) رات تاریک ہوگئی۔ لَیْلَۃٌ غَدْراءُ۔ تاریک رات، غَدِرَتِ الشَّاۃ: بکری دوسری بکریوں سے پیچھے رہ گئی۔ الغَدْرُ۔ ضدّ الوفاء بالعھد (لسان) الغَدْرُ۔ الاخلالُ بالشئ وترکہ (راغب) وَغَادَرَالشَّئَ مُغَادَرَۃً وغِدَارًا واَغْدَرَہٗ تَرَکَہٗ (لسان) غادرتُ کذا ای ترکتُہٗ۔ والمُغَادَرَۃُ الترکُ ومنہ الغَدْرُ لانہٗ ترکٌ الوفاء۔ وانّما سُمّی الغَدِیْرُ من الماء لانّ الانسان ذھب وترکہٗ ومنہ غدائرُ المرأۃ لانّھا تجعلُھا خلفھا (قرطبی)

صَفًّا: وَعُرِضُوْا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا۔
صَفٌّ، یہ اصل میں صَفَّ یَصِفُّ کا مصدر ہے جس کے معنی قطار باندھنے کے آتے ہیں اور خود قطار کے معنی میں بھی بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے اس کی جمع صفوف آتی ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ کسی شئے کو مثلاً آدمیوں کو یا درختوں کو تم ایک خط مستوی پر کردو اس کو صف کہتے ہیں۔ اور بقول ابو عبیدہ کے لفظ صف مصدر بمعنی اسم فاعل بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ وَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا اور آیت کریمہ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا میں دونوں احتمال ہیں۔ لفظ صف مصدر بھی ہوسکتا ہے۔ اور بمعنی اسم فاعل صَافِّیْنَ کے بھی قطار باندھنے والے۔ واحد صَافٌّ قطار باندھنے والا۔ صَفَّ الشَّئَ کسی چیز کو صف میں لگانا۔ صف بنانا۔ صَفَّ القَوْمُ قوم کا صف بندی سے کھڑا ہونا۔ المَصَفُّ

میدان کارزار۔ صف بندی کی جگہ، جمع مَصَافٌّ، علیٰ مَصَافِّکُمْ۔ اپنی اپنی جگہوں میں رہو۔ یعنی جہاں جنگ کے لئے صف بندی ہوئی ہے۔ قرآن پاک میں ہے فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْھَا صَوَافَّ۔ ان اونٹوں پر اللہ کا نام لو جو نحر کے مقام پر کھڑے ہیں قطار باندھے۔ صَوَافٌّ یہ جمع ہے صَافَّۃٌ کی۔

الصَّفُّ: السَّطْرُ المستوی من کُلِّ شَیْءٍ۔ وجمعہ صفوفٌ (لسان)

مُشْفِقِیْنَ: فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ اَلْاِشْفَاقُ۔ باب افعال سے کسی کی خیرخواہی کے ساتھ اس پر تکلیف آنے سے ڈرنا۔ کیونکہ مشفق ہمیشہ مشفق علیہ کو محبوب رکھتا ہے اور اس پر تکلیف آنے سے ڈرتا ہے اور جب یہ فعل حرف مِنْ کے واسطے سے متعدی ہوتا ہے تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور بواسطہ فی متعدی ہو تو عنایت کے معنی زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْ اَھْلِنَا مُشْفِقِیْنَ۔ اس سے قبل ہم اپنے گھر میں خدا سے ڈرتے رہتے تھے (راغب)

شَفِقَ عَلَیْہِ۔ شَفَقًا۔ اصلاح اور بھلائی کی فکر میں۔ رحم کرنا۔ مہربان ہونا۔ صفت شَفِقٌ اور شَفِیْقٌ۔ اَشْفَقَ عَلَیْہِ ومنہ ڈرنا لالچ کرنا۔

قال صاحب اللّسان۔ الشَّفَقُ وَ الشَّفَقَۃُ الاسم من الاشفاق والشَّفَقَ الخِیْفَۃُ۔ شَفِقَ شَفَقًا فَھُوَ شَفِقٌ والجمع شَفِقُوْن۔ والشَّفَقُ والشَّفَقَۃُ الخِیْفَۃُ مِنْ شِدَّۃِ النصح (لسان)

عَضُدًا۔ بازو، قوت بازو، یاور، مددگار۔ عَضُدٌ کہنی سے لیکر کاندھے تک کا درمیانی حصہ ہے۔ عَضَدْتُہٗ یہ محاورہ ہے جس کے معنی ہیں، میں نے اس کا بازو تھام لیا اور اس کو تقویت دی۔ نیز یَدٌ کی طرح عَضُدٌ کا استعمال بھی بطور استعارہ ہوتا ہے جس کے معنی معین و مددگار کے ہیں۔ اور مصباح میں ابوزید سے منقول ہے کہ اہل تہامہ عَضُدٌ مؤنث استعمال کرتے ہیں اور بنو تمیم مذکر بولتے ہیں۔ اس کی جمع اَعْضُدٌ اور اَعْضَادٌ ہے۔ جیسے اَقْفُلٌ کی جمع اقفالٌ ہے اور تاج العروس میں ہے کہ آیت کریمہ وَمَا کُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا اور میں وہ نہیں ہوں کہ بناؤں بہکانے والوں کو اپنا قوت بازو۔

یہاں عَضُدٌ بمعنی اعضادٌ یعنی انصار و مددگار کے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں لفظ

عضُدٌ کو مفرد اس لئے لایا گیا ہے کہ رُوسِ
آیات کے ساتھ مطابقت ہوجائے۔ عَضَدَہٗ
یَعْضُدُہٗ۔ عَضْدًا مدد کرنا۔ بازو پر مارنا۔
عَضُدُ الطریق راہ کا پہلو۔ کہتے ہیں فُتَّ فِیْ
عَضُدِہٖ۔ وہ اپنے ساتھیوں سے جُدا ہوگیا
بچھڑ گیا۔ فلانٌ عضادۃُ فلانٍ، فلاں
فلاں کا مددگار ہے۔
رَجُلٌ اَعْضَدُ۔ پتلے بازو کا آدمی۔ عُضِدَ
بازو کے درد میں مبتلا ہونا۔ اور مُعَضَّدٌ وہ آدمی
جس کے بازو پر نشان ہو اور ایسے نشان کو
عِضَادٌ کہتے ہیں۔ اور مِعْضَدٌ بازو بند،
اَعْضَادُ الحوض۔ حوض کے جوانب۔ وہ پشتہ
جو حوض کی حفاظت کے لئے اسکے اردگرد
بنایا جائے۔ امام قرطبی لکھتے ہیں کہ وفی عَضُدٍ
ثمانیۃُ اَوْجُہٍ۔ یعنی لفظ عضد کے اندر
آٹھ لغات ہیں۔
نمبر۱۔ عَضُدًا بفتح العین وضم الضاد،
یہ جمہور کی قراءت ہے۔ اور یہی زیادہ فصیح ہے
نمبر۲۔ عَضْدًا۔ بفتح العین واسکان
الضاد۔ یہ بنو تمیم کی لغت ہے۔
نمبر۳۔ عُضُدًا۔ حرف عین اور ضاد دونوں
کا ضمہ، یہ ابوعمرو اور حسن بصری کی قراءت ہے۔
نمبر۴۔ عُضْدًا۔ عین پر پیش اور ضاد ساکن
یہ حضرت عکرمہ کی قراءت ہے۔
نمبر۵۔ عِضَدًا۔ بکسر العین وفتح الضاد
یہ حضرت ضحاک کی قراءت ہے۔
نمبر۶۔ عَضَدًا۔ یہ عیسٰی بن عمر کی قراءت ہے
نمبر۷۔ عَضِدًا۔ یہ ہارون قاری کی قراءت ہے
نمبر۸۔ یہ آٹھویں قراءت عِضُدًا ہے یہ
اُن لوگوں کی لغت ہے جو کِتْفٌ اور فِخْذٌ
بولتے ہیں۔ لفظ عَضُدًا سے مراد اعوان و
انصار ہیں۔ عَضُدًا ای اَعْوَانًا اور اِعْتَضَدْتُ
بفلانٍ کے معنی ہیں کسی سے مدد اور قوت
حاصل کرنا۔ اِعْتَضَدَ بہٖ کسی سے مدد مانگنا
مضبوط ہونا۔
اِعْتَضَدْتُ بفلانٍ۔ اِذَا اسْتَعَنْتَ بہٖ وَ
تَقَوَّیْتَ۔ والاصل فیہ عَضُدُ الیدِ ثُمَّ یُوْضَعُ
موضع العون لان الید قوامہا العَضُدُ۔ یقالُ
عَضَدَہٗ وعَاضَدَہٗ علٰی کذا اَعَانَہٗ واَعَزَّہٗ
(قرطبی) اور آیت کریمہ۔ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ
باخیک ای سَنُقَوِّیْكَ بِاَخِیْكَ۔ یعنی ہم
تمہارے بھائی کو تمہارے لئے قوت بازو
بنادیں گے۔

مَوْبِقًا : وَجَعَلْنَا بَیْنَهُمْ مَّوْبِقًا
(آیت نمبر ۵۲) وَبَقَ (ض) وَبْقًا و مَوْبَقًا
کے معنی ہیں ضعیف اور گراں بار ہو کر ہلاک

ہو جانا ۔ اَوْبَقَہٗ کَذَا ۔ ہلاک کرنا ۔ آیتِ کریمہ : اَوْ یُوْبِقْهُنَّ بِمَا کَسَبُوْا ۔ یا اُن کے اعمال کے سبب اُن کو تباہ کر دے ۔

مَوْبِقٌ : وَبَقَ سے ظرفِ مکان ہے، ہلاکت کی جگہ ۔ یہ سَمِعَ حَسِبَ اور ضَرَبَ سے آتا ہے اسم مکان مِنْ وَبَقَ وُبُوْقًا کَوَثَبَ وُثُوْبًا ، اَوْ وَبَقَ وَبْقًا کَفَرِحَ فَرَحًا اذا ھلك ای مَھْلِکًا (روح) وَجَعَلْنَا بَیْنَھُمْ مَوْبِقًا ۔ اور اُن کے بیچ ہلاکت کی جگہ بنا دیں گے (راغب)

ابن اعرابی کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان حاضر اور آڑ ہو وہ مَوْبِقٌ ہے (قرطبی) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ مَوْبِقٌ مصدر ہو جیسے مَوْعِدٌ اور مَوْرِدٌ ۔

قال صاحب الکشاف الموبق المھلك من وَبَقَ وَبِقَ وَبْقًا و وُبُوْقًا : اذا ھلك واَوْبَقَہٗ غَیْرَہٗ فیَجُوْزُ ان یکون مصدرًا کالمورد والموعد (کبیر)

مَوْبِقٌ ۔ ہلاکت کی جگہ ۔ وعدہ کی جگہ ۔ قید خانہ ۔ جیل ۔ دو چیزوں کے درمیان حائل ہونے والی چیز ۔ فلانٌ یَرْکَبُ الموبقات فلاں خطرات میں ڈالتا ہے اور فلانٌ یفعل الموبقات ، فلاں گناہ کے کام کرتا ہے معاصی کا مرتکب ہوتا ہے ۔ حدیث ہے ، اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ ۔ سات مہلک گناہوں سے بچو ۔ اِیْبَاقٌ (افعال) روکنا ۔ ہلاک کرنا ۔ والموبقُ مَفعِلٌ منہ (ای من وبق) کالموعد مَفْعِلٌ من وَعَدَ یَعِدَ (لسان) المُوْبِقات : کبائر ۔ بڑے بڑے گناہ جو آخرت کو تباہ کر دیں ۔

یُدْحِضُوْا : لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ : یہ اصل میں دَحْضُ الرِّجْلِ سے مشتق ہے جس کے معنی پاؤں کے پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کے ہیں اور بطور استعارہ دَحَضَتِ الشمس من کَبِدِ السَّمَاءِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سورج ڈھلنے کے ہیں ، دَاحِضَۃٌ فاعل مؤنث کا صیغہ ہے ۔ وہ دلیل جو باطل اور زائل ہونے والی ہو ۔ قرآن پاک میں ہے حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ ، ان کے پروردگار کے نزدیک ان کی دلیل بالکل باطل اور بودی ہے یعنی زائل ہونے والی اور حق کے مقابلے میں باطل ہونیوالی اَدْحَضْتُ فُلَانًا فِیْ حُجَّتِہٖ فَدَحَضَ وَاَدْحَضْتُ حُجَّتَہٗ فَدَحَضَتْ میں نے اس کی دلیل کو باطل کیا تو وہ باطل ہو گئی آیت کریمہ وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا

بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ، کے
معنی یہ ہیں کہ کافر اور منکر لوگ باطل سے
استدلال کرتے ہیں تاکہ حق اور اصل کو اپنی
جگہ سے پھسلا دیں (راغب)
ومعنی يُدْحِضُوْا : يُزِيلُوْا اَوْ يُبْطِلُوْا
واصل الدَّحْضِ : الزَّلَقُ - يُقَالُ
دَحَضَتْ رِجْلُهٗ اى زَلِقَتْ وَالْاِدْحَاضُ
اَلْاِزْلَاقُ (قرطبی)
اَلْاِدْحَاضُ کے معنی ہیں کسی چیز کو پھسلا دینا
اور دَحْضٌ اس مٹی کو کہتے ہیں جس سے
پاؤں پھسل جائے ۔ واصل الادحاض
الازلاقُ : والدحض الطين الذى
يزلق فيه (روح)
دَحْضٌ مصدر ۔ فتح سے پھسلنا ۔ سورج کا
ڈھلنا ۔ دُحُوْضٌ مصدر بمعنی باطل ہونا ۔
زائل ہونا ۔ مَدْحَضَةٌ پھسلنے کی جگہ پھسلنی
حدیث میں ہے ۔ دُوْنَ جِسْرِ جَهَنَّمَ
طَرِيْقًا ذَا دَحْضٍ : جہنم کے پل کے پاس
ایک پھسلواں رستہ ہے ۔ نُجَبَاءُ غَيْرُ
دُحَّضِ الاقدام وہ ایسے شریف ہیں
جن کے پاؤں پھسلتے نہیں ۔ یعنی اپنی بات
اور عزم پر ثابت قدم رہتے ہیں، فَدَحَضَتْ
التِّلَاعَ ۔ بارش اتنی برسی کہ ٹیلوں کو
پھسلواں بنا دیا ۔ یعنی بارش کی وجہ سے
پہاڑ مَزَلَّةٌ بن گئے ۔ مَكَانٌ دَحْضٌ
وہ جگہ جہاں قدم نہ جم سکیں ۔ هٰذَا مَدْحَضَةٌ
القدم : یہ وہ جگہ ہے جہاں سے قدم
پھسل جائے ۔ اسم فاعل مذکر کا صیغہ
داحضٌ آتا ہے اس کی جمع دُحَّضٌ آتی ہے
وہ لوگ جو ایک ارادہ پر قائم نہ رہیں ۔
الدَّحْضُ الزَّلَقُ ۔ وَالْاِدْحَاض :
الازلاقُ (لسان)

مَوْئِلًا : لَنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ
مَوْئِلًا ۔ (آیت نمبر ۵۸) کہیں نہ پائیں گے
اس سے ورے سرک جانے کی جگہ (معارف)
مَوْئِلٌ : اسم ظرف پناہ کی جگہ ۔ وَأَلَ
يَئِلُ وَأْلًا وَوَئِيْلًا ۔ وَوُءُوْلًا ۔
وَوَائَلَ مُوَائَلَةً وئل مِنْ كَذَا
کسی سے پناہ یا نجات مانگنا ۔ وَأَلَ اِلَيْهِ
پناہ لینا کسی کا سہارا لینا ۔ وَأَلَ مِنْهُ
نجات طلب کرنا ۔ عرب لوگ کہتے ہیں لَا وَأَلَتْ
نَفْسُهٗ ۔ وہ نجات نہ پائے (قرطبی)
منجٰى وَلَا مَلْجَأَ ۔ يقال : وَأَلَ، اذا نجا
ووأَلَ اِلَيْهِ ۔ اذ لجاء اليه (کشاف)
وَالْوَأْلُ وَالْمَوْئِلُ : الملجأُ
(لسان العرب)

مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ : لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا (آیت نمبر ۶۰) میں یوں ہی چلتا رہوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچ جاؤں (یا یونہی) سالہا سال تک چلا کروں (ماجدی)

مجمع البحرین کے لفظی معنٰی ہر وہ جگہ ہے جہاں دو دریا ملتے ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع دنیا میں بے شمار ہیں، اس جگہ مجمع البحرین سے کونسی جگہ مراد ہے۔ اس میں اہلِ تفسیر و تاریخ کے مختلف اقوال ہیں۔ چونکہ حدیث اور قرآن پاک میں اسکو معین طور پر نہیں بیان فرمایا گیا اس لئے آثار و قرائن کے اعتبار سے مفسرین کے اقوال میں اختلاف ہوا ہے۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم لکھتے ہیں کہ یہ سفر اگر حضرت موسٰی علیہ السلام کے دورانِ قیام مصر پیش آیا تھا تو دریائے نیل کی دونوں شاخوں کے ملنے کی جگہ مراد ہوسکتی ہے اور اگر جیسا کہ اغلب ہے یہ سفر جزیرہ نمائے سینا، کے دورانِ قیام پیش آیا تو عجب نہیں کہ جو بحرِ قلزم کے دو شاخہ کے اتصال کی جگہ مراد ہو۔ یعنی خلیج عقبہ یا خلیج سویز (ماجدی) عام طور پر اہلِ تفسیر کا رجحان اسی طرف پایا جاتا ہے کہ مجمع البحرین سے مراد خلیج عقبہ اور سویز کا وہ مقامِ اتصال جہاں سے بعد کے مراحل میں حضرت موسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیکر گزرے۔

علامہ قرطبی نے مفسرین کے چند اقوال نقل کئے ہیں۔ قتادہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ نمبر ۱، مجمع البحرین وہ جگہ ہے جہاں بحرِ فارس اور بحرِ روم جا کر ملتے ہیں۔ نمبر ۲ بعض نے بحرِ اُردن کہا ہے اور بعض اہلِ علم کا قول ہے کہ مجمع البحرین سے مراد بحرِ اندلس ہے۔

حُقُبًا : برسوں۔ سالہا سال۔ حُقُبٌ بضمّ القاف، زمانے کو کہتے ہیں اسکی جمع اَحْقَابٌ ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا۔ رہا کریں اس میں قرنوں، جن کا کوئی شمار نہیں۔ قرن پر قرن گزرتے چلے جائیں گے اور اُن کی مصیبت کا خاتمہ نہ ہوگا (عثمانی) حُقْبٌ، سکون القاف زمانے کی ایک مقررہ مدت کا نام ہے مگر یہ ہے کتنی مدت اسمیں اہلِ لغت کا اختلاف ہے۔ بعض نے اسّی برس، بعض ستر برس کی مدت کو اور بعض چالیس سال، اور بعض نے تین سو سال کو حقب کہا ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ تیس ہزار سال کا زمانہ حُقب ہے ۔ حضرت قتادہ نے تصریح کی ہے احقاب غیر منقطع زمانہ کو کہا جاتا ہے اس کی صحیح تعیین خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ لفظ حقب تعیین کے لحاظ سے ایسا ہی ہے جیسا کہ قوم اور رھط کا لفظ انکے افراد واحاد کی کوئی تعیین نہیں ۔

امام قرطبی نحاس کے قول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ الّذی یعرفہ اھل اللغۃ انّ الحُقُب والحِقْبۃ زمان من الدھر مبہم غیر محدود کما انّ رھطًا و قومًا مبہم غیر محدود (قرطبی) ویجمع علی احقابٍ کعنق واَعْنَاقٍ (جمل) والحُقْبُ والحُقُبُ ثمانون سنۃً وقیل اکثر من ذالک ، و جمع الحقب (بسکون القاف) حِقابٌ مثلُ قُفٍّ وقِفافٍ وحکی الازھری فی الجمع احقابًا ۔ والحُقُبُ الدّھرُ والاحقاب الدّھور (لسان العرب) صاحبِ کشاف نے حقب کی مدت اسّی سال بتائی ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ جیسا کہ علامہ راغب نے لکھا ہے کہ والصحیح ان الحِقْبَۃَ مدۃ من الزمان مُبْھَمَۃٌ (راغب) حِقْبَۃٌ ، وہ تھیلا جسمیں مسافر کا زادِ سفر ہو ۔ کہتے ہیں

اِحْتَقَبَہٗ و اِسْتَحْقَبَہٗ ، سوار نے پالان کے پیچھے حقبہ باندھ لیا ۔ اور حَقِبَ البَعِیْرُ : شتر کے غلاف نرہ میں اس کے تنگ داخل ہونے کی وجہ سے اس کا پیشاب رک جانا یا تکلیف سے آنا ۔ اور اَحْقَبُ اس حمار وحشی کو کہا جاتا ہے جس کے دونوں بازوؤں میں سفید داغ ہو ۔ اسکی مؤنث حقباءُ ہے حَقِبَ العام : خشک سالی ہونا ، بارش کا سال میں نہ ہونا ۔ حَقِبَ الامرُ : بات بگڑ گئی ۔ معاملہ خراب ہو گیا ۔

سَرَابٌ : چرنے والا اونٹ ۔ مویشی اور چوپائے ۔ الشَّرَبَۃ : راستہ ۔ جانے کی جگہ ۔ السَّرَاب : وہ ریت جسکی چمک کی وجہ سے آدمی کو پانی کا دھوکا ہو ۔

اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍۭ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ط (آیت ۳۹ سورہ نور)

پیاسا یہ خیال کرتا ہے کہ پانی ہے لیکن وہ اس کی طرف جاتا ہے تو حیرت اور رنج کے سوا اس کو کچھ نہیں ملتا ۔ قرآن پاک نے یہاں غلط طرز زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو سراب سے تشبیہ دی ہے کہ جن سہاروں اور آسروں پر اور جن باطل پرستوں کی قتلاً

میں اس نے اپنی زندگی برباد کر دی ہے یہ
سب آخرت کو ٹوٹ جائیں گے ۔

سَرَبًا : فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا (آیت نمبر ۶۱) پھر اسنے
اپنی راہ کرلی دریا میں سُرنگ بنا کے ۔

سَرَبٌ : کے معنی اس سُرنگ کے ہیں جو
پہاڑوں میں راستہ بنانے کے لئے کھودی
جاتی ہے یا شہروں میں زمین دوز راستہ
بنانے کے لئے کھودی جاتی ہے (معارف)
اور سَرَبٌ کے معنی برتن سے پانی بہہ جانے
کے بھی آتے ہیں ۔ سَرِبَ الْمَاءُ مِنَ السِّقَاءِ
مشکیزے سے پانی ٹپک پڑنا ۔ اور جو پانی
مشکیزے سے ٹپک رہا ہو اُسکو نازُ سَرَبٌ
(بالفتح) اور نازُ سِرْبٌ (بالکسر) کہا جاتا ہے ،
سَرِبَ الدَّمْعُ ، آنسو رواں ہونا ، اور
سَرَبَ الرَّجُلُ يَسْرُبُ (ن) سَرَبًا آدمی
کا آگے گھستے چلے جانا ۔ اصل میں جیسا کہ صاحب
مفردات نے لکھا ہے سَرَبٌ کے معنی
نشیب کی طرف جانے کے ہیں اور اسم کے
طور پر نشیبی جگہ کو بھی سَرَبٌ کہدیا جاتا ہے
سَرَبَ (ن) اور اِنْسَرَبَ (انفعال) کے
معنی تقریباً ایک ہیں لیکن سَرَبَ بالذات
فاعل سے فعل صادر ہونے پر بولا جاتا ہے ،
یعنی وہ فعل جو دوسرے سے متأثر ہو کر کہا
جائے ۔ سَارِبٌ اسم فاعل ہے ۔ گلیوں میں
پھرنے والا ۔ راہ چلنے والا ۔ اسکا اصل مصدر
سُرُوبٌ ہے جسکے معنی ہیں اپنے رُخ پر
چلنا ۔ سَارِبٌ بِالنَّهَارِ دن کی روشنی میں
کھُلم کھُلا چلنا ۔ اس کی جمع سُرُبٌ آتی ہے
جیسے رُكُبٌ جمع ہے رَاكِبٌ کی ۔

اور شدتِ گرما میں دُور سے چمکتی
ہوئی جو ریت نظر آتی ہے اسکو سَرَابٌ
کہا جاتا ہے کیونکہ بظاہر دیکھنے میں وہ پانی
معلوم ہوتی جیسے پانی بہہ رہا ہو اور پھر
خاص کر اُس شخص کو جس کو پیاس لگ رہی
ہو ۔ پھر اس سے استعارہ کے طور پر ہر
اُس چیز کو سرابٌ کہدیا جاتا ہے جو بے حقیقت
ہو ۔ قرآن پاک میں ہے كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ
يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً جیسے میدان
میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ۔
وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ،
پہاڑوں کو چلایا جائے گا تو وہ ریت کی
طرح ہو جائیں گے ۔

وَالسَّارِبُ : هو الذاهب ومنه قوله
تعالیٰ (وسارب بالنهار) (کبیر)
وَالسَّارِبُ الذَّاهِبُ فِي حُدُوْرِ السَّرَبُ

الْمَكَانُ الْمُنْجَلِدُ (راغب)
سَرَبَ الابلَ : اونٹوں کو ٹولی ٹولی کرکے
بھیجنا ۔ فُلَانٌ مُخَلَّى السَّرَبِ ، اس پر
کوئی تنگی نہیں ۔ اور خَلِّ سَرَبَہٗ : اسکا
راستہ چھوڑ دو ۔ طَرِيْقٌ سَرِبٌ ، چلتا ہوا
راستہ ۔ جمع اَسْرَابٌ ۔ السِّرْبُ ہرنوں
کا ریوڑ ۔ پرندوں کا ٹولہ ۔ درختوں کا جھنڈ،
دل کو سِرْبٌ کہا جاتا ہے ۔ محاورہ ہے
فُلَانٌ وَاسِعُ السِّرْبِ ۔ فلاں فراخ دل ہے
هُوَ اَخْدَعُ مِنَ السَّرَابِ : وہ سراب
سے زیادہ جھوٹا اور فریبی ہے ، اِنْسَرَبَ
الْوَحْشِی ، وحشی جانور کا بل میں گھس جانا
سَرَبَ يَسْرُبُ سُرُوْبًا ۔ خَرَجَ وَسَرَبَ
فِی الارض ۔ يَسْرُبُ سَرَبًا ذَهَبَ
وَالسَّارِبُ : الذاهب على وجهه فی
الارض (لسان ۔ منجد) السَّرَبُ :
الطَّرِيق والمسلك والسَّرَابُ : مالا
حقيقة له (معجم الفاظ القرآن)

الصَّخْرَةِ : اِذْ اَوَيْنَا اِلَى

الصَّخْرَةِ : (آیت نمبر ۶۳)
صَخْرٌ سخت پتھر ، چٹانیں صَخْرَةٌ واحد ہے
اس کی جمع صَخْرٌ ۔ صُخُوْرٌ صَخَرَاتٌ آتی ہے
وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ
بِالْوَادِ ، اور ثمود جنہوں نے چٹانیں تراشیں
الصَّخْرُ مِنَ الْاَمْكِنَةِ ، چٹانی جگہ ،
هُوَ صَخِرُ الْوَجْهِ اَوْ اَصْخَرُ الْوَجْهِ
کے معنی ہیں وہ بے حیا ہے ۔ صَخَّرَهٗ مطیع
کرنا ۔ اَصْخَرَ المکانُ ۔ کسی جگہ کا بہت
پتھروں والی ہونا ۔ صفت مُصْخِرٌ
الصَّخْرَةُ : الحجر العظيم الصُّلْب (لسان)
صَخْرَةُ الوادی ۔ میدان کی چٹان ، ناقابلِ
تسخیر مرد میدان ۔ عرب کا مشہور شاعر
متنبی کہتا ہے ؎

انا صخرُ الوادی اذا ما زُحِمَتْ
وَاِذَا اُنْطِقْتُ فَاِنَّنِی الْجَوْزَاءُ

یعنی جب کوئی میرا مقابلہ کرے تو میں
میدان کے پتھر کی طرح ہوں جب کمر باندھوں
تو جوزا ، تارہ کی طرح ہوں جو ایک مشہور
برج ہے ۔ صَخْرٌ بن حرب ، یہ حضرت
ابوسفیانؓ کا نام ہے ۔ متنبی کے شعر کا ترجمہ
میں نے علامہ وحید الزماں کی لغات الحدیث
سے لیا ہے لیکن یہ ترجمہ مشکوک معلوم ہوتا ہے
چونکہ نطق کے اصل معنیٰ بولنے اور گفتگو کرنے
کے ہی آتے ہیں ، لہٰذا مصرع آخر وَاِذَا اُنْطِقْتُ
کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جب میں گفتگو کرتا ہوں تو
بلند گفتاری میں مثل جوزا برج کے رفیع

منزلت رہتا ہوں ۔ اس شعر میں متنبی اپنی
دو صفتوں کا بیان کرتا ہے۔ صخرۃ الوادی
میں مرد میدان ہونا اور وإذا نطقت
میں بلند گفتار ہونا واضح کرتا ہے۔ ممکن ہے
کہ علامہ نے نطقت (تخییل) سے ماخوذ مانکر
ترجمہ کیا ہو (واللہ اعلم) نطاق الجوزا: وسط
جوزا کے تین ستارے ۔

خُبْرًا: وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا، آیت نمبر ۶۸
اور کیونکر ٹھہرے گا دیکھ کر ایسی چیز کو کہ تیرے
قابو میں نہیں اسکا سمجھنا" (معارف القرآن)
خُبْرٌ : دانش، سمجھ، خبر، خبرداری ۔ یہ
خَبَرَ یَخْبُرُ کا مصدر ہے ۔ اور جو اشیار
بتانے سے معلوم ہوں اُن کے جاننے کا نام خَبَرۃ
ہے ۔ خُبْرَۃٌ کا لفظ کسی معاملہ کی باطنی
حقیقت کو جاننے پر بولا جاتا ہے اور یہاں
لفظ خُبْرًا بھی اسی معنی میں ہے کہ جس معاملہ
کی اندرونی اور باطنی حقیقت سے آپ واقف
نہیں ہیں اس پر آپ کیسے صبر کریں گے ۔
قال صاحب اللسان ۔ وَالْخُبْرُ وَالْخُبْرَۃُ
وَالْخِبْرَۃُ وَالْخُبُرَۃُ وَالْمَخْبَرَۃُ وَالْمَخْبُرَۃُ
(بضم الباء) كُلُّهُ: العلم بالشئ (لسان)
الخبير من اسماء اللہ عزّ وجلّ ۔
العالم بما كان وما يكون (لسان)
خَبَرَ الشَّئَ : چیز کو جانچا پرکھا ۔ الخُبْرُ
علم ۔ تجربہ ۔ حقیقت حال کو جاننا ۔
الخبير : بَوَاطِن اُمور کو جاننے والا
مَالِيْ بِهٖ خُبْرٌ مجھے اسکی کوئی اطلاع نہیں
اَلْخَبَرُ : علم، اطلاع ۔ جمع اخبار

اِمْرًا : لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ۝
(آیت نمبر ۷۱) البتہ تونے کی ایک چیز بھاری
(معارف) یعنی آپ نے تو حد ہی کردی، پورا
بیڑا غرق کرنے لگے۔ کسی منکر اور معیوب کام
کو اِمْرٌ کہتے ہیں ۔ ناپسندیدہ فعل ۔ اِمْرًا کے
معنی قُتَبِی نے عجبًا اور مجاہد نے منکرًا کے لئے
ہیں ۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ اِمْرٌ حادثۂ عظیم
کو کہتے ہیں ۔ اور یہ شعر بطور شاہد کے پیش
کیا ہے ؎

قَدْ لَقِيَ الْاَقْرَانُ مِنِّيْ نُكْرًا
دَاهِيَةً دَهْيَاءَ اِدًّا اِمْرًا

وقال صاحب الکشاف
جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا : اَتَيْتَ شَيْئًا عَظِيْمًا
من اَمِرَ الاَمْرُ ۔ اذا عَظُمَ۔ قال ابو عُبَيْدَہ
الإمر الداهيۃُ العظيمۃ (قرطبی)
اَمِرَ اَمْرُہٗ يَأْمُرُ (س) اَمَرًا ۔ اِذَا
اِشْتَدَّ ۔ والاسم اَلْاِمْرُ قرطبی عن

الاَخفش - اور ھٰذَا اَمْرٌ رَضِیْتُہٗ : کے معنی ہیں، یہ بات ہے جو مجھے پسند ہے۔

تُرْھِقْنِیْ : وَلَا تُرْھِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا - (آیت نمبر ۷۳)

اِرْھَاقٌ (افعالٌ) کے معنی کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا، کسی کو مبتلائے آفت کرنا اَرْھَقَہٗ عُسْرًا کے معنی ہونگے اس کو تنگی میں ڈال دیا (تدبر) رَھِقَہٗ (س) رَھَقًا - الامرُ کسی معاملہ نے اس کو بزور وجبر دبا دیا، اَرْھَقَہٗ و رَھِقَہٗ (مجرد و مزید) دونوں کے معنی ایک ہی ہیں - جیسے رِدفہٗ وَاَرْدَفَہٗ تَرْھَقُھُمْ الذِلَّۃُ - اور ان پر ذلت چھا رہی ہو گی - اَرْھَقَتِ الصَّلٰوۃ کے معنی ہیں نماز کو آخر وقت تک موخر کر دینا حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت داخل ہو جائے (راغب)

لَاتُرْھِقْنِیْ : تو مجھ پر دباؤ نہ ڈال، مجھ پر چھا نہ جا - کہتے ہیں لَاتُرْھِقْنِیْ لَا اَرْھَقَکَ اللّٰہُ - تو مجھ پر سختی نہ کر، تجھ پر اللہ سختی نہ کریگا اور صلی الصَّلٰوۃ مُرَاھِقًا کے معنی ہیں اُس نے نماز کو وقت ختم ہونے کے قریب پڑھا - رَھَقٌ ، جہالت ، حماقت ، بیوتوفی بدخلقی - ابن فارس نے اس کے معنی تعدّی اور ظلم کے ذکر کئے ہیں - آیت فَزَادُوْھُمْ

رَھَقًا : (آیت نمبر ۶ سورۂ جن) سو انھوں نے اُنھیں جہالت میں بڑھایا - رَھِقَ یَرْھَقُ رَھَقًا : سَفِہَ و طَغٰی (معجم الفاظ القرآن)

نُکْرًا : لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا نُّکْرًا (آیت نمبر ۷۴) یقیناً آپ نے بڑی بیجا حرکت کی - نُکر کا لفظ ایسے امرِ عظیم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کو دیکھ کر سب لوگ کانوں پر ہاتھ دھرلیں - نُکْرًا ای دَاھِیَۃً (بخاری)

قال ابو عبیدۃ نُکْرًا ای عَظِیْمًا (فتح الباری)

المنکر - الدھاء والامر الصعب الذی لایعرف (راغب) قال اللیث : الدھاء والنکر لغۃٌ لِلْاَمر الشدید (تاج)

نکر کا درجہ قبح میں اِمْرٌ سے بڑھا ہوا ہے

النکر اعظم من الاِمْر فی القبح (کبیر) وقیل النکر ما انکرتہ العقول والنفوس وھو ابلغ فی تقبیح الشئ من الامر (کبیر - ازماجدی) وقال ابن عطیۃ وعندی انھما المعنیین وقولہ : اِمْرًا اَفْظَعُ وَاَھْوَلُ من حیث متوقع عظیم - ونکرًا بَیِّنٌ فی الفساد لان مکروھہ قد وقع وھذا بیّنٌ (قرطبی)

غَصْبًا : یَاْخُذُ کُلَّ سَفِیْنَۃٍ غَصْبًا : (آیت نمبر ۷۹) غَصَبَہٗ - غَصْبًا

غَصَبَهُ علی الشئ مجبور کرنا ۔ غَصَبَهُ الشئ (بغیر حرف علی) کسی چیز کو زبردستی چھین لینا ۔ ناجائز طور پر کسی کا مال دبالینا غَصَبَ الْمَرْأَةَ عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرنا ۔ غاصب اسم فاعل ہے ۔ جمع غَاصِبُوْنَ اور غُصَّابٌ آتی ہے ۔

الغَصْبُ فی اللغة : اخذ الشئ من الغیر علی وجه القهر مالا کان اَوْ غیر مالٍ و فی الشرع : هو ازالة الید المحققة باثبات الید المبطلة فی مَالٍ متقومٍ محترمٍ قابل للنقل بغیر اذن مالکه (حاشیہ قدوری از مولانا اعزاز علیؒ)

الغَصْبُ : اَخَذَ الشئ ظلمًا و تکرمًا فی الحدیث ذکر الغصب وهو اخذ مال الغیر ظلمًا و عُدْوَانًا (لسان)

مَغْصُوْبٌ اسم مفعول ،

اَلْغَصْبُ : اخذ الشئ ظُلْمًا (معجم الفاظ القرآن)

رُحْمًا : وَاَقْرَبَ رُحْمًا ، (آیت نمبر ۸۱) رُحْمٌ یہ رَحْمٌ (بفتح الراء) سے ماخوذ ہے ۔ اور معنی ہیں زور و قوت رحمت سے زیادہ رکھتا ہے ۔ امام بخاری فرماتے ہیں

رُحْمًا من الرَّحْمَة وهو اشد مبالغة من الرحمة و يُظَنُّ اَنَّهُ مِنَ الرَّحِيْمِ و تدعى مكة ام الرحم اى الرحمة تنزل بها (بخاری) اور ابو عبیدہ لغوی کا قول ہے کہ رُحْمٌ رَحْمٌ سے جس کے معنی قرابت کے ہیں ۔ اور رحمت سے زیادہ زوردار ہے جس کے معنی محض رقتِ قلب کے ہیں وحاصل کلامہ ان رُحْمًا من الرَّحِمِ التی ھی القرابةُ وھی ابلغ من الرحمة التی ھی رِقَّةُ القلب (ماجدی بحوالہ فتح القدیر) رحم کے معنی رقت قلب ، ہمدردی اور محبت و شفقت کے ہیں ۔ خیرًا مِنْهُ زکوٰۃ و اقرب رُحْمًا ، یعنی طبیعت اور اخلاق کی پاکیزگی کے اعتبار سے اس سے بہتر اور دردمندی اور مروّت کے اعتبار سے زیادہ پاس و لحاظ والا ۔ (تدبر)

اَلْجِدَارُ : وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِى الْمَدِيْنَةِ ، (آیت نمبر ۸۲) اور وہ جو دیوار تھی ، سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی ۔ اَلْجِدَار اور المدینة پر الف لام عہد خارجی ہے ۔ الجدار اور الحائط کے ایک معنی ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو جدار زمین سے اونچی ہوتی ہے وہ جدار

کہلاتی ہے ۔ جَدَرْتُ الْجِدَار کے معنی ہیں، دیوار کو اونچی کرنا ۔ اس کی جمع جُدُرٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے اَوْ مِنْ وَّرَاءِ جُدُرٍ یا دیواروں کی اوٹ سے اور اس اعتبار سے کہ دیوار احاطہ کئے ہوتی ہے الحائط کہلاتی ہے ۔ اَجْدَرَتِ الشَّجَرَۃُ درخت کو پھل لگنا ۔ حدیث میں ہے حَتّٰی یَبْلُغَ الْمَاءُ الْجُدُرَ ۔ جب تک پانی دیواروں تک نہ پہنچ جائے اور مکانٌ جدیرٌ ۔ وہ مکان جس کے ارد گرد چار دیواری ہو ۔ مکانٌ جدیرٌ : بنی حوالیہ جدارٌ (قرطبی راغب)

ذِی الْقَرْنَیْنِ : وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ (آیت نمبر ۸۳)

اور آپ سے ذوالقرنین کی بابت پوچھتے ہیں ۔ واقعہ ذوالقرنین کا جتنا قرآن پاک نے بتایا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک صالح عادل بادشاہ تھے جو مشرق و مغرب میں پہنچے اور انکے ممالک کو فتح کیا اور اُن میں عدل و انصاف کی حکمرانی کی ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہر طرح کے سامان اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے عطا کر دیئے گئے تھے ۔ انھوں نے فتوحات حاصل کرتے ہوئے تین اطراف میں سفر کئے ۔ مغرب اقصیٰ تک اور مشرقِ اقصیٰ تک، پھر جانب شمال میں کوہستانی سلسلے تک ۔ اسی جگہ انہوں نے دو پہاڑوں کے درمیانی درّے کو ایک عظیم الشان آہنی دیوار کے ذریعہ بند کر دیا جس سے یاجوج ماجوج کی تاخت وتاراج سے اس علاقے کے لوگ محفوظ ہو گئے ۔

واضح رہے کہ قرآن پاک سیرت یا تاریخ کی کوئی کتاب نہیں ہے کہ وہ جس شخص کا ذکر کرے اس کے تمام حالات کا استقصا کرتا جائے کیونکہ یہ چیز اس کے موضوع سے خارج ہے ۔ وہ جس شخص کا ذکر کرتا ہے اُس کی زندگی کے اسی پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو دوسروں کے لئے پند و موعظت اور عبرت و نصیحت کا سبق ہو ۔ چنانچہ جب قریش نے یہود سے معلومات حاصل کر کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کی نسبت سوال کیا تو قرآن مجید نے اس کے جواب میں وہی انداز اختیار کیا جو صالحین کے تذکرہ میں اسکا عام انداز ہے اور وحی ربّانی کے معجزانہ جواب کے سامنے سائل کو مجال دم زدن نہ رہی ۔

بہرحال قرآن پاک ذوالقرنین کے

بارے میں صرف اتنا کہتا ہے کہ وہ ایک مرد مجاہد، دنیا کا عظیم ترین فاتح، عادل اور بندگانِ خدا کا ہمدرد بادشاہ تھا باقی ذوالقرنین کی تاریخ بیان کرنا یہ کلامِ الٰہی کے موضوع سے خارج ہے لیکن جاہلیت کبریٰ کی اس نشاۃِ جدید نے ذوالقرنین کے واقعہ کو اور اُس کی شخصیت کو اپنے معاندانہ اعتراضات کا ہدف بنالیا ہے، اور بعض بدنصیبوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ ذوالقرنین کا کوئی اصل اور حقیقی وجود ہی نہیں بلکہ یہ ایک بے حقیقت افسانہ تھا اور پیغمبر اسلام نے (معاذاللہ) محض خوش اعتقادی کی بنا پر اس کو حقیقت سمجھ کر نقل کر دیا۔

بلاشبہ ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں مفسرین کے اقوال میں اختلاف و اضطراب پایا جاتا ہے۔ کوئی اس کو عرب کا بادشاہ سمجھ کر اذوا یمن سے قرار دیتا ہے۔ اور کوئی سکندر رومی کو ذوالقرنین خیال کرتا ہے لیکن بلاتحقیق کسی معترض کا اپنی نارسائی کا اعتراف کرنے کے بجائے سرے سے اسکی شخصیت کا انکار کر بیٹھنا جہل مرکب کی کتنی شرمناک مثال ہے آج اکتشافاتِ اثریہ نے جن سیکڑوں چھپی حقیقتوں کو بے نقاب کر کے رکھدیا ہے انہیں سے ایک ذوالقرنین کی بھی حقیقت ہے۔ واقعہ ذوالقرنین کی پوری تحقیق مولانا آزاد مرحوم نے ترجمان القرآن میں اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم نے اپنی مشہور کتاب قصص القرآن میں ذکر کی ہے۔ تاریخی ذوق رکھنے والے حضرات کو ان کتب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ذوالقرنین مذکور فی القرآن فارس کا وہ بادشاہ ہے جسکا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت بعد انبیاء بنی اسرائیل میں سے دانیالؑ کا زمانہ تبلایا جاتا ہے جو سکندر رومی قاتل دارا کے زمانہ کے قریب قریب ہوجاتا ہے مولانا نے اسکا بڑی شدت سے انکار کیا ہے کہ ذوالقرنین وہ سکندر مقدونی جسکا وزیر ارسطو تھا وہ نہیں ہوسکتا، وہ مشرک آتش پرست تھا اور یہ مومن صالح تھے حضرت مفتی صاحب نے معارف القرآن اور مولانا عبدالرشید نعمانی نے لغات القرآن میں بھی اس پر کافی بحث کی ہے۔ یہ بات اتفاقی ہے کہ لفظ ذوالقرنین کا لقب قرآن کا دیا ہوا نہیں ہے، بلکہ یہ عرب کے یہود کا ہے اور لوگوں میں یہ عام ایک فاتح بادشاہ کی حیثیت سے مشہور تھا

قرن کے معنی سینگ یا شاخ کے ہیں اسلئے
ذوالقرنین کے لفظی معنی ہونگے دو سینگوں والا
اور ایک معنی قوت کے بھی لئے گئے ہیں۔
قِیلَ القرنُ : القوۃُ (واللہ اعلم)

سَبَبًا : وَاٰتَیْنٰہُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا
فَاَتْبَعَ سَبَبًا ، (آیت نمبر ۸۴ - ۸۵)
سبب کے اصلی معنی وسیلہ اور ذریعہ کے ہیں
یہاں مِنْ کُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا کا مطلب یہ ہے کہ
اس کی مملکت میں ہر قسم کے وسائل و ذرائع
موجود تھے ۔ صاحبِ کشاف فرماتے ہیں (سبباً ،
طریقاً موصلاً الیہ ، والسَّبَبُ مَا
یُتوصَّل بہٖ الی المقصود من عِلم اَوْ قدرۃٍ
اَوْ اٰلۃٍ (کشاف)
السَّبَبُ ، اصل میں اُس رسّی کو کہا جاتا ہے
جس کے ذریعہ درخت خرما وغیرہ پر چڑھا جائے
پھر اُسی مناسبت سے ہر اُس چیز کو سَبَبٌ
کہا جاتا ہے جو دوسری شے تک رسائی کا ذریعہ
بنتی ہو ۔ اس کی جمع اَسْبَابٌ آتی ہے ، قرآن پاک
میں فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ (آیت نمبر ۱۰
سورہ ص) تو اُن کو چاہیئے کہ سیڑھیاں لگاکر
(آسمان پر) چڑھیں ۔
وَالسَّبَبُ : کُلُّ شَیْءٍ یُتوصَّلُ بہٖ الیٰ
غیرہٖ ، وفی نُسْخَۃٍ کُلُّ شَیْءٍ یُتوصَّلُ
بہٖ الیٰ شَیْءٍ غیرہ ۔ وَقَدْ تَسَبَّبَ اِلَیْہِ
والجمع اسبابٌ ۔ وکلُّ شَیْءٍ یُتَوَصَّلُ
بہٖ الیٰ شَیْءٍ فھو سَبَبٌ (لسان العرب)
تَسَبَّبَ ۔ اسباب تلاش کرنا اور تَسَبَّبَ
الیہ : وسیلہ بنا ۔

اَتْبَعَ : فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۔ اِتْباع کے
معنی پیچھے لگنے ، درپے ہونے ، تعاقب کرنے
کے ہیں ۔ اَتْبَعَ سبباً کے معنی ہونگے اُس نے
وسائل و ذرائع کا جائزہ لیا اسکا اہتمام کیا ،
پھر یہیں سے ذرا وسیع معنی میں یہ کسی مہم کی
تیاری کے لئے استعمال ہوا (تدبر)

**وَجَدَ : وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ
حَمِئَۃٍ** (آیت نمبر ۸۶)
وَجَدَ کے دو مختلف مفہوم لغت عرب میں ہیں
ایک معنی تو ہیں ، پایا ، معلوم کیا ، دریافت کیا ،
گویا اس معنی میں واقعیت یا واقعہ کے ساتھ
مطابقت کا پہلو بھی شامل ہے اور دوسرے
معنی ہیں محسوس کیا ، مشاہدہ کیا ، گویا اس کا
تعلق محض وجدان و ادراک سے ہے ، واقعہ
سے مطابقت ہرگز ضروری نہیں اور یہاں
یہی آخری معنی مراد ہیں (ماجدی)
وَجَدَ کے مختلف مصادر اور صلوں کی تبدیلی
سے اس کے معنی میں تبدیلی ہوتی ہے مثلاً

مُوْجِدَةً و وِجْدَاناً غصے کے لئے آتا ہے۔
وَجَدَ علیہ، اُس پر ناراض ہوا۔

سِتْرًا : لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا (آیت نمبر ۹۰) ہم نے اسکے ادھر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی۔ سِتْرٌ۔ حجاب پردہ اس کی جمع سُتُوْرٌ اور اَسْتَارٌ آتی ہے سِتْرٌ کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جو ڈھانکے۔ هُوَ مَا يُسْتَرُ بِهٖ، (ماجدی بحوالہ تاج) یہاں مراد ہر ایسی چیز ہے جو دھوپ سے بچانے اور محفوظ رکھنے کا کام دے سکے اور اس میں مکان اور لباس دونوں آگئے، یعنی ان لوگوں کا نہ تو کوئی لباس تھا اور نہ ہی کبھی انھوں نے مکان بنائے، محض حیوانی زندگی بسر کرتے تھے۔ المراد، لاشئ لَهُمْ يَسْتُرُهُمْ من اللباس والبناء (روح) معناه انه لا ثياب لهم ويكونون كسائر الحيوانات عُرَاة ابدًا (كبير)

السَّدَّيْنِ : حَتّٰى إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ، (آیت نمبر ۹۳)
لفظ سَدّ عربی میں ہر اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کے لئے رکاوٹ اور اوٹ بن جائے، خواہ دیوار ہو یا پہاڑ، اور قدرتی ہو یا مصنوعی، یہاں سدّین سے مراد دو پہاڑ ہیں جو یاجوج ماجوج کے راستے میں رکاوٹ تھے، لیکن ان دونوں کے درمیانی درّے سے حملہ آور ہوتے تھے جسکو ذوالقرنین نے بند کر دیا جسکی وجہ یاجوج ماجوج کے حملوں سے آبادی کے لوگ محفوظ ہوگئے۔

سدِ ذوالقرنین کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو تحقیق ہے وہ نہایت عمیق اور قابلِ قدر ہے۔ اور اپنے زمانے کی جدید تحقیق ہے ہم اسی کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بحرِ خزر کے مغربی ساحل پر ایک شہر دربند آباد ہے، یہ ٹھیک اسی مقام پر واقع ہے جہاں کاکیسیا کا سلسلہ کوہ ختم ہوتا ہے اور بحرِ خزر سے ملجاتا ہے اس مقام پر قدیم زمانے سے ایک عریض و طویل دیوار موجود ہے جو سمندر سے شروع ہوکر تقریباً تیس ۳۰ میل تک مغرب میں چلی گئی ہے۔ اور اُس مقام تک پہنچ گئی ہے جہاں کاکیسیا کا مشرقی حصہ بہت زیادہ بلند ہوگیا ہے، اس طرح اس دیوار نے ایک طرف بحرِ خزر کا ساحلی مقام بند کر دیا تھا۔ دوسری طرف پہاڑ کا وہ حصہ بھی روک دیا گیا تھا جو ڈھلوان ہونیکی وجہ سے قابلِ عبور ہو سکتا تھا، ساحل کی طرف یہ دیوار دوہری ہے۔ یعنی اگر

آذربائیجان سے ساحل ہوتے آگے بڑھیں تو پہلے ایک دیوار ملتی ہے جو سمندر سے برابر مغرب تک چلی گئی ہے۔ اسمیں پہلے ایک دروازہ تھا۔ دروازے سے جب گزرتے تھے تو پہلے شہر دربند ملتا تھا، اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔ دربند سے آگے پھر اسی طرح ایک دیوار ملتی ہے لیکن یہ دوہری دیوار صرف دو میل تک گئی ہے۔ اس کے بعد پھر اکہری دیوار کا سلسلہ ہے۔ دونوں دیواریں جہاں جاکر ملتی ہیں وہاں ایک قلعہ ہے، قلعہ تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سَو گز سے زیادہ نہیں رہتا، لیکن ساحل کے پاس پہنچ کر پانچسو گز ہے۔ اور اسی پانچسو گز کے عرض میں دربند آباد ہے۔ اس دوہری دیوار کو ایرانی قدیم سے دوبازہ کہتے آئے ہیں یعنی دوہرا سلسلہ۔

اس مقام سے جب مغرب کیطرف کاکیسیا کے اندرونی حصوں میں اور آگے بڑھتے ہیں تو ایک اور مقام ملتا ہے جو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور موجودہ زمانے کے نقشہ میں اسکا محل ولاڈی، کیوکز، یونانی کاکیسیا، روسی کیوکز اور فارسی قفقاز، ایک ہی لفظ ہے اور ٹفلس کے درمیان دکھایا جاتا ہے۔ یہ کاکیسیا کے نہایت بلند حصوں سے ہوکر گزرا ہے۔ اور دُور تک بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں بھی ایک قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے۔ اور ارمنی روایتوں میں اسے آہنی دروازہ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ارمنی زبان میں اسکا قدیم نام بھاک کورائی اور کاپان کورائی چلا آتا ہے دونوں ناموں کا مطلب یہ ہے کہ کور کا درّہ سوال یہ ہے کہ کورَ سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ گورش کی بدلی ہوئی صورت نہیں ہے جو سائرس (ذوالقرنین) کا اصلی نام تھا جیسا کہ دارا کے کتبہ استخر میں پڑھا جا چکا ہے اب ایک اور سوال غورطلب ہے، ذوالقرنین نے جو سدّ تعمیر کی تھی وہ درۂ داریال کی سدّ ہے یا دربند کی دیوار یا دونوں۔

قرآن میں ہے کہ ذوالقرنین دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچا، اُس نے آہنی تختیوں سے کام لیا۔ اُس نے برابر کا حصہ پاٹ کے برابر کر دیا۔ اُس نے پگھلا ہوا تانبا استعمال کیا۔ تعمیر کی یہ تمام خصوصیات کسی طرح بھی دربند کی دیوار پر صادق نہیں آتیں یہ پتھر کی بڑی بڑی سِلوں کی دیوار ہے اور دو پہاڑوں کے درمیان نہیں ہے بلکہ پہاڑ سے سمندر کے

بلند حصہ تک چلی گئی ہے اسمیں آہنی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے کا کوئی نشان نہیں ملتا پس قطعی ہے کہ ذوالقرنین والی سد کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔

البتہ درہ داریال کا مقام ٹھیک قرآن کی تصریحات کے مطابق ہے۔ یہ دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان ہے اور جو سد تعمیر کی گئی ہے اسکی درمیانی راہ بالکل مسدود کر دی گئی ہے چونکہ اس کی دیوار میں آہنی سلوں سے کام لیا گیا تھا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جارجیاں میں قدیم دروازہ کے نام قدیم زمانے سے مشہور چلا آتا ہے۔ اسی کا ترجمہ ترکی میں داکر کپو مشہور ہو گیا۔ بہرحال ذوالقرنین کی اصل سد یہی ہے (ملاحظہ ہو لغات القرآن باب سین مع الدال معارف القرآن جلد ۵ صفحہ ۶۶۲ تا ۶۶۳، قصص القرآن جلد ۳ صفحہ ۲۰۲ تا ۲۲۰۔ تدبر قرآن جلد ۴ صفحہ ۷۷)

زُبَرَ الْحَدِيدِ: زُبَرٌ زُبْرَةٌ کی جمع ہے جسکے معنی تختی یا چادر کے ہیں، مراد لوہے کے ٹکڑے ہیں جن کو اس درّہ کے بند کرنیوالی دیوار میں استعمال ہونا تھا اور کبھی زُبْرَۃٌ کا لفظ بالوں کے گچھے پر بولا جاتا ہے اسکی جمع زُبُرٌ آتی ہے۔ اور استعارہ کے طور پر پارہ پارہ کی ہوئی چیز کو بھی زُبُرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ فَتَقَطَّعُوٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا، پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ کر کے اپنا اپنا دین جدا جدا کر لیا۔

وَقَرَأَ الجمهور زُبَرَ: بفتح الباء، وَقَرَأَ الحسن بضمها وكل ذلك جمع زُبْرَةٍ وهي القِطْعَةُ العَظِيمَةُ منه (قرطبی) واصل الزَّبْرِ: الاجتماع۔ ومنه زبرت الكتاب جَمَعْتُ حروفه (روح)

رَدْمًا: اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا (آیت نمبر ۹۵) رَدْمٌ کہتے ہیں بہت پختہ اور سنگین اور مضبوط قسم کے حجاب کو حاجزًا حصينًا موثقًا (کشاف) رَدْمٌ بمعنی مُرَدَّمٌ یا مُرْدَمٌ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

هَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ من مُتَرَدَّمٍ

کیا شعراء قدیم نے کوئی قابل اصلاح کام چھوڑا ہے (جس پر طبع آزمائی کیجائے) اور سَحَابٌ مُرْدَمٌ ساکن اور ایک جگہ ٹھہرنے والا بادل۔

رَدَمَ (ض) يَرْدِمُ رَدْمًا۔ رخنہ کو پتھروں سے بند کرنا۔ رَدْمٌ موٹی اور مضبوط دیوار کو کہتے ہیں۔ رَدْمًا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے ثَوْبٌ مُرَدَّمٌ۔ پیوند لگا ہوا کپڑا۔

وَالرَّدْم : وَضْعُ الشئ على الشئ مِنْ
حِجَارَةٍ اَوْ تُرَابٍ اَوْ نحوہ حَتّٰى
يقوم من ذالك حجابٌ منيع (قرطبی)

الصَّدَفَيْنِ : حَتّٰى اِذَا سَاوٰى
بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ (آیت نمبر ۹۶)
صَدَفَيْنِ : دو پہاڑوں کی دو جانبیں جو ایک
دوسرے کے بالمقابل ہوں (معارف)
صَدَف خول اور خلاء کو کہتے ہیں۔ یہاں اسکے
مثنی استعمال کرنے میں اسکے دونوں طرفوں کا
لحاظ ہے جس طرح مشرقین اور مغربین میں ان
کے دونوں اطراف کا لحاظ ہے اس طرح
صدفین میں اسکے دونوں کناروں کا لحاظ کر
مقصود یہی بتانا ہے کہ دونوں پہاڑوں کے
درمیان کا خلا پورا بھر دیا گیا (تدبر)
والصَّدَفَانِ (بفتحين) جانبا الجَبَلَيْنِ
لاَنَّهُمَا يتصادفان اى يتقابلان
(كشاف) صدف اگرچہ پہاڑ کے کنارے
اور جانب پر بولا جاتا ہے لیکن یہ اسوقت ہے
جب کہ مقابل میں دوسرا کنارہ موجود ہو تنہا
ایک طرف کی جانب اور کنارہ کو صدف نہیں
کہا جاتا۔ یہ اسماء متضایفہ میں سے ہے جیسے
زَوْجٌ کالفظ ایک فرد کے لئے نہیں بولا جاتا۔
اور صَدَف کے معنی مائل ہونے اور پھر جانے
کے ہیں اور حرف عَنْ کے ساتھ اعراض کے معنی
دیتا ہے۔ صَدَفَ عنہ کے معنی سخت اعراض اور
بے رخی برتنے کے ہیں۔ والصدف : جانب
الجبل واصله على ماقيل الميل، ونقل فى
الكشف انه لايقال للمنفرد صدف حتى
يُصَادفه، اى آخر ثم قال فهو من الاسماء
المتضايفة كالزوج وامثاله (روح)
اور صَدَف (ضرب) وہ کترایا، اُسنے منہ موڑا۔
صَدَفٌ بمعنی کنارہ کوہ والصدفان : الجبلان
المتناوحان ولايقال للواحد صدف و
انما يقال للاثنين، لان احدهما يصادف
الأخر (قرطبی) وقال الرازی مثل ما قال
صاحب الكشاف، وقال الراغب صدف
عنه اَعْرَضَ اِعراضًا شديدًا يجرى مجرى
الصدف اى الميل فى ارجل البعير او
فى الصلابة كصدف الجبل الى جانبه
او الصدف الذى يخرج من البحر :
یعنی اصل میں صَدَفٌ کا لفظ پہاڑ کے کنارے
سمندر سے نکلنے والے سیپ اور اونٹ کی
ٹانگوں میں کجی کو کہتے ہیں پھر ٹانگوں کے
ٹیڑھے پن یا پہاڑ اور سیپ کی سختی سے شدتِ
اعراض کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے،

قِطْرًا : قَالَ اٰتُوْنِىْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا

(ذوالقرنین نے) کہا لاؤ میرے پاس کہ ڈالوں
اس پر پگھلا ہوا تانبا۔ قِطر کے معنی اکثر مفسرین
کے نزدیک پگھلے ہوئے تانبے کے ہیں بعض نے
پگھلے ہوئے لوہے یا رانگ کو بھی مراد لیا ہے
والقطر عند المفسرین : النحاس المذاب
واصله من القطر لانه اذا اذیب قَطَر
کما یَقْطُر الماء (قرطبی) قِطْرًا ای نحاسًا
مذابًا (راغب)

اور القطران کے معنی پگھلی ہوئی رال یا گندھک
کے ہیں۔ سَرَابِیْلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ ۔ ان کے
کرتے گندھک کے ہونگے اور ایک قرات میں
مِنْ قِطْرٍ اٰنٍ ہے، جس کے معنی پگھلے ہوئے گرم
تانبے کے ہیں۔ اس قرارت میں قِطرٌ موصوف
آنٍ صفت ہوگا۔

سَحَابٌ قَطُوْرٌ بہت برسنے والا بادل (قرطبی)

دَکَّآءَ : فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ
جَعَلَهٗ دَکَّآءَ (آیت نمبر ۹۸)
پھر جب میرے پروردگار کا وعدہ آپہنچے گا
تو وہ اُسے ڈھا کر برابر کر دیگا (ترجمہ ماجدی)
دَکَّآءَ یعنی ریزہ ریزہ ہو کر زمین کے برابر
ہوجانے والی (معارف)

اَلدَّكُّ : اسم ہے نرم اور ہموار زمین،
دَکَّہٗ دَکًّا کے معنی ہیں کسی چیز کو کوٹ کر
برابر اور ہموار کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے،
وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا
دَکَّةً وَّاحِدَةً ۔ اور زمین اور پہاڑ
دونوں اُٹھا لئے جائیں گے، پھر یک بارگی
توڑ کر برابر کر دیے جائیں گے۔ اور دُكَّتِ
الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا اور زمین کوٹ کوٹ کر
ہموار کر دی جائے گی۔ اَرْضٌ دَکَّاءُ ہموار
زمین دَکَّاءُ اسکی جمع دَکَّاوَاتٌ آتی ہے۔
بعض علم و فہم کے ناہمواروں نے آیت کریمہ
اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا کا ترجمہ
کیا ہے، جب معاشی ہمواریاں پیدا کردی جائیں
گی۔ یہ الحاد فی القرآن ہے۔

اصل میں دَكٌّ کے معنی نرم اور ہموار زمین
کے ہیں اور چونکہ نرم اور ہموار زمین ریزہ ریزہ
ہوتی ہے اسلئے اسی مناسبت سے اس کے
مصدر کے معنی مقرر ہوگئے۔

الدَّكُّ : هَدْمُ الجبل والحائط ونحوهما
دَكَّهٗ يَدُكُّهٗ دَكًّا ۔ اللیث : الدَّكُّ
كسر الحائط، وَجَبَلٌ دُكٌّ وجمعه
دِكَكَةٌ ودَكَّ الارض دَكًّا : سوّى
صَعُوْدَهَا وَهُبُوْطَهَا (لسان)

يَاْجُوْجُ مَاْجُوْجُ : کا اشتقاق اہل
لغت نے مادہ اَجَّ سے کیا ہے جس کے معنی

آگ کے بھڑکنے اور شعلہ مارنے کے ہیں۔ اور
پانی کے تموج اور تلاطم کے معنی میں بھی آتا ہے
ان کے یہ نام شدتِ شورش کی وجہ سے پڑے
علامہ راغب لکھتے ہیں:
شُبِّهُوا بِالنَّارِ الْمُضْطَرِمَةِ وَالْمِيَاهِ الْمُتَمَوِّجَةِ
لِكَثْرَةِ اِضْطِرَابِهِمْ (راغب)
أَجَّ (ن) أَجِيجًا، آگ کا بھڑکنا، شعلہ
مارنا۔ صفت أَجَاجٌ و أَجُوجٌ اور أَجَّ
الْمَاءُ أُجُوجًا: پانی کا کھاری اور کڑوا
ہونا۔ أَجَّجَ النَّارُ (تفعیل) آگ کا
بھڑکنا۔ أَجَّجَ الْمَاءُ: پانی کو کھاری
کرنا۔ اِئْتَجَّ الْحَرُّ: گرمی کا شدید
ہونا۔ الْأُجَاجُ بہت کھاری اور کڑوا پانی
الْأَجَّةُ، گرمی کی شدت اور تیزی، جمع
إِجَاجٌ و أُجَجٌ، شور چلنے کی آہٹ
الْأَجِيجُ۔ تَلَهُّبُ النَّارِ (لسان)
صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ یاجوج ماجوج
دونوں عجمی لفظ ہیں جس کی دلیل انکا غیر منصرف
ہونا ہے۔ اسمان اعجمیان بدلیل منع الصرف
(کشاف) لیکن اگر یہ اسماء عربی مانیں جائیں
تو ان کا اشتقاق أَجَّتِ النَّارُ اور أَجَّ الْمَاءُ
سے ہوگا۔ وهُمَا اسمان اعجميان واشتقاق
مثلهما من كلام العرب يخرج من

أَجَّتِ النَّارُ، وهو من الماء الاجاج
وهو الشديد الملوحة، المحرق من
مُلُوحَتِهِ (لسان)
لفظ یاجوج ماجوج کو دو طرح پڑھا گیا ہے،
ایک ہمزہ کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزہ کے
اگر ہمزہ کے ساتھ یَأْجُوج مَأْجُوج پڑھا
جائے تو یَأْجُوجُ یَفْعُولُ کے وزن پر ہوگا
اور مَأْجُوجُ مَفْعُولُ کے وزن پر ہوگا اور
اگر بغیر ہمزہ کے الف کے ساتھ ہوں تو
دونوں کا وزن فَاعُولُ ہو جائے گا،
أَجَّ الرَّجُلُ يَئِجُّ (س) أَجِيجًا جيجا۔
زور سے پکارنا، آواز کرنا، اور أَجَّ يَؤُجُّ
أَجًّا۔ تیز دوڑنا، جلدی بھاگنا۔ أَجَّ فِي
سَيْرِهِ: يَؤُجُّ اذا أَسْرَعَ وهَرْوَلَ
(لسان العرب) اصلهما من اجيج
النَّارِ وهو ضَوْؤُهَا وشَرَرُهَا
شبهوبه لكثرتهم وشدتهم
(خازن) اہلِ تاریخ کا اس پر اتفاق ہے کہ
یاجوج ماجوج سے مراد حضرت نوحؑ کے
بیٹے یافثؑ کی وہ اولاد ہے جو ایشیا کے
شمالی علاقوں میں آباد ہوئی۔
حزمیل فرماتے ہیں کہ اور خداوند کا کلام
مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد یاجوج

کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے۔ اور
روش، مسک اور توبل کا فرمانروا ہے
متوجہ ہو اور اسکے خلاف نبوت کر حزقی
ایل = ۳۸ : ۱ روش، مسک اور توبل کے
نام اب تک ایشیا ماسکو اور توبالسک
کی صورت میں موجود ہیں اور یہ علاقے فلسطین
سے شمال کی بعید اطراف میں ہیں۔ یاجوج،
ماجوج کے قبائل بحر خزر کے شمال کی جانب
اور وسط ایشیا میں منگولیا کے علاقہ میں
آباد تھے۔

تورات کتاب پیدائش (۱۰ : ۲) میں
یافس کے ایک بیٹے کا نام ماغوغ آیا ہے
عبری زبان میں غ کا تلفظ گاف (گ) کی
آواز سے ہوتا ہے اسلئے ماغوغ کو ماگوگ
کہتے ہیں۔ عربی میں گ کو ج سے بدل لیتے ہیں
اسلئے ماغوغ کو ماجوج کہتے ہیں گویا یاجوج
ماجوج اصل میں یاگوگ ماگوگ تھے۔

يَمُوْجُ : وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ
يَمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ (آیت نمبر ۹۹)
مَاجَ يَمُوْجُ مَوْجًا وَمُوُوْجًا وَتَمَوَّجَ
البحر: سمندر کا موج مارنا، جوش مارنا،
ٹھاٹھیں مارنا۔ مَاجَ القوم: قوم کا مضطرب
ہونا، بے ترتیب ہونا اور ماج عَنِ الحق
حق سے پھر جانا، الگ ہوجانا۔ يَمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ
یعنی کثرت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوگا
کہ ایک دریا ہے جس کی لہریں اٹھ رہی ہیں
اور پچھلی لہریں اگلی لہروں میں گھسی پڑتی ہیں
مَوْجٌ : لہروں کا تلاطم۔ پانی میں لہریں
اٹھنا۔ جمع اَمْوَاجٌ اَلْمَوْجُ مَا ارْتَفَعَ
مِنَ الْمَاءِ فَوْقَ الماء والفعل مَاجَ
الْمَوْجُ والجمع اَمْوَاجٌ والناس
يموجون وماج الناس دخل بعضهم
فِيْ بَعْضٍ (لسان)

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی
اضطراب کے لکھے ہیں۔ مَوْجَةُ الشَّبَابِ
جوانی کی لہر کو کہتے ہیں۔

الصُّوْرُ : وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ
اور صور پھونکا جائے گا۔ بعض نے کہا ہے صور
سے قرن یعنی نرسنگے کی طرح کی کوئی چیز
مراد ہے جسمیں پھونکا جائے گا تو اس سے
انسانی صورتیں اور روحیں انکے اجسام کی
طرف لوٹ آئیں گی۔ ایک روایت میں ہے،
ان الصور منه صورة الناس كلهم،
کہ صور کے اندر تمام لوگوں کی صورتیں موجود ہیں
اکثر اہل علم اور اصحاب تفسیر کے نزدیک صور
سے مراد نرسنگا۔ قرن اور وہ چیز ہے جسکو

حضرت اسرافیل علیہ السلام خلق کو مارنے اور
جِلانے کے لئے پھونکیں گے ۔ سورہ انعام
میں ہے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ جسدن
صُور پھونکا جاوے گا ۔

لفظ صور میں دوسرا قول یہ ہے کہ صُوَرٌ
جمع ہے ۔ اسکی واحد صُوْرَۃٌ ہے، جیسے
صُوْفٌ جمع صُوْفَۃٌ کی اور بُسْرٌ جمع ہے
بُسْرَۃٌ کی ۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے
کہ جسدن مُردوں کے پیکروں میں روحیں پھونکی
جائیں گی اور حضرت حسن بصری نے قراءت
ہی بتحریک واؤ کی ہے یعنی یَوْمَ یُنْفَخُ
فِی الصُّوَرِ جسدن صور تیلوں میں پھونکا جائیگا،

یہ قول ابو عبیدہ اور مقاتل کیطرف منسوب ہے
وقال ابو عبیدۃ الصُّوَرُ جمع صُوْرَۃٍ والنَّفخ
فیھما اَحْیَاؤُھا بنفخ الروح فیھا و
ھٰذا قول الحسن ومقاتل (جمل) مگر
اہلِ تفسیر اور اصحابِ لغت نے قول اوّل کو
صحیح قرار دیا ہے اور ابو عبیدہ وغیرہ کے قول
پر شدید نکیر کی ہے کیونکہ قرآن مجید میں دوسری
جگہ ارشاد ہے ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی ،
پھر دوبارہ اس میں پھونکا جائے گا، اسمیں
فیہ کی ضمیر ہ واحد مذکر ہے جو صُوْرٌ کی
طرف راجع ہے، ظاہر ہے اگر صُوَرٌ جمع ہوتی
تو اسکی طرف واحد مذکر کی ضمیر نہ لوٹتی ۔ نیز
ارشاد ہے فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ پھر جب
بجنے لگے گی وہ کھوکھلی چیز ۔ یہ صور پھونکنے
کا بیان ہے ۔ پھر خود حدیث میں ہے کہ
صحابہ کرام نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے
سوال کیا کہ صور کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا
الصُّوْرُ القرن یُنْفَخُ فیہ ۔ صور قرن
یعنی نرسنگا ہے جسمیں پھونکا جائے گا، علامہ
جمل نے اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی
کے حوالہ سے نقل کیا ہے ۔ اور اہلِ سنت
وجماعت کا اسی پر اجماع ہے کہ صور سے
مراد قرن ۔ بُوق نرسنگا ہے جسمیں حضرت
اسرافیل قیامت کے قریب پھونکیں گے

والصُّوْرُ : قَرْنٌ (روح)

ابو الہیثم کہتے ہیں کہ ایک قوم نے صور
کے قرن ہونے سے انکار کیا ہے جسطرح
کہ انھوں نے میزان، عرش، صراط کا انکار
کیا ہے ۔ اور انھوں نے اسکا دعویٰ کیا ہے
کہ صُوَرٌ صُوْرَۃٌ کی جمع ہے جیساکہ صُوْفٌ
صُوْفَۃٌ کی جمع ہے اور نَوْمٌ جمع ہے نَوْمَۃٌ
کی ۔ انھوں نے بھی ابو عبیدہ ہی کے قول
سے استدلال کیا ہے لیکن یہ انکی کھلی ہوئی
غلطی ہے جو قرآن پاک میں تحریف کے

مترادف ہے۔ چونکہ قرآن پاک میں دوسری
جگہ ارشاد ہے، وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ
صُوَرَكُمْ یہاں صُوَرُ کو بفتح الواو ہی پڑھا
گیا ہے۔ اور اہلِ قرارت میں سے کسی ایک
کا بھی اختلاف منقول نہیں ہے۔ اسی طرح
آیت کریمہ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ میں تمام اہلِ
قرارت نے بسکون الواو پڑھا ہے جس
سے مراد قرن ہے۔ تو جن حضرات نے
فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ میں صُوَرٌ کو صُوْرٌ بسکون
الواو اور نُفِخَ فِي الصُّوَرِ میں لفظ صُوْرٌ کو
صُوْرَةٌ کی جمع قرار دیکر صُوَرٌ بفتح
الواو پڑھا ہے انھوں نے جھوٹ اور افترا
کیا ہے، اور خدا کے کلام کو تبدیل کیا ہے،
ابوالہیثم کہتے ہیں کہ ابو عبیدہ تاریخی
آدمی تھے اور عجیب وغریب واقعات نویس
تھے انھیں علم نحو کی معرفت نہ تھی وکان
ابوعبیدة صاحب اخبارٍ وغریبٍ
ولم یکن لہٗ معرفۃ بالنحو (لسان)
علم نحو کے امام اور مشہور لغوی فراء کہتے ہیں
کہ ہر وہ جمع جو واحد مذکر کے لفظ پر ہو اور
اسکی جمع واحد سے پہلے ہو تو اسکی واحد
کو جمع سے ممیز کرانے کے لئے آخر میں ھاء
کو زیادہ کیا جاتا ہے جیسا کہ صُوْفٌ، وَبَرٌ
شَعْرٌ، قُطْنٌ اور عُشْبٌ وغیرہ الفاظ میں
یہ تمام اسماء اپنی پوری جنس کے لئے بطور
اسم کے استعمال ہوتے ہیں۔ اور جب انکی
واحد مقصود ہو تو آخر میں حرف ھاء کو
زیادہ کر کے صُوْفَةٌ اور شَعْرَةٌ وغیرہ
کہتے ہیں۔ چونکہ ان الفاظ کی جمع واحد سے
پہلے استعمال ہو چکی ہے۔ اور اگر انکی واحد
جمع سے سابق ہوتی تو صُوْفَةٌ کی جمع صُوَفٌ
اور بُسْرَةٌ کی جمع بُسَرٌ کہتے۔ جیسے کہ غُرْفَةٌ کی
جمع غُرَفٌ اور زُلْفَةٌ کی جمع زُلَفٌ کہتے ہیں
بہر حال آیتِ کریمہ میں لفظ صُوْرٌ سے مراد
قرن ہے۔ اس کو صُوْرَةٌ کی جمع قرار دینا
کسی طرح بھی درست اور جائز نہیں ہے
اور صورۃ الانسان کی جمع جو صُوَرٌ آتی ہے
تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی واحد جمع سے
سابق یعنی پہلے ہے۔ واما الصورُ، القرنُ
فهو واحد لا یجوز ان یقال واحدتہٗ
صورۃ وانما تجمع صورۃ الانسان
صُوَرًا لِأَنَّ وَاحِدَتَهٗ سَبَقَتْ جَمْعَهٗ
(لسان کبیر)

غِطَآءٍ : الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ
فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ (آیت نمبر ۱۰۱)
جن آنکھوں پہ پردہ پڑا تھا میری یاد

ہے (ترجمہ معارف) الْغِطَاءُ کے اصل معنی طباق، ڈھکنا وغیرہ کی قسم کی چیز کے ہیں جو کسی چیز پر بطور سرپوش کے رکھی جائے جیسے غِشَائٌ، لباس وغیرہ کی چیز کو کہتے ہیں، جسے کسی دوسری چیز کے اوپر ڈالا جائے، اور پھر بطور استعارہ کے جہالت اور غفلت وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ آیت کریمہ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (ق) یہاں کشف غطار سے مراد پردۂ جہالت کو چاک کرنا ہے۔

وَالغِطَاءُ : ما يجعل فوق الشئ من طبقٍ ونحوه كما ان الغشاءَ ما يُجْعَلُ فوق الشئ من لباس ونحوه وقد اُسْتُعِيْرَ للجهالة - قال فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (راغب) فِيْ غِطَاءٍ اى فى غِشَاءٍ وسَتْرٍ (خازن) غَطَا يَغْطُوْ اغْطُوًا وَغَطُوًّا - غَطَا الشئ : کسی چیز کو چھپانا، ڈھانکنا۔ غَطَا الماءُ وغيرُهٗ - پانی وغیرہ کا بلند ہونا۔ غطّى تَغْطِيَةً و اَغْطٰى اِغْطَاءً، الشئَ۔ چھپانا ڈھانکنا تَغَطّٰى واغطٰى چھپنا۔ غَطٰى يَغْطِى غَطْيًا وغُطْيًا۔ غطى اللَّيْلُ رات تاریک ہوگئی۔ غَطَى الشابُّ جوانی میں بھرنا (منجد)

والغِطَاءُ : مَا غُطِّيَ بِهٖ، وغَطَا الشئَ غَطْوًا وغَطَّاهُ تَغْطِيَةً واَغْطَاهُ : وارَاهُ وسَتَرَهٗ وهٰذِهِ الكلمة وادِيَّةٌ ويائِيَّةٌ والجمع الاَغْطِيَة (لسان العرب)

حدیث میں ہے نہٰی ان يُّغَطِّيَ الرّجل فاهُ فى الصلوٰة، آپؐ نے نماز میں منہ چھپانے سے منع کیا۔ مثلاً ڈھاٹا وغیرہ باندھنا جیسا کہ عربوں کی عادت تھی کہ منہ پر کپڑا وغیرہ لپیٹ لیتے تھے۔ البتہ اگر جماہی وغیرہ آئے تو نماز میں منہ پر ہاتھ رکھنے کی اجازت ہے، ایک روایت میں ہے اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الذُّنُوْبِ الَّتِيْ تَكْشِفُ الْغِطَاءَ، میں تیری پناہ مانگتا ہوں ان گناہوں سے جو پردہ چاک کردیں۔

اَلْفِرْدَوْسِ : كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا (آیت نمبر ۱۰۷) لفظ فِردَوس میں اہل لغت کا اختلاف ہے کہ یہ عربی ہے یا عجمی۔ فارس میں فردوس اُس باغ کو کہتے ہیں جسکے درخت پھلتے اور پھولتے جائیں۔ اور صاحب غیاث اللغات نے تاریخ بیہقی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ

پردوس کا معرب ہے اور قبطی زبان میں انگور کی ٹٹیوں کو کہتے ہیں اور صاحب قاموس اور صاحب منتہی الارب نے لکھا ہے کہ فردوس پانی کی وہ چھوٹی نہر جسمیں ہر طرح کا سبزہ اُگا ہوا ہو۔ وہ باغ جسکے اندر انگور اور ہر طرح کے پھل ہوں۔

زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ فردوس عربی ہے، کیونکہ اسکے ہم مادہ اور دوسرے الفاظ عربی میں مستعمل ہیں۔ مثلاً فُرْدُوس مہمان کے سامنے رکھا جانے والا کھانا۔ صَدْرٌ مُفَرْدَسٌ۔ چوڑا سینہ۔ فَرْدُوسَۃٌ۔ کشادگی۔ فراخی۔ زمین پر کسی کو پٹک دینا۔ گرا دینا۔

فردوس، جنت کے اعلیٰ مقام میں ہے، اور یہ اُن لوگوں کا حصّہ ہے جو اس دُنیا میں حق کی سربلندی کے لئے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں گے۔ قال قتادہ: الفردوس ربوۃ الجنۃ واَوسَطُها وَاَعلَاهَا وَاَفضَلُهَا وارفعها، وقال مجاهد والفردوس البستان بالرومیۃ۔ الفراءُ: هو عربی والفردوس حدیقۃٌ فی الجنۃ وفردوس اسم روضۃ دون الیمامۃ والجمع فرادیس

الفردوس: البستان، قال الفراء: هو عربی۔ قال ابن سیدہ: الفردوس الوادی۔ الخصیب عند العرب کالبستان وهو بلسانِ الروم البستانُ (لسان)

اہل لغت کے اختلافِ اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ فردوس عربی اور دوسری زبانوں میں مشترک ہے اور مراد اس سے سرسبز و شاداب باغ ہوتے ہیں اور خاصکر وہ باغ جسمیں انگور زیادہ ہوں۔ بہرحال عربی زبان میں فردوس کے معنی چمن اور گلشن کے ہیں۔ اور فردوس اس چمن اور گلشن کو کہا جاتا ہے جسمیں تمام وہ چیزیں موجود ہوں جو باغوں اور بستانوں میں ہوتی ہیں۔ چنانچہ صاحب لسان العرب زجاج کا قول نقل کرتے ہیں کہ قال الزجاج: و حَقِیقَتُہٗ انہ البستان الذی یجمع ما یکون فی البساتین: وکذلك هو عند اهل کل لغۃ (لسان) والفردوس: حدیقۃٌ فی الجنۃ (ایضًا)

حِوَلًا: لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا: حَوَّلْتُ الشیئَ: کسی چیز کو متغیر کرنا اور پھیر دینا اور یہ تغیر کبھی باعتبار ذات کے ہوتا ہے اور کبھی باعتبار حکم اور قول کے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ اَحَلْتُ عَلٰی فلانٍ بالدَّین

میں نے فلاں پر قرض کا حوالہ کر دیا۔ اور حَوَّلْتِ الکتاب کے معنی کتاب کو نقل کرنا اور آیت کریمہ لَا یَبْغُوْنَ عنھا حِوَلًا میں حِوَلًا کے معنی تحویل یعنی پھرنے کے ہیں۔ وہ وہاں سے مکان نہ بدلنا چاہیں گے مطلب یہ کہ جنت کی لازوال نعمتوں سے نہ تو انکو کوئی بے دخل کر سکے گا اور نہ وہ وہاں سے منتقل ہونے کی خواہش کریں گے، کیونکہ اس سے آگے کوئی بڑی نعمت نہیں اور اس سے زیادہ کوئی عزت و شرف کی جگہ نہیں، بخلاف دُنیا کے یہاں طمع و لالچ کبھی ختم نہیں ہوتا، الحِوَلُ: دُور بین۔ قدرت و تصرف، ہٹنا کہا جاتا ہے لاحِوَلَ عَنْہُ: اس سے ہٹنا ممکن نہیں قال الزمخشریؒ: الحِوَلُ: التحوّلُ۔ یقال حال من مکانہ حولًا کقولك عاد فی حبّھا عودًا (کشاف) والحِوَل: بمعنی التحویل، وقال الزجاج حال من مکانہ حِوَلًا کما یقال عَظُمَ عِظَمًا، وقال الجوھری: التحول: التنقّلُ من موضع الی موضع، والاسم الحِوَلُ (قرطبی) اور اگر حِوَلٌ کو حِیْلَۃٌ سے ماخوذ مانا جائے تو معنی یہ ہونگے وہ اپنے مکان سے نکل کر دوسرے مکان میں پہنچکر حیلہ نہیں کریں گے تاکہ اس سے بڑے بنگلہ میں منتقل ہو جائیں۔

مِدَادًا: قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ: مِدَادًا روشنائی، چراغ کا تیل، ہر چیز کی زیادتی، یہ مَدَّ یَمُدُّ سے ماخوذ ہے مَدَّ الشیٔ و بالشیٔ پھیلانا کھینچنا۔ مَدَّ اللہُ عُمْرَہٗ زندگی دراز کرنا مَدَّ مِنَ الدَّوَاۃِ دوات سے سیاہی لینا۔ مدّ الدواۃ دوات میں پانی یا سیاہی ڈالنا۔ حدیث میں ہے۔ میزابانِ مدادھما الجنۃ: دو نالے اسمیں آکر گرتے ہیں جنہیں برابر زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ ایک روایت میں ہے یَنْبَعِثُ فیہ میزابان مدادھما انھار الجنۃ:

حوض کوثر میں دو پرنالے ہیں جنت کی نہریں اس میں پانی کی مدد پہنچا رہی ہیں۔ قال صاحب الکشاف:

المداد اسم ما تمدّ بہ الدّواۃ من الحبر وما یمدّ بہ السراج من السلیط (کشاف)

تمت

شرح الفاظ القرآن من سورۃ مریم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ : یہ حروف مقطعات اور متشابہات میں سے ہے جسکا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اللہ اعلم بمرادہ بذالک (جلالین) بندوں کے لئے اس کی تفتیش بھی اچھی نہیں، (معارف) علامہ قرطبی نے ابن عباس کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ کاف، کافی کا مخفف ہے۔ ھاء، ھادٍ اور ع عالِم اور ص صادقٍ کا مخفف ہے۔ اور مسند دارمی میں ہے کہ ی ید سے مخفف ہے اور مراد اس سے یَدُ اللہ فوق عبادہٖ ہے۔ حضرت ابن عباس سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ یہ اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، حضرت علی سے بھی یہی منقول ہے، چنانچہ آپ جب دعا کرتے تو اسمیں یہ الفاظ بھی ہوتے کہ یا کٓھٰیٰعٓصٓ اغفرلی۔ سدّی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور یہ اسم اعظم ہے۔ اس کے واسطے سے جو طلب کیا جائے گا ملے گا۔ اور بعض کے نزدیک یہ سورتوں کا نام ہے۔ قشیری نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ پورے قرآن کا نام ہے۔ قال قتادہ ھو اسم من اسماء القرآن،

وَهَنَ : قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا (آیت نمبر ۴) زکریا علیہ السلام نے کہا، اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور میرے سر میں بالوں کی سفیدی پھیل گئی ہے (ماجدی)، الوَھْنُ کے معنی کسی معاملے میں کمزوری ظاہر کرنے کے ہیں اور کمزوری کا اظہار اخلاقی بھی ہوتا ہے، جسمانی بھی۔ اس آیت کریمہ میں جسمانی کمزوری اور عجز کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ میرے خدایا! بڑھاپے کی وجہ سے میری ہڈیاں کمزور ہوچکی ہیں لیکن تیرے کرم سے ناامید نہیں ہوں اور آیت کریمہ وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ میں اخلاقی کمزوری یعنی بزدلی ظاہر کرنا ہے۔ یعنی کفار کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرنا، قرطبی۔ وَهَنَ بالحرکات الثلاث ای ضَعُفَ، یقال وَهَنَ یَهِنُ وَهْنًا

اذا ضَعُفَ فھو واھِنٌ وَقال ابوزید یقال وَھَنَ یَھِنُ وَوَھِنَ یُوھَنُ (س) (قرطبی) وَاھِنٌ اُس آدمی کو کہتے ہیں جو کام اور معاملہ میں کمزور ہو اور جو بدنی اور جسمانی لحاظ سے کمزور ہو اُسکو مَوْھُوْنٌ کہتے ہیں۔ وھن وہ کمزور ہوا۔ اَوْھَنَ: کمزور اور ضعیف بنایا اور آیت کریمہ ولا تَھِنُوْا وَلَاتَحْزَنُوْا (آل عمران آیت ۱۳۹) تم سست نہ ہو، کمزور نہ رہو، اسمیں جسمانی کمزوری بھی مراد ہوسکتی ہے، اور عقل وفکر وعلم وبصیرت کی بھی۔

اِشْتَعَلَ: اشتعال کے معنی شعلہ بھڑکنے کے ہیں۔ اور قَدْ اَشْعَلْتُھَا (افعال) میں نے آگ بھڑکائی۔ ابوزید کے نزدیک فعل مجرد سے یعنی شعلتُھا، کہنا بھی درست اور جائز ہے۔ اَلشَّعِیْلَۃُ، جلی ہوئی آگ یا بتّی اور لیمپ وغیرہ۔ اسی سے سفیدی کے چمکنے کے محاورہ استعمال کیا جاتا ہے، بَیَاضٌ یَشْتَعِلُ چمکنے والی سفیدی، پھر بطور تشبیہ رنگت کے لحاظ سے بالوں کی سفیدی کو آگ سے تشبیہ دیکر اشتعال کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ بہترین استعارہ ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں، وھذا من احسن الاستعارۃ فی کلام العرب۔ والاشتعال۔ انتشار شعاع النار شبّہ بہ انتشار الشیب فی الرأس (قرطبی) والاشتعال فی الاصل انتشار شعاع النار، فشبہ انتشار بیاض شعر الرأس فی سوادہ بجامع البیاض والانارۃ (فتح القدیر) اَلْمُشْعَلُ: قندیل۔ شَعَلَ النَّارَ[1]

شَقِیًّا: یہ فعیلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ بے نصیب، محروم بدبخت، خائب وخاسر، جمع اشقیا۔ شَقِیَ (س)، شَقْوَۃً وشَقَاوَۃً بدبخت ہونا۔ لفظ شِقَاءٌ تھکاوٹ اور تعب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور شَقِیْتُ فی کذا کے معنی ہیں، میں نے فلاں معاملہ میں مشقت اُٹھائی۔ اور شَقِیَ بکذا، کسی کام میں مشقت اُٹھائی مگر مقصود حاصل نہ ہوا۔ شَقِیَ یَشْقٰی شَقَاوَۃً وشِقْوَۃً

---

[1] اس نے آگ بھڑکا دی اِشْتَعَلَتِ النَّارُ: آگ لگ گئی، واشتعل الرأس شَیْبًا: انتشر الشیب فی الرأس کانہٗ شُعْلَۃُ نارٍ (المعجم)

بدبخت و بدنصیب ہونا۔
شَقِیَ بکذا ای تعب فیہ ولم یحصل مقصودہٗ منہ (فتح) اور شَقَا یَشْقُوْ شَقَاءً و اَشْقٰی اِشْقَاءً بدبخت بنانا، حدیث میں ہے، اَلشَّقِیُّ مَنْ شَقِیَ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ والسَّعِیْدُ مَنْ سَعِدَ فِیْ بطنِ اُمِّہٖ : بدبخت وہ جو اپنی ماں کے پیٹ میں بدبخت لکھا گیا، اور نیک وہ جو اپنی ماں کے پیٹ میں نیک لکھا گیا۔ مراد یہ ہے کہ جو آخرت میں بے نصیب ہے در اصل وہ شقی ہے۔ اور جو آخرت میں ماجور ہو وہ سعید اور خوش بخت ہے۔ ایک اور روایت میں ہے اَعُوْذُبِکَ مِنَ الذُّنُوْبِ الَّتِیْ تُوْرِثُ الشِّقَاءَ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں ان گناہوں کی جو مفلسی اور تنگی پیدا کر دیتے ہیں۔ مراد دنیا و آخرت کی بربادی ہے، غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا تو شِقْوَۃٌ بروزن رِدَّۃٌ ہے۔ اور شَقَاوَۃٌ سَعَادَۃٌ کے وزن پر ہے۔ سعادت کی طرح شقاوت بھی دو قسم کی ہے۔ دُنیوی اور اُخروی پھر سعادت دنیوی تین قسم پر ہے، نفسانی، بدنی اور خارجی۔ اسی طرح شقاوت بھی انہی تین اقسام کی طرف منقسم ہوتی ہے،

چنانچہ شقاوتِ اُخروی کے متعلق ارشاد ہے لَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی وہ نہ گمراہ ہوگا، نہ تکلیف میں پڑے گا، اسی طرح غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا کا تعلق بھی شقاوتِ اُخروی سے ہے۔ اور شقاوت دنیوی کے متعلق ارشاد ہے، فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّۃِ فَتَشْقٰی (راغب)

اَلْمَوَالِیْ : وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ (آیت نمبر ۵)

میں ڈرتا ہوں بھائی بندوں سے اپنے پیچھے (معارف) مَوَالِی مَوْلٰی کی جمع ہے، عربی زبان میں یہ لفظ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے ان میں سے ایک معنی چچازاد بھائی اور اپنے عَصَبَات کے بھی آتے ہیں اس جگہ وہی مراد ہے (معارف القرآن) المَوَالِی سے مراد وہ عزیز ہیں جو اولاد نہ ہونے کی صورت میں وارث و جانشین ہوتے ہیں۔ آپ کو اُن لوگوں سے خطرہ تھا کہ میری وفات کے بعد یہ لوگ ہیکل کی خدمت سے قاصر رہیں گے اس لئے نیک اور صالح اولاد کی آرزو کی۔

وَقَالَتْ طَائِفَۃٌ : انما کان موالیہ مھملین للدین فخاف بموتہ ان

یضیع الدّین فَطَلَبَ ولیّا یقوم بالدّین بعدہ (قرطبی)

الوِلاءُ والتوالی ۔ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے بعد درمیان میں کوئی ایسی چیز نہ آئے جو انہیں سے نہ ہو۔ پھر استعارہ کے طور پر قرب کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے خواہ وہ قرب بلحاظ مکان یا نسب اور یا بلحاظ دین اور دوستی یا نصرت کے ہو اور یا بلحاظ عقائد کے ۔ اَلْوِلَایَۃُ بکسر الواو کے معنے نصرت اور وَلَایَۃُ بفتح الواو کے معنی کسی کام کا متولّی ہونے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ دَلَالَۃٌ اور دِلَالَۃٌ کی طرح ہے یعنی اس میں دو لغت ہیں اور اسکے اصلی معنی کسی کام کا متولّی ہونے کے ہیں۔ اَلْوَلِیُّ والْمَوْلٰی یہ دونوں کبھی اسم فاعل یعنی بمعنی مُوالٍ کے استعمال ہوتا ہے اور کبھی بمعنی اسم مفعول مُوَالٰی میں استعمال ہوتا ہے، اور مومن کو وَلِیُّ اللّٰہ تو کہا جاتا ہے لیکن مَوْلَی اللّٰہ کہنا ثابت نہیں ۔ اور خدا کے لئے وَلِیُّ المؤمنین اور مولی المؤمنین دونوں طرح کہنا ثابت ہے (راغب)

یَرِثُ : یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْب (آیت نمبر۶) جو میری جگہ بیٹھے اور اولاد یعقوب کی ۔ باتفاق جمہور علماء اس جگہ وراثت سے وراثت مالی مراد نہیں کیونکہ اوّل تو حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس کوئی بڑی دولت ہونا ثابت نہیں جس کی فکر ہو کہ اس کا وارث کون ہوگا ۔ اور پیغمبر کی شان سے بھی ایسے فکرات میں پڑنا بعید ہے اس کے علاوہ وہ صحیح حدیث جس پر صحابہ کرام کا اجماع ثابت ہے اسمیں ہے ۔

انّ العلماء ورثۃ الانبیاءِ وانّ الانبیاءَ لم یُوَرِّثوا دِیْنَارًا وَلَا دِرْھمًا انّما ورّثوا العلم فمن اخذہٗ اخذ بحظٍ وافرٍ (رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجہ والترمذی)

بیشک علماء ورثاء ہیں انبیاء کے کیونکہ انبیاء علیہ السلام دینار اور درہم کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ ان کی وراثت علم ہوتا ہے ۔ جس نے علم حاصل کر لیا اُس نے بڑی دولت حاصل کر لی ۔

یہ حدیث کتب شیعہ کافی کلینی وغیرہ میں بھی موجود ہے ۔ اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا نُوْرَثُ وَمَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ ۔ ہم

انبیاء کی مالی وراثت کسی کو نہیں ملتی ہم جو
مال چھوڑیں وہ صدقہ ہوتا ہے اور خود اس
آیت میں یَرِثُنِی کے بعد وَیَرِثُ مِنْ آلِ
یعقوب کا اضافہ اس کی دلیل ہے کہ وراثت
سے مال مراد نہیں۔ کیونکہ جس لڑکے کی پیدائش
کی دعا کی جا رہی ہے اسکا آل یعقوب کے
لئے مالی وراثت بننا بظاہر ممکن نہیں کیونکہ
آل یعقوب کے وارث انکے عصبات قریبیہ
ہونگے اور وہی موالی ہیں جن کا ذکر اس آیت
میں کیا گیا ہے۔ بلاشبہ قرابت وعصوبت
میں حضرت یحییٰ علیہ السلام سے اقرب ہیں،
اقرب کے ہوتے ہوئے عصبہ بعید کو
وراثت ملنا اصولِ وراثت کیخلاف ہے
(معارف القرآن)

غرض کہ طلب ولی کی دعا مال وراثت
اور جائیداد کے لئے نہیں بلکہ علم وحکمت
کے ولی کی دعا ہے جو اسی طرح قبول و
منظور ہوئی۔ لفظ ارث کا اطلاق جس
طرح مال وجائداد پر ہوتا ہے اسی طرح
علم وحکمت اور علوم نبوت و شریعت پر
بھی ہوتا ہے۔ اور یہ معنی صحابہ کرام
تابعین اور اکابر مفسرین سے منقول ہیں،
وقال ابن عباس وَیَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوبَ
النبوة فقد اجاز اطلاق اسم المیراث
علی النبوة (جصاص) علامہ زمخشری
لکھتے ہیں المراد بالارث ارث الشرع
والعلم لان الانبیاء لا تُوَرَّثُ المالَ
(کشاف)

رَضِيًّا : وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا
(آیت نمبر ۶) رَضِيٌّ پسندیدہ۔ مَن مانا
رَضِيٌّ سے صفت مشبہ کا صیغہ فعیل
بمعنی مفعول ہے (لغات القرآن)
اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فعیل بمعنی فاعل
ہو۔ یعنی رضیًّا راضیًا کے معنی میں ہو
ای مرضیاً عندك قولاً وفعلاً وقیل
راضیًا والاول انسب (روح) ای
مرضیًا فی اخلاقہ وافعالہ وقیل:
راضیا بقضائك وقدرك (قرطبی)

**سَمِيًّا : لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ
سَمِيًّا ،** (آیت نمبر ۷)
لفظ کے معنی ہمنام کے بھی آتے ہیں اور
مثل اور مشابہ کے بھی۔ اگر پہلے معنی
مراد ہوں تو مطلب واضح ہے کہ ان سے
پہلے یحییٰ نام کسی کا کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ
نام کی یکتائی اور امتیاز بھی بعض خاص
صفات میں انکی یکتائی کی طرف مشیر تھی،

اس لئے ان کو انکی صفت خاص میں ذکر
کیا گیا۔ اور اگر دوسرے معنی مراد لئے جائیں
تو مطلب ہوگا کہ بعض خاص حالات وصفات
اُن کے ایسے تھے جو پچھلے انبیاء میں سے
کسی کے نہ تھے (معارف القرآن)

امام راغب فرماتے ہیں، آیت کریمہ هَلْ
تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (کسی کو پہچانتا ہے تو
اسکے نام کا) یعنی اس کی کوئی نظیر جانتے
ہو جو اس کے نام کا مستحق ہو، یا اس کی
صفت سے متصف ہو کہ حقیقتاً اس کا
استحقاق رکھتا ہو، اور یہ معنی نہیں ہیں کہ
آپ کسی کو پاتے ہو جو اس کے نام سے
موسوم ہو۔ کیونکہ اللہ کے بہت سے
اسماء ہیں جن کا غیر پر بھی اطلاق ہوتا ہے
لیکن اللہ کے لئے جب اسکا استعمال ہو
تو وہ معنی نہیں ہوتے جو غیر کے لئے استعمال
کرتے وقت ہوتے ہیں (لغات القرآن)

اکثر اہلِ تفسیر کے نزدیک جس طرح
هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا میں لفظ سمی سے
مراد نظیر اور مثال کے ہیں اسی طرح یہاں
لَمْ نَجْعَلْ لَهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا میں بھی لفظ
سَمِیًّا سے مراد نظیر اور مثال ہے۔

قال مجاهد وغیرہ، سَمِيًّا : ای مثلاً
ونظیرًا (ماجدی از بحر) وقیل معناہ
لم نجعل لہ شبھًا ومثلاً کما قال اللہ
تعالیٰ ھل تعلم لہ سمیًّا ۔ ای مثلا
(معالم بغوی عن مجاھد ان سمیًّا بمعنی
شبیھًا وروی عن عطاء وابن جبیر
مثلہ (روح)

مولانا اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ
سمی کے معنی نظیر و مثل کے ہیں اس سورۃ
میں آگے آیت نمبر ۶۵ میں ہے، ھَلْ
تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ، کیا تم خدا کی کسی نظیر سے
آشنا ہو۔ یہ حضرت زکریا علیہ السلام کو
اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہر چند تم بوڑھے
ہو مگر تمہاری بیوی بانجھ ہے۔ بوڑھے مرد
اور بانجھ بیوی کے ہاں اولاد کی کوئی نظیر
موجود نہیں ہے لیکن ہماری مرضی یہ ہے کہ ہم
تمہیں ایسی بے نظیر اولاد دیں (تدبر)

ان المراد بالسمی النظیر کما فی قولہ ھَلْ
تَعْلَمُ لَہٗ سمیًّا (کبیر)

امام رازی فرماتے ہیں کہ آیت لَمْ نَجْعَلْ
لَہٗ من قبل سمیا میں پہلے معنی (یعنی ہمنام
ہونا) زیادہ انسب ہے کیونکہ لفظ سمی کو
مثل اور نظیر پر محمول کرنے سے اگرچہ مدح
وتعظیم کا فائدہ ہوتا ہے لیکن یہ ظاہری معنی

سے بلا وجہ کے عدول ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں اور آیت کریمہ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا میں ظاہری معنی سے عدول اس لئے ہے کہ جناب حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے کہ فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا، اور یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا صرف اس اسم سے مسمّیٰ ہونا کی عبادت کو مقتضی نہیں، بلکہ ایسی صفات ہیں جن کی کوئی نظیر اور مثال اس کائنات میں نہیں پائی جاتی (واللہ علم)

سَمِیٌّ کی اصل سَمِیْوٌ ہے واؤ کو یار سے بدل کر یار کو یار میں مدغم کر دیا گیا ہے (جمل)

عِتِيًّا : قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (آیت نمبر ۸) میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچا ہوا ہوں (ماجدی)، عِتِيّ کے معنی ہیں کسی شئے کا حد سے زیادہ متجاوز ہو جانا، قابو اور اختیار سے باہر ہو جانا۔ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا: یعنی بڑھاپے کی وجہ سے اس حد کو پہنچ چکا ہوں کہ مجھے اپنے اعضاء و جوارح اور اعصاب پر بھی قابو نہیں رہ گیا (تدبر)

عِتِيًّا، عتو سے مشتق ہے جس کے اصل معنی ہیں تأثر قبول نہ کرنا۔ مراد اس سے ہڈیوں کا خشک ہو جانا ہے (معارف)

عِتِيًّا: بوڑھا پھوس (ماجدی)

عَتَا يَعْتُوْ اعُتُوًّا و عِتِيًّا حکم عدولی کرنا، فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ تو انھوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی، اور آیت کریمہ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عتیًّا میں بعض نے کہا ہے کہ عتیًا مصدر ہے۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ عَاتٍ کی جمع ہے۔ اور العَاتی کے معنی ہیں سنگ دل اور اُجڈ،

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ عِتِيًّا کے معنی ہیں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ جانا اور ہڈیوں کا گودا خشک اور سوکھ جانا اور اس کی اصل عُتُوٌّ ناقص واوی ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ عِتِيًّا کی اصل عُتُوْوٌ ہے جیسا کہ قُعُوْدٌ ہے، توالی ضمتین اور دو واؤ کا اکٹھا ہونا چونکہ ثقیل سمجھا گیا ہے اسلئے حرف تار کو کسرہ دیا گیا اور حرف واؤ، یا سے بدل گیا۔ پھر دوسری واؤ کو بھی یار سے بدل کر یا، کو یار میں مدغم کر دیا گیا ہے عِتِيًّا ہو گیا (جمل)

اس تعلیل کے مطابق عتیا کو بضم العین عُتِيًّا پڑھا جائے گا۔ چنانچہ قرار سبعہ میں سے

اکثر نے اس کو بضم العین ہی پڑھا ہے، اور ابن مسعود نے بفتح العین یعنی عَتِیًّا پڑھا ہے (روح)

بعض حضرات نے عَتِیًّا کے بجائے عَسِیًّا حرف سین سے پڑھا ہے معنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیونکہ عَسَا یَعْسُوْا عُسُوًّا و عَسِیًّا کے معنی بھی وہی ہیں جو عَتَا یَعْتُوْا عُتُوًّا کے ہیں۔ عَسَا الشَّیْخُ کے معنی ہیں بوڑھا ہو گیا۔ اسم فاعل عاسی آتا ہے۔ وہ شخص جو طول عمر کی وجہ سے بڑھاپے کے اس درجہ کو پہنچ چکا ہو جسکے بعد توانائی کی کوئی امید نہ ہو۔

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

والعاسی ھو الذی غیرہ طولُ الزمان الی حال البؤس (الکبیر)

لَیْلٌ عاتٍ: سخت اندھیری رات جس میں روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آئے پھر اسی سے استعارہ کے طور پر عمر کے اس مرحلہ پر بھی بولا جانے لگا جہاں سوائے مایوسیوں کے کچھ نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنی عمر کے اس مرحلہ پر پہنچ چکا ہوں کہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے کوئی امید اولاد کی نہیں، لہٰذا میرا سوال صرف تیری قدرت کے بل بوتے پر ہے۔

سَوِیًّا: قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (آیت نمبر ۱۰)

اللہ نے فرمایا، بیشک تم تین راتیں بول سکو گے درانحالیکہ تم تندرست ہو گے (سَوِیًّا) کے معنی ہیں سالم۔ صحیح۔ غیر ناقص رَجُلٌ سَوِیٌّ۔ وہ آدمی جو خلقت کے اعتبار سے مکمل اور ہر عیب ونقص اور افراط و تفریط سے پاک ہو رَجُلٌ سَوِیٌّ اِسْتَوَتْ اخلاقُہٗ وخِلْقَتُہٗ عن الافراط و التَّفْرِیْط (راغب) سَوِیًّا کا لفظ اسلئے بڑھایا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ عدم قدرت علی التکلم کسی بیماری کی وجہ سے نہ ہوگی بلکہ ایسا اللہ کی طرف سے بطور معجزہ کے ہوگا۔ ذکر اللہ اور عبادت کے لئے زبان بالکل کھلی ہوئی تھی۔

آیت کے یہ معنی اہل لغت اور اہل تفسیر دونوں نے لئے ہیں۔ صاحب لسان العرب زجاج نحوی کا قول نقل کرتے ہیں کہ ای تمنع الکلام وانت سوِیٌّ لا اَخْرَس فتعلم بذالك ان اللہ قد وھب لك الولد۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں جمہور کا مسلک یہی ہے۔ سَوِیًّا: تکلم کی ضمیر سے

حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ حالٌ من فاعل تکلم (جمل) حال من فاعل تکلم (روح) وسَوِیًّا۔ منصوب علی الحال (لسان) ابن عباس سے ایک دوسرا احتمال بھی منقول ہے کہ سَوِیًّا: کا نصب حالیت کی بنا پر نہیں بلکہ صفت ہونے کی وجہ سے ہے اور اسکا تعلق لَیَالٍ کے ساتھ ہے یعنی بالکل پوری اور مکمل تین راتیں آپ لوگوں کے ساتھ بات چیت نہیں کرسکیں گے۔ وعن ابن عباس: ان سویا: عائد علی اللیالی ای کاملات مُسْتَوِیات فیکون صفۃ لثلاث (روح) اختلفوا فی معنی سویا فقال بعضہم۔ ھو صفۃ اللیالی الثلاث وقال اکثر المفسرین ھو صفۃ لزکریا (کبیر)

عَشِیًّا : سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا : (آیت نمبر ۱۱) اللہ کی پاکی بیان کرو صبح وشام

العَشِیُّ : زوال آفتاب سے لیکر طلوع فجر تک کا وقت ہے۔ اکثر اہل لغت کا قول یہی ہے اَلْعَشِیُّ من زوال الشمس الی الصباح (راغب) صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ بُکْرَۃً اور عَشِیًّا دونوں ظرف زماں ہیں علامہ حمید الدین فراہی صاحب مفردات القرآن

ہیں لکھتے ہیں کہ عشی سورج ڈوبنے سے پہلے کا وقت ہے، جبکہ سورج کی روشنی پھیکی پڑنے لگتی ہے۔ اور جن شہروں میں فضا صاف نہیں ہوتی وہاں دھوپ پیلی پڑ جاتی ہے۔ اور یہی نماز عصر کا وقت ہوتا ہے اسوقت میں قدیم زمانے سے لوگ نمازیں پڑھتے آئے ہیں حضرت داؤدؑ کے بارے میں ارشاد ہے سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ۔ یعنی ہم نے جناب داؤدؑ کے تابع کر دیا تھا پہاڑوں کو، وہ انکے ساتھ صبح وشام خدا کی پاکی بیان کرتے تھے، علامہ ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں لکھتے ہیں کہ عَشِیٌّ مفرد ہے عَشِیَّۃٌ کا، جیسے رَکِیٌّ مفرد ہے رَکِیَّۃٌ کا۔ یعنی عَشِیٌّ مفرد ہے عَشِیَّۃٌ اسکی جمع ہے۔ اور امام محمد بن احمد قرطبی بالکل اسکے خلاف فراء کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں کہ عَشِیٌّ جمع ہے عَشِیَّۃ کی۔ قال وقد یکون العشی جمع عشیۃ (قرطبی) اور تاج العروس میں بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عَشِیٌّ بغیر ھاء کے دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ اور عَشِیَّۃٌ ایک دن کے آخری حصہ کا نام ہے۔ اس اعتبار سے عَشِیٌّ کا ترجمہ شام اور عَشِیَّۃٌ کا

ترجمہ ایک شام ہونا چاہیئے (لغات القرآن) ابوالعالیہ کہتے ہیں بکرۃ سے مراد صبح کی نماز اور عشی سے مراد عصر کی نماز ہے (کبیر) ابوالہیثم کہتے ہیں کہ سورج کے زوال کے بعد جب سایہ مشرق کی طرف اور سورج مغرب کی طرف بڑھنے لگتا ہے وہ عشی ہے، ازہری کہتے ہیں زوال اور غروب کے درمیان کا وقت عِشی ہے (لسان العرب) عَشِیٌّ کی تصغیر علی غیر القیاس عُشَیْشِیَانٌ آتی ہے اور بعض کے نزدیک عشی کی تصغیر عُشَیَّانٌ ہے (لسان العرب) اور صاحب تاج العروس کی طرح ابن منظور صاحب لسان العرب نے لیث لغوی کا قول نقل کیا ہے۔ عشی بغیرھا کے، دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں اور عَشِیَّۃٌ ایک دن کے لئے بولا جاتا ہے، قال اللیث : العشی بغیرھاء اٰخر النھار فاذا قلت عَشِیَّۃٌ فھو لیوم واحدٍ (لسان)

اَلْحُكْمُ : وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ، (آیت نمبر ۱۲)

الحکم سے مراد حق و باطل میں امتیاز کی قوت و صلاحیت ہے یہی قوت و صلاحیت تمام علم و حکمت کی بنیاد ہے۔ یہ صلاحیت عام حالات میں سن رشد کے بعد ابھرتی ہے اور چالیس سال کی عمر میں پختہ ہوتی ہے لیکن حضرت یحیٰی پر اللہ کا یہ خاص فضل ہوا کہ ان کو یہ دولت گرانمایہ بچپن ہی میں مل گئی (تدبر)، اور بعض کے نزدیک حکم سے مراد نبوۃ ہے، امام رازی نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ بعض نے حکم سے مراد علم و حکمت اور عقل و فہم کی پختگی مراد لی ہے۔ حضرت یحیٰی ان تمام صفات میں کامل تھے۔ حَكَمَ يَحْكُمُ حُكْمًا کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کرنا۔

وَحَنَانًا : وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا :

حَنَانٌ کے معنی رقّتِ قلب اور رحمت و شفقت کے ہیں جو حضرت یحیٰی کو امتیازی طور پر دی گئی تھی (معارف)

الحَنِينُ۔ کسی چیز کی طرف مشفقانہ کھنچنا۔ کہا جاتا ہے حَنَّتِ الْمَرْاَۃُ والنَّاقَۃُ لِوَلَدِھَا، عورت اور اونٹنی کا اپنے بچّہ کا مشتاق ہونا اس اشتیاق کے ساتھ چونکہ کبھی آواز بھی ہوتی ہے اسلئے حنین اس آواز کو کہتے ہیں جسمیں اشتیاق اور شفقت پائی جائے رِیْحٌ حَنُوْنٌ۔ وہ ہوا جسمیں سرسراہٹ ہو۔ حنینٌ چونکہ معنی شفقت پر مشتمل ہوتا ہے اور شفقت میں ہمیشہ جذبہ ہوتا ہے اس لیے اس سے مراد رحمت لیجاتی ہے، حَنَانَيْكَ

میں تجھ سے رحم کی التجا کرتا ہوں ۔ یہ لبیک
اور سعدیک کی طرح تثنیہ بولا جاتا ہے ۔
(مفردات راغب) یہ حَنَّ یَحِنُّ کا مصدر ہے
وہ رقتِ قلب جس میں شفقت موجود ہو۔ علامہ
قرطبی نے نقل کیا ہے لفظ حنان واحد اور
تثنیہ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے بقول
ابو عبیدہ عرب کہتے ہیں، حَنَانک یا ربِّ
و حَنَانَیک یا ربّ ۔ دونوں کے معنی ایک
ہی ہیں ۔ یعنی یا اللہ میں تیری رحمت کی
التجا کرتا ہوں ۔ امرا القیس کہتا ہے ؎

ویَمنَحُهَا بنو شمجی بن جَرمٍ
مَعِیزَهم حَنَانَكَ ذَا الحنانِ (لسان)

اسی طرح ایک شعر میں کہتا ہے ؎

اَبَا مُنذِرٍ اَفنَیتَ فَاستَبقِ بَعضَنَا
حَنَانَیكَ بَعضُ الشَّرِّ اَهوَنُ مِن بَعضِ

ابن عباس کا قول بعض اہلِ تفسیر نے نقل
کیا ہے کہ اُنھوں نے فرمایا مجھے معلوم نہیں
کہ حَنَانًا کے کیا معنی ہیں ۔ و روی عن
ابن عباس انہٗ قال : واللہ ما ادری
ما الحنان (قرطبی)

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ حَنان کے معنی
محبت، ذوق، شوق اور سوز و گداز کے ہیں
اور یہ لفظ نہایت معروف و متداول الفاظ
میں سے ہے اسوجہ سے تعجب ہوتا ہے کہ ابن
عباس کی طرف بعض لوگوں نے یہ بات کس
طرح منسوب کر دی کہ انھوں نے فرمایا کہ مجھے
اس کے معنی معلوم نہیں (تدبر)

الحَنَّانُ ، بتشدید النون ، باری تعالیٰ کے اسمائے
حُسنیٰ میں سے ہے اور مُخفّف ، حَنَانٌ کے معنی
عطف و رحمت کے ہیں ۔ اور لفظ حَنَانٌ، رزق
اور برکت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے
حَنَّانَۃٌ وہ عورت جو اپنے خاوند کے ساتھ
محبت کرے ۔ حدیث میں ہے لَا تَزَوَّجَنَّ
حَنَّانَۃً وَّلَا مَنَّانَۃً ، ایسی عورت سے
نکاح مت کرو جو اپنے پہلے خاوند کی طرف
مائل ہو کیونکہ وہ تجھ سے محبت نہیں کرے گی
اور جو بات بات پر احسان جتاتی ہو ۔

حَنُوْنٌ مہربان اور حُنَیْنٌ طائف کے نواح
میں ایک مقام ہے ۔ وہی وہ مقام ہے جہاں
پر ۸ ہجری میں جنگ حنین واقع ہوئی
اور حَنَانَۃٌ مُخفّف نجف کے پاس ایک
مقام کا نام ہے ۔

امام قرطبی اور صاحب روح المعانی نے
ابن عباسؓ سے اسکے معنی رحمت اور شفقت
کے نقل کئے ہیں ۔ یہ معنی حسن ۔ ضحاک
قتادہ ۔ عکرمہ ۔ فراء ۔ ابو عبیدہ اور اکثر

مفسرین نے اختیار کئے ہیں اور اسکا اصل
مادہ حَنٌّ ہے جبکا معنی کسی کا اشتیاق
کرنے کے ہیں۔ وھو فی الاصل من حَنَّ
اذا ارتاح واشتاقَ ثم استعمل فی
الرحمۃ والعطف (روح)
الحنانُ: من اسماء اللّٰہ عزوجل قال
ابن اعرابی الحنّانُ بتشدید النون،
بمعنی الرحمۃ، قال ابن الاثیر الحنّان
الرحیم بعبادہٖ فعّالٌ من الرحمۃ للمبالغۃ
والحَنَانُ (مخفف) الرحمۃ والعطف،
والحَنَانُ الرزق والبرکۃ (لسان العرب)

عَصِیًّا: وَلَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا
(آیت نمبر ۱۴) اور وہ سرکش و نافرمان نہ تھے
عَصِیًّا: بڑا نافرمان، بہت بے حکم، بد چلن
مَعْصِیَۃٌ اور عِصْیَانٌ سے فَعِیْلٌ کے وزن
پر یا مفعولٌ کے وزن پر صفت مشبّہ یا
مبالغہ کا صیغہ ہے۔ علامہ قرطبی امام اللغۃ
کسائی کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ عَصِیًّا و
عاصٍ بمعنی واحد، یعنی عَصِیٌّ اور عاصٍ دونوں
کے معنی ایک ہی ہیں اس صورت میں صفت
مشبّہ کا صیغہ ہوگا۔ لیکن امام رازی فرماتے ہیں
کہ عَصِیًّا کا لفظ عاصی سے بلیغ تر ہے جیسا
کہ علیم عالم سے زیادہ بلیغ ہے۔ عَصِیًّا
وَھُوَ اَبْلَغُ مِنَ العَاصِی کما ان العلیم
ابلغ من العالم (کبیر) اس اعتبار سے
یہ مبالغہ کا صیغہ ہوگا۔ ابو الحیان اندلسی
اپنی کتاب البحر المحیط میں فرماتے ہیں کہ
عَصِیٌّ کے معنی عاصی نافرمان کثیر العصیان
یعنی ایسا نافرمان جو بڑی نافرمانی کرے،
اصل میں یہ عَصُوْیٌ بروزن مفعُوْلٌ ہے
جو کہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے
کہ فَعِیْلٌ کے وزن پر ہو (لغات القرآن)

اِنْتَبَذَتْ: اِنْتَبَذَتْ مِنْ اَھْلِھَا
مَکَانًا شَرْقِیًّا (آیت نمبر ۱۶) جب
وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر ایک
شرقی مکان میں چلی گئیں۔
اِنْتَبَذَتْ، نَبْذٌ سے مشتق ہے جس کے اصلی
معنی دور ڈالنے اور پھینکنے کے ہیں۔ اِنتباذ
افتعال کے معنی مجمع سے ہٹ کر دور چلے
جانے کے ہیں (معارف) یہاں اس سے مراد
یہ ہے کہ حضرت مریم ہیکل کے مشرقی جانب
میں معتکف ہوگئیں۔ مشرقی جانب میں
اسوجہ سے کہ ہیکل کا جو حصّہ عورتوں کے اعتکاف
وعبادت کے لئے خاص تھا وہ مشرقی سمت
میں ہی تھا۔ نصاریٰ نے اپنا قبلہ جو
بیت المقدس کو بنایا ہے اسمیں بڑا دخل

اسی چیز کو ہے وہ ہیکل کی مشرقی سمت کو اپنی خاص سمت سمجھتے ہیں (تدبر)

اِنْتَبَذَتْ، ای تَنَحَّتْ وتَبَاعَدَتْ والنَّبْذُ الطَّرحُ وَالرَّمْیُ والانتباذ الاعتزال والانفراد (قرطبی)

وقال صاحب الکشاف: الانتباذ: الاعتزال والانفراد... وقیل - ان النصاری اتخذت المشرق قبلةً لانتباذ مریم مکانًا شرقیًا (کشاف)

نَبَذْتُ الشئی کے معنی کسی چیز کو پھینک دینے کے ہیں - محاورہ ہے نَبَذْتُهٗ نبذ النّعلِ الخَلَقِ - میں نے اس کو پرانے جوتے کی طرح پھینک دیا - اسی سے نبیذ ہے کیونکہ اسے بھی برتن میں ڈالا جاتا ہے - یہ فعیل بمعنی مفعول ہے - صَبِیٌّ مَنْبُوْذٌ - وہ بچہ جو راستہ میں پڑا ہو، لیکن اس لحاظ سے کہ وہ پھینکا گیا ہو منبوذ ہے، اور اس لحاظ سے کہ وہ اٹھایا جاتا ہے لقیط کہلاتا ہے -

اسی سے منابذہ ہے، حدیث میں ہے نہی عن المنابذة فی البیع، بیع میں منابذۃ سے آپؐ نے منع فرمایا اور منابذہ یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق سے کہے کہ جیسا میں اپنا کپڑا تیری طرف پھینکدوں یا پتھر اور کنکریاں وغیرہ پھینکدوں تو بیع مکمل ہو گئی - اِنْتَبَذَتْ منهٗ - میں اُن سے جُدا ہو کر ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گیا

وقال الرازی - النبذ - اصله الطرح والالقاء والانتباذ افتعال منه (کبیر)

سَوِیًّا: السّوِیُّ: اسے کہتے ہیں جو مقدار اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا - پوری تین راتیں - رَجُلٌ سَوِیٌّ وہ آدمی جو خُلُق اور خلقت دونوں کے لحاظ سے معتدل ہو - افراط و تفریط سے محفوظ ہو - یہاں بَشَرًا سَوِیًّا سے مراد مکمل انسان ہے - چونکہ جناب مریم کے لئے حضرت جبرئیل کو اصلی شکل میں دیکھنا ممکن نہ تھا - سَوِیًّا، ای مستوّی الخلقة لانها لم تکن لتطیق ان تنظر جبرائیل فی صورته (قرطبی)

(بَشَرًا سَوِیًّا) سَوِّیُ الخلق کامل البُنْیَةِ لَمْ یفقد من حسان نعوت الآدمیّة شیئًا (روح)

ابو الہیثم کہتے ہیں سَوِیٌّ فَعِیْلٌ کے

وزن پر بمعنی مفتعل یعنی مُسْتَوِیٌ ہے جو خلق اور عقل کے اعتبار سے انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ قال ابو ھیثم: السّوِیُّ فعیلٌ فی معنی مفتعلٍ ای مستوٍ، قال والمستوی التّام فی کلام العرب الذی قد بلغ الغایۃ فی شبا وتمام خَلْقِہٖ وعقلہ (لسان) اس تعریف کے اعتبار سے بَشَرًا سَوِیًّا کا ترجمہ خوبصورت جوان ہوگا اس کی مزید تشریح چند الفاظ سے پہلے دیکھیں ثلاثَ لَیَالٍ سَوِیًّا کے تحت۔

تَقِیًّا: اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا: اگر تو خدا ترس ہے (ماجدی)، تَقِیًّا، پرہیزگار متقی، یہ وقایۃٌ سے ہے جس کے معنی ہر اُس چیز سے حفاظت کرنے کے ہیں جو ایذا دے یا ضرر پہنچائے۔ فعیل کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ فعیل بمعنی مفعولٌ بھی ہو سکتا ہے جس سے ڈرایا جائے، وقیل تَقِیٌّ فعیل بمعنی مفعولٍ ای ان کنت ممّن یُتّقی منہٗ (قرطبی) صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ تقوٰی سے صیغہ وصف کا ہے اور جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ تقی کسی فاسق و فاجر کا نام تھا یہ درست نہیں، فالتّقیُّ وصفٌ من التقوٰی۔ وقول من قال انّہٗ اسم رجلٍ صالحٍ اوطالحٍ لیس بسدیدٍ (روح)

تَمَثَّلَ: فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا۔ (آیت نمبر ۱۷) تمثّل مثال سے ہے۔ بتکلف مثال بننا، کسی کی نقل کرنے کی کوشش کرنا۔ مشتق من المثال وَاصلہ ان یتکلف ان یکون مثال الشیٔ، والمراد تَتَصَوَّرَ لَهَا (روح)

بَغِیًّا: وَلَمْ اَكُ بَغِیًّا (آیت ۲۰) یعنی بدکار اور چھنال عورت کو کہتے ہیں (تدبر) بَغْیٌ سے صفت مشبہ (لغات القرآن) البَغْیُ کے معنی کسی چیز کی طلب میں درمیانہ روی کی حد سے تجاوز کرنے کی خواہش کرنے کے ہیں، خواہ تجاوز کر سکے یا نہ کر سکے۔

بَغَیْتُ الشّیٔ وابتغیتُہٗ، کسی چیز کے حاصل کرنے میں جائز حدود سے تجاوز کرنا۔ اور بَغْیٌ کے معنی ظلم و تعدی، حد اور کسی اہم معاملہ وغیرہ کے آتے ہیں۔ وَالبغیُ التعدی وبغی الرّجل علینا بَغْیًا عَدَلَ عن الحق واستطال قال الفراء: البغی: الاستطالۃ

علی الناس (لسان) ومعنی البَغْیِ قصد الفساد : یعنی فساد اور ناجائز کام کا قصد کرنا، اور الفِئَۃُ الباغیۃُ، وہ جماعت جو اطاعتِ خلیفہ سے منحرف ہو۔

الفئۃ الباغیۃُ : ھی الظالمۃ الخارجۃ عن طاعۃ الامام العادل، حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تَقْتُلُہُ الفِئَۃُ الباغِیَۃُ اے عمار تمہیں ایک باغی جماعت قتل کریگی۔

بَغْیٌ کے اصل معنی حد سے تجاوز کرنیکے ہی زیادہ مستعمل اور مشہور ہیں، اصل البغی مجاوزۃ الحد، حضرت ابن عمر نے ایک صاحب کو فرمایا کہ میں تجھے ناپسند کرتا ہوں تو اُسنے پوچھا، آپ مجھے کیوں ناپسند کرتے ہیں؟ تو ابن عمر فرماتے ہیں لِاَنَّکَ تَبْغِیْ فِی اَذَانِکَ، یعنی تو اذان میں حد سے بڑھ جاتا ہے، حروف کو خواہ مخواہ بڑھاتا گھٹاتا رہتا ہے۔ بَغَی الوالی، حاکم کا حد سے تجاوز کرنا، ظلم کرنا، صاحب لسان نے ایک قول نقل کیا ہے کہ ہر وہ کام جو حد سے بڑھا ہوا ہو بَغْیٌ ہے، وکل مجاوزۃ وافراط علی المقدار الذی ھو حد الشیٔ بغی، حسد کو بھی بَغْیٌ اس لئے کہتے ہیں کہ حاسد بلاوجہ کے محسود سے ازالۂ نعمت کی فکر میں پڑا رہتا ہے کہ اس سے زائل ہوکر یہ نعمت یا تو میرے پاس آجائے یا پھر اسکے پاس بھی نہ رہے حسد چونکہ ایک بدترین قسم کا ظلم ہے اس لئے ہر ظلم کو بَغْیٌ کہتے ہیں۔ لیکن ہر بغی کا ظلم ہونا ضروری نہیں ہے۔ چونکہ بغی محمود بھی ہوتی ہے اور مذموم بھی۔ اگر حدودِ فرض سے بڑھ کر سنن ونوافل تک پڑھتا ہے تو یہ بغی محمود ہے اور اگر حق سے تجاوز کرکے باطل اور شبہات میں پڑجانا چاہے تو یہ مذموم ہے، اور بَغِیٌّ کا لفظ خاص کسبیہ اور زانیہ عورت کے لئے بولا جاتا ہے۔ عورت چاہے باندی ہو یا آزاد، اور باندی پر لفظ بَغِیٌّ کا اطلاق ہر حال میں ہوتا ہے چاہے وہ فاجرہ ہو یا نہ ہو چونکہ باندی ہونیکی وجہ سے اس کے حقوق آزاد عورت سے کم ہوتے ہیں ابوعبیدہ کے نزدیک بَغِیٌّ کی جمع بغایا ہے۔ البغاءُ کے معنی فجور اور گناہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَاءِ اپنی باندیوں کو بُرائی پر مجبور نہ کرو۔ اَلْبِغْیَۃُ اور البُغْیَۃُ : وہ چیز جس کے حصول کی کوشش کیجائے۔ الباغی تلاش کرنے والا[1]

[1] ابن فارس نے لکھا ہے کہ یہ لفظ دو مختلف معنوں پر دلالت کرتا ہے (۱) طلب شئی (۲) بگاڑ اور فساد کی کوئی نوعیت۔ مثلاً جب کہیں کہ بغیت الشئ تو اسکے معنی ہونگے میں نے کسی چیز کو طلب کیا، اور جب کہیں کہ بغی الجرح تو اسکا مطلب ہوگا زخم بگڑ گیا۔

قَصِيًّا : مَكَانًا قَصِيًّا (آیت ۲۲) دُور جگہ (ماجدی) قَصِیٌّ کے معنی دُور کے ہیں، اس دوری کی جگہ سے کونسی جگہ مراد ہے، اس کی کوئی تصریح نہیں لیکن انجیلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے بعد بیت اللحم چلی گئیں (تدبر) قَصَوْتَ عَنْہُ کے معنی ہیں، میں اس سے دُور رہا اور اَقْصَيْتُہٗ میں نے اس کو دُور کر دیا۔ المکان الاقصٰی، دُور دراز جگہ۔ اَقْصَى المدینۃ۔ شہر کا پرلا کنارہ الْقَصِيُّ وَالْقَاصِيُ : البعید والجمع اَقْصَاءٌ فیہما کشاھد واشھاد ونصیر وانصار (لسان) قصا سے فعیلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔
قُصْوٰی۔ اسم تفضیل مؤنث اور اَقْصٰی مذکر ہے

مَخَاضُ : فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ (آیت نمبر ۲۳) المَخَاضُ : اسم۔ درد ولادت، درد زہ مصدر، درد زہ ہونا، درد ولادت ہونا، مخضت الحامل مخاضًا، حاملہ کو درد ولادت ہوا۔ تمخض الولدُ (تفعل) باہر نکلنے کے لئے بچہ نے پیٹ کے اندر حرکت کی (لغات القرآن)
مَخَضَ (ن۔ ف۔ ض) مَخْضًا۔ اللَّبَنَ : دودھ بلونا۔ صفت مفعولی مَخِيضٌ وَمَخْوضٌ مَخَضَ الشَّیْءَ، کسی چیز کو زور سے ہلانا، مَخَضَ الرَّأیَ، رائے پر خوب غور کرنا، تَمَخَّضَتِ السماءُ، بادل برسنے کے قریب ہوا، تَمَخَّضَ الدہر بالفتنۃ، زمانہ نے فتنہ وفساد برپا کر دیا، وَالمَخَاضُ وَجَعُ الولادۃِ، وکل حامل ضربھا الطلق فھی ماخِضٌ والجمع مَوَاخِضُ ومَمَخَّضٌ (لسان)

فَاَجَآءَ : اَجَاءَ اِجَاءَةٌ سے ہے جس کے معنی لانے اور آنے پر مجبور کرنے کے ہیں، فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ درد زہ انہیں مجبورًا جذع نخلہ کی طرف لے آیا۔ اَجَاءَۃٌ لانا۔ آنے کو لازم ٹھہرنا، بعض نے یہاں اَجَاءَ کے معنی اِلْجَاءٌ کے بھی کئے ہیں۔ مگر یہ جَاءَ لازم سے ہمزہ تعدیہ کا لگا کر متعدی بنایا گیا ہے۔ مجبور اور لاچار کر دینا، زهیر کا شعر ہے ؎

وَجَارٍ سَارَ مُعْتَمِدًا اِلَيْنَا
اَجَاءَتْهُ المخافَةُ وَالرَّجَاءُ

اَجَاءَهَا بمعنی اِضطرھا وَھُوَتَعْدِیَۃُ جَاءَ بالھمزۃ یقال جَاءَہٗ بہ وَاَجَاءَہٗ الیٰ مواضع کذا (قرطبی)

صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ اَجَاءَ : منقول

من جاء الآن استعمالہٗ قد تغیّر بعد النقل الی معنی الالجاء (کشاف)

جَذْعٌ : درخت کا تنہ، ٹہنی، شاخ، جمع جذوعٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے، وَلَاُصَلِّبَنَّکُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ، اور میں تمہیں کھجور کے درختوں پر سولی چڑھاؤں گا۔ جَذْعَۃٌ تنے کی طرح کسی کو کاٹ دینا، فُلَانٌ فی ھذا الامر جَذَعٌ فلاں اس کام میں نو آموز ہے۔

بعض نے کہا کہ یہ درخت سوکھا ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جذع النخلہ کہا ہے کیونکہ اگر درخت سرسبز و شاداب ہوتا تو الیٰ النخل فرمایا جاتا۔ امام قرطبی لکھتے ہیں کہ والجذع : ساق النخلہ الیابسۃ فی الصحراء الذی لاسعف علیہ ولاغصن ولھذا لم یقل الی النخلۃ (قرطبی) لیکن لفظ جُذُوعٌ میں سوکھا ہونے کے معنی نہیں ہیں۔ جڑ اور شاخوں کے درمیان کے تنہ کو جذعٌ کہا جاتا ہے خواہ سوکھا ہو خواہ سبز۔ اور خود شاخ اور ٹہنی پر جذع کا اطلاق ہوتا ہے والجذع مابین العرق و متشعب الاغصان من الشجرۃ وقد یقال للغصن ایضا (روح) والجذع : واحد جذوع النخل وقیل ھو ساق النخلۃ والجمع اَجْذَاعٌ وجذوعٌ۔ وقیل لایتبینُ لھا جذع حتی یبین ساقھا (لسان) اور الجذع جانور کو بھوکا رکھنا اس کو چارہ وغیرہ نہ ڈالنا، عجاج کہتا ہے ؎

کانہ من طول جذع العفس
وَرَملان الخمس لجذ الخمس
یُنحتُ من اقطارہ بفاس

(لسان)

اور الجذع من البھائم : اونٹ گائے، بھیڑ بکری کا چھوٹا بچہ، اونٹ کا جذع اسوقت کہلاتا ہے جب وہ پانچ سال کا ہو جائے اور بھیڑ بکری کا ایک سال کا،

اور جَذَعْتُ بَیْنَ البعیرین : دو اونٹوں کو ایک ہی رسی سے باندھنا اور جَذَاعُ الرجلِ آدمی کی قوم، برادری۔ مخبل شاعر زبرقان کی ہجو کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تمنّی حُصَیْنٌ اَنْ یَسُوْدَ جِذَاعَہٗ
فامسٰی حُصَیْنٌ قَدْ اَذَلَّ واَمْھَرَ (لسان)

ترجمہ : حصین تمنّی کرتا ہے کہ اس کی قوم سردار بن جائے۔ پس حصین تو ذلیل اور رسوا ہے۔

نَسْيًا : قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (آیت ۲۳)
اور وہ بولیں کاش میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی (ماجدی)
نَسْيًا کے معنی ہیں کہ میں اس حقیر چیز کے بمنزلہ ہوتی جس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اگرچہ وہ بھولی ہوئی نہ ہو۔ پھر بھولی بسری ہوئی چیز کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے مَنْسِيًّا کا لفظ لایا گیا ہے کیونکہ نَسْيٌ کے معنی اُس معمولی چیز کے ہیں جو درخور اعتنا نہ ہو اور اسکا فراموش ہونا ضروری نہیں
النَّسِيُّ : وہ معمولی چیزیں جن کو آدمی بھول جاتا ہے۔ عرب کا مقولہ ہے، اِحْفَظُوْا اَنْسَاءَكُمْ، کوچ کے وقت اپنی معمولی چیزوں کی حفاظت رکھو۔
مَنْسِيٌّ : وہ چیز جسکو بھلا دیا جائے مفعول کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جناب مریم علیہا السلام کرب و اضطرار کی وجہ سے فرماتی ہیں کہ، کاش اس وقت سے پہلے ہی میں مر مٹ چکی ہوتی اور لوگوں کے ذہنوں سے میری یاد بھی محو ہو چکی ہوتی۔
اور نِسْيًا بالکسر کے معنی کے وہ کپڑے جن کو عورت پھینک دیتی ہے، بعض حضرات نے نِسْيًا مَنْسِيًّا پڑھا ہے اس صورت میں اسکے یہ معنی ہونگے کہ میں ان خرقوں کی طرح ہوتی جن کو پھینک کر بھول جایا کرتے ہیں،
نَسِيَ يَنْسَىٰ نِسْيَانٌ نِسَاوَةٌ وَنَسْوَةٌ سب مصادر ہیں۔ فراموش کردہ۔ لوگوں کی یاد سے بھی غائب۔ نَسْيٌ فراموش کردہ یا بھول جانے کے قابل۔ نَسِيٌّ بہت بھولنے والا، اور بھولا بسرا نا قابل شمار اِنْسَاءٌ! کسی کی یاد سے کسی بات کو فراموش کرا دینا
وَالنَّسِيُّ فِى اللغة كل ما اُلْقِيَ وَنُسِيَ ولم يذكر لحقارته (بغوی)
النَّسِيُّ فى كلام العرب الشئ الحقير الذى شانه ان ينسى ولا يتألم لفقده كالوتد والحبل للمسافر ونحوه (قرطبی)
وقال الفراء النَّسِيُّ ما تلقيه المرأة من خرق اعتلالها (ایضا)
ابن الانباری کا قول ہے کہ نِسْيٌ بالکسر اس چیز کے لئے بطور اسم ہے جس کو بھلا دیا جاتا ہے جیسا کہ نِقْضٌ اسم ہے اس چیز کے لئے جسکو توڑ دیا جائے، منہدم کر دیا جائے اور نَسْيٌ بالفتح مصدر ہے جو اسم کے قائم مقام ہے (روح)
محمد بن کعب القرظی نے اسکو نِسْئًا

نون کے کسرہ اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے (القرطبی ص۹۳ جلد ۱۱)

سَرِيًّا : قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (آیت نمبر ۲۴)

سَرِیٌّ چھوٹے چشمہ کو کہتے ہیں (تدبر) لفظ سَرِیٌّ کے لغوی معنی چھوٹی نہر کے ہیں۔ اس موقع پر حق تعالیٰ نے ایک چھوٹی نہر کی صورت میں اپنی قدرت سے بلا واسطہ یا جبرئیل کے ذریعہ چشمہ جاری کر دیا، دونوں طرح کی روایتیں ہیں (معارف)

ثعلب کہتے ہیں سَرِیٌّ غَنِیٌّ کی طرح بمعنی نہر ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ بمعنی جدول ہے یہ قول ابن عباس اور اہل لغت کا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کی تفسیر اس چھوٹی نہر سے کی ہے جو نخلستان کی طرف رواں ہو۔ جدول کو سَرِیٌّ اس لئے کہتے ہیں کہ پانی اسمیں سیر کرتا ہے اس معنی کے لحاظ سے یہ سَرٰی یَسْرِی سے ماخوذ ہوگا اور اسکا لام کلمہ ی ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ: وسمی الجدول سَرِيًّا لان الماء یسری فیہ فلامہ علی ھذا المعنی یاء (روح)

والنھر یسمی سَرِيًّا کان الماء یسری فیہ (قرطبی)

حسن بصری ابن زید اور جبائی وغیرہ سے مروی ہے کہ سَرِیٌّ سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور یہ سَرْوٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی رفعت اور بلندی کے ہیں جیسا کہ امام راغب اور قرطبی وغیرہ نے ذکر کیا ہے اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہونگے تیرے نیچے تیرے رب نے ایک بلند مرتبہ لڑکا پیدا کر دیا ہے اس معنی کے لحاظ سے اس کا لام کلمہ واؤ ہے (روح المعانی صفحہ ۸۳ جلد ۹ طبع ملتان)

والسَّرِیُّ من الرجال العظیم الخصال السید - قال الحسن کان واللہ سَرِيًّا من الرجال - ویقال : سَرِیَ فلانٌ علی فلان ای تکرّم (قرطبی)

السَّرِیُّ : اَلسید الشریف، یقال : سَرُوَ یَسْرُوْ وسَرَی الیسار و سَرِیَ یَسْرٰی : ای شرف وساد (معجم الفاظ القرآن)

هُزِّيْ : وَهُزِّيْ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ (آیت نمبر ۲۵)

اور ہلا اپنی طرف کھجور کی جڑ - کھجور کے تنے کو حضرت مریم کا ہلانا محض رحمت

الٰہی کے ظہور کا ایک بہانہ تھا۔ ورنہ ظاہر ہے
کہ ان کی قوتِ بازو اتنی کہاں کہ وہ کھجور کے
درخت کو ہلا دیں۔
هُزِّی واحد مؤنث حاضر امر کا صیغہ ہے۔
بمعنی تو ہلا۔ الھَزُّ کے معنی ہیں کسی چیز
کو زور سے ہلانا ہیں جیسے هَزَزْتُ الرُّمْحَ،
میں نے نیزے کو زور سے ہلایا۔
اِهْتَزَّ۔ باب افتعال اسکا مطاوع ہے۔
اسی طرح هَزَزْتُهٗ فُلَانًا للعطاء، کے معنی ہیں
میں نے فلاں کو بخشش کے لئے حرکت دی
یعنی وہ خوشی سے جھومنے لگا۔ قرآن پاک
میں ہے۔ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ
جب اسے دیکھا تو وہ اس طرح ہل رہا تھا
(گویا وہ عصا) سانپ ہے (راغب)
هِزَّةٌ خوشی خوش مزاجی، دل کی شگفتگی
ہانڈی کے اُبال کی آواز۔ هَزِيْزٌ آواز
اور هُزْهُزٌ اور هَزْهَازٌ: خوب جاری
پانی۔ مَاءٌ هُزْهُزٌ صاف و شفاف پانی
متعدی لنفسہ اور متعدی بحرف الباء دونوں
طرح استعمال ہوتا ہے۔ هَزَّهٗ و هَزَّبِهٖ
اسکو ہلایا۔ هَزَّ يَهُزُّ هَزًّا: هَزَّ الشَّئَ
و بالشئ: چیز کو حرکت دینا۔ هَزَّ مِنْ
عِطْفِ فُلَانٍ: کام کے لئے اُبھارنا۔

اِهْتَزَّ حرکت میں آنا۔ هُوَ يَهْتَزُّ لِلْمَعْرُوْفِ
وہ اچھے اعمال پر خوش ہوتا ہے حدیث
میں ہے اِهْتَزَّ الْعَرْشُ لموت سَعْدٍ:
حضرت سعد بن معاذ کے مرنے سے عرش
الٰہی خوشی سے جھوم اُٹھا کہ ایک سعید روح
آرہی ہے۔

تُسٰقِطْ: تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا،
(آیت نمبر ۲۵) تُسٰقِطْ۔ وہ گرائیگی مُسَاقَطَةٌ
سے، جس کے معنی گرانے کے ہیں مضارع کا
صیغہ واحد مؤنث غائب ہے (لغات القرآن)
السُّقُوْطُ، مصدر ہے جسکے معنی ہیں کسی چیز
کا اوپر سے نیچے کی طرف گرنا۔ مثلاً کسی انسان
کا چھت سے گرنا، یا بڑھاپے کی وجہ سے
نیچے کو جھک جانا۔ تُسٰقِطْ یہ روایت حفص ہے
دوسری روایت تَسَّاقَطُ ہے اسکی اصل تَتَسَاقَطُ
ہے۔ ایک تاء کو سین میں مدغم کر دیا گیا ہے
اور حمزہ نے تَسَاقَطُ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے
اس میں حرف تاء کو حذف کر دیا گیا ہے
اور چوتھی قرات تَتَسَاقَطُ ہے اسمیں دونوں
حرفوں کو ظاہر کر کے پڑھا گیا ہے یعنی ہر دو
تاء کو اصل پر پڑھا گیا ہے اور پانچویں قرأت
يَسَّاقَطْ ہے۔ اسمیں حرف یاء علامت
غیب ہے۔ اور نفس کلمہ کی تاء کو سین میں

مدغم کر دیا گیا ہے اس کی اصل یَتَسَاقَطُ ہے
بعض نے تُسْقِطُ(۶) ۔ تَسْقُطُ(۷) ۔ یُسْقِطُ(۸) اور
یَسْقُطُ(۹) پڑھا ہے ۔ یہ کل نو قراءتیں ہیں
جسمیں تار کی صورت میں فاعل نخلۃ اور یار
کی صورت میں جِذْعٌ ہو گا (کشاف، قرطبی)

رُطَبًا : رُطَبًا جَنِیًّا (آیت نمبر ۲۵)

رُطَبٌ، تازہ خرما ۔ تازہ کھجوریں، پکی
کھجوریں رُطَبَۃٌ واحد اور رِطَابٌ اور اَرْطَابٌ
جمع الجمع ہے ۔ رُطَبٌ کا لفظ تر و تازہ اور
پختہ کھجوروں کے لئے مخصوص ہے اَرْطَبَ
النخلُ کے معنی ہیں درخت خرما پکی
کھجوروں والا ہو گیا ۔ اسمیں صاحب مأخذ
ہونے کا خاصہ پایا جاتا ہے جیسے اَثْمَرَ اور
اَجْنٰی میں ہے ۔ محاورہ ہے اَرْطَبْتُ
الفرس و رَطَّبْتُہٗ میں نے گھوڑے کو
تازہ گھاس کھلائی اور رَطِبَ الْفَرَسُ باب
سَمِعَ سے لازم ہے ۔ گھوڑے نے تازہ گھاس
کھائی ۔ (راغب) وفی الصحاح : الرُّطَبُ
من التمر معروف الواحدۃ رُطَبَۃٌ و
جمع الرطب رِطَابٌ و اَرْطَابٌ ایضًا
مثل رُبَعٍ و رِبَاعٍ و جمع الرُّطَبَۃِ
رُطَبَاتٌ و رُطَبٌ (لسان)

جَنِیًّا : تازہ چنا ہوا میوہ جَنْیٌ سے
فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے
جَنَیْتُ الثَّمَرَۃَ جَنْیًا و اَجْتَنَیْتُھَا،
میں نے درخت سے پھل توڑا، اَلْجَنْیُ و
الجَنٰی ۔ چُنے ہوئے پھل ۔ چھتہ سے نکالا
ہوا شہد ۔ لیکن عام طور پر جَنْیٌ تازہ پھل
کو کہتے ہیں ۔ قرآن پاک میں ہے، وَجَنَا
الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ دونوں باغوں کے میوے
قریب جھک رہے ہیں ۔ اَجْنَی الشَّجَرُ
درخت کے پھل پک گئے اور توڑنے کے قابل
ہو گئے ۔ اَجْنَتِ الْاَرْضُ زمین زیادہ پھلوں
والی ہو گئی ۔ پھر اسی سے یعنی پھل توڑنے
کے معنی سے بطور استعارہ کے جَنٰی فلانٌ
جِنَایَۃً گناہ اور جرم کرنے کے معنی میں استعمال
ہوتا ہے (راغب)

جَنٰی یَجْنِیْ (ض)، جَنْیًا و جَنٰی صفت فاعل
جانٍ جمع جُنَاۃٌ و اَجْنَاءٌ مؤنث جَانِیَۃٌ
جمع جوانٍ و جانیات ۔ الجَنٰی ۔ چنا ہوا پھل
سونا ۔ شہد، اَلْمَجْنٰی مصدر میمی وہ جگہ جہاں
سے پھل توڑا جائے ۔ جس سے پھل توڑا جائے
جیسے درخت وغیرہ اسکی جمع مجانٍ آتی ہے (منجد)
فراء کہتے ہیں کہ جَنِیٌّ اور مَجْنِیٌّ دونوں کے معنی
ایک ہیں جیسے قتیل اور مقتول اور جریحٌ اور
مجروحٌ اور فراء کے علاوہ دوسرے بعض

حضرات کا قول یہ ہے کہ اَلْجَنِیُّ ان کھجوروں کو کہا جاتا ہے جو ایک درخت سے توڑی اور چُنی جائیں (قرطبی)

اصل میں ہر اُس چیز کو جو چُنی جائے جَنیٰ کہا جاتا ہے اور شہد بھی چونکہ چھتوں سے چُنی اور نکالی جاتی ہے اسلئے جَنیٰ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے، حتیٰ کہ کپاس وغیرہ پر بھی جنی کا اطلاق ہوتا ہے۔ وَالجنیٰ کُلّ ما اجْتُنِیَ حتیٰ القطن والکماۃ ..... وَالجَنِیُّ: الثَّمَرُ المُجْتَنیٰ مادام طرِیًّا (لسان) یعنی تازہ پھل،

تَرَیِنَّ : فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ

(آیت نمبر ۲۶) تَرَیِنَّ، صیغہ واحد مؤنث حاضر ہے رؤیۃٌ سے: تو دیکھے۔ نون تاکید ثقیلہ ہے۔ یہ صیغہ تقریباً آٹھ یا نو ادوار سے گزر کر تَرَیِنَّ بنا ہے اسکی اصل تَرْءَ یِیْنَ ہے اور اسکا وزن تَفْعَلِیْنَ ہے۔ ہمزہ جو کہ اسکا عین کلمہ ہے حذف کر کے اسکی حرکت واؤ کو دیدی جو اصل میں فا کلمہ ہے یہی تعلیل ترٰی میں ہوئی ہے۔ اب صیغہ کی صورت تَرَیِیْنَ ہو گئی ہے۔ پھر یا متحرک ما قبل مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے بدل گئی اب دو ساکنوں کا اجتماع ہو گیا، ایک تو الف جو یار سے بنا، اور دوسری یار تانیث تو التقائے ساکنین کی وجہ سے الف کو گرا دیا گیا، اب صیغہ کی صورت تَرَیْنَ ہو گئی۔ پھر حرف شرط اِمَّا جو اِنْ اور مَا سے مرکب ہے ان پر داخل ہوا تو نون اعرابی گر گیا۔ اب صیغہ کی صورت تَرَیْ رہ گئی۔ پھر نون تاکید ثقیلہ اس پر داخل ہوا تو حرف یار کو جو یار تانیث ہے، اجتماع ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیدیا گیا چونکہ نون ثقیلہ دو نونوں کے قائم مقام ہوتا ہے۔ پہلا ساکن اور دوسرا متحرک اب صیغہ تَرَیِنَّ ہو گیا۔ قرطبی صفحہ ۹۷ جلد ۱۱، جمل صفحہ ۵۹ جلد ۳، حاشیہ سراج الارواح صفحہ ۶۳۔

صَوْمًا : نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا

لفظ صَوم یہاں صَمْتًا کے معنی میں ہے مراد خاموش رہنا ہے یہ صوم سکوت پہلے ادیان میں جائز رہا ہے اسلامی شریعت میں اسکا جواز منسوخ ہو گیا ہے صوماً ای صَمْتًا ..... ونھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صوم الصمت (کشاف)

قُولِی : یہاں قول بمعنی اشارہ ہے

کلام عرب میں قَالَ اشارہ کرنے کے

معنی میں استعمال ہوتا ہے قال برمحہٖ اس نے اپنے نیزے سے اشارہ کیا، قال بیدہٖ ھکذا، اُس نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا۔ اہلِ عرب لفظ قال کو تقریباً تمام افعال کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ قالَ برِجلِہٖ: پاؤں سے چلا، تولی: اشارہ سے بتا۔

اِنْسِیًّا: فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا

اِنْسِیًّا: آدمی۔ اِنْسٌ کی طرف منسوب ہے۔ ی نسبت کی ہے اس اعتبار سے انسی اس کو کہا جائے گا جو کثیر الانس ہو اور جس سے انس کیا جاسکے اور جانوروں کی وہ جانب جو سوار کی طرف ہو اس کو بھی اِنْسِیٌّ کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح کمان کی وہ جانب جو کمانچی کی طرف ہوتی ہے اِنْسِیٌّ کہلاتی ہے اور دودھ دالے جانور کی وہ جہت جس طرف سے بیٹھ کر اُسکو دوہیا جاتا ہے اِنْسِیٌّ کہلاتی ہے۔

الْاِنْسُ۔ خلاف الجن وَالْاِنْسُ خِلَافُ النُّفُوْرِ۔ وَالْاِنْسِیُّ مَنْسُوْبٌ اِلَی الْاِنْسِ (راغب)

فَرِیًّا: لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا

(آیت نمبر ۲۷) تونے کی یہ چیز طوفان کی، (ترجمہ عثمانی) تم نے بڑے غضب کا کام کیا، لفظ فَرِیٌّ عربی زبان میں دراصل کاٹنے اور پھاڑنے کے معنی میں آتا ہے جس کام یا جس چیز کے ظاہر ہونے میں غیر معمولی کاٹ چھانٹ ہو اس کو فَرِیٌّ کہتے ہیں۔ ابوحیان نے فرمایا کہ ہر امرِ عظیم کو فَرِیٌّ کہا جاتا ہے خواہ وہ بھلائی کے اعتبار سے عظیم ہو یا بُرائی کے اعتبار سے۔ اس جگہ بُرائی کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس لفظ کا کثیر الاستعمال ایسی چیزوں کے لئے معروف ہے جنکو اپنی شناعت اور بُرائی کے اعتبار سے غیر معمولی اور بڑا سمجھا جاتا ہو (معارف)

قال ابوعبیدہ: الفَرِیُّ العَجِیْبُ النَّادِرُ وقالہ الاخفش: قالَ فَرِیًّا عَجِیْبًا۔ وَالْفَرِیُّ: القطع کانّہٗ ممّا یَخْرُقُ العادۃ او یقطع القولَ بکونہ عَجِیْبًا نادرًا (قرطبی) فَرَیٰ یَفْرِیْ فَرْیًا علیہ الکَذِبَ کسی پر بہتان لگانا، الفِرْیَۃُ جھوٹ تہمت الفَرِیُّ گھڑی ہوئی بات، عجیب شئے کہا جاتا ہے۔ فلانٌ یَفْرِی الْفَرِیَّ، فلاں شخص تعجب خیز اور حیرت انگیز کام کرتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت اسی محاورہ سے ہے۔ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا، یعنی تم نے ایسا کام کیا،

تعجب وحیرت ہے۔ اصل میں فَرْیُ الْجِلْدِ کے معنی چمڑے کو کاٹنے کے ہیں چاہے یہ کاٹنا اصلاح کے لئے ہو یا افساد کے لئے، افْرَیْتُ الجِلْدَ کے معنی بھی اکثر کے نزدیک یہی ہیں، یعنی ثلاثی مجرد اور افعال دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یقال فَرَیْتُ وافریتُ بمعنی واحد (قرطبی)

صاحب روح المعانی نے صحاح کے حوالہ سے لکھا ہے کہ الفری (مجرد) کے معنی ہیں چمڑے کو علیٰ وجہ الاصلاح کاٹنا۔ اور الافرا کے معنی علیٰ وجہ الافساد کاٹنے کے ہیں امام راغب نے بھی یہی معنی بیان کئے ہیں (روح)، والفری: العظیم من الامر یقال فی الخیر والشر۔ وقال الکسائی افری الادھم قطعہ علی جھۃ الافساد وفراہٗ قطعہ علیٰ جھۃ الاصلاح (جمل)

بَغِیًّا: وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِیًّا، (آیت نمبر ۲۸) اور نہ تھی تیری ماں بدکار، (معارف) بَغِیًّا، بَغْیٌ سے صفت مشبّہ کا صیغہ ہے بمعنی بدکار۔ البَغِیُّ: فاسق و فاجر۔ حدود عفاف کی خلاف ورزی کرنے والا۔ تفصیل دیکھئے لَمْ اَكُ بَغِیًّا کے تحت۔

صَبِیًّا: كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا، (آیت نمبر ۲۹) الصَّبِیُّ۔ نابالغ لڑکا۔ رَجُلٌ مُصْبِیٌ، عیالدار آدمی جس کے بچے ابھی چھوٹے ہوں صَبَا۔ یَصْبُو۔ صَبْوًا وصَبْوَۃً۔ کسی چیز کی طرف مائل ہو کر بچوں کے سے کام کرنا (راغب) صاحب قاموس نے صبی کے معنی اس بچے کے لکھے ہیں جس نے ابھی دودھ نہ چھوڑا ہو۔ صاحب لسان العرب نے بھی تقریباً یہی معنی بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ پیدا ہونے سے لیکر دودھ چھڑانے تک کا بچہ صبی ہے لیکن امام راغب نے بلوغ سے قبل کے بچہ کو صبی قرار دیا ہے یہ بھی فعیل کے وزن پر صفت مشبّہ کا صیغہ ہے۔ صِبْیَۃٌ اور صِبْیَانٌ اس کی جمع آتی ہے۔ الصَّبِیُّ: من لَدُنْ یُولَدُ اِلیٰ اَنْ یُفْطَمَ (لسان) الصَّبِیُّ مَنْ لَمْ یَبْلُغِ الْحُلُمَ (راغب)

اَوْصٰی: اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّكٰوۃِ (آیت نمبر ۳۱) اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ اَوْصٰنِیْ اس نے مجھے تاکید کی ہے۔ اوصٰی اِیْصَاءٌ۔ نصیحت کے طور پر دوسروں کو عمل کی تاکید کرنا۔ اَوْصٰی فعل ماضی۔ نون وقایہ اور یا ضمیر مفعول یہ

کی ہے۔ کسی چیز کا حکم جب زیادہ تاکید کے ساتھ کیا جائے تو اسکو وصیت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی۔ اسکا مفہوم یہ ہے کہ بڑی تاکید سے ان دونوں چیزوں کا مجھے حکم دیا ہے (معارف)

جَبَّارًا : وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا: (آیت نمبر ۳۲)

جَبَّارٌ۔ سرکش، زور کرنے والا، زبردست دباؤ والا۔ خود اختیار۔ جبرٌ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اہلِ لغت کی تصریح کے مطابق جَبْرٌ کا استعمال ایک طرح کی زبردستی کے ساتھ کسی شے کی اصلاح کرنے کے ہے لیکن جَبْرٌ کا استعمال اصلاح یا محض زبردستی کے لئے بھی ہوتا ہے۔ انسانوں میں جبّار وہ شخص کہلاتا ہے جو اپنے نقص کو عُلوِّ مرتبت کے اِدّعا سے پورا کرنا چاہے جسکا وہ مستحق نہیں ہے بایں معنیٰ جبّار کا استعمال بطور مذمت ہی کے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جبّار اسکو بھی کہتے ہیں جسکا دوسروں پر دباؤ اور زور ہو۔ قرآن پاک میں ہے، وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ اور تیرا ان پر دباؤ نہیں ہے اور تو ان پر زور کرنے والا نہیں ہے۔ (لغات القرآن)

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ جبّار وہ جو اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور لوگوں کو غضب کی بنا پر قتل کرے۔ اور مارے۔ اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ جبّار وہ ہے جو اپنے اوپر کسی کا حق نہ مانے۔ جَبَّارًا: اى مُتَعَظِّمًا مُتَكَبِّرًا يَقْتُلُ وَيَضْرِبُ على الغضب وقيل الجَبَّارُ: الذى لا يَرٰى لِاَحَدٍ عَلَيْهِ حَقًّا قط (قرطبی) اس کی تحقیق پہلے گذر چکی ہے۔ علامہ ابن منظور افریقی نے لسان العرب میں لفظ جبّار پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اصحابِ ذوق کو اسی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

يَمْتَرُوْنَ : باب افتعال کے مصدر اِمْتِرَاءٌ سے جمع مذکر غائب مضارع کا صیغہ ہے۔ اِمْتِرَاءٌ کے اصل معنیٰ بکری کے تھن کو اچھی طرح نچوڑنے کے ہیں یہیں سے یہ لفظ کٹ حجتی کر کے کسی بات کا بتنگڑ بنانے اور اسمیں طرح طرح کے اوہام و شکوک پیدا کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا ہے (تدبر) يَمْتَرُوْنَ یہاں بمعنیٰ يَشُكُّوْنَ ہے (روح)، وہ شک کرتے ہیں، شک میں پڑے رہتے ہیں (لغات)

المِرْيَةُ کے معنی کسی معاملہ میں تردّد کرنے
کے ہیں اور شکّ سے خاص ہے۔ اور الامتراءُ
اور المُمَارَاۃُ کے معنی ایسے کام میں جھگڑا کرنے
کے ہیں جسکے تسلیم کرنے میں تردّد ہو (راغب)۔

مَلِيًّا : وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا : اور تو مجھے
ایک مدت طویل کے لئے چھوڑ دے مَلِیٌّ
مدّت العمر اور زمانہ طویل کے معنی میں آتا ہے
ہمارے نزدیک تقدیر کلام یوں ہے وَاهْجُرْنِيْ
هِجْرًا مَلِيًّا، یعنی میرے سامنے سے
دفع ہو کبھی اپنی شکل مجھے نہ دکھائیو (تدبر)
الاملاء کے معنی امداد یعنی ڈھیل دینے کے
ہیں اسی سے مَلَاوَةٌ مِنَ الدهر یا مَلِيٌّ مِنَ
الدهر کا محاورہ ہے جس کے معنی عرصہ دراز
کے ہیں تَمَلَّيْتَ دَهْرًا تمہاری عمر دراز ہو
تَمَلَّى بكذا اس نے فلاں چیز سے عرصہ دراز
تک فائدہ اُٹھایا۔ عِشْتَ مَلِيًّا، تم ہمیشہ
جیتے رہو۔ تمہاری زندگی دراز ہو (راغب)
حضرت ابن عباسؓ نے اس کے معنی
یہ بیان کئے ہیں کہ تو اپنی عزت سلامت
لیکر الگ ہو جا۔ ای اعتزلنی سالم العرض
لا يُصِيبَنَّكَ مِنِّيْ مَعَرَّةٌ (قرطبی)
علامہ طبری اور ابن جریر نے بھی یہی معنی
اختیار کئے ہیں اس اعتبار سے لفظ مَلِيًّا
ابراہیم سے حال ہوگا۔

حَفِيًّا : اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا،
(آیت نمبر ۴۷)، بیشک وہ مجھ پر بہت
مہربان ہے (ماجدی) حفی اسکو کہتے ہیں جو
بڑی خبر رکھنے والا ہو، اسکے لئے بڑا اہتمام
کرنے والا ہو اور اس پر نہایت کرم فرمانے
والا ہو (تدبر) الحفی : المبالغ فی البرّ
والالطاف یقال حَفِيَ و تَحَفّٰى اذا بَرَّه
وقال الكسائى يقال حَفِيَ (س) حِفَاوَةً
وحِفْوَةً وقال الفراء اِنَّهٗ كَانَ بِيْ
حَفِيًّا، اى عالمًا لطيفًا يُجِيْبُنِيْ اِذَا
دَعَوْتُهٗ (قرطبی)
اَحْفٰى فی السّؤال : سوال پر اصرار کرنا،
الحاح سے کام لینا۔ حَفِيٌّ : عالم

لِسَانَ : لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا،
(آیت نمبر ۵۰) اللّسان۔ زبان اور قوتِ
گویائی کو کہتے ہیں۔ محاورہ ہے لِكُلِّ قَوْمٍ
لِسَانٌ و لِسْنٌ، ہر قوم کی زبان اور لب و
لہجہ جدا ہے۔

صِدْقٍ : کے معنی ہیں دل اور زبان
کی ہم آہنگی اور بات کا نفس واقعہ کیمطابق
ہونا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی شرط نہ
پائی جائے تو کامل صدق باقی نہیں رہتا ایسی

صورت میں یا تو وہ کلام صدق کیساتھ متصف
ہی نہیں ہوگا اور یا دو مختلف حیثیتوں سے
کبھی صدق اور کبھی کذب کے ساتھ متصف ہوگا
مثلاً ایک کافر جب اپنے ضمیر کے خلاف
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کہتا ہے تو اُسے نفس واقعہ
کے مطابق ہونے کی حیثیت سے صدق بھی کہہ
سکتے ہیں اور اس کے دل و زبان کے ہم آہنگ نہ
ہونے کی وجہ سے کذب بھی کہہ سکتے ہیں چنانچہ
دوسری حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے منافقین
کو اس کے اس اقرار میں نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ
میں جھوٹا قرار دیا ہے کیونکہ وہ یہ بات اپنے
ضمیر کے خلاف کہہ رہے تھے (راغب)
اور آیت کریمہ وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ
عَلِيًّا میں لسان سے مراد ذکر، چرچا اور شہرت
ہے۔ لفظ صدق کے اندر رسوخ، پائیداری
اور استحکام کا مفہوم پایا جاتا ہے یہ اسی
طرح کی ترکیب ہے جس طرح دوسرے
مقام میں قَدَمَ صِدْقٍ کی ترکیب استعمال
ہوئی ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
اُن کی دعوت کو فروغ دیا اور ان کو پائیدار
عزت و شہرت حاصل ہوئی جو دنیا میں
کسی کو حاصل نہیں ہوئی (تدبیر) چنانچہ
دنیا میں تمام بسنے والی بڑی بڑی قومیں
ابراہیم علیہ السلام کی نبوت کی معتقد ہیں،
اور خاصکر مسلمان عیسائی اور یہودی تو
اپنے ادیان کی بنیاد ہی ان اکابر کو قرار
دیتے ہیں اور اُمتِ مسلمہ کی اہم ترین عبادت
نماز اُسوقت تک مکمل ہی قرار نہیں دی
جاتی جب تک ابراہیم علیہ السلام اور انکی
اولاد پر صلوٰۃ و سلام نہ بھیجا جائے۔

صِدِّيْقٌ : بکسر الصاد قرآن کا ایک
اصطلاحی لفظ ہے۔ اس کے معنی اور تعریف
میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ایک
یہ کہ صدیق وہ ہے جس نے عمر میں کبھی جھوٹ
نہ بولا ہو۔ دوسری تعریف لفظ صدیق
کی یہ کی گئی ہے کہ صدیق وہ ہے جو قول
اور عمل اور اعتقاد میں صادق ہو، یعنی
جو دل میں اعتقاد ہو ٹھیک وہی زبان پر
ہو اور اس کا ہر فعل اور ہر حرکت و سکون اسی
اعتقاد اور قول کے تابع ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے
میں ہے اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا :۔
صاحب روح المعانی نے اسمیں دو تعریفیں کی
کی ہیں۔ نمبر۱۔ ملازم الصدق لم یکذب
قط نمبر۲۔ الصدیق من صدق
بقوله واعتقاده وحقق صدقه بفعله (روح)

لفظ صدیق - فِعِّیْلٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بہت سچا۔ الصدیق من ابنیۃ المبالغۃ (کشاف)

شاہ عبدالقادر صاحبؒ سورۃ النساء کی آیت فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ کے فوائد میں لکھتے ہیں کہ صدیق وہ کہ جو وحی آوے اُن کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے۔ (موضح القرآن)

کُلّ من صَدَّقَ بکل امر اللّٰہ لا یتخالجہٗ فی شیئ منہ شكٌّ وصَدَّقَ النبیّ صلے اللّٰہ علیہ وسلم فھو صدّیق (لسان العرب عن اللیث)

مَرْضِيًّا : وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (آیت نمبر ۵۵) اور تھا اپنے رب کے یہاں پسندیدہ (معارف القرآن)

مَرْضِيًّا اسم مفعول۔ پسند کیا ہوا خوش کیا ہوا۔ مؤنث مرضیۃٌ۔ مرضیٌّ کی اصل مَرْضُوْوٌ ہے۔ دونوں واؤ کو یاء سے بدلکر ادغام کر دیا گیا ہے۔ رضوانٌ سے ماخوذ ہے پہلی واؤ زائد ہے جیسے مضروب میں، اور دوسری واؤ لام کلمہ ہے۔ واصلہ مرضووٌ بواوین الاولیٰ زائدۃٌ کھی فی مضروب والثانیۃُ لام الکلمۃ لانہٗ من الرضوان فاُعِلّ لِقلبِ الواوِ والْاٰخِیْرۃُ یاءٌ و اجتمعت الیاء والواوُ فقلب الواوُ یاءً (قرطبی)

اِدْرِيْسَ : وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ (آیت نمبر ۵۶) "اور کتاب میں ادریسؑ کا بھی ذکر کرو"۔ حضرت ادریس علیہ السلام خدا کے بھیجے ہوئے نبی اور رسول تھے۔ لفظ ادریس میں اختلاف ہے کہ یہ لفظ سُریانی ہے یا عربی جن حضرات نے لفظ ادریس کو عربی قرار دیا ہے انھوں نے اسکا اشتقاق دراستؔ مانا ہے جس کے معنی پڑھنے اور یاد کرنے کے ہیں صحفِ الٰہی کے مطالعہ اور درس کی کثرت کی وجہ سے اُنھیں اُدریس کہا گیا ہے۔

لیکن علامہ جاراللہ زمخشری نے تصریح کی ہے کہ یہ لفظ عجمی ہے اور دراست سے اسکا اشتقاق ماننا محض وہم ہے صحیح نہیں ہے صاحبِ کشاف کا کہنا یہ ہے کہ اگر ادریس کو بروزن افعیل درسؔ سے مشتق مانا جائے تو اس کو منصرف ہونا چاہیئے کیونکہ اس صورت میں صرف ایک سبب عَلَمِیّت باقی رہ جاتی ہے۔ حالانکہ یہ منصرف نہیں ہے بلکہ غیر منصرف ہے لہٰذا غیر منصرف ہونا اس کی

عجمیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح لفظ ابلیس بھی عجمی ہے ابلاس سے اسکا اشتقاق نہیں، جیسا کہ بعض کا گمان ہے۔ اسی طرح یعقوب بھی عقب سے ماخوذ نہیں اور نہ ہی اسرائیل اسرال سے مشتق ہے جیسا کہ ابن السکیت کا خیال ہے۔ اور جن حضرات کو صناعت اور علوم عربیہ میں مہارت حاصل نہیں ہوتی ان سے اس طرح کی غلطیاں صادر ہوتی رہتی ہیں۔ صاحب کشاف نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے کہ جس زبان کا یہ لفظ ہے اسمیں ادریس کے معنیٰ پڑھنے کے قریب قریب ہوں اور راوی کو شبہ ہو گیا ہو کہ یہ دَرس سے مشتق ہے علامہ قرطبی نے بھی زمخشری کا یہ قول نقل کیا ہے۔ حضرت ادریس کے زمانے میں اختلاف ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے کے رسول ہیں یا انکے بعد کے۔

امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ یہ جناب نوح علیہ السلام کے جدِّ اعلیٰ ہیں اور اُن کا نام اُخنوخ ہے۔ اور نسب یوں بیان کیا ہے۔ نوح بن لمک بن متوشلخ ابن اخنوخ (کبیر صفحہ ۲۳۳ جلد ۲۱)

مولانا عبد الحق صاحب حقانیؒ نے بھی غالباً اسی روایت پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ حضرت ادریس نوح علیہ السلام کے پردادا تھے۔ اخنوخ نام اور ادریس لقب تھا، بوجہ کثرتِ درس اور صحفِ آسمانی کے، (حقانی صفحہ ۳۷ جلد ۱۶)

جناب مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام سے ایک ہزار سال پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی اور رسول ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے تیئیس ۲۳ صحیفے نازل فرمائے اور ادریس علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو علم نجوم اور حساب بطور معجزہ کے عطا کیا گیا۔ اور سب سے پہلے انسان ہیں جنہوں نے قلم سے لکھنا اور کپڑا سینا ایجاد کیا اس سے پہلے لوگ جانوروں کی کھال بجائے لباس کے استعمال کرتے تھے۔ اور سب سے پہلے ناپ تول کے طریقے بھی آپ ہی نے ایجاد کئے اور اسلحہ کی ایجاد بھی آپ سے شروع ہوئی آپ نے اسلحہ ایجاد کر کے بنو قابیل سے جہاد کیا (معارف، بحرِ محیط، قرطبی، روح، مظہری)

بعض حضرات نے حضرت ادریس علیہ السلام
کا زمانہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بتایا ہے
مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے قصص القرآن
میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

بُکِیًّا : خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُکِیًّا :
(آیت نمبر ۵۸) بُکِیًّا روتے ہوئے سُجَّدًا
خَرُّوْا کی ضمیر سے حال ہے اور بُکِیًّا اسی پر
عطف ہے۔ یہ باکِیٌ کی جمع ہے بکے معنی
رونے والے کے ہیں۔ اصل میں بُکِیٌ فُعُولٌ
کے وزن پر تھا جیسے سَاجِدٌ اور سُجُودٌ۔ راکع
اور رُکوع۔ قاعد اور قُعود، لیکن جاثٍ اور
جُثِیّ اور عاتٍ اور عُتِیٌّ کی طرح اس کے
واؤ کو یاء سے بدلا گیا ہے اور یاء کا یاء میں
ادغام کر دیا گیا ہے۔ بُکِیٌّ کا استعمال اندوہگیں
اور آنسو بہانے دونوں کے متعلق بھی ہوتا ہے
اور صرف اندوہگیں اور صرف آنسو بہانے
کے متعلق بھی آتا ہے۔ البُکِیُّ جمع باکٍ
کالسُّجُوْدِ والقُعود فی جمع ساجد و
قاعد (کشاف) واصل بُکِیٍّ بُکُوْیٌ
قُلِبَتِ الواوُ یاءً والضمۃُ کسرۃً۔
(جلالین)

غَیًّا : فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا
(آیت نمبر ۵۹) سو یہ لوگ عنقریب
آخرت میں خرابی دیکھیں گے (تھانوی)
لفظ غَیٌّ عربی زبان میں رشادٌ کے بالمقابل ہے
ہر بھلائی اور خیر کو رشاد اور ہر برائی اور
شر کو غَیٌّ کہا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ
ابن مسعود سے منقول ہے کہ غَیٌّ جہنم کے
ایک غار کا نام ہے جس میں سارے جہنم
سے زیادہ طرح طرح کے عذاب ہوں گے،
(معارف) والاظہر انّ الغیّ اسم للوادی
سمی بہ لان الغاوین یصیرون
الیہ (قرطبی)

امام راغب نے لکھا ہے کہ لفظ غَیٌّ سے
سے کبھی عذاب مراد ہوتا ہے۔ کیونکہ گمراہی
عذاب کا سبب ہے اور سبب کا اطلاق
مسبب پر ہوجاتا ہے جیسے فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ
غَیًّا، کچھ مدت کے بعد وہ عذاب پائیں گے
یا اس آیت میں مضاف محذوف ہے
یعنی یَلْقَوْنَ اَثَرَ الْغَیِّ وہ گمراہی کا
نتیجہ پائیں گے۔

غَوٰی یَغْوِیْ (ض) غَیًّا وغَوِیَ یَغْوٰی
(س) غَوایَۃً۔ گمراہ ہونا، ناکام ہونا
محروم ہونا، ہلاک ہونا۔ اسم فاعل غَاوٍ
آتا ہے۔ رَجُلٌ غاوٍ گمراہ، بے راہ رَو
آدمی ایک شاعر مرثیہ کہتا ہے ؎

فَمَنْ يَلْقَ خَيْرًا يَحْمَدِ النَّاسُ أَمْرَهٗ
ومن يَغْوَ لَا يَعْدَمْ على الغَيِّ لَائِمًا
اور غَوِیَ سے اسم فاعل غوٍ جیسے رَشَدَ سے
رَشِيْدٌ اس طرح غَوِيٌّ اسم فاعل بھی
غَوِیَ سے ہے۔ الغَيُّ : الضَّلَالُ وَالْخَيْبَۃُ
غَوٰی بالفتح، غَيًّا وَغَوِیَ، غَوَايَۃً
الاخيرة عن ابی عبيدة : ضَلَّ
(لسان) فعصٰی اٰدمُ ربَّهٗ فغوٰی،
ای فَسَدَ عليه عِيشُهٗ (لسان) یعنی
حضرت آدم علیہ السلام کو شجرہ جنت کے
استعمال اور کھانے سے یہ نقصان اٹھانا
پڑا کہ جنت کی زندگی سے محروم ہو گئے۔

لفظ مَاْتِيًّا کی تعلیل: لفظ مَاْتِيًّا
اسم مفعول بمعنی اسم فاعل ہے۔ اصل میں
مَاْتُوْيٌ تھا، واؤ کو یاء سے بدل کر ادغام
کیا گیا ہے، ضمہ کو یاء کی مناسبت سے
کسرہ سے تبدیل کر دیا، مَاْتِيًّا ہو گیا
والا ضرور آ کر رہے گا۔ امام راغب لکھا ہے
کہ اس جگہ مَاْتِيٌّ کو اسم فاعل [illegible]
لینے کی ضرورت نہیں ہے [illegible]
میں اس پر پہنچا اور آ [illegible]
مجھے پہنچا دونوں طرح بولا جاتا ہے [illegible]
دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔ [illegible]

کشاف کو بھی یہ توجیہ یعنی ماتیا کو اسم فاعل
کے معنی میں لینا پسند نہیں۔ اس لئے اس
توجیہ کو صیغۂ تمریض کے ساتھ ذکر کرتے ہیں
کہ قِيْلَ فی مَاْتِيًّا : مفعول بمعنی فاعل والوجه
ان الوعد هو الجنة وَهُمْ يأتونها
او هو من قولك : اتی اليه احسانًا
ای كان وعده مفعولًا منجزًا
(كشاف) مَاْتِيًّا مفعول من الاتيان
وكُلّ ما وصل اليك فقد وَصَلْتَ
اليه، تقول اتت علیّ ستون سنة
ووصل الیّ من فلان خير ووصلتُ
منه الیّ خير۔ وقال القتبی مَاْتِيًّا
بمعنی آتٍ هو مفعول بمعنی فاعل
ومَاْتِيًّا مهموز لانه من اتی
يأتی۔ (قرطبی)

لَغْوًا : [illegible] يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا
[illegible] سَلٰمًا (مریم ۶۲)
[illegible] سے مراد کلام باطل فضول اور گالی
[illegible] اور ایذا [illegible] والا کلام ہے کہ اہل
[illegible] رہیں گے۔ کوئی
[illegible] ایسا نہ ہو گا جو ان کو رنج دہ
[illegible] -
الا [illegible] استثناء منقطع ہے مراد یہ ہے

کہ وہاں جسکا جو کلام سننے میں آوے گا وہ بھلائی اور خوشی میں اضافہ کریگا، اصطلاحی سلام بھی اسمیں داخل ہے جو اہلِ جنت آپسمیں ایک دوسرے کو کریں گے اور اللہ کے فرشتے ان سب کو کریں گے (معارف)

اَللَّغْوُ : معناہ الباطل من کلام والفحش منہ والفضول وما لا ینتفع بہ ...... قال ابن عباس : اللغو کل مالم یکن فیہ ذکر اللّٰہِ (قرطبی)

یعنی ہر وہ کلام لغو ہے جو اللہ کی یاد سے خالی ہو۔

نَسِیًّا : نِسْیَانٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے بمعنی بھولنے والا، یعنی چھوڑنے والا، بھولنے والا۔

اِصْطَبِرْ : فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ : تو اُسی کی بندگی کرو، اور اُسی کی بندگی پر جمے رہو (تدبر)

اصطبار میں صبر کے مقابلے میں زیادہ زور ہے عربی قاعدہ کے مطابق حروف کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔

مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی مدظلہ العالی اسکا ترجمہ یوں فرماتے ہیں :

اِصْطَبِرْ، تو قائم رہ، سہتا رہ، صبر کر، اِصْطِبَارٌ سے جسکے معنی صبر کرنے کے ساتھ قائم رہنے کے ہیں (لغات القرآن)

جِثِیًّا : یہ جاثٍ کی جمع ہے۔ جَثَا جُثُوًّا اسکے معنی دو زانوں اور اکڑاوں ہو کر بیٹھنے کے ہیں۔ یہ نشست مجرموں کی نشست ہے جس طرح مجرم اپنا فیصلہ سننے کے لئے کسی حکمران کے سامنے بیٹھتے ہیں اسی طرح غلامانہ اور محکومانہ نشست کے لئے یہ لفظ آتا ہے، (تدبر) اس کی اصل جُثُوْوٌ ہے فعُولٌ کے وزن پر دونوں واؤ کو یاء بنا کر ادغام کیا گیا ہے اور بعض کے نزدیک اس کی اصل جُثُوْیٌ ہے۔ ایک واؤ جو یاء سے پہلے ہے یاء بنا کر یاء کو یاء میں مدغم کر دیا گیا ہے۔

جِثِیًّا جمع جاثٍ، یُقَالُ : جثا علی رکبتیہ یَجْثُوْ وَیَجْثِیْ جُثُوًّا وجُثِیًّا علیٰ فُعُوْلٍ فِیْهِمَا۔ جَلَسَ علی رُکْبَتَیْہِ للخصومۃ (قرطبی، لسان) جَثَا : وہ زانوں کے بل بیٹھا۔ جَاثٍ فاعل جاثیۃ مؤنث الجُثْوَۃُ : مٹی کا ڈھیر، صَارَ فُلَانٌ جُثْوَۃً : وہ مٹی کا ڈھیر ہو گیا یعنی مر گیا۔

جِثِیًّا : زانو پر گرے ہوئے، اوندھے گرے ہوئے۔ جاثٍ کی جمع ہے جس کے معنی زانو کے بل گرنے والے کے ہیں، (لغات القرآن)

اس کی مؤنث جاثیۃٌ آتی ہے ۔
جاثی : کسی کے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھنا، اَجۡثَاہُ (افعال) کسی کو زانو کے بل بٹھانا

عِتِیًّا : اَیُّھُمۡ اَشَدُّ عَلَی الرَّحۡمٰنِ عِتِیًّا، (آیت نمبر ۶۹) یہ آیت کریمہ اعراب کے اعتبار سے مشکل آیات میں سے ہے جس کی تحقیق علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے لفظ عتیا کی تحقیق و تعلیل شروع سورت میں گزر چکی ہے ۔

صِلِیًّا : ھُمۡ اَوۡلٰی بِھَا صِلِیًّا : وہ بہت قابل ہیں اسمیں داخل ہونے کے
صِلِیًّا : آگ میں داخل ہونے والے، آگ میں داخل ہونا ۔ پہلے معنی کے اعتبار سے یہ صالٍ کی جمع ہے، اور دوسرے معنی کے اعتبار سے صَلِیَ یَصۡلٰی کا مصدر ہے جس کے معنی سوختہ ہونے اور آگ میں داخل ہونے کے آتے ہیں (لغات القرآن)
اَلصَّلٰی : کے اصل میں معنی ہیں آگ جلانا، صَلِیَ بِالنَّارِ وہ آگ میں جلا، صَلِیَ بکذا : اسے فلاں چیز سے پالا پڑا ۔ صَلِیَ النَّارَ کے معنی بعض کے نزدیک آگ میں داخل ہونے کے ہیں ۔ اور اَصۡلاھا (افعال) آگ میں داخل کرنا فَسَوۡفَ نُصۡلِیۡہِ نَارًا، ہم اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کریں گے ۔ اور فلانٌ لَا یُصۡطَلٰی بِنَارِہٖ کے معنی ہیں کہ فلاں اتنا بہادر ہے کہ اس کو بچھاڑا نہیں جا سکتا (راغب، قرطبی)
واصلہٗ : صلوی مِن صَلِیَ بکسر اللام و فتحھا (جلالین) قُلِبَتِ الواوُ یاءً و اُدغمت فی الیاء وکسرت اللام لِتصِحّ الیاءُ (جمل) اس میں ایک لغت صُلِیًّا بھی ہے جیساکہ مضی یَمۡضِی مُضِیًّا (ایضًا)

نَدِیًّا : اَحۡسَنُ نَدِیًّا : نَدِیٌّ سے مراد مجلس اور مجمع ہے ۔ نَدِیًّا ای مجلسًا و مجتمعًا (روح) احسن نَدِیًّا ھو مجتمع الرجال (ابن کثیر)
والنَّدِیُّ علٰی فعیل مجلس القوم ومُتَحَدَّثُھُمۡ، وکذٰلک النَّدوۃ والنَّادِی والمنتدٰی والمُتَنَدّٰی، فان تفرق القومُ فلیس بندیّ قالہ الجوھری (قرطبی) نَدِیٌّ : وہ محفل جہاں لوگ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں ۔ دار الندوۃ : پنچایت خانہ، اَحۡسَنُ نَدِیًّا : مجلس کے اعتبار سے بہتر ۔

قَرۡنٍ : وَکَمۡ اَھۡلَکۡنَا قَبۡلَھُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ ھُمۡ اَحۡسَنُ اَثَاثًا وَّرِءۡیًا (آیت ۷۴)

قَرْنٌ ۔ ایک دور کے لوگ، اُمت اور
قَوم مِنْ قَرْنٍ ، ای مِنْ اُمّۃٍ وّجماعۃٍ
(قرطبی) ایک قرن کتنی مدت پر بولا جاتا ہے
اس میں اہلِ لغت میں اختلاف ہے۔ کوئی
حتمی اور یقینی فیصلہ مشکل ہے۔ قرن کی
اوسط مدت اسّی سال کی ہے۔ سو سال کو
قرن کہنا زیادہ انسب معلوم ہوتا ہے۔
والقرنُ : اُمّۃ تأتی بعد اُمّۃ (لسان)

اَثَاثًا : الاثاثُ : گھر کا سامان جس
سے مکان کی زینت اور رونق ہوتی ہے
والاثاثُ : متاع البیت (قرطبی)
اِمرأۃ اَثِیثَۃٌ : بارونق خاتون
شعرٌ اثیثٌ : گھنے بال اور طویل۔

رِءْيًا : هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا
(آیۃ نمبر ۷۴) وہ اُن سے بہتر تھے سامان
اور نمود میں (ساعت) رِءْیٌ کے معنی ہیں
نمود، منظر، شان وشوکت (تدبر)
رؤیۃ سے بمعنی مرئی ہے۔ رِءْيًا، مَنْظَرًا
من الرؤیۃ (جلالین)
رِءْيًا ۔ بمعنی المرئی (جمل)، وقال صاحب
الکشاف ۔ رِءْيًا، وهو المنظر والهیئۃ
فعل بمعنی مفعول من رأیتُ (کشاف)
یہ بھی ممکن ہے کہ رِءْيًا رِیٌّ سے مشتق ہو
جس کے معنی فراخی نعمت اور فراوانی کے ہیں
امام راغب فرماتے ہیں کہ جو لوگ اسے مہموز
نہیں مانتے ان کے نزدیک یہ رَوِیٌ سے
مشتق ہے۔ اور خوبصورت کو رِیّ اسلئے
کہتے ہیں کہ گویا وہ حُسن سے پُر ہے۔ لیکن اگر
اُسے مہموز پڑھا جائے تو رِءْيًا سے مراد وہ چیز
ہوگی جس کی خوبصورتی کی وجہ سے اسکی طرف
نظریں اُٹھتی ہوں۔ اور بعض کے نزدیک
بغیر ہمزہ کے بھی رُؤیۃ سے مشتق ہے، اور
رِیّ کے معنی منظر کے ہیں۔
او مِنَ الرِّیِّ الّذی هو النعمۃ والرفاهۃ
من قولهم ریّانٌ مِنَ النَّعیم (کشاف)

جُنْدًا : جُنْدًا کا اطلاق ہر بشری مجمع
پر ہوتا ہے۔ یقال لِکلِّ مجتمع جُنْدٌ
(راغب) یہاں مراد حمائتیوں کا گروہ یا
جتھا ہے، الجند هم الراعون والانصار
(کشاف) جمع جُنُوْدٌ آتی ہے، جَنَّدَ
الجُنُوْدَ : عساکر کو جمع کیا۔

مَرَدًّا : مَرَدًّا بمعنی مرجع ہے۔ مراد
انجام وعاقبت ہے (معارف)
مَرَدًّا اسم فعل، ٹالنا، لوٹانا، پلٹ دینا
(لغات القرآن)، امام قرطبی فرماتے ہیں کہ
(مردّ) مصدر ہے جیسے رَدٌّ ہے۔ والمَرَدُّ

مصدر کالردّ، ای وخیرٌ ردًّا علیٰ
عاملھا بالثواب ۔ (قرطبی)
رَدَّ، یَرُدُّ رَدًّا و مَرَدًّا۔ رَدَّہٗ عن
کذا: پھیرنا واپس کر دینا، رَدَدْتُ
الشیئَ ۔ چیز کو واپس کر دینا۔ الرَّدُّ: مصدر
زبان کی لڑکھڑاہٹ، ہکلاپن: الرَّدِّی
طلاق دی ہوئی عورت۔ الرَّدِیُّ: وہ بادل
جو پانی برسا چکا ہو (منجد) الرَّدُّ صرف الشیئ
ورَجْعُہٗ (لسان)

فَرْدًا: وَیَاْتِیْنَا فَرْدًا، (آیت نمبر ۸۰)
اور آئیگا ہمارے پاس اکیلا، فَرْدٌ: واحد
جمع فُرَادیٰ۔ اکیلا۔ تنہا جو کسی غیر کے ساتھ
مخلوط نہ ہو۔ لفظ فرد وِتْرٌ سے عام ہے اور
واحد سے خاص (راغب)
فَرَدَ، فَرْدًا و فَرِدَ و فَرُدَ: اکیلا ہونا،
فَرَدَ بِالْاَمْرِ ۔ تنہا کام کرنا ۔ فَرَدَ عَنِ الشیئ
علیحدہ ہونا فَرَدَ بِرَأْیِہٖ رائے میں اکیلا
ہونا۔ الفَرِیْدُ: ایک، یکتا، چھوٹا موتی
جوہر۔ جمع فَرَائِدُ (منجد) الفَرْدُ: الوِتْرُ
والجمع، افرادٌ و فُرادیٰ علیٰ غیر قیاس (لسان)

ضِدًّا: وَیَکُوْنُوْنَ عَلَیْھِمْ ضِدًّا:
اور ہوجائیں گے ان کے مخالف یعنی جن معبودان
باطل پر ان کا سہارا تھا وہ ان کے خلاف
ہوجائیں گے اور حشر میں ان کا کوئی سہارا
نہیں ہوگا ۔ لفظ ضد کی جمع اَضْدَادٌ ہے ۔ یہ
مفرد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے،
اور یہاں یہ جمع ہی کے معنی میں ہے ۔ علامہ
سمین فرماتے ہیں کہ اگرچہ خبر ایک جماعت
کے متعلق دی گئی ہے مگر ضِدًّا کو واحد لایا
گیا ہے اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ کہ یا تو
یہ مصدر ہے اور مصادر واحد و جمع دونوں
طرح استعمال ہوتے ہیں اور یا یہ مفرد ہے بمعنی
جمع ۔ (جمل صٹ ج ۳)
علامہ شیخ سلمان فرماتے ہیں کہ ضد کے متعلق ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مصدر سماعی ہے اور یا اسم مصدر
ہے ۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ ضدین وہ دو چیزیں
ہیں کہ جو ایک ہی جنس کے تحت ہوں اور انہیں سے
ہر ایک دوسرے کے اوصاف خاصہ میں منافی ہو
اور دونوں کے درمیان انتہائی بُعد پایا جائے، جیسے
سفیدی اور سیاہی اور خیر و شر، اور جو متغائر
چیزیں ایک جنس کے تحت ہوں انھیں ضدین
نہیں کہا جاتا جیسے حلاوت اور حرکت، علماء نے
کہا ہے کہ ضد متقابلات کی ایک قسم کا نام ہے کیونکہ
وہ دو چیزیں جن میں ذاتی اختلاف ہو اور یہ
دونوں بیک وقت ایک جگہ اکٹھی نہ ہو سکتی
ہوں انھیں متقابلین کہا جاتا ہے ۔

اور تقابل کی چار اقسام ہیں :
نمبر۱ : تقابل تضاد جیسے سفیدی اور سیاہی
نمبر۲ : تقابل تناقض جیسے ضِعْفٌ اور نِصفٌ
نمبر۳ : تقابل عدم ملکہ جیسے بصر و عمی
نمبر۴ : تقابل ایجاب و سلب جو جملہ خبریہ میں ہوتا ہے جیسے کُلّ انسانٍ ھٰھُنَا و لیس کُلُّ اِنسَانٍ ھٰھُنَا، اکثر متکلمین اور اہلِ لغت ان سب کو تقابل تضاد کی فہرست میں شامل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ضِدّان اُن دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک محل میں جمع نہ ہوسکتی ہوں اور ذات باری تعالےٰ کے متعلق لَانِدَّ لَہٗ وَلَاضِدَّ لَہٗ کہہ کر دونوں کی نفی کی جاتی ہے کیونکہ نِدّ شریک فی الجوہر کو کہتے ہیں اور ان دو متخالف چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت علیٰ سبیل المتعاقب پائی جاتی ہوں اور چونکہ ذات باری تعالیٰ جوہریّت اور جنسیت دونوں سے منزہ ہے اس لئے اسکا نہ کوئی نِدٌّ ہوسکتا ہے اور نہ ضدٌّ اور آیتِ کریمہ وَیَکُوْنُوْنَ عَلَیْھِمْ ضِدًّا میں لفظ ضد سے مراد دشمن اور مخالف ہے (راغب)
ضَدَّ یَضُدُّ ضَدًّا، ضَدَّ فلانًا فِی الْخُصُوْمَۃِ : جھگڑے میں غالب آنا ۔
ضَدَّہٗ عَنْ کَذَا ۔ نرمی سے ہٹا دینا ۔
ضَادَّہٗ مُضَادَّۃً ۔ مخالفت کرنا ۔ الضِّدُّ مخالفت، دشمنی، مثل، نظیر، جمع اَضْدَادٌ
الضِّدُّ : کُلُّ شیئٍ ضَادَّ شَیْئًا لِیَغْلِبَہٗ والسّواد ضد البیاض وَالموتُ ضِدُّ الحیات واللیلُ ضِدّ النّھار، اذا جاءَ ھذا ذھب ذالِك (لسان)

اَزًّا : تَؤُزُّھُمْ اَزًّا : عربی لغت میں لفظ ھَزَّ، اَزَّ، فَزَّ، حَفَّ سب ایک معنی میں ہیں یعنی کسی کام کے لئے اُبھارنا آمادہ کرنا ۔ خفت اور شدت اور کمی زیادتی کے لحاظ سے ان میں باہم فرق ہے ۔ لفظ اَزّ کے معنی پوری قوت اور تحریک و تدبیر کے ذریعہ کسی شخص کو کسی کام کے لئے آمادہ بلکہ مجبور کر دینے کے ہیں ۔ معنی آیت کے یہ ہیں یہ شیاطین ان کو اعمالِ بد پر اُبھارتے رہتے ہیں اور ان کی خوبیاں ان کے دل پر مسلط کر دیتے ہیں خرابیوں پر نظر نہیں ہونے دیتے (معارف)
وقال صاحب الکشاف : الازُّ، والھزُّ والاِستِفزاز : اخواتٌ ومعناھا التَّھْیِیْجُ وشدّۃ الازعاج (کشاف)
اَزَّ یَؤُزُّ اَزًّا کے اصل معنی ہانڈی کے جوش مارنے کے ہیں ۔ اَزَّتِ الْقِدْرُ ۔ دیگچی

کاجوش مارنا، سنسنانا، پھر اسی مناسبت
سے ورغلانے، اُبھارنے اور آپس میں گتھ جانے
اور اُچھال دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے
امام راغب لکھتے ہیں، تَؤُزُّهُمْ أَزًّا - ای
تُرْجِعُهُمْ ارجاعَ القِدْرِ اِذا اَزَّتْ
ای اِشْتَدَّ غَلْيَانُهَا،
اَزَّهٗ علیٰ کذا - بھڑکانا، برانگیختہ کرنا،
اُکسانا - تَأَزَّ المَجْلِسُ اہلِ مجلس میں
اضطراب وہلچل مچنا - تَؤُزُّهُمْ ای تغریهم
علی المعاصی - والازُّ الاختلاط وقد
اَزَزْتَ الشیءَ اَزُّه اَزًّا ای ضَمَمْتُ
بعضہ الی بعض (قرطبی)، اَزَّ النار: آگ
بھڑکانا - اَزَّ الشیءَ کسی چیز کو شدت سے
حرکت دینا (جمل) والازُّ: الاختلاط-
والازُّ - التهييج والاغراء (لسان)

وَفْدًا: يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى
الرَّحْمٰنِ وَفْدًا - جس دن ہم اکٹھا کر لائیں
گے پرہیزگاروں کو رحمٰن کے پاس مہمان بلائے
ہوئے (معارف)، وَفَدَ وَفْدًا کے معنی
کہیں عزت و اکرام کے ساتھ جانے کے ہیں،
جس طرح سفیر اور قاصد بادشاہ اور امیر
کے پاس جاتے ہیں (تدبر)، وَفَدَ القومُ
(ض)، وفادۃً - لوگوں کا وفد بنکر بادشاہ
کی خدمت میں حاضر ہونا - اور وفد یا وفود
ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی ضروریات
پورا کرنے کے لئے بادشاہوں کی خدمت میں
حاضر ہوں - اسی سے وَافِدٌ، اس اونٹ
کو کہتے ہیں جو سب سے آگے نکل جانے والا
ہو (راغب) والوفد: اسم للوافدين
كما يقال صَوم و فِطْرٌ و زَوْرٌ، فهو جمع
الوافد، مثل رکب و راکب وصحب و صاحب
وهو من وفد يَفِدُ وَفْدًا وَفُوْدًا ووفادةً
اذا خرج الی ملك في فتح او امر خطيرٍ
(قرطبی) الوفد: اسم جنس کے طور پر بھی
استعمال ہوتا ہے اس جماعت کو کہا جاتا ہے
جو مشترکہ کام کے لئے بھیجی جائے۔ صیغہ صفت
کا وافد آتا ہے اس کی جمع وفودٌ آتی ہے اور
وَافِدٌ کی جمع بھی وفدٌ آتی ہے - فامّا
الوفد: فاسم للجمع، وقيل جمع واما
الوفود فجمع وافدٍ (لسان)

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں
کہ لفظ وفد ایسے آنیوالوں پر بولا جاتا ہے جو کسی
بڑے بادشاہ یا امیر کے پاس اکرام و اعزاز
کے ساتھ جائیں -

وِرْدًا: وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى
جَهَنَّمَ وِرْدًا: (آیت نمبر ۸۶) اور ہم

ہانک کر لیجائیں گے گناہگاروں کو دوزخ کی طرف پیاسے۔ وِرْدًا کے لفظی معنی پانی کیطرف جانے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ پیاس ہی کے وقت کوئی آدمی یا جانور پانی پر جاتا ہے، اسلئے وِرْدًا کا ترجمہ پیاسا کیا گیا ہے (معارف)

وِرْدًا: وَرَدَ یَرِدُ سے اسم ہے اسکے معنی گھاٹ پر اُترنے کے ہیں جس طرح پیاسے اونٹ گھاٹ پر جاتے ہیں (تدبر) اور خاص اُس پانی کو بھی کہا جاتا ہے جو وارد ہونے کے لئے تیار کیا گیا ہو (راغب) الوردُ القوم یَرِدونَ الماءَ فسمی العطاش وِرْدًا بطَلَبِہِمْ ورود الماء کما تقول قوم صوم ای صیامٌ وقوم زَوْرٌ ای زوّارٌ۔ فھو اسم علی لفظ المصدر واحدھم وَارِدٌ (قرطبی)

والورد اسم للعطاش۔ لان من یرد الماء لا یردہ الا للعطش۔ وحقیقۃ الورد السیر الی الماء فسمی بہ الوَارِدُونَ (کبیر)

اِدًّا: لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا (آیت ۸۹)

بیشک تم آپھنسے ہو بھاری چیز میں (معارف)

اِدٌّ کے معنی ہیں سخت اور سنگین بات جس سے ہنگامہ برپا ہو جائے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ اَدَّتِ النَّاقَۃ: کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اونٹنی اپنے بچّے کی جُدائی میں سخت روئی اور گریہ کیا۔ الاَدِیْدُ: شور و ہنگامہ علامہ جوہری نے اِدًّا کے معنی ایسی مصیبت کے کئے ہیں جو گھبرا دے۔ قال الجوھری الادُّ والاِدَّۃُ الداھیۃُ والامر الفظیع (قرطبی) اسم فاعل آدٌّ آتا ہے اَدَّ یَؤُدُّ اَدًّا فھُوَ اٰدٌّ والاسم الاَدُّ۔ اِدٌّ اسم ہے بُری اور منکر شئے۔ ابن خالویہ نے اِدًّا کے معنی اچنبھے کے بیان کئے ہیں (کبیر)

اِدٌّ کی جمع اِدادٌ اور اِدَّۃٌ کی اِدَدٌ آتی ہے، الِادُّ والِادَّۃُ: العجب والامر الفظیع العظیم والداھیۃُ (لسان)

تَنْشَقُّ: وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ ھَدًّا۔ (آیت نمبر ۹۰)

اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ کانپ کر گر پڑیں

اِنْشِقاق سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے صاحب قرطبی نے تنشق کے معنی تَتَصَدَّعُ کے کئے ہیں۔ اصل مادہ شَقٌّ ہے شَقَقْتُہٗ بِنِصْفَیْنِ۔ میں نے اسکو برابر دو ٹکڑے میں کر دیا

ھَدًّا الھَدُّ کے معنی کسی چیز کو زور کی آواز کے ساتھ گرا دینے یا کسی بھاری چیز کے گر پڑنے کے ہیں اور گرنے کی آواز کو ھَدَّۃٌ کہا جاتا ہے (راغب)

ھَدٌّ کے معنی کسی دیوار وغیرہ کا دھماکے کے

ساتھ گر پڑنے کے ہیں (تدبر)

هَدَّ يَهُدُّ هَدًّا و هُدُودًا ۔ هَدَّ البناءَ: عمارت وغیرہ کو دھڑام سے گرا دینا۔ هَدَّتْهُ المُصِيبَةُ مصیبت نے اس کو کمزور کر دیا، اور هَدَّ يَهِدُّ (س۔ض) هَدًّا، هَدَّ الرجل آدمی کا بوڑھا ہونا۔ الهادُّ سمندر کا شور، دریا کی آواز جو ساحل پر رہنے والوں کو سنائی دے۔ الهادّةُ بادل کی گرج، کڑک۔ الهِدُّ بکسر الہاء کمزور آدمی، جمع هَدُّونَ و هِدُّون۔ الهَدادُ نرمی مہربانی۔ قَوْمٌ هِدادٌ بزدل لوگ۔ دوسرے کو تڑی دیتے ہوئے کہتے ہیں اِنّی لَغَیْرُ هَدٍّ میں کمزور نہیں ہوں۔ هَدٌّ سخی بہادر آدمی کو کہا جاتا ہے۔ الهَدُّ مِنَ الرِّجالِ الجواد الکریم (قرطبی)

الهَدُّ: الهدم الشدید والکسر کحائط هُدَّ بمَرَّةٍ فینهدم (لسان)

ایک شاعر کہتا ہے ؎

فلو کان مابی بالجبال لهَدَّهٗ
وان کان فی الدنیا شدیدًا هدودها

رِكْزًا: اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا: رِكْزٌ وہ مخفی آواز جو سمجھ میں نہ آئے، جیسے مرنے والے کی زبان لڑکھڑانے کے بعد جو آواز ہوتی ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ سب حکومت و سلطنت والے اور شوکت و حشمت اور طاقت و قوت والے جب اللہ کے عذاب میں پکڑے گئے اور فنا کئے گئے تو ایسے ہو گئے کہ ان کی کوئی مخفی آواز اور حس و حرکت بھی سنائی نہیں دیتی (معارف)

رِكْزٌ کے معنی آہٹ، سُن گُن اور کھٹکے کے ہیں (تدبر)

رِكْزٌ کہتے ہیں آواز خفی کو (ماجدی)

رَكَزْتُ كَذَا کے معنی ہیں میں نے اسکو مخفی طور پر دفن کر دیا، اِرْتَكَزَ، وہ اپنی جگہ قائم اور ثابت ہو گیا۔ اسی سے الرِّكاز ہے جس کے معنی دفینہ کے ہیں خواہ کسی انسان نے اسکو دفن کیا ہو یا قدرتی طور پر زمین کے اندر پایا جاتے جیسے معدنیات وغیرہ رَكَزَ رُمْحَهُ اس نے اپنا نیزہ گاڑ دیا۔ یہ ایک محاورہ ہے اور وہ جگہ جہاں جا کر فوج اترتی ہے اس کو مرکز کہتے ہیں کیونکہ فوجی اپنے پرچم وغیرہ گاڑ دیتے ہیں (راغب)

وَالرِّكْزُ: الصَّوْتُ الخَفِيُّ منه: ركز الرمح اذا غيّبَ طرفه فی الارض، والرِّكاز: المالُ المدفون (کشاف)

تمت

شرح الفاظ القرآن